خلیفۂ ثانی، مُرادِ رسول ﷺ اِمام عدل و حُریّت
ناصر دین مبین فاتح عرب و عجم امیرُ المؤمنین

سیّدنا حضرت

عُمرِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ

مصنّف محمد حسین ھیکل

مترجم حبیب اشعر دہلوی

TR
طٰہٰ رحیم پبلیکیشنز

Marfat.com

خلیفۂ ثانی، مُرادِ رسُول ﷺ اِمام عدل وحُرّیت
ناصر دین مبین، فاتح عرب وعجم، امیرُ المؤمنین

سیدنا حضرت

عُمرِ فارُوقِ اعظم رضی اللہ عنہ

مصنف محمد حسین ہیکل

مترجم حبیب اشعر دہلوی

TR
طٰہٰ رحیم پبلیکیشنز

خلیفہ ثانی، مُرادِ رسول ﷺ اِمام عدل وحُریت
ناصرِ دینِ مبین، فاتحِ عرب وعجم، امیرُ المؤمنین

سیدنا حضرت
عُمر فارُوقِ اعظم رضی اللہ عنہ

طٰہٰ رحیم پبلیکیشنز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

297-992
142736

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب : سیدنا حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ

مصنف کا نام : محمد حسین ہیکل

مترجم : حبیب اشعر دہلوی

سرورق واندرونی تزئین صفحات : محمد [illegible]

[illegible] 0301 [illegible]

نظر ثانی : حکیم جمیل احمد

باہتمام : محمد قیصر محمود ہمدانی

پرنٹر : عبداللہ زبیر پرنٹر

اللہ کے فضل وکرم سے انسانی بساط کے مطابق کتاب کے تمام اشاعتی مراحل میں بہت احتیاط برتی گئی ہے۔ تاہم انسان خطا کا پتلا ہے۔ اگر کسی بھی طرح کی غلطی یا کوتاہی میں کوئی چیز سامنے آئے تو آپ سے التماس ہے کہ ادارہ کو ضرور آگاہ فرمائیے۔ آپ کی تجویز ان شاء اللہ کتاب اور ادارے کے لیے بہت اہم کردار ادا کرے گی۔

ناشر

142736

TR
طٰہٰ رحیم پبلیکیشنز
حق سٹریٹ اردو بازار لاہور
042-37360541 | 0300-9233714

Marfat.com

21-05-2014

اس کتاب میں حضرت عمرؓ کی زندگی اور کارناموں کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ ان کی بلند پایہ شخصیت کا ایک ایک خط واضح اور ایک ایک رنگ روشن ہو جائے۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ ایک مختصری مدت میں اتنی بڑی سلطنت کیسے قائم ہو گئی اور اس کے قیام میں حضرت عمرؓ ابن خطاب کی شخصیت کو کتنا دخل ہے؟ پھر وہ سب بھی آپ پر منکشف ہو جائے گا جس نے اس عظیم انسان کو جس کا نام مشرق و مغرب میں حیرت و احترام سے لیا جاتا ہے، تاریخ کے صفحات پر زندہ و جاوید کر دیا۔

Marfat.com

حضرت
عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ

مشعلِ راہ

خلافتِ راشدہ کے دوسرے حکمران
امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب کی
شخصیت امتِ مسلمہ کے ہر دور کے لیے
مشعلِ راہ ہے۔ آج کے دور کے
اربابِ حکومت و سیاست اگر حضرت عمر
کی شخصیت کو اپنا شعارِ زندگی بنا لیں تو
آج کا معاشرہ بھی تاریخ کے سنہرے
دور کا عکس پیش کرے گا۔

PANJAB
UNIVERSITY
LIBRARY

Marfat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نسبی رشتہ

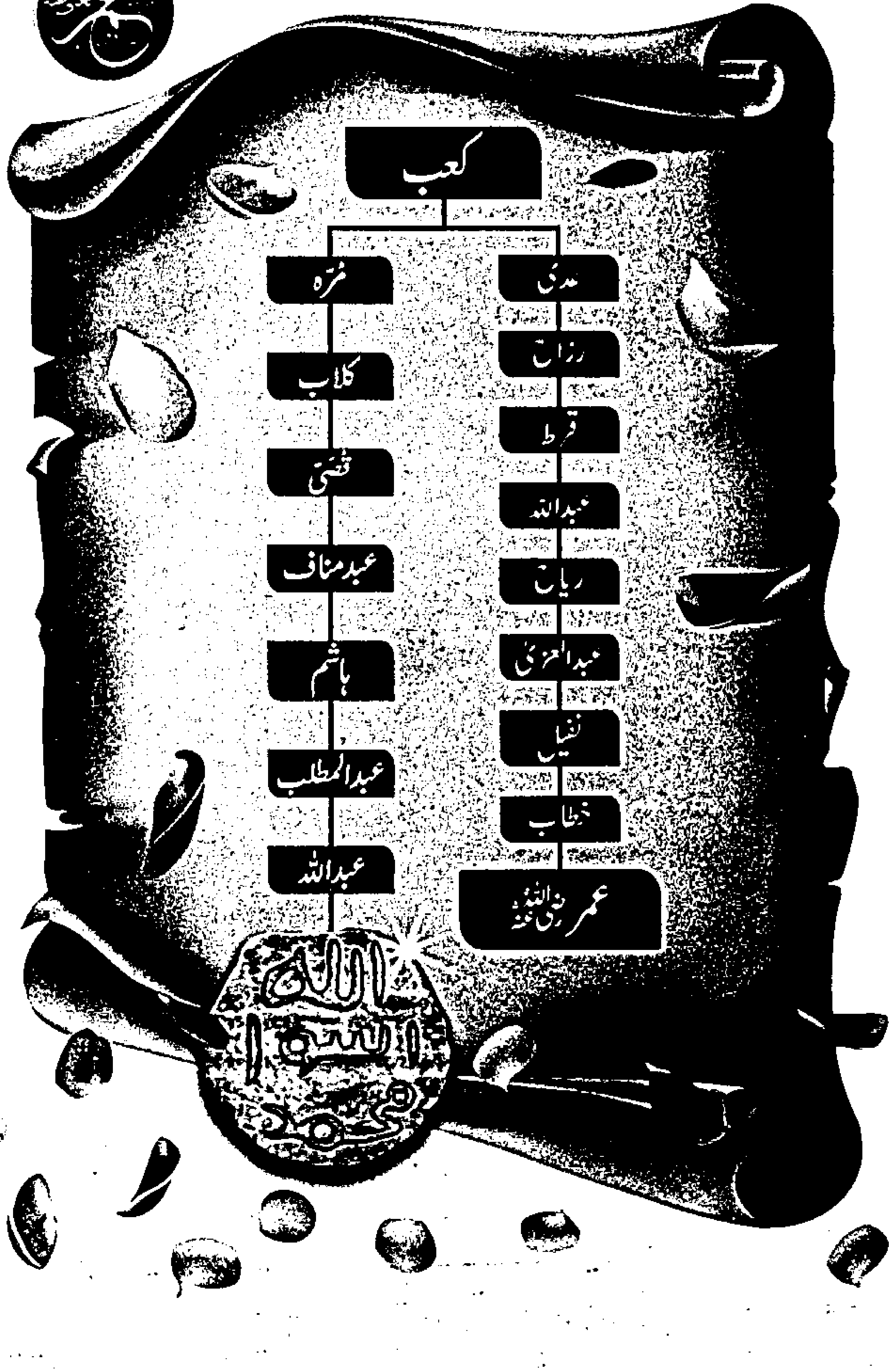

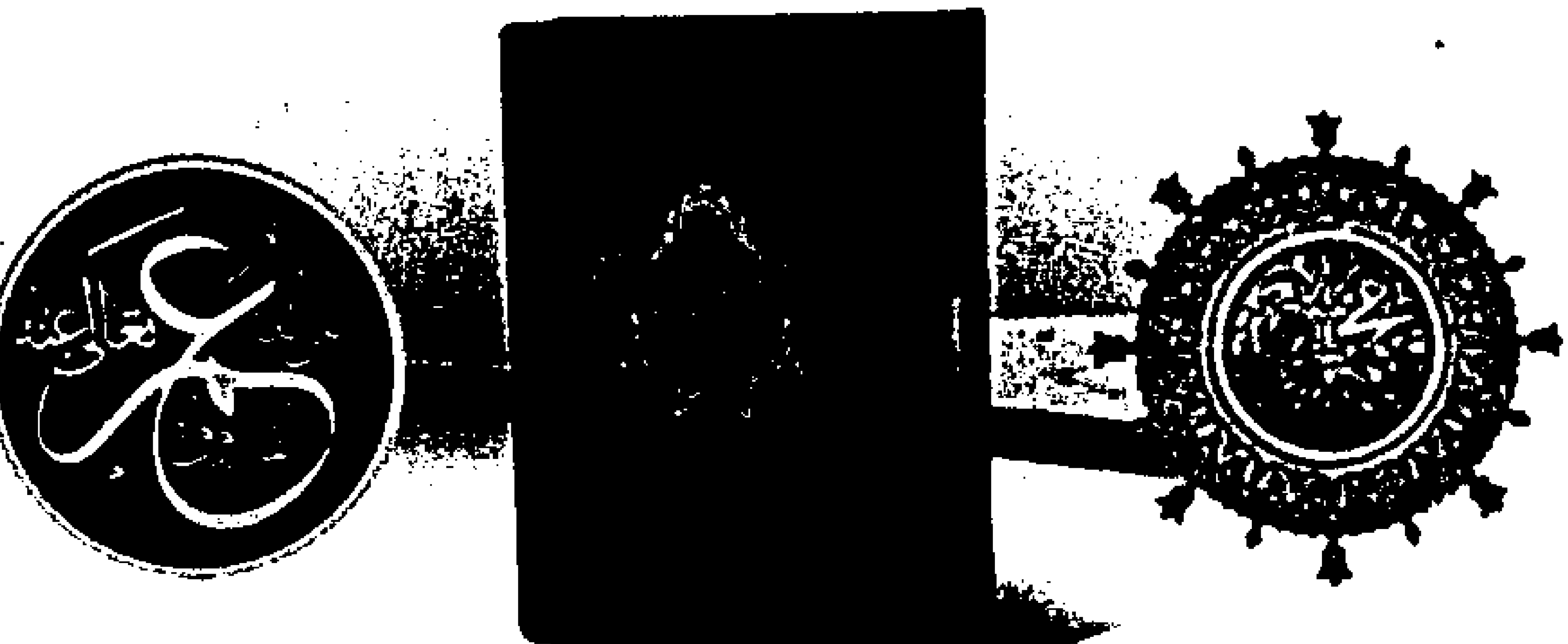

زبانِ نبوّت سے قرآن سن کر عمر رضی اللہ عنہ کی حیرت

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ سیدنا عمر ؓ نے رسول اللہ ﷺ کا پیچھا کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ حرم پہنچ گئے ہیں اور آپ ﷺ نے نماز پڑھنی شروع کر دی ہے، عمر ؓ آپ کے پیچھے کھڑے ہوگئے۔ آپ ﷺ نے سورۃ الحاقہ کی تلاوت شروع کر دی، عمر ؓ قرآن مجید سننے لگے اور اس کے بے نظیر نظم و اسلوب پر تعجب کرنے لگے۔ انھوں نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا: ''اللہ کی قسم! یہ تو شاعر ہیں جیسا کہ قریش کہتے ہیں۔''

اتنے میں رسول اللہ ﷺ نے یہ آیاتِ مبارکہ تلاوت فرمائیں:

﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۙ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ ۝﴾

''بلاشبہ یہ (قرآن) رسولِ کریم کا قول ہے۔ اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں، تم کم ہی ایمان لاتے ہو۔''

یہ سن کر عمر ؓ بولے: ''(ارے یہ شاعر نہیں بلکہ یہ تو) کاہن ہیں۔''

پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیات تلاوت فرمائیں:

﴿وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ ۝ تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِينَ ۝﴾ (الحاقۃ 69: 40-47)

''اور نہ (قرآن) کسی کاہن کا قول ہے، تم کم ہی نصیحت پکڑتے ہو۔ (یہ تو) تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ اور اگر یہ ہم پر کوئی بات گھڑ کر لگاتا۔ تو یقیناً ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے۔ پھر ہم اس کی شہ رگ کاٹ ڈالتے۔ پھر تم میں کوئی ایک بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔''

رسول اللہ ﷺ نے اس سورت کی آخر تک تلاوت فرمائی۔ سیدنا عمر ؓ آپ ﷺ کی زبانِ اطہر سے قرآن مجید کی تلاوت سن کر بے حد متاثر ہوئے، وہ فرماتے ہیں: فَوَقَعَ الْإِسْلَامُ فِي قَلْبِي كُلَّ مَوْقِعٍ.

''(یہ تلاوت کلام پاک سن کر) اسلام میرے دل میں پوری طرح جاگزیں ہوگیا۔''[1]

[1] مسند احمد 1/17

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ

کا اسلام قبول کرنا دراصل رسول اللہ ﷺ کی دعا کا نتیجہ تھا۔

آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ دعا فرمائی تھی:

«اَللّٰھُمَّ! أَعِزَّ الْإِسْلَامَ بِأَحَبِّ ھٰذَیْنِ الرَّجُلَیْنِ إِلَیْکَ بِأَبِي جَھْلٍ أَوْ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ»

”اے اللہ! ابوجہل اور عمر بن خطاب دونوں میں سے جو تجھے زیادہ محبوب ہے، اس کے ذریعے سے اسلام کو عزت عطا فرما۔“

راوی حدیث سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کو دونوں میں سے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ زیادہ محبوب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی دعا کو شرفِ قبولیت سے نوازا اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اپنے دین کے لیے چن لیا۔ جامع الترمذي: 3681

Marfat.com

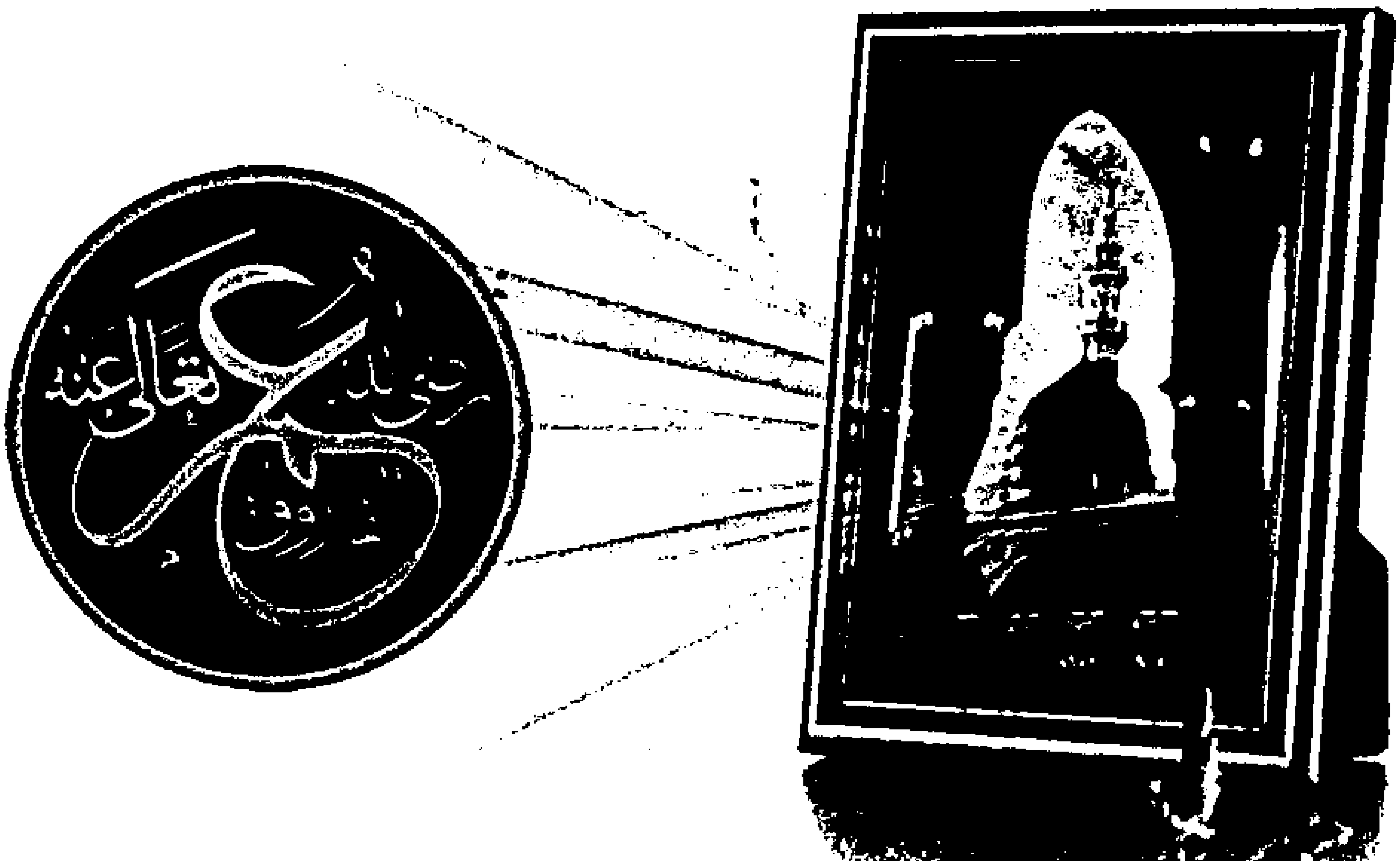

مسلمان ہونے پر سیدنا حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے لیے دعائے نبوی ﷺ

جب عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں درج ذیل دعا دیتے ہوئے اپنا دست مبارک تین بار ان کے سینے پر مارا:

«اَللّٰهُمَّ! أَخْرِجْ مَا فِي صَدْرِهٖ مِنْ غِلٍّ وَّ أَبْدِلْهُ إِيمَانًا»

”اے اللہ! اس کے سینے میں موجود کینہ نکال دے اور اسے ایمان سے بدل دے۔“

آپ ﷺ نے تین بار یہی دعا فرمائی۔

المعجم الأوسط للطبراني: 1/308، حديث: 1096.

Marfat.com

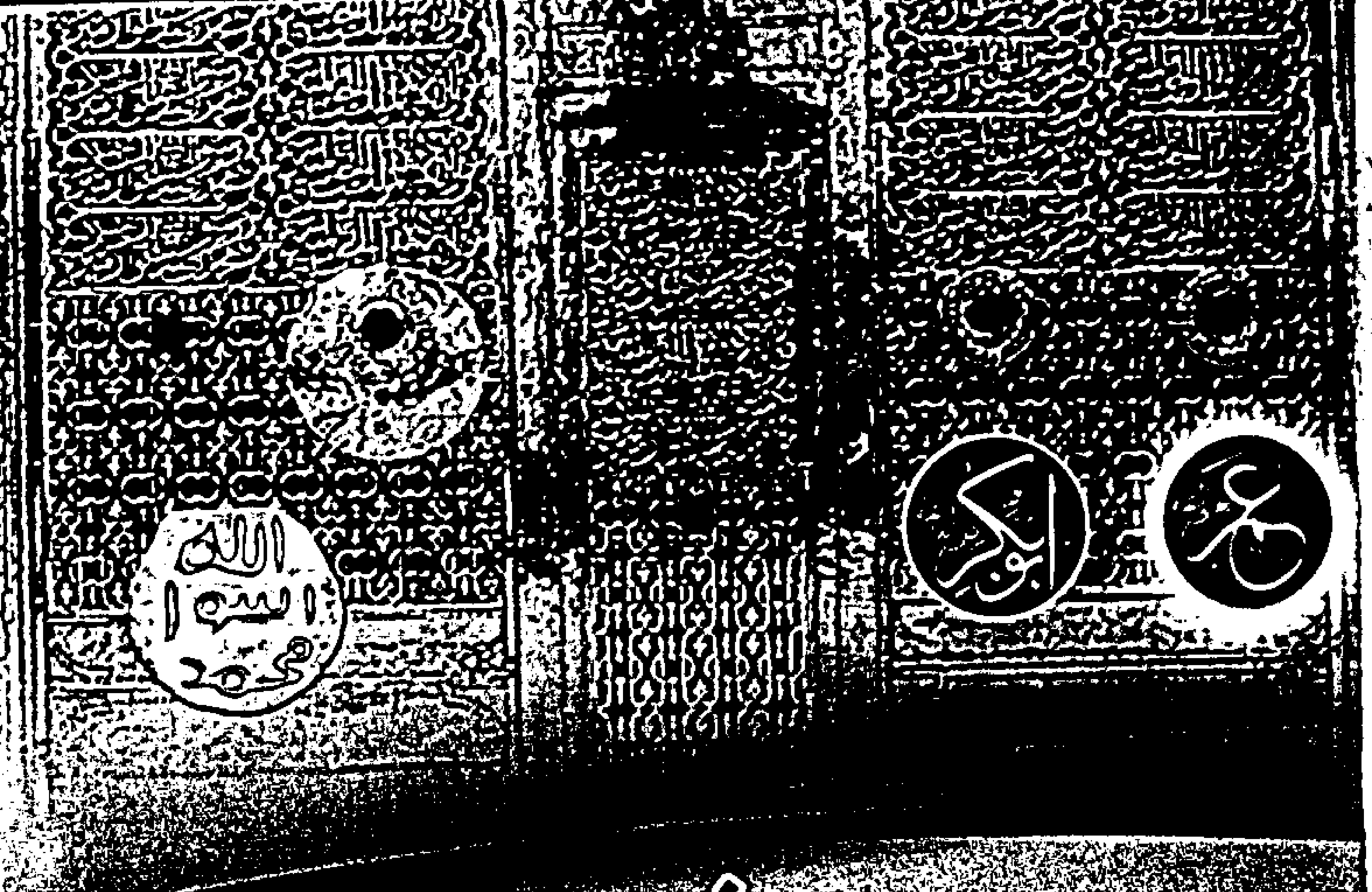

مواجہہ شریف

نبی کریم ﷺ اپنی قبر مبارک میں حجرۂ مبارک کے جنوبی جانب مدفون ہیں، جبکہ سیدہ عائشہؓ اسی حجرۂ مبارکہ کی شمالی جانب زندگی گزارتی رہیں۔ ان کے اور قبر مبارک کے درمیان کوئی دیوار یا رکاوٹ نہیں تھی۔

1 جب سیدنا ابوبکر صدیقؓ فوت ہوئے تو سیدہ عائشہؓ کی اجازت سے نبی کریم ﷺ کے پاس ہی دفن کیے گئے۔ ان کی قبر نبی کریم ﷺ کی قبر سے ایک ہاتھ نیچے کھودی گئی اور ان کا سر رسول اللہ ﷺ کے مقدس و مطہر کندھوں کے برابر رکھا گیا۔ اب بھی سیدہ عائشہؓ نے اپنے اور قبروں کے درمیان کوئی رکاوٹ قائم نہیں فرمائی۔ وہ فرماتی تھیں: ''ایک میرے خاوند ہیں، دوسرے میرے باپ۔''

2 پھر جب عمر بن خطابؓ فوت ہوئے تو سیدہ عائشہؓ نے ان کو بھی وہیں دفن کرنے کی اجازت دے دی۔ سیدنا عمرؓ کی قبر سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے بھی ایک ہاتھ نیچے کھودی گئی اور ان کا سر سیدنا ابوبکرؓ کے کندھوں کے برابر رکھا گیا۔ چونکہ حضرت عمرؓ قد کے لمبے تھے اس لیے ان کے پاؤں حجرۂ مبارکہ کی مشرقی دیوار سے جا لگے۔ ان کے دفن کے بعد سیدہ عائشہؓ نے اپنے اور ان بابرکت قبروں کے درمیان دیوار بنوا دی، کیونکہ حضرت عمرؓ ان کے لیے نامحرم تھے اس لیے انہوں نے ان کی وفات کے بعد بھی ان کا احترام قائم رکھا۔ (تاریخ مدینہ منورہ)

Marfat.com

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ
سے منسوب تلواریں

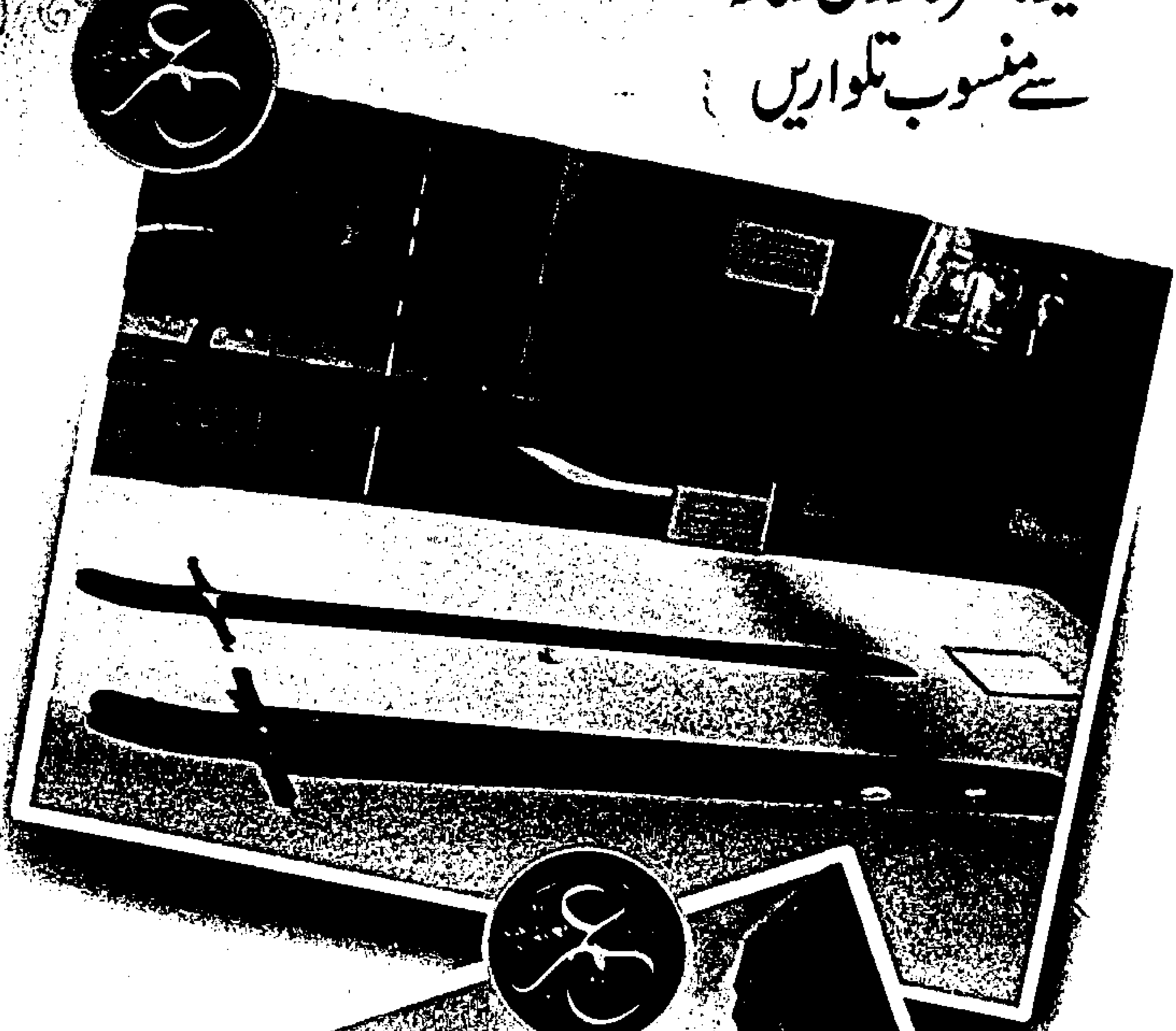

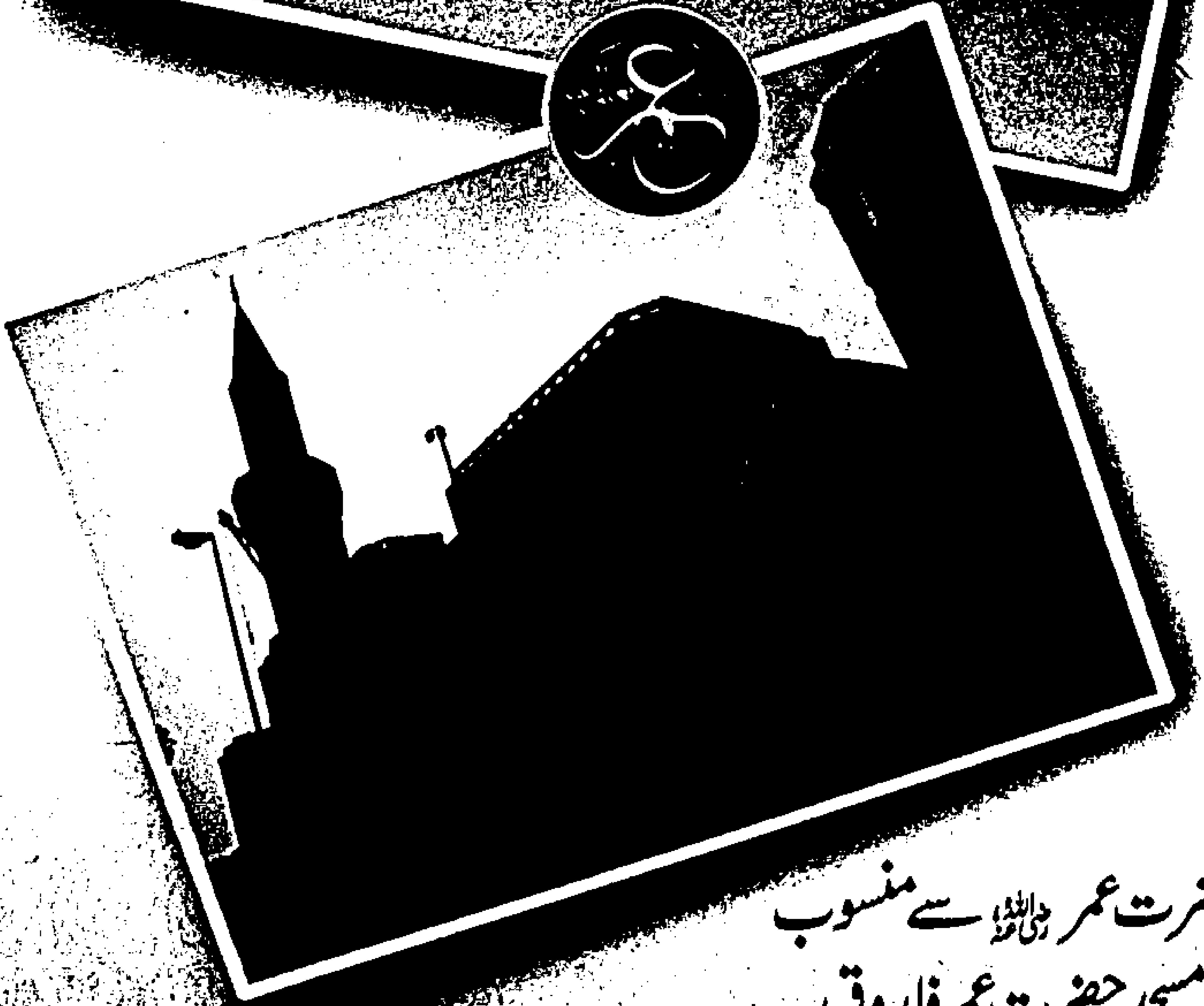

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب
مسجد حضرت عمر فاروق
مدینہ منورہ

Marfat.com

1. جو آدمی زیادہ ہنستا ہے اس کا رعب کم ہو جاتا ہے
2. جو مذاق زیادہ کرتا ہے، لوگ اس کو ہلکا اور بے حیثیت سمجھتے ہیں
3. جو باتیں زیادہ کرتا ہے، اس کی لغزشیں زیادہ ہو جاتی ہیں
4. جس کی لغزشیں زیادہ ہو جاتی ہیں، اس کی حیا کم ہو جاتی ہے
5. جس کی حیا کم ہو جاتی ہے، اس کی پرہیز گاری کم ہو جاتی ہے
6. جس کی پرہیز گاری کم ہو جاتی ہے، اس کا دل مردہ ہو جاتا ہے

((حیاۃ الصحابہ جلد 3، ص: 562))

Marfat.com

حضرت عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ

سیدنا صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”جب عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو اسلام ظاہر اور غالب ہوگیا اور اسلام کی طرف علانیہ دعوت دی جانے لگی۔ ہم بیت اللہ کے اردگرد حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے، پھر ہم نے بیت اللہ کا طواف کیا۔ جس نے ہم پر سختی کی، ہم نے بھی اس سے انتقام لیا اور اس کی بعض اذیت رسانیوں کا جواب دیا۔“

الطبقات لابن سعد: 269/3

Marfat.com

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لقب "فاروق" کی وجہ تسمیہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ آپ کو "فاروق" کیوں کہا جاتا ہے تو آپؓ نے اپنے اسلام قبول کرنے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا "مجھ سے قبل حضرت حمزہؓ اسلام قبول کر چکے تھے۔ جب میں نے اسلام قبول کرلیا تو میں نے کہا، جب ہم حق پر ہیں تو پھر اخفاء کیسا ہے؟ لہذا ہم سیّد عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دو صفوں میں نکلے۔ دارِارقم سے چلے تو ایک صف میں تھا اور ایک میں حضرت حمزہؓ تھے۔ جب کفار نے مجھے اور حضرت حمزہؓ کو دیکھا تو مرعوب ہو گئے۔ اس دن سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے فاروق کہا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سبب سے حق و باطل میں فرق کر دیا۔"

Marfat.com

عمر
فاروق
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
تقاضہ ہے کہ پھر دنیا میں شان حق ہویدا ہو
عرب کے ریگزاروں سے کوئی فاروقؓ پیدا ہو
بڑا چرچا ہے پھر سے جہاں میں کفر و باطل کا
کوئی فاروقؓ پھر اٹھے تو حق کا بول بالا ہو
عمر
رضی اللہ عنہ
الفاروق

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت

عمر فاروق رضی اللہ عنہ

Marfat.com

اللّٰھم

صلّ علیٰ محمّد وعلیٰ آلِ محمّد

کما صلیت علیٰ ابراہیم وعلیٰ آلِ ابراہیم

انک حمیدٌ مجید

اللّٰھم

بارک علیٰ محمّد وعلیٰ آلِ محمّد

کما بارکت علیٰ ابراہیم وعلیٰ آلِ ابراہیم

انک حمیدٌ مجید

فہرست

حرفِ آغاز 5
باب:1- عہدِ جاہلیت کا ایک ورق 35
باب:2- شرفِ اسلام سے سرفرازی 56
باب:3- موافقاتِ عمر رضی اللہ عنہ 79
باب:4- صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دوش بدوش 105
باب:5- عہدِ فاروقی رضی اللہ عنہ کا آغاز 125
باب:6- ابوعبید رضی اللہ عنہ اور مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے کارنامے 148
باب:7- فتح دمشق 176
باب:8- جنگِ قادسیہ کی تفصیلی روداد 201
باب:9- فتح مدائن 253
باب:10- مسلمانوں کا عراق پر تسلط 275
باب:11- شام سے رومی فوجوں کا اخراج 302
باب:12- حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس میں 329
باب:13- شام پر مسلمانوں کے قبضہ کی تکمیل 354
باب:14- قحط اور طاعون 369
باب:15- ایرانی فتوحات میں توسیع 395

Marfat.com

فہرست

باب:16-فتح نہاوند 418
باب:17-ایرانی فتوحات کا تتمہ 438
باب:18-اسلامی فوجوں کی مصر کی طرف پیش قدمی 473
باب:19- مصر میں اسلامی فوج کی کامیابیاں 512
باب:20-فتح اسکندریہ 550
باب:21- مصر پر مسلمانوں کا قبضہ 590
باب:22- اُمورِ مملکت کا نظم و نسق 632
باب:23- عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں اجتماعی زندگی کا ایک نقشہ 685
باب:24- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد 733
باب:25- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت 778
حرفِ اختتام 821

Marfat.com

حرفِ آغاز

اسلام کی تاریخ میں رسول اللہ ﷺ کے بعد صرف حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا نام ہے، جو بار بار زبانوں پر آتا ہے۔ زبانیں اس نام کو دہراتی ہیں اور اس کا دامن...... بہ صد استعجاب و احترام...... ان اعلیٰ خوبیوں اور غیر معمولی صلاحیتوں کے دامن سے باندھ دیتی ہیں، جو مبدأ فیاض نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذات میں ودیعت فرمائی تھیں۔ چنانچہ جب کبھی اس زہد کا ذکر آتا ہے جو دنیا کی تمام نعمتیں میسر آچکنے کے باوجود اختیار کیا جائے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زہد کا ذکر آتا ہے اور جب کبھی اس عدل و انصاف کا تذکرہ ہوتا ہے، جس میں کسی لوث اور کسی غرض کا شائبہ تک نہ ہو تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عدل و انصاف کا تذکرہ ہوتا ہے۔ جب کبھی دل کی وہ پاکیزگی بیان کی جاتی ہے، جو اپنے پرائے میں تمیز کرنا جانتی ہی نہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل کی پاکیزگی بیان کی جاتی ہے اور جب کبھی علم اور تفقہ فی الدین پر گفتگو ہوتی ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علم اور تفقہ فی الدین پر گفتگو ہوتی ہے۔ اس کے متعلق آپ کتابوں میں پڑھیے تو بیشتر واقعات کو آپ مبالغے پر محمول فرمائیں گے، جنہیں تسلیم کرتے ہوئے عقل ہچکچاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ برگزیدہ ہستیوں کی عظمت وجلالت کے مقابلے میں ان معجزات سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں جو صرف پیغمبروں کے لیے مخصوص ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہی فضائل وکمالات تھے، جو ان کے عہد میں اسلامی سلطنت کے قیام کا سبب بنے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد مسلمانوں کی امارت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس وقت سونپی گئی جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فتنہ ارتداد کا استیصال کر چکے تھے اور اسلامی فوجیں عراق و شام کی سرحدوں پر ایران اور روم کی طاقتوں سے نبرد آزما تھیں، لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو عراق اور شام کلیۃً اسلامی سلطنت کے زیر اقتدار آچکے تھے، بلکہ وہ ان سے گزر کر ایران اور مصر میں بھی اپنے پرچم لہرا چکی تھی، جس کی وجہ سے اس کی حدود مشرق میں چین، مغرب میں افریقہ، شمال میں بحیرہ قزوین اور جنوب میں سوڈان تک وسیع ہوگئی تھیں۔

Marfat.com

دس سال کی مختصر سی مدت میں اتنی عظیم الشان سلطنت کا قیام بلاشبہ ایک معجزہ ہے۔ اس معجزے کی قدر و اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے، جب اس زمانے کی دو سب سے بڑی سلطنتیں...... ایران اور روم...... شکست کھاتی ہیں اور اس عرب سے شکست کھاتی ہیں جو اس سے کچھ ہی پہلے تک چند متفرق قبائل کا مجموعہ تھا، جن کی باہمی نفرت و عداوت انہیں ایک دوسرے سے برسر پیکار رکھتی تھی اور جن کے لڑائی جھگڑے انہیں ایک لمحے کے لیے بھی چین سے نہ بیٹھنے دیتے تھے۔

یہی ایک بات کہ یہ معجزہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اور ان کی توجہ سے مکمل ہوا، ان کے "عظیم انسان" ہونے کا ایک بین ثبوت ہے۔ اس عظمت کے نقوش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کے عہد میں ابھر آئے تھے، بعد میں مسلمانوں کی فتوحات نے اس کی اہمیت دوچند کردی جس طرح مرور زمانہ نے اسے بڑھایا اور اس میں اضافہ کیا۔ جوں جوں ماہ و سال گزرتے گئے، یہ حقیقت لوگوں پر عیاں ہوتی گئی کہ یہ سلطنت غیر معمولی فوجی ذہانت کا ثمرہ نہیں ہے کہ جب تک وہ باقی ہے یہ بھی باقی ہے اور جہاں وہ فنا ہوئی یہ بھی فنا ہوئی، بلکہ خلق متین کی محکم اساس اور تہذیب و حضارت کی محفوظ بنیاد پر قائم ہے۔

پس اگر جولیس سیزر، اسکندر اعظم، چنگیز خاں اور نپولین جیسی کچھ سلطنتیں وہ قائم کرسکے، قائم کرنے پر ان کی عظمت کے راگ گائے جانے جائز ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عظمت کا اقرار اور ان کے کارناموں کا اعتراف جائز تر ہے۔

یہ معجزہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اسلامی سلطنت قائم ہونے پر تمام ہوا۔ مسلمان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسند آرائے خلافت ہونے کے دن تک ایران اور روم سے خائف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایران سے مقابلہ کرنے کے لیے انہیں عراق جانے کی دعوت دی تو وہ دم چرا گئے۔ اپنی اس بے حوصلگی کا عذر ان کے پاس یہ تھا کہ ایران کا نام اس زمانے میں بھی قلب و گوش کے زلزلے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے شام چلے جانے کے بعد اسلامی فوجیں عراق سے نکال باہر کردی گئی تھیں۔ مسلمانوں کی بے ہمتی کا سلسلہ کچھ دن جاری رہا۔ آخر کار ابوعبیدہ ثقفی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعوت پر لبیک کہا اور چند ہزار کی جمعیت ساتھ لے کر کسریٰ کی فوجوں کا مقابلہ کرنے لگے لیکن معرکہ جسر میں انہیں ناکامی ہوئی۔ خود شہید ہوئے اور ان کی فوج کو شکست کھانی پڑی۔

Marfat.com

اس شکست سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حوصلہ پست نہ ہوا، بلکہ ان کی ہمت اور بڑھ گئی۔انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ فوج لے کر جائیں گے اور ایرانی طاقت کا مقابلہ کر کے اس ہزیمت کا داغ اسلام کے دامن سے دھوئیں گے۔ یقیناً وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتے لیکن بعض اہل الرائے صحابہ رضی اللہ عنہم نے انہیں اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی جگہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جنگ قادسیہ میں ایرانوں پر نہایت شاندار فتح حاصل کی، جس نے ان کے لیے ایران کے پایہ تخت اور مسلمانوں کے لیے پورے ایران کے دروازے کھول دیئے۔اسی دوران میں حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ شام میں فاتحانہ پیش قدمی کر رہے تھے۔شہنشاہ روم، ہرقل ان کے مقابلے میں پسپا ہو رہا تھا اور ان دونوں کی متفقہ کوشش تھی کہ اسے روم کے دارالسلطنت میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا جائے۔

ابھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو دو ہی سال ہوئے تھے کہ یہ سب کچھ ہو گیا۔اس دن سے مسلمان جہاں کہیں جاتے فتح ونصرت ان کے دامن سے پیمان وفا باندھ لیتی۔ چنانچہ انہوں نے مدائن اور بیت المقدس فتح کیے۔فارس کے بعد عراق سے گزر کر مصر پہنچے اور ان دونوں ملکوں میں اپنے جھنڈے گاڑ دیئے۔

اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دس سال میں اسلامی سلطنت کی بنیادیں اتنی استوار کر دیں کہ اس نے دنیا میں اپنے قدم جما لیے اور اس کی تہذیب وشائستگی نے آنے والی قوموں اور نسلوں کا خط سفر بدل دیا۔

تو کیا...... ان حالات میں...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے مستحق نہیں ہیں کہ زبانیں ان کا نام دہرائیں اور بار باران کی اعلیٰ خوبیوں اور وہبی صلاحیتوں کا ذکر کریں، جو دلوں کو حیرت واحترام کے انتہائی جذبات سے لبریز کر دیتی ہیں؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ احترام ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم تاریخ کی چھان بین کریں اور اس کے واقعات کی جانچ پڑتال کریں۔تا آنکہ وہ محرکات اپنے چہرے سے نقاب اٹھا دیں، جنہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس سلطنت کے استحکام کے لیے تیار کیا۔اس لیے کہ اگر چند محرکات نہ ہوتے تو واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی ذہانت اس سلطنت کے استحکام میں تنہا کفایت نہ کرتی۔

ان محرکات میں سب سے پہلا اور سب سے قوی محرک اسلام کا قیام ہے کہ اسلام ہی تھا

جس نے عرب کو افتراق و پراگندگی کے بعد متحد کیا اور اس کے نفرت پیشہ قبائل کو ایک ہم احساس قوم بنا دیا اور یہ اسی کا فیضان تھا کہ اہل عرب اسلامی تعلیمات کی اشاعت، اعلائے کلمۃ الحق اور اسلام کو ان فتنہ پردازوں کے شر سے محفوظ رکھنے پر کمر بستہ ہو گئے جو لوگوں کو گمراہ کرنا چاہتے تھے۔

عرب اسلام سے پہلے، روم اور ایران کے مقابلے میں بہت کمزور تھے، ان کے ملک کا بیشتر حصہ قیصر و کسریٰ کے اثر و نفوذ کا شکار تھا، لیکن جب انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو یہ اثر نفوذ پورے جزیرہ نمائے عرب سے بہ سرعت تمام زائل ہونے لگا۔ پھر بھی ایران و روم کی ہیبت ان کے دلوں پر طاری رہی۔ یہاں تک کہ جب انہیں عراق اور شام پر حملے کی دعوت دی گئی، وہ سمجھتے تھے کہ ان دونوں حکومتوں کے قلعے ناقابل تسخیر اور ان کی فوجیں ناقابل شکست ہیں، لیکن جس وقت انہوں نے سرحدیں پار کر کے ان فوجوں کا مقابلہ اور ان قلعوں کا محاصرہ کیا تو انہیں بہت جلد معلوم ہو گیا کہ انہیں گھن لگ چکا ہے اور وہ اس بوسیدہ دیوار کی مثل ہو گئی ہیں، جو ایک ہی ریلے میں زمین پر آ رہتی ہے۔ جس کی بنیادیں تیشے کی ایک ہی بھرپور ضرب میں اپنی گرفت چھوڑ دیتی ہیں۔

عرب اسلام قبول کرنے کے بعد، ایران اور روم پر غالب آ گئے۔ اس لیے کہ اسلام نے انہیں ایک نئی زندگی عطا کر دی، ان میں ایک ایسی روح پھونک دی، جس نے ان کی فطرت ہی کو بدل کے رکھ دیا۔ اسلام نے ان کے دلوں پر حملہ کیا اور قدیم عقائد و عبادات کو پامال کرتا ہوا ان کے وجدان تک پہنچ گیا، جہاں اس نے توحید کا بیج ڈالا جو ہر آمیزش سے پاک تھا۔ پھر ان پر وہ عبادتیں فرض کیں، جنہوں نے ان کے ایمان بالتوحید کا رنگ نکھارا اور ان کے دلوں کو انتہائی مضبوط رشتے میں باندھ دیا۔ اس نے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج ان پر فرض کیے اور ان کے علاوہ جتنے بھی ان کے قدیم مذہبی مراسم تھے انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ اس طرح ان کی روحیں وہم کے بندھنوں سے آزاد اور ان کے دل بت پرستی کی آلائشوں سے پاک ہو گئے اور ان میں سے ہر ایک یہ سمجھنے لگا کہ جس کسی نے دعوت الی اللہ کا جواب اثبات میں دیا اور نیک کام کیے، اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔

اسلام نے ان عبادات کو حکومت کے رسمی شعائر کی حیثیت سے فرض نہیں کیا تھا، بلکہ یہ اللہ کے فرائض تھے۔ مومنوں پر جن کی بجا آوری ثواب کی مستحق تھی اور جن کا ترک باز پرس کا مستوجب۔ چنانچہ جو کوئی اللہ پر ایمان لایا اور اس کا فرض ادا کرنے سے قاصر رہا، اس کا حساب اللہ کے ذمے ہے اور جس کسی نے اپنے رب کا حکم مانا اور نیک کام کیے اللہ سے نیک لوگوں کا اجر

Marfat.com

دے گا.....اور یہ بہت ہی بڑا اجر ہے۔

اس ایمان نے دلوں میں پیوست ہو کر انہیں ایک کر دیا اور اس کا اثر فرد سے جماعت میں منتقل ہو گیا...... یہ اثر بڑا زبردست اثر تھا! مسلمان نماز کے لیے جمع ہوتے۔ یہ اجتماع ان میں ربط پیدا کرتا اور رجوع الی اللہ ان کے دل کی کدورتیں دھو دیتا۔ اب وہ آپس میں بھائی بھائی تھے۔ ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ پسند کرتا جو خود اپنے لیے، مسلمان روزہ رکھتے اور ان کا امیر ان کے فقیر کے برابر ہوتا، خدا کے سامنے بھی اور خدا کے بندوں کے سامنے بھی۔ روزہ دولت مند کے نفس کو پاک کرتا اور وہ محتاج پر مہربانی کر کے اللہ کی خوشنودی اور ثواب سے بہرہ یاب ہوتا۔ مسلمان زکوٰۃ ادا کرتے جس سے ان کے مختلف طبقات کی معاشی کمزوری کا ازالہ ہو جاتا...... اس لیے کہ زکوٰۃ نے دولت مند کے مال میں محتاج کا ایک خاص حق مقرر کر دیا تھا اور حج انہیں سال کے سال دنیا کے ہر گوشے سے کھینچ کر ایک جگہ جمع کر دیتا کہ وہ ایک دوسرے کو صبر و صلوٰۃ کی تلقین اور نیکی و پرہیزگاری میں ایک دوسری کی اعانت کریں۔

اسلام نے جو اجتماعی نظام جاری کیا وہ روحانی نظام کی طرح سادہ تھا۔ چنانچہ اس کا بھی عربوں کی اجتماعی وحدت پر وہی اثر تھا جو اثر روحانی نظام کا تھا۔ اللہ کے حضور ان کی مساوات، اسلامی توحید کی بنیاد تھی اور قانون کی نظر میں ان کی ''مساوات'' اجتماعی نظام کی اساس۔ اسلام سے پہلے عرب اپنی عورتوں سے غیر شریفانہ برتاؤ کرتے تھے۔ اسلام نے عورت کو عزت و احترام سے نوازا اور خدا کی نظر میں اس کا درجہ مرد کے برابر ٹھہرایا۔ مرد کو عورت پر جو فضیلت دی گئی، وہ صرف اس لیے کہ وہ عورت کی کفالت کرتا ہے، اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا اور اسے اپنی محبت و مہربانی سے آسودہ کرتا ہے۔ غریبوں کا حال عورت سے بھی کچھ بدتر تھا۔ اسلام سے پہلے وہ بھی بڑی ذلت و بے چارگی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اسلام نے دولت کے بجائے پرہیزگاری کو اللہ کے نزدیک فضیلت کی بنیاد قرار دے کر ان کا مقام بھی بلند کر دیا۔

ان قواعد اور ان امور کو جن سے وحی الٰہی نے عہد رسالت میں جماعت کی تنظیم کی اور انہیں پورے عالم انسانیت کے لیے ایک نظام بنا کر پیش کیا۔ عربوں کے اتحاد اور ان کی معنوی قوتوں کے نشوو ارتقاء میں بڑا دخل تھا۔ انہیں کی اساس پر اسلامی سلطنت کی تعمیر ہوئی۔

اس کے آثار رسول اللہ ﷺ ہی کی زندگی میں ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے اور مستقبل قریب میں قایم ہونے والی اسلامی سلطنت کی نوید اسی وقت فضا میں سرسرانے لگی تھی۔ ہجرت کے

ساتویں سال رسول اللہ ﷺ نے قیصر و کسریٰ اور ان کے علاوہ دوسرے بادشاہوں اور امیروں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے قاصد روانہ کیے۔ کسریٰ قاصد کے ساتھ بڑی سخت کلامی سے پیش آیا اور یمن میں اپنے عامل ''بازان'' کو لکھا کہ وہ ''حجاز کے اس شخص (ﷺ)'' کا سر اس کے حضور پیش کرے لیکن اس سے پہلے کہ وہ حکم بازان تک پہنچے، کسریٰ قتل کر دیا گیا اور اس ایرانی امیر نے نبی عربی ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کی معنوی قوت کا اندازہ کر کے یمن سے اکاسرہ کا تسلط ختم کر دیا اور آنحضرت ﷺ سے مل گیا۔ اور بازان کا رسول اللہ ﷺ سے مل جانا ملک عرب کے اجنبی استیلاء سے آزاد ہونے کی طرف گویا پہلا قدم تھا۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ روم اور اس پر حملہ کرنے کے متعلق سوچتے رہے۔ ہجرت کا نواں سال تھا کہ آپ ایک لشکر لے کر، جو تاریخ میں جیش العسرۃ کے نام سے مشہور ہے، تبوک کی طرف روانہ ہوئے۔ رومیوں کو جب آپ کی آمد کا علم ہوا تو مارے خوف کے شام کی داخلی حدود میں سمٹ گئے اور مقابلہ نہ کیا۔ پہلے ایلہ کے حاکم، یوحنا بن روبہ اور اس کے بعد جرباء اور اذراح والوں نے جزیہ پر صلح کر لی۔ ایلہ، جرباء اور اذراح، یہ تینوں شام کے علاقے تھے، جن پر رومی اقتدار مسلط تھا۔ اس طرح تبوک کی مہم نے جزیرہ نمائے عرب میں روم کا سارا اثر و نفوذ ختم کر دیا اور یہ مہم اسلامی سلطنت کے لیے ایک دروازہ بن گئی جس سے گزر کر وہ سرزمین شام میں قدم زن ہوئی۔

اللہ نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو یاد فرمالیا اور مسلمانوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دست خلافت پر بیعت کر لی۔ اس وقت عربوں کی ایک جماعت نے گمان کیا کہ وہ خلیفۂ رسول ﷺ اور اس کے دین کے خلاف بغاوت کی قدرت رکھتے ہیں، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ارتداد کی جنگوں میں فتح یاب ہونا اس بات کی قطعی دلیل تھی کہ توحید کے اصول عربوں کے دلوں میں راسخ ہوچکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مدعیان نبوت میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہ کہا کہ وہ لوگوں کو بت پرستی قدیم جاہلیت کی طرف بلا رہا ہے۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ کے مہاجر و انصار صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے جن بزرگوں نے اصول توحید کی پیروی کی اور اس کے لیے اپنی جانیں وقف کر دیں، ان پر کوئی غالب نہ آسکا۔ یہی ایک نقطہ ہے جس سے وحدت عرب نے نہایت تیزی کے ساتھ ثبات و استحکام کی طرف قدم بڑھایا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ مسلمان فرات کے جوار میں ایرانیوں کا مقابلہ کر رہے تھے اور انہیں شکست پر شکست دے رہے

رہے تھے اور ابھی خلافت صدیقی رضی اللہ عنہ کا دوسرا سال ختم نہ ہونے پایا تھا کہ وہ شام میں رومی لشکروں کے منہ پھیر رہے تھے۔ اس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلامی فتوحات اور اسلامی سلطنت کے فروغ کی راہیں کھول دیں جس کے لیے نئے دین نے پہلے ہی سے دل ودماغ تیار کر دیئے تھے۔ ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور اسلامی سلطنت کو ان حدود تک وسیع کر دیا جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

اسلامی سلطنت کے نشوو ارتقاء پر یہ سرسری نگاہ شہادت دیتی ہے کہ اسلام نے عربوں کے دلوں میں ایک زبردست معنوی قوت پیدا کر دی تھی، جس کے سہارے انہوں نے اجنبی اقتدار کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا۔ اپنی سرحدوں سے کہیں آگے نکل کر دشمنوں کا مقابلہ کیا اور روم و ایران کی قوتوں کو ان کے گھروں میں گھس کر کچل دیا۔ ہر لڑائی میں فتح وظفر کی بنیاد معنوی قوت ہی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ معنوی قوت رکھنے والا شکست کے نام سے آشنا نہیں ہوتا اور نہ کسی حال میں اسے قبول کرتا ہے۔ اگر اسے کبھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ بھی جاتا ہے تو یہ ناکامی اس کے ارادے میں کمزوری کا سبب نہیں بنتی، بلکہ اس کی کوششوں کو دوگنا کر دیتی ہے۔ وہ ہر مشکل کو آسان سمجھنے لگتا ہے اور جس مقصد کو پہنچنا چاہتا ہے اس کی راہ میں جان پر کھیل جانا بھی اس کے لیے ایک معمولی سی بات ہوتی ہے۔

عہد عتیق سے لے کر دور حاضر تک کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ لڑائی میں فتح ہمیشہ اسی کی ہوتی ہے جس کا عقیدہ مضبوط اور ایمان راسخ ہو، اس لیے کہ راسخ ایمان اور مضبوط عقیدہ اپنے ماننے والے میں اتنی قوت پیدا کر دیتے ہیں کہ اگر وہ پہاڑ سے کہے تو پہاڑ بھی اپنی جگہ چھوڑ دے۔

اسلامی سلطنت کی تعمیر عقیدے نے کی۔ یہ عقیدہ بخشنے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ ہی نے اس عمارت کی ٹھوس بنیاد رکھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے رفیق اور جاں نثار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس عقیدے سے بغاوت کرنے والوں کا قلع قمع کر کے اور اہل عرب کو عراق وشام کی حدود میں پہنچا کر اسلامی سلطنت کے قیام کی راہ ہموار کی۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عمارت کو مکمل کیا اور اسے مضبوط ستونوں پر استوار کر کے چھوڑ گئے۔ بعد کو یہ عمارت، اپنی ذاتی قوت کے بل پر جو اسے روح اسلام کے سرچشمے سے حاصل ہوئی تھی، وسیع ہوئی اور برابر وسیع ہوتی چلی گئی۔ تا آنکہ وہ فکر، جس نے یہ سلطنت قائم کی تھی، بیمار پڑ گئی۔ اسے توہمات نے

آ گھیرا جو بڑی حد تک جاہلانہ توہمات سے مشابہ تھے اور مسلمانوں میں بغض و عداوت اور فتنہ و فساد کے جذبات بھڑک اٹھے۔

ہم نے عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد صدیقی رضی اللہ عنہ کی تاریخ بیان کی ہے اور دیکھا ہے کہ اس عقیدے پر ایمان لانے والوں کے دل میں اس معنوی قوت کا کتنا اثر تھا۔ اس کتاب میں جب آپ شجاعت و دلیری کے ان کارناموں کا مطالعہ فرمائیں گے، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مسلمانوں نے سرانجام دیئے تو اس قوت کی اثر کاریوں پر آپ کا ایمان اور پختہ ہو جائے گا اور کہنے والوں کی یہ بات آپ کو سراسر بہتان نظر آئے گی کہ مسلمانوں نے اپنی جنگجویانہ فطرت اور مال غنیمت کی طمع سے مجبور ہو کر ایران و روم پر چڑھائی کی تھی۔ بھلا ایک قلیل التعداد اور قریب قریب بے سروسامان قوم محض اپنی جنگجویانہ فطرت کے تقاضے کی تسکین و تشفی کے لیے اپنے ہمسائے پر حملہ کرنے کا خیال دل میں کیسے لا سکتی ہے، جو تعداد اور سامان جنگ کے اعتبار سے اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور ہو! اور لوگ اپنی جان اس غنیمت کے لیے ہنسی خوشی کیسے قربان کر سکتے ہیں، جس کے لم و بیش حصول سے پہلے انہیں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا قوی احتمال بھی ہو! بلاشبہ یہ ایک صحیح عقیدے پر سچا ایمان ہی تھا، جس نے صدر اول کے مسلمانوں کو بلندی عطا کی اور وہ تاریخ کے صفحات پر ایسے سرمدی نقوش چھوڑ گئے جن کی نظیر شاذ ہی ملتی ہے۔ ان بزرگوں نے کیا کچھ کیا؟ یہ داستان اس مقدمے میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ ناظرین کو یہ تفصیل کتاب میں ملے گی، جسے پڑھ کر ہر طالب حق کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلام نے قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں جو قوت پیدا کی تھی، وہی انہیں عظمت و بزرگی کے میدانوں میں لے گئی اور اسی نے حق کی راہ میں...... جو اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا تھا...... انہیں جاں سپاری کا آرزومند بنایا اور جو کوئی حق کی راہ میں شہادت کی آرزو کرتا ہے کامیابی و کامرانی لازماً اس کے قدم چومتی ہے۔

اگر مسلمانوں کی اس معنوی قوت کا مقابلہ کسی معنوی قوت سے ہوتا تو واقعات کا رخ...... ایک حد تک ہی سہی کچھ بدل جاتا۔ لیکن ایران اور روم کی سلطنتیں بڑی تیزی سے زوال و انحطاط کی طرف جا رہی تھیں اور ان میں سے کسی ایک میں بھی وہ ہمت نہ تھی جو اسے غازیان اسلام کے مقابلے میں ثابت قدم رکھ سکتی۔ کسریٰ کے درباریوں میں اس کے تخت کا جھگڑا انتہائی نازک صورت اختیار کر گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وقتاً فوقتاً اندرونی بغاوتیں اور داخلی شورشیں برپا ہوتی رہتی

تھیں اور روم کا حال بھی کچھ ایسا بہتر نہ تھا۔ ہرقل نے قیصر روم، فوکاس کے خلاف بغاوت کر دی تھی اور اسے قتل کر کے اس کے تخت پر قبضہ جما بیٹھا تھا۔ زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد اس نے جب دیکھا کہ مسیحی فرقے آپس کے مذہبی جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور ان کے یہ تنازعات سلطنت کو کمزور کیے دے رہے ہیں تو ایک ایسا مذہب رائج کرنے کا ارادہ کیا جس میں ان تمام فرقوں کے عقائد سمو دیئے جائیں اور تمام عیسائی اسے قبول کر لیں، لیکن اس کی یہ کوشش خود اس کے لیے وبال بن گئی۔ اس لیے کہ اس نے اپنے مذہب کی دعوت کا طریق ایسا بھونڈا اختیار کیا کہ اس میں نہ حکمت و مصلحت کا کوئی پہلو تھا نہ پند و موعظت کا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ایران اور روم میں باہمی جنگ کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ایران نے روم پر حملہ کیا اور شام و مصر اس سے چھین لیے۔ پھر ہرقل نے فوج کشی کی اور اپنے چھنے ہوئے علاقے ایران سے واپس لے لیے۔ اس طرح یہ باہمی معرکہ آرائیاں دونوں سلطنتوں کو گھن کی طرح کھاتی اور ان کے وقار کو خطرے میں ڈالتی رہیں۔ یہ انہیں واقعات کا اثر تھا کہ ایران کے عوام اکاسرہ اور ان کے درباریوں کے کرتوت دیکھ کر ایرانی فتوحات سے دلچسپی لینا فضول سمجھنے لگے تھے اور رومی مقبوضات میں رہنے بسنے والی قومیں قیاصرہ اور ان کے عمال کی دراز دستیوں سے تنگ آ کر ان کی امداد و اعانت سے دست کش ہو چکی تھیں۔ یہ تھے وہ اسباب جنہوں نے ایران اور روم کی معنوی قوت کا خاتمہ کر دیا تھا اور یہ دونوں سلطنتیں اس تند و تیز لہر کو روکنے سے معذور ہو گئی تھیں جو عرب کے جزیرہ نما سے اٹھ کر ان کی حدود میں تباہی مچا رہی تھی۔

یہاں ایک محرک اور ہے جسے نظر انداز کرنا صحیح نہ ہوگا اور وہ یہ ہے کہ ان دنوں عراق و شام میں عربوں کی اچھی خاصی آبادی تھی۔ حیرہ میں لخمیین فرماں روا تھے اور شام میں غسانی حکومت قائم تھی۔ ان لوگوں نے جب دیکھا کہ ان کے بھائی ایران اور روم سے مصروف پیکار ہیں اور فتح و نصرت ان کے قدم لے رہی ہے تو بیش تر تعداد میں مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو کر دشمن سے لڑنے لگے، حالانکہ ابھی انہوں نے اسلام قبول نہ کیا تھا۔ ان کی اس اعانت سے مسلمانوں کو سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ انہوں نے متعدد معرکوں میں ایران اور روم کو شکست دے کر بڑی تیزی سے ان کے ملکوں پر قبضہ کر لیا۔

یہ ایک اہم محرک تھا جس کی بنا پر اسلامی سلطنت کا قیام بہ سرعت عمل میں آیا اور وہ صدیوں تک قائم رہی، لیکن سلطنت کے استقرار و استحکام میں اس کے ساتھ ایک اور شدید الاثر محرک بھی

Marfat.com

شریک تھا۔ اس محرک سے ہماری مراد وہ سیاست ہے جو مفتوحہ علاقوں اور خود جزیرہ نمائے عرب کے نظم ونسق پر حاوی تھی اور اس سیاست کے اصول مقرر کرنے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا بہت بڑا حصہ ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس سیاست کے بنیادی اصول اسلام کے قواعد وتعلیمات پر مبنی تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان میں سے بعض اصولوں کی وضاحت بھی فرمادی تھی، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس باب میں بطور خاص توجہ صرف کی اور اس کے بڑے اہم نتائج برآمد ہوئے۔ انہوں نے ان اصولوں اور ان کی تصریحات کو بنیاد بنا کر تمام عربی ممالک اور اسلامی سلطنت کے لیے ایک ایسا نظام وضع کیا جو ان کے عہد میں اور اس کے بعد بھی ایک زمانے تک جاری رہا۔ یہی نظام تھا جس نے اسلامی سلطنت کا تحفظ کیا اور اسے قائم رکھا۔ اس کے علاوہ ایران، عراق، شام اور مصر وغیرہ ملکوں میں جو اسلام کا اثر پھیلا اور وہاں کے باشندوں نے جو اسلام قبول کیا، اس میں بھی اس نظام کو بہت گہرا دخل تھا۔ بعد میں یہ ممالک دنیائے اسلام میں شامل ہو گئے۔ اس نظام کو وضع کرنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس اجتہاد فکر سے کام لیا، اس نے تاریخ میں ان کے لیے ایک بلند مقام پیدا کر دیا اور یہ مقام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس مقام سے اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں، جو اسلامی سلطنت کے بانی کی حیثیت سے انہیں حاصل ہے۔

اس نظام کی تفصیل قارئین کو کتاب میں مل جائے گی۔ اس لیے یہاں اس کا بیان مناسب نہیں۔ تاہم ایک مثال ضرور پیش کروں گا کہ جب غازیان اسلام نے عراق اور شام کے علاقے بھی مال غنیمت کی طرح مجاہدین میں تقسیم کیے جانے کا مطالبہ کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا اور زمین اس رقم کے بدلے میں جو زمین کے مالک ادا کرتے تھے حسب سابق انہی کے قبضے میں رہنے دی۔ آپ نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ آدمی بھیجے جنہوں نے ان زمین کی پیمائش کی اور اس کی پیداوار بڑھانے کے لیے آب پاشی کے ذرائع وسیع کیے۔ اسی طرح حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مصر کا جزیہ اور خراج وصول کیا اور اس میں سے جتنی رقم انہیں پلوں اور نالوں کی مرمت کے لیے درکار تھی لے کر باقی رقم مدینہ بھیج دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہ صرف یہ کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے اس طریق کار کو خود رائی پر محمول نہ کیا بلکہ اسے پسند بھی فرمایا۔

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انتہائی دور بینی سے کام لے کر مفتوحہ ممالک کے نو مسلموں

کا جزیہ معاف کر دیا اور انہیں فاتحین اسلام کے مساوی قرار دے دیا۔ ان کی اس حکمت عملی نے بہت سے غیر مسلموں کو اسلام کی طرف مائل کر دیا اور ان کے مسلمان ہو جانے سے دنیائے اسلام دیکھتے ہی دیکھتے وسیع سے وسیع تر ہو گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نومسلموں کا جزیہ بھی معاف کر دیا اور انہیں فاتحین اسلام کے مساوی بھی قرار دے دیا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ اس سے مدینہ کی آمدنی میں کتنا فرق پڑ جائے گا اور ان ملکوں کی حکومت پھر انہی کے باشندوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ اس کے باوجود انہوں نے تامل سے مطلق کام نہ لیا اور ان باتوں کو بالکل اہمیت نہ دی۔ اس لیے کہ مسلمانوں نے ان ممالک کو اس غرض سے فتح نہیں کیا تھا کہ انہیں اپنا محکوم بنائیں، بلکہ اس لیے فتح کیا تھا کہ ان ممالک میں اسلام کی دعوت کو کسی قسم کی روک ٹوک پیش نہ آئے۔ چنانچہ جب ان ممالک کے باشندوں نے اسلام قبول کر لیا تو اللہ کے انعام نے انہیں فاتحین اسلام کا بھائی بنا دیا...... اب ان کے بھی وہی حقوق تھے جو مسلمانوں کے تھے اور ان پر بھی وہی فرائض عائد ہو گئے تھے جو مسلمانوں پر عائد تھے۔

یہ تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیاست اور یہ تھا وہ نظام جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نوزائیدہ اسلامی سلطنت کے لیے وضع کیا تھا۔ تو کیا یہ فطرت کے عین مطابق نہیں ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں مسلمان ان کا نام لیں اور اسے عزت و احترام سے ہم رشتہ کریں۔ مسلمانوں کو یہی چاہیے تھا، یہی انہوں نے کیا اور یہی وہ ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ چنانچہ مؤرخین و مصنفین نے جتنا کچھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر لکھا ہے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں سے کسی پر نہیں لکھا اور باوجودیکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں کوئی ایسی پیغمبرانہ باطنی کشش نہ تھی جو دنیا کو اپنی طرف کھینچتی اور لوگوں کو مختلف طریقوں سے ان کے گن گانے پر مجبور کرتی، لیکن لکھنے والوں نے اس کا خیال نہ کیا اور ان کی خدمت میں عقیدت کا خراج اور احترام کی نذر پیش کرنے میں پیش پیش رہے۔

یہی نہیں بلکہ مؤرخین نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے احترام میں اس قدر غلو کیا ہے اور ان کی سیرت میں ایسی باتیں شامل کر دی ہیں جو پیغمبرانہ معجزات سے زیادہ قریب ہیں اور جنہیں کوئی انتقاد پیشہ مؤرخ صحیح تسلیم نہیں کر سکتا۔ حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایسے مبالغہ آمیز احترام کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ ان کے لیے اسلامی سلطنت کا قیام اور عہد فاروقی کے دوسرے کارنامے ہی

Marfat.com

کافی ہیں جنہیں تاریخ تسلیم کرتی ہے اور جن کی بنا پر تاریخ میں انہیں ایک ایسا پر عظمت مقام حاصل ہوا ہے جو ابدالآباد تک قائم رہے گا۔

اگر قدیم مؤرخین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت میں فوق الفطرت واقعات کا اضافہ نہ کرتے تو ان کے بعد آنے والے مؤرخ کو ان کی تحقیق میں سر کھپانے کی مصیبت سے نجات مل جاتی اور وہ بآسانی صحیح حالات اخذ کر سکتا۔ پھر اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قدرت و منزلت اور ان کے کارناموں کی عظمت پر بھی کوئی اثر نہ پڑتا۔ اسی لیے پہلے میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ان واقعات سے صرفِ نظر کر لوں گا جنہیں عقل تسلیم اور تنقید ثابت نہیں کرتی، لیکن پھر مجھے محسوس ہوا کہ جن روایات کو ممکن الوقوع سمجھنے میں عقل تکلف کرتی ہے، ان کا اثبات مجھ پر فرض ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ مؤرخین نے یہ روایات علی التواتر نقل کی ہیں اور اس اعتبار سے بھی ان کی صحت شک و شبہ سے بالاتر قرار پاتی ہے۔ اور آخر میں ایسا کیوں نہ کروں جب کہ یہ واقعات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں اور ان میں ایسے پہلو بھی ہیں جن کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جنگی اور ملکی سیاست سے گہرا تعلق ہے۔ پھر بھی میں نے کوشش کی ہے کہ ان واقعات کی توضیح و تفسیر میں حتی الامکان علمی بحث و انتقاد سے کام لوں اور مجھے یقین ہے کہ اس کوشش میں توفیق الٰہی میرے شامل حال رہی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے متقدمین کی کتابوں میں صرف واقعات کی بحث و تمحیص کے سلسلے میں مشکل پیش نہیں آتی بلکہ آپ دیکھیں گے کہ یہ متقدمین واقعات بیان کرنے میں بعض اوقات ایک دوسرے سے اتنا اختلاف کرتے ہیں کہ انسان حیرت میں رہ جاتا ہے۔ پھر ان میں کچھ مؤرخ ایسے ہیں جنہوں نے کچھ واقعات اتنی تفصیل سے بیان کیے ہیں کہ ان کی انتہائی جزئیات میں چلے گئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض دوسرے واقعات میں اتنا اختصار برتا ہے کہ ان کی دلالت تک واضح نہیں ہو پاتی۔ میں اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں: طبری، ابن اثیر اور بلاذری عراق کی فتوحات کے بیان میں اتنی دراز نفسی سے کام لیتے ہیں کہ ان معرکوں کے ایک ایک ہیرو کی شجاعت مجسم ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہے، لیکن جب وہ مسلمانوں کی سیاست اور مفتوحہ علاقوں میں ان کے طرزِ حکومت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان کا قلم اس قدر اجمال پسند ہو جاتا ہے کہ پہلی تفصیل سے کسی طرح میل نہیں کھاتا۔ پھر یہی

مؤرخین شام کی فتوحات میں داستان کا دامن ذرا سمیٹ لینے کے باوجود بیان کا حق ادا کر دیتے ہیں لیکن مصر کی فتوحات پر پہنچتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کے قلم کی سیاہی خشک ہو گئی ہے۔ آپ بھی یقیناً اس رائے میں مجھ سے اتفاق کریں گے جب دیکھیں گے کہ طبری نے صرف قادسیہ کے ایک معرکے کو ساٹھ سے زیادہ صفحات میں بیان کیا ہے اور مدائن کی فتح کو بارہ صفحات میں جگہ دی ہے، لیکن مصر کی پوری فتح کل پانچ صفحوں میں گھونٹ کے رکھ دی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قادسیہ کی جنگ خاص توجہ کی مستحق تھی۔ اس لیے کہ اسی کی بدولت عربوں کو دوبارہ عراق میں داخل ہونے کا موقع ملا اور اسی کی وجہ سے پہلے مدائن اور بعد کو پورے ایران کے دروازے مسلمانوں کے لیے کھل گئے، لیکن اہمیت کے اعتبار سے مصر کی فتح بھی عراق اور ایران کی فتح سے کسی عنوان کم نہ تھی اور اس لیے ضروری تھا کہ مؤرخین نے اس کے بیان میں جتنی تفصیل سے کام لیا ہے، اس سے زیادہ تفصیل سے کام لیتے۔

ان مؤرخین کی طرف سے یہ عذر پیش کیا جا سکتا ہے کہ جو روایات انہیں مل سکیں، انہوں نے مدون کر دیں یا جن ملکوں میں وہ پلے بڑھے تھے ان کی طرف انہوں نے دور دراز کے ملکوں سے زیادہ توجہ صرف کی، لیکن ایسی حالت میں کہ ہمارے اور ان کے درمیان کئی صدیاں حائل ہو چکی ہیں، ان کی طرف سے کسی قسم کا عذر پیش کرنے اور ان کے طریق نقد کے لیے معذرت طلب ہونے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ عہد حاضر کے مؤرخ کی وہ کون سی مشکلات ہیں جو اس قدیم دور کے سلسلے میں اسے پیش آتی ہیں۔ چنانچہ براہ راست اپنے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ آج کے مؤرخ کے سامنے لامتناہی مواد ہے جس سے وہ ہر کمی کو پورا کر سکتا ہے، جو بات طبری، ابن اثیر، ابن خلدون، بلاذری اور ابن کثیر اجمالی طور پر لکھتے ہیں وہی بات دوسرے مؤرخین کے ہاں اتنی تفصیل سے مل جاتی ہے کہ اس سے ہر قسم کی معلومات فراہم کی جا سکتی ہیں۔ جن مؤرخین نے مصر میں عربی فتوحات کا ذکر انتہائی اختصار سے کیا ہے، ان کی طرف میں پہلے ہی اشارہ کر چکا ہوں، لیکن یہی فتوحات ابن عبدالحکم سیوطی اور ابن تغری بردی کی کتابوں میں پوری وضاحت سے مذکور ہیں۔ ان مؤرخین نے فتح مصر کے واقعات اسی قدر تفصیل سے بیان کیے ہیں، جس قدر تفصیل سے طبری نے فتح عراق کے واقعات بیان کیے ہیں۔

پھر جو کتابیں عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں لکھی گئی ہیں، ان میں اسلامی فتوحات اور

Marfat.com

اسلامی سلطنت کے متعلق اتنی روشنی موجود ہے کہ مؤرخ اس سے استفادہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان مؤرخین کی کتابوں میں ان کی زبان، ان کے میلانات اور اختلاف مقاصد کے باوجود جو کچھ لکھا گیا ہے، اگر واقعات کی تحقیق کے لیے اس کا موازنہ کیا جائے تو وہ صحیح نتیجے پر پہنچنے میں بہترین معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مشرق و مغرب کے جدید مؤرخین کے پاس بہت سے اور بھی وسائل ہیں جن کی مدد سے وہ قدیم کتابوں کے مباحث کی تنقید و تحقیق کر کے انہیں ایسی صورت میں پیش کر سکتے ہیں، جو فکر و قیاس کے نئے سے نئے معیاروں پر پوری اتر سکے۔ پھر جب تاریخی مواد کی اتنی فراوانی ہے۔ سعی و جہد کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں، اسے پوری آزادی ہے کہ جس پہلو سے چاہے اس مواد سے استفادہ کرے اور اس میں سے جو بات اس کے نزدیک حق ثابت ہو اسے لوگوں کے سامنے پیش کر دے۔

ہر مؤرخ کے لیے ایک پہلو ہوتا ہے جسے وہ اپنے لیے مخصوص کر کے اپنا سارا زور مطالعہ اس پر صرف کر دیتا ہے اور باقی تمام دوسرے پہلوؤں کو اپنے اس مطالعے میں سند کے طور پر کام میں لاتا ہے اور جو مؤرخ اپنے لیے کسی عہد کو، اس کے تمام پہلوؤں کے ساتھ موضوع بناتا ہے وہ اسے چاہے اختصار کے ساتھ ہی سہی۔ مختلف حصوں میں تقسیم کر کے، اس کے ہر حصے پر الگ الگ خصوصی مطالعہ صرف کرتا ہے، جو کبھی کبھی تو ایک یا اس سے زیادہ مجلدات پر محیط ہوتا ہے۔ پھر جب وہ ان تمام پہلوؤں کا خلاصہ کرنا چاہتا ہے تو اس کی یہ تلخیص نفس تاریخ کے مقابلے میں فلسفہ تاریخ کی بحث سے زیادہ قریب ہو جاتی ہے۔

گذشتہ اجمال کی تفصیل کے لیے ہم بطور مثال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے موضوع کو لیتے ہیں۔ چنانچہ کبھی تو مؤرخ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذات کو اپنا موضوع بنا کر اس سے بحث کرتا ہے اور ان کے تمام شخصی و عصری واقعات کو ان کی ذہنی تصویر کے خط و خال نمایاں کرنے کا مزید وسیلہ بناتا ہے اور کبھی ان کے عہد کو عربی زندگی کے اقتصادی یا اجتماعی، یا کسی اور پہلو کے اعتبار سے اپنا موضوع قرار دیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس مخصوص پہلو پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا کچھ اثر ڈالا ہے؟ یہ تمام پہلو اپنی اپنی جگہ مطالعے میں ایک خاص توجہ کے مستحق ہیں اور ان میں سے ہر پہلو اتنی گنجائش رکھتا ہے کہ اس سے متعلق ایک ایسی جامع کتاب لوگوں کے سامنے پیش کی جا سکے جو اپنے مواد و مفاد کے پیش نظر اس پہلو کی مکمل ترجمانی کرتی ہو۔ عہد فاروقی میں عربی قوم کی ادبی زندگی کا مطالعہ ایک مفید مطالعہ ہے جس سے ایک طرف تو لوگوں پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ زندگی اس عہد اور اس عہد

Marfat.com

سے پہلے کے اقتصادی، سیاسی، اجتماعی اور مذہبی انقلابات نے کیسے متاثر ہوئی اور دوسری طرف وہ عربی کتب خانے کا ایک ایسا علمی وادبی سرمایہ بن سکتا ہے جو اپنے فوائد ومعلومات کی بناء پر لوگوں کے لیے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہو۔

"حیاتِ محمد ﷺ" اور "ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ" کی طرح میں نے اس کتاب میں بھی اس دور کی عربی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے کیونکہ میرا خیال ہے کہ اس سے میری بحث کی تکمیل میں مدد ملتی ہے، لیکن میں نے اسے ایک مبسوط مطالعے کی حیثیت سے پیش نہیں کیا کہ وہ میرے مقصود کے خلاف تھا۔ میں تو بس اسی حد تک اسے زیر بحث لایا ہوں جس حد تک اس سے میری غرض پوری ہو سکتی تھی۔ لیکن جس مقصد کے تحت میں نے یہ کتابیں لکھی ہیں وہ ان کتابوں کے مقدمات میں بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ "حیاتِ محمد ﷺ" کے مقدمے میں، میں نے لکھا ہے:

جب کبھی مشرق ومغرب کے درمیان کسی مفید اور نتیجہ خیز علمی تعاون کی راہ پیدا ہوتی ہے، مسیحی کلیسا کی اجارہ دار اور مغربی مصنفین کا ایک گروہ اسلام اور محمد ﷺ پر طنز وتشنیع کے تیر برسانے شروع کر دیتا ہے، جس کی تائید ایک طرف تو آزادی رائے کے نام پر اپنی پوری قوتوں کے ساتھ مغربی استعمار کرتا ہے اور دوسری طرف مسلمان جمود پرست اسے سہارا دیتے ہیں اور جو لوگ ان دونوں میں سے کسی کے خلاف جنگ کرتے ہیں، ان سے برسرپیکار ہوتے ہیں۔ اس کے واضح اثرات میں نے صرف مشرق ہی کے نہیں بلکہ تمام دنیا کے اسلامی ممالک میں دیکھے اور میری نگاہ ان مقاصد کو تاڑ گئی جو حریت رائے اور تلاش حقیقت کی راہ میں آزادانہ بحث ونظر کو موت کے گھاٹ اتار دینے کے ساتھ ساتھ ان ممالک کی معنوی روح کو کچل ڈالنے کے لیے درپردہ کام کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو ایک ایسے فرض کی انجام دہی پر مجبور پایا جسے کسی طرح نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مقدس زندگی کے مطالعے کا حتمی فیصلہ کر لیا، جن کی ذات گرامی ایک طرف تو مسیحی طعنہ زنوں کے طنز وتعریض کا ہدف بنی ہوئی ہے اور دوسری طرف جمود پرست مسلمان اس کی عظمت کو اپنی بے حسی کا نشانہ بنا رہے ہیں، لیکن میرا یہ علمی مطالعہ حق اور صرف حق کے لیے ہوگا جو بطور خود انسانیت کو اس تہذیب کی راہ پر ڈال دے جس کی تلاش میں وہ ادھر ادھر ماری ماری پھر رہی ہے۔

"ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ" کا آغاز میں نے اسلامی سلطنت اور اس کے عروج وزوال کے اسباب سے کیا ہے۔ اس لیے کہ یہ سلطنت نبی عربی علیہ التحیۃ والتسلیم کی تعلیمات اور سنت کی

Marfat.com

اساس پر قائم ہوئی تھی اور اس لیے کہ اس سلطنت نے اپنے زوال کے بعد جو قومیں اپنی یادگار کے طور پر چھوڑیں وہ سب کی سب اسلام سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی اکثریت عربوں پر مشتمل ہے۔ پھر ماضی نے ان قوموں کے درمیان کچھ ایسے رشتے قائم کر دیے ہیں کہ جب تک اسلام اور عربی زبان کا وجود باقی ہے وہ ٹوٹ نہیں سکتے۔ ان رشتوں کی ترتیب و تنظیم میں انسانیت کے لیے غیر معمولی فلاح ہے اور اس تک پہنچنے کی کوئی راہ نہیں ہے تاوقتیکہ ان رشتوں کو نہ سمجھا جائے جو ماضی میں ان قوموں کے درمیان رہے ہیں، پس ماضی کا علم ہی ایک ایسی راہ ہے جس کے ذریعے سے ہم حال کی تشخیص اور مستقبل کی تدبیر کر سکتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے متعلق یہ کتاب اسی سلسلے کی تیسری کڑی ہے لیکن پہلی دو کڑیوں سے اسی طرح مختلف جس طرح وہ آپس میں ایک دوسرے سے نمایاں طور پر مختلف ہیں۔ اس کے باوجود ان میں سے ہر کڑی اپنی پہلی کڑی سے پیدا ہوئی ہے، جیسے جڑیں بیج سے نکلتی ہیں، جڑوں سے تنے نمودار ہوتے ہیں اور تنوں سے شاخیں پھوٹتی ہیں۔ کبھی شاخیں سوکھ بھی جاتی ہیں، لیکن تنے زندگی کی پوری توانائیوں کے ساتھ باقی رہتے ہیں، بلکہ کبھی تنے بھی خشک ہو جاتے ہیں، لیکن جڑیں صحیح و سالم رہتی ہیں اور ان میں اتنی سکت ہوتی ہے کہ پہلے سے زیادہ مضبوط تنا اور پہلے سے زیادہ سرسبز شاخیں ان سے نمو پائیں۔ اس لیے اگر اسلامی سلطنت زوال کا شکار ہو گئی ہے تو کیا ہوا؟ وہ اسلام جس نے اس سلطنت کو بالیدگی عطا کی تھی، آج بھی زندہ ہے اور اس میں آج بھی اتنی طاقت موجود ہے کہ انسانیت کی اس عظیم وحدت کو پروان چڑھا سکتا ہے جو زمانے کی روح کے عین مطابق اور اس کے نظام سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔

اسلامی سلطنت کی نشاۃ اولیٰ کی صورت گری نے مجھے مجبور کیا کہ میں جزیرہ نمائے عرب اور ان ممالک کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کروں جو صدر اول کے مسلمانوں نے فتح کیے تھے، لیکن ان پہلوؤں سے میں نے صرف اسی حد تک سروکار رکھا ہے، جس حد تک اس سلطنت کے قیام کا مقتضا تھا۔ مگر یہ کام بھی کوئی آسان کام نہ تھا اس لیے کہ چاہے اختصار کے ساتھ ہی سہی عربی ممالک کی سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی زندگی کے خطوط واضح کرنے تھے اور مفتوحہ ممالک کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ایسا نقشہ کھینچنا تھا جس میں زیادہ سے زیادہ اجمال و ایجاز سے کام لیا جائے۔ میں نے یہ اجمالی تصویر اس سلسلے کی پہلی دو کتابوں میں بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور

Marfat.com

اس کتاب میں تو اس کا اور بھی لحاظ رکھا ہے۔ خاص طور پر ان واقعات و حالات کے ضمن میں جو روم و ایران سے تعلق رکھتے ہیں۔ میری انتہائی تمنا ہے، یہ اختصار اس حد تک نہ پہنچے کہ جس چیز کی تصویر میں نے کھینچنی چاہی ہے، قاری کا ذہن اس کی طرف منتقل ہی نہ ہو۔

یہ تینوں کڑیاں، جو اسلامی سلطنت اور دنیائے اسلام کے نشو و ارتقاء کی تاریخ بیان کرنے کے لیے مرتب کی گئی ہیں، تاریخ عالم کے ان لمحات کی تصویر کشی کرتے ہیں، جو بلاشبہ انسانی زندگی کے سب سے قیمتی لمحات ہیں، جن پر اکثر نگاہ رکتی ہے اور جو سوچ و بچار کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ لمحات ظاہر کرتے ہیں کہ انسانی زندگی پہلے...... سب سے پہلے...... ایک ''فکر'' ہے اور اس کے ثبوت میں ہمارے سامنے تصویروں کا ایک سلسلہ پیش کرتے ہیں جو ایک مختصر سے زمانے میں لازمی ترتیب و تسلسل کے ساتھ نمودار ہوتی ہیں، لیکن یہ زمانہ مختصر ہونے کے باوجود جب سے انسان نے اس خاک دان ہستی میں آنکھ کھولی، انسانیت کی تاریخ کا منفرد زمانہ ہے۔ اس لیے کہ یہ تصویریں ایک فکر کی کہانی دہراتی ہیں کہ یہ فکر ایک بلند و برتر ذہن میں ابھری جسے قضا و قدر نے اپنے پیغام کی عالمگیر تبلیغ کے لیے تیار کیا تھا اور اس کا ظہور دنیا میں اس وقت ہوا جب اللہ نے اپنے رسول ﷺ پر وحی نازل فرمائی کہ لوگوں کو حکمت اور دل نشیں نصیحت کے ساتھ اس کی طرف بلایا جائے۔ لوگ اس فکر سے بھڑک اٹھے اور اس کا مقابلہ کرنے اور اسے فنا کے گھاٹ اتار دینے کے لیے درپے ہو گئے لیکن یہ فکر کامیاب ہوئی، اس کے پیامی ﷺ کی عظمت و شخصیت نے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ جوق در جوق اس کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ پھر جب صاحب فکر کی وفات ہوئی تو مادی خواہشوں کے غلام، اس فکر کے واجبات و فرائض سے بھاگ کر اپنی سابقہ زندگی کی بے اعتدالیوں میں کھو گئے لیکن جو بزرگ سچے دل سے اس فکر پر ایمان لائے تھے وہ ان گمراہان کوئے ضلالت کے مقابلے پر کھڑے ہوئے اور مرتدین کو دوبارہ اس فکر کے دائرے میں لا کر انہیں واجبات و فرائض کی بجا آوری پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد اس فکر نے کارگاہ وجود میں قدم جما لیے اور اسے اتنی قوت حاصل ہو گئی کہ زندگی کی کوئی طاقت اس کے مقابلے پر نہ ٹھہر سکی، دنیا کا کوئی اقتدار اس پر غالب نہ آ سکا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ساری دنیا کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ زمین کے گوشے گوشے میں اپنی جڑیں پیوست کر دیں۔ پھر ہے کوئی تصویر، جو اس تصویر سے زیادہ دل فریب اور نظر نواز ہو، جس میں عقل و دل اور جذبات و محسوسات کے لیے اس سے زیادہ دل

Marfat.com

کشی اور اس سے زیادہ حسن پایا جائے؟ کیا دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال مل سکتی ہے جو اس فکر کی طرح خود اپنی قوت پر قائم ہو اور جو اسی فکر کی طرح سلطنتوں کے تاج و تخت چھین سکتی ہو؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانیت کی تاریخ سمٹ سمٹا کر چند کارفرما افکار میں محدود ہو جاتی ہے، جن پر نظام عالم کا دارومدار ہے۔ یہ افکار اپنے اپنے رستے ذہن میں در آتے اور زندگی کو اپنی قوت سے متاثر کرتے ہیں، لیکن ان میں سے ہر فکر کم و بیش اسی وقت ظہور کرتی ہے جب وہ کسی ایسی مقاومت سے دوچار ہو، جو اسے چاروں طرف سے گھیر کے تنگ حدود میں سمٹنے پر مجبور کر دے تاکہ تحقیق کے ہاتھ اس کی طرف بڑھیں تو اسے اچھی طرح الٹ پلٹ کے حق اس میں سے لے لیں اور کھوٹ چھوڑ دیں اور وہ دائرہ اعتدال میں آکر اس کارفرما فکر کی صورت اختیار کر لے جس کے سائے میں وہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہوں، لیکن فکر میں یہ ہمواری یہ اعتدال پیدا نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ صدیاں نہ گزر جائیں، جنگ کی بھٹیاں نہ سلگیں، خون کی ہولیاں نہ کھیلی جائیں اور جسم و جان کے رشتے نہ کاٹے جائیں۔ اس تمام عرصے میں فکر، اخذ و رد اور نفی و اثبات کے مختلف مرحلوں سے گزرتی رہتی ہے اور آخر کار جس نقطے پر پہنچتی ہے، وہ اسے ایک ایسے روپ میں ڈھال دیتا ہے جو اس کے پچھلے روپ سے بالکل الگ، بالکل مختلف ہوتا ہے۔

کچھ افکار ایسے بھی ہوتے ہیں جو ظاہر تو ہو جاتے ہیں لیکن جنگ و مقاومت کی تاب نہیں رکھتے اور ہمیشہ کے لیے چھپ جاتے ہیں۔ ہمارے پاس اس کی ایک مثال ہے جو قیام اسلام کے مقابلے میں...... جب اسلام نشو و ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا تھا...... پیش کی جا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہرقل نے مختلف مسیحی فرقوں کو ایک مذہب میں سمو کر اسے اپنی سلطنت میں سرکاری طور پر نافذ کرنے کی کوشش کی اور حصول مقصد کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کی کانفرنسیں منعقد کر کے انہیں اتحاد و اتفاق پر مجبور کیا۔ ان میں سے کچھ تو متفق ہو گئے اور کچھ اپنی رائے پر قائم رہے۔ اس کے بعد شہنشاہ نے شام، مصر اور دوسرے ان ممالک میں، جو اس کے اقتدار کی چکی میں پس رہے تھے، اپنے کارندے بھیجے جو لوگوں کو خواستہ و ناخواستہ سرکاری مذہب کی طرف گھسیٹتے تھے، ان کارندوں نے ہرقل کے احکام کو روبہ نفاذ لانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی اور تمام ممالک میں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ باغیوں نے عذاب و عقاب کے نئے نئے ڈھنگ اختیار کیے۔ قتل و غارت گری پھیلائی، خون کی ندیاں

۱۲۲۷۳۶

Marfat.com

بہائیں اور ان تمام شورشوں، اس سارے فتنہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ کی ساری کوششیں دھری کی دھری رہ گئیں اور اس نے مرنے سے پہلے اپنی ناکامی کا منظر خود دیکھ لیا۔ بہت ممکن ہے کہ اس نے کئی بار اپنے دل سے پوچھا ہو اور اپنی زندگی کے آخری سانس تک پوچھتا رہا ہو کہ نبی عربی ﷺ کے قدم کامیابی نے کیسے چومے، جب نئے دین کی اقامت کے لیے آپ ﷺ کے پاس کوئی قوت بھی نہ تھی اور وہ خود کیوں ناکام ہو گیا جب کہ اس کے پاس اتنی قوت اور اتنا اقتدار تھا کہ وہ لوگوں کو اپنے قائم کردہ مذہب کے گرد جمع کرسکتا تھا۔ پھر وہ مذہب بھی کوئی نیا مذہب نہ تھا بلکہ اس دین کے مختلف عقائد کا نچوڑ تھا جو مسلسل چھ صدیوں سے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کر رہا تھا۔

بلاشبہ وہ اس سوال کا جواب دینے سے قاصر تھا۔ اس لیے کہ اس کے امکان میں ہوتا تو وہ اپنے عمال کو لوگوں پر ظلم توڑنے، انہیں ایذائیں پہنچانے اور موت کے گھاٹ اتارنے کی احمقانہ اجازت کبھی نہ دیتا۔ عوام اس کے جبر واستبداد اور شقاوت وسنگ دلی کا شکار ہوتے رہے تا آنکہ مسلمانوں نے مصر وشام فتح کر لیے اور ہرقل اور اس کے لشکر ان دونوں ملکوں سے نکل بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ اگر شہنشاہ اپنی فکر میں حد سے زیادہ تشدد اختیار نہ کرتا اور تعصب اس آنکھوں پر پٹی نہ باندھ دیتا تو وہ اس جواب کو پالیتا۔ کیونکہ وہ بالکل سادہ تھا: نبی عربی علیہ التحیۃ والتسلیم اپنی رسالت میں اس لیے کامیاب ہوئے کہ آپ ﷺ کے پاس اس سچے اور سیدھے عقیدے کی قوت کے سوا، جس کی طرف آپ ﷺ لوگوں کو اپنے پروردگار کے حکم سے بلا رہے تھے اور کوئی قوت نہ تھی اور ہرقل اس لیے ناکام ہوا کہ اس نے لوگوں کو اس مذہب کی طرف زبردستی بلانا چاہا، جس کے متعلق ان کی عقلیں نہیں جانتی تھیں کہ وہ ان کے اپنے عقیدے سے بہتر ہے۔ نبی عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام اس لیے کامیاب ہوئے کہ آپ نے حق کے سوا کوئی سہارا نہ ڈھونڈا۔ چنانچہ وحی کی زبانی آپ ﷺ رماتے ہیں:

"اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ."

(ترجمہ: ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولاد یعقوبؑ کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان

Marfat.com

کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔)

اور ہرقل اس لیے نا کام ہوا کہ اس نے اپنے مذہب کا سہارا ان دوسرے مذاہب کو بنایا جو سب کے سب عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کی طرف منسوب ہے۔ نبی عربی ﷺ اس لیے کامیاب ہوئے کہ آپ ﷺ نے لوگوں کو صرف ان کے پروردگار کی راہ دکھائی، اس کے سوا ان سے کچھ نہ چاہا۔ چنانچہ نجران سے عیسائیوں کا جو وفد آپ ﷺ سے بحث مباحثہ کرنے آیا تھا آپ ﷺ اس سے فرماتے ہیں:

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔

(ترجمہ: کہہ (اے محمد ﷺ! کہہ) اے اہل کتاب! آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے (اور وہ) یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے (اس دعوت کو قبول کرنے سے) اگر وہ منہ موڑیں تو (صاف) کہہ دو کہ گواہ رہو: ہم مسلم ہیں۔)

اور ہرقل اس لیے نا کام ہوا کہ وہ اللہ کو نہیں، لوگوں کو ایک دوسرے کا پروردگار بنانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ اس کی دعوت سنتے ہی بھڑک اُٹھے۔ اس دعوت میں انہیں وہ حق نظر نہ آیا جو ان کے دلوں کو ان کے آبائی عقائد کی طرف سے پھیر دیتا۔ یہ تھے وہ اسباب جن کی بنا پر نبی عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے پروردگار کے حکم سے کامیاب ہوئے اور آپ کی دعوت کی اساس پر وہ سلطنت قائم ہوئی جس میں آپ کی تعلیمات عملاً نافذ تھیں۔ یہ سلطنت یقیناً اس قابل تھی کہ ساری دنیا کو اپنے سایہ رحمت و عاطفت میں لے لیتی لیکن اس کے حاملین نے اپنے آپ کو اور اس کے نتیجے میں اللہ نے انہیں بدل دیا۔

مسلمانوں نے اپنے آپ کو اسی دن بدل دیا تھا جب وہ مختلف فرقوں اور ذاتوں میں بٹ گئے تھے۔ اس سے لوگوں کی فکر اور ان کی توجہ عقیدے کی عظمت و جلالت سے ہٹ کر اس کے صفائے جوہر میں اُلجھ گئی۔ وہ اس کی جزئیات میں گم ہو کر آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ جس کی وجہ سے ان کے درمیان اختلاف کی خلیج وسیع ہوگئی اور وہ ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ حالانکہ

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسے لوگوں کی ہمیشہ مذمت فرمائی جن کے دلوں میں اس قسم کے مناقشے گردش کرتے رہے ہیں۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ نے تو ان عقل کے دشمنوں کو تنبیہ فرمائی تھی کہ پچھلی قوموں میں سے جو قومیں تباہ ہوئی ہیں انہیں مسائل کی وجہ سے ہوئی ہیں جن میں بحث وتکرار کرنے سے نہ صرف یہ کہ حق تک رسائی نہیں ہوتی بلکہ اختلاف ونزاع اور بغض وعداوت کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کو برحق پاکر صدر اول کے مسلمانوں نے فرمانِ نبوی ﷺ کی تعمیل کی اور یقین کرلیا کہ جو لوگ دین میں لڑتے جھگڑتے ہیں ان کی مثال یہود ومنافقین کی سی ہے جو مسلمانوں میں سازشیں پھیلاتے ہیں۔ ان سے پوچھتے ہیں: ''اگر مخلوق کو اللہ نے پیدا کیا ہے تو اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟'' یا ان سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں اور اس قسم کی باتوں سے ان کی مُراد یہ ہوتی ہے کہ اسلامی عقیدے کی طرف سے مسلمانوں کے دلوں میں شک وشبہ پیدا کریں۔ وحی نے ان سوالوں کا جواب انتہائی ایجاز وبلاغت سے دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

(ترجمہ: کہہ (اے محمد) وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے احتیاج ہے۔ نہ اس سے کوئی پیدا ہوا، نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور کوئی اس کی برابری کرنے والا نہیں ہے۔)

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا

(ترجمہ: اور وہ تجھ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں کہہ دو روح میرے پروردگار کا حکم ہے اور تمہیں تھوڑا علم دیا گیا ہے۔)

پھر ایک مقام پر ہے:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ.

(ترجمہ: اور (تم لوگ) ان لوگوں کی طرح نہ بنو جو ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور آپس میں اختلاف کیا اس کے بعد کہ ان کے پاس روشن دلیلیں آچکی تھیں۔)

Marfat.com

ایک اور مقام پر فرمایا جاتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ.

(ترجمہ: جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے۔ یقیناً ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں۔)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اختلاف کو سب سے زیادہ ناپسند فرماتے تھے۔ چنانچہ اختلاف پیدا کرنے والوں کی تہدید و سرزنش میں آپ تامل سے مطلق کام نہ لیتے، چاہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور عالی مرتبت مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ کوئی تعجب نہیں اگر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شان یہ تھی۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ جاہلیت اور اسلام دونوں میں ان کا اندازِ فکر یکساں تھا لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جو لوگ ان کے ذہنی اُفق کو تنگ سمجھتے ہیں ان کا خیال درست ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہ صرف یہ کہ اپنے اکثر ہم عصروں سے زیادہ علم رکھتے تھے اور ان کا ذہنی افق ان سے کہیں زیادہ وسیع تھا بلکہ ان کی امتیازی شان یہ تھی کہ وہ نظم جماعت کو ہر قیمت مقدم رکھتے تھے۔ وہ اس کے قرار و ثبات میں فرد اور جماعت دونوں کے لیے خیر و برکت کی سب سے قوی، سب سے معتبر ضمانت پاتے تھے۔

اختلاف رائے سے یہ شدید نفرت، اسلام کی ان تعلیمات سے کیسے میل کھاتی ہے، جو فکر و نظر اور حکمت و تدبر کی دعوت دیتی ہے، اور حریت رائے اس ماحول میں کس طرح پنپ سکتی ہے جہاں صاحب امر اختلاف کرنے والوں کو سزا کی دھمکی دیتا ہے؟

یہ ہے وہ اعتراض جو بعض مستشرقین نے بالفعل وارد کیا ہے اور جس کا رد ہم یہاں اس لیے..... صرف اس لیے..... کر رہے ہیں کہ انسانی فکر کی تاریخ اس کی نفی کرتی ہے۔ آج علماء کی اکثریت کا رجحان اس طرف ہے کہ نظری علوم میں سے الٰہیاتی منطق نے انسانی فکر پر جو تسلط حاصل کیا ہے مابعد الطبیعیاتی دور میں اس وقت حاصل کیا ہے جب انسانی ذہن علمی مقررات میں زندگی کے لیے کوئی سہارا نہ پا سکا۔ چنانچہ اس نے الٰہیات کو اپنی امنگوں کی جولان گاہ بنا لیا اور اس کے ذریعے سے ان نظریات تک اس کی رسائی ہوئی جو علمی طریق پر ثابت نہ کیے جا سکتے تھے اور چند ایسے امور اس کے ہاتھ لگ گئے جن کا بیشتر حصہ اس دائرے میں آتا ہے جسے ہربرٹ اسپنسر ''نادانستی'' (Unknowable) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ پھر جب علم نے اپنے قدم

جما لیے اور اس کی بنیاد پر حقیقی فلسفے کی عمارت تعمیر ہوئی تو یہ الہیاتی منطق، عقلی تعیش کی صورت اختیار کر کے دنیائے فکر کی زندگی میں ضعیف الاثر ہو گئی۔ اس بنا پر اگر رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم ان مسائل پر غور و فکر کرنے سے منع فرماتے تھے جن کے عرفان کی کوئی راہ نہیں اور اس لیے منع فرماتے تھے کہ اس غور و فکر سے سوا نزاع و اختلاف میں اضافے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا تو ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ حضور رسالت مآب ﷺ اور آپ ﷺ کے جانشینوں نے حریت فکر کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ فکر کے اس طریقے کی مذمت و بیخ کنی کی ہے جسے علم حاضر کی اصطلاح میں ''جدل عقیم'' کا طریقہ کہا جاتا ہے!

رہیں فکر کی وہ صورتیں، جو زندگی اور ہستی کے واقعات و حقائق سے ٹیک لگاتی ہیں اور جنہیں علم حاضر بحث و نظر کی جولان گاہ قرار دیتا ہے، سو وہ اس زمانے میں بھی غور و فکر اور باہمی گفتگو کا موضوع تھیں اور ان کے جو پہلو معاملات حکم و قضا سے تعلق رکھتے تھے ان میں اجتہاد رائے سے کام لینے کی پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ اگر مجتہد صحیح نتیجے پر پہنچ جاتا تو اسے توفیق الہٰی پر محمول کیا جاتا تھا اور اگر بھٹک جاتا تو یہ اس کے اپنے نفس اور شیطان کی گمراہی ہوتی تھی۔

جن مسائل میں اختلاف کو حرام قرار دیا گیا ہے قاری کو اس کتاب میں ان کی تفصیل اور ساتھ ہی اس تحریم کی حکمت بھی معلوم ہو جائے گی! اس حکمت کی توضیح کے سلسلے میں یہاں میرے لیے بس اتنا سا اشارہ کر دینا کافی ہو گا کہ رسول اللہ ﷺ نے مسئلہ قدر میں الجھنے سے منع فرمایا ہے اور یہ وہ مسئلہ ہے جس نے مابعد الطبیعیاتی ادوار میں شدید اختلافات اور بڑے بڑے جھگڑے برپا کیے ہیں۔ اس کے باوجود نہ وہ اب تک طے ہوا ہے اور نہ آئندہ کبھی طے ہو گا اور یہ اس امر کی بین دلیل ہے کہ مسئلہ قدر میں الجھنے سے روکنا سرتاسر ایک حکیمانہ فعل تھا۔ یہ حکمت، بداہت کی حد تک پہنچ جاتی ہے جب ہم خیال کرتے ہیں کہ دین اس زمانے میں اپنی ابتدائی منزلیں طے کر رہا تھا اور مشرکین و منافقین یہود اختلافی مسائل کو ہوا دے دے کر اس کے اہم ترین اصول و مبادی کو ہدف تنقید بنا رہے تھے اور اس سے ان کی غرض یہ تھی کہ ان اصول و مبادی کے گرد شک و ریب کی فضا قائم کر کے لوگوں کو اس دین کی راہ سے ہٹا دیں۔ پھر جب ہم اس کے ساتھ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اسلام کا ابتدائی عہد، جہادِ مسلسل کا عہد تھا اور اختلاف کی ہنگامہ آرائیوں کے نتائج اس جہاد کے لیے خطرناک اور اس کوشش کے لیے مضرت رساں تھے۔ جو راہ جہاد میں صرف کی جا رہی تھیں تو اس اعتراض کے لیے کوئی بنیاد باقی نہیں رہ جاتی جو مستشرقین نے وارد کیا

Marfat.com

ہے اور اختلاف پیدا کرنے والے مسائل کی ممانعت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ شدت، نہ صرف جائز بلکہ ناگزیر ہو جاتی ہے۔

اس مقدمے میں ان عوامل کے اجمالی تذکرے کے بعد، جو اسلامی سلطنت کے قیام کا سبب بنے، میرے لیے ناممکن ہے کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذات پر گفتگو نہ کروں۔ پڑھنے والے کو اس کتاب کے ایک ایک باب میں ان کی بااثر شخصیت کے واضح نقوش ملیں گے اور یہ شخصیت اس کے سامنے اس طرح ابھرے گی کہ وہ اس کی عظمت سے متاثر ہو کر اس کا موازنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شخصیت سے کرنے لگے گا۔ اس لیے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے اپنے وہ الفاظ نقل کرتا ہوں جو میں نے اپنی کتاب ''ابوبکر، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ '' کے دیباچے میں لکھے تھے: ''بعض لوگ عہدِ صدیقی رضی اللہ عنہ اور عہدِ فاروقی رضی اللہ عنہ کا موازنہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان میں کون، کس سے بہتر تھا۔ لیکن جہاں تک ہماری رائے کا تعلق ہے ان میں کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دونوں بزرگ عظمت کے ان مدارج کمال پر فائز تھے جہاں تاریخ عالم کا کوئی حکمران یا سیاست دان شاید ہی پہنچ سکا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عہدِ فاروقی رضی اللہ عنہ اسلام کا اہم ترین دور تھا جس میں اسلامی سلطنت کی بنیادیں مستحکم ہوئیں، حکومت کا نظام مرتب کیا گیا اور مصر کے علاوہ ان دوسرے ممالک پر بھی اسلام کا پرچم لہرایا جو روم اور ایران جیسی باجبروت سلطنتوں کے لیے سرمایۂ نازش و افتخار تھے۔ بایں ہمہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عظیم الشان عہدِ خلافت، عہدِ صدیقی رضی اللہ عنہ کا مرہون اور اس کا تتمہ ہے۔ جس طرح عہدِ صدیقی رضی اللہ عنہ عہدِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان مند اور اس کا تکملہ ہے۔''

ہر چند کہ عہدِ صدیقی رضی اللہ عنہ اور عہدِ فاروق رضی اللہ عنہ کو تقابل کی ترازو میں تولنے کی کوئی گنجائش نہیں اور عہدِ فاروق رضی اللہ عنہ، عہدِ صدیقی رضی اللہ عنہ کا تتمہ ہے۔ تاہم ان دونوں شخصیتوں میں موازنہ آسان ہے جس سے ان کی سیرت اس طرح آئینہ ہو جاتی ہے کہ ہم ان کی قدر و قیمت کا بہ آسانی اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس موازنے کی واضح اور صحیح تصویر اس واقعے سے زیادہ اور کہیں نہیں مل سکتی۔

جب اسیرانِ بدر کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رائے دی تھی کہ فدیہ لے کر انہیں آزاد کر دیا جائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ ان کی گردن مار دی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر مسلمانوں کے سامنے ان دو شخصیتوں کی مثال پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ فرشتوں میں میکائیل کی مثال ہیں

Marfat.com

جو اللہ کی طرف سے رحمت اور معافی لے کر اترتا ہے اور انبیاء میں ابراہیمؑ کی مثال ہیں جو اپنی قوم کے لیے شہد سے زیادہ شیریں اور نرم تھے۔ ان کی قوم نے انہیں آگ میں ڈال دیا تو بھی انہوں نے بس یہی کہا تھا:

اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ .

(ترجمہ: افسوس ہے تم پر اور تمہارے غیر اللہ معبودوں پر۔ تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کیوں کرتے ہو۔ کیا تم نہیں سمجھتے۔)

اور فرمایا:

فَمَنْ تَبِعَنِىْ فَاِنَّهٗ مِنِّىْ وَمَنْ عَصَانِىْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ .

(جس نے میری پیروی کی وہ میرا ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو اے اللہ! تو بڑا بخشنے والا اور رحیم ہے۔)

یا پھر عیسیٰؑ کی، جنہوں نے فرمایا:

.اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ.

(ترجمہ: اگر انہیں عذاب دے گا تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر انہیں معاف کر دے گا تو اے اللہ! تو غالب اور حکمت والا ہے۔)

اور عمر رضی اللہ عنہ فرشتوں میں جبرائیلؑ کی مثال ہیں جو اللہ کے دشمنوں پر غضب اور قہر لے کر نازل ہوتا ہے اور انبیاء میں نوحؑ کی مثال ہیں۔ جنہوں نے کہا تھا:

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا.

(ترجمہ: اے پروردگار! کافروں کا روئے زمین پر سے نام و نشان تک مٹا دے۔)

یا پھر موسیٰؑ کی جنہوں نے بددعا دی تھی:

رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ .

(ترجمہ: اے پروردگار! ان کے مالوں کو ہلاک کر دے اور ان کے دلوں پر سختی فرما۔ وہ جب تک دردناک عذاب نہیں دیکھیں گے ایمان نہیں لائیں گے۔)

عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں ان دونوں بزرگوں کا جو اخلاق و کردار تھا یہ تصویر اس کی صحیح صحیح عکاسی کرتی ہے۔ اس کے بعد جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے تو عقیدے اور ایمان کے سوا ہر

Marfat.com

معاملے میں انہوں نے نرمی و لطف سے کام لیا لیکن جہاں عقیدے اور ایمان کا معاملہ ہوتا تھا وہ نرمی اور لطف کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک بے پناہ معنوی قوت کے مالک تھے جو اس خاص مسئلے میں تردد و تکلف اور رورعایت سے قطعاً ناآشنا تھی اور ان میں شخصیتوں کی تعمیر اور ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا ایک خاص ملکہ تھا۔ چنانچہ جب وہ کسی کو کوئی ذمہ داری سونپتے تو اس پر مکمل اعتماد کرتے اور اسے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں سے کام لینے کی پوری پوری آزادی دیتے۔ اب یہ اس شخص کا کام تھا کہ اپنی قابلیت کے مطابق جتنی چاہے ترقی کر لے۔ اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ ارتداد کی لڑائیوں اور عراق و شام کی جنگوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سپہ سالاران اسلام کے سامنے اپنی حکمت عملی کے بنیادی خطوط واضح کیے تھے اور تفصیلات ان کے لیے اختیار تمیزی پر چھوڑ دی تھیں۔ جب وہ اپنی مہم میں کامیاب ہو گئے تو ان کے طریق عمل کے متعلق ان سے کوئی پوچھ گچھ نہ کی، البتہ ناکامی کی صورت میں اس کے اسباب کی چھان بین اور علاج کے ذریعے ضرور تلاش کیے۔ اسی طرح جو سپہ سالار ارتداد کی جنگوں اور شام کی معرکہ آرائیوں میں کامیاب نہ ہو سکے تھے انہیں مدینہ واپس بلانے سے انکار کر دیا کہ مدینہ والوں کے حوصلے کہیں پست نہ ہو جائیں، اور شام کے محاذ پر اسلامی فوجوں کا جمود و تعطل دیکھ کر ان کی مدد کے لیے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عراق سے شام بھیج دیا کہ وہ رومیوں کی غلط فہمی دور کر دیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی یہ حکمت عملی صرف سپہ سالاران افواج ہی تک محدود نہ تھی۔ مذہبی معاملات میں بھی ان کا یہی طرز عمل تھا۔ اپنے عمال کے فرائض و اختیارات میں وہ صرف اسی وقت دخل دیتے تھے جب کسی گتھی کو سلجھانے یا کسی فساد کو دور کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ جب تک کام صحیح طریق پر چلتے رہتے تھے۔ وہ ان سے کوئی تعرض نہ کرتے اور حکومت کے دوسرے معاملات کی تدبیر و اصلاح میں لگے رہتے۔ چنانچہ جب انہوں نے حضرت زید رضی اللہ عنہ بن ثابت کو جمع قرآن کی خدمت پر مامور فرمایا تو ان کے کام میں کبھی دخل نہ دیا۔ اگر حضرت زید رضی اللہ عنہ ہی کسی موقع پر ان کی رائے دریافت فرماتے تو یہ الگ بات تھی۔

جو امیر عام معاملات میں اپنے عمال پر اطمینان و اعتماد رکھتا ہے، اس کے عمال کا نام بھی اس کے نام کے ساتھ ہی مشہور ہو جاتا ہے اور سطحی نظر رکھنے والے لوگ بعض عمال کے متعلق یہ خیال کر بیٹھتے ہیں کہ وہ امیر سے بھی زیادہ فضیلت و امتیاز رکھتے ہیں، لیکن یہ سمجھ کی کوتاہی ہے ورنہ اساسی فکر میں ہر عمل کی روح رواں ہوتی ہے۔ کسی قابل اعتماد عامل کو تفصیلات طے کرنے کی آزادی دے

دراصل اس کی قوت عمل کو مہمیز کرتا ہے۔اس طرح وہ دشواریوں کا مقابلہ زیادہ جرأت سے کرتا ہے اور اس کی کوشش ہمہ وقت یہی رہتی ہے کہ بہتر سے بہتر خدمات انجام دے کر اپنے امیر کا زیادہ سے زیادہ اعتماد اور زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرے۔

یہ سیاست حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فطری نرم دلی، سادہ دلی، سادہ مزاجی، حسن ایمان، راسخ الاعتقادی اور اسی طرح ان کے سن و سال کے بھی عین مطابق تھی۔جس وقت انہوں نے بار خلافت اٹھایا ہے وہ ساٹھ برس سے بھی زائد عمر کے نحیف الجثہ انسان تھے۔اس کے برعکس زمام حکومت ہاتھ میں لیتے وقت، حضرت عمر رضی اللہ عنہ پچاس سال کے لگ بھگ تھے۔ان میں شباب کی وہ گرمی اور قوت موجود تھی جس سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ محروم تھے۔پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فطرتاً بھی تند مزاج تھے۔ان کا بدن مضبوط تھا، جس میں عمل کی حرارت خون بن کر دوڑتی تھی۔حوادث جب کبھی ان کی شخصیت سے ٹکراتے تو ان کی قوت وجلالت چمک اٹھتی بلکہ ہمہ وقت نمایاں رہتی۔یہی وجہ تھی کہ وہ چاہتے تھے جہاں تک ہوسکے مسلمانوں کے معاملات، خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، اہم ہوں یا پیچیدہ، انہیں کے ہاتھ انجام پائیں اور شخصیت کی یہ نمود ہی انہیں مجبور کرتی تھی کہ وہ عمال کے معتمد و معتبر ہونے کے باوجود، ان کی نگرانی کرتے رہیں ان سے اس قدر قرب رکھیں کہ وہ عراق میں ہوں یا شام میں، فارس میں ہوں یا مصر میں، یہی محسوس کرتے رہیں کہ خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ مدینہ میں نہیں، ہمارے پاس ہیں۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اتصال اور اس نگرانی نے انہیں اس قدر شدید الاحتساب بنا دیا تھا کہ ان کے عمال ایک بار نہیں متعدد بار ان کے خلاف بھڑک اٹھے اور یہ واقعہ ہے کہ یہ برانگیختگی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بجائے کسی ایسے شخص کے خلاف ہوتی جو ان کی سی طاقت و قوت اور ان کے سے رعب وجلال کا مالک نہ ہوتا تو اس کے نتائج ہرگز خوشگوار نہ ہو سکتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت اور اس کی نمود کا اثر، انتظامی معاملات کی طرح، ان کی عقلی زندگی پر بھی تھا۔اجتہادی قوت میں وہ اکثر مسلمانوں سے بڑھے ہوئے تھے۔عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد صدیقی رضی اللہ عنہ دونوں میں ان کی یہی شان تھی اور اپنے زمانہ خلافت میں تو وہ سب سے بڑے مجتہد تھے۔مسلمانوں کو ایک بھی اجتماعی مسئلہ پیش نہیں آیا، جس کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی کوئی رائے نہ رکھتے ہوں اور فقہ کا کوئی مسئلہ نہ تھا جس کے متعلق ان کا فیصلہ، ان کے ہم عصر اور بعد کے آنے والے مسلمانوں میں حجت تسلیم نہ کیا گیا ہو۔آپ دیکھیں گے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کئی بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اختلاف رائے کی اور وحی ربانی نے کبھی ان کی

Marfat.com

رائے کی تائید فرمائی کبھی تردید۔ ان کے عہد خلافت میں مسلمانوں کو ان کے اجتہاد پر کلیتہً اعتماد و اطمینان تھا اور ان کی رائے کا وزن اس سے اور بھی بڑھ گیا تھا کہ وہ ہر خاص مصلحت اور تمام ذاتی اعتبارات کو پس پشت ڈال کر، صرف اللہ، اس کے دین اور مسلمانوں کی بھلائی کے لیے وقف ہو کر رہ گئے تھے اور یہ ان کا وہ وصف ہے جو ان کے بعد مسلمانوں کے کسی فرماں روا کو نصیب نہ ہوا۔

ہمیں ان کی بے نفسی سے متعلق جو روایات ملتی ہیں اگر وہ سب کی سب صحیح ہیں تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ تاریخ کے ایک درخشندہ آفتاب اور عظمت کے مقابلے میں نبوت و رسالت کے مراتب سے قریب ① تر تھے یہ شخص جو اپنے دور میں عظمت و امتیاز کے انتہائی نقطے پر فائز تھا، اس زمانے کی سب سے بڑی سلطنت کا مطلق العنان فرماں روا ہونے کے باوجود، حکومت و اقتدار کی نعمتوں کو اپنے لیے حرام سمجھتا تھا۔ اور محتاجوں کا دکھ درد محسوس کرنے کے لیے انہیں کی سی زندگی بسر کرنے کا خواہش مند تھا۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ زہد کسی سنیاسی یا جوگی کا نہیں، ایک با اختیار حاکم کا زہد تھا، جو ہر قسم کی نعمت آسانی سے حاصل کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے زہد و تقویٰ کی اس تمام تر شدت کے باوجود، وہ ان زہاد کی نمائشی زندگی کو سخت ناپسند فرماتے تھے جو محرومی ہی کو سرمایہ لذت سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو زاہد کہلوانے کے شوق میں بولتے ہیں تو مریضوں کی طرح اور چلتے ہیں تو چیونٹی کی چال، اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کمزوری کو، اس کے ہر روپ میں برا سمجھتے تھے، خصوصاً اس کی نمائش تو ان سے کسی عنوان برداشت نہ ہو سکتی تھی۔

زندگی کی تمام نعمتیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قدموں میں تھیں، لیکن فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے انہیں ٹھکرا دیا اور اپنے اسی استغناء کی وجہ سے عدل و انصاف کی ایک جیتی جاگتی تصویر بن گئے۔ وہ صرف اللہ سے ڈرتے تھے اور اس کے سوا کسی کی خوشنودی نہ چاہتے تھے۔ اللہ کا یہ خوف اور اس کی رضا جوئی کا یہ جذبہ ان میں بڑا شدید تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی خلافت و امامت کا ان سے محاسبہ کیا جائے گا۔ اس سے ان کی خشیت میں اضافہ ہوتا تھا اور خشیت اللہ جل شانہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ان میں عدل و انصاف کی تڑپ کو اور تیز کر دیتی تھی۔ چنانچہ ان کا عدل، قرب و بعید میں کوئی امتیاز روا نہ رکھتا۔ وہ اللہ پر ایمان رکھنے والوں میں کوئی فرق نہ کرتے تھے اور جو کوئی

---

① رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر میرے بعد کسی کو نبوت ملتی تو عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب کو ملتی۔'' یہ روایت مسند احمد میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

Marfat.com

مسلمانوں کی پناہ میں آجاتا تھا، اسے بھی عام مسلمانوں کی طرح، امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے عدل کا مستحق سمجھتے تھے۔ انہیں بے لوث انصاف سے محبت تھی۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ان کے عمال بھی انہیں کی طرح شیوۂ عدل اختیار کریں۔ انہوں نے سلطنت کے گوشے گوشے میں اعلان کرا دیا تھا کہ اگر کسی کو عمال کے ہاتھوں کوئی تکلیف پہنچے تو معاملہ ان کے حضور پیش کیا جائے۔ شکایت صحیح ہوگی تو ضرور انصاف کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی عامل پر زیادتی ہو تو اسے بھی بارگاہ خلافت سے انصاف طلب کرنا چاہیے کہ حکومت کا رعب قائم اور عادل حاکم کا وقار برقرار رہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زہد نے ان کے دل کو غریبوں اور مسکینوں کے لیے لطف و نرمی سے لبریز کر دیا تھا جس کے متعلق، ان کی خلافت کے دن، لوگوں کو اندیشہ تھا کہ وہ اس سے بے نصیب رہیں گے۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک شمشیر بہ دست عادل تھے اور عہد صدیقی رضی اللہ عنہ میں ظالموں کے لیے ایک برق غضب۔ اس لیے یہ بات ان میں سے کسی کے وہم و گمان بھی نہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی زندگی میں کبھی رحم و شفقت سے بھی آشنا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ زمام حکومت ہاتھ میں آتے ہی ظالموں پر تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی گرفت اور سخت ہوگئی، لیکن کمزوروں اور مسکینوں سے انہوں نے رحم و شفقت کا برتاؤ کیا، بلکہ ان کے ماں باپ سے زیادہ ان پر مہربان ہوگئے۔ ان کی اشک شوئی کرتے، ان کے حقوق انہیں پہنچاتے اور ہر چھوٹے بڑے کا خیال رکھتے۔ ہر قوم میں کمزوروں اور غریبوں ہی کی اکثریت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ اکثریت بہت جلد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا ہمدرد و غم گسار سمجھنے لگی اور یہ سخت گیر انسان بے سہاروں کے لیے ان کی جان اور اولاد سے زیادہ عزیز و محبوب ہو گیا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے متعلق میں نے جو کچھ کہا ہے، اس سے میری یہ مراد نہیں ہے کہ وہ کبھی غلطی کے مرتکب ہوئے ہی نہیں یا ان میں کوئی ذاتی خواہش باقی ہی نہ رہی تھی کہ لوگ ان کے کسی حکم کی خلاف ورزی کرتے۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ ان کے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں لوگوں میں کیسا اختلاف رائے پیدا ہوا۔ ایک گروہ کہتا تھا کہ اس جابر و قاہر سپہ سالار پر ظلم کیا گیا ہے، جس نے اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی اور دوسرے کی رائے تھی کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے معاملے میں انصاف برتنے سے زیادہ سلطنت کی بھلائی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیش نظر تھی۔ اسی طرح سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے معاملے میں ہمیں معلوم ہوگا کہ بغیر کسی خیانت اور کوتاہی کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں از راہ سیاست کیسے معزول فرما دیا۔ لیکن فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی رائے اور

Marfat.com

احکام و تصرفات سے لوگوں کے یہ اختلافات، اس حقیقت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہ کبھی اپنی خواہش کی پیروی کی نہ اپنے ضمیر کے خلاف قدم اٹھایا۔ اور یہ کہ جب کبھی وہ کسی مسئلے میں اجتہاد کرتے، کوئی فیصلہ دیتے یا کوئی حکم صادر فرماتے تو بڑی سختی سے اپنے نفس کا جائزہ لیتے۔

یہ ہے ایک اجمالی تصویر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی اور ان کے کارناموں کی جسے اس کتاب میں تفصیل سے پیش کیا گیا ہے تاکہ اس کا ایک ایک خط واضح اور ایک ایک رنگ روشن ہو جائے۔ یہ تصویر آپ کو بتائے گی کہ ایک مختصر سی مدت میں اتنی بڑی سلطنت کیسے قائم ہو گئی اور اس کے قیام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت کو کتنا دخل ہے؟ پھر وہ سب بھی آپ پر منکشف ہو جائے گا جس نے اس عظیم انسان کو جس کا نام مشرق و مغرب میں حیرت و احترام سے لیا جاتا ہے، تاریخ کے صفحات پر زندۂ جاوید کر دیا۔

اس کتاب میں جو تفصیل پیش کی گئی ہے وہ ابتدائی مسلمانوں کی زندگی کے اس مختصر لمحے کی سیاسی تاریخ نہیں ہے۔ البتہ اس کے مختلف ابواب میں عربوں کی اجتماعی زندگی اور ایران و روم کا جو اجمالی ذکر کیا گیا ہے، اس سے میری مراد اسی سیاسی تاریخ کی توضیح ہے۔ ظہور اسلام سے عربی ممالک کی اجتماعی زندگی میں کیا انقلاب رونما ہوا اور جو ممالک مسلمانوں نے فتح کیے تھے، ان کی سیاسی زندگی کیا تھی؟ یہ تفصیل بھی میرے موضوع بحث سے خارج ہے۔ اسی طرح جو باب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کے لیے مخصوص کیا گیا ہے، اس میں بھی ان کے اجتہادی کارناموں کی تفصیل آپ کو نہیں ملے گی۔ دور حاضر کے بعض علماء و محققین نے ان میں چند پہلوؤں پر بڑی مفید اور سیر حاصل بحثیں کی ہیں اور مستشرقین نے بھی اس قسم کے مباحث پر ایسی فاضلانہ نظر ڈالی ہے جو انہیں علمائے عرب کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ پھر بھی یہ میدان اس سے زیادہ تحقیق و تلاش کا محتاج ہے اور مجھے یقین ہے کہ عنقریب ہی اس موضوع پر اس کے شایان شان توجہ صرف کی جائے گی۔

میں اس مقدمے کو بارگاہ ایزدی میں اس تضرع و زاری کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ وہ ہم سب کو تحقیق کی راہ میں حق کی توفیق عطا فرمائے کہ حق ہی ایک انصاف پسند محقق کا بہترین مقصد ہے۔

واللہ خیر حافظاً من الزلل، وھو الحکم العدل اللطیف الخبیر.

محمد حسین ہیکل

باب:1

عہدِ جاہلیت کا ایک ورق

بعثت نبوی ﷺ سے چند سال پہلے کی بات ہے کہ جیسے ہی ذوالقعدہ کا چاند طلوع ہوا، جزیرہ نمائے عرب کے مختلف گوشوں سے عرب سانڈنی سواروں کا ایک طوفان امنڈ پڑا جو ہر سال حج سے پہلے عکاظ کے میلے میں شرکت کے لیے آتے تھے۔ میلہ مختلف قبائل کے تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جس میں مکہ والوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ بطحا کے میدان میں...... جہاں یہ میلہ لگتا تھا...... عربوں نے اپنے خیمے گاڑ دیئے تھے اور اس کا ایک حصہ تجارت کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ اس حصے میں تاجروں نے خیموں کے سامنے اپنی دوکانیں آراستہ کی تھیں، جن میں حجازی مصنوعات بہت کم اور شام و یمن کی وہ مصنوعات بکثرت تھیں، جو مکہ اور اس کے قرب و جوار کے لوگ جاڑے اور گرمی کے سفروں میں لائے تھے۔ دوکانوں پر مردوں اور عورتوں کا جمگھٹا تھا جو اپنی اپنی پسند کی چیزیں خرید رہے تھے۔ عورتیں زیادہ تر کپڑے کی دوکانوں پر تھیں۔ مختلف رنگ اور مختلف بناوٹ کے کپڑے اٹھاتیں، انہیں الٹ پلٹ کے دیکھتیں اور شام و یمن کے بنے ہوئے ان نظر فریب کپڑوں میں سے جو کپڑا انہیں پسند آتا، خرید لیتیں۔ ان میں اگر کوئی طرح دار حسینہ ہوتی تو بے فکرے نوجوانوں اور پختہ کار مردوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی جو بظاہر تو خریداری کے لیے آتے لیکن دراصل کپڑوں اور سامان سے زیادہ انہیں اس کا فرادا کے حسن و جمال سے آسودہ ہونے کا شوق بے چین کرتا۔ ان دوکانوں کے قریب ہی عیش و نشاط کے اڈے تھے، جہاں دن کو عموماً اور رات کو خصوصاً نوجوانوں کی بھیڑ سی لگی رہتی۔ ان محفلوں میں عرب کی فتنہ فروش عورتیں بھی بے تکلف شریک ہوتی تھیں۔ رات کے رومانی اندھیروں میں بساطِ طرب بچھائی جاتی اور رعب کے منچلے جام و ساغر سے کھیلنے لگتے، نشے کی ترنگ کے ساتھ ساتھ زبان کی باگیں بھی ڈھیلی چھوڑ

دی جاتیں اور ہر طرف فقرہ بازی، چھیڑ چھاڑ اور دھینگا مشتی کا بازار گرم ہو جاتا اور یہ سلسلہ اکثر و بیشتر ان لڑائیوں پر جا کے ختم ہوتا تھا جن کی آگ مدتوں سلگتی رہتی۔

ایک دن میلے میں ایک شاعر اپنا قصیدہ پڑھنے کھڑا ہوا۔ پہلے اس نے تشبیب سنائی، پھر فخریہ انداز میں اپنی اور اپنے قبیلے کی مدح و توصیف کی اور اس کے بعد اس قبیلے کی ہجو میں اشعار پڑھے جو گذشتہ سال اس کے قبیلے سے شکست کھا چکا تھا۔ شاعر کے چاروں طرف لوگوں کا ہجوم تھا۔ تشبیب پر سب نے داد دی، لیکن مفاخرت پر کچھ لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں اور کچھ ناک بھوں چڑھانے لگے اور جب وہ اپنے حریف قبیلے کی مذمت پر آیا تو موافق و مخالف آوازیں تحسین و نفریں کی چیخوں سے بدل گئیں اور تلواریں میان کے پردوں سے نکل آئیں۔ قصیدہ ختم ہونے کے بعد ایک کار آزمودہ بزرگ اٹھا اور بپھرے ہوئے نوجوانوں کو سمجھا بجھا کے ان کا جوش ٹھنڈا کیا۔

قصیدہ سننے والوں میں ایک نوجوان بھی تھا...... عمر بیس سال سے کچھ زیادہ، مضبوط کسرتی جسم، بالا بلند اتنا کہ مجمع میں سب سے زیادہ اور رنگ میدہ اور شہاب۔ شاعر قصیدہ پڑھ رہا تھا اور وہ جھوم رہا تھا۔ گویا سخن فہمی کا بہت ہی پاکیزہ اور بلند مذاق رکھتا ہے۔ لوگوں کی چیخ و پکار میں اس نے کوئی حصہ نہ لیا۔ اس لیے کہ اسے شاعر اور اس کے قبیلے کی مفاخرت سے کوئی غرض تھی نہ اس کے حریف قبیلے کی مذمت سے کوئی واسطہ۔ وہ نہ اس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا نہ اس قبیلے سے، بلکہ شاید وہ دونوں قبیلے اس کے وطن سے کوسوں دُور کے تھے۔ اسے اگر دلچسپی تھی تو ان اشعار سے جو وہ سن رہا تھا۔ شاعر نے جب اپنا قصیدہ ختم کیا اور اس عقل مند بزرگ نے مجمع کو آشتی و سلامتی کی تلقین کی تو بھی وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد وہ اٹھا اور اپنے دوستوں کے ساتھ چل پڑا وہ اس قدر تیز گام تھا کہ ساتھ چلنے والے ہانپے جا رہے تھے۔ انہوں نے اسے باتوں میں لگانا چاہا کہ شاید اسی طرح اس کی رفتار کچھ سست ہو جائے لیکن یہ کوشش بھی اکارت گئی۔ بات یہ تھی کہ بلند قامتی کی وجہ سے اس کا قدم ہی لمبا پڑتا تھا اور آہستہ چل ہی نہ سکتا تھا۔ ہوتے ہوتے باتوں میں شدت اور کرختگی پیدا ہو گئی۔ نوجوان چلتے چلتے ٹھہر گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور غیظ و غضب کے آثار اس کے چہرے سے جھلکنے لگے۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیا اور کہا:

”تم مجھے اس چھوکرے سے ڈراتے ہو! میں خطاب بیٹا نہیں اگر ہاتھ ملتے ہی اسے زمین پر

Marfat.com

نہ دے مارا۔"

یہ کہہ کر وہ پہلے سے بھی زیادہ تیز چلنے لگا۔ اب اس کے ساتھی چل نہیں رہے تھے، دوڑ رہے تھے۔ یہ ٹولی اکھاڑنے میں پہنچی، جہاں بہت سے تومند اور قوی باز و نوجوان تھے۔ اس وقت ایک جوڑ چھوٹی ہوئی تھی اور ایک پہلوان دوسرے پہلوان کو پچھاڑ کے اس کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا عمر ابن خطاب کو اپنی طرف آتے دیکھ کر لوگوں نے رستہ چھوڑ دیا اور کشتی لڑنے والے بھی الگ الگ ہو کے تماشائیوں کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ انہیں یقین تھا کہ عمر تماشا دیکھنے نہیں، کشتی لڑنے آیا ہے۔ عمر نے حاضرین پر نگاہ دوڑائی۔ اس کے چہرے پر ابھی تک غصے کے آثار تھے۔ اس نوجوان پر نظر پڑتے ہی جس کے متعلق رستے میں باتیں ہو رہی تھیں عمر نے اسے مقابلے کی دعوت دی۔

نوجوان مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور مجمع کے وسط میں کھڑا ہوا۔ اسے اپنے اوپر اعتماد اور اپنی جسمانی طاقت پر بھروسا تھا۔ اس سے پہلے اس نے عمر سے کشتی نہیں لڑی تھی۔ وہ اپنے قبیلے کے ساتھ پہلی بار عکاظ کے میلے میں آیا تھا۔ لیکن جب سے آیا تھا ہر مقابلے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ وہ قامت و جسامت میں بھی عمر کے قریب قریب ہی تھا۔ عمر آگے بڑھا اور دونوں میں کشتی شروع ہو گئی۔

بدوی نوجوان کی پھرتی اور داؤ پیچ دیکھ کر خلقت کا ازدحام ہونے لگا اور اتنے تماشائی جمع ہو گئے کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔ آس پاس کی لڑکیاں بھی اس جوڑ کا نام سن کے آ گئیں۔ انہیں بڑی بے صبری سے کشتی کے فیصلے کا انتظار تھا۔ اس لیے کہ اور لوگوں کی طرح وہ بھی جانتی تھیں کہ گذشتہ مقابلوں میں ابن خطاب کو کبھی ناکامی کا منہ دیکھنا نہیں پڑا، لیکن جب سے یہ بدوی نوجوان آیا تھا برابر اپنے حریفوں کو پچھاڑ رہا تھا اور لوگوں کے دلوں میں یہ خیال آنے لگا تھا کہ شاید یہ عمر کو بھی پچھاڑ دے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بہت سی شرطیں بدی جا چکی تھیں۔ جب عمر نے اپنے حریف کو کشتی لڑنے کی دعوت دی تو یہ خبر بجلی کی سی تیزی سے سارے میلے میں پھیل گئی اور لوگ اپنے کام چھوڑ چھاڑ کر آ گئے۔ ابتداءً عمر نے اپنے حریف کو زور آزمائی کا موقعہ دیا اور خود صرف اپنا بچاؤ کرتا رہا، لیکن جب دیکھا کہ اس کا سانس پھول گیا ہے تو ایک دم جھپٹ کے اس کے کندھوں پر سوار ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے زمین پر چاروں شانے چت گرا دیا۔ فضا آفرین و مرحبا کے نعروں سے گونج اٹھی اور مجمع میں عمر کی پہلوانی کے پچھلے کمالات دہرائے جانے لگے۔ لڑکیاں اور عورتیں بھی اس نجیب الطرفین قریشی نوجوان کی تعریف و توصیف میں مردوں سے پیچھے نہ تھیں۔

Marfat.com

تھوڑی دیر بعد سورج آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا۔ تماشائی اپنی اپنی راہ چلے گئے اور عمر اپنے دوستوں کے حلقے میں میلے کا چکر کاٹنے لگا۔ دوست اس کی طاقت کے گن گا رہے تھے اور جواب میں صرف ایک مسکراہٹ کے امیدوار تھے، جس سے نوازا جانا گویا ان کی تقدیر ہی میں نہ تھا اور جو برسوں کی برسات میں کبھی عمر کے لبوں پر نمودار ہوتی تھی۔ پاس سے گزرنے والے اسے بڑے اہتمام سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں اس کے دوستوں سے بھی زیادہ فخر و حیرت کا اظہار کر رہی تھیں۔

رات کی تاریکیاں گہری ہوگئیں۔ عمر اپنے دوستوں کے ساتھ عکاظ کی ایک سمت چلا گیا جہاں عیش و طرب کی محفل سجی ہوئی تھی اور اس محفل کی پشت پر صحرا افق کی لامتناہی وسعتوں میں کھو گیا تھا۔ عمر اپنے بہت سے جاننے والوں کو سلام کرتا اور ان کا عقیدت مندانہ جواب لیتا صحرا کی جانب محفل کے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ حاضرین نے اس کی تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد شراب کا دور چل پڑا۔ عمر ان سب مے نوشوں کا سردار تھا۔ رات گزر رہی تھی اور پینے والے پی رہے تھے۔ متانت سے یاوہ گوئی، عشق بازی سے شہ سواری اور ایام عرب سے انساب عرب تک کوئی موضوع ایسا نہ تھا جو پینے کے دوران میں زیر بحث نہ آیا۔ عمر اس گفتگو میں بڑھ چڑھ کے حصہ لے رہا تھا۔ شراب نے اس کی زبان کی گرہیں کھول دی تھیں اور وہ ہر موضوع پر بڑے ماہرانہ انداز میں روشنی ڈال رہا تھا۔ بدوی پہلوان پر فتح پانے کی خوشی نے اس کی قوت گویائی کو اور چمکا دیا تھا۔ باتوں باتوں میں کسی دوست نے ایک شہ سوار کا ذکر چھیڑ دیا جو آج دوپہر سے پہلے اسے نظر نہ آیا تھا اور جس کے گھوڑے کے سم زمین کا سینہ چاک کیے دیتے تھے۔ عمر نے جھلا کے کہا:

''لات اور عزیٰ کی قسم! اس کی شہ سواری پر اظہار حیرت کر کے تم نے مجھے بڑی تکلیف پہنچائی ہے۔''

اس پر وہ دوست مسکرایا جو اس سے پہلے بدوی پہلوان کی باتیں کر رہا تھا اور بولا:

''عزیٰ سے اپنے چچازاد بھائی زید بن عمرو کے لیے معافی چاہو جس نے کہا ہے:

فلا العُزیٰ ادین وَلَا ابنَتَیھَا
وَلَا صَمَرَ بنی طسمٍ ادیرُ

اربـــاً واحـــداً ام الف ربّ
ادیـن اذا تـقـسـمـت الاُمـورُ

(ترجمہ: میں نہ عزیٰ پر ایمان رکھتا ہوں نہ اس کی بیٹیوں پر اور نہ بنی طسم کے بتوں پر جب خدائی کے کام تقسیم ہو گئے تو میں ایک پروردگار پر ایمان لاؤں یا ہزار پروردگار پر۔)

یہ سن کر عمر نے ایک لمبا سانس کھینچا اور کہا:

''وہ غارت ہو! اور عزیٰ اس کی ناشکری کو کبھی معاف نہ کرے! جب اس نے ہمارا دین چھوڑا اور ہمارے بتوں کے ساتھ زیادتی کی تو خطاب نے بالکل ٹھیک کیا کہ اسے مکے سے نکال دیا۔ وہ اپنے معبود کی تلاش میں یہود ونصاریٰ کے پاس مارا مارا پھرتا رہا لیکن نہ یہودیوں سے کچھ پایا نہ عیسائیوں سے۔ اسے زعم تھا کہ وہ اپنے باپ ابراہیم کے دین پر ہے اور اگر کہیں خطاب اسے میرے حوالے کر دیتا تو میں اسے جان ہی سے مار ڈالتا۔''

اس کے بعد گفتگو نے سنجیدگی اختیار کر لی۔

دوسرے دن دس بجے کے قریب عمر اپنے دوستوں سے پھر ملا۔ وہ اس وقت کل کی کشتی کا ذکر کر رہے تھے اور عمر نے اس میں اپنی جس مہارت کا مظاہرہ کیا تھا، اسے سراہ رہے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ عمر اپنے حریف کو اگر ایک بار اور پچھاڑ دے تو پھر اس بدوی پہلوان کے لیے اکھاڑے کا رُخ کرنا مشکل ہو جائے۔ لیکن عمر نے اپنے دوستوں کی مخالفت کی۔ اس کی رائے میں ان کی یہ بات بہادری کے خلاف تھی کہ وہ فاتح ہو کر پھر اپنے حریف کو مقابلے کی دعوت دے۔ البتہ اگر اس کا حریف دوبارہ اس سے کشتی لڑنا چاہے تو ایک لمحے کا توقف کیے بغیر اس کی دعوت قبول کر لے گا۔ میلہ اب جلد ختم ہونے والا تھا۔ تین دن کے بعد لوگ عکاظ سے رخصت ہو کر کعبے کے طواف کی تیاری کے لیے مجنہ جانے والے تھے۔ جہاں ہر قبیلے کو اپنے بت کے حضور نذر پیش کرنی تھی اور قربانی سے فراغت پانے کے بعد ذوالمجاز جانا تھا کہ عرفات کی چڑھائی چڑھنے کے لیے کیل کانٹے سے لیس ہو جائیں۔ مجنہ جانے سے پہلے یہ تین دن زائرین کے لیے بڑی مصروفیت کے دن تھے۔ انہیں حج کی تیاری کرنی تھی، اس لیے وہ اب کسی قسم کے کھیل تماشے میں دلچسپی نہ لے سکتے تھے۔

یہ تین دن بھی گزر گئے اور بدوی پہلوان نے ابن خطاب کو ایک ناقابل شکست ستون پا کر ہار

Marfat.com

مان لی۔ لوگ عکاظ سے رخصت ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ عمر اس تیاری میں بھی پیش پیش تھا۔ دوپہر کے وقت اس نے اپنے غلام کو گھوڑا لانے کا حکم دیا۔ مختلف قبیلوں کے عالی نسب نوجوانوں نے اس گھوڑے کو دیکھا اور اس کا مشکی رنگ، چھوٹے چھوٹے کان، تنی ہوئی گردن، باریک پنڈلیاں اور پچکا ہوا پیٹ دیکھ کر حیرت میں رہ گئے۔ عمر کو اپنی ذات اور اپنے گھوڑے پر نازاں پا کر جس میں خود اعتمادی اور درشتی کا پہلو شامل تھا۔ ان کے پندار کو ٹھیس لگی۔ انہوں نے عمر سے کہا: آؤ! ذرا گھڑ دوڑ ہو جائے۔ اس سے فارغ ہو کر آرام کر لیں گے اور قیلولے کے بعد مجنہ چلے جائیں گے۔

عمر نے یہ دعوت قبول کر لی۔ ان لوگوں نے بھی اپنے گھوڑے منگا لیے اور سب کے سب کھلے میدان میں پہنچ گئے۔ اس جگہ کا انتخاب کر کے جہاں سے دوڑ شروع ہونے والی تھی وہ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور ثالث کا اشارہ پاتے ہی گھوڑے چھوڑ دیئے۔ عمر اور اس کا گھوڑا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ٹکڑا ہے جس کے متعلق دیکھنے والا یہ تمیز نہ کر سکتا کہ وہ زمین میں دھنسا جا رہا ہے یا فضا میں پرواز کر رہا ہے۔ آج گھڑ دوڑ میں جو کامیابی عمر نے حاصل کی تھی اس پر لوگوں کی حیرت و مسرت، اس حیرت و مسرت سے کسی طرح کم نہ تھی جو انہیں کل کے اس کشتی جیتنے پر ہوئی تھی۔

لوگ عکاظ سے مجنہ اور وہاں سے ذوالمجاز پہنچے، جہاں انہوں نے اپنے اپنے بتوں پر نذریں چڑھائیں اور اس کے بعد ہر قبیلہ جزیرہ نمائے عرب کی مختلف سمتوں میں اپنے اپنے مستقر کی طرف روانہ ہو گیا۔

سال ختم ہونے پر عکاظ کا میلہ پھر آیا۔ عمر اس میلے میں بھی اسی آن بان سے شریک ہوا، اور یہ سلسلہ کئی سال تک بدستور چلتا رہا۔

ایک سال عمر اپنے معمول کے مطابق میلے کے شروع میں عکاظ نہ پہنچ سکا۔ لوگ اسے ڈھونڈنے اور ایک دوسرے سے اس کے میلے میں شریک نہ ہونے کا سبب پوچھنے لگے۔ انہیں زیادہ بے چینی اس بات کی تھی کہ عمر نے تجارت شروع کر دی تھی اور اس جیسے ممتاز تاجر کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ عرب کے اس سب سے بڑے میلے اور سب سے بڑی سالانہ نمائش سے غیر حاضر رہے، لیکن انہیں بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اسے ایک ذمہ داری سونپ دی گئی ہے جو اس سے پہلے قبیلہ عدی بن کعب میں اس کے بزرگوں کو سونپی جاتی رہی ہے۔ بات یہ تھی کہ جب کبھی قریش اور دوسرے قبائل عرب کے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہو جاتا تو ثالثی کے فرائض عمر کا قبیلہ انجام

Marfat.com

دیتا تھا۔ چنانچہ اب یہ ذمہ داری عمر کے سر تھی۔ قریش کے کسی قبیلے اور بنی ثقیف میں کسی اہم مسئلے پر چل گئی تھی اور اس جھگڑے کا تصفیہ عمر کو کرنا تھا۔ لوگوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہیں معلوم ہوا کہ عمر نے اپنے فرائض باحسن وجوہ پورے کر لیے ہیں اور اب وہ میلے کے باقی دن ان کے ساتھ گزارنے کے لیے اپنے مشکی گھوڑے پر سوار ہو کر عکاظ آپہنچا ہے۔ آتے ہی وہ تجارت میں مصروف ہو گیا لیکن اس مصروفیت نے اسے دوسرے مشاغل سے باز نہ رکھا، نہ بلانوشی اور نظر بازی کی اس شہرت ہی میں کوئی کمی آنے دی جو عمر کو اپنے حلقہ احباب میں حاصل تھی۔

اس سال کے بعد رسول اللہ ﷺ معبوث ہوئے اور آپ ﷺ نے اپنی رسالت کی تبلیغ شروع کر دی۔ عمر اپنی جوانی اور جواں مردی کے غرور میں آپ ﷺ سے برسر عناد رہا۔ اس کی جنگ جاہلیت میں بلا کی شدت اور کرختگی تھی۔ چنانچہ جب وہ عکاظ آیا اور لوگوں میں اس شخص کی بات چھڑی جو قریش کو بت شکنی اور خدا پرستی کی دعوت دے رہا تھا تو عمر مارے غصے کے جامے سے باہر ہو گیا۔ اس نے محمد (ﷺ) کو جو اس کے منہ میں آیا کہنا شروع کر دیا اور قریش میں پھوٹ ڈالنے اور اپنے آباؤ اجداد کے دین سے روگرداں ہو جانے پر آپ ﷺ کو ہدف ملامت بنانے لگا۔ محمد (ﷺ) نے اپنی قوم کے عقائد و عبادات کے خلاف جو انقلابی پیغام دیا تھا اس پر وہ اتنا غضبناک تھا کہ اگر بنو ہاشم مانع نہ ہوتے تو وہ آپ ﷺ کو قتل کی دھمکی دینے سے بھی نہ چوکتا اور اس قتل سے جو خونریزی برپا ہوتی اس کی مثال مکہ کی تاریخ میں کہیں ڈھونڈے نہ ملتی۔

عمر کی دشمنی کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ اس نے اسلام قبول کر لیا اور اب وہ اللہ کے دین اور اس کے رسول ﷺ کی مدافعت بھی اسی جوش اور اسی شدت سے کرنے لگا، جس جوش اور جس شدت سے وہ پہلے ان کی مخالفت کرتا تھا۔

یہ ہے عمر بن خطاب کے شباب کی تصویر! آپ اسلامی تاریخ کی قدیم و جدید کتابیں جتنے غور سے پڑھتے جائیں گے، یہ تصویر اپنے تمام تر خطوط کے ساتھ اتنی ہی نمایاں ہوتی جائے گی، لیکن اگر آپ یہ چاہیں کہ عمر بن خطاب کے زمانہ قبل از شباب کا مطالعہ کر کے ان کے بچپن اور لڑکپن کی بھی ایسی ہی واضح تصویر کھینچ سکیں جیسی ان کے شباب کی ہے تو یہ کتابیں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکیں گی۔ حالانکہ ان میں عمر بن خطاب کے اکثر معاصرین کے مقابلے میں ان کے حالات زیادہ وضاحت سے موجود ہیں۔

وہ قبیلہ عدی بن کعب سے تعلق رکھتے تھے جو قریش کا عدنانی قبیلہ تھا اور جس کی شرافت و

Marfat.com

بزرگی نے اسے ان سربرآوردہ قبائل میں شامل کر دیا تھا جن میں ہاشم، امیہ، تیم اور مخزوم سب سے زیادہ ممتاز سمجھے جاتے تھے، لیکن بنو عدی کو اسلام سے پہلے مکہ میں وہ مرتبہ حاصل نہ تھا جس مرتبہ پر بنو ہاشم اور بنو امیہ فائز تھے۔ ان کے پاس مکہ کا کوئی مذہبی یا سیاسی منصب نہ تھا اور نہ مال و دولت میں وہ ان قبائل کے برابر تھے، البتہ شرف و عظمت میں وہ قبیلہ بنی عبد شمس کے حریف تھے اور اس کے مرتبے کو پہنچنا چاہتے تھے۔ ان دونوں قبیلوں کی یہ کشمکش اور منافست سالہا سال جاری رہی یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے والد خطاب بن نفیل کے زمانے میں بنو عدی اپنے صفا کے مکانوں کو چھوڑ کر قبیلہ بنو سہم کے جوار میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ پھر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بزرگ اپنا تحفظ کرتے رہے، اس لیے کہ قلیل التعداد اور بڑے بڑے قبائل کے مقابلے میں کمزور ہونے کے باوجود وہ علم و حکمت اور دور اندیشی میں اپنا ایک خاص درجہ رکھتے تھے۔

ان کے علم اور حکمت نے انہیں سفارت اور فیصلہ منافرۃ کے اہم عہدے عطا کیے۔ چنانچہ قریش اور دوسرے قبائل کے درمیان جب کوئی نزاع پیدا ہوتا وہ قریش کی نمائندگی کرتے اور جھگڑوں میں ان کا فیصلہ تسلیم کیا جاتا۔ وہ فصاحت اور بلاغت میں بے نظیر تھے اور یہ ان کی حکمت و دانش ہی کا اثر تھا کہ ان میں زید بن عمرو جیسے شخص نے جنم لیا جو کھلم کھلا بت پرستی کے خلاف تھا اور جس نے بتوں کا ذبیحہ کھانے سے صاف لفظوں میں انکار کر دیا تھا۔ پھر ان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابن الخطاب پیدا ہوئے اور جس قبیلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت پیدا ہوا سے اپنے فخر و امتیاز کے لیے کسی سہارے کی مطلقاً ضرورت نہیں۔

یہ ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قبیلہ اور یہ ہے ان کے باپ کا سلسلہ نسب: خطاب بن نفیل بن عبدالعزیٰ بن رباح بن عبداللہ بن قرط بن رزاح بن عدی بن کعب۔ عدی، مرہ کے بھائی ہیں جو آٹھویں پشت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جد تھے۔

مادری سلسلہ نسب یہ ہے: حنتمہ بنت ہاشم بن المغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم۔

خطاب اپنی قوم میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے لیکن نہ ان کے پاس دولت و ثروت تھی نہ خدم و حشم۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاص کو جو اس وقت مصر کے گورنر تھے ایک خط لکھا، جس میں ان سے مصر کے محاصل کی تفصیل طلب کی۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ یہ خط پڑھ کر طیش میں آ گئے اور جواب میں لکھا:

Marfat.com

''......خدا کی قسم! اگر میرے لیے آپ کی خیانت جائز بھی ہوتی تو بھی میں ایسا نہ کرتا اس لیے کہ ہم ایسے حسب ونسب کے مالک ہیں، جسے دیکھ کر ہم آپ کی خیانت سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔''

''آپ نے فرمایا ہے کہ آپ کے پاس وہ مہاجرین رضی اللہ عنہم اولین ہیں جو مجھ سے بہتر ہیں۔ اگر ایسا ہے تو خدا کی قسم! اے امیر المومنین! نہ میں آپ کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا نہ آپ کے لیے اپنے دروازے کا قفل کھولوں گا۔''

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا غصہ اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ جب محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ان کے محاسب بنا کر بھیجے گئے تو انہوں نے کہا: ''......خدا کی لعنت ہو اس گھڑی پر جب میں عمر رضی اللہ عنہ کی حکومت میں گورنر بنایا گیا۔ اللہ کی قسم! میں نے عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے باپ دونوں کو اس حال میں دیکھا ہے کہ ان کے جسم پر ایک بہت ہی گھٹیا کپڑے کا چغہ ہوتا تھا جو بمشکل گھٹنوں تک پہنچتا تھا اور ان کی گردن پر خشک لکڑیوں کا گٹھا، لیکن عاص بن وائل حریر و دیبا کا لباس پہنتے تھے۔''

اس کے جواب میں محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''عمرو! اس قدر بے آپے نہ ہو! عمر رضی اللہ عنہ تم سے بہتر ہیں۔ اب رہا ان کے اور تمہارے باپ کا سوال، سو دونوں جہنم میں ہیں......''

خطاب نہایت سنگ دل اور بے رحم تھے۔ اپنے زمانہ خلافت میں ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک ایسی جگہ سے گزرے جہاں درختوں کا جھنڈ تھا اور جسے ضجنان کہتے تھے۔ آپ نے فرمایا: ''مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب میں یہاں خطاب کے اونٹ چرایا کرتا تھا اور خدا کی قسم! میں نے ان سے زیادہ سنگ دل اور بے رحم کسی کو نہیں پایا۔''

علامہ طبری کی روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عہد خلافت میں جب ضجنان سے گزرے تو فرمایا:

''سوائے خدا کے کوئی معبود نہیں! وہ جسے چاہتا ہے اور جو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ ایک وہ دن تھا جب میں اس وادی میں نمدے کا کرتا پہنے خطاب کے اونٹ چرایا کرتا تھا اور ان کا دل بہت سخت تھا۔ میں کام کرتا تو مجھے تھکا مارتے اور کوتاہی کرتا تو مارتے اور ایک یہ دن ہے کہ

Marfat.com

میرے اور خدا کے درمیان کوئی (حاکم) نہیں......'' اس کے بعد آپ نے چند شعر پڑھے۔[1]

خطاب نے خواہش نفس کے تحت نہیں، بلکہ کثرت اولاد کے لیے متعدد شادیاں کیں، اس لیے کہ عرب کے مفاخر میں ایک چیز کثرت اولاد بھی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا: رسول اللہ ﷺ کے دادا عبدالمطلب نے قلت اولاد کے سبب جو اپنی قوم میں اپنے حامیوں کی کمی محسوس فرمائی تو منت مانی کہ اگر ان کے ہاں دس بیٹے ہوئے اور ان کے بازو بن سکے تو وہ ان میں سے ایک بیٹے کو کعبہ میں اللہ کے نام پر قربان کر دیں گے اور ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ بنوعدی قلت تعداد کی بنا پر اپنی کمزوری محسوس کرتے تھے، اسی لیے بنوعبد شمس نے انہیں ان کے صفا والے مکانوں سے نکال دیا تھا۔ ان حالات میں اگر خطاب کثرت اولاد کے ذریعے سے اپنا تحفظ کرنا چاہتے تھے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

خطاب ایک ذہین شخص تھے جو اپنی قوم میں نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ شجاع و بہادر بھی تھے اور مختلف معرکوں میں بنوعدی کے جنگی سرداروں کی حیثیت سے جرأت و پامردی کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ بنوعدی جنگ فجار میں شریک تھے اور ان کی قیادت زید بن عمرو بن نفیل اور ان کے بھائی اور چچا خطاب بن نفیل کے سپرد تھی۔ خطاب کے والد نفیل نے جیداء سے شادی کی تھی اور اس کے بطن سے خطاب اور عبدنہم پیدا ہوئے تھے۔ اس کے بعد نفیل مر گئے اور ان کے بیٹے عمرو نے ان کی بیوی جیداء سے نکاح کر لیا جو ان کی سوتیلی ماں تھی۔ یہ نکاح عہد جاہلیت میں رائج تھا۔ اور اس سے زید بن عمرو پیدا ہوئے۔ اس طرح وہ خطاب کے بھائی بھی تھے اور بھتیجے بھی[2]۔ یہ دونوں چونکہ ہم عمر تھے اس لیے جنگ فجار میں اپنی قوم کی قیادت انہیں سونپی گئی۔

---

[1] یہ وہ اشعار ہیں جو علامہ طبری اور دوسرے مورخین نے نقل کیے ہیں:

لا شئی فیما تری تبقی بشاشته ... یبقی الا له ویودی المال والولد
لم تغن عن هرمز یوما خزائنه ... والخلا قد حاولت عادفما خلدوا
ولا سلیمان اذ تجری الریاح له ... والانس والجن فیما بینها ترد
این الملوك التی کانت نوافلها ... من کل اوب الیها راکب یفد
حوضا هنالك مورودا بلا کذب ... لا بد من ورده یوما کما وردوا

[2] دیکھو: الاغانی جلد: 3، ص 123، مطبوعہ دار الکتب المصریہ۔

Marfat.com

جب زید بن عمرو نے بت پرستی ترک کی اور بتوں کا ذبیحہ کھانا چھوڑ دیا تو اپنی قوم سے کہنے لگے: ''کیا اللہ آسمان سے مینہ اس لیے برساتا ہے، زمین سے سبزہ اس لیے اگاتا ہے اور جانور اس لیے پیدا کرتا ہے کہ تم انہیں ان چراگاہوں میں چراؤ اور غیر اللہ کے لیے ذبح کردو! خدا کی قسم! اپنے سوا روئے زمین پر مجھے کوئی نظر نہیں آتا جو ابراہیم کے دین پر ہو!'' اس کے بعد چند شعر کہے جن میں بت پرستی چھوڑنے کی تلقین تھی۔ [1] ان باتوں سے خطاب ان کے دشمن ہو گئے اور اس دشمنی نے انتہائی شدت اختیار کرلی۔ قریش کی ایک جماعت نے زید بن عمرو کو مکہ سے نکال دیا اور ممانعت کردی کہ اب ادھر کا رخ نہ کریں۔ اس معاملہ میں سب سے شدید اور سب سے سنگدلانہ روش خطاب کی تھی۔

خطاب کی ایک بیوی حنتمہ بنت ہاشم بن المغیرہ بنی مخزوم سے تھیں۔ یہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید کی چچا زاد بہن تھیں۔ اور اس اعتبار سے مغیرہ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم ان دونوں کے دادا تھے۔ مغیرہ مخزومی کا شمار قریش کے سرداروں اور سورماؤں میں ہوتا تھا۔ یہ بنی مخزوم کی فوج کے امیر تھے اور اسی لیے ان کو صاحب الاعنہ کا لقب حاصل تھا۔ قریش میں ان کے مرتبے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کو سب سے پہلے جس نے یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی منت پوری کرنے کے لیے اپنے بیٹے عبداللہ کو ذبح نہ کریں وہ یہی تھے۔ چنانچہ انہوں نے

---

[1] اس سلسلے میں زید بن عمرو سے بہت سے اشعار منسوب ہیں جو صاحب الاغانی ابن ہشام اور دوسرے مصنفین نے اپنی کتابوں میں نقل کیے ہیں۔ وہ شعر بھی ہم نے اس باب میں لکھے ہیں زید ہی کی ایک طویل نظم سے لیے گئے ہیں۔ نیز ذیل کے اشعار بھی انہی کے ہیں:

اسلمت وجهي لمن اسلمت	له المزن تحمل عذباً زلالا
واسلمت وجهي لمن اسلمت	له الارض تحمل صخراً ثقالا
دحاها فلما استوت شدها	سواء وارسى عليها الجبالا

ترجمہ: میں نے اس کی ذات کے آگے اپنا سر جھکا دیا جس کے آگے صاف اور میٹھا پانی اٹھانے والے بادلوں نے اپنی گردن جھکا دی اور میں نے اپنی گردن اس ذات کے آگے جھکا دی جس کے آگے بھاری چٹانوں کو اٹھانے والی زمین نے سر خم کیا اس نے اس زمین کو بچھا دیا اور جب دیکھا کہ وہ پانی پر ٹھیک طور پر استوار ہو گئی تو اس نے اس پر پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے۔

صاحب الاغانی نے سنداً روایت کیا ہے کہ سعید بن زید بن عمرو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زید کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن وہ موحدین میں ہوں گے۔''

Marfat.com

عبدالمطلب سے کہا تھا: خدا کی قسم! آپ عبداللہ کو ذبح نہ کریں۔ اگر اس سلسلے میں آپ کو فدیہ ادا کرنا پڑے تو ہم اپنا سارا مال دینے کو تیار ہیں۔'' مغیرہ مخزومی کا یہی مقام تھا جس کی بنا پر حنتمہ اپنی سوکنوں میں سب سے ممتاز سمجھی جاتی تھیں۔ جب ان کے بطن سے عمر رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو خطاب کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہا۔ انہوں نے بتوں پر بڑی بڑی نذریں چڑھائیں اور بنی عدی کے محتاجوں کو اتنا دل کھول کر کھانا کھلایا کہ اس سے پہلے شاید ہی کسی نے کھلایا ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کب پیدا ہوئے؟ اس کے متعلق قطعیت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اتنا ثابت ہے کہ ان کی وفات ماہ ذی الحجہ 23ھ کے آخری دنوں میں ہوئی۔ لیکن وفات کے وقت ان کی عمر کیا تھی اس میں اختلاف ہے کوئی کہتا ہے کہ اس وقت وہ پچپن برس کے تھے، اور کوئی کہتا ہے ستاون برس کے، کسی کے نزدیک اس وقت ان کی عمر ساٹھ برس کی تھی اور کسی کے نزدیک تریسٹھ برس کی۔ اس کے علاوہ بھی کچھ روایتیں ملتی ہیں، لیکن غالب قیاس یہی ہے کہ وفات کے وقت ان کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔ اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ہجرت کے وقت ان کی عمر چالیس سے کچھ کم بیٹھتی ہے، لیکن یہ قیاس صحت سے اتنا قریب نہیں ہے کہ اسے یقین کا درجہ دیا جا سکے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بچپن اور جوانی کا دور قریش کے عام آدمیوں کی طرح گزرا، لیکن اس کے بعد انہوں نے پڑھنا لکھنا سیکھ کے اپنے آپ کو ممتاز کر لیا۔ وجہ امتیاز یہ تھی کہ اس زمانے میں پڑھنے لکھنے کا رواج نہ تھا اور قریش میں پڑھے لکھے لوگ محض برائے نام تھے۔ چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معبوث ہوئے ہیں۔ صرف سترہ قریشی پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ آج ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پڑھنا سیکھ کے اپنے ہم چشموں میں امتیاز حاصل کر لیا تھا۔ لیکن اس زمانے میں عرب پڑھنے لکھنے کو برتری کی علامت نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اپنی اولاد کو اس سے روکتے تھے۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ جوان ہوئے تو ضجنان اور مکہ کے آس پاس اپنے والد کے اونٹ چرانے لگے۔ ہم ابھی وہ روایت بیان کر چکے ہیں، جس میں خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے والد کے اونٹ چرانے اور ان کے مزاج کی سختی کا ذکر کیا ہے۔ عقد الفرید کے مصنف کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن نابغہ جعدی سے فرمایا: ''مجھے اپنے وہ اشعار سناؤ جو اللہ کے نزدیک جائز ہیں۔'' اس نے چند شعر سنائے تو آپ نے فرمایا: ''یہ تم ہی نے کہے ہیں؟'' بولا ہاں! فرمایا: ''خطاب کے اونٹ چراتے ہوئے میں نے مدتوں یہ شعر پڑھے۔'' جوانان قریش میں اونٹوں کا چرانا ان کی عزت و منزلت کے اعتبار سے مختلف ہوتا تھا۔

Marfat.com

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھا تو قوت و طاقت کے اعتبار سے اپنے تمام ہم عمروں پر فوقیت رکھتے تھے اور کوئی نوجوان قامت و جسامت میں انہیں نہ پہنچتا تھا۔ ایک دفعہ عوف بن مالک نے کچھ لوگوں کو ایک جگہ جمع دیکھا جن میں ایک شخص سب سے بلند تھا۔ اتنا بلند کہ نگاہیں اس پر رکتی تھیں۔ پوچھا "یہ کون ہے؟" جواب ملا: "عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ!"[1] رنگ سفید تھا جس پر سرخی غالب تھی۔ جسم طاقت ور اور قدم فراخ تھا جس کی وجہ سے رفتار میں تیزی تھی۔

ابھی جوانی کا آغاز ہی تھا کہ جسمانی ورزشوں میں مہارت پیدا کر لی، خصوصاً پہلوانی اور شہ سواری میں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو ایک شخص کسی چرواہے سے ملا اور کہا: "تمہیں معلوم ہے وہ مرد توانا مسلمان ہو گیا؟" چرواہے نے کہا: "وہی جو عکاظ کے میلے میں کشتی لڑتا تھا؟" اس شخص نے جواب دیا: "ہاں! وہی۔" چرواہے نے چلا کر کہا: "خدا کی قسم! وہ ان میں خیر یا شر کو ضرور وسعت دے گا!"

"جسمانی ریاضت" کے سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سب سے محبوب مشغلہ گھوڑے کی سواری تھی، جس سے انہیں زندگی بھر دلچسپی رہی۔ خود ان کے عہد خلافت کی بات ہے: "ایک دن گھوڑے پر سوار ہوئے ایڑ جو لگائی تو گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا اور کئی راہ گیر اس کی جھپٹ میں آتے آتے رہ گئے۔ لوگوں نے تعجب کیا تو فرمایا: "اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ دل میں امنگ اٹھی۔ میں گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے ایڑ لگا دی!" ان کی جنگی قابلیت مسلمہ ہے جو انہیں اپنی ننھیال بنی مخزوم سے ورثے میں ملی تھی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مرض الموت میں فرمایا تھا: "جب میں نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو شام بھیجا ہے۔ اگر عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ کو بھی جیسا میں چاہتا تھا عراق بھیج دیتا تو میرے دونوں باز و خدا کی راہ میں پھیل جاتے۔"

جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہلوانی اور شہ سواری جیسی جسمانی ورزشوں میں مہارت رکھتے تھے اسی طرح ان کا مذاق شعری بھی نہایت شستہ اور بلند تھا۔ وہ عکاظ اور اس کے علاوہ دوسرے مقامات پر شاعروں کا کلام سنتے جو شعر پسند آتے انہیں اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتے اور مناسب موقعوں پر مزے لے لے کر پڑھتے۔ حطیہ، حضرت حسان بن ثابت اور زبرقان جیسے شعراء سے

1۔ طبقات ابن سعد کی روایت میں ہے: "ایک شخص لوگوں سے تین ہاتھ اونچا تھا۔" پوچھا: "یہ کون ہے؟" جواب ملا: "عمر بن خطاب۔"

Marfat.com

ان کی اکثر طویل گفتگوئیں رہتیں۔ انساب عرب میں بھی وہ اپنا حریف نہ رکھتے تھے اور یہ فن انہوں نے اپنے والد سے حاصل کیا تھا۔ وہ بڑے بلیغ اور فصیح اللسان تھے، اسی لیے قریش کی سفارت کے فرائض انجام دینے دوسرے قبیلوں میں جاتے تھے اور اسی لیے باہمی جھگڑوں میں ان کے فیصلے بھی اسی طرح تسلیم کیے جاتے جس طرح ان سے پہلے ان کے والد کے فیصلے تسلیم کیے جاتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ مکہ کے دوسرے نوجوانوں کی طرح بلکہ ان سے کہیں زیادہ بنت رز کے عاشق تھے۔ انہیں اپنے عنفوان شباب میں حسینان عرب سے بھی بلا کا شغف رہا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے تمام سوانح نگار ان کی بادہ پیمائی اور حسن نوازی پر متفق ہیں۔ یہ دونوں شوق صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کی ذات تک محدود نہ تھے، بلکہ اس زمانے میں یہ قریش کا عام مذاق تھا۔ چنانچہ مکہ والے نبیذ پر جان دیتے تھے اور اس کے نشے میں انہیں دونوں جہان کی نعمتیں مل جاتی تھیں۔ اپنی خواہش نفس وہ لونڈیوں سے پوری کرتے تھے اور اپنے جذبات عشق وشیفتگی کی راحت کا سامان دوسری عورتوں سے بہم پہنچاتے تھے۔ جاہلیت کے اشعار اس شغف کی ترجمانی کرتے اور ان دل باختگان شاہد وشراب کے سمند شوق کے لیے تازیانہ ثابت ہوتے تھے۔ ظہور اسلام کے بعد بھی عمر بن ابی ربیعہ اور اسی قسم کے دوسرے شاعروں کا کلام مکہ کی ان رنگین مزاج عورتوں کے لیے آگ پر تیل کا حکم رکھتا تھا جنہیں نفسانی خواہشیں اپنی ماؤں اور خالاؤں سے ورثے میں ملی تھیں...... وہ نفسانی خواہشیں؟ جنہیں اسلام نے گناہ قرار دیا تھا لیکن جو اسلام سے پہلے گناہ نہ تھیں۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جوانی اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ رخصت ہوگئی تو ان کے دل میں نکاح کی خواہش نے انگڑائی لی۔ کثرت اولاد کے لیے تعدد ازواج کا شوق ان کے اسلاف کی وراثت تھی۔ چنانچہ انہوں نے بھی اپنی زندگی میں نوعورتوں سے شادی کی جن سے بارہ بچے پیدا ہوئے۔ آٹھ لڑکے اور چار لڑکیاں۔ زینب بنت مظعون سے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اور حفصہ رضی اللہ عنہا، ام کلثوم بنت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے زید اکبر رضی اللہ عنہ اور رقیہ رضی اللہ عنہا۔ ام کلثوم بنت جرول بن مالک سے زید اصغر اور عبیداللہ...... اسلام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ام کلثوم بنت جرول سے جدا کر دیا تھا...... جمیلہ بنت ثابت بن ابی الافلح سے عاصمہ...... یہ وہی جمیلہ ہیں جنہیں عاصیہ کہتے تھے، لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام تبدیل فرما دیا اور کہا: ''تم عاصیہ نہیں بلکہ جمیلہ ہو''...... ام حکیم

بنت حارث بن ہشام بن المغیرہ سے فاطمہ، عاتکہ، بنت زید بن عمرو سے عیاض لہتیہ...... یہ ام ولد تھیں...... سے عبدالرحمن الاوسط، اور فکیہہ...... یہ بھی ام ولد تھیں...... سے زید اصغر۔ اسی طرح عبدالرحمن الاصغر بھی ایک ام ولد کے بطن سے تھے جن کے نام میں مؤرخین کا اختلاف ہے۔

ان میں چار عورتوں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مکہ میں شادی کی تھی اور پانچ عورتوں سے ہجرت کے بعد مدینہ میں۔ لیکن یہ سب ان کے گھر میں ایک جگہ کبھی جمع نہیں ہوئیں۔ ام کلثوم بنت جرول نے چونکہ قبول اسلام سے انکار کر دیا، اس لیے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جدا ہو گئیں اور ام حکیم بنت حارث بن ہشام اور جمیلہ جن کے بطن سے عاصم پیدا ہوئے تھے ان دونوں کو انہوں نے طلاق دے دی۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عمر وفا کرتی تو شاید وہ اور نکاح کرتے! چنانچہ جب وہ امیر المومنین تھے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صغیر السن صاحبزادی ام کلثوم کو ان کی بڑی بہن ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی معرفت پیام دیا، لیکن ام کلثوم نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ بہت تنگی ترشی سے گزارا کرتے ہیں اور عورتوں کے لیے سخت ہیں۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ام ابان بنت عتبہ بن ربیعہ سے نکاح کرنا چاہا اور انہوں نے بھی یہ کہہ کر پیام قبول نہیں کیا کہ ''ان کا دروازہ بند رہتا ہے اور وہ لطف و مہربانی سے پیش نہیں آتے۔ تیوری چڑھائے گھر میں آتے ہیں اور تیوری چڑھائے گھر سے جاتے ہیں۔''

ام کلثوم بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا نے ان کی سختی و سرشتی اور ام ابان نے ان کی تنگی و ترش روئی کے متعلق جو کچھ کہا وہ درست ہے۔ یہ باتیں جوانی میں ان کی طبیعت کا ایک جزو ہو گئی تھیں اور ساری زندگی ان کے ساتھ رہیں۔ جب مسلمانوں کی امارت انہیں سونپی گئیں، ان کی سب سے پہلی دعا یہ تھی: ''یا اللہ! میں سخت ہوں؟ مجھے نرم کر یا اللہ! میں کمزور ہوں، مجھے طاقت دے! یا اللہ! میں بخیل ہوں، مجھے سخی بنا!'' سختی انہیں اپنے والد سے ملی تھی کہ وہ لڑکپن میں ان کے ساتھ بے رحمی سے پیش آتے تھے اور بعد کو ان کی جسمانی طاقت اس سختی کے قیام و بقا میں اعانت کار ہوئی۔ بخل ان میں اس لیے تھا کہ نہ وہ خود دولت مند تھے نہ ان کے والد۔ ان کی زندگی مال و دولت کے لحاظ سے ہمیشہ اوسط درجے کی رہی۔ حالانکہ بہت سے مکہ والوں کی طرح وہ بھی تجارت کرتے تھے۔ غالباً ان کے مزاج کی یہی سختی تھی جس نے انہیں تجارت سے وہ نفع نہیں کمانے دیا جو مکہ کے دوسرے تاجر کماتے تھے اور وہ بقول قریش چٹان سے پانی نکال سکے نہ مٹی کو سونا بنا سکے۔ گرمی اور جاڑے کے تجارتی سفروں میں وہ برابر یمن اور شام جاتے رہے۔ یمن اور شام ہی نہیں انہوں نے فارس

اور روم کے سفر بھی کیے، لیکن اپنے ان تمام سفروں میں تجارتی مفاد سے زیادہ ان کی توجہ تہذیب نفس پر رہی۔ مسعودی نے مروج الذہب میں ان تجارتی سفروں کا ذکر کیا ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایام جاہلیت میں کیے اور جن میں انہیں اکثر امرائے عرب سے ملنے اور ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ گمان غالب یہ ہے کہ قریش کے منصب سفارت، ایام وانساب عرب کے علم اور اس زمانے کی کتابوں کے مطالعے نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کسب مال سے زیادہ اکتساب علم پر حریص کر دیا تھا۔

اور یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان میں انتہائی خود اعتمادی اور عزت نفس کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ دولت مند اپنے مال کے تحفظ اور اس میں اضافے کی طمع کا شکار ہو جاتا ہے۔ کوڑی کو پیسہ بنانے کا لالچ اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ لوگوں سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھے اور ان کی خوشامد میں لگا رہے۔ ایک تاجر کی کامیابی کا معیار ہی یہ ہے کہ وہ موقع شناس ہو اور اپنی لچھے دار باتوں سے گاہک کو خوش کر سکے۔ لیکن حکمت ومعرفت کا طلب گار دولت کو بے اصل اور دنیا کو ذلیل سمجھتا ہے اس لیے کہ دولت کا لالچ اسے حکمت کی راہ سے ہٹا کر دنیاوی تعلقات کے جال میں پھنسا دیتا ہے اور وہ مادی قوتوں کی بندگی میں الجھ کر رہ جاتا ہے، لیکن جو کوئی دنیا اور اس کی دولت کو پائے حقارت سے ٹھکرا کے علم وعرفان کی جستجو کرتا ہے اس میں عزت نفس کا احساس اس شدت سے بیدار ہو جاتا ہے کہ وہ دولت کے پجاریوں کو پست وادنیٰ سمجھ کر ان سے دامن بچانے لگتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی جوانی میں اس حد کو تو نہیں پہنچے تھے، لیکن جہاں تک خود اعتمادی اور عزت نفس کا تعلق ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دونوں چیزیں ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

اسباب معرفت کی تلاش نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کی جوانی میں قومی مسائل اور ان کی اصلاح کے طریقوں پر غور وفکر کا موقع بہم پہنچایا اور عزت نفس کے احساس نے ان کی رائے میں عصبیت پیدا کی۔ پھر ان کے مزاج کی سختی اور ان کے جسم کی توانائی نے اس عصبیت کو تشدد کی حد تک پہنچا دیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بات منوانے کے لیے زبان کی حدت کے ساتھ ساتھ بازو کی قوت سے بھی کام لے لیا کرتے تھے۔ پھر بھی دوسرے کی بات وہ بڑے غور سے سنتے تھے اور اس کے ہر پہلو پر تفصیلی نظر ڈالتے تھے تا کہ اسے رد کریں تو قطعی دلیل سے اور ختم کریں تو پوری قوت سے۔

مکہ اور جزیرہ نمائے عرب کے دوسرے شہروں میں اقتصادی اور اجتماعی مسائل وجہ اختلاف بنے تھے۔ اس سلسلے میں لوگوں نے چند نظریات پر اتفاق کر لیا تھا، جو ان میں نسلاً بعد نسل چلے آرہے تھے۔ وہ اپنی زندگی میں ان نظریات پر قائم تھے اور اپنے باہمی تعلقات میں ان سے مطمئن......

Marfat.com

البتہ مذہب اور عبادات میں ان کا اختلاف تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ یہودی اور عیسائی، جوان کے ساتھ رہتے تھے، بت پرستی کے مخالف تھے اور اسے ایک ایسا فعل سمجھتے تھے جسے تسلیم کرنا عقل کی توہین ہے۔ پھر انہوں نے گرمیوں کے تجارتی سفر میں روم کے ان یہودیوں اور عیسائیوں کو بھی دیکھا تھا جو باعتبار تہذیب ان سے زیادہ ترقی یافتہ تھے اور اس ترقی کو اپنے اپنے مذہب کا فیضان قرار دیتے تھے۔ مزید برآں آج کی طرح اس زمانے میں بھی مسیحیت کے پرچارک اپنے مذہب کی تبلیغ بڑے جوش وخروش سے کرتے تھے۔ اس بنا پر عرب کے چند عقل مند بزرگوں نے بت پرستی سے انکار کر دیا تھا۔

تو کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی...... جو پڑھے لکھے انسان تھے...... بندگان فکر ونظر کے اس گروہ میں شامل تھے؟

نہیں! بلکہ وہ ان لوگوں کے شدید ترین دشمن تھے۔ ان کی رائے میں اس گروہ کا اپنے قومی مذہب سے پھر جانا گویا عربی اتحاد کے ایک ستون کا گر جانا تھا۔ اسی لیے وہ ان موحدین سے برسر پیکار رہتے تھے اور انہیں اس طرح ختم کر دینا چاہتے تھے کہ ان کا نام ونشان تک باقی نہ رہے۔ شاید ان کے اس تعصب میں بت پرستی سے زیادہ قوم پرستی کو دخل تھا اور وہ اپنے اس قومی نظام کو کسی عنوان خطرے میں نہ دیکھ سکتے تھے، جو دوسری قوموں کے مقابلے میں انہیں قوت پہنچاتا اور ان کے وجود کی حفاظت کرتا تھا۔

اور یہ واقعہ ہے کہ قدیم ترین زمانے سے انسان اپنی زندگی کے دو بنیادی اصولوں کی کشمکش میں مبتلا ہے اور یہ کشمکش اسے آج بھی پیسے ڈال رہی ہے۔ کبھی ان میں سے پہلا اصول غالب آجاتا ہے کبھی دوسرا۔ یہ اصول ہیں۔ حریت اور نظم...... حریت فرد اور نظم جماعت! جماعت کی زندگی نظم کے بغیر کچھ نہیں اور فرد کی زندگی حریت کے بغیر بے معنی ہے۔ پس اگر حریت فرد اور نظم جماعت کا تصادم ہو جائے تو ہمیں ان میں سے کس کا ساتھ دینا چاہیے؟ لازماً نظم جماعت کا...... اس لیے کہ فرد کی آزادی جماعت کے نظم سے وابستہ ہے۔ اگر جماعت کا نظم باطل ہو جائے تو فرد کی آزادی آپ سے آپ باطل ہو جائے گی۔ لیکن کیا حریت فرد کے لیے ایسی حدود مقرر نہیں ہیں جو اسے نظم جماعت سے نہ ٹکرانے دیں اور اسی طرح کیا نظم جماعت کی ایسی حدود متعین نہیں ہیں جو اسے حریت فرد سے متصادم نہ ہونے دیں نہیں! یہ حدود ہیں اور ہمیشہ کی طرح آج بھی نقطۂ اختلاف

بنی ہوئی ہیں۔ ہر قوم کی اقتصادی، اجتماعی اور سیاسی زندگی میں فرد کی آزادی اور جماعت کا نظم اپنی الگ الگ حدیں رکھتے ہیں اور انہی حدوں کا اختلاف ہے جو کبھی اس قوم کو داخلی شورشوں میں مبتلا کر دیتا ہے اور کبھی اس کے اور دوسرے قوموں کے باہمی تعلقات کو جنگ و پیکار کے جہنم میں جھونک دیتا ہے بلکہ بہت سی جنگیں جو ہوس اقتدار کے ماتحت شروع ہو جاتی ہیں دیکھتے ہی دیکھتے کبھی حریت فرد کے جھنڈے تلے پہنچادی جاتی ہیں اور کبھی عالمی نظم کے جھنڈے تلے جو عوامی آزادی کا کفیل بنتا ہے۔

اکثر زمانوں میں لوگ اس پر متفق رہے ہیں کہ عقائد و نظریات کی آزادی جب تک عقائد و نظریات اور ان کے اظہار تک محدود رہے جماعتی نظم سے اس کا تصادم نہیں ہونا چاہیے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں یہ بات نہ تھی۔ فارس اور روم کی اکثر جنگیں مذہبی تعصب کی بنا پر ہوئیں بلکہ اس کے بعد بھی مسیحی یورپ اور مسلمانوں کے درمیان صلیبی جنگیں لڑی گئیں اور ان کی آگ محض اختلاف عقائد کے سبب مدتوں شعلہ زن رہی۔ وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں مذہب کو اجتماعی زندگی کی اساس سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے جب کبھی رعایا کو لطف و مہربانی سے نوازا جاتا ان لوگوں کو، جن کا مذہب حکومت کے مذہب سے مختلف ہوتا، اجنبیوں کے ذیل میں شمار کیا جاتا تھا، وہ چونکہ اپنے آبائی عقائد پر قائم تھے، اس لیے انہیں وہ حقوق نہیں دیئے جا سکتے تھے جو حقوق حکومت اپنے مذہب کے پیروؤں کو دیتی تھی۔ اس تصور کے پیش نظر حیرت کی کیا بات ہے کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ...... جاہلیت کے زمانے میں ...... ان لوگوں کے دشمن تھے جو بتوں کے سوا کسی اور کی پرستش کرتے تھے؟ اور تعجب کا کون سا موقع ہے۔ اگر وہ اپنے ان ابنائے قوم سے برسر جنگ رہتے تھے جنہوں نے اپنے آبائی مذہب سے روگردانی اختیار کر لی تھی؟

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خیال میں ان مرتدین کو محض اس لیے معاف نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ علم و حکمت کی دولت سے بہرہ ور تھے، بلکہ شاید ان کے علم اور حکمت ہی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں ان کا جرم شدید کر دیا تھا۔ عوام جاہلوں کی پیروی نہیں کرتے اور نہ انہیں اپنی عقیدتوں کا مرکز بناتے ہیں، وہ تو انہی فرزندان قوم کے پیچھے چلتے ہیں جن کی تلاش حق میں دقت نظر اور معاملہ فہمی پر انہیں اعتماد ہوتا ہے۔ چنانچہ قس بن ساعدۃ الایادی اگر اصنام عرب کی عیب جوئی کرتا ہے تو کرے۔ وہ نصرانی ہے اور اس کا نصرانی ہونا ہی اس کی عیب جوئی کے جواز کے لیے کافی ہے، لیکن زید بن عمرو بن نفیل، ورقہ بن نوفل، عثمان بن الحویرث، عبداللہ بن جحش اور اسی گروہ کے دوسرے مکہ والے

Marfat.com

اگر بت پرستی چھوڑ کے اپنے اشعار میں توحید کی اشاعت کرتے ہیں تو ان کا کوئی عذر مسموع نہیں ہو سکتا اور وہ کسی حال میں قریش کی دراز دستیوں سے نہیں بچ سکتے۔ انہیں اگر ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے تو وہ عوام کو گمراہ کر دیں گے اور قریش کی وحدت پارہ پارہ ہو کر رہ جائے گی، بلکہ ہو سکتا ہے وہ زمین کو فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنا دیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کا یہ تشدد ہی تھا جس نے قریش کی وحدت اور مکہ کی منزلت کو برقرار رکھا۔ ان کے خوف سے اہل دانش کی حکمت صرف ان کی اپنی ذات تک محدود رہی اور وہ دوسروں کو اپنے نقش قدم پر چلنے کی دعوت دے کر ان عقائد سے روگرداں نہ کر سکے جو ان کے باپ دادا کے وقت سے چلے آ رہے تھے۔

ان مرتدین کے خلاف سب سے زیادہ سخت، سب سے زیادہ جری اور سب سے زیادہ بے رحم حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے مزاج کی سختی اور غصے کی تیزی نے انہیں حد درجہ تشدد پسند بنا دیا تھا۔ حالانکہ اس وقت ان کی عمر پچیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ ان کے شباب نے ان کی رائے کے تعصب کو انتہائی حدوں تک پہنچا دیا تھا اور ان کی رائے کے تعصب کی حدت، ان کے مزاج کی سختی اور بے رحمی سے مل گئی تھی۔ چنانچہ تارکین اصنام کے خلاف ان کی جنگ بڑی شدید ہوتی تھی اور بتوں کی عیب جوئی کرنے والوں پر ان کا لوہا ہمیشہ تیز رہتا تھا۔

اس وقت اللہ عزوجل نے اپنے حکم سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کو ہدایت اور دین حق کی طرف بلائیں جب توحید کی دعوت پھیلنے لگی تو مکہ کے غالی بت پرستوں نے بے دست و پا مسلمانوں کو نشانہ ستم بنانا شروع کر دیا کہ وہ درماندہ ہو کر دوبارہ بت پرستی اختیار کر لیں۔ اس نئی دعوت کے مخالفین میں حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ کا نام سرفہرست تھا۔ مشرکین مکہ میں وہ سب سے زیادہ مسلمانوں کے دشمن تھے۔ طرح طرح سے انہیں ستاتے اور بہ ہر عنوان ترک اسلام پر مجبور کرتے۔

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ ایک دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک لونڈی کو مسلمان ہونے کے جرم میں مار رہے ہیں۔ مارتے مارتے تھک گئے تو چھوڑ دیا اور بولے: ''میں نے تجھے تھک کے چھوڑا ہے۔'' لونڈی نے جواب میں کہا: ''یہی خدا نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس لونڈی کو خرید کر آزاد کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جو دشمنی تھی وہ کسی جہل و تعصب کی بنا پر نہ تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے

Marfat.com

زیادہ علم اور آپ ﷺ سے زیادہ حکمت رکھنے والا اور کوئی نہیں۔ وہ آپ ﷺ کے بعض اقوال سے متاثر بھی تھے، لیکن اس کے باوجود نئی دعوت کے خلاف ان کی دشمنی میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا، جس مسلمان پر ان کا بس چلتا اسے ہرگز نہ چھوڑتے۔ یہاں تک کہ مسلمان ان کی ایذا رسانیوں سے عاجز آگئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ ساری اسلام دشمنی نتیجہ تھی ان کی اس رائے کا کہ اگر اس شخص کا اتباع کیا گیا تو مکہ کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور اس کی حدود میں فساد کے شعلے بھڑک اٹھیں گے اور مکہ کا نظام، مکہ والوں کا سکون انہیں محمد (ﷺ) اور محمد ﷺ کی اس دعوت سے کہیں زیادہ عزیز تھا، جس نے قریش کے اتحاد کو ضرب لگائی اور بلد حرام کی منزلت کو زک پہنچائی تھی۔ ان کے نزدیک اس دعوت پر صبر کرنے کے معنی یہ تھے کہ قریش کا اتحاد تیلیوں کی طرح بکھیر دیا جائے اور مکہ کا وقار اور احترام فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ اگر قریش محمد ﷺ کے متبعین کی دشمنی اور کمزور مسلمانوں کو دوبارہ اپنے دین پر لانے کی کوششوں سے باز آجاتے ہیں تو مکہ کی ہوا اکھڑ جائے گی اور قریش عربوں کے منہ کا نوالہ بن کر رہ جائیں گے۔

آخر ان بے چاروں کا گناہ کیا ہے جس کی پاداش میں ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جائیں۔ گناہ تو جو کچھ ہے وہ محمد ﷺ اور اس کی معجز بیانی و قادر الکلامی کا ہے۔ یہ اسی کے بیان کا اعجاز ہے جس نے ان بے سہاروں اور اپنے آبائی مذہب سے پھر جانے والوں کی عقل کو اس کا حلقہ بگوش بنا دیا ہے۔ اگر محمد ﷺ کو ختم کر دیا جائے تو فتنہ فرو ہو جائے، فساد کے بادل چھٹ جائیں اور بلد حرام کا گیا ہوا سکون پھر واپس آجائے...... اور ایک شخص کا قتل کسی قبیلے بلکہ مکہ کے تمام قبیلوں کی نجات کے مقابلے میں کیا اہمیت رکھتا ہے؟ اس سے قریش کی اجتماعی حیثیت اور مکہ کے قومی نظام کو برقرار رہنے کا موقع مل جائے گا۔

''لیکن محمد ﷺ کی باتیں بڑی دل آویز ہوتی ہیں، وہ لوگوں کو بڑے حسین پیرائے میں اپنی دعوت دیتا ہے۔ پھر وہ ایسا شخص ہے جسے قریش نے آج تک جھوٹ بولتے نہیں دیکھا تو کیا اسے محض اس لیے قتل کر دیا جائے کہ وہ کہتا ہے: ''اللہ میرا رب ہے!'' اور اس لیے کہتا ہے کہ اس پر ایمان رکھتا ہے۔

لیکن اسے قتل کرنے یا اس سے نجات پانے کی سبیل کیا ہے؟ وہ تو بنو ہاشم میں سے ہے اور بنو ہاشم اس کے مددگار ہیں۔ پھر جو لوگ اس پر ایمان لائے ہیں، جنہوں نے اس کی دعوت قبول کر لی ہے اور ایک جماعت کی شکل میں اس کے ساتھ ہیں، ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کا تعلق

معزز قبیلوں سے ہے اور بنو ہاشم کی طرح ان کے قبیلے بھی ان کی حفاظت و مدافعت پر آمادہ ہیں۔ چنانچہ ابو بکر رضی اللہ عنہ اور طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ بنی تیم بن مرہ سے، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بنی زہرہ سے۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بنی عبد شمس سے، ابو عبیدہ بن الجراح بنی فہر بن مالک سے، اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ بنی اسد سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سب کو اپنے اپنے قبیلے میں وہ مقام حاصل ہے کہ اگر ان پر کوئی زیادتی ہوئی تو یہ قبیلے ان کی ضرور مدد کریں گے۔ اب اگر عمر رضی اللہ عنہ ان سے اور ان کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرے اور قریش کو ان کے خلاف بھڑکائے تو مکہ میں ایسی خانہ جنگی برپا ہو جائے گی جس کے مقابلے میں وہ خطرہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا جو مکہ کی منزلت کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی دعوت سے لاحق ہو سکتا ہے۔"

یہ اور اسی قسم کے خیالات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تنہائی میں پریشان رکھتے، لیکن جب وہ گھر سے نکلتے اور اپنی قوم کا انتشار دیکھتے تو ان کا جی چاہتا کہ اس فرقے کو بیخ و بن ہی سے اکھاڑ کے پھینک دیں تاکہ مکہ کا امن بحال ہو جائے۔ یہ خیال برابر ان کے دل میں آتا رہا، یہاں تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متبعین رضی اللہ عنہم کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب ان مسلمانوں کو اپنا گھر بار اور عزیز و اقارب چھوڑتے دیکھا تو ان پر رحم آگیا اور تارکین وطن کی جدائی ان کے دل کا بوجھ بن گئی۔ مسئلہ اب ان کے نزدیک اور بھی اہم ہو گیا تھا۔ دل میں ایک طوفان اٹھا اور انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت سے نجات حاصل کرنے کے متعلق تفصیل سے سوچنا شروع کر دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر انہیں اپنے ارادے میں کامیابی ہوگئی تو قریش کو اطمینان نصیب ہو جائے گا اور صرف کعبے ہی کے نہیں بلکہ عرب کے تمام بت ان سے خوش ہو جائیں گے اور اگر اس کے برعکس کوئی ناگوار صورت حال پیش آگئی تو وہ قریش اور مکہ والوں کی خاطر اسے بھی ہنسی خوشی برداشت کرلیں گے۔ اس لیے کہ قریش ان کے عزیز ہیں اور مکہ ان کا وطن اور عزیزوں اور وطن کی راہ میں جو مصیبت بھی پیش آئے وہ خوشگوار ہے اور محبوب بھی۔

اپنے اس فیصلے پر وہ مضبوطی سے قائم ہو گئے، لیکن یہ بھول گئے کہ مخلوق میں اللہ جل شانہ کی ایک حکمت ہے اور وہ حکمت یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کی عقل اس کے جوش غضب پر غالب آئے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر وہ فاروق رضی اللہ عنہ بنے جس کا نام قیامت تک لوگ نہایت عزت و احترام سے لیتے رہیں۔

......☆......☆......

Marfat.com

باب:2

شرفِ اسلام سے سرفرازی

مشہور ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پینتالیس (45) مردوں اور اکیس (21) عورتوں کے بعد اسلام قبول کیا۔ بعض روایتوں میں یہ تعداد زیادہ ہے اور بعض میں کم۔ علامہ ابن کثیر نے ''البدایة والنہایة'' میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حبشہ کی ہجرت کے بعد حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے اور مہاجرین حبشہ کی تعداد مع عورتوں کے نوے (90) کے قریب تھی۔ جب یہ مسلمان حبشہ کی طرف چلے گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے تعاقب میں ارقم رضی اللہ عنہ کے مکان پر پہنچے جو صفا میں واقع تھا اور اس وقت وہاں مرد اور عورتیں مل کر چالیس مسلمان موجود تھے۔ اس قول کی روشنی میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے ایک سو تیس مرد و زن اسلام قبول کر چکے تھے۔ اس سلسلے میں یہ آخری روایت ہے۔ اس سے زیادہ تعداد کی جستجو آپ کے لیے بے معنی ثابت ہوگی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام کیوں قبول کیا؟ اس کے متعلق روایتوں میں اختلاف ہے، لیکن سب سے مشہور روایت یہ ہے کہ دعوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش میں جو افتراق پیدا کر دیا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سے بہت پریشان تھے، اسی لیے وہ اور ان کے ساتھی مسلمانوں کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچاتے تھے کہ وہ اس نئے دین سے برگشتہ ہو کر اپنا آبائی مذہب قبول کر لیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے دین کی حفاظت کے لیے کہیں اور چلے جائیں اور حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی خاص طور پر نصیحت فرمائی تو انہیں جاتے دیکھ کر بے حد صدمہ ہوا اور وہ ان کی جدائی سے بہت گھبرائے۔ ام عبداللہ بن ابی حثمہ کہتی ہے: ''قسم بخدا! جب ہم حبشہ کی طرف ہجرت کر رہے تھے عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ آئے اور میرے پاس کھڑے ہو گئے۔ وہ ابھی تک اپنے شرک پر قائم تھے اور ہمیں ان کی ذات سے طرح طرح کی اذیتیں برداشت کرنی

Marfat.com

پڑتی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا: ''ام عبداللہ! جانا یقینی ہے؟'' میں نے کہا: ''ہاں! قسم بخدا! ہم ضرور اللہ کی زمین میں نکل جائیں گے۔ تم لوگوں نے ہمیں بہت ستایا، ہم پر ظلم وستم کے بہت پہاڑ ڈھائے، یہاں تک کہ اللہ نے ہمارے لیے نجات کی راہ پیدا کردی۔'' بولے: ''اللہ تمہارے ساتھ ہو!'' جیسی رقت اس وقت میں نے ان پر طاری دیکھی کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس کے بعد وہ چلے گئے۔ میرا خیال ہے ہمارے جانے سے وہ سخت دلگیر تھے۔ جب ان کے شوہر آئے تو انہوں نے اپنی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی گفتگو ان کے سامنے دہرائی اور کہا: ''میرا خیال ہے، وہ اسلام قبول کرلیں گے!'' ان کے شوہر نے جواب دیا۔ ''خطاب کا گدھا ایمان لے آئے تو آئے مگر اس شخص سے امید نہیں!''

آگے چل کر اس روایت میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے برادران قوم کو انتہائی مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ترک وطن کرتے دیکھا تو اپنے دل میں ایک ٹیس سی محسوس کی اور انہیں اس ابتلاء سے نکالنے کی تدبیر سوچنے لگے۔ ان کی عقل نے کہا: ''کسی فیصلہ کن کوشش کے بغیر اس معاملے میں کامیابی ممکن نہیں اور انہوں نے اسی وقت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قتل کا مصمم ارادہ کرلیا کہ اس اقدام کے سوا ان کے نزدیک قریش کے اتحاد کی کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ ایک دن صبح وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے نمٹنے کے لیے شمشیر بدست گھر سے نکلے۔ یہ انہیں معلوم ہو ہی گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ ارقم رضی اللہ عنہ کے مکان میں اقامت فرما ہیں اور مسلمانوں کی مجموعی تعداد چالیس کے لگ بھگ ہے۔ ابھی راستے ہی میں تھے کہ نعیم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ مل گئے انہوں نے پوچھا: ''کہاں؟'' بولے: ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قصہ پاک کرنے جا رہا ہوں کہ یہی وہ بے دین ہے جس نے قریش میں تفرقہ ڈالا ہے۔ ان کا اخلاق تباہ کیا۔ ان کے عقائد پر لعن طعن کی اور ان کے دیوتاؤں کو برا بھلا کہا۔ میں آج اسے قتل ہی کرکے چھوڑوں گا۔'' نعیم رضی اللہ عنہ نے کہا: ''خدا کی قسم! عمر! تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کردیا تو بنی عبد مناف تمہیں زمین پر اکڑتے پھرنے کے لیے زندہ چھوڑ دیں گے۔ پہلے اپنے گھر والوں کی خبر تو لو، پھر ان سے بھی نمٹ لینا!'' عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''میرے گھر والے کون؟'' نعیم رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ''تمہارے بہنوئی اور چچازاد بھائی سعید بن زید بن عمرو اور تمہاری بہن فاطمہ بنت خطاب خدا کی قسم! وہ دونوں مسلمان ہوچکے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی پیروی کرتے ہیں۔ جاؤ، پہلے انہیں سمجھاؤ!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ سیدھے اپنی

Marfat.com

بہن کے گھر پہنچے۔ اس وقت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ ہاتھ میں قرآن پاک کے اجزاء لیے سعید رضی اللہ عنہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کو سورۂ طٰہٰ پڑھا رہے تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ کی آہٹ پا کر خباب ایک کوٹھری میں چھپ گئے اور قرآن پاک کے اجزاء فاطمہ رضی اللہ عنہا نے چھپا لیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خباب رضی اللہ عنہ کی آواز سن لی تھی۔ گھر میں آتے ہی کہنے لگے: یہ کیا ہو رہا تھا؟ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''کچھ نہیں!'' بولے: ''نہیں خدا کی قسم! مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم دونوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین قبول کر لیا ہے!'' یہ کہہ کر سعید بن زید رضی اللہ عنہ پر جھپٹے، بہن اپنے شوہر کو بچانے اٹھیں تو انہیں اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو وہ دونوں بولے: ہاں ہم مسلمان ہو گئے ہیں اور خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے ہیں، کر لو جو تمہارا جی چاہے!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن کے جسم سے خون بہتے دیکھا تو اپنی زیادتی پر نادم ہوئے۔ بہن کو محبت کی نگاہ سے دیکھا بولے: ''لاؤ! مجھے دکھاؤ جو ابھی تم پڑھ رہے تھے۔ دیکھوں تو سہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا لایا ہے؟'' بہن نے کہا: ''ہمیں ڈر لگتا ہے۔'' بولے: ''ڈرو نہیں!'' اور دیوتاؤں کی قسم کھائی کہ پڑھ کر واپس کر دوں گا۔ فاطمہ نے وہ اجزاء انہیں دے دیئے، پڑھ کے بولے: ''کتنا حسین اور کتنا بزرگ ہے یہ کلام!'' ان کی زبان سے یہ سن کر خباب رضی اللہ عنہ کوٹھری سے نکل آئے اور کہا: خدا کی قسم! اے عمر! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے تمہیں اپنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ میں نے کل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا مانگتے سنا تھا کہ یا اللہ! ابوالحکم بن ہشام یا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی قوت اسلام کے شامل حال کر! اور اے عمر! خدا بہر حال خدا ہے!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خباب سے کہا: ''خباب! میری رہنمائی کرو! کہ میں اسلام لے آؤں!'' خباب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ صفا کے قریب ایک مکان میں تشریف فرما ہیں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ تلوار ہاتھ میں لے کر چل پڑے اور اقامت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر پہنچ کے دستک دی۔ آواز سن کر ایک صحابی رضی اللہ عنہ اٹھے اور کواڑوں میں سے جھانک کے دیکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ تلوار ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔ وہ خوف زدہ واپس ہوئے اور کہنے لگے: ''یا رسول اللہ! باہر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بدست شمشیر کھڑے ہیں۔'' حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''آنے دو! اگر نیک ارادے سے آیا ہے تو بہتر، ورنہ اسی کی تلوار سے اس کی گردن اڑا دی جائے گی!'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا: ''آنے دو!'' صحابی نے انہیں بلا لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں آتا دیکھ کر اٹھے اور ایک کمرے میں ان سے ملاقات کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی چادر کا ایک کونہ پکڑا اور زور سے جھٹکا دے کر فرمایا: ابن خطاب! تم کس ارادے سے

آئے ہو؟ خدا کی قسم! اگر تم نے اپنی من مانی کی تو اللہ کا غضب تم پر نازل ہوگا! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "یا رسول اللہ! میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ خدا، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی وحی پر ایمان لے آؤں!" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز سے "اللہ اکبر" کہا جس سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو معلوم ہوگیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایمان لے آئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کی روایتوں میں یہ سب سے مشہور روایت ہے۔ اس کے بعد اس روایت کا نمبر ہے جو خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب کی جاتی ہے کہ آپ نے فرمایا: "میں اسلام سے کوسوں دور تھا۔ جاہلیت میں شراب پیتا تھا اور بڑے چاؤ سے پیتا تھا۔ ہماری ایک محفل جمتی تھی جس میں قریش کے اکثر نوجوان شامل ہوتے تھے۔ ایک رات میں اس محفل میں پہنچا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ میں نے دل میں کہا اگر میں مکہ میں فلاں مے فروش کے پاس چلوں تو شاید مجھے شراب مل جائے اور میں پی سکوں، لیکن وہ بھی مجھے نہ ملا۔ اب میں نے سوچا کہ چلو! کعبے کے سات یا ستر طواف کرلوں۔ اسی نیت سے مسجد میں پہنچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ رخ شام کی طرف تھا اور کعبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور شام کے درمیان تھا۔ آپ رکن اسود اور رکن یمانی کے درمیان نماز ادا فرما رہے تھے۔ آپ کو دیکھ کر مجھے خیال آیا آپ کا کلام سننے کا یہ بہترین موقع ہے سنوں تو سہی آخر آپ کہتے کیا ہیں؟ لیکن اندیشہ یہ تھا کہ اگر قریب گیا تو مجھے دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ڈر جائیں گے۔ اس خیال سے میں حجر اسود کی طرف غلاف کعبہ میں گھس گیا اور دبے پاؤں چلنے لگا، آپ نماز میں قرآن پاک کی تلاوت فرما رہے تھے۔ چلتے چلتے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل سامنے پہنچ گیا۔ اب میرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان غلاف کعبہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ قرآن پاک کی آیات سن کر میرے دل پر رقت طاری ہوگئی میں رو پڑا اور اسلام میرے باطن میں در آیا۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ختم کی اور گھر جانے کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے نزدیک پہنچے تو میں قریب آچکا تھا۔ آہٹ سن کر آپ نے مجھے پہچان لیا اور گمان فرمایا کہ میں کسی بری نیت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعاقب کر رہا ہوں۔ ڈانٹ کر پوچھا: "ابن خطاب! اس وقت تم کیوں آئے ہو؟" میں نے عرض کیا: "اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی وحی پر ایمان لانے!" آپ نے خدا کا شکر ادا کیا اور فرمایا: "عمر! اللہ نے تمہیں ہدایت بخش دی!" یہ کہہ کر آپ نے میرے سینے پر ہاتھ پھیرا اور میرے لیے ثبات واستقلال کی دعا فرمائی۔ اس طرح میں دین کی دولت سے مالا مال ہوکر آپ کی خدمت سے واپس ہوا۔"

Marfat.com

یہی روایت دوسری صورت میں...... جس سے شاید پہلے مفہوم کی تکمیل ہوتی ہے...... مسند امام احمد بن حنبل میں بھی آئی ہے۔ اس میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اسلام سے پہلے میں اس ارادے سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچاؤں، گھر سے نکلا۔ آپ مجھ سے پہلے ہی مسجد میں موجود تھے۔ میں جا کر آپ کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ آپ نے سورۃ الحاقہ کی تلاوت شروع فرمائی۔ قرآن کے اسلوب نے مجھے حیرت میں ڈال دیا اور میں نے اپنے دل میں کہا: ''خدا کی قسم! قریش سچ کہتے ہیں یہ شاعر ہے!'' اسی وقت آپ نے یہ آیت پڑھی:

اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ. (الحاقہ: 41-40)

ترجمہ: بے شک یہ ایک بزرگ پیغمبر کا قول ہے کسی شاعر کا کلام نہیں تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔

اب میرے دل نے کہا ''یہ کاہن ہے!'' اور اسی وقت لسان نبوت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیات جاری ہو گئیں:

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ. (الحاقہ: 42-47)

(ترجمہ: اور نہ کسی کاہن کا قول ہے۔ تم بہت کم نصیحت اندوز ہوتے ہو، یہ پروردگار عالم کی طرف سے اتارا گیا ہے اور اگر وہ ہم پر کوئی بات گھڑ لاتا تو ہم ضرور اس کا دایاں ہاتھ پکڑتے اور اس کے بعد اس کی گردن کاٹ ڈالتے اور تم میں سے کسی کی قوت اسے بچا نہ سکتی۔)

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورت ختم کی ہے تو اسلام پوری قوت سے میرے دل پر اثر انداز ہو چکا تھا۔

یہ روایت شہرت میں پہلی روایت کے قریب قریب ہے۔ ابن اسحاق نے ان دونوں روایتوں کے اثبات کے بعد لکھا ہے: ''اللہ بہتر جانتا ہے (ان میں) کون سی صحیح ہے۔''

یہ دونوں اور اسی قبیل کی دوسری روایتیں، جو کتابوں میں مذکور ہیں، اس دن کی تصویر تو اچھی طرح کھینچ دیتی ہیں جس دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا آبائی مذہب ترک کر کے خدا، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی، لیکن ان

Marfat.com

میں سے ایک بھی روایت نفسیاتی ارتقا پر روشنی نہیں ڈالتی، جس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اسلام کا رستہ دکھایا۔ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام کوئی اتفاقی امر تھا؟ کیا وہ اسلام سے اتنے دور اور اتنے نفور تھے کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور اس کے کسی پہلو پر غور کرنے کے لیے تیار ہی نہ تھے، کیا اللہ جل شانہ، نے ان کے دل میں دفعتہً ایمان ڈال دیا اور خباب رضی اللہ عنہ کے پاس دیکھے گئے صفحے یا قرآن کی ان آیات کو، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں پڑھ رہے تھے، اچانک اس شخص کی ہدایت کا وسیلہ بنا دیا جو اس کے دین کا سب سے بڑا دشمن تھا؟ کہیں حقیقت کچھ اور تو نہیں؟...... واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خباب کے پاس موجود صفحات کو پڑھنے اور کعبے کے غلاف میں چھپ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سورۃ الحاقہ کی کی آیات سننے سے پہلے بھی قرآن سے گوش آشنا ہو چکے تھے۔ انہوں نے قرآن پر بھی غور کیا تھا اور اس سے متعلق اپنی روش پر بھی۔ پھر وہ اپنے طرز عمل کو بھی چھانتے پھٹکتے رہتے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین رضی اللہ عنہم کے مقابلے میں انہوں نے اختیار کر رکھا تھا اور اسی مسلسل فکر، اسی طویل سوچ بچار نے آخر اس منزل کی طرف ان کی رہنمائی کی، جہاں اللہ کے حکم نے انہیں پہنچایا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام سے متعلق مؤرخین نے جو روایات نقل کی ہیں، وہ ان دونوں وجہوں میں سے کسی ایک کی بھی صراحت نہیں کرتیں۔ حالانکہ یہ کوئی دشوار بات نہ تھی۔ پھر اس صراحت سے ایک ایسی قطعی بات سامنے آجاتی ہے جسے عوام بھی مسلم سمجھتے اور جو ہمارے نزدیک بھی تنقید و تنقیح سے بالاتر قرار پاتی۔

مشہور روایت ہے کہ "حضرت عمر رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادے سے چلے، جب آپ صفا میں اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ اقامت فرما تھے۔ لیکن قرآن کے وہ اجزاء پڑھ کر جو خباب رضی اللہ عنہ، ان کے بہنوئی اور بہن کو پڑھا رہے تھے، ہدایت الٰہی نے انہیں توفیق سعادت عطا کر دی۔" جب ہم اس روایت پر نظر ڈالتے ہیں تو عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے بدست شمشیر جائیں اور انہیں یہ بھی معلوم ہو کہ چالیس صحابہ رضی اللہ عنہم...... جن میں حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اور ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ جیسے مکہ کے نامور بہادر بھی شامل تھے...... آپ کی خدمت میں جاں نثاری کے لیے حاضر تھے۔ بھلا حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ کیسے سمجھ سکتے تھے کہ وہ تنہا ان سب پر غالب آجائیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر کے یہ

Marfat.com

آئے دن کا جھگڑا ختم کر دینا چاہتے تھے اور انہوں نے اپنے ارادے کو جامہ عمل پہنانے کے طریقے بھی سوچ لیے تھے، لیکن جب انہوں نے قرآن کے اجزاء پڑھے اور اس کے حسن اثر سے متاثر ہو گئے تو اپنا ارادہ بدل دیا اور اسلام قبول کر لیا، لیکن ان کے قبول اسلام والی مشہور روایت میں ارادہ قتل کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، عقل اس سے انکار کرتی ہے۔ میرے نزدیک وہ صحیح ہے جو دوسری روایت میں خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبانی بیان کیا گیا ہے اور جس کی تائید امام ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں کی ہے۔

یہ راجح روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نفسیات اور ان کی شخصیت سے بھی مطابقت رکھتی ہے وہ اپنی قوم کا دل تھے اور اس کے لیے ان میں انتہائی درجے کا تعصب تھا۔ اپنی قوم کے نظام اور اپنے شہر کی منزلت کا انہیں حد سے زیادہ خیال تھا اس کے علاوہ ایک باعمل انسان تھے اور فکر کی درستی ان کے نزدیک زندگی میں فعال اثر رکھتی تھی، لیکن محض سوچنے کے لیے سوچنا، محض نفس فکر سے شغف اور اس کی تہوں میں چھپی ہوئی حقیقت کی کج روی کے لیے اس میں غلطاں و پیچاں رہنا، جب حقیقت اور فکر کا کوئی ایسا مظہر نہ ہو جس سے لوگ اپنی زندگی میں متاثر ہوں، لاحاصل ہے۔ اس سے نہ کوئی تڑپ پیدا ہوتی ہے نہ کسی قوم کی شیرازہ بندی میں کوئی کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ تھی زندگی کے تمام معاملات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے بلکہ جذباتی مسائل میں بھی ان کا نقطہ نظر یہی تھا۔ وہ اسے بالکل پسند نہ کرتے تھے کہ ایک نوجوان کسی حسینہ کو پرچار کرنے کے لیے اپنا سارا وقت اس کی ناز برداریوں یا اس کے حسن و ادا کی قصیدہ خوانیوں میں گزار دے، بلکہ وہ اسے کمزوری سمجھتے تھے جو ایک مکمل مرد کے شایان شان قرار نہیں دی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایک دن بھی ان عشق فروشوں کو اپنی توجہ سے نہیں نوازا تھا۔ جو محبت کے راگ الاپنے کو اپنا فن بنا بیٹھے تھے۔ عقیدے کے بارے میں ان کی اس رائے کا اظہار اس شدید بدسلوکی سے ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے چچا زاد بھائی زید بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روا رکھی۔ صرف اس لیے کہ زید بن عمرو رضی اللہ عنہ اپنے آبائی مذہب سے ہاتھ جھاڑ کے دین حق کی تلاش میں غیروں کے پاس چلے گئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے میں یہ سب کچھ محض خیال تھا، جس کا زندگی میں کوئی دخل نہ تھا اور جوان کی اس فطرت سے بالکل میل نہ کھاتا تھا جس کے زیر اثر وہ قریش کے اجتماعی نظام کی استواری اور سارے جزیرہ نمائے عرب میں مکہ کی سربلندی کے شدید خواہش مند تھے۔

Marfat.com

یہ رجحان فکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فطرت کے عین مطابق تھا۔ ان کے جسم میں توانائی تھی اس لیے وہ طاقت پر، اس کے تمام مظاہر میں، ایمان رکھتے تھے۔ بالخصوص بعثت نبویؐ کے ابتدائی دور میں ان کا یہ ایمان بڑا مستحکم تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا۔ جب زندگی کے تجربات، مزاج کی سختی اور درشتی کو اعتدال پر نہیں لاتے۔ چنانچہ جس مسلمان پر ان کا زور چلتا وہ اسے ضرور اپنے مظالم کا نشانہ بناتے اور چاہتے کہ کسی نہ کسی طرح وہ اسلام سے اپنا رشتہ منقطع کرے۔ اس سلسلے میں ان کی انتہا پسندی کا یہ عالم تھا کہ اگر ممکن ہوتا تو تمام مسلمانوں سے لڑائی مول لیتے، لیکن وہ جانتے تھے کہ قبائل قریش اپنے اپنے آدمیوں کی حمایت کرتے ہیں اور خود ان کے اپنے قبیلے، بنو عدی، میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو ان کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتے۔ چنانچہ دوسرے مشرکین قریش کی طرح انہوں نے بھی کمزور مسلمانوں ہی کو اپنے پنجہ غضب میں جکڑے رکھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ جیسے مسلمانوں پر اپنی طاقت نہ آزما سکے کہ یقین تھا کہ ان کے قبائل ان کی حمایت سے گریز نہ کریں گے۔ لہٰذا مشرکین نے ان صاحب اثر مسلمانوں کو بھی نہ بخشا، ان کا مقاطعہ کیا اور ان میں سے بھی جس پر بس چلا ستانے سے باز نہ رہے۔

اپنی اس ساری اسلام دشمنی کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ دل کے نرم تھے اور انصاف کے باب میں بڑے نازک احساسات رکھتے تھے۔ ان کی نرمی کی ایک مثال تو یہ ہے کہ ان کی بہن اپنے شوہر کو بچانے کے لیے اٹھتی ہے اور وہ انہیں مار مار کے لہولہان کر دیتے ہیں، لیکن جب بہن کے جسم سے خون بہتا دیکھتے ہیں تو ان کا سارا غصہ ندامت میں بدل جاتا ہے اور ندامت ان کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے اور یہ ہر طاقتور، ہر جوشیلے آدمی کی خصوصیت ہے کہ جب وہ طاقت کے بل پر اپنے آپ کو حد اعتدال سے متجاوز ہوتے دیکھتا ہے تو اس کی پیشانی عرق ندامت سے تر ہو جاتی ہے۔ دوسری مثال جس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رقت قلب پوری شان کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہے، ان کی وہ گفتگو ہے جو ام عبداللہ بنت ابی حثمہ سے ہوئی تھی جس دن وہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ ام عبداللہ کے دل پر اس رقت کا اتنا اثر ہوا کہ اپنے شوہر کی واپسی پر ان سے کہا: ''اگر تم ابھی عمر رضی اللہ عنہ کی رقت اور دل سوزی کو دیکھتے تو ان کے اسلام کی تمنا کرنے لگتے!'' ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بعد کو اسلام قبول کرنے والے تھے۔

Marfat.com

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مکہ کے نظام اور اس کے وقار کا بہت خیال تھا اور وہ ڈرتے تھے کہ نئے دین کی اشاعت سے مکہ کی عظمت و منزلت کو ٹھیس لگے گی، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ نبی عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ دعوت الی اللہ کے فرائض بڑے دل نشیں انداز میں انجام دیتے ہیں اور زمین میں کسی قسم کا فساد نہیں پھیلاتے، پھر وہ اپنے دین پر بھی پوری قوت سے قائم ہیں اور اپنے عقیدے کو زندگی کی ہر چیز یہاں تک کہ خود زندگی سے بھی زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں تو ان کے متعلق از سر نو غور کرنا شروع کر دیا اور اسی ذیل میں اپنی بدسلوکیوں پر بھی نظر ڈالی، انہوں نے سوچا۔ مسلمانوں کو دھمکیاں دی گئیں، اذیتیں پہنچائی گئیں، ان پر طرح طرح کے ستم ڈھائے گئے۔ لیکن نہ ان کے پائے ثبات میں لغزش پیدا ہوئی نہ ان کے دلوں میں کمزوری نے راہ پائی، بلکہ ہر مصیبت کے جواب میں ان کی زبان یہی کہتی رہی کہ اللہ ہمارا رب ہے اور جب ان پر مصائب و مظالم کی انتہا کر دی گئی تو انہوں نے وطن کو اپنے عقیدے پر قربان کر دیا اور اپنے دین کی حفاظت کے لیے ایک اجنبی ملک کی طرف ہجرت کر گئے۔ ایسی صورت میں اس دین کو محض فکری و نظری قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس کا اپنے متبعین کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر کوئی اثر نہ ہو، بلکہ وہ ایک زبردست قوت ہے جو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر یکساں اور غیر معمولی اثر رکھتی ہے۔ یہ اثر آغاز اسلام ہی سے مکہ کی زندگی میں ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا اور جوں جوں دن گزر رہے تھے اس کا دائرہ وسیع اور اس کے نقوش واضح ہوتے چلے جا رہے تھے۔ پھر مکہ اور اس کی عظمت کا حشر کیا ہوگا۔ اگر ہجرت کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا اور عربوں کو معلوم ہو گیا کہ مکہ کے باشندے مکہ میں نہیں رہ سکتے۔ اس لیے کہ ان پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں اور ان قبائل کی موجودگی میں ڈھائے جاتے ہیں، جن سے ان کے قرابت اور ہمسائیگی کے تعلقات ہیں۔ پھر ان سب جور آزمائیوں، تمام ستم رانیوں کا سبب صرف یہ ہے کہ مظلوم جماعت کے عقائد طاقتور گروہ کے عقائد کے خلاف ہیں۔ حالانکہ جزیرہ نمائے عرب میں عقائد کا اختلاف ایک عام بات ہے۔ وہاں مختلف بتوں کو پوجنے والے رہتے ہیں۔ وہاں اہل کتاب یہود و نصاریٰ اور ایرانی مذہب کے پیرو، مجوسی آباد ہیں تو کیا مکہ کے لیے یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان مسلمانوں سے صرف نظر کر لیا جائے، نہ ان کے عقائد کے سبب ان پر ستم توڑے جائیں نہ انہیں اسلام سے روگرداں کرنے کی کوشش کی جائے اور ہر شخص کو اسلام میں داخل ہونے اور مسلمانوں کے ساتھ رہنے کی اجازت دی جائے اور

کیا عمر رضی اللہ عنہ جیسے انسان کے لیے جس کا مطالعہ اوروں کے مطالعے سے وسیع ہے، جو فارس و روم اور یہود و نصاریٰ کا فلسفہ اپنی قوم کے دوسرے لوگوں سے بہتر جانتا ہے، یہ مناسب ہے کہ وہ مسلمانوں کی مخالفت کرتا رہے اور اسلام کو نقد و بصیرت کے بجائے تعصب اور کینہ پروری کی آنکھ سے دیکھتا رہے۔

اہل قریش کی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی رسول اکرم ﷺ کی دعوت اور نزول قرآن کا ذکر سنا تھا اور ان لوگوں کا حال بھی انہیں معلوم ہو گیا تھا جو رات کی تاریکی میں چھپ کر کاشانہ رسالت ﷺ کے پاس پہنچے اور اثنائے نماز میں لسان نبوت ﷺ سے کلام پاک کی آیات سنیں، اس کے بعد دوسری رات کو الگ الگ گئے اور واپسی میں جب ان کا میل ہوا تو ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ پھر ابوالحکم بن ہشام کا وہ جواب بھی ان کے علم میں آ گیا تھا جو قرآن کی آیات کے متعلق لوگوں کے پوچھنے پر اس نے دیا تھا کہ ''ہم میں اور بنو عبد مناف میں شرف و عظمت کا جھگڑا تھا۔ انہوں نے کھانا کھلایا تو ہم نے بھی کھلایا۔ انہوں نے ذمہ داریاں سنبھالیں تو ہم نے بھی سنبھالیں، انہوں نے بخششیں کیں تو ہم نے بھی کیں۔ غرض یہ کہ ہم ایک دوسرے کے دوش بہ دوش چلتے رہے، لیکن جب ہم نے شہ سواری میں ان پر سبقت حاصل کی تو انہوں نے دعویٰ کر دیا کہ ''ہم میں نبی ﷺ مبعوث ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے'' اب ہم اس کا جواب کیسے دے سکتے ہیں۔ خدا کی قسم! ہم اس پر کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔ ہرگز اس کی تصدیق نہیں کریں گے۔'' اس لیے ابوالحکم اور اس کے ساتھی مسلمانوں کو ناحق ستانے لگے، لیکن مسلمان اپنے دین پر قائم رہے۔ مصائب کے ہجوم نے انہیں اسلام سے منحرف نہ کیا بلکہ اس سے ان کی محبت و شیفتگی اور بڑھ گئی..... تو کیا یہ مسلمانوں کے حق پر ہونے کی آخری اور قطعی دلیل نہ تھی؟ پھر ابوجہل تو صرف اس لیے محمد ﷺ کے دین کے متعلق سوچنے، ان پر ایمان لانے اور ان کی تصدیق سے انکار کر رہا تھا کہ بنو عبد شمس اور بنو عبد مناف کے درمیان کوئی مسابقت بھی نہ تھی۔ یہ تھی وجہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلاف کعبہ میں چھپ کر رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھنے اور لسان نبوت ﷺ سے کلام پاک سننے کی اور اسی لیے انہوں نے اس صحیفے میں سورۂ طٰہٰ پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تھی، جو ان کی بہن کے پاس تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سب باتوں پر غور کیا اور کرتے رہے، یہاں تک کہ ہدایت پائی اور اللہ نے ان کے ذریعے سے اپنے دین کی حمایت اور اپنے

Marfat.com

رسول ﷺ کی مدد فرمائی۔

سرکار دو عالم ﷺ کی انتہائی تمنا یہ تھی کہ اسلام کو ایک ایسے مضبوط دل اور طاقتور شخص کی حمایت حاصل ہو جائے جو اپنے عقیدے کی راہ میں دشمن کا مقابلہ کرنے سے نہ ڈرے، اسی لیے آپ ﷺ اپنے پروردگار سے دعا مانگتے تھے کہ "یا اللہ! ابوالحکم بن ہشام یا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی قوت اسلام کے شامل حال کر!" ابوالحکم ایک قوی ہیکل، تیز زبان اور جنگ و جدل سے نہ گھبرانے والا آدمی تھا اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جو کچھ تھے وہ آپ نے پچھلے صفحات میں دیکھ ہی لیا۔ اس لیے ان دونوں میں کسی ایک کا قبول اسلام مسلمانوں کی حمایت کے لیے مفید تھا اور جو مصیبتیں اور اذیتیں مسلمان اس وقت برداشت کر رہے تھے، وہ ان میں سے کسی ایک کے مسلمان ہو جانے سے بہت حد تک کم ہو سکتی تھیں، لیکن ابوالحکم اس منافست کا شکار تھا جو اس کے اور رسول اللہ ﷺ کے قبیلے کے درمیان کارفرما تھی اور جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں اس لیے محمد ﷺ کے لائے ہوئے دین کو قبول کرنا اس کے لیے کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کے برعکس واقعات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رفتہ رفتہ اسلام کے قریب لا رہے تھے۔ اپنی قوم کے تعصب اور اپنے شہر کے نظام کی جو زنجیریں انہیں جکڑے ہوئے تھیں وہ آہستہ آہستہ ڈھیلی پڑ رہی تھیں اور ان کے دل میں حقیقی انصاف کا جو عنصر تھا وہ باقی تمام عناصر پر غالب آ رہا تھا، یہاں تک کہ گذشتہ تفصیل کے مطابق وہ صفا میں ارقم رضی اللہ عنہ کے مکان پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے یا جب حضور ﷺ کعبے میں نماز ادا فرما کر اپنے گھر تشریف لے جانے لگے تو آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے ہو لیے اور جب رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: "تم کیوں آئے ہو؟" تو بغیر کسی تردد یا تکلف کے جواب دیا "میں خدا، اس کے رسول ﷺ اور اس کی وحی پر ایمان لانے حاضر ہوا ہوں۔"

اس طرح جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ لیا کہ اسلام ایک زبردست قوت ہے جو صرف مسلمانوں کے دلوں ہی پر حکومت نہیں کرتی بلکہ انہیں اجتماعی زندگی اور اس کے نظام کی طرف بھی لے جا رہی ہے تو وہ اللہ کے دین میں اسی حمیت کے ساتھ داخل ہو گئے جس حمیت کے ساتھ پہلے اس کی مخالفت کیا کرتے تھے اور اسلامی جماعت کے لیے ایک نظام کی خواہش ظاہر کی، جس کا تحفظ بھی اسی طرح کیا جائے، جس طرح قریش اپنے نظام کا تحفظ کرتے ہیں۔ چنانچہ مسلمان ہوتے ہی انہوں نے قریش میں عملاً اپنے اسلام کی اشاعت شروع کر دی۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جس رات میں نے اسلام قبول کیا ہے سوچا کہ قریش میں رسول

اللہ ﷺ کا سب سے بڑا دشمن کون ہے کہ میں اس کے پاس جاؤں اور اسے اپنے مسلمان ہونے کی خبر سناؤں۔ دوسرے دن صبح سویرے میں نے ابو جہل کا دروازہ جا کھٹکھٹایا اور مجھے دیکھ کر بولا: ''آؤ بھانجے! کہو! کیسے آنا ہوا؟'' میں نے جواب دیا: ''میں تمہیں یہ اطلاع دینے آیا ہوں کہ میں اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ پر ایمان لے آیا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سچ کہتے ہیں۔'' ابو جہل نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا: ''اللہ تمہیں اور تمہاری اس اطلاع کو ذلیل کرے۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جب ان کے والد نے اسلام قبول کیا، سن تمیز کو پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے ایک روایت میں بتایا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اسلام کے اظہار کا کتنا شوق تھا اور اس کے لیے وہ قریش سے کس طرح لڑتے تھے۔ فرماتے ہیں: ''جب میرے والد عمر رضی اللہ عنہ ایمان لائے تو پوچھا، قریش میں سب سے بڑا باتونی اور ڈھنڈورچی کون ہے؟ کہا گیا: جمیل بن معمر الجمحی! اس کے پاس پہنچے اور کہا ''جمیل! تمہیں معلوم ہے میں نے اسلام قبول کرلیا ہے اور میں محمد ﷺ کے دین میں داخل ہوگیا ہوں۔'' خدا کی قسم! نے ایک لفظ نہ کہا اور اپنی چادر گھسیٹتا ہوا چل پڑا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ جمیل مسجد کے دروازے پر کھڑا ہوا اور چلا چلا کے کہنے لگا۔ ''اے گروہ قریش!''...... قریش اس وقت کعبے کے چاروں طرف ٹولیاں بنائے بیٹھے تھے...... تمہیں معلوم ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ بے دین ہوگیا ہے۔ فوراً ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''یہ بکتا ہے! میں تو اسلام لایا ہوں اور شہادت دیتا ہوں کہ ''لا الٰہ الا اللّٰہ وان محمدًا عبدہٗ ورسولہ.'' یہ سنتے ہی قریش بھڑک اٹھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے لڑنے لگے۔ یہاں تک کہ جب سورج سروں پر آگیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھک کے بیٹھ گئے۔ قریش ان پر پلے کھڑے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: ''کرلو جو تمہارا جی چاہے! میں خدا کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اگر ہم تین سو کی تعداد میں ہوتے تو یا سب کچھ تم سے لے لیتے یا سب کچھ تمہارے لیے چھوڑ دیتے۔'' اسی اثناء میں ایک معمر قریشی منقش جبہ اور پھول دار قمیص پہنے آیا اور ان کے پاس آکر پوچھنے لگا ''کیا بات ہے؟'' لوگوں نے کہا: ''عمر رضی اللہ عنہ بے دین ہوگیا ہے!'' بوڑھے نے جواب دیا ''تو پھر کیا ہوا، ایک شخص نے جو چاہا اپنے لیے پسند کرلیا ہے۔ تمہیں کیا مطلب؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ بنو عدی بن کعب اپنے آدمی کو تمہارے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے۔ ہٹ جاؤ اس کے پاس سے۔'' پس خدا کی قسم! وہ اسی طرح الگ ہوگئے جیسے جسم سے کپڑے اتار دیئے جاتے ہیں۔

Marfat.com

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہجرت فرمائی تو آپ کے صاحبزادے عبداللہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''ابا! جب آپ اسلام لائے تھے اور قریش آپ سے لڑ رہے تھے تو وہ کون سا شخص تھا جس نے انہیں ڈانٹ کر آپ سے الگ کیا تھا؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''بیٹا! وہ عاص بن وائل السہمی تھا۔''

عاص بن وائل السہمی، عمرو بن العاص کے والد تھے انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کے بعد کئی باران کی مدد کی اور اس سے بھی زیادہ مدد کی جو ابھی آپ پڑھ آئے ہیں۔ اس دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس سے منتشر ہو جانے کے بعد قریش نے انہیں قتل کی دھمکی دی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں بیٹھے اس دھمکی کے پورے ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: وہ اپنے گھر میں خوف زدہ بیٹھے تھے کہ عاص بن وائل السہمی آئے۔ ان کا تعلق بنو سہم سے تھا اور بنو سہم عہد جاہلیت میں ہمارے حلیف تھے۔ عاص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''کیا بات ہے؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''تمہاری قوم اسلام قبول کرنے کے جرم میں مجھے قتل کرنا چاہتی ہے۔'' بولے ''وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔'' ان کی یہ بات سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ڈھارس بندھ گئی۔ عاص جب ان سے رخصت ہو کر نکلے تو دیکھا کہ ساری وادی قریش سے پٹی پڑی ہے۔ پوچھا ''تم کہاں جا رہے ہو؟'' جواب ملا ''عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس جو بے دین ہو گیا ہے!'' انہوں نے کہا ''بے دین ہو گیا ہے تو کیا ہوا؟ میں اس کا حلیف ہوں!'' یہ سن کر مجمع منتشر ہو گیا۔

جاہلیت میں بنو سہم نے بنو عدی بن کعب کو جو پناہ دی تھی اور جس کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں، اس کو دیکھتے ہوئے اگر عاص نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حمایت کی تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ان دونوں قبیلوں میں دوستی کا آغاز اس وقت سے ہوا جب بنو عدی نے بنو عبد شمس سے مسابقت کی اور شکست کھائی۔ بنو عدی کو بنو عبد شمس نے ان کے صفاء والے گھروں سے نکال دیا اور وہ بنو سہم کی پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اس پناہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کے اسلام میں جری، قریش سے مقابلہ کرنے میں بے باک اور مسلمانوں کی حمایت و مدافعت میں حوصلہ مند بنا دیا تھا۔ اس کی وجہ سے ان کی شخصیت اور ان کی خود اعتمادی اور نمایاں ہو گئی تھی۔ چنانچہ جو بزرگ ان سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے ان میں سے کوئی اس امتیاز کو نہ پہنچ سکا اور مؤرخین نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان جلیل القدر خدمات اور غیر معمولی صفات پر استعجاب و احترام کے نذرانے ان کی خدمت

Marfat.com

میں پیش کیے۔

روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کئی بار رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا ''یا رسول اللہ! کیا ہم زندگی اور موت میں حق پر نہیں ہے؟'' سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم دنیا اور آخرت میں حق پر ہو!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ''پھر یہ چوری کیوں؟ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو معبوث فرمایا۔ ہم ضرور کھل کے سامنے آئیں گے!'' چنانچہ نبی اکرم ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کی دو صفوں میں باہر تشریف لائے۔ ایک صف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے اور دوسری صف میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ۔ ان دونوں کا پاؤں جہاں پڑتا تھا وہاں کی زمین ایسی معلوم ہوتی تھی گویا پسا ہوا آٹا ہے۔ مسلمان مسجد میں داخل ہو گئے اور قریش دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ حالانکہ مسلمانوں کی یہ بے خوفی ان سب پر گراں گزری تھی، لیکن ان کا کوئی بے وقوف یا سمجھدار آدمی ان صفوں کے قریب آنے کی جرأت نہ کر سکا، جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لے آئے تھے اس لیے ضروری تھا کہ سب کو ان کے اسلام کی خبر ہو جائے تاکہ جو بگڑنا چاہے بگڑ لے اور جو لڑنا چاہے لڑ لے۔ جو لوگ کعبے کے اردگرد ٹولیاں بنائے بیٹھے ہیں، اگر وہ مرنے مارنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کا مقابلہ کریں گے اور اس وقت تک پیچھے نہیں ہٹیں گے، جب تک ان کی قوت ہی جواب نہ دے دے۔ اس کے بعد بھی وہ قریش سے ہار نہیں مانیں گے اور جب مسلمانوں کی تعداد تین سو تک پہنچ جائے گی تو پھر ان کا مقابلہ کریں گے۔ یہاں تک کہ مسلمان قریش کو مکہ سے نکال دیں گے یا قریش مسلمانوں کو۔ پھر انہیں ابوجہل کی قوت اور مزاج کی تیزی بھی اس کے گھر کے جانے اور دروازہ کھٹکھٹا کر اسے اپنے مسلمان ہو جانے کی خبر دینے سے نہ روک سکی۔ وہ طاقتور تھے اور انہیں اپنی طاقت پر بھروسا تھا۔ وہ جوان تھے اور انہیں اپنی جوانی کا مان تھا۔ وہ جرأت رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ ان پر کوئی غلبہ نہیں پا سکتا۔ انہیں کوئی نہیں ڈرا سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے دوسرے مسلمانوں کی طرح چھپ کر کوئی کام نہ کیا بلکہ مسلمانوں کے ساتھ کعبے میں نماز پڑھنے کی قسم کھائی اور اس وقت کھائی جب مسلمان مکہ کے آس پاس کی پہاڑیوں میں چھپ چھپ کے نمازیں پڑھتے تھے۔

Marfat.com

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قسم پوری ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔ ”عمر کا اسلام ہماری فتح، ان کی ہجرت ہماری کامیابی اور ان کی امارت خدا کی رحمت تھی۔ جب تک عمر رضی اللہ عنہ اسلام نہیں لائے تھے ہم کعبے میں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے لیکن جب وہ مسلمان ہوئے تو قریش کو لڑ بھڑ کے مجبور کر دیا کہ مسلمانوں کو کعبے میں نماز پڑھنے سے نہ روکیں۔“ وہ یہ بھی فرماتے تھے ”جب سے عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا، ہم سربلند ہیں۔“ حضرت صہیب بن سنان سے ایک روایت منقول ہے کہ جب عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے، اسلام کھل کر سامنے آگیا اور اس کی دعوت علانیہ دی جانے لگی۔ ہم کعبے کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھتے اور بیت اللہ کا طواف کرتے تھے۔ زیادتی کرنے والے سے بدلہ لیتے اور دریدہ دہنی سے پیش آنے والے کو منہ توڑ جواب دیتے تھے۔“

یہ حقیقت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک اپنے اور اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے کعبے اور اس کے جہات میں نماز پڑھنے کے وہ تمام حقوق حاصل نہ کر لیے، جو اللہ کے دشمنوں کو اللہ کے گھر پر حاصل تھے۔ مشرکین مکہ کے خلاف اس جہاد میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ برابر کے شریک رہے اور اسلام کے ان دونوں شیدائیوں نے مسلمانوں کو اس ایجابی مؤقف پر پہنچا دیا جہاں مسلمان اس سے پہلے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے قریش سے ان کے ان حقوق کے لیے جنگ کی جو محض مسلمان ہونے کے جرم میں حلقہ بگوشانِ اسلام سے چھین لیے گئے تھے اور مشرکین سے دعوت اسلام کی آزادی کے لیے برسر پیکار ہوئے، جس کی راہ میں دیوار بن کر کھڑے ہونے کی اجازت کسی قرشی یا غیر قرشی کو نہیں دی جا سکتی تھی۔

اس ایجابی مؤقف نے قریش کے تمام قبائل پر اثر ڈالا۔ ان میں سے بہت سوں کے دل اسلام کے لیے بے چین تھے لیکن قریش کی دراز دستیوں کا خوف ان کے قبول اسلام میں مانع تھے۔ ان تشنگانِ بادہ حقیقت نے جب دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لے آئے ہیں اور انہوں نے اپنی طاقت و جرأت کے بل پر قریش کو اتنا مرعوب کر دیا ہے کہ بغیر کسی مزاحمت کے مسلمانوں کے ساتھ کعبے میں نماز پڑھی ہے تو وہ سب کے سب یہ سمجھ کر کہ قریش کا دست تعدی اب ان تک نہیں پہنچ سکتا، اللہ کے دین میں داخل ہو گئے۔ اس وقت قریش نے ایک دوسرے سے کہنا شروع کر دیا ”حمزہ رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قریش کے تمام قبائل میں پھیلا دیا ہے۔“

اوراس نئی صورت حال کا مقابلہ کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔

یہ خبر کہ قریش کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کرلیا ہے ہوتے ہوتے اتنی مشہور ہوئی کہ حجاز سے گزر کر حبشہ تک پہنچ گئی۔ حبشہ کے مہاجرین اسلام رضی اللہ عنہم نے جو یہ سنا تو رخت سفر باندھ اپنے وطن کی طرف چل پڑے، لیکن ابھی وہ مکہ کے قریب ہی پہنچے تھے کہ معلوم ہوا یہ خبر جھوٹی ہے۔ ہوا یہ کہ قریش نے جو یہ دیکھا کہ ان کے اکثر ہم قوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر چل کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوش ہو گئے ہیں تو بڑے فکر مند ہوئے اور ان کے تمام قبائل نے مل کر ایک عہد نامہ مرتب کیا کہ بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب سے معاشرتی تعلقات منقطع کر دیے جائیں۔ نہ انہیں بیٹی دی جائے نہ ان کی بیٹی لی جائے۔ نہ ان سے کوئی چیز خریدی جائے نہ ان کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کی جائے اور اس معاہدے پر قائم وثابت رہنے کے لیے اسے کعبے کے صحن میں لٹکا دیا۔ قریش کے اس اقدام نے طلبگارانِ اسلام کو ڈگمگا دیا اور وہ قریش کی معاندانہ روش کے ڈر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول نہ کر سکے۔ اس سے قریش اور مسلمانوں کے درمیان جنگ نے نازک صورت اختیار کر لی۔ حبشہ سے آنے والے مسلمانوں کو جب اس کی اطلاع ملی تو وہ مکہ کے باہر ہی ٹھہر گئے۔ صرف وہی لوگ مکہ میں آئے جنہیں کسی نے پناہ دے دی یا جو قریش کی آنکھ بچا کر داخل ہو گئے۔ باقی سب کے سب حبشہ واپس چلے گئے۔

قریش اور مسلمانوں کے درمیان جنگ میں دوبارہ شدت پیدا ہو گئی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی قریش کے ہاتھوں وہی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں، جو دوسری صحابہ رضی اللہ عنہم برداشت کر رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ساتھ اذیتیں جھیلتے رہے اور اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قوت ایمانی، انتظامی قابلیت اور اصابت رائے انہیں ذات رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر کرتی رہی اور نگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں ان کا اعتبار قائم ہوتا چلا گیا۔ یہ اسی قربت اور اسی اعتبار کا عظیم الشان اثر تھا جس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نام کو خدمت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم، عہد صدیقی رضی اللہ عنہ اور اسلام کی زندگی میں قوت وانصاف اور رحمت واحسان کا مجموعی نشان اور ان کے دور کو نہ صرف اسلامی سلطنت بلکہ انسانی تہذیب کی تاریخ کا سب سے بڑا دور بنا دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی غیرت وحمیت کے ساتھ اللہ کے دین میں داخل ہوئے، جس غیرت و حمیت کے ساتھ پہلے وہ اس کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اسلام قبول کرتے ہی انہوں نے کوششیں شروع کر دیں کہ قریش میں ان کے اسلام کی خبر عام ہو جائے۔ مسلمان اس وقت تک

Marfat.com

بیت اللہ میں نماز نہ پڑھ سکتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قریش سے لڑ بھڑ کے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ مسلمانوں کو کعبے میں نماز پڑھنے سے نہ روکیں۔ اسلام کی دعوت پہلے چوری چھپے دی جاتی تھی، لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایمان لے آئے تو اس کی اشاعت کھلے بندوں ہونے لگی۔ اب مسلمانوں نے کعبے میں بیٹھنا، اس کا طواف کرنا اور مشرکین مکہ کی زبان درازیوں کا جواب دینا شروع کر دیا۔ اس سے دعوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم تمام قریش میں پھیل گئی اور ان کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔ قریش اس نئی صورت حال سے گھبرا گئے اور باہمی مشورے کے بعد ان کے مختلف قبائل نے ایک عہد نامہ مرتب کر کے صحن کعبہ میں لٹکا دیا جس کی رو سے ان میں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب میں قرابت و تجارت کا کوئی رشتہ باقی نہ رہا۔ اس عہد نامے نے اس لڑائی میں اور شدت پیدا کر دی جو قریش اور مسلمانوں کے درمیان برپا تھی۔

اس جنگ میں قریش نے ہر قسم کے ہتھیار استعمال کیے۔ انہوں نے پروپیگنڈا کیا کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم جادوگر ہے اور اپنی سحر بیانی سے باپ کو بیٹے، بھائی کو بھائی، میاں کو بیوی اور رشتہ دار کو رشتہ دار سے الگ کر دیتا ہے۔" پھر نضر بن حارث کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لگا دیا۔ وہ سائے کی طرح ساتھ رہتا۔ جس مجلس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جاتے، پہنچ جاتا اور قریش کو اہل فارس اور ان کے پارینہ مذہب کی باتیں سنا کر کہتا: "خدا کی قسم! محمد صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے زیادہ خوش گفتار نہیں ہے، اس کی باتیں تو پارینہ داستانیں ہیں جو اس کی طرح، میں بھی بیان کر سکتا ہوں۔" پھر قریش نے یہ مشہور کر دیا کہ "جبر جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھاتا پڑھاتا ہے وہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم آ کر ہمارے سامنے دہرا دیتا ہے۔" جبر ایک نصرانی غلام تھا اور رسول اللہ اکثر اوقات مروہ کی ایک دُکان میں اس کے پاس جا کر بیٹھا کرتے تھے۔

اس کے بعد قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم پر شدت کے ساتھ ظلم کرنا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جدھر سے گزرتے، ابولہب کی بیوی ام جمیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رستے میں کانٹے بچھا دیتی اور امیہ بن خلف جہاں کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا فقرے کستا اور مذاق اڑاتا اور کمزور مسلمانوں کو جبر و جور کے مختلف طریقوں سے مبتلائے آزمائش کرنا تو گویا مکہ میں روزانہ کا معمول ہو گیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت نہیں کی تھی، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

Marfat.com

کے ساتھ مکہ ہی میں مقیم تھے۔ قریش کے مظالم کا بڑے صبر و تحمل کے ساتھ سامنا کر رہے تھے۔

جب ایذا رسانیوں کی انتہا ہوگئی اور قریش نے، ان سے قطع معاشرت کر لی تو خدا کے ان مظلوم بندوں نے مکہ کے باہر ایک گھاٹی میں پناہ لی۔ اور محرومی و بے چارگی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ مکہ کا کوئی آدمی ان پر ترس کھا کے جو تھوڑا بہت لے آتا وہی کھا پی لیتے اور اگر یہ سلسلہ بھی نہ ہوتا تو بھوک یقیناً انہیں زندہ نہ چھوڑتی۔ مسلمان اس گھاٹی میں مسلسل تین برسوں تک رہے۔ صرف حرمت کے مہینوں میں باہر آتے۔ رسول اللہ ﷺ اس دوران میں عرب کے مختلف قبائل کو اسلام کی دعوت دیتے اور ان میں سے کچھ لوگ جب یہ دیکھتے کہ آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اس حق پر ایمان کی راہ میں جو اللہ نے آپ ﷺ پر نازل کیا ہے ہر مصیبت اور ہر تکلیف بڑے صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کر رہے ہیں تو آپ ﷺ پر ایمان لے آتے۔

ہشام بن عمرو رضی اللہ عنہ اور زہیر بن ابی امیہ اس ظالمانہ معاہدے سے بہت دل تنگ تھے جس کی بنا پر قریش نے محمد ﷺ کا مقاطعہ کر رکھا تھا۔ کچھ اور لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر انہوں نے یہ معاہدہ کعبے کی دیوار سے نوچ پھینکا۔ قریش نے بھی ان کے اس فعل پر ناراضگی یا غصے کا اظہار نہیں کیا۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سمیت گھاٹی سے آ گئے اور مکہ اور ان قبائل میں، جو حرمت کے مہینوں میں مکہ آتے تھے، پھر اپنی دعوت و تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔

جتنی جتنی دعوت الی اللہ بڑھتی اور پھیلتی جاتی تھی، رسول اللہ ﷺ کے خلاف قریش کی جنگ میں شدت اور سنگ دلی کا اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اور دوران میں رسول اللہ ﷺ کے چچا ابو طالب اور آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا۔ اس سے قریش کے حوصلے بڑھ گئے اور ان کی ایذا رسانیوں میں اور شدت پیدا ہو گئی۔ آپ نے طائف کے قبیلہ بنی ثقیف سے مدد لینی چاہی، لیکن اس نے کورا جواب دے دیا۔ حج کے موسموں میں آپ ﷺ مختلف قبیلوں میں تشریف لے جاتے اور ان کے سامنے اسلام پیش کرتے رہے لیکن ان میں سے بھی کسی نے آپ ﷺ کی نہ سنی۔

اس کے بعد معراج کا واقعہ پیش آیا اور خود مسلمانوں کی ایک جماعت اسلام سے کٹ گئی، جو لوگ اپنے دین پر قائم رہے انہیں قریش نے اتنا ستایا کہ عاجز کر دیا، لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی دعوت کئی برس تک مسلسل جاری رہی جس کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے لوگ اسلام اور اس

Marfat.com

کے حق کے متعلق سوچنے لگے، جو اسلام کی تہوں میں لپٹا ہوا تھا۔ سب سے زیادہ متاثر اہل یثرب تھے۔ چنانچہ ان کی ایک جماعت نے اسلام قبول کر لیا اور یہ وہ جماعت تھی جس نے عقبہ کی پہلی بیعت میں حصہ لیا تھا۔ ان لوگوں کا قبولِ اسلام سب سے پہلا سبب تھا، جس نے رسول اللہ ﷺ کو مدینہ کی ہجرت کے متعلق غور وفکر کا موقع بہم پہنچایا۔

دوسرے سال مدینہ سے پچھتر مسلمان آئے...... تہتر مرد اور دو عورتیں! اور یہ وہ لوگ ہیں جو عقبہ کی دوسری یا بڑی بیعت میں شامل تھے۔ یہ بیعت اس لیے لی گئی تھی کہ مدینہ کے مسلمان رسول اللہ ﷺ کی بھی اسی طرح حمایت وحفاظت کریں گے، جس طرح وہ اپنی عورتوں اور بچوں کی حمایت وحفاظت کرتے ہیں۔ اس بیعت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ وہ مدینہ میں انصار کے پاس چلے جائیں، لیکن ایک ایک دو دو کر کے مکہ سے نکلیں تاکہ قریش مشتعل نہ ہوں۔ یہ مدینہ کی ہجرت کا نقطہ آغاز تھا۔ اسلام مکہ سے مدینہ میں منتقل ہونا شروع ہوا اور وہاں سے جزیرہ نمائے عرب کے گوشے گوشے میں پھیل گیا۔

یہ دور جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام سے شروع ہو کر مدینہ کی ہجرت کے حکم پر ختم ہوتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ اور اس کے دین کے لیے بلاشبہ انتہائی نازک دور تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس دور میں بھی اسی خلوص، اسی قوت اور اسی غیرت کا مظاہرہ کیا ہے یا نہیں، جو ہمارے نزدیک ان کی شخصیت کے اجزائے لاینفک ہیں۔ سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں اس کے متعلق کوئی تسلی بخش بات نہیں ملتی، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان واقعات میں، جو اس وقت رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم پر گزر رہے تھے، اپنی شجاعت اور طاقت وقوت کے اظہار میں کوئی منفی پہلو اختیار کیا۔ یہ حقیقت ہر شک اور ہر شبہے سے بالاتر ہے کہ مسلمانوں پر جو ظلم اس وقت ڈھائے جا رہے تھے، انہیں صبر وشکر کے ساتھ برداشت کرنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم پر امتیاز رکھتے تھے اور جب کبھی ان کے لیے ممکن ہوتا تھا وہ نبی اکرم ﷺ اور اپنے مسلمان بھائیوں کی حمایت ومدافعت میں سب سے زیادہ جرأت وہمت کا ثبوت دیتے تھے لیکن اس کے باوجود نظم پر ایمان رکھتے اور اس کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔ یہ حال ان کا زمانہ جاہلیت میں تھا۔ پھر عہد رسالت میں کیوں نہ ہوتا۔ اس وقت تو اس کی اور بھی ضرورت تھی۔ جس دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں رسول اللہ ﷺ کی

Marfat.com

سیاست یہ تھی کہ طاقت اور جبر کے استعمال سے بہ ہر قیمت پہلو تہی کی جائے۔ برائی کرنے والوں کو معاف کر دیا جائے۔ دعوت الی اللہ کا طریق ایسا اختیار کیا جائے جس میں دانائی ہو، دلنشیں نصیحت ہو اور لڑائی جھگڑے میں تمکین و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ چنانچہ اگر دشمن بھی رستے میں مل جائے تو اس سے اس طرح پیش آنا چاہیے گویا وہ تمہارا گہرا دوست ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے قریش، طائف کے ثقیف اور ان دوسرے قبائل کے ساتھ، جنہیں روشنی اور ہدایت کی طرف بلایا گیا، لیکن انہوں نے ازراہ غرور منہ پھیر لیا، اسی حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔ اس سیاست میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس قوت اور اس دلیری کے ابھرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی، جس کا مظاہرہ انہوں نے قبول اسلام کے دن کیا تھا اور جس کے بل پر مشرکین مکہ سے لڑ بھڑ کے انہوں نے کعبے میں مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کی تھی۔

ہجرت کا حکم ملنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور مکہ سے چوری چھپے نکل گئے۔ اگرچہ ایک اور روایت میں جو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے۔ اس طرح مذکور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں نہیں جانتا کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے سوا کسی مسلمان نے علانیہ مکہ سے ہجرت کی ہو۔ چنانچہ جب وہ ہجرت کرنے لگے، تلوار گلے میں ڈالی، کمان کندھے پر رکھی، تیر مٹھی میں لیے، ایک چھوٹا سا ڈنڈا، جس کے نیچے تیر کا سا پھل لگا تھا، کمر سے باندھا اور کعبے کی طرف چل پڑے۔ کعبہ اس وقت قریش سے بھرا ہوا تھا۔ پہلے انہوں نے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ کعبے کے سات طواف کیے، پھر نماز پڑھی۔ اس کے بعد قریش کی ایک ایک ٹولی کے پاس یہ کہتے ہوئے گئے: ''کالا منہ ہو تمہارا! اللہ تمہیں جیسوں کو مغلوب و ذلیل کرتا ہے، جو کوئی اپنی ماں کو ماتم کناں، اپنے بیٹے کو یتیم اور اپنی بیوی کو بیوہ بنانا چاہے وہ اس وادی کے پیچھے مجھ سے دو دو ہاتھ کر لے۔''

ابن ہشام، ابن سعد اور طبری اس روایت کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ ابن ہشام سیرت میں اور ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مسلمانوں کو ہجرت کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ تاکید بھی فرما دی کہ مکہ سے ایک ایک، دو دو کر کے نکلیں تاکہ قریش میں اشتعال نہ پیدا ہو۔ چنانچہ مسلمان آہستہ آہستہ مکہ سے نکلنے شروع ہو گئے، جن کے پاس سواریاں تھیں وہ سواریوں پر اور جن کے پاس کچھ نہ تھا وہ پیدل۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''عیاش بن ابی ربیعہ، ہشام بن

Marfat.com

العاص بن وائل اور میں نے...... جب ہم تینوں چھپ کر مکہ سے نکلنے والے تھے...... آپس میں یہ طے کیا کہ اگر ہم میں سے کوئی ایک وقت پر نہ پہنچا تو باقی دو اس کا انتظار کیے بغیر چل پڑیں گے۔ چنانچہ میں اور عیاش بن ابی ربیعہ تو نکل گئے اور ہشام بن العاص رہ گئے۔ اس کے بعد ان پر جو بیتی سو بیتی۔ میں اور عیاش چلتے رہے یہاں تک کہ قبا پہنچ گئے۔'' اسی روایت میں آگے چل کر ہے کہ عیاش اپنی ماں کو لینے مکہ آئے لیکن پکڑ لیے گئے، قریش نے انہیں قید کر لیا اور ان پر جو گزرنی تھی گزر گئی۔

کیا یہ دونوں روایتیں باہم متناقض ہیں؟ یا ان میں اس طرح مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے کہ پہلے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشرکین کو دعوت مقابلہ دی جیسا کہ اس روایت میں ہے جو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے اور بعد کو ابن ہشام اور ابن سعد کی روایت کے مطابق چپکے سے ہجرت کر گئے؟ ہمارے نزدیک زیادہ صحیح یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی کو دعوت مقابلہ نہیں دی اور وہ قریش کی آنکھ بچا کر مکہ سے نکلے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل کسی کمزوری یا بزدلی پر مبنی نہ تھا۔ اس لیے کہ وہ زندگی بھر کمزوری اور بزدلی سے نا آشنا رہے۔ بات یہ تھی کہ وہ جماعتی نظم کے علمبردار تھے۔ خود بھی اس پر چلتے تھے اور دوسروں کو بھی اس پر چلانا چاہتے تھے۔ اس وقت تمام مسلمان قریش سے چھپ چھپ کر ہجرت کر رہے تھے۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر اس نظم کے احترام میں انہوں نے بھی عام مسلمانوں کی تقلید کی اور چھپ چھپ کر ہجرت کرنے والوں کو یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمر رضی اللہ عنہ کا ایمان ان کے ایمان سے زیادہ قوی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ قبا پہنچے اور بنو عمرو بن عوف میں رفاعہ بن عبدالمنذر کے ہاں قیام فرمایا۔ بعد کو ان کے اہل و عیال بھی یہیں آ کر ٹھہرے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تشریف لائے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں تھے، جنہوں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رکاب میں مدینہ تک آئے۔ اس کے بعد مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور کاشانہ رسالت کی تعمیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کام کیا۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان سے کاشانہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں منتقل ہو گئے۔

مدینہ کی ہجرت اسلام اور مسلمانوں کی زندگی میں ایک نئے دور اور ایک نئی سیاست کی ابتدا

Marfat.com

تھی مکہ سے ہجرت کرنے والے مدینہ کے اسلام لانے والوں سے مل گئے اور اس اجتماع نے مسلمانوں کی آواز اونچی اور ان کا بول بالا کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا کہ مہاجرین رضی اللہ عنہم اور انصار رضی اللہ عنہم میں رابطہ بڑھا کر اس آواز کو اور بلند اور اس کلمے کو اور سرفراز کر دیں تا کہ مسلمانوں میں اپنی وحدت وقوت کا شعور اور پختہ ہو جائے۔ اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دینی مواخاۃ کی طرف بلایا چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ کے دینی بھائی بنے۔ اسی طرح ایک ایک مہاجر کو ایک ایک انصاری کا دینی بھائی بنا دیا گیا اور اس نئے رشتے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے وہی حیثیت حاصل ہو گئی جو خون اور نسب کے رشتے کو حاصل تھی۔ اس دینی مواخاۃ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جن کا بھائی قرار دیا گیا وہ بنو سالم بن عوف بن عمرو بن عوف الخزرجی کے بھائی حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ تھے۔ ①

اس مواخاۃ نے مدینہ میں مسلمانوں کا مرتبہ بہت بلند کر دیا۔ مدینے کے مشرکین اور یہودی ان کی قوت سے خائف ہو گئے چنانچہ یہودیوں نے بغیر کسی تکلف کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح کر لی اور مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک معاہدہ قرار پایا، جس میں رائے اور عقیدے کی آزادی، جان و مال اور مدینے کا احترام اور گناہ کی حرمت کو تسلیم کیا گیا۔ اس معاہدے نے مدینہ کے مشرکین اوس و خزرج کو کمزور کر دیا، جس طرح مسلمانوں کی قوت اور ان کے اثر و نفوذ کو بڑھا دیا۔

مدینہ کی عام زندگی میں مسلمانوں کو جو اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے وہ بہت سے راستے کھول دیئے جو مکہ میں مسدود تھے، وہ ایک صاحب نظم اور صاحب رائے انسان تھے اور نظم کی راہ میں اپنی رائے کے لیے لڑنا جانتے تھے۔ مکہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی، لیکن ان کے ایمان باللہ اور ایمان بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بچائے رکھا۔ نہ وہ مشرکین کے بہکائے میں آئے، نہ ان کی طاقت سے مرعوب ہوئے، جو کوئی انہیں اللہ کے دین سے بھٹکانا

---

① ابن سعد کی مختلف روایتوں میں سے ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ یہ رشتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ کے درمیان قائم ہوا اور تیسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن عفراء رضی اللہ عنہ کے دینی بھائی قرار دیئے گئے۔ ان کے علاوہ اور بھی روایتیں ہیں جو ابن حجر نے فتح الباری میں نقل کی ہیں لیکن سب سے مشہور اور متواتر روایت یہی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا گیا۔

Marfat.com

چاہتا تھا صرف اسی کو راہ سے ہٹاتے تھے، لیکن یہ دفاعی اور سلبی موقف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طبیعت سے میل نہ کھاتا تھا۔ ان کی طبیعت نہ صرف جوشیلی اور قوی تھی بلکہ وہ دشمن پر آگے بڑھ کر حملہ کرنے کے عادی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ میں ان کے حوصلوں کی نمود کے لیے کوئی میدان نہ تھا۔

لیکن مدینہ کی زندگی اور اس کے نظام میں مسلمانوں کو جو اثر و رسوخ قائم ہو گیا تھا، اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے اپنی شخصیت کو نمایاں اور عام زندگی پر اپنے نقوش مرتسم کرنے کا موقع بہم پہنچا دیا تھا۔

......☆......☆......

Marfat.com

باب 3:

موافقاتِ عمر رضی اللہ عنہ

مدینہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کچھ ایسی صلاحیتیں بھی ظاہر ہوئیں جو مکہ میں ظاہر نہ ہوئی تھیں، مثلاً یہ معلوم ہوا کہ وہ الہامی شخصیت کے مالک ہیں، جو کچھ سوچتے ہیں کم وبیش وہی ہو جاتا ہے۔ مدینہ کی ابتدائی زندگی میں مسلمان نماز کے لیے خود بخود جمع ہو جاتے تھے۔ اعلان کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی فکر تھی۔ پہلے خیال آیا، بگل کو ذریعہ اعلان بنایا جائے، لیکن یہ یہودیوں کا طریقہ تھا اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہ فرمایا اور حکم دیا کہ عیسائیوں کی طرح ناقوس بجا کر نماز کا اعلان کیا جائے۔ چنانچہ ناقوس تیار ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ وہ کل صبح آئیں تو اس کے لیے دو لکڑیاں خرید لائیں۔ رات کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں سو رہے تھے کہ آپ نے خواب میں کسی کو کہتے سنا، ناقوس نہ بناؤ نماز کے لیے اذان دو!'' صبح آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ خواب سنانے حاضر ہوئے لیکن رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اس کے متعلق پہلے ہی وحی نازل ہو چکی تھی۔

روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور کہا: ''یا رسول اللہ! آج رات میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک سبز پوش ہاتھ میں ناقوس لیے میرے پاس آیا۔ میں نے اس سے کہا ''اے اللہ کے بندے! یہ ناقوس بیچے گا؟'' بولا ''تم اس کا کیا کرو گے؟'' میں نے جواب دیا ''نماز کا اعلان کریں گے!'' اس نے کہا ''اور اگر میں اس سے بھی اچھی ترکیب بتا دوں، یہ کہہ کر عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اذان سنائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کا حکم دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت گھر میں تھے آواز سن کر تیز تیز قدم اٹھاتے خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''اے اللہ کے نبی! قسم ہے اس ذات کی! جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ میں نے بھی یہی خواب دیکھا تھا۔''

Marfat.com

اس دن سے نماز کے لیے اذان دی جانے لگی اور مدینہ کی فضائیں دن میں پانچ مرتبہ تقدیس ورحمت کی خوشبوؤں سے معطر ہونے لگیں۔ یہ گویا قاطع دلیل تھی اس بات کی کہ مسلمانوں کا بول بالا ہو گیا ہے اور نماز کے لیے اذان کا دیا جانا دراصل مسلمانوں کا اس نظام کی طرف بلایا جانا تھا، جو ان کی ایمانی قوتوں کو اور نکھارتا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ اذان کے لیے وحی نازل ہو، اس کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں القا کیا جانا اس کا بین ثبوت ہے کہ دین حق اس مرد توانا کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں پیوست ہو چکا تھا اور اس نظام کے سوا جو اسلام کی سربلندی اور اشاعت میں اضافے کا سبب تھا، کسی اور چیز کے متعلق کچھ سوچتا ہی نہ تھا۔

مدینہ کے یہودی اور وہ مشرکین جو ابھی تک اپنے سابقہ عقائد پر قائم تھے، مسلمانوں کے اقتدار اور ان کی قوت سے دل تنگ تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور ان کی مخالفت پر اتر آئے۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے بھی ایسے طریقے اختیار کیے جو شدت اور سختی سے خالی نہ تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس موقع پر بھی کسی مسلمان سے پیچھے نہ رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں اور منافقوں کو ڈرانا اور قریش کو یہ بتانا چاہا کہ اگر وہ آزادی اشاعت اسلام کی شرط پر مسلمانوں سے صلح کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہوگا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اوقات میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، حضرت عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں مختلف دستے بھیجے۔ ان کے علاوہ کچھ دستے ایسے بھی تھے جن کی امارت کے فرائض رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس انجام دیئے۔ سیرت اور تاریخ کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابتدائی فوجی دستوں میں شرکت نہیں فرمائی۔ شاید اس لیے کہ حق کی پاکیزگی کے ساتھ جو سیاسی سوجھ بوجھ ان میں تھی۔ اس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینہ ہی میں رکھنا بہتر تصور فرمایا۔ اس کی شہادت اس واقعے سے بھی ملتی ہے جب نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث مباحثہ کرنے آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اور یہودیوں کے جھگڑے کا رد اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے کیا:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ . (آل عمران:63)

Marfat.com

ترجمہ: ''کہو اے اہل کتاب! آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے (اور وہ) یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے (اس دعوت کو قبول کرنے سے) اگر وہ منہ موڑیں تو (صاف) کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم مسلم ہیں۔''

اس کے بعد وفد سے فرمایا کہ یا تو ان آیات کو قبول کرلو۔ ورنہ تم جانو اور تمہارا کام! عیسائیوں نے بغیر کسی فیصلے کے واپس جانا مناسب نہ سمجھا لیکن آپ کی انصاف پسندی دیکھ کر استدعا کی کہ ایک ایسا شخص ہمارے ساتھ کر دیا جائے جو نزاعی امور میں محاکے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''شام کو آنا! میں تمہارے ہمراہ ایک ایسے شخص کو بھیج دوں گا جو قوی بھی ہوگا اور امین بھی۔'' ابن ہشام کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: میں نے امارت کی کبھی اتنی تمنا نہیں کی جتنی اس دن۔ مجھے امید تھی کہ یہ منصب میرے حصے میں آئے گا۔ چنانچہ ظہر کی نماز کے وقت میں بلند آواز سے باتیں کرتا ہوا مسجد میں پہنچا۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی اور سلام پھیرنے کے بعد دائیں بائیں دیکھا۔ میں اونچا ہو ہو کر اپنے تئیں نمایاں کر رہا تھا کہ حضور ﷺ مجھے دیکھ لیں۔ لیکن نگاہ رسالت ﷺ ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ پر جا کے رکی، آپ نے انہیں اپنے قریب بلا کر فرمایا: ''ان کے ساتھ جاؤ اور اختلافی امور میں حق کے ساتھ ان کا فیصلہ کرو۔'' اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ ان عیسائیوں کے ہمراہ بھیج دیئے گئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ثالث بنا کر بھیجے جانے کی تمنا اس لیے اور بھی کی تھی کہ جاہلیت میں وہ اور ان کے بزرگ قبائل قریش کی سفارت اور فیصلہ منافرہ کے فرائض انجام دیا کرتے تھے لیکن اس کے باوجود قلب رسالت ﷺ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے جگہ تھی، رسول اکرم ﷺ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو ثالث بنا کر بھیجا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور ﷺ، ابن خطاب رضی اللہ عنہ کو مدینہ ہی میں رکھنا چاہتے تھے تاکہ ان کی جرأت، ان کے خلوص اور ان کی اصابت رائے سے فائدہ اٹھایا جاتا رہے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ آنحضرت ﷺ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شدت اور درشت مزاجی سے واقف تھے، اس لیے آپ ﷺ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کا انتخاب فرمایا کہ وہ امانت کے ساتھ گداز قلب اور رضائے نفس کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔

قریش نے اس وعدے پر عمل نہیں کیا جو رسول اللہ ﷺ نے اشاعت اسلام کی آزادی کے

Marfat.com

لیے ان سے چاہا تھا بلکہ اسلام اور مسلمانوں سے برابر دشمنی کرتے رہے۔ آخر کار رسول اللہ ﷺ تین سو مسلمانوں کے ساتھ بدر تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ مکے سے آنے والوں کی تعداد ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا کہ مقابلہ کریں یا مدینے واپس جائیں؟ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی انہی لوگوں میں تھے جنہوں نے جنگ کے حق میں رائے دی اور جب لڑائی شروع ہوئی، معرکہ کارزار گرم ہوا تو مسلمانوں کا پہلا شہید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غلام مہجع تھا۔ لڑائی کے دوران میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام کو قتل کر دیا۔ ایک روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ سے ملے اور کہا: ''میں دیکھتا ہوں تمہارے دل میں میری طرف سے کوئی بات ہے۔ شاید تم مجھے اپنے باپ کا قاتل سمجھتے ہو۔ اگر میں انہیں قتل کرتا تو کبھی تم سے معذرت نہ کرتا لیکن میں نے تو اپنے ماموں عاص بن ہشام بن المغیرہ کو قتل کیا ہے۔ تمہارے والد کے پاس سے میں گزرا ضرور تھا۔ وہ بیل کے سینگ ٹٹول رہے تھے۔ میں تو ہٹ گیا لیکن ان کے چچا زاد بھائی علی رضی اللہ عنہ نے ان کو دیکھا اور قتل کر دیا۔''

اس جنگ کے متعلق جس نے اسلام ہی کی نہیں بلکہ تمام دنیا کی تاریخ کو ایک نئی راہ پر ڈال دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خود ان کی زبانی یہ پہلا قول ہے جو نقل کیا گیا ہے۔ ان سے اس اثر کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے جو اسلام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل پر قائم کیا تھا اور جس کا تقاضا یہ تھا کہ اس دین کی راہ میں انسان کو اپنا سب کچھ بے حقیقت سمجھنا چاہیے۔ یہاں تک کہ اگر جنگ میں اس کا بھائی یا کوئی اور رشتہ دار سامنے آجائے تو اسے قتل کرنے میں بھی تامل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اس لیے کہ اس نے اپنی زندگی راہ خدا میں وقف کر دی ہے اور دین الٰہی کی نصرت کے سوا کوئی اس کا محبوب و مطلوب نہیں۔

مسلمانوں نے اس جنگ میں دشمن کے ستر آدمی گرفتار کیے جن میں بیشتر قریش کے سردار اور اعیان و اکابر تھے۔ ان قیدیوں کے متعلق مسلمانوں میں سب سے زیادہ مخالفانہ روش حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تھی۔ وہ ان سب کو قتل کر دینا چاہتے تھے لیکن قیدیوں کو اپنی زندگی عزیز تھی اور وہ چاہتے تھے کہ فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ یہ لوگ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے ان کی سفارش کریں۔ انہوں نے سفارش کا وعدہ تو کر لیا لیکن انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کام خراب نہ کر دیں۔ اس خیال سے قیدیوں کو ان کے پاس بھیج دیا۔ قیدی پہنچے اور

Marfat.com

ان سے بھی وہی کہا جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جواب ایک قہر آلود نگاہ تھی اور بس! حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کیا کہ ان قیدیوں پر احسان کیا جائے یا فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے۔ فدیے کی رقم سے مسلمانوں کو قوت بھی پہنچے گی۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ اپنی آخری حد کو پہنچا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! یہ اللہ کے دشمن ہیں۔ انہوں نے آپ کو جھٹلایا۔ آپ سے لڑے اور آپ کو مکہ سے نکال دیا۔ ان کی گردنیں مار دیجئے! یہ گمراہی کے سردار اور کفر کے امام ہیں۔ ان کے قتل سے اسلام کو سر بلندی حاصل ہوگی اور اہل شرک ذلیل ہو جائیں گے۔''

اس مسئلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے مشورہ کیا اور بات فدیہ قبول کر لینے پر ختم ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیہ لے کر قیدیوں کو آزاد کر دیا لیکن اس کے فوراً بعد وحی آئی جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ . (الانفال:67)

ترجمہ: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مناسب نہ تھا کہ ان کے پاس قیدی رہیں جب تک ملک میں خوب قتل نہ کریں۔ تم لوگ تو دنیا کی متاع چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔''

اس طرح اسیران بدر کے سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے نے الہامی شخصیت ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا جیسا کہ اس سے پہلے اذان کے مسئلے میں بھی ظاہر ہو چکا تھا اس سے نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم اور مسلمانوں کی نگاہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حیثیت بلند اور ان کی رائے وقیع ہو گئی۔

مکرز بن حفص نے سہیل بن عمرو کا فدیہ ادا کرنا چاہا۔ سہیل بڑا ابلغ البیان خطیب تھا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مکرز کو سہیل کا فدیہ ادا کرتے دیکھا۔ فوراً رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''اجازت دیجئے کہ میں سہیل بن عمرو کی بتیسی نکال دوں۔ یہ پوپلا ہو جائے گا اور میدان جنگ میں آپ کے سامنے کھڑا نہ ہو سکے گا۔'' ارشاد ہوا: ''میں اس کے ساتھ کوئی ایسا برا سلوک نہیں کرنا چاہتا جو میرے نبی ہونے کے باوجود کل میرے ساتھ؟؟؟ اللہ کرے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا ان کے اس اصرار پر صریحی دلالت کرتا ہے کہ ان قیدیوں میں جو

Marfat.com

صاحب اقتدار ہیں انہیں نہ چھوڑا جائے۔ تاکہ کل وہ مسلمانوں کے مقابلے پر نہ آسکیں اور وہ اپنی اس رائے پر اس وقت بھی مصر تھے، جبکہ مسلمانوں کی جماعت فدیہ وصول کر لینے کے حق میں اپنی رائے دے چکی تھی۔

وحی نازل ہوئی اور اس نے اسیرانِ بدر کے سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی تصدیق کر دی۔ اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اور تقرب اور اعتبار حاصل ہو گیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیر خاص بن گئے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بنت عمر رضی اللہ عنہ خنیس بن حذافہ کی بیوی تھیں جو سابقون اولون میں سے تھے۔ واقعہ بدر سے چند مہینے پہلے خنیس نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو چھوڑ دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کر لیا۔ جس طرح اس سے پہلے حضرتؓ عائشہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے کیا تھا۔ اب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان رشتہ مصاہرت قائم ہو گیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی کاشانہ رسالت میں آنے جانے لگے۔

سال گزر گیا اور قریش بدر کا انتقام لینے مکہ سے نکلے۔ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مشورے کے طور پر عرض کیا کہ مدینہ کے باہر احد کے مقام پر ان کا مقابلہ کیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے۔ پہلے ان دونوں نے فرق نبوت صلی اللہ علیہ وسلم پر عمامہ باندھا۔ پھر آپ کو زرہ پہنائی۔ اس کے بعد سرورِ کونین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تلوار زیب گلو فرمائی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے حلقے میں دشمن سے مقابلہ کرنے روانہ ہو گئے۔ دن کے ابتدائی حصے میں میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا لیکن اس کے بعد جب تیر اندازوں نے فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی خلاف ورزی کی اور مال غنیمت کے لالچ میں پہاڑ کا مورچہ چھوڑ کے نیچے آگئے تو لڑائی کا رخ بدل گیا۔ خالد بن ولید قریش کے چند گھڑ سواروں کے ساتھ چکر کھا کے مسلمانوں کی پشت پر پہنچ گئے اور زور سے نعرہ لگایا۔ یہ دیکھ کر قریش پلٹے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم پر جو مال غنیمت لوٹنے میں مصروف تھے ٹوٹ پڑے۔ مسلمان قریش کے اس ناگہانی حملے سے گھبرا گئے اور ان کی صفیں درہم برہم ہو گئیں، یہ انتشار اور بڑھ گیا جب ایک مشرک نے چلا کر کہا "محمد قتل کر دیئے گئے۔" یہ سنتے ہی مسلمانوں کے اوسان جاتے رہے۔ انہوں نے سوچا کہ اب ان کی اور ان کے اس دین کی خیر نہیں جس پر وہ ایمان لائے تھے۔ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نصرت کا وعدہ فرمایا تھا لیکن اب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی شہید کر دیئے گئے اور

Marfat.com

آپ ہی کے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں جو شکست کھا رہے ہیں اور مشرکین کی تلواریں ان کے خون میں نہا رہی ہیں۔ پھر یہ دین کیسے بچ سکتا ہے اور اس دین کے بعد اس کے حلقہ بگوشوں کی بقا کیا معنی رکھتی ہے؟ اس خیال نے مسلمانوں میں ایک عام بد دلی پیدا کر دی بلکہ بعض ممتاز صحابہ رضی اللہ عنہم پر تو...... جن میں مہاجرین اور انصار دونوں شامل تھے...... اتنی مایوسی چھائی کہ وہ تلواریں پھینک پھینک کے پہاڑ کے ایک طرف جا بیٹھے انس بن نضر رضی اللہ عنہ ادھر سے گزرے تو دیکھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب، حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ اور کچھ دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم بیٹھے ہیں۔ مایوسی و پریشانی ان سب پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کریں۔ انس رضی اللہ عنہ نے بلند آواز سے پوچھا۔ ''یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟'' یہ لوگ بولے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید کر دیئے گئے!'' شمع رسالت کے اس پروانے نے جواب میں کہا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تم زندہ رہ کے کیا کرو گے؟ اٹھو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح حق کی راہ میں جان دے دو!'' یہ کہہ کر مشرکین پر ٹوٹ پڑے اور بڑی بے جگری سے لڑے اور یہاں تک کہ ستر زخم کھانے کے بعد جام شہادت نوش کیا۔ ان کی لاش کثرت زخم کے سبب پہچانی نہ جاتی تھی۔ ان کی ہمشیرہ نے انگلیوں کی پوروں سے انہیں پہچانا۔

مسلمانوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر جھوٹی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم زینت افزائے عالم ہستی ہیں تو ان کے دلوں میں ایمان کی شمع پھر روشن ہو گئی اور اس یقین نے دوبارہ ان میں زندگی پیدا کر دی کہ اللہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حامی و ناصر ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے دوڑے۔ خالد بن ولید کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ قریش کے گھڑ سواروں کو لے کر پہاڑ پر چڑھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے فدائیوں کو شہید کر دیں لیکن حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے چند مسلمانوں کے ساتھ خالد اور ان کے سپاہیوں کا مقابلہ کیا اور نبی رحمت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی مدافعت میں اس طرح جان توڑ کر لڑے کہ انہیں پسپا کر دیا اور خالد اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اذان کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا الہامی واقعہ پہلے گزر چکا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دین حق اس مرد توانا کی روح میں رچ گیا تھا اور وہ جب بھی سوچتا تھا اس دین یا اس نظام کے متعلق ہی سوچتا تھا جو اس کی اشاعت و سربلندی میں اضافے کا موجب تھا۔ پھر اسیرانِ بدر کے سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا موقف اور ان کی رائے کی تائید میں وحی کا نزول اور اس کے بعد خالد

Marfat.com

بن ولید کے مقابلے میں ان کا آنا کہ وہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ تک نہ پہنچ سکیں۔ یہ دونوں واقعات اس امر کا کھلا ثبوت ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اللہ کے دین کو اپنی ذات پر مقدم سمجھتے تھے اور اسی لیے وہ اس کی حمایت ونصرت میں ہر جگہ انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب سے ہوش سنبھالا ان کے کردار کی یہ اہم خصوصیت رہی کہ جس چیز پر ایمان لاتے، دل سے لاتے اور جب دل کسی چیز پر ایمان لاتا ہے تو صاحب ایمان پورے خلوص اور پوری وفاداری کے ساتھ اپنی جان اس چیز کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ ہم نے جاہلیت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس کردار کا مطالعہ کیا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ قریش کے لیے دوسرے قبائل سے بلا کا تعصب رکھتے تھے اور دعوت محمدی ﷺ کے مقابلے میں قریش کے دین سے انہیں اس قیامت کا غلو تھا کہ وہ ابتدائی مسلمانوں کو جور وستم کا نشانہ بنانے والوں کے ساتھ برابر کے شریک تھے، لیکن جب اللہ نے ان کے دل کو اپنے ایمان کے نور سے روشن کیا تو وہ اس کے دین کی نصرت کے لیے بھی اسی حمیت اور اسی غیرت کے ساتھ کوشش کرنے لگے جو قبول اسلام سے پہلے اسلام کے خلاف صرف کیا کرتے تھے اور اب جب کہ مسلمان اپنے دین اور اپنے نبی ﷺ کی برکت سے مفتخر ہو چکے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس سے زیادہ اہم کوئی چیز نہ تھی کہ وہ اس دین کی خدمت کریں اور اس کے لیے اپنا سب کچھ یہاں تک کہ اس کی راہ میں اپنی جان بھی قربان کر دیں۔ جب قریش میں رسول اللہ ﷺ کی وفات کی افواہ پھیلی اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر بھی مایوسی و بے دلی کے بادل چھائے تو یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسی مذہبی تعصب کا اثر تھا کہ وہ شدت غم سے اپنا ذہنی توازن قائم نہ رکھ سکے لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ سرور کونین علیہ التحیۃ والتسلیم زینت آرائے بزم حیات ہیں تو بڑھے اور اس دین کی راہ میں اپنی جان کی بازی لگا دی، جس پر ان کا دل ایمان لایا تھا اور اللہ نے اس غیر معمولی سپہ سالار کے مقابلے میں انہیں کامیاب بنایا جو قریش کے لیے سرمایہ عزت وافتخار تھا اور جس کی وجہ سے احد کا میدان قریش کے ہاتھ رہا۔

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ایمان اور اس ایمان کے لیے ان کے تعصب نے انہیں پیش گاہ نبوت میں بھی عزت نفس اور خود اعتمادی کے اظہار سے نہیں روکا۔ اپنی رائے پر انہیں اس قدر اعتماد تھا اور اس کی تائید میں وہ ایسی زبردست دلیلیں پیش کرتے تھے کہ اس خصوصیت میں کوئی مسلمان ان کی برابری نہ کرسکتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس زمانے کے مسلمان جمود و بے عملی سے نا آشنا

تھے۔ان میں جو صاحب رائے ہوتا تھا وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بے جھجک مشورہ پیش کر دیتا تھا اور اپنی رائے منوانے یا مخالف رائے قبول کرنے میں بحث و استدلال کو اپنا جائز حق سمجھتا تھا۔اس معاملے میں اس کی مثال ان مسلمانوں کی سی تھی جو شورش و بغاوت کے زمانوں میں چاہتے تھے کہ شورش و بغاوت کو اس کے اصول و مبادی کے آخری نقطے تک پہنچا دیں لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاف گوئی اور جرأت ان سب سے بڑھی ہوئی تھی۔ ہر چند انہیں رسول اللہ ﷺ سے بے انتہا محبت تھی اور وہ حضور ﷺ کی رسالت پر قابل رشک ایمان بھی رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود خدمت نبوی میں اپنی رائے کے اثبات و اصرار میں انہیں کوئی تکلف نہ ہوتا تھا۔اسیرانِ بدر کے موقع پر آپ دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کس طرح سہیل بن عمرو کی بتیسی نکالنے کی اجازت طلب کی تھی حالانکہ مسلمان ان قیدیوں کا فدیہ قبول کر چکے تھے اور آگے چل کر بھی ہم عہد رسالت ﷺ اور عہد صدیقی رضی اللہ عنہ میں ان کی یہی شان دیکھیں گے۔اس کے علاوہ سرکار دو عالم ﷺ کی حیات طیبہ میں ان کے وہ اجتہادات ہماری نگاہ سے گزرے ہیں جن میں سے بعض کو قرآن نے شرف قبول عطا فرمایا ہے، جس طرح وہ بہت سے احکام و مبادی ہمارے پیش نظر ہیں جن میں رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجتہاد رائے سے کام لیا اور وہ آج تک مسلمانانِ عالم کا مرکز تقلید بنے ہوئے ہیں۔

جب رسول اللہ ﷺ بنو مصطلق سے جنگ فرمانے تشریف لے گئے اور اس سے فراغت پائی تو دو مسلمانوں کا پانی پر جھگڑا ہو گیا اور وہ آپس میں مرنے مارنے پر تل گئے۔ان میں سے ایک مہاجر تھا اور دوسرا انصاری۔مہاجر نے مہاجرین کو مدد کے لیے پکارا اور انصاری نے انصار کو! اس وقت عبداللہ بن ابی بن سلول نے جو مدینہ کے منافقوں کا سردار تھا حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا: "ہمارے شہر میں مہاجروں کی اکثریت ہو گئی۔ واللہ! ہمارا اور ان کا معاملہ ایسا ہی ہے جس کے متعلق اوّل نے کہا ہے:" "اپنے کتے کو موٹا کرو گے تو وہ تمہاری ہی ہڈیاں چبائے گا!" بخدا! جب ہم مدینہ واپس ہوں گے تو با اقتدار گروہ ذلیلوں کو ضرور نکال باہر کرے گا۔" یہ بات حضور ﷺ کے سمع مبارک تک پہنچی۔حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ اس وقت حاضر خدمت تھے، وہ غصے سے بے آپے ہو گئے اور کہا: "یارسول اللہ! عباد بن بشر رضی اللہ عنہ کو حکم دیجیے کہ وہ اس کی گردن اڑا دے!" جواب میں لسان نبوت ﷺ نے فرمایا: "عمر! اس وقت کیا ہو گا جب لوگ کہیں گے، محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو قتل کرا رہا ہے۔" اور فوراً روانگی کا حکم دیا حالانکہ ایسے وقت مسلمان سفر نہیں

Marfat.com

کیا کرتے تھے۔

ابن ابی خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر اپنی بات سے مکر گیا لیکن وحی نے بات صاف کر دی۔ اس وقت عبداللہ بن عبداللہ بن ابی، جو راسخ الاعتقاد مسلمان تھے حاضر ہوئے اور عرض کیا ''یا رسول اللہ! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ عبداللہ بن اُبی کو قتل کرانا چاہتے ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو مجھے حکم فرمایئے میں خدمت اقدس میں اس کا سر پیش کر دوں گا۔ واللہ! تمام اہل خزرج جانتے ہیں کہ ان میں مجھ سے زیادہ اپنے باپ کا کوئی فرمانبردار نہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر آپ نے میرے سوا کسی اور کو قتل کرنے کا حکم دیا تو میں اپنے باپ کے قاتل کو لوگوں میں چلتا پھرتا نہ دیکھ سکوں گا۔ اسے قتل کر دوں گا اور چونکہ کافر کے بدلے مسلمان کو قتل کروں گا اس لیے مجھے جہنم کی آگ میں جلنا پڑے گا۔'' رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہم اسے قتل نہیں کریں گے بلکہ جب تک وہ ہمارے ساتھ ہے، اس سے رفق و احسان کے ساتھ پیش آئیں گے!'' اس کے بعد اہل مدینہ ہمیشہ ابن ابی کو حقارت و غضب کی نظروں سے دیکھتے رہے اور وہ بے حیثیت ہو کر رہ گیا۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مسلمانوں کے بارے میں گفتگو فرما رہے تھے، ہوتے ہوتے بات ابن ابی تک پہنچ گئی کہ اس کی قوم اس کے ساتھ حقارت آمیز برتاؤ کرنے لگی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ''کیوں عمر! کیا خیال ہے؟ اگر میں عبداللہ بن ابی کو اس دن قتل کرا دیتا جس دن تم نے مجھ سے کہا تھا تو اللہ کی قسم! ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا! لیکن آج تم اسے قتل کرنے کے لیے کہتے تو تمہاری بات ضرور مان لیتا!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ''اللہ کی قسم! مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد میری بات سے زیادہ بابرکت ہے!''

جب عبداللہ بن ابی مرا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھانی چاہی، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور اسلام سے اس کے بغض اور اس بغض میں اس کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا یہ قول نقل کیا:

اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ. (التوبہ:80)

ترجمہ: ''(اے رسول ﷺ) ان کے لیے مغفرت چاہو یا نہ چاہو (برابر ہے) اگر تم ستر بار بھی ان کے لیے مغفرت چاہو گے تو بھی اللہ انہیں نہیں بخشے گا۔''

نبی رحمت ﷺ نے اس مرے ہوئے شخص سے متعلق ان کی جرأت تنقید پر مسکرا کر فرمایا

Marfat.com

''اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ ستر بار سے زیادہ مغفرت چاہنے پر اس کی بخشش ہو جائے گی تو میں اس سے زیادہ اس کے لیے مغفرت چاہوں گا۔'' اس کے بعد نماز جنازہ پڑھائی اور اس کی میت کے ساتھ تشریف لے گئے، یہاں تک کہ اس کے دفن سے فارغ ہو گئے۔ اس کے بعد یہ وحی نازل ہوئی:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۔(التوبہ:83)

ترجمہ: ''ان میں سے (اگر) کوئی مر جائے تو کبھی اس کی نماز جنازہ نہ پڑھو اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہو۔''

ہجرت کے چھٹے سال رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو حج کا حکم دیا اور جب مکہ کے قریب پہنچے تو قریش کے سوار آپ ﷺ کو شہر میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے نکلے۔ قریش نے قسم کھائی تھی کہ وہ محمد ﷺ کو زبردستی مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ جنگ کے ارادے سے نہیں حج کے ارادے سے تشریف لائے تھے۔ اس لیے آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر قیام فرمایا اور قریش سے گفتگو کرنی چاہی کہ وہ مسلمانوں کو فریضۂ حج کی ادائیگی اور کعبے کے طواف سے نہ روکیں۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ وہ مکہ جائیں اور اس مسئلے میں قریش سے گفتگو کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ''یا رسول اللہ! مجھے اندازہ ہے کہ قریش میرے ساتھ زیادتی کریں گے اور مکہ میں بنو عدی بن کعب کا کوئی فرد نہیں جو میری حمایت کرے۔ مشرکین جانتے ہیں کہ میں ان کا کتنا دشمن ہوں۔ میرا طرزِ عمل ان کے مقابلے میں کتنا سخت ہے۔ تاہم میں آپ کو ایک ایسے شخص کا نام بتاتا ہوں جو قریش کے نزدیک مجھ سے بھی زیادہ معزز ہے اور وہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں!'' چنانچہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ مکہ تشریف لے گئے جہاں قریش سے ان کی گفتگو خاصی طویل ہو گئی اور انہیں رکنا پڑا۔ مسلمان سمجھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے اس پر رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے بیعت لی جو بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے کہ اگر مشرکین قریش نے عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا تو مسلمان ان سے لڑیں گے لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ واپس تشریف لے آئے اور بتایا کہ قریش عرب میں اپنا وقار رکھنے کے لیے مسلمانوں کو اس سال مکہ میں داخل ہونے دینا نہیں چاہتے لیکن یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ حضور ﷺ جنگ کے ارادے سے نہیں حج کی نیت سے تشریف لائے ہیں۔ وہ صلح کی بات چیت کرنے پر تیار ہو گئے ہیں۔ فریقین میں معاہدہ صلح کے

Marfat.com

متعلق گفتگو جاری رہی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان شرطوں سے بہت پریشان اور دل تنگ تھے جو اس گفتگو میں رسول اللہ ﷺ قبول فرما رہے تھے۔ چنانچہ وہ ایک دم اُٹھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ کر ان سے کہنے لگے "ابوبکر! کیا حضور ﷺ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "کیوں نہیں!" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا "کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "کیوں نہیں!" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا "کیا وہ مشرک نہیں ہیں؟" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہیں!" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "تو پھر ہم اپنے دین میں کمزوری کو دخل کیوں دے رہے ہیں؟" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "عمر! حضور ﷺ کی اطاعت کرو! میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ﷺ ہیں!" اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا "اور میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس گفتگو سے مطمئن نہیں ہوئے جو ان کے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے درمیان ہوئی تھی...... چنانچہ اسی غم اور غصے کے عالم میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "یارسول اللہ! کیا آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟" حضور نے فرمایا "ہوں!" کہا "کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟" فرمایا "ہیں!" کہا "کیا وہ مشرک نہیں ہیں؟" فرمایا "ہاں ہیں!" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا "تو پھر ہم اپنے دین میں کمزوری کو دخل کیوں دے رہے ہیں؟" رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "میں اللہ کا بندہ اور اس کا نبی ہوں، ہرگز اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا اور وہ کبھی مجھے ناکام نہیں ہونے دے گا۔" اس جواب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے۔ بعد کو وہ فرمایا کرتے تھے۔ "اس دن میں نے جو کچھ کیا اور اپنے نزدیک بھلائی کے لیے جو باتیں کہیں ان کے ڈر سے آج تک صدقہ دیتا ہوں، روزے رکھتا ہوں، نفل پڑھتا ہوں اور غلام آزاد کرتا ہوں۔"

دیکھی آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ عزت نفس اور خود اعتمادی اور سچ تو یہ ہے کہ انہیں اپنی رائے کو وقیع سمجھنا ہی چاہیے تھا۔ اسیرانِ بدر کے معاملے میں وحی الٰہی نے ان کے موقف کی حمایت کی تھی۔ پھر جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عبداللہ بن ابی کے قتل کا مشورہ پیش کیا تھا تو اس یقین سے پہلے کہ ارشاد نبوی ﷺ ان کی بات سے زیادہ بابرکت ہے، وہ اپنی رائے سے نہیں ہٹے تھے اور اس کے بعد صلح حدیبیہ کے سلسلے میں بھی انہیں برابر اپنی رائے پر اصرار رہا تھا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی تائید میں وحی نازل ہوئی اور اس نے معاہدے کو

مبین" سے تعبیر کیا۔ اس طرح رائے کے معاملے میں وہ ذات رسالت ﷺ سے بھی اختلاف کرتے تھے اور جب تک وحی کا نزول یا ان کی رائے کے موافق یا مخالف واقعے کا ظہور حق کو ان پر واضح نہ کر دیتا، وہ اپنی رائے پر جمے رہتے۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی فکر کو مجرد نظریات میں الجھانا پسند نہیں فرماتے تھے کہ انہیں الٹ پلٹ کر ان کی چھان بین کر کے ان سے منطقی نتائج مرتب کرتے رہیں بلکہ جاہلیت کی طرح زمانہ اسلام میں بھی ان کی توجہ انہیں مسائل پر مرکوز رہی جن کا پیش نظر زندگی کے واقعات پر کوئی عملی اثر ہو اور یہی عملی اثر تھا جس نے اسیران بدر، ابن ابی اور صلح حدیبیہ کے معاملات میں انہیں اپنی رائے پر شدت کے ساتھ قائم رکھا جس طرح اس کے بعد بھی مسلمانوں کے عام اور رسول اللہ ﷺ کے خاص معاملات میں...... جن سے متعلق وحی نازل نہیں ہوئی تھی...... ان کی رائے میں استقامت اور جوش پیدا کرتا رہا۔

اہل مکہ کو نبیذ کا بے حد شوق تھا۔ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ جاہلیت کے زمانے میں شراب پیتے تھے اور دوسرے مسلمان بھی مکہ کے دوران قیام اور مدینہ کی ہجرت کے چند سال بعد تک مے نوشی کرتے رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ شراب لوگوں میں ہیجان وغضب پیدا کرتی ہے۔ اسے پی کر شرابی ایک دوسرے کی بدگوئی کرتے اور آپس میں بدکلامی سے پیش آتے ہیں، پھر یہودی اور منافقین، اوس وخزرج کو بھڑکانے، ان کے پرانے جھگڑوں کو ہوا دینے کے لیے اکثر و بیشتر شراب نوشی کے اوقات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، لیکن اس وقت تک شراب کے بارے میں وحی نازل نہ ہوئی تھی۔ اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا "اے اللہ! ہمیں شراب کے متعلق کچھ بتا!" چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا. (البقرہ:219)

ترجمہ: "(اے پیغمبر ﷺ) مسلمان تم سے پوچھتے ہیں۔ شراب پینا اور جوا کھیلنا کیسا ہے؟ کہہ دو ان دونوں چیزوں میں بڑا نقصان ہے اور لوگوں کے کچھ فائدے بھی ہیں مگر ان کا نقصان فائدے سے بڑھ کر ہے۔"

چونکہ اس آیت میں شراب کی ممانعت نہیں تھی، اس لیے بعض مسلمانوں کی راتیں اب بھی

بادۂ جام میں بسر ہوتی تھیں، وہ جب نماز پڑھتے تو انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر عرض کیا اے اللہ! شراب کے متعلق ہمیں ہدایت دے! اس میں عقل اور مال دونوں کا نقصان ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ.
(النساء:43)

ترجمہ: ”اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ (نشہ اتر جائے اور) جو منہ سے نکالتے ہو اس کو سمجھنے لگو۔“

اس دن سے رسول اللہ ﷺ نے اعلان کرا دیا کہ لوگ مستی و بے خبری کی حالت میں نماز کے قریب نہ آئیں۔ اس اعلان سے مسلمانوں نے اگرچہ شراب نوشی ترک نہ کی تو برائے نام ضرور کر دی، لیکن کچھ لوگوں میں اس کے بُرے اثرات قائم رہے۔ ایک دفعہ شراب پیتے میں ایک انصاری اور ایک مہاجر کا آپس میں جھگڑا ہو گیا اور انصاری نے کباب کی ہڈی مہاجر کے کھینچ ماری۔ دونوں نشے میں تھے۔ لڑ پڑے اور نوبت مار کٹائی تک پہنچ گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا تو بارگاہ الٰہی میں پھر درخواست کی۔ ”اے اللہ! ہمیں شراب کے بارے میں مفصل ہدایت دے کہ یہ عقل اور مال دونوں کی دشمن ہے! اس پر یہ وحی نازل ہوئی:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ. (المائدہ:90-91)

ترجمہ: ”مسلمانو! شراب اور جوا اور بتوں کے تھان اور پانسے (یہ سب) پلید ہیں شیطانی کام ان سے بچے رہو تا کہ تم مراد کو پہنچو۔ شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ شراب اور جوئے سے تم میں عداوت اور بغض پیدا کر دے اور تمہیں خدا کی یاد اور نماز سے باز رکھے تو اب بھی تم باز آتے ہو یا نہیں؟“

امتناع شراب کا یہ حکم بعض مسلمانوں کو شاق گزرا اور انہوں نے کہا ”شراب ناپاک کیسے ہو سکتی ہے؟ جبکہ یہ فلاں فلاں کے پیٹ میں تھی جب وہ اُحد میں شہید ہوئے اور فلاں فلاں کے

Marfat.com

پیٹ میں تھی جب وہ بدر میں شہید ہوئے۔'' اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ . (المائدہ:93)

ترجمہ:'' جو لوگ ایمان لائے اور (جنہوں نے) نیک کام کیے ان پر (پہلے) جو کچھ کھا پی چکے اس کا کچھ گناہ نہیں جب وہ شرک سے بچیں اور ایمان پر قائم رہیں اور نیک کام کرتے رہیں پھر (حرام چیزوں سے) بچیں اور یقین کریں اور پھر بچیں اور اچھے کام کریں اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

مسلمانوں کے ایک معاملے میں...... جس کے متعلق وحی نے اس وقت تک کوئی حکم صادر نہ کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روش یہ تھی۔ ان کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے معاملات بھی دوسرے لوگوں کے معاملات کی طرح خاص نہ تھے بلکہ ان کا شمار بھی مسلمانوں کے عام مسائل میں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان معاملات میں دخل دیتے اور ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کرنے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرتے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ''عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے کہا کرتے تھے، ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو پردہ کرائیے لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہ کیا۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن رات کو قضائے حاجت کے لیے جاتی تھیں۔ ایک دن سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا جو طویل القامت تھیں، رات کے وقت قضائے حاجت کے لیے نکلیں۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس وقت ایک مجلس میں بیٹھے تھے، انہیں دیکھ کر بولے ''سودہ! میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔'' مقصد یہ تھا کہ پردے کا حکم نازل ہو۔ چنانچہ اللہ نے پردے کی آیت نازل فرمائی۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ ''میں نے کہا، یارسول اللہ! آپ کے پاس اچھے برے بھی قسم کے لوگ آئیں گے، بہتر ہے آپ امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو پردے کا حکم فرمادیں۔ اس پر آیت حجاب نازل ہوئی۔'' آیت حجاب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا

تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولٰى وَأَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَأَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا. (الاحزاب:32-33)

ترجمہ: ''اے پیغمبر کی بیبیو! تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم (خدا سے) ڈرتی ہوتو (غیر مردوں سے) دبی زبان (باریک زبان) سے بات نہ کرو (ایسا کروگی) تو جس کے دل میں کھوٹ ہے اس کو لالچ پیدا ہوگا اور کھری کھری صاف بات کیا کرو اور اپنے گھروں میں جمی رہو اور دورِ جاہلیت جیسی زینت وآرائش کا مظاہرہ نہ کرو۔ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرو۔ اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے گندی باتیں دُور کردے اور تم کو پاک وصاف بنادے۔''

پھر اللہ جل شانہ ارشاد فرماتا ہے:

يٰأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ أَدْنٰى أَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. (الاحزاب:59)

ترجمہ: ''اے نبی! کہہ دو اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہ اپنی چادروں کا گھونگھٹ نکال لیں اس سے وہ پہچانی جائیں گی تاکہ کوئی انہیں ستائے نہیں اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نجی معاملات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دخل اندازی کا ایک اور واقعہ ہے جو شاید نہ ہوتا اگر ان کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا امہات المومنین میں شامل نہ ہوتیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ ان سے انصاف نہیں کیا جاتا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کی محبت میں ان پر زیادتی ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کے ہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از راہ محبت بچے سے شفقت فرمانے لگے تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کی دیکھا دیکھی تمام امہات المومنین نے شکایت کی، یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے علیحدگی اختیار کرلینے کی تہدید کرکے یوں ظاہر فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا،

Marfat.com

امہات المومنین میں وہ دو کون تھیں جنہوں نے یہ شکایت کی؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "حفصہ رضی اللہ عنہا اور عائشہ رضی اللہ عنہا!" اس کے بعد کہا، "واللہ! ہم جاہلیت میں عورتوں کی کوئی حیثیت نہ سمجھتے تھے یہاں تک کہ اللہ نے ان کے بارے میں جو نازل کرنا تھا۔ اور جو حصہ انہیں دلوانا تھا، دلوا دیا۔" ایک دفعہ مجھے کوئی معاملہ در پیش آیا۔ میری بیوی نے کہا "آپ ایسا ایسا کیوں نہیں کر لیتے؟" میں نے کہا۔ 'تم کون ہوتی ہو؟ تم سے اس معاملے میں دخل دینے کو کس نے کہا ہے؟" وہ بولی۔ "ابن خطاب! تعجب ہے تم میری ذرا سی دخل اندازی برداشت نہیں کر سکتے اور تمہاری بیٹی رسول اللہ ﷺ کو ایسا جواب دیتی ہے کہ حضور ﷺ دن بھر غضب ناک رہتے ہیں۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ "یہ سنتے ہی میں نے چادر اٹھائی اور گھر سے نکل کر سیدھا حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچا اور اس سے کہا "بیٹی! کیا تم رسول اللہ ﷺ کو ایسا جواب دیتی ہو کہ حضور ﷺ دن بھر غضب ناک رہتے ہیں۔" حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے کہا "ہاں! خدا کی قسم! ہم آپ ﷺ کو جواب دیتے ہیں۔" میں نے کہا "دیکھو! میں تمہیں اللہ کی سزا اور اس کے رسول ﷺ کے غضب سے ڈراتا ہوں۔ بیٹی! اپنے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو، اس (عائشہ رضی اللہ عنہا) کو تو اس کے حسن اور رسول اللہ ﷺ کی محبت نے نازاں کر دیا ہے۔" یہ کہہ کر میں وہاں سے نکلا اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچا جو میری رشتہ دار تھیں جب اس سلسلے میں ان سے بات ہوئی تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا "ابن خطاب! حیرت ہے تم ہر بات میں دخل دیتے ہو، اب یہ چاہتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کی ازواج کے معاملات میں بھی دخل دینے لگو!" حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ان کی یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ میں آگے جو کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا اور ان کے پاس سے اٹھ کے چلا آیا۔

ایک انصاری میرے دوست تھے۔ ہم میں سے کسی کی غیر موجودگی میں جو باتیں ہوتیں وہ ہم ایک دوسرے کو سنا دیا کرتے تھے۔ ان دنوں ہم غسان کے ایک بادشاہ سے خوفزدہ تھے، جس کے متعلق سننے میں آیا تھا کہ وہ ہم پر حملہ کرنا چاہتا ہے اور ہمارے دل ہر وقت اس متوقع حملے کے خیالات سے لبریز رہتے تھے۔ ایک دن میرے انصاری دوست نے زور زور سے کنڈی کھٹکھٹائی اور کہا "دروازہ کھولو! دروازہ کھولو!" میں نے گھبرا کر پوچھا "کیا غسانی آ گیا؟" بولے "نہیں! اس سے بھی بڑا حادثہ پیش آ گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے علیحدگی اختیار فرمائی ہے۔" میں نے کہا "برا ہو! حفصہ رضی اللہ عنہا اور عائشہ رضی اللہ عنہا کا!" اور چادر لے کر سیدھا خدمت نبوی ﷺ میں پہنچا۔ اس وقت حضور ﷺ بالا خانے پر تشریف فرما تھے جس تک

Marfat.com

پہنچنے کا ذریعہ ایک سیڑھی تھا جو کھجور کا تنا کھود کر بنائی گئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے غلام اسود رضی اللہ عنہ سیڑھی کے سرے پر کھڑے تھے۔ میں نے ان سے کہا "عرض کردو! عمر وخطاب حاضر ہوا ہے!" اورانہوں نے میرے لیے اجازت طلب کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں نے یہ گفتگو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دہرائی اور جب ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی بات پر پہنچا تو حضور ﷺ نے تبسم فرمایا۔"

ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک ماہ تک ازواج مطہرات سے علیحدہ رہے، جب پورا مہینہ گزر گیا تو مسلمان مسجد میں جمع ہوئے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے: "رسول اللہ ﷺ نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو طلاق دے دی" یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بالا خانے کے پاس پہنچ کر حضور ﷺ کے غلام رباح کو آواز دی کہ حاضرین کی اجازت طلب کریں۔ لیکن رباح رضی اللہ عنہ نے جواب نہ دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ آواز دی اور جب دوسری بار بھی جواب نہ ملا تو بلند آواز سے کہا "رباح رضی اللہ عنہ! میری حاضری کے لیے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کرو! میرا خیال ہے حضور ﷺ یہ گمان فرما رہے ہیں کہ میں حفصہ رضی اللہ عنہا کے لیے آیا ہوں۔ خدا کی قسم! اگر حضور ﷺ مجھے حکم دیں تو میں حفصہ رضی اللہ عنہا کی گردن ماردوں!" رسول اللہ ﷺ نے حاضری کی اجازت مرحمت فرمادی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ازواج مطہرات کی کون سی بات قلب رسالت ﷺ پر گراں گزری؟ اگر حضور ﷺ انہیں طلاق دے چکے ہیں تو اللہ اور اس کے ملائکہ، جبرئیل، میکائیل، میں، ابوبکر رضی اللہ عنہ اور تمام مسلمان حضور ﷺ کے ساتھ ہیں۔ اس کے بعد وہ نبی اکرم ﷺ سے مسلسل باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بشرہ مبارک سے غصہ وغضب کے آثار معدوم ہو گئے اور حضور ﷺ مسکرا دیئے۔

روایت ہے کہ جب حضور ﷺ نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے علیحدگی اختیار فرمائی حضرت عمر رضی اللہ عنہ امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے پاس گئے اور کہا۔ "بہتر ہے کہ آپ سب باز آجائیں ورنہ اللہ اپنے رسول کو نعم البدل عطا فرمادے گا۔" یہ سن کر ان میں سے ایک نے جواب میں "عمر! کیا رسول اللہ ﷺ اپنی ازواج کو نصیحت نہیں فرماسکتے جو تم انہیں سمجھانے آئے ہو؟"[1] تمام واقعے کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ

Marfat.com

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿﴾ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ وَاللّٰهُ مَوْلٰكُمْ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿﴾ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿﴾ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ﴿﴾ عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا. (التحریم: 1 تا 5)

ترجمہ: ''اے پیغمبر ﷺ! جو چیز اللہ نے تم پر حلال کی ہے تم اسے (اپنے اوپر) حرام کیوں کرتے ہو؟ (کیا اس سے) اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہو اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ خدا نے تم لوگوں کے لیے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا اور خدا ہی تمہارا کارساز ہے اور وہ دانا (اور) حکمت والا ہے اور (یاد کرو) جب پیغمبر ﷺ نے اپنی بیوی سے راز کی بات کہی (اور کہا کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا) پھر جب اس نے (دوسری بی بی کو) خبر کر دی اور اللہ تعالیٰ نے پیغمبر ﷺ پر اس کا حال کھول دیا تو پیغمبر ﷺ نے کچھ تو (اس بیوی کو) جتلایا (جس نے راز فاش کر دیا) اور کچھ کو نہیں جتلایا (چشم پوشی کی اس کی عزت رکھنے کو) جب پیغمبر ﷺ نے اس بیوی کو یہ جتلایا تو وہ کہنے لگی تم کو یہ (سب حال) کس نے بتایا ہے۔ پیغمبر ﷺ نے کہا جاننے والے خبردار نے۔ (اے پیغمبر ﷺ کی دونوں بیبیو!) اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں (اس قصور سے) توبہ کرو (تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا) تمہارے دل جھک پڑے ہیں اور اگر تم دونوں (ایک دوسرے کی مددگار بن کر) پیغمبر ﷺ پر زور ڈالنا چاہو گی تو یہ سمجھ رکھو کہ خدا اور جبریل علیہ السلام اور نیک مسلمان سب پیغمبر ﷺ کے حمایتی ہیں اور فرشتے الگ، ان کے علاوہ مدد کو حاضر ہیں۔ اگر پیغمبر ﷺ تم کو طلاق دے دیں تو عجب نہیں ان کا پروردگار تمہارے بدلے ان کو تم سے بہتر بیویاں عنایت فرما دے (جو) فرماں بردار، ایمان دار، نماز گزار، توبہ کرنے والیاں، عاجزی کرنے والیاں، روزہ رکھنے والیاں، بیاہی ہوئی اور کنواریاں۔''

Marfat.com

جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی توبہ کرنے والی، عبادت گزار اور صاحب ایمان ازواج سے رجوع فرمالیا۔ ①

یہ ہیں وہ امور جن کے متعلق تمام مؤرخین نے ثابت کیا ہے کہ وحی الٰہی نے ان کے سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی تائید فرمائی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''میرے پروردگار نے تین موقعوں پر مجھے اپنی تائید سے نوازا۔'' میں نے کہا ''یارسول اللہ! اگر ہم مقام ابراہیم پر نماز پڑھیں؟ تو'' اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ پھر میں نے کہا ''یارسول اللہ! ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو پردے کا حکم فرمادیجیے تو بہتر ہوگا، ان سے اچھے برے بھی طرح کے لوگ باتیں کرتے ہیں۔'' اس پر آیت حجاب نازل ہوئی۔ اس کے بعد ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے متحد ہوکر رشک و رقابت کا مظاہرہ کیا تو میں نے ان سے کہا۔ ''اگر حضور ﷺ آپ سب کو طلاق دے دیں تو ہوسکتا ہے کہ پروردگار اپنے رسول ﷺ کو بہتر بیویاں عطا کردے۔ اس پر متذکرہ بالا آیت نازل ہوئی۔'' غالباً وحی ربانی کی یہی تائید تھی جس کی بنا پر رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے ''اللہ نے عمر رضی اللہ عنہ کی زبان اور دل کو حق کے لیے وقف کردیا ہے۔'' یا ارشاد ہوتا تھا ''اللہ نے حق کو عمر رضی اللہ عنہ کی زبان پر جاری کردیا ہے۔''

اسیران بدر، عبداللہ بن ابی، صلح حدیبیہ، امتناع شراب اور امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے معاملات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو روش اختیار کی وہ نگاہ کا دامن پکڑتی اور ان کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ واضح، زیادہ جاندار ہوتے جارہے تھے۔ اس سے ہماری مراد ان کی جرأت وصاف گوئی ان کی شخصیت کی نمود اور ان کی وہ دوسری خوبیاں نہیں ہیں جن کا ذکر پہلے کرچکے ہیں اور نہ ہمارا مقصد ان کی اصابت رائے اور وسعت علم کو ظاہر کرنا ہے بلکہ ہم اس طرز عمل کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں، جس سے عوامی مسائل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی گہری دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے اور جس کے پیش نظر وہ ایک ایسے مدبر کی حیثیت میں ہمارے سامنے آتے ہیں جو قومی سیاست، قومی مسائل کی اور قومی نظام کی بہتری کے لیے ہمہ تن عمل ہوتا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ خصوصیت ان کی دوسری تمام خصوصیات سے زیادہ نمایاں ہے۔ اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ انہیں اپنا وزیر فرمایا کرتے تھے اور

① ازواج مطہرات سے متعلق اس واقعے کی تفصیل کے لیے دیکھیے: حیات محمد ﷺ، ص 428 تا 436

Marfat.com

صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کے موقع پر ان کی رائے کو اپنے مخلص اور جانثار دوست حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے کے ہم پلہ قرار دیتے تھے۔ بارگاہ نبوت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اعتبار نے عام مسلمانوں میں ان کی رائے کو بے حد وقیع بنا دیا تھا۔ اگر چہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر و بیشتر ان کی رائے سے اختلاف فرماتے تھے۔ محض اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صلابت، کار آگہی اور دور اندیشی کی حدود سے متجاوز تھی اور یہ بات مزاج رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے منافی تھی جس میں دور اندیشی کے ساتھ نیکی اور قدرت کے ساتھ عفو و درگزر کی شان بھی پائی جاتی تھی۔

جب مسلمان مکہ فتح کرنے گئے۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ مکہ سے نکلے اور اپنے بھتیجے کی فوج اور قوت دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ قریش میں اس کے مقابلے کی سکت نہیں۔ ادھر ابوسفیان بن حرب بھی کچھ لوگوں کے ساتھ ٹوہ لینے نکلے۔ وہ اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہے تھے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی آواز پہچان لی اور کہا: ''ابوسفیان! وہ رہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے حلقہ میں۔ قریش کے لیے وہ صبح کتنی مصیبت انگیز ہوگی جب یہ مسلمان بزور شمشیر مکہ میں داخل ہوں گے۔'' ابوسفیان نے کہا ''میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں! پھر کیا کیا جائے؟'' حضرت عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفید خچر پر سوار تھے۔ باقی لوگوں کو تو مکہ واپس کر دیا اور ابوسفیان کو اپنے پیچھے بٹھا کر خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری کے ارادے سے چلے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خچر کو دیکھا تو ابوسفیان کو پہچان لیا اور سمجھ گئے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ ابوسفیان کو پناہ دینا چاہتے ہیں اسی وقت خیمہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ابوسفیان کی گردن مار دینے کی اجازت چاہی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا ''یا رسول اللہ! میں پناہ دے چکا ہوں!'' اس پر ان دونوں میں سخت کلامی ہوگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملہ دوسری صبح پر ملتوی کر دیا اور دوسرے دن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ گفتگو کرنے کے بعد ابوسفیان اسلام لے آئے۔ نبی رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں یہ عزت بخشی کہ ''جو کوئی ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے اس کا خون معاف ہے، جو اپنے دروازے بند کر کے گھر میں بیٹھ گیا وہ محفوظ ہے اور جو کعبے میں داخل ہو گیا وہ امان میں ہے۔'' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ، ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی اس نجات سے دل آزردہ چلے گئے۔ یہاں تک کہ مکہ کے دروازے کھلے تو انہیں معلوم ہوا کہ عبداللہ بن ابی کے واقعے کی طرح اس معاملے میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان کی بات سے زیادہ بابرکت ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ صاف گو بھی تھے اور بے باک بھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ رسول

Marfat.com

اللہ ﷺ نے ان کی رائے سے اتفاق نہیں فرمایا، لیکن اس کے باوجود ان کی عظمت و منزلت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ اپنے ہر مشورے، اپنی ہر رائے میں وہ صادق الاخلاص تھے اور مخلص کا احترام، اس کی تعظیم ہم پر فرض ہے۔ چاہے ہم اس کا مشورہ قبول نہ کریں۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ اکثر موقعوں پر ان کی زبان نے حق کا اعلان کیا اور اس بارے میں آپ کیا کہیں گے کہ پہلے ان کی رائے سے اختلاف کیا گیا، لیکن بعد کو جب وہ برسرِ حق پائے گئے تو ان کی رائے قبول کر لی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اس اعلان کے لیے بھیجا کہ جس نے تہِ دل سے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا اسے جنت کی بشارت دی جاتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ اعلان سنا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو سختی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں واپس بھیج دیا اور اس بات کی تصدیق کے لیے کہ بشارت کا یہ اعلان واقعی ارشادِ نبوی ﷺ کے تحت عمل میں آیا ہے، خود بھی ان کے پیچھے پیچھے گئے۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے جواب اثبات میں مرحمت فرمایا، تو عرض کیا ''ایسا نہ کیجئے، مجھے ڈر ہے لوگ اس پر تکیہ کر کے بیٹھ رہیں گے۔ انہیں عمل کرنے دیجئے!'' نبی اکرم ﷺ نے ان کی رائے کو شرف پسندیدگی عطا کرتے ہوئے فرمایا: ''ٹھیک ہے انہیں عمل کرنے دو۔''

جب رسول اللہ ﷺ کے مرض وفات نے شدت اختیار کی۔ حضور ﷺ نے ان مسلمانوں کی طرف جو اس وقت کاشانۂ نبوت میں حاضر تھے، اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: کاغذ اور قلم لاؤ، میں تمہیں ایک ہدایت نامہ لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو گے۔'' اس پر حاضرین میں اختلاف پیدا ہوا۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا'' کاغذ اور قلم لے آؤ کہ حضور ایسا ہدایت نامہ تحریر فرما دیں جس سے تمہاری گمراہی کا امکان باقی نہ رہے۔'' لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم نے جن کے سرگروہ حضرت عمر تھے، اس کی مخالفت کی اور کہا: ''اس وقت رسول اللہ ﷺ کو تکلیف ہے۔ ہمارے پاس قرآن موجود ہے اور وہ ہمارے لیے کافی ہے۔'' نبی رحمت ﷺ نے صحابہ کا یہ اختلاف دیکھا تو ارشاد ہوا ''چلے جاؤ، تمہیں نبی ﷺ کے سامنے جھگڑنا نہیں چاہیے۔'' اور کچھ تحریر نہیں فرمایا شاید حضور ﷺ سب سے زیادہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے سے متاثر ہوئے تھے، اس لیے کہ آپ ﷺ ان کے اخلاص کی صداقت اور رائے کی پاکیزگی سے واقف تھے۔

ہمارے احترام و تعظیم کا سب سے زیادہ مستحق وہ شخص ہے جو اپنی ذات کو نظر انداز کر کے محض

Marfat.com

عام فلاح و بہبود کے لیے پرخلوص رائے دے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی بہترین مثال تھے۔ آپ پہلے دیکھ چکے ہیں کہ ان کی رائیں کتنی بے لاگ اور لوث وغرض سے کیسی پاک ہوتی تھیں۔ بلکہ آپ نے دیکھا کہ وہ تحریم شراب کے لیے کس قدر بے چین تھے۔ حالانکہ شراب حرام نہیں تھی اور ایام جاہلیت میں وہ خود بھی بلا کے بادہ نوش تھے۔ پیتے تھے اور بڑے چاؤ سے پیتے تھے۔ پھر جو انہوں نے اس کی حرمت چاہی تو صرف اس لیے کہ جماعت کی بھلائی، اس کی شیرازہ بندی اور جماعتی نظام کا استحکام ان کا نصب العین تھا۔ اس کے علاوہ مال و دولت کے معاملے میں بھی وہ سب سے زیادہ بے نیاز تھے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں غنیمت میں سے ان کا حصہ مرحمت فرمایا تو کہا: "یہ کسی مجھ سے زیادہ محتاج کو عطا فرما دیجئے!" ایک دن جب پھر انہوں نے یہی بات کہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس وقت تو لے لو! پھر خود ہی صدقہ کر دینا۔"

بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ زہد اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ ایک دفعہ خیبر میں انہیں کچھ زمین ملی، وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: "مجھے خیبر میں ایک زمین ملی ہے جس سے بہتر چیز آج تک میرے حصے میں نہیں آئی۔ اس کے متعلق کیا ارشاد ہے؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "چاہو تو زمین اپنے پاس رکھو اور آمدنی وقف کر دو۔" چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فقیروں، رشتہ داروں، غلاموں اور مہمانوں کے لیے فی سبیل اللہ وقف کر دیا، جس کے متولی کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ بقدر ضرورت اس میں سے کھا پی سکتا ہے اور اپنے محتاج دوست کو کھلا بھی سکتا ہے اور فرمایا کہ اصل زمین نہ بیچی جائے گی نہ ہبہ کی جائے گی اور نہ کوئی اس کا وارث ہو گا۔ چنانچہ اسلام میں یہ سب سے پہلا وقف تھا جو اسلامیان شرق و غرب کے نظام اوقاف کی اولین اساس قرار پایا۔

ایک ایسا شخص جس کی خصوصیات یہ ہوں اور جو مادی اغراض سے اس قدر بلند ہو، کوئی تعجب نہیں اگر وہ اپنے اخلاق کی شدت اور غلظت کے باوجود تمام مسلمانوں کی تعظیم و تکریم کا مرکز ہو اور خود ذات رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اسے اپنی محبت و قربت سے اس درجہ نوازے کہ "یا اخی!" کہہ کر مخاطب فرمائے۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عمرہ کی اجازت چاہی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیتے ہوئے فرمایا "یا اخی! اپنی دعا میں ہمیں نہ بھولنا!" حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب کبھی اس کا ذکر کرتے تو فرماتے "مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد، یا اخی، ان تمام چیزوں سے محبوب ہے جن پر

Marfat.com

سورج طلوع ہوتا ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خلوص، ان کا دنیوی خواہشوں سے پاک ہونا اور ان کی عدل وانصاف سے محبت یہ تمام وہ چیزیں ہیں جنہوں نے ان کے لقب "فاروق" کو دوام بخشا۔ اس میں اختلاف ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فاروق کے نام سے کس نے موسوم کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اس کے متعلق جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔" ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ نے عمر رضی اللہ عنہ کی زبان اور ان کے دل کو حق سے سرفراز فرمایا اور وہ فاروق ہیں جن کے ذریعے حق و باطل میں فرق کیا گیا۔" ابن سعد نے طبقات میں سنداً ایک عبارت درج کی ہے کہ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ سب سے پہلے اہل کتاب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فاروق کہا، بعد کو مسلمانوں نے یہ لفظ اختیار کرلیا۔ یہ بات ہم تک نہیں پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق کچھ فرمایا تھا۔" ان روایتوں میں سے جو بھی صحیح ہو لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فاروق تھے۔ اسی لیے وہ آج تک فاروق مشہور ہیں اور قیامت تک مشہور رہیں گے۔

ان کی شدت اور درشتی کی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ان پر ترجیح دیتے تھے، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا اور کسی کو ان سے بہتر نہ سمجھتے تھے۔ ان کے اخلاص اور صاف گوئی اور ان کے عزم وحزم کی بنا پر، ان کی سختی اور درشتی کا اتنا شہرہ ہوگیا تھا کہ ان کے دل کی نرمی اور رقت اس کے مقابلے میں دب کر رہ گئی تھی حالانکہ اکثر مواقع پر اس نرمی اور رقت کا اظہار ہوا ہے جس کا کچھ تھوڑا سا ذکر ہم نے ان کے قبول اسلام کے سلسلے میں کیا بھی ہے۔ روایت ہے کہ خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باریابی کی اجازت چاہی۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قریش کی کچھ عورتیں بیٹھی بلند آواز سے گفتگو کر رہی تھیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حاضری کی اجازت چاہی تو سب کی سب اسی وقت چھپ گئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ باریاب ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا: "مجھے ان پر تعجب ہو رہا ہے۔ ابھی میرے پاس بیٹھی تھیں، لیکن تمہاری آواز سنتے ہی چھپ گئیں۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا "یارسول اللہ! اصل میں تو انہیں آپ سے ڈرنا چاہیے!" اس کے بعد کہا: "اے اپنے نفس کی دشمنو! مجھ سے ڈرتی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتیں!" وہ بولیں "ہاں! آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ سخت ہیں۔"

غالباً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہی شدت تھی کہ جس کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے اپنی علالت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا تھا۔ ایک دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ موجود نہ تھے اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی اور بلند آواز میں تکبیر کہی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ابوبکر کہاں ہے؟ اس بات کو اللہ اور مسلمان دونوں پسند نہیں کرتے۔''

آپ تعجب کر رہے ہوں گے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ سختی اور درشتی رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت کہاں چلی گئی تھی؟ جب یہ خبر ان کے ہوش و حواس پر بجلی بن کر گری اور انہوں نے اس شخص کو جھٹلایا جس نے اس المناک حقیقت کا انہیں یقین دلانا چاہا۔ وہ مجمع سے مخاطب ہوئے اور کہا ''منافق کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے وفات پائی۔ واللہ! آپ ﷺ نے وفات نہیں پائی، بلکہ موسیٰ بن عمران علیہ السلام کی طرح اپنے رب کے پاس تشریف لے گئے ہیں جو چالیس روز غائب ہو کر واپس آ گئے تھے۔ حالانکہ ان کی نسبت بھی کہا جاتا تھا کہ وفات پا گئے۔ خدا کی قسم! رسول اللہ ﷺ بھی موسیٰ بن عمران علیہ السلام کی طرح مراجعت فرمائیں گے اور ان لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے جو کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے رحلت فرمائی۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور نبی رحمت ﷺ کو دیکھ کر انہیں آپ کی وفات کا یقین ہو گیا تو مجمع میں کھڑے ہوئے اور فرمایا ''جو شخص محمد ﷺ کو پوجتا تھا وہ سمجھ لے کہ محمد ﷺ نے وفات پائی، لیکن جو کوئی اللہ کو معبود مانتا تھا تو وہ جان لے کہ اللہ زندہ ہے کبھی نہیں مرے گا۔''

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ. (آل عمران:144)

ترجمہ: ''اور نہیں ہیں محمد (ﷺ) مگر ایک رسول۔ ان سے پہلے رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر وہ مر جائیں گے یا قتل کر دیئے جائیں گے تو تم برگشتہ ہو جاؤ گے؟ اور جو شخص برگشتہ ہو جائے گا وہ خدا کو کچھ نقصان نہیں پہنچائے گا اور اللہ شکر گزاروں کو عنقریب جزا دے گا۔''

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ زمین پر گر پڑے۔ ان کے پاؤں انہیں سنبھال نہ سکے گویا یہ آیت انہوں نے پہلے کبھی سنی ہی نہ تھی۔ اس وقت کہاں تھی ان کی

Marfat.com

وہ سختی درشتی؟ بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فدائی ابوبکر رضی اللہ عنہ...... رقیق القلب اور زود اشک ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صبر وثبات کے مقابلے میں ان کے جزع وفزع کی کیا حیثیت تھی؟ اور ان کی ہمت واستقامت کو کیا ہو گیا تھا؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب ہوش میں آئے تو ان کا سیاسی شعور بیدار ہو گیا اور وہ سوچنے لگے کہ اس جانکاہ سانحے کے بعد مسلمانوں کا انجام کیا ہوگا۔ اس نازک ترین موقع پر یہ انہیں کے فکر وعمل کی کارفرمائی تھی جس نے اسلام کو ہر خطرے سے محفوظ رکھا اور اس کی توسیع واشاعت کی راہیں ہموار کیں۔

❀⊙❀

Marfat.com

باب 4:

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دوش بدوش

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کی وفات کا یقین ہو گیا اور وہ سوچنے لگے کہ آپ ﷺ کے بعد مسلمانوں کا انجام کیا ہوگا؟ بات تھی بھی واقعی گہرے سوچ بچار کے قابل، عرب اگر آپس میں لڑ پڑتے تو اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا جو لوگ مکہ اور مدینہ سے دور جزیرہ نمائے عرب کے مختلف گوشوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ قریش اور مدینہ کا اقتدار انہیں گوارا نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یمن میں اسود عنسی نے بغاوت کر دی۔ اہل یمامہ میں سے بنو حنیفہ نے مسیلمہ بن حبیب کے باطل ادعائے نبوت کو قبول کر لیا اور بنو اسد اپنے جھوٹے نبی طلیحہ بن خویلد پر ایمان لے آئے۔ اگر مسلمان ہمت و جرأت سے کام نہ لیتے اور اتحاد و ثبات اور عزم کے سہارے اس قیامت صغریٰ کا سامنا نہ کرتے تو نہ جانے رسول اللہ ﷺ کے بعد اسلام کا انجام کیا ہوتا؟

نبی اکرم ﷺ کی وفات کا یقین ہوتے ہی سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی مسئلے پر غور و فکر فرمایا اور حقیقت اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ آن کی آن میں واضح ہو گئی کہ اگر سہل انگاری سے کام لیا گیا اور فوراً ہی خلیفہ کا انتخاب نہ کیا گیا جو سیاسی امور میں مسلمانوں کی رہنمائی کرے تو ہو سکتا ہے کہ مہاجرین رضی اللہ عنہم اور انصار رضی اللہ عنہم میں اختلاف پیدا ہو جائے اور ہو سکتا ہے کہ عرب کے تمام ممالک میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھے۔ یہ سوچتے ہی وہ مجمع کو چیرتے پھاڑتے...... جس میں وفات رسول ﷺ کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں...... مسجد سے نکلے اور چل پڑے۔ رستے میں حضرت ابو عبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ عنہ ملے۔ ان سے کہا "ہاتھ بڑھائیے کہ میں بیعت کروں! لسان نبوت نے آپ کو "امین الامت" فرمایا ہے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ بات سن کر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ دم بخود رہ گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح اس مسئلے کی اہمیت انہوں نے بھی محسوس کر لی لیکن ان کی رائے سے مطمئن نہ ہوئے۔ انہیں غور سے دیکھا اور کہا "جب سے تم مسلمان

ہوئے ہو، ایسی بے وقوفی کی بات میں نے تمہاری زبان سے نہیں سنی۔ کیا تم مجھ سے بیعت کرو گے جبکہ تم میں ثانی اثنین صدیق رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت موجود ہے!''

ابھی یہ دونوں اس اہم مسئلے پر تبادلہ خیال کر ہی رہے تھے کہ خبر ملی، انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر خلافت کے بارے میں مشورہ کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی امارت انہیں ملے۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تیزی سے چلے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بلانے کے لیے ایک آدمی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر بھیجا جسے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں مصروف ہوں، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کا مسئلہ ہر مصروفیت پر مقدم ہے۔ چاہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے انہوں نے آدمی کے ہاتھ دوبارہ یہ پیغام بھیجا ''ایک نہایت اہم مسئلہ درپیش ہے اور ائل میں آپ کا ہونا اشد ضروری ہے۔''

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ یہ کہتے ہوئے گھر سے نکلے۔ ''ایسی کیا بات پیش آ گئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین سے بھی اہم ہے؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ ''آپ کو نہیں معلوم کہ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہیں اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کا امیر بنانا چاہتے ہیں جو بات وہاں سب سے زیادہ پسند کی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے!'' حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے معاملے کی نزاکت کو محسوس فرمالیا اور ان دونوں...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ...... کے ساتھ تیزی سے سقیفہ بنی ساعدہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہاں پہنچ کر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بڑی احتیاط اور نرمی کے ساتھ انصار کے جھگڑے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہہ دیا کہ میرے پاس کھڑے ہو کر خاموشی سے فیصلے کا انتظار کرو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ اول اول تو چپ چاپ کھڑے رہے لیکن یہ دیکھ کر کہ حباب بن منذر رضی اللہ عنہ انصار کو بھڑکا رہے ہیں کہ اگر ایک امیر ہم میں سے اور ایک مہاجرین میں سے نہ ہوا تو ہم بغاوت کر دیں گے۔ ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور بول اٹھے کہا۔ ''ایک وقت میں دو امیر جمع نہیں ہو سکتے! خدا کی قسم! عرب تمہاری سیاست ہرگز تسلیم نہیں کریں گے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے نہیں تھے۔ وہ تو انہی کو اپنا امیر بنائیں گے جن میں نبوت تھی۔ اس روشن دلیل اور اس نمایاں اقتدار سے جو کوئی انکار کرے گا ہم اس سے لڑیں گے۔ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز و اقارب ہیں جو کوئی امارت و اقتدار کے مسئلے میں ہم سے جھگڑا کرے گا وہ باطل کی طرف لے جانے والا، گناہ کی طرف ڈھلنے والا اور ہلاکت کی دلدل میں پھنسنے والا ہوگا۔'' اس کے جواب میں حباب رضی اللہ عنہ نے

Marfat.com

انصار رضی اللہ عنہم سے مطالبہ کیا کہ مہاجرین رضی اللہ عنہم کو مدینہ سے نکال دیں یا ان پر حکومت کریں۔ اس کے بعد ان تینوں مہاجرین سے خطاب کر کے کہا۔ ''خدا کی قسم! اگر تم چاہو تو ہم تمہیں اب بھی نکال باہر کریں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چیخ کر کہا ''تو پھر اللہ تمہیں ہلاک کر دے گا!'' حباب رضی اللہ عنہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ''نہیں! تمہیں ہلاک کرے گا۔''

ان جملوں نے جذبات میں طوفان برپا کر دیا۔ فوراً حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے مداخلت کی اور اہل مدینہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ''اے گروہ انصار! تم نے حمایت ونصرت میں سبقت کی تھی، اب توڑ پھوڑ میں پہل نہ کرو۔''

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی اس بات نے دلوں کا جوش ٹھنڈا کر دیا اور لوگوں میں بحث ومباحثہ پھر شروع ہو گیا، بشیر بن سعد قبیلہ خزرج کے ایک ممتاز فرد تھے۔ وہ مہاجرین رضی اللہ عنہم کے ہم نوا بن گئے جس سے انصار رضی اللہ عنہم کے اتحاد میں رخنہ پڑ گیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اندازہ کر لیا کہ رستہ ہموار ہو گیا ہے اور یہ لمحہ فصل ہے۔ چنانچہ انہوں نے انصار کو فرقہ بندی سے بچنے اور جماعت کی طرف آنے کی دعوت دی۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کے بلند آواز سے فرمایا ''یہ عمر رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ۔ ان میں سے جس کے ہاتھ پر چاہو بیعت کر لو!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ لوگوں میں اختلاف پایا جاتا ہے اسے جڑ پکڑنے کی مہلت نہیں دینی چاہیے۔ وہ اٹھے اور اپنی پاٹ دار آواز میں فرمایا ''ابوبکر اپنا ہاتھ بڑھائیے!'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کہتے ہوئے بیعت کر لی ''ابوبکر! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم نہیں دیا تھا کہ آپ مسلمانوں کو نماز پڑھائیے! آپ خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ہم آپ کے ہاتھ پر اس لیے بیعت کر رہے ہیں کہ آپ ہم سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب تھے۔'' حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے بیعت کرتے ہوئے کہا ''آپ افضل مہاجرین ہیں، آپ دو میں دوسرے ہیں، جب وہ دونوں غار میں تھے، آپ نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہیں اور نماز مسلمانوں کے دین میں سب سے افضل ہے۔ پھر کون ہے جو آپ پر فضیلت رکھتا ہو اور آپ کے ہوتے ہوئے امارت کا منصب سنبھالے۔'' اس کے بعد اہل سقیفہ کا تانتا بندھ گیا اور سوائے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے سب نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ بیعت ختم ہو گئی تو سب کے سب مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر سے حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز وتکفین کے متعلق اطلاع حاصل کریں۔ دوسرے دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسجد نبوی

Marfat.com

صلی اللہ علیہ وسلم میں تشریف لائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں سے معذرت چاہنے کھڑے ہوگئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے انکار میری غلطی تھی۔ انہوں نے فرمایا۔ ''میں نے کل آپ سے ایسی بات کہی جو نہ مجھے کتاب اللہ میں کہیں ملی نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مجھ سے فرمائی تھی لیکن میرا اپنا یہ خیال تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رہنمائی فرماتے رہیں گے اور آخر تک ہم میں موجود رہیں گے لیکن اللہ نے اپنی وہ کتاب تم میں باقی رکھی ہے جس سے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت پائی تھی اور اگر تم بھی اس سے وابستہ رہو گے تو اللہ اپنے رسول کی طرح تمہیں بھی اس کے ذریعے ہدایت دیتا رہے گا۔ اللہ نے تمہاری باگ ڈور ایک ایسے شخص کے حوالے کی ہے جو تم میں سب سے بہتر ہے۔ پس اٹھو! اور اس کی بیعت کرلو۔!'' سب لوگ کھڑے ہوئے اور سقیفہ بنی ساعدہ کی بیعت کے بعد مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں عام بیعت ہوئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پہلا موقف تھا اور جیسا کہ آپ نے دیکھا، دور اندیشی، سلامت نظر اور حسن سیاست کا موقف تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قائدانہ صلاحیتیں جھلکتی تھیں اور ظاہر ہوتا تھا کہ اپنی بے غرضی اور تمام تر توجہ جماعت کی بھلائی اور اس کے حسن انتظام پر مرکوز رکھنے کے باوجود صرف وہی ہیں جو ابھرتی ہوئی سلطنت کی سیاسی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر سب سے زیادہ اضطراب انہی کو تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس کو سچ ماننے کے لیے بھی تیار نہ تھے لیکن جب انہیں اس کا یقین ہوگیا تو ان کے اضطراب نے ان کی فکر کو مفلوج نہیں کیا اور ان کے غم نے انہیں اتنا بے حال نہ ہونے دیا کہ وہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے مسلمانوں کی اس انتہائی نازک پوزیشن...... ان کے معاملات کی تدبیر اور ان کی سیاست کا رخ معین کرنے...... کے متعلق گفتگو نہ کر سکتے۔ اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ خواہش نہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو منصب امارت کا مستحق ثابت کریں، بلکہ وہ اس مسئلے پر ہر غرض اور ہر خواہش سے بلند ہو کر سوچ رہے تھے۔ اسی لیے وہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے کو تیزی سے بڑھے لیکن جب امین الامت نے انہیں متنبہ کیا کہ مسلمانوں میں بیعت کے سب سے زیادہ مستحق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں تو انہوں نے فوراً ان کی رائے تسلیم کرلی۔ پھر جب انہیں معلوم ہوا کہ انصار رضی اللہ عنہم سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہیں تو اسی وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بلوایا کہ وہاں چل کر انصار کے دعویٰ کا جواب دیں۔ پھر کہنے والے کی اس بات نے بھی کہ انصار اپنے مطالبے پر اڑے ہوئے ہیں اور اس سے کبھی دستبردار نہیں ہوں گے، انہیں سقیفہ بنی ساعدہ میں جا کر اپنا حق منوانے سے باز نہیں رکھا۔ وہ اپنے دونوں ساتھیوں کو لے کر وہاں پہنچے اور حضرت

Marfat.com

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر کے مسلمانوں کا شیرازہ منتشر ہونے سے بچالیا۔

بیعت کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سیاست یہ تھی کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا تھا اسے ترک نہ کیا جائے اور جو کام آپ نے ترک فرمایا ہے اسے اختیار نہ کیا جائے۔ چنانچہ مسند آرائے خلافت ہونے کے بعد سب سے پہلا حکم جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صادر فرمایا وہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں جو لشکر روم اور شام پر حملے کی غرض سے بھیجنے کی تیاری فرمائی تھی وہ بھیج دیئے جائیں۔ اس حکم سے مسلمان جز بز ہوئے جس طرح عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اسامہ رضی اللہ عنہ نوعمر تھے اور ان کا سن اس وقت بیس سے کم تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو یہ خدشہ بھی تھا اور اسی نے ان کو زیادہ چیں بہ جبیں کر رکھا تھا کہ اگر یہ لشکر روانہ کر دیا تو مدینہ خطرے میں پڑ جائے گا۔ عرب اس پر حملہ آور ہو جائیں گے اور اس کے اقتدار کو صدمہ پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ اس لیے انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا، ''یہ لوگ...... اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر...... جلیل القدر مسلمان ہیں اور عرب جیسا کہ آپ خود بھی جانتے ہیں آپ کے خلاف بغاوت کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ایسی صورت میں مناسب نہیں ہے کہ آپ مسلمانوں کی ایک جماعت کو اپنے سے جدا کر دیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حتمی لہجے میں جواب دیا ''قسم ہے اس ذات کی! جس کے ہاتھ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جان ہے اگر میں یہ جانتا ہوتا کہ درندے مجھے اٹھا لے جائیں گے پھر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تعمیل میں اس لشکر کو ضرور بھیجتا۔ اگر شہر میں میرے سوا کوئی متنفس نہ رہے تو بھی یہ لشکر جائے گا اور ضرور جائے گا۔''

کیا اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیاست بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرح عزم وقوت کی سیاست تھی؟ کہا جاتا ہے اسامہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہہ کر اس لشکر کو مدینہ واپس بلوالیں تاکہ وہ مشرکین کے خلاف ان کی مدد کر سکے۔ ادھر انصار نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا ''اگر وہ ہمیں بھیجنا ہی چاہتے ہیں تو ہماری طرف سے یہ مطالبہ ان کی خدمت میں پیش کر دیجئے کہ ہمارا قائد کسی ایسے شخص کو بنائیں جو عمر میں اسامہ رضی اللہ عنہ سے بڑا ہو۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسامہ رضی اللہ عنہ کی درخواست رد کی نہ انصار رضی اللہ عنہم کی بلکہ یہ دونوں پیغام لے کر ا[illegible] کی خدمت میں پہنچے۔ اسامہ رضی اللہ عنہ کی درخواست مسترد کرتے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''اگر مجھے کتے اور بھیڑیے بھی پھاڑ کھائیں تو بھی میں وہ حکم واپس نہیں لوں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صادر فرمایا تھا۔'' اور انصار کی بات کے جواب میں فرمایا ''ابن خطاب! تمہاری ماں تمہیں

Marfat.com

روئے، رسول اللہ ﷺ نے تو اسامہ رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر مقرر فرمایا اور تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں اسے معزول کر دوں؟''

اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر روانہ ہوا جس میں جلیل القدر مہاجرین رضی اللہ عنہم وانصار رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ اس لشکر میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حیثیت بھی ایک عام سپاہی کی سی تھی جو سردار لشکر اسامہ رضی اللہ عنہ کے تابع فرمان تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لشکر کو رخصت کرنے اور ضروری ہدایات دینے کے لیے ساتھ گئے۔ جب واپس ہونے لگے تو اسامہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا ''اگر مناسب سمجھو تو عمر رضی اللہ عنہ کو میری مدد کے لیے چھوڑ دو!'' اسامہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اجازت دے دی کہ وہ لشکر چھوڑ کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ واپس چلے جائیں۔''

ہمارا فرض ہے کہ ہم یہاں تھوڑی دیر کے لیے رکیں اور اس سیاسی نظریہ کے اختلاف پر روشنی ڈالیں جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مقلد تھے، مجتہد نہیں تھے۔ چنانچہ جو کام رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا اس کی تقلید ان پر فرض تھی۔ مسلمان جو چاہیں کہیں اور جتنی چاہیں ان کی مخالفت کریں لیکن وہ ایسی کوئی بات ہرگز نہیں سنیں گے جو انہیں رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل سے روک دے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر بھیجنے کا حکم دیا تھا اس لیے وہ بہر حال بھیجا جائے گا...... مہاجرین اور انصار اس سے اختلاف کرتے ہیں تو کریں۔ تمام جزیرہ نمائے عرب میں بغاوت کے شعلے بھڑکتے ہیں تو بھڑکیں اور مدینہ پر خطرات کے بادل چھاتے ہیں تو چھائیں، لیکن یہ ناممکن ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان باتوں سے خوف کھا کر رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی تنفیذ سے دستبردار ہو جائیں۔ کیا اللہ نے آپ کا انتخاب نہیں فرمایا تھا اور اپنی کتاب آپ پر نازل نہیں کی تھی؟ کیا اللہ نے آپ سے مدد کا وعدہ نہیں فرمایا تھا اور آپ کے دین کی حفاظت کا یقین نہیں دلایا تھا؟ پھر ایک مسلمان اپنے تئیں آپ کا حکم نافذ نہ کرنے پر کیسے مطمئن ہو سکتا ہے؟ اور پہلے خلیفہ کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ آپ کے حکم کا پہلا مخالف ہو؟

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے میں ایک سیاست دان کا یہ فرض تھا کہ وہ گرد و پیش کے واقعات کو پوری اہمیت دے اور اس وقت کے حالات یہ تھے کہ سقیفہ بنی ساعدۃ کے اجتماع میں مہاجرین اور انصار کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا تھا، جس کی مثال عہد رسالت میں کہیں نہیں ملتی

Marfat.com

اور جزیرہ نمائے عرب کے مختلف گوشوں میں رسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبر پہنچتے ہی عربوں نے مدینہ کا اقتدار تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور یہ انکار بغاوت کی سرحدوں تک پہنچ گیا تھا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ مسلمان ازراہ ایمان و تسلیم رسول اللہ ﷺ کے احکام کی تعمیل کرتے تھے، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان سے اس قسم کی اطاعت کا مطالبہ کریں جو صرف اللہ کے برگزیدہ نبی ﷺ کی ذات گرامی کے لیے مخصوص تھی۔ ان وجوہ کے پیش نظر خلیفہ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان حالات کی صحیح اہمیت محسوس کرے۔ پھر اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے...... جبکہ رسول اللہ ﷺ کی وفات سے وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے...... کہ وہ ایک سیاست دان کی طرح مسائل کا حل تلاش کرنے میں اپنے علم کی روشنی اور اپنی بصیرت کے امتیاز کا سہارا لے کہ اب بصیرت کے سوا کوئی تدبیر اور قوت باقی نہیں رہی تھی جو معاملات کی گرہیں کھول سکے۔

ملکی سیاست میں ان دونوں بزرگوں کے درمیان یہ بنیادی اختلاف ہے لیکن ایسا اختلاف نہیں جو ان کی باہمی قدردانی، محبت اور احترام پر اثر انداز ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حق پوری طرح ملحوظ رکھا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ مسلمانوں کی رائے ان تک پہنچا دی اور اس کی تائید میں دلیل پیش کر دی، لیکن جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے پر اصرار کیا تو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے ساتھ روانہ ہو گئے اور آخر وہ ایسا کیوں نہ کرتے جبکہ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور ان کی خلافت کو تسلیم کیا تھا۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حق پہچانا اور انہیں اپنا وزیر منتخب کر لیا۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے بھی مشیر بن گئے جس طرح اس سے پہلے وہ رسول اللہ ﷺ کے مشیر تھے اور اس طرح ان دونوں بزرگوں کے تعلقات ایسے خوشگوار رہے جن میں پرخلوص محبت اور باہمی احترام اور اسلام اور مسلمانوں کی بہتری کے لیے تعاون کا بھرپور جذبہ کارفرما تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان اسی قسم کا اختلاف رائے ایک اور موقع پر بھی پیدا ہوا تھا۔ اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر ابھی جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں روم کے حامیوں سے برسرپیکار ہی تھا کہ عبس اور ذبیان کے قبیلوں نے...... جو مدینہ کے قریب ہی آباد تھے...... زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بزور شمشیر انہیں راہ راست پر لانے کا فیصلہ کیا اور

اپنے مخالفین کی دلیل مسترد کرتے ہوئے فرمایا ''خدا کی قسم! اگر وہ مجھے اونٹ باندھنے کی رسی بھی دینے سے انکار کریں گے جو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بطور زکوٰۃ پیش کیا کرتے تھے تو میں ان سے قتال کروں گا۔'' اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں کے ساتھ تھے جو مانعین زکوٰۃ پر تشدد کیے جانے کے خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ مرتدین کے مقابلے میں ان سے مدد لی جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی اس رائے پر اتنی سختی سے قائم تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے قدرے تند لہجے میں کہا ''آپ ان لوگوں سے کیسے جنگ کر سکتے ہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ''مجھے حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کرتا رہوں جب تک کہ وہ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ نہ کہیں اور جس کسی نے یہ کہہ دیا اس نے اپنے مال اور اپنی جان کو مجھ سے محفوظ کرلیا۔ الا یہ کہ اس کا کوئی حق ہو اور ان لوگوں کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: خدا کی قسم! میں اس سے ضرور جنگ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا۔ زکوٰۃ مال کا حق ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، الا یہ کہ اس کا کوئی حق ہو۔'' اس اختلاف رائے اور ان تمام مشکلات کے باوجود، جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مانعین زکوٰۃ سے جنگ کرنے اور ان پر فتح پانے کے سلسلے میں پیش آئیں، ان دونوں بزرگوں کے رشتہ اخلاص و محبت میں کوئی فرق نہ آیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہم پہلو مسلمانوں کی صف میں شامل ہو کر جہاد کرنے تشریف لے گئے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نظم کے علمبردار اور اسلامی حکومت کی زمام کار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی، وہی اس کے ذمہ دار تھے اور ان کی صوابدید پر اس کے معاملات کا انحصار تھا۔ ایسی صورت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بس یہ فرض تھا کہ اپنا مشورہ خلیفہ کی خدمت میں پیش کر دیں اور جو حکم وہ دیں اس کی اطاعت کریں۔ چنانچہ انہوں نے یہی کیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک وزیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، جس کی بات سنی جاتی تھی اور جس کے مشوروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ پر فتح پائی اور یہ فتح ان کی رجاحت فکر اور حسن سیاست کا کھلا ہوا ثبوت تھی۔ اس سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ''خدا کی قسم! میں کبھی اپنی رائے سے نہ ہٹتا مگر میں نے دیکھا کہ اللہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سینہ جہاد کے واسطے کشادہ کر دیا ہے اور مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ حق پر ہیں۔'' چنانچہ اس فتح کے بعد جب حضرت

Marfat.com

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تمام جزیرہ نمائے عرب میں مرتدین کے خلاف جنگ کرنی چاہی تو کسی نے مخالفت نہ کی۔ شاید مسلمان اس بزرگ ہستی میں جو مسلسل بیس برس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت سے برکت اندوز ہوئی تھی، روح رسالت کا پرتو دیکھ رہے تھے اور سمجھتے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اللہ کے نور کی رہنمائی میں وہ چیزیں نظر آتی ہیں جو کسی اور کو نظر نہیں آتیں اور ان کے دل میں وہ باتیں ڈالی جاتی ہیں جو کسی اور کے دل میں نہیں ڈالی جاتیں۔ مدینہ کی فوجیں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں قضاعہ اور بنو اسد کے مرتدین سے لڑنے اور انہیں دوبارہ اللہ کے دین میں شامل کرنے کے لیے روانہ ہوئیں۔ مسلمان مطمئن تھے کہ اللہ ان فوجوں کی ضرور مدد کرے گا جو اس کی راہ میں جہاد کے لیے نکلی ہیں اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں بیٹھے انہیں اپنے مشوروں سے مستفید کر رہے تھے، ملکی سیاست کے انصرام میں ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بنو اسد کے مرتدین پر فتح پانے کے بعد بنو تمیم کے مرتدین کا قصہ پاک کرنے کے لیے بطاح کا رخ کیا اور بنو تمیم کے سردار مالک بن نویرہ کو قتل کر کے عرب کی اس رسم کے خلاف کہ وہ جنگ میں عورتوں سے پرہیز کرتے تھے، اس کی بیوی سے شادی کر لی۔[1]

اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں یمامہ بھیج دیا جہاں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو شاندار فتح نصیب ہوئی۔ یہ فتح گویا تمام جزیرہ نمائے عرب میں فتنہ ارتداد کے خاتمے کا اللہ کی طرف سے اعلان تھا باوجودیکہ اس میں بارہ سو مسلمان شہید ہوئے۔ ان شہیدوں کے غم میں سارا مدینہ ایک ماتم کدہ سا بن گیا۔ خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے بھائی حضرت زید رضی اللہ عنہ کی شہادت پر بے انتہا رنجیدہ و غمگین تھے۔ یہاں تک کہ جب ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ مدینہ واپس آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں دیکھ کر فرمایا "زید رضی اللہ عنہ کی ہلاکت کے بعد تم کیا منہ لے کر آئے ہو جاؤ! میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا!" ان کے صاحبزادے نے ایمان کے سچے لہجے میں جواب دیا: "انہوں نے اللہ سے شہادت طلب کی اور اللہ نے ان کی دعا قبول فرمالی۔ کوشش میں نے بھی کی مگر میں ناکام رہا۔"

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا آٹھواں باب۔

Marfat.com

ہر چند کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے بھائی کی موت پر بے حد مغموم تھے لیکن اس غم نے انہیں اس مسئلے پر غور و فکر کرنے سے باز نہیں رکھا جو اسلام اور مسلمانوں کی زندگی کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ تھا۔ یمامہ کی جنگ میں جو مسلمان شہید ہوئے تھے ان میں حفاظ قرآن کی اچھی خاصی تعداد شامل تھی۔ اگر جنگوں کا سلسلہ یونہی جاری رہا اور ان میں حفاظ اسی طرح شہید ہوتے رہے، جس طرح یمامہ کی جنگ میں شہید ہوئے تو کیا ہوگا؟ یہ موضوع تھا جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سوچنا شروع کیا اور بالآخر ایک نتیجے پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اس وقت مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تشریف فرما تھے اور ان سے کہا ''یمامہ کی جنگ میں بہت سے حفاظ شہید ہو گئے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے اگر دوسری جنگوں میں بھی حفاظ کی شہادت کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو قرآن کا بیشتر حصہ ان کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ میری رائے ہے آپ جمع قرآن کا حکم صادر فرما دیجئے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے یہ بات بالکل نئی اور خلاف توقع تھی۔ انہوں نے جواب میں فرمایا ''وہ کام میں کیسے کر سکتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے کو دلیل سے ثابت کر دیا۔ مطمئن ہونے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بلایا پہلے اپنی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی گفتگو ان کے سامنے دہرائی۔ پھر فرمایا: ''تم ایک عقل مند اور صالح نوجوان ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں کاتب وحی مقرر فرمایا تھا۔ قرآن کی آیات تلاش کرو کہ انہیں مرتب کر دیا جائے۔'' ابتداء حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت زید کو بھی تردد ہوا لیکن آخر کار شیخین ر کی طرح اللہ نے اس خدمت کے لیے ان کا سینہ بھی کشادہ کر دیا اور انہوں نے ہڈیوں، کاغذ کے پرزوں، کھجور کی تختیوں اور مسلمانوں کے سینوں سے قرآن کی آیات تلاش کر کے ایک جگہ جمع کر دیں۔ اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورے سے قرآن مرتب کیا گیا اور وہ آج تک اپنی اصلی صورت میں قائم و دائم ہے۔ یہاں تک کہ فرنگی مستشرق ولیم میور اس کے متعلق کہتا ہے۔ ''سچ تو یہ ہے کہ تمام دنیا میں قرآن کے سوا کوئی کتاب نہیں جو پورے بارہ سو برس تک اپنے متن کی صحت و دقت کے ساتھ اس طرح محفوظ رہی ہو۔''

ایک روایت میں ہے کہ سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن کو مصحف کی صورت میں جمع کیا لیکن یہ قول تواتر کے خلاف ہے۔ البتہ تواتر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کو ثابت کرتا ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن کا مشورہ دیا اور انہیں دلیل سے مطمئن بھی کر دیا۔

Marfat.com

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو اس طرف متوجہ نہ کرتے کہ یمامہ کی طرح دوسری جنگوں میں حفاظ کے شہید ہو جانے سے قرآن کا بیشتر حصہ ختم ہو جائے گا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جمع قرآن کی فکر کرتے، نہ اس کے لیے کوئی عملی قدم اٹھاتے بلکہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا تھا کہ: ''میں وہ کام کیسے کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔'' اگر عمر رضی اللہ عنہ ان کی رائے نہ بدلتے اور انہیں جمع قرآن کی ضرورت پر مطمئن نہ کر دیتے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہرگز اس کام کے لیے آمادہ نہ ہوتے اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بلا کر یہ خدمت کبھی ان کے سپرد نہ فرماتے۔ اس عظیم الشان خدمت کے سلسلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ان کے متعلق فرماتے تھے ''خدا کی رحمت ہو ابوبکر رضی اللہ عنہ پر! جمع مصاحف میں وہ سب سے زیادہ اجر کے مستحق ہیں۔'' تو بلاشبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس اجر اور اس فضیلت میں ان کے شریک وسہیم ہیں اور مسلمان کتاب اللہ کی جمع و ترتیب کے لیے جتنے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے منت گزار ہیں اتنے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بھی احسان مند ہیں۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روحانی عظمتوں کی صرف ایک جھلک ہے...... لیکن ایسی جھلک جو اپنی جلالت اور خیر و برکت کے اعتبار سے ان کی تمام جھلکیوں سے افضل و اعظم ہے۔

گزشتہ صفحات میں شاید آپ دیکھ چکے ہیں کہ عہد صدیقی رضی اللہ عنہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مرتبہ کتنا بلند تھا اور یہ بھی آپ کی نظر سے گزر چکا ہے کہ عہد رسالت کی طرح اس عہد میں بھی وہ جنگ آزمائی اور شمشیر زنی سے زیادہ مشورت و سیاست سے دلچسپی لیتے رہے بلکہ آپ یہ بھی ملاحظہ کر چکے ہیں کہ جس طرح انہوں نے اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کی روانگی سے اختلاف کیا تھا اسی طرح وہ مانعین زکوٰۃ سے جنگ کرنے کے بھی خلاف تھے لیکن جب یہ حقیقت ان پر واضح ہوئی کہ حزم و جہاد کی سیاست نصرت و رفعت کا زینہ ہے تو وہ اس پر ایمان لے آئے اور اپنی تمام تر قوتیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تائید و اعانت میں صرف کر دیں۔ کیا یہ جہاد کی سیاست نہ تھی جو فتنہ ارتداد کے مرتدین کو پھر اسلام کے دائرے میں لے آئی اور جس نے تمام جزیرہ نمائے عرب کو ایک جھنڈے تلے جمع کر دیا؟ کیا اس سیاست نے عراق کے دروازے کھول کر مسلمانوں کے لیے کسریٰ کی سلطنت فتح کرنے کا راستہ ہموار نہیں کیا؟ پھر تعجب کیوں اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سیاست پر ایمان لے آئے اور اس کی تائید و حمایت بھی اسی زور و قوت سے کرنے لگے جس زور و قوت سے وہ اپنے دوسرے معتقدات کی تائید و حمایت کرتے تھے۔

جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عراق میں پیش قدمی کی اور فتح و نصرت کی خبریں جزیرہ نمائے عرب اور اس کے گردو پیش کی فضاؤں میں گونجیں تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دل میں شام کو فتح کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ ایک دن صبح اہل الرائے کو بلا کر...... جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پیش پیش تھے کہا ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شام پر حملے کا مصمم ارادہ فرما چکے تھے لیکن اللہ نے آپ کو یاد فرما لیا۔'' اس کے بعد فرمایا ''عرب اپنے ماں باپ کے بیٹے ہیں اور میرا ارادہ ہے کہ انہیں رومیوں سے لڑنے کے لیے شام بھیجوں۔ ان میں سے جو مارا جائے گا، شہید ہوگا اور نیک لوگوں کے لیے اللہ کے گھر خیر و برکت ہے اور جو زندہ رہے گا وہ دین کی حفاظت و مدافعت میں زندہ رہے گا اور اللہ عزوجل اسے مجاہدین کے ثواب سے نعمت اندوز کرے گا'' یہ کہہ کر اس مسئلے میں ان کی رائے طلب کی۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے جواب دیتے ہوئے کہا ''خدا کی قسم! ہم نے جب کبھی کسی بھلائی کی طرف بڑھنا چاہا! آپ ہم پر سبقت لے گئے۔ خدا شاہد ہے یہی بات میں بھی آپ سے کہنے والا تھا۔ لیکن اللہ کو منظور نہ ہوا اور اب آپ نے خود ہی اس کا ذکر فرما دیا۔ اللہ نے آپ پر راستی و فتح مندی کی راہیں کھول دی ہیں۔ گھوڑوں کے پیچھے گھوڑے، پیادوں کے پیچھے پیادے اور فوجوں کے پیچھے فوجیں بھیجیں! اللہ اپنے دین کا مددگار، اسلام اور اہل اسلام کا محافظ اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کیے ہوئے وعدے کا پورا کرنے والا ہے۔''

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ گفتگو سن کر بھی حاضرین کے دل میں اس دعوت کے لیے کوئی جوش پیدا نہ ہوا بلکہ وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ دراصل ان پر روم کی ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ جب ان کی سرگوشیاں ختم ہوئیں تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے تیاری کا حکم دیا لیکن وہ خاموش رہے۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نہ رہا گیا اور وہ چیخ کر بولے۔ ''مسلمانو! آخر تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب کیوں نہیں دیتے جبکہ وہ تمہیں زندگی بخش جہاد کی طرف بلا رہے ہیں؟'' حاضرین کے دل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس چیخ سے دہل گئے اور وہ جہاد پر رضا مند ہو گئے۔ لیکن بہتر یہ سمجھا گیا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ یمن اور جزیرہ نمائے عرب کے دوسرے لوگوں سے بھی مدد کی اپیل کریں۔

ہم یہاں ایک دفعہ اور توقف کریں گے۔ یہ تبدیلی، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روش میں ہوئی اور جس نے انہیں جنگی سیاست کا مؤید بنایا، ان کے اندازِ فکر کی اس تصویر کے خطوط واضح کرتی ہے جو ہم نے پچھلے صفحات میں پیش کی ہے اور اس سے ہمارے یقین میں اضافہ ہوتا ہے کہ حضرت

Marfat.com

عمر رضی اللہ عنہ ایک باعمل انسان تھے جن کے نزدیک محض فکر کی کوئی قیمت نہ تھی جب تک وہ زندگی کے واقعی پہلو پر اثر انداز نہ ہو۔ اس کا ذکر ہم اس موقع پر کر چکے ہیں جہاں ہم نے اسلام سے مناسبت کے سلسلے میں ان کے طریق فکر کی تصویر کھینچی ہے اور عہد صدیقی رضی اللہ عنہ میں جب وہ احتیاط وگریز کی پالیسی چھوڑ کر جنگ و پیکار کی پالیسی اختیار کرتے ہیں تو اس تصویر کے نقوش اور بھی روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ اسلام سے کوسوں دور اور مسلمانوں کے شدید ترین دشمن تھے اور مسلمان اس وقت اتنے عاجز و درماندہ تھے کہ غریبوں میں اپنے بچاؤں کی قوت بھی نہ تھی۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کا وجود مکہ کے نظام اور اس کی مذہبی منزلت کے لیے ایک خطرہ تھا لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ حلقہ بگوشان اسلام اپنے دین پر ثابت قدم ہیں اور اس کی راہ میں ہر تکلیف اور ہر قربانی کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے اکثر ترک وطن بھی کر گئے ہیں تو یہ حقیقت ان پر اچھی طرح واضح ہوگئی کہ اس نئے دین کا اپنے فدائیوں کے دل پر غیر معمولی اثر ہے اور انہیں یقین ہوگیا کہ مسلمان کبھی مغلوب نہیں ہوسکتے۔ اب انہوں نے اپنا رخ بدلا اور قرآن کی آیات سن سن کر غور کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی وحی پر ایمان لے آئے اور جب ایمان لے آئے تو اسی قوت اور اسی جوش کے ساتھ مسلمانوں کی حمایت کرنے لگے جس قوت اور جس جوش کے ساتھ پہلے ان کی مخالفت کرتے تھے۔ اسی طرح وہ حضرت ابوبکر کی جنگی سیاست سے دامن کش تھے۔ اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کی روانگی پر ان کا دل خوش نہ تھا۔ مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ کرنے پر وہ رضامند نہ تھے اور جب ارتداد کی جنگوں کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں تیاری کی تو وہ اس سے اس حد تک الگ تھلگ رہے کہ مؤرخین اس سلسلے میں ان کی کسی رائے کا قریب قریب ذکر ہی نہیں کرتے، لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ کی یہ جنگی سیاست کامیاب رہی۔ پہلے ارتداد کا فتنہ موت کی نیند سویا، پھر عراق فتح ہوا۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا خطِ فکر بدلا اور پوری قوت کے ساتھ اس سیاست کی تائید کرنے لگے جس طرح قبول اسلام کے بعد ان میں تبدیلی پیدا ہوئی تھی اور وہ پوری قوت کے ساتھ اسلام کی حمایت کرنے لگے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فکر کا یہ نیا موڑ ہی تھا جس کی بنا پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد خلافت کا بار سنبھالنے کے لیے ان کو منتخب فرمایا اور فتح و نصرت کی جس سیاست کا آغاز خلیفہ اول نے فرمایا

Marfat.com

تھا وہ ان کے دور میں پوری طرح کامیاب ہوئی۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شجاعت و بسالت نے کس طرح اس سیاست کو فروغ دیا کہ اس نے ایران اور روم کی دو عظیم الشان سلطنتوں کو پامال کر کے اسلامی سلطنت کی بنیادیں مستحکم کر دیں۔

لیکن ان دنوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سیاسی مسلک میں جو انقلاب پیدا ہوا، اس نے ان کی اجتماعی پالیسی پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ اجتماعی حیثیت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرز عمل بعض بنیادی امور میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے طرز عمل سے مختلف تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسلمانوں میں مساوات کے بشدت خواہش مند تھے۔ وہ عربی اور عجمی میں کوئی فرق روا نہ رکھتے تھے۔ اسلام میں سبقت اور تاخیر کرنے والوں میں کوئی تمیز ان کے نزدیک جائز نہ تھی۔ ان کے عہد میں مدینہ کے قریب سونے کی ایک کان برآمد ہوئی اور اس کان سے جو سونا نکلا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سب مسلمانوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا۔ ان سے جب کہا گیا کہ سابقون اولون سے ان کی حیثیت کے مطابق ترجیحی سلوک کیا جائے تو انہوں نے جواب میں فرمایا ''وہ اللہ کے لیے اسلام لائے تھے اور ان کا اجر اللہ کے پاس ہے جو انہیں آخرت میں ملے گا۔ یہ حصہ تو دنیا کا ہے۔'' پھر جب انہوں نے شام پر حملے کا ارادہ فرمایا تو اہل مکہ سے بھی مشاورت و اعانت چاہی جس طرح اہل مدینہ سے چاہی تھی لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی پالیسی میں طبقاتی نظام کی طرف مائل تھے۔[1] وہ سابقون اولون کو عام مسلمانوں اور اہل بیعت کو سابقون اولون پر ترجیح دیتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اس طبقاتی میلان کو عہد صدیقی میں چھپاتے نہیں تھے۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شام پر حملے کے لیے اہل مدینہ کی طرح مکہ سے بھی مشاورت و اعانت چاہی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان پر اعتراض کیا اور اس لیے کہ وہ اسلام میں سبقت کرنے والے مہاجرین رضی اللہ عنہم و انصار رضی اللہ عنہم کو مشورہ و اثر میں تمام مسلمانوں پر ترجیحی حق دلوانا چاہتے تھے۔ سہیل بن عمرو نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا ''کیا ہم اسلام میں تمہارے بھائی اور نسب میں تمہارے اسلاف کی اولاد نہیں ہیں؟ کیا تم محض اس لیے کہ اس نیک مقصد کی راہ میں ہم سے پہلے قدم اٹھا چکے ہو، ہمارے رشتوں کو کاٹ رہے ہو اور ہمارے حقوق سلب کر لینا چاہتے

---

[1] یہاں ''طبقاتی نظام'' فلسفہ اشتراکیت کے اصطلاحی معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ اس سے وہ دینی و معنوی امتیاز مراد ہے جس کی طرف یہ آیہ کریمہ: ﴿ان اکرمکم عند اللہ اتقکم﴾ اشارہ کرتی ہے۔ (مترجم)

Marfat.com

ہو؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے مفہوم کی وضاحت اس جواب میں فرمائی ''خدا کی قسم! میں نے جو کچھ کہا ہے تمہیں سابقین اسلام کے متعلق نصیحت کرنے کے لیے کہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے اور تم سے برتر مسلمانوں کے درمیان انصاف ہونا چاہیے۔''

سابقین اسلام رضی اللہ عنہم، اصحاب بدر رضی اللہ عنہم اور اہل بیعت کی فضیلت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ رائے کسی ذاتی غرض پر نہیں، ان کی قناعت پسندی پر مبنی تھی۔ چنانچہ عہد صدیقی رضی اللہ عنہ اور خود اپنے زمانہ خلافت میں وہ ان تمام حضرات سے معاملت اور ان کے درمیان انصاف کرنے میں ہر اثر اور ہر غرض سے پاک تھے۔ اس لے کہ معدلت کیشی ان کی فطرت تھی اور اس لیے کہ ان کے ذہن میں انصاف کا مفہوم اور ان کی بصیرت میں عدل کی تصویر مجسم ہوگئی تھی۔ عہد صدیقی میں وہ دو سال تک منصب قضا پر فائز رہے لیکن اس دوران میں ایک مقدمہ بھی ان کی عدالت میں نہیں آیا۔ بلاشبہ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمان اس وقت ارتداد کی جنگوں اور عراق و شام کی فتوحات میں مصروف تھے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انصاف کی شہرت نے بھی کافی حد تک مقدمہ بازی کے رجحان کا خاتمہ کر دیا تھا جو چیزیں لوگوں کو عدالت میں جانے پر عموماً اکساتی ہیں، ان میں سرفہرست کسی غیر مستحق کی یہ امید ہوتی ہے کہ وہ جج کو چکمہ دے کر یا سعی و سفارش کے ذریعے سے اس کی ہمدردیاں حاصل کر کے اپنا الو سیدھا کر لے گا۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق ایک لمحے کے لیے بھی یہ تصور نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ حق کے مقابلے میں کسی کی بے جا طرفداری کر سکتے ہیں یا مقدمات کا فیصلہ کرتے وقت ان پہلوؤں کو چھوڑ سکتے ہیں جن سے حق کی رہنمائی ہوتی ہے اور جو حق کے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہیں۔ پھر تعجب کیوں اگر کوئی غیر حق کی تلاش میں ان کے پاس جانے سے کترائے؟ اور حیرت کس لیے اگر ظالم ان کی سطوت سے خائف ہو کر اپنی سرکشی سے باز آجائے اور حقدار کا حق اسے واپس کر دے۔

عدل و انصاف کا یہ جذبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فطرت میں اول ہی سے تھا جو وقت کے ساتھ ترقی کرتے کرتے حد کمال کو پہنچ گیا۔ ان کے دل اور ان کی عقل نے انہیں زندگی کی مادی خواہشات سے بلند کر دیا تھا اور ان خواہشوں کا ان پر کوئی اثر باقی نہ رہا تھا۔ عنفوان شباب میں وہ تجارت کرتے تھے لیکن کماتے بس اتنا ہی تھے کہ ان کی اور ان کے اہل و عیال کی ضروریات زندگی مناسب حد تک پوری ہو جائیں نہ یہ کہ وہ نعمت و آسائش کی زندگی بسر کریں۔ اپنی تجارت کے

سلسلے میں وہ عراق، شام اور یمن جایا کرتے تھے لیکن اپنی تجارت کو فروغ دے کر مالداروں کی صف میں شامل ہونے سے کہیں زیادہ انہیں اس بات کی خواہش تھی کہ ان ممالک کے امراء و حکماء سے مل کر، ان سے گفتگو کر کے اپنے علم میں اضافہ کریں۔ پھر جب وہ مسلمان ہوئے تو اسلام آہستہ آہستہ انہیں طہارت و پاکیزگی کی طرف لے گیا۔ اپنے مقصود کو پہنچنے کے لیے انہوں نے تقشف کو وسیلہ بنایا اور دنیوی ثروت سے بے نیاز ہو گئے۔ وہ نہ کسی دولت مند کے محتاج تھے اور نہ کسی صاحب ثروت سے کوئی امید یا غرض وابستہ رکھتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی روایتی درشتی مزاج نے طہارت و پاکیزگی تک پہنچنے میں ان کی مدد کی ہو۔ چنانچہ آپ اپنے معتقدات کے اظہار میں وہ کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے، نہ مدارات والتماس سے کام لیتے تھے۔ کیا صلح حدیبیہ کے بعد وہ نبی رحمت علیہ التحیۃ والتسلیم کی خدمت اقدس میں حاضر نہیں ہوئے تھے اور سرکار رسالت ﷺ کے حضور بے جھجک عرض نہیں کیا تھا ''کیا آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ کیا وہ مشرک نہیں ہیں؟ تو پھر ہم اپنے دین میں کمزوری کو دخل کیوں دے رہے ہیں!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ جرأت استغنا کے اس نمائشی پندار کی پیدا کردہ نہ تھی جو ضرورت کے وقت خوشامد اور چاپلوسی کا روپ دھار لیتا ہے۔ خوشامد اور چاپلوسی ان لوگوں کا کام ہے جنہیں دنیا اپنے جال میں پھنسا کر ذلیل کر دیتی ہے لیکن جو شخص دنیا کو پائے حقارت سے ٹھکراتا ہے وہ خوشامد اور چاپلوسی سے بدرجہ اولیٰ مستغنی ہوتا ہے۔ یہ صفت ان صالحین کی ہے جن کی روحیں عظیم اور جن کے دل آئینے کی طرح شفاف ہوتے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان صالحین کی صف اول میں تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ان خوبیوں نے جو ان کی ذات میں جمع ہو گئی تھیں انہیں اپنی اور اپنے عیال و اقارب کی بھلائی پر عام بھلائی کو ترجیح دینے کی طرف مائل کیا اور ان کی اس فکر نے جس کی بنا پر، وہ عراق و شام کی فتوحات کے سلسلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سیاست پر ایمان لے آئے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس فیصلے پر پہنچایا کہ مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بہتر ان کا نائب اور کوئی نہیں ہو سکتا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مزاج میں شدت و غلظت تھی جس کی وجہ سے اکثر اہل الرائے ان کی دوستی سے گھبراتے تھے اور اہل الرائے ہی ملکی سیاست میں خلیفہ کے دست و بازو ہوتے ہیں۔ اگر ان میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں خلوص کا رشتہ قائم نہ رہتا تو وہ اعانت بالرائے سے گریز کرتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے ان کی اور ان کے ذریعے مملکت کی

Marfat.com

دیکھ بھال کرنی بہت دشوار ہو جاتی۔ کیا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے مناسب نہ تھا کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صفات اور حسن سیاست کا موازنہ ان کی فطری درشتی سے کرتے جو ان کا کام بگاڑ سکتی تھی اور اس حد تک بگاڑ سکتی تھی کہ ان کی باقی تمام خوبیاں بھی اس کی تلافی نہ کر سکتیں؟

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس مسئلے پر اس وقت غور فرمایا جب محسوس کیا کہ ان کی بیماری موت کی سرحدوں کے قریب آ گئی ہے..... کیا وہ مسلمانوں کو ان کی مرضی پر چھوڑ دیتے اور اس باب میں انہیں کسی قسم کا مشورہ نہ دیتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرتے ہوئے کسی کو اپنا نائب مقرر نہ کرتے؟ یہ سب سے سہل اور آسان طریقہ تھا! لیکن سقیفہ بنی ساعدہ اور اس میں انصار کے طرز عمل کا نقشہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں پھر گیا۔ انہوں نے سوچا کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ مسلمانوں کو ان کی بیعت پر متفق نہ کر دیتا تو نہ جانے کیا کچھ پیش آ جاتا اور اگر اب بھی ان کی وفات کے وقت مسلمانوں میں کوئی ایسا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے نتائج بڑے دور رس اور نہایت خطرناک ہوں گے۔ اب بات صرف مہاجرین رضی اللہ عنہم و انصار رضی اللہ عنہم ہی کے دائرے میں نہیں رہے گی بلکہ ان سے گزر کر عراق و شام کے مجاہدین میں پہنچے گی جو ایران اور روم کی طاقتوں سے ٹکر لے رہے ہیں۔ اگر آپ کی وفات کے بعد مسلمان آپس میں اُلجھ گئے تو یہ اختلاف ایک فتنہ بن کر تمام جزیرہ نمائے عرب میں پھوٹ پڑے گا جو سارا بنا بنایا کام بگاڑ دے گا اور فتح و توسیع کی اس سیاست کو موت کے گھاٹ اتار دے گا جو ابھی گھٹنوں کے بل چل رہی ہے، لیکن اگر وہ کسی کو خلیفہ نامزد کر دیں اور جسے نامزد کر دیں مسلمانوں کا اس پر اجماع بھی ہو جائے تو یہ خطرہ آسانی سے ٹل سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر کسی کو اپنا خلیفہ نہیں بنایا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ خلیفہ بنائے جانے کے متعلق کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ اس کی خلافت وحی ربانی کی عطا کردہ ہے اور وہ خلیفۃ اللہ بنا دیا جائے لیکن اگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کسی کو اپنا خلیفہ منتخب کرتے ہیں تو اس اندیشے کے پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ اس سے مسلمان بھی اختلاف کا شکار ہونے سے بچ جائیں گے اور اسلامی مملکت کی توسیع کا پروگرام بھی کامیابی کے ساتھ جاری رہے گا۔ پھر یہی ٹھیک ہے! عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ اور مسلمانوں کا ان کی خلافت پر اجماع ہونا ہی چاہیے۔ اگر وہ لوگوں کو عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر متفق کر سکے تو یہ اللہ کی طرف سے اس کے دین کی نصرت و کامیابی کی توفیق ہو گی۔

چنانچہ صبح ہوتے ہی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف کو بلایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق ان سے پوچھا، انہوں نے جواب میں کہا "واللہ! ان کے متعلق آپ کی جو رائے

Marfat.com

ہے وہ اس سے بہتر ہیں لیکن مزاج میں سختی ہے۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''یہ سختی اس لیے ہے کہ وہ مجھے نرم پاتے ہیں لیکن جب ذمے داری ان پر آپڑے گی تو وہ بہت سی باتیں چھوڑ دیں گے۔ اور اے ابومحمد! میں نے بہت قریب سے ان کا مطالعہ کیا ہے اور دیکھا ہے کہ جب میں غصے میں ہوتا تو وہ غصہ فرو کرنے کی کوشش کرتے نرمی دیکھتے تو سختی کا مشورہ دیتے!'' حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے چلے جانے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو بلایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کی رائے معلوم کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''خدا بہتر جانتا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے ان کا باطن ان کے ظاہر سے بہتر پایا ہے اور ہم میں ان جیسا کوئی نہیں!'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے تشریف لے جانے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سعید بن زید رضی اللہ عنہ، اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ اور دوسرے مہاجرین رضی اللہ عنہم و انصار رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر مسلمانوں کو متفق کرنا چاہتے تھے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب ان مشوروں کی خبر سنی تو انہیں اندیشہ ہوا کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنادیا گیا تو ان کی سختی و درشتی مسلمانوں میں انتشار و افتراق پیدا کردے گی۔ چنانچہ بالاتفاق یہ فیصلہ کیا گیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مل کر انہیں اس ارادے سے باز رکھا جائے۔ اذن باریابی کے بعد یہ بزرگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا۔ ''آپ اللہ کو کیا جواب دیں گے جب وہ آپ سے رعیت کی بابت سوال کرے گا۔ آپ عمر رضی اللہ عنہ کو ولی عہد مقرر کر رہے ہیں حالانکہ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ لوگوں سے آپ کے سامنے کیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ اس وقت کیا ہوگا جب آپ بھی اپنے رب کے پاس چلے جائیں گے اور لوگوں کا براہ راست ان سے واسطہ پڑے گا؟'' یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غصے سے کانپ اٹھے اور اپنے کسی عزیز سے چیخ کر کہا ''مجھے بٹھاؤ'' بیٹھ گئے تو اسی غصے کی حالت میں ارشاد فرمایا ''کیا تم مجھے اللہ سے ڈراتے ہو؟ نامراد ہو جو تمہارے معاملے میں ظلم کو توشہ آخرت بنائے! میں اللہ سے کہوں گا اے اللہ! میں تیرے بندوں پر اس شخص کو جانشین مقرر کر آیا ہوں جو تیری امت میں سب سے بہتر تھا۔'' اس کے بعد آپ طلحہ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ''جو بات میں نے تم سے کہی ہے وہ اپنے پیچھے بیٹھے ہوؤں کو بھی سنادو!''

اس گفتگو سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ اندیشہ ہو گیا کہ مسلمان برضا و رغبت حضرت عمر رضی اللہ عنہ

Marfat.com

خلافت پر متفق نہیں ہوں گے۔ چنانچہ آپ نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ جب صبح ہوئی تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے۔ علیک سلیک کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے ایسے لہجے میں گفتگو کی جیسے کل کے واقعے نے انہیں بے حد دُکھ دیا ہے اور فرمایا ''میں نے اپنی دانست میں تمہارا کام تم میں سب سے بہتر شخص کو سونپنا چاہا، لیکن تم سب اس پر ناک بھوں چڑھا رہے ہو اور چاہتے ہو کہ یہ ذمہ داری کسی اور کے سپرد کی جائے!'' حضرت عبدالرحمٰن نے جواب دیا ''اللہ آپ پر رحم کرے! آپ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیجئے! ورنہ آپ کی بیماری میں اضافہ ہوگا۔ لوگ اس معاملے میں دو فریق ہو گئے ہیں۔ ایک فریق وہ ہے جس کی رائے آپ کی رائے سے اتفاق رکھتی ہے اور وہ آپ کے ساتھ ہے اور دوسرا وہ جو آپ کی رائے کے خلاف ہے اور وہ آپ کا مشیر ہے جیسا کہ آپ چاہتے ہیں آپ کا دوست ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کا ارادہ نیک ہے اور امت کی صلاح وفلاح اور اصلاح وہدایت کے سوا اس سے آپ کا اور کوئی مقصود نہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صرف اہل الرائے مسلمانوں سے مشورہ کر لینا ہی کافی نہ سمجھا۔ بالخصوص یہ دیکھا کہ کچھ لوگ ان کی رائے سے اختلاف بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ بالا خانے پر تشریف لے گئے نیچے مسجد میں آدمی جمع تھے۔ ان کو مخاطب کر کے فرمایا ''کیا تم اس شخص کو پسند کرو گے جس کو میں ولی عہد مقرر کروں؟ خدا کی قسم! میں نے غور و فکر کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور اپنے کسی قرابت دار کو یہ منصب نہیں دیا۔ میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں۔ میرا کہنا سنو اور مانو'' لوگوں نے کہا ''ہم نے سنا اور مانا!'' اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور کہا ''اے اللہ! میں نے یہ انتخاب صرف مسلمانوں کی بہتری کے لیے کیا ہے اور اس اندیشے سے کہ ان میں فساد نہ ہو میں نے وہ عمل کیا ہے جس کو تو بہتر جانتا ہے۔ میں نے خوب غور و فکر کے بعد رائے قائم کی ہے۔ بہترین اور قوی ترین شخص کو ولی عہد کیا ہے جو سب سے زیادہ مسلمانوں کی راست روی کا خواہش مند ہے۔'' لوگوں نے جب یہ دعا سنی تو ان کی بیشتر تعداد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام سے بالکل مطمئن ہو گئی۔

اب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلایا اور وصیت فرمائی کہ ''بغیر سہل انگاری اور تاخیر کے عراق اور شام کی جنگ جاری رکھی جائے۔'' اس کے بعد انہیں وہ فرائض یاد دلائے جو تلاش حق کے سلسلے میں خلیفۃ المسلمین پر عائد ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ ''اللہ نے آیت رحمت کے

ساتھ ہی آیت غضب کا ذکر فرمایا ہے تا کہ بندہ اپنے اللہ سے رغبت بھی رکھے اور اس سے خوف بھی کھائے اور غیر حق کے لیے اس کا شکر ادا نہ کرے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو غائب چیزوں میں موت سے زیادہ اسے کوئی چیز محبوب نہ ہوگی۔ اس کے بعد اللہ اس کا حساب لے گا اور حق اور اس کے اتباع کا اسے نیک اجر دے گا۔'' جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وصیت فرما چکے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ باہر آئے۔ وہ اس وقت اس ذمے داری کے متعلق سوچ رہے تھے جو ان کے شانوں پر ڈال دی گئی تھی اور آرزو کر رہے تھے کہ کاش! حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ صحت یاب ہو کر اس نازک ترین صورت حال کا مقابلہ کر سکیں۔

لیکن جب بوجھ اٹھانے کا وقت آیا تو انہوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اسے اٹھا لیا۔ بے شک وہ بڑی ذمہ داری اور غیر معمولی مشقتوں کا بوجھ تھا لیکن کون تھا جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرح اس بوجھ کو اٹھا سکے اور اس سے عہدہ برآ ہو سکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پورے عزم اور پوری قوت سے یہ بوجھ اٹھایا اور دنیا کو اس وقت خیر باد کہا جب اسلامی فتوحات ایران، شام اور مصر کو اپنی وسیع آغوش میں لے چکی تھیں، جب اسلامی سلطنت فولادی بنیادوں اور آہنی ستونوں پر استوار ہو چکی تھیں۔

⊙❀⊙

Marfat.com

باب:5

عہدِ فاروقی رضی اللہ عنہ کا آغاز

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے 23 جمادی الاخریٰ سنہ 13ھ (22 اگست۔632ء) کو بعد غروب آفتاب وفات پائی۔ رات کی تاریکیاں پھیل جانے پر میت کو غسل دیا گیا اور جس تخت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر زیب دوش کیا تھا۔ اسی تخت پر آپ رضی اللہ عنہ کا جنازہ بھی مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں لایا گیا۔ جنازے کی نماز کے بعد میت روضۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لے جائی گی اور ثانی اثنین ذکو ان کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ ابوبکر صدیق ذکا سر شانہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے متوازی رکھا گیا اور لحد سے لحد ملا دی گئی۔ تدفین میں عمر بن خطاب، عثمان بن عفان، طلحہ بن عبیداللہ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم شامل تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ اول کا آخری حق ادا کیا اور قبر سے نکل کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر پہنچے۔ حاضرین کو سلام کیا اور بیٹھ گئے۔ آدھی رات کے بعد اپنے گھر واپس ہوئے[1] اور بستر میں لیٹ کر ان واقعات پر غور کرنے لگے جو کل پیش آنے والے تھے۔ صبح سویرے ہی لوگ خلافت کے لیے بیعت کو آئیں گے، جن میں کچھ ایسے بھی ہوں گے جو اسے ایک ناگوار فرض سمجھ کر ادا کریں گے، پھر عراق اور شام میں بھی جنگ کا نازک اور پیچیدہ مرحلہ درپیش ہے، آخر وہ کون سی صورت ہے جو ان دونوں مسئلوں کو حل کر دے، جب کہ یہ نوزائیدہ اسلامی مملکت کے لیے انتہائی خطرناک بھی ہیں۔

---

[1] ابن سعد نے طبقات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پہلے خطبے کے متعلق چند روایات نقل کی ہیں: ان میں سے ایک روایت عفان بن مسلم اور وہب بن جریر سے ماثور ہے۔ یہ جریر بن حازم سے، یہ حمید بن ہلال سے اور یہ ان لوگوں سے، جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت موجود تھے، روایت کرتے ہیں، ''جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ تدفین سے فارغ ہوئے تو انہوں نے ہاتھ سے قبر کی خاک جھاڑی اور وہیں کھڑے ہو کر خطبہ دیا۔'' یہ خطبہ آپ اسی باب میں آگے چل کر اس کے موقع پر پڑھیں گے۔ ہمیں اس میں شبہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے موقع پر خطبہ دے سکتے تھے اور ہمارے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ خطبہ ایک دوسرے موقع پر دیا گیا تھا۔ سورج غروب ہونے کے بعد جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر پھیلی تو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ کی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ان کا ماتم کیا تھا۔››

ان دنوں عراق اور شام میں مسلمانوں کی حالت بڑی نازک تھی۔ شام میں روم کی قوتوں کے سامنے اسلامی فوجیں جیسے جام ہو کر رہ گئی تھیں اور انہیں حرکت میں لانے کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تھوڑی سی فوج کے ساتھ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عراق سے شام بھجوایا تھا، لیکن اس کے باوجود کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ ان فوجوں کے سردار تھے۔ ان میں کوئی حرارت پیدا نہ ہو سکی اور مدینہ کے مسلمان کسی ایسے پیغام کے منتظر ہی رہے جس سے ان کے دلوں میں امید کی کرن پھوٹتی، یا وہ ان فوجوں کے انجام کی طرف سے مطمئن ہو جاتے۔ ادھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مختصری فوج کے ہمراہ شام چلے جانے سے عراق کا لشکر کمزور پڑ گیا اور مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کو اپنی جنگی فراست و مہارت کے باوجود عراقی مقبوضات کی حفاظت کرنی دشوار ہو گئی تھی، چنانچہ وہ حیرہ جا کر قلعہ بند ہو گئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے اس ایرانی لشکر کو جو شہریران بن اردشیر نے ہرمز جادویہ کی سرکردگی میں بھیجا تھا۔ بابل کے کھنڈروں میں عبرتناک شکست دی تھی لیکن اس فتح کے باوجود وہ دشمن کے اچانک حملے کے خوف سے اپنے پہلے مورچوں میں قلعہ بند ہونے پر مجبور ہو گئے تھے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ مدافعت تو کر سکتے ہیں، پیش قدمی نہیں کر سکتے، لیکن یہ مدافعت بھی انہیں دشوار ہونے لگی، جب انہوں نے محسوس کیا کہ امرائے ایران کے اضطراب میں اطمینان کی صورت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ جو مرتدین تائب ہو چکے ہیں ان سے مدد لی جائے۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان لوگوں سے جنگ میں مدد لینی اپنے اوپر حرام کر چکے تھے۔ جب یہاں جواب میں تاخیر ہوئی تو بشیر بن خصاصیہ کو اپنی جگہ سپہ سالار مقرر کر کے مثنیٰ نے مدینہ کا رخ کیا تا کہ اپنی نازک حالت بیان کر کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے بدلنے کی کوشش کریں۔

›› حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ماتمی کلمات میں صرف اتنا کہا تھا ''اے خلیفہ رسول اللہ! آپ نے قوم کو اپنے بعد بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ آپ اسے بڑی مصیبت میں چھوڑ گئے۔ آہ! آپ جدا ہو گئے۔ اب کیسے ملنا ہو گا؟'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رات اندھیری ہو جانے کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم پہلو دفن کیے گئے وہاں دفن کرنے والوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے تدفین میں ہاتھ بٹانا چاہا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ''ہم ہی کافی ہیں!'' ان حالات میں یہ بات بالکل غیر فطری معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں خطبہ دینے کھڑے ہو جائیں، بالخصوص جب ان میں سے بیشتر لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس بھی ہو گئے تھے۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں چند متنفس باقی رہ گئے تھے اور وہ اصحاب صفہ تھے۔ لوگوں کے جلد واپس چلے جانے کا سبب یہ تھا کہ ان دنوں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں روشنی کا انتظام نہ تھا۔)

Marfat.com

اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان ساری مشکلات سے کیسے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؟ وہ رات بھر انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں رہے۔ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں گڑگڑا کے دعائیں مانگتے رہے کہ وہ ان کے دل کو اپنی ہدایت سے نوازے اور انہیں سیدھا رستہ دکھا دے۔ صبح سب سے پہلے ان کا سامنا مثنیٰ سے ہوگا اور وہ ان سے بھی وہی مطالبہ کریں گے جو پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کر چکے ہیں کہ تائبین ارتداد کو ان کی مدد کے لیے بھیجا جائے۔ دلیل وہ دیں گے کہ تائبین ارتداد غنیمت پر جان دیتے ہیں اور ان سے زیادہ جنگ کا شائق اور کوئی نہیں ہے۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عراق کے متعلق انہیں جو وصیت کی ہے اس کا نفاذ بھی لابدی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کو بلا کر فرمایا تھا: ''عمر! جو کچھ میں کہتا ہوں اسے سنو اور اس پر عمل کرو! مجھے امید ہے کہ میں آج ہی دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ اگر میں مر جاؤں تو شام ہونے سے پہلے پہلے مثنیٰ کو امداد دے کر رخصت کر دینا اور اگر رات ہو جائے تو صبح سب سے پہلے یہ کام کرنا، اگر اللہ امرائے شام پر تمہیں فتح بخش دے تو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی فوج کو عراق واپس بھجوا دینا کہ اس فوج میں عراق کے بڑے بڑے صاحب اثر لوگ شامل ہیں جو اہل عراق پر جرأت کے ساتھ حملہ کر کے انہیں مار بھگانے کی قوت رکھتے ہیں۔''

اب انہیں کیا کرنا چاہیے؟ مدینے کے مسلمانوں کو مثنیٰ کے ساتھ کریں یا تائبین ارتداد کو؟ انہیں یہ خوف تھا کہ مسلمان یہ دیکھنے کے بعد کہ ان کے ساتھی شام میں پیش قدمی نہیں کر سکتے اور مثنیٰ مدینے میں ایران اور اس کی طاقت سے خائف نظر آ رہے ہیں، اس دعوت پر لبیک نہیں کہیں گے۔ لیکن مسلمان عراق میں ٹھہر نہیں سکتے تھے اگر انہیں کمک نہ پہنچائی جائے اور وہاں سے واپسی کا تصور بھی کبھی مثنیٰ کے ذہن میں نہ آیا تھا۔ اس لیے کہ انہوں نے خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو عراق پر حملے کے لیے آمادہ کیا اور وہی خالد رضی اللہ عنہ اور دوسرے مسلمانوں سے پہلے عراق پہنچے تھے۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ جس ملک پر حملہ کرنے میں وہ سب سے آگے تھے اور جس ملک کے متعلق انہیں یقین ہے کہ وہ اسے فتح کرنے کی قوت رکھتے ہیں، اب اس سے خود ہی پسپا ہو جائیں۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تائبین ارتداد کو ان کی مدد کے لیے بھیج دیں تو وہ فتح کے قدم بڑھاتے ہوئے ایوان کسریٰ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔

مثنیٰ کی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں بھی یہ کبھی خیال نہ آیا تھا کہ عراق سے پسپا ہوا جا سکتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں خلیفہ ہی اپنے اس یقین کے تحت نامزد کیا تھا کہ وہ سب

Marfat.com

مسلمانوں سے زیادہ ان کی سیاست کو جاری رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے لیکن اس سیاست کو جاری نہیں رکھا جا سکتا تاوقتیکہ معاملے کو پوری قوت کے ساتھ ہاتھ میں نہ لیا جائے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق مسلمانوں کو مثنیٰ کی مدد کے لیے بھیج کر عراق میں اسلامی قوت کو سہارا نہ دیا جائے۔

لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ اسلام کے وہ اکابر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ صحاب رضی اللہ عنہم جو ان کی خلافت پر چیں بہ جبیں تھے، اس باب میں سچے دل سے ان کی مدد کریں گے؟ اگر انہوں نے پس و پیش کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کیا کرنا چاہیے؟ اور ان کی اس پس و پیش کا اثر عرب اور مدینہ میں ان کے حلقہ اثر پر کیا پڑے گا؟ بس ایک ہمت و جرأت ہی کی پالیسی ہے جو اس مرحلے پر انہیں کامیابی کر سکتی ہے اور ہمت و جرأت کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں کمی نہیں۔ پھر تو انہیں اللہ پر بھروسہ کر کے جرأت مندانہ قدم اٹھا ہی لینا چاہیے۔

ساری رات اسی فکر و اضطراب میں گزر گئی، صبح اٹھ کر وہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آئے اور لوگوں کو بیعت کے لیے آگے بڑھتے دیکھ کر ان کی بے چینی قدرے کم ہوئی۔ ظہر کی نماز کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر پر کھڑے ہوئے، اس سیڑھی سے ایک سیڑھی نیچے جس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے۔ پہلے انہوں نے اللہ کی حمد و ثنا بیان کی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا اور اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب کا ذکر کر کے فرمایا:

''لوگو! میں تم ہی میں سے ایک انسان ہوں۔ اگر مجھے خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حکم عدولی گوارا ہو سکتی تو میں ہرگز یہ ذمے داری قبول نہ کرتا۔''

یہ فقرے اتنے انکسار اور اتنے تاثر کے ساتھ ادا کیے کہ سامعین کے دلوں میں اتر گئے۔ اب لوگوں کو محسوس ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق جو رائے قائم کی تھی وہ بالکل درست تھی اور اپنے بعد انہیں خلیفہ نامزد کر کے خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے واقعی بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تعریف کرنے لگے اور اس تعریف میں اور اضافہ ہو گیا جب انہوں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کے کہہ رہے ہیں، ''یا اللہ! میں سخت ہوں، مجھے نرم کر! یا اللہ! میں کمزور ہوں، مجھے قوت دے! یا اللہ! میں بخیل ہوں، مجھے سخی بنا!''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے اور جب مجمع پر سکوت چھا گیا تو فرمایا:

''اللہ نے میرے دو رفقاء کے بعد مجھے تم میں باقی چھوڑ کر میرے ساتھ تمہیں اور تمہارے

Marfat.com

ساتھ مجھے آزمایا ہے۔ خدا کی قسم! تمہارا جو معاملہ میرے سامنے آئے گا میرے سوا کوئی اسے طے نہ کرے گا اور جو میری نگاہوں سے دور ہوگا اس میں تا حد امکان کفایت و امانت کو ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا، اگر لوگوں نے میرے ساتھ بھلائی کی تو میں بھی یقیناً ان کے ساتھ بھلائی کروں گا اور اگر وہ برائی کے ساتھ پیش آئے تو میں ضرور انہیں عبرتناک سزا دوں گا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا خطبہ ختم کیا اور نماز پڑھانے کے لیے منبر سے اترے، نماز سے فارغ ہونے کے بعد حاضرین سے خطاب کیا اور انہیں مثنیٰ کے ساتھ عراق جانے کی دعوت دی۔ ساتھ ہی اس بارے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وصیت کا ذکر فرمایا۔ لوگوں نے یہ اپیل سنی اور ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ جواب کسی نے نہ دیا۔ گویا شام میں ان کے بھائیوں پر جو کچھ بیت رہی تھی اس کا منظر ان کی نگاہوں کے سامنے تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ خود بھی اس ابتلاء سے دوچار ہوں۔ کیا اس وقت بھی وہ اسی طرح دم بخود نہیں رہ گئے تھے جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں شام پر حملے کی دعوت دی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو چیخ کر کہنا پڑا تھا: ''مسلمانو! آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب کیوں نہیں دیتے۔ جب کہ وہ تمہیں زندگی بخش جہاد کی طرف بلا رہے ہیں؟...... تب کہیں انہوں نے یہ دعوت قبول کی تھی اور ہرقل اور اس کی فوجوں سے مقابلے کے لیے نکلے تھے، پھر آج بھی تو وہی ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جنہیں جزیرہ نمائے عرب کے مختلف امراء و قائدین کی اعانت بھی حاصل ہے۔ انہیں یہ کیا ہو گیا ہے کہ روم پر غالب آنے کی طاقت یہ اپنے اندر نہیں پاتے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو عراق سے شام منتقل کر کے جو مدد ان حضرات کو دی تھی وہ بھی ان کے لیے کفایت نہیں کرتی، حالانکہ یہی خالد رضی اللہ عنہ عراق میں اپنی پیہم فتوحات سے ایرانی قوت کو پامال کر چکے ہیں، آپ کا کیا خیال ہے؟ اگر مسلمان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعوت قبول کر کے مثنیٰ کے ساتھ عراق چلے جاتے ہیں تو نفع میں رہیں گے یا کسریٰ کی فوجوں کے مقابلے میں ان کا بھی وہی حال ہوگا جو شام میں ہرقل کی فوجوں کے مقابلے میں ان کے ساتھیوں کا ہو رہا تھا؟ انہیں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے معلوم تھی اور مالک بن نویرہ کے معاملے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے خلاف جو طرز عمل اختیار کیا تھا وہ بھی انہیں یاد تھا۔ اس لیے ان میں سے کسی کو یہ امید نہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو عراق واپس بھیجیں گے۔ مثنیٰ، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک بہت بڑے سپہ سالار ہیں۔ لیکن نہ وہ

Marfat.com

قرشی ہیں نہ رسول اللہ ﷺ کے صحابی! وہ بکر بن وائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جونہی حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو عراق سے شام بھیجا گیا، مثنیٰ عراق سے پسپا ہو کر حیرہ میں قلعہ بند ہو گئے، اور وہاں سے وہ اب مدینہ آئے ہیں کہ خلیفہ سے مدد کی درخواست کریں۔ ان تمام باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ ایران کے مقابلے میں ان کی پوزیشن کچھ ایسی بہتر نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس میں معذور بھی ہوں؟ اس لیے کہ ایران کا نام اس وقت بھی عرب کے دلوں میں دہشت پیدا کر دیتا تھا۔ پھر بعض لوگوں کا خیال یہ تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایرانیوں پر محض اس لیے غلبہ پالیا کہ ایرانی شروع ہی میں ان سے مرعوب ہو گئے تھے اور ان میں اتنی ہمت باقی نہ رہی تھی کہ اپنی پوری قوت سے حملہ کر کے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو پسپا کر دیتے۔ جب مسلمانوں کا حال یہ ہو تو وہ جنگ پر کیسے آمادہ ہو سکتے تھے جو ایک مصیبت بن کر ان کے سروں پر منڈلا رہی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ دعوت عرب کے زعماء اور اہل الرائے کے نزدیک معمولی نہ تھی اور جب یہ لوگ ہی پس و پیش کر رہے تھے، تو ظاہر ہے عوام میں اس سے بھی زیادہ ہچکچاہٹ ہو گی۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تھوڑی دیر کے لیے سر جھکا لیا اور اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئے۔ جہاں بیعت کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ عشاء کی نماز کے بعد لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ساری رات سوچ بچار میں گزار دی۔ صبح ہوئی تو مسجد میں اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے اور لوگوں نے پھر بیعت کرنی شروع کر دی۔ مؤذن نے ظہر کی اذان دی۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بلند آواز میں لوگوں کو حکم دیا کہ مرتدین کے غلام ان کے رشتہ داروں کو واپس کر دیئے جائیں اور توجیہاً فرمایا:

''میں اسے پسند نہیں کرتا کہ عربوں میں غلامی کی رسم قائم ہو جائے۔''

لوگوں نے یہ حکم سنا تو ان کی نگاہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چہرے پر جم کے رہ گئیں اور وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھنے لگے، ''یہ چاہتے کیا ہیں؟ مسلمانوں نے ارتداد کی جنگوں میں عربوں کو خلیفہ اول کے حکم سے غلام بنایا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جزیرہ نمائے عرب کے گوشے گوشے میں اعلان کرا دیا تھا کہ میں نے فوج کے تمام سرداروں کو یہ حکم دے دیا ہے کہ وہ اسلام کے سوا مرتدین کی اور کوئی پیشکش قبول نہ کریں۔ جو کوئی انکار کرے اس سے لڑیں اور جو ہاتھ آئے اسے نہ چھوڑیں۔ انہیں قتل کریں، ان کے گھروں کو آگ لگا دیں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیں۔ تو کیا اب اس حکم سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ ہے کہ وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ

Marfat.com

کے حکم کی مخالفت کریں، ان کی راہ چھوڑ کر کسی دوسرے رستے پر چلیں؟ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ مثنیٰ کی امداد کے لیے مختلف قبائل عرب کا دل اس طرح مٹھی میں لینا چاہتے ہیں؟ بات چاہے کچھ ہو، یہ واقعہ ہے کہ ان کا یہ حکم ملکی سیاست میں بالکل نیا ہے جس پر نظر رکھتی ہے اور جو باہمی مشاورت کا متقاضی ہے۔

سچ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد گذشتہ دو راتوں سے سو نہیں سکے تھے، لوگ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے پیمان و وصیت کے احترام میں ان سے بیعت کر رہے تھے تاہم ان کے اکثر زعماء حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شدت اور درشتی کے سبب انہیں پسند نہیں کرتے تھے، پھر ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے دل میں خلافت کی امید رکھتے تھے، لیکن حکومت کے معاملات کبھی مستحکم بنیادوں پر نہیں چل سکتے تاوقتیکہ اہل الرائے اس کی سیاست میں ذمہ دارانہ حیثیت سے شریک نہ ہوں اور مرحلہ اتنا نازک تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے وقت کے حوالے کر کے خدا سے یہ دعا مانگنے پر اکتفا نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ان کے دل میں لوگوں کی اور لوگوں کے دل میں ان کی محبت پیدا کر دے! اگر اس موقع پر ہمت و جرأت سے کام نہ لیا جاتا تو ملکی سیاست میں تشویشناک صورت حال پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ لیکن اس حکم سے کہ غلاموں کو ان کے رشتہ داروں کے پاس بھیج دیا جائے، قبائل عرب کی تالیف قلب ہو گئی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی سختی سے نفرت کرنے والے دلوں کو جیت لیا تھا۔ اب انہیں بے کھٹکے اپنی پالیسی پر کاربند ہو جانا چاہیے تھا! چنانچہ تیسرے دن جب وہ مسجد میں تشریف لائے اور لوگ ان کی بیعت سے فارغ ہو گئے تو اٹھے اور فرمایا:

''عرب کی مثال ایک نکیل پڑے اونٹ کی سی ہے جو اپنے ساربان کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ یہ دیکھنا ساربان کا فرض ہے کہ وہ اسے کس طرف لے جائے۔ قسم ہے مجھے رب کعبہ کی! میں انہیں راہ راست پر لا کے چھوڑوں گا۔''

نگاہیں اور بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چہرے پر جم گئیں اور مسجد میں جتنے لوگ تھے ان سب نے یہی گمان کیا کہ یہ شخص اپنی سختی اور درشتی کی بنا پر ان کے لیے عذاب کا تازیانہ بن کر رہے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے چہروں کو پڑھ لیا اور جب لوگ ظہر کی نماز کے لیے جمع ہوئے تو منبر پر چڑھ کے فرمایا:

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ لوگ میری سختی سے ڈرتے اور میری درشتی سے کانپتے ہیں۔ وہ کہتے

Marfat.com

ہیں، عمر رضی اللہ عنہ اُس وقت بھی ہم پر سختی کرتا تھا جب رسول اللہ ﷺ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم تھا۔ پھر وہ اس وقت بھی ہم سے سختی کے ساتھ پیش آتا رہا جب ہمارے اور اس کے درمیان حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حائل تھے، لیکن اب کیا ہوگا جب کہ تمام معاملات اسی کے ہاتھ میں ہیں اور جو بھی یہ کہتا ہے ٹھیک کہتا ہے...... مجھے رسول اللہ ﷺ کی مصاحبت کا شرف حاصل تھا۔ میں سرکار دو عالم ﷺ کا غلام اور ادنیٰ چاکر تھا اور کوئی نہ تھا جو نرمی اور رحمدلی میں آپ ﷺ کو پہنچ سکتا۔ جیسا کہ اللہ نے بھی فرمایا ہے، ''وہ مومنین کے لیے رافت ورحمت کا سرچشمہ ہیں۔'' بارگاہ رسالت ﷺ میں میری حیثیت ایک برہنہ شمشیر کی سی تھی، جب حضور ﷺ چاہتے، مجھے نیام میں فرمالیتے اور جب چاہتے اذن کار عطا کر دیتے۔ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اسی طرح رہا یہاں تک کہ اللہ نے آپ ﷺ کو یاد فرمالیا۔ حضور ﷺ آخر وقت تک مجھ سے خوش رہے، اس پر میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں اور اس سعادت پر مجھے فخر ہے۔''

اس کے بعد مسلمانوں کی زمام کار ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سپرد کی گئی، جن کے تحمل، کرم اور نرمی سے انکار نہیں، اور میں ان کا بھی خادم اور مددگار تھا۔ اپنی سختی کو ان کی نرمی میں سمو دیتا تھا۔ میں ایک برہنہ تلوار تھا، جسے وہ نیام میں کر لیتے تھے یا اپنا کام کر کے چھوڑ دیتے تھے۔ میں اسی طرح ان کے ساتھ بھی رہا، یہاں تک کہ اللہ نے انہیں بھی ہم سے جدا کر دیا اور وہ آخر دم تک مجھ سے خوش تھے۔ اس پر میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں اور اس سعادت پر مجھے خوشی ہے۔

اور اب کہ اے لوگو! تمہارے معاملات کی ذمہ داری میرے شانوں پر رکھ دی گئی ہے تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ سختی اب نرمی سے بدل گئی ہے، لیکن ان لوگوں پر بدستور قائم ہے جو مسلمانوں پر ظلم اور زیادتی کرتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو امن وسلامتی سے رہتے اور جرأت ایمانی رکھتے ہیں سو ان کے لیے میں سب سے زیادہ نرم ہوں۔ اگر کوئی کسی پر ظلم یا کسی کے ساتھ زیادتی کرے گا تو میں اس وقت تک اسے نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر نہ ٹکا دوں اور دوسرے رخسار پر اپنا پاؤں نہ رکھ دوں، تا آنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز نہ ہو جائے، لیکن اپنی اس تمام تر شدت کے باوجود اہل عفاف اور اہل کفاف کے لیے میں خود اپنا رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔

لوگو! مجھ پر تمہارے چند حقوق ہیں جو میں تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں۔ اپنے یہ حقوق مجھ سے حاصل کرو۔ مجھ پر تمہارا یہ حق ہے کہ تمہارے خراج اور اس غنیمت میں سے جو اللہ تمہیں عطا

کرے کوئی چیز ناحق نہ لوں۔ مجھ پر تمہارا یہ حق ہے کہ جب تم میں سے کوئی میرے پاس آئے تو مجھ سے اپنا حق لے کر جائے۔ مجھ پر تمہارا یہ حق ہے کہ ان شاء اللہ میں تمہارے عطیات و وظائف میں اضافہ اور تمہاری سرحدوں کو مستحکم کردوں اور مجھ پر تمہارا یہ حق ہے کہ تمہیں ہلاکت میں نہ ڈالوں، تمہیں گھر واپس آنے سے نہ روکے رکھوں اور جب تم کسی جنگ پر جاؤ تو ایک باپ کی طرح تمہارے اہل و عیال کی نگہداری کروں!

اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو! مجھ سے درگزر کر کے میرے ہاتھ بٹاؤ! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں میری مدد کرو! اور تمہاری جو خدمات اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کی ہیں ان کے متعلق مجھے نصیحت کرو۔ میں تم سے یہ بات کہہ رہا ہوں اور اپنے اور تمہارے لیے اللہ سے مغفرت طلب کر رہا ہوں!''

یہ کہہ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر سے اترے اور لوگوں کو نماز پڑھائی۔ نماز پڑھا کے مسجد سے تشریف لے گئے اور لوگوں نے جو کچھ ان سے سنا تھا اس پر غور کرنے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ظاہر و باطن ایک ہے اور ان کے دل اور زبان میں کوئی فرق نہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی سختی اور درشتی کے باوجود انصاف پسند انسان ہیں اور ابھی بھی انہوں نے فرمایا ہے کہ ان کی سختی صرف ظالموں کے لیے ہوگی۔ وہ دھوکا نہیں دے رہے تھے جب کہہ رہے تھے کہ پر امن اور نیک لوگوں کے لیے وہ سب سے زیادہ نرم ہوں گے۔ چنانچہ بعض موقعوں پر انہوں نے ان کی رقت اور نرم دلی کے ایسے مناظر بھی دیکھے تھے جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا، جنہیں بھلایا نہیں جا سکتا، پھر انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ ان کے عطیات و وظائف میں اضافہ کریں گے اور جب وہ محاذ جنگ پر ہوں گے تو ان کے اہل و عیال کی نگرانی اور دیکھ بھال ایک باپ کی طرح کریں گے۔ تو کیا وہ اس کے مستحق نہیں ہیں کہ ان پر پوری طرح اعتماد کیا جائے اور جب وہ کسی مقصد کی طرف بلائیں تو جواب میں لبیک کہا جائے؟

حاضرین میں سے اکثر یہی سوچ رہے تھے لیکن ان کے زعماء ابھی تک نقطہ گریز سے نہیں ہٹے تھے، ان میں سے کچھ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کو ناپسند کرتے تھے اور بہت سے ایسے تھے جو شام اور عراق میں مسلمانوں کی خطرناک پوزیشن سے خوف زدہ تھے۔ عصر کی نماز کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر لوگوں سے اپیل کی کہ وہ مثنیٰ کے ساتھ جائیں، لیکن لوگ اسی طرح ہچکچاتے رہے۔ مثنیٰ اس وقت موجود تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اصرار کر رہے تھے کہ تائبین ارتداد کو ان کی مدد کے

Marfat.com

لیے بھیجا جائے، اس لیے کہ وہ ایرانیوں سے جنگ کرنے کے بڑے شائق تھے۔ ان کے اصرار میں اس وقت اور بھی شدت پیدا ہوگئی جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ مرتدین کے غلام ان کے رشتہ داروں کو واپس کر دیئے جائیں۔ انہیں امید تھی کہ یہ حکم تائبین کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ان کے ساتھ جانے پر ابھارے گا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی درخواست کا جواب دینے میں تاخیر کی اور انہوں نے دیکھا کہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت سے مطمئن ہو کر ان کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں تو انہیں یہ امید پیدا ہوگئی کہ خلیفہ کی اپیل پر لوگ ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو جائیں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ لوگ اب بھی ہچکچا رہے تھے اور ان کے چہرے پکار پکار کر کہہ رہے تھے ہم ایرانیوں کی صورت کو انتہائی مکروہ سمجھتے ہیں۔ مثنیٰ نے محسوس کیا کہ ایران اپنے غیر معمولی اقتدار، دبدبہ، شوکت وعظمت اور غلبہ استیلاء کی بناء پر ان کے لیے ایک ایسا بوجھ بنا ہوا ہے جسے وہ اٹھا نہیں سکتے۔ یہ دیکھ کر وہ تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور بولے:

''لوگو! ایران کو ہوّا نہ سمجھو! ہم اس کے سبزہ زاروں کے قلب میں بیٹھے ہیں۔ ہم نے اس کے بہترین حصے پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ہم ان کے ملک میں آدھے کے شریک ہیں اور یہ حصہ ہم نے انہی سے حاصلکیا ہے۔ ہم میں سے جو کوئی ان کے مقابلے پر آیا، ان پر دلیر ہوا اور ان شاء اللہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مثنیٰ کی یہ باتیں سنیں اور دیکھا کہ حاضرین پر ان کا اثر اچھا پڑا ہے، چنانچہ وہ کھڑے ہوئے اور اپنی تقریر میں فرمایا:

''حجاز ایک ایسی جگہ ہے جو تمہیں صرف گزارے کے لائق ہی دے سکتی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ کہاں ہیں اپنا گھر بار چھوڑ کے اللہ کے وعدے کی طرف جھپٹنے والے؟ آئیں، اور اس سرزمین میں پھیل جائیں جس کے متعلق اللہ نے اپنی کتاب میں وعدہ کیا ہے کہ وہ تمہیں اس کا وارث بنائے گا۔ چنانچہ فرماتا ہے: ﴿لیظھرہ علی الدین کلہ﴾ (کہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے) اور اللہ اپنے دین کو غالب کرنے والا، اس کے مددگار کو عزت دینے والا اور اس کے حلقہ بگوشوں کو قوموں کی میراث عطا کرنے والا ہے۔ کہاں ہیں اللہ کے نیک بندے؟''

مثنیٰ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقریروں سے حاضرین نے اپنے پس وپیش پر ذلت محسوس کی۔ انہوں نے سوچا: ''ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر چل کر اللہ کے دین کو سربلند کیا، آپ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا اور اللہ نے ہماری مدد کی۔ پھر ہمیں کیا ہوگیا ہے کہ ہم حضرت

Marfat.com

عمر رضی اللہ عنہ کی دعوت پر ٹس سے مس نہیں ہوتے؟'' ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھے کہ ہمت و جرأت سے کام لیں یا احتیاط اور گریز پر قائم رہیں کہ ابوعبید بن مسعود بن عمرو الثقفی رضی اللہ عنہ عراق جانے کے لیے آگے بڑھے۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس اہم کام کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ ان کے بعد سلیط بن قیس رضی اللہ عنہ نے آمادگی ظاہر کی اور پھر تو لوگوں کا ایک تانتا سا بندھ گیا، چنانچہ مدنی مجاہدین کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی۔ اس کمک کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے حد مسرور ہوئے، ان کا دل ادائے شکر الٰہی میں دھڑکنے لگا کہ اس نے بالآخر مسلمانوں کو جمود و بے حسی کی اس دلدل سے نکال ہی دیا، جس میں وہ بُری طرح پھنس گئے تھے اور جس سے ان کی بات بگڑ جانے کا بھی قوی امکان تھا۔

جو لوگ عراق جانے میں ہچر مچر کر رہے تھے اب انہوں نے سوچا: دیکھئے، مہاجرین اور انصار میں سے اس لشکر کا امیر کس کو بنایا جاتا ہے؟ انہیں ڈر تھا کہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس لشکر کی قیادت، جس میں مدینہ والوں کی بہت بڑی تعداد شامل ہے..... کسی غیر مدنی کے سپرد نہ کر دیں۔ چنانچہ اسی وقت لوگوں نے عرض کیا:

''اس فوج کی کمان کسی ایسے مہاجر یا انصاری کے حوالے فرمائیے جس نے اسلام میں سبقت کی ہو!''

لیکن اپنی خلافت کے ابتدائی تین دنوں میں ان کی مسلسل خاموشی اور پس و پیش دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دل ان کی طرف سے کھٹا ہو گیا تھا اور وہ ان سے ناراض تھے۔ اس لیے بغیر کسی تردد کے جواب دیا:

''نہیں! خدا کی قسم! میں ایسا کبھی نہیں کروں گا! اللہ نے تمہیں سربلندی اس لیے عطا فرمائی تھی کہ تم نے اسلام میں سبقت اور دشمنوں کا مقابلہ کرنے میں سرعت کا ثبوت دیا تھا لیکن جب تم بزدل ہو گئے اور دشمن کا سامنا کرنے سے جی چرانے لگے، تو امارت کے لیے وہ شخص تم پر فائق ہو گیا جس نے اپنے دین کی مدافعت اور قبول دعوت میں تم پر سبقت کی۔ خدا کی قسم! میں لشکر کی امارت اسی شخص کے سپرد کروں گا جس نے تم سب سے پہلے جہاد پر آمادگی ظاہر کی۔''

اس کے بعد ابوعبید رضی اللہ عنہ کو بلایا اور انہیں لشکر کا امیر بنا دیا۔ پھر سعد بن عبید رضی اللہ عنہ اور سلیط بن قیس رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا: ''اگر تم ابوعبید رضی اللہ عنہ پر سبقت کرتے تو فوج کی قیادت میں تمہارے سپرد کرتا اور تمہارے تقدم کا صلہ تمہیں ضرور دیتا۔''

Marfat.com

مثنیٰ بن حارثہ نے جب دیکھا کہ یہ لشکران کے ساتھ عراق جانے کو تیار ہے، تو وہ مطمئن ہو گئے۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اب مثنیٰ کو مدینے میں روکے رکھنا مناسب نہ سمجھا، چنانچہ انہیں حکم دیا کہ عراق جا کر اپنی فوج سے مل جائیں۔ پھر فرمایا: "جب تک یہ کمک نہ پہنچ جائے لڑائی سے گریز کرنا۔" نیا لشکر تیاری کرنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کی روانگی کا وقت آ گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو عبید رضی اللہ عنہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی بات ماننا اور انہیں مشورے میں شریک رکھنا، جب تک کوئی معاملہ واضح نہ ہو جائے، جلد بازی سے کام نہ لینا! یہ جنگ ہے اور جنگ میں کامیابی اس کے لیے ہے جس کی طبیعت میں ٹھہراؤ ہو اور جو موقع سے فائدہ اٹھانا جانتا ہو۔"

اس پُر پیچ مسئلے میں اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رہنمائی کی اور انہوں نے اپنی خلافت کے چار دن کے اندر اندر اس کو حل کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ دوسرے مسائل پر بھی غور کرتے رہے جو اس وقت انہیں درپیش تھے۔ چنانچہ انہوں نے شام کی صورت حال کا جائزہ لیا۔ نجران کے عیسائیوں کے متعلق سوچا اور ایک ایک کر کے ان تمام امور پر غور کیا، جن میں ان کی رائے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رائے سے مختلف تھی۔ درحقیقت وہ ایک ایسا طریق کار وضع کرنے کی فکر میں تھے جسے اختیار کر کے وہ اپنی رائے کو عملی جامہ پہنا سکیں اور مسلمانوں کو اپنے گرد جمع کر سکیں اور جب ان مسائل کے متعلق مسلمانوں کے سامنے انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا تو بڑی صاف گوئی اور انتہائی جرأت کے ساتھ کیا۔ نہ اس میں کسی تردد کو بار پانے دیا، نہ مدارات کو۔ اس سلسلے میں وہ ہر دشواری کا سامنا کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ اس لیے کہ برسر حق ہونے پر ایمان رکھتے تھے اور انہیں دل سے یقین تھا کہ اللہ ہر حال میں ان کی مدد کرے گا۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ عراق سے شام آئے اور وہاں اسلامی فوجوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی، لیکن ایک مہینے سے زیادہ گزر جانے پر بھی وہ رومی لشکر پر غالب نہ آ سکے بلکہ انہوں نے اس کا سامنا تک نہیں کیا۔ لہٰذا حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو فوج کی سپہ سالاری کے عہدے سے معزول اور ان کی جگہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو اس منصب پر مامور کرنے کا اس سے بہتر موقع اور کون سا ہو سکتا تھا؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہی کیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے دوسرے دن حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو اس سانحہ جان کاہ کی اطلاع بھیجی اور اس کے بعد ہی حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی

Marfat.com

اوران کی جگہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے تقرر کا حکم نامہ لکھ کر روانہ کیا جس میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو فوج کے اس حصے کی امارت سونپی جس کے امیر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام یرفا کے ہاتھ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی اوران کی جگہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی امارت کا حکم محمیہ بن زنیم اور شداد بن اوس کے ذریعے روانہ کیا۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کوان کی امارت کے حکم نامے میں نصیحت فرماتے ہوئے لکھا:

غنیمت کے لالچ میں مسلمانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالنا، نہ انہیں کسی ایسی جگہ ٹھہرانا جہاں کے حالات کا تمہیں پوری طرح علم نہ ہو۔ فوج کا کوئی دستہ نہ بھیجنا جب تک کہ سپاہیوں کی اچھی خاصی تعداد اس میں شامل نہ ہو۔ خبردار! جو تم نے مسلمانوں کو ہلاکت میں ڈالا! اللہ نے میرے ساتھ تمہیں اور تمہارے ساتھ مجھے آزمائش میں مبتلا کیا ہے۔ دنیا کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کرلو اور اپنا دل اس میں نہ الجھاؤ! ورنہ وہ تمہیں بھی اسی طرح ہلاک کردے گی جس طرح تم سے پہلے کے لوگوں کو ہلاک کرچکی ہے اور جن کی تباہی و بربادی تم بھی دیکھ چکے ہو۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول کرنے کی جرأت کیسے کی؟ جب کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ شام کی اسلامی فوجوں کے سپہ سالار تھے اور یہ فوجیں بڑی نازک پوزیشن میں تھیں؟ وہاں ان کا مقابلہ رومیوں سے تھا لیکن وہ ان کا سامنا تک نہ کرسکی تھیں اب تک نہ وہ رومیوں کا کچھ بگاڑ سکی تھیں اور نہ رومی ان کا بال بیکا کرسکے تھے۔ اس سے پہلے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عراق سے شام جائیں؟ یہ تھی اسلامی فوجوں کی صورت حال! جس میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے شام پہنچ جانے کے بعد بھی کوئی فرق نہ آیا تھا اور فریقین اپنے جمود کو توڑ کر دشمن پر حملہ کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کا انتظار کرتے رہے۔ ایسی صورت میں کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا اندیشہ نہ تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی کا حکم مسلمانوں کے بازو کمزور کردے گا اور اسلامی فوجوں کی پوزیشن اور بھی نازک ہوجائے گی اور کیا ان کے لیے یہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ کچھ اور انتظار کرلیتے اور جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ مسلمانوں کو اس تنگ اور دشوار گزار مقام سے نکال لے جاتے جس میں وہ پھنس گئے تھے، تو جو چاہتے حکم دے دیتے۔

بلاشبہ ان باتوں کو جنگ کے نشیب و فراز میں بڑا دخل ہے اور ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کی ناراضگی اور غصے کی پروا کیے بغیر، ان کی قدر و قیمت کا قرار واقعی لحاظ رکھا۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مسئلے پر ایک اور پہلو سے غور کیا تھا، اگر وہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ

کی معزولی کو جنگ کے خاتمے پر اٹھا رکھتے تو اس سے ان کی سیاست کو نقصان پہنچتا اور ان کی پالیسی خطرے میں پڑ جاتی۔ جنگ کا نتیجہ دو ہی صورتوں میں برآمد ہو سکتا تھا۔ مسلمانوں کی شکست یا ان کی فتح۔ اگر مسلمانوں کو شکست ہو جاتی تو اس شکست کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی کے لیے کافی نہیں سمجھا جا سکتا تھا اور اگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مسلمان کامیاب ہو جاتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں فتح و نصرت کے اس بلند مقام سے معزول نہیں کر سکتے تھے۔ ورنہ وہ اپنی روایتی جرأت سے کام لے کر اس وقت انہیں معزول کر بھی دیتے تو معاملہ انتہائی نازک صورت اختیار کر جاتا، لیکن چاہتے وہ بہر حال یہی تھے کہ شام یا شام کے سوا کسی اور محاذ پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے سپہ سالار لشکر نہ ہوں، اس لیے انہوں نے بہ عجلت تمام ان کی معزولی کا حکم صادر کر دیا اس سلسلے میں ایک اور عذر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تھا اور وہ یہ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جس مقصد کے لیے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو عراق سے شام بھیجا تھا وہ اسے پورا نہ کر سکے تھے، اب اگر اس کے بعد مسلمانوں کو فتح حاصل ہو جائے تو کوئی زبان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام پر اعتراض کی جرأت نہ کر سکے گی، اس لیے کہ انہوں نے جو کچھ کیا حق سمجھ کر کیا۔

آج تک یہ سوال کیا جاتا ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول کیے جانے کا راز کیا ہے؟ جب کہ لسان نبوت ﷺ نے انہیں ''سیف اللہ'' کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ فتنہ ارتداد کا انہوں نے خاتمہ کیا تھا اور عراق کی فتح ان کی رہین منت تھی، ان کی شجاعت ناقابل تسخیر اور ان کی جنگی مہارت عدیم المثال تھی۔ کیا واقعی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محض اس لیے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول کیا تھا کہ انہوں نے مالک بن نویرہ کو قتل کر کے اس کی بیوی سے شادی کر لی تھی یا انہیں اس بات کا اندیشہ تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی مسلسل فتوحات نے لوگوں کے دلوں میں جو گرویدگی ان کے لیے پیدا کر دی ہے، وہ کہیں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو گمراہ نہ کر دے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی گمراہی حکومت کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے!

بعض لوگوں نے اس دوسری رائے کی تائید کی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اپنی معزولی کا سبب پوچھنے مدینہ آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں نے تمہیں کسی شبہے کی بنیاد پر معزول نہیں کیا، لوگ تمہارے بہت گرویدہ ہو گئے تھے...... مجھے ڈر پیدا ہوا کہ ان کی یہ گرویدگی تمہیں گمراہ نہ کر دے''...... لیکن یہ روایت غیر مستند ہے اور صحیح یہ ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اپنی معزولی کے بعد مدینہ نہیں گئے بلکہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت شام کی

Marfat.com

معرکہ آرائیوں میں مصروف رہے یہاں تک کہ سنہ 16ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو تمام فوجی خدمات سے محروم کر دیا۔ اسی طرح میں یہ بھی نہیں سمجھتا کہ ان کی معزولی کا سبب مالک بن نویرہ کا قتل تھا۔ اس واقعہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں دو سال کا وقفہ ہے۔ اس وقفے میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی قائدانہ عبقریت اپنے انتہائی نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھی اور یمامہ و عراق کی جنگوں میں ان کے کارہائے نمایاں جزیرہ نمائے عرب اور ایران و روم میں زبان زد خاص و عام ہو چکے تھے۔ میرے نزدیک حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی کا اصل سبب یہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت سے پہلے اور اس کے دوران میں ان دونوں حضرات کے درمیان باہمی اعتماد کا رشتہ قائم نہ رہا تھا۔

میری مراد یہ نہیں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی عبقریت اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انصاف پر بھروسہ نہیں تھا۔ میں تو اس اعتماد کی بات کر رہا ہوں جو ایک شخص کے دل میں اپنے دوست کے لیے حسن ظن پیدا کرتا ہے جس کے زیر اثر دوست کی کمزوریاں نظر انداز ہو جاتی ہیں اور خوبیاں دوگنی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں۔

ہماری اس رائے پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ خلافت کا منصب کسی ذاتی غرض کے لیے نہیں، عامۃ المسلمین کے مجموعی مفاد کے لیے تھا، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرض تھا کہ وہ اپنے اور خالد رضی اللہ عنہ کے ذاتی اختلافات کو بھول جاتے اور ''سیف اللہ'' کو اپنا کام کرنے دیتے۔ انہیں چاہیے تھا کہ اس باب میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی پالیسی کو اپناتے اور شخصی کارناموں کی قدر افزائی...... ذاتی خواہشات و میلانات سے بلند قدر افزائی...... کر کے مسلمانوں کے لیے ایک مثال قائم کر دیتے۔ بلاشبہ یہ اعتراض نظری منطق کے اعتبار سے بڑا وزن رکھتا ہے، لیکن یہ وزن بالکل ختم ہو جاتا ہے جب ہم اسے زندگی کے واقعاتی پہلو پر منطبق کرتے ہیں۔ ہم اس جمعیت انسانی کے افراد، زندگی کے مسائل میں تنہا اپنی عقلوں سے ہی کام نہیں لیتے بلکہ ہم پر ہمارے جذبات کا بھی قرار واقعی اقتدار ہے اور اس میں عملی طور پر ذاتی یا غیر ذاتی مسئلے کی کوئی قید نہیں۔ اس لیے کہ جب ہم کسی مسئلے کو عملی شکل دیتے ہیں تو اپنے جذبات سے بھی اتنے ہی متاثر ہوتے ہیں جتنے کہ اپنی عقل سے بلکہ کبھی کبھی تو ہمارے رجحانات میں عقل سے زیادہ جذبات کا دخل ہوتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ جذبات کے حکم اور عقل کے حکم میں ہم کوئی حد فاصل قائم کر سکیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض لوگ جذبات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور بعض عقل سے۔ لیکن مقدار کا اختلاف ہمارے احکام کی توجیہ میں عقل و جذبات کے امتزاج کو نہیں بدلتا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے مسئلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے جذبات سے متاثر تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بغیر کسی نرمی کے نہایت جرأت کے ساتھ مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے حل کرتے وقت ان کی نظر نظم عام اور حکومت کے امن و سلامتی پر رہی۔

لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول کر دینا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے کوئی انوکھا کام نہ تھا۔ اگر چہ وہ اپنی نوعیت کا پہلا کام ضرور تھا، بلکہ یہ ان کی وہ پالیسی تھی جو انہوں نے اپنے عمال کے لیے وضع کی تھی اور جس پر وہ اپنے تمام دور خلافت میں عمل پیرا رہے۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اپنے گورنروں اور امیروں سے باز پرس کرنا ان کی ایک عام روش تھی۔ وہ انہیں مدینہ بلاتے اور جو شکایتیں ان کے خلاف دربار خلافت مین موصول ہوتیں ان کی چھان بین کرتے اور جو کوئی اپنے کسی فعل کی مصلحت و دیانت ثابت کرنے میں ناکام رہتا اسے معزول فرما دیتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سارا اقتدار صرف اپنے ہی ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ منصب خلافت پر فائز ہوتے ہی سب سے پہلی بات جو انہوں نے کہی تھی، یہ تھی: ''خدا کی قسم! تمہارا جو معاملہ میرے سامنے آئے گا۔ میرے سوا کوئی اسے طے نہ کرے گا اور جو میری نگاہوں سے دور ہوگا اس میں بھی تا حد امکان کفایت و امانت کو ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔ اگر لوگوں نے میرے ساتھ بھلائی کی تو میں بھی یقیناً ان کے ساتھ بھلائی کروں گا اور اگر برائی کے ساتھ پیش آئے تو میں انہیں ضرور عبرت ناک سزا دوں گا۔''

ملکی سیاست کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ رائے خالد رضی اللہ عنہ سے ان کے سوئے ظن اور ان دونوں حضرات کے درمیان اعتماد اور محبت کے فقدان سے ملتی ہے تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی کا راز اپنے چہرے سے نقاب اٹھا دیتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ راز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذہن میں کہاں چھپا ہوا تھا؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو فوج کی سپہ سالاری سے معزول کر کے یہ عہدہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا لیکن اس سے روم کے مقابلے مین مسلمانوں کے موقف پر کوئی اثر نہ پڑا۔ نہ ان کی طاقت ہی میں کوئی فرق آیا۔ بلکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو شاید اس معاملے کے برعکس ہوتا اور مسلمانوں کو کسی عظیم ہلاکت سے دوچار ہونا پڑ جاتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حکم دے کر کہ مرتدین کے غلام ان کے رشتہ داروں کو واپس کر دیے جائیں، ان کے دلوں کو مسخر کر لیا تھا، چنانچہ تائبین اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے چاروں طرف

سے دوڑ دوڑ کر آنے لگے۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ جنگ میں حصہ لے کر اپنے دامن ارتداد کے داغ کو بھی دھو دیں اور مسلمانوں کی طرح اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے مال غنیمت بھی حاصل کر لیں۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ کی اس توفیق پر اطمینان کا سانس لیا جو اس نے جزیرہ نمائے عرب سے باہر لڑنے والی اسلامی فوجوں کو خطرے سے نکالنے کے لیے انہیں عطا فرمائی تھی اور اپنی فکر کو ایک دوسرے مسئلے کی طرف متوجہ کر دیا جو رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سیاست سے بنیادی طور پر اتفاق رکھتا تھا۔ اگرچہ بعض تفصیلات میں اس سے مختلف تھا۔

وہ مسئلہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے تمام انسانوں کو اللہ کے دین کی طرف بلایا اور اپنی دعوت میں اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کی تفریق نہیں فرمائی۔ مدینہ کے یہودیوں نے اس دعوت کو اپنے لیے خطرہ سمجھا اور رسول اللہ ﷺ سے عقیدے کی آزادی پر صلح کر لی۔ لیکن جیسے ہی دعوت اسلام کے قدم جمتے دیکھے، اپنے عہد سے پھر گئے۔ مجبوراً مسلمانوں نے ان سے جنگ کی اور انہیں مدینہ اور جزیرہ نمائے عرب کی مختلف یہودی بستیوں سے نکال باہر کیا۔ صرف گنتی کے وہ یہودی باقی رہ گئے، جنہوں نے جنگ خیبر کے بعد اس شرط پر صلح کر لی تھی کہ وہ اپنی زمینوں میں کھیتی باڑی کرتے رہیں گے اور اس کے بدلے نصف غلہ مسلمانوں کو دے دیا کریں گے۔ لیکن نجران کے عیسائیوں نے رسول اللہ ﷺ سے بحث مباحثے کے لیے ایک وفد بھیجا اور جب حضور ﷺ نے انہیں دعوت دی کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں، کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ کے سوا کسی کو اپنا پروردگار نہ بنائیں، تو یہ دعوت انہوں نے قبول نہ کی اور اپنے ملک واپس چلے گئے اس کے بعد انہوں نے بارگاہ رسالت ﷺ میں ایک اور وفد بھیجا، جس نے اس شرط پر مسلمانوں سے صلح کر لی کہ نجران کے عیسائیوں کو عقیدے کی آزادی حاصل ہو گی اور اس کی قیمت وہ جزیہ کی صورت میں ادا کرتے رہیں گے۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو انہوں نے اس معاملے کو جوں کا توں رہنے دیا اور نجران کے عیسائیوں کے ساتھ اسی شرط پر معاہدہ کر لیا جس شرط پر عہد رسالت ﷺ میں ہوا تھا۔ بالکل یہی صورت حال خیبر کے یہودیوں کے ساتھ بھی رہی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس دن عنان خلافت سنبھالی، اس مسئلے کو ایک نئے زاویے سے دیکھا۔ آپ نے یعلی بن امیہ کو بلا کر کہا کہ نجران کے عیسائیوں کو جلا وطن کر دیا جائے، پھر فرمایا "انہیں اسلام کی دعوت دو لیکن جبراً تبدیل مذہب پر آمادہ نہ کرو! اس کے بعد جو اپنے دین پر قائم رہے اسے جلا وطن کر دو اور جو اسلام قبول کر لے اسے رہنے دو! جو زمین وہ چھوڑیں اس کی پیمائش

اور جہاں وہ چاہیں انہیں جانے دو! اور اعلان کر دو کہ ہم انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم سے جلاوطن کر رہے ہیں۔ ان کا حکم ہے کہ جزیرہ نمائے عرب میں دو دین نہ رہیں۔ اس لیے جو اپنا دین نہ چھوڑے وہ یہاں سے چلا جائے۔ بعد میں ہم انہیں ویسی ہی زمین دے دیں گے جیسی وہ چھوڑ کے گئے ہوں گے، اس لیے کہ یہ ان کا ہم پر حق ہے اور اس فرض کی ادائیگی بھی، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ نجران کے جلاوطن عیسائیوں، ان کے ہم جوار اہل یمن اور ساحلی علاقے کے ان لوگوں کو جو ان کے پڑوس میں آ کر آباد ہو گئے، ان کا معاوضہ دے دو!

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ پالیسی اختیار کر کے رسول اللہ ﷺ کی سنت اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اتباع سنت کے خلاف قدم اٹھایا ہے اس لیے مستشرقین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام پر اعتراض کرتے ہیں۔ جس کے ڈانڈے ملامت سے جا ملتے ہیں لیکن مسلمان مؤرخین اس سلسلے میں انہیں معذور قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نجران کے عیسائیوں سے یہ معاہدہ فرمایا تھا کہ انہیں تبدیل مذہب پر مجبور نہیں کیا جائے گا! بشرطیکہ وہ معاہدے کا لحاظ رکھیں، نصیحت کی راہ اختیار کریں اور خنزیر نہ کھائیں! لیکن انہوں نے پہلے سے کہیں زیادہ خنزیر کھانا شروع کر دیا اور اس طرح معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ اس بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں جزیرہ نمائے عرب سے نکال دینے میں بالکل حق بجانب تھے۔

کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ ان کا آپس میں اختلاف ہو گیا تھا اور اس اختلاف نے شدت اختیار کر لی تھی۔ اس لیے انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ انہیں کہیں اور منتقل کر دیا جائے۔

ان دونوں گروہوں سے ہٹ کر کچھ لوگوں نے یہ راہ اختیار کی ہے کہ عیسائیوں کی طاقت بڑھتی جا رہی تھی، اس خوف سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں جلاوطن کر دیا۔ یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے، صحیح ہو یا غلط، اس سے میرے نقطہ نظر پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ میری رائے میں یہ وہ اسباب نہیں تھے جن کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عیسائیوں کو جزیرہ نمائے عرب سے نکال دینے کا عزم صمیم فرمایا۔ بلکہ اس کا اصل سبب ملکی سیاست میں وہ عام قطع و برید تھی جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے خوب اچھی طرح غور کیا اور اطمینان حاصل کرنے کے بعد جرأت و انصاف کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہو گئے۔

اس قطع و برید پر محاکمہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تعصب کے اس الزام سے بری قرار دیں جو بعض مستشرقین نے ان پر لگایا ہے۔ دور حاضر میں عقیدے کی آزادی کو جو اہمیت حاصل ہے۔ مستشرقین اسے حجت بنا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فعل پر نکتہ چینی کرتے

ہیں لیکن یہ وہ غلطی ہے جس نے حقیقت سے لاعلمی کی آغوش میں جنم لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں عقیدہ اجتماعی زندگی کی حقیقی بنیاد تھا اور اجتماعی عقیدے کے مخالف یا اس سے بغاوت کرنے والے جماعت کے مخالف بلکہ اس کے باغی تصور کیے جاتے تھے۔ اس بنا پر ان لوگوں سے جنگ کرنا صاحب امر کے لیے جائز ہی نہیں بلکہ اس کا فرض تھا۔ اسی لیے اللہ اور اس کے دین کی طرف دعوت دینے پر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کی گئی اور اسی لیے عقیدے کی بنا پر روم اور ایران کے درمیان ہولناک لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا اور زیادہ دور کیوں جائیے آج سے کچھ ہی دنوں پہلے کی بات ہے کہ یورپ اور غیر یورپ میں یہی کچھ ہوتا رہا۔ اسی عقیدے نے عیسائیوں اور مسلمانوں میں صلیبی جنگیں برپا کرائیں اور اسی عقیدے نے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کو قتل وخونریزی کے جہنم میں جھونکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں سے اس لیے معاہدہ فرمایا تھا کہ اس وقت تک جزیرہ نمائے عرب کی سیاسی وحدت مکمل نہیں ہوئی تھی۔ نجران یمن سے متصل تھا اور یمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان عیسائیوں کے درمیان یہ معاہدہ ہونے کے بعد بھی ایک مدت تک شرک پر قائم رہا، چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تخت خلافت پر جلوہ افروز ہوئے تو یمن ان لوگوں کی صف اول میں تھا جنہوں نے مدینہ کے اقتدار سے بغاوت کی تھی اور جو اسلام سے منحرف ہو گیا تھا۔ اس بنا پر یہ بالکل فطری امر تھا کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ بھی نجران کے ان عیسائیوں سے اسی شرط پر معاہدہ کر لیں جس شرط پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معاہدہ فرمایا تھا، ارتداد کی جنگیں باغیوں اور مرتدین کے مکمل استیصال پر ختم ہوئیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ عراق اور شام کی معرکہ آرائیوں نے بھی جزیرہ نمائے عرب کے مختلف گوشوں میں دینی اور سیاسی وحدت کے قیام میں بڑی مدد دی، چنانچہ وہ ایک متحدہ سلطنت بن گئی جس کا دارالخلافہ مدینہ تھا اور جس کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ، اور اس طرح جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی امارت سنبھالی، وہ اسباب بالکلیہ ختم ہو چکے تھے جو عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد صدیقی رضی اللہ عنہ میں معاہدہ نجران کی اساس تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے وقت آ گیا تھا کہ وہ ایک ایسی مملکت کے لیے نئی سیاسی پالیسی مرتب کریں جس کے اجزاء جزیرہ نمائے عرب کے شمال سے جنوب تک متحد ہو چکے ہیں اور جس کا دارالخلافہ بغیر کسی اختلاف ونزاع کے مدینہ قرار پا چکا ہے۔

Marfat.com

عرب کا سارا ملک ایک ایسی متحدہ سلطنت بن چکا تھا جس کا مذہب ایک تھا اور جس کی باگ ڈور اس شخص کے ہاتھ میں تھی جس کے ہاتھ پر ملک کے عوام نے بالاتفاق بیعت کی تھی، چنانچہ اس مملکت کے امیر کا فرض تھا کہ ان تمام اسباب کا قلع قمع کر دے جو ملک کو کمزوری کی طرف لے جاتے ہوں اور کسی قوم کی کمزوری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس کے افراد مختلف جنسوں اور ایسے متعدد مذہبوں میں بٹے ہوئے ہوں جن کا اپنے ماننے والوں پر غیر معمولی اثر و اقتدار ہو۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہمیشہ سے مسلم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج سے کچھ ہی دنوں پہلے تک ایسے معاہدات مرتب کیے گئے ہیں، جن کی رو سے ایک نسل کے افراد کسی خاص علاقے میں منتقل ہو گئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی ترقی یافتہ قوم اسے برداشت نہیں کرتی کہ اس میں ایک سے زیادہ قانون رائج ہوں۔ اسلام کے بعض احکام عیسائیت سے کلیتہً اختلاف رکھتے ہیں۔ اسلام سود سے منع کرتا ہے لیکن عیسائیت اسے جائز سمجھتی ہے۔ اسلام شراب کو حرام قرار دیتا ہے لیکن عیسائیت میں شراب حلال ہے۔ اسلام ایک خدا کو مانتا ہے لیکن عیسائیت تین خداؤں کی قائل ہے اور یہ وہ مقررات ہیں جن کا اس زمانے میں اتنا اثر تھا کہ ان سے کوئی شخص بے تعصبی نہ برت سکتا تھا جس طرح آج کل عقیدے کی آزادی کے نام پر برتی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے کوئی تعجب نہیں اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر اصرار کیا ہو کہ جزیرہ نمائے عرب میں بہ یک وقت دو مذہب یکجا نہیں رہنے دیئے جا سکتے جب کہ ملک کے تمام عربوں کا صرف ایک ہی مذہب تھا جو انہوں نے عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں قبول کیا تھا اور عہد صدیقی رضی اللہ عنہ میں اس سے منحرف ہو کر بھی پھر اسی کی طرف رجوع ہوئے تھے۔ یہ مذہبی اتحاد اہل ملک کے آرام و اطمینان اور باہمی اتحاد کے استقرار و استحکام کی ضمانت تھا اور اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں ایسے جھگڑے پیدا نہ ہوں جو ان کے اطمینان و اتحاد کو پارہ پارہ کر دیں۔ چنانچہ یہی انہوں نے کیا اور اسی لیے یعلی بن امیہ کو بلا کر حکم دیا کہ نجران کے عیسائیوں کو جلاوطن کر دیا جائے۔

اس باب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل ستائش کا مستحق ہے نہ کہ اتہام و ملامت کا۔ انہوں نے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کی اکثریت کی طرح یہ نہیں کیا کہ اپنے مذہبی حریفوں کے خلاف ہنگامہ آراء ہوئے تو ایک دوسرے کو وحشیانہ مظالم کا نشانہ بنا کر انتہائی سفاکی اور بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا۔ بلکہ یعلی بن امیہ کو سب سے پہلے یہ تاکید کی کہ نجران کے عیسائیوں کو بالجبر تبدیل

Marfat.com

مذہب پر آمادہ نہ کیا جائے۔ اس کے برعکس انہیں پوری آزادی دی جائے کہ چاہیں تو اپنے مذہب پر قائم رہیں اور چاہیں تو اسلام قبول کر لیں اور اگر وہ ترک مذہب پر ترک وطن کو ترجیح دیں تو جزیرہ نمائے عرب کے باہر انہیں ایسی زمین دی جائے جو ہر اعتبار سے ان کی متروکہ زمین کے مماثل ہو۔ ان حالات میں ہر انصاف پسند یہی کہے گا کہ ان پر کوئی ظلم نہیں کیا گیا بلکہ ان کے ساتھ وہی شریفانہ سلوک روا رکھا گیا جو کسی اقلیت کو اس کی اکثریت کے علاقوں میں منتقل کرتے وقت آج کل کی ترقی یافتہ حکومتیں اس کے ساتھ روا رکھتی ہیں جہاں وہ نسلی یا مذہبی اختلاف کی بنا پر اپنی ہمسایہ اکثریت کے جور و ستم سے محفوظ رہ سکے۔

جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نجران کے عیسائیوں کی جلاوطنی کا حکم دے دیا ہے تو انہیں اس میں کوئی شبہ نہ رہا کہ اب یہودی اور دوسرے غیر مسلم بھی تمام جزیرہ نمائے عرب سے نکال دیئے جائیں گے، ہر چند کہ یہ سیاست ان کے لیے نئی تھی مگر انہوں نے اسے ناپسند نہ کیا اور نہ اس پر متعجب ہی ہوئے بلکہ زیادہ تعجب شاید انہیں اس وقت ہوا تھا جب ابو عبید ثقفی اس عراقی لشکر کے سردار بنائے گئے تھے جس میں مدینہ کے بڑے بڑے مہاجرین رضی اللہ عنہم اور انصار رضی اللہ عنہم شامل تھے اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ان کے نزدیک وہ لمحہ تھا جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو شامی قیادت سے معزول کیا گیا تھا۔ لیکن ان کا تجربہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ معاملات کو بڑی جرأت اور انصاف کے ساتھ طے کرتے ہیں اور انہیں یاد تھا کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد صدیقی میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ شام و عراق میں مسلمانوں کی پوزیشن بڑی نازک ہے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے خطبوں میں اپنی ذات سے صرف نظر کر کے عامۃ المسلمین کی بھلائی کے لیے ہمہ تن رجوع الی اللہ ہوتے ہیں۔

ان وجوہ کی بنا پر انہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ یہ تمام معاملات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری پر چھوڑ کر خود بارگاہ رب العزت میں انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ دعا مانگیں کہ جس طرح اللہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی توفیق سے نوازا تھا اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی ہدایت و نصرت سے بہرہ یاب فرمائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کوئی خطبہ ایسا نہ ہوتا تھا جو سامعین کے دلوں پر اپنا بھرپور اثر نہ چھوڑتا ہو،

Marfat.com

ان کے ایک ایک فقرے سے ان کا اخلاص جھلکتا تھا اور ان کے ایک ایک لفظ سے ان کی بے نفسی اور بارگاہ الٰہی میں مسلمانوں کے لیے خیر طلبی کے جذبے کا اظہار ہوتا تھا، وہ مسلمانوں سے فرمایا کرتے تھے:

''مجھے امید ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں گا انشاء اللہ تعالیٰ تمہاری خدمت کرنے میں حق کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑوں گا اور کوئی مسلمان، چاہے وہ محاذ جنگ ہی پر کیوں نہ ہو..... ایسا نہ ہوگا جسے اللہ کے مال میں سے اس کا حصہ نہ ملا ہوگا۔''

اور آپ کا ارشاد ہوتا تھا: میں مسلمان ہوں اور ایک بندہ ضعیف مگر یہ کہ اللہ عزوجل میری مدد فرمائے! تمہاری خلافت ان شاء اللہ میری فطرت میں کوئی تغیر پیدا نہیں کرے گی۔ عظمت صرف خدائے بزرگ و برتر کے لیے ہے بندوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ تم میں سے کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ جب سے عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوا ہے بدل گیا ہے۔ میں اپنا حق جانتا ہوں اور اپنی ایک ایک بات کھول کے تمہارے سامنے رکھتا ہوں اگر کسی کی کوئی حاجت پوری نہ ہوئی ہو، یا کسی پر ناحق ظلم کیا گیا ہو، یا کسی کو میرے مزاج سے، کوئی تکلیف پہنچی ہو تو وہ آ کے مجھے پکڑے کیونکہ میں بھی تم ہی جیسا ایک انسان ہوں..... مجھے تم سب سے زیادہ تمہاری بھلائی محبوب ہے اور تمہاری تکلیف مجھ پر ایک بوجھ ہے..... مجھے اپنی امانت اور ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس ہے۔ جو مسئلہ میرے سامنے آئے گا۔ انشاء اللہ العزیز میں خود ہی اسے حل کروں گا، کسی دوسرے پر نہیں چھوڑوں گا، مجھے صرف دیانت دار اور مخلص کارکنوں کی ضرورت ہے اور انشاء اللہ میں ایسے ہی لوگوں کو اپنی امانت سپرد کروں گا۔'' یہ اور اسی قسم کی باتیں تھیں جن سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے خطبوں سے عوام کا دل موہ لیتے تھے اور جب سے انہوں نے مرتدین کے غلاموں کو ان کے رشتہ داروں کے پاس واپس بھیجنے کا حکم دیا تھا، جزیرہ نمائے عرب کے اکثر باشندوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب انہوں نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر بنایا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول کیا اور نجران کے عیسائیوں کی جلاوطنی کا حکم دیا تو لوگوں نے ان میں سے کسی بات پر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔

حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے پیش رو کی روش سے ہٹ کر جن اقدامات سے اپنے عہد کا آغاز فرمایا تھا اور جن پر وہ نہایت مضبوطی سے قائم تھے عوام کے لیے وہ بلاشبہ ایک نئی بات تھی اور آخر انہیں کیا پڑی تھی کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس نئی سیاست کو ناپسند کرتے، یا اس پر معترض ہوتے جبکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک ایسے شخص ہیں جو بڑی سے بڑی مشکل سے نہیں گھبراتے، بڑے

Marfat.com

سے بڑا بوجھ اٹھانے سے نہیں جھجکتے اور توفیق الٰہی ہر پیچیدہ مسئلے میں ان کی رہنمائی کرتی ہے۔

ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد میں بیٹھے تھے یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ مسلمانوں کو اپنا سیاسی ہمنوا بنا چکنے کے بعد عملاً اس سیاست کا نفاذ کرنے والے تھے۔ اتنے میں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ آئے اور اس لشکر کو...... جو اسلامی پرچم تلے جمع تھا...... عراق لے جانے کی اجازت چاہی، ان کے پیچھے پیچھے اور بھی بہت سے لوگ آئے اور ''خلیفۂ رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ کہہ کہہ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سلام کرنے لگے۔ یہ لقب خود انہوں نے ایجاد کیا تھا، لیکن نطق و سماعت کے لیے اس میں جو ثقافت تھی اس پر وہ مطمئن نہ تھے اور اس لقب کی ناموزونی انہیں کھٹک رہی تھی۔ ابھی اس سلسلے میں وہ ایک دوسرے سے باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے یہ کہہ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سلام کیا: ''سلام اللہ علیک! یا امیر المومنین!''①

یہ نیا لقب سن کر لوگ بہت خوش ہوئے اور پسندیدگی ان کے لبوں پر مسکراہٹ بن کر نمایاں ہوگئی۔ اس دن کے بعد سے کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ''خلیفۂ رسول اللہ کے خلیفہ!'' کہہ کر خطاب نہیں کیا، بلکہ سب کے سب ''امیر المومنین'' کہنے لگے۔ اور یہ لقب ان کے اور ان کے بعد مسلمانوں کے خلفاء و سلاطین کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا۔

اب کہ مثنیٰ ہم سے پہلے ہی عراق روانہ ہو چکے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ جلد سے جلد ان سے مل کر ان کی داستان شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اپنے لشکر سمیت ہم سے آملیں اور اسلامی فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے کر اس بے نظیر شجاعت کا مظاہرہ کریں جو انجام کار ان کی شہادت پر منتج ہوئی۔

---

① حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سب سے پہلے کس نے ''امیر المومنین'' کہہ کر مخاطب کیا، اس کے متعلق ابن عساکر نے ''تاریخ دمشق'' میں دو روایتیں نقل کی ہیں جن میں پہلی روایت یہ ہے کہ وہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس خطاب سے مخاطب کیا۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کے گورنر کو لکھا کہ دو ذہین اور شریف آدمی میرے پاس بھیجو جن سے میں رعایا کے متعلق سوال کر سکوں۔ انہوں نے عدی بن حاتم طائی اور لبید بن ربیعہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ جب یہ دونوں مدینہ پہنچے تو اپنا سامان اتار کر مسجد کے صحن میں رکھا اور اندر داخل ہوئے۔ حضرت عمرو بن العاص سے ان کا سامنا ہوا اور انہوں نے کہا: ''امیر المومنین سے اذن حضور لے لیجیے!'' عمرو کہتے ہیں: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا اور کہا: 'امیر المومنین! عراق کے گورنر نے عدی بن حاتم اور لبید بن ربیعہ کو بھیجا ہے...... انہوں نے کہا: ''ہمارے لیے امیر المومنین سے اذن حضوری لے دیجیے!'' میں نے کہا: ''خدا کی قسم! تم دونوں نے بالکل ٹھیک کہا وہ ''امیر'' ہیں اور ہم ''مومنین''۔ اس دن سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہی خطاب ہوگیا اور مصنفین نے بھی اس کو رائج کر دیا۔)

Marfat.com

باب:6

ابو عبید رضی اللہ عنہ اور مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے کارنامے

عراق کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے ابو عبید بن مسعود الثقفی رضی اللہ عنہ تھے۔ اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کو امیر لشکر بنایا اور حکم دیا کہ تیاری کے بعد روانہ ہو جائیں۔ مثنیٰ بن حارثہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پہلے ہی بھیج دیا اور کہا: ''جب تک کمک نہ پہنچ جائے لڑائی شروع نہ کرنا۔'' مثنیٰ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور حیرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ سفر کر رہے تھے اور عہد صدیقی رضی اللہ عنہ کے واقعات انہیں یاد آ رہے تھے، جب علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ نے بحرین میں مرتدین کو شکست دی تھی اور یہ بھی ان سے جا ملے تھے۔ پھر ان دونوں نے ان شکست خوردہ مرتدین کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں، جنہوں نے زمین پر فتنہ و فساد کے شعلے بھڑکائے تھے۔ اس کے بعد یہ ایرانی دستوں کا مقابلہ کرتے اور ان کے حامی قبیلوں کو شکست دیتے ہوئے خلیج فارس کے کنارے کنارے چلے تھے، یہاں تک کہ فرات کے دہانے پر پہنچ گئے تھے۔ اس وقت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ان کی مدد کے لیے بھیجا تھا اور اس عبقری سپہ سالار کی قیادت میں اس کے دوش بدوش مثنیٰ نے کسریٰ کی فوجوں کو عبرت ناک شکست دی تھی، اس کے بعد یہ دونوں لشکر مختلف شہروں میں پھیل گئے تھے جس کے نتیجے میں حیرہ، انبار اور عین التمر وغیرہ مقامات فتح ہوئے تھے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ فیراض پہنچ گئے تھے جو شمالی عراق میں شام کی سرحد پر واقع ہے۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے قدم اکاسرہ کی سرزمین میں جم چکے تھے۔ مثنیٰ کو ان فتوحات کی بے حد خوشی تھی۔ وہ حیرہ اور اس کے گرد نواح میں اپنی فوجوں کے ساتھ ایک سال سے زیادہ مقیم رہے۔ اچانک حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے نام حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا یہ حکم پہنچا کہ وہ شام جا کر اس لشکر کی کمان سنبھالیں جو رومیوں سے لڑ رہا ہے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ فوج کا بہترین حصہ لے کر عراق سے روانہ ہو گئے۔ اب مثنیٰ کو انجام کی فکر ہوئی، لیکن توفیق الٰہی نے ان کی رہبری کی اور انہوں نے بابل

Marfat.com

کے کھنڈروں میں ہرمز جادویہ کو شکست دی اور اس کے بعد حیرہ واپس آ کر قلعہ بند ہو گئے۔ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ تائبین ارتداد کو ان کی مدد کے لیے بھیجا جائے، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تمام دلچسپیاں اس وقت شام کے محاذ پر مرتکز تھیں اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی اور مثنیٰ مدینہ روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر دیکھا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ زندگی کی آخری منزل طے کر رہے تھے۔ پھر جب آپ کی وفات ہوگئی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ منصب خلافت پر فائز ہوئے تو انہوں نے لوگوں کو مثنیٰ کی مدد کے لیے عراق جانے کی دعوت دی اور اس امدادی لشکر کا سالار ابوعبید رضی اللہ عنہ کو بنایا۔

مثنیٰ ان واقعات کو یاد کرتے تھے، لیکن وہ اضطراب بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہ تھا جو ان واقعات کے دوران میں ایران کے امراء پر چھایا ہوا تھا۔ پھر اس اضطراب نے ایران کی قوت میں جو کمزوری اور مسلمانوں کے ارادے میں جو قوت پیدا کی تھی، اس کا بھی انہیں احساس تھا۔ اکاسرہ ایران پر فرمانروائی کر رہے تھے اور عرب عراق کے حاکم مطلق تھے، جہاں کوئی ان کے اتحاد کے درپے نہ تھا۔ کسریٰ پرویز نے ابوقابوس نعمان بن منذر کو قتل کر کے حیرہ میں لخمیین کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا اور رومیوں سے جنگ کر کے انہیں مغلوب کر لیا تھا۔ اس طرح سرزمین روم میں اس کی حکومت بیت المقدس اور مصر تک وسیع ہوگئی تھی، لیکن جب ہرقل روم کا بادشاہ ہوا تو کسریٰ سے جنگ کی اور اسے پسپا کر دیا۔ اس شکست سے عربوں اور ان ایرانیوں کو بہت خوشی ہوئی جو کسریٰ کی سخت گیری سے نالاں تھے۔

اس کے بعد جب کسریٰ کے بیٹے شیرویہ نے اس کے خلاف بغاوت کی اور اسے قتل کر دیا تو ایران کے امراء میں اختلاف پیدا ہو گیا اور اس حادثے کے متعلق ان کی رائیں بٹ گئیں۔ شیرویہ نے بے وقوفی اور ناتجربہ کاری کی راہ اختیار کی، جس نے اس کے درباریوں کو اس سے بیزار کر دیا اور وہ ان امراء سے وابستہ ہو گیا جو تخت کے لالچ میں اس کا ساتھ دینے پر آمادہ تھے۔ آخر کار شیرویہ قتل کر دیا گیا اور لالچ کے یہ بندے آپس میں لڑنے مرنے لگے۔ چنانچہ کبھی اعلانیہ اور کبھی دھوکے سے ایک دوسرے کو قتل کیا جانے لگا۔ جو کوئی اپنے حریف پر غالب آتا چند مہینے تک تخت نشین رہتا اور قتل کر دیا جاتا۔ اس طرح چار برس میں یکے بعد دیگرے نو بادشاہ تخت پر بیٹھے۔ ان حالات میں کوئی تعجب نہیں اگر ایرانیوں کی قوت کمزور پڑ گئی، ان کے ایوان حکومت کے ستون منہدم ہو گئے اور ان لڑائیوں میں شکست و نکبت چھا گئی جو ان کے اور عربوں کے

Marfat.com

درمیان برپا تھیں۔

اس خانہ جنگی نے ایران کو اضطراب و انتشار کے جس جہنم میں جھونک دیا تھا، ایرانیوں نے اسے محسوس کیا اور شہریران بن اردشیر کو بادشاہ بنا کر تمام ایرانی امراء اس کی امداد پر کمر بستہ ہو گئے۔ شہریران کو معلوم ہوا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عراق سے شام چلے گئے ہیں اس لیے اس نے سب سے پہلے مسلمانوں کو عراق سے نکالنے کا عزم کیا، لیکن مثنیٰ نے بابل کے کھنڈروں میں دشمن کے لشکر کو شکست دی اور اس کا قائد بخار میں مبتلا ہو کر مر گیا۔

اپنے بھائی کے بعد کسریٰ کی بیٹی، دخت زناں تخت نشیں ہوئی، لیکن اس کام کو نہ سنبھال سکی اور تخت سے اتار دی گئی۔ اس کی جگہ شہریران کا بیٹا شاہ پور بادشاہ ہوا۔ شاہ پور نے فرخ زاد کو اپنا وزیر بنایا اور چاہا کہ کسریٰ کی بیٹی آزرمیدخت کی اس سے شادی کر دے، لیکن آزرمیدخت کو اپنے غلام کی زوجیت میں آنا گوارا نہ ہوا اور اس نے سیاوخش سے سازش کر کے اسے حجلہ عروسی ہی میں قتل کرا دیا۔ اس کے بعد اس کی معیت میں شاہ پور کی طرف چلی اور اسے محصور کر کے قتل کر دیا۔

مثنیٰ نے سوچا کہ ایرانی امراء کے اس اختلاف و انتشار سے فائدہ اٹھا کر ایران پر حملہ کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مدد چاہی اور جب وہاں سے جواب میں تاخیر ہوئی تو فوری مدد حاصل کرنے کے لیے خود مدینہ چلے گئے اور اب وہیں سے حیرہ واپس ہو رہے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ ایران میں ابھی تک خلفشار موجود ہے جس سے فائدہ اٹھا کر ان پر حملہ کر دینے کا یہ بہترین موقع ہے؟ یا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایرانیوں کے ملک میں امن و اطمینان بحال ہو گیا ہے۔ اس لیے جب تک کثیر فوج اور وافر ساز و سامان نہ ہو ان پر فتح حاصل نہیں کی جا سکتی۔

مثنیٰ حیرہ پہنچے تو سب سے پہلے ان کا سوال یہ تھا کہ امرائے ایران کا کیا حال ہے؟ انہیں بتایا گیا کہ ان کی غیر موجودگی میں ایرانی اپنے اختلافات کی وجہ سے مسلمانوں سے غافل رہے ہیں، پھر انہیں معلوم ہوا کہ کسریٰ کی بیٹی پوران انہیں متحد کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

پوران ایک دانش مند شہزادی تھی، اس لیے ایران میں جب کبھی کوئی اختلاف رونما ہوتا، ایرانی اس کے انصاف سے مطمئن ہو کر اس کے فیصلے کو تسلیم کر لیتے تھے۔ جب سیاوخش نے فرخ زاد کو قتل کر دیا اور آزرمیدخت تخت پر بیٹھی، تو ایرانیوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ پوران نے جب دیکھا کہ ان میں مصالحت کی کوئی صورت نہیں ہے تو فرخ زاد کے بیٹے سپہ سالار رستم کو ایک آدمی کے ذریعے اس کے باپ کے قتل کی اطلاع بھیجی اور اسے مدائن پر حملے کے لیے اکسایا۔

Marfat.com

رستم جو ایک ممتاز سپہ سالار تھا اس وقت خراسان کی سرحد پر تھا وہ اپنے لشکر کو لے کر تیزی سے مدائن کی طرف چلا راستے میں اس کی مڈ بھیڑ آزرمیدخت کے لشکر سے ہوئی۔ رستم نے اس لشکر کو شکست دے کر مدائن کا محاصرہ کر لیا۔ آزرمیدخت اور سیاوخش بھی مدائن کے محصورین میں شامل تھے۔ بالآخر رستم نے فتح پائی اور دارالسلطنت میں داخل ہو گیا۔ سیاوخش قتل کر دیا گیا اور آزرمیدخت کی آنکھیں نکلوا دی گئیں۔ رستم نے پوران کو مدائن کے تخت پر بٹھا دیا اور اس طرح ایران کا اقتدار پوران کے ہاتھ میں آ گیا، لیکن پوران دس سال تک حکمران رہی، اس کے بعد حکومت آل کسریٰ کے ہاتھ میں آ گئی، اگر مرد ملتے تو مرد، ورنہ عورتیں ہی تخت پر بٹھا دی جاتیں۔ پوران نے رستم کو اپنا وزیر بنا کر حکومت کے تمام معاملات اس کے سپرد کر دیئے۔ رستم ہی فوج کا کمانڈر انچیف بھی تھا، جس کی اطاعت پوران کی طرف سے تمام ایرانیوں پر فرض کر دی گئی۔

مثنیٰ حیرہ میں تھے کہ ان تمام واقعات کی اطلاع انہیں ملی، لیکن وہ بے دست و پا تھے، ان کی فوج میں بالکل جان نہ رہی تھی اور جب تک ابوعبید کا لشکر نہ پہنچ جائے وہ ایرانیوں پر حملے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ مثنیٰ کے عراق چلے جانے کے بعد ابوعبید ایک ماہ تک مدینہ میں اپنی فوج اور اس کی روانگی کی تیاریوں میں مصروف رہے، جب تیاری مکمل ہو گئی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اجازت چاہی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی اور دوبارہ نصیحت فرمائی:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرتے رہنا اور انہیں اپنے کاموں میں شریک رکھنا۔ سلیط ابن قیس ایک جری اور تجربہ کار سپاہی ہیں۔ ان کی بات سننا اور اس پر عمل کرنا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سلیط پر اس قدر اعتماد تھا کہ آپ نے ابوعبید سے فرمایا: "میں نے سلیط کو اس لیے امیر نہیں بنایا کہ وہ لڑائی میں عجلت سے کام لیتے ہیں اور جب تک اس کی کھلی ہوئی ضرورت نہ ہو، جلد بازی جنگ میں نقصان پہنچاتی ہے۔ جنگ نے ہمیشہ انہی لوگوں کو کامیاب کیا ہے جن کے مزاج میں تحمل اور طبیعت میں برداشت ہو۔"

ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کے ساتھ روانہ ہو گئے اور جب عراق پہنچے تو معلوم ہوا کہ مثنیٰ حیرہ سے نکل کر خفان پہنچ گئے ہیں جو صحرا کی حدود پر واقع ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ رستم ایک بہادر اور مغرور آدمی تھا، جس کے غرور میں ایرانیوں کی محبت و عقیدت نے اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اس کا یہی غرور تھا جس کی بنا پر مؤرخین نے یہ مشہور کر دیا کہ

Marfat.com

رستم علم نجوم کا ماہر تھا اور اس نے ستاروں میں ایران کا انجام دیکھ لیا تھا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا:
''جب وہ ستاروں میں ایران کا حشر دیکھ چکا ہے تو پھر حکومت کی باگ ڈور کس لیے سنبھالی ہے؟''
رستم نے جواب دیا: ''اقتدار کی ہوس اور حکومت کے لالچ میں!''

جب پوران نے زمامِ حکومت رستم کے حوالے کر دی تو رستم نے اسی وقت ایران کے تمام جاگیرداروں کو ایک فرمان کے ذریعے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا اور عوام کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کے لیے ملک کے گوشے گوشے میں اپنے نقیب پھیلا دیئے۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے ایک لشکر تیار کیا اور مثنیٰ کے مقابلے کے لیے بھیج دیا۔ رستم کے احکام سارے ملک میں عام ہو گئے اور اہل عراق اس سرے سے اس سرے تک مسلمانوں کے خلاف بھڑک اٹھے۔ مثنیٰ کو اس کی اطلاع ملی اور انہوں نے یہ دیکھ کر کہ رستم نے جو فوج ان سے لڑنے کو بھیجی ہے۔ مسلمانون اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے، جنگ سے پہلو تہی کرنا ہی مناسب سمجھا۔ چنانچہ وہ حیرہ چھوڑ کر خفان آ گئے، جہاں مسلمانوں پر پشت کی طرف سے حملہ نہیں کیا جا سکتا، کچھ دن بعد ابو عبید بھی آ کر مثنیٰ سے مل گئے۔ خفان پہنچ کر ابو عبید نے اسلامی لشکر کو چندے آرام کرنے کا حکم دیا تا کہ ایک طرف سفر کی تکان دور ہو جائے اور دوسری طرف دشمن سے مقابلہ کرنے کا کوئی مناسب پروگرام وضع کر لیا جائے۔

مسلمانوں سے لڑنے کے لیے رستم نے مدائن سے دو لشکر بھیجے تھے۔ ایک لشکر کی قیادت جاپان کے سپرد تھی جسے حکم دیا گیا تھا کہ فرات کے کنارے کنارے چل کر حیرہ پہنچے اور دوسرے لشکر کی کمان نرسی کے ذمے تھی جسے ہدایت کی گئی تھی کہ فرات اور دجلہ کے درمیان کسکر میں قیام کرے۔ ابو عبید مدینہ سے چار ہزار کی جمعیت لے کر نکلے تھے، لیکن راستے میں اور بہت سے لوگ شامل ہو گئے، جس سے لشکر کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی، خفان میں جب مسلمانوں کی تمام قوتیں یکجا ہو گئیں تو وہ جاپان سے لڑنے نکلے۔ حیرہ اور قادسیہ کے درمیان نمارق کے مقام پر دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ طرفین جان توڑ کے لڑے۔ بالآخر قیامت خیز معرکہ آرائی کے بعد اللہ نے ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو دشمن پر فتح نصیب کی، جاپان اور اس کا ایک ماتحت افسر مردان شاہ گرفتار ہوئے، مردان شاہ تو اس مسلمان کے ہاتھوں قتل ہو گیا، جس نے اسے گرفتار کیا تھا، جاپان نے اس سے کہا: ''اے اہل عراق! تم بات کے دھنی ہو اگر میں تمہیں دو پھرتیلے غلام اور یہ یہ کچھ دوں تو کیا تم مجھے چھوڑ دو گے؟'' اور اسے اپنے وعدے کی تکمیل کا یقین دلا دیا۔ اس شخص نے حامی بھر لی تو جاپان

Marfat.com

سے کہا: "لو، اب مجھے اپنے امیر کے پاس لے چلو، میں ان کے سامنے بات طے کرنا چاہتا ہوں!"

وہ شخص اسے ابوعبید کے پاس لے گیا اور جو بات ان دونوں کے درمیان طے پائی تھی، وہ ابوعبید کے سامنے پختہ ہوگئی، کچھ لوگ جاپان کو پہچان گئے اور انہوں نے ابوعبیدہ سے کہا، "اسے قتل کردیجئے! یہ ایرانی فوج کا سرار ہے!" لیکن ابوعبید نے جواب دیا:

"یہ سردار ہے تو ہوا کرے! ایک مسلمان اسے امان دے چکا ہے اس لیے اب یہ قتل نہیں کیا جاسکتا۔ باہمی محبت ونصرت میں مسلمان ایک جسم کی مثال ہیں، اس لیے جو فرض کسی مسلمان پر عائد ہوتا ہے گویا سب مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے۔"

جاپان پر جو بیتی تھی اس کا علم پوران اور رستم دونوں کو ہوگیا اور رستم نے جالینوس کو حکم دیا کہ وہ اپنے ساتھیوں کی مدد کو جائے اور کسکر میں نرسی سے جا ملے۔ جالینوس بہ عجلت تمام منزل مقصود کی طرف روانہ ہوگیا، لیکن ابوعبید نے اس سے زیادہ پھرتی سے کام لیا اور جاپان کی شکست کے فوراً بعد اپنے لشکر کو حکم دیا کہ نرسی کے مقابلے کے لیے چل پڑے۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ جالینوس پہنچے کسکر کے قریب ایک مقام پر جسے سقاطیہ کہتے ہیں مسلمان نرسی اور اس کے سپاہیوں کے مقابل صف آرا ہوگئے جو نمارق کی جنگ سے فرار ہوکر نرسی کی فوج سے جا ملے تھے، نرسی بھی جاپان سے زیادہ مسلمانوں کے سامنے نہ ٹھہر سکا اور حریف کے لیے بے شمار ساز وسامان چھوڑ کر اپنی فوج کے ساتھ بھاگ کھڑا ہوا۔ اسی اثناء میں ابوعبید کو اطلاع ملی کہ جالینوس اپنے لشکر کو لے کر بارسماء کے مقام پر پہنچ گیا ہے۔ یہ سن کر ابوعبید سیدھے بارسماء پہنچے اور فتح یاب ہوئے۔ نرسی کی طرح جالینوس بھی اپنے لشکر سمیت ایسا بھاگا کہ مدائن پہنچ کر ہی دم لیا۔

ابوعبید نے اپنی فوج کے افسروں کو جن میں مثنیٰ سرفہرست تھے۔ بھیجا اور وہ سرزمین عراق میں اس سرے سے لے کر اس سرے تک پھیل گئے جس سے عراقیوں کے دل پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی اور ان کے ذہن میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور ان کے کارناموں کی یاد ایک بار پھر تازہ ہوگئی۔ وہاں کے جاگیرداروں نے ابوعبید سے اپنی مخالفانہ کارروائیوں کی معافی چاہی اور کہا: "ہم ان کے محکوم تھے اس لیے جو کچھ ہوا اس میں ہمارے اپنے ارادہ اختیار کا کوئی دخل نہ تھا۔" ابوعبید نے ان سے صلح کرلی۔ یہ لوگ طرح طرح کے لذیذ وپُرتکلف ایرانی کھانے لے کر ابوعبید کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا:

''ہماری طرف سے یہ حقیر ہدیہ خلوص قبول فرمائیے!''

ابوعبید نے پوچھا: ''کیا تمام لشکر کے لیئے ایسے ہی کھانوں کا انتظام کیا گیا ہے؟''

جواب ملا: ''نہیں۔'' یہ سن کر ابوعبید نے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا: ''لے جاؤ! ہمیں اس کی ضرورت نہیں، کتنا برا آدمی ہوگا ابوعبید! اگر وہ اکیلے اکیلے یہ کھانا کھالے اور اپنے ان ہم وطنوں کو نہ پوچھے جو اس کی خاطر اپنا خون بہا رہے ہیں۔ نہیں! خدا کی قسم! جب تک سارے مسلمانوں کو یہی کھانا نہ ملے گا، میں اس کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔'' اور جب تک سارے لشکر کے لیے اسی قسم کے کھانے کا انتظام نہیں ہوگیا ابوعبید نے ان کی دعوت قبول نہ کی۔

سقاطیہ کی جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ بے شمار مال غنیمت آیا، جس میں کھانے پینے کے سامان کی خاص طور پر بہتات تھی، لیکن مسلمانوں نے سب سے زیادہ اس کھجور کو پسند کیا جس کا نام نرسیان تھا اور جو ایران کے بادشاہوں کی من بھاتی کھجور تھی۔ یہ کھجوریں صرف مسلمانوں ہی میں تقسیم نہیں کی گئیں بلکہ ایران کے غریب کسانوں کو بھی کھلائی گئیں۔ اس کا خمس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مدینہ بھیجا گیا اور ساتھ ہی لکھا گیا: ''اللہ نے ہمیں مرغوب غذائیں ارزانی سے فرمائیں ہیں۔ ہم چاہتے ہیں آپ ابھی انہیں دیکھیں اور اللہ کے فضل و انعام کو یاد کریں۔''

مثنیٰ واپس حیرہ پہنچ گئے۔ دیکھئے اب مثنیٰ کو بھی وہاں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی سی کامیابی حاصل ہوتی ہے یا نہیں کہ وہ کچھ دن حیرہ میں قیام کرنے کے بعد مدائن فتح کرلیں۔ یہ ان کی سب سے بڑی خواہش تھی جس کو پہنچنے کی تمنا انہیں دن رات بے چین رکھتی تھی۔

لیکن مثنیٰ کی امید پر جلد ہی اوس پڑ گئی۔ رستم، جس کی نخوت و جرأت کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں، یہ برداشت نہ کرسکا کہ ایرانی فوجیں عربوں سے شکست کھائیں۔ اس نے اپنے مشیران خاص سے مشورہ کیا:

''تمہارے خیال میں عربوں پر کون عجمی غالب آسکتا ہے؟''

ان سب نے یک زبان ہو کر کہا: ''ذوالحاجب بہمن جادویہ!''

رستم نے بہمن کو طلب کیا اور ایک بہت بڑی فوج دے کر روانہ کر دیا۔ جالینوس کو بھی اس کے ساتھ جانے کا حکم دیا اور ڈانٹ کر اس سے کہا: ''اگر تم نے اب کے بھی بزدلی دکھائی تو یاد رکھنا تمہاری گردن اُڑا دوں گا۔'' اس سے رستم لوگوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اس جنگ کو وہ کتنا اہم سمجھتا ہے اور مسلمانوں سے ایرانیوں کی شکست کا بدلہ لینے کی اس کے دل میں کتنی بے چینی تھی

Marfat.com

ایرانی لشکر کے آگے آگے چیتے کی کھال کا بنا ہوا درفش کاویانی تھا۔ جس کا طول بارہ ہاتھ تھا اور عرض آٹھ ہاتھ۔ بہمن اس شان سے اپنے لشکر کو لے کر مدائن سے نکلا۔

ابوعبید پہلے ہی اپنے لشکر کے ساتھ قیس الناطف نامی ایک آبادی میں پہنچ گئے تھے اور دریا عبور کر کے دشمن کے انتظار میں قلعہ بند ہو بیٹھے تھے، کچھ دن بعد بہمن بھی پہنچ گیا۔ اب فریقین کے درمیان صرف دریا حائل تھا۔ بہمن نے ابوعبید کو پیغام بھیجا کہ ''یا تو تم دریا عبور کر کے اس طرف آ جاؤ یا ہمیں اپنی طرف آنے کا موقع دو۔'' ابوعبید کو ان کے ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ ایرانیوں کو دریا عبور کرنے کا موقع دیا جائے، لیکن ابوعبید نے اس میں بزدلی محسوس کی اور کہا: ''وہ ہم سے زیادہ موت پر دلیر نہیں ہیں۔ دریا ہم عبور کریں گے۔''

سلیط بن قیس اور دوسرے اکابر نے اس کی مخالفت کی اور کہا: ''عربوں کو آج تک اتنے بڑے ایرانی لشکر سے واسطہ نہیں پڑا ہے، وہ زبردست تیاری کر کے آئے ہیں اور یہ جگہ، جہاں ہم اس وقت ہیں، پناہ لینے، حملہ کرنے اور دوسری جنگی ضروریات کے لیے نہایت موزوں ہے۔''

لیکن ابوعبید رضی اللہ عنہ نے کہا: ''خدا کی قسم! یہ میری بزدلی ہوگی!'' اور سلیط رضی اللہ عنہ کو بزدلی کا طعنہ دیا، سلیط رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا: ''واللہ! میں آپ سے زیادہ دلیر ہوں۔ میں نے تو اپنی رائے پیش کر دی ہے، آگے جیسی آپ کی مرضی؟''

تعجب ہے کہ ابوعبید نے اپنے رفقاء کی ایک نہ مانی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس نصیحت کا کوئی خیال نہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ضرور مشورہ کرنا، انہیں اپنے کاموں میں شریک رکھنا اور سلیط رضی اللہ عنہ کی رائے کو خاص اہمیت دینا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی فراموش کر دیا کہ ''تم ایک ایسی زمین کی طرف جا رہے ہو جو مکر و فریب اور خیانت سے بھری ہوئی ہے اور جس میں ایک ایسی قوم آباد ہے جو شر کی ماہر اور خیر سے یکسر نابلد ہے!'' اور انہیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سلیط رضی اللہ عنہ کو محض اس لیے امیر لشکر نہیں بنایا تھا کہ جنگ میں تحمل اور تجربے کی ضرورت ہے، لیکن سلیط رضی اللہ عنہ عجلت کار ہیں، اور عجلت، جب تک کوئی ایسی مجبوری نہ ہو، جنگ میں ہمیشہ تباہ کن ہوتی ہے۔ لیکن تقدیر وہ زبردست قوت ہے جو آنکھ والے کو اندھا اور عقلمند کو بیوقوف بنا دیتی ہے اور کون جانے۔ بہرحال انہوں نے لشکر کو دریا عبور کرنے کا حکم دے دیا اور مروحہ سے، جہاں وہ قلعہ بند تھے، قیس الناطف کی طرف..... جہاں دشمن کی فوج تھی..... دریا عبور کیا گیا۔ سلیط بن قیس رضی اللہ عنہ دریا عبور کرنے والوں میں سب سے

آگے تھے۔

مسلمان دس ہزار سے بھی کم تھے، لیکن ایرانیوں نے دریا کے اس پار جو میدان ان کے لیے چھوڑا تھا وہ پھر بھی ناکافی تھا۔ مسلمانوں نے ابھی پل عبور ہی کیا تھا کہ دشمن نے ان پر حملہ کر دیا اور انہیں سنبھلنے کا موقع بھی نہ دیا۔ ایرانی فوج کے آگے ہاتھیوں کی قطار تھی جن کے گلوں میں گھنٹے لٹک رہے تھے۔ مسلمانوں کے گھوڑوں نے جو یہ پہاڑ سے ہاتھی دیکھے اور ان کے گھنٹوں کی ہیبت ناک گونج سنی تو بدک بدک کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بہ مشکل تمام چند گھوڑوں کو روکا گیا۔ ایرانی تیراندازوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بہت سے مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ مسلمان لاکھ جتن کر رہے تھے مگر ان کی ایک پیش نہ جاتی تھی۔ یہاں تک کہ ان کا جی چھوٹ گیا۔

ابوعبید نے یہ حال دیکھا تو اپنے گھوڑے سے کود پڑے اور ان کے ساتھ دوسرے سواروں نے بھی گھوڑوں سے کود کود کر دشمنوں پر ہلہ بول دیا اور اتنی بے جگری سے لڑے کہ چھ ہزار ایرانیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس سے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی لیکن ہاتھیوں کی قطار جس طرف بھی رخ کر لیتی، صفوں کی صفیں الٹ دیتی۔ ابوعبید رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کو للکارا ''ہودوں کی رسیاں کاٹ کر سواروں سمیت الٹ دو!'' مسلمان جانبازوں نے ایسا ہی کیا اور تمام فیل نشینوں کو خاک پر گرا دیا۔ چند گھنٹے معرکہ کارزار اسی طرح گرم رہا، کبھی مسلمان ایرانیوں کی صفوں میں گھستے چلے جاتے اور کبھی ایرانی، مسلمانوں کو پسپا کر دیتے۔

ابوعبید رضی اللہ عنہ کی انتہائی کوشش تھی کہ اسی دن ایرانیوں پر فتح پالیں۔ سلیط رضی اللہ عنہ اور دوسرے اہل الرائے کا مشورہ قبول نہ کر کے جو غلطی انہوں نے کی تھی اس کی تلافی کے احساس نے اس کوشش میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا، انہیں اندیشہ تھا کہ اگر آج کی لڑائی میں ایرانیوں کو فتح ہوگئی تو شکست کی ساری ذمہ داری ان پر ہوگی اور یہ ندامت حشر تک ان کا دامن نہ چھوڑے گی۔ اسی لیے ان کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا، جب دشمن کو پسپا ہوتے دیکھتے تو مارے خوشی کے اچھل پڑتے اور جب وہ پیش قدمی کرنے لگتا تو شرم سے پانی پانی ہو جاتے۔ جب فیل نشینوں کو زمین پر گرا کر قتل کر دیا گیا اور ہاتھیوں پر ایک سوار بھی نہ رہا تو ابوعبید کو قدرے اطمینان ہوا۔ لیکن انہوں نے پلٹ کر دیکھا کہ ان کے قریب ہی ایک کوہ پیکر سفید ہاتھی ہے جو دائیں بائیں جدھر سونڈ اٹھاتا ہے مسلمان کائی کی طرح پھٹ جاتے ہیں گویا وہ ہاتھی نہیں کوئی سورما ہے جسے جنگ آزمائی کے تمام گر معلوم ہیں۔ ابوعبید نے سوچا اگر اس ہاتھی کا کام تمام کر دیا جائے تو مسلمانوں کی ہمت بڑھ جائے گی اور ایرانیوں کی ہمت ٹوٹ جائے گی۔ یہ سوچ کر وہ آگے بڑھے اور اس کی سونڈ پر ایک ایسا بھرپور

ہاتھ مارا کہ مستک سے الگ ہوگئی۔ ہاتھی نے ایک خوفناک چنگھاڑ ماری اور ابوعبید کی طرف بڑھ کر انہیں اپنے پاؤں تلے کچل دیا۔ ابوعبید یہ وصیت کر گئے تھے کہ اگر میں لڑائی میں کام آجاؤں تو میرے قبیلے کے فلاں فلاں سات آدمی علی الترتیب فوج کی قیادت کریں۔ ان میں سے پہلے آدمی نے جو یہ دیکھا تو علم اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہاتھی پر جھپٹ کے ابوعبید کو اس کے پاؤں تلے سے نکالا۔ ابوعبید رضی اللہ عنہ، اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اس نے ابوعبید رضی اللہ عنہ کی لاش مسلمانوں میں پہنچائی اور پلٹ کے ہاتھی پر حملہ کیا۔ لیکن ابوعبید رضی اللہ عنہ کی طرح ہاتھی نے اسے بھی شہید کر دیا۔

اسی طرح بنوثقیف کے یہ ساتوں آدمی باری باری قیادت سنبھالتے اور شہید ہوتے گئے۔ ① یہ منظر دیکھ کر مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے اور ان میں سے اکثر اپنی جان بچا بچا کر پل کی طرف بھاگنے لگے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ اب اس لشکر کے سامنے ٹھہر بھی نہیں سکتے تھے جس سے مقابلے کی ان میں قوت نہ رہی تھی اور مسلمان سرداروں کے پے در پے مارے جانے کی وجہ سے خود ان کی صفوں میں بھی انتشار پیدا ہو گیا تھا۔

مثنیٰ رضی اللہ عنہ نے یہ نازک صورت حال دیکھی تو آگے بڑھ کر علم اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مسلمانوں پر یہ قیامت صغریٰ نازل ہو جانے کے بعد مثنیٰ کے دل میں ایرانیوں سے لڑنے اور ان پر فتح پانے کی خواہش تو کیا باقی رہتی البتہ وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ مسلمان نظم و ترتیب کے ساتھ دریا پار کر کے مردحہ پہنچ جائیں۔ یہ پھر سوچا جائے گا کہ کیا کیا جائے؟ وہ ابھی واپسی کی راہ سوچ رہے تھے کہ عبداللہ بن مرثد ثقفی نے پل کی ابتدائی کشتیاں توڑ دیں اور چلا کر کہا: ''لوگو! اپنے قائدین کے نقش قدم پر چل کے جان دے دو یا دشمن پر فتح حاصل کرو!''

ابن مرثد کے اس جذباتی فعل سے مسلمانوں کے آئے اوسان جاتے رہے اور انہوں نے گھبرا گھبرا کر دریا میں چھلانگیں لگانی شروع کر دیں۔ جس نے بے صبری سے کام لیا وہ غرق ہو گیا۔ مثنیٰ ڈرے کہ یہ افراتفری عام نہ ہو جائے، چنانچہ وہ پرچم بہ دست کھڑے ہوئے اور بلند آواز سے کہا:

''لوگو! میں دشمن کو روکے کھڑا ہوں۔ گھبراؤ نہیں! اور اطمینان سے پل عبور کر لو ہم اس وقت تک یہاں سے نہیں ہٹیں گے جب تک تمہیں اس پار نہیں دیکھ لیں گے۔''

① طبری اور دوسرے مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ ابوعبید رضی اللہ عنہ کی بیوی دومہ نے جو اپنے شوہر کے ساتھ مردحہ میں تھیں، ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک شخص شراب طہور کی صراحی لیے آسمان سے اترا ہے اور ابوعبید اور چند دوسرے اہل ثقیف نے اس صراحی سے شراب پی ہے۔ دومہ نے اپنا یہ خواب شوہر سے بیان کیا۔ انہوں نے سن کر کہا: ''یہ شہادت ہے'' اور اپنے نائبین کو نامزد کیا۔

اتنے میں ایک ناگہانی آفت نے ابن مرثد کی جان لے لی۔ بہر کیف کشتیاں جوڑ کر پل دوبارہ درست کیا گیا اور مسلمانوں نے دریا عبور کرنا شروع کر دیا۔ مثنیٰ ایرانیوں کو آگے روکے کھڑے تھے اور بڑی بہادری سے دشمن کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اسی حالت میں ایک نیزہ آ کر لگا اور زرہ کی ایک کڑی ان کے جسم میں پیوست ہو گئی۔ ان کے ساتھ ایک عیسائی ابوزبید الطائی بھی مسلمانوں کی طرف سے لڑ رہے تھے اور سلیط بن قیس رضی اللہ عنہ بھی انہی کی طرح دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ مثنیٰ زخم کھا کر بھی اپنی جگہ سے نہ ہلے اور ایرانی فوج کے سامنے فولادی دیوار بنے کھڑے رہے۔ اس سے شکست خوردہ مسلمانوں کو مہلت مل گئی اور وہ بہ اطمینان پل عبور کر کے مروحہ پہنچ گئے۔ مثنیٰ نے جب دیکھا کہ ان کے تمام ساتھی پل عبور کر چکے ہیں تو اب وہ بھی پیچھے ہٹے۔ اس دوران میں سلیط بن قیس رضی اللہ عنہ شہید ہو چکے تھے اور ان کا خون بھی میدان کی خاک میں جذب ہو رہا تھا...... جس نے ہزاروں مسلمانوں کے خون سے اپنی پیاس بجھائی تھی۔

آپ کی کیا رائے ہے؟ بہمن جادویہ دریا پار کر کے مسلمانوں کا تعاقب کرے اور ان کے ایک ایک سپاہی کو موت کے گھاٹ اتار کر سرزمین عراق سے مسلمانوں کا نام ونشان تک مٹا دے یا اپنی اس شاندار فتح کو لے کر بیٹھ رہے جو رستم، پوران اور تمام اہل ایران کی نظر میں ایک ایسا امتیاز ہے جس میں اس کا کوئی ہم چشم سپہ سالار اس کی برابری نہیں کر سکتا۔

مثنیٰ اچھی طرح جانتے تھے کہ بہمن ان کا تعاقب کرے گا، اس لیے وہ اپنی فوجوں کو لے کر بہ سرعت تمام مروحہ سے حیرہ آئے اور یہاں سے جنوب کی طرف الیس کے مقام پر جا پہنچے۔ اس اثناء میں تعاقب کرنے والوں کا خطرہ بہ شدت لاحق رہا اور کیوں نہ رہتا، جب کہ اسلامی لشکر کا بیشتر حصہ لڑائی میں شہید ہو چکا تھا اور جو لوگ باقی بچے تھے ان میں سے بھی کچھ دریائے فرات میں غرق ہو گئے تھے اور مدینہ کے دو ہزار سپاہی الگ اپنی جان بچا کر بھاگ گئے تھے، لیکن جس تقدیر نے ابوعبید کی آنکھوں پر پردہ ڈال کر انہیں دریا عبور کرنے پر مجبور کیا تھا جس کے نتیجے میں وہ خود بھی شہید ہوئے، اور دوسرے مسلمان بھی ہلاکت میں پڑے وہی تقدیر مثنیٰ پر مہربان تھی اور ان کا ساتھ دے رہی تھی، لڑائی ابھی جاری ہی تھی کہ بہمن کو اطلاع ملی کہ مدائن میں ایرانیوں کے دو گروہ ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ رستم کے ساتھ ہے اور دوسرا اس کے حریف فیروزان کے ساتھ۔ یہ سنتے ہی بہمن اپنی فوج کو لے کر ایران کے پایہ تخت کی طرف روانہ ہو گیا اور جاپان اور مردان شاہ کو تھوڑی سی فوج دے کر چھوڑ گیا۔ یہ دونوں ایرانی سردار مثنیٰ کے تعاقب میں چلے۔ انہیں امید تھی کہ وہ مثنیٰ پر غالب آ جائیں گے لیکن الیس والوں نے مثنیٰ کو امرائے ایران کے تازہ ترین اختلاف

Marfat.com

سے آگاہ کر دیا اور مثنیٰ مسلمانوں کے علاوہ الیس کے باشندوں کی کثیر جمعیت لے کر ان پر حملہ آور ہو گئے۔ جاپان، مردان شاہ اور ان کے ساتھی گرفتار ہوئے اور ان سب کی گردنیں ماردی گئیں۔ اس طرح جاپان کو اپنے اس دھوکے کا بدلہ مل گیا جو اس نے نمارق میں اپنی گرفتاری کے وقت ابوعبید رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے اپنے گرفتار کرنے والے سے امان چاہی تھی اور اسے امان دے دی گئی تھی۔ لیکن بعد کو وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو کر مسلمانوں سے پھر جنگ کرنے آیا تھا۔ اس لحاظ سے گرفتاری کے بعد، اس کا قتل، انصاف کے عین مطابق تھا۔

معرکہ جسر سے بھاگنے والوں میں سب سے پہلے جو صاحب مدینہ پہنچے وہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے تو ان پر نظر پڑی۔ آواز دے کر پوچھا: "کہو عبداللہ! کیا خبر لائے ہو؟" عبداللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ساری حقیقت بیان کر دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پریشانی کا بالکل اظہار نہیں فرمایا بلکہ تمام واقعات انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ سنے۔ جو مسلمان معرکہ جسر سے بھاگ کر آئے تھے، مارے شرم کے مدینے میں داخل نہ ہوتے تھے کہ ان کے عزیز و اقارب جب یہ بات سنیں گے تو فرار و بزدلی پر انہیں ملامت کریں گے۔ کچھ لوگ، جو ہمت کر کے مدینہ میں آ گئے تھے، ان کی گردنیں بھی شرم و ندامت کے بوجھ سے جھکی رہتی تھیں۔ یہ حال دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان پر رحم آ گیا اور وہ لوگوں کو ان پر طنز و ملامت کرنے سے روکنے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے:

"یا اللہ! میں تمام مسلمانوں کا ذمہ دار ہوں۔ جس کسی نے دشمن سے مقابلہ کیا اور کوئی تکلیف اٹھائی اس کی تلافی میرے سر ہے۔ مسلمانو! ڈرو نہیں! تم میرے پاس آئے ہو، تمہارا ذمہ دار میں ہوں! اللہ ابوعبید پر رحم فرمائے! اگر وہ بھی میرے پاس آ جاتے تو میں ان کا بھی ذمہ دار ہوتا!"

بنی نجار کے معاذ قاری بھی ان ہی لوگوں میں تھے جو معرکہ جسر سے بھاگ آئے تھے۔ وہ جب کبھی قرآن کی یہ آیت پڑھتے، زار و قطار رونے لگتے:

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۔ (الانفال:16)

ترجمہ: "اور جو کوئی اس دن ان سے اپنی پیٹھ پھیرے گا سوائے اس کے کہ جنگ کے ایک طرف پھر جائے یا کسی جماعت کے ساتھ پناہ لے تو وہ اللہ کے غضب کا محل ہو گیا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔"

Marfat.com

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے فرماتے: ''معاذ! روؤ نہیں! تم میرے پاس بھاگ کر آئے ہو۔ تمہارا ذمہ دار میں ہوں!''

جو لوگ معرکہ جسر سے بھاگ کر مدینہ آئے تھے ان کے ساتھ جب ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ سلوک دیکھتے ہیں تو ہمیں بے اختیار وہ طرز عمل یاد آ جاتا ہے جو غزوہ موتہ کی اسلامی فوج کے متعلق حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا تھا کہ جب اس جنگ میں مسلمانوں کے سردار شہید کر دیئے گئے تھے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ باقی ماندہ فوج کو دشمن پر فتح حاصل کیے بغیر واپس لے آئے تو اہل مدینہ ان کے سروں پر خاک اچھال اچھال کے کہتے تھے: ''بھگوڑو! تم اللہ کی راہ سے بھاگ کر آئے ہو!'' لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: ''یہ بھگوڑے نہیں ہیں۔ ان شاء اللہ یہ دوبارہ حملہ کریں گے!''

موتہ سے مسلمانوں کی ناکام واپسی، اندوہ ناکی اور سوئے اثر کے اعتبار سے اتنی اہم نہ تھی جتنی کہ معرکہ جسر کی شکست۔ اسی طرح شفقت و مہربانی کے لحاظ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور نبی رحمت علیہ التحیۃ والتسلیم میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ لیکن اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ شکست خوردہ لوگوں کو تسلی دیتے رہے بلکہ ان کے پشت پناہ بن گئے۔ وہ ان کی حمایت و حفاظت کرتے اور انہیں اپنی مہربانی سے نوازتے رہے جس سے ان کا خوف دور ہو گیا اور ننگ ہزیمت کے شدت احساس میں کمی آ گئی۔ ان لوگوں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ سلوک محل تعجب نہیں، اس لیے کہ وہ تمام مسلمانوں کے امیر تھے اور ان سے شفقت و مہربانی سے پیش آنا ان کا فرض تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ کمزوروں کے حق میں سراپا لطف و احسان تھے اور طاقتوروں اور ظالموں کے حق میں یکسر قہر و غضب!

ادھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ معرکہ جسر سے بھاگنے والوں کی تالیف قلب فرما رہے تھے۔ ادھر جاپان، مردان شاہ اور ان کی سپاہ کو قتل کرنے کے بعد مثنیٰ الیس میں قلعہ بند ہو گئے تھے، کچھ دن ستانے کے بعد جب مسلمان تازہ دم ہو گئے تو مثنیٰ نے عراق میں اپنی پوزیشن اور مسلمانوں کے انجام کے متعلق سوچنا شروع کیا، بلاشبہ وہ خطرے میں تھے۔ اگر مدائن کا جھگڑا طے ہو گیا اور ایرانیوں نے ایک لشکر جرار کے ساتھ...... جس کے آگے ہاتھی ہوں گے...... مسلمانوں پر حملہ کر دیا تو کیا ہوگا؟ کیا مثنیٰ کی تقدیر میں یہی لکھ دیا گیا ہے کہ اکاسرہ کا آفتاب اقبال پھر اسی شان سے چمکنے لگے۔ اگر اللہ کی مرضی یہی ہے تو اسے کوئی نہیں بدل سکتا۔ اس صورت میں ان کی فوج کے لیے عراق میں ٹھہرانا ناممکن ہو جائے گا اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہے گا کہ معرکہ جسر میں شکست

کھا کر مدینہ بھاگ جانے والوں کی طرح مثنیٰ بھی اپنی قوم بنی بکر بن وائل کے وطن واپس چلے جائیں اور اپنی زندگی کے باقی دن بحرین میں گزار دیں۔

لیکن یہ وہ مثنیٰ ہیں، جن کے متعلق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دریافت فرمانے پر قیس بن عاصم منقری نے کہا تھا: "یہ کوئی گمنام یا مجہول النسب شخص نہیں ہے، جن کا کوئی سہارا نہ ہو۔ یہ مثنیٰ بن حارثہ شیبانی ہیں!" پھر اس سے پہلے بھی عراق میں انہیں ایسے مراحل پیش آچکے ہیں جو باعتبار وقت ونزاکت اس مرحلے سے کسی طرح کم نہ تھے۔ کیا وہ صورت حال بھی ایسی ہی نازک نہ تھی جب وہ بحرین سے یہاں آئے تھے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس وقت تک ان کی مدد کو نہ پہنچے تھے؟ پھر ان سب سے زیادہ نازک اور پیچیدہ مرحلہ تو وہ تھا جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عراق سے شام بھیجا تھا کہ وہ رومیوں کا شیطانی پندار خاک میں ملائیں۔ بھلا وہ شخص، جو ایسے نازک ترین مراحل سے گزر چکا ہو، غیب کے پردوں میں چھپی ہوئی تقدیر سے ڈر کر ہار کیسے مان سکتا ہے؟ وہ تو ایک غیر معمولی قوت ہے۔ جسے دست قضا کائنات کا رخ بدلنے کے لیے کار زار حیات میں پھینکتا ہے، چنانچہ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے ضروری تھا کہ مثنیٰ ایک کارآزمودہ اور متحمل مزاج قائد کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے جو ان کی ذات میں ودیعت کی گئی تھیں اور ساتھ ہی خلیفۃ المسلمین سے مدد کی درخواست کرتے جس کے قبول ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا اور جنگ اپنی کامرانیوں سے صرف اسی شخص کو بہرہ مند کرتی ہے جو صبر و تحمل سے کام لینا جانتا ہے۔

اس طرح مثنیٰ نہایت جرأت واستقلال کے ساتھ ان تاریک دنوں کا سامنا کرتے رہے جو معرکہ جسر کے بعد ان پر آئے تھے اور جن سے بعید نہ تھا کہ عراق میں مسلمانوں کے اقتدار کا خاتمہ ہی کر دیتے۔ مدینے سے عراق کمک پہنچنے کے لیے ایک خاص مدت درکار تھی اور اندیشہ تھا کہ اس دوران میں کہیں ایرانی حملہ ہی نہ کر دیں اس لیے مثنیٰ نے ایک طرف تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اعانت کی درخواست روانہ کی اور دوسری طرف آس پاس کے عرب قبائل میں اپنے نمائندے بھیجے۔ ان قبائل نے مثنیٰ کی دعوت قبول کر لی اور کثیر تعداد میں ان کے پاس پہنچ گئے۔ ان لوگوں میں بنو نمر کے عیسائی بھی شامل تھے جو کہتے تھے کہ: "ہم بھی اپنی قوم کے دوش بدوش لڑیں گے۔" مثنیٰ نے اپنا لشکر الیس سے ساخ میں منتقل کر دیا جو قادسیہ اور خفان کے درمیان واقع ہے۔ یہ جگہ عرب کی سرحد کے قریب تھی اور مثنیٰ نے اس کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ مغلوب ہوں تو پناہ لے سکیں اور غالب ہوں تو مزید کمک حاصل کر سکیں اور فتح و نصرت کا سلسلہ جاری رکھنے کے

Marfat.com

لیے مدد کی انہیں بے انتہا ضرورت تھی، سباخ میں بہت بڑا لشکر جمع ہو گیا جس کی وجہ سے خوف کے بادل چھٹ گئے اور مثنیٰ دلجمعی کے ساتھ آنے والے واقعات کا انتظار کرنے لگے۔

معرکہ جسر کے بعد مسلمان عراق میں جس نازل صورت حال سے دوچار ہو گئے تھے۔ مثنیٰ کی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کا شدید احساس تھا اور یہ بات بھی ان سے پوشیدہ نہ تھی کہ اس نازک مرحلے پر مثنیٰ کو امداد و اعانت کی سخت ضرورت تھی۔ جب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تائبین ارتداد پر سے پابندیاں اٹھائی تھیں، یہ لوگ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف گوشوں سے کھنچ کھنچ کر مدینہ آ رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو عراق جانے کی اجازت دی لیکن وہ کترا گئے اور شام کی جنگ میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی لیکن وہاں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ یرموک میں رومیوں کو عبرتناک شکست دے چکے تھے اور انہیں کسی مدد کی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں شام بھیجنے پر رضامند ہوئے نہ انہوں نے عراق جانے پر آمادگی ظاہر کی۔

عہد صدیقی رضی اللہ عنہ کی بات ہے، جریر بن عبداللہ بجلی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد یاد دلایا تھا کہ بنو بجیلہ کو جو مختلف قبائل میں بکھرے ہوئے ہیں یکجا کر دیا جائے، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ فرما کر انہیں واپس کر دیا تھا کہ ''تم دیکھ رہے ہو ہم کتنے مصروف ہیں اس وقت ہماری تمام تر توجہ ان مسلمانوں کی طرف مرکوز ہے جو آج کل ایران و روم کے دو شیروں سے پنجہ آزما ہیں اور تم مجھے اس کام میں الجھانا چاہتے ہو۔ فی الحال اس مسئلے کو رہنے دو اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس چلے جاؤ! خدا جب ہمیں اس طرف سے فراغت دے گا تو دیکھا جائے گا۔''

پھر جب زمام خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ آئی تو جریر نے ان کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وعدہ یاد دلایا اور اسے واضح دلیلوں سے ثابت کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال کو لکھ بھیجا اور بنی بجیلہ یکجا کر دیئے گئے۔ جب یہ کام ہو گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جریر سے فرمایا: ''مثنیٰ کے پاس عراق چلے جاؤ!'' جریر نے جواب دیا: ''ہم شام جائیں گے۔ ہمارے بزرگ وہیں کے تھے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نہیں، عراق......! شام میں اسلامی فوجیں کافی ہیں۔'' ادھر سے اصرار ہوتا رہا ادھر سے انکار، بالآخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے حصہ غنیمت کے علاوہ خمس میں سے مزید چوتھائی حصہ انہیں دینے کا وعدہ کیا اور وہ جریر کی قیادت میں عراق جانے پر رضامند ہو گئے۔ بنی بجیلہ کی دیکھا دیکھی اور لوگوں نے بھی آمادگی ظاہر کی جن میں معرکہ جسر سے بھاگ کر آنے والے

Marfat.com

پیش پیش تھے۔ اس کے بعد بنوازد، عرفجہ بن ہرثمہ اور بنو کنانہ، غالب بن عبداللہ کی قیادت میں چلنے کو تیار ہو گئے اور اس طرح ایک کثیر جماعت نے، جس میں مختلف قبائل کے اور بھی بہت سے لوگ شامل تھے، اپنے بال بچوں سمیت عراق کی طرف کوچ کر دیا۔

مدینہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عراق میں مثنیٰ کا یہ حال تھا۔ اب دیکھیے، مدائن میں ایرانیوں کا کیا حال ہے؟ اہل ایران کو جب یہ معلوم ہوا کہ عراق میں مسلمانوں کی فوجیں جمع ہو رہی ہیں، ان کے اوسان خطا ہو گئے، چنانچہ رستم اور فیروزان نے آپس میں سلطنت تقسیم کر لی اور ایک بہت بڑا لشکر مرتب کر کے اس کی کمان مہران ہمدانی کے سپرد کی اور اسے حکم دیا کہ جلد سے جلد اسلامی فوجوں کے مقابلے میں پہنچ جائے۔ مہران اپنے لشکر کو لے کر روانہ ہوا جس کے آگے آگے ہاتھی تھے۔ وہ ایک ایسی فتح کے لیے بے چین تھا جسے دیکھ کر ایرانی معرکہ جسر میں بہمن کی فتح کو بھول جائیں۔ مثنیٰ کو جب اس لشکر کی روانگی کا علم ہوا وہ ساخ میں تھے، چنانچہ انہوں نے جریر بن عبداللہ اور اپنی مدد کو آنے والے دوسرے قائدین کے نام پیغام بھیجا: ''اس وقت ہم ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہیں کہ جب تک آپ حضرات نہ پہنچیں، ہم اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ براہ کرم بویب [1] میں آکر ہم سے فوراً ملیے۔''

یہ پیغام بھیج کر مثنیٰ نے بویب کا رخ کیا اور دریائے فرات کے کنارے اپنی فوج جمع کی۔ اسی طرح مہران بھی اپنی فوج لے کر مسلمانوں کے مقابلے میں پہنچ گیا۔ اب فریقین کے درمیان صرف دریا حائل تھا۔

مثنیٰ نے اپنے لشکر پر نظر دوڑائی تو انہیں اطمینان ہو گیا۔ ہر چند اس میں ہاتھی نہیں تھے لیکن وہ جزیرہ نمائے عرب اور اس سے باہر کی امدادی فوجوں کا ایک دل پذیر مرقع تھا۔ اس میں وہ لوگ تھے جنہوں نے مثنیٰ کی استعانت پر الیس میں انہیں مدد دی تھی۔ اس میں بجیلہ، ازد، کنانہ اور دوسرے قبائل عرب تھے، جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مثنیٰ کی مدد کے لیے بھیجا تھا۔ اس میں بنو نمر اور بنو تغلب کے عیسائی تھے جو انس بن ہلال اور ابن مردی الفہر التغلبی کی سرکردگی میں اپنے اپنے گھڑ سوار دستے لے کر مسلمانوں کی اعانت کو آئے تھے اور اس میں بنو نمر اور بنو تغلب کے علاوہ عراق کے ان عربی قبائل کے بھی افراد تھے جنہوں نے عرب کو عجم کے مقابلے پر دیکھا اور یہ کہہ کر اسلامی

[1] جہاں آج کل کوفہ آباد ہے۔ بویب اس کے قریب ایک مقام کا نام ہے۔

Marfat.com

فوج میں شامل ہو گئے کہ ہم بھی اپنی فوج کے دوش بہ دوش لڑیں گے اور اس طرح نسلی رابطے نے عراق کے عیسائیوں کی کثیر تعداد مسلمانوں کے ساتھ کر دی۔

مہران نے مثنیٰ کو پیغام بھیجا۔ ''یا تم دریا عبور کرو یا ہمیں موقع دو!''

مثنیٰ ابھی وہ دن نہیں بھولے تھے جب ابوعبید نے بہمن سے لڑنے کے لیے دریا عبور کیا تھا، دوسرے معرکہ جسر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں سختی کے ساتھ تاکید کر دی تھی کہ جب تک فتح مکمل نہ ہو جائے دریا عبور نہ کرنا۔ اس لیے انہوں نے ایرانیوں سے کہلا بھیجا کہ دریا تم عبور کرو! ایرانی دریا عبور کر کے آئے اور اپنی فوج کو تین صفوں میں مرتب کیا۔ ہاتھی ان کی ہر صف میں تھے۔

مثنیٰ اپنے سیماب صفت گھوڑے پر سوار ہوئے جسے وہ صرف جنگ کے موقعوں پر استعمال کرتے تھے اور جب لڑائی سے فارغ ہوتے تھے تو آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے انہوں نے پوری فوج کا چکر لگایا۔ سپاہیوں کو ہدایات دیں اور انہیں جوش دلایا، ان کی ہمتیں بڑھائیں۔ وہ ایک ایک علم کے پاس کھڑے ہوتے اور کہتے: ''مجھے امید ہے کہ تم عرب کے دامن شرافت وشجاعت پر دھبہ نہ آنے دو گے! خدا کی قسم! آج کے دن مجھے اپنے لیے بھی وہ چیز پسند ہے جو تم سب کے لیے پسند ہے۔'' اور وہ بھی انہیں کے لہجے میں انہیں جواب دیتے۔ چونکہ رمضان کا مہینہ تھا، اس لیے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''تم سب کے منہ میں روزہ ہے اور روزہ نرمی وکمزوری پیدا کرتا ہے۔ اس لیے میری رائے میں اگر تم روزہ افطار کر لو تو بہتر ہے، اس سے دشمن کے مقابلے میں تمہاری قوت بڑھ جائے گی۔'' اور مسلمانوں نے روزہ افطار کر لیا۔ یکایک مثنیٰ نے دشمن کی فوج میں ایک شور سنا اور دیکھا کہ ایرانی ان کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی فوج سے کہا۔ ''یہ بزدلانہ شور وغل ہے۔ تم خاموش رہو اور بات کرو بھی تو سرگوشی کے انداز میں۔'' یہ لوگ پوری توجہ سے مثنیٰ کی باتیں سن رہے تھے اور چونکہ ان کا ایک ایک لفظ انصاف وصداقت کی تصویر تھا، اس لیے کوئی ایک متنفس بھی اپنے قول یا فعل سے ان کی تخفیف نہ کر سکا بلکہ جوں جوں وہ تقریر کر رہے تھے، حاضرین کی محبت اور تعلق خاطر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ چنانچہ جب انہوں نے کہا، ''میں تین بار تکبیر کہوں گا، تم تیار ہو جانا اور چوتھی تکبیر پر حملہ کر دینا۔'' تو سارے علم اپنی اپنی جگہ حملے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

Marfat.com

مثنیٰ نے ابھی پہلی تکبیر ہی کہی تھی کہ ایرانیوں نے تیزی سے عربوں پر حملہ کر دیا، جس کے جواب میں عرب بھی ان پر ٹوٹ پڑے۔ ایرانی حملے کی شدت سے بنو عجل کی صفوں میں کچھ بے ترتیبی پیدا ہوگئی، یہ دیکھ کر مثنیٰ نے ان کے پاس پیغام بھیجا۔ ''امیر لشکر تمہیں سلام کہتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ آج مسلمانوں کو رسوا نہ کرو!'' یہ سن کر بنو عجل سنبھلے اور عربی لشکر کے ساتھ ایرانیوں پر حملہ کر دیا، جس سے ان کی صفوں کا انتشار دور ہوگیا۔ چند گھنٹوں تک گھمسان کا رن پڑا اور بلا کی خونریزی ہوئی، مثنیٰ نے جب دیکھا کہ لڑائی طول کھینچتی جا رہی ہے تو عربوں کی فتح کا ذریعہ سوچنے لگے، انہیں اس کی بس ایک ہی صورت نظر آئی کہ ایرانی سپہ سالار پر حملہ کر کے اسے پیچھے دھکیل دیا جائے یا قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ اپنے اس ارادے کو جامہ عمل پہنانے کے لیے انہوں نے انس بن ہلال نمری اور ابن مردی الفہر تغلبی کو بلا کر ان سے کہا: ''مانا کہ تم ہمارے ہم مذہب نہیں ہو۔ مگر عرب ضرور ہو، مجھے مہران پر حملہ کرتے دیکھو تو میرے ساتھ تم بھی حملہ کر دینا۔'' یہ کہہ کر مثنیٰ نے مہران پر بڑے زور کا حملہ کیا اور اسے دھکیلتے دھکیلتے میمنے تک لے گئے۔ ایرانیوں نے یہ جو دیکھا تو اپنے سردار کو بچانے کے لیے دوڑے۔ دونوں لشکروں کے قلب ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئے اور اتنی گرد اڑی کہ کچھ پتا نہ چلتا تھا، فریقین میں کون کس پر غالب ہے؟ تھوڑی دیر کے بعد جب غبار چھٹا تو مسلمانوں نے دیکھا، ایرانیوں کا قلب پھر یک جا ہو رہا ہے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے ایرانیوں کے میمنے اور میسرے دونوں پر بہ یک وقت حملہ کر دیا اور انہیں دریا تک دباتے چلے گئے۔ اس اثناء میں مثنیٰ برابر اپنے لشکر کو ابھارتے اور سرفروشوں کو یہ پیغام بھیجتے رہے، ''جانبازو! تم اللہ کی مدد کرو! اللہ تمہاری مدد کرے گا!'' یہ پیغام، مسلمانوں کی ہمتیں بڑھاتا، ان میں شجاعت و جواں مردی کا ولولہ پیدا کرتا اور وہ آگے بڑھ بڑھ کے دشمن پر کاری ضربیں لگاتے۔

ایرانی اس شدید حملے کی تاب نہ لا سکے اور پل عبور کرنے کے ارادے سے پیٹھ دے کر بھاگے۔ مثنیٰ نے جو یہ دیکھا تو ان سے پہلے پل پر جا کر راستہ روک لیا۔ اس سے ان کے اوسان بالکل خطا ہوگئے۔ حواس باختہ کچھ لوگ پل کی طرف بھاگے، کچھ دریا میں کود گئے۔ مسلمانوں کے گھڑسوار دستوں نے ان خوف و اضطراب کے ماروں کو گھیر لیا اور کشتیوں کے پشتے لگا دیئے۔ ایرانیوں کے ہراس کا یہ عالم تھا کہ ایک مسلمان کئی ایرانیوں کو قتل کر دیتا لیکن ان میں سے کسی کو ہاتھ اٹھانے کی بھی جرأت نہ ہوتی۔ یہاں تک کہ بویب کے اس معرکے کا نام ''یوم الاعشار'' پڑ گیا کہ سو

مردان غازی ایسے تھے جن میں سے ایک ایک نے اس لڑائی میں دس دس ایرانیوں کو قتل کیا تھا۔

مسلمان رات گئے تک شکست خوردہ دشمن کو چن چن کے موت کے گھاٹ اتارتے رہے اور دوسرے دن بھی صبح سے رات تک قتل و تعاقب کا یہی سلسلہ جاری رہا۔ اس اعتبار سے جتنی خونریزی بویب کی اس جنگ میں ہوئی کسی اور جنگ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ایک لاکھ کے قریب ایرانی اس معرکے میں کام آئے جن کی لاشیں میدان میں پڑے پڑے گل سڑ گئیں اور ہڈیاں تک ایک مدت تک دنیا کو افسانہ عبرت سنا کر کوفہ کی بنیادوں میں دفن ہو گئیں۔

مسلمانوں کو بویب میں شاندار فتح حاصل ہوئی۔ اس فتح کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ مثنیٰ کی محبت اسلامی فوج کے ایک ایک سپاہی کے دل میں گھر کر چکی تھی اور حقیقتاً یہی سب سے بڑا اور سب سے اہم سبب تھا۔ مثنیٰ کو یقین کی حرارت اور دل کی جرأت کے ساتھ دشمنوں کے ہجوم میں گھستے دیکھ کر ان کے جذبہ شجاعت نے بھی انگڑائی لی اور وہ بھی انتہائی بے جگری سے دشمن پر ٹوٹ پڑے، جس کے نتیجے میں اللہ نے انہیں فتح و کامرانی سے مالا مال کیا۔ معرکہ جسر کے مفرورین اس لیے موت سے بے پروا ہو کر لڑ رہے تھے کہ انہیں اپنے دامن حیات سے فرار و بزدلی کا داغ دھونا تھا۔ مثنیٰ لڑائی کی صفیں درست کر رہے تھے کہ ایک نوجوان جوش جہاد میں صف سے نکل کر ایرانیوں کی طرف دوڑا۔ مثنیٰ نے نیزے کی نوک چبھو کر اس سے کہا: ''تمہارا باپ نہ ہو، اپنی جگہ کھڑے رہو، جب حریف سامنے آئے تو اسے کسی اور کے لیے نہ چھوڑنا!'' بولا: ''ہاں، میرے لیے یہی مناسب ہے۔'' اور اپنی صف میں جا کر کھڑا ہوا۔ مثنیٰ کی فوج کے ایک ایک افسر نے اور ایک ایک سپاہی نے اس جنگ میں ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیئے جو شجاعت و سرفروشی کے باب میں فخر و نازش کی سیاہی سے لکھے گئے۔ جب معرکہ کارزار گرم ہوا تو مثنیٰ کے بھائی مسعودؓ بن حارثہ دشمن کی صفوں میں جا گھسے اور ایرانیوں کی شکست سے پہلے ہی زخم کھا کر گر پڑے۔ ساتھیوں میں بے دلی کے آثار دیکھے تو جاں کنی کے عالم میں پکار کے کہا: ''اے فرزندان بکر بن وائل! اپنا پرچم بلند کرو۔ اللہ تمہیں بلند کرے گا۔ خبردار! میری موت سے ہراساں نہ ہونا۔'' زخمی ہونے سے پہلے بھی وہ ان سے کہہ چکے تھے: ''اگر تم ہمیں نقصان پہنچتے دیکھو تو اپنا ہاتھ نہ روکنا کہ جنگ میں فوج پیچھے ہٹ کر بھی پلٹتی ہے۔ اپنی جگہ ڈٹے رہنا اور اپنے مقابل کا حق ادا کر دینا۔'' انس بن ہلال نصرانی لڑتے لڑتے مارے گئے۔ بنو تغلب کا ایک عیسائی جوان مہران پر جھپٹا اور اسے قتل کر دیا۔ پھر اچھل کر اس کے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور لہک لہک کے کہنے لگا: ''میں ہوں تغلب کا

جوان جس نے سالار عجم کو قتل کیا ہے۔" جب مثنیٰ نے ایرانیوں سے پہلے پل پر پہنچ کے ان کا راستہ روک لیا تو عرفجہ بن ہرثمہ اپنی فوج کا ایک دستہ لے کر فرات پر جا پہنچے۔ ایرانیوں نے ہر طرف سے راہ بند پا کر عرفجہ اور ان کے دستے پر حملہ کر دیا اور بے جگری سے لڑنے لگے۔ یہ دیکھ کر عرفجہ کے ایک ساتھی نے ان سے کہا: "اگر تم پیچھے ہٹے تو دیکھ لوں گا!" عرفجہ نے جواب میں کہا۔ "نہیں! میں آگے بڑھوں گا!" اور ایرانیوں پر اتنے زور کا حملہ کیا کہ وہ فرات کی طرف بھاگے اور ان کا ایک سپاہی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ اس معرکے میں مسلمانوں کے کئی نمایاں افراد زخمی اور اسلامی فوج کے بیشتر جاں باز شہید ہوئے، اسی طرح بنو تغلب، بنو نمر اور عراق کے دوسرے قبائل کے بھی کئی بہادر زخمی اور بہت سے قتل ہوئے لیکن فتح و نصرت نے ان کے سر پر شہادت کا تاج رکھا اور ان کی یاد تاریخ کے صفحات کا قیمتی سرمایہ بن گئی، وہ جوار خداوندی میں زندگی سے ہمکنار ہیں اور ان کا پروردگار انہیں رزق سے نعمت اندوز کر رہا ہے۔

معرکہ ختم ہوا۔ مثنیٰ اپنے بھائی مسعود اور انس بن ہلال نصرانی کی لاشوں سے چمٹ گئے۔ انہیں ان دونوں کی موت کا یکساں غم تھا۔ مذہب کا اختلاف ان کے حزن و ملال میں کمی کا سبب نہ بن سکا۔ اس کے بعد انہوں نے مسلمان شہداء کی نماز جنازہ ادا کی اور کہا: "خدا کی قسم! یہ خیال میرے غم کو ہلکا کر دیتا ہے کہ یہ لوگ بویب کی جنگ میں شریک ہوئے، ثابت قدم رہے اور جرأت سے کام لیا۔ نہ خوف زدہ ہوئے، نہ بزدلی کا اظہار کیا اور شہادت گناہوں کا کفارہ ہے!"

لڑائی ختم ہونے کے بعد مسلمان شام کے وقت خوش خوش بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مثنیٰ نے کہا: "میں نے جاہلیت اور اسلام دونوں میں عرب و عجم سے جنگ کی ہے، خدا کی قسم! جاہلیت میں ایک سو عجمی ایک ہزار عربوں پر بھاری ہوتے تھے، لیکن آج ایک سو عرب ایک ہزار عجمیوں پر بھاری ہیں۔ اللہ نے ایرانیوں کا رعب زائل اور مکر باطل کر دیا۔ تم ان کے نمائشی دبدبے، لمبے نیزوں اور کثرت تعداد سے مرعوب نہ ہو جانا۔ ان سہاروں سے محروم ہوتے ہی وہ ان چوپایوں کی مثال ہیں جنہیں تم جہاں چاہو ہانک کر لے جاؤ! باتوں باتوں میں کسی نے اس واقعہ کا ذکر کیا، جب مثنیٰ نے ایرانیوں سے پہلے پل پر قبضہ کر کے ان کی ایک بہت بڑی جمعیت کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ لیکن مثنیٰ نے بات کو آگے نہ بڑھنے دیا اور اپنے اس اقدام کو نامحمود قرار دیتے ہوئے ندامت کے لہجے میں کہا: "یہ جو میں نے ان سے پہلے پل پر قبضہ کر کے ان کا رستہ روکا تھا، میری کمزوری تھی جس کی برائی سے اللہ نے بچایا، اس قسم کی حرکت اب میں کبھی نہیں

Marfat.com

کروں گا اور یاد رکھو! تم بھی ہرگز ایسا نہ کرنا۔ لوگو! وہ میری غلطی تھی، جب تک دشمن کی تاب مقاومت جواب ہی نہ دے جائے اسے اس طرح گھیر لینا فوجی نقطہ نظر سے ناجائز ہے۔"

یہ اس سپہ سالار کے الفاظ ہیں، جس نے ایک اہم لڑائی میں فتح پا کر مسلمانوں کے دامن سے معرکہ جسر کی شکست کے داغ دھوئے تھے، یہ الفاظ شہادت دیتے ہیں کہ جس طرح مثنیٰ فوجی قیادت اور صف شکنی میں غیر معمولی شجاعت کے مالک تھے، اسی طرح خود انتقادی میں بھی ان کی جرأت قابل داد تھی اگر وہ نمائش پسند اور عام داد و تحسین کی رو میں بہہ جانے والے ہوتے تو یہ الفاظ ان کی زبان سے کبھی نہ نکلتے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ایرانی پل کی راہ بند پا کر پلٹے اور جوش انتقام میں مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے تو انہیں اپنے سرفروشوں کی موت پر افسوس ہوا اور اپنے اس فعل پر ندامت۔ انہوں نے محسوس کیا کہ چاروں طرف سے مجبور ہو کر دشمن جس جاں بازی کے ساتھ لڑا تھا اس کے پیش نظر مسلمانوں کی فتح کا شکست سے بدل جانا بعید از مکان نہ تھا تو پوری جرأت کے ساتھ اپنی اس لغزش کا اعتراف کر لیا تا کہ آئندہ کوئی اور ایسی غلطی نہ کر بیٹھے۔

بویب میں مسلمانوں کو بہت سا مال غنیمت ملا جس میں بھیڑ بکریوں کے علاوہ گیہوں کا آٹا بھی تھا۔ کھانے پینے کا یہ سامان کچھ تو مجاہدین مدینہ کے اہل و عیال کو بھیج دیا گیا جنہیں وہ جزیرہ نمائے عرب کی سرحد پر چھوڑ آئے تھے اور کچھ ان عورتوں اور بچوں کو پہنچا دیا گیا جو بویب و جسر کے معرکوں سے پہلے عراق آنے والوں کے ساتھ آئے تھے اور حیرہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جو عورتیں جزیرہ نمائے عرب کی سرحد پر مقیم تھیں انہوں نے جو یہ دیکھا کہ چند سوار گھوڑوں پر غلہ لادے ان کی طرف بڑھے چلے آرہے ہیں تو سمجھیں، ڈاکو ہیں اور پتھر، ڈنڈے لے کر کھڑی ہوگئیں۔ عمرو بن عبدالمسیح نے ...... جو اس قافلے کے ساتھ تھے۔ یہ منظر دیکھ کے کہا: "ایسے لشکر کی عورتیں بھی ایسی ہی ہونی چاہئیں!" آنے والوں نے ان خواتین کو اطمینان دلایا، فتح کی خوشخبری سنائی اور سامان ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "یہ پہلی غنیمت ہے!"

مثنیٰ نے فوجی افسروں اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ سواد عراق کو طے کرتے ہوئے مدائن کے بالمقابل ساباط پہنچ جائیں۔ ایرانی فوجیں مویشیوں کی طرح بے تحاشہ ان کے آگے آگے بھاگی چلی جا رہی تھیں۔ نہ کوئی چیز ان کے قدم روکتی تھی نہ ان میں سے کسی کو ٹھہرنے کی جرأت ہوتی تھی۔ خود مثنیٰ بھی روانہ ہوئے اور میلا بھرنے کے دنوں میں خنافس اور انبار پر حملہ کیا جس میں بہت سا مال غنیمت ان کے ہاتھ آیا۔ مسلمان دجلہ پہنچے اور بغداد کی بستی پر غارت کرتے ہوئے تکریت

Marfat.com

پہنچ گئے۔ ان لڑائیوں میں لڑنے والوں کو قتل کرتے، ان کے بچوں کو غلام بناتے اور ان کا مال لے لیتے۔ اس طرح بے شمار غنیمت ان کے ہاتھ لگی اور عراق دوبارہ ان کے زیر نگین آ گیا۔ غنیمت کی تقسیم میں مثنیٰ نے مختلف قبائل کے ان لوگوں کو ترجیح دی جنہوں نے غیر معمولی جرأت و دلیری کا ثبوت دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وعدے کے مطابق قبیلہ بجیلہ کو خمس کا چوتھائی حصہ مزید دیا گیا اور بقیہ تین چوتھائی امیر المومنین کی خدمت میں روانہ کر دیا گیا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرح اب عراق میں مثنیٰ کا طوطی بول رہا تھا۔ مسلمان عراق کے مختلف حصوں میں پھیل گئے تھے اور وہاں کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہو رہے تھے۔ مثنیٰ نے حیرہ میں قیام کیا اور اسلامی لشکر کے جو سپاہی بویب کے قیامت آفریں معرکے میں کام آئے تھے۔ ان کی جگہیں پُر کرنے کے متعلق سوچنے لگے۔ شاید وہ کسی فوری کمک کے ضرورت مند نہ تھے۔ بویب کی شکست کے بعد عربوں کا جو رعب ایرانیوں کے دلوں پر طاری ہو گیا تھا اس کو دیکھتے ہوئے مثنیٰ کا خیال تھا کہ ایرانی اب اُٹھ نہیں سکیں گے۔ یہ شکست مدائن میں ان کے اختلاف کو اور شدید کر دے گی جس کے سبب ایران کے گوشے گوشے میں بغاوت پھوٹ پڑے گی اور ایران کی قوت کمزور اور اس کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔

ہمیں چاہیے کہ مثنیٰ کو ان مسائل کے متعلق سوچنے دیں اور خود معرکہ بویب کے ان اثرات پر غور کریں جو اس نے تاریخ کے صفحات پر چھوڑے ہیں۔ ہم نے ایرانیوں کے خلاف عراق کے عرب عیسائیوں کو مسلمانوں کے دوش بہ دوش انہی کی سی حمیت کے ساتھ لڑتے دیکھا ہے اور مثنیٰ کو انس بن ہلال نمری سے کہتے سنا ہے۔ ''انس! مانا کہ تم ہمارے ہم مذہب نہیں ہو مگر عرب ضرور ہو۔ مجھے مہران پر حملہ کرتے دیکھو تو میرے ساتھ تم بھی حملہ کر دینا'' اور تقریباً یہی بات انہوں نے ابن مردی الفہر تغلبی سے بھی کہی تھی تو کیا یہ اس امر کی قطعی دلیل نہیں ہے کہ اس کی اصل محرک عربوں کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنے برادران قوم کو غیر قومی استیلاء سے...... جو صدیوں سے ان پر مسلط تھا...... نجات دلائیں اور عرب قوم کی...... چاہے وہ کہیں رہتی بستی ہو۔ سیاسی وحدت قائم کریں۔ میرے نزدیک تو یہ بات اتنی واضح ہے کہ اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ پھر جو محرک عراق کی جنگ کا تھا بالکل وہی محرک شام کی جنگ کا بھی تھا۔ اب رہ گیا تلوار کے زور پر اسلام کی اشاعت کا سوال سو یہ بات حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حاشیہ خیال میں بھی

Marfat.com

نہ تھی۔ ان کا مدعا تو صرف یہ تھا کہ دعوت اسلام کو مکمل آزادی نصیب ہو جائے اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

یہ اس لیے کہ تیر و تفنگ کے بل پر اسلام کی اشاعت، اسلام کے اصول و مبادی کے قطعاً منافی ہے اور اللہ نے اپنے رسول ﷺ پر جو کتاب نازل فرمائی ہے وہ اس کی بالکل اجازت نہیں دیتی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے خلفاء اللہ کا یہ فرمان ہمیشہ یاد رکھتے تھے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ. (النحل:125)

ترجمہ: ''اپنے رب کے رستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ سے بلاؤ اور ان کے ساتھ اس طریق سے بحث کرو جو نہایت عمدہ ہے۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ. (السجدہ:34)

ترجمہ: ''برائی کا بدلہ اچھے سے اچھا کر! (ایسا کرے گا تو دیکھ لے گا) جو تیرا دشمن تھا وہ ایک دم سے ایسا ہو جائے گا جیسے (تیرا) دل سوز دوست!''

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی فتوحات جس قدر بڑھتی گئیں اسی قدر اسلام کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ مفتوحہ علاقوں کے باشندوں نے اس دین قیم کے اصول دیکھے، انہیں پرکھا اور اسلام کی عظمت سے متاثر ہو کر اس پر ایمان لے آئے اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ مسلمانوں کے کردار اور جنگ آزمائی اور فرمانروائی میں معجزانہ قوتوں کو دیکھ کر غیر مسلموں کے دل میں شوق پیدا ہوا اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا...... اس اعتبار سے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ فتوحات کے ساتھ ساتھ اسلام کا حلقہ اثر بھی بڑھتا اور پھیلتا گیا۔ لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ اسلام کو بزور شمشیر پھیلانے کی خواہش ان فتوحات کی محرک تھی۔

بویب کی جنگ جہاں ان چند حقائق کے چہرے سے نقاب اٹھاتی ہے وہاں اس حقیقت کو بھی واضح کر دیتی ہے کہ عربوں اور ایرانیوں کی دشمنی اس حد کو پہنچ چکی تھی جہاں صلح و آشتی کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ معرکہ بویب نتیجہ تھا معرکہ جسر کا اور معرکہ جسر میں مسلمانوں کو غیر معمولی شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا جس کا بھرپور جواب انہوں نے معرکہ بویب میں دیا۔ بویب کی شان

Marfat.com

فتح نے نہ صرف یہ کہ پچھلی شکست کے دھبے مسلمانوں کے دامن سے دھو دیئے بلکہ ان کا کلمہ بھی بلند کردیا۔ ایرانیوں کے دل میں مسلمانوں کی دھاک بھی بٹھادی اور ایرانیوں کی ہمتیں بھی پست کردیں، تاہم جس طرح معرکہ جسر کے بعد مسلمانوں کے دل میں سپرانداز ہونے اور ایرانیوں سے صلح کر لینے کا خیال تک نہ آیا تھا، اسی طرح معرکہ بویب کے بعد ایرانیوں نے بھی مسلمانوں سے ہار نہ مانی نہ مصالحت ہی کی کوئی کوشش کی۔ ان حالات میں اس کے سوا اور چارہ کار بھی کیا تھا کہ جب تک کوئی فریق بلا شرط ہتھیار نہ ڈال دے، جنگ برابر جاری رہے۔

بویب کی دہشت دل سے دور ہوتے ہی ایرانیوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ ایران کے داخلی انتشار اور گروہ بندیوں کا یہی حال رہا تو ان کا انجام کیا ہوگا؟ انہوں نے خیال کیا کہ عرب ایک نہ ایک دن ایران کے پایہ تخت میں داخل ہو کر ان کے قلعے مسمار کر دیں گے اور کسریٰ کی اولاد کو اپنا باج گزار بنالیں گے؟ اس سے بچنے کی اگر کوئی صورت ہو سکتی ہے تو بس یہ کہ کوئی معجزہ ان کو متحد کر دے اور وہ غازیان اسلام کے مقابلے میں ثابت قدم رہ کر انہیں اپنے ملک سے نکال باہر کریں۔ لیکن اتحاد کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک رستم اور فیروزان میں اقتدار کی جنگ جاری ہے اور جب تک ایران کے امراء اور جاگیرداران دونوں کی اعانت سے دستکش نہیں ہو جاتے۔ بہت کچھ سوچ بچار کے بعد اہل ایران ان دونوں کے پاس گئے اور انہیں ان کے باہمی اختلاف و کشمکش کے مہلک نتائج سے خبردار کرتے ہوئے کہا، ”بغداد، ساباط اور تکریت کے بعد اب مدائن کی باری ہے۔“ پھر انہیں دھمکی دی: ”یا تو تم دونوں آپس میں صلح کرلو ورنہ اس سے پہلے کہ ہم پر کوئی آفت نازل ہو ہم تمہارا قصہ تمام کر دیں گے۔“

رستم اور فیروزان نے باہمی مشورے کے بعد کسریٰ کے اہل و عیال کے نام ایک خط لکھوایا اور جب کسریٰ کی بیویاں مدائن لائی گئیں تو معلوم ہوا کہ اس کی اولاد نرینہ میں صرف یزدگرد بن شہریار بن کسریٰ باقی بچا ہے، جسے اس کی ماں نے شیریٰ کے خوف سے اس کی ننھیال میں چھپا دیا تھا۔ جب شیریٰ اپنے باپ کے تمام بیٹوں کو موت کے گھاٹ اتر وا رہا تھا، یزدگرد کو لا کر اس کے آبائی تخت پر بٹھا دیا گیا اس وقت اس کی عمر اکیس سال تھی۔ اپنے تمام اختلافات کو پس پشت ڈال کر ایرانی اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس طرح اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور زائل شدہ وقار کی بازیابی کے لیے کوشش کرنے لگے۔

مثنیٰ کو یہ اطلاعات ملیں تو وہ بہت پریشان ہوئے انہیں یقین تھا کہ ایرانی فوجیں ان کی

Marfat.com

طرف بڑھیں تو اہل عراق بغاوت کر دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھا جس میں فوجی ضروریات کے علاوہ اس متوقع بغاوت کا بھی ذکر تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ان کا خط دربار خلافت میں پہنچے، ایرانیوں کا لشکر تیار ہو گیا۔ اس لشکر کی تیاری نے عراق کے شہروں اور بستیوں میں بغاوت کے شعلے بھڑکا دیئے اور مثنیٰ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ ایک دفعہ پھر جزیرہ نمائے عرب کی سرحدوں کی طرف سمٹ آئیں، چنانچہ وہ اپنی فوج کو لے کر ذی قار پہنچ گئے اور جتنے آدمی انہیں وہاں مل سکے سب کو ایک لشکر میں جمع کر کے ایرانیوں کی اس نئی فوج کا مقابلہ اور مدائن فتح کرنے کے لیے خلیفہ کی مدد کا انتظار کرنے لگے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب مثنیٰ کے خط سے یہ معلوم ہوا کہ ایرانیوں نے اپنے اختلافات دور کر کے مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں مکمل کر لی ہیں تو فرمایا: ”خدا کی قسم! میں شاہان عجم کو ملوک عرب سے ضرور ٹکراؤں گا۔“ اور مثنیٰ کو حکم دیا کہ وہ عراق کی سرحدوں پر پہنچ کر ایران کے قریبی ساحل پر پھیل جائیں اور وہاں کے لوگوں سے مدد چاہیں، مبادا اس سے بے سروسامانی کے عالم میں ایرانی ان پر حملہ کر دیں۔

مثنیٰ ذی قار پہنچے، لیکن ایرانیوں نے وہاں ان سے مقابلہ کرنا کچھ ضروری نہ سمجھا۔ وہ ذی قار ہی میں مقیم رہے، یہاں تک کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ان سے آملے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اس فوج کے امیر تھے جو مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روانہ کی تھی۔ لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور مثنیٰ کا ساتھ کچھ زیادہ دنوں تک نہ رہ سکا۔ مثنیٰ کو معرکہ جسر میں جو زخم لگا تھا وہ ابھی تک مندمل نہ ہوا تھا اور آخر کار وہی ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ بعض روایات میں تو یہ ہے لیکن کچھ روایتیں کہتی ہیں کہ مثنیٰ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ذی قار پہنچنے سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے اور انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے لیے ایک وصیت چھوڑی تھی جس کا ذکر ہم اس کے محل پر کریں گے۔

اب جبکہ حضرت مثنیٰ وفات پا چکے ہیں ہمارا فرض ہے کہ اس باب کو ختم کرنے اور واقعات کے تند و تیز دھارے میں بہنے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے اس جانباز سپہ سالار کی قبر پر کھڑے ہو کر اسے الوداع کہیں اور اس کی بعض خدمات کا اعتراف کریں۔

اس بزرگ مرد مجاہد نے ایران کی جنگوں میں مسلمانوں کا بوجھ جس طرح اپنے کندھوں پر لیا، اس کی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ وہ پہلے مسلمان تھے جو اس علاقے میں آئے اور جنہوں

Marfat.com

نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی توجہ فتح عراق کی طرف منعطف کرائی۔ اگر وہ یہاں نہ آتے تو خلیفہ اول رضی اللہ عنہ ایرانیوں سے نبرد آزما ہونے کے متعلق کبھی نہ سوچتے۔ انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملک عراق کا ایک حصہ فتح کیا اور اگر ابن حارثہ رضی اللہ عنہ میں غیر معمولی جرأت، عسکری مہارت اور رائے کی اصابت نہ ہوتی تو وہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے شام چلے جانے کے بعد ایرانیوں کا اتنی ہمت و پامردی کے ساتھ مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وصیت کی تھی کہ وہ مثنیٰ کے لیے لوگوں سے اپیل کریں تو اصولاً اس کی کمک کی قیادت مثنیٰ ہی کے سپرد ہونی چاہیے جو ان کی درخواست پر عراق روانہ کی جا رہی تھی، اس لیے کہ مثنیٰ عراق کے چپے چپے سے واقف تھے اور اہل عراق سے جتنی جرأت اور بہادری کے ساتھ وہ لڑ سکتے تھے کوئی دوسرا نہیں لڑ سکتا تھا اور اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ زندہ رہتے تو یقیناً انہیں کو اس لشکر کی امارت سونپتے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ منصب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمایا کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے وہی تھے۔ وہ حجاز کے ثقفی تھے اور مثنیٰ کا نسبی تعلق بنو بکر بن وائل سے تھا تو کیا مثنیٰ اس بات سے ناراض ہوئے یا ان کے دل میں اس بدگمانی نے راہ پائی کہ ان کے معاملے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وصیت کے خلاف عمل کیا ہے؟ نہیں بالکل نہیں! مثنیٰ نے اس سطح سے بلند ہو کر سوچا تھا۔ وہ ابوعبید رضی اللہ عنہ سے پہلے ہی عراق روانہ ہو گئے اور جب ابوعبید وہاں پہنچے تو ان کی ماتحتی میں نمارق کی جنگ لڑی اور فتح حاصل کی۔ پھر معرکہ جسر میں ابوعبید اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کے بعد اسلامی پرچم اپنے ہاتھ میں لے لیا اور وہاں سے اسلامی فوج کے بچے کھچے سپاہیوں کو لے کر الیس آ گئے۔ یہاں کچھ دنوں قیام کرنے کے بعد جب کمک پہنچی تو بویب کا معرکہ پیش آیا، اور اس میں انہوں نے فوج کی ایسی ماہرانہ قیادت کی کہ لوگوں کے حافظے میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے کارناموں کی یاد تازہ ہو گئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مثنیٰ پر ابوعبید کو امیر بنانا اس طبقاتی نظام کی طرف ابتدائی قدم تھا جو امیر المومنین مسلمانوں میں قائم کرنا چاہتے تھے۔ یوں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اپنے اس اقدام کی ایک اور وجہ جواز بھی تھی اور وہ یہ کہ ابوعبید نے اس وقت عراق جانے پر آمادگی ظاہر کی تھی جب دوسرے لوگ اس سے پہلو تہی کر رہے تھے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان کا یہ قدم ان کی طبقاتی پالیسی سے پوری پوری مطابقت رکھتا تھا، جس کی تصدیق اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ جریر بن

Marfat.com

عبداللہ بجلی معرکہ جسر کے بعد مثنیٰ کی مدد کو پہنچے اور مثنیٰ کو معلوم ہوا کہ وہ ان کے قریب سے ہو کر گزر گئے ہیں۔ انہوں نے جریر رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھا کہ آپ میری مدد کو آئے ہیں، آپ کو میرے پاس آنا چاہیے، جس کا جواب جریر رضی اللہ عنہ نے یہ دیا کہ جب تک امیر المومنین رضی اللہ عنہ مجھے حکم نہ دیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔ آپ بھی امیر ہیں اور میں بھی امیر ہوں۔ مثنیٰ نے اس کی شکایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھیجی تو دربار خلافت سے جواب آیا:

''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی پر تمہیں امیر نہیں بنا سکتا۔'' پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو عراق بھیجا تو مثنیٰ اور جریر رضی اللہ عنہ دونوں کو لکھا کہ: ''سعد رضی اللہ عنہ تمہارے امیر ہوں گے۔'' اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ سابقون اولون میں سے تھے اور سابقون اولون کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ تمام مسلمانوں سے افضل سمجھتے تھے۔

مثنیٰ اس بات سے بھی آتش بہ دل نہ ہوئے کہ ان پر کسی اور کو امیر کیوں بنایا گیا۔ وہ ایک ایسے مسلمان تھے جن کا ایمان سچا اور بے کھوٹ تھا۔ اسی طرح وہ ایک ایسے مجاہد تھے جو نظم و طاعت کے مفہوم سے پوری طرح آشنا تھے اور نظم و ایمان کو ذاتی اغراض سے کہیں بلند سمجھتے تھے۔ اگر ان کو فوج کی امارت سے محروم رکھا گیا تو اس سے ان کی قدر و اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اور نہ تحسین و امتیاز کی وہ سطریں ہی مٹ سکتی ہیں جو ان کے متعلق تاریخ نے اپنے صفحات میں محفوظ کر رکھی ہیں۔ اگر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ ایک عدیم النظیر سپہ سالار اور اللہ کی تلوار ہیں تو مثنیٰ بن حارثہ کی اس اولیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فتح عراق کی بساط سب سے پہلے انہی نے بچھائی تھی۔ وہ ایک ایسے آزمودہ کار قائد تھے جنہوں نے انتہائی نازک موقعوں پر مسلمانوں کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی اور وہ ایک ایسے مدبر تھے جنہوں نے مذہبی اختلاف کے باوجود عراق کے تمام عربی النسل قبائل کے دل موہ لیے تھے اور انہیں اپنے ساتھ ملا کر بویب کی جنگ میں ایرانیوں پر وہ کاری ضرب لگائی تھی جسے ایرانی ہمیشہ سینکتے رہے اور جس کے بعد انہیں فتح کا منہ دیکھنا کبھی نصیب نہ ہوا۔

یہ بات مثنیٰ کے فخر میں اور اضافہ کرتی ہے کہ یہ سارے کارنامے انہوں نے کم سے کم مدت میں سرانجام دیئے۔ ابو عبید 634ء کی ابتدائے خزاں میں عراق پہنچے تھے۔ اسی سال اکتوبر کے مہینے میں انہوں نے نمارق کی جنگ فتح کی اور اسی مہینے کی آخری تاریخوں میں جسر کے موقع پر شہید بھی ہو گئے۔ ان کے بعد فوج کی کمان مثنیٰ نے سنبھالی اور الیس فتح کر کے نومبر کے مہینے

بویب کا شاندار معرکہ سر کیا۔

بویب کی فتح کے بعد اگر انہیں بروقت کمک مل جاتی تو وہ مدائن پہنچ کر سال کے ختم ہونے سے پہلے پہلے اسے بھی فتح کر لیتے لیکن کمک پہنچنے میں دیر ہوئی اور موت جلد آ پہنچی۔ مثنیٰ کا انتقال ہو گیا اور فتح و نصرت نے فخر و امتیاز کا وہ تاج ان کے سر پر رکھ دیا جس کی جگمگاہٹ ابدالآباد تک نگاہوں کو خیرہ کرتی رہے گی۔

اچھا! الوداع! اے قائد توانا! خدا کے حوالے! ہم تیرے میدان کو تیری فتح و نصرت کے غلغلوں سے گونجتے چھوڑ کر تیرے ساتھی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس شام جاتے ہیں۔ لوگ رہتی دنیا تک یاد رکھیں گے کہ مثنیٰ بن حارثہ شیبانی اسلامی سلطنت کے بساط گستروں کی صف اول میں تھے۔ ان کا شمار اس کے دانش مند اور طاقتور بانیوں میں کیا جائے گا اور اس کی تعمیر میں ان کے عظیم الشان کارناموں کی عظمت اس بات سے کم نہ ہوگی کہ وہ قریشی نہ تھے، صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے بعد انہیں فوج کی امارت نہیں سونپی گئی تھی۔ وہ جنگ بویب کے قائد تھے اور اس معرکے میں جس جرأت و پیش قدمی کا مظاہرہ انہوں نے کیا تھا وہ انہیں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے برابر لا کھڑا کرتی ہے بلکہ جہاں تک مصلحت و پیش بینی کا تعلق ہے ان کا مرتبہ شاید حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے بھی بلند ہے۔

⊙❀⊙

Marfat.com

باب:7

فتح دمشق

شاید آپ کو یاد ہو گا جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شام کو فتح کرنے کا عزم فرمایا تھا اور اس کے لیے تمام عربوں سے مدد چاہی تھی تو سرزمین شام کی طرف چار فوجیں روانہ کی تھیں۔ ایک فوج کے سردار حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ تھے اور دوسری فوج کے افسر حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابی جہل۔ تیسری فوج کی قیادت حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمائی تھی اور چوتھی فوج کی کمان حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے۔ ان چاروں کے لیے شام کا ایک ایک حصہ مخصوص کر دیا تھا اور حکم یہ تھا کہ اگر چاروں فوجیں یکجا ہو جائیں تو ان سب کے امیر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ ہوں گے۔ ان فوجوں کو روم کی طاقت اور قوت مقابلہ نے یرموک کے کنارے ایک جگہ جمع ہونے پر مجبور کر دیا۔ ہرقل کی فوج نے اسلامی لشکر کو پیش قدمی نہ کرنے دی اور وہ اس کے بالمقابل دریا کے دوسرے کنارے آ کر ٹھہر گیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی فوج کے جمود سے تنگ آ گئے اور عراق میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ شام جا کر تمام لشکر کی قیادت سنبھال لیں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ شام پہنچے اور یہ بھی یرموک کے کنارے رومیوں سے مقابلہ کیے بغیر ایک مہینے تک پڑاؤ ڈالے رہے۔ اسی دوران میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وفات پا گئے اور مسلمانوں کی امارت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوئی، لیکن شام میں اسلامی فوجوں کے جمود کا وہی حال رہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کا آغاز اس طرح کیا کہ محمیہ بن زنیم اور شداد بن اوس کو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے نام ایک خط دے کر بھیجا جس میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو فوج کی سپہ سالاری سے معزول کر کے ان کی جگہ حسب سابق حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار مقرر کیے جانے کا حکم تھا۔[1]

---

[1] مؤرخین نے اس خاص موقع اور شام کی فتح سے متعلق جو روایات نقل کی ہیں ان میں بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے اپنی رائے ''الصدیق ابوبکر رضی اللہ عنہ'' کے چودھویں باب میں ظاہر کر دی ہے اور یہ وہ باب ہے جس میں عہد صدیق رضی اللہ عنہ کی شامی فتوحات کا ذکر کیا گیا ہے، واقعات کی ترتیب میں روایات مختلف ہیں۔ اس حد تک کہ بعض مؤرخین کے نزدیک یرموک کا معرکہ شام کا آخری معرکہ ہے۔ اسی طرح حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔''

Marfat.com

محمیہ بن زنیم اور شداد بن اوس جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی کا حکم لے کر شام روانہ ہوئے تھے، ابھی رستے ہی میں تھے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا، رومی مقابلے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بھی تیاریاں شروع کر دیں اور رومیوں کا قصہ پاک کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ انہوں نے اپنی فوج کو ایک ایسے طریق پر، جس سے عرب قطعاً ناآشنا تھے مختلف دستوں میں تقسیم کیا اور دوسرے دن سورج نکلنے سے پہلے دشمن پر حملہ کر دیا، رومیوں نے جم کر مقابلہ کیا، لیکن مسلمانوں کا حملہ اتنا شدید تھا کہ وہ سہار نہ سکے اور شام میں ان کی تمام اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ ①

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی کا حکم لے کر جانے والے ایلچی اسی دن صبح کے وقت شام پہنچے، جس دن یہ فیصلہ کن معرکہ پیش آیا اور امیر المومنین کا مراسلہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو پہنچا دیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے جب تک لڑائی ختم نہ ہوگئی، اس خط کا مضمون کسی کو نہ بتایا۔ جب مسلمانوں نے معرکہ سر کر لیا تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اس حکم سے آگاہ کیا اور اعلان عام کے بعد فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔

بعض دوسری روایتیں کہتی ہیں کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے لڑائی کے بعد بھی اس خبر کو چھپائے رکھا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں دمشق روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر بھی اس وقت تک امیر المومنین کے حکم کی تشہیر نہ کی جب تک مسلمانوں نے دمشق فتح نہیں کر لیا اور اہل دمشق سے ان کی صلح نہ ہو گئی۔ لیکن کچھ روایتیں ایسی بھی ہیں جو واقعات کو اس سے مختلف صورتوں میں پیش کرتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو تمام فوجی خدمات سے معزول کر دیا تھا اور ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا تھا کہ ان کے خلاف الزامات کی تحقیق کر کے ان سے جواب طلب کیا جائے۔

»اور یہ امر بھی فیصلہ طلب ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر کی سپہ سالاری سے معزول کر دیئے جانے کے باوجود اپنی اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی فوجوں کے سردار رہنے دیئے گئے تھے، یا انہیں ہر قسم کی فوجی خدمات سے محروم کر دیا گیا تھا؟ ''الصدیق ابوبکر رضی اللہ عنہ '' کی طرح یہاں بھی ہم طبری اور اس کے متبعین کی روایت کو ترجیح دیں گے۔ اس لیے کہ یہ روایت ہماری رائے میں واقعے سے قریب تر ہے۔ اگر سلسلہ کلام مقتضی ہوا تو ہم بلاذری وغیرہ کا حوالہ بھی دیں گے جن کی رائے طبری کی رائے سے مختلف ہے۔)

① اپنی کتاب ''الصدیق ابوبکر رضی اللہ عنہ'' میں ہم نے اس معرکے کی پوری تفصیلات درج کی ہیں۔ آپ چاہیں تو اس سے رجوع کر سکتے ہیں۔

Marfat.com

میرے نزدیک قرین صواب یہ ہے کہ جس وقت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی کا حکم پہنچا، اسی وقت انہوں نے اس کا اعلان نہیں کیا۔ اب چاہے یہ حکم اسی دن پہنچا ہو جس دن یرموک کا معرکہ پیش آیا، یا اس جنگ میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے فتح یاب ہونے کے بعد ملا ہوا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کچھ دنوں تک یہ خبر پوشیدہ رکھی اور سوچتے رہے کہ اس حکم کا اعلان کس طرح کریں۔ اسی اثناء میں عراق کے اسلامی لشکر کو معلوم ہو گیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وفات پا گئے اور ان کی جگہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسند نشین خلافت ہوئے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت نے اختلاف رائے پیدا کر دیا اور اہل مدینہ کی طرح یہاں بھی بعض لوگوں نے اسے ناپسند کیا، لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق ہوا ہے تو وہ مطمئن ہو گئے اور ان کے دلوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو جب یہ خبر ملی تو اسی وقت انہوں نے سمجھ لیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں عراق کے لشکر کا سپہ سالار نہیں رہنے دیں گے اور وہ ایک نہ ایک دن اس عہدے سے لازماً معزول کر دیئے جائیں گے۔ چنانچہ اس اندیشے کا اظہار حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اپنے قریبی دوستوں سے بھی کیا تھا۔ ہمارا خیال ہے یہ بات انہوں نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے بھی کہی ہو گی اور اس وقت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مراسلے کی اطلاع نہیں دی ہو گی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم سن کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے غیظ و غضب کا بالکل اظہار نہ کیا بلکہ عراقی لشکر کی کمان طیب خاطر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن الجراح کے سپرد فرما دی، جس طرح اس سے پہلے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کی کمان حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دی تھی جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ عراق سے شام گئے تھے۔[1] دوسرے لوگ بھی حضرت خالد رضی اللہ عنہ

---

① بعض روایات میں ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی کا خط حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو اس وقت ملا جب اسلامی لشکر دمشق کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس خط کا مضمون حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے خالد رضی اللہ عنہ سے پوشیدہ رکھا اور تقریباً بیس دن کے اس وقت انہیں بتایا جب دمشق فتح ہو گیا۔ ''البدایہ والنہایہ'' میں ابن کثیر کا بیان ہے کہ جب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ان کی معزولی سے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم پہنچایا تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: ''اللہ آپ پر رحم کرے آپ نے یہ حکم مجھے اسی وقت کیوں نہ پہنچا دیا؟'' حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''یہ مجھے کچھ اچھا معلوم نہ ہوا کہ میں آپ کی جنگ آزمائی کا سلسلہ منقطع کر دوں۔ مجھے دنیا کا اقتدار نہیں چاہیے، نہ میرا عمل دنیا طلبی کے لیے ہے کہ دنیا اور اس کا اقتدار ایک نہ ایک دن ختم ہو جائیں گے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور ایک انسان کے لیے اس میں کوئی نقصان نہیں ہے کہ اس کا بھائی دین و دنیا میں اس کے قریب رہے۔'' اور یہ وہی جواب ہے جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خط میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو دیا تھا، جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ خلیفہ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف سے سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی جگہ شام کے امیر لشکر مقرر کیے گئے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے انہیں لکھا تھا: ''خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

معزولی کے حکم سے چراغ پا نہیں ہوئے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مالک بن نویرہ کے قتل کے بعد سے ان دونوں حضرات میں مستقل کشیدگی چلی آرہی ہے۔ اس طرح فوجی قیادت کی یہ تبدیلی ایسے وقت عمل میں آئی جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جنگ میں نہایت شاندار فتح حاصل کی تھی اور مسلمانوں کے نظام اور ان کے لشکروں میں اس تبدیلی کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوا، جو اپنے نتائج کے اعتبار سے خطرناک کہا جا سکتا۔ یہ ہے وہ بات جسے میں صحیح سمجھتا ہوں اور جو مختلف روایتوں سے مستنبط ہوتی ہے۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے فتح یرموک کی خوشخبری کے ساتھ دربار خلافت میں خمس روانہ کیا اور خط لکھا کہ ''میں بشیر بن سعد بن ابی حمیری کو یرموک میں اپنی جگہ چھوڑ کر ان ہزیمت خوردہ فوجوں کے تعاقب میں، جو فحل، کے مقام پر جمع ہو رہی ہیں، مرج الصفر جا رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ہرقل حمص میں مقیم ہے اور وہاں سے دمشق فوجیں روانہ کر رہا ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا میرے لیے دشوار ہے کہ پہلے دمش پر حملہ کروں یا فحل پر؟'' حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کا یہ خط پڑھتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں جواب میں لکھا:

''پہلے دمشق پر حملہ کر کے اسے فتح کرو کہ وہ شام کا قلعہ ہے اور اس کا صدر مقام ہے۔ ساتھ ہی فحل میں بھی سوار دستے بھیج دو جو انہیں تمہاری طرف نہ بڑھنے دیں۔ اگر دمشق سے پہلے فحل فتح ہو جائے تو بہتر ہے ورنہ دمشق فتح کر لینے کے بعد تھوڑی سی فوج وہاں چھوڑ دینا اور تمام سرداروں کو اپنے ساتھ لے کر فحل روانہ ہو جانا اور اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں فحل فتح کرا دے تو خالد رضی اللہ عنہ اور تم حمص چلے جانا اور شرحبیل وعمرو کو اردن اور فلسطین بھیج دینا۔''

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ خط ملا تو انہوں نے اپنی فوج کے دس افسروں کو، جن میں سب سے نمایاں ابو الاعور سلمی تھے، فحل بھیج دیا اور خود حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک بھاری جمعیت لے کر دمشق روانہ ہو گئے۔ رومی فوجوں نے جو شکست کھا کر فحل میں جا چھپی تھیں اور جن پر یرموک کا خوف ابھی تک طاری تھا، مسلمانوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اپنے

'' ایک خط میرے پاس آیا ہے، جس میں حکم دیا گیا ہے کہ میں شام جا کر اسلامی فوجوں کی قیادت سنبھال لوں۔ خدا گواہ ہے میں نے اس کی طلب نہیں کی نہ میرا ایسا کوئی ارادہ تھا۔ نہ میری طرف سے اس کے متعلق دربار خلافت میں کوئی خط لکھ گیا۔ آپ، اللہ آپ پر رحمت کرے بدستور اپنی جگہ رہیں گے، نہ آپ کے حکم سے سرتابی کی جائے گی نہ آپ کی رائے سے اختلاف۔ کوئی معاملہ آپ کی رائے کے بغیر طے نہیں ہوگا کیونکہ آپ مسلمانوں کے سرداروں میں سے ایک سردار ہیں۔ نہ آپ کی فضیلت سے انکار کیا جا سکتا ہے، نہ آپ کی رائے سے بے نیاز ہوا جا سکتا ہے۔ اللہ ہمیں اور آپ کو اپنے احسان کی نعمت سے نوازے اور دوزخ کی آگ سے بچائے۔'' اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں سپہ سالاروں کا یہ باہمی اعتماد ان کی فتوحات میں ایک قوی ترین سبب کا درجہ رکھتا ہے۔

Marfat.com

گردو پیش کی زمین میں بحیرہ طبریہ اور دریائے اردن کا پانی چھوڑ دیا جس سے ساری زمین دلدل بن گئی اور اسے عبور کرنا دشوار ہو گیا۔ مسلمانوں کو دشمن کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا اور انہوں نے رومیوں کا محاصرہ کرلیا۔ اس لیے کہ دلدل کی وجہ سے آگے بڑھنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ محاصرہ جاری رہا یہاں تک کہ دمشق کے بعد ان کے بھائی انہیں کمک بھیجنے کے قابل ہو گئے۔

دمشق کی مستحکم فصیلوں اور اس عظیم الشان لشکر کے باوجود، جو ہرقل نے اس شہر کی حفاظت کے لیے بھیجا مسلمانوں کا دمشق فتح کر لینا کوئی حیرت کی بات نہیں، اس لیے کہ یرموک فتح کرنے کے بعد مسلمان ایک ایسی سرزمین سے گزرتے رہے تھے جس میں اگرچہ نہروں اور دریاؤں کی کمی نہ تھی لیکن اس کی سرسبزی و شادابی مدینہ اور اس کے نواح کی سرسبزی و شادابی پر فضیلت نہ رکھتی تھی اور نہ وہ عراق کے نہری علاقے کی طرح جاذب نظر تھی لیکن جب وہ واقوصہ سے یرموک ہوتے ہوئے دمشق کی طرف چلے تو ایسے ایسے حسین مناظر ان کی نظر سے گزرے جن کی رونق و تازگی آنکھوں کو نور اور دلوں کو سرور بخشتی تھی، جنوب میں حد نظر تک پھیلا ہوا سبزہ تھا اور شمال میں نظر افروز مرغزار، جن سے متصل گیہوں اور جَو کے لہلہاتے کھیتوں میں سے نظر آنے والے درخت رنگ برنگ کے پھولوں اور طرح طرح کے پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ پھولوں کی خوشبو فضا میں مشک و عبیر بکھیر رہی تھی اور ندی نالوں کا شفاف پانی، کہیں پرسکون اور کہیں نغمہ ریز، کھیتوں، درختوں اور باغوں کو سیراب کر رہا تھا۔ جہاں یہ پانی ٹیلوں سے بہتا انہیں دھانی پوشاکیں پہنا دیتا یا بلند و بالا درختوں سے آراستہ کر دیتا اور وہ ٹیلے ایسے معلوم ہوتے جیسے وادیوں میں پرچم گڑے ہوں۔ ہوا جب ان درختوں سے کھیلتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے فضا میں جھنڈے لہرا رہے ہوں اور زمین پر خوش رنگ کا پھولوں کا مینہ برس رہا ہو۔ اس عشرت گاہ نظر، اس فردوس رنگ و نکہت کے اہلو پہلو رومیوں کے بسائے ہوئے شہر تھے جن کی سیر گاہوں، تفریح کدوں اور کلیساؤں کی عظمت نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتی اور دلوں سے حیرت و استعجاب کا خراج وصول کرتی تھی۔

ادھر شمالی افق میں دور تک سر بہ فلک پہاڑوں کا ایک سلسلہ تھا جنہیں برف نے سفید تاج پہنا کر بڑھاپے کے وقار و جلال کی دلنشیں تصویر بنا دیا تھا۔ دنیا کی کوئی چیز نہ تھی جو اس منظر کی دل فریبی و سحر آگینی کا مقابلہ کر سکتی اور ایمان کے سوا کائنات کی کوئی قوت نہ تھی جو اس جنت ارضی کی تسخیر کی ہمت اپنے اندر پا سکتی۔ لیکن مسلمانوں کا یہ لشکر، جو اللہ کی زمین پر حق کا بول بالا کرنے

کے لیے تن بہ تقدیر وسر بہ کف اپنے وطن سے نکلا تھا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت سے سرشار اور ایمان کی دولت سے مالا مال تھا۔ پھر اس سرزمین کی طلسم کاریوں نے اس کے ایمان کی قوتوں کو اور مضبوط و مستحکم کر دیا تھا جس کے زیر اثر وہ شام کے دارالسلطنت کی طرف تیزی سے بڑھا چلا جا رہا تھا۔

یہی نہیں بلکہ خود دمشق کے نام میں اتنی کشش تھی جو مسلمانوں کو فتح و کامرانی کی دعوت دے کر اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ مسلمانوں نے اپنے بھائیوں اور بزرگوں سے جو موسم گرما میں شام کا سفر کیا کرتے تھے، اکثر اس شہر کے عجائب و نوادر کا ذکر سنا تھا، پھر ان کے ہم وطن عیسائیوں نے بھی، جو بیت المقدس حج کے لیے جاتے رہتے تھے، ان سے اس شہر کے حالات بیان کیے تھے۔ یہ عیسائی حج سے فارغ ہو کر شام کے پایہ تخت دمشق جاتے، وہاں تمدن و حضارت کے مختلف پہلوؤں سے نعمت اندوز ہوتے اور وہ بیش بہا تحفے خریدتے جو فلسطین کے مقدس شہر میں ڈھونڈے نہ ملتے تھے۔ ان عیسائیوں سے دمشق کے حالات سن سن کر مسلمانوں کے دل میں اس شہر کے سرسبز باغوں، بہتی نہروں، ٹھنڈے سایوں اور لذیذ و خوش رنگ پھلوں کو دیکھنے اور چکھنے کا شوق بھڑک اٹھا۔ وہ دمشق کے اس جمال سے نظر آشنا ہونے کے لیے پھڑکنے لگے جس کا ماضی اس کے حال سے کہیں زیادہ دل فریب اور سحر کار تھا۔ اس لیے کہ دمشق اگر دنیا کا قدیم ترین شہر نہ تھا تو اس کے قدیم ترین شہروں میں سے [1] ضرور تھا۔ عہد عتیق میں اسے ایک خاص عظمت حاصل تھی، پہلے یہ بت پرستی کا بہت بڑا مرکز تھا، لیکن جب مسیحیت آئی تو اس کے بت کدے کو کلیسا بنا دیا گیا۔ اپنے حسن و وقار کے لحاظ سے یہ کلیسا اس مرتبے کا تھا کہ انطاکیہ کے کلیسا کو چھوڑ کر، جو شام میں عیسائیوں کی سب سے بڑی عبادت گاہ تھی۔ دنیا کا کوئی مسیحی معبد اس کا جواب پیش نہ کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس شہر میں رومیوں کی بنائی ہوئی وہ عمارتیں بھی تھیں جن کی عظمت ان تمام عمارتوں سے فائق تھی جو راستے میں عربوں کی نگاہ سے گزری تھیں۔ پھر کیوں نہ عربی لشکر اس شہر کی طرف تیزی سے جھپٹتا اور کیوں نہ رومیوں کو یرموک میں شکست دینے اور واقوصہ کے میدان میں ان لاکھوں سپاہیوں کو جہنم واصل کرنے کے بعد یہ سمجھتا کہ وہ دمشق کو بھی لازمی طور پر فتح کر لے گا۔

---

(1) لسان العرب کے مصنف کا قول ہے کہ دمشق کا نام اپنے بانی دمشاق بن کنعان یا دامشقیوس کے نام پر رکھا گیا ہے۔ مؤرخین نے توریت کے بیان کو معتبر قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ شہر حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے زمانے میں دنیا کا ایک بڑا شہر تھا جو شاہان مصر کے اٹھارہویں خاندان کے عہد حکومت میں مصر کا محکوم ہو گیا تھا۔ تل عمارنہ میں اس کا نام "دمشقہ" منقوش ہے۔)

Marfat.com

اس کامیاب و کامران لشکر کو راستے میں کوئی قابل ذکر مزاحمت پیش نہ آئی اس لیے کہ رومی جنگ میں دریاؤں سے مورچہ بندی کا وہ کام نہیں لے سکتے تھے جو کام ایرانیوں نے دجلہ وفرات سے لیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ شام میں دجلہ وفرات جیسے دریا نہیں تھے، اس کے علاوہ اہل روم ایرانیوں کی طرح ہتھیلی پر سر رکھ کے لڑ بھی نہیں سکتے تھے اس لیے کہ عراق ایرانی سلطنت کے ایک بہت بڑے رقبے کو شامل کیے ہوئے تھا اور اکاسرہ کا پایہ تخت مدائن، ایران کے سب سے بڑے دریا...... دجلہ...... کے کنارے آباد تھا۔ اس کے برعکس شام رومی سلطنت کا محض ایک صوبہ اور قیاصرہ کا دارالسلطنت قسطنطنیہ، بیت المقدس اور دمشق دونوں سے بہت دور تھا اس بنا پر شام میں لڑنے والی رومی فوجیں اس تڑپ، اس بے جگری سے محروم تھیں جو مدائن کا بچاؤ کرنے والی ایرانی فوجوں میں پائی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ رومی فوجیں اس مذہبی عصبیت سے بھی بیگانہ تھیں جو انہیں بیت المقدس کے لیے کٹ مرنے پر ابھار سکتی۔

اس سے پہلے ایرانیوں نے رومیوں پر حملہ کر کے کلیسائے مہد پر قبضہ کر لیا تھا اور حکومت کی اس تبدیلی نے وہاں کے باشندوں میں اس غیرت وحمیت کا جذبہ سرد کر دیا تھا جو ان عبادت گاہوں کے لیے انہیں جانثاری وفداکاری پر آمادہ کر سکتا۔ پھر جب ہرقل نے ایرانیوں کو شکست دے کر دوبارہ فلسطین پر قبضہ کیا تو وہاں کی حکومت ایسے لوگوں کے سپرد کی جو ایرانی حکام سے کسی طرح بہتر نہ تھے، نہ ان کے دل میں اپنی رعایا کے لیے انصاف ومہربانی کا کوئی جذبہ ہی پایا جاتا تھا، اس بنا پر ہرقل نے فلسطین پر کبھی وہ اعتماد نہیں کیا جو اسے اپنے دوسرے قلعہ بند شہروں، دمشق، حمص اور انطاکیہ پر تھا۔

مسلمان غوطہ دمشق میں پہنچے تو ان کی شجاعت وجواں مردی میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس کشادہ وہموار زمین پر انہوں نے دنیا کا سب سے پرانا اور اہم شہر آباد دیکھا جو اپنی خوبصورتی کی بنا پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آسمانی جنت کا ایک قطعہ فرشتوں نے زمین پر لا کر رکھ دیا ہے۔ جس میں بہتی نہریں، اچھلتے کودتے چشمے، لچکتی ہوئی گھنی شاخیں اور مسکراتے ہوئے خوشنما پھول آنکھوں کو دعوت نظارہ دے رہے ہیں اور ہوا کی عطر بیزیوں سے مہکتے ہوئے ان طویل سایوں کی آغوش میں ان آسودگان عیش وراحت کے محل ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے دنیا جہان کی نعمتوں سے نواز رکھا ہے اور جو اپنے عشرت کدوں کو فتنہ فروش کنیزوں کے حسن وشباب سے تابناک بناتے ہیں۔ بھلا کہاں یہ رنگ ونور کی جنت اور کہاں ان غازیان اسلام کی آنکھیں جو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ

Marfat.com

کے ساتھ عراق کی مہم پر گئے تھے، انہیں تو یہ نظارہ ایک خواب، ایک طلسم نظر آ رہا تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے عراق میں ایک موقع پر اپنے سپاہیوں سے فرمایا تھا: ''دیکھ رہے ہو تم یہ غذائی سامان جو اپنی کثرت کی بنا پر مٹی کا ایک انبار معلوم ہوتا ہے۔ اگر ہمارا مقصد جہاد فی سبیل اللہ نہ ہوتا اور ہماری یہ جنگ محض مادی اغراض کے لیے ہوتی تو اس وقت ہم آپس میں دست و گریباں ہو جاتے اور ان لوگوں کو حصہ دینے پر ہرگز آمادہ نہ ہوتے جو اس جنگ میں شامل نہیں ہیں۔'' اگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی یہ بات عراق کے بارے میں ایک بار صحیح ہے تو دمشق اور غوطہ دمشق کے بارے میں ایک ہزار بار صحیح ہے کہ یہاں صرف غذائی سامان ہی کی بہتات نہ تھی بلکہ وہ کچھ تھا جو کبھی مسلمانوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آیا تھا۔

اسلامی فوجیں جب غوطہ دمشق میں داخل ہوئیں تو باغوں میں چہکنے والے پرندوں کے سوا وہاں کوئی متنفس نہ تھا۔ تمام مکان خالی اور سنسان تھے اور مکین حملہ آوروں سے جان بچا کر شہر سے بھاگ گئے تھے۔ دمشق کی فصیلیں...... جن کی تعمیر میں بڑے بڑے پتھر صرف کیے گئے تھے۔ اپنی استواری کے اعتبار سے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں، ان کی بلندی چھ میٹر اور بالائی سطح تین میٹر سے بھی زیادہ تھی۔ اوپر تیر اندازوں اور منجنیق چلانے والوں کے لیے برجیاں تھیں اور ان برجیوں میں بہت سی کھڑکیاں بنائی گئی تھیں۔ ایرانیوں کے حملے کے بعد ہرقل نے ان فصیلوں کو اور زیادہ مستحکم کرا دیا تھا۔ اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب ان فولادی فصیلوں کو بہ آسانی فتح نہیں کیا جا سکتا۔ ان فصیلوں میں بڑے بڑے دروازے تعمیر کیے گئے تھے جن کے بند ہو جانے کے بعد نہ کوئی اندر جا سکتا تھا، نہ باہر آ سکتا تھا۔ فصیل کے چوطرفہ تین میٹر چوڑی خندق تھی جس میں برف کا ساٹھنڈا پانی بھرا رہتا تھا اور اس طرح دمشق ایک ایسا قلعہ بن گیا تھا جس کے ہر طرف حفاظتی برجیاں تھیں اور جس پر قبضہ کرنے کی صرف یہی ایک صورت تھی کہ محاصرے کو طول دے کر اس کے باشندوں کی کمر توڑ دی جائے اور ان کے ارادوں کی پستی سے فائدہ اٹھا کر انہیں اپنی شکست مان لینے پر مجبور کر دیا جائے۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے دمشق جیسے مستحکم شہر پر فتح پانے کے لیے اس طویل محاصرے کا اندازہ کر لیا تھا چنانچہ انہوں نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ غوطہ کے عبادت کدوں اور گھروں کے دروازے کھول کر ان میں سکونت پذیر ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انہیں اس کا بھی یقین تھا کہ ہرقل حمص یا فلسطین سے فوجیں بھیجے گا اور اسلامی لشکر دمشق کی آہنی فصیلوں اور رومی

Marfat.com

فوجوں میں گھر کے رہ جائے گا، اس خیال سے انہوں نے ذوالکلاع حمیری کو دمشق و حمص اور علقمہ بن حکیم اور مسروق عبسی کو دمشق و فلسطین کے درمیان پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ اس طرف سے اطمینان حاصل کر لینے کے بعد وہ اپنی فوج کو لے کر آگے بڑھے اور شہر کے ایک ایک دروازے پر ایک ایک افسر مقرر کر دیا، چنانچہ وہ خود باب جابیہ پر، حضرت عمرو بن العاص باب توماء پر، حضرت شرحبیل بن حسنہ باب فرادیس پر اور حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم باب صغیر یا باب کیسان پر اترے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے حصے میں مشرقی دروازہ آیا، جس کے قریب ''دیر صلیبا'' نام کا ایک گرجا تھا، چونکہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اسی گرجے میں قیام فرمایا تھا، اس لیے بعد کو اس کا نام ''دیر خالد'' پڑ گیا۔

مسلمانوں نے شہر کے چاروں طرف منجنیق اور توپیں نصب کر کے رومی مورچوں پر حملے کا آغاز کر دیا، لیکن یہ مورچے اتنے مستحکم تھے کہ عربوں کی قلت تعداد اور معمولی سامان جنگ اور محاصرے کے فن سے نا آشناسپاہی انہیں فتح کرنے سے عاجز تھے۔ چنانچہ توپوں اور منجنیقوں کے حملوں کو رومیوں نے تیروں اور نیزوں سے ناکام بنا دیا۔ دمشق کے گورنر نسطاس اور سپہ سالار باہان کو یقین تھا کہ ہرقل، جو ان کے قریب حمص میں ایک لشکر جرار کے ساتھ مقیم ہے، دمشق کو مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا کبھی گوارا نہ کرے گا اور وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ دوسرے حملہ آوروں کی طرح ان فولادی فصیلوں کو توڑ دینا عربوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ اسی یقین نے ان کے پاؤں جما رکھے تھے اور مسلمانوں کو شہر میں داخل ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ سچ یہ ہے کہ ہرقل نے ان کی توقعات کو غلط ثابت نہ ہونے دیا اور حمص سے دمشق کے لیے امدادی فوجیں روانہ کر دیں۔ لیکن راستے میں ان فوجوں کی مڈبھیڑ ذوالکلاع حمیری سے ہوئی اور زبردست مقابلے کے بعد یمن کے سرفروشوں نے ان فوجوں کو حمص کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ نسطاس اور باہان کو یہ خبر ملی تو بہت پریشان ہوئے لیکن دمشق کی قوت مقابلہ دیکھ کر ان کی ہمت پھر بندھ گئی۔ انہوں نے سوچا کہ عنقریب سردی شدید ہو جائے گی اور یہ گرم صحراؤں کے رہنے والے اس کی تاب نہ لا کر اپنے ملک واپس ہو جائیں گے۔

لیکن اس اطمینان کے باوجود انہوں نے ہرقل سے بہ عجلت مدد طلب کرنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہ برتی۔ انہیں خوف تھا کہ اگر محاصرے نے کچھ اور طول پکڑا تو شہر والوں کے چھوٹ جائیں گے، لیکن قیصر نے اپنے خط میں انہیں مدد کا یقین دلایا اور ثابت قدم رہنے کی تاکید

Marfat.com

کی۔اس سے ان کی امیدوں میں از سر نو جان پڑ گئی مگر اس کے باوجود انہیں یہ جرأت نہ ہوئی کہ قلعے سے باہر نکل کر اس لشکر کا سامنا کرتے جس نے یرموک میں ان کو عبرت ناک شکست دی تھی اور قلعے میں بیٹھے بیٹھے مقابلہ کرتے رہے۔ مسلمانوں کا محاصرہ اور رومیوں کا دفاع ایک مدت تک جاری رہا۔اس مدت کی تعیین میں اختلاف ہے۔بعض لوگوں کے نزدیک یہ محاصرہ ستر (70) دن تک رہا اور بعض کے نزدیک چار ماہ تک۔لیکن کچھ روایتوں میں یہ مدت چھ ماہ بتائی گئی ہے۔

بہر حال ادھر مسلمانوں کا محاصرہ طویل ہوتا گیا اور ادھر قیصر کی امداد پہنچنے میں تاخیر۔جس سے دمشق کے محصورین کی پریشانی بڑھنے لگی۔انجام کار موسم سرما گزر گیا اور بہار کے دن آ گئے لیکن عربوں کے پائے استقامت میں نام کو بھی لغزش نہ ہوئی۔ یہ دیکھ کر رومیوں کے حوصلے جواب دے گئے اور ہمتیں پست ہو گئیں۔نہ انہیں قیصر کی طرف سے کوئی مدد پہنچی، نہ محاصرین جاڑے سے عاجز ہو کر اپنے وطن واپس ہوئے۔اب ان کے لیے صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا اور وہ یہ کہ مسلمانوں سے مصالحت کی کوشش کی جائے۔چنانچہ انہوں نے اس پر سوچنا شروع کر دیا۔

بالآخر مسلمان شہر میں داخل ہو گئے اور اہل شہر سے صلح کر لی، لیکن وہ شہر میں کیسے داخل ہوئے؟ بزور شمشیر یا دمشق والوں کی مرضی سے؟ مسلمانوں میں سے کس نے صلح کی اور کن شرائط پر کی؟ اس میں روایات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔مختلف ہی نہیں بلکہ ان میں ژولیدہ بیانی بھی پائی جاتی ہے۔سب سے مشہور روایت یہ ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جو دمشق کے مشرقی دروازے پر متعین تھے، نہ خود سوتے تھے نہ کسی اور کو سونے دیتے تھے۔انہوں نے دمشق کے حالات معلوم کرنے کا ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ پل پل کی خبر انہیں پہنچتی تھی۔ایک دن انہیں اطلاع ملی کہ ''دمشق کے بطریق کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے جس کی خوشی میں اس نے ایک شاندار دعوت کی ہے اور اس دعوت میں تمام فوجیوں نے اتنی کثرت سے کھایا پیا ہے کہ بے سدھ پڑے ہیں۔''

یہ سن کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے رسیوں کی سیڑھیاں تیار کرائیں اور جب رات ختم ہونے کو آئی تو وہ اور عراق سے ان کے ساتھ آئے ہوئے سپاہی اٹھ کھڑے ہوئے۔حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: ''جب تم فصیل پر سے ہماری تکبیر سنو تو اوپر چڑھ آنا۔'' یہ کہہ کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے قعقاع بن عمرو، مذعور بن عدی اور اسی مرتبے کے دوسرے بہادروں کو ساتھ لیا اور مشکیزوں پر بیٹھ کے خندق عبور کی۔اس کے بعد رسیوں کی سیڑھیاں بنا کر انہیں فصیل کے کنگروں سے اٹکا دیا اور اوپر چڑھ گئے۔پھر وہی سیڑھیاں دوسری طرف لٹکا دیں اور قلعہ کے اندر اتر کے تلوار سے

Marfat.com

دروازے کی زنجیریں کاٹ ڈالیں۔ جو لوگ فصیل کے اوپر کھڑے تھے انہوں نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے سپاہیوں نے تیزی سے خندق عبور کر کے فصیل پر چڑھنا شروع کر دیا۔
مشرقی دروازہ دمشق کے تمام دروازوں سے زیادہ مضبوط و مستحکم تھا۔ اس کے سامنے چونکہ خندق زیادہ چوڑی اور گہری تھی اس لیے اس دروازے پر پہرے کا بھی غیر معمولی انتظام نہ تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے پہرے داروں پر دفعتاً حملہ کر دیا اور ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تلواروں سے دروازے کے قفل کھول دیئے، اس طرح جو سپاہی فصیل پر نہ چڑھ سکے تھے وہ نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے اس رستے سے شہر میں داخل ہو گئے۔ دمشق والوں پر خوف و ہراس طاری ہو گیا اور یہ خبر اس سرے سے اس سرے تک پھیل گئی کہ مسلمان مشرقی دروازے سے شہر میں داخل ہو گئے ہیں اور جو کوئی ان کے سامنے آتا ہے انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کے پھینک دیتے ہیں۔ یہ سن کر انہوں نے فوراً شہر کے سارے دروازے کھول دیئے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے انہیں امان دے دی اور باب جابیہ سے شہر میں داخل ہو گئے۔ اس وقت تک انہیں یہ معلوم نہ ہوا تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ شہر میں کس طرح در آئے ہیں۔ جب ان کو اس خونریزی کا علم ہوا تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو کہلا بھیجا کہ صلح ہو چکی ہے۔ قتل و غارت سے ہاتھ روک لو۔ اس پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اعتراض کیا کہ وہ شہر میں بہ زور شمشیر داخل ہوئے ہیں، لیکن چونکہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ لشکر کے امیر تھے اس لیے حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر ان کے حکم کی تعمیل فرض تھی، چنانچہ چار و ناچار انہوں نے بھی صلح تسلیم کر لی۔
فتح دمشق کی یہ سب سے مشہور روایت ہے جسے واقعات کے انوکھے پن کے باوجود مؤرخین عرب اور مستشرقین کی تائید محض اس لیے حاصل ہے کہ اس کے ہیرو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ہیں اور اگر اس عدیم النظیر سپہ سالار کے سوا جس کے جنگی کارنامے معجزوں سے آنکھ ملاتے ہیں، یہ روایت کسی اور کی طرف منسوب ہوتی تو مؤرخین اسے مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہ دیتے بلکہ سرے سے اس کو بیان ہی نہ کرتے۔ بھلا حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے سوا اور ہو بھی کون سکتا ہے جو نہ خود سوئے اور نہ دوسروں کو سونے دے، جو دمشق کے اندرونی حالات کی اتنی پرچول رکھے کہ اسے یہ تک معلوم ہو کہ بطریق کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے جس کی خوشی میں اس نے شاندار دعوت کی ہے اور اس دعوت میں رومی سپاہیوں نے اتنی کثرت سے شراب پی ہے کہ وہ بے سدھ پڑے ہیں اور جو ستر دن یا چار یا چھ مہینے کے محاصرے کے بعد بھی اتنی جرأت کر سکے کہ اپنے ساتھیوں کو لے کر

Marfat.com

خندق پار کرے اور کمندوں کے ذریعے فصیل پر چڑھ کر قلعے میں کود جائے اور اسے اس بات کا کوئی خوف نہ ہو کہ صبح ہونے والی ہے اگر دشمن بروقت ہوشیار ہو گیا تو زندگی صریحاً خطرے میں پڑ جائے گی۔

لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جنگ میں واقعی بڑے بڑے معجز نما کارنامے انجام دیئے ہیں جن کی جھلکیاں ہم ارتداد کی جنگوں، عراق کی فتح اور یرموک کے معرکے میں دیکھ چکے ہیں۔ اس بنا پر کوئی تعجب نہیں اگر ان کا یہ کارنامہ بھی ان ہی معجز نمائیوں کا ایک حصہ ہو جو ہر جنگ میں ان کے لیے فتح و کامرانی کی ضامن رہی ہیں اور جن کی وجہ سے مؤرخین عرب اور مستشرقین نے اس روایت کی تائید کی ہے۔

• لیکن یہ تائید بھی اس روایت کو ناقدروں کی تنقیص اور طعنہ گردوں کی تعریض سے محفوظ نہ رکھ سکی اور انہوں نے اسے چھوڑ کر وہ روایات نقل کیں، جو دمشق جیسے معرکوں کے سلسلے میں بیان کردہ روایات سے بالکل قریب تر تھیں۔ ان روایات میں سے ایک روایت یہ ہے کہ ایک طرف حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج کے ساتھ باب جابیہ پر حملہ کر کے اسے بزور شمشیر کھول دیا اور دوسری طرف عین اسی وقت حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دمشق کے ان باشندوں سے صلح کر لی جو مشرقی دروازے کے قریب تھے اور جب یہ دونوں سردار وسط شہر میں ایک دوسرے سے ملے تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی صلح کو تسلیم کر لیا اور اس کی شرطیں تمام شہر پر نافذ کر دیں گئیں۔

ہر چند کہ یہ روایت حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے فوق الفطرت کارناموں کے ذکر سے خالی ہے۔ تاہم اس میں اور پہلی روایت میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ باب الشرق سے بزور قوت اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ باب الجابیہ سے از روئے مصالحت شہر میں داخل ہوئے تھے لیکن بعد کو شہر والوں سے عام صلح کا برتاؤ کیا گیا تھا۔ یہ دونوں روایتیں اصلاً ایک ہیں اور ان سے مجموعی مفہوم یہ متبادر ہوتا ہے کہ اسلامی فوج کے افسروں نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ طویل محاصرے نے اہل دمشق کے حوصلے پست کر دیئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بیک وقت شہر کے تمام دروازوں پر حملہ آور ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

دمشق والے اسلامی فوج کے اس حملے سے سٹپٹا گئے اور ان میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ ایک گروہ نے مسلمانوں سے صلح کر لی اور اپنی طرف کے دروازے کھول دیئے، لیکن دوسرا گروہ ہار ماننے کے لیے تیار نہ ہوا۔ جن دروازوں پر رومی مسلمانوں کا مقابلہ کر رہے تھے، ان دروازوں

میں مسلمانوں کو زبردستی داخل ہونا پڑا اور جو دروازے مسلمانوں کے لیے کھول دیے گئے تھے، ان میں مسلمان امن وسلامتی کے ساتھ داخل ہوئے۔ لیکن جن مسلمانوں کو شہر میں داخل ہونے کے لیے شمشیر آزمائی کرنی پڑی تھی، انہیں بھی دروازے کھل جانے کے بعد کوئی مزاحمت پیش نہ آئی اور تمام شہر صلح کے لیے مفتوح قرار دے دیا گیا۔

یہ مفہوم صرف ان دونوں روایتوں ہی میں تطبیق پیدا نہیں کرتا، بلکہ ان مختلف روایات سے بھی قدم ملا کر چلتا ہے جو مذکورہ روایتوں سے ہٹ کر بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک روایت یہ ہے کہ شہر کے اسقف نے کئی بار فصیل پر آ کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے گفتگو کی اور ایک دن کہا:

''ابوسلیمان! اگر تم مجھ سے صلح کا وعدہ کرو تو ہم تمہاری اطاعت قبول کر سکتے ہیں!'' حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس کی شرط منظور کر لی اور قلم دوات منگا کر یہ تحریر اسے لکھ دی:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اہل دمشق کو یہ مراعات دی ہیں کہ اسلامی لشکر دمشق میں داخل ہو کر اہل دمشق کو امان دے گا۔ ان کے جان و مال اور عبادت گاہوں کی حفاظت کرے گا۔ شہر کی فصیل پر کوئی مکان نہیں ڈھائے گا۔ مسلمانوں کا کوئی فرد دمشق کے کسی شہری کے مکان میں سکونت اختیار نہیں کرے گا اور جب تک دمشق والے جزیہ ادا کرتے رہیں گے، مسلمان اور خلیفۃ المسلمین ان سے نیکی کے سوا کوئی برا سلوک روا نہیں رکھیں گے۔''

بلاذری نے اس تحریر کے اثبات وتصدیق کے بعد یہ اضافہ کیا ہے کہ ایک رات اسقف نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو چپکے سے یہ اطلاع بھیجی کہ آج شہر میں عید ہے اور اہل شہر رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ تم سیڑھی لگا کر آ جاؤ۔ چنانچہ دو سیڑھیاں لائی گئیں اور چند مسلمان سپاہی فصیل پر چڑھ کے قلعے کے دروازے تک پہنچ گئے جس پر ایک یا دو پہرے دار تھے۔ مسلمانوں نے حملہ کر دیا اور طلوع آفتاب کے وقت اسے فتح کر لیا۔ دوسری طرف جب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ باب جابیہ میں بزور شمشیر داخل ہوئے تو اسقف نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی تحریر ان کے سامنے کر دی۔ بعض مسلمانوں نے اعتراضاً کہا: ''واللہ! خالد رضی اللہ عنہ فوج کے امیر نہیں ہیں۔ ہم ان کی صلح تسلیم نہیں کریں گے۔''

لیکن حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر مسلمانوں کا ایک معمولی سپاہی بھی صلح کر لے تو ہم اس کا احترام کریں گے۔'' اور صلح کی اجازت دے دی۔

ایک اور روایت میں ہے جب اہل دمشق محاصرے کی طوالت سے تنگ آ گئے تو انہوں نے مسلمانوں کے پاس صلح کا پیغام بھیجا۔ اثنائے گفتگو میں مسلمانوں نے شہر کی تقسیم پر زور دیا کہ آدھا

Marfat.com

شہر اور اس کا تمام سامان مسلمانوں کا ہوگا۔ اہل شہر کو یہ شرط قبول کرنے میں تکلف ہوا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی فوج مدافعت سے قاصر ہے اور شکست تسلیم کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ باقی نہیں ہے تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس اپنا قاصد بھیج کر شہر کے لیے امان حاصل کر لی۔ جس کے بعد شہر کے دروازے کھول دیئے گئے اور اسلامی فوجیں بغیر کسی کشت و خون کے دمشق میں داخل ہوگئیں۔

بعض مستشرقین نے لکھا ہے کہ دمشق کی محافظ فوجوں نے اس کے دفاع کی طرف سے مایوس ہو کر شہر خالی کر دیا اور اہل شہر نے ہار مان کے لشکر اسلام کے لیے شہر کے دروازے کھول دیئے اور جب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ شہر میں داخل ہوئے تو ان سے صلح کر لی۔

یہ ہیں وہ مختلف روایات جو فتح دمشق کے سلسلے میں نقل کی گئی ہیں۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود مؤرخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ دمشق جنگ سے نہیں، صلح سے مفتوح ہوا تھا اور یہ بات ہمارے اس خیال کو صحیح ثابت کرتی ہے کہ اہل دمشق محاصرے کی طوالت اور ہرقل کی امداد سے مایوس ہو کر مصالحت پر آمادہ ہوئے تھے۔ لیکن صلح کی شرائط نے پھر اختلاف پیدا کر دیا اور مسلمان شہر پناہ پر حملے کی تیاریاں کرنے لگے، یہ دیکھ کر شہر والوں نے دروازے کھول دیئے۔ غالباً کچھ دروازے ایسے بھی تھے جن کے کھلنے میں تاخیر ہوئی اور مسلمانوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ اسلامی فوج کے شہر میں داخل ہونے کے بعد فریقین میں گفتگو ہوئی اور دونوں نے آپس میں صلح کر لی۔

صلح کی شرطیں بیان کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ شہر پناہ کے اندر جائیں اور اس حسین و جمیل تاریخی شہر کو ایک نظر دیکھیں کہ یہ نظر صلح کی شرطوں سے بہت گہرا تعلق رکھتی ہے۔ یرموک سے دمشق تک کے راستے اور غوطہ دمشق کی حسن آرائیوں اور دل فریبیوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس شہر کی رونق و دل کشی اس سے بھی کہیں بڑھ کے تھی۔ دمشق زمانہ قدیم سے مشرق و مغرب کی تجارت کا مرکز بنا ہوا تھا، جس کی وجہ سے اس کی آبادی کثیر اور اس کے باشندے مرفہ الحال تھے۔ ایک سیدھی سڑک شہر قطع کرتی ہوئی دور تک چلی گئی تھی اور اس کے شرقی و غربی حصوں کو آپس میں ملاتی تھی۔ اس کا سلسلہ باب جابیہ سے شروع ہو کر باب شرقی پر ختم ہوتا تھا۔ اس کے دونوں طرف ایسی ایسی شاندار دکانیں تھیں کہ نہ عربوں نے اپنے ملک میں دیکھی تھیں، نہ عراق میں۔ شہر میں موتی جیسے شفاف اور برف جیسے ٹھنڈے پانی کی نہر جاری تھی۔ جس کے گرد خوبصورت باغوں کی آغوش میں نہایت عالی شان محل تھے۔ ان باغوں

Marfat.com

سے پانی کا سماعت نواز ترنم بلند ہوتا اور آسمان کی سعتوں میں تحلیل ہو جاتا۔ دمشق کے مسیحی عبادت کدے بھی بڑے حسین تھے، جنہیں رومی فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ تعداد میں پندرہ تھے اور ان میں سب سے بڑا گرجا یوحنا معمدان کا تھا۔ مسیحی عقائد قبول کرنے سے پہلے رومیوں نے اس گرجے کو ایک بت خانے کی حیثیت سے تعمیر کیا تھا، لیکن جب وہ عیسائی ہو گئے تو انہوں نے اس بت خانے کو حضرت مسیح علیہ السلام اور کنواری ماں کی عبادت گاہ بنا دیا۔ ان کلیساؤں، محلوں اور دکانوں کے اردگرد رومیوں نے اپنے مذاق کے مطابق تفریح گاہیں، تھیٹر اور حمام بنائے تھے عرب ان سب چیزوں کو دیکھ کر حیرت میں رہ گئے کہ انہوں نے عظمت و جلال اور شان و شوکت کے ایسے مناظر کبھی نہ دیکھے تھے۔ یہ منظر حیرہ اور صنعاء میں کہاں تھے؟ نعمان بن منذر کے محلوں خورنق اور سدیر میں یہ حسن و جمال ان کی نظروں سے کب گزرا تھا؟ کیا دمشق کے ذرے ذرے کا یہ حسن، یہ جلال صلح کا مستحق نہ تھا؟ کیا عرب اسے جنگ و غارت گری کے جہنم میں جھونک دیتے اور اس سے راحت اندوز نہ ہوتے؟ اگر دمشق کی تمام نعمتیں ان کے نصیب میں نہ آسکتی تھیں تو کیا وہ ان نعمتوں کے آدھے حصے کی تمنا بھی نہ کرتے؟

جس طرح فتح دمشق کے سلسلے میں روایات باہمی طور پر مختلف ہیں اسی طرح صلح کے متعلق بھی ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بلاذری کی روایت ہے کہ صلح حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اس خط پر ہوئی تھی جو انہوں نے دمشق کے اسقف کو لکھا تھا اور جس کی عبادت ہم پہلے نقل کر آئے ہیں۔ اس خط کی رو سے یہ طے پایا تھا کہ مسلمان صرف جزیہ لیں گے اور اس کے بدلے رومیوں کے جان و مال، ان کی عبادت گاہوں اور فصیلوں، ان کے مکانوں اور محلوں سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔ بلاذری نے اپنی تائید میں ابو عبداللہ واقدی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "میں نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا خط پڑھا ہے۔ مجھے اس میں مکانوں اور کلیساؤں کی آدھی آدھی تقسیم کا ذکر کہیں نہیں ملا!"

واقدی نے اس پر یہ اور اضافہ کیا ہے کہ دمشق کے مکانوں میں مسلمانوں کے ٹھہرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے باشندے شہر فتح ہونے کے موقع پر مکان خالی کر کے چلے گئے تھے اور ہرقل سے جا ملے تھے جو ان دنوں انطاکیہ میں مقیم تھا چونکہ ان مکانوں کا مالک اب کوئی نہ رہا تھا اس لیے مسلمانوں نے انہیں اپنی اقامت گاہ بنا لیا۔

لیکن طبری کی روایت یہ ہے کہ دمشق کی صلح منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کی تقسیم کے علاوہ

کے بدلے ایک دینار کی ادائیگی پر ہوئی تھی۔ ابن کثیر نے مال ومتاع کی تقسیم پر وضاحتی نظر ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ شہر کا ایک حصہ چونکہ بزور شمشیر فتح کیا گیا تھا اس لیے یہ تقسیم مسلمانوں کا جائز حق تھا اور شہر کا دوسرا حصہ چونکہ صلح کے ذریعے از خود مفتوح ہو گیا تھا۔ اس لیے اس حصے پر محض جزیہ عائد کیا گیا تھا، یہی وجہ تھی کہ آدھے شہر کے عبادت کدوں، مکانوں اور مال ومتاع کو مسلمانوں نے اپنے قبضے میں کر لیا کہ وہ طاقت کے بل پر فتح کیا گیا تھا اور باقی شہر پر جزیہ عائد کر دیا کہ وہ صلح کے ذریعے مفتوح ہوا تھا۔

کلیساؤں، مکانوں اور اموال کی تقسیم کا ذکر کرنے والے مؤرخ لکھتے ہیں کہ دمشق کے چودہ گرجوں میں سے مسلمانوں نے سات گرجوں پر تو قبضہ کر لیا تھا اور سب سے بڑی عبادت گاہ یوحنا معمدان کا گرجا تقسیم کر دیا تھا، چنانچہ اس کے نصف اول میں تو عیسائی اپنی عبادت کرتے اور انجیل پڑھتے تھے اور نصف آخر میں مسلمان نماز پڑھتے، قرآن پاک کی تلاوت کرتے اور اس کے اوپر چڑھ کے اذان دیتے تھے۔

یہ تقسیم اسی برس تک قائم رہی۔ اس دوران میں پہلے حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد عبدالملک بن مروان نے مسجد کی توسیع کے ارادے سے گرجا والے حصے کو مسجد میں شامل کرنا چاہا اور اس کے بدلے عیسائیوں کو ایک بھاری رقم کی پیش کش کی، لیکن عیسائیوں نے دونوں کی پیش کش کو مسترد کرتے ہوئے دمشق کے معاہدہ صلح کا حوالہ دیا۔

اس کے بعد جب عنان خلافت ولید بن عبدالملک کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے بھی عیسائیوں سے یہی مطالبہ کیا اور حسب سابق ایک کثیر رقم معاوضے کے طور پر پیش کی لیکن عیسائی اب بھی رضامند نہ ہوئے۔ اس پر خلیفہ نے انہیں تہدید کی کہ اگر انہوں نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا تو گرجا منہدم کر دیا جائے گا۔ عیسائیوں نے خلیفہ کو اللہ کے غضب سے ڈرایا، لیکن وہ ہراساں نہ ہوا اور گرجا کا حصہ ڈھا کر مسجد میں شامل کر لیا۔ پھر جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ مسند آرائے خلافت ہوئے تو عیسائیوں نے ان سے شکایت کی کہ ولید نے ان کا گرجا منہدم کر کے ان پر ظلم کیا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے دمشق کے گورنر کو حکم دیا کہ عیسائیوں حصہ انہیں واپس کر دیا جائے۔ یہ حکم دمشق کے فقیہوں اور مسلمانوں پر گراں گزرا۔ انہوں

"ہم مسجد کو کیسے منہدم کرا سکتے ہیں جب کہ ہم نے اس میں اذان دی ہے، نماز رضی اللہ عنہ سب عبادت کی ہے۔"

ے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ

Marfat.com

اور عیسائیوں سے درخواست کی کہ اگر وہ کلیسائے یوحنا کے مطالبے سے دست بردار ہو جائیں تو انہیں غوطہ کے وہ تمام گرجے واپس کر دیں گے جو بزور شمشیر حاصل کیے گئے۔ عیسائی اس پر رضا مند ہو گئے اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اس باہمی فیصلے کو منظور فرمالیا۔

اگر دمشق کی صلح تقسیم پر نہ ہوتی تو کلیسائے یوحنا کے ایک حصے کو مسجد بنایا جاتا نہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور عبدالملک مسجد کی توسیع کے لیے عیسائیوں سے ان کا حصہ طلب فرماتے۔ ولید کے حکم سے کلیسا منہدم کرایا جاتا، نہ عیسائی حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ سے اس کی شکایت کرتے۔ یہ دلیل ہے ان لوگوں کی جن کے نزدیک دمشق کی صلح جزیے تک ہی محدود نہ تھی بلکہ تقسیم کی شرط بھی اس میں شامل تھی۔ اس کا جواب اس روایت کے مخالف یہ دیتے ہیں کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے صلح نامے کی رو سے نہ کلیسائے یوحنا تقسیم ہوا نہ اس کے علاوہ دمشق کے دوسرے کلیسا اور مکانات واموال وغیرہ۔ اس صلح نامے میں تو صرف جزیہ ہی عائد کیا گیا تھا حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ اور عبدالملک بن مروان نے کلیسا کو مسجد بنانے کی خواہش اس وقت کی تھی جب اسلامی سلطنت کا دارالخلافہ قرار پانے کی وجہ سے دمشق میں مسلمانوں کی تعداد عیسائیوں سے زیادہ ہو گئی تھی اور حکومت کے تمام معاملات صرف خلیفہ کی مرضی پر منحصر ہو کے رہ گئے تھے، لیکن اس کے باوجود جب عیسائیوں نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا تو یہ دونوں اموی خلفاء اپنے مطالبے سے دست بردار ہو گئے تھے اور انہوں نے گرجا کو چھوا تک نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں رواداری کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اور حالات کی تبدیلی کے باوجود وہ معاہدہ صلح کا احترام کس حد تک کرتا ہے؟

حالات کی تبدیلی سے یہاں مراد یہ ہے کہ دمشق اب وہ پہلا سا دمشق نہیں رہا تھا۔ پہلے وہ روم کے عیسائیوں کا شہر تھا، لیکن اب عرب کے مسلمانوں کا مرکز بن گیا تھا۔ چنانچہ حالات کی یہی تبدیلی تھی جس نے ولید بن عبدالملک کو گرجا منہدم کرا دینے کی جرأت دلائی اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں عیسائیوں کو اس پر رضا مند کر دیا کہ وہ کلیسائے یوحنا کو مسجد کے لیے چھوڑ دیں اور اس کے بدلے اسلامی دارالسلطنت کے باہر غوطہ دمشق کے گرجے قبول کر لیں۔

ہم اس آخری رائے کی ترجیح کے حق میں ہیں کہ بہرحال یہ رائے سب سے زیادہ تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہے اور اس کے راویوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔

Marfat.com

تقسیم کے سلسلے میں راوی باہم مختلف ہیں، لیکن اس پر ان سب کا اتفاق ہے کہ از روئے صلح نامہ اہل دمشق پر جزیہ فرض کیا گیا تھا جو وہ اپنے جان و مال کی حفاظت اور عقیدہ ورائے کی آزادی کے بدلے مسلمانوں کو ادا کرتے تھے۔ جزیے کی تفصیل یہ تھی کہ ہر شخص ایک دینار، ایک معین مقدار میں گیہوں اور مسلمانوں کے کھانے پینے کے لیے زیتون کا تیل اور سرکہ دیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اہل دمشق جو ٹیکس اس سے پہلے رومی حکام کو دیتے تھے اب مسلمانوں کو دینے لگے۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے عہد نامہ صلح سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو مطلع کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جزیے کی شرائط ذرا نرم کرنے کی ہدایت فرمائی اور لکھا کہ اہل دمشق کو دو مختلف طبقات میں تقسیم کر کے دولت مندوں سے چار دینار فی کس اور ان کے علاوہ باقی آبادی سے چالیس درہم فی کس جزیہ وصول کیا جائے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ دمشق والے تین طبقوں میں تقسیم کیے گئے تھے، مالدار، غریب اور متوسط اور ان سب سے ان کی حیثیت کے مطابق جزیہ وصول کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے کھانے پینے کے لیے گیہوں، زیتون کے تیل، چربی اور شہد کی فراہمی بھی رومیوں پر عائد کی گئی تھی۔

یہ تھا صلح دمشق کے جزیے کا نصاب اور یہ تھیں وہ روایات جو تقسیم کے سلسلے میں بیان کی گئیں۔ ایک طویل محاصرے کے بعد منصفانہ صلح کی بنیاد پر مسلمان شام کے پایہ تخت میں اقامت پذیر ہو گئے اور ہرقل کے حامیوں کے ساتھ رومی متبعین کو بھی شہر بدر کر دیا گیا۔ دمشق کے نظم و نسق کی اساس اس سیاست کو بنایا گیا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپنے عہد خلافت میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو فتح عراق کے لیے بھیجتے وقت مرتب فرمائی تھی۔ یعنی مسلمانوں نے دمشق کا نظم و نسق اہل دمشق کے ہاتھوں میں رہنے دیا اور اپنے حاکمانہ اقتدار کی بنیاد حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے اس قول کو بنایا جو انہوں نے اہل عراق کے سامنے ظاہر کیا تھا کہ:

”اگر تم عرب ہو تو عربوں سے اور اگر عجمی ہو تو عدل و انصاف سے کس بات کا انتقام لیتے ہو؟“

اور جب مسلمانوں کے قدم اس حسین شہر میں جم گئے تو انہوں نے اپنے دینی اور وطنی فرائض کے متعلق غور کرنا شروع کر دیا۔

دمشق میں استقلال حکومت کے بعد فطری امر تھا کہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سب سے پہلے اسلامی لشکر کے متعلق سوچتے جو وہ اردن میں فحل کے قریب چھوڑ آئے تھے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کا وہ خط، جس میں جزیے کے نصاب میں نرمی کرنے کی ہدایت کی تھی، اپنے ساتھ بعض ایسے احکام بھی ساتھ لایا تھا جن کا فوری نفاذ اشد ضروری تھا۔ ان احکام میں سرفہرست حکم یہ تھا کہ خالد رضی اللہ عنہ عراق سے جو فوجیں اپنے ساتھ لائے تھے انہیں واپس بھیج دیا جائے لیکن خالد رضی اللہ عنہ شام ہی میں رہیں۔ یہ اس لیے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کرتے وقت وصیت فرمائی تھی کہ: "جب اللہ تمہیں شام پر فتح ارزانی فرمادے تو خالد رضی اللہ عنہ کی فوج کو عراق واپس بھیج دینا کہ وہ عراق کے ممتاز باشندے ہیں اور اہل عراق کے مقابلے میں جرأت اور شجاعت رکھتے ہیں۔"

اور اب جبکہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے شام فتح کر لیا تھا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وصیت پوری ہونی ہی چاہیے تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ ایرانیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی حالت نازک تھی اور وہ کمک کے بہت زیادہ حاجت مند تھے۔ جو فوج عراق سے شام لائی گئی تھی وہ کوئی معمولی فوج نہ تھی بلکہ اس میں ایسے ایسے مایہ ناز بہادر شامل تھے جن کی شجاعت و بہادری اور جنگی بصیرت مثال کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔ اس لیے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے ہاشم بن عتبہ کو عراقی فوج کا سردار مقرر کیا اور اس فوج کے جو سپاہی شام کی جنگ میں شہید ہو گئے تھے، ان کے بجائے ان سے بہتر سپاہی ان میں شامل کر کے قعقاع بن عمرو اور انہی جیسے چند اور غازیان اسلام کے ساتھ مثنیٰ کی مدد کے لیے روانہ کر دیے جو اس وقت جزیرہ نمائے عرب کی سرحد کے قریب ذی قار میں مقیم تھے۔ یہ فوج قافلوں والی سڑک سے عراق جا رہی تھی اور اس رستے سے دور تھی جس سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ رومیوں کا غرور خاک میں ملانے شام آئے تھے۔ جب یہ فوج صحرا کی پہنائیوں سے گزر رہی تھی تو ہاشم بن عتبہ اور ان کے ساتھیوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی زیر سرکردگی قادسیہ کے میدان میں ایرانیوں سے ایک ایسی زبردست ٹکر لیں گے جو ان پر مدائن کی راہیں کھول دے گی۔

اب ہم ان لوگوں کو عراق کی طرف قدم زن چھوڑ کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے پاس شام چلتے ہیں، کیونکہ ہمیں بہت جلد پھر عراقی لشکر کے ساتھ شامل ہو کر قادسیہ کا وہ شاندار معرکہ دیکھنا ہے جس نے کسریٰ کی فوجوں کا خاتمہ کر کے ایرانی سلطنت کے پرخچے اڑا دیے اور تاریخ کے صفحات میں عظمت و بزرگی کے ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ [1]

---

[1] بعض مؤرخین اسے صحیح سمجھتے ہیں کہ ہاشم بن عتبہ جنگ فحل کے بعد عراق روانہ ہوئے تھے اور اس کی تائید میں عراق اور شام کے معرکوں کی تاریخیں پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان تاریخوں کی تعین بہت ہی مشکل اور دقت طلب ہے۔ اس لیے کہ اس سلسلے میں مؤرخین کا شدید اختلاف ہے۔

دمشق میں مسلمانوں کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو اسلامی فوجوں کی فکر ہوئی جو اردن میں فحل کے قریب اقامت پذیر تھیں۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے چند ساتھیوں نے، جو کامیابی کے نشے میں چور تھے، انہیں حمص فتح کرنے کا مشورہ دیا، جہاں محاصرہ دمشق کے دوران میں ہرقل مقیم تھا، لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کی فوجیں شام کے پایہ تخت کی حفاظت کے لیے وہاں تک نہیں پہنچ سکتیں تو حمص سے انطاکیہ چلا گیا۔ اب اگر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ حمص فتح کر لیتے ہیں تو ہرقل انطاکیہ سے اناضول یا قسطنطنیہ بھاگ جائے گا اور اگر ایسا ہو گیا تو اس کی فوجوں کے جی چھوٹ جائیں گے اور وہ شام کے کسی محاذ پر بھی مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکیں گی، لیکن حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس مشورے سے اختلاف کیا اور وہ اسے قبول بھی کیسے کر سکتے تھے جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم یہ تھا کہ جب تک پچھلی طرف رومیوں کا کوئی ایسا لشکر موجود ہو جس سے حملے کا خطرہ ہر وقت لاحق ہو سکتا ہے، ہرگز پیش قدمی نہ کی جائے اور اس وقت بحیرہ طبریہ کے جنوب میں فحل کے قریب رومیوں کا وہ لشکر موجود تھا، جس نے یرموک کے میدان سے بھاگ کر وہاں پناہ لی تھی اس کے علاوہ ہرقل کی امدادی فوجیں بھی ان کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ جب ابو الاعور سلمی ان فوجوں سے لڑنے چلے ہیں، رومیوں پر یرموک کی شکست کا خوف طاری تھا۔ اس لیے انہوں نے دریا کا بند کھول دیا اور فحل کے اردگرد کی تمام زمین زیر آب ہو جانے کی وجہ سے مسلمانوں کی پیش قدمی رک گئی۔ اسی طرح رومی بھی ہرقل کی مدد کو پہنچ جانے کے باوجود اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ یہ زمین جاڑے کے اختتام اور دمشق کے محاصرے تک زیر آب رہی اور رومی فوجیں فحل کے اس طرف وادی بیسان میں محصور پڑی رہیں۔ اس کے بعد موسم گرما کے آغاز میں جب دمشق فتح ہوا اور زمین بھی خشک ہونی شروع ہو گئی تو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی سرداری میں یمنی فوج کو دمشق میں چھوڑا اور خود حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہمراہ فوج لے کر روانہ ہو گئے۔ یہ فوج رومیوں سے معرکہ آرا ہونے کے لیے فحل اور وادی بیسان میں اس وقت پہنچی جب زمین تھوڑی تھوڑی خشک ہونی شروع ہو گئی تھی۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اردن کی امارت حضرت شرحبیل بن حسنہ کے سپرد فرمائی تھی جس طرح حمص کے لیے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ، بلقا کے لیے حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ اور عربان کے لیے حضرت عمرو بن العاص کو امیر مقرر فرمایا تھا اور عملی قیادت کے سلسلے میں یہ حکم دیا تھا کہ جس امیر کی حدود امارت میں جنگ ہو وہی امیر لشکر کی قیادت کرے، اس حکم کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

Marfat.com

بھی برقرار رہنے دیا۔ اس لیے فحل کی اسلامی فوجوں کی کمان حضرت شرحبیل بن حسنہ کے ہاتھ میں آئی جن میں وہ فوج بھی شامل تھی جو محاصرہ دمشق سے پہلے ابوالاعور سلمی کی امارت میں تھی اور وہ فوج بھی جو محاصرہ دمشق کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں وہاں پہنچی تھی۔

حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ نے ابن الاعور کو تو طبریہ کے محاصرے کے لیے بھیج دیا اور خود فحل جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ مقدمۃ الجیش پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، میمنہ و میسرہ پر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ و حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور سوار دستوں پر ضرار بن ازور رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ تیاری کے بعد لشکر روانہ ہوا اور ام قیس کے قریب سے، جو دریائے اردن کے دہانے پر واقع ہے، یرموک کو عبور کرتا ہوا وادی غور میں قدم زن ہوا۔ وہاں سے فحل پہنچا اور بیسان میں رومی فوجوں کے سامنے خیمہ زن ہو گیا، لیکن دلدل کی وجہ سے پیش قدمی نہیں کی جا سکتی تھی، اس لیے فوج کے سرداروں نے باہمی مشورے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا اور جواب کا انتظار کرنے لگے۔ خوراک کی یہاں کوئی کمی نہ تھی جو مسلمانوں کو بہ عجلت اپنے مؤقف سے ہٹا سکتی کیونکہ جو حصہ مسلمانوں کے پاس تھا وہ رومیوں کے حصے سے بہتر تھا، اس میں چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا اور مسلمان بڑے اطمینان و آسائش کے ساتھ وقت بسر کر رہے تھے۔ ادھر ان کے سامنے اسی ہزار رومیوں کا لشکر جرار تھا جو ان سے یرموک اور دمشق کی ہار کا بدلہ لینے کے لیے چوٹ کھائے ہوئے ناگ کی طرح پھنکاریں مار رہا تھا۔

جب فحل میں مسلمانوں کا قیام طویل ہو گیا تو ہرقل کے جرنیل سقلاء بن مخراق نے اپنی کثرت افواج کے زعم میں مسلمانوں پر اچانک حملہ کر کے انہیں شکست دینے کا ارادہ کیا۔ اسے مقصد کو جامہ عمل پہنانے کے لیے اس نے ایک خاص جگہ منتخب کی جہاں سے اپنی فوجوں کو مسلمانوں کی طرف بھیجنا چاہتا تھا، اور جب رات کی سیاہی پھیل گئی تو اس کا لشکر اس جگہ سے گزرا۔ سقلاء کو یہ گمان تک نہ تھا کہ مسلمان اس حملے کے لیے تیار ہوں گے اس بنا پر سقلاء یہ سوچ رہا تھا کہ پہلے ہی حملے میں ان کی صفیں درہم برہم ہو جائیں گی، لیکن اس کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ رومیوں سے ہر چالبازی کی امید تھی اور اسی لیے شرحبیل رضی اللہ عنہ رات دن ان کی طرف سے چوکنے رہتے تھے، چنانچہ دونوں لشکروں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی اور معرکہ رات سے گزر کر دوسرے دن تک جاری رہا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور ضرار بن ازور رضی اللہ عنہ نے اس جنگ میں شجاعت و جوان مردی کے وہ جوہر دکھائے کہ اپنے پچھلے کارناموں کی یاد تازی کر دی، یہاں تک کہ جب رات تاریک ہوئی تو رومیوں کی قوت جواب دے گئی اور سقلاء اور اس کے ہم

Marfat.com

دوسرے فوجی افسروں کے قتل ہو جانے کے بعد شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

کیا ان ہزیمت خوردہ فوجوں کے لیے کوئی جائے پناہ تھی، جہاں وہ جا چھپتے یا کوئی خط دفاع تھا، جس کا وہ سہارا لے لیتے؟ نہیں! چنانچہ ان کی شکست و سراسیمگی نے انہیں دلدل میں پھنسا دیا اور ان کے لیے قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔ آخر کار مسلمانوں نے انہیں جا لیا اور اپنے نیزوں سے ان کو دلدل میں گرا گرا کے بری طرح قتل کر دیا۔

اسی ہزار کی جمعیت میں سے صرف وہی رومی بچ سکے جو کسی نہ کسی طرح بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح مسلمانوں نے شام میں ایک نہایت شاندار پرمسرت فتح حاصل کی، جس میں انہیں بے شمار مال غنیمت میسر آیا۔ فاتحین نے غنیمت آپس میں تقسیم کی اور انہیں اللہ کی نصرت کا یقین ہو گیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فتح کی خوشخبری امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مدینہ ارسال کی اور لکھا کہ وہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ حمص جا رہے ہیں۔

اللہ پاک کی نصرت پر مسلمانوں کا ایمان یہ دیکھ کر اور پختہ ہو گیا کہ جس چیز کو وہ اپنے لیے ناگوار سمجھتے ہیں اللہ تعالیٰ اسی کو ان کے حق میں بہتر بنا دیتا ہے۔ جب ان کے اور دشمن کے درمیان دلدل حائل ہو گئی تو انہیں بے حد ناگوار گزرا اور بادل نخواستہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے لیکن آخر کار اللہ عزوجل نے انہیں شاندار فتح ارزانی فرمائی...... کیا یہ اس بات کی واضح دلیل نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بہر حال ان کا حامی و ناصر ہے اور ایک نہ ایک دن ایران و روم کے تاج ان کے قدم چومیں گے۔؟[1]

مسلمان جب فحل کی جنگ سے فارغ ہوئے۔ طبریہ میں ابوالاعور کا محاصرہ جاری تھا۔ ادھر شرحبیل رضی اللہ عنہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر فحل سے بیسان پہنچے اور اس کا محاصرہ کر لیا اور اہل بیسان نے جگہ جگہ قلعہ بند ہو کر مسلمانوں کی مزاحمت کرنی چاہی، جس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں معلوم تھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ حمص جانے کے لیے دمشق واپس آ گئے ہیں اور ابوالاعور ابھی تک طبریہ کا محاصرہ کیے پڑے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کی طاقت شام کے مختلف حصوں میں بٹ گئی ہے اور اس وقت جو فوج ان کا محاصرہ کرنے کے لیے باقی رہ گئی ہے، اس کا مقابلہ کرنا کچھ ایسا مشکل کام نہیں ہے لیکن اس کے باوجود زیادہ دیر تک مسلمانوں کے مقابلے پر نہ ٹھہر سکے اور تھوڑے ہی دنوں بعد اہل دمشق کی طرح اعتراف شکست

① مؤرخین اس جنگ کو جنگ فحل، جنگ بیسان اور جنگ روغہ۔ دلدل والی جنگ کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔

کے بعد صلح کر لینے پر مجبور ہو گئے۔ یہ اس لیے کہ ان کی معنوی حالت یرموک، دمشق اور فحل کی شکستوں کے بعد بُری طرح تباہ ہو گئی تھی۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ اہل شام کو مسلمانوں سے اتنی شدید نفرت نہ تھی جو مقاومت میں رومی فوج کی اعانت کر سکتی۔

رومیوں نے اہل شام پر طاقت و تشدد کے بل پر حکومت کی تھی، جس کی وجہ سے اہل شام اس حکومت کے برقرار رہنے کی کوئی خواہش اپنے اندر نہ پاتے تھے۔ اس کے علاوہ شام میں عرب عیسائیوں کے بہت سے قبیلے تھے جو ایک زمانے تک نسلی اور مذہبی رابطوں کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ وہ مسلمانوں کی طرح نسلاً عرب تھے اور رومیوں کی طرح مذہباً عیسائی۔ انہوں نے جب ہرقل کی کمزوری، اس کی فوجوں کی بزدلی اور اس کے جرنیلوں کی شکستیں دیکھیں تو ان میں سے بعض قبائل مسلمان عربوں کے ساتھ مل گئے اور انہیں رومیوں کے کمزور پہلو بتا دیئے، اور سب سے آخری اور سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ فتح و نصرت میں بجائے خود اتنی تابناکی ہوتی ہے کہ دیکھنے والے کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں اور عوام فاتح کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس کے حلقہ بگوش ہو جاتے ہیں۔

اہل طبریہ کو جب بیسان اور اہل بیسان کا حشر معلوم ہوا تو انہوں نے ابوالاعور کے ذریعے حضرت شرحبیل رضی اللہ عنہ سے صلح کی درخواست کی اور اہل بیسان کی طرح ان سے بھی صلح نامہ دمشق کی شرائط کے مطابق صلح کر لی گئی۔ یعنی یہ کہ شہری جائیداد میں سے نصف مسلمانوں کا ہوگا۔ ہر سال ایک دینار فی کس جزیہ ادا کرنا ہوگا اور اسی طرح زمینوں سے بھی ایک معین مقدار میں گندم وصول کیا جائے گا۔ اذرعات، عمان، جرش، ماب اور بصریٰ کے باشندوں نے بھی ان ہی شرطوں پر صلح کر لی اور اس طرح ملک اردن حوران و صحرا تک مسلمانوں کا مطیع و منقاد ہو گیا۔ لوگوں نے مسلمانوں کی حکومت پر اطمینان و رضامندی کا اظہار کیا۔ بعد کو مسلمانوں نے حکومت کا نظم و نسق انہی کے حوالے کر دیا اور عدل و انصاف کی شرط لگا دی۔

کہیے! اب ہم حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہمراہ حمص چلیں، یا ہاشم بن عتبہ اور قعقاع بن عمرو کی ہمراہی میں عراق جا کر یہ دیکھیں کہ مثنیٰ اور ان کی باقی ماندہ فوج کے ساتھ مشیت خداوندی نے کیا کیا ہے اور اس کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی معیت میں جنگ قادسیہ کا نظارہ کریں؟ بالفاظ دیگر فتح شام تک اسلامی فوجوں کے ساتھ رہیں یا عراق چل کر وہاں کی مکمل فتح کا حال بیان کریں؟ بعض مورخین نے پہلی راہ اختیار کی ہے اور

Marfat.com

بعض نے دوسرا طریق پسند کیا ہے!

یہاں ہم دوسرے گروہ کی تقلید میں عراق کا رخ کریں گے تاکہ اسلامی سلطنت کا یہ حصہ بتمامہ نظر میں رہے اور ہم اسے آہستہ آہستہ مشرق کی طرف پھیلتے ہوئے دیکھیں۔ اس سے جہاں ہم اس جدوجہد کا بآسانی اندازہ کر سکیں گے جو صدر اول کے مسلمانوں نے ایران اور روم کے دو شیروں کے مقابلے میں بیک وقت جاری کر رکھی تھی وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیاست بھی اچھی طرح ہماری سمجھ میں آجائے گی۔ اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ مسلمانوں نے ان غیر معمولی اور پیہم حوادث کا سامنا کس طرح کیا؟ اور ہم یہ بھی جان لیں گے کہ مدینہ اور جزیرہ نمائے عرب میں انہوں نے کس حسن وخوبی کے ساتھ حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالیں، عوام کے اطمینان وخوش حالی کے لیے کیا کچھ کیا اور اس فتح کے لیے ان میں کتنا جوش اور کتنی تڑپ تھی، جس نے انہیں ایران وروم کی ان نعمتوں سے مالا مال کر دیا جو نعمتیں انہیں اپنی تاریخ کے اور کسی دور میں میسر نہ آسکیں۔

لیکن اس سے پہلے کہ ہاشم بن عتبہ اور ان کے ساتھیوں کے ہمراہ ہم عراق جائیں، ہمارا فرض ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے یہاں ٹھہریں اور مؤرخین کے اس اختلاف کا ذکر کریں جو فتح شام کے واقعات کی تاریخی ترتیب سے متعلق ہم ''سیرت ابوبکر رضی اللہ عنہ '' میں بیان کر چکے ہیں۔ اس باب کے واقعات میں ہم نے دیکھا ہے کہ مسلمان ابھی یرموک ہی میں تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی اور یہ معرکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوا اور اس دن ہوا جس دن وہ ڈاک شام پہنچی جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر کے ساتھ ساتھ یہ حکم بھی تھا کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو فوج کی سپہ سالاری سے معزول کر کے ان کی جگہ ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا جاتا ہے!

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے مسلمان دمشق روانہ ہوئے اور ایک طویل محاصرے کے بعد اسے فتح کر لیا۔ دمشق سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ اردن پہنچے اور اسے دشمنوں کے وجود سے پاک کر کے اہل دمشق کی طرح اہل اردن سے بھی صلح کر لی۔ یہ طبری، ابن خلدون، ابن اثیر، ابن کثیر اور ان کے متبعین کی روایت ہے۔ لیکن ازدی، واقدی اور بلاذری فتح شام کے واقعات کی اس ترتیب میں طبری سے اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اجنادین اور دمشق وغیرہ کی لڑائیاں یرموک سے پہلے ہوئی تھیں۔ ان میں سے بعض کا خیال یہ ہے کہ یرموک کی جنگ شام کی آخری

Marfat.com

جنگ تھی۔ اس اختلاف کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم کرنا ہمارے لیے دشوار ہے۔ خود علامہ طبری نے بھی اس اختلاف کا ذکر کیا ہے، لیکن وہ کسی فیصلہ کن رائے پر نہیں پہنچے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"محمد بن اسحاق نے کہا ہے کہ دمشق رجب سنہ 14 ھ میں فتح ہوا تھا اور فحل کی جنگ دمشق سے پہلے ہوئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ فحل کے کچھ لوگ دمشق چلے گئے تھے اور مسلمان بھی ان کے تعاقب میں وہاں جا پہنچے تھے۔ ان کے خیال میں فحل کی جنگ ذوالقعدہ 13 ھ میں ہوئی تھی، لیکن واقدی کے نزدیک فتح دمشق سنہ 14 ھ اور یرموک کی جنگ 15 ھ کی بات ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہرقل اسی سال جنگ یرموک کے بعد ماہ شعبان میں انطاکیہ سے قسطنطنیہ چلا گیا اور یرموک کے بعد سرے سے کوئی جنگ ہی نہیں ہوئی۔"

جب کسی قطعی رائے تک پہنچنا ہی ممکن نہیں تو پھر اس اختلاف میں الجھنا بے سود ہے۔ بہر حال ہم نے اس باب میں علامہ طبری اور ان کے متبعین کی روایت اختیار کی ہے اور اس سے ہمارے موضوع بحث...... عہد فاروقی میں اسلامی سلطنت کی تاریخ...... پر کوئی زد نہیں پڑتی۔

دمشق کی فتح چاہے یرموک سے پہلے ہوئی ہو یا اس کے بعد ہمارے لیے دونوں برابر ہیں کیونکہ فتح کے واقعات تاریخوں اور بعض تفصیلات میں اختلاف کے باوجود متفق علیہ ہیں۔ طبری نے سیف بن عمرو رضی اللہ عنہ سے ایک رویت نقل کی ہے کہ یرموک کا معرکہ رجب 13 ھ مطابق ستمبر 634ء میں پیش آیا تھا۔ دمشق کا محاصرہ اسی سال کے ماہ شوال میں کیا گیا تھا جو دوسرے سال کے اوائل میں...... دسمبر 634ء اور اوائل بہار 635ء کے درمیان...... فتح پر منتج ہوا اور فحل کی جنگ دمشق کے بعد 635ء میں جیتی گئی، جس کے فوراً بعد ہی اردن کے دوسرے شہر بھی فتح ہو گئے۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جنگ فحل کے بعد حمص روانہ ہو گئے اور ہاشم بن عتبہ عراق لوٹ گئے۔ اب ہم حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عراقی فوج کے ساتھ قادسیہ کی جنگ دیکھنے چلتے ہیں کہ یہی وہ فیصلہ کن معرکہ ہے جس نے مسلمانوں کے سامنے مدائن کے دروازے کھول دیئے اور جو مؤرخین کے نزدیک ان شاندار معرکوں میں شمار ہوتا ہے، جنہوں نے دنیا کی تاریخ کو ایک نئی راہ پر ڈال دیا۔

Marfat.com

باب:8

جنگِ قادسیہ کی تفصیلی روداد

فحل کی جنگ میں اسلامی فوجوں کی کامیابی کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تو حمص چلے گئے اور ہاشم بن عتبہ اور قعقاع بن عمرو امدادی فوجیں لے کر عراق روانہ ہو گئے۔ ادھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک عظیم لشکر...... جس کی تعداد تیس ہزار سے بھی زیادہ تھی۔ مدینہ سے روانہ کیا تاکہ عراق میں ایرانی اقتدار کا بالکل خاتمہ کر دیا جائے۔

اس لشکر کی کمان بڑے سوچ بچار اور طویل مشورے کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے سپرد کی گئی تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ معرکہ بویب کے بعد مثنیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا کہ یزدگرد بن شہریار بن کسریٰ کو تخت پر بٹھا کے ایرانی دوبارہ متحد ہو گئے ہیں اور عربی فوجوں کے مقابلے میں لشکر پر لشکر بھیج رہے ہیں۔ ایرانیوں کے اس اتحاد نے اہل سواد کو مسلمانوں کے خلاف بغاوت پر ابھار دیا ہے اور ہم جزیرہ نمائے عرب کی سرحد پر ذی قار میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ضلعوں کے حکام اور عرب کے تمام قبائل کو حکم دیا کہ ہر اس شخص کو جو اسلحہ یا گھوڑا رکھتا ہے یا عقل و شجاعت سے بہرہ مند ہے، تلاش کر کے فوراً میرے پاس بھیج دو! اور فرمایا:

"خدا کی قسم! میں شاہانِ عجم سے ملوک عرب کو ضرور ٹکراؤں گا۔"

جب چند ہزار کی جمعیت فراہم ہو گئی تو اسے لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینے سے نکلے اور صرار نامی ایک چشمے پر قیام فرمایا۔ اب تک کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوج کی قیادت خود فرمائیں گے یا یہ خدمت کسی اور کے سپرد کر کے مدینہ واپس چلے جائیں گے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اس کے متعلق سوال کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نماز کے لیے جمع ہونے کا حکم دیا اور ان کے جمع ہو جانے پر لشکر کی قیادت کے متعلق ان کی رائے

Marfat.com

جنگ تھی۔ اس اختلاف کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم کرنا ہمارے لیے دشوار ہے۔ خود علامہ طبری نے بھی اس اختلاف کا ذکر کیا ہے، لیکن وہ کسی فیصلہ کن رائے پر نہیں پہنچے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''محمد بن اسحاق نے کہا ہے کہ دمشق رجب سنہ 14 ھ میں فتح ہوا تھا اور فحل کی جنگ دمشق سے پہلے ہوئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ فحل کے کچھ لوگ دمشق چلے گئے تھے اور مسلمان بھی ان کے تعاقب میں وہاں جا پہنچے تھے۔ ان کے خیال میں فحل کی جنگ ذوالقعدہ 13 ھ میں ہوئی تھی، لیکن واقدی کے نزدیک فتح دمشق سنہ 14 ھ اور یرموک کی جنگ 15 ھ کی بات ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہرقل اسی سال جنگ یرموک کے بعد ماہ شعبان میں انطاکیہ سے قسطنطنیہ چلا گیا اور یرموک کے بعد سرے سے کوئی جنگ ہی نہیں ہوئی۔''

جب کسی قطعی رائے تک پہنچنا ہی ممکن نہیں تو پھر اس اختلاف میں الجھنا بے سود ہے۔ بہر حال ہم نے اس باب میں علامہ طبری اور ان کے متبعین کی روایت اختیار کی ہے اور اس سے ہمارے موضوع بحث...... عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں اسلامی سلطنت کی تاریخ...... پر کوئی زد نہیں پڑتی۔

دمشق کی فتح چاہے یرموک سے پہلے ہوئی ہو یا اس کے بعد ہمارے لیے دونوں برابر ہیں کیونکہ فتح کے واقعات تاریخوں اور بعض تفصیلات میں اختلاف کے باوجود متفق علیہ ہیں۔ طبری نے سیف بن عمرو رضی اللہ عنہ سے ایک رویت نقل کی ہے کہ یرموک کا معرکہ رجب 13 ھ مطابق ستمبر 634ء میں پیش آیا تھا۔ دمشق کا محاصرہ اسی سال کے ماہ شوال میں کیا گیا تھا جو دوسرے سال کے اوائل میں...... دسمبر 634ء اور اوائل بہار 635ء کے درمیان...... فتح پر منتج ہوا اور فحل کی جنگ دمشق کے بعد 635ء میں جیتی گئی، جس کے فوراً بعد ہی اردن کے دوسرے شہر بھی فتح ہو گئے۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جنگ فحل کے بعد حمص روانہ ہو گئے اور ہاشم بن عتبہ عراق لوٹ گئے۔ اب ہم حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عراقی فوج کے ساتھ قادسیہ کی جنگ دیکھنے چلتے ہیں کہ یہی وہ فیصلہ کن معرکہ ہے جس نے مسلمانوں کے سامنے مدائن کے دروازے کھول دیئے اور جو مؤرخین کے نزدیک ان شاندار معرکوں میں شمار ہوتا ہے، جنہوں نے دنیا کی تاریخ کو ایک نئی راہ پر ڈال دیا۔

Marfat.com

باب:8

جنگِ قادسیہ کی تفصیلی روداد

نحل کی جنگ میں اسلامی فوجوں کی کامیابی کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تو حمص چلے گئے اور ہاشم بن عتبہ اور قعقاع بن عمرو امدادی فوجیں لے کر عراق روانہ ہو گئے۔ ادھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک عظیم لشکر...... جس کی تعداد تیس ہزار سے بھی زیادہ تھی۔ مدینہ سے روانہ کیا تا کہ عراق میں ایرانی اقتدار کا بالکل خاتمہ کر دیا جائے۔

اس لشکر کی کمان بڑے سوچ بچار اور طویل مشورے کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے سپرد کی گئی تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ معرکہ بویب کے بعد مثنیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا کہ یزدگرد بن شہریار بن کسریٰ کو تخت پر بٹھا کے ایرانی دوبارہ متحد ہو گئے ہیں اور عربی فوجوں کے مقابلے میں لشکر پر لشکر بھیج رہے ہیں۔ ایرانیوں کے اس اتحاد نے اہل سواد کو مسلمانوں کے خلاف بغاوت پر ابھار دیا ہے اور ہم جزیرہ نمائے عرب کی سرحد پر ذی قار میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ضلعوں کے حکام اور عرب کے تمام قبائل کو حکم دیا کہ ہر اس شخص کو جو اسلحہ یا گھوڑا رکھتا ہے یا عقل و شجاعت سے بہرہ مند ہے، تلاش کر کے فوراً میرے پاس بھیج دو! اور فرمایا:

"خدا کی قسم! میں شاہان عجم سے ملوک عرب کو ضرور ٹکراؤں گا۔"

جب چند ہزار کی جمعیت فراہم ہو گئی تو اسے لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینے سے نکلے اور صرار نامی ایک چشمے پر قیام فرمایا۔ اب تک کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوج کی قیادت خود فرمائیں گے یا یہ خدمت کسی اور کے سپرد کر کے مدینہ واپس چلے جائیں گے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اس کے متعلق سوال کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نماز کے لیے جمع ہونے کا حکم دیا اور ان کے جمع ہو جانے پر لشکر کی قیادت کے متعلق ان کی رائے

Marfat.com

دریافت کی۔ عوام نے کہا: ''آپ خود ہمارے ساتھ چلیے!''...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کی یہ بات پسند نہ آئی، لیکن وہ چاہتے تھے کہ زور، زبردستی سے کام نہ لیا جائے، بلکہ نرمی و ملاطفت سے ان کی رائے تبدیل کی جائے۔

چنانچہ اہل الرائے کو طلب فرمایا، اور ان سے کہا: ''میں اس معاملے میں پریشان ہوں مجھے مشورہ دو؟'' تھوڑی دیر وہ لوگ آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ پھر سب نے یک زبان ہو کر رائے دی کہ امیر المومنین! اس لشکر کی کمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی رضی اللہ عنہ کو عطا فرما دیں، اور خود مدینے میں رہ کر کمک روانہ کرتے رہیں۔ اگر اللہ نے ہمیں فتح نصیب فرما دی تو فہوالمراد ورنہ دشمن کی سرکوبی کے لیے دوسرا لشکر بھیج دیا جائے گا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس رائے کی تائید کرتے ہوئے فرمایا: ''آپ خود مدینہ میں قیام فرمایئے اور لشکر کو بھیج دیجیے! شروع سے لے کر اب تک آپ دیکھ چکے ہیں کہ آپ کے لشکروں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا کیا فیصلہ رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ اسے شکست بھی ہوگئی تو یہ اس ہزیمت سے بہرحال کم ہوگی جو آپ کی قیادت میں پیش آئے گی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر آپ شہید ہوگئے یا شکست کھا گئے تو مسلمان پھر کبھی نہ تکبیر پڑھ سکیں گے اور نہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت دے سکیں گے۔''

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو جمع کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:
''مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اپنے معاملات باہمی مشورے سے طے کریں۔ میں بھی تمہی میں سے ایک فرد ہوں...... تمہارے اہل الرائے نے مجھ روک دیا ہے اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ خود نہ جاؤں اور یہ خدمت کسی اور کے سپرد کردوں!''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سپہ سالار کے بارے میں خواص سے معلوم کیا۔ ابھی وہ مختلف نام پیش کر ہی رہے تھے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا، جو ان دنوں نجد میں تھے، خط ملا جس میں انہوں نے لکھا کہ میں نے ایک ہزار عقل منداور بہادر سوار منتخب کر لیے ہیں۔ لوگوں کو جب اس خط کے مضمون کا علم ہوا تو بول اٹھے! ''ہم نے اپنا سپہ سالار پا لیا ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''وہ کون ہے؟'' جواب ملا: ''کچھار کا شیر، سعد بن مالک رضی اللہ عنہ''

اس انتخاب کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی پسند فرمایا اور سعد رضی اللہ عنہ کو نجد سے بلوا کر جنگ عراق کا سپہ سالار بنا دیا۔ سب سے پہلی ہدایت جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو فرمائی، وہ یہ تھی:
''اے سعد! اے بنو وہیب کی سعادت! اس بات پر کبھی گھمنڈ نہ کرنا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

Marfat.com

ماموں اور حضور اکرم ﷺ کے صحابی ہو، اللہ جل شانہ برائی کو برائی سے نہیں، نیکی سے مٹاتا ہے اور اللہ اور اس کے بندے کے درمیان رشتہ اطاعت کے سوا دوسرا کوئی رشتہ نہیں، اللہ کے دین میں بڑے چھوٹے سب برابر ہیں۔ سربلندی صرف اسی کے لیے مقدر کی جاتی ہے جو اطاعت کوش ہو۔ ہر مسئلے میں رسول اللہ ﷺ کی سنت پر نظر رکھنا اور اسی پر عمل کرنا اور صبر و استقامت کا دامن کسی حال میں ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو یہ ہدایت اس لیے فرمائی تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے صحابی، قرابت دار اور مسلمانوں میں ایک خاص مرتبے کے مالک تھے۔ ان کا نسبی تعلق رسول اللہ ﷺ کی ننھیال بنو زہرہ سے تھا اور وہ قریش کے ابتدائی مسلمانوں میں شمار ہوتے تھے۔ جس وقت انہوں نے اسلام قبول کیا ہے ان کی عمر سترہ (17) برس کی تھی۔ چنانچہ فرمایا کرتے تھے:

- "میں نے اس وقت اسلام قبول کیا تھا، جب اللہ نے نماز بھی فرض نہیں فرمائی تھی۔" ان کا یہ بھی ارشاد تھا کہ: "مجھ سے پہلے کوئی اسلام نہیں لایا تھا، صرف ایک شخص اس دن مسلمان ہوا تھا جس دن میں نے اسلام قبول کیا تھا اور ایک دن مجھ پر ایسا بھی گزرا ہے جبکہ میں تیسرا مسلمان تھا۔" ان کی صاحبزادی عائشہ ان کے متعلق فرماتی ہیں:
- "میرے والد کا قد چھوٹا اور جسم دوہرا تھا اور ہاتھوں کی انگلیاں مضبوط اور بالوں سے بھری ہوئی تھیں اور وہ خضاب لگایا کرتے تھے۔"

حضرت سعد رضی اللہ عنہ دولت و نعمت سے سرفراز تھے۔ ریشمی لباس اور انگلی میں سونے کی انگوٹھی پہنتے تھے۔ اسی لیے وہ حدیث وصیت کے باعث تھے، ابھی وہ مکہ ہی میں تھے کہ عنفوان شباب میں بیمار پڑنے اور زندگی سے مایوس ہو گئے۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے تو انہوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! میرے پاس دولت بہت ہے لیکن اس کی وارث صرف میری ایک بیٹی ہے، کیا میں تین حصوں کی وصیت کر دوں؟"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "نہیں!"...... عرض کیا: "آدھے حصے کی؟" ارشاد ہوا: "نہیں!" پھر عرض کیا: "ایک تہائی کی اجازت؟" اس وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ایک تہائی؟ ایک تہائی زیادہ ہے۔ اگر تم اپنے وارثوں کو دولت مند چھوڑو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔"

ان خوبیوں کے علاوہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ ایک بہادر سپاہی اور ایک ممتاز شہسوار بھی تھے۔

Marfat.com

جنگ احد میں رسول اللہ ﷺ نے جن صحابہ رضی اللہ عنہم کو تیراندازی کے لیے مخصوص فرمایا تھا ان میں یہ بھی شامل تھے۔ بدر، احد، خندق، حدیبیہ، خیبر، فتح مکہ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دوسرے تمام غزوات میں شریک رہے۔ فتح مکہ میں مہاجرین کے تین علموں میں سے ایک علم ان کے ہاتھ میں تھا۔ غزوۂ احد میں، جب اور لوگ رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ گئے تھے، حضرت سعد رضی اللہ عنہ اس وقت بھی انتہائی جانثاری و ثابت قدمی کے ساتھ ذات رسالت ﷺ کی حفاظت میں سینہ سپر رہے، یہاں تک کہ لسان نبوت سے ارشاد ہوتا رہا:

''سعد! میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں! اسی طرح تیر چلاتے رہو!''

پھر اسلام میں سب سے پہلے تیر چلانے والے بھی وہی تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سریہ عبیدہ بن حارث میں شریک ہو کر وہ حجاز کے ایک چشمے پر پہنچے جو وادی رابغ میں واقع تھا، وہاں ان کی مڈبھیڑ قریش کی ایک جمعیت سے ہوگئی جس کا سالار ابوسفیان تھا۔ قریش بغیر لڑے واپس ہو گئے۔ ان تک صرف ایک تیر پہنچا، جو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے پھینکا تھا۔ چنانچہ وہ خود فرماتے تھے ''میں سب سے پہلا عرب ہوں جس نے اللہ کی راہ میں تیر چلایا۔'' ان خوبیوں کے شہ سوار کے لیے کوئی تعجب نہیں ہے اگر کہا جائے کہ وہ کچھار کا شیر ہے اور اسے عراق جانے والے اس لشکر کا باتفاق رائے سپہ سالار بنا دیا جائے، جو مسلمانوں کی زندگی کے نازک ترین لمحات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بھیجا جا رہا ہو۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ چار ہزار فوج لے کر، جو اپنے بال بچوں کو بھی ساتھ لائی تھی، مدینے سے عراق روانہ ہو گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعوت پر لوگ چاروں طرف سے آ آ کر مدینے میں جمع ہوتے رہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں حضرت سعد کے پاس بھیجتے رہے۔ اس سے ان کے لشکر کی قوت و تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ اس لشکر کا ایک نمایاں امتیاز یہ بھی کہ اس میں عرب کے بڑے بڑے شہ سوار، شاعر، خطیب اور رئیس بھی شامل تھے، جن میں عمرو بن معدی کرب زبیدی، طلیحہ بن خویلد اسدی، اور اشعث بن قیس کندی جیسے زعمائے عرب خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو اپنے اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ زرود کے مقام پر پہنچے تو ان کے لشکر کی تعداد بیس ہزار کے قریب تھی۔ مثنیٰ کی فوجیں، جو بویب کی جنگ اور یزدگرد کی تخت نشینی کے بعد ذی قار میں سمٹ آئی تھیں، تین ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھیں جن میں آس پاس کے قبیلوں کے پاس ہزار افراد اور آ کر شامل ہو گئے تھے اور جو فوجیں ہاشم بن عتبہ کی سرکردگی

شام سے چلی تھیں، ان کی تعداد آٹھ ہزار تھی، اس طرح قادسیہ کی جنگ میں شرکت کے لیے جو فوجیں مختلف اطراف سے آئی تھیں ان کی مجموعی تعداد چھتیس ہزار یا اس سے لگ بھگ ہوگئی تھی اور یہ سب سے بڑا لشکر تھا جو عہدی صدیقی رضی اللہ عنہ میں مثنیٰ کے عراق جانے سے لے کر اس وقت تک جنگ عراق کے لیے فراہم ہو سکا تھا۔

جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ شراف پہنچے تو شام سے آنے والی فوج کے سوا باقی تمام فوجوں کی تنظیم مکمل ہو چکی تھی، لیکن مثنیٰ اپنی فوج میں نہ تھے۔ معرکہ جسر میں جو زخم انہیں آیا تھا، وہ جان لیوا ثابت ہوا اور وہ بشیر بن خصاصیہ کو فوج پر اپنی جگہ مقرر کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مثنیٰ کے بھائی معنیٰ بن حارثہ بھی اس فوج میں نہ تھے، انہیں اطلاع ملی کہ قابوس بن قابوس منذر ایرانیوں کے حکم سے عربوں کو ایرانیوں کی مدد پر اکسانے کے لیے وہاں گیا ہے اور نعمان بن منذر کی طرح سودے بازی کر کے بنو بکر بن وائل کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ سنتے ہی معنیٰ ذی قار سے بہ عجلت تمام روانہ ہو گئے اور بنو بکر بن وائل میں پہنچ کر اس کی سودے بازی کے تار پود بکھیر دیے۔ ان کا قبیلہ بنو بکر مسلمانوں کا ساتھ دینے پر کمربستہ ہو گیا۔ اور معنیٰ ذی قار سے اپنی بھاوج کو ساتھ لے کر شراف پہنچ گئے۔ جہاں حضرت سعد رضی اللہ عنہ قادسیہ جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

سلمیٰ اور معنیٰ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور معنیٰ نے قابوس اور بنو بکر بن وائل کا ماجرا ان کے سامنے دہرا کے مثنیٰ کی وصیت ان سے بیان کی کہ "ایرانیوں سے اس وقت جنگ نہ کی جائے جب ان کی شیرازہ بندی ہو چکی ہو اور وہ آپس میں متحد ہو گئے ہوں۔ ان کے ملک میں گھس کر بھی ان سے لڑنا ٹھیک نہیں، بلکہ ان کی سرحدوں پر رہ کر ان کا مقابلہ کیا جائے۔ جہاں سے عرب کی سرزمین عجم کی زمین کی نسبت زیادہ قریب ہو۔ پس اگر مسلمانوں کو اللہ ان پر غالب کر دے تو آگے بڑھنا مشکل نہیں اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہو تو عرب اپنے رستوں سے زیادہ واقف اور اپنی سرزمین میں زیادہ جری ہوں گے اور ان کے لیے پلٹ کر حملہ کرنا آسان ہوگا۔"

مثنیٰ کی یہ وصیت سن کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے دل میں ان کی موت کا غم تازہ ہو گیا۔ انہوں نے مثنیٰ کی خدمت معنیٰ کے سپرد فرما دی اور انہیں ہدایت کی کہ مثنیٰ کے اہل و عیال سے بہتر سلوک کریں۔ اس کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مثنیٰ کی بیوہ سلمیٰ سے نکاح کر لیا۔ عربوں میں یہ رسم تھی

Marfat.com

کہ جب کوئی عظیم المرتبت ہستی انتقال کر جاتی تھی تو اس کی عزت و تکریم کے طور پر اس کی بیوہ سے نکاح کر لیا جاتا تھا تاکہ اسے وہی عظمت و بزرگی حاصل رہے جو اس سے پہلے اسے اپنے مرنے والے شوہر کی زندگی میں نصیب تھی۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مدینے میں تشریف فرما ہوتے ہوئے عراقی لشکر کی نقل و حرکت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ان کا یہ حکم تھا کہ انہیں ایک ایک موقع کی اطلاع دی جائے اور اس کے متعلق ان کے احکام کا انتظار کریں۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے شراف میں خیمہ زن ہوتے ہی سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں تفصیلی رپورٹ بھیجی اور ہدایت طلب کی۔ جس وقت حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ خط لکھا ہے، مثنیٰ کی وفات کی خبر ان کو نہیں ملی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خط کے جواب میں جو ہدایات حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بھیجیں وہ مثنیٰ کی وصیت کے عین مطابق تھیں۔ انہوں نے سعد رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ فوراً قادسیہ چلے جائیں، جو ایام جاہلیت میں ایران کا دروازہ تھا اور ہدایت فرمائی کہ حدود عرب سے قریب تر رہ کر ایرانیوں کے تمام راستے بند کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد لکھا:

"تمہیں دشمن کی تعداد اور ساز و سامان کی کثرت سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ایک مکار اور فریبی قوم ہے۔ اگر تم نے صبر و استقلال سے کام لیا، احسان و کرم سے پیش آئے اور امانت کا احترام کیا تو مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان پر فتح یاب کر دے گا اور وہ پھر کبھی متحد نہ ہو سکیں گے اور اگر جمع ہو بھی گئے تو ان کے دل ٹھکانے نہ ہوں گے۔ اس کے برعکس تمہیں کامیابی نہ ہو تو پسپا ہو کر حدود عرب میں سمٹ آنا۔ یہاں تمہاری ہمتیں بڑھی ہوئی ہوں گی اور ناواقفیت کی وجہ سے ایرانیوں پر بزدلی طاری رہے گی۔ یہاں تک کہ اللہ تمہیں ان پر غالب کر دے گا اور تم ان پر فتح یاب ہو جاؤ گے۔"

اور خط کے آخر میں تحریر فرمایا: "اپنے تمام حالات و تفصیلات مجھے لکھو کہ تم کس طرح پڑاؤ ڈالتے ہو اور دشمن تم سے کتنے فاصلے پر ہوتا ہے۔ تمہارے خط کا مضمون ایسا ہونا چاہیے گویا میں تمہیں دیکھ رہا ہوں اور اپنے موقف کی پوری پوری وضاحت کر دینا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو احکام صادر فرماتے تھے، ان میں بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی کوئی بات چھوٹنے نہیں پاتی تھی۔ وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں فرماتے تھے کہ اپنی فوج کے افسروں اور سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کریں، انہیں جوش میں لائیں، ان کے اور ان کی قوم کے مفاخر بیان

کریں اور نہ صرف اسی کو کافی سمجھتے تھے کہ ان کو دشمن کی قوت اور فریب کاریوں سے ہوشیار رہنے کی تاکید فرمادیں بلکہ سفر کی راہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا وقت معین فرمادیتے تھے۔ گویا وہ اس سرزمین اور اس کے نقشے سے بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: ''جب تم قادسیہ پہنچو تو اس بات کا خیال رکھنا کہ قادسیہ ایام جاہلیت سے ایران کا دروازہ ہے۔ ان لوگوں کی تمام مادی ضروریات اسی دروازے سے فراہم ہوتی ہیں۔ وہ ایک سرسبز و شاداب اور محفوظ و مستحکم مقام ہے جس کے پل اور دریا ایک فصیل کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے تمہارے مسلح دستے ان راستوں پر ہونے چاہئیں اور باقی لوگ پیچھے کسی محفوظ مقام پر۔''

اپنے ایک اور خط میں شراف سے کوچ کا دن مقرر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''جب فلاں دن آئے تو وہاں سے کوچ کر کے عذیب الہجانات اور عذیب القوادس کے درمیان پہنچ جانا اور وہاں سے مشرق و مغرب کی طرف حملے کرنا۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے نام ایک اور خط میں ارشاد ہوتا ہے:

''مجھے لکھو! دشمن کی فوجیں تم سے کتنی دور آگئی ہیں اور ان کا سپہ سالار کون ہے؟ کیونکہ موقع و محل اور دشمن کے حالات سے لاعلمی کے باعث میں بہت سی باتیں جو لکھنی چاہتا ہوں، نہیں لکھ سکتا۔ اس لیے تم اسلامی فوجوں کے مورچوں اور اپنے اور مدائن کے درمیانی شہروں کے حالات اس تفصیل سے لکھو کہ گویا وہ میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا:

''قادسیہ، شاپور کی خندق اور دریائے فرات کی ایک نہر عتیق کے درمیان واقع ہے، اس کے بائیں جانب بحر اخضر ہے جس کا پھیلاؤ حیرہ تک دو راستوں کے درمیان سے نمودار ہے۔ ان میں سے ایک راستہ بلندی کی طرف جاتا ہے اور دوسرا ایک نہر کے کنارے جس کو الحضوض کہتے ہیں۔ اس راستے سے گزرنے والا آدمی خورنق اور حیرہ کے درمیان پہنچتا ہے اور قادسیہ کی دائیں جانب، وہاں کے دریاؤں کی ایک ترائی ہے۔'' پھر اہل سواد کے سلسلے میں لکھا کہ: ''پہلے انہوں نے مسلمانوں سے مصالحت کی تھی لیکن اب اپنے عہد سے پھر کے ایرانیوں سے جا ملے ہیں۔''

اس خط کا جواب دیتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تحریر فرمایا: ''تمہارا خط ملا، حالات سے آگاہی ہوئی۔ جب تک دشمنوں میں کوئی حرکت نہ ہو تم اپنی جگہ جمے رہو، یاد رکھو! کہ اس موقع پر آئندہ کی کامیابیاں موقوف ہیں۔ اگر خدا نے تمہارے ہاتھوں دشمن کو مغلوب کر دیا تو تم ان کو دباتے دباتے مدائن میں گھس جانا۔ ان شاء اللہ مدائن برباد ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ بالآخر فتح

Marfat.com

تمہارے حصے میں آئے گی۔ تمہیں بھی اس میں شک نہیں ہونا چاہیے!'' اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے حق میں خصوصاً اور تمام مسلمانوں کے حق میں عموماً دعائے خیر فرمانے لگے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی اس مراسلت سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو عراق سے کتنی دلچسپی تھی۔ وہ اسلامی فوج کی خبریں اس قدر اہتمام سے طلب فرماتے تھے جیسے سپہ سالاری کے فرائض خود انجام دے رہے ہیں، اور فوج کی ایک ایک نقل وحرکت پر ان کی نظر ہے۔ بالکل یہی حال شام کی اسلامی فوجوں کے ساتھ تھا۔ جس طرح وہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو خط لکھتے رہتے تھے، اسی طرح حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سے بھی ان کی مراسلت تھی، ان کی نظریں اور صرف نظریں ہی نہیں بلکہ ان کا دل اور ان کا سارا وجود اپنی فوج کے سرداروں کے ساتھ ساتھ رہتا تھا گویا وہ ان میں موجود ہیں، ان کے قدم سے قدم ملا کر چل رہے ہیں، انہیں دشمن سے ڈرا رہے ہیں، ان کے رنج وراحت میں شریک ہیں اور ان کی کامیابی کے لیے بے چین ہیں۔ یہ فتح حاصل کرنے کے لیے انہوں نے جزیرہ نمائے عرب کے گوشے گوشے میں یہ اعلان کرا دیا کہ ہر وہ شخص جو لڑنے کے قابل ہے مدینہ پہنچ جائے اور جو شخص مدینہ پہنچتا اسے عراق یا شام روانہ فرما دیتے۔ اس کی وجہ ان کا یہ یقین تھا کہ اگر مدائن فتح ہو کر پورا عراق اور حمص وانطاکیہ فتح ہو کر پورا شام اسلامی سلطنت میں شامل نہ ہوا تو ملک عرب، ایران اور روم کے چنگل میں پھنسا رہے گا اور ملک عرب کی تباہی دراصل اس نوزائیدہ دین کی پامالی ہوگی جو اس ملک کی آغوش میں پروان چڑھ رہا ہے۔ اس دین کی حمایت ہر مسلمان اور ہر مسلمان سے پہلے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا فرض اولین ہے اور اس فرض کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ ان دو شیروں ایران وروم...... کے ناخن کاٹ دیئے جائیں۔ اور ہر اس قوت کا خاتمہ کر دیا جائے جو ملک عرب کے لیے خطرہ بن سکتی ہو۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مکتوب ملا اور وہ شراف سے قادسیہ روانہ ہو گئے، لیکن یہ روانگی اس وقت عمل میں آئی جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اطمینان کا اظہار فرما دیا اور فوج کے مختلف حصوں کے افسر نامزد کر دیئے۔ انہوں نے لشکر کو دہائیوں میں تقسیم کر دیا اور ہر دہائی پر حریف مقرر کیا۔ علموں کا امیر سابقون اولون کو بنایا اور مقدمۃ الجیش اور میمنہ ومیسرہ کی قیادت ان مرد کار کو عطا فرمائی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ داد شجاعت دے چکے تھے۔ چنانچہ اس لشکر میں جو صحابہ رضی اللہ عنہم تھے جنہیں نبی علیہ التحیۃ والتسلیم کی رکاب میں نبرد آزما ہونے کا شرف حاصل ہو چکا

،ان میں ستر سے کچھ اوپر اصحاب بدر تھے، تین سو دس سے کچھ اوپر وہ صحابہ رضی اللہ عنہم تھے جو بیعت رضوان اور اس کے بعد خدمت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر رہے۔ تین سو فتح مکہ کے مجاہدین تھے اور سات سو تابعین۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بڑے وقار و جلال کے ساتھ روانہ ہوئے اور عذیب کے مقام پر پڑاؤ کیا، جہاں قادسیہ جانے سے پہلے وہ کچھ دنوں تک اقامت فرما رہے۔

عذیب ایرانیوں کی ایک فوجی چوکی تھی جس کی بلند دیواروں پر مضبوط برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ مسلمانوں کا ہراول دستہ علی الصباح وہاں پہنچ کر رکا۔ اسے چھاؤنی کی ہر برجی میں ایک آدمی نظر آیا۔ یہ دیکھ کر اس نے اپنے قدم روک لیے اور جب دوسرا دستہ پہنچا تو حملے کی نیت سے آگے بڑھے، قریب جا کر انہیں معلوم ہوا کہ ایک آدمی قادسیہ کی طرف بھاگا جا رہا ہے اور تمام برجیاں خالی پڑی ہیں۔ اب انہیں یقین ہو گیا کہ یہ اس شخص کی مکاری تھی۔ وہ ایک ایک برجی میں سے جھانک رہا تھا کہ ہماری قوت کا اندازہ کر کے ایرانیوں کو اس سے باخبر کر دے۔ مسلمانوں کو ان برجیوں میں سے بہت سے تیر، نیزے اور مچھلی کی کھال کے برتن ملے، جن سے انہوں نے کام لیا۔ انہوں نے زہرہ بن حویہ کو اس شخص کے تعاقب میں بھیجا کہ اسے گرفتار کر کے لائیں، لیکن انہیں ناکام واپس ہونا پڑا۔

عذیب میں کسی ایرانی کو نہ پا کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے وہاں قیام فرمایا اور گرد نواح میں شب خون مارنے کے لیے دستے بھیجنے شروع کر دیئے، جس سے لوگوں پر رعب بھی طاری ہونے لگا اور مال غنیمت کے علاوہ قیدی بھی مسلمانوں کے ہاتھ آنے لگے۔ ایک دفعہ ایک غارت گر دستہ رات کے وقت حیرہ کی طرف چلا۔ سیلحین سے گزر کر جب اس نے وہ پل عبور کی جو کمین کے دارالسلطنت کے راستے میں پڑتا تھا تو اسے شور و شغب کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ دستہ ایک کمین گاہ میں چھپ گیا۔ یہاں تک کہ جب وہ ہنگامہ قریب آیا تو معلوم ہوا کہ وہ حاکم حیرہ مرزبان کی بیٹی کی بارات ہے جو ایک عجمی سردار حاکم سنین سے بیاہی گئی ہے۔ جب یہ برات مسلمانوں کی کمین گاہ کے برابر سے گزری تو انہوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ باراتی بھاگ کھڑے ہوئے اور دلہن تیس دہقانی بیگمات اور سو خدمت گاروں اور خواصوں سمیت گرفتار کر لی گئی۔ اس کے علاوہ بہت سے قیمتی زیورات اور بیش بہا سامان ہاتھ لگا۔ یہ ساری چیزیں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کر دی گئیں اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں میں تقسیم کرا دیں۔

اہل عراق پر ہیبت طاری ہو چکی تھی۔ اور اس سے پہلے جو بغاوت انہوں نے مسلمانوں کے

Marfat.com

خلاف کی تھی وہ ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ جب عذیب کے حالات سے مطمئن ہو گئے تو اس مقام کی قلعہ بندی کی اور غالب بن عبداللہ لیثی کی امارت میں عرب قیدیوں کو یہاں چھوڑ کر سوار فوج کا ایک دستہ اس کی حفاظت کے لیے متعین کر دیا اور اس کے بعد قادسیہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے قلعہ قدلیس میں قیام کیا اور زہرہ بن حویہ نے قنطرۃ العتیق کے سامنے پڑاؤ ڈالا۔ فوج کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے مختلف مقامات پر مامور کر دیا گیا اور وہاں سے مختلف غارت گرد ستے ادھر ادھر بھیجنے شروع کر دیے جو فوج کے لیے مویشی، گندم اور ضروریات زندگی کا دوسرا سامان فراہم کر کے لاتے تھے۔ ①

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے قادسیہ میں ایک ہفتے تک قیام فرمایا، اس دوران میں ان کی فوج نے بڑے اطمینان و فراغت سے دن گزارے۔ اس لیے کہ چھاپہ مار دستوں کے ذریعے جن کا دائرہ حیرہ، کسکر اور انبار تک پھیلا ہوا تھا کھانے پینے کا وافر سامان جمع ہو گیا تھا، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بارگاہ خلافت میں ایک عریضہ ارسال کیا، جس میں اپنے مؤقف کی صراحت کے علاوہ شاید قادسیہ کا بھی مکمل جائزہ لیا گیا تھا۔ اس خط میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ ایرانی اب تک ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئے ہیں اور جہاں تک انہیں معلوم ہوا ہے مسلمانوں کے مقابلے کے لیے ایرانی فوج کا ہنوز کوئی سپہ سالار مقرر نہیں کیا گیا ہے، لیکن خط بھیجتے ہی اہل حیرہ کے ذریعے سے مسلمانوں کو یہ اطلاع ملی کہ یزدگرد نے جنگ کی تمام ذمہ داریاں رستم بن فرخ زاد کو سونپ دی ہیں اور اسے مسلمانوں سے جنگ آزما ہونے کے لیے روانگی کا حکم دے دیا ہے۔ فوراً ہی یہ خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دی گئی اور امیر المومنین نے جواب میں فرمایا:

---

① طبری اور دوسرے مؤرخین نے لکھا ہے کہ عاصم بن عمرو ایک غارت گری کے سلسلے میں میسان گئے۔ میسان والے اطراف کی گڑھیوں اور قلعوں میں گھس گئے لیکن ایک شخص عاصم کے ہاتھ آ گیا۔ عاصم نے اس سے پوچھا، بتاؤ بکریاں اور گائیں کہاں ہیں؟ لیکن چرواہا ہونے کے باوجود اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس پر ایک بیل چلا کر بولا: "خدا کی قسم! یہ جھوٹ بولتا ہے ہم یہاں ہیں۔" یہ سن کر عاصم اندر گھس گئے اور تمام بیلوں کو ہانک لائے۔ آگے چل کر یہ مؤرخین کہتے ہیں کہ حجاج بن یوسف نے اپنے زمانے میں جب یہ روایت سنی تو اس کی صحت سے انکار کر دیا اور جو لوگ اس واقعے میں شریک تھے ان سے حلف لیا۔ ان لوگوں نے قسم کھا کر اس واقعے کی تصدیق کی۔ اگر اس روایت کو عقل کی کسوٹی پر کسا جائے تو اس کے جھوٹے ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ عقل کہتی ہے کہ چرواہے نے جھوٹ بولا اور اس کے بعد بیلوں نے ڈکارنا شروع کر دیا۔ چنانچہ مسلمان باڑے میں گھس کر انہیں ہانک لے گئے۔ بیلوں کے ڈکارنے کی تفسیر و توجیہ وہ لوگ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے کہ بیلوں نے کہا: "یہ جھوٹ بولتا ہے، ہم یہاں ہیں، اور ہمیں ہانک لے جاؤ!"

Marfat.com

''دشمن کی تیاریوں سے بالکل پریشان اور خوف زدہ نہ ہونا، اللہ سے مدد طلب کرنا اور اسی پر بھروسا رکھنا دشمن کے پاس دعوت اسلام دینے کے لیے تم ایسے لوگوں کو بھیجو جو وجیہ، عقل منداور بہادر ہوں، اللہ اس دعوت کو دشمن کی ذلت اور ہماری کامیابی کا ذریعہ بنائے گا اور مجھے روزانہ خط لکھتے رہو!''

تعجب ہے کہ بویب کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے ایرانی یزدگرد کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے اور اپنے تمام اختلافات کو دفن کر کے انہوں نے عربوں سے انتقام لینے کی ٹھان لی تھی مگر پھر بھی حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور ان کی فوجوں سے مقابلہ کرنے میں دیر لگا رہے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اس سال کے موسم بہار کی ابتداء میں مدینہ سے چلے تھے اس کے بعد وہ کئی مہینے تک شراف اور عذیب میں مقیم رہے اور اب قادسیہ میں ٹھہرے ایک مہینے سے زیادہ ہو چکا تھا، اس طویل مدت میں ایرانی کہاں رہے؟ اور یزدگرد کیا کرتا رہا؟

واقعہ یہ ہے کہ ایرانی حالات سے بے خبر نہ تھے۔ یزدگرد نے رستم بن فرخ زاد کے پاس پیغام بھیجا: ''آج تم ایران کے سب سے بڑے سورما ہو اور میں چاہتا ہوں کہ عربوں سے مقابلے کے لیے تمہیں بھیجوں!'' جس کے جواب میں رستم نے کہا:

''مجھے مدائن ہی میں رہنے دیجئے! شاید میرے شریک جنگ نہ ہونے میں ہی ایرانی سلطنت کی بھلائی ہو، جنگ میں مصلحت اندیشی بعض فتوحات سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے اور تاخیر کو تعجیل پر تقدم حاصل ہے۔ یکے بعد دیگرے فوجوں سے لڑنا ہمارے دشمن کو زیادہ مہنگا پڑے گا اور جب تک میں جنگ میں شامل نہیں ہوں گا، عربوں پر ایرانیوں کا رعب طاری رہے گا۔''

یزدگرد نے رستم کے جواب پر خود بھی غور کیا اور اپنے مشیروں سے بھی رائے لی۔ لیکن جب اسے یہ اطلاع ملی کہ عربوں نے حیرہ کے مرزبان کی بیٹی قیدی بنالی ہے اور وہ عراق میں برابر قتل و غارت گری کر رہے ہیں تو اس نے رستم کو پھر لکھا اور رستم نے اپنی پہلی بات دہراتے ہوئے جواب دیا: ''میں نے مجبوراً خودستائی سے کام لیا تھا اگر میرے لیے کوئی دوسری راہ ہوتی تو میں اپنے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہتا۔ خدا گواہ ہے، میں آپ کی ذات اور آپ کے ملک کی بقا کا طلبگار ہوں! مجھے یہیں رہنے دیجئے اور جالینوس کو روانہ کر دیجئے! اگر اس نے کامیابی حاصل کر لی تو ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا ورنہ ہم کسی اور کو بھیج دیں گے اور اسی طرح رفتہ رفتہ ان کی قوت توڑ دیں گے۔ میں اسی وقت تک اہل ایران کی امیدوں کا مرکز ہوں جب تک شکست نہ کھاؤں!''

Marfat.com

لیکن جب عراق میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک عرب کی غارت گری عام ہوگئی اور وہاں کے زمینداروں اور جاگیرداروں نے یزدگرد کو لکھا کہ: "یا تو ہماری مدد کی جائے ورنہ ہم طوعاً و کرہاً مسلمانوں کے تابع فرمان ہو جائیں گے۔" تو یزدگرد نے پس وپیش کو بالائے طاق رکھ کر رستم کو ساباط روانہ ہو جانے کا حکم دے دیا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو رستم کی روانگی کا علم ہوا اور انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وہ خط لکھا جس کا جواب ہم پیچھے نقل کر آئے ہیں اور جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حکم دیا تھا کہ فرمانروائے ایران کے پاس ایک وفد بھیجا جائے جو اس کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرے۔

کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مکتوب سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وفد رستم کے پاس بھیجا جائے، یا وہ یزدگرد کو اسلام کی دعوت دینا چاہتے تھے؟ اور عملاً یہ وفد کس کے پاس گیا تھا؟ اس سلسلے میں روایات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وفد نے رستم سے گفتگو کی اور جب اسے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تو قادسیہ کی جنگ پیش آئی۔ لیکن دوسری روایتیں کہتی ہیں کہ وفد یزدگرد کے پاس مدائن گیا تھا اور قادسیہ کی جنگ اس وفد کی ناکامی کا نتیجہ تھا۔ ایک تیسری روایت اور ہے اور وہ یہ کہ وفد پہلے رستم کے پاس گیا تھا، لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی اور وہ یزدگرد کے پاس مدائن پہنچا اور جب یزدگرد نے بھی انکار کی راہ اختیار کی تو جنگ قادسیہ میں مسلمان بھائیوں کے ساتھ شرکت کرنے کے لیے مدائن سے واپس آ گیا۔

شاید ہوا یہ کہ وفد رستم سے ملے بغیر سیدھا یزدگرد کے پاس مدائن گیا تھا کیونکہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ رستم اس وقت تک مدائن کے قریب ساباط ہی میں تھا اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے مقابلہ کرنے کے لیے قادسیہ کے میدان میں رات کے دوسرے کنارے تک نہیں پہنچا تھا۔ رستم کی سست رفتاری اپنی اس سیاست کو روبہ عمل لانے کے لیے تھی جس کا اظہار وہ یزدگرد کے نام اپنے ایک خط میں کر چکا تھا، چنانچہ ساباط پہنچ کر اس نے محض اسی پر اکتفا کیا کہ اہل سواد کے اطمینان کے لیے اپنی فوج کا ایک دستہ روانہ کر دیا، اس کے بعد حیرہ اور عراق کے دوسرے شہروں میں بھی اس نے اپنے فوجی دستے بھیجے تاکہ وہاں کے لوگوں پر ایرانی حکومت کا رعب قائم رہے اور ان کے دلوں سے عربوں کا خوف زائل ہو جائے۔ اس نے ان لوگوں کو اس بات کا بھی یقین دلایا کہ وہ عربوں کی قوت کو خاک میں ملا دے گا اور انہیں عبرتناک شکست دے کر جزیرہ نمائے عرب کے ریگستانوں میں اس طرح پھینک دے گا کہ وہ پھر کبھی عراق کی طرف رخ کرنے کی جرأت نہ

Marfat.com

کر سکیں گے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بہر صورت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کی تعمیل کرنی تھی، اس لیے انہوں نے یزدگرد کے پاس عرب کے عقل منداور بہادر سیاست دانوں کا ایک وفد بھیجا جن میں نعمان بن مقرن، فرات بن حیات، اشعث بن قیس، عمرو بن معدی کرب، مغیرہ بن شعبہ اور معنیٰ بن حارثہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور انہیں ہدایت کی کہ پہلے اسلام کی دعوت دینا۔ اگر وہ قبول نہ کی جائے تو جزیہ اور جزیہ بھی منظور نہ ہو تو جنگ۔ وفد مدائن پہنچا۔ وہاں کے لوگوں نے جوان کے ستے ہوئے چہرے، کندھوں پر پڑی ہوئی چادریں، ہاتھوں میں کوڑے، پاؤں میں موزے اور دبلے پتلے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اڑتی ہوئی خاک دیکھی تو کہا: ''یہ لوگ آخر کس بوتے پر ہم سے لڑنے، ہم پر فتح پانے اور ہمارے پایہ تخت میں گھسنے آئے ہیں؟'' وفد نے یزدگرد سے ملاقات کی اجازت چاہی۔ یزدگرد نے اپنے وزیروں سے مشورہ کرنے کے بعد وفد کو ملاقات کی اجازت دے دی۔ جب وفد اس کے دربار میں پہنچا تو یزدگرد نے انتہائی نخوت و پندار کے لہجے میں ان سے سوال کیا: ''تم لوگ ہمارے ملک مین کیوں آئے ہو؟ کیا یہ جرأت تمہیں اس لیے ہوئی ہے کہ ہم آپس کے جھگڑوں میں مصروف ہیں؟''

اس کے جواب میں نعمان بن مقرن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کی تعلیمات کا ذکر کر کے اسے اسلام کی دعوت دی۔ اس کے بعد کہا: ''اگر تمہیں اس دعوت سے انکار ہے تو جزیہ قبول کرو، ورنہ ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ تلوار کرے گی!'' اپنی بات ختم کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا: ''اگر تم نے ہمارا دین قبول کر لیا تو ہم کتاب اللہ تمہارے پاس چھوڑ جائیں گے اور تمہیں اپنے تمام فیصلے اس کتاب کے احکام کے مطابق کرنے ہوں گے۔ اس صورت میں ہم تم سے اور تمہاری حکومت سے کوئی تعرض نہیں کریں گے، اگر تم جزیہ دینا پسند کرو گے تو ہم اسے بھی قبول کر لیں گے، لیکن ان دو صورتوں کے سوا تیسری صورت جنگ ہوگی!''

یزدگرد کو یہ بات بہت ناگوار گزری لیکن اس نے دانش مندی و تحمل کو تدبیر و دور اندیشی سے قریب تر پایا اور کہا: ''میں نے دنیا میں تم سے زیادہ بد بخت، تم سے زیادہ کم سواد اور تم سے زیادہ خستہ حال کوئی قوم نہیں دیکھی، جب کبھی تم سرکشی کرتے تھے تو ہم سرحدی بستیوں کے لوگوں سے کہہ دیتے تھے اور وہ تمہاری گوشمالی کے لیے کافی ہوتے تھے۔ ایرانیوں نے کبھی تم پر چڑھائی نہیں کی۔ تم کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ تم ان کے سامنے ٹھہر سکو گے۔ اگر تمہاری تعداد بڑھ گئی ہے تو

اس بات پر تمہیں اکڑنا نہیں چاہیے۔ اگر قحط سالی اور افلاس نے تم کو یہاں آنے پر مجبور کیا ہے تو ہم تمہارے کھانے پینے کا اس وقت تک کے لیے انتظام کیے دیتے ہیں جب تک تمہارے ہاں کچھ پیدا ہو۔ ہم تمہارے سرداروں کی عزت کریں گے، تم کو کپڑے پہنائیں گے اور تم پر ایسے شخص کو بادشاہ مقرر کر دیں گے جو تمہارے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آئے۔"

وفد نے یہ باتیں سن کر سکوت اختیار کیا مگر مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ اپنی جگہ سے اٹھے اور کہا:

"اے بادشاہ! یہ لوگ عرب کے سردار اور وہاں کے معززین ہیں۔ اشراف ہیں اور اشراف سے شرماتے ہیں۔ اشراف کی عزت اور ان کے حقوق کی پاسداری اشراف ہی کرتے ہیں۔ انہوں نے تم سے سب باتیں نہیں کہی ہیں اور نہ تمہاری سب باتوں ہی کا جواب دیا ہے۔ تم مجھ سے بات کرو تاکہ میں صاف صاف جواب دوں اور یہ لوگ اس کی شہادت دیں۔ تم نے ہماری خستہ حالی کا ذکر کیا ہے۔ بے شک ہم ایسے ہی تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ خستہ حال تھے....." اس کے بعد انہوں نے عرب کی فاقہ مستی کی تفصیل بیان کی اور نعمان بن مقرن کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر کرتے ہوئے کہا: "تم چاہے جزیہ پسند کر لو یا تلوار یا پھر اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو بچا لو۔"

یہ سن کر یزدگرد آپے سے باہر ہو گیا۔ غضب ناک لہجے میں اس نے کہا: "اگر قاصدوں کا قتل خلافِ اصول نہ ہوتا تو میں تمہاری گردنیں اڑا دیتا۔ جاؤ! تمہارے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے!"

اس کے بعد مٹی کا ایک ٹوکرا لانے کا حکم دیا اور کہا: "ان میں جو سب سے زیادہ معزز ہو ٹوکرا اس کے سر پر لاد کے اسے ہانکتے ہانکتے مدائن سے باہر نکال دو۔"

اور وفد سے مخاطب ہو کر کہا: "جاؤ اپنے سردار سے جا کر کہہ دو کہ میں تمہاری سرکوبی کے لیے رستم کو بھیج رہا ہوں۔ وہ اسے اور تمہیں قادسیہ کی خندق میں دفن کر دے گا، پھر میں اس کو تمہارے ملک میں بھیج کر تمہیں ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ تم شاپور کو بھول جاؤ گے!"

وفد کے ارکان یزدگرد کے غصے اور دھمکی سے بالکل مرعوب نہ ہوئے، بلکہ عاصم بن عمرو کھڑے ہوئے اور مٹی کا ٹوکرا اپنے کندھے پر رکھتے ہوئے بولے: "میں ان میں سب سے زیادہ معزز ہوں۔ میں ان سب کا سردار ہوں۔"

Marfat.com

اور مٹی کا ٹوکرا اٹھائے ایوان کسریٰ سے نکل گئے۔ اپنے گھوڑوں کے پاس پہنچ کر اس پر سوار ہوئے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ قادسیہ پہنچ گئے۔ قلعہ قدیک میں وفد حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے ملا اور عاصم بن عمرو نے سارا ماجرا بیان کر کے کہا: ''انہوں نے اپنی زمین خود ہمیں دے دی ہے!'' پھر بولے: ''مبارک ہو! بخدا! ان کے ملک کی کنجیاں اللہ نے ہمیں عطا فرما دی ہیں۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے وفد اور یزدگرد کے درمیان جو کچھ پیش آیا، اس کی روایت میں عرب کے تمام مؤرخین متفق ہیں اور فریقین کے بعض فقروں کے سوا ان میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ مستشرقین کا خیال ہے کہ یہ روایات، اگر بنیادی طور پر نہیں تو کم سے کم تفصیلات میں ضرور...... بعد کو گھڑی گئی ہیں۔ ہم نے یہاں ان تفصیلات کو بہت ہی کم جگہ دی ہے۔ مستشرقین اپنے دعوے کے ثبوت میں رقم طراز ہیں: ''مسلمان مؤرخین ہر اس موقع پر، جب اسلامی وفود کسی غیر قوم مثلاً مجوسیوں اور عیسائیوں سے ملتے ہیں تو مسلمان خطیبوں کی زبان سے یہی کہلواتے ہیں کہ ظہور اسلام سے پہلے عرب قوم بغض و عداوت اور افلاس و بدبختی کا شکار تھی۔ پھر جب اللہ نے اپنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمایا اور اس نے دین حق کی طرف ان کی رہنمائی کی تو ٹوٹے ہوئے دل جڑ گئے، فاقہ مستی شکم سیری سے بدل گئی اور انہیں وہ نعمتیں حاصل ہو گئیں جن سے ان کے باپ دادا ناآشنائے محض تھے، حالانکہ ان مسلمانوں میں وہ لوگ بھی تھے جو اسلام سے پہلے عیش و فراغت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مثلاً اہل یمن اور وہ لوگ جو خلیج فارس کے ساحل پر آباد تھے۔ ان مؤرخین نے اسی قسم کی باتیں ان لوگوں سے بھی منسوب کی ہیں جو عہد رسالت میں حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ وہاں جب نجاشی نے ان سے پوچھا کہ وہ اپنے آبائی مذہب سے روگرداں کیوں ہوئے ہیں؟ تو جواب میں انہوں نے بھی یہی کچھ کہا تھا۔ پھر عہد صدیقی میں جو لوگ عراق گئے تھے وہ بھی کچھ اسی طرح کی باتیں کرتے نظر آتے ہیں اور جب یرموک کی لڑائی میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے رومی سپہ سالار جارج سے ملاقات کی تھی تو وہ بھی اس سے ملتی جلتی باتیں کرتے دکھائے جاتے ہیں اور یہی باتیں اب اس وفد سے منسوب کی جا رہی ہیں جو یزدگرد سے ملا تھا۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ یہ اقوال سیاسی اغراض کے لیے بعد کے زمانے میں وضع کیے گئے ہیں اور انہیں صدر اول کے مسلمانوں کی زبان سے اس لیے ادا کر دیا گیا ہے کہ اس سے ایک طرف تو اسلام کا پروپیگنڈا مقصود تھا اور دوسری طرف امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے اقتدار کا استحکام!''

Marfat.com

مستشرقین اپنی تنقید کے اثبات میں یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمان مؤرخین لچر اور پوچ باتوں کی روایت سے بھی گریز نہیں کرتے، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یزدگرد نے مشیران خاص کے ساتھ رستم کو ساباط سے طلب کیا اور مسلمانوں کے وفد سے اس کی جو گفتگو ہوئی تھی وہ ان کے سامنے دہرا کر بولا: ''مسلمانوں کے معزز ترین آدمی نے مٹی کا ٹوکرا اٹھا کر بڑی حماقت کا ثبوت دیا، حالانکہ وہ اسے دوسرے کے سر پر بھی لاد سکتا تھا۔''

رستم نے جواب دیا: ''نہ وہ احمق تھے، نہ ان کا معزز ترین آدمی۔ اس نے جو کچھ کیا، اپنی قوم کے لیے ایثار کے طور پر کیا تھا۔''

یزدگرد سے یہ باتیں سن کر رستم کے حواس جاتے رہے اور وہ بادشاہ کے پاس سے انتہائی غم و غصہ کے عالم میں نکلا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نجومی تھا اور ستاروں کی چال سے اس نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ جو لوگ مدائن کی مٹی لے کر گئے ہیں وہ دراصل ایران کی سرزمین لے کر گئے ہیں۔ چنانچہ اس ہلاکت آفریں انجام سے بچنے کے لیے اس نے ایک آدمی کو ان لوگوں کے پیچھے دوڑایا اور اس سے کہا:

''اگر وہ مٹی مل جائے تو واپس لے آنا کہ اس سے آئی بلا ٹل جائے گی اور اگر وہ اسے لے کر اپنے امیر کے پاس پہنچ گئے تو ہماری زمین پر غالب آجائیں گے!''

اور جب وہ شخص ان لوگوں کو نہ پا سکا تو اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا اور اس نے بادشاہ کی حماقت و جہالت پر اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

لیکن اس کے باوجود جب بادشاہ نے اسے مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کا حکم دیا تو وہ سرتابی نہ کر سکا اس لیے کہ یزدگرد نے اس سے کہا تھا: ''تم جاؤ! نہیں تو میں خود جا رہا ہوں۔'' رستم ساباط سے چلا، پہلے اس نے جالینوس کو چالیس ہزار فوج کے ساتھ بھیجا۔ اس کے بعد ساٹھ ہزار فوج لے کر خود روانہ ہوا۔ میمنے پر ہرمزان تھا اور میسرے پر مہران بن بہرام رازی، پھر اس نے اپنے بھائی بندوان کو لکھا: ''کیل کانٹے سے لیس ہو جاؤ اور کسی طرح کی سہل نگاری سے کام نہ لو۔ یوں سمجھو کہ عرب تمھیں اور تمھاری اولاد کو ملک بدر کر رہے ہیں۔ میری رائے میں جب تک ان کی سعادت بدبختی سے نہ بدل جائے ہمیں ان کا مقابلہ کرتے رہنا چاہیے!'' اس نے جو کچھ ستاروں میں پڑھا تھا اس کا ذکر کرنے کے بعد وہ اپنے خط کو اس فقرے پر ختم کرتا ہے۔ ''مجھے یقین ہے کہ یہ قوم ہم پر غالب اور ہمارے ملک پر قابض ہو کر رہے گی۔'' اس کے باوجود اس نے اپنا سفر جاری رکھا گو

تقدیر اسے اپنی اور ایران کی ہلاکت کے غار میں زبردستی دھکیل رہی تھی۔

مستشرقین نجوم سے متعلق اس روایت کو لچر اور پوچ سمجھتے اور اسے اس روایت کی تنقیص و تغلیط کے لیے کافی سمجھتے ہیں جو مؤرخین اسلام نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے وفد اور یزدگرد کے سلسلے میں نقل کی ہے۔ ہر چند کہ میں اس باب میں مستشرقین کو مورد الزام قرار نہیں دیتا، پھر بھی اپنے آپ کو ان کے میلان سے متفق نہیں پاتا۔

مستشرقین اعتراض کرتے ہیں کہ صدر اول کے مسلمان اپنے دشمن کے سامنے ہمیشہ یہی کہتے نظر آتے ہیں کہ زمانہ قبل از اسلام میں ہم تفرقہ وکمزوری کا شکار تھے، لیکن اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو جانے کے بعد ہم کو عظمت واتحاد کی انتہائی بلندیوں پر فائز کر دیا گیا اور ہر جگہ ان کی زبان سے یہی سننے میں آتا ہے کہ جو دین لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معبوث ہوئے تھے، اس کے بلند اصول ومبادی کے اتباع سے ہمیں عزت وسربلندی اور اتفاق واتحاد کا یہ عدیم المثال مقام حاصل ہوا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ اور وہ کون سی سیاسی یا غیر سیاسی غرض ہے جس کی تکمیل کے لیے لوگوں کو یہ باتیں گھڑنے کی ضرورت پیش آئی؟ یہ دین دراصل اس نظام اور ان عقائد کے خلاف ایک بغاوت تھا جو ان دنوں جزیرہ نمائے عرب، ایران اور روم پر چھائے ہوئے تھے۔ یہ ایک عالمگیر انقلاب کا پیغام تھا جس کی تبلیغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انسانیت کے لیے فرمائی اور ہر انسان کو دعوت دی کہ وہ اس کی اعلیٰ تعلیمات پر ایمان لائے۔ پھر جو لوگ اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے ان پر فرض عائد کیا کہ وہ تن من دھن سے اس کی اشاعت کریں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل اور دوسرے ملوک وامراء کو خطوط بھیجے کہ وہ اسلام کے حلقہ اطاعت میں داخل ہو جائیں۔ پھر تعجب کی بات کیا ہے...... کہ اگر مسلمانوں نے اس سنت پر عمل کیا۔ اور جہاں گئے اور جس سے ملے اس کے سامنے اسلام پیش کیا۔ ر تو اس زمانے کا فطری اقتضا تھا اور وہ ایک اسی زمانے پر کیا موقوف ہے، انقلاب نے جب کبھی اور جہاں کہیں جنم لیا ہے۔ یہ تقاضا اس کے ساتھ ابھرا ہے۔ مثال کے طور پر فرانس کے انقلاب کو لیجئے اس کے داعی دنیا کے جس حصے میں جاتے اسی انقلاب کی بات کرتے اور اسی کے اصول لوگوں کے سامنے رکھتے وہ انہیں بتاتے کہ اس انقلاب سے پہلے فرانس ظلم وستم کی چکی میں پس رہا تھا، لیکن جب یہ انقلاب آیا اور اہل فرانس نے اس کے اصول اپنائے تو وہ عزت وسربلندی کے مرتبے پر پہنچ گئے۔ یہی کچھ روس میں بھی ہوا اور آج تک ہو رہا ہے۔ اس لیے اگر مسلمان اپنے دین کی باتیں

Marfat.com

کرتے تھے اور ان کی زبانوں پر اسلام سے پہلے کی بدحالی اور اسلام کے بعد کی سر بلندی کا تقابلی تذکرہ رہتا تھا تو اس پر حیرت کا اظہار کیوں کیا جاتا ہے۔ حیرت کی بات تو جب تھی کہ وہ ایسا نہ کرتے بھلا ایک مومن سے یہ توقع کس طرح کی جاسکتی ہے کہ جس چیز پر وہ ایمان رکھتا ہے، جس چیز کو وہ حق سمجھتا ہے اس کی طرف لوگوں کو نہ بلائے، جب کہ اس کا یہ بھی عقیدہ ہو کہ حق کی طرف سے سکوت اختیار کرنے والا گونگا شیطان ہے؟ اور ایک مومن کے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ جن اصول و مبادی کو وہ انسانیت کے لیے سرمایہ سعادت سمجھتا ہے، ان کی اشاعت سے باز رہے، وہ تو بہر حال یہی چاہے گا کہ لوگ ان اصول و مبادی پر ایمان لائیں جو اس کے اور دوسروں کے درمیان سچی اخوت کی اساس اور ان کی آزادی، خوش نصیبی اور سلامتی کی بنیاد ہیں۔

اب رہا مستشرقین کا یہ قول کہ نجوم کی روایت من جملہ خرافات ہے سو اس کے متعلق میں کوئی یقینی بات نہیں کہہ سکتا، اس لیے کہ میں نجوم کا عالم نہیں ہوں اور نہیں کہہ سکتا کہ ستاروں کا اس زمین سے جس پر ہم رہتے بستے ہیں، کیا تعلق ہے اور وہ یہاں کے واقعات و حوادث پر اثر انداز ہوتے ہیں یا نہیں؟ لیکن بہت سے لوگ ہیں جو آج بھی ستاروں پر اعتقاد رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ علم انسان کو غیب کے حالات پر مطلع کر دیتا ہے۔ بات چاہے کچھ ہو اتنا بہر حال ثابت ہے کہ اس زمانے کا ایران بہت سی قوموں کے مقابلے میں علم نجوم پر زیادہ اعتقاد رکھتا تھا اپنی زندگی کے خاص و عام معاملات میں اس سے رہنمائی حاصل کرتا تھا اور مستشرقین کی طرح اسے منجملہ خرافات نہیں سمجھتا تھا۔

مؤرخ کے لیے ضروری ہے کہ واقعات کے ثبوت و عدم ثبوت میں کسی ایسے پیمانے سے کام نہ لے جو اس کے ذاتی میلانات کا آئینہ ہو، بلکہ اسے اس زمانے کے عقائد و رجحانات کو پیمانہ بنانا چاہیے، جس زمانے میں وہ حوادث و واقعات پیش آئے ہیں، ایرانی اس زمانے میں علم نجوم سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے اور غالب گمان یہ ہے کہ امرائے فوج عام لوگوں سے بھی زیادہ اس علم پر اپنی توجہ صرف کرتے تھے۔ بہر حال یہ بات خبر متواتر کی حیثیت رکھتی ہے کہ رستم نجوم کا عالم تھا اور اس نے ستاروں کی مدد سے ایران کے مستقبل کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا، لیکن اس کے غرور اور جاہ پسندی نے اسے اپنے علم کے خلاف عمل کرنے پر اکسایا جس کے سبب وہ معاملات حکومت میں پوران کا شریک بھی ہوا اور یزدگرد کے حکم سے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں فوج لے کر بھی آیا۔

Marfat.com

ادھر رستم اپنی ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ قادسیہ جا رہا تھا ادھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے فوجی دستے نجف فراض اور عراق کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے قبائل کی بستیوں میں غارت گری کر رہے تھے اور اسلامی فوج کو مویشیوں اور کھانے پینے کے سامان کی ضرورت لاحق نہ ہونے دیتے تھے۔

رستم حیرہ پہنچا۔ یہاں کے لوگوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی تھی، رستم نے حیرہ کے سربرآوردہ لوگوں کو بلا کر زجر وتوبیخ کی اور انتقام کی دھمکی دی۔ جس پر حیرہ کے ایک عقل مند آدمی نے جواب دیا۔ ''ایک تو ہماری مدد کو نہ پہنچے اور الٹے ہمیں کو ملامت کر رہے ہو کہ ہم نے اپنی مدافعت آپ کیوں نہ کی!'' یہاں سے رستم نجف پہنچا اور جالینوس سیلحیس۔ نجف میں رستم کو اطلاع ملی کہ مسلمانوں کے دستے ڈیلٹا کے علاقے میں لوٹ مچا رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے تھوڑی سی فوج مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے بھیج دی، ان دستوں کو جو یہ معلوم ہوا تو عمرو بن معدی کرب اور ان کے ساتھی واپس ہو گئے۔ لیکن طلیحہ بن خویلد اسدی نے ان کے ساتھ واپس جانے سے انکار کر دیا، یہ سن کر ایک شخص نے کہا: ''تمہارے دل میں چور معلوم ہوتا ہے، عکاشہ بن محصن کے قتل کر دینے کے بعد تمہیں کبھی فلاح نصیب نہ ہوگی۔'' یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ تھا جب طلیحہ نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا اور بزاخہ کی جنگ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے معرکہ آرائی کی تھی۔ [1] اس تعریض کے باوجود طلیحہ اپنے انکار پر قائم رہے۔ وہ چپکے سے رستم کے لشکر میں داخل ہوئے اور دو سواروں کو قتل کر کے ان کے گھوڑے نکال لائے۔ رستم کے سپاہی ان کی تلاش میں نکلے جن میں سے دو کو تو انہوں نے قتل کر دیا اور ایک سپاہی کو گرفتار کر کے لڑتے بھڑتے اپنے لشکر کے قریب پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر باقی سپاہی واپس ہو گئے۔ طلیحہ قیدی کو لے کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے قیدی سے طلیحہ کے کارنامے کے متعلق پوچھا تو اس نے جواب میں کہا: ''میں لڑکپن سے فوج میں ہوں اور میں نے بڑے بڑے سورماؤں کے حالات سنے ہیں لیکن ایسا بہادر میں نے آج تک نہیں دیکھا یہ شخص چھ میل کی مسافت طے کر کے ستر ہزار کے لشکر میں جا گھسا اور وہاں سے دو گھوڑے نکال لایا۔ پھر جب ہم اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس کے قریب پہنچے تو اس نے ہمارے ایک ایسے سورما کو قتل کر دیا جو ایک ہزار ایرانیوں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد اس نے ہمارے ایک اور ساتھی کو تلوار سے موت کے گھاٹ اتارا جو شجاعت وجواں مردی میں پہلے

[1] اس کی تفصیل ''الصدیق ابوبکر رضی اللہ عنہ'' کے ساتویں باب میں دیکھیے۔

Marfat.com

کی مثال تھا۔ بالآخر میں نے اس پر حملہ کیا۔ کیونکہ میں اپنے ساتھیوں کے خون کا بدلہ لینے کے لیے بے چین تھا...... لیکن مجھے بھی موت نظر آئی اور میں گرفتار ہو گیا۔''

رستم کا سفر جاری رہا، یہاں تک کہ مدائن سے رخصت ہونے کے چار ماہ بعد وہ قادسیہ پہنچا...... یہ سست رفتاری اس نے اس لیے اختیار کی کہ مسلمان قلت غذا سے تنگ آ کر یا طویل قیام سے اکتا کر اپنے ملک واپس چلے جائیں۔ وہ دیر اس لیے بھی لگا رہا تھا کہ اس نے ستاروں کی چال میں ایران کا انجام بد دیکھ لیا تھا۔ یہ آپ کو پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ مدائن میں رہنا چاہتا تھا اور اس کی رائے یہ تھی کہ مسلسل فوجیں بھیج کر عربوں کی ہمت پست کر دی جائے۔ لیکن یزدگرد نے اس کی رائے نہ مانی اور اسے خود لڑائی پر جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ بڑی بے دلی کے ساتھ مدائن سے نکلا اور جو رستہ چند دنوں میں طے کیا جا سکتا تھا وہ پورے چار مہینے میں طے کیا۔

رستم ایک لاکھ بیس ہزار کا لشکر لے کر قادسیہ پہنچا۔ تینتیس ہاتھی فوج کے آگے آگے چل رہے تھے، جن کے وسط میں شاپور کا سفید ہاتھی تھا۔ باقی تمام ہاتھی اس کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ لیکن اس عظیم الشان لشکر کے باوجود رستم چاہتا یہی تھا کہ عرب بغیر لڑے ہی اس ملک سے واپس چلے جائیں۔ اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ اگر اسے شکست ہوگئی تو عربوں کے لیے ایک مدائن ہی نہیں بلکہ پورے ایران کے دروازے کھل جائیں گے۔ وہ ایک ایسا شہ سوار تھا جس پر سارے ملک کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں اور وہ ایک ایسا سورما تھا جس کی مثال ایران میں ڈھونڈے نہیں ملتی تھی۔ لیکن ستاروں کی پیش گوئی نے اس کے حواس گم کر رکھے تھے۔ پھر اس نے ایک خواب بھی دیکھا تھا، جس نے ستاروں کی پیش گوئی پر اس کا ایمان اور پختہ کر دیا تھا۔

ان باتوں کے علاوہ عرب پچھلی جنگوں میں شجاعت و دلیری کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ اس کے سامنے ایران کی تمام قوت اور سارا ساز و سامان رکھا کا رکھا رہ گیا تھا۔ جب سے مثنیٰ اس علاقے میں آئے تھے، ایرانیوں نے عربوں سے کئی جنگیں لڑیں اور ہاتھیوں کے باوجود ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ یہاں تک کہ معرکہ بویب میں انہوں نے عربوں سے نہایت عبرتناک شکست کھائی۔ ان تمام لڑائیوں میں کیا بلحاظ تعداد اور کیا بلحاظ سامان جنگ، ایرانیوں کے مقابلے میں عرب بے حد کمزور تھے، لیکن اس کے باوجود جب وہ ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو عرب ان کے شانوں پر سوار ہو گئے اور فتح پانے کے بعد بے شمار مال غنیمت سمیٹ کر لے گئے۔ اس اعتبار سے عرب وہ قوم تھی جس کے لیے فتح و نصرت مقدر کر دی گئی تھی۔ اب اگر ایسی قوم بغیر لڑے بھڑے اپنے ملک

Marfat.com

واپس چلی جاتی تو یہ رستم کے لیے بادشاہ اور ملک دونوں کی نظر میں اتنا بڑا اعزاز ہوتا کہ اس کے مقابلے میں بڑی سے بڑی فتح ہیچ نظر آتی۔

رستم نے مسلمانوں کے مقابلے میں صف آرائی کی اور ہاتھیوں کو سب سے آگے رکھا جس سے لشکر نے ایک ہیبت ناک شکل اختیار کر لی۔ اس کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کہلوایا کہ وہ اپنی فوج میں سے کسی ایسے عقل مند انسان کو بھیجیں جو مسلمانوں کا مدعا واضح کر سکے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو اس خدمت پر مامور کیا گیا۔ انہوں نے تخت پر رستم کے ہم پہلو بیٹھ کر پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی بعثت کا ذکر کیا، جس طرح اس سے پہلے ان کے ساتھیوں نے مدائن میں یزدگرد کے سامنے یہ تفصیل بیان کی تھی۔ پھر کہا: ''ہمارے اہل و عیال نے ایرانی غذا کا مزہ چکھ لیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اب ہم زیادہ صبر نہیں کر سکتے!''

اور اس کے بعد اپنے ساتھیوں کی طرح گفتگو ختم کرتے ہوئے فرمایا: ''ایرانی اسلام قبول کریں یا جزیہ دیں! اگر ان دونوں سے انکار ہے تو پھر آخری صورت جنگ ہے۔''

رستم کے ساتھیوں کو یہ بات ناگوار گزری کہ ایرانیوں سے جزیہ طلب کیا جائے! چنانچہ انہیں بہت غصہ آیا، لیکن رستم نے اس مطالبے پر غور کرنے کے لیے مغیرہ رضی اللہ عنہ سے کچھ مہلت چاہی۔ اس کے بعد دوسرے دن حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے پھر کہلوایا کہ صلح کی بات چیت کے لیے کوئی نمائندہ بھیجیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے اس نمائندے نے بھی اس سے وہی گفتگو کی جو مغیرہ رضی اللہ عنہ نے کی تھی اور اس کے جواب میں رستم نے بھی وہیں پیش کش کی جو یزدگرد نے کی تھی کہ اگر مسلمان واپس اپنے ملک چلے جائیں تو ان کی ضروریات زندگی فراہم کر دی جائیں گی اور ان کے سرداروں کا احترام کیا جائے گا، لیکن مسلمانوں کے ایلچی نے جب اسلام یا جزیہ یا تلوار کے سوا اور کوئی بات منظور نہ کی تو رستم نے ایک بار پھر اس سے مہلت چاہی اور اس کے بعد مسلمانوں کا ایک اور سفیر طلب کیا۔ مسلمانوں میں عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ وہ اس قسم کی سفارتیں تین دن سے زیادہ جاری نہیں رکھتے تھے، چاہے اس کے بعد صلح ہو یا جنگ۔ چنانچہ جب مسلمانوں نے اپنے مؤقف اسلام یا جزیہ یا تلوار پر اصرار کیا تو جنگ سے مفر کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔

کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ رستم اس قدر پریشان اور جنگ کے انجام سے اس درجہ خوف زدہ ہو گیا تھا کہ ہر قیمت پر صلح کرنی چاہتا تھا؟ بعض روایات یہی ظاہر کرتی ہیں اور بعض مؤرخین کہتے

Marfat.com

ہیں کہ رستم خود اسلام کی طرف مائل ہو گیا تھا مگر اس کے ساتھیوں نے اسے قبول اسلام سے باز رکھا، لیکن جب ہم جنگ قادسیہ کے پہلے دو دنوں میں ایرانیوں کا جوش و خروش دیکھتے ہیں یہ رائے قابل لحاظ معلوم نہیں ہوتی۔ کچھ مؤرخین ایسے ہیں جن کا خیال ہے کہ رستم نے گفت و شنید کو طول دینے کی کوشش اس لیے کی تھی کہ مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو جائے اور اس کے اختلاف کے بعد رستم کے لشکر کو اپنے اوپر جھپٹے دیکھیں تو ان کا ضعف و عجز اس حد کو پہنچ جائے کہ وہ اس طاقت ور سپہ سالار سے مقابلہ کرنے کی ہمت ہی اپنے اندر نہ پائیں۔

رائے چاہے پہلی صحیح ہو یا دوسری۔ مسلمانوں میں بالکل اختلاف نہ ہوا اور وہ یک زبان ہو کر یہی کہتے رہے کہ اسلام یا جزیہ، ورنہ تلوار۔ یہ دیکھ کر رستم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کہلوایا، تم دریا پار کر کے ہماری طرف آ جاؤ ورنہ ہم تمہاری طرف آتے ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ دریا کیسے عبور کر سکتے تھے جب کہ معرکہ جسر کی مثال ان کے حافظے میں تازہ تھی۔ پھر وہ رستم کو بھی اس کی اجازت نہیں دے سکتے تھے کہ وہ دریا پار کر کے لڑائی کے لیے اپنی صفیں درست کر لے۔ اس لیے وہ بے فکری کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ سامنے دیران کی حفاظت کر رہا تھا، پہلو میں خندق شاپور اور پشت پر ریگستان پھیلا ہوا تھا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ دریا عبور نہیں کر سکتے تھے اور رستم اپنی جگہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا رہ سکتا تھا۔ عراق کے ایرانیوں اور عربوں کے دل میں سلطنت کی ہیبت اور مدائن کے اقتدار کا اثر روبہ زوال ہو چکا تھا۔ پس اگر رستم قادسیہ میں مسلمانوں پر کوئی ضرب نہ لگاتا تو اس ہیبت و اقتدار کا خطرے میں پڑ جانا عین ممکن تھا۔ اس کے علاوہ یزدگرد کی فوجیں مسلمانوں سے اس ننگ و ذلت کا انتقام لینے کے لیے تڑپ رہی تھیں، جو اس سے پہلے ان کے بھائیوں کے دامن کا داغ بن چکے تھے۔ ان سب باتوں نے مل کر رستم کو مجبور کر دیا کہ وہ دریا پار کر کے دشمن سے نبرد آزما ہو۔

لیکن جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اسے عتیق کا پل پار کرنے کی اجازت نہ دی اور کہا: ''جو چیز ہم تم سے زبردستی لے چکے ہیں، وہ تمہیں واپس نہیں کریں گے۔'' تو رستم ٹھہر گیا اور رات ہونے پر اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ دریائے عتیق کو مٹی، خس و خاشاک اور ہر اس چیز سے پاٹ دو جس کی تمہیں جنگ میں ضرورت نہ ہو۔ اس پل سے ایرانی فوج گزری۔ دریا پار کر کے رستم نے اپنی فوج آراستہ کی۔ قلب میں ہاتھی تھے اور میمنہ و میسرہ پر ہتھیاروں سے بھرے ہوئے صندوق اور سپاہی باقی فوج کو پیچھے رکھا گیا۔

Marfat.com

رستم خود ایک تخت زرنگار پر بیٹھا جس پر چتر سایہ کیے تھا اور اس طرح دونوں لشکر بالمقابل کھڑے ہو کر جنگ شروع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

فریقین اچھی طرح جانتے تھے کہ جو فیصلہ کن معرکہ ہمیں درپیش ہے اس کا انجام دو ہی صورتوں میں ظاہر ہوگا اگر شکست ایرانیوں کو ہوئی تو عربوں کے لیے مدائن کے دروازے کھل جائیں گے اور اگر ہزیمت عربوں کو اٹھانی پڑی تو انہیں جزیرہ نمائے عرب کے ریگستانوں میں پسپا ہونا پڑے گا اور یہ خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ اس کے بعد وہ پھر کبھی عراق آ بھی سکیں گے یا نہیں۔

یزدگرد کی شدید خواہش تھی کہ اس غیر معمولی جنگ کی خبریں ساعت بہ ساعت، لحظہ بہ لحظہ اس تک پہنچتی رہیں گویا وہ اس جنگ میں خود موجود ہے۔ رستم کے برعکس اسے اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نوجوان تھا اور نوجوانی یاس و نومیدی سے آشنا نہیں ہوتی، نہ شکست و ناکامی کا تصور کر سکتی ہے، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جس یکجہتی کے ساتھ ایرانی اس کے گرد جمع ہوئے تھے اس سے پہلے ایران کے کسی شہنشاہ کے گرد نہیں ہوئے تھے۔ پھر ایرانیوں نے فتح کا مصمم ارادہ بھی کر لیا تھا اور انہیں اپنی کامیابی کا مکمل یقین بھی تھا۔ اس لیے یزدگرد معرکے کی ایک ایک خبر سے باخبر رہنا چاہتا تھا، جس میں اسے فتح نصیب ہونے کی امید تھی، چنانچہ اس نے مدائن سے قادسیہ تک جگہ جگہ اپنے آدمی مقرر کر دیئے تھے۔ پہلا آدمی دوسرے کو خبر دیتا اور دوسرا تیسرے کو اور اس طرح پل پل کی خبریں مدائن میں یزدگرد کے پاس پہنچتی رہتیں۔ جو ایرانی فتح کی آخری خبر سننے کے لیے بے حد مضطرب، حد درجہ بے قرار تھا۔

شاید یہ سب سے پہلی خبر ہی اس کے چراغ امید کا تیل ثابت ہوئی کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو لڑائی کے شروع ہی میں ایک مرض لاحق ہو گیا ہے جس کی وجہ سے نہ وہ گھوڑے پر سوار ہو سکتے ہیں نہ اٹھ بیٹھ سکتے ہیں۔ وہ سینے کے بل ایک تکیے کا سہارا لیے اوندھے پڑے ہیں اور پرچوں پر احکام لکھ لکھ کر اپنے محل کے دریچوں سے پھینک رہے ہیں۔ دراصل حضرت سعد رضی اللہ عنہ عرق النساء میں مبتلا تھے جس نے اس بطل جلیل اور مرد مجاہد کو اس نازک وقت میں اٹھنے بیٹھنے تک سے عاجز کر دیا تھا۔ جب کہ اسلامی فوج اس کی شجاعت و جاں بازی کی واقعی محتاج تھی۔ یزدگرد کو یہ سن کر اور بھی خوشی ہوئی کہ بعض مسلمان حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے ناراض ہیں اور اس بیماری کو بہانے پر محمول کر رہے ہیں، یہاں تک کہ کہنے والے نے یہ بھی کہہ دیا ہے:

Marfat.com

نقاتل حتّٰی انزل اللّٰہ نصرہ
وسعد بباب القادسیۃ مُعصِم
فابنا وقد ایمت نساءٌ کثیرۃٌ
ونسوۃُ سعد لیس فیھن ایم

ترجمہ: ''ہم لڑتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے فتح ارزانی فرمادی لیکن سعد رضی اللہ عنہ قادسیہ کے دروازے سے چمٹے رہے جب ہم واپس ہوئے تو ہماری بہت سی عورتیں بیوہ ہوچکی تھیں لیکن سعد رضی اللہ عنہ کی کوئی بیوی بیوہ نہ ہوئی۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ بعض ذمہ دار لوگ ان پر الزام لگارہے ہیں، انہیں بزدلی اور بے ہمتی کے طعنے دے رہے ہیں تو انہیں بہت دُکھ ہوا اور انتہائی غضب میں اپنے پاس والوں سے کہا: ''مجھے اٹھا کر لوگوں کے سامنے کرو!'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اٹھا کر لوگوں کے سامنے کیا گیا اور فوج نے ان کی تکلیف دیکھ کر انہیں معذور قرار دیا، لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی اس سے تسلی نہ ہوئی انہوں نے الزام لگانے والوں کو بُرا بھلا کہتے ہوئے فرمایا:

''خدا کی قسم! اگر تم دشمن کے مقابل نہ ہوتے تو تمہیں عبرت آفریں سزا دیتا، واللہ! آج کے بعد اگر کسی نے کوئی حرکت کی جو ہمیں دشمن کی طرف سے غافل کردے تو اس کے ساتھ وہ سلوک کروں گا جو میرے بعد آنے والوں کے لیے ایک مثال ہوجائے گا۔'' اور حکم دیا کہ ان لوگوں کو، جن میں ابو محجن ثقفی بھی تھے، محل میں قید کردیا جائے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے اس حزم واستقلال کو دیکھ کر لوگوں نے صرف انہیں معذور قرار دینے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کی اطاعت وامارت کا بھی اعتراف واعلان کیا۔ جریر بن عبداللہ بجلی نے کہا، ''میں نے اس عہد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی کہ ہر اس شخص کی اطاعت کروں گا جسے اللہ صاحب امر بنائے گا چاہے وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو؟'' یہ روح سارے لشکر میں سرایت کرگئی اور فتنے کی آگ ٹھنڈی پڑگئی۔

اس کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مختلف علم برداروں کو لکھا:

''میں اپنی جگہ خالد بن عرفطہ کو تم پر امیر مقرر کرتا ہوں اگر مجھے تکلیف نہ ہوتی تو یہ مقدس فرض میں خود سرانجام دیتا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ شدت درد سے میرا سر سینے پر جھکا ہوا ہے۔ ان کی طاعت کرو کہ ان کا حکم میرا حکم ہے۔''

یہ تحریر فوج کے سامنے پڑھی گئی اور سب نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو معذور قرار دے کر ان کے

Marfat.com

ارشاد کی تعمیل کی۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے درد کی شدت میں اپنے قریب کی فوج سے خطاب کیا۔ اللہ کی حمد و ثناء کے بعد انہوں نے فرمایا: اللہ برحق ہے۔ حکومت میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے اور اس کا قول کبھی غلط نہیں ہوتا۔ اللہ جل شانہ فرماتا ہے:

﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ﴾ (الانبیاء:105)

ترجمہ: ''ہم نے ذکر کے بعد زبور میں لکھا ہے کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔''

یہ زمین تمہاری میراث اور تمہارے پروردگار کا کیا ہوا وعدہ ہے۔ اس نے تین سال سے اسے تمہارے لیے حلال کر رکھا ہے۔ یہاں تم آج تک کھا پی رہے ہو اس سرزمین کے باشندوں کو قتل کر رہے ہو اور انہیں لونڈی، غلام بنا رہے ہو۔ دیکھو، یہ جمعیت تمہارے لیے آئی ہے اور تم معززین عرب ہو، تمہارے قبیلوں کو تم پر ناز ہے۔ اگر تم دنیا کو ٹھکرا کر آخرت کو پسند کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں دنیا اور آخرت دونوں سے نوازے گا۔ لیکن اگر تم نے بزدلی اور پست ہمتی سے کام لیا تو تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی، تمہاری عاقبت خراب ہو جائے گی۔''

عاصم بن عمرو نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی تکلیف دیکھی تو ان پر اس تقریر کا دوگنا اثر ہوا، وہ کھڑے ہوئے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: اس ملک کے باشندوں کو اللہ نے تمہارے لیے حلال کر دیا ہے، یہاں تم تین برس سے ہو اور ان لوگوں پر تمہیں بالادستی حاصل ہے، تم سربلند ہو اور اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ اگر تم نے صبر و تحمل سے کام لیا اور تیر و شمشیر کا صحیح استعمال کیا تو ان کی دولت، ان کی عورتیں، ان کے بچے اور ان کا ملک سب تمہارے لیے ہیں لیکن اگر تم نے بزدلی کم ہمتی کا اظہار کیا۔ اللہ تمہیں اس سے محفوظ رکھے۔ تو یہ سب تمہارا ساتھ چھوڑ کے چلے جائیں گے۔ اللہ! اللہ! پچھلے دن اور ان کی نعمتیں یاد کرو! کیا تم نہیں دیکھتے کہ تمہاری پشت پر سنگلاخ اور بنجر زمین ہے، جہاں نہ جھاڑیاں ہیں نہ کوئی جائے پناہ! اپنا مرکز نظر آخرت کو بناؤ!''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے چند اہل الرائے، بہادر اور ممتاز افراد کو طلب کیا، اہل الرائے میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور عاصم بن عمرو، بہادروں میں طلیحہ بن خویلد اور عمرو بن معدی کرب اور شاعروں میں شماخ، حطیہ اور عبدہ بن طبیب تھے۔ اسی طرح تمام قبیلوں کے ایسے ہی بلند مرتبہ افراد اور بھی

Marfat.com

تھے اور ان سے کہا:

"جاؤ! اور اپنا اپنا فرض ادا کرو۔ تم عرب میں بلند حیثیت کے مالک ہو، شاعر اور خطیب مدبر اور بہادر ہو فوج میں جا کر لوگوں کو جنگ پر ابھارو!"

یہ سب کے سب گئے اور اپنی تقریروں، شعروں اور سخن آرائیوں سے فوج میں ایک آگ سی لگا دی۔ ہذل اسدی نے اپنی قوم سے کہا: "اے گروہ معد! تلواروں کو اپنا قلعہ بناؤ بپھرے ہوئے شیر کی طرح دشمنوں پر جھپٹو! اور چیتے کی طرح ان کا وار خالی کر دو۔ گرد کی زرہ پہن لو! اللہ پر بھروسا کرو اور نگاہیں نیچی رکھو! جب تلواریں جواب دے جائیں تو سنان و تیر کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دو کیونکہ تیروں کو جہاں بار مل جاتا ہے تلواروں کو نہیں ملتا۔ عاصم بن عمرو نے کہا: "اے قوم عرب! تم عربوں کے سردار ہو اور عجمی سرداروں کے مقابلے پر آئے ہو۔ تمہارے دلوں میں جنت کی آرزو ہے اور ان کے دلوں میں دنیا کی تمنا......! دیکھو! دنیا کے کتے آخرت کے شیروں سے بازی نہ لے جانے پائیں۔ آج کے دن کوئی ایسی بات نہ کرنا جو کل عرب کے لیے سامان ندامت بن جائے!"

ہر شخص نے اسی قسم کی تقریریں کیں اور تمام سرداروں نے اپنی اپنی قوم کو ایسے ہی خطبوں سے جوش دلایا یہاں تک کہ ان سب نے یہ عہد کر لیا کہ فتح یا موت کے سوا اور کوئی چیز قبول نہیں کریں گے۔

رستم نے عربوں کی یہ تیاریاں دیکھیں تو اس کے دل میں بھی وطنی حمیت کا شعلہ بھڑک اٹھا۔ وہ اپنی پریشانی خاطر اور ستاروں کی پیش گوئی دونوں کو بھول گیا اور ایک بار پھر ایران کا سب سے بڑا سورما بن کر اٹھا۔ چنانچہ دریا پار کرتے ہی اس نے اپنی فوج کی صفیں درست کیں۔ پھر زرہ پہنی، خود سر پر رکھا اور ہتھیار جسم پر سجائے۔ اس کے بعد گھوڑے کی تیاری کا حکم دیا اور کہا: "کل ہم انہیں پیس کے رکھ دیں گے!" اس نے چند آدمیوں کو مقرر کیا کہ "فوج کو اپنے وطن کی مدافعت پر ابھاریں اور ان جاہل عربوں کے مقابلے میں ایرانی سپاہیوں کا حوصلہ بڑھائیں، جو برسوں ایرانی اقتدار کے غلام رہے ہیں، لیکن آج ان کی یہ ہمت ہو گئی ہے کہ وہ ایرانیوں سے دو دو ہاتھ کرنے آئے ہیں۔ بھلا اس سے زیادہ ننگ و عار کی بات ایرانیوں کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے؟"

اس طرح یہ دونوں لشکر اشارے کے منتظر کھڑے تھے۔ مسلمان اگر جنت کی آسائشوں اور دنیا کی نعمتوں کی امید میں داد شجاعت دینے کے لیے بے چین تھے تو ایرانی اپنے وطن اور کسریٰ کی

Marfat.com

سلطنت وعظمت کو اجنبی اقتدار سے بچانے کے لیے بے قرار تھے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فوج میں اعلان کرا دیا تھا کہ جب پہلی تکبیر سنو تو اپنے جوتوں کے تسمے کس لینا، دوسری تکبیر پر تیار ہو جانا اور تیسری تکبیر پر حملہ کر دینا۔ اس کے بعد سورۂ جہاد کی تلاوت کا حکم دیا جس نے دلوں میں جاں بازی و سرفروشی کے جذبات بیدار کر دیئے۔ جب قاریوں نے سورۂ جہاد ختم کی تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے پہلی تکبیر کہی جسے پاس والوں نے بلند آواز سے دہرایا۔ دوسری تکبیر پر لوگ تیار ہو گئے اور جب تیسری تکبیر کہی گئی تو بہادر جوان صفوں سے نکل آئے اور ایرانیوں کو مقابلے کی دعوت دی۔ ایرانیوں میں بھی جوش وخروش کا یہی عالم تھا۔ وہ مسلمانوں کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھے۔ غالب بن عبداللہ الاسدی مبارز طلبوں میں پیش پیش تھے۔ یہ شعر پڑھتے ہوئے میدان میں نکل آئے:

قد علمت واردۃُ المسائح
ذات اللّبان وَالبَنانِ الواضح
انی سمام البطل المشایح
فارجُ الامر المهم الفارح

ترجمہ: ''اس بکھری زلفوں، ابھری پوروں اور نمایاں سینے والی حسینہ کو معلوم ہے کہ میں وہ برق کار سورما اور پھرتیلا تیغ زن ہوں جو بڑی کٹھنائی کو جیت لیتا ہے۔''

ہرمز، جو شاہان باب میں سے تھا، تاج پہنے ان کے مقابلے کو آیا اور غالب نے اسے گرفتار کر کے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کر دیا اور خود پھر میدان جنگ میں چلے گئے۔

عاصم بن عمرو یہ رجز پڑھتے ہوئے میدان میں نکلے:

قد علمت بیضاء صفراء اللبب
مثل اللّجَینِ اِذ تَغشّاہ الذهب
انی امرؤ لامن یعیبه السبب
مثلی علی مثلك یغریه العَتب

ترجمہ: ''وہ حسینہ جس کے گورے بدن میں چنپئی ہنسلی ایسی معلوم ہوتا ہے، جیسا چاندی پر سونے کا جھول چڑھا ہو۔ جانتی ہے کہ میں مرد ہوں، وہ نہیں جس کا کوئی کچھ بگاڑ سکے۔ میرے جیسا شخص تیرے جیسے شخص پر جب جھپٹتا ہے تو گویا ایک مصیبت چمٹ جاتی ہے۔''

Marfat.com

یہ رجز پڑھتے ہوئے ایک ایرانی پر حملہ کر دیا جو بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد ایک اور ایرانی ملا۔ یہ بھی اپنا خچر چھوڑ کے بھاگ گیا اور عاصم اس کے خچر کو مع سامان کے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لے آئے۔ معلوم ہوا کہ وہ شاہی باورچی تھا جو رستم کا کھانا لے کر جا رہا تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ کھانا سپاہیوں میں تقسیم کرا دیا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی چوتھی تکبیر پر دونوں لشکر گتھم گتھا ہو گئے اور مسلمان اتنی بے جگری سے لڑے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ عش عش کر اٹھے۔ اہل ایران جس ساز و سامان سے مسلمانوں کو مٹانے آئے تھے اسے دیکھ کر غازیان اسلام کے دل رحم کے جذبات سے خالی ہو گئے تھے، عمرو بن معدی کرب لوگوں کو جوش دلاتے پھر رہے تھے کہ ایرانی فوج سے ایک شخص نکلا جس کا کوئی تیر خالی نہ جاتا تھا۔ اس نے ایک تیر مارا جو عمرو بن معدی کرب کی زرہ میں آ کر لگا۔ یہ پلٹ کر اس پر حملہ آور ہوئے اور اس کی گردن پکڑ کر توڑ دی۔ اس کے بعد تلوار اس کے حلقوم پر رکھی اور اسے ذبح کر دیا اور پھر للکار کے کہا ''ان کے ساتھ یہ کرو!'' اور مقتول کے ہاتھوں کے کڑے، ڈھال اور قیمتی قبا اتار لی۔

ایرانیوں نے جب دیکھا کہ جریر بن عبداللہ کی قیادت میں بنو بجیلہ بڑھ چڑھ کے وار کر رہے ہیں، چنانچہ ان پر حملہ کرنے کے لیے تیرہ ہاتھی بھیجے، جنہیں دیکھ کر گھوڑے بدکے اور بھاگ کھڑے ہوئے اور صرف سوار باقی رہ گئے انہیں ہاتھی روندنے ہی والے تھے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بنو اسد کو ان کی مدد کے لیے بھیجا۔ طلیحہ بن خویلد اور ان کے قبیلے کے دوسرے جاں باز مدد کو دوڑے، طلیحہ نے چیخ کر کہا:

''میرے قبیلے کے جاں بازو! اگر سعد رضی اللہ عنہ ان کی مدد کے لیے تم سے زیادہ کسی اور کو موزوں سمجھتے تو اسے بھیجتے۔ ان پر زوردار حملہ کرو اور بپھرے ہوئے شیر کی طرح جھپٹو۔ تمہیں اسد کہا جاتا ہے۔ اپنے آپ کو اسم بامسمی ثابت کرو۔ حملہ کرو اور پیچھے نہ ہٹو! بڑھو اور اللہ کا نام لے کر ٹوٹ پڑو!''

اور بنو اسد نے ایسا زوردار حملہ کیا کہ ہاتھیوں کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے، لیکن انہوں نے پھر پلٹ کر حملہ کر دیا۔ اب حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عاصم بن عمرو کو پیغام بھیجا: ''اے قبیلہ بنی تمیم! تم اونٹوں اور گھوڑوں والے مشہور ہو، تمہارے پاس ان ہاتھیوں کا بھی کوئی علاج ہے؟''

بنو تمیم نے جواب دیا: ''ہاں ہے!''

عاصم نے تیراندازوں کو پکارا کہ فیل بانوں کو تیر مار مار کے گرادو تیروں اور نیزوں کی بارش سے ہاتھی گھبرا اٹھے اور چنگھاڑیں مار مار کے فیل بانوں کو پھینک دیا جو سب کے سب قتل کر دیئے گئے اور اس طرح بنواسد اور بنوبجیلہ کو اس بلائے بے درماں سے نجات ملی جب کہ صرف بنواسد کے پانچ سو سے زیادہ آدمی اس کی نذر ہوئے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ قدیس کے ایک بالا خانے سے جنگ کا منظر دیکھ رہے تھے۔ کبھی سرفروشان عرب کی جواں مردی دیکھ کر مسرور ہو جاتے اور کبھی بنوبجیلہ اور بنواسد پر ہاتھیوں اور ایرانی شہ سواروں کی یلغار دیکھ کر مضطرب انہیں اس بات کا بہت صدمہ تھا کہ وہ اس قیامت آسا جنگ میں شرکت کی سعادت سے محروم رہے۔

مثنیٰ بن حارثہ کی بیوہ سلمیٰ بنت حفص، جن سے اب حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے نکاح کر لیا تھا، ان کے پہلو میں بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور ایسے معرکوں میں اپنے پہلے شوہر کے کارنامے انہیں رہ رہ کے یاد آ رہے تھے، جب انہوں نے ایرانیوں کو بنواسد پر جھپٹتے اور انہیں قتل کرتے دیکھا تو بے اختیار چیخ اٹھیں: ''ہائے مثنیٰ، افسوس! آج مثنیٰ نہ ہوئے؟''

یہ انہوں نے ایک ایسے شخص کے سامنے کہا، جو پہلے ہی اپنی اور اپنے ساتھیوں کی حالت دیکھ دیکھ کر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ یہ الفاظ سن کے بے آپے ہو گئے اور سلمیٰ کے منہ پر طمانچہ مار کے کہا۔ ''ان جانبازوں بنواسد اور بنوتمیم...... سے مثنیٰ کا کیا مقابلہ، جو اس قیامت کا سامنا کر رہے ہیں۔''

یہ طمانچہ اس جرأت مند بدویہ کا سر نہ جھکا سکا اور اس نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا: ''یہ بزدلی اور یہ غیرت!''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنی اس حرکت پر بہت شرمندہ ہوئے، ان کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ انہوں نے کہا: ''بخدا! اگر تم بھی مجھے معذور نہ سمجھو گی تو پھر اور کون سمجھے گا۔ تم دیکھ رہی ہو، میری کیا حالت ہے؟''

لوگوں کو حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور سلمیٰ کے اس واقعے کا علم ہوا تو انہوں نے اس جرأت مند بدویہ کی بہت تعریف کی۔ کوئی شاعر ایسا نہ تھا جس نے اسے خراج تحسین پیش نہ کیا، حالانکہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بھی ان کے نزدیک بزدل یا قابل ملامت نہ تھے۔

مسلمانوں کی جرأت و پامردی اور شاندار کارناموں کے باوجود حضرت سعد رضی اللہ عنہ لڑائی کے

Marfat.com

انجام کی طرف سے مطمئن نہ تھے، وہ ایرانیوں کی شدت، کثرت تعداد اور ہاتھیوں کی تباہ کاری کو دیکھ دیکھ کر بے چین ہوئے جا رہے تھے۔ دن بیت گیا، سورج غروب ہو گیا لیکن لڑائی کی شدت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ جب رات کا ایک حصہ گزر گیا تو دونوں لشکر اپنی اپنی جگہ واپس ہو گئے اور ہر شخص دوسرے دن کے لیے تیاریاں کرنے لگا، بالخصوص مسلمان کہ آج انہیں اچھا خاصا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔

مؤرخین، جنگ قادسیہ، کے اس پہلے دن کو ''یوم ارماث'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں، لیکن اس کی وجہ تسمیہ کوئی بیان نہیں کرتا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ ارماث اس جگہ کا نام ہے جہاں یہ معرکہ برپا ہوا تھا، لیکن یہ محض گمان ہے، دلیل سے عاری! قادسیہ کی جنگ تین دن اور ایک رات ایک ہی جگہ ہوتی رہی، لیکن اس کے ہر دن کو ایک الگ نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یوم ارماث کی شام کو دونوں لشکر اپنی اپنی جگہ واپس ہوئے۔ صبح نے آنکھ کھولی تو عرب اور ایرانی اپنے اپنے مقتولوں کو دفن کرنے اور زخمیوں کو میدان جنگ سے اٹھانے میں مصروف ہو گئے۔ مسلمانوں نے اپنے شہیدوں کو عذیب کے قریب ایک وادی میں دفن کیا اور زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے عورتوں کے پاس عذیب پہنچا دیا، لیکن ایرانیوں نے اپنے مقتولوں کو پشت کے میدان میں گاڑا اور زخمیوں کو دریا کے دوسرے کنارے لے گئے۔

ادھر یہ دونوں لشکر اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ادھر قعقاع بن عمرو تمیمی ایک ہزار کی جمعیت لیے منزلیں مارتے چلے آ رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو شام سے عراقی فوج کی مدد کے لیے بھیجے گئے تھے اور جن کے متعلق حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ دمشق فتح ہونے کے بعد عراق کے لوگ واپس بھیج دیئے جائیں چنانچہ جب دمشق فتح ہو گیا اور فحل میں مسلمانوں نے رومیوں کو شکست دے دی تو ہاشم بن عتبہ چھ ہزار فوج لے کر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی مدد کو روانہ ہوئے اور قعقاع بن عمرو کو مقدمۃ الجیش کا افسر بنا کے آگے بھیجا تا کہ وہ بروقت حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ جائیں۔

قعقاع بن عمرو وہ مشہور بہادر تھے جنہیں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے عراق روانہ ہونے کے وقت ان کی مدد کو بھیجا تھا اور جب لوگوں نے ان پر اعتراض کیا تھا کہ آپ قعقاع کو ایک ایسے شخص کی مدد کے لیے بھیج رہے ہیں جس کی سپاہ منتشر ہو چکی ہے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا تھا: ''جس لشکر میں اس جیسا آدمی ہو، وہ لشکر شکست نہیں کھا سکتا!'' اور یہ سچ

Marfat.com

بھی تھا۔ قعقاع، حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ساتھ عراق کی جنگ میں شریک ہوئے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے دل میں اپنے لیے وہی...... بلکہ اس سے بھی زیادہ جگہ پیدا کر لی جو مثنیٰ بن حارثہ کو حاصل تھی۔ چنانچہ عیاض بن غنم کی مدد کے لیے جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ دومۃ الجندل روانہ ہوئے تھے تو حیرہ میں انہیں کو اپنا نائب مقرر کیا تھا اور عراق سے شام جاتے وقت بھی انہیں اپنی فوج کے ایک حصے کا افسر بنایا تھا۔

ان خوبیوں کے ہوتے ہوئے اگر قعقاع ان تمام عربوں سے زیادہ...... جو اس وقت عراق میں تھے...... ایرانیوں پر جری اور عجمی طریق جنگ کو ان سب سے زیادہ سمجھتے تھے، تو حیرت کی کوئی بات نہیں۔ اسی طرح اگر ہاشم بن عتبہ نے انہیں حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور مسلمانوں کی مدد کے لیے پہلے بھیج دیا تھا تو ہمیں اس پر بھی تعجب نہیں کرنا چاہیے۔

قعقاع یوم ارماث کے دوسرے دن صبح سویرے قادسیہ کے قریب پہنچے۔ انہوں نے مجاہدین اسلام کی حوصلہ افزائی کے لیے اپنے ایک ہزار سپاہیوں کو دس حصوں میں تقسیم کیا اور انہیں حکم دیا کہ جب تک ایک دستہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے، دوسرا دستہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ وہ خود پہلے دستے کے ساتھ روانہ ہوئے اور جنگ شروع ہونے سے پہلے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گئے۔ انہیں سلام کیا اور کمک پہنچ جانے کی خوشخبری سنائی۔ اس کے بعد صفیں آراستہ کرنے کے ارادے سے نکلے اور لوگوں سے کہا: ''جو میں کروں وہی تم کرنا۔'' اور میدان میں نکل کر للکارے:

''آیئے! کون مقابلے پر آتا ہے؟''

ادھر سے ذوالحاجب نکلا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا: ''میں بہمن جادویہ ہوں!''

یہ سن کر قعقاع نے بلند آواز سے کہا: ''پھر میں تجھ سے ابو عبید، سلیط اور معرکہ جسر میں شہید ہونے والے دوسرے مسلمانوں کا بدلہ ضرور لوں گا۔'' دونوں میں مقابلہ شروع ہوا۔ بالآخر قعقاع نے ذوالحاجب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

مسلمانوں نے جو یہ منظر اور شام سے آنے والے دستوں کو دیکھا تو کل کی مصیبت بھول گئے، انہیں سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ آج ایرانی لشکر کے ساتھ ہاتھی نہیں تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ کل کی لڑائی میں ان کے ہودے ٹوٹ گئے تھے، اور آج ان کی مرمت کی جا رہی تھی لیکن ابھی یہ ہودے درست نہ ہونے پائے تھے کہ شدت کی لڑائی شروع ہو گئی۔

قعقاع جب اپنی فوج کے دستوں کو آتا دیکھتے، نعرہ تکبیر بلند کرتے اور مسلمان اسے دہراتے تو سارا میدان جنگ دہل اٹھتا۔ ان دستوں کی مسلسل آمد مسلمانوں کے لیے دل میں امنگوں کی جوت جگا رہی تھی اور ایرانی اس خوف سے سہمے جا رہے تھے کہ اس لامتناہی کمک کے مقابلے میں رستم کا لشکر کیا کر سکے گا؟ ایرانیوں کا خوف اپنی جگہ درست بھی تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اکیلے قعقاع کے ہی سامنے جو ایرانی جاتا ہے موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ ذوالحاجب کے قتل ہو جانے کے بعد ایران کے دو نامی گرامی شہسوار اپنے ساتھی کا انتقام لینے میدان میں آئے اور قعقاع کو مقابلے کے لیے للکارا۔ قعقاع کے ساتھ حارث بن ظبیان بن حارث تھے اور ان دونوں نے ذوالحاجب کی طرح ان دونوں مبارز طلبوں کی للکار کو بھی موت کی خاموشی سے بدل دیا۔ قعقاع نے پکار کے کہا: ''مسلمانو! تلواریں نکال لو کہ تلواریں ہی فتح و نصرت کی زمین کو دشمنوں کے خون سے سینچتی ہیں۔'' مسلمانوں نے تلواریں سونت سونت کے ایرانیوں پر حملہ کر دیا اور شام تک ان کا خون بہاتے رہے۔

جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ابو محجن ثقفی کو قید کر دیا تھا۔ ابو محجن عربوں کے مشہور شہسوار تھے۔ جب معرکہ کارزار گرم ہوا اور مسلمانوں کے نعرہ ہائے تکبیر بار بار ان کے کانوں میں ٹکرائے تو پابہ زنجیر گھسٹتے ہوئے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور معافی کے ساتھ ساتھ جنگ آزمائی کی اجازت چاہی لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ڈانٹ کر واپس کر دیا۔ یہاں سے وہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بیوی سلمٰی بنت حفص کے پاس گئے اور درخواست کی اور کہا کہ وہ ان کی بیڑیاں کھول کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا بلقاء نامی گھوڑا انہیں دے دیں، اور قسم کھائی کہ میں زندہ رہا تو آ کر خود بیڑیاں پہن لوں گا۔ سلمٰی نے جواب دیا: ''میں نہ تمہاری بیڑیاں کھول سکتی ہوں نہ تمہیں گھوڑا دے سکتی ہوں۔''

ابو محجن مایوس ہو کر اپنی کوٹھری کی طرف چلے۔ اس وقت ان کی زبان پر یہ اشعار جاری تھے:

كفى حزنا ان تردى الخيل بالقنا
و اُترك مشدودا علىَّ وَثَاقِيَا
اذا قُمتُ عنّانى الحديد و اُغلقت
مصاليعُ دُونى قد تُصِمّ المناديا

وَقَد كنتُ ذا مَال كثيرو اخوة (1)
فقد تركوني واحدًا لا اخاليا
وَلِلّٰهِ عهدٌ لا اخيس بعهده
لئن فُرِجتُ ان لا ازور الحوانيا

ترجمہ: ''اس سے بڑھ کر غم اور کیا ہوگا کہ سوار نیزے بازیاں کر رہے ہیں اور میں زنجیروں میں جکڑا پڑا ہوں۔ کھڑا ہونا چاہتا ہوں تو زنجیریں نہیں اٹھنے دیتیں اور دروازے اس طرح بند کر دیئے جاتے ہیں کہ پکارنے والا پکارتے پکارتے تھک جاتا ہے۔ میرے پاس دولت بھی بہت ہے اور میرے بھائی بھی بہت سے ہیں لیکن ان سب نے مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے اور کسی کو میرا خیال نہیں! میں نے بارگاہ خداوندی میں عہد کیا ہے اور میں اس عہد سے نہیں پھروں گا کہ اگر میرے لیے میخانوں کے دروازے کھول بھی دیئے جائیں تو بھی میں ادھر کا رخ نہ کروں گا۔''

سلمٰی نے یہ شعر سنے تو ان کا دل پسیج گیا۔ بولیں: ''میں نے استخارہ کر لیا ہے۔ میں تمہارے وعدے سے مطمئن ہوں۔'' یہ کہہ کر ان کی بیڑیاں کھول دیں۔ ابو محجن بلقاء پر سوار ہوئے جو ہتھیاروں سے مسلح تھا اور نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے ایرانیوں پر ٹوٹ پڑے۔ کبھی ان کے میمنے میں گھس جاتے، کبھی میسرے میں تباہی مچا دیتے، وہ ایرانیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کاٹ کے پھینک رہے تھے۔ لوگ انہیں پہچان نہ سکے اور سمجھے کہ ہاشم بن عتبہ کا کوئی ساتھی ہے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنے محل سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ بولے: ''واللہ! اگر ابو محجن قید میں نہ ہوتا تو میں کہتا، یہ ابو محجن ہے اور اس کی سواری میں بلقاء! دن ختم ہوا تو ابو محجن واپس ہوئے اور بیڑیاں پہن کر اپنے قید خانے میں چلے گئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی طبیعت پہلے سے کچھ بہتر تھی، نیچے آئے اور دیکھا کہ بلقاء پسینے میں نہا رہا ہے۔ پوچھا تو سلمٰی نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ابو محجن کا قصور درگزر کر دیا اور انہیں رہا کر دیا۔ (2)

---

(1) جرجی زیدان کی ''تاریخ آداب اللغۃ العربیہ'' میں یہ مصرع اس طرح ہے وقد کنت ذا اهل کثیرو اخوة (میرے بہت سے عزیز اور بھائی ہیں) اور یہی صحیح بھی ہے۔ (مترجم)

(2) ایک روایت ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی ام ولد زبراء نے ابو محجن کو قید سے آزاد کیا تھا اور گھوڑا بھی انہی نے دیا تھا۔ بلاذری کی رائے اسی روایت کے حق میں ہے۔ ابن کثیر نے بھی سلمٰی کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن طبری اور ان کے متبعین نے سلمٰی کا نام لکھا ہے اور اس پر یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ سلمٰی نے ابو محجن سے پوچھا: ''سعد رضی اللہ عنہ نے تمہیں کس جرم میں قید کیا ہے؟'' انہوں نے جواب دیا: ''مجھے کسی حرام چیز کے کھانے یا پینے پر قید نہیں کیا گیا۔ میں جاہلیت میں شراب پیتا تھا اور

Marfat.com

اس دن جنگ آدھی رات تک جاری رہی جس میں مسلمانوں کا پلہ بھاری تھا اور انہیں فتح کے آثار واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ فتح کی اس امید نے مسلمانوں کو کس قدر مسرت بخشی تھی، اس سلسلے میں مؤرخین نے چند روایات نقل کی ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ صرف قعقاع نے اس دن تیس ایرانیوں کو قتل کیا۔ ہاتھیوں کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو بڑا اطمینان تھا اور وہ بڑھ بڑھ کے ایرانیوں کا صفایا کر رہے تھے۔ آگے چل کر مؤرخین لکھتے ہیں کہ قعقاع کے قبیلے والوں نے اونٹوں پر جھول اور برقعے ڈال دیئے اور انہیں ہاتھیوں کی طرح مہیب بنا کر ایرانیوں پر حملہ کر دیا، جس سے ایرانیوں کا وہی حال ہو گیا جو حال یوم رماث میں ہاتھیوں کی وجہ سے عربوں کا ہوا تھا۔ ایرانیوں کے گھوڑے اس ہیبت ناک منظر سے خوف زدہ ہو کر بھاگے اور مسلمانوں نے کشتیوں کے پشتے لگا دیئے۔ ایک سپاہی نے یہاں تک جرأت کی کہ وہ رستم کو قتل کرنے کے ارادے سے ایرانی صفوں میں دیوانہ وار گھس گیا اور انہیں چیرتا ہوا رستم کے قریب جا پہنچا۔ وہ رستم کا کام تمام کرنے ہی والا تھا کہ ایک ایرانی نے اسے شہید کر دیا اور رستم بال بال بچ گیا۔ اسی طرح آدھی رات گزر گئی۔ مسلمان چاہتے تھے کسی نہ کسی طرح ایرانیوں کو ان کے مورچوں سے پیچھے دھکیل دیا جائے اور اس کے لیے وہ انتہائی بے جگری سے لڑے، وہ یقیناً اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ اگر ایرانیوں کی تعداد بے شمار اور ان کی قوت مدافعت بے حد شدید نہ ہوتی۔ آدھی رات گزر جانے کے بعد فریقین کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اپنے اپنے مورچوں میں چلے جائیں اور دوسرے دن کے لیے تیاری شروع کر دیں۔

مؤرخین، جنگ قادسیہ کے اس دوسرے دن کو یوم اغواث کہتے ہیں۔ بعض مستشرقین کے نزدیک اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس دن قعقاع نے شام سے آنے والی فوج کے ذریعے حضرت

» شاعر بھی ہوں اس لیے دل کی بات زبان پر آ گئی اور میرے ان شعروں پر مجھے قید کر دیا گیا۔

اذا مت فادفنی الی جنب کرمۃ ترویٰ عظامی بعد موتی عروقھا
ولا تدفننی فی الفلاۃ فاننی اخاف اذا مامت ان لا اذوقھا

ترجمہ: جب میں مر جاؤں، مجھے پہلوئے تاک میں دفن کرنا۔ تاکہ میری ہڈیاں اس کا رس چوستی رہیں اور مجھے خشک زمین میں دفن نہ کرنا کیونکہ میں ڈرتا ہوں، مرنے کے بعد اس کا مزہ نہ چکھ سکوں گا۔ سلمیٰ نے یوم اغواث کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے ان کی سفارش کی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان کے کہنے سے ابو محجن کو چھوڑ دیا اور کہا: ''جو کچھ تم نے کہا ہے جب تک اس پر عمل نہ کرو گے میں تمہیں کچھ نہ کہوں گا۔'' ابو محجن نے جواب دیا: ''خدا کی قسم! ایسی بیہودہ بات میری زبان پر کبھی نہ آئے گی۔''

Marfat.com

سعد رضی اللہ عنہ کے لشکر کی مدد کی تھی۔ ① لیکن جب تک اس جنگ کے ایک ایک دن کے نام کی توجیہ نہ ہو ہمارے لیے اس توجیہ کو قبول کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ یوم ارماث کی جو وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ اس توضیح وتفسیر سے میل نہیں کھاتی۔ یوم رماث اور یوم اغواث کی درمیانی رات کو مؤرخین ''لیلۃ الہداۃ'' یعنی ''سکون کی رات'' کے نام سے یاد کرتے ہیں، جس طرح یوم اغواث کے بعد کی رات کو'' لیلۃ السواد'' یعنی ''تاریک رات'' کہتے ہیں۔

یوم اغواث سے مسلمان اتنے شاد وخرم تھے کہ ساری رات اس خوشی میں جاگتے رہے اور اپنے اپنے قبیلے کی تعریفیں کرتے رہے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ بھی آج کے معرکے اور مسلمانوں کی قوت سے اس درجہ مسرور و مطمئن تھے کہ سوتے وقت اپنے ایک ہم نشیں سے کہنے لگے: ''اگر لوگ تعریفیں ہی کرتے رہیں تو مجھے نہ جگانا کہ یہ دشمن پر غالب رہے ہیں اور اگر خاموش ہو جائیں، کچھ لوگ ایسا نہ کریں تو بھی کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر تم دیکھو کہ لے بڑھ رہی ہے اور مفاخرت کا پہلو غالب آتا جا رہا ہے تو مجھے جگا دینا کہ یہ بات خطرناک ہے۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ اطمینان سے سو گئے لیکن قعقاع جاگتے اور اپنے ساتھ شام سے آئے ہوئے سپاہیوں کو جنگل میں اس مقام پر بھیجتے رہے جہاں وہ یوم اغواث کی صبح کو آ کر ٹھہرے تھے، ان لوگوں کو قعقاع کا حکم تھا کہ صبح جب آفتاب طلوع ہو تو وہ کل کی طرح ایک ایک سو کے دستوں میں بٹ کر دوبارہ آئیں اور اگر اس دوران میں ہاشم بن عتبہ بھی پہنچ جائیں تو ان کی فوج کو بھی اسی تدبیر پر عمل کرنے کی ہدایت کر دیں تاکہ اس سے مسلمانوں کی ہمت بھی بڑھے گی اور انہیں اپنی کامیابی کا یقین بھی زیادہ ہو جائے گا۔

لوگ اٹھے تو دونوں لشکر اپنی اپنی جگہ تھے اور میدان مقتولوں اور زخمیوں سے پٹا پڑا تھا جن میں دو ہزار مسلمان تھے اور دس ہزار ایرانی۔ مقتولوں کو دفن کر دیا گیا اور زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے کیمپوں میں بھیج دیا گیا۔ مسلمان خواتین زخمیوں کی دیکھ بھال پر مامور تھیں اور ان سے ایسی دلجوئی کے ساتھ پیش آتی تھیں کہ وہ اپنا تمام دکھ درد بھول جاتے تھے۔ اس طرح خواتین بھی اس شاندار معرکے میں شامل تھیں اور ان کی خدمات کو شاعروں اور مؤرخوں نے زندہ جاوید بنا دیا۔

سورج نکلا تو قعقاع لشکر کے پیچھے کھڑے صحرا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جب سواروں کے دستے آتے نظر آئے تو زور سے نعرہ تکبیر بلند کیا جسے لوگوں نے دہرایا اور مسلمانوں کے لشکر میں

---

① غوث کے معنی امداد کے ہیں۔ مترجم

''مدد آ گئی! مدد آ گئی!'' کا غل مچ گیا۔ ہاشم بن عتبہ بھی اپنے لشکر سمیت قعقاع کی فوج سے آ ملے۔ جب انہیں اپنے رفیق کی اس تدبیر کا علم ہوا تو انہوں نے بھی اسی پر عمل کیا اور حکم دیا کہ جب تک پہلا دستہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے، دوسرا دستہ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ وہ خود پہلے دستے کے ساتھ روانہ ہوئے، قیس بن ہبیرہ ان کے ہم رکاب تھے جب وہ قادسیہ پہنچے تو مسلمان لڑائی کے لیے صفیں باندھ چکے تھے۔ لوگوں نے انہیں دیکھا تو اس زور کا نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ فضا گونج اٹھی۔ ہاشم تیر برساتے ہوئے دشمن کے قلب میں گھستے چلے گئے، یہاں تک کہ دریا تک جا پہنچے۔ وہاں پلٹے اور پھر جھپٹے، لیکن کسی کو ان سے مقابلے کی جرأت نہ ہوئی۔

مسلمانوں کی اس کمک سے ایرانیوں کے حملے پست نہیں ہوئے، انہوں نے ہودوں کی مرمت کر لی تھی اور سورج نکلتے ہی ہاتھیوں کو لے مسلمانوں پر حملہ کر دیا تھا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ وہ آج کی لڑائی میں مسلمانوں کو یوم ارماث سے بھی زیادہ نقصان پہنچائیں گے۔ یوم ارماث میں مسلمانوں نے ہاتھیوں کو مار مار کے پسپا کر دیا تھا۔ اس کے لیے ایرانیوں نے آج یہ پیش بندی کی کہ ہاتھیوں کو سواروں کے گھیرے میں لے لیا۔ ہاتھی چونکہ ان سواروں سے مانوس تھے، اس لیے انہیں کچھ نہ کہتے تھے، لیکن اس تدبیر نے ایک اور قباحت یہ پیدا کر دی کہ اپنے سواروں کی طرح ہاتھی دشمن پر بھی حملہ نہ کرتے تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ ہاتھی جب اکیلا ہوتا ہے تو اس پر وحشت غالب رہتی ہے لیکن جب اس کے گرد دیکھے بھالے چہرے ہوں تو اس کی وحشت انس سے بدل جاتی ہے۔ مسلمانوں نے ان سواروں پر شدید حملہ کیا اور ان پہاڑ سے حیوانوں کے سامنے لڑائی ہونے لگی، جنہیں یہ معلوم نہ ہو پاتا تھا کہ کس کو مارنا ہے اور کسے چھوڑنا ہے؟ اس لیے جنگ پوری شدت کے ساتھ جاری رہی، کبھی ایرانی عربوں کو پیچھے دھکیل دیتے، کبھی عرب، ایرانیوں کو۔ اتنے میں یزدگرد کی بھیجی ہوئی کمک ایرانیوں کے پاس پہنچ گئی اور ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ تاہم عربوں کی ہمت پر اس کا کوئی اثر نہ پڑا اور وہ اسی بے جگری کے ساتھ لڑتے رہے۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب ہاتھی صورت حال سے مانوس ہوئے اور ان کے گرد و پیش لڑائی نے شدت اختیار کی تو یوم ارماث کی طرح تباہی مچانے لگے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جو یہ دیکھا تو ان ایرانیوں سے، جو اپنی جان کے خوف سے مسلمان ہو گئے تھے، اس کا علاج معلوم کیا۔ انہوں نے بتایا ان کی آنکھیں اور سونڈیں بیکار کر دی جائیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے قعقاع اور

Marfat.com

عاصم بن عمرو کو بلا کر کہا: ''سفید ہاتھی کا ذمہ تم لو کہ وہ تمہارے سامنے ہے۔'' اس کے بعد حمال اور ربیل کے پاس پیغام بھیجا جو بنو اسد کے جاں باز تھے کہ'' تمہارے سامنے جو چتکبرا ہاتھی ہے اس کا بندوبست تم کرو۔'' دراصل یہ دونوں ہاتھی ہی سب سے زیادہ خطرناک تھے، باقی سارے ہاتھی انہیں کے پیچھے تھے۔ قعقاع اور عاصم گھوڑوں سے اتر پڑے اور دونوں نے اپنے اپنے نیزے سفید ہاتھی کی آنکھوں میں گھونپ دیئے ہاتھی نے مارے درد کے چنگھاڑ ماری اور فیل بان کو گرا کر سونڈ پھرانے لگا۔ قعقاع آگے بڑھے اور اس کی سونڈ پر تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ مستک سے الگ ہو کر زمین پر جا پڑی۔ ادھر حمال اور ربیل نے چتکبرے ہاتھی پر حملہ کیا۔ اس کی ایک آنکھ پھوڑ دی اور سونڈ کاٹ ڈالی۔ دونوں ہاتھی چنگھاڑ رہے تھے۔ چتکبرا ہاتھی ایرانیوں کی طرف پلٹ پڑا اور انہیں کچلنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنا رخ مسلمانوں کی طرف کیا اور ان میں تباہی مچا دی۔ غرض یہ کہ وہ خنزیر کی طرح چیختا چلاتا دونوں صفوں میں گھستا اور انہیں روندتا رہا، یہاں تک کہ بھاگا اور دریا میں کود پڑا، اس کی دیکھا دیکھی دوسرے ہاتھی بھی اپنے اپنے فیل بانوں کو گرا کر دریا کی طرف بھاگے اور پھر واپس نہ ہوئے۔

اس مرحلے پر لڑائی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ ہاتھیوں نے مسلمانوں کی صفوں کو درہم برہم کرنا شروع کیا تو ایرانیوں کا پلہ بھاری ہو گیا اور جب وہ دونوں فوجوں کے درمیان خالی میدان میں ہنگامہ برپا کرنے لگے تو دونوں لشکر اپنی اپنی جگہ کھڑے اس مصیبت سے بچنے کی تدبیریں سوچنے لگے، لیکن جب مسلمانوں نے دیکھا کہ وہ دریا میں کود گئے ہیں تو اطمینان کا سانس لیا اور ہاتھیوں کے اس فرار کو دشمن کے خلاف اللہ کی نصرت پر محمول کیا۔ اور ایرانی بھی اپنی کثرت تعداد اور یزدگرد کی کمک پر نازاں تھے۔ انہوں نے اپنی صفوں کو از سر نو مرتب کیا اور ہاتھیوں کے فرار کی ذلت کو چھپانے کے لیے پہلے سے بھی زیادہ جوش وخروش کے ساتھ لڑنے لگے۔ اس طرح دوبارہ شدت کی جنگ شروع ہو گئی، جو دن ڈھلنے کے بعد تک جاری رہی۔ سارا میدان گرد وغبار سے اٹ گیا اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور رستم دونوں میں سے کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کون غالب ہے اور کون مغلوب؟

کیا آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ دونوں فوجیں پرسوں کی طرح اپنے اپنے مورچوں میں واپس چلی گئیں؟ یا آپ کا خیال یہ ہے کہ کل کی طرح رات گئے ان کی واپسی ہوئی؟ نہیں! نہ یہ ہوا نہ وہ بلکہ فریقین ایک دوسرے سے برسر پیکار رہے۔ گویا اپنی اپنی جگہ دونوں نے یہ ٹھان لی تھی کہ آج جنگ کا فیصلہ کر کے ہی ہٹیں گے۔ لڑائی کو اسی دن کسی فیصلہ کن نقطے پر پہنچانے میں حضرت سعد

Marfat.com

رضی اللہ عنہ یا رستم کے حکم کو دخل نہ تھا۔ یہ بات سپاہیوں نے بطور خود طے کی تھی بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ صورت حال خود بخود پیدا ہوگئی اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟

دراصل یہ تقدیر الٰہی کا کرشمہ تھا اور اللہ جب کسی بات کا ارادہ فرمالیتا ہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا، اس کے فیصلے کو کوئی نہیں بدل سکتا۔

رات ہوئی تو لڑائی کا زور کچھ کم ہوا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے خیال کیا کہ دونوں لشکر اب جنگ بند کر کے چوتھے دن کے لیے تیاری شروع کر دیں گے جو پچھلے تین دنوں یوم ارماث، یوم اغواث اور یوم عماس سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔ لیکن انہیں اندیشہ ہوا کہ دشمن کہیں لشکر کے پیچھے، گھاٹ کی طرف سے حملہ نہ کر دے۔ چنانچہ انہوں نے طلیحہ اور عمرو کو تھوڑے سے سپاہیوں کے ساتھ ادھر روانہ کیا اور کہا: ''اگر تم دیکھو کہ ایرانی تم سے پہلے وہاں موجود ہیں تو ان کے بالمقابل اتر جانا اور اگر وہ وہاں نہ ہوں تو وہیں ٹھہر کر میرے حکم کا انتظار کرنا۔''

جب یہ لوگ گھاٹ پر پہنچے تو وہاں کوئی نہ تھا۔ طلیحہ اور عمرو دونوں کے دل میں یہ خیال آیا کہ پانی میں گھس کر ایرانیوں پر پشت کی طرف سے حملہ کر دیں لیکن یہ کیا کس طرح جائے؟ اس پر ان دونوں میں اختلاف ہوگیا۔ طلیحہ ایرانی لشکر کی پشت پر پہنچ گئے اور تین بار نعرہ تکبیر بلند کیا۔ ایرانی خوف زدہ ہوگئے اور سمجھے کہ مسلمانوں نے بدعہدی کا تہیہ کرلیا ہے، ادھر مسلمانوں کو یہ آواز سن کر تعجب ہوا۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ ایرانیوں نے ان کے حفاظتی دستے پر حملہ کر دیا ہے اور وہ مدد کے لیے بلا رہے ہیں۔ عمرو نے گھاٹ کے نچلے حصے کی ایرانی فوج پر ہلہ بول دیا۔ ایرانیوں کو عربوں کی بدعہدی کا یقین ہوگیا اور جوابی حملے کے طور پر ان کی فوجیں بھی عربوں پر ٹوٹ پڑیں۔

قعقاع نے جو یہ دیکھا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے اجازت لیے بغیر ایرانیوں پر حملہ آور ہوگئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنے بالا خانے میں بیٹھے ایرانیوں پر حملے کے متعلق سوچ رہے تھے، جب انہوں نے قعقاع کو حملہ کرتے دیکھا تو کہا: ''یا اللہ! اسے معاف کر دے اور اس کی مدد فرما! ہر چند کہ اس نے مجھ سے اجازت نہیں لی مگر میں اسے اجازت دیتا ہوں!''

اور اپنے ساتھیوں سے کہا: ''جب میں تیسری بار تکبیر کہوں تو حملہ کر دینا!''

لیکن ابھی وہ پہلی تکبیر ہی کہنے پائے تھے کہ بنو اسد نے حملہ کر دیا اور ان کے ساتھ ہی بنو نخع، بنو بجیلہ اور کدنہ کے قبائل بھی لڑائی میں کود پڑے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ قعقاع کے چاروں طرف جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ان سب کے لیے

Marfat.com

مغفرت چاہی اور ان کی کامیابی کے لیے دعا کی۔ ان کی دوسری اور تیسری تکبیر پر عام جنگ شروع ہوگئی، میدان میں کھچاکھچ تلواریں چل رہی تھیں اور لڑنے والے باتیں نہیں کر رہے تھے، چیخ رہے تھے۔ جوں جوں رات گزرتی جا رہی تھی، لڑائی شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی، رات بھر قیامت کی جنگ جاری رہی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور رستم کو کچھ علم نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

بیماری کی وجہ سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ بارگاہ رب العالمین میں دست بہ دعا ہونے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے چنانچہ وہ انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنے لشکر کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ لشکر کے تمام آدمیوں کی طرح حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بھی پلک نہ جھپکی اور جب صبح نے اپنا نور بکھیرنا شروع کیا تو مسلمان اپنے اپنے قبیلے کی مدح سرائی کرنے لگے، جس سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو یہ اطمینان ہوگیا کہ وہ غالب ہیں اور انہوں نے ایرانیوں کی گردنیں دبوچ رکھی ہیں۔ ان کے اطمینان میں اور بھی اضافہ ہوگیا جب انہوں نے قعقاع بن عمرو کو یہ رجز پڑھتے سنا:

نحن قتلنا معشرا و زائدا
اربعة و خمسة و واحدا
نُحسَبُ فوق اللبَد الاساودا
حتیٰ اذا ماتوا دعوتُ جاهدا
اللّٰه ربی واحترزت عامدا

ترجمہ: "ہم نے گروہ کے گروہ بلکہ اس سے بھی زیادہ تلوار کے گھاٹ اتار دیے، چار چار بھی، پانچ پانچ بھی اور ایک ایک بھی ہم کثیر سے کثیر جمعیت پر بھاری سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ میرے حریف جب تک موت کی نیند نہ سو گئے میں انہیں برابر تیغ آزمائی کے لیے للکارتا رہا۔ اللہ میرا پروردگار ہے اور میں نے اسی کی قوی اور یاور آڑ پکڑی ہے۔"

یہ ہنگامہ آفریں اور خوں فروش رات ہوئی جسے مؤرخین "لیلۃ الھریر" کے نام سے پکارتے ہیں اور صبح نے بیداری کی کروٹ بدلی، لیکن ابھی تک فتح نے کسی فریق کے پرچم سے اپنا دامن نہیں باندھا تھا، تو کیا چوبیس گھنٹے کی اس مسلسل اور انتہائی شدید جنگ کے بعد فوج تھک گئی تھی اور اب آرام کرنا چاہتی تھی۔ نہیں، بلکہ قعقاع لوگوں سے یہ کہتے پھر رہے تھے:

"جنگ ابھی ایک گھنٹے کے بعد شروع ہوگی۔ ذرا صبر کرو۔ پھر حملہ کرنا! کہ فتح صبر وتحمل کے

Marfat.com

ساتھ ہوتی ہے۔'' سرداروں کی ایک جماعت اپنی فوجوں سمیت قعقاع کے ساتھ ہوگئی، یہ سب رستم کی طرف چلے اور ان لوگوں کے ساتھ گتھم گتھا ہوگئے جو رستم کی حفاظت کر رہے تھے۔ دوسرے قبیلوں نے جو مہاجرین وانصار کی یہ جرأت دیکھی تو ان کے سرداروں نے ان مسلمانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''دیکھو، یہ لوگ خدا کی راہ میں تم پر سبقت نہ لے جائیں!'' اور ایرانیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''اور نہ وہ تم سے زیادہ موت پر جری ہونے پائیں۔''

قبیلوں نے اپنے اپنے مقابل پر حملہ کر دیا جو دوپہر ہونے تک شدت اور تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔ اس وقت ایرانیوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہونے لگا۔ فیروزان اور ہرمزان، جو فوج کے دائیں، بائیں بازو پر تھے، پیچھے ہٹنے لگے اور قلب میں شگاف پڑ گیا۔ ساتھ ہی زور کی آندھی آئی اور رستم کا خیمہ دریائے عتیق میں اڑا لے گئی...... قعقاع اپنے ساتھیوں کو لے کر رستم کے تخت کی طرف دوڑے لیکن رستم تخت سے اتر کر ان خچروں کی طرف ہولیا جن پر دولت لاد کر لائی گئی تھی اور ایک خچر پر لدے ہوئے سامان کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ قعقاع کی فوج کے سپاہی دریا کی طرف نکل گئے۔ انہیں نہ یہ معلوم ہوا کہ خچروں پر دولت لدی ہوئی ہے، نہ یہ پتا چلا کہ رستم سامان کے پیچھے چھپا کھڑا ہے؟ ہلال بن علقمہ نے ایک خچر پر تلوار کا ہاتھ مارا جس سے اس سامان کی رسی کٹ گئی، جس کے نیچے رستم چھپا کھڑا تھا۔ سارا بوجھ رستم پر گرا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ لیکن ہلال کو اس کا پتا نہ چلا۔ رستم دوڑ کر دریا میں کود گیا۔ ہلال نے اسے دیکھا اور پہچان گئے۔ اس کے پیچھے وہ بھی پانی میں کود گئے اور اسے دریا میں باہر نکال کر قتل کر دیا۔ پھر اس کے تخت پر کھڑے ہو کر چلائے:

''رب کعبہ کی قسم! میں نے رستم کو قتل کر دیا۔ ادھر آؤ ادھر!'' لوگ نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے ان کے گرد جمع ہوگئے۔ ایرانیوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ ایران کا سب سے بڑا قائد مارا گیا تو ان کے جی چھوٹ گئے۔ جالینوس نے ان سے کہا کہ فیروزان اور ہرمزان کی طرح بند کے اوپر سے دریا عبور کر لو، لیکن بند اتنے سپاہیوں کا بوجھ نہ سہار سکا، ان سب کو لے کر بیٹھ گیا اور تیس ہزار ایرانی اپنی زرہوں سمیت دریا میں غرق ہوگئے۔ ضرار بن خطاب نے ایران کا سب سے بڑا پرچم...... درفش کادیانی...... اٹھا لیا، جس کی قیمت لاکھوں کروڑوں تک پہنچی تھی اور اس طرح یزدگرد کی فوجوں کو عبرتناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور وہ ایسی دُم دبا کے بھاگیں کہ پلٹ کے دیکھا تک نہیں۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان کے تعاقب کا حکم دیا۔ پہلے قعقاع اور شرحبیل اور اس کے بعد زہرہ تمیمی اور دوسرے لوگ ان کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ زہرہ نے جالینوس کو جالیا جو شکست خوردوں کو جمع کر رہا تھا اور اسے قتل کر دیا۔ مسلمانوں کو جو ایرانی ملتا وہ اسے تلوار کے گھاٹ اتار دیتے یا گرفتار کر لیتے، لیکن ایرانیوں کی طرف سے کوئی مزاحمت نہ کی جاتی بلکہ بعض روایتوں میں تو یہاں تک ہے کہ مسلمان ایرانی بھگوڑوں کو ایک دوسرے کے قتل کا حکم دیتا اور وہ بے چون وچرا ان کے حکم کی تعمیل کرتے جس کی وجہ یہ تھی کہ ایرانیوں کی معنوی قوت بالکل تباہ ہو چکی تھی اور ان میں مقاومت کا کوئی جذبہ ہی باقی نہ رہا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ جو ایرانی مقابلہ کرتا ہے مارا جاتا ہے اور ان کے سردار بھی فرار ہو رہے ہیں تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ مسلمانوں کا ایک نوجوان ان کے بیسیوں سپاہیوں کو ہانکتا ہوا لے جاتا اور وہ سر جھکائے اس کے آگے آگے اس طرح چلتے جیسے بھیڑوں کا کوئی ریوڑ ہے جس میں ننگ وعار کی زندگی بسر کرنے کے سوا نہ کوئی ارادہ ہے نہ امید۔ جو لوگ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے ان میں سے ہر ایک یہ سمجھ رہا تھا کہ فرار ہو کر اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی مراد حاصل کر لی ہے۔

یہ شاندار فتح مسلمانوں کو دل وجان سے زیادہ عزیز تھی اس لیے کہ اس نے انہیں فخر ونازش کا تاج پہنایا تھا۔ مسلمانوں کے اہل وعیال کو جب اس کا علم ہوا تو وہ بھی اس میں شرکت کے لیے میدان جنگ کی طرف چلے۔ ہمام بن حارث نخعی کی بیوی ام کثیر سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ''اپنے شوہروں کے ساتھ قادسیہ میں ہم بھی شریک تھے۔ جب ہمیں معلوم ہوا کہ لڑائی ختم ہو گئی ہے تو ہم نے اپنی کمر کس کے باندھی اور ڈنڈے لے کر مقتولین اور مجروحین کے پاس پہنچے۔ اگر کوئی مسلمان ہوتا ہم اسے پانی پلاتے اور اٹھا لیتے، لیکن مشرکوں کو ڈنڈے مار مار کے ہلاک کر دیتے بچے بھی ہمارے ساتھ تھے اور ہم ان سے بھی یہی کام لے رہے تھے۔''

اس طرح تمام مسلمان...... مرد، عورتیں اور بچے، اس شدید اور فیصلہ کن معرکے میں شامل تھے، جس نے اللہ پر ایمان لانے والوں کا بول بالا کیا اور جس کا اسلامی سلطنت کے قیام میں وہی دخل واثر ہے جو اسلام کے قیام میں غزوۂ بدر کا۔

مسلمانوں نے اس شاندار فتح حاصل کرنے کی قیمت ادا کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ ان کے رشک آفریں کارنامے اور قعقاع بن عمرو جیسے افسروں کی سرفروشی آپ دیکھ چکے ہیں۔ آپ

Marfat.com

کی نظر سے یہ بھی گزر چکا ہے کہ فتح و کامرانی کی راہ میں مسلمانوں نے کس طرح اپنا خون بہایا، کس بے باکی سے اپنی جانیں نچھاور کیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں کیسی جزا سے نوازا۔ مسلسل تیس گھنٹوں کی لڑائی میں، جو بالآخر مسلمانوں کی فتح پر تمام ہوئی، چھ ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ اس سے پہلے یوم ارماث اور یوم اغواث میں ڈھائی ہزار مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا تھا اور یہ مقتولین کی وہ تعداد تھی جس کا عرب اس زمانے میں تصور بھی نہ کر سکتے تھے لیکن اس تعداد کے مقابلے میں جب ہم ایرانی مقتولین کو دیکھتے ہیں، جو میدان جنگ میں مارے گئے، شکست کھانے کے بعد دریا میں غرق ہوئے اور بھاگتے وقت مسلمانوں کی تلواروں کا لقمہ بنے تو اس کی بھی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی۔

قعقاع، زہرہ اور فوج کے دوسرے افسر اور سپاہی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جمع ہوئے۔ فتح کی خوشی نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی تکلیف میں کچھ کمی کر دی تھی۔ جب مال و دولت اور سامان جنگ کا ڈھیر لگا دیا گیا تو وہ اتنا تھا کہ کبھی عربوں کے تصور میں بھی نہ آیا تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ہلال بن علقمہ سے کہلا بھیجا کہ رستم کے لباس میں سے جو چاہو اتار لو۔ اور ہلال نے سب کچھ اتار لیا، جس کی قیمت ستر ہزار تک پہنچتی تھی اور اگر اس کی ٹوپی دریا میں نہ گر پڑتی تو ہلال اس سے بھی زیادہ نفع میں رہتے۔ زہرہ بن حویہ جالینوس کی پوشاک اتار لائے لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے وہ سب کچھ انہیں دے دینا ان کی خدمات سے زیادہ سمجھا اور اس کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا جس کے جواب میں دربار خلافت سے حکم آیا: ''زہرہ جیسے جاں باز پر اعتماد کرو! اس نے اس جنگ میں بے نظیر شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ابھی تمہیں اور بھی جنگیں لڑنی ہیں اس کا دل تھوڑا نہ کرو! جو کچھ اس نے جالینوس کے جسم سے اتارا ہے، اسے دے دو! اس کے علاوہ جب فوج میں حصے تقسیم کرنے لگو تو اسے اس کے حصے سے پانچ سو زائد دینا۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے لوگوں میں فئے تقسیم کرتے وقت سوار کو چھ ہزار دیئے اور پیدل کو دو ہزار اور جن لوگوں نے جنگ میں غیر معمولی کارنامے سرانجام دیئے تھے انہیں دوسروں سے پانچ پانچ سو زائد دیئے۔ اس کے باوجود بہت کچھ بچ رہا حالانکہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے وہ خمس بھی الگ کر دیا تھا جو مدینہ بھیجا جانے والا تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تقسیم کی پوری تفصیل لکھی، باقی ماندہ غنیمت کے متعلق ہدایت چاہی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

"خمس بھی مسلمانوں میں تقسیم کردو اور ان لوگوں کو بھی حصہ دو جو لڑائی میں شریک نہیں ہو سکے۔"①

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کی تعمیل کی لیکن سامان اتنا تھا کہ پھر بھی بچ رہا۔ مجبوراً حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے پھر لکھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے حفاظ قرآن میں تقسیم کر دینے کا حکم صادر فرما دیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اس حکم کی تعمیل کر رہے تھے کہ عمرو بن معدی کرب اور بشر بن ربیعہ الخثعمی آئے۔ یہ دونوں حضرات اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر لڑے تھے جس کے معاوضے میں انہیں دوسروں سے زیادہ حصہ مل چکا تھا، لیکن وہ اپنی خدمات کو اس صلے سے زیادہ سمجھ کر اب حفاظ قرآن کے حصے میں بھی شریک ہونا چاہتے تھے، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عمرو بن معدی کرب سے پوچھا: "تمہیں کتنا قرآن حفظ ہے؟"

عمرو نے جواب دیا: "میں یمن میں مسلمان ہوا تھا اور قبول اسلام کے بعد ہی لڑائیوں میں شریک ہو گیا، اس لیے مجھے حفظ قرآن کا موقع نہ مل سکا۔"

یہ سن کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے انہیں حصہ دینے سے انکار کر دیا اور بشر سے سوال کیا: "تم نے کتنا قرآن حفظ کیا ہے؟"

بشر نے کہا: "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سب لوگ ہنس پڑے اور بشر بھی اس حصے سے محروم رہے۔

کیا آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان دونوں شہ سواروں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے جواب سے مطمئن ہو کر خاموشی اختیار کر لی؟ نہیں......! بلکہ عمرو نے کہا:

اذا قُتلنا ولا یبکی لنا احدٌ
قالت قریش الا تلك المقادیر
نُعط السَّویّة من طعن علی نفد
ولا سَوِیّة اذ تعطی الدنانیر

ترجمہ: "جب ہم قتل کیے گئے تو کوئی ہم پر رونے والا نہ تھا قریش نے کہا یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ جب نیزے سینے چھید رہے تھے تو ہمیں برابر کا شریک رکھا گیا لیکن جب دینار تقسیم کرنے کا وقت آیا تو برابر کا حصہ نہ دیا گیا۔"

---

① طبری اور دوسرے مؤرخین کہتے ہیں کہ ہاشم بن عتبہ کے ساتھ جو فوج شام سے آئی تھی وہ ساری کی ساری قادسیہ کی جنگ میں شریک نہیں ہو سکی، بلکہ اس کا ایک حصہ مسلمانوں کی فتح اور ایرانیوں کے فرار کے بعد قادسیہ پہنچا اور یہی وہ لوگ ہیں، جن کی طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس خط میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو متوجہ کیا ہے۔

Marfat.com

اور بشر بن ربیعہ نے کہا:

انخت بباب القادسیة ناقتی
وَسعد بن وقاص علی امیر
وَسَعد امیر خیره دون شرّہ
وخیرُ امیرٍ بالعراق جریر
تَذکَّر هداكَ اللّٰه وقع سیوفنا
بباب قُدَیس والمکر عسیر
عشیة ودالقوم لَو انَّ بعضهم
يُعار جناحی طائر فیطیر ①

ترجمہ: ''قادسیہ کے دروازوں پر میں نے اپنی اونٹنی بٹھائی اور سعد بن وقاص ہم پر امیر تھے اور سعد ایسے امیر ہیں جن کی بھلائی ان کی برائی سے سوا ہے اور عراق کے سب سے اچھے امیر جریر ہیں اللہ تجھے نیکی دے تو قدلیس کے دروازے پر ہماری تلواروں کی کاٹ یاد کر جب شدت ہجوم کے سبب پلٹنے کی گنجائش نہ تھی۔ وہ ایسی رات تھی جس میں لوگ چاہتے تھے کہ پرندے کے پر مستعار مل جائیں تو اڑ جائیں۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عمر اور بشیر کا پورا واقعہ اور اشعار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجے، جس کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تحریر فرمایا: ''ان کی سرفروشی کی قیمت انہیں دے دو!''

چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دونوں کو دو دو ہزار درہم دے کر خوش کر دیا۔ اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ جانباز ہونے کے ساتھ ہی ساتھ دوسروں سے کہیں زیادہ لالچی بھی ہیں۔ اس طرح قادسیہ کا یہ معرکہ، جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، شاندار فتح پر تمام ہوا، جب کہ جزیرہ نمائے عرب کے ہر گوشے کی نگاہیں اور دل اس کی طرف لگے ہوئے تھے اور ہر جگہ اس کی خبریں معلوم کرنے کے لیے ایک اضطراب، ایک بے چینی سی پائی جاتی تھی۔ مؤرخین لکھتے ہیں:

① یہ روایت طبری اور ان کے ہم خیالوں کی ہے جن کی مؤرخین میں اکثریت ہے۔ بلاذری نے عمرو کے اشعار نہیں لکھے اور بشر کے اشعار بھی سرفروشان قادسیہ کے اشعار کے ساتھ نقل کیے ہیں جو انہوں نے اپنی جنگ آزمائی کی تعریف میں کہے تھے۔ چنانچہ بشر کا دوسرا شعر بلاذری کے ہاں اس طرح پایا جاتا ہے۔

و سعد امیر شره دون خیره طویل الشذی کابی الزناد قصیر

(ترجمہ) اور سعدؓ امیر ہیں جن کی برائی ان کی بھلائی سے سوا ہے وہ تکلیف دینے میں طویل اور (قد میں) ابوالزناد کی طرح کوتاہ ہیں۔

Marfat.com

''عذیب سے لے کر عدن اور ابلہ سے لے کر بیت المقدس تک سارا عرب جنگ قادسیہ کے انجام کا منتظر تھا اور اسے اپنے ملک کے ثبات و زوال کی میزان سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ ہر علاقے سے خبریں معلوم کرنے کے لیے قاصد آئے ہوئے تھے۔'' اس سلسلے میں سب سے زیادہ فکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تھی۔ وہ روزانہ صبح ہوتے ہی قادسیہ سے آنے والے قاصد کے انتظار میں مدینے کے باہر تشریف لے جاتے اور دوپہر کو وہاں سے واپس ہوتے۔ ایک دن وہ تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک سانڈنی سوار ملا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ قادسیہ سے آ رہا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''اے اللہ کے بندے! وہاں کی کوئی خبر ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''اللہ نے مشرکین کو شکست دی!''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے ساتھ ساتھ دوڑتے جاتے تھے اور حالات پوچھتے جاتے تھے۔ وہ اونٹ پر بیٹھا ان کے سوالوں کا جواب دیتا جا رہا تھا اور انہیں جانتا تھا کہ یہ کون ہیں۔ یہ سوار سعد بن عمیلہ فزاری تھا جو امیر المؤمنین کے نام حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا پیغام لایا تھا۔ اس کے پاس ایک مکتوب بھی تھا جس میں فتح کی خوشخبری کے ساتھ ساتھ شہداء کی تعداد اور جو ان میں پہچانے جا سکے تھے ان کے نام درج تھے، جب یہ دونوں مدینہ میں داخل ہوئے اور لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنین کہہ کہہ کر سلام کرنا شروع کیا تو ابن عمیلہ نے کہا: ''اللہ آپ پر رحم کرے! مجھے یہ کیوں نہ بتلایا کہ آپ امیر المؤمنین ہیں؟''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بڑی سادگی اور بے تکلفی کے لہجے میں جواب دیا: ''میرے بھائی، کوئی بات نہیں!......'' اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا خط اس سے لے کر لوگوں کو سنایا۔

ادھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینے کے لوگوں کو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا نامہ فتح سنا رہے تھے تو ادھر یزدگرد مدائن میں شکست کی المناک خبریں سن رہا تھا۔ اسے رستم کا مشورہ رہ رہ کے یاد آ رہا تھا اور غم کی شدت اسے نڈھال کیے دیتی تھی۔ پریشانی نے اس کے دماغ کو مفلوج کر دیا تھا اور اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب وہ کیا کرے......؟ اب وہ اور سارا ایران مل کر بھی کیا کر سکتا تھا؟ مسلمان وادی عراق میں اس سرے سے اس سرے تک پھیل چکے تھے اور اہل عراق نے ان کی اطاعت بھی قبول کر لی تھی۔ وہ مسلمانوں سے یہ معذرت کر رہے تھے کہ ایران کی غلامی کا جوا انہوں نے مجبوراً اپنے کندھے پر رکھا تھا اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ ان کا دل رکھنے اور امن قائم کرنے کے لیے ان کی معذرتیں قبول فرما رہے تھے، بلکہ نہرین کے علاقے میں بکھرے ہوئے قبائل عرب نے تو ان کے

Marfat.com

پاس آ کر یہاں تک اعتراف کر لیا تھا کہ ان کے جو بھائی ان سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے ان سے زیادہ عقل مند اور سمجھ دار تھے اور اس اعتراف کے بعد ان کے سامنے اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لے آئے تھے۔

یزدگردان تمام حالات کا مقابلہ کیسے کر سکتا تھا؟ اسے یہ ساری خبریں پہنچ رہی تھیں اور اس کے رنج و غم کو اور شدید سے شدید تر کرتی چلی جا رہی تھیں۔ انتہائے یاس اس کو خودکشی کی سرحدوں پر پہنچا دیتی، اگر جوانی کا جوش اس کی نگاہوں کے سامنے امید کا ایک سراب قائم نہ رکھتا۔ یہ سراب اسے حقیقت سے بھٹکا کر اس تخت سے چمٹے رہنے پر مجبور کر رہا تھا جس سے وہ بچپن میں محروم کر دیا گیا تھا لیکن جب اس پر بیٹھا تو اس کے پائے جواب دے گئے۔ اف! کتنا خطرناک ہے وہ سراب جو امید کو یقین کے روپ میں پیش کرنے یا تقدیر کے اندھے کنوئیں میں دھکیل دے۔

یہ ہے قادسیہ کا وہ معرکہ جس نے ایران کے پایہ تخت میں ایوان کسریٰ کا رستہ کھول دیا اور اس کے اقتدار حکومت پر آخری ضرب لگانے کے لیے زمین ہموار کر دی۔ چنانچہ جتنی تفصیل سے سیرت کی کتابوں میں غزوۂ بدر کا ذکر پایا جاتا ہے اتنی ہی تفصیل سے مؤرخین نے اس معرکے کا ذکر کیا ہے اور اس کے ذیل میں ایسے مافوق الفطرت واقعات درج کیے ہیں جن کی تصدیق صرف وہ دیرپا اثر ہی کر سکتا ہے جو ان شیران بیشہ شجاعت نے دنیا کی تاریخ پر ڈالا ہے اور صرف مؤرخین اسلام ہی نہیں بلکہ مستشرقین اور ایرانی مؤرخین نے بھی اس جنگ کے بیان میں درازنفسی سے کام لیا ہے۔ ہمیں مؤرخین کی اس غیر معمولی توجہ پر متعجب نہیں ہونا چاہیے کہ قادسیہ جنگ انسانیت کی تاریخ پر تیمور لنگ اور نپولین کی معرکہ آرائیوں بلکہ ان تمام جنگوں سے زیادہ اثر انداز ہوئی ہے جو آج تک دنیا میں لڑی گئیں اور جن کا انسانی تہذیب کو نئے رستے پر ڈالنے میں بڑا ہاتھ ہے۔

بلاشبہ مؤرخ کا یہ فرض ہے کہ وہ قادسیہ جیسے اہم معرکے پر توقف کرے، اس کے رموز و اسرار کے چہرے سے نقاب اٹھائے اور جو عبرتیں اس کے دامن میں پوشیدہ ہیں، انہیں چن چن کر دنیا کے سامنے رکھے۔ حضرت خالد بن ولید نے سواد عراق فتح کیا۔ جنوب سے لے کر شمال تک اس کی زمین کو اپنے ظفر مند قدموں سے ناپا اور اس کے شہر و دیہات پر قبضہ کر کے سارے ملک کو اسلام کا مطیع و منقاد بنا دیا۔ ایرانیوں سے تیغ آزمائی کے دوران حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایسے ایسے معجزانہ کارنامے سرانجام دیے ہیں جو آج تک تاریخ کے صفحات کا قیمتی سرمایہ ہیں تو کیا حضرت خالد رضی اللہ عنہ ان پر اس لیے فتح یاب ہوئے کہ ایرانی دربار ان دنوں تشتت و اضطراب کے

چنگل میں پھنسا ہوا تھا۔ امرائے عجم حصول تخت کے لیے باہم دست و گریبان تھے اور ان میں خفیہ و علانیہ قتل وخون کی لے اتنی بڑھ گئی تھی کہ چار برس کی مختصر سی مدت میں نو بادشاہ تخت پر بیٹھے؟ اگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی فتح کے صرف یہی اسباب تھے تو قادسیہ کے مردان کار نے ایرانیوں کو شکست کیسے دی جب کہ افتراق و پراگندگی کے بعد ایرانیوں میں دوبارہ اتحاد و یک جہتی کی شان پیدا ہوگئی تھی اور ان کے خواص و عوام دونوں یزدگرد کے جھنڈے تلے جمع ہو کر متفقہ طور پر اس کی مدد کر رہے تھے۔

ہاں...... اسبب زائل ہونے کے بعد مرض کیسے باقی رہ گیا تھا اور مسلمان اپنی قلت تعداد کے باوجود کثیر التعداد ایرانیوں پر کیسے غالب آگئے تھے، جب کہ ایرانی اپنے ملک میں تھے اور سامان جنگ کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن کا بھی وافر سرمایہ ان کے پاس تھا۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے وطن سے کوسوں دور اور ایرانیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ غیر متمدن تھے، ان کے پاس وہ سامان جنگ بھی نہ تھا جو ان کے دشمن کے پاس تھا اور وہ جنگ کے ان طریقوں سے بھی ناآشنا تھے جن سے ایرانی اچھی طرح واقف تھے۔

اس میں راز یہ ہے کہ ایرانیوں کا یہ اتحاد ان کے ذہن میں کوئی انقلاب برپا نہ کر سکا تھا۔ وہ صرف ایک سطحی جذبہ تھا جو ہنگامی ضرورتوں نے پیدا کر دیا تھا۔ دلوں کی گہرائیوں میں اس وقت بھی بیگانگی و پراگندگی ہی تھی، ہر امیر اور ہر سردار اس وقت بھی وطن سے پہلے اپنی ذات اور اپنے مفاد ہی کے لیے سوچ رہا تھا بفرض محال اگر وہ اس وقت عربوں پر غالب آ بھی جاتے اور انہیں اپنے ملک سے نکال بھی دیتے تو بھی ان کی حالت پھر وہی ہو جاتی۔ ایرانی دربار دوبارہ تشتت و افتراق کی آماجگاہ بن جاتا اور ذاتی اغراض اپنے سوا ہر مفاد پر ہلہ بول دیتیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ رستم جنگ سے کیسا ہچکچا رہا تھا اور اگر اسے یہ خوف نہ ہوتا کہ اس کی جگہ یزدگرد کے جنگ پر جانے سے عوام اس کے خلاف بغاوت کر دیں گے تو وہ کبھی فوج لے کر نہ نکلتا؟

کیا آپ کی نظر سے نہیں گزرا کہ رستم اور ایران کے دوسرے فوجی افسروں نے کتنی سست رفتاری سے کام لیا۔ اور مدائن سے قادسیہ پہنچنے میں چار مہینے لگا دیئے؟

حقیقت یہ ہے کہ رستم نے ستاروں میں وہی کچھ دیکھا جو اس کے دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ تھا۔ اپنی ذات کی محبت اس پر غالب آ گئی تھی۔ اس لیے وہ شکست کھانا یا قتل ہونا پسند نہیں کرتا تھا، دراصل اپنی شکست اور قتل کا یہی خوف تھا جو اسے ستاروں میں وطن کی بدانجامی بن کر نظر

Marfat.com

آیا۔ اگر وہ ایران کی قدر و قیمت پہچانتا اور اپنی ذات کو فراموش کر کے اپنی زندگی اور موت وطن کے لیے وقف کر دیتا تو پس و پیش اور سست رفتاری سے ہرگز کام نہ لیتا نہ اسے ستاروں میں وہ کچھ نظر آتا، جو نظر آیا، اس کی روح ہر طرح کے خوف اور اندیشے سے بلند ہو جاتی اور فوج کے افسروں و سپاہیوں میں سرایت کر کے انہیں اتنا جری بنا دیتی کہ وہ بے دھڑک موت کے جبڑے میں انگلیاں ڈال دیتے لیکن فوج کے افسر اور سپاہی بھی رستم کی اپنی ذات سے چمٹے ہوئے تھے اور ڈرتے تھے کہ انہیں کسی قسم کی گزند نہ پہنچ جائے۔ چنانچہ انہیں اپنی زندگی ایران اور اس کے واجبات سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ وہ اگر میدان جنگ کی طرف جا بھی رہے تھے تو صرف اس لیے کہ سرداروں کو ان کی اغراض و خواہشات ہانک رہی تھیں اور سپاہیوں کو ذلت و اطاعت کی وہ زنجیریں گھسیٹ رہی تھیں جن میں وہ مدت دراز سے جکڑے ہوئے تھے تو کیا اتحاد کی ہنگامی ضرورتیں ان پوشیدہ عوامل کو موت کی نیند سلانے کے لیے کافی ہو سکتی ہیں، جو دلوں میں اچھی طرح جڑ پکڑ چکے ہوں اور جن کی بنا پر افراد میں خود غرضی اور جماعت میں مصلحت پرستی کے سوا اور کوئی جذبہ باقی نہ رہا ہو؟

یہ انہی عوامل کا اثر تھا جس نے ایرانی ذہن کو اس بلند نصب العین سے محروم کر دیا تھا جس کے لیے کوئی قوم جیتی ہے اور جس کی راہ میں وہ جان کی بازی لگا دیتی ہے اور جب کسی قوم کو اتحاد کی لڑی میں پرونے والا کوئی ایسا بلند نصب العین نہ ہو جس کی تبلیغ و اشاعت اور جسے حاصل کرنے کی پرخلوص تمنا ہی اس قوم کا مقصد حیات ہوتی ہے تو پھر اسے جنگ پر آمادہ کرنے والی صرف دو چیزیں رہ جاتی ہیں۔ حب ذات اور خواہش حیات! اور یہی حال اس زمانے میں امرائے عجم بلکہ خود یزدگرد کا تھا، حب ذات نے ایک طرف تو یزدگرد کے دل میں وطن کی عزت سے زیادہ تخت کی طلب پیدا کر دی تھی اور دوسری طرف امرائے عجم کو اپنی خواہشوں کا اتنا زبردست پجاری بنا دیا تھا کہ وہ دوسرے ہر مقصد اور ہر غرض کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ یہی دو فطرتی ایران کے ایک ایک فرد میں سرایت کر گئی تھی اور تمام ایرانی ذلت کی زندگی پر قانع ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود جب انہوں نے رومیوں کو شکست دے کر مصر و شام ان سے چھینے تو اپنے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے اور انہیں یہ خیال نہ رہا کہ روم بھی ایران کی طرح زوال و انحطاط کی منزلوں سے گزر رہا ہے اور اس کے بعد جب رومیوں نے ان پر دوبارہ غلبہ حاصل کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے لی کہ جنگ میں فتح و شکست تو ہوتی ہی رہتی ہے اور اس حقیقت کی طرف ان کا دھیان نہ گیا

صحت مند قوت کبھی شکست نہیں کھاتی اور جب شکست کھاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں کوئی روگ ضرور پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ ایرانیوں نے اول اول اسلامی حملوں کی خبریں سنیں تو انہیں کوئی اہمیت نہ دی اور یہ سمجھا کہ عرب جلد ہی ایران کے نام سے ہیبت زدہ اور اس کی قوت سے مرعوب ہو کر اپنے ملک واپس چلے جائیں گے لیکن جب مسلمانوں کے قدم برابر آگے بڑھتے چلے گئے تو ان کی آنکھیں کھلیں، لیکن اب وہ آنکھیں اپنی مسلسل شکستیں اور اپنے ملک کا پیہم زوال دیکھ رہی تھیں۔

جس لشکر کی معنوی قوت اس حد تک کمزور پڑ چکی ہو، بھلا وہ اس لشکر کے سامنے کیسے ٹھہر سکتا ہے جس کی روح توانائی کے نقطہ کمال پر ہو جو ایک اعلیٰ نصب العین کی خاطر جہاد کر رہا ہو اور موت کو اس کی راہ میں شہادت سمجھتا ہو، جو اسے پروردگار عالم کا قرب عطا کرے گی اور جنت کے دروازے اس پر کھول دے گی۔ جہاں وہ اللہ کی خوشنودی اور ابدی نعمتوں سے سرفراز ہو گا۔ مسلمانوں کا اتحاد اس نصب العین کی اساس پر قائم تھا اسی لیے انہوں نے اپنی جانیں اللہ کی راہ میں وقف کر رکھی تھیں اور اسے حاصل کرنے کے لیے موت کو زندگی پر ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ وہ تقدیر کی قوتوں میں سے ایک قوت تھی جو انسانیت کو سیدھی اور سچی راہ پر چلانے کے لیے پیدا کی گئی تھی اور جس کے دامن میں ایک ایسا پیغام تھا جسے سنے بغیر کائنات اپنے وجود کو برقرار نہ رکھ سکتی تھی۔ ایسی قوت کی راہ میں نہ بڑے سے بڑا اقتدار حائل ہو سکتا ہے نہ اس کے پیغام کی اشاعت میں بڑی سے بڑی طاقت روک بن سکتی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ ایرانیوں کے دیو پیکر ہاتھی بھی اس قوت کے سامنے نہ ٹھہر سکے، اہل عجم کی صفیں درہم برہم ہو گئیں اور وہ مجاہدین اسلام کے خوف سے میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اب اس پیغام کی اشاعت کے راستے کھل گئے تھے۔ لوگوں نے اس کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا تھا اور سمجھ گئے تھے کہ اس پیغام کا ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف حق کی قوت کی مکمل تصویر ہے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ باطل پر مسلسل ضربیں لگا رہا ہے اور باطل بھاگا چلا جا رہا ہے۔ بیشک باطل نیست و نابود ہی ہونے کے لیے ہے۔

یہ ہے جنگ قادسیہ میں مسلمانوں کی ایرانیوں پر کامیابی کا راز۔ لیکن اس سے جو عبرت حاصل ہوتی ہے اس کی بہترین تفسیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ۔

Marfat.com

ترجمہ: ''بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا تاوقتیکہ وہ خود اپنی حالت میں تبدیلی پیدا نہ کرے۔''

اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر مسلمانوں کے ایمان نے ان کے اندر ایک انقلاب برپا کر دیا تھا اور انہیں اس حق کی راہ دکھائی تھی جس کی اساس پر اعلیٰ تہذیب کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ انہوں نے اسلام کا کلمہ بلند کیا اور اسلام نے انہیں سربلندی عطا کی، لیکن رومی اور ایرانی زندگی کی ادنیٰ مسرتوں اور بے قیمت نعمتوں کے پیچھے دوڑتے رہے اور انہوں نے ان اعلیٰ تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا جو انسانی زندگی کی قیمت اور معنویت کی ضامن ہیں۔ چنانچہ اس جرم کی فطری سزا انہیں یہ ملی کہ وہ ذلت و نکبت کے گہرے غار میں دھکیل دیئے گئے اور ان کی ظاہری شان و شوکت انہیں تباہی و بربادی سے نہ بچا سکی۔

اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لا کر مسلمانوں نے اپنے آپ کو بدل لیا۔ اور وہ اس بلند نصب العین کے گرد جمع ہو گئے جو اللہ نے اپنے رسول ﷺ کے ذریعے انہیں بخشا تھا۔ اپنے اس اجتماع کی برکت سے وہ ''ایک امت'' بن گئے اور اس امت میں ان کے ہر فرد کو وہی حیثیت حاصل ہو گئی، جو حیثیت جسم میں اعضائے جسم کی ہوتی ہے کہ ہر عضو کی اپنی قوت کوئی نہیں بلکہ پورے جسم کی قوت اس کی قوت ہے۔ اس طرح اس امت کا ہر مرد اور ہر عورت ایک قوت میں تبدیل ہو گئے جو اپنے اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے میدان جنگ میں کودنا جانتے تھے اور انہیں اتنی بلندی حاصل ہو گئی تھی کہ ضعف و پسپائی اور شکست و ناکامی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، بلکہ ہزیمت کی پستی پر شریفانہ موت کو ترجیح دیتے تھے۔

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ طلیحہ بن خویلد اسدی ارتداد کی جنگوں میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مقابلے پر کتنے کمزور تھے، لیکن قادسیہ کی لڑائی میں ایرانیوں کے مقابلے پر کتنے قوی ہو گئے اور کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ عمرو بن معدی کرب اور اشعث بن قیس اپنے زمانہ ارتداد میں اسلامی لشکر کے سامنے کس طرح شکست کھا کر بھاگے تھے، لیکن قادسیہ کی جنگ میں انہوں نے کیسی شجاعت، جواں مردی کا مظاہرہ کیا کہ یاد رکھنے والے انہیں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب طلیحہ نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، وہ قوی الجثہ مگر ضعیف الایمان تھے اور ان کی جسمانی قوت ان کے ضعف ایمان کی تلافی نہ کر سکی۔ یہی حال عمرو بن معدی کرب، اشعث بن قیس اور ان سب لوگوں کا تھا جنہوں نے مرتد ہو کر مسلمانوں سے جنگ کی تھی۔ لیکن جب وہ دوبارہ ایمان

لائے اور اس امت کا ایک جزو بن گئے تو اس ایمان نے ان کی قوتوں کو دو چند کر دیا۔ چنانچہ قادسیہ میں جو کارہائے نمایاں انہوں نے سرانجام دیئے وہ تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ لیکن قادسیہ کے بعد بھی ان کی ذات سے شرف وشجاعت کے ایسے ایسے کارنامے ظہور میں آئے ہیں جو تاریخ کے صفحات کا غیر فانی سرمایہ ہیں۔

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس جسم میں دماغ کی حیثیت رکھتے تھے جو عوام کی بھلائی کے لیے عوامی امور ومسائل کی تدبیر فرماتے تھے اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچانا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تقلید فرمائی۔ عدل وانصاف کو میزان حکومت بنانے، امت کے ہر فرد کو اپنے اوپر ترجیح دینے اور امت کی بھلائی کے لیے بڑے سے بڑا ایثار کرنے میں وہ ایک مثالی کردار تھے۔ انہوں نے مصلحت اسی میں پائی کہ قادسیہ کے مال غنیمت کا خمس بھی مجاہدین میں تقسیم کر دینا چاہیے اور حکم دے دیا کہ خمس مدینہ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ اسلامی فوج میں تقسیم کر دیا جائے۔

انہوں نے محسوس کیا کہ جنگ قادسیہ میں جرأت وسرفروشی کا مظاہرہ کرنے والے انعام کے مستحق ہیں اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ہدایت فرمادی کہ انہیں انعام دے دیئے جائیں۔ انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں سے بدعہدی کرنے والے اہل عراق کی معذرت قبول کر لینی چاہیے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ "معذرت طلب کرنے والوں کی معذرت قبول کر لو۔"

اہل مدینہ نے ان میں سے کسی بات پر ناراضگی کا اظہار نہیں کیا، حالانکہ مال غنیمت کا جو خمس مجاہدین میں تقسیم کیا گیا تھا اس میں ان کا بھی حصہ تھا۔ لیکن وہ ناراض ہو بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ امیر المؤمنین تمام اسلام کی بھلائی چاہتے ہیں، ہر بڑے سے بڑے اور نازک سے نازک مسئلے میں ان سے مشورہ کرتے ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ اسلام کی بھلائی ہی ان سب کی بھلائی اور ایثار و بےنفسی منجملہ اوامر الٰہی ہے۔ اس لیے انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سیاست سے اتفاق کرتے ہوئے ان کے ساتھ تعاون کیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کا دوگنا اور چوگنا صلہ انہیں عطا فرمایا۔

یہ ہیں قادسیہ کے چند رموز ونکات اور نصیحت وعبرت کے کچھ پہلو! یہ نکتے اور یہ عبرتیں ہی ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اسلامی سلطنت کی تعمیر کی اور اس کے شرف وعظمت کو مادی شکل وصورت دی اس لیے ہمیں اس سلطنت کے معماروں اور اس عظمت کے علم برداروں

کے پیچھے پیچھے چلنا چاہیے کہ اب وہ بہت جلد مدائن کی طرف روانہ ہو کر اسے فتح کرنے والے ہیں جس کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ ایوان کسریٰ میں نزول اجلال فرمائیں گے اور اس کا مالک ایک الوداعی نظر ڈال کر ہمیشہ کے لیے اس سے رخصت ہو جائے گا۔ ①

⊙❀⊙

① قادسیہ کی جنگ کب ہوئی؟ اس میں مؤرخین کا اختلاف ہے۔ ابن خلدون کا بیان ہے، ''قادسیہ کا معرکہ ۱۴ھ پیش آیا۔'' لیکن بعض کے نزدیک یہ سنہ ۱۵ھ کی بات ہے اور بعض کے نزدیک سنہ ۱۶ھ کی۔ ابوالفداء کا کہنا ہے کہ یہ جنگ سنہ ۱۵ھ میں ہوئی تھی اور میں اسی کو صحیح سمجھتا ہوں اس لیے کہ یہ لڑائی یرموک، فتح دمشق اور معرکہ فحل کے بعد پیش آئی ابوعبید اس سے پہلے مثنیٰ کی مدد کے لیے بھیجے جا چکے تھے اور نمارق، جسر اور بویب کی لڑائیاں برپا ہو چکی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا لشکر مرتب فرما کر روانہ کیا تھا تو اس کی رفتار بہت سست تھی کیونکہ اس میں بہت سے قبائل اپنے بال بچوں سمیت شریک تھے، قادسیہ جانے سے پہلے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کئی مہینے تک عذیب میں اقامت فرما رہے اور قادسیہ میں بھی جنگ ہونے سے پہلے کم از کم دو مہینے انہوں نے قیام فرمایا۔

Marfat.com

باب 9:

فتح مدائن

قادسیہ کے بعد ایرانی دُم دبا کر بھاگے۔ ان کی بڑی تعداد تو بابل کے کھنڈروں میں پہنچ گئی اور جو باقی بچے وہ ایران کے مختلف حصوں میں تتر بتر ہو گئے۔ مسلمانوں نے قادسیہ میں دو مہینے قیام کیا، یہاں تک کہ ان کی تکان اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بیماری دور ہو گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا کہ جب تک میرا حکم نہ پہنچے قادسیہ نہ چھوڑنا۔ چنانچہ جب فوج کی طرف سے اطمینان ہو گیا اور کمک بھی روانہ کر دی، تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو مدائن جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ بال بچوں کو عتیق میں چھوڑ کر معتدبہ فوج ان کی حفاظت پر مامور کر دینا اور محافظین کو ان کی خدمت کے عوض مال غنیمت میں سے برابر کا حصہ دینا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے زہرہ بن حویہ کو پہلے روانہ کر دیا اور وہ حیرہ جا کر اترے۔ پھر جب عبداللہ بن معتم اور شرجیل ابن سمط وہاں پہنچے تو زہرہ مدائن روانہ ہو گئے۔ رستے میں برس [1] کے مقام پر ایرانیوں کی ایک جماعت سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی۔ زہرہ نے انہیں شکست دی اور وہ بھاگ کر بابل میں قادسیہ کے بھگوڑوں سے جا ملے۔ زہرہ کو معلوم ہوا کہ قادسیہ کے شکست خوردہ بابل میں ہیں۔ انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اطلاع بھیجی جو اس وقت ہاشم بن عتبہ کے ساتھ حیرہ میں قیام پذیر تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بابل کے ارادے سے چلے۔ رستے میں فیروزان سے مقابلہ ہوا اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے آن کی آن میں اسے شکست دے دی۔ فیروزان نہاوند بھاگ گیا۔

---

① برس: بابل کے قریب ایک نیستان ہے جسے بعض مورخین برالنمرود" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ علامہ بلاذری احمد بن کوفی سے روایت کرتے ہیں: "برس کا نیستان بابل میں قصر نمرود کے قریب ہے۔ نیستان میں ایک بہت گہرا گڑھا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ قصر نمرود کے لیے مزدوروں نے مٹی یہاں سے کھودی تھی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں زمین دھنس گئی تھی۔"

ہرمزان نے اہواز میں پناہ لی اور مہران نے مدائن میں سر چھپایا۔ مسلمانوں کا لشکر آگے بڑھا کوثیٰ کے مقام پر اس کا سامنا شہریار سے ہوا۔ مسلمانوں نے شہریار کو قتل کر دیا اور اس کے ساتھیوں کو مار بھگایا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے شہریار کی پوشاک اور ہتھیار اس شخص کو دے دیئے جس نے اسے قتل کیا تھا۔ زہرہ بن حویہ ساباط کی طرف بڑھے اس کے باشندوں نے جو یہ سنا کہ یہ وہی لشکر ہے جس نے سورا اور دیرا کے درمیان سدراہ ہونے والی ایرانی فوج کو شکست دی تھی اور اس کے افسروں کو قتل کر دیا تھا تو جزیے پر صلح کر لی۔ اس طرح اسلامی لشکر سواد کے مختلف حصوں سے گزرتا رہا اور اسے کوئی قابل ذکر مزاحمت پیش نہ آئی۔ اطراف ملک سے لوگ دوڑ دوڑ کے آ رہے تھے اور لشکر کے سرداروں کی خدمت میں حاضر ہو کر اطاعت قبول کر رہے تھے۔ ان میں سے کچھ تو مسلمان ہو جاتے اور کچھ جزیہ دینے پر رضامندی کا اظہار کرتے۔ غرض یہ کہ وہ سب کے سب ان لوگوں کے حلقہ تسلیم واطاعت میں آ گئے، جنہوں نے ان پر غالب آ کر ان میں عدل وانصاف قائم کیا تھا، لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے شام چلے جانے کے بعد انہیں وہاں سے نکال دیا گیا تھا۔ اب وہی لوگ پھر ان کے پاس آئے ہیں اور ایسی قوت لے کر آئے ہیں جس کے مقابلے میں انہیں دوبارہ نکال باہر کرنے کی ہر امید ایک بے تعبیر خواب بن کر رہ گئی ہے۔ انہیں اب نکالے گا بھی کون؟ رستم مارا جا چکا ہے اور ایرانیوں کی معنوی قوت بے جان ہو چکی ہے! پھر تو مشیت الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم ہی کر دینا چاہیے جسے نہ کوئی بدل سکتا ہے نہ اس پر غالب آ سکتا ہے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ خود بابل میں ٹھہرے اور زہرہ بن حویہ کو مدائن جانے والے لشکر کا سردار بنا کر روانہ کر دیا۔ آپ کے خیال میں کیا بابل کے کھنڈروں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور ان کی فوج کے حافظے میں اس قدیم شہر کی یاد تازہ کر دی تھی جو کبھی طیبہ، منفس اور فراعنہ مقتدمین کی تہذیب کا مرکز رہا تھا اور کیا انہوں نے اپنی چشم تصور سے ان اشوریوں کی تہذیب اور عقائد کو دیکھا تھا جن کے عہد میں بابل اپنی بلند فصیلوں، عظیم الشان عبادت گاہوں، مستحکم برجوں، معلق باغوں اور حسین وجمیل محل سراؤں کی بنا پر نعمت وشوکت اور حسن ورعنائی کا گہوارہ بنا ہوا تھا؟ بلاشبہ انہوں نے بابل کا برج یاد کیا اور ان قوموں کی تصویر اپنے ذہن میں کھینچی جو وقتاً فوقتاً اس شہر پر حملہ آور ہوتی رہیں، یہاں تک کہ بابل ان مختلف زبانوں کا مرکز ہونے کے اعتبار سے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا جو وہاں پہنچنے والے قیدی اور فاتحین بولتے تھے۔ لیکن بابل کے برج اور خود شہر کا یہ ذ

غالباً اِدھر اُدھر کی باتوں ہی میں ہوتا تھا اس لیے کہ اس وقت مسلمانوں کی تمام تر توجہ فتح مدائن کی طرف مرکوز تھی۔ مدائن ایک آباد اور بھرا پرا شہر تھا، لیکن بابل کھنڈروں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مدائن، ایران کا پایہ تخت تھا، لیکن بابل نہ اب پایہ تخت رہا تھا۔ نہ شہر، مدائن زندگی کا عنوان تھا لیکن بابل بیتے ہوئے دنوں کا ایک فرسودہ نقش۔ اور انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ حال ہی سے چمٹا رہتا ہے، ماضی سے بہت کم عبرت حاصل کرتا ہے۔ اکثر و بیشتر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ زندگی کے مسکراتے چہرے کو دیکھنے والے عبرت کی جستجو نہیں کرتے اور جب زندگی تیوری چڑھا کر ان کی طرف سے منہ پھیر لیتی ہے تو گذشتہ زمانے کی دل فریبیوں میں کھو جاتے ہیں کہ شاید ماضی کی خوشگوار یاد ہی حال کے زخموں کا مرہم بن جائے۔ زمانہ اس وقت مسلمانوں پر ہر طرح مہربان تھا پھر انہیں کیا غرض پڑی تھی کہ وہ بابل اور اشوریوں کی یاد میں الجھے رہتے جو اب ایک داستان پارینہ بن چکے تھے۔ انہیں تو اپنے چاروں طرف بھرپور زندگی، قیمتی خزانے اور وہ قومیں بکھری نظر آ رہی تھیں جو ان کا نام سنتے ہی اطاعت کیشی اور معذرت طلبی کے لیے دوڑی چلی آتی تھیں۔

بلکہ بابل کو دیکھ کر انہیں مسلمانوں کے وہ کارنامے یاد آ گئے جب مثنیٰ بن حارثہ نے اس کے ٹیلوں پر چھاؤنی بنائی تھی اور دجلہ کی نہروں کے بچھے ہوئے جال میں قیام کر کے ہرمز جادویہ اور اس کے حملے کا انتظار کیا تھا، ان لوگوں نے اس خطرناک صورت حال کو یاد کیا جو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے شام چلے جانے اور شہریران بن اردشیر کے تخت نشین ہونے کے بعد دفعتاً پیش آ گئی تھی جب اس نے مسلمانوں کو اپنے ملک سے نکالنے کا پختہ ارادہ کیا تھا کہ مثنیٰ نے ہرمز کے ہاتھی کو کس طرح قتل کیا تھا اور ایرانیوں کو شکست دے کر ان کا پیچھا کرتے ہوئے کس طرح مدائن تک جا پہنچے تھے جو لوگ اس معرکے میں شریک تھے، اس کا ذکر انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینے سے آنے والوں اور ان لوگوں سے کیا جو عرب کے مختلف گوشوں سے آ کر اس لشکر میں شامل ہو گئے تھے اور انہیں بتایا کہ یہ سرزمین، جس کی حسین نزہت گاہوں، ہرے بھرے کھیتوں اور لدے پھندے باغوں سے وہ اس وقت گزر رہے ہیں، ان کے زیر اقتدار آ چکی ہے؟ اس کی نعمتوں سے وہ خود بھی متمتع ہو چکے ہیں اور جس قدر بھیج سکتے ہیں، مدینہ بھی بھیج چکے ہیں۔

بابل اور دوسرے وہ تمام مقامات جنہیں آج مسلمان طے کر رہے تھے، اگر بتمامہ نہیں تو جزوی طور پر ضرور مسلمانوں کے دائرہ فتح و حکومت میں شامل ہو چکے تھے۔ چنانچہ قادسیہ ان کے ہاتھ میں تھا اور حیرہ کو وہ اپنا مستقر حکومت بنا چکے تھے اور مدائن ان کے حوصلوں کی زد میں تھا۔ جو

Marfat.com

مقامات آج ان کی گزرگاہ تھے، ان میں سے بیشتر ایسے تھے جہاں مسلمانوں نے نعمت وفراغت کی زندگی بسر کی تھی اور کل اور آج میں اگر کوئی فرق تھا تو بس اتنا کہ کل وہ ان پر حکمران تھے اور آج وہ ان کی نئی فتوحات کا میدان تھے جن سے وہ یکے بعد دیگرے گزر کر ساباط اور مدائن کی طرف بڑھ رہے تھے اور اس اطمینان کے ساتھ بڑھ رہے تھے کہ عراق کے باشندوں کی قوت مقابلہ کمزور ہو جانے کی وجہ سے اب فتح اتنی مشکل نہیں رہی جتنی پہلے تھی۔

زہرہ بن حویہ اور ہاشم بن عتبہ مدائن کے ارادے سے نکلے۔ بہرشیر کے قریب ساباط میں ان کا سامنا پوران بنت کسریٰ کے شاہی رسالے سے ہوا جس کے سپاہی روزانہ اس بات کی قسم کھاتے تھے کہ جیتے جی ایران کی حکومت پر زوال نہ آنے دیں گے۔ اس رسالے کے ساتھ ایک شیر بھی تھا جو کسریٰ سے بہت مانوس تھا، لیکن یہ رسالہ بھی مسلمانوں کے سامنے برس اور بابل کی ایرانی فوجوں سے زیادہ نہ ٹھہر سکا اور وہ ٹھہر بھی کیسے سکتا تھا جب کہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس شیر کا انجام بھی وہی ہوا جو قادسیہ کے ہاتھیوں کا ہوا تھا۔ ہاشم بن عتبہ نے تلوار کے ایک ہی وار میں شیر کا کام تمام کر دیا۔ یہ دیکھ کر ایرانی سپاہی بہرشیر میں پناہ لینے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اتنے میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ بھی آ پہنچے۔ انہیں جب اپنے بھتیجے کی شیر افگنی کا علم ہوا تو اس جواں مردی پران کی پیشانی چوم لی۔۔۔ ہاشم نے بھی اپنے چچا کی اس شفقت ومہربانی کے جواب میں ان کی قدم بوسی کی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے آسمان کی طرف رخ کر کے اللہ کا شکر ادا کیا اور مدائن کی طرف دیکھ کر یہ آیت پڑھی:

اَوَلَمْ تَكُونُوٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَالَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۝ (ابراہیم:۴۴)

ترجمہ: کیا تم نے پہلے قسم نہیں کھائی تھی کہ تمہارے لیے زوال نہیں ہے۔"

رات کے ابتدائی حصے میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مدائن کے متعلق سوچنا شروع کیا: انہیں فوج کی فاتحانہ اولوالعزمی اور مدائن پر ہجوم کرنے کے شوق بے تاب سے فائدہ اٹھا کر فوراً حملہ کر دینا چاہیے یا کچھ دن ستانے کے بعد آگے بڑھنا چاہیے، لیکن۔۔۔ مدائن اب دور ہی کتنا رہ گیا ہے اگر خواہ مخواہ توقف کیا گیا تو اہل مدائن کا جذبہ مدافعت قوی ہو جائے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ پہلی فرصت میں حملہ کر دیا جائے۔ چنانچہ تھوڑی رات گئے لشکر کو روانگی کا حکم دیا اور بہرشیر پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا۔

بہرشیر مدائن ہی کا ایک حصہ تھا۔ وہ دریائے دجلہ کے دائیں کنارے واقع تھا اور مدائن اس

Marfat.com

کے بالکل سامنے بائیں کنارے۔ اوراس طرح اگر چہ دریا ان دونون کو ایک دوسرے سے جدا کررہا تھا۔ پھر بھی تھا وہ مدائن ہی کا ایک حصہ۔ مدائن بغداد کے جنوب میں بیس میل کی مسافت پر آباد تھا اور بغداد کی حیثیت ان دنوں محض ایک بستی کی سی تھی جسے دجلہ کی دوسری بستیوں پر کوئی امتیاز حاصل نہ تھا۔

مدائن مدتوں سے ایران کا دارالسلطنت چلا آرہا تھا۔ وہ اگر چہ بابل کے بہت بعد آباد ہوا تھا، لیکن حسن ورونق اور عظمت وجلال میں اس سے کہیں آگے نکل گیا تھا۔ کئی بار رومیوں نے اس پر قبضہ کیا اور کئی بار اندرونی بغاوتوں نے اس امن وسکون کو بدامنی و بے چینی سے بدلا، لیکن اس کے جلال و جمال میں کوئی فرق نہ آیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تمام دنیا کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا اور اس کے نام میں انسانی ذہن کے لیے جو ساحرانہ کشش تھی وہ روم اور قسطنطنیہ کے نام میں بھی نہ تھی۔ وہ مشرق کی عیش آرائیوں اور عشرت کوشیوں کا ایک مکمل نمونہ تھا جس میں خداوندان فن اور شیاطین شعر کے لیے خیال انگیزی اور مضمون آفرینی کا پورا پورا سامان موجود تھا۔ ایسے شہر کی طرف، جس کی خصوصیات یہ ہوں، کوئی تعجب نہیں اگر مسلمانوں کے قدم اس نظارے کے شوق میں، جسے آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا، تیزی سے بڑھ رہے ہوں، اور کوئی تعجب نہیں اگر یہ تصور ان کی شجاعت وحماست کو مہمیز کررہا ہو کہ جس چیز کو وہ آج تک خیال کی آنکھ سے دیکھتے رہے ہیں اب ایک زندہ حقیقت بن کر ان کی نگاہوں کے سامنے ہوگی۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ بہر شیر کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کا لشکر شجاعت وجواں مردی کے جذبات سے سرشار تھا۔ چنانچہ جب وہ بہر شیر کے قریب پہنچ کر رکا تو فضا تکبیر کے نعروں سے گونجنے لگی۔ لیکن شہر والے فصیل کے دروازے بند کرکے بیٹھ رہے تھے جس کی وجہ سے حملے کی کوئی صورت اور محاصرے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا تھا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے محاصرہ کرلیا اور اس اندیشے سے بے پروا ہوکر کہ ایرانی پشت کی طرف سے حملہ نہ کردیں۔ فوج کو دجلہ وفرات کے درمیانی علاقے میں غارت کا حکم دے دیا۔ ایک لاکھ کسان گرفتار کرکے لائے گئے۔ جن سے مسلمانوں نے اپنے چاروں طرف خندق کھدوائی۔ لیکن یہ کسان تیغ آزمائی اور تیراندازی سے ناآشنائے محض تھے۔ اس لیے انہیں قید کرنے سے کوئی فائدہ تھا نہ چھوڑ دینے میں کوئی نقصان۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ساباط کے جاگیردار شیرزاد کے مشورے سے انہیں ان کی زمینوں پر واپس بھیج دیا تاکہ وہ کھیتی باڑی کرکے

Marfat.com

زیادہ سے زیادہ غلہ پیدا کریں۔اس کی اطلاع حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بارگاہ خلافت میں بھیجی اور امیر المومنین نے شیرزاد کے مشورے کی توثیق فرمادی۔اہل سواد کو ساحل دجلہ سے سرزمین عرب تک امان دے دی گئی اور وہ کھیتی باڑی کرنے لگے۔زمینداروں نے مسلمانوں کو جزیہ اور خراج ادا کر کے کسانوں کے امن وسکون میں اور اضافہ کردیا۔حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بہرشیر کا محاصرہ جاری رکھا۔پشت کی طرف سے حملے کا انہیں کوئی اندیشہ نہ تھا۔کیونکہ اپنی فوج کی قوت کی طرف سے وہ مطمئن تھے۔

مسلمان منجنیقیں نصب کر کے اندرون شہر پتھراؤ کرنے لگے،ایرانی اس سے پریشان نہ ہوئے انہیں یقین تھا کہ اگر حملہ آوروں کو شہر سے پسپانہ کیا گیا تو ان کے لیے دارالسلطنت کے راستے کھل جائیں گے اور مدائن مزید خطرے میں پڑ جائے گا۔پھر بہرشیر کی مدافعت ایسی دشوار بھی نہ تھی۔اس کے قلعے مضبوط اور دیواریں مستحکم تھیں۔دجلے کا پل اسے مدائن سے ملاتا تھا اور اس پل کے راستے ایران کے مختلف گوشوں سے بے شمار امداد اور بے انتہا سامان غذا اہل شہر کو پہنچ رہا تھا،اس لیے وہ کئی مہینے تک محاصرہ برداشت کرتے رہے۔محاصرہ کی مدت میں مؤرخین کا اختلاف ہے کوئی اسے نو مہینے بتاتا ہے اور کوئی اٹھارہ مہینے۔اس اثنا میں کبھی کبھی ایرانی شہر پناہ سے نکل کر مسلمانوں پر حملہ بھی کرتے رہے کہ شاید وہ شکست کھا کر الٹے پاؤں لوٹ جائیں،لیکن مسلمانوں نے ہمیشہ ان کے حملوں کو ناکام بنا کر انہیں دوبارہ شہر میں پناہ لینے پر مجبور کردیا۔بالآخر جب محاصرے نے طول کھینچا تو ایرانیوں نے تنگ آ کر ان فوجی افسروں کی سرکردگی میں جن کی شجاعت اور جنگی مہارت پر انہیں پورا پورا بھروسہ تھا،ایک لشکر مرتب کیا اور مسلمانوں سے مقابلہ کرنے نکلے۔لیکن پہلے کی طرح اس لشکر کو بھی اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی اور وہ بھی شکست کھا کر شہر واپس ہوگیا۔اس شکست نے ایرانیوں کی ہمت توڑ دی اور یہ خوف ان کے دل میں بیٹھ گیا کہ جو بھی ان مسلمانوں کے مقابلے میں جائے گا شکست کھائے گا۔

محاصرے اور جنگ کی خبریں یزدگرد کے پاس روزانہ بلکہ ساعت بہ ساعت پہنچ رہی تھیں۔چنانچہ غم اس پر چھا گیا اور مایوسی اس کے دل میں رینگنے لگی،یہ دیکھ کر اس کے رنج ونومیدی میں اور بھی اضافہ ہوگیا کہ اتنے مہینے گزر جانے کے باوجود مسلمانوں میں بے دلی کے آثار بالکل نہیں پائے جاتے۔پھر اس نے دیکھا کہ مسلمان کھانے پینے کا سامان سرزمین عراق سے جتنا چاہیں حاصل کرسکتے ہیں۔لیکن ایرانی روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتے چلے جارہے ہیں اور یقین

Marfat.com

ہو گیا کہ بہر شیر اب کسی قیمت پر بھی مسلمانوں سے نہیں بچایا جا سکتا۔

مجبور ہو کر اس نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی خدمت میں صلح کی درخواست بھیجی اور دجلے کو ایران وعرب کے درمیان حد فاصل قرار دیتے ہوئے ایلچی کے ہاتھ کہلوایا: دجلے کے اس طرف جو کچھ ہے وہ ہمارا اور اس طرف پہاڑ تک جو کچھ ہے وہ تمہارا۔۔۔!'' لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یزدگرد کی شرائط صلح نامنظور کر دیں اور ایلچی واپس چلا گیا۔ وہ صلح کر بھی کیسے سکتے تھے جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غیر مبہم اور واضح الفاظ میں مدائن فتح کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔ اور وہ ایرانی لشکر کو شکست دینے اور ان کے سپاہیوں کو قیدی بنا لینے کے بعد اب بہر شیر پر قابض ہی ہونے والے تھے۔ ابھی قاصد حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا جواب لے کر یزدگرد کے پاس پہنچا بھی نہ تھا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے محاصرہ شدید کر دینے کا حکم دیا اور مسلمانوں نے پہلے سے کہیں زیادہ سنگ باری شروع کر دی۔ لیکن جواب میں بہر شیر سے کوئی ایک تیر بھی نہ آیا، اس سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو یقین ہو گیا کہ محافظوں نے شہر خالی کر دیا ہے۔ انہوں نے فوج کو شہر میں داخل ہو جانے کا حکم دیا۔ مسلمانون نے فصیل پر چڑھ کے دروازے کھول دیئے۔ شہر پر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور کوئی تنفس وہاں نہ تھا۔ صرف ایک شخص امان طلب کرتا ہوا ان کے پاس آیا اور اس سے معلوم ہوا کہ بہر شیر کے محافظ یزدگرد کے حکم سے مدائن چلے گئے ہیں۔ انہوں نے پل کو آگ لگا دی ہے اور دجلہ میں چلنے والی ساری کشتیاں اپنے قبضے میں کر لی ہیں، تا کہ دریا اپنی تند و تیز موجوں کے ساتھ دفاعی خط کا کام دے اور غازیان اسلام کو مدائن میں داخل ہونے سے روکے رکھے۔

مسلمان آدھی رات کے وقت بہر شیر میں داخل ہوئے اور اسی وقت دریائے دجلہ کو عبور کر کے مدائن پر حملہ آور ہونے کے متعلق سوچنے لگے، لیکن وہاں نہ پل تھا نہ کشتیاں؟ مجبوراً وہ کنارے پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ مدائن کا بارونق شہران کی نگاہوں کے سامنے تھا اور وہ حیرت واستعجاب کی تصویر بنے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اسے دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین نہ آتا تھا کہ جو کچھ ان کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں وہ حقیقت ہے۔ دوسرے کنارے پر ایک شاندار عمارت، عظمت وشوکت کے جلال آفریں مرقعے کی صورت میں انہیں دعوت نظارہ دے رہی تھی۔ ایسی بلند عمارت مسلمانوں نے آج تک نہ دیکھی تھی۔ جس کی سفیدی کو رات کی گھنی تاریکیوں نے اور نکھار دیا تھا۔ جب رات کے اندھیرے چھٹنے شروع ہوئے اور نسیم سحر کی ہلکی ہلکی خوشگوار موجیں فضا میں سرسرائیں تو اس منظر کی دلکشی میں جلال و رعنائی سے اور اضافہ ہو گیا۔ جس سے فوجیوں

کے سانس رک گئے۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے، جیسے منظر کی حیرت آفرینیوں نے ان کے حواس پر قبضہ کرلیا ہو۔ وہ دریا کی طرف کچھ اور کھسک آئے اتنے میں ضرار بن خطاب بھی وہاں پہنچ گئے اور یہ منظر دیکھ کر بلند آواز میں کہنے لگے: ''اللہ اکبر! یہ کسریٰ کا قلعہ سفید ہے! جس کا اللہ اور اس کے رسول نے تم سے وعدہ کیا ہے!''

یہ سن کر چاروں طرف سے تکبیر کے نعرے بلند ہوئے اور لوگوں کو یقین ہوگیا کہ وہ اس ایوان کے سامنے ہیں جس کا ذکر مدتوں سے شاعروں کے اشعار اور افسانہ طرازوں کے افسانوں میں سنتے چلے آرہے تھے۔ وہ صبح تک اللہ اکبر کے نعرے لگاتے رہے۔ دریا پار کر کے اس ایوان میں داخل ہونے کا شوق انہیں بے چین کیے دے رہا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ اس شاندار محل میں جا کر کسریٰ کے عدیم النظیر تخت کے نظارے سے اپنی آنکھوں اور اپنے دل کو آسودہ کریں۔ ان کا سردار اس تخت پر جلوہ افروز ہو کر کلمہ توحید بلند کرے اور اس کی صدائے بازگشت محل کے گوشے گوشے میں گونج کر اس حقیقت کا اعلان بن جائے کہ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ کفر کا پرچم سرنگوں اور اللہ کا کلمہ بلند ہوا اور اللہ عزت وحکمت والا ہے۔

کسریٰ کا محل دیکھ کر مسلمانوں کا متحیر ومبہوت رہ جانا کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ یہ محل اس زمانے میں عجائبات عالم میں شمار ہوتا تھا۔ وہ اپنی قدامت کی بنا پر حیرت انگیز نہیں تھا کہ جس وقت کی یہ بات ہے اس وقت اس کو بنے پوری ایک صدی بھی نہ ہوئی تھی بلکہ محل تعجب اس کی عظمت اور اس کا جلال تھا۔ اسے کسریٰ نوشیرواں نے 550ء میں بنوایا تھا اور اس کی تعمیر میں رومی اور یونانی فن تعمیر کی تمام نزاکتیں صرف کرادی تھیں۔ اس کے سامنے کا حصہ ایک سو پچاس میٹر سے بھی زیادہ چوڑا تھا اور بلندی چالیس میٹر تھی۔ پانچوں دالانوں پر بڑے بڑے گنبد اس کی عظمت اور جلال کو تاج پہنا رہے تھے اور ان عربوں کے دل میں، جو انہیں دیکھ کر انگشت حیرت در دہان تھے۔ یہ خیال پیدا کر رہے تھے کہ نہ جانے ان گنبدوں میں کتنے خزانے بھرے پڑے ہیں، صدر دالان جس کا گنبد سب سے اونچا تھا، جس کی مثال روئے زمین پر نہ تھی۔ کیا کسریٰ کے تخت اور اس میں جڑے ہوئے بیش قیمت جواہر کی داستانیں، دیومالائی کہانی معلوم نہ ہوتی تھیں۔ یہ تخت یہ ایوان اور یہ محل سب کے سب اسلامی فوج کے سامنے تھے۔ صرف بیچ میں دریا حائل تھا۔۔ پھر وہ اس دریا کو عبور کر کے یہ محل اور اس کے نوادر اپنی آنکھوں سے کب دیکھیں گے؟

ادھر مسلمانوں کے دل میں یہ خیالات مچل رہے تھے اور مدائن کا منظر ان میں زندگی اور

قوت کی جوت جگا رہا تھا۔ ادھر یزدگرد اپنے ایوان میں پراگندہ خاطر بیٹھا تھا اور طرح طرح کے وسوسے اس کے دل ودماغ سے کھیل رہے تھے، وہ سوچ رہا تھا کہ دجلے کا چوڑا چکلا پاٹ اور تیز وتند موجیں ایک قدرتی قلعے کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے استحکام میں اس برف کو زیادہ دخل ہے جو ان پہاڑوں کی بلندیوں سے، جن سے آذربائیجان اور موصل نکلتے ہیں، پگھل پگھل کر دریا کے پاٹ کو اور وسیع اور اس کی موجوں کو کف آگیں بنا رہی ہے پھر تمام کشتیاں بھی مشرقی کنارے پر لا کر جمع کر دی گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے دریا عبور کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی ایرانی فوجیں اس کنارے کی حفاظت نہیں کر سکتیں، کیا اب بھی وہ اپنے دارالسلطنت کو خطرے سے نہیں بچا سکتیں؟ ان حالات میں اس قسم کے خیالات کا پیدا ہونا بالکل فطری بات تھی اور یزدگرد کو چاہیے تھا کہ وہ ایرانی فوج کے سرداروں کو اپنا ہم خیال بنا کر وطن کی عزت وحرمت بچانے کے لیے اپنے جوان عزائم کی روح ان سرداروں اور مدائن کے تمام باشندوں کے دلوں میں پھونک دیتا۔ اگر وہ کر سکتا تو اس فرض کی ادائی کا کم سے کم درجہ تھا جو اس پر خود اپنی اور اس رعایا کی طرف سے عائد ہوتا تھا جس نے اسے اپنی قسمت کا مالک بنا دیا تھا۔

لیکن یزدگرد کے اضطراب نے اس کے دل کو گمراہ اور اس کی فکر کو فاسد کر دیا تھا، وہ ان مسلمانوں کو جنات سمجھنے لگا تھا، جن کی راہ میں کوئی قوت مزاحم نہ ہو سکتی تھی، نہ کوئی طاقت ان کے مقابلے میں راہ فرار اختیار کیے بغیر رہ سکتی تھی۔ ایسی صورت میں اس سے زیادہ یہ حق کس کو پہنچتا ہے کہ وہ بھاگ کر اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جان بچا لے۔ اس نے شاہی خدام کو حکم دیا کہ قیمتی سامان، خزانہ، حرم شاہی اور شہزادے شہزادیوں کو لے کر حلوان چلے جائیں۔ لوگوں نے جو اپنے بادشاہ کا یہ حال دیکھا تو ان کے بھی جی چھوٹ گئے اور وہ بھی اپنے اور اپنے اہل وعیال کی فکر کرنے لگے، کیا رعایا اپنے فرمانرواؤں کی مقلد نہیں ہوتی! آخر بادشاہ کے اہل وعیال اور کنیزیں ایک سپاہی یا افسر کے بیوی بچوں سے ممتاز کیوں ہوں! چنانچہ ایرانیوں کی قوت مقابلہ جواب دے گئی اور دجلے کے سوا کوئی سہارا نہ رہا جو انہیں غازیان اسلام کے حملے سے بچا سکتا۔

اس طرح دجلہ دو لشکروں کے درمیان بہہ رہا تھا۔ ایک وہ لشکر جس کی قوتیں مضمحل ہو گئی تھیں اور اس کے لیے کوئی عزم، کوئی ارادہ باقی نہ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے تھے اور انجام، قسمت کے حوالے کر دیا تھا اور دوسرا وہ لشکر جس کی معنوی روح بلندی کے نقطہ کمال پر تھی جسے ایمان کی قوت نے فتح وکامرانی کا یقین دلا دیا تھا اور وہ خیال کرنے لگا تھا کہ دریا اس

Marfat.com

کے عصا کی ایک ضرب سے پھٹ کر اسے ایوان کسریٰ تک پہنچنے کا راستہ دے دے گا۔ یہ وہ معجزہ ہے جو اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا اور وہ اس کے سہارے اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل گئے تھے اور اسی قسم کا معجزہ آج اللہ اسلامی لشکر کو عطا کرے گا اور یہ لشکر دریا پار کر کے مدائن میں داخل ہوگا۔ کسریٰ کی سلطنت کا خاتمہ کر کے سب سے بڑے ایوان پر حق کا جھنڈا لہرائے گا۔

ہاں وہ معجزہ ہی تھا جس کے بل پر مسلمانوں نے دجلہ پار کیا۔ وہ کنارے پر کھڑے ہو کر موجوں کی شورانگیزیاں دیکھ رہے تھے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ اسے عبور کرنے کی تدبیر سوچ رہے تھے، لیکن کوئی بات ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ آخرکار کچھ ایرانیوں کو بلوا کر ان سے پوچھا اور انہوں نے ایک جگہ بتائی جہاں سے دریا عبور کر کے وادی میں پہنچا جا سکتا تھا۔ لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دریا کے بہاؤ کو دیکھ کر تردد کیا وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا ایک آدمی بھی ضائع ہو، اس لیے انہوں نے اس رائے پر عمل نہیں کیا۔

دوسرے دن انہیں اطلاع ملی کہ یزدگرد نے اپنا خزانہ حلوان منتقل کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ اس وقت انہوں نے لوگوں کو جمع کیا اور تقریر کرنے کھڑے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنے کے بعد انہوں نے فرمایا:

"دشمن نے اس دریا کو اپنی سپر بنایا ہے۔ تم اس میں سے گزر کر اس کی طرف نہیں جا سکتے لیکن وہ جب چاہے کشتیوں میں بیٹھ کر تم پر حملہ آور ہو سکتا ہے، تمہاری پشت پر کوئی ایسا خطرہ نہیں ہے جس سے خوف کھایا جا سکے۔ میری رائے میں اس سے پہلے کہ دنیا تمہیں گھیرے، تم قدم بڑھا کے دشمن پر حملہ کر دو۔ میں عزم کر چکا ہوں کہ دریا پار کر کے ان تک پہنچوں گا۔"

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دفعتاً یہ ارادہ کیوں کر لیا؟ کیا وہ کل تک متردد نہ تھے۔ کیا انہیں یہ اندیشہ نہ تھا کہ لوگ اس ورطہ ہلاکت میں کودنے پر آمادہ نہ ہوں گے؟ لیکن لوگوں نے تردد نہیں کیا۔ اس لیے کہ مدائن کے نظارے نے انہیں مسحور کر لیا تھا اور کسریٰ کا محل اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ ان کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ وہ ایران کے دارالسلطنت میں داخل ہونے اور محل کے گرد گھیرا ڈالنے کے لیے بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کو تیار تھے۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنی بات پوری بھی نہ کر پائے تھے کہ سب نے یک زبان ہو کر کہا:

اللہ ہماری اور آپ کی رہنمائی کا فیصلہ فرما چکا ہے۔ اپنی ارادے کو روبہ عمل لائیے!" لیکن

دریا عبور کیسے کیا جائے؟ چلیے وہ گھوڑوں پر بیٹھ کر اسے پار کر سکتے ہیں، لیکن ایرانی لشکر دوسرے کنارے پر کھڑا ہے۔ وہ انہیں دریا سے کیوں نکلنے دے گا۔ آخر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ذہن میں ایک بات آئی اور انہوں نے صلائے عام کے طور پر فرمایا: ''کون ہے جو پہلے اس کنارے پر جا کر دشمن کو روکے رکھے تا کہ وہ لشکر کو دریا پار کرنے سے باز نہ رکھ سکیں۔'' قوت وشجاعت کے پتلے عاصم بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کام کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ ان کے ساتھ چھ سو جاں باز اور تیار ہو گئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عاصم رضی اللہ عنہ کو ان کا افسر بنا دیا اور جب یہ لوگ دجلے کے ساحل پر پہنچے تو عاصم رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا: ''دوسرے کنارے پر پہنچنے کے لیے سب سے پہلے میرے ساتھ دریا میں کون اترے گا؟ ساٹھ سوار آگے بڑھے، انہوں نے ہچکچانے والوں سے مخاطب ہو کر کہا: ''تم اس ذرا سے پانی سے ڈر گئے؟'' پھر یہ آیت پڑھی:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (آل عمران:۱۴۵)

ترجمہ: ''اور کوئی شخص مر نہیں سکتا جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو اس نے لکھ رکھا ہے وقت مقررہ پر۔''

یہ کہہ کر دریا میں گھوڑا ڈال دیا اور ان کے پیچھے ان کے ساتھی بھی پانی میں اتر گئے۔ قعقاع بن عمرو نے دیکھا کہ مجاہدین اسلام کی یہ پہلی ٹکڑی تیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے اور دریا کے دوسرے کنارے پر ایرانی ان سے مقابلے کی تیاری کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے چھ سو ہمرائیوں کو حکم دیا اور عاصم بن عمر و اور ان کے ساتھیوں کی طرح ان جانبازوں نے بھی اپنے اپنے گھوڑے ریا میں ڈال دیئے۔ یہ دیکھ کر ایرانی حیران و ششدر رہ گئے۔ یہاں تک کہ بعض کی زبان سے بے اختیار نکل گیا: ''دیوانے ہیں، دیوانے!'' اور بعض نے کہا: ''تم لوگ انسانوں سے نہیں جنوں سے لڑ رہے ہو!''

تھوڑی دیر تک تو ایرانی ان موج بلا سے کھیلنے والوں کو تکتے رہے لیکن جب انہوں نے یکھا کہ عاصم اور ان کے ساتھی دریا کے وسط میں پہنچ گئے ہیں تو مقابلے کے لیے اپنے ند سوار دریا میں اتار دیئے۔ یہ لوگ جب عاصم کے قریب پہنچے تو وہ دوسرے کنارے سے کچھ ہی صلے پر تھے۔ عاصم نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''تیر چلاؤ تیر! اور ان کی آنکھیں پھوڑ دو!'' جب برایرانی گھوڑوں کی آنکھوں میں تر ازو ہونے لگے تو وہ گھبرا کر پلٹے اور ان کے سوار کوشش کے وجود مسلمانوں کے قریب نہ پہنچ سکے، جو ہنستے کھیلتے دریا کی مرگ آفریں موجوں کا سینہ چیرتے

Marfat.com

چلے جا رہے تھے۔ جب عاصم اپنے تمام ساتھیوں سمیت دوسرے کنارے پر پہنچے تو ایرانی بھاگ کھڑے ہوئے پیچھے پیچھے قعقاع بھی اپنے دستے کو لے کر عاصم سے جا ملے۔ اس وقت مشرقی کنارے پر ایک بھی ایرانی باقی نہ رہا تھا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جب یہ دیکھا کہ دجلے کے مدائن والے کنارے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا ہے تو باقی گھڑ سواروں کو بھی دریا پار کرنے کا حکم دے دیا اور عاصم کے دستے کی طرح ان بہادروں نے بھی دریا کی تیز و تند لہروں سے کھیلنا شروع کر دیا۔ اس وقت سارا دریا گھوڑوں سے اس طرح پٹ گیا تھا کہ پانی تک نظر نہ آتا تھا۔ عاصم نے ایرانی ملاحوں کو حکم دیا کہ بہر شیر کی طرف کشتیاں لے جائیں، چنانچہ جو پیادہ فوج ادھر رہ گئی تھی وہ کشتیوں میں بیٹھ کر آ گئی۔ جس وقت حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دریا پار کیا ہے، مدائن والے فرار ہو چکے تھے۔ صرف وہی لوگ باقی رہ گئے تھے جو قلعہ سفید میں پناہ گزیں تھے۔ ان لوگوں نے بھی مقابلہ نہ کیا بلکہ جزیہ دینے پر آمادگی ظاہر کر کے قلعے کے دروازے مسلمانوں کے لیے کھول دیئے۔

یہ جنگی معجزوں میں سے ایک ایسا معجزہ ہے جسے تسلیم کرتے ہوئے عقل ہچکچاتی ہے۔ چنانچہ ابن کثیر ''البدایہ والنہایہ'' میں اس واقعہ کی تفصیل بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''یہ ایک عظیم معرکہ، خطرناک مرحلہ، کڑی مصیبت، روشن خرق عادت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا جو اللہ نے آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے رونما کیا تھا اور جس کی مثال نہ اس ملک میں ملتی ہے، نہ دنیا کے کسی اور حصے میں۔''

یہ ایک اسلامی مؤرخ کی عبارت ہے جو ان غیر معمولی کارناموں اور اس بے مثال اقدام کے نقوش مرتسم کرتے ہوئے ہمارے اور مؤرخ کے شعور کی صورت گری کرتی ہے۔ کیا ان کارناموں کو معجزے کے علاوہ اور بھی کسی نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ واقعی کتنا بڑا معجزہ ہے کہ عاصم رضی اللہ عنہ اور قعقاع کے دستے دریا میں گھوڑے ڈال دیتے ہیں اور انہیں موجوں کی بلا خیزیاں ڈراتی ہیں نہ دشمن کی تیراندازیاں! لیکن فتح کا یقین انسان کو اس بلندی پر پہنچا دیتا ہے جہاں نصب العین کی راہ میں زندگی اور موت کے معنی ایک ہو جاتے ہیں۔ مسلمان مدائن فتح کرنے کے لیے بے تاب تھے اور اسے ہر قیمت پر یہاں تک کہ جان کی بازی لگا کر بھی حاصل کر لینا چاہتے تھے، اسی لیے انہیں دیکھ کر ایرانیوں نے کہا تھا: ''ہم انسانوں سے نہیں جنوں سے لڑ رہے ہیں۔''

Marfat.com

اور وہ ان جنوں کے سامنے نہ ٹھہر سکے جو بپھری ہوئی موجوں کا منہ پھیر کر آئے تھے گویا یہ لوگ قضاوقدر کی وہ قوت ہیں جو زمین کو ہلا کر اور پہاڑوں کو پیس کر رکھ دیتی ہے۔ کیا آتش فشاں پہاڑ اور بجلیاں فطرت کی قوتیں نہیں ہیں۔ یہی حال ان دونوں دستوں کا تھا اور یہی حال حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور ان کے تمام لشکر کا تھا جب وہ دریا میں اترے اور اس کی برق آسا لہروں سے گزر کر دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ دنیا کی کونسی قوت اس غیبی طاقت کے سامنے ٹھہر سکتی تھی اور ایرانی جن کے قویٰ مضمحل اور جن کی روحیں درماندہ ہو چکی تھیں اس کے مقابلے میں فرار کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے۔

''یہ ایک معجزہ ہے جس کی مثال نہ اس ملک میں ملتی ہے نہ دنیا کے کسی اور حصے میں!'' یہ ابن کثیر کے الفاظ ہیں اور اگر چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں تیمور لنگ بغداد پر حملہ کرتے وقت اپنے لشکر کے ساتھ دریا عبور کر کے اسی قسم کے معجز نما کارنامے کا اظہار نہ کرتا تو کچھ لوگوں کو اس کی صحت میں شبہ رہتا، بلکہ علامہ بلاذری اس واقعے کا ذکر بڑی احتیاط سے کرتے ہیں اور اس کے ساتھ کچھ ایسی روایتیں بھی ٹانک دیتے ہیں جو ان کے نزدیک صحت سے زیادہ قریب ہیں۔ ان میں سے ایک ابان بن صالح کی روایت ہے کہ:

مسلمان دجلے کی طرف آئے، وہ اس وقت پانی سے لبریز تھا اور اتنا لبریز کبھی نہیں دیکھا گیا، جب اس کے کنارے پر پہنچے تو دیکھا کہ ایرانی کشتیاں اور وہ تمام چیزیں جن سے دریا عبور کیا جا سکتا تھا، مشرقی کنارے پر لے گئے ہیں، اور پل جلا دیا گیا ہے۔ عبور کی کوئی راہ نہ پا کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور مسلمانوں کو فکر ہوئی۔ آخر کار ایک مسلمان نے دریا عبور کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور گھوڑا پانی میں ڈال کر دریا عبور کر لیا۔ یہ دیکھ کر اور لوگوں نے بھی اپنے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے اور دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے ملاحوں کو حکم دیا کہ جا کر اسباب لے آئیں۔ ایرانیوں نے جو یہ دیکھا تو بے اختیار کہہ اٹھے: بخدا! تم جنوں سے لڑ رہے ہو!'' اور بھاگ نکلے۔ ایک اور روایت عمرو بن العلاء کی ہے: ''حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو دریا پار کرنے کا کوئی ذریعہ نظر نہ آیا انہیں بتایا گیا کہ شکاریوں کی بستی کے قریب پانی نسبتاً کم ہے۔ چنانچہ اس طرف سے گھوڑے دریا میں ڈالے گئے۔ ایرانیوں نے انہیں روکنے کے لیے تیر برسائے لیکن قبیلہ طے کے ایک شخص کے سوا باقی سب صحیح سلامت دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔''

ان روایات میں جو احتیاط برتی گئی ہے آپ نے یقیناً اسے محسوس کر لیا ہوگا۔ اس سے ظاہر

Marfat.com

ہوتا ہے کہ ان کے راوی ہماری اس روایت کو قبول کرنے سے ہچکچاتے ہیں، جس پر طبری، ابن اثیر، ابن خلدون اور ابن کثیر وغیرہ کا اتفاق ہے۔ لیکن یہ احتیاط نہ تو ہماری اس روایت کی تردید کرتی ہے اور نہ اس کی مخالف روایتوں کی تائید۔ یہ تو اس روایت کو عجیب سمجھنے والوں کی احتیاط ہے جس سے صرف اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کی صحت کے بارے میں مشکوک ہیں۔ لیکن اگر متشککین چودہویں صدی عیسوی کے اواخر تک زندہ رہتے اور انہیں معلوم ہوتا کہ تیمور لنگ نے بھی اپنے لشکر کو لے کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی طرح دجلہ عبور کیا تھا تو ان کی حیرت جاتی رہتی اور ان کے دلوں سے اس روایت کے متعلق تمام شکوک وشبہات مٹ جاتے، جس پر اکثر مؤرخین متفق ہیں۔ بلکہ انہیں اس روایت کو تعجب انگیز سمجھنے پر تعجب ہوتا اور وہ یقین کر لیتے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دجلے میں اپنا گھوڑا ڈال دیا اور ان کے پیچھے سارا لشکر دریا میں اتر گیا۔ وہ دریا میں اس طرح چل رہے تھے گویا زمین پر چل رہے ہوں۔ دریا کا پاٹ ان سے بھر گیا تھا اور گھوڑوں اور ان کے سواروں کے سوا پانی نظر نہ آتا تھا۔ دریا میں وہ اس طرح باتیں کرتے چلے جا رہے تھے جس طرح زمین پر باتیں کرتے چلتے ہیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے دل سکون واطمینان سے لبریز تھے۔ انہیں اللہ کے حکم اور اس کے وعدے، اللہ کی نصرت اور اس کی تائید پر پورا پورا بھروسا تھا......

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس لشکر کی نصرت وسلامتی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اسے دریا کی موجوں کے سپرد کر دیا۔ اللہ نے اس کی حفاظت کی اور مسلمانوں کا کوئی آدمی یہاں تک کہ سامان بھی ضائع نہ ہوا۔ صرف لکڑی کا ایک پیالہ، اس سامان کی رسی ڈھیلی ہو جانے کی وجہ سے جس میں وہ بندھا ہوا تھا دریا میں گر گیا، لیکن پانی کا بہاؤ اس کو بھی اسی سمت لے گیا جس سمت یہ لشکر جا رہا تھا چنانچہ لوگوں نے اسے اٹھا کر اس کے مالک کے حوالے کر دیا...... دریا میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ خدا کی قسم! اللہ اپنے حامیوں کو ضرور اپنی نصرت سے نوازے گا۔ وہ یقیناً اپنے دین کو غالب کرے گا اور لازمی طور پر اپنے دشمن کو شکست دے گا۔ بشرطیکہ لشکر میں کوئی ایسا تجاوز یا گناہ نہ ہو جو نیکیوں پر غالب آ جائے۔۔۔!''

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا: واللہ! ان کے لیے زمین کی طرح دریا بھی پامال کر دیئے گئے ہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں سلمان رضی اللہ عنہ کی جان ہے! جس طرح وہ دریا میں اترے ہیں اسی طرح صحیح سلامت دریا سے پار ہوں گے۔'' اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے ارشاد کے مطابق انہوں نے بہ حفاظت تمام دریا پار کر لیا، نہ ان کا کوئی آدمی ڈوبا، نہ کوئی

Marfat.com

چیز گم ہوئی!"

مسلمانوں کا لشکر دریا سے نکلا تو گھوڑوں نے ہنہنا ہنہنا کے اپنے جسم سے پانی جھاڑا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ مدائن میں داخل ہوئے، لیکن ان لوگوں کے سوا جو قلعے میں چھپے ہوئے تھے، وہاں کوئی نہ تھا۔ یہ اس لیے کہ یزدگرد اپنے اہل و عیال اور اس سامان کو لے کر جو بآسانی لے جایا جا سکتا تھا، حلوان بھاگ گیا تھا، جو لوگ قلعے میں بند ہو کر بیٹھ رہے تھے، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے انہیں نکل آنے کا حکم دیا اور وہ نکل آئے۔ اس کے بعد وہ اپنے لشکر کو لے کر قلعے میں داخل ہوئے اور کسریٰ کے عظیم الشان محل کے عجائب و نوادر کا یک نظری جائزہ لیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تلاوت کی:

کَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ○ (الدخان: ۲۵ تا ۲۹)

ترجمہ: وہ بہت سے باغ، چشمے، کھیت، پاکیزہ مقام اور نعمتیں چھوڑ گئے، جن میں وہ عیش و راحت کی زندگی بسر کرتے تھے اور اس طرح ہم نے ایک دوسری قوم کو ان کا وراث بنایا۔ پس نہ ان پر آسمان رویا نہ زمین اور نہ ڈھیل دی گئی۔"

کتنی عظیم و جلیل تھی یہ فتح۔ یہ ہے کسریٰ کا شہر اور اس کا ایوان؟ اور یہ ہیں وہ جزیرہ نمائے عرب کی خشک و سنگلاخ زمین کے فوجی، جو خوش رنگ پھولوں، سرسبز درختوں اور طرح طرح کے پھلوں سے نگاہوں کو آسودہ کرتے ہوئے قصر شاہی کے حسین و جمیل باغوں سے گزر رہے ہیں۔ باغوں سے وہ دالانوں میں پہنچے اور ان کی دلکشی دیکھ کر اور بھی حیرت میں رہ گئے۔ دیواروں کے حسین نقش و نگار اتنی نفاست و نزاکت سے بنائے گئے تھے کہ تعریف نہیں کی جا سکتی۔ سامان آرائش ایسا تھا کہ اس کی نظیر دمشق میں بھی نہ ملتی تھی۔ ایرانی ریشم کے زرکار پردے اور عیش و عشرت کا نظر فریب سامان۔ غرض یہ کہ مشرقی ممالک کی صنعت کے بہترین نمونے اس ایوان میں جمع تھے۔ کیا ان نعمتوں پر محض اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر دینا ہی کافی تھا؟ لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی شکر الٰہی بجالانے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے! چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فتح کے شکرانے کے آٹھ نفل ادا کیے اور حکم دیا کہ مسلمان حیرہ اور عراق کے دوسرے تمام

Marfat.com

شہروں اور بستیوں سے اپنے اہل وعیال کو لا کر مدائن میں آباد کر دیں۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کسریٰ کے محل میں قیام فرمایا اور ایوان شاہی کو مسجد بنا دیا اس کی مورتیوں کو جوں کا توں رہنے دیا گیا اور انہیں چھیڑا بھی کیوں جاتا جب کہ وہ محل اور خاص طور پر ایوان کی سجاوٹ کے لیے وہاں رکھی گئی تھیں۔ محل کی اندرونی دیواریں نقش ونگار اور دوسرے سامان آرائش سے لپی ہوئی تھیں، لیکن ان کا بیرونی رخ سادہ وسفید چھوڑ دیا گیا تھا۔ مسلمانوں نے کسریٰ کے خزانوں کو مال ودولت، نفش پوشاکوں، بیش قیمت برتنوں اور اعلیٰ قسم کی خوشبوؤں سے لبریز پایا، جن کی قیمت بیان کرنے سے زبان اور قلم دونوں عاجز ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یزدگرد اور اس کے ساتھ حلوان فرار ہونے والوں کے تعاقب میں فوج بھیجی۔ اس فوج نے انہیں جالیا اور وہ سامان بھی ان سے چھین لائی جو وہ مدائن سے لے کر بھاگے تھے اور جس کی قیمت محل کے ساز وسامان سے بھی زیادہ تھی۔ مدائن کے گھروں میں مسلمانوں کو ایسی ایسی نادر ونفیس چیزیں ملیں کہ وہ ہکا بکا رہ گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دنیا کی کوئی قوم ایرانیوں سے زیادہ خوش حال نہ تھی۔

آج جب ہم اس مال غنیمت کی نفاست، قیمت اور بہتات کا ذکر سنتے ہیں تو دنگ رہ جاتے ہیں۔ پھر آپ ہی اندازہ فرمائیے کہ اس دور کے فاتحین کی حیرت کا کیا عالم ہوگا۔ جنہوں نے وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مؤرخین عرب نے اس مال غنیمت کی جو تفصیلات بیان کی ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے ہماری اور ان فاتحین کی حیرت بالکل حق بجانب معلوم ہوتی ہے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو کسریٰ کے خزانوں سے تیس کھرب دینار ملے اور محل میں جو سامان تھا، اس کی قیمت کا تو ٹھکانا ہی نہ تھا۔ جو لوگ یزدگرد کے تعاقب میں روانہ کیے گئے تھے کسریٰ کا موتیوں اور جواہرات سے مرصع تاج اور زرکار ریشمی ملبوس لے کے آئے، جس میں جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔ کسریٰ کی زرہ اور تلوار وغیرہ جو تاج وملبوس کے ساتھ لائی گئی تھیں وہ بھی جواہر سے مزین تھیں۔

قعقاع بن عمرو نے ایک ایرانی کا تعاقب کر کے اسے قتل کر دیا۔ اس کے قبضے سے دو تھیلے برآمد ہوئے جن میں کسریٰ ہرقل، خاقان ترک، نعمان اور ان دوسرے بادشاہوں کی زرہیں اور تلواریں تھیں۔ جن سے ایرانیوں نے اور جنہوں نے ایرانیوں سے جنگ کی تھی۔ عصمت بن خالد ضبی دو پٹارے لائے۔ ان میں سے ایک سونے کا گھوڑا تھا جس پر چاندی کی زین کسی

ساز چاندی کا تھا اور اس میں یاقوت وزمرد جڑے تھے۔ سوار بھی چاندی کا تھا جس کے سر پر جواہر کا تاج تھا۔ دوسرے پٹارے میں چاندی کی اونٹنی تھی جس کی مہار، تنگ اور پالان سب سونے کے تھے اور ان میں یاقوت پروئے ہوئے تھے۔ ناقہ سوار سونے کا تھا اور سر سے پاؤں تک جواہرات سے مرصع تھا۔ مدائن کے مکانوں میں مسلمانوں کو سر بہ مہر جھابے ملے وہ سمجھے ان میں کھانا ہوگا مگر دیکھا تو سونے چاندی کے برتن تھے۔ غرض یہ کہ اس کی قسم کی چیزیں مسلمانوں کو اس کثرت سے ملیں کہ بازار میں سونا چاندی ایک نرخ پر بک گئے۔ یہی حال کافور کا تھا مسلمانوں نے اس کی بہتات دیکھ کر سمجھا کہ نمک ہے۔ لیکن جب آٹے میں ملا کر گوندھا تو ساری روٹیاں کڑوی ہو گئیں۔

کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ ان خزانوں نے بادیہ نشینان عرب کے ایمان ڈانواں ڈول کر دیئے ہوں گے اور ان میں سے کسی لالچ کے بندے نے کوئی چیز چھپا کر اپنے پاس رکھ لی ہوگی؟ نہیں! بلکہ جس نے جو چیز پائی بجنسہٖ لا کر افسر کے پاس حاضر کر دی کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اس کے متعلق جو چاہیں فیصلہ کر دیں۔ جب قعقاع بن عمرو نے کسریٰ اور دوسرے بادشاہوں کی تلواریں لا کر پیش کیں تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: ''ان میں سے جو تمہیں پسند ہو، لے لو۔''

لیکن انہوں نے صرف ہرقل کی تلوار پسند کی باقی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا، ایک سپاہی مال غنیمت کے خزانچی کے پاس جواہرات کا ایک ڈبہ لے کر آیا، جسے دیکھ کر خزانچی اور حاضرین مجلس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ ''جتنا سامان اب تک ہمارے پاس آیا ہے اس میں ایک چیز بھی ایسی نہیں، جسے اس کے مقابلے پر رکھا جا سکے یا جو اس سے انیس ہی ہو!'' اور اس سپاہی سے پوچھا: ''تم نے اس میں سے کچھ لیا تو نہیں؟'' اس نے کہا: ''خدا کی قسم! نہیں! اور اگر ایک بات نہ ہوتی تو یہ میں تمہیں لا کر ہی نہ دیتا۔'' انہوں نے پوچھا: ''وہ کیا؟'' کہنے لگا: ''یہ میں نہیں بتاؤں گا۔ تم اسے سن کر میری تعریف کرو گے۔ لیکن میں اللہ کی تعریف کرتا ہوں اور اسی کے اجر پر مطمئن ہوں!'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو جب اس سپاہی اور اس جیسے دوسرے راست بازوں کا حال معلوم ہوا تو فرمایا: واللہ! لشکر کا لشکر امین ہے اور اگر اصحاب بدر کو ایک خاص فضیلت حاصل نہ ہوتی تو میں کہتا کہ یہ لوگ اصحاب بدر کے ہم رتبہ ہیں!''

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے تھے: ''قسم ہے اللہ کی! جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہمیں قادسیہ

Marfat.com

کے مجاہدین میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جس نے آخرت کے ساتھ دنیا بھی طلب کی ہو۔ ہم نے تین آدمیوں پر دنیا طلبی کا الزام لگایا اور وہ طلیحہ، عمرو بن معدی کرب اور قیس بن مکشوح ہیں لیکن ان کے جیسی زہد و امانت کی مثال بھی ہماری نظر سے نہیں گزری۔'' ان تینوں حضرات کے متعلق جابر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ایک خاص وزن رکھتی ہے۔ یہ تینوں ان مرتدین کے سرغنہ تھے جن سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اور جنہوں نے دنیا اور اس کے اقتدار کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جنگ کی تھی۔ لیکن یہی لوگ جب اپنے دامن ایمان کے داغ دھبے دھو کر دوبارہ اسلام کی آغوش میں آئے تو اللہ کی راہ میں لڑنے، دنیا کو پائے حقارت سے ٹھکرانے، نیک اعمال کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کرنے اور میدان جنگ میں اپنے تئیں سراپا شجاعت و جواں مردی بنا دینے میں ایسا کردار پیش کیا کہ عربوں کی صف اول میں شمار ہونے لگے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مدینے بھیجنے کے لیے مال غنیمت کا خمس علیحدہ کیا اور چھانٹ چھانٹ کر اس میں ایسی چیزیں رکھیں جنہیں دیکھ کر عرب تصویر حیرت بن جائیں۔ انہوں نے اس فرش کا بھی پانچواں حصہ بھیجنا چاہا جس پر کسریٰ بیٹھا کرتا تھا لیکن اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا انہیں گوارا نہ ہوا۔ چنانچہ مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''کیا تم لوگ یہ پسند کرو گے کہ اس فرش کو خمس کا چوتھائی حصہ قرار دے کر بارگاہ خلافت میں بھیج دوں! میں دیکھتا ہوں، یہ چھوٹا ہے اور ہم سب کے حصے میں نہیں آ سکتا، پھر اگر اسے جوں کا توں بھیج دیا گیا تو یہ مدینے والوں کے لیے ایک نادر تحفہ ہوگا۔'' یہ فرش ساٹھ مربع گز تھا اور شاہان آل ساسان اسے موسم بہار گزر جانے کے بعد شدت سرما میں استعمال کرتے تھے۔ اس پر مملکت کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ اس کی زمین سونے کی تھی جس میں جا بجا موتیوں کی نہریں تھیں۔ کناروں پر چمن تھے جن میں سبز رنگ کے درخت قائم کیے گئے تھے۔ ان درختوں کے تنے سونے کے، پتے ریشم کے اور پھل جواہرات کے تھے۔ لوگوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق کیا اور یہ فرش خمس کے ساتھ مدینے روانہ کر دیا گیا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ساٹھ ہزار سواروں میں مال غنیمت تقسیم کیا اور ایک ایک سوار کے حصے میں بارہ بارہ ہزار آئے۔ اس کے بعد ہتھیلی پر سر رکھ کر لڑنے والوں کو ان کی دلیری و شجاعت کے مطابق مزید حصہ دیا گیا۔ مدائن کے سارے مکان مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے گئے اور ان کے اہل و عیال ان مکانوں میں آباد ہو گئے۔ مسلمان مدائن میں مقیم رہے، یہاں تک کہ جب اسلامی فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھا تو ان میں سے کچھ لوگ مدائن سے چلے گئے۔ آپ خود اندازہ کریں

ہیں کہ اس بے شمار اور بیش قیمت مال غنیمت نے مسلمانوں کو کس درجہ مسرور اور آئندہ فتوحات کے لیے ان میں کتنا جوش اور ولولہ پیدا کیا ہوگا جو ان پر مال غنیمت کی مزید بوچھاڑ کرنے والی تھیں۔

بشیر بن خصاصیہ خمس لے کر مدینے پہنچے اور اسے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے خط سے فتح مدائن کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ اپنے اس خط میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے واقعات اتنی تفصیل کے ساتھ بیان کیے تھے۔ گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما رہے ہیں لیکن اس کے باوجود جب انہوں نے مال غنیمت کی کثرت ونفاست اور مسلمانوں کی امانت و دیانت دیکھی تو حیران رہ گئے اور حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''جن لوگوں نے یہ سب چیزیں لا کے حاضر کر دیں واقعی وہ بڑے امانتدار ہیں!!''

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''چونکہ آپ کا دامن پاک ہے اس لیے آپ کی رعایا بھی پاک دامن ہے۔ اگر آپ کی نیت ٹھیک نہ ہوتی تو اس کی نیت میں بھی فتور آ جاتا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسریٰ کی پوشاکوں، تلواروں اور زرہوں کو دیکھا اور انہیں ایک لکڑی پہ ٹنگوا کر اس لکڑی کو میدان میں نصب کرا دیا کہ لوگ زینت و آرائش کے اس عجیب و غریب منظر کو دیکھیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سراقہ بن جعشم، جن کا ہاڑ عرب میں مشہور تھا، بلائے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا، کسریٰ کا لباس انہیں پہنایا جائے۔ جب وہ لباس پہن کر ہتھیار سے سج کر اور تاج سر پہ رکھ کر کھڑے ہوئے تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''پیچھے ہٹو!'' وہ پیچھے ہٹ گئے۔ پھر فرمایا: ''آگے بڑھو اور وہ آگے بڑھ گئے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا: ''اللہ اللہ! بنو مدلج کا ایک اعرابی اور اس کے جسم پر کسریٰ کا یہ ملبوس! اے سراقہ بن مالک! ایسے دن کب کب آتے ہیں کہ تیرے جسم پر کسریٰ اور آل کسریٰ کا یہ پر تکلف شاہانہ لباس تیرے اور تیری قوم کے لیے مجد و شرف کا سبب بنے!''

اسی طرح ایک اور روایت میں ہے کہ کسریٰ کے مختلف حالتوں کے مختلف لباس تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مدینے کے سب سے جسیم اعرابی کو بلایا اور کسریٰ کے یہ مختلف ملبوس اسے باری باری پہنائے۔ لوگ ان لباسوں کو دیکھتے اور دنیا کے سحر و طلسم کا ایک عظیم الشان منظر ان کی آنکھوں میں پھر جاتا۔ جب وہ اعرابی کسریٰ کے تمام ملبوسات پہن چکا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

Marfat.com

آسمان کی طرف سر اٹھا کر فرمایا: ''اے اللہ! تو نے یہ سب کچھ اپنے نبی اور رسول ﷺ کو نہیں دیا حالانکہ وہ تجھے مجھ سے زیادہ محبوب وعزیز تھے۔ پھر تو نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی محروم رکھا۔ لیکن اب یہ انعامات تو نے مجھے ارزانی فرمائے ہیں۔ بارِ الٰہا! میں پناہ مانگتا ہوں کہیں یہ میری آزمائش نہ کی جارہی ہو!''

یہ سیرت فاروقی کی ایک جھلک ہے ذکر بعد میں آئے گا اور اس پر بھی تفصیل سے گفتگو کی جائے گی کہ اس کا اثر امت پر کیا پڑا؟ انہوں نے محسوس فرمایا کہ اس نعمت وآسودگی میں ایک فتنہ ہے جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور وہ آسودگی کو ایک اعلیٰ نصب العین قرار دے کر اپنی تمام قوتیں، ساری صلاحیتیں اس کی راہ میں صرف کردیتے ہیں اور اس طرح انسانیت کے اس بلند مفہوم سے ہٹ جاتے ہیں جو ہمارے دل ودماغ کو انتہائی بلندی پر لے جاکر ہمیں اللہ کا قرب عطا کرتا ہے اور اس کے صدقے میں ہم مشاہدہ حق کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس کردار اور اس خوف نے کہ آل ساسان کی یہ دولت اللہ نے کہیں آزمائش کے لیے عطا نہ کی ہو، انہیں بے حال کردیا اور وہ اتنا روئے، اتنا روئے کہ حاضرین کو ان پر رحم آ گیا۔ اس کے بعد انہوں نے اس دولت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے فرمایا: میں تم سے قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اسے فروخت نہ کروں گا اور شام ہونے سے پہلے پہلے تقسیم کردوں گا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خمس لوگوں میں ان کی حیثیت کے مطابق تقسیم کردیا اور سر سے کفن باندھ کے لڑنے والوں میں سے ہر غائب وحاضر کا حصہ پہلے نکال لیا۔ فرش اپنی ساخت کے لحاظ سے ناقابل تقسیم نظر آیا، اس لیے اہل مجلس سے فرمایا: ''اس فرش کے متعلق آپ حضرات کی کیا رائے ہے''؟ بیشتر لوگوں نے کہا: ''فوج نے یہ آپ کو دیا ہے، آپ جو مناسب سمجھیں کریں۔'' اور کچھ لوگ بولے: ''یہ صرف امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے لیے ہے اس میں کسی کا حصہ نہیں!'' لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کو قبول کرنے یا اس کے متعلق کوئی رائے دینے سے انکار کردیا، اس پر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''اللہ نے آپ کے علم کو جہل اور آپ کے یقین کو شک نہیں بنایا۔ دنیا میں آپ کی وہی چیز ہے جو آپ کسی کو دے دیں یا پہن کے پھاڑ ڈالیں یا کھا کے ختم کردیں۔ آج اگر آپ اس کو رہنے دیں گے تو کل اس پر وہ شخص قبضہ کرے گا، جو کسی طرح اس کا مستحق نہیں ہے!''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''آپ نے سچ کہا اور مجھے نیک مشورہ دیا!'' اس کے بعد اس فرش

Marfat.com

کو پھاڑ پھاڑ کے بانٹ دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حصے میں جو ٹکڑا آیا اگر چہ وہ کوئی خصوصیت نہ رکھتا تھا پھر بھی وہ بیس ہزار میں فروخت ہوا۔

جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینے میں نے تقسیم کر رہے تھے اور مسلمان اس مال غنیمت کو جو اس سے پہلے انہیں نصیب نہیں کیا گیا تھا، اللہ کا ایک خاص انعام سمجھ رہے تھے، حضرت سعد رضی اللہ عنہ مدائن کے قصر سفید میں راحت و اطمینان کے ساتھ اقامت فرما تھے۔ انہوں نے ایوان شاہی کو مسجد بنا لیا تھا، جہاں اللہ کا نام پکارا جاتا تھا، نماز پڑھی جاتی تھی اور ہر جمعے کو مسلمان حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا خطبہ سننے اور ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ لیکن یزدگرد اس زمانے میں رنجیدہ و غمگین حلوان میں پڑا تھا۔ غم اس کے دل کی رگیں کاٹ رہا تھا اور مایوسی اس کا کلیجہ کھا رہی تھی۔ ایران کی عظمت اور اس کا شرف جب اسے یاد آتا تو اس کے غم میں اور اضافہ ہو جاتا۔ رستم کی پرچھائیں رہ رہ کے آنکھوں کے سامنے آتی اور اسے ستاروں کی پیش گوئی یاد دلاتی۔ وہ دن اب کہاں گئے جب اس کے اسلاف نے ایران سے چل کر عراق پہ یلغار کی تھی اور دجلے کے کناروں تک سارا علاقہ فتح کر لیا تھا۔ جب انہوں نے سلوقیہ کے سامنے طیسفون پر اپنے جھنڈے گاڑے تھے۔ طیسفون اور سلوقیہ کو ملا کر مدائن کے نام سے ایک نیا شہر بنا دیا تھا اور سلوقیہ کا نام بدل بہر شیر کر دیا تھا کہ اس کے باشندے اپنے عروج و اقبال کے دن بھول جائیں۔ اس لیے کہ سلوقیہ ایک یونانی شہر تھا، جو اپنی آزادی کے لیے اسی طرح بے چین تھا جس طرح ایتھنز اور اسپارٹا اپنی اپنی آزادی کے لیے مضطرب تھے!

کہاں ہیں وہ دن! جب اس کے آباؤ اجداد۔۔۔ اکاسرہ بنی ساسان۔۔۔ نے تمام دنیا کو پامال کر کے رکھ دیا تھا۔۔۔ اور کہاں ہے وہ زمانہ! جب اس کا دادا اور مدائن کے قصر و ایوان کا مالک اردشیر عیش و راحت اور عظمت و جلال کی زندگی بسر کرتا تھا۔ آج وہ ایک ایسا بادشاہ ہے جسے شکست دے کر اس کے دارالسلطنت سے نکال دیا گیا ہے اور وہ بزدلوں کی طرح بھاگ آیا ہے تو کیا وہ اس ہزیمت پر صبر کر لے اور اس مصیبت پر راضی ہو جائے؟ کیا کارکنان قضا و قدر نے ان عربوں کی قسمت میں یہ لکھ دیا ہے کہ وہ اسے اس سرزمین کے آخری کنارے تک بھگا دیں؟ نہیں! اس میں تو شباب کی جرأت و حرارت تھی جو اس کے دامن امید کو وسیع کر رہی تھی، لیکن کیا اب بھی اس امید میں سے کچھ اس کے لیے باقی رہ گیا ہے، یا شکست نے اس جرأت کو ختم اور اس حرارت کو ٹھنڈا کر دیا ہے اور اس کے دل میں ہر آس اور ہر امید مر کے رہ گئی ہے؟

اس شکست خوردہ جوان نے حلوان پہنچتے ہی کچھ نہ سوچا اور مسلمانوں کو صلح کا پیغام بھیج دیا کہ دجلے کو حد فاصل قرار دے کر جنگ بند کردی جائے؟ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ مدائن فتح کرنے کے بعد مسلمان فتح وظفر کے قدم روک لیں اور آگے نہ بڑھیں؟ اگر ایسا ہو جائے تو اس کی کچھ امیدیں پوری ہو سکتی ہیں۔ آئندہ وہ اپنے لیے کوئی تدبیر سوچ لے گا۔ لیکن مسلمان فاتح ہیں اور فاتح رعایت کرنا نہیں جانتا۔ اس کے مقابلے میں اس کی کثیر فوجیں اپنی جان بچانے کے لیے ہر طرف ماری ماری پھر رہی ہیں۔ پھر تو مسئلے کو وقت کے حوالے کر دینا چاہیے اور کل کون سا دور! کل کیا ہوگا؟ یہی ہمارے آئندہ باب کا موضوع ہے!

❀⊙❀

Marfat.com

باب10:

مسلمانوں کا عراق پر تسلط

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کسریٰ کے محل میں قیام فرمایا اور باقی مسلمان محل کے گرد مدائن کے مکانوں میں سکون واطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے اور وہ ایسا کیوں نہ کرتے۔ ایک تو ان کے پاس مال غنیمت ہی اتنا تھا کہ برسوں ختم نہ ہوتا۔ دوسرے آس پاس کے علاقوں سے کھانے پینے کا بے شمار سامان بہ سہولت تمام پہنچ جاتا تھا۔ دجلہ ان کے قدموں تلے بہہ رہا تھا اور وہ ریگزار عرب کے ٹیلوں کو بھول گئے تھے۔ وہ پل، جو سلوقیہ اور طیسفون کو ملا کر مدائن کا یہ پرفضا اور بارونق شہر بنا تھا، واقعی اس لائق تھا کہ اسے دیکھ کر عربی شاعر کے دل پر بھی وہی الہامی کیفیت طاری ہو جائے جو بغداد کے ایک ایسے ہی پل کو دیکھ کر علی بن جہم پر طاری ہوئی تھی اور وہ بے اختیار کہہ اٹھا تھا:

عیون المھا بین الرصافۃ والجسر
جلبن الھوی من حیث ادری ولا ادری

ترجمہ: رصافہ اور جسر کے درمیان اس نیل گائے کی نشیلی آنکھیں خواہش کو محسوس طور پر کھینچتی ہیں"

لوگ قصر کسریٰ میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس جمع ہوتے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ اہل علم سے اس ملک کی گذشتہ تاریخ پر گفتگو فرماتے۔ وہ ان بیتے ہوئے دنوں کا ذکر کرتے جب یہ ملک دنیا کی تہذیب کا مرکز تھا اور اس کے مختلف حصوں میں بابل والوں، آشوریوں اور کلدانیوں کی حکومتیں تھیں۔ ان میں سے بعض حکومتیں تو یہاں قائم رہیں اور بعض مغلوب ہو کر یہاں سے رخصت ہو گئیں۔ اس کے بعد جو حکومت دجلہ وفرات کے درمیانی علاقے بین النہرین، میں جہاں قائم ہوئی وہیں کے نام سے مشہور ہو گئی۔

دجلہ وفرات کا یہ درمیانی علاقہ قدیم ترین زمانے سے "بین النہرین" کہلاتا ہے، چنانچہ فراعنہ متقدمین کے عہد میں، جب مصری اقتدار یہاں تک وسیع ہوا، یہ علاقہ اسی نام سے معروف

تھا اور اس کے بعد جب یونانیوں نے اسے اپنے دائرہ حکومت میں شامل کیا تو اس وقت بھی یہ اسی نام سے پکارا جاتا رہا۔ کچھ تعجب نہیں کہ آج بھی اس کا یہ نام باقی ہو؟ کیونکہ جو علاقہ ان دونوں دریاؤں کے درمیان واقع ہے اور جسے یہ سیراب کرتے ہیں اس کی سرسبزی وشادابی کی بہترین ترجمانی یہی نام کرتا ہے۔

بین النہرین کو عراق کے نام سے اس وقت موسوم کیا گیا جب ایرانی اقتدار نے وہاں اپنے پرچم گاڑے۔ ایرانیوں نے ایران کے میدانوں سے نکل کر فرعونوں اور یونانیوں کو یہاں سے نکالا اور دجلہ کے کناروں، بلکہ اس سے بھی آگے تک کے علاقوں پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے اپنے پیش روؤں کے دارالسلطنت طیسفون میں قیام کیا اور اس کے آس پاس کے سات شہروں اور سلوقیہ کی آزاد یونانی ریاست کو اس میں ضم کر کے ''مدائن'' کے نام سے ایک شہر بنا دیا جو اپنی عظمت کے جلال، اپنے اقتدار کی وسعت، اپنی دولت کی فراوانی اور اپنے باشندوں کی مرفہ الحالی کے اعتبار سے مدتوں تاریخ کی پیشانی کا تابناک ستارہ بنا رہا۔ چونکہ بین النہرین کا علاقہ عراق عجم سے متصل تھا، اس لیے ایرانیوں نے اس پر بھی عراق کا نام ٹھونس دیا اور جس طرح وہ سلوقیہ کو طیسفون کا ایک حصہ سمجھتے تھے اسی طرح بین النہرین کو عراق کا ایک حصہ سمجھ بیٹھے۔ اس دن سے اس ملک کو بھی عراق ہی کہا جانے لگا۔

عراق کا یہ حصہ، جو مسلمانوں نے ایرانیوں سے چھینا تھا ''دلتا النہرین''[1] کے جنوب سے چل کر شمال میں موصل کے قریب ختم ہوتا ہے اور وہیں سے شام کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ اس محل وقوع کا پہلے ایران اور روم کی تاریخ پر اثر تھا اور بعد کو اسلامی فتوحات کی تاریخ بھی اس سے متاثر ہوئی۔ عراق اور شام کی سرحدوں کے اس اتصال نے ان مذاہب کو عراق میں جگہ دی جن کا ظہور فلسطین میں ہوا تھا۔ پھر یونان کی صنم پرستی اور ایران کی مجوسیت جنگ وجدال کے راستے اس ملک میں داخل ہوئی یہی وجہ ہے کہ یہودیوں کا ایک بڑا مرکز یہاں قائم ہو گیا۔ اس کے بعد نصرانیت بھی شام ہوتی ہوئی عراق پہنچ گئی۔

بین النہرین کی سرزمین جس طرح ایران کے قریب تھی اسی طرح عرب کے قریب بھی تھی۔ چنانچہ بہت سے عربی قبائل شام کی طرح یہاں آ کر بھی آباد ہو گئے تھے۔ جب عربوں نے

---

[1] دلتا معرب ہے ڈیلٹا کا جو ایک جغرافیائی اصطلاح ہے۔ مثلث کی شکل کا وہ قطعہ زمین جو دریاؤں کے دہانے میں زرخیز مٹی کے جمع ہو جانے سے بن جاتا ہے۔ (مترجم)

Marfat.com

بین النہرین پر چڑھائی کی تو وہ اس کے نام عراق سے مانوس تھے، اس لیے انہوں نے اس کا کوئی اور نام نہ رکھا۔ البتہ دجلہ وفرات کے درمیانی حصے اور اس کے آس پاس کے علاقوں کو سواد کہہ کر پکارنے لگے۔ بعد کو مؤرخین نے اس عراق اور عجمی عراق کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے کے لیے ایک کو عراق کے نام سے موسوم کر دیا اور دوسرے کو عراق عجم کے نام سے۔

عراق عرب اور عراق عجم طبعی جغرافیے کے اعتبار سے باہم بالکل مختلف ہیں۔ عراق عرب کی زمین نرم وہموار ہے، جس میں دو دریا بہتے ہیں اور نہروں، ندی، نالوں اور سرسبز قطعات کا گویا ایک جال سا بچھا ہوا ہے اس کا بیشتر حصہ شاداب اور زرخیز ہے اور مشرق سے شروع ہو کر اس بلند پہاڑ پر ختم ہوتا ہے جو عراق عرب کو عراق عجم سے جدا کرتا ہے۔ اس کے پیچھے پہاڑوں اور وادیوں کا ایک سلسلہ ہے جو ایران کے میدانی علاقے پر جا کر تمام ہوتا ہے۔ یہ پہاڑ ایک قدرتی فصیل ہے جو ایشیا اور اس کے مشرق اقصیٰ کو مغربی ایشیا کے اس ملک سے جدا کرتی ہے اور اسی لیے عراق عرب اپنی ہمسایہ مشرقی اقوام کے مقابلے میں افریقہ اور یورپ کی ان قوموں سے زیادہ قریب ہے جو بحر ابیض کے ساحلوں پر رہتی بستی ہیں۔

اس جغرافیائی محل وقوع کا اثر تھا کہ قبائل عرب نے عراق وشام کی طرف ہجرت کی اور عربی نسل کی آبادیاں جنوب میں خلیج عدن اور بحر ہند سے لے کر شمال کے آخری کنارے سرزمین عراق وشام تک پھیل گئیں اور اسی بنا پر جزیرہ نمائے عرب کے بیشتر حصوں کی طرح یہ قبائل بھی مدتوں ایران وروم کے محکوم رہے، لیکن آج جزیرہ نمائے عرب کے وہی باشندے ہیں، جو دنیا کی دو بڑی سلطنتوں سے ٹکرا رہے ہیں۔ وہ شام میں دمشق اور عراق میں مدائن تک پہنچ گئے ہیں اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کسریٰ کے شاہی محل میں اقامت فرما ہیں۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ اس بارونق پایہ تخت میں مقیم رہے تا آنکہ وہ اور ان کی فوج کے سپاہی تازہ دم ہو گئے۔ انہوں نے دجلہ کے اس پار عراق عرب کے وسیع علاقے میں ایرانیوں کا تعاقب نہ کیا، اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا حکم نہیں دیا تھا اور صرف جاسوسوں کے ذریعے ان کی خبریں حاصل کرتے رہے۔ انہیں اطلاع ملی کہ شکست کھا کر بھاگنے والے ایرانیوں نے جلولا میں پناہ لی ہے جو مدائن کے شمال میں چالیس میل کی مسافت پر واقع ہے اور یہ دیکھ کر کہ وہاں سے ایران کے مختلف گوشوں میں راستے پھٹتے ہیں، ایک دوسرے سے کہا ہے: ''اب یہاں سے بھی پیچھے ہٹے تو ہماری قوت منتشر ہو جائے گی اور قلمرو عجم کے تمام علاقے ایک دوسرے سے منقطع

Marfat.com

ہو جائیں گے۔اس لیے یہاں لشکر جمع کر کے ہم عربوں سے ایک زبردست مقابلہ کریں۔فتحیاب ہوئے تو فبہا، ورنہ کوئی یہ تو نہ کہے گا کہ ہم نے وطن کی حمایت کا حق ادا نہیں کیا۔'' اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ حلوان کے راستے میں بہت سے آدمی یزدگرد کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اس نے مختلف شہروں کی فوج جمع کر کے مہران کی سرکردگی میں جلولا بھیج دی ہے اور خود حلوان میں بیٹھ کر امدادی فوجیں اور سامان بھیج رہا ہے، مدائن کے بھگوڑے بھی جلولا میں اس فوج سے آ ملے اور ان سب نے شہر کے گرد ایک بہت بڑی خندق کھود کے اس کے چاروں طرف لوہے کے نکیلے تار بچھا دیئے۔ان تمام حفاظتی انتظامات سے فارغ ہو کر وہ شہر میں بیٹھ گئے اور فرار نہ ہونے کی قسم کھا کر یہ عہد کر لیا کہ جب تک عربوں کا ایک ایک آدمی ختم کر کے انہیں اپنے ملک سے نکال باہر نہ کریں گے، چین سے نہ بیٹھیں گے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ قصر کسریٰ میں تھے کہ یہ خبریں پہنچیں۔انہوں نے اس کی اطلاع بارگاہ خلافت میں بھیجی۔ وہاں سے حکم آیا کہ ہاشم بن عتبہ کو بارہ ہزار فوج کے ساتھ جلولا بھیج دو۔ مقدمۃ الجیش پر قعقاع بن عمرو کو مقرر کرنا۔اسی طرح میمنے، میسرے اور ساقے کے افسروں کے نام لکھے ہوئے تھے، فوج پہلے ہی تازہ دم ہو چکی تھی۔ مدائن میں چند مہینے آرام و آسائش کی زندگی گزار لینے اور اللہ کی عطا کردہ غیر معمولی نعمتوں سے آسودگی حاصل کر لینے کے بعد اس میں جنگ کا ولولہ از سر نو بیدار (1) ہو چکا تھا۔ ہاشم بن عتبہ جلولا پہنچے تو ایرانی قلعہ بند ہو کر اس کی مدافعت کے

---

(1) بعض روایات میں ہے کہ مسلمانوں نے مدائن میں صرف چند روز قیام کیا اور جب انہیں یہ اطلاع ملی کہ ایرانی جلولا میں جمع ہیں تو ہاشم بن عتبہ وہاں پہنچ گئے، لیکن ہم ان روایتوں کو درست نہیں سمجھتے، اس لیے کہ ایرانیوں کی تیاری اور حلوان سے یزدگرد کی امداد کے لیے ایک اچھا خاصا وقت درکار ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ جب تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوئی صاف و صریح حکم نہ پہنچ جاتا، حضرت سعد رضی اللہ عنہ جلولا کی طرف از خود فوج روانہ نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ حضرت ابوبکر کی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بھی یہی سیاست تھی اور جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مدائن کا مال غنیمت تقسیم کرنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا اور خمس کے ساتھ مدینہ روانہ کیا جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں میں تقسیم کیا اس کے بعد حضرت سعد نے دوسرا خط حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس وقت لکھا جب انہیں واضح طور پر یہ اطلاع ملی کہ ایرانی جلولا میں جمع ہیں اور یزدگرد حلوان میں بیٹھا کی امداد کر رہا ہے۔ یہ تمام مرحلے گزر جانے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں حکم دیا کہ ہاشم کو جلولا بھیج دیا جائے۔ان حقائق کے پیش نظر ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اچھی خاصی مدت مدائن میں قیام کرنے کے بعد ہاشم فوج لے کر جلولا روانہ ہوئے۔ ہماری رائے کی تائید طبری کی یہ روایت بھی کرتی ہے کہ جلولا ذوالقعدہ سنہ 16 کے آغاز میں فتح ہوا اور اس کی اور مدائن کی فتح میں نو مہینے کا وقفہ ہے۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ جلولا اسی دن محاصرے کے بعد فتح کیا گیا۔ان دنوں کو طبری کے بیان کردہ نو مہینوں میں سے منفی کیا جائے تو چھ مہینے باقی رہتے ہیں یہ وہ مدت ہے جو ہاشم کے جلولا روانہ ہونے سے پہلے مسلمانوں نے مدائن میں گزاری۔

Marfat.com

لیے جان کی بازی لگائے بیٹھے تھے۔ یہ دیکھ کر ہاشم نے محاصرہ کرلیا،لیکن صرف محاصرہ ہی ایرانیوں کی سپراندازی کے لیے کافی نہ تھا کیونکہ جس طرح مدائن سے مسلمانوں کو مسلسل کمک پہنچ رہی تھی،اسی طرح ایرانیوں کے لیے بھی حلوان سے برابر مدد آ رہی تھی محاصرہ اسی دن تک جاری رہا۔ اس دوران میں ایرانی مسلمانوں سے مقابلے کے لیے نکلتے اور شکست کھا کر پھر اپنے مورچوں میں واپس ہو جاتے۔ آخر کار انہیں یقین ہو گیا کہ اگر کچھ دن اور یہی حالت رہی تو ان کا وقار ختم ہو جائے گا

اوران کی کثرت تعداد بھی ان کے لیے سودمند ثابت نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ ایرانی سپہ سالار مہران نے اپنی فوج کو حملے کا حکم دیا اور زور شور کی لڑائی شروع ہو گئی۔ ابن کثیر لکھتے ہیں: ''اتنی شدت کی جنگ ہوئی جس کی مثال نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ طرفین کے تیر ختم ہو گئے، نیزے ٹوٹ گئے اور نوبت تلواروں اور کلہاڑوں تک پہنچ گئی۔ ظہر کا وقت ہوا تو مسلمانوں نے اشارے سے نماز ادا کی۔ ایرانیوں کی یہ فوج جب تھک گئی تو واپس چلی گئی۔ قعقاع بن عمرو نے مسلمانوں سے کہا: ''مسلمانو! یہ دیکھ کر کہیں تم ڈر تو نہیں گئے؟'' مسلمانوں نے جواب دیا: ''ہاں، ہم تھکے ہوئے ہیں اور وہ تازہ دم ہیں۔'' قعقاع نے کہا: ''نہیں! ہم ان پر حملہ کریں گے اور اس وقت تک ان کی جان نہ چھوڑیں گے جب تک اللہ تعالیٰ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی فیصلہ نہ کر دے۔ یکجان ہو کر ان پر ٹوٹ پڑو اور ان کی صفوں میں گھس جاؤ!'' یہ کہہ کر حملہ کیا اور چند بہادروں کو ساتھ لے کر اس مقام تک گھستے چلے گئے جہاں خندقوں کے درمیان گزرنے کے لیے راستہ بنایا گیا تھا اس وقت جھٹ پٹا ہو چکا تھا۔ قعقاع نے دیکھا کہ اندھیرے کی وجہ سے لوگ پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ اتنے میں ان کے نقیب نے نعرہ لگایا: ''کہاں ہو؟ اے مسلمانو! دیکھو، یہ تمہارے سردار دشمنوں کی خندق کے حصار میں داخل ہو گئے ہیں، آؤ! اور کسی رکاوٹ کی پرواہ نہ کرو!'' مسلمانوں نے اتنے زور کا حملہ کیا اور دشمنوں کو اس بری طرح قتل کرنے لگے کہ لیلۃ الہریر کی یاد تازہ ہو گئی۔ مسلمان جب خندق کے قریب پہنچے تو دیکھا، گزرگاہ پر قعقاع قبضہ کیے ہوئے ہیں اور ایرانی ان کے سامنے دائیں بائیں بھاگ رہے ہیں کیونکہ بیچ میں خندق حائل ہے جس کی وجہ سے وہ شہر میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اب مسلمانوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور کشتیوں کے پشتے لگا دیئے، چنانچہ دم بھر میں ایک لاکھ لاشیں بچھ گئیں۔

جو ایرانی باقی بچ گئے وہ حلوان بھاگ گئے۔ قعقاع نے تعاقب کر کے خانقین کے مقام پر مہران کو جا لیا اور قتل کر دیا۔ فیروزان گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلا اور حلوان پہنچے۔ جب ...

Marfat.com

مصیبت یزدگرد سے بیان کی۔ یزدگرد رے بھاگ گیا اور قعقاع حلوان جا پہنچے۔ محافظین شہر مقابلے کے لیے نکلے اور شدید جنگ کے بعد شکست کھا گئے مسلمان شہر میں داخل ہوئے جہاں بہت سا مال غنیمت اور لونڈی غلام ان کے ہاتھ آئے اور انہوں نے شہر اور اس کے نواحی علاقوں پر جزیہ عائد کر دیا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جلولا کی فتح، وہاں سے حاصل ہونے والے بے شمار مال غنیمت اور قعقاع کے حلوان پہنچنے کی اطلاع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کی اور ایرانیوں کو ان کے اندرون ملک میں مار بھگانے کی اجازت چاہی، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے احتیاط کو ترجیح دی اور قادسیہ کے ہیرو اور مدائن کے فاتح کی رائے سے اتفاق نہ فرمایا۔ انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو لکھا: ''میں چاہتا ہوں کہ سواد اور پہاڑ کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو جائے کہ نہ وہ ہماری طرف آ سکیں نہ ہم ان کی طرف جا سکیں۔ ہمارے لیے سواد کا علاقہ ہی کافی ہے۔ میں مسلمانوں کی سلامتی کو مال غنیمت پر ترجیح دیتا ہوں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ رائے سو فیصد درست تھی، محض اس لیے نہیں کہ وہ مسلمانوں کی سلامتی کو ہر چیز پر مقدم رکھتے تھے، بلکہ اس لیے بھی کہ مسلمان ابھی تک عراق میں کلیۃً محفوظ و مامون نہیں تھے اور ان کے قدم ہنوز وہاں پوری طرح نہیں جمے تھے۔ باوجودیکہ مدائن فتح کر لینے کے بعد مسلمانوں نے تکریت، موصل، ہیت اور قرقیسیاء پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ تاہم شمالی عراق سے انہیں خطرہ لاحق تھا اور یہی حال جنوبی سمت کا بھی تھا۔ حالانکہ مدائن سے پہلے اور اس کے بعد مسلمانوں نے اس کو بھی فتح کر لیا تھا۔ ایسی صورت میں یہ کوئی دوراندیشی کی بات نہ تھی کہ اسلامی لشکر کو ایران کے پہاڑوں اور ان کی پشت پر پھیلے ہوئے وسیع میدانوں میں پھینک دیا جائے، اگر اس کے بعد عراق میں بغاوت کی آگ پھیل جاتی جس طرح حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی آمد اور شاندار فتح سے پہلے پھیل چکی تھی تو اس پر قابو پانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ مسلمان ایران کے پہاڑوں کو اپنے اور ایرانیوں کے درمیان حد فاصل بنالیں اور ہر اس اثر کا خاتمہ کرنے کی انہیں مہلت بھی مل جائے جو عراق میں بغاوت کا سبب بن سکتا ہو، تاکہ حکومت کا نظم ونسق مستحکم بنیادوں پر قائم ہو جائے۔

اس کے علاوہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیاست یہ تھی کہ عربی نسل کو، جو بحر ہند سے لے کر شمال میں عراق و شام تک بکھری پڑی تھی، اتحاد کی لڑی میں پرو کر جزیرۃ العرب بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں

Marfat.com

مدینے کے زیر اقتدار لے آیا جائے ان کے نزدیک یہی کافی تھا کہ عربی اقوام اس اقتدار کے تحت سکون واطمینان کی زندگی بسر کریں اور دین الٰہی کی دعوت دلیل و حجت اور پند و موعظت کے ذریعے پوری آزادی کے ساتھ جاری رہے۔ عربوں اور مسلمانوں کے دل سے روم و ایران کی دہشت زائل ہو جائے اور وہ ان دونوں کے درمیان ایک شریف معزز ہمسائے کی طرح رہ سکیں۔ اس کے بعد اللہ اپنے دین کو تمام مذاہب پر خود ہی غالب کر دے گا، چاہے کافر کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے لیے امیر المومنینؓ کی رائے اور حکم پر عمل کرنا ضروری تھا۔ فوج اور اس کے دوسرے افسروں نے بھی یہ دیکھ کر کہ عراق کے مختلف گوشوں میں برپا ہونے والی بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے انہیں بار بار اِدھر اُدھر جانا پڑتا ہے، اس رائے کو تسلیم کر لیا۔ قادسیہ، مدائن اور جلولا کی لڑائیوں میں ان کی ضرورت اور خواہش سے کہیں زیادہ مال غنیمت انہیں مل گیا تھا۔ جلولا میں جو زر و مال ان کے ہاتھ آیا، وہ مدائن کے زر و مال سے کم نہ تھا۔ چنانچہ جلولا کے مال غنیمت کا اندازہ تین کروڑ کا تھا جس میں وہ نفائس و نوادر بھی شامل تھے جو ایرانی مدائن سے لے کر بھاگ تھے۔ اس کے علاوہ جلولا میں انہیں بار برداری کے جانور اور جنگی ہتھیار بھی ملے، جن میں سے ایک چیز بھی ایرانیوں نے مدائن میں نہ چھوڑی تھی۔ اسی طرح یہاں لونڈی غلام بھی ان کے ہاتھ لگے۔ حالانکہ مدائن میں کوئی غلام انہیں نہ ملا تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جب یہ بے شمار مال غنیمت فوج میں تقسیم کیا تو ہر سوار کے حصے میں نو ہزار کی رقم اور نو بار بردای کے جانور آئے۔ کنیزیں اور غلام اس کے علاوہ تھے اور کنیزوں میں کچھ ایسی بھی تھیں جنھوں نے نعمت و آسائش کی آغوش میں پرورش پائی تھی اور اسی نعمت و آسائش کی زندگی نے انہیں پہاڑوں اور میدانوں میں فرار نہ ہونے دیا تھا!

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جلولا کے مال غنیمت کا خمس زیاد بن ابی سفیان کی نگرانی میں مدینہ بھیجا۔ جب یہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو زیاد نے جلولا اور حلوان کی فتح کے حالات ایسی فصاحت و بلاغت سے بیان کیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جس طرح یہ حالات تم نے مجھ سے بیان کیے ہیں، یونہی مجمع عام میں کھڑے ہو کر سب کے سامنے بیان کر دو گے؟'' زیاد نے عرض کیا: ''ضرور یا امیر المومنین! بخدا! دنیا بھر میں مجھ پر اگر کسی کا رعب پڑ سکتا ہے تو آپ کا! جب آپ کے سامنے بیان کر دیا تو اور لوگوں کے سامنے بیان کرنا کیا مشکل

Marfat.com

ہے!'' چنانچہ زیاد کھڑے ہوئے اور لڑائی کے حالات، مسلمان جاں بازوں کے کارنامے، ایرانی مقتولوں کی تعداد اور مال غنیمت کی تفصیل اپنے حسین و دل نشیں اسلوب میں بیان کی کہ آنکھوں کے سامنے تصویر کھنچ گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حیرت و استعجاب کے لہجے میں فرمایا: ''واللہ! یہ زبان آور خطیب ہے!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس تحسین سے زیاد کے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور انہوں نے کہا: ''ہماری فوج نے اپنے کارناموں سے ہماری زبانیں کھول دی ہیں!''

بعض اہل الرائے نے امیر المومنین کو مشورہ دیا کہ خمس بیت المال میں داخل کر دیا جائے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''واللہ! میں اسے بیت المال کی چھت کے نیچے رکھنے سے پہلے تقسیم کر دوں گا۔'' چنانچہ یہ مال مسجد نبویؐ کے صحن میں رکھا رہا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ نے رات بھر پہرہ دیا۔ صبح ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لائے، پہلے نماز پڑھائی اور جب سورج طلوع ہوا تو اس دولت پر سے چادر ہٹائی گئی۔ یاقوت، زبرجد، جواہرات اور سونے چاندی کے اس ڈھیر پر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی نظر پڑی اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: ''امیر المومنین! آپ رو کیوں رہے ہیں؟ بخدا! یہ تو شکر کا مقام ہے!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا: ''مجھے اس دولت کے ملنے پر رونا نہیں آیا، خدا کی قسم! اللہ نے جس قوم کو یہ چیزیں دیں اس میں کینہ و حسد پیدا ہو گیا اور جب کسی قوم میں حسد پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا وقار اٹھ جاتا ہے۔''

یہاں ہم تھوڑی دیر کے لیے اس حکیمانہ مقولے پر توقف کریں گے، اس سے پہلے کہ ہر چہار طرف سے یہ مال غنیمت آئے، عرب بے محنت کی روزی سے ناآشنا تھے وہ رزق کی تلاش میں زمین کا گز بنے پھرتے تھے اور بڑی محنت و مشقت کے بعد بقدر ضرورت روزی انہیں میسر آتی تھی۔ گرمی اور جاڑے میں وہ یمن اور شام کے تجارتی سفر پر جاتے تھے اور اس سفر میں انہیں رستے کی دشواریوں کے علاوہ رہزنوں کے حملے سے بھی دوچار ہونا پڑتا تھا، جو قافلے مال لے کر مغرب و مشرق کے درمیان آتے جاتے تھے، لٹیرے عموماً ان پر چھاپے مارتے اور انہیں اپنے مال کی حفاظت کے لیے ان سے جنگ کرنی پڑتی۔ اس طرح گوناگوں خطرات میں مبتلا ہو کر انہیں اپنی زندگی کا سرو سامان کرنا پڑتا تھا، لیکن اب یہی لوگ تھے، جن کے پاس بے شمار مال غنیمت چلا آ رہا تھا اور جو اللہ کی عطا کردہ نعمتوں سے آسودگی حاصل کر رہے تھے۔ دیکھیے! اقتصادی زندگی کا یہ عظیم انقلاب انہیں کہاں لے جاتا ہے؟ عین ممکن ہے کہ وہ اطمینان و آسائش کے خوگر

جائیں اور اطمینان، بغض وحسد کا دروازہ ہے۔ اس لیے کہ اطمینان وفراغت حاصل ہو جانے کے بعد ہر انسان یہ چاہنے لگتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ حصہ بٹور کے اپنے عیش و آرام میں اضافہ کرے اور انسان جب عیش و آرام کی تھپکیوں کا عادی ہو جاتا ہے تو اس کی عملی قوتوں کو زنگ لگ جاتا ہے اور بغض وحسد اس کی بنی بنائی بات بگاڑ دیتے ہیں۔ بھلا ان چیزوں کا اس اخوت اور اس تعاون وتساند سے کیا علاقہ جس کی طرف اللہ بلاتا ہے کہ افراد اپنی قوم کا سرمایہ فخر اور اس حق کے معاون ومددگار ہوں، جو اللہ نے ان کی نصرت وعزت کیلئے اپنے رسول ﷺ پر نازل فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ سکون وفراغت، کمزوری وکینہ پروری کا پیش خیمہ ہیں اور رو دیئے۔ گویا غیب کی چلمن میں سے وہ تحریر دیکھ لی جو دست قضا نے اس قوم کی لوح تقدیر پر لکھ دی تھی جس نے اپنے امیر کے ہاتھ پر بیعت کی اور قوم وامیر دونوں کو ایک دوسرے سے عزت وسربلندی حاصل ہوئی۔ تا آنکہ اس کے حیرت انگیز کارناموں نے جزیرہ نمائے عرب کے ریگزار میں نعمت وشادابی کے دریا بہادیئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب مسلمانوں کے مشورہ واتفاق سے وہ مال غنیمت تقسیم کیا، جس نے انہیں رلایا تھا اور بعض اہل مدینہ کو کچھ زیادہ حصہ دیا۔ اس مال غنیمت کی تقسیم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہی طریق کار اختیار فرمایا جو جنگ قادسیہ کے خمس کی تقسیم میں اختیار فرمایا تھا۔ اس خمس کی تقسیم کے وقت زیاد بن ابی سفیان موجود تھے۔ اس کے بعد وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مکتوب اور یہ حکم لے کر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے پاس روانہ ہو گئے کہ ''ایرانیوں کے ملک میں گھس کر ان سے جنگ نہ کی جائے۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ خط پڑھا تو امیر المومنینؓ کی حکمت کے اور زیادہ قائل ہو گئے۔ یہ اس لیے کہ جب انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جلولا میں ایرانیوں کے اجتماع اور حلوان سے یزدگرد کی امداد کے متعلق لکھا تھا تو ساتھ ہی یہ بھی تحریر کیا تھا کہ:

''موصل کے رومی تکریت میں جمع ہو رہے ہیں جو مدائن کے شمال میں دجلہ کے قریب واقع ہے اور عرب کے عیسائی قبائل ایاد، تغلب اور نمران کے ساتھ مل کر انہیں مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے اکسا رہے ہیں۔'' اس خط کا جواب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیا اور ان کے حکم کے مطابق عبداللہ بن معتم پانچ ہزار فوج لے کر تکریت روانہ ہو گئے۔ اس فوج نے چالیس دن تک شہر کا محاصرہ جاری رکھا، جس سے تنگ آ کر رومیوں نے ارادہ کیا کہ کشتیوں میں اپنا سامان لاد کر بھاگ جائیں۔ ابن معتم کو یہ اطلاع ملی تو انہوں نے عرب عیسائیوں سے دعوت اسلام کے سلسلے

Marfat.com

میں مراسلت کی اور انہیں مسلمانوں کی مدد پر ابھارا اور کہا، جو حصہ مسلمانوں کا ہوگا وہی تمہارا بھی ہوگا۔ عرب عیسائیوں نے اس کو قبول کرلیا۔ اس پر ابن معتم نے ان کے پاس پیغام بھیجا کہ شہر کے ان دروازوں پر قبضہ کرلو جن سے دریا کی طرف رستہ جاتا ہے۔ رومی کشتیوں پر سوار ہونے کے لیے نکلے تو ان کا قتل عام شروع ہوگیا۔ ادھر مسلمانوں نے شہر پر حملہ کردیا۔ مسلمانوں نے اللہ اکبر کے نعرے بلند کیے تو دوسری طرف سے عربوں نے بھی یہی نعرے دہرانے شروع کردیے۔ رومی گھبرا کر دروازوں سے نکلنے لگے، لیکن سامنے سے مسلمانوں نے انہیں اپنی تلواروں پر رکھ لیا اور پیچھے سے ان عربوں نے ان کا صفایا کرنا شروع کردیا جو اسی رات مسلمان ہوئے تھے یہاں تک کہ رومیوں کا ایک آدمی بھی زندہ نہ بچا۔ اس کے بعد جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خط میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا۔ عبداللہ بن معتم نے ربعی بن افکل عنزی کو موصل روانہ کیا۔ ابن افکل جن کے ساتھ ایاد، نمر اور تغلب کے نو مسلم تھے، برق رفتاری کے ساتھ نینویٰ اور موصل کے قلعوں پر جا پہنچے، جہاں ابھی تک تکریت کی خبریں نہیں پہنچی تھیں۔ قلعے والوں نے مقابلے کا ارادہ کیا، لیکن جب انہیں تکریت کا حشر معلوم ہوا تو جزیے پر صلح کرلی۔ جب تکریت کا مال غنیمت تقسیم کیا گیا تو سوار کے حصے میں تین ہزار درہم آئے اور پیادے کے حصے میں ایک ہزار۔

تکریت اور موصل کی شکست کی خبریں شام میں ان کے بھائیوں کے پاس پہنچیں۔ وہ پہلے ہی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی شجاعت سے خائف تھے، جس کا ذکر آگے آئے گا یہ دیکھ کر ان کے اوسان اور بھی جاتے رہے کہ مسلمان عراق میں پیش قدمی کرتے کرتے شام کی سرحدوں تک آ پہنچے ہیں اب ایک طرف تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ انہیں دباتے ہوئے ان سرحدوں کی طرف لے جا رہے تھے اور دوسری طرف عراق کا اسلامی لشکر ان کی سمت بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس صورت میں ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا تھا کہ وہ ہر طرف سے محصور ہو کر تسلیم واطاعت کا جوا اپنے کندھوں پر روک لیں۔ چاروناچار انہوں نے مسلمانوں کے خلاف اہل جزیرہ سے مدد طلب کی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو یہ خبر اس وقت ملی جب ہاشم بن عتبہ جلولا سے فتح یاب ہو کر واپس آ گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انہیں یہ اطلاع بھی پہنچی کہ اہل جزیرہ کا ایک بڑا بھاری لشکر فرات کے کنارے، ہیت کے مقام پر جمع ہو چکا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عمرو بن مالک کی سرکردگی میں ایک لشکر وہاں بھیجا۔ عمرو بن مالک جب منزل مقصود پہنچے تو دشمن قلعہ بند ہوا بیٹھا تھا اور اس نے اپنے چاروں طرف خندق کھود رکھی تھی۔ عمرو نے جنگ

Marfat.com

ان کے اس حفاظتی انتظام کو دیکھا تو حارث بن یزید کو اپنا قائم مقام بنا کر شمال کی طرف قرقیسیا چلے گئے جو عراق وشام کی سرحد پر فرات اور خابور کے سنگم کے قریب واقع تھا۔ عمرو نے بزور شمشیر اس پر قبضہ کر لیا اور قرقیسیا والے جزیہ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ اس کے بعد عمرو بن مالک نے حارث بن یزید کو لکھا کہ ہیت کی قلعہ بند فوجیں اگر حصار سے باہر آ جائیں تو انہیں کچھ نہ کہو، ورنہ ان کی خندق کے گرد ایک اور خندق کھود لو جس کے دروازے تمہاری طرف ہوں۔ حارث نے اہل ہیت کو اپنے اس ارادے سے آگاہ کیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ یہ محاصرہ ہماری موت تک جاری رہے گا۔ چنانچہ انہوں نے شہر خالی کر دیا اور مسلمان اس پر قابض ہو گئے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ہیت اور قرقیسیا میں اسلامی فتوحات کی خبر ملی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس دانش مندانہ حکم پر ان کا ایمان اور بڑھ گیا کہ ایران کے پہاڑوں اور میدانوں میں یزدگرد کی فوجوں کا تعاقب نہ کیا جائے۔ اگر وہ ایرانیوں کا پیچھا کرتے اور عراق میں بغاوت کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا یا ایرانی اسے بھڑکانے کی کوشش کرتے تو اس کا استیصال دشوار ہو جاتا۔ جلولا میں ہاشم کی فتحیابی کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ ایرانی فوجیں عراق عرب کی مشرقی اور ایران کی مغربی سرحدوں کے درمیان ماسبذان کے مقام پر جمع ہوئی ہیں۔ یہ سن کر انہوں نے ضرار بن خطاب کو فوج دے کر روانہ کیا۔ ماسبذان کے میدان میں مقابلہ ہوا۔ ضرار نے دشمن کو شکست دے کر ایرانی سالار لشکر کو قتل کر دیا۔ ایرانی ماسبذان کے شہر میں گھس گئے۔ مسلمان مفرورین کے تعاقب میں آگے بڑھے اور شہر ماسبذان پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ اہل شہر گھر بار چھوڑ چھاڑ کے پہاڑوں میں بھاگ گئے۔ ضرار نے انہیں واپس بلا لیا اور جزیہ عائد کر کے ماسبذان میں آباد کر دیا۔

عراق کے شمال مشرق میں ان مسلسل حملوں کی کامیابی نے یہاں کی باشندوں کو مسلمانوں کا مطیع ومنقاد بنا دیا۔ عراق کا جنوبی حصہ اس سے پہلے ہی ان کا تابع فرمان ہو چکا تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ اس علاقے کے لوگوں نے اسی زمانے میں مسلمانوں کی قوت دیکھ لی تھی جب حضرت خالد بن ولید اور مثنیٰ بن حارثہ نے عہد صدیقی میں ان پر حملہ کیا تھا۔ اس کے بعد جب سارے کا سارا عراق مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تو اس جنوبی حصے نے بھی بغاوت کر دی۔ چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو قادسیہ کی مہم پر روانہ کیا تو عتبہ بن غزوان کو جنوبی حصے پر چڑھائی کے لیے بھیجا۔ عتبہ، عرفجہ بن ہرثمہ بارقی کے ساتھ ابلہ روانہ ہوئے

Marfat.com

جو اس مقام کے قریب واقع تھا۔ جہاں آج کل بصرہ آباد ہے۔

کئی ہفتوں کی جنگ کے بعد مسلمانوں نے اس پر قبضہ کیا۔ ابلہ ان دنوں ایک بہت بڑی بندرگاہ تھی، جہاں چین اور ہندوستان سے آنے جانے والے جہاز لنگر انداز ہوتے تھے۔ یہاں ہندوستانی تاجروں کی ایک بہت بڑی تعداد رہتی تھی۔ جب شہر کے محافظوں نے شکست کھائی تو اہل شہر ہلکا پھلکا سامان لے کر نکل گئے۔ مسلمان شہر میں داخل ہوئے اور جو کچھ ملا آپس میں تقسیم کرلیا۔ عتبہ نے شکست خوردہ فوج کے تعاقب میں دریا پار کیا اور دست میسان کو حملہ کر کے فتح کرلیا۔ وہاں کا سردار گرفتار ہوا اور عتبہ نے اس کی بیٹی مدینہ بھیج دی، جو شخص بیٹی لے کر گیا اس کی زبانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ عرب، عراق میں دنیا کی نعمتوں کو دل دے بیٹھے ہیں۔ امیر المومنینؓ اس انجام سے ڈرے اور دریافت حال کے لیے عتبہ کو بلوا بھیجا۔

عتبہ نے فوج پر مجاشع بن مسعود اور نماز کے لیے مغیرہ بن شعبہ کو اپنا قائم مقام بنایا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مجاشع کے نائب بنائے جانے کی اطلاع ملی تو بہت ناراض ہوئے اور عتبہ سے کہا: ''تم بدوؤں کو شہریوں پر حاکم بنا کر آئے ہو۔ جانتے ہو، اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟'' عتبہ نے کہا: ''مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے مرغاب میں ایرانیوں کو شکست دی ہے اور میں نے مجاشع کے فاتح فرات ہونے کے باوجود، فوج کا امیر مغیرہ رضی اللہ عنہ بنایا ہے تاکہ کوئی بدوی کسی قرشی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی پر امیر نہ ہو۔

مغیرہ رضی اللہ عنہ کا ایرانیوں پر فتح پانا کوئی ہنسی کھیل نہ تھا۔ قیامت کی لڑائی ہوئی اور ایرانیوں نے جان کی بازی لگادی۔ اسی اثناء میں انہوں نے دیکھا کہ ایک دستہ میدان کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے۔ وہ سمجھے مسلمانوں کی کمک آگئی ہے۔ یہ دیکھ کر ان کی ہمت جواب دے گئی اور وہ شکست کھا گئے۔ یہ کوئی امدادی دستہ نہ تھا بلکہ خواتین اسلام اپنے اپنے خیموں سے نکل آئی تھیں اور اپنے آنچلوں کے پرچم بنا کر مردوں کی اعانت کے لیے میدان جنگ میں پہنچ گئی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عتبہ کو اپنی خدمت پر واپس جانے کا حکم دیا، لیکن عتبہ نے معذرت چاہی جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قبول نہ فرمایا۔ عتبہ ابھی عراق کے رستے ہی میں تھے کہ پیغام اجل آپہنچا اور ان کی جگہ مغیرہ رضی اللہ عنہ فوج کے سپہ سالار رہے۔ ①

① عہد فاروقیؓ میں ابلہ کی فتح کے متعلق ایک اور بھی روایت ہے جسے ابن اثیر نے ترجیح دی ہے۔ اس روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ علاء بن حضرمی نے عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں ''دلتا النہرین'' پر حملہ کرنے کے متعلق سوچا۔ جس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مثنیٰ نے سوچا تھا لیکن علاء اپنے ارادے کو جامہ عمل نہ پہنا سکے اور اپنی فوج کے ساتھ خلیج فارس کے ساحل پر نہ

Marfat.com

مسلمانوں کو عراق میں اطمینان نصیب ہوا اور وقت آ گیا کہ وہ نظام حکومت کے قیام کے متعلق غور و فکر کریں۔ آپ کی رائے میں کیا ان کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ عراق میں ایسے آدمی مقرر کر دیتے جو نو مسلموں کو دین کی تعلیم دیں اور غیر مسلموں سے جزیہ وصول کر لیا کریں؟ رسول اللہ ﷺ کا طریق عمل یہی تھا کہ جزیرہ نمائے عرب کے قبائل جب دائرہ اسلام میں داخل ہوتے تو حضور ﷺ کچھ آدمی ان کے پاس بھیج دیتے جو انہیں دین کی باتیں سکھاتے اور ان سے زکوٰۃ وصول کرتے۔ اب اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی عراق میں یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں تو اس کے نتائج سے محفوظ رہ سکتے ہیں؟''

عہد رسالت میں مکہ اور طائف کو چھوڑ کر کوئی شہر اور کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جو بزور شمشیر اسلام لایا ہو۔ اس کے باوجود حضور ﷺ کی وفات سے کچھ ہی پہلے مرتدین نے پہلی فرصت سے فائدہ اٹھا کر جزیرہ نمائے عرب کے مختلف گوشوں میں سرکشی اختیار کر لی۔ اس کے بعد جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دست خلافت پر بیعت ہوئی تو ارتداد و تمرد اس طرح پھیلے جیسے لکڑیوں میں آگ پھیلتی ہے۔ یہ اس وقت تھا جب کہ جزیرہ نمائے عرب کے باشندے عرب تھے اور مدینے کی حکومت ان پر بار نہ تھی۔ نہ غیر عرب کی طرح ان کے دل اس حکمت سے بیزار تھے۔ فتنہ ارتداد کے سلسلے میں جو لڑائیاں ہوئیں ان کے پیش نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ خوف اپنی جگہ بالکل فطری تھا کہ عراق کے ایرانی باشندے کہیں بغاوت نہ کر دیں جبکہ ان کی اکثریت غیر مسلم بھی ہے بلکہ عراق کے عربوں کی سرکشی کا خطرہ بھی بجا تھا، چاہے وہ مسلمان ہو گئے ہوں یا اپنے ہی مذہب پر قائم ہوں۔ یہ سب کے سب حیرہ اور مدائن کے اقتدار سے مانوس تھے اور ان کی حکومت میں

» اترے، بلکہ بحرین سے، اس خلیج کو عبور کرتے ہوئے اصطخر جا پہنچے۔ وہاں ایرانیوں نے ان کے جہازوں کو سمندر ہی میں گھیر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے علاء کو اس کی اجازت نہیں دی تھی کیونکہ وہ بحری جنگ کو خطرناک سمجھتے اور اس سے گریز کرتے تھے، لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ علاء اپنی شجاعت و جرات اور اپنے لشکر کی ہمت و پامردی کے باوجود ایک غلط موقع پر گھر گئے ہیں تو عتبہ بن غزوان کو حکم دیا کہ ایک بھاری لشکر لے کے جائیں اور اس سے پہلے کہ علاء اور ان کے ساتھی ہلاک ہوں۔ انہیں خطرے سے نکالیں۔ عتبہ بارہ ہزار کا لشکر لے کے روانہ ہوئے اور ایرانیوں سے لڑتے بھڑتے علاء اور ان کے ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے۔ پھر ان سب نے مل کر ابلہ اور اہواز کو فتح کیا۔ اس کے بعد عتبہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حج کی اجازت چاہی اور فریضہ حج سے فارغ ہو کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اپنا استعفیٰ پیش کر دیا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے قبول نہ کیا اور انہیں اپنی مہم پر جانے کا حکم دیا۔ عتبہ واپس عراق جا رہے تھے کہ رستے میں بطن نخلہ کے مقام پر وفات پا گئے اور وہیں دفن ہوئے۔

Marfat.com

عیش وراحت کی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن اس عشرت وآسودگی کی زندگی کے اکثر وبیشتر پہلوؤں سے نہ جزیرہ نمائے عرب کی زندگی میل کھاتی تھی، نہ اس دین کی تعلیمات ہی ساز کرتی تھیں، جو اللہ تعالیٰ نے نبی عربی علیہ التحیہ والتسلیم پر نازل فرمایا تھا۔ اگر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو وہ جزیرہ نمائے عرب کے عربوں سے زیادہ سرکشی کے قریب پہنچ جاتے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بعید النظری اور شدت احتیاط فتنے کو یہ موقع کہاں دے سکتی تھی کہ وہ مفتوحہ ممالک میں پاؤں پھیلائے۔ جب کہ وہ جزیرہ نمائے عرب کے پڑوس میں تھے اور اس فتنے کی چنگاری یہاں بھی پہنچ سکتی تھی۔ ان سب خرابیوں کے مہلک نتائج سے امیر المومنین کا بے خبر ہونا ناممکن تھا۔

صرف یہی ایک خطرہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے وجہ تشویش نہ تھا۔ فرض کر لیجیے، ان نومسلموں کے لیے دینی تعلیم کا بندوبست کر کے اور اہل عراق کو ان کے حال پر چھوڑ کر ان کی سرکشی سے محفوظ بھی رہا جا سکتا تو بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے ضروری تھا کہ وہ ان ایرانیوں سے خبردار رہیں جو شکست کھا کر پہاڑوں میں جا چھپے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تمنا کرتے تھے کہ کاش! ان کے اور ایرانیوں کے درمیان آگ کا پہاڑ ہوتا کہ نہ وہ اِدھر آ سکتے نہ یہ اُدھر جا سکتے، لیکن یہ پہاڑ موجود نہ تھا اور کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر ایران کے میدانوں میں بھاگ جانے والے ایرانی اپنا کھویا ہوا ملک دوبارہ حاصل کرنے کے لیے پھر عراق آنے کی کوشش کریں جیسا کہ اس سے پہلے وہ کر بھی چکے ہیں۔ جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حیرہ اور انبار کو فتح کر لیا تھا اور اس کے بعد وہ شام کی اسلامی فوجوں کی مدد کے لیے شام روانہ ہو گئے تھے تو یہی کچھ ہوا تھا۔ اس وقت اگر عراق سے اسلامی فوجیں ہٹ جاتیں تو ایرانیوں کی کامیابی عین ممکن تھی لیکن اگر یہ فوجیں یہیں رہتیں اور اپنے مرکزوں کو اچھی طرح مستحکم کر لیتیں تو ایرانیوں کو شورش برپا کرنے کے متعلق سوچنے سے پہلے اچھا خاصا تردد ہوتا۔ اور اگر وہ یہ ہمت کر بھی لیتے تو امیر المومنین کی فوجوں میں اتنی قوت تھی کہ وہ انہیں پسپا کر کے پہاڑوں میں مار بھگاتیں، بلکہ وہ اس قدر طاقتور تھیں کہ میدانی علاقے میں پیش قدمی کر کے ان کے ملک پر قبضہ کر سکتی تھیں، جس طرح انہوں نے عراق پر قبضہ کر کے وہاں ان کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا۔

یہ دونوں پہلو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھے بلکہ وہ اتنے بدیہی تھے کہ ہو سکتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنا موضوع فکر ہی نہ بنایا ہو۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب عراق

Marfat.com

جنگ کی تھی، ان کا مقصد یہ نہ تھا کہ ایرانیوں کو نکال باہر کریں اور اس کے بعد انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں بلکہ یہ مدعا تھا کہ عراق اور شام اس عربی وحدت میں شامل ہو جائیں جو جنوب میں خلیج عدن، بحر ہند اور خلیج فارس سے شروع ہو کر انتہائے شمال میں صحرائے شام پر ختم ہوتی ہے۔ اس لیے یہ بالکل فطری بات تھی کہ فاتحین، عراق کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیتے۔ سکون واطمینان کے ساتھ وہاں قدم جماتے اور اس کا نظام حکومت خود سنبھالتے۔ کیا یہ نظام حکومت ان ہی خطوط پر وضع کیا جانا چاہیے جن خطوط پر رومی ایرانی اپنے مفتوحہ ممالک کا نظام حکومت وضع کرتے تھے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ کونسا نظام حکومت ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس نوزائیدہ اسلامی سلطنت کے مقبوضات میں جاری فرمائیں گے؟

اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ عراق کے ظفر مند لشکر کو خوش کرنا چاہتے تو ایرانیوں اور رومیوں کی طرح سب کچھ اسی لشکر کے حوالے کر دیتے اور عوام کے لیے بچے کھچے ٹکڑوں کے سوا کچھ نہ چھوڑتے، جس طرح ایران کے زمیندار اپنے کاشتکاروں کے لیے صرف وہی ٹکڑے چھوڑتے تھے جوان سے بچ رہتے تھے۔ قادسیہ، مدائن اور جلولا وغیرہ کے معرکوں میں مسلمانوں کو اتنا مال غنیمت ملا تھا کہ انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا اور عراق کے مختلف گوشوں میں انہوں نے ایسی ایسی نعمتیں دیکھی تھیں جو انہیں عیش وراحت کی زندگی بسر کرنے پر اکساتی تھیں کہ وہ ان میں سے جسے چاہیں اپنی تلواروں کے سائے میں اپنے لیے سامان عشرت بنائیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ عراق کے ابتدائی حملوں میں دجلہ کی فتح کے موقع پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج سے فرمایا تھا: ''دیکھ رہے ہو غذائی سامان کی اس بہتات کو، جو مٹی کا ایک انبار معلوم ہوتی ہے۔ اگر ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کر رہے ہوتے اور ہماری جنگ محض معاش کے لیے ہوتی تو آج ہم اس پر کٹ مرتے کہ یہ صرف ہمارا ہی حق ہے، ان لوگوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں جنہوں نے اس جنگ میں ہمارے ساتھ شرکت نہیں کی۔'' اور بھلا دجلہ کے غذائی سامان کا مدائن کے غذائی سامان سے، فرات کی زرخیزی کا دجلہ کی زرخیزی سے اور حیرہ کی عظمت اور خورنق اور سدیر کے جلال کا کسریٰ کے محل کی عظمت اور اس کے تخت وپایہ تخت کے جلال سے کیا مقابلہ؟ مسلمان آج اس ساری دولت وثروت کے مالک اور اس سے نعمت اندوز ہیں۔ آج وہ فتح وکامرانی کی انتہائی بلندیوں پر فائز ہیں تو کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے مناسب نہ تھا کہ وہ اپنے لشکر کو خوش کریں اور عراق کی نعمتوں کے دروازے اس پر کھول دیں، جو کسریٰ اور قیصر دونوں اپنے اپنے ظفر مند

لشکروں کے لیے روا رکھتے تھے۔

اس مسئلے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود بھی غور فرمایا اور اپنے رفقاء سے مشورہ بھی کیا۔ سب سے پہلے آپ کو وہ احکام یاد آئے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے سپہ سالاروں کو عراق کی مہم پر روانہ کرتے وقت دیئے تھے۔ عرب ان دنوں عراق میں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ انہیں اپنی محنت کا برائے نام معاوضہ ملتا تھا۔ باقی سب کچھ وہ زمیندار ہضم کر جاتے تھے جو عربوں سے انتہائی ذلت و سنگدلی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے سپہ سالاروں کو حکم دیا تھا کہ ان عرب کسانوں سے بدسلوکی نہ کی جائے۔ ان میں سے کسی کو قتل کیا جائے، نہ قیدی بنایا جائے اور نہ ان سے تعلق رکھنے والے کسی معاملے میں زیادتی سے کام لیا جائے۔ بلاشبہ یہ سیاست سر حکیمانہ سیاست تھی اور عراق کے، تمام عرب اور غیر عرب کسانوں کے متعلق یہی سیاسی روش اختیار کرنی چاہیے بلکہ اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ وہ ایرانی بھی، جنہوں نے فاتحین کا مقابلہ نہیں کیا، یہ محسوس کرلیں کہ نئی حکومت نے اپنی مادی مصلحتوں کے لیے رعایا کو تکلیف نہیں پہنچائی، نہ کسی کو بدسلوکی کا نشانہ بنایا۔ جو لوگ اپنی جگہ سے نہیں ہلے اور جو لوگ جنگ کے خوف سے بھاگ کر اپنے اپنے گھروں کو واپس آگئے، امن و سلامتی کے یکساں مستحق سمجھے جائیں مسلمان حاکم کے لیے تو بس یہی کافی ہے کہ وہ بغیر کسی زیادتی یا دباؤ کے ان سے جزیہ یا خراج وصول کرلیا کریں۔ اس خوش سلوکی اور رعایا کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنے سے محکوم مطمئن ہو جائیں گے اور مسلمانوں کے اقتدار کو اپنے لیے راحت و آسائش کا سرچشمہ سمجھیں گے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ محکوموں پر حاکموں کی طاقت و قوت کا اثر رہنا بھی ضروری ہے تاکہ سرکشی اور بغاوت کا ہر وہ خیال اپنی موت آپ مر جائے جو بہت ممکن ہے، ذاتی وقار یا قومی عزت کے نام سے ایرانیوں کے دلوں میں راہ پالے اور اس کے لیے واجب ہے کہ فاتح اپنے واسطے کچھ شہر مخصوص کرلیں، جن میں محکوموں کا کوئی ایک فرد بھی آباد نہ ہو۔ ان شہروں میں مسلمانوں کی فوج ہونی چاہیے جو ہر وقت لڑائی کے لیے کمربستہ رہے۔ اس طرح مسلمان بھی عراق کی بغاوت سے محفوظ رہیں گے اور ایرانی بھی فتنہ انگیزی کا خیال دل سے نکال کر ان کے اقتدار پر مطمئن ہو جائیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان ہمہ وقت عزت و وقار کے ساتھ اس ملک کی حفاظت پر قادر رہیں گے۔

Marfat.com

اپنے رفقاء سے مشورے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہی سیاست اختیار فرمائی اور واقعات نے اس کے نفاذ کو آسان بنا دیا۔ اس سے نہ عراقیوں اور ایرانیوں کے جذبات مشتعل ہوئے، نہ فاتح مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ فتوحات کے مال غنیمت سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ ہوا یہ کہ عراق کے شہروں کی آب و ہوا نے اسلامی فوجوں کی صحت پر برا اثر ڈالا۔ جلولا، حلوان، تکریت اور موصل سے فتح کی خبر اور مال غنیمت لے کر کچھ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے پہلے تو ان کے مطالبات پر غور کیا، اس کے بعد فرمایا: ''بخدا! تمہاری صورتیں اب وہ نہیں جو یہاں سے جاتے وقت تھیں، قادسیہ اور مدائن سے جو لوگ آئے تھے، میں نے دیکھا، ان کی بھی یہی حالت تھی۔ آخر یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے؟'' انہوں نے جواب دیا: ''یہ وہاں کی آب و ہوا کا اثر ہے!''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے دریافت کرایا کہ عربوں کی رنگتیں کیوں جھلس گئی ہیں؟ انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔ حذیفہ بن یمان مدائن میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ساتھ مقیم تھے۔ انہوں نے ان وفود کے پہنچنے سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا کہ ''عربوں کے پیٹ پچک گئے ہیں۔ جسم سوکھ گئے ہیں اور رنگتیں جھلس گئی ہیں!'' اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تشویش ہوئی اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو لکھا: ''عربوں کو وہی آب و ہوا راس آئے گی جو ان کے اونٹوں کو راس آئے گی، لہٰذا کوئی دریا یا پل حائل نہ ہو!'' اس خط سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دو مقصود تھے۔ ایک یہ کہ ان عربوں کے قیام کے لیے جو مقام انتخاب کیا جائے وہ صحرا کی طرح خشک ہو، لیکن اس میں صاف ستھرے پانی کی نہریں اور چشمے بھی ہوں۔ دوسرے یہ کہ اگر کبھی ان لوگوں کی مدد کی ضرورت پڑ جائے تو رستے میں کوئی دریا یا پل مزاحم نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بحری سفر کو خطرناک سمجھتے تھے اور اس لیے نہیں چاہتے تھے کہ ان کے اور ان کی فوج کے درمیان کوئی ایسی چیز حائل ہو جسے طے کرنے میں ان کی بھیجی ہوئی مدد کسی خطرے یا ہلاکت سے دوچار ہو جائے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے موصل سے عبداللہ بن معتم اور جلولا سے قعقاع بن عمرو کو بھیجا کہ وہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی پسند کے مطابق کوئی جگہ تلاش کریں۔ ادھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی مدینہ میں باخبر لوگوں سے ایسی جگہ کے بارے میں مشورہ کیا۔ سب نے یک زبان ہو کر یہ رائے دی کہ حیرہ کے قریب کوفہ کا مقام بالکل موزوں ہے۔ ایک تو وہ حیرہ کی طرح فرات کے قریب سرسبز و شاداب مقام پر واقع ہے۔ دوسرے صحرا سے بھی کچھ دور نہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ مدائن سے کوفہ کے مقام

Marfat.com

پر پہنچے اور ایک اونچی جگہ منتخب کر کے مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔ اس کے چاروں طرف اتنی جگہ چھوڑ دی گئی کہ اگر مسجد کے وسط میں کھڑے ہو کر تیر پھینکا جائے تو اس میدان کے آخری سرے پر گرے اور اس جگہ کو بازار بنا دیا گیا۔ مسجد تعمیر ہوئی اور سنگ رخام کی ستونوں پر دو سو ہاتھ لمبی چھت ڈالی گئی۔ یہ ستون کسریٰ کے محلوں سے لائے گئے تھے جن کی بلندی رومی کلیساؤں کی بلندی سے مشابہ تھی۔ مسجد کے چاروں طرف خندق کھودی گئی کہ لوگ اس کی چار دیواری پر چڑھائی نہ کر دیں۔ کسریٰ کے ایک ایرانی معمار نے مسجد کے قریب حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے لیے مکان تیار کیا جس میں بیت المال بھی تھا۔ اس عمارت کا نام "قصر سعد رضی اللہ عنہ" رکھا گیا۔ فوج نے بھی مسجد کے چاروں طرف اپنے مکان بنا لیے اور ہر قبیلے نے اپنے اپنے مطلب کی جگہ تلاش کر کے خیمے نصب کر دیئے۔ جب لوگ آباد ہو گئے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا: "میں نے حیرہ اور فرات کے درمیان کوفہ میں قیام کیا ہے۔ یہ مقام خشکی اور تری سے یکساں تعلق رکھتا ہے اور شاداب و زرخیز بھی ہے۔ میں نے مسلمانوں کو اجازت دے دی ہے کہ چاہے مدائن میں رہیں چاہے یہاں آ کر آباد ہو جائیں۔ جن لوگوں نے مدائن میں رہنا پسند کیا میں انہیں وہاں مسلح پہریداروں کی حیثیت میں چھوڑ آیا ہوں۔"

کوفہ کا قیام سب کو راس آیا اور ان کی صحتیں بحال ہو گئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں درخواست بھیجی گئی کہ بانسوں کے مکان بنانے کی اجازت مرحمت فرما دی جائے، وہ خیموں سے زیادہ پائیدار رہیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی اجازت دیتے ہوئے تحریر فرمایا: "چھاؤنی ایسی ہونی چاہیے جو تمہاری اچھی طرح حفاظت کر سکے اور تمہارے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ہو۔ میں تمہاری مخالفت کرنا نہیں چاہتا۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ مکتوب سنتے ہی لوگوں نے بانس کے مکان بنانے شروع کر دیئے اور ان میں جا بسے۔ ایک دن ان مکانوں میں آگ لگ گئی اور وہ جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔ اب لوگوں کے لیے پھر کوئی جگہ سر چھپانے کی نہ رہی تو کیا انہیں پھر خیمے نصب کر لینے چاہئیں؟ کھلے میدان میں رہنے سے تو یہی بہتر ہے، لیکن اب وہ مکانوں میں رہنے کے عادی ہو چکے تھے، خیموں کی زندگی انہیں کیسے راس آتی۔ چنانچہ آتش زنی کی خبر کے ساتھ یہ درخواست بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کی گئی کہ اینٹوں کے مکان بنانے کی اجازت عطا فرما دی جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی اور فرمایا: بنا لو، لیکن کوئی شخص تین کمروں سے زیادہ نہ بنائے اور دیواریں بہت اونچی نہ کرے۔ تم سنت کے پیچھے چلو، دولت

Marfat.com

تمہارے پیچھے چلے گی!'' اس طرح کوفہ کے مکانوں کی تیاری کے بعد لوگ ان میں مقیم ہو گئے۔ اس نو آباد شہر نے حیرہ کی تمام عظمت و شوکت اس سے چھین لی اور تخمین کا دارالسلطنت اس عظیم الشان شہر کے پہلو میں ایک معمولی سی بستی ہو کر رہ گیا جو چند ہی برس کے بعد اسلامی سلطنت کا دارالخلافہ قرار پا کر اسلام کی تاریخ میں ایک خاص مرتبے کا مالک بن گیا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں قیام کیا اور اپنی قیام گاہ میں ایک دروازہ بنوا کر اس پر چھت ڈلوا دی۔ اس لیے کہ بازار کا شور وغل ان کی گفتگو میں مخل ہوتا تھا، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے معمار سے کہا: ''مجھے اس ہنگامے سے نجات دلاؤ'' اس کی اطلاع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ملی اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ لوگ اس مکان کو ''قصر سعد رضی اللہ عنہ'' کہتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو کوفہ روانہ کیا اور انہیں حکم دیا: ''محل کے دروازے کو آگ لگا کر الٹے پاؤں واپس آ جانا!'' ابن مسلمہ رضی اللہ عنہ کوفہ پہنچے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو خبر ملی تو انہیں بلایا لیکن انہوں نے محل میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ خود باہر آئے اور ان کے سامنے کھانا پیش کیا۔ ابن مسلمہؓ نے کھانا بھی قبول نہ کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط انہیں دے دیا۔ خط میں لکھا تھا: ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے محل تعمیر کرایا ہے جو قلعہ بن گیا ہے اور قصر سعد رضی اللہ عنہ کہلاتا ہے۔ تمہارے دروازے پر لوگوں کی روک ٹوک ہے۔ یہ تمہارا محل نہیں بلکہ ہلاکت کا محل ہے اس کا وہ حصہ جو بیت المال سے ملا ہوا ہے، نکال ڈالو اور اس کو بند کر دو! محل کے دروازے پر خبردار کوئی پہرہ چوکی نہ رہے جس سے لوگوں کی روک ٹوک ہو!''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے خط پڑھ کر قسم کھائی کہ لوگوں نے غلط خبر پہنچائی ہے۔ ابن مسلمہ کو ان کی قسم کا اعتبار آ گیا، اور وہ واپس ہو گئے۔ مدینہ پہنچ کر انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پوری تفصیل سنائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: ''پھر تم نے سعد رضی اللہ عنہ کا عذر قبول نہیں کیا؟'' ابن مسلمہ نے کہا: ''اگر آپ یہ چاہتے تھے تو مجھے لکھ دیا ہوتا یا اس کی اجازت دے دی ہوتی۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''صحیح معنی میں اہل الرائے وہ ہوتا ہے جس کے پاس اگر اپنے حاکم کا حکم نہ ہو تو اپنی سوجھ بوجھ سے کام لے اور خاموش نہ رہے'' یہ کہہ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا عذر قبول فرما لیا اور انہیں برقرار رہنے دیا۔

جس وقت کوفہ کی بنیاد پڑی تھی اسی وقت بصرے کی بھی نیو ڈالی گئی تھی۔ یہ شہر سنہ 18ھ یعنی خلافت فاروقی کے چوتھے سال ابلہ کے قریب، دلتا النہرین میں خلیج فارس سے متصل آباد

Marfat.com

ہوا۔ ایک روایت میں ہے کہ بصرہ، کوفہ سے پہلے بسایا گیا تھا، لیکن اس کے مکانات اس وقت پختہ کیے گئے جب کوفہ کے مکانات پختہ ہو چکے تھے۔ علامہ بلاذری لکھتے ہیں کہ عتبہ بن غزوان نے سنہ 14ھ میں ابلہ پر چڑھائی کی اور جب اسے فتح کر لیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا: ''مسلمانوں کے لیے ایک ایسی قرارگاہ کی ضرورت ہے جہاں وہ سردی سے محفوظ رہ سکیں اور جنگ سے واپس آئیں تو قیام کریں۔'' امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے انہیں جواب دیا: ''اپنے ساتھیوں کو ایک جگہ جمع کر لو، یہ جگہ پانی اور سبزہ زار کے قریب ہونی چاہیے پھر مجھے اس کی مفصل کیفیت لکھو۔'' جب عتبہ نے پوری تفصیلات لکھ بھیجیں، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بصرہ کے محل وقوع کو پسند فرمایا اور لوگوں نے وہاں پہنچ کر بانسوں کے مکان بنا لیے۔ اسی طرح عتبہ نے بانسوں کی مسجد تعمیر کرائی۔ مسلمان جب کہیں چڑھائی کرتے ان مکانوں کو گرا دیتے اور جب لڑائی سے واپس آتے تو پھر بنا لیتے۔ ایک دفعہ کوفہ کی طرح بصرہ میں بھی آگ لگ گئی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اجازت سے بصرہ والوں نے بھی کوفہ والوں کی طرح پختہ مکان بنا لیے۔ بعد کو جب بصرہ خلیج فارس کے کنارے عراق کی سرحدی چھاؤنی بن گیا تو پتھروں کے مکان بنائے گئے اور ایک نہایت شاندار مسجد تعمیر کرائی گئی۔ آگے چل کر بصرہ کو بھی اسلامی تاریخ میں وہی اہمیت حاصل ہو گئی جو اہمیت کوفہ کو حاصل تھی۔

ہم چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد کی تاریخ لکھ رہے ہیں اس لیے یہ بتانا ہمارے فرائض میں شامل نہیں کہ ان دونوں شہروں نے بعد میں کتنی ترقی کی۔ صرف اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ ان شہروں نے لغت، ادب، فقہ اور اسلامی ثقافت کی تاریخ میں ایسی ایسی راہیں پیدا کی ہیں کہ ان کا اثر آج تک باقی ہے علوم وفنون کے باب میں بھی یہ دونوں شہر اسی طرح ایک دوسرے کے حریف رہے، جس طرح دولت اسلامیہ کی سیاست کا عموماً اور عراق کی سیاست کا خصوصاً رخ متعین کرنے میں وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ ان میں سے ہر شہر نے عہد فاروقی رضی اللہ عنہ ہی میں اپنا مقام بنانا شروع کر دیا تھا اور یہ تھا بھی ایک فطری تقاضا، اس لیے کہ کوفہ عراق کا دارالخلافہ تھا اور بصرہ عراق کی سب سے پہلی سرحدی چھاؤنی۔ پھر جیسا کہ ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں، جزیرہ نمائے عرب کے باشندے ان دونوں شہروں کو پسند کرتے تھے۔ چنانچہ جنوبی یمن اور اس کے آس پاس کے لوگ کوفہ میں منتقل ہو گئے تھے اور مدینہ کے انصار اور شمالی عرب کے باشندے بصرہ میں نقل وطن کر آئے تھے۔ اس نقل وطن کا بغداد کو ایران کی جنگوں پر بہت اچھا اثر پڑا۔

Marfat.com

دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں شہروں کے آباد ہو جانے کے بعد ان کے باشندوں نے زندگی بسر کرنے کے لیے کون کون سے ذرائع اختیار کیے؟ اسلامی فوجیں ایران میں جب یزدگرد اور اس کی فوجوں سے لڑ کر واپس آئیں اور انہیں مال غنیمت ملا، اس سے خاصی مدت پہلے عراق میں امن وسکون بحال ہو چکا تھا پھر عرب زراعت پیشہ بھی نہیں تھے جو عراق میں کھیتی باڑی کر کے معاش کا انتظام کر لیتے۔ تو کیا وہ بھی کسانوں کی محنت ومشقت کے ثمرات، ہتھیا لیتے تھے جو اس سے پہلے ایران کے زمینداروں کا شیوہ تھا؟

اس سوال کا جواب دینے کے لیے کہ بصرہ اور کوفہ کے لوگ اپنی ضروریات زندگی کس طرح فراہم کرتے تھے، ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ مدائن، جلولا، تکریت، موصل اور عراق کے دوسرے علاقوں میں اسلامی فوجیں اپنی معاشی اغراض کے لیے کیا کچھ کرتی تھیں۔ اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی وہی سیاسی روش اختیار کی تھی جو ان سے پہلے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اختیار فرما چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے فوجی افسروں اور سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ عراق کے کسانوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ ان میں عدل وانصاف قائم کیا جائے۔ تاکہ وہ اسلامی حکومت سے مطمئن ہوں۔ مسلمان حاکم کے لیے بس یہی کافی ہے کہ وہ بغیر زیادتی یا دباؤ کے ان سے جزیہ یا خراج وصول کر لیا کرے۔ جب جلولا فتح ہوا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ اتنے کسان بھاگ گئے ہیں اور اتنے موجود ہیں۔ بھاگنے والے کسانوں کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار سے کچھ اوپر تھی اور ان سے تیس ہزار سے کچھ زیادہ گھر آباد تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں لکھا:

کسانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ سوائے ان کے جو تم سے لڑیں یا تمہیں چھوڑ کر تمہارے دشمن کے پاس بھاگ جائیں اور ان سے وہی سلوک کرو جو پہلے کسانوں سے کیا گیا، جب میں تمہیں کسی جماعت کے متعلق لکھوں تو اس سے ملتی جلتی جماعتوں کے ساتھ بھی اسی کا سا سلوک کرنا۔ اہل حرب میں سے جو اپنی زمین چھوڑ کر چلے گئے ہوں وہ تمہاری ہے، اگر وہ تمہارے بلانے پر واپس آ جائیں اور جزیہ دینا قبول کریں تو ان کی زمینیں انہیں واپس کر دینا، بشرطیکہ وہ تقسیم نہ ہوئی ہوں اور جنہیں تم نے نہیں بلایا ان کی زمینیں تمہاری ہیں۔"①

① علامہ بلاذری لکھتے ہیں کہ جریر بن عبداللہ بجلی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس وفد لے کر آئے اور درخواست کی کہ آپ نے بنو بجیلہ کو مال غنیمت میں سے چوتھائی حصہ دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔ سواد کا چوتھائی حصہ عطا کیجیے۔ بنو بجیلہ تین برس»

Marfat.com

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے احکام کی تعمیل کی۔ کسانوں کو ان کی زمینوں پر برقرار رہنے دیا۔ جو چلے گئے تھے انہیں واپس بلایا اور جو واپس آ گئے ان پر خراج عائد کر دیا۔ خاندان کسریٰ اور اس کے ساتھ فرار ہونے والے امیروں اور جاگیرداروں کی جائیداد پر قبضہ کر لیا گیا۔ یہ بے شمار جائیداد، جو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ضبط کی تھی، جبل فارس اور عرب کی سرحدوں کے درمیان پھیلی ہوئی تھی اور نا قابل فروخت قرار دی گئی تھی، جس طرح رفاہ عامہ کی چیزیں مثلاً جنگل، نہریں، ڈاک گھر اور آتش کدے۔۔۔ مجوسیوں کی عبادت گاہیں۔۔۔ نا قابل فروخت قرار دیئے گئے تھے۔

اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ کسانوں کی زمینیں برقرار رہیں اور وہ ذمیوں میں شمار کیے گئے چاہے وہ دوران جنگ میں اپنی زمینوں پر قابض رہے ہوں یا ڈر کے بھاگ گئے ہوں اور لڑائی کے بعد پھر واپس آ گئے ہوں۔ اسی طرح وہ زمینیں بھی، جو مسلمانوں میں تقسیم نہیں کی گئی تھیں، ان کسانوں اور غیر کسانوں کو واپس کر دی گئیں جنہوں نے جنگ میں حصہ لیا تھا۔ اس کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے انہیں بلایا اور ان کا نام ذمیوں کی فہرست میں شامل کر دیا، لیکن وہ زمینیں، جو کسریٰ کے خاندان یا ان امیروں اور جاگیرداروں کی ملکیت تھیں جنہوں نے جنگ میں کسریٰ کا ساتھ دیا تھا، بحق حکومت ضبط کر لی گئیں۔ ان کی بیع وشریٰ ناجائز قرار دی گئی اور عراق کے کسانوں کو معاوضے پر کھیتی باڑی کرنے کی اجازت مل گئی۔ یہ معاوضہ وہ سرکاری خزانے میں داخل کرتے تھے۔ آتش کدوں کی زمینیں بھی اسی حکم کے ذیل میں تھیں، لیکن رفاہ عامہ کی چیزوں نہریں اور ڈاک گھر وغیرہ کو عوامی ملکیت ہی رہنے دیا گیا۔ معاملت ان میں ناجائز قرار دی گئی اور وہ اپنی مخصوص نفع رسانی کے حکم پر قائم رہنے دی گئیں۔

» تک اس چوتھائی حصے پر متصرف رہ چکے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر میں ایک ذمہ دار تقسیم کرنے والا نہ ہوتا تو جو کچھ تمہیں دے چکا تھا اس پر قائم رہتا، لیکن اب میری رائے یہ ہے کہ تم اپنا حصہ واپس کر دو! اور انہوں نے اپنا حصہ واپس کر دیا۔ بلاذری نے ایک اور روایت نقل کی ہے کہ جب سواد فتح ہو گیا تو اس کے فاتحین نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا، ''اس کو ہمارے درمیان تقسیم فرما دیجیے، کیونکہ ہم نے اسے بزور شمشیر فتح کیا ہے۔'' لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا اور فرمایا: ''پھر ان مسلمانوں کے لیے کیا رہے گا جو تمہارے بعد آئیں گے؟ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں اس کو تقسیم کر دوں تو پھر تم آپس میں پانی پر بھی فساد کرو گے'' اور اہل سواد کو ان کی زمینوں پر برقرار رکھا۔ ان پر جزیہ اور ان کی زمینوں پر خراج مقرر کیا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اس ارشاد سے کہ ''پھر ان مسلمانوں کے لیے کیا رہے گا جو تمہارے بعد آئیں گے؟'' مراد جزیرہ نمائے عرب کے وہ مسلمان نہیں جو فتح عراق کے بعد وہاں جا کر آباد ہو گئے۔ اگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ یہ زمین فاتحوں میں تقسیم فرما دیتے تو ان کے بعد عراق آنے والوں کے لیے کچھ نہ بچتا۔

Marfat.com

اس تنظیم سے حکومت کے خزانے میں مختلف ذرائع سے دھڑا دھڑ دولت جمع ہونی شروع ہو گئی۔ یہ ذرائع خراج، جزیہ اور سرکاری زمین کے کرائے وغیرہ پر مشتمل تھے اور اس خزانے سے کوفہ، بصرہ اور مسلمانوں کی تمام فوجی چھاؤنیوں کے سپاہیوں اور ان کے اہل وعیال کو وظیفے دیئے جاتے تھے۔ ان سپاہیوں کی خواہش تھی کہ سواد کی زمین ان میں تقسیم کر دی جائے، جو بعد کو ان کے عزیز واقارب کی ملکیت قرار پائے۔ اگر ان کی اس خواہش کو پورا نہ کیا اور عطاء و بخشش میں بخل سے کام لیا گیا تو وہ اس شوق ورغبت سے ملک گیری و کشور کشائی میں حصہ نہ لے سکیں گے۔ لیکن عمر رضی اللہ عنہ ان کے اس مطالبے کے خلاف تھے۔ انہوں نے فرمایا: "اگر تم ایک دوسرے کے منہ پر طمانچہ مارنے والے نہ ہوتے تو ہم یہ مطالبہ منظور کر لیتے!"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہلے ہی دن سے فوج میں زمینیں تقسیم کر دینے کے خلاف تھے کہ مسلمان زراعت کو اپنا پیشہ بنا کر قیام وحضر کی زندگی سے مانوس نہ ہو جائیں اور جب انہیں جنگ کے لیے بلایا جائے تو ہچر مچر کرنے لگیں۔ ابھی تک حکومت ان کی شجاعت و تیغ آزمائی کی محتاج ہے۔ اسے آج بھی ایک ایسے لشکر کی ضرورت ہے جو سامان جنگ سے لیس لڑائی پر جانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہے۔ پھر امیر المومنین رضی اللہ عنہ اپنی فوج کی اس قیام وقرار کی زندگی سے کیسے مطمئن ہو سکتے تھے جبکہ ممکن تھا کہ ایرانی کل پھر چڑھ آئیں اور ممکن تھا کہ پہلے کی طرح عراق دوبارہ بغاوت کر دیں، اس لیے ضروری ہے کہ کسریٰ کی زمین حکومت کی ملکیت رہے اور حکام عراق کے کسانوں سے اس میں کھیتی باڑی کرائیں۔ اسلامی فوجوں کو اپنی چھاؤنیوں میں ہر وقت مسلح رہنا چاہیے کہ اگر آدھی رات کو بھی انہیں جنگ کی دعوت دی جائے تو وہ فوراً لبیک کہہ سکیں۔

کوفہ اور بصرہ والوں کے وظائف دوسرے جنگ آزماؤں کی طرح وافر اور اطمینان بخش تھے بلکہ ان دونوں شہروں میں وظیفہ پانے والوں کی اتنی کثرت تھی کہ یہاں کے باشندے بڑے اطمینان وفراغت کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، لیکن اسکے باوجود بصرہ والے کوفہ والوں سے رشک وحسد رکھتے تھے اسلیئے کہ اپنے محل وقوع اور سامان راحت کی کثرت کے سبب کوفہ، بصرہ سے ممتاز تھا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بصرہ سے بارگاہ خلافت میں حاضر ہونے والے ایک وفد سے اس کی ضرورت کے متعلق پوچھا۔ احنف بن قیس اور ان کے ساتھیوں نے جواب دیا: "یا امیر المومنین! خیر وبرکت کی کنجیاں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ ہمارے شہری بھائی، ان خالی مکانوں میں اترے ہیں جو میٹھے پانی اور ہرے بھرے باغوں کے درمیان واقع ہیں، لیکن ہم

Marfat.com

بنجر اور شور زمین میں آباد ہوئے ہیں، جس کے مشرق میں مواج و متلاطم سمندر ہے اور مغرب میں صحرائے بے آب و گیاہ۔ چنانچہ ہمیں پیداوار نصیب ہے نہ دودھ دینے والے جانور۔ ہم اپنی ضروریات بڑی مشکل سے حاصل کرتے ہیں۔ ایک بوڑھا میٹھے پانی کی تلاش میں چلتا ہے تو کہیں دو میل جا کے اس کی ضرورت پوری ہوتی ہے اور جب کوئی عورت اس مقصد کے لیے نکلتی ہے تو بچے کو بکری کی طرح باندھ کر نکلتی ہے کہ دشمن اسے اٹھا کر نہ لے جائے اور درندہ اسے پھاڑ نہ کھائے۔ اگر ہماری دشواریاں دور نہ کی گئیں۔ ہمارا ہاتھ نہ پکڑا گیا تو ہم ہلاک ہو جائیں گے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے وظیفے بڑھا دیئے اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو جو اس زمانے میں کوفہ کے گورنر تھے، حکم دیا کہ ان کے لیے شمال میں تین میل کے فاصلے پر دجلہ سے نہر نکال دی جائے۔ مسلمان عراق میں آسائش کی ایسی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جس کی مثال جزیرہ نمائے عرب میں کہیں نہ ملتی تھی اس فراغت و راحت کے علاوہ انہیں فاتح سرداروں کی عزت بھی حاصل تھی۔ اسی طرح کئی برس گزر گئے۔ نہ انہیں ایران پر حملہ کرنے کا خیال آیا نہ وہ کسی نئی فتح کے لیے کوشاں ہوئے۔ اس دوران میں وہ صرف ایک بار ہرمزان سے مدافعتی جنگ لڑے۔ جب اس نے جنوب مشرق میں بصرہ کی طرف سے ان پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی تھی۔ محض مدافعتی جنگ لڑنے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی اس رائے پر اصرار تھا کہ عراق اور اس کی سرحدوں کے دفاع سے آگے نہ بڑھا جائے۔ اسی لیے انہوں نے ان لوگوں کی رائے سے اختلاف کیا جو ہرمزان سے اس کے ملک میں گھس کر لڑنا چاہتے اور حکم دیا کہ ہرمزان سے پھر انہی شرائط پر صلح کر لی جائے جنہیں وہ بار بار توڑ چکا ہے۔ چنانچہ ہرمزان گرفتار کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مدینہ حاضر کر دیا گیا۔ یہاں اس تفصیل کا موقع نہیں ہے کہ ہرمزان نے مسلمانوں اور مسلمانوں نے ہرمزان کے ساتھ کیا کیا۔ یہ تفصیل ابھی آگے چل کر آئے گی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اس فیصلے پر قائم رہے کہ عراق پر بس کیا جائے اور اس کی سرحدوں کو ایرانیوں سے محفوظ رکھا جائے۔ اسلامی حملے سے پہلے ایرانی چونکہ اپنے باہمی جھگڑوں اور باہمی انتشار کی بنا پر عراق کی طرف سے غافل ہو گئے تھے، اس لیے وہاں کا سارا انتظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ زراعت تباہ اور آمدنی کے تمام ذرائع مسدود ہو گئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی اصلاح کا تہیہ فرمایا اور حکم دیا کہ زمین کی پیمائش کی جائے۔ آب رسانی کا انتظام کر کے زمین کے ہر اس ٹکڑے کو پانی پہنچایا جائے جو کاشت کے قابل ہے۔ پلوں کو درست کیا جائے اور جو مقامات

Marfat.com

شورشوں اور لڑائیوں کی وجہ سے ویران ہو گئے ہیں، انہیں از سر نو بسایا جائے۔ ایرانی انجینئر، جو عراق میں موجود تھے، اس اصلاحی پروگرام کو روبہ عمل لانے میں بہترین معاون تھے۔ انہوں نے اسلامی برکتیں دیکھ لی تھیں اور انہیں یقین ہو گیا کہ کسریٰ اب اس ملک کو مسلمانوں سے واپس نہیں لے سکتا۔ اس کے علاوہ وہ اسلامی حکومت کا امن و امان اور ہمہ گیر عدل و انصاف بھی دیکھ چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے ملک اور عوام کی بہتری اسی میں پائی کہ وہ اسلامی حکومت سے تعاون کریں۔ اس اصلاحی پروگرام کے نفاذ نے نئی حکومت کے استقرار اور استحکام میں اور اضافہ کر دیا۔

رؤسائے ایران نے جو ذمیوں کی حیثیت سے عراق میں مقیم تھے اور جنہیں ان کا مال و متاع واپس کر دیا گیا تھا، اس اصلاحی پروگرام کی دولت افزائی دیکھی۔ کسان نے اس تمدن کو امن و آسودگی کا گہوارہ پایا اور عراق کے عربی قبائل نے اپنے ابنائے جنس کو ایرانیوں سے بہتر حکمران اور ان سے زیادہ انصاف پرور محسوس کیا اور یہ سب کے سب اس نظام کو آیہ رحمت سمجھنے لگے جسے امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے عراق کی حکومت کی بنیاد بنایا تھا۔ وہ اپنے اپنے کاموں میں ہمہ تن مصروف ہو کر ملک کی دولت میں اضافہ کرنے لگے۔ انہیں اس پہلو سے ہٹ کر کسی دوسری طرف توجہ کرنے کی ہمت بھی کیسے ہوتی جب وہ دیکھ رہے تھے کہ ہر جگہ اسلامی فوجیں ان کے سروں پر مسلط ہیں اور فتنہ انگیزوں کی سرکوبی کے لیے ہمہ دم تیار رہتی ہیں۔

روزی اور دولت مندی کے لیے تمام اہل عراق اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے، لیکن فاتحین اپنے وظائف کے سبب عیش و آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے سے حسد کرتے تھے۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ اہل بصرہ نے کوفہ کے محل وقوع اور اس کی آسودہ حالی کی بنا پر کس طرح اہل کوفہ سے رشک و رقابت کا اظہار کیا تھا۔ ان دونوں شہروں میں جو قبائل آباد تھے وہ ایک دوسرے سے جلتے اور اپنی اپنی شان میں مدحیہ راگ الاپتے تھے، قبائلی روح کی توانائی انہیں منافست و مفاخرت پر ابھارتی تھی اور فرات اس کڑوے کریلے کو اور نیم پر چڑھا دیتی تھی۔ اس کے علاوہ جب ان لوگوں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ قریش کو سب پر ترجیح دیتے ہیں اور مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کو باقی سب لوگوں سے افضل سمجھتے ہیں تو ان حضرات کے خلاف مکر و چالبازی سے کام لینا شروع کر دیا، جنہیں خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ ان سے ممتاز رکھتے تھے۔ یہی مکر تھا جس نے کچھ لوگوں کو، قصر سعد رضی اللہ عنہ کا دروازہ بنتے وقت، حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی ذات سے جھوٹی باتیں منسوب کرنے سے بھی باز نہ رکھا اور کچھ فتنہ پرداز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی یہ شکایت لے کر پہنچے کہ وہ نماز اچھی

Marfat.com

طرح نہیں پڑھاتے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اہل کوفہ اور خود حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے اس کے متعلق دریافت کرایا اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق نماز پڑھاتے ہیں تو کہا: ''ابواسحٰق![1] تمہارے متعلق یہ محض گمان تھا!''

اہل کوفہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس حد تک فریب کاریاں کیں کہ ایک دن وہ تنگ آ کر کہہ اٹھے: ''یا اللہ! نہ ان سے کسی امیر کو راضی رکھیو! نہ ان کو کسی امیر سے!'' معلوم ہوتا ہے، اللہ نے ان کی دعا قبول فرمالی۔ چنانچہ کوفہ کا کوئی امیر ایسا نہ تھا جس کی شکایت اہل کوفہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے نہ کی ہو۔ جب کوئی امیر انہیں ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانی اور شورش انگیزی کرتے دیکھتا، ان کی فتنہ پردازیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتا تو وہ اس کے خلاف شکایت لے کر مدینہ پہنچ جاتے۔

بصرہ اور کوفہ والوں اور ان کے علاوہ عراق کے دوسرے مسلمانوں کی یہ نفسانفسی عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں کوئی ایسا اثر نہ رکھتی تھی کہ اس کے نتیجے کی طرف خوف کھایا جاسکتا۔ اس زمانے میں سارے مسلمان فوجی، جو وقتاً فوقتاً جنگ پر جاتے رہتے تھے اور اس سے ان کی آتش رقابت ٹھنڈی پڑ جاتی تھی۔ ادھر ان کے اہل و عیال بھی جنگ کی خبروں میں لگ جاتے تھے کہ کہاں کہاں اسلامی فوجوں نے فتح حاصل کی اور کہاں کہاں انہیں نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کے علاوہ عراق کی اصلاح و ترقی کا جو شوق ہر طرف پھیل گیا تھا اس نے بھی رشک و رقابت کے قصوں کو غیر مقبول بنا دیا تھا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شدت و حزم کے ساتھ ساتھ دانش مند اور رحم دل تھے۔ ان کی شدت فتنے کو سر نہ اٹھانے دیتی تھی اور ان کی حکمت و رحم دلی مظلوم کے لیے فریاد کی نوبت نہ آنے دیتی تھی۔ لہٰذا عراق میں امن و سکون بحال رہا اور وہاں کے حالات نے نہ خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ کو پریشان کیا نہ ان کے علاوہ کسی اور مسلمان کو۔

ادھر سعد رضی اللہ عنہ قادسیہ سے مدائن جا رہے تھے، اپنی فوج کے افسروں کو جلولا، تکریت، اور موصل کی طرف روانہ کر رہے تھے۔ کوفہ اور بصرہ آباد ہو رہے تھے اور عراق میں ہر طرف امن و سکون کا دور دورہ ہو رہا تھا۔ ادھر ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ، عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور شرحبیل بن حسنہ اپنی فوج اور دوسرے سپہ سالاروں کے ہمراہ شام میں رومیوں سے برسرپیکار تھے اور عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ مدینہ سے بیت المقدس اور دمشق تشریف لے

---

[1] حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے۔

Marfat.com

جا رہے تھے۔ اب ہمیں بھی ان حضرات کے ساتھ چلنے کے لیے شام منتقل ہو جانا چاہیے تاکہ یہ دیکھ سکیں کہ جزیرہ نمائے عرب کے جنوب سے لے کر صحرائے سماوہ کے شمال تک ان بزرگوں نے عربی نسل کی وحدت کس طرح مکمل کی۔

⊙❀⊙

Marfat.com

باب:11

شام سے رومی فوجوں کا اخراج

جس وقت حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، قادسیہ میں ایرانیوں کو شکست دے رہے تھے، پھر مدائن پر یلغار کر رہے تھے، کوفہ اور بصرہ آباد ہو رہے تھے اور عراق میں اسلامی حکومت کا نظام قائم کیا جا رہا تھا، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی شام میں شہر پر شہر فتح کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے اور رومیوں کو وہاں سے نکال رہے تھے۔ وہ ایسا کیوں نہ کرتے جب کہ یرموک میں تذارق کو شکست دے چکے تھے۔ دمشق فتح کر چکے تھے۔ فحل میں ہرقل کی فوجوں کے پرخچے اڑا چکے تھے اور اس کے اردگرد طبریہ اور بیسان پر اسلامی پرچم لہرا چکے تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ طبریہ، یرموک، فحل اور دمشق یہ سب کے سب شام کی سرحدوں کے قریب صحرا کی جانب واقع تھے اور رومیوں کی مضبوط پناہ گاہیں اور مستحکم قلعے ملک کی اندرونی سمت تھے جنہیں غازیان اسلام اس وقت تک سر نہ کر سکتے تھے جب تک ان کے حمایتیوں کا قصہ پاک نہ کرتے۔ چنانچہ انہیں ان قلعوں کی طرف بڑھنا تھا اور اس ملک کو زیر کرنا تھا جس کی فتح کا ارادہ پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اور ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے۔

فتح شام کی پالیسی فتح عراق کی پالیسی سے مختلف تھی۔ عراق میں فوج کی باگ ڈور صرف ایک شخص کے ہاتھ میں تھی۔ چنانچہ عہد صدیقی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عراقی فوجوں کے سپہ سالار رہے اور عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی جگہ ان فوجوں کا کمان دار بنا دیا گیا۔ لیکن جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا، شام میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بیک وقت چار لشکر روانہ فرمائے تھے اور ہر لشکر کے لیے شام کا ایک ایک حصہ مخصوص کر دیا تھا۔ ان لشکروں کے امیر الگ الگ تھے اور انہیں اپنی حدود میں مکمل اختیارات حاصل تھے لیکن کسی موقع پر اگر یہ لشکر ایک جگہ جمع ہو جائیں تو حکم یہ تھا کہ ان کے سپہ سالار حضرت ابوعبیدہ بن الجراح

Marfat.com

ہوں گے۔ جو فوجیں فسلطین روانہ کی گئی تھیں، ان کی کمان حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے سپرد تھی۔

رومیوں سے الگ الگ مقابلہ کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر یہ فوجیں یرموک کے مقام پر جمع ہوئیں، لیکن رومیوں سے کوئی مقابلہ پیش نہ آیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس جمود سے تنگ آ گئے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ان افواج کا سپہ سالار بنا کر عراق سے شام منتقل کر دیا۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی اور زمام خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنبھالی تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو فوج کا امیر بنا دیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو معزولی کا یہ حکم ایک روایت کے مطابق معرکہ یرموک اور دوسری روایت کے مطابق فتح دمشق کے بعد پہنچایا۔ جب دمشق فتح ہو گیا تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو تھوڑی سی فوج دے کر وہیں چھوڑا اور خود حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور باقی ماندہ فوج اور اس کے تمام سرداروں کو لے کر روانہ ہو گئے۔ پہلے فحل میں رومیوں کو شکست دی پھر فوجیں لے کر بیسان اور طبریہ پر چڑھائی کر دی اور یہاں کے باشندوں کی درخواست پر ان سے صلح کر لی۔ اس قوت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حمص پر حملے کا حکم دیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اپنی فوج اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ شمال میں دمشق کی طرف روانہ ہوئے اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کو فلسطین فتح کرنے کے لیے اردن میں چھوڑ دیا۔ فلسطین پر حملہ کرنے والی فوجوں کے کماندار حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ تھے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بدستور شام کے تمام اسلامی لشکر کے سپہ سالار۔

اس وقت ہم حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شام چلتے ہیں۔ وہاں سے واپس ہو کر ابن عاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیت المقدس چلیں گے، جہاں وہ اس وقت تک اپنا محاصرہ جاری رکھیں گے جب تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ بنفس نفیس تشریف لا کر اس کے باشندوں سے صلح نہ کر لیں۔ ہم حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز اس لیے نہیں کر رہے کہ وہ شام میں اسلامی فوجوں کے سپہ سالار اعظم ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ دونوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے استقبال کے لیے مسجد اقصیٰ کے شہر کے دروازوں پر حاضر ہوں گے، اس لیے بہتر ہو گا کہ شام میں اسلامی فتوحات کا واضح نقشہ اس دن ہماری نگاہوں کے سامنے ہو، جس دن فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بیت المقدس کے بطریق کے ساتھ مسجد الصخرہ کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے اس مقدس شہر کے کوچہ و بازار سے گزریں اور اس طرح تین آسمانی مذاہب، یہودیت، مسیحیت اور

Marfat.com

اسلام کو زمین کے اس ایک قطعے میں باہم مربوط کر دیں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو حمص پر حملہ کرنے کا حکم دیا اور وہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر دمشق کی راہ اپنی منزل کی طرف قدم زن ہو گئے۔ شام کے دارالسلطنت میں پہنچ کر انہوں نے ہاشم بن عتبہ کو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے عراق جانے کا حکم دیا جو اس وقت قادسیہ میں ایرانیوں سے مقابلہ کرنے کو تیار بیٹھے تھے اور خود حمص کے ارادے سے آگے بڑھے۔ دمشق کے شمال میں اسلامی فوج کا ایک حصہ دمشق کی اعانت وامداد کے لیے متعین تھا، جس کے نگران ذوالکلاع حمیری تھے۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ جب یہاں پہنچے تو اس فوج کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ دمشق کے شمال مشرق میں مرج الروم پہنچ کر اس کا سامنا ایک رومی لشکر سے ہوا جو ہرقل نے بطریق توذر کی زیر کمان بھیجا تھا۔ اسلامی فوج اس کے بالمقابل ٹھہر گئی۔ اسی اثناء میں ایک اور لشکر، جس کا سردار شنس رومی تھا توذر کی مدد کے لیے پہنچ گیا، لیکن شنس نے ان سے ہٹ کر پڑاؤ ڈالا۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے آپس میں مشورہ کیا اور طے یہ پایا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ توذر کا مقابلہ کریں اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ شنس سے معرکہ آزما ہوں۔ ان دونوں حضرات کو یقین تھا کہ ہرقل کے یہ دونوں لشکر انہیں حمص کی طرف پیش قدمی کرنے سے روکنا چاہتے ہیں۔

حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ رات بھر دشمن سے مقابلہ کرنے کا پروگرام بناتے رہے جب صبح نے انگڑائی لی تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ توذر سے نبرد آزما ہونے کا فیصلہ فرما چکے تھے، لیکن یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئے کہ توذر کے لشکر کا آس پاس کہیں پتا نہیں۔ آخر یہ لشکر کہاں گیا؟ اور کیسے گیا؟ کس طرح وہ اس عبقری سپہ سالاروں کی روبینی وہوشیاری سے بچ کر نکل گیا؟ چشم زدن میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ ان کا حریف رات کے ابتدائی حصے میں اپنی فوج کو لے کر دمشق چلا گیا ہے۔ اسے یقین ہے کہ دمشق کے محافظین اس کے مقابلے کی تاب نہ لاسکیں گے اور وہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کا سارا لشکر شنس کے لشکر سے الجھا رہے گا۔ دمشق کے محافظ اس وقت واقعی اس قابل نہ تھے کہ تنہا اس حملہ آور فوج کے سامنے ٹھہر سکتے۔ اگر یہ لشکر شہر میں گھس کر قلعہ بند ہو گیا تو شنس پر فتح یابی بھی اس کی تلافی نہ کر سکے گی اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو از سر نو شام کے دارالسلطنت کا محاصرہ کرنا پڑے گا جس سے مسلمانوں کی ہمتیں پست اور ارادے کمزور ہو جائیں گے۔ یہ سوچ کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے

Marfat.com

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے اجازت لی اور سواروں کا ایک دستہ لے کر توذر کے تعاقب میں روانہ ہو گئے کہ وہ اچانک یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ پر نہ ٹوٹ پڑے۔ یزید رضی اللہ عنہ کو توذر اور اس کے لشکر کی آمد کا علم ہوا تو اسے روکنے نکلے۔ انہیں حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور ان کے دستے کی خبر نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے شہر کے دروازے بند کر کے اس امید پر مدافعانہ جنگ شروع کر دی کہ وہ مدد کے انتظار میں لڑائی کو طول دے سکیں گے، لیکن توذر نے ابھی حملہ کیا ہی تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اپنے دستے کو لے کر اس کے عقب میں پہنچ گئے اور سارے دستے نے مل کر نعرہ تکبیر بلند کیا۔ حضرت یزید رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے جو یہ نعرہ سنا تو انہیں مدد پہنچنے کا یقین ہو گیا اور ان کے دل بڑھ گئے اس کے برعکس رومیوں نے جونہی نعروں کی آواز سنی اور محسوس کیا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ آ پہنچے ہیں تو ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ چنانچہ سامنے سے حضرت یزید رضی اللہ عنہ نے اور پیچھے سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے انہیں تلواروں کی باڑھ پر رکھ لیا اور ان میں وہی بچ سکا جو کسی طرح بھاگ نکلا۔ رومیوں کے گھوڑے، بار برداری کے جانور، ہتھیار اور بہت سا سامان، جو وہ چھوڑ گئے، مسلمانوں کے ہاتھ لگا جسے جناب یزید رضی اللہ عنہ نے اپنی اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی فوج میں تقسیم کر دیا اور فتح و کامرانی کے پھریرے اڑاتے دمشق واپس ہوئے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر مسلمانوں نے حق کا ساتھ نہ چھوڑا، ثابت قدم رہے اور دنیا پر آخرت کو مقدم رکھا تو اللہ اپنا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اس معرکے سے، جس میں توذر مارا گیا تھا، مرج الروم واپس ہوئے تو حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ شنس پر فتح پا چکے تھے، شنس قتل ہو چکا تھا اور اس کی فوجیں تلوار کے گھاٹ اتاری جا چکی تھیں۔ اب اسلامی لشکر حمص کی طرف روانہ ہوا۔ ہرقل کو یہ ساری خبریں ملیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے بعلبک کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اہل حمص سے مدد کا وعدہ کر کے اور انہیں مقابلے کی ہمت دلا کر وہ رہاء چلا گیا۔ حمص والے آخر مقاومت کیوں نہ کرتے۔ جاڑے کا موسم تھا اور حمص کی قاتل سردی عربوں کے صبر و برداشت سے باہر تھی۔ بعلبک میں زیادہ وقت نہ لگا اور وہاں کے باشندوں نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی۔ یہاں سے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ حمص کی طرف بڑھے اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ آگے آگے تھے۔

حمص والے قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہے۔ وہ اسی دن مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکلتے تھے جس دن جاڑا تیز ہوتا تھا۔ ادھر سردی مسلمانوں کے حواس گم کیے دیتی تھی۔ ادھر رومی محاصرے سے

Marfat.com

تنگ آ گئے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ ہرقل کی مدد پہنچے یا مسلمان سردی سے عاجز آ کر بھاگ جائیں، لیکن مسلمانوں نے ثبات وصبر سے کام لیا اور ہرقل کی مدد نہ پہنچی۔ جب سردی بھی گزر گئی تو اہل حمص کو یقین ہو گیا کہ اب ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ان کی جان نہیں چھوڑیں گے اور ان کے گلے کا پھندہ روز بروز کستے چلے جائیں گے۔ اس پر ان میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ بعض مسلمانوں سے صلح کر لینے کے حق میں تھے اور بعض صلح کو ایسی ذلت سمجھتے تھے کہ اس پر موت کو ترجیح دیتے تھے۔ اچانک زلزلہ آیا جس سے شہر کی فصیلیں شق ہو گئیں اور بہت سے مکان مٹی کا ڈھیر بن گئے۔ شہر والے خوف سے کانپ اٹھے۔ اس زلزلے کو عذاب الٰہی کا الارم سمجھے۔ چنانچہ دوڑے دوڑے اپنے سرداروں کے پاس پہنچے اور ان سے صلح کا مطالبہ کیا کہ اس کے سوا نجات کا کوئی رستہ نہیں۔

اگر اس وقت مسلمان حمص پر حملہ کر دیتے تو کوئی ان کی مزاحمت نہ کرتا اور شہر بزور شمشیر فتح ہو جاتا، لیکن محاصرے کی طوالت، سردی کی شدت اور زلزلے کی دہشت ان کے حواس پر ایسی چھا گئی کہ وہ اہل شہر کے خوف وہراس کا اندازہ نہ کر سکے، چنانچہ جب حمص کے سرداروں نے صلح کی پیش کش کی تو مسلمانوں نے اسے قبول کر لیا اور شہر کے سارے مکان اہل شہر کے لیے چھوڑ دیئے گئے اور دمشق کی طرح خراج اور جزیے پر صلح کر لی گئی۔ البتہ چند عمارتیں مسلمانوں نے اپنے قیام کے لیے ان سے لے لیں۔ اس کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو تمام واقعات کی اطلاع بھیجی۔ جس کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم آیا: "تم ابھی وہیں ٹھہرے رہو اور شام کے طاقتور قبائل عرب کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرو۔ میں بھی ان شاء اللہ برابر یہاں سے کمک بھیجتا رہوں گا!"

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ حمص میں مقیم رہے۔ یہاں تک کہ سنہ 15ھ کا آدھا موسم بہار گزر گیا۔ جب جاڑے کی شدت اور زمہریری ہواؤں کا اثر فوج پر سے زائل ہو گیا تو فتح کی امنگ پھر چٹکیاں لینے لگی۔ اسی دوران میں شام کے طاقتور عرب قبائل بھی ان سے آ ملے جس کی وجہ سے ان کے حوصلے اور بلند ہو گئے۔ اب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے شمالی شام کی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھنے کے متعلق پھر سوچنا شروع کیا۔ حضرت عمرو بن عاص اور ان کے ساتھی فلسطین میں ہرقل کی فوجوں سے برسرپیکار تھے۔ اس کی خبریں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو اور بھی سوچنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ شمال میں ایک طرف سے

Marfat.com

انطاکیہ اور دوسری طرف سے حلب پر حملہ کیا جائے۔ انطاکیہ کا راستہ دریائے ارند[1] کے کنارے ہوکر جاتا تھا اور حماۃ و شیزر اس کے بیچ میں پڑتے تھے۔ لاذوقیہ کی فوجی چوکیاں اس کی حفاظت کرتی تھیں اور حلب کے راستے میں قنسرین کا قلعہ تھا جسے چاروں طرف سے پہاڑ نے گھیر رکھا تھا اور اس مضبوط و مستحکم قلعے تک پہنچنے کے لیے پہلے اس پہاڑ کو طے کرنا ضروری تھا۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو حمص میں چھوڑا اور خود فوج لے کر حماۃ کی طرف روانہ ہوئے۔ پہلے اوستان نے اپنے دروازے ان کے لیے کھول دیے۔ اس کے بعد اہل حماۃ نے ان کے آگے سر اطاعت خم کر دیا...... اور مسلمانوں نے حمص کی شرائط صلح پر ان سے بھی صلح کر لی۔

شیزر والوں کو جب معلوم ہوا کہ غازیان اسلام ان کی طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں تو صلح کے لیے دوڑے اور حماۃ والوں کی طرح ان سے بھی صلح ہو گئی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے سلمیہ فتح کیا اور اس کے بعد لاذوقیہ کے سرحدی قلعے پر پہنچ گئے۔ لاذقیہ والوں نے انہیں اپنی طرف آتے دیکھا تو قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہے اور شہر کے دروازے بند کر کے مقابلے پر آمادہ ہو گئے۔ انہیں اطمینان تھا کہ اگر مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کیا تو وہ مقابلہ کر سکیں گے اور اتنے میں سمندر کے راستے انہیں مدد پہنچ جائے گی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے شہر کا استحکام دیکھ کر محسوس کر لیا کہ اسے سر کرنا دشوار ہے۔ اگر وہ اس کے بالمقابل خیمہ زن ہو جاتے ہیں تو قیام طول پکڑ جائے گا اور اگر اس دوران میں دشمن کو مدد پہنچ گئی تو یہاں سے ناکام جانا پڑے گا، یا پھر شہر کا محاصرہ کرنا ہوگا اور اس صورت میں انطاکیہ جانا ناممکن ہو جائے گا۔ اس لیے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو ایک جنگی چال چلنی پڑی۔ انہوں نے شہر سے دور پڑاؤ ڈالا اور حکم دیا کہ غار نما گڑھے اتنے گہرے کھودے جائیں کہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا سوار ان میں چھپ جائے۔

جب گڑھے کھد گئے تو ایسا ظاہر کیا، گویا حمص واپس جا رہے ہیں۔ لاذقیہ والوں نے انہیں جاتے دیکھا تو اطمینان کے ساتھ اپنے کام کاج میں مصروف ہو گئے۔ رات ہونے پر مسلمان واپس آ کر ان گڑھوں میں چھپ گئے۔ صبح کو اہل لاذقیہ شہر کے دروازے کھول کر باہر آ گئے۔ مسلمان اچانک گڑھوں سے نکلے اور شہر پر ہلہ بول دیا۔ کچھ مسلمانوں نے شہر کے دروازے پر

---

[1] ارند: ارنط یا ارند سے مراد دریائے اورنٹس (Orantes) ہے جس پر حمص، حماۃ اور انطاکیہ واقع ہیں۔ اس کا دہانہ ساحل انطاکیہ میں ہے۔

Marfat.com

قبضہ کر کے ایک طرف تو اہل شہر کو اندر جانے سے روک دیا اور دوسری طرف قلعہ بند رومی فوجوں کو گھیرے میں لے لیا۔ جو لوگ شہر سے نکل آئے تھے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان پر خوف طاری ہو چکا تھا، اس لیے ان میں سے ہر ایک نجات کی راہ تلاش کرنے لگا، جو لوگ شہر میں تھے ان کے لیے تسلیم واطاعت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ وہ سپر انداز ہو گئے اور بھاگنے والوں نے امان چاہی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے جزیے پر ان سے صلح کر لی۔ ان کا گرجا انہیں کے قبضے میں رہنے دیا گیا اور بعد کو مسلمانوں نے اس کے قریب اپنی ایک مسجد بنا لی۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ لاذقیہ سے معرہ حمص ① پہنچے اور اسے فتح کر لیا، وہاں سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو قنسرین بھیجا جو صوبہ حلب کا بڑا بارونق شہر تھا۔ قنسرین کا استحکام حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس شہر کو بچانے کے لیے ہر قسم کی مدد بھی بھیجی جائے گی، لیکن قلعے کی فوجی قوت اور شہر کی مضبوطی حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو بھلا کیا ڈراتی اور دشمن کی آہنی صفیں سیف اللہ کو صف شکنی سے بھلا کیا باز رکھتیں۔ اس لیے وہ اللہ کی نصرت وحمایت پر یقین رکھتے ہوئے منزل مقصود کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ قنسرین کے جنوب میں باہر کی طرف بنوتنوخ اور سلیح کے عرب خیمہ زن تھے، گویا وہ اس مستحکم شہر کے ہراول ہیں۔ عربوں کا یہ دستور تھا کہ وہ شہر کی حفاظت کے لیے شہر سے باہر نکل کر خیمہ ڈال دیتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے بھی اپنے عرب بھائیوں کے اسی دستور پر عمل کیا تھا۔ رومیوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ حملہ آور قاہر و جابر زیرک فاتح ہے تو انہوں نے محض ان عربوں کو غازیان اسلام کے مقابلے میں کافی نہ سمجھا۔ چنانچہ میناس، جو ہرقل کے بعد روم کا سب سے بااثر شخص تھا، ایک بھاری لشکر لے کر شہر سے باہر نکلا تاکہ انہیں قیصر کے ملک میں در آنے سے روکے۔ اس نے معتبر آدمیوں کو دشمن کی خبریں لانے پر مامور کیا کہ ان کی روشنی میں مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کی پالیسی مرتب کرے، لیکن ابھی وہ خبروں کے انتظار ہی کر رہا تھا کہ صبح ہوتے ہی حضرت خالد رضی اللہ عنہ کسی نامعلوم سمت سے اچانک جا پہنچے۔ میناس نے بہت چاہا کہ کسی طرح اس ناگہانی حملے کو روکے، لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس کی تدبیر خاک میں ملا دی اور پوری قوت سے رومیوں پر حملہ کر دیا۔ رومی اس حملے کی تاب نہ لاسکے اور وہ تاب لا بھی کیسے سکتے تھے، جب کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا نام سن کر دل دہلنے لگتے تھے اور ارادے مسمار ہو جاتے تھے، وہ مسلمانوں کے سامنے کس طرح ٹھہر سکتے تھے جب کہ دمشق

① معرہ حمص سے مراد معرہ نعمان ہے جو بعد کو نعمان بن بشیر انصاری کی طرف منسوب ہو کر اس نام سے موسوم ہوا۔

حمص، حماۃ اور لاذقیہ میں اسلامی فتوحات کی خبریں ان کے کانوں تک پہنچ چکی تھیں۔ پھر وہ فوج ثابت قدم رہ بھی کیسے سکتی ہے۔ جس کی معنوی قوت فنا ہو چکی ہو۔ چنانچہ اس نے بھاگنا چاہا لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرار کی ساری راہیں مسدود کر دیں اور کشتیوں کے پشتے لگا دیئے۔ مناس کو بھی مسلمانوں نے اس کے خون میں نہلا دیا۔ کچھ رومی بھاگ کر قنسرین میں قلعہ بند ہو گئے۔ خالد رضی اللہ عنہ نے ان کا تعاقب کیا، لیکن جب وہ قنسرین پہنچے تو رومی شہر کے دروازے بند کر چکے تھے۔ یہ دیکھ کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ان کے پاس یہ تہدیدی پیغام بھیجا: ''اگر تم بادلوں میں جا چھپو گے تو اللہ ہم کو تمہارے پاس پہنچا دے گا۔ یا تمہیں ہماری طرف پھینک دے گا۔''

کچھ دن تک تو وہ یوں ہی قلعہ بند رہے، لیکن آخرکار قنسرین والوں کو یقین ہو گیا کہ مناس، تذریق اور روم کے تمام سپہ سالاروں کو کچل دینے والے قائد کے سامنے جھک جانے کے سوا نجات کی اب کوئی راہ نہیں۔ چنانچہ انہوں نے درخواست کی کہ حمص کی شرائط پر انہیں امان دے دی جائے، لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ ان کو حکم عدولی کی سزا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے اس لیے شہر کو تباہ کرنے کے سوا اور کسی بات پر راضی نہ ہوئے اور اہل قنسرین اپنے مال و متاع اور اہل و عیال کو تقدیر کے حوالے کر کے انطاکیہ بھاگ گئے۔

فتح قنسرین کی مشہور روایت یہ ہے لیکن بعض ادبی ذوق رکھنے والے مؤرخین اس میں جبلہ بن ایہم غسانی کے اس واقعے کا بھی ذکر کرتے ہیں جو اس شہر کی مدافعت کے سلسلے میں اس سے منسوب ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہرقل سے پہلے جبلہ بنو غسان کا آخری بادشاہ اور رومیوں کا پرخلوص حلیف تھا۔ اسے غسان اور حیرہ کے دوسرے بادشاہوں کی طرح شعرائے عرب سے بڑی محبت تھی۔ وہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا اور ان کے ساتھ احترام سے پیش آتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر حضرت حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ اسے تمام شاعروں سے زیادہ محبوب تھے۔ اس کی مدح میں حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے اشعار آج تک عربی شاعری میں اپنا ایک خاص درجہ رکھتے ہیں، جن دنوں جبلہ کو قنسرین کے محاصرے کی خبریں پہنچیں، وہ انطاکیہ کے قریب دریائے ارند کے آہنی پل کے پاس مقیم تھا۔ وہ رومیوں کا ساتھ دینے اور ان کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے روانہ ہوا لیکن ابھی رستے ہی میں تھا کہ اس کے ہراول دستے ایک مسلمان کو پکڑ لائے جس نے اپنا نام سعید بن عامر خزرجی بتایا اور بنو ثعلبہ کے ایک قبیلے مزیقیا سے اپنا نسبی تعلق ظاہر کیا جو جبلہ کے اجداد تھے۔ خزرج کا نام سن کر جبلہ کو اپنا دوست انصاری شاعر یاد آ گیا۔ اس نے سعید سے پوچھا: ''تمہیں اس سے جدا ہوئے کتنے دن ہوئے؟'' سعید نے جواب دیا: ''تھوڑے ہی دنوں کی بات

Marfat.com

ہے اس نے مجھے ایک دعوت میں بلایا اور کنیز کو وہ اشعار گانے کا حکم دیا جو اس نے تمہاری مدح میں کہے ہیں اور کنیز نے یہ اشعار گائے:

لِلّٰہ دَرُّ عصابۃ نادمتھم
یَوماً بِجلّقَ فی الزّمان الاولِ
اولاد جَفنَہ حول قبر اَبیھم
قبر ابن مَارِیَہ الجوادِ المفضلِ
یُغشَونَ حتی مَا تَھِرّ کِلابُھم
لا یسئالون من السوادِ المُقبلِ
بیض الوجوہ کریمۃٌ احسابُھم
شُمُّ الانوفِ مِن الطِّراز الاوّلِ

ترجمہ: اللہ اللہ! مدتوں پہلے وہ ایک دن جلق میں خوش باشوں کی محفل آرائی۔ جفنہ کی اولاد اپنے باپ صاحب جودو فضل ماریہ کی قبر کے گرد بیٹھی تھی۔ رات کی سیاہ چادر پھیل گئی یہاں تک کہ کتے بھونکنے لگے، لیکن وہ بڑھتی ہوئی تاریکی کے متعلق کچھ نہ پوچھتے تھے۔ چہرے کی سفیدی ان کی نسبی فضیلت اور ناک کی بلندی ان کی پشتینی عظمت کی دلیل ہے۔"

جبلہ نے یہ اشعار سن کر سعید کو انعام دیا اور بتایا کہ بادشاہ نے اسے قنسرین کی مدافعت کے لیے بھیجا ہے۔ اس کے بعد کہا کہ وہ جا کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اس کی فوجی طاقت اور تلواروں کی کاٹ سے ڈرائے۔ جبلہ اور اس کے لشکر نے رومیوں کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے نبرد آزما ہوا۔ اسے فتح ہونے ہی والی تھی کہ کمک پہنچ جانے سے مسلمانوں کا پلہ بھاری ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے جبلہ کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا اور شہر والوں میں سے جو بھاگ سکا، انطاکیہ بھاگ گیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ جب اپنے لشکر کو لے کر پہنچے تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ فتح یاب ہو چکے تھے۔ آخر کار اہل قنسرین کو امان دے دی گئی اور اس شرط پر صلح ہو گئی کہ وہ جزیہ ادا کریں گے اور ان کی فصیلیں اور قلعے منہدم کر دیئے جائیں گے جو عرب شہر کے باہر خیمہ زن تھے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا تو اطاعت قبول کر لی۔ ان میں سے اکثر مسلمان ہو گئے اور جو نصرانیت پر قائم رہے ان پر جزیہ عائد کر دیا گیا۔

جبلہ سے متعلق یہ روایت، جس میں کہا گیا ہے کہ وہ قنسرین کی مدافعت کے لیے گیا تھا،

Marfat.com

میرے نزدیک صحیح نہیں اور یہی وجہ ہے کہ طبری، ابن خلدون، ابن اثیر، ابن کثیر اور ان کے متبعین نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اگرچہ فتوح الشام میں، جو واقدی سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس کا ذکر موجود ہے۔ لیکن صحیح اور مشہور روایت یہی ہے جو ثقہ مؤرخین نے نقل کی ہے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو خط لکھا جس میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے کارناموں، میاس اور اس کے لشکر پر ان کی فتح اور قنسرین میں اس کے تمام تر استحکام کے باوجود ان کے داخلے کی تفصیل بیان کرنے کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی وہ بات بھی نقل کی جو انہوں نے اہل قنسرین سے کہی تھی: ''اگر تم بادلوں میں بھی جا چھپو گے تو اللہ ہم کو تمہارے پاس پہنچا دے گا یا تمہیں ہماری طرف پھینک دے گا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی عبقریت پر، جو قنسرین کے کارناموں میں پوری طرح نمایاں تھی، بڑا تعجب ہوا اور آپ نے فرمایا: ''خالد نے اپنے آپ کو امیر بنا لیا۔ اللہ ابوبکر رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے وہ مجھ سے زیادہ مردم شناس تھے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ ہمیں بتاتے ہیں کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے قنسرین میں جو معجز نما کارنامے سرانجام دیئے وہ ان کے ان تمام کارناموں پر فوقیت رکھتے ہیں جن کا اظہار حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دمشق، حمص اور ان دوسرے شہروں میں کیا۔ جو حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے آغاز خلافت سے لے کر ان کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہونے کے وقت تک مسلمانوں نے فتح کیے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ان کارناموں کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ فتح قنسرین کے چند ماہ بعد جب وہ بیت المقدس میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے ملے تو قنسرین کی امارت ان کے سپرد فرما دی۔

تعجب ہے کہ قنسرین میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے کارنامے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو اس درجہ متاثر کرتے ہیں اور قنسرین اپنے گردو پیش پھیلے ہوئے اضلاع کا مرکز بھی ہے، لیکن اس کے باوجود متذکرہ بالا تفصیلات کے سوا ثقہ مؤرخین اس کے بارے میں اور کچھ نہیں لکھتے [1] اور ایک قنسرین

---

[1] ہمیں معرکہ قنسرین کے سلسلے میں کوئی ایسی مفید تفصیل نہیں ملی جیسی واقدی نے فتوح الشام میں بیان کی ہے، لیکن جیسا کہ ہم نے متن میں کہا ہے، ہمارے نزدیک واقدی کی روایت غیر مستند ہے اور جو واقعات اس نے نقل کیے ہیں وہ خرافات سے زیادہ قریب ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ جس وقت جبلہ اور رومی لشکر قنسرین پہنچے ہیں، حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ساتھ صرف دس مسلمان جاں باز تھے۔ یہ دس کے دس مسلمان دشمن کی فوج میں شامل ہو گئے اور کوئی انہیں نہ پہچان سکا۔ جبلہ اور اس کے ساتھیوں کے لیے جب شہر کے دروازے کھولے گئے تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حاکم شہر پر حملہ کر کے اسے گرفتار کر لیا اور اس کے بعد انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے بتا دیا کہ ہم مسلمان ہیں۔ جبلہ اور رومی سپہ سالار»

Marfat.com

ہی پر کیا موقوف ہے، شام کی دوسری فتوحات میں بھی طبری اور ان کے متبعین اور بلاذری اور ان کے مقلدین ایسے ہی اختصار سے کام لیتے ہیں جو عراق کی فتوحات کی تفصیل سے کسی طرح میل نہیں کھاتا۔ البتہ شام کے واقعات میں معرکۂ یرموک اور فتح بیت المقدس کا ذکر ان مؤرخین نے تفصیل سے کیا ہے اور تھوڑی سی توجہ فتح دمشق کی طرف بھی منعطف کی ہے۔ اس لیے کہ جس طرح وہ قادسیہ کی جنگ کو عراق کی کنجی سمجھتے ہیں، اسی طرح یرموک کی جنگ کو شام کی کنجی قرار دیتے ہیں اور اس لیے کہ دمشق شام کا دارالسلطنت تھا اور بیت المقدس مسجد اقصیٰ کا شہر۔ کاش! اگر وہ قنسرین کے واقعات بھی تفصیل سے بیان کر دیتے تو امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے اس قول کا راز ہم پر واضح ہو جاتا۔

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اہل قنسرین نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے حمص کی شرائط صلح پر امان طلب کی، لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ انہیں ان کی حکم عدولی کی سزا دینے کا فیصلہ فرما چکے تھے اور شہر کو تباہ و برباد کر دینے کے سوا اور کسی بات پر راضی نہ تھے۔ چنانچہ قنسرین والے انطاکیہ بھاگ گئے۔ جس وقت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کو عدل و انصاف کے عین مطابق پایا اور شہر کے قلعے اور فصیلیں منہدم کرا دیں۔ اس کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ انصاف کے ساتھ شفقت بھی ہونی چاہیے اور اہل شہر کو ان کی درخواست کے مطابق امان دے دی۔ کہا جاتا ہے کہ شہر کے کلیسا اور مکان تقسیم کر دیئے گئے اور ان کے نصف حصے پر مسلمان قابض ہو گئے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ شہر کی کچھ زمین لے کر وہاں مسجد تعمیر کر دی گئی۔

» ڈرے کہ اگر ہم ان مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ حاکم شہر کو قتل کر دیں گے، جو ہرقل کے مقربین خاص میں سے تھا۔ چنانچہ جبلہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے درمیان ایک طویل گفتگو ہوئی۔ اور یہ طے پایا کہ رومی سورما ایک ایک کر کے مسلمان جاں بازوں سے مبارزت کریں۔ اس مبارزت میں شجاعان اسلام نے رومیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو قتل کر دیا لیکن ان کا ایک آدمی بھی شہید نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر جبلہ اور رومی سپہ سالار غضبناک ہو گئے اور اپنے اپنے لشکروں کے ساتھ ان دس مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے دشمن کی ایک بڑی جمعیت کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا آخر کار وہ ہمت کر کے ایک دم مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑنے ہی والے تھے کہ انہوں نے تکبیر کے نعروں کی گونج سنی اور کمک پہنچ جانے کے یقین نے ان کو سنبھال لیا۔ اتنے میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اپنے لشکر سمیت وہاں پہنچ گئے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو دشمن کے نرغے سے نکالنے اور قنسرین فتح کرنے کے لیے جبلہ اور رومی لشکر پر حملہ کر دیا۔ یہ ہے واقدی کے بیان کا خلاصہ جس میں چند ایسی کہانیاں بھی اس نے شامل کر دی ہیں جو سرتاسر خرافات ہیں اس لیے ہم نے انہیں یہاں درج نہیں کیا۔

اور باقی سب کچھ بدستور اہل شہر کے قبضے میں رہنے دیا گیا۔ چنانچہ جو لوگ انطاکیہ بھاگ گئے تھے۔ جزیہ قبول کر کے واپس آ گئے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق ان سے بھی بہتر سلوک کیا گیا جس طرح دوسرے مفتوحہ علاقوں کے باشندوں سے بہتر سلوک کیا گیا تھا اور صحیح مساوات کی بنیاد پر ان کے درمیان عدل قائم کیا گیا، جس میں کوئی طاقتور کسی کمزور پر ظلم و جبر نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن اس کے باوجود اہل شہر کے دلوں میں کینہ و غضب کی چنگاری سلگتی رہی اور جب مسلمان حلب کی طرف بڑھے تو بغاوت و سرکشی کا شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے باغیوں کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجی، جس نے محاصرہ کر کے ان کے مویشی چھین لیے۔ اس فوج کو وہیں چھوڑ دیا گیا کہ اہل شہر دوبارہ سرکشی نہ کر سکیں اور ظفر مند لشکر کے عقب کی حفاظت ہو سکے، اس طرف سے مطمئن ہو کر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور حلب کے باہر جا کر پڑاؤ ڈالا۔ یہاں جو عرب تھے، انہوں نے جزیے پر صلح کر لی اور اس کے بعد ان میں سے اکثر مسلمان بھی ہو گئے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے عیاض بن غنم کو آگے بھیجا اور انہوں نے حلب کا محاصرہ کر لیا۔ ہر چند کہ حلب کے قلعے بڑے مضبوط تھے لیکن اہل حلب نے فوراً ہی صلح کر لی اور قلعوں کی مضبوطی کر بھی کیا سکتی تھی جب دل ہی ٹوٹ جائیں۔ ہمتیں ہی پست ہو جائیں اور ارادے ہی جواب دے جائیں؟

حلب والے دیکھ چکے تھے کہ ان سے پہلے جن لوگوں نے مسلمانوں کی مزاحمت کی ان کا کیا حشر ہوا؟ اور سمجھ لیا تھا کہ موت سے کھیلنے والے ان فاتحین کا مقابلہ کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ عیاض نے ان کی درخواست کے مطابق انہیں امان دے دی اور ان کی جان اور اہل و عیال، ان کے کلیسا اور ان کے قلعے غرض یہ کہ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا، صرف مسجد کے لیے ایک جگہ ان سے لے لی۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ صلح مکانوں اور کلیساؤں کی تقسیم پر ہوئی تھی اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ حلب میں داخل ہوئے تو وہاں کوئی نہ تھا۔ شہر کا شہر انطاکیہ منتقل ہو گیا اور جب صلح ہوئی تو واپس ہوا۔

اس باب میں انطاکیہ کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ فتح دمشق کے بعد ہرقل نے حمص سے بھاگ کر یہاں پناہ لی تھی اور ابھی آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ حضرت

Marfat.com

ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اسے آکر فتح کریں گے اور اس کے فتح ہوتے ہی ہرقل شام کو خیر باد کہہ کر قسطنطنیہ میں سر چھپائے گا۔ اس کے فوراً بعد جبلہ بن ایہم مسلمانوں سے آملے گا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوگا۔ انطاکیہ کا ذکر اگر بار بار آیا ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ان دنوں انطاکیہ مشرق میں رومی سلطنت کا پایہ تخت تھا اور قسطنطنیہ کے مقابلے کا شہر سمجھا جاتا تھا۔ رومی سردار اس کے نزدیک ہونے کی بنا پر اسے اسکندریہ سے بہتر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مصری پایہ تخت کے مقابلے میں جس کی راہ میں سمندر حائل ہے اور جو بار بار ان کے خلاف بغاوت بھی کر چکا ہے، یہ شہر ان سے زیادہ مضبوط رابطہ رکھتا ہے، اس لیے ان کی توجہ انطاکیہ پر زیادہ رہتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس شہر میں ایسی ایسی عبادت گاہیں، ایسی ایسی عمارتیں اور ایسے ایسے تفریح کدے بنائے تھے، جنہوں نے اس شہر کو دمشق اور دمشق کے علاوہ مشرق کے تمام شہروں سے زیادہ بارونق بنا دیا تھا۔ یونانی اور رومی بت پرستی کے زمانے میں بھی اس کی یہی شان تھی اور اس کے بعد مسیحیت کے دور میں بھی اس کی یہی شان رہی۔ بڑے بڑے عالی شان مندر اس کے مختلف گوشوں میں پھیلے ہوئے تھے جنہیں کئی بار زلزلوں نے مسمار کیا اور ہر بار وہ پہلے سے بھی زیادہ عظمت و شان کے ساتھ تعمیر کر دیئے گئے۔ مسیحی کلیسا بعد کے زمانے میں تعمیر کیے گئے، جو باعتبار جلال و وقار ان مندروں سے کسی طرح کم نہ تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انطاکیہ کو سب سے زیادہ مسیحیت قبول کرنے کا فخر حاصل تھا اور اس کے باشندوں نے سب سے پہلے اپنے آپ کو مسیحی کے نام سے موسوم کیا تھا۔ اس کے بطریق کہتے ہیں کہ سینٹ پیٹرس نے ان بزرگوں کو نصرانی بنایا تھا۔ ان میں ''انجیل برناباس'' کو رواج دیا تھا اور اس کی تعلیمات ان میں پھیلائی تھیں۔ اس شہر میں سینٹ پیٹرس کے اتنے شاگرد اور چیلے تھے کہ مسیحیت کے ابتدائی دور میں یہ شہر مذہبی سرگرمیوں کا ایک عظیم مرکز اور ایشیائی بطریق کا مستقر تھا۔ تیسری صدی عیسوی کے نصف آخر میں یہاں دس کلیسائی کانفرنسیں منعقد ہوئیں، جن کی تجویز نے مسیحی فرقوں کی تکوین پر اثر ڈالا۔ یہ پوری تفصیل نصرانیت کی تاریخ میں موجود ہے۔ انہیں وجوہ کی بنا پر اس زمانے میں شہر کی حدود وسیع ہو گئیں اور اس کے باشندوں کی تعداد ایک لاکھ پہنچ گئی۔ اس عظیم آبادی کی معیشت میں کوئی تنگی پیدا نہ ہوتی تھی اس لیے کہ انطاکیہ بحر روم کے ساحل پر ارنط کے دہانے کے قریب واقع تھا جہاں اس کے باشندوں کی ضرورت کی تمام اشیاء سلطنت کے مختلف ملکوں سے جہازوں پر لاد کر پہنچا دی جاتی تھیں۔ اسی طرح وہ قافلوں کے حلب جانے والے راستے پر بھی واقع تھا جو حلب سے عراق اور ایشیائے کوچک کی طرف پھٹ جاتا تھا۔ اسی محل وقوع نے اسے تجارت کا ایک عظیم

Marfat.com

مرکز بنا دیا تھا جو شرق و مغرب کا نقطہ اتصال تھا۔

انطاکیہ کی یہ منزلت عہد فاروقی رضی اللہ عنہ تک برقرار رہی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی اہمیت و شہرت کا اچھی طرح اندازہ تھا اور اس کی فتح ان کی نظر میں مدائن اور بیت المقدس کی فتح کے مساوی حیثیت رکھتی تھی۔ اسی لیے وہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی خبروں کا بھی اسی بے چینی سے انتظار فرماتے تھے جس بے چینی سے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی جنگ قادسیہ کی خبروں کا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ انطاکیہ کے استحکام، اس کے محل وقوع اور اس کی فوجی قوت سے بے خبر نہیں تھے۔ جس طرح یہ بات ان سے پوشیدہ نہ تھی کہ شام کی لڑائیوں میں، جو رومی شکست کے بعد بچ گئے ہیں، وہ سب کے سب انطاکیہ میں جمع ہو کر اس کی مدافعت پر کمربستہ ہیں۔ انطاکیہ واقعی ایک مستحکم شہر تھا جسے چاروں طرف سے بلند و بالا فصیلوں نے گھیر رکھا تھا، جن کی بلندی کو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی تھی۔ یہ دیواریں کہیں کہیں حلب کو چاروں طرف سے گھیرنے والی وادی کے شگافوں سے اٹھائی گئی تھیں اور اکثر ان پہاڑوں سے بھی اونچی نکل گئی تھیں جو شہر کے بعض حصوں کو محیط تھے۔ یہاں تک کہ دیکھنے والا یہ خیال کرنے لگتا تھا کہ پہاڑ اس شہر کو اپنی آغوش میں لیے کھڑے ہیں اور انہیں طے کرنے، ان پر قابو پانے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ ایسی مستحکم جگہ، جب کہ روم کی تمام فوجیں بھی شام کی شمالی جنگوں سے پسپا ہو کر وہاں جمع ہو گئی ہوں، واقعی اس قابل تھی کہ مسلمان اپنے قدم روک لیں بلکہ اس پر حملے کا خیال ہی سرے سے ترک کر دیں اور ہرقل کے لیے بھی یہی مناسب تھا کہ اس میں پناہ لے کر بحری راستے سے ہر قسم کی مدد حاصل کرے اور اپنے دشمن کو دفع کر کے اس کے داغ کو دھوئے جو اس کے اور اس کی سلطنت کے دامن میں لگ گیا تھا، لیکن ہرقل نے رہاء سے انطاکیہ آنے کے متعلق سوچا ہی نہیں اور نہ اس عظیم شہر کی مدد ہی کی فکر کی بلکہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو اس کی طرف جانے دیا کہ انطاکیہ والے انطاکیہ سے نکل کر ان کا مقابلہ کریں اس کی چار دیواری کے باہر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ایک سخت معرکے کے بعد انہیں شکست دے کے چاروں طرف سے شہر کا محاصرہ کر لیں اور انطاکیہ والوں کے لیے تسلیم و اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے جزیے پر ان سے صلح کر لی جن لوگوں نے جزیہ دینا قبول نہ کیا انہیں جلاوطن کر دیا اور وہاں سے آگے بڑھے۔

انطاکیہ والوں پر یہ شرمناک شکست اتنی گراں گزری کہ انہوں نے صلح کا معاہدہ توڑ دیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے عیاض بن غنم کو ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا جنہوں نے بغ... ت... ے

Marfat.com

سابقہ شرائط پر نیا معاہدہ کرلیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے یہ پوری تفصیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کی، جس کے جواب میں دربار خلافت سے یہ حکم آیا کہ انطاکیہ میں حفاظتی دستے متعین کردیئے جائیں اور ان کے وظائف میں تاخیر نہ کی جائے تاکہ شہر میں دوبارہ بغاوت کی آگ بھڑک اٹھنے کا اندیشہ باقی نہ رہے۔

انطاکیہ کے بعد شمالی شام کے باقی ماندہ حصے کی تطہیر اور بغاوتوں کی سرکوبی مسلمانوں کے لیے باقی رہ گئی تھی۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ حلب روانہ ہوئے جہاں رومیوں کا لشکر دوبارہ جمع ہو گیا تھا۔ مسلمانوں نے اس لشکر کو شکست دے کر پراگندہ کردیا۔ اس کے بعد قورس اور منبج فتح کیے۔ پھر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو بھیجا جنہوں نے مرعش پر قبضہ کرلیا۔ اس سے شام کی فتوحات کا سلسلہ فرات سے جاملا اور عراق و شام کی فوجیں ایک دوسرے کے قریب ہوگئیں۔ اس کے علاوہ حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ دمشق سے نکلے اور بیروت اور اس کے قریب کے سرحدی قلعوں کو فتح کرلیا۔ یہ تمام خبریں ہرقل کو رہاء میں پہنچیں اور اسے یقین ہوگیا کہ شام اب اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس کی سلطنت اب شام سے محروم ہوگئی۔

اسے کیا کرنا چاہیے؟ کیا رہاء میں رہ کر اہل جزیرہ اور ان کے پڑوسیوں کو دشمن کے مقابلے کے لیے جمع کرے کہ شاید تقدیر ترش روئی کے بعد پھر اس کے لیے مسکرا دے؟ نہیں! اس نے کچھ نہ کیا۔ اس پر مایوسی چھا گئی تھی اور اسے یقین ہوگیا تھا کہ اس کا ستارہ اقبال اب غروب ہوچکا ہے۔ چنانچہ وہ رہاء سے قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب شمشاط سے گزر رہا تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، بلاد قلقیہ میں مرعش سے تل اعزاز ہوتے ہوئے دلوک جارہے تھے۔ ہرقل بہ سرعت شمشاط سے چل پڑا اور پہاڑوں کی راہ اختیار کی۔ وہاں اس نے شام کی حسین و جمیل سرزمین پر نگاہ ڈالی اور حسرت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ ''سلام! اے سرزمین شام! الوداعی سلام! اب کوئی رومی بے کھٹکے تیری طرف نہ آسکے گا!'' وہ عزم و ہمت کا جنازہ اپنے کندھوں پر لادے بزنطیہ پہنچا اور دل بہ خوں آغشتگی کے عالم میں عصائے سفر وہیں ٹیک دیا۔

کیا ہرقل اور شام کا یہ انجام حیرت انگیز نہیں ہے؟ ایرانیوں نے سنہ 614ء میں رومیوں پر حملہ کیا اور مصر و شام پر قابض ہوگئے۔ لیکن ہرقل نے تخت نشین ہوتے ہی ایرانیوں پر چڑھائی کی اور جنگ میں انہیں شکست دی۔ مصر و شام سے انہیں نکال کر صلیب اعظم ان سے چھین لی اور بڑی دھوم دھام سے اسے پھر بیت المقدس لے گیا لیکن آج اس کی فوج کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ

Marfat.com

مسلمانوں کے مقابلے میں پے در پے شکستیں کھا رہی ہے پھر خود ہرقل پر کیا بپتا پڑ گئی ہے کہ وہ اپنے لشکر کی قیادت نہیں کرتا اس میں وہ اپنی معنوی قوت نہیں پھونکتا جس کا مظاہرہ اس نے تخت نشیں ہوتے ہی کیا تھا؟ بلکہ اسے کیا ہو گیا ہے کہ وہ فوج سے دور دور رہتا ہے۔ پہلے حمص، پھر انطاکیہ، پھر رہاء اور آخر کار اب بزدلوں کی طرح بزنطیہ بھاگ آیا ہے اور ذلت و سرگشتگی کے عالم میں پڑا ہے؟ ابھی دس سال بھی نہیں گزرے کہ اس نے ایرانیوں کو شکست دی تھی اور آج مسلمانوں سے خود شکست کھا رہا ہے۔ اُس نے ایرانیوں کو سنہ 625ء میں ہرایا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں اس کی ہزیمتوں کا آغاز 634ء میں ہو گیا اور سنہ 635ء میں وہ پورے شام ہی کو چھوڑ بھاگا۔ کیا اس حیرت انگیز انقلاب میں کوئی ایسا راز پوشیدہ نہیں جس کا انکشاف ممکن ہو؟ یا یہ تقدیر کی اتفاق آفرینی ہے جس کی تفسیر اور جس کے اسباب کی توضیح کی کوئی صورت نہیں؟ اس کارگاہ آب وگل میں کوئی کام ایسا نہیں جو کائنات ہستی کے قوانین کا محکوم نہ ہو۔ اگر ہم ان تمام قوانین کو جان لیں اور ہمارا علم ہر بڑے سے بڑے اور باریک سے باریک واقعے کا احاطہ کرے تو ہمارے لیے ممکن ہے کہ دقت نظر سے کام لے کر، جو افلاک کے مدار اور ستاروں کی رفتار ہم پر واضح کر دیتی ہے، اجتماعی مظاہر کی تشریح اور ان کے نتائج کا عرفان حاصل کر لیں۔ لیکن بہت سے قوانین ہیں جن کا علم آج تک ہماری نگاہوں سے روپوش ہے اور کائنات کے بہت سے واقعات وحوادث ہیں جن کی معرفت ہمیں حاصل نہیں، چاہے وہ ہم سے پہلے گزر چکے ہوں اور ہمارے پیش روؤں نے انہیں اس طرح مدون نہ کیا ہو جو ہمیں ان کی صحیح حقیقت پر مطمئن کر دے یا ہماری زندگی اتنی کوتاہ ہو کہ ہم اس مدت میں ان تمام باریکیوں کا احاطہ نہ کر سکیں، جن کی مدد سے اجتماعی حوادث کے متعلق دو اور دو چار کی طرح کوئی حتمی رائے قائم کی جا سکے، لیکن اس سے یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی دور کے مصنفین ومفکرین نے اسباب کی تلاش اور ان سے نتائج اخذ کرنے میں تکلف کیا ہو۔ اتنا کام وہ بہر حال کر گئے ہیں کہ متاخرین ان کے نظریات کی چھان بین کے بعد کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کر سکتے ہیں۔ دقائق کی تلاش میں بحث ونظر کا یہ سلسلہ مسلسل کئی صدیوں تک یونہی جاری رہے گا تا آنکہ اجتماعی معاملات میں قوانین ہستی کا علم ہمیں اس حد تک حاصل ہو جائے جس حد تک آج ہمیں ریاضی قاعدوں کا علم حاصل ہے۔ اس وقت انسانی ہستی کے اسرار ہم پر منکشف ہو جائیں گے اور اس کے ماضی واستقبال کا علم ہمارے لیے ایک ہو جائے گا۔ غالب گمان یہ ہے کہ ہمارے اور اس مقصد کے درمیان ابھی

Marfat.com

بڑی مدت درکار ہے۔ لہٰذا حقیقت کے عرفان کے لیے ہمیں اپنی متجسسانہ کوششیں جاری رکھنی چاہئیں کہ یہ تلاش وتحیص ہی عقلی زندگی اور روحانی نشاط کی مظہر ہے۔ اس طرح اگر ہم مکمل طور پر تمام حقائق کے چہرے سے نقاب بھی نہ اٹھا سکے تو ان کے ایک بڑے حصے کے انکشاف پر تو قادر ہو ہی جائیں گے۔

اب دیکھیے کہ اس انقلاب کا راز کیا ہے جو ہرقل اور اس کی فوجوں پر چھپٹا اور وہ اسلامی قوتوں کے سامنے پسپا ہونے لگیں۔ حالانکہ ابھی دس برس بھی نہیں گزرے تھے کہ انہوں نے ایرانیوں پر فتح پائی تھی، انہیں مصر وشام سے نکالا تھا اور ایرانی دارالسلطنت تک ان کی زد میں آ گیا تھا؟ کیا ایرانیوں سے ان جنگوں نے، جو چھ سال تک جاری رہیں، انہیں تھکا دیا تھا اور انہیں غیر معمولی جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا؟ بلاشبہ بعض اوقات یہ سبب بھی اہمیت رکھتا ہے لیکن جو حالات ہم بیان کر رہے ہیں ان میں اس کی کوئی اہمیت نہیں اور اسی لیے وہ اس انقلاب کی وضاحت نہیں کرتا جو چند ہی سال میں رومیوں کو فتح سے شکست کی طرف دھکیل کر لے گیا۔ اس لیے کہ عربوں کی طاقت اپنے نظم اور اپنی تعداد کے اعتبار سے ایران یا روم کی طاقتوں کے سامنے کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی اور دس سال کی مدت رومی سلطنت کے مختلف گوشوں سے ایک ایسا نیا لشکر مرتب کرنے کے لیے کافی تھی جس کی تعداد اور سامان کے مقابلے میں عرب کوئی لشکر تیار نہ کر سکتے تھے۔ ہم نے یرموک، دمشق، فحل اور دوسرے تمام معرکوں میں دیکھا ہے کہ رومی تعداد میں عربوں سے دوگنے اور چوگنے تھے، لیکن اس کثرت تعداد نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا اور وہ مسلمانوں پر غالب نہ آ سکے بلکہ یرموک کی جنگ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا یہ قول سچ ثابت ہوا: ''فوجیں فتح ونصرت کے لحاظ سے زیادہ اور شکست و ہزیمت کے لحاظ سے کم ہوتی ہیں، نہ کہ سپاہیوں کی تعداد کے اعتبار سے۔'' اب ضروری ہے کہ اس انقلاب کی تشریح وتوضیح کے لیے ہم دوسرے اسباب کی جستجو کریں۔

یہ اسباب مختلف ہیں لیکن بالآخر وہ ایک ہی حتمی نتیجے پر پہنچاتے ہیں جو ہماری رائے میں اس واقعے کی اصل علت ہے۔ اس نتیجے کا خلاصہ یہ ہے کہ ملکی سیاست نے رومی عوام کو بدگمانی اور حکومت کے خلاف برہمی تک پہنچا دیا تھا جس کی وجہ سے وہ حکومت کی حمایت سے دست بردار ہو گئے تھے، اس کے تحفظ کے لیے ان کے دلوں میں کوئی جوش اور کوئی ولولہ باقی نہیں رہا تھا اور فتح وکامرانی کا حصول اس ذہنی فضا میں بہت دشوار کام ہے۔ اس لیے کہ فتوحات کے واسطے صرف

فوجی قوت ہی بڑھا لینی کافی نہیں ہوتی، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عوام میں جرأت و اخلاق کی قدروں کو قائم رکھنا لابدی اور ناگزیر ہے۔ آج ہم اس ضرورت کا پختہ شعور رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ جہاں فوجیں میدان جنگ میں جنگ کی صعوبتیں برداشت کرتی ہیں، وہاں عوام بھی ان خوفناکیوں میں ان کے برابر کے شریک رہتے ہیں۔ اس لیے کہ آج انہیں بحری ناکہ بندی اور فضائی حملوں کا شکار ہونا پڑتا ہے جبکہ اگلے زمانے کے عوام ان صعوبتوں سے محفوظ رہتے تھے۔ یہ صحیح ہے، لیکن یہ صرف اس دشوار پہلو ہی کی عکاسی کرتا ہے جو کبھی کبھی شہریوں کو پیش آجاتا ہے۔ ان مسلسل ایجابی قربانیوں کی تصویر کشی نہیں کرتا، جن کا شہریوں سے مطالبہ کیا جاتا ہے جو فوجی قوت کی اساس ہیں اور جن کے مطابق انہیں فتح کی امید ہوتی ہے۔ شہری ہی غذا اور سامان سے فوج کی مدد کرتے ہیں اور وہی جنگ کے زمانے میں محرومیوں کو اپنی زندگی بنا کر فوج کو اپنے اور اپنے اہل وعیال پر ترجیح دیتے ہیں تاکہ فوج کی فتح ان کی پرامن زندگی کی ضامن بن جائے اور یہ قربانیاں وہ مخلصانہ طور پر اسی وقت کرتے ہیں جب انہیں ملکی سیاست پر بھروسا ہو اور وہ یقین رکھتے ہوں کہ حکومت کا مدعا ان سے انصاف برتنا اور ان کے حالات کی اصلاح کرنا ہے۔ لیکن اگر وہ سیاست سے مطمئن نہ ہوں، اسے ناگوار سمجھیں تو یہ قربانی بادل نخواستہ کرتے ہیں اور ان میں حکومت کی فتح یابی کے لیے کوئی ولولہ نہیں ہوتا جو فوج کی جرأت و ہمت میں اضافہ کرتا ہے اور یہی وہ ذہنی حالت ہے جو فوج کی فتح و شکست میں تمام امدادوں اور سامانوں سے زیادہ قوی الاثر ہوتی ہے۔

ہرقل کے تخت نشیں ہونے اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے سے پہلے اسی نفسیاتی کیفیت نے قوت بخشی اور اسی کی وجہ سے وہ ایرانیوں پر فتح یاب ہوا۔ رومی سلطنت کے وجود میں فساد و تنزل کے عوامل و محرکات رینگ رہے تھے، اسی لیے ایرانی اسے شکست دے کر اس کے علاقے پر قابض ہو گئے تھے، لیکن جب ہرقل نے فوکاس کی ظالمانہ حکومت کے خلاف بغاوت کی اور اس سے تخت و تاج چھین لیے تو لوگوں کو یقین ہو گیا کہ ایک نئے دور کی صبح نمودار ہونے والی ہے اور سلطنت بہت جلد اپنا کھویا ہوا وقار و اقتدار دوبارہ حاصل کر لے گی۔ چنانچہ انہوں نے ہرقل سے مخلصانہ تعاون کیا، ہر ممکن قربانی اس کے لیے پیش کی اور اپنی راحت و آسائش بلکہ زندگیاں تک اس کی فتح و نصرت کی راہ میں تج دینے پر آمادہ ہو گئے اور جان سے بڑی کون سی قربانی ہے، جو انسان پیش کر سکتا ہے؟ اسی لیے ہرقل نے وہ سب کچھ واپس لے لیا جو اس کے اسلاف کھو چکے

Marfat.com

تھے اور عوام انتظار کرنے لگے کہ اس نئے دور میں ان کی امیدیں بر آئیں گی۔

لیکن جب مصر و شام میں ہرقل کے قدم اچھی طرح جم گئے تو اس نے ایسی سیاست اختیار کی جس سے وہاں کے عوام ناراض ہو گئے۔ اس کے خزانے خالی ہو چکے تھے اور ان خزانوں کو بھرنا ضروری تھا، اس لیے اس نے ان دونوں ملکوں کے عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ لاد دیا، جس سے ان کے دلوں میں نفرت بیٹھ گئی، لیکن صرف ٹیکسوں کی بھرمار ہی وہ تنہا سبب نہ تھی کہ اس عظیم الشان شہنشاہ کی طرف سے ان کے دل پھر جاتے بلکہ انہیں اپنی اس مادی قربانی کا صلہ اس حکومت کی صورت میں بھی نہ ملا، جو ان کے لیے امن و آزادی کی ضامن ہوتی لوگوں کو عقیدے کی آزادی سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں ہوتی۔ اگر آپ انہیں ان عقائد سے پھیرنے کی کوشش کریں گے، جنہیں ان کے آباؤ اجداد نے حکمت اور دل نشیں نصیحت کے زیر اثر قبول کیا تھا تو وہ اسے برداشت نہ کر سکیں گے۔ وہ آپ کی بات صرف اسی وقت سنیں گے جب یہ حقیقت ان پر واضح ہو جائے گی کہ آپ ان کے لیے خلوص رکھتے ہیں، آپ کا دل ان کی ہدایت کے لیے بے چین ہے اور یہ اطمینان ہو جانے کے بعد بھی وہ ابتداءً ڈرتے ڈرتے آپ کے قریب ہوں گے، لیکن جب آپ کی دعوت پر ایمان لے آئیں گے تو پھر اس کی راہ میں اپنی جانیں تک قربان کر دیں گے۔ جب ان داعیوں کے ساتھ، جو انہیں اچھے انداز میں حق کی طرف بلاتے ہیں ان کا یہ طرز عمل ہوتا ہے تو پھر اس حاکم کے خلاف تو انہیں آپ سے آپ بغاوت کر دینی چاہیے جو زبردستی ان کو اپنے عقائد سے پھیر کر کوئی دوسرا عقیدہ ان پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ کھلم کھلا اس کے خلاف بغاوت نہ کر سکیں گے تو مکر و فریب کے دامن میں پناہ لیں گے اور اس کا برا چاہیں گے۔ ہرقل کا مصر و شام اور سلطنت کے دوسرے حصوں میں یہی حال تھا۔ اس لیے عوام اس سے برگشتہ اور ان کے دل اس سے بیزار ہو گئے اور وہ شہریوں کی طاقت اور معنوی قوت سے کام لے کر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں اپنی فوجوں کا بوجھ ہلکا نہ کر سکا۔

اس نے جب ایرانیوں پر فتح پائی اور صلیب اعظم لے کر بیت المقدس پہنچا تو یہودیوں کے مطالبے کے مطابق انہیں جان و مال کی امان دی اور ان کے عبادت کدوں کی حفاظت کا ذمہ لیا لیکن جشن اعلائے صلیب کے بعد عیسائیوں اور ان کے پادریوں نے یہودیوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور ان پر یہ الزام لگایا کہ وہ عیسائیوں پر ظلم توڑنے، ان کے کلیساؤں کو ڈھانے اور آگ لگانے میں ایرانیوں سے کہیں آگے تھے۔ اول اول تو ہرقل نے یہودیوں سے نقض عہد

تامل کیا لیکن جب اس کے حاشیہ نشینوں کا اصرار بڑھا اور انہوں نے اس عہد کے خلاف دلائل پیش کیے تو اس کا تردد جاتا رہا اور اس نے بیت المقدس سے یہودیوں کو نکال باہر کرنے بلکہ ان کا خون تک بہا دینے کی اجازت دے دی۔ تا آنکہ رومی سلطنت اور مصر و شام میں ایک بھی یہودی زندہ نہ بچا۔ سوائے اس کے جو بھاگ گیا یا کہیں چھپ گیا۔ ①

جو یہودی دریائے اردن کے اس پار صحرا میں بھاگ گئے تھے، ان کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ ان کے دلوں میں ہرقل کے اس ذلیل برتاؤ کے خلاف نفرت و عداوت کی آگ بھڑکتی رہی اور اس وقت بھی نہ بجھی، جب ہرقل نے انہیں اپنے وطن واپس آنے کی دعوت دے دی۔ چنانچہ وہ موقع کی تاک میں رہے اور جب مسلمانوں کے علم نمودار ہوئے تو ان سے مل گئے اور ان کے راہنما بن کر ملک کے بھید اور حکومت کے اسرار انہیں بتا دیئے۔ صرف یہودیوں ہی کے دل میں ہرقل کی طرف سے نفرت و غضب کی آگ بھری ہوئی نہ تھی، بلکہ خود عیسائیوں کو بھی اس سے تلخ و تند شکایتیں تھیں۔ ہوا یہ کہ جب ہرقل کے پاؤں اچھی طرح جم گئے تو اس نے تمام سلطنت میں عیسائی فرقوں کو اپنے اس یقین کے تحت ایک کر دینا چاہا کہ مذہبی فرقہ بندیوں ہی نے ملک میں پھوٹ ڈالی ہے اور انہی کی وجہ سے سلطنت کا دبدبہ و جلال خطرے میں پڑا ہے۔ اس کی یہ سب سے بڑی تمنا تھی کہ خداوندان کلیسا اپنی دانائی سے ان مختلف فرقوں کو ایک مذہب میں سمو دیں اور وہ مذہب کسی جبر و اکراہ کے بغیر، اتفاق و رضامندی کے ساتھ سلطنت کی حدود میں نافذ کر دیا جائے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو حکومت اپنے حریفوں کے مقابلے میں قوت حاصل کر لیتی اور تاریخ میں ہرقل کو شرف دوام کی مسند مل جاتی، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

مذہبی فرقے علیٰ حالہ قائم رہے اور شہنشاہ مجبور ہو گیا کہ لوگوں کو سرکاری مذہب کی اطاعت پر زبردستی آمادہ کرے۔ چنانچہ جس نے انکار کیا اسے نشانہ ستم بنایا گیا۔ عوام سرکاری مذہب قبول کرنے سے بچتے تھے اور انہیں سزائیں دی جاتی تھیں۔ انہوں نے سرکاری افسروں کی شکایت ہرقل سے کی، لیکن وہ کانوں میں تیل ڈالے بیٹھا رہا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا کا اعتماد اس پر سے اٹھ گیا اور دلوں میں اس کے خلاف نفرت نے اپنا گھر بنا لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہبی اتحاد کی اس کوشش میں ہرقل کی نیت نیک تھی، لیکن اس نے ایک حقیقت کو فراموش کر دیا، جسے پیش نظر رکھتا تو ہرگز جابرانہ روش اختیار نہ کرتا اور عوام کبھی اس کے خلاف نہ ہوتے۔ عوامی معاملات میں

① المقریزی، بحوالہ مصر میں عربی فتوحات، تالیف بٹلر۔ مترجم: فرید ابو حدید۔ صفحہ 199

Marfat.com

قوانین کا اتحاد مستحسن ہی نہیں، ضروری ہے اور ان معاملات سے متعلق قانون کی اصلاح میں خواہ کتنا ہی اختلاف رائے کیوں نہ ہو۔ اگر کبھی یہ خطرہ پیدا ہو جائے کہ اس کا اثر غلط پڑ رہا ہے تو اسے بدلا جا سکتا ہے، لیکن عقیدے کے معاملے میں ضمیر کی آزادی کو قانون محدود کر سکتا ہے نہ منظم، اس لیے کہ جس طرح خواہش ہماری مادی زندگی کی اصل ہے، اسی طرح یہ آزادی ہماری انسانی زندگی کی بنیاد ہے۔ چنانچہ لوگ اسے کسی عنوان برداشت نہیں کرتے جو کوئی اسے فنا کرنا چاہتا ہے، اس کے خلاف اپنی تمام قوتوں کے ساتھ بغاوت کر دیتے ہیں۔ زعمائے کلیسا اور ائمہ مذاہب اس بارہ خاص میں اپنی اور عوام کی آزادی کے سب سے زیادہ خواہش مند ہوتے ہیں اور اس کی حد بندیوں سے کسی طرح اتفاق نہیں کرتے۔ کیونکہ اگر اسے محدود و مقید کر دیا جائے تو ان کا روحانی اقتدار کمزور پڑ جاتا ہے اور دلوں میں ان کی عظمت و منزلت ڈگمگا جاتی ہے۔ چنانچہ یہی کچھ اس وقت بھی ہوا، جب ہرقل نے انطاکیہ، بیت المقدس اور اسکندریہ کے لیے ایک پادری منتخب کیا اور عوام پر فرض قرار دیا کہ وہ انجمن خلقدونیہ کے مقرر کردہ مذہب کو قبول کریں۔ ان پادریوں میں سے ایک بھی اپنے مذہب اور آزادی رائے سے، دست بردار نہ ہوا۔ پھر ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی افتاد مزاج کی بنا پر، الگ الگ راہیں اختیار کیں۔ اسکندریہ کے پادری نے مصریوں کو تبدیلی مذہب کے لیے بزور مجبور کیا۔ بیت المقدس کے پادریوں نے حیلہ گری سے کام لیا اور انطاکیہ کے پادری نے انتہائی کشادہ دلی کا ثبوت دیا۔

اگر ہرقل اس مذہب کی حلقہ بگوشی کو فرض قرار نہ دیتا تو عوام اس سے برگشتہ اور دل اس سے بیزار نہ ہوتے۔ اس برگشتگی اور اس بیزاری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب عربوں نے شام پر حملہ کیا تو اہل شام کے دلوں میں اپنے ملک کی مدافعت کا سرے سے کوئی جذبہ ہی پیدا نہ ہوا، بلکہ ان میں سے اکثر تو دل ہی دل میں اللہ سے قیصر کی حکومت کے زوال کی دعائیں مانگنے لگے۔ ابوالفرج عبری لکھتا ہے: ''لوگوں نے جب ہرقل سے شکایت کی تو اس نے کوئی جواب نہ دیا، اس لیے خدائے منتقم نے عرب کے ہاتھوں ہمیں روم کے پنجہ استبداد سے نجات دلائی اور اس کی یہ نعمت ہمارے حق میں بہت بڑی نعمت ثابت ہوئی کہ اس نے ہم کو رومیوں کی دراز دستیوں سے بچا لیا اور ہم نے ان کی شدید کراہت، ناقابل برداشت عداوت سے چھٹکارا پالیا۔''

ٹیکسوں کی بھرمار، یہودیوں کی نفرت اور مذہبی تشدد، یہ تین اسباب و عوامل تھے جن کی بنا پر اہل شام رومیوں کو لڑتے دیکھتے اور ان کی مدد کا کوئی جوش، ان کی اعانت کا کوئی جذبہ ان کے دل

میں پیدا نہ ہوا۔ ان تین اسباب کے ساتھ جو ہرقل کی شکست اور شام سے اس کے فرار کا باعث بنے تھے، ایک چوتھا سبب یہ اور شامل ہو گیا کہ صحرائے شام کی سرحدوں پر جو عرب آباد تھے ان میں یہ جذبہ نہ تھا کہ وہ سر سے کفن باندھ کر اپنے قومی بھائیوں...... جزیرہ نمائے عرب کے باشندوں...... کے خلاف لڑ سکتے۔ شاید یہ ایک جبلہ ایہم ہی تھا جو ان عربوں میں سب سے زیادہ ہرقل کی نصرت وحمایت کا جوش اپنے اندر پاتا تھا۔ اس لیے کہ اپنی حکومت کے سلسلے میں وہ ان رومیوں کا احسان مند تھا جنہوں نے اسے ہر طرح نوازا اور جب یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کے حملے سے اس کا اقتدار خطرے میں پڑ گیا ہے تو اس کی نصرت واعانت کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اس کے باوجود تاریخ کی کتابوں میں جبلہ کی حمایت کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

صرف وہی ایک ناقابل اعتبار واقعہ ہے جس کی طرف ہم نے فتح قنسرین کے ذیل میں اشارہ کیا ہے اور جسے ثقہ مؤرخین نے اپنی کتابوں میں جگہ نہیں دی۔ جو فضا ہرقل اور اس کی فوجوں کو محیط تھی وہ آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ پھر تعجب کی کیا بات ہے۔ اگر مصیبتیں ہرقل پر ٹوٹ پڑیں، اس کا ستارہ اقبال غروب ہو جائے اور وہ مایوسیوں اور نامرادیوں کا بوجھ اپنے اوپر لاد کر ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ بزنطیہ کی طرف بھاگ جائے۔ یہی اسباب تھے جن کی بنا پر وہ فوج کی قیادت دوسروں کے سپرد کر دیا کرتا تھا۔ عہد صدیقی میں اسلامی فوجوں نے عراق میں جو کارنامے سرانجام دیے تھے، وہ اس کے کانوں تک پہنچ چکے تھے، چنانچہ اس نے بہتر یہی سمجھا کہ تذارق کو ایک بھاری لشکر دے کر یرموک روانہ کر دے۔ جب اس لشکر کو شکست ہوئی اور تذارق اس جنگ میں مارا گیا تو اس نے اس خوف سے خود جنگ میں حصہ لینا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں اسے شکست نہ اٹھانی پڑے اور اس کا مجد وشرف کہیں میدان کارزار ہی میں دفن نہ ہو جائے۔ بہت ممکن ہے کہ اب اس نے نبی عربی علیہ التحیۃ والتسلیم کے مکتوب گرامی کو یاد کیا ہو جو دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس کے رستے میں اسے پہنچایا تھا۔ جب وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر پر صلیب اعظم واپس لے کر جا رہا تھا اسے خیال آیا ہو کہ اس مکتوب مقدس کی اس نے کس طرح توہین کی تھی اور اس کے ساتھ کتنی بے پروائی سے پیش آیا تھا۔ اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے والے وہی عرب ہیں جو فاتح حملہ آوروں کی صورت میں اس ملک پر یلغار کر رہے ہیں۔ وہ زندگی کے مقابلے میں موت سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اس لیے اللہ انہیں

Marfat.com

زندگی کی نعمتوں سے مالا مال کر رہا ہے۔ بھلا ان غازیان اسلام کے سامنے اس کی وہ فوجیں کیسے ٹھہر سکتی ہیں جو طاقت کا ایک تھپڑ برداشت نہیں کر سکتیں، جنہیں فرار میں بھی کوئی ذلت محسوس نہیں ہوتی۔ بھلا ہرقل! جب اس کی اور اس کے لشکر کی یہ حالت ہو، فتح یاب کیسے ہو سکتا ہے؟ بلکہ وہ عظمت و سیادت کی بلندیوں سے ذلت و بدبختی کی پستیوں میں گرنے سے کس طرح بچ سکتا ہے؟ وہ یہ بھول گیا تھا کہ اس کائنات ہستی میں خدائے بزرگ و برتر کے چند قوانین ہیں جن میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی اور جن سے لاعلمی انسان کو ضلالت و گمراہی کی تاریکیوں میں دھکیل دیتی ہے۔ یہی بھول ہرقل کی تباہی کا باعث ہوئی اور اسی نے اس کو تاریخ میں عبرت اندوزں کے لیے سامان عبرت بنا دیا۔

جبلہ بن ایہم نے ہرقل کا انجام دیکھا اور یہ بھی کہ شام کے اکثر عربی قبائل دوڑ دوڑ کے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب اس کے ملک اور اس کے وقار کی بقا اسی میں ہے کہ وہ اور اس کے عزیز و اقارب اسلام قبول کر لیں۔ چنانچہ اس نے اپنے اور بنو غسان کے قبول اسلام کی اطلاع حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو دی، جس سے امین الامت رضی اللہ عنہ کو بے انتہا خوشی ہوئی اور انہوں نے یہ خبر بارگاہ خلافت میں بھیج دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر مسرور ہوئے۔ اس کے بعد جبلہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مدینہ حاضر ہونے کی درخواست کی اور اجازت ملنے پر اپنے پانچ سو رشتہ داروں کو ساتھ لے کر مدینے روانہ ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے استقبال کا حکم دیا اور مدینے کا ہر چھوٹا بڑا شہر سے باہر نکل کر اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ جبلہ نے اپنے دو سو ہمراہیوں کو ہتھیار سجانے اور ریشمی لباس پہننے کا حکم دیا۔ یہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہوئے جن کی دموں میں گرہیں لگی تھیں اور گلوں میں سونے چاندی کے قلاذے پڑے تھے۔ جبلہ نے اپنا تاج پہنا جس میں اس کی دادی ماریہ کے کانوں کی بالیاں لگی تھیں، اہل مدینہ اس کی یہ آن بان دیکھ کر حیرت میں رہ گئے۔ جبلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے اسے خوش آمدید کہا اور از راہ لطف و مہربانی اپنے پہلو میں جگہ دی۔

جبلہ کچھ دن مدینہ میں رہا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کو گیا۔ وہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ اس کا تہبند بنو فزارہ کے ایک شخص کے پاؤں تلے آکر اتر گیا۔ جبلہ نے اس کی ناک پر مکا مار دیا۔ وہ شکایت لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جبلہ کو بلا کر دریافت کیا اور جب اس نے اس واقعے کی تصدیق کر دی تو فرمایا: ''چونکہ تم نے اقرار کر لیا

Marfat.com

ہے اس لیے یا تو اس شخص کو مناؤ! ورنہ تمہیں اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔" جبلہ نے یہ سن کر ناگواری کے لہجے میں کہا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ ایک معمولی آدمی ہے اور میں بادشاہ ہوں۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اسلام نے تمہیں اور اسے ایک جگہ جمع کر دیا ہے سوائے پرہیزگاری اور سلامتی کے تم کسی چیز میں اس پر فضیلت نہیں پا سکتے!" جبلہ نے کہا: "امیر المومنین! میں تو یہ سمجھتا تھا کہ مجھے اسلام میں جاہلیت سے زیادہ عزت دی جائے گی!" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "یہ خیال اپنے دل سے نکال دو! اگر تم اس کو نہیں مناؤ گے تو میں تمہیں سزا دوں گا۔" جبلہ بولا: "پھر میں نصرانیت اختیار کر لیتا ہوں!" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اگر تم نے نصرانیت اختیار کی تو میں تمہاری گردن مار دوں گا، تم اسلام قبول کر چکے ہو اور اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے!" جبلہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی بات پر قائم دیکھا تو کہا: "اچھا! آج رات میں اس مسئلے پر غور کروں گا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دروازے پر اِدھر اُدھر کے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حزم و استقلال پر حیرت کا اظہار کر رہے تھے اور بعض اسے غیر ضروری شدت قرار دے رہے تھے۔ یہ اختلاف اس حد تک بڑھا کہ فتنے کی صورت اختیار کرتے کرتے رہ گیا شام ہوئی تو مجمع منتشر ہو گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جبلہ کو اپنی قیام گاہ پر جانے کی اجازت دے دی۔ جبلہ نے اپنے ساتھیوں کو چپکے سے نکل چلنے کا مشورہ دیا۔ وہ رات ہی رات میں شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ صبح ہوئی تو مکہ ان سے خالی تھا۔ جبلہ نے سیدھا قسطنطنیہ کا رخ کیا اور اپنے ساتھیوں سمیت عیسائی ہو کر ہرقل کے پاس جا پہنچا۔ ہرقل بہت خوش ہوا اور اسے اپنے حق میں ایک بہت بڑی فتح تصور کی،، جبلہ کی خواہش کے مطابق اسے جاگیر بخشی اور جیسا اس نے چاہا ویسا اس نے سلوک کیا۔ ①

جبلہ، ہرقل کے جوار میں بڑے عیش و آرام سے رہا۔ لیکن اس کے باوصف اپنی ان قیام گاہوں کی یاد اس کے دل میں پھانس بن کر کھٹکتی رہی جو دمشق کے آس پاس واقع تھی۔ ابو الفرج کتاب الاغانی میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو خط دے کر ہرقل کے پاس بھیجا جب وہ ہرقل کے ہاں سے واپس ہوا تو جبلہ کے پاس بھی گیا اور دیکھا کہ وہ ہرقل سے بھی زیادہ شان و شوکت کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے۔ کنیزیں اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور

① الاغانی: جلد، 14۔ ص 44، مطبوعہ ساسی، اکثر مؤرخین جبلہ کے اس قصے کو صحیح نہیں سمجھتے اور اسے محض ایک ادبی کہانی قرار دیتے ہیں۔

Marfat.com

حسان بن ثابت کے وہ اشعار گا رہی ہیں جو انہوں نے جبلہ کی مدح میں کہے تھے، جبلہ نے قاصد سے حسان رضی اللہ عنہ کا حال پوچھا۔ قاصد نے بتایا: ''ان کی آنکھیں جاتی رہی ہیں اور وہ بہت ضعیف العمر ہو گئے ہیں!'' جبلہ نے کنیز کو پانچ سو دینار اور پانچ ریشمی پوشاکیں لانے کا حکم دیا اور قاصد سے کہا کہ حسان رضی اللہ عنہ کو پہنچا دینا۔ اس کے بعد قاصد کو بھی اتنا ہی انعام دینا چاہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ جبلہ رو پڑا اور کنیزوں سے کہا: ''مجھے اور رلاؤ!'' کنیزوں نے اپنے اپنے عود اٹھائے اور جبلہ کے ان اشعار کو نغمے میں ڈھالنے لگیں:

تنصّرت الاشرافُ من عار لَطمةٍ
ومَا كان فيها لو صبرتُ لها ضرر
تكنّفنی فيها لَجاجٌ و نخوةٌ
وبعت بها العينَ الصحيحة بالعَوَر
فيا ليت اُمّی لم تَلِد نی وليتنی
رجعتُ الی القول الذی قاله عمر!
ويا ليتنی ارعی المَخاض بدِمنَةٍ
وكنت اسيرا فی ربيعة او مضرا
ويَا ليتنی بالشام ادنی معيشة
اُجالس قومی ذاهبَ السمع والبصرا!

ترجمہ: میں نے ایک طمانچہ کھا کر قبیلے کے سرداروں سے مدد چاہی۔ اگر میں اس پر چپ ہو جاتا، تو کوئی بری بات نہ ہوتی لیکن مجھے غصے اور غرور نے گھیر لیا اور میں نے صحیح آنکھ، کانی آنکھ کے بدلے بیچ ڈالی کاش! میری ماں نے مجھے جنم ہی نہ دیا ہوتا اور کاش! میں وہی بات مان لیتا، جو عمر رضی اللہ عنہ نے کہی تھی کاش! میں ترائی میں ہی اپنا گلہ چرایا کرتا یا ربیع یا مضر کے ہاں قید کاٹ رہا ہوتا اور کاش! شام میں ادنیٰ اوقات بسر کرتا اور اپنے ہم قوموں میں بہرا اور اندھا ہو رہتا۔''

قاصد مدینہ واپس ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جبلہ کا حال سنا کر اس انعام کا ذکر کیا جو اس نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر نے دینار اور کپڑے لے لیے تو اشعار پڑھتے ہوئے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی بارگاہ سے چلے گئے:

Marfat.com

إن ابن جفنة من بقية معشر
لم يغذهم اباؤهم باللوم
لم ينسني بالشام اذهو ربها
كلا ولا متنفرا بالروم
يعطي الجزيل ولا يراه عنده
الا كبعض عطية المذموم

ترجمہ: ابن جفنہ ہی اب قبیلے میں باقی رہ گیا ہے۔ ان کے بزرگوں نے انہیں کمینہ پن نہیں سکھایا وہ مجھے اس وقت بھی نہیں بھولا جب اسے شام میں اتنا اقتدار حاصل تھا کہ اس نے کبھی رومیوں سے بھی مدد نہیں چاہی وہ بہت کچھ عطا کرتا ہے لیکن یہ سمجھتا ہے جیسے اس نے کوئی معمولی سی چیز دی ہو۔''

بعض روایات میں ہے کہ جبلہ اپنی ان قیام گاہوں کے لیے بے انتہا بے چین تھا جو اطراف دمشق میں تھیں اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی کسی صاحبزادی کا نکاح اس سے کر دیں تو وہ دوبارہ اسلام قبول کر سکتا ہے، لیکن اس سے پہلے کہ اس کی خواہش کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انکار اس تک پہنچے، وہ مر گیا۔ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ جبلہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے زمانے تک زندہ رہا۔ کہتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر وہ دوبارہ اسلام قبول کر لے تو سارا غوطہ دمشق اسے جاگیر میں دے دیا جائے گا، لیکن اس نے انکار کر دیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جبلہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس یہ عرضداشت بھیجی کہ ''اگر وہ اس کی قیام گاہیں اور غوطہ دمشق کے بیس گاؤں اسے عطا فرما دیں تو وہ دوبارہ مسلمان ہونے کو تیار ہے۔''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کی درخواست قبول کر لی، لیکن جب ان کا خط پہنچا تو وہ مر چکا تھا۔ ان دونوں آخری روایتوں میں اس طرح مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے کہ جبلہ نے پہلے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی پیش کش نامنظور کر دی، لیکن بعد کو اسے اپنی اس حرکت پر ندامت ہوئی اور جس چیز سے انکار کیا تھا اسے قبول کر لیا۔ مگر اس سے پہلے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی منظوری کا جواب اسے ملے، وہ دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

قسطنطنیہ میں جبلہ کے ساتھ اس کے عزیز و اقارب بھی مقیم تھے جنہیں شاہان روم نے اپنے

تقرب واعزاز سے نوازا اور وہ رومی سلطنت کے زوال تک درباریوں میں شامل رہے۔ اس کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ ہرقل کے محل میں کچھ لوگ ایسے تھے جنہیں جبلہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اور جبلہ ایک عربی نام ہے جس سے یونانی اور رومی جبلہ بن ایہم کے پایہ تخت میں آنے سے پہلے ناآشنا تھے۔

جبلہ، ہرقل کے پاس اپنے گھروں کی یاد میں مضطرب و بیتاب رہا اور ہرقل اپنے پایہ تخت کی یاد میں غمگین اور اداس۔ یہ تمنا رہ رہ کے اس کے دل میں چٹکیاں لیتی تھی کہ کاش! اسے پھر کبھی شام جانا نصیب ہو جہاں وہ کشادہ باغوں، برف سے چمکتے پہاڑوں اور سرسبز وادیوں میں سے ہوتا ہوا بیت المقدس حضرت مسیح علیہ السلام کے مزار تک پہنچے!

تو کیا شام کو آخری طور پر الوداع کہہ دینے کے بعد اس نے پھر اس سرزمین کی طرف لوٹنے کی کوشش کی یا اس کی ہمت نے اسے جواب دے دیا؟ یہ ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا۔ فی الحال ہم اسے اپنے محل میں اشک بار و ماتم گسار چھوڑ کر فلسطین کا رخ کرتے ہیں۔ جہاں سپہ سالارانِ اسلام کے ساتھ ہمیں مسجدِ اقصیٰ کے شہر میں داخل ہونا ہے۔

Marfat.com

باب:12

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس میں

مسلمانوں نے خلافت فاروقی رضی اللہ عنہ کے آغاز ہی میں یرموک پر فتح پائی تھی اور روم کی شکست خوردہ فوجیں وہاں سے بھاگ کر فحل میں جمع ہوگئی تھیں، اس لیے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے ابوالاعور سلمی کو ان کے مقابلے کے لیے بھیجا اور خود دمشق روانہ ہوگئے۔ ابوالاعور نے اپنے لشکر کے ساتھ ان فوجوں کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا، جنہیں ہرقل کی بھیجی ہوئی امدادی فوجوں نے کچھ سنبھال لیا تھا۔ جب دمشق فتح ہوگیا تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ وہاں سے واپس ہوئے اور فحل پہنچ کر رومیوں کا محاصرہ کرلیا تا آنکہ انہیں شکست دی، اس کے بعد طبریہ اور بیسان پر چڑھائی کی اور فلسطین کے دروازوں پر جا کھڑے ہوئے۔ اس وقت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق حمص چلے گئے اور فلسطین پر حملہ کرنے والی اسلامی فوجوں کی قیادت حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور حضرت شرحبیل رضی اللہ عنہ کے سپرد کر گئے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حمص فتح کرلیا۔ وہاں سے مسلمان حماۃ، پھر حلب، پھر انطاکیہ، پھر شام کے شمالی اور قلقیہ کے جنوب میں پہنچے۔ فتح ان کے رکاب میں چل رہی تھی۔ اس لیے ہرقل کو اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آیا کہ شام کو آخری سلام کہہ کر قسطنطنیہ بھاگ جائے۔

جس وقت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ شمالی روم میں فاتحانہ پیش قدمی فرما رہے تھے، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ روم کی ان فوجوں سے جنگ آزما تھے جو فلسطین میں جمع تھیں اور انہیں شکست دینے کی کوشش کررہے تھے، لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ فوجیں کثرت تعداد اور سامان کے اعتبار سے بہت قوی تھیں اور ان کی قیادت روم کا سب سے بڑا سپہ

سالار طربون[1] کر رہا تھا، جس کی بعید النظری اور جنگی سوجھ بوجھ ساری مملکت میں اپنا کوئی حریف نہ رکھتی تھی۔ اس نے سوچا کہ فوج کو مختلف مقامات پر پھیلا دیا جائے تاکہ زمام اقتدار بھی تنہا اس کے ہاتھ میں رہے اور اگر اس فوج کے کچھ حصوں پر عرب فتح بھی پائیں تو دوسرے حصے اس سے متاثر نہ ہوں۔ چنانچہ اس نے رملہ اور اسی طرح ایلیا[2] پر ایک بھاری لشکر متعین کیا اور ان کی حمایت کے لیے غزہ سبسطیہ، نابلس، لد اور یافا میں فوجیں چھوڑ دیں۔ اس کے بعد عربوں کی آمد کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ عربوں پر فتح پانے اور ان کی قوتوں کو پراگندہ کرنے کی طاقت و قوت رکھتا ہے۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے موقع کی نزاکت کو محسوس فرمالیا۔ انہوں نے سوچا کہ اگر وہ اپنی تمام فوجوں کے ساتھ اطربون کے مقابلے میں صف آرا ہوتے ہیں تو رومی فوجیں ایک دوسرے سے مل جائیں گی اور وہ ان پر فتح یاب نہ ہوسکیں گے بلکہ ہوسکتا ہے کہ رومی ان پر فتح پالیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا اور خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ نے یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اپنے بھائی معاویہ رضی اللہ عنہ کو قیساریہ فتح کرنے بھیجو تاکہ بحری راستے سے اطربون کو مدد نہ پہنچ سکے۔ قیساریہ ایک بہت مضبوط اور خطرناک سرحدی قلعہ تھا، جس کی حفاظت پر ایک بہت بڑا رومی لشکر متعین تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے قیساریہ پہنچ کر اس کا محاصرہ کرلیا۔ رومی کبھی کبھی اسلامی فوج پر حملہ کرتے، لیکن شکست کھا کر پھر اپنے مورچوں میں واپس ہوجاتے۔ آخرکار جب محاصرہ طویل ہوگیا تو ایک دن مرنے مارنے کے ارادے سے نکلے لیکن شکست کھائی اور ایسی عبرتناک شکست کھائی کہ میدان جنگ میں ان کے اسی ہزار سپاہی کھیت رہے اور یہ تعداد ہزیمت فرار کے بعد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ قیساریہ کی فتح اور اس کے لشکر کی تباہی کے بعد مسلمان اس

---

① طبری اور ان کے متبعین کی کتابوں میں اس کا نام ارطبون آیا ہے۔ بعض مؤرخین اس پر لام تعریف کا اضافہ کر کے الارطبون لکھتے ہیں۔ الفریڈ بٹلر نے اپنی کتاب "مصر میں عربوں کی فتوحات" میں اس کی تصحیح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اریطیون ہے، لیکن بعض کتب و اسفار میں یہ نام اطربون ہی ہے جیسا کہ ہم نے متن میں لکھا ہے۔ بعض محققین کی رائے ہے کہ اطربون کا لفظ ارطبون اور اریطیون سے زیادہ صحیح ہے اور یہ اس سپہ سالار کا نام نہیں ہے جو بیت المقدس کی رومی فوجوں کا کماندار تھا بلکہ روم کے اس سپہ سالار اعظم کا لقب ہے جو عزت و اقتدار کے لحاظ سے ہرقل کا ہم مرتبہ تھا۔ یہ لاطینی لفظ (Iribunus) کا معرب ہے، ہم اس تحقیق کو درست سمجھتے ہیں اس لیے ہم نے متن میں اطربون ہی لکھا ہے۔

② بیت المقدس کا نام ہے اور رملہ آٹھویں صدی عیسوی میں "راما" نامی ایک بستی کے قریب آباد کیا گیا تھا۔ لیکن بعد کو برباد ہوگیا۔ مؤرخین عرب آج بھی جو اس مقام کو رملہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ پڑھنے والے التباس میں مبتلا نہ ہوجائے۔

Marfat.com

طرح سے مطمئن و محفوظ ہو گئے اور اس رستے رومیوں کی کمک کا سلسلہ رک گیا۔ [1]

جس طرح عربوں نے قیساریہ پر قبضہ کیا تھا اسی طرح غزہ بھی فتح کر لیا۔ عہد صدیقی رضی اللہ عنہ میں بھی مسلمان ایک دفعہ غزہ پر قبضہ کر چکے تھے، لیکن بعد کو انہیں وہاں سے نکال دیا گیا تھا۔ جب یہ دونوں سرحدی مقام مسلمانوں کے زیر اقتدار آ گئے تو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو سمندر کی طرف سے اطمینان ہو گیا اور اطربون کو صرف انہیں فوجوں پر اعتماد کرنا پڑا جو اس کے پاس تھیں۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ جب دیکھا کہ اطربون اپنی فوج لے کر اجنادین کی طرف بڑھ رہا ہے تو علقمہ بن حکیم اور مسروق عکی کو ایلیا کی طرف بھیجا اور انہوں نے ایلیا کی فوجوں کو الجھا لیا۔ ساتھ ہی ابوایوب مالکی کو رملہ کی طرف روانہ کیا اور اس کے حامیوں کو چار و ناچار اس کی حفاظت کرنی پڑی۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک مکتوب ارسال کیا جس میں ان تمام واقعات کی تفصیل کے بعد اطربون کی سوجھ بوجھ اور حیلہ کاریوں کا ذکر کیا۔ اپنے اس خط میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے رومی فوجوں کی کثرت و طاقت کا بیان ایسے پیرائے میں کیا تھا کہ خلیفۃ المسلمین نے ان کی مدد کے لیے ایک عظیم لشکر بھیجنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد خط پر دوبارہ نظر ڈالی۔ اطربون کی ہوشیاری و چالاکی اور حیلہ و مکر کا بیان پڑھ کر مسکرائے اور حاضرین سے فرمایا: ''ہم نے روم کے اطربون کو عرب کے اطربون سے بھڑا دیا ہے، دیکھیے، اب کیا ظہور میں آتا ہے۔''

کمک فلسطین پہنچ گئی۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اس میں سے کچھ فوج تو ان مسلمانوں کی مدد کے لیے بھیج دی جو ایلیا اور رملہ میں دشمن کے لشکر کو الجھائے ہوئے تھے اور خود ایک بڑا لشکر لے کر اطربون سے نمٹنے اجنادین روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر دیکھا تو رومی قلعہ بند ہوئے بیٹھے تھے اور چاروں طرف خندق کھود کر اچھی طرح اپنی حفاظت کر رکھی تھی۔ ان تک کیسے پہنچا جائے؟ کون ہے جو رہنمائی کرے؟ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو حیلے کے سوا کوئی وسیلہ نظر نہ آیا۔ انہوں نے صلح کی بات چیت کرنے کے بہانے اپنے ایلچی بھیجے اور انہیں چپکے سے سمجھا دیا کہ دشمن کے

---

[1] طبری، ابن اثیر اور ابن کثیر کی روایتیں یہی کہتی ہیں لیکن ابن خلدون نے اپنی تاریخ میں صرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے محاصرہ قیساریہ کا ذکر کیا ہے، یہ نہیں لکھا کہ انہوں نے اس کو فتح بھی کر لیا تھا۔ مشہور مستشرق میور کا بیان ہے کہ مسلمانوں نے قیساریہ کے علاوہ سارے فلسطین پر قبضہ کر لیا تھا۔ بعض روایات یہ بتاتی ہیں کہ قیساریہ کا محاصرہ سات برس تک جاری رہا۔ اس دوران میں غالباً وہ کئی بار مسلمانوں نے فتح کیا، لیکن رومیوں نے ہر بار سمندر کی طرف سے واپس لے لیا۔ بہرحال اتنی بات یقینی ہے کہ قیساریہ کے محاصرے نے اطربون کو اس رستے سے آنے والی ہر مدد سے محروم کر دیا تھا۔

Marfat.com

راز معلوم کر کے مجھے بتانا، لیکن ایلچی ان کی تشفی نہ کر سکے اور انہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ یہ کام خود ہی انجام دیں۔ اس طرح کہ دشمن پر یہ راز ظاہر نہ ہو۔ اس لیے کہ اطربون کو کہیں یہ پتا چل گیا کہ جو شخص اس سے گفتگو کر رہا ہے وہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ہے تو انہیں گرفتار کر لے گا اور پھر کبھی نہ چھوڑے گا اور یہ بھی اس وقت ہے جب اس نے انہیں قتل نہ کرایا، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھیس بدل کر اطربون سے ملنے روانہ ہو گئے اور اپنے مطلب کی باتوں کو اچھی طرح دیکھ بھال کے ایلچی کے روپ میں اطربون کے پاس پہنچے۔ دونوں میں گفتگو ہوئی۔ اطربون کو شک گزرا اور اس نے...... دل میں کہا: ''بخدا! یہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ہے یا پھر وہ شخص ہے جس کے مشورے پر عمر رضی اللہ عنہ چلتا ہے۔ اگر میں نے اسے قتل نہ کیا تو اپنی قوم پر بڑا ظلم کروں گا۔'' دل میں یہ فیصلہ کر کے اس نے اپنے محافظ دستے کے ایک سپاہی کو بلایا اور اس کے کان میں کہا کہ رستے میں کھڑے ہو جاؤ اور جیسے ہی یہ عرب تمہارے پاس سے گزرے اس کی گردن اڑا دینا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ تاڑ گئے کہ ان کے ساتھ دھوکا کیا جانے والا ہے اور اطربون سے کہا: ''آپ نے میری سن لی اور میں نے آپ کی۔ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے میرے دل نے اسے قبول کر لیا ہے۔ میں ان دس آدمیوں میں سے ایک ہوں جنہیں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مسلمان سالار لشکر کا مشیر بنا کر اس کے ساتھ بھیجا ہے۔ میں جاتا ہوں اور ان سب کو اپنے ہمراہ لے کر ابھی واپس آتا ہوں۔ اگر آپ کی بات میری طرح انہوں نے بھی قبول کر لی تو اہل لشکر اور امیر المومنین رضی اللہ عنہ دونوں اسے قبول کر لیں گے اور اگر ان کی رائے اس کے خلاف ہوئی تو آپ انہیں ان کے لشکر میں واپس بھیج دیں اور اس کے بعد جو مناسب قدم اٹھائیں۔''

اطربون نے یہ بات سنی تو اسے اپنے گمان پر شک گزرا۔ جس سپاہی کو اس نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے قتل پر مامور کیا تھا اسے منع کرا دیا اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ سے کہا: ''جاؤ! اور اپنے ساتھیوں کو لے آؤ! حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بہ سرعت تمام اپنے لشکر میں پہنچ گئے اور دوبارہ اس کے پاس نہ گئے۔ اطربون کو جب حقیقت کا علم ہوا تو بولا: ''وہ مجھ سے چال چل گیا۔ میں نے ایسا عیار آدمی نہیں دیکھا۔'' جب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ملی تو کہا: ''عمرو رضی اللہ عنہ نے اسے زیر کر لیا۔ بخدا! عمرو رضی اللہ عنہ نے!''

لڑائی کے تمام پہلوؤں پر سوچ بچار اور اس کی تیاری مکمل کر لینے کے بعد حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک قیامت آفرین معرکے کے سوا اور کوئی مرحلہ باقی نہ رہا تھا، دونوں لشکر

اجنادین میں مقابل ہوئے جس طرح اس سے پہلے مسلمانوں اور رومیوں کے لشکر یرموک کے لیے واقوصہ میں مقابل ہوئے تھے۔ فریقین جانتے تھے کہ اس لڑائی کو رومی سلطنت اور اسلام دونوں کی زندگی میں کتنا دخل ہے۔ چنانچہ اجنادین میں بھی یرموک کی طرح کا رن پڑا۔ طرفین کے بے شمار آدمی قتل ہوئے اور فتح کے پلڑے دیر تک اونچے نیچے ہوتے رہے، لیکن مسلمانوں میں صبر واستقامت کا جذبہ رومیوں سے زیادہ تھا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے شمالی شام میں جو فتوحات حاصل کی تھیں، ان کی خبر مسلمانوں اور رومیوں دونوں کو مل گئی تھی۔ فلسطین کے یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنے حاکموں اور جنگ آزماؤں سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ ان کی حیثیت محض تماشائیوں کی سی تھی، جن کو رومیوں سے ہمدردی تھی نہ مسلمانوں سے دشمنی۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر کو اسلامی فتوحات کی خبریں اور اپنے گردوپیش کی رومی رعایا کے اس طرزِ عمل سے بڑی تقویت پہنچی۔ ان کے جذبہ جہاد کو شہ ملی اور ان کے ثبات واستقلال میں اضافہ ہو گیا۔ جب سورج ڈوبنے لگا تو اطربون نے دیکھا کہ اس کی صفوں میں انتشار پیدا ہو رہا ہے اور سپاہیوں پر تکان کے آثار طاری ہیں۔ چنانچہ وہ بیت المقدس کی طرف پسپا ہو گیا۔ علقمہ بن حکیم اور مسروق عکی نے جو اسے پسپا ہوتے دیکھا تو اپنی فوجوں کو حکم دیا کہ رستہ چھوڑ دیں۔ اطربون اپنی بچی کھچی فوج لے کر بیت المقدس کے مورچوں کی مضبوطی اور مدافعانہ قوت پر اعتماد کرتے ہوئے شہر میں داخل ہو گیا اور اس دن کا انتظار کرنے لگا، جس میں وقت کی بے رخی کم سے کم اس کے حصے میں آئے تاکہ جس فتح سے وہ آج محروم رہا ہے اس کی امید کر سکے۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے علقمہ بن حکیم، مسروق عکی اور ابوایوب مالکی کو حکم دیا کہ وہ اپنی فوجیں لے کر اجنادین آجائیں اور جب یہ تمام فوجیں جمع ہو گئیں تو بیت المقدس میں اطربون پر حملہ کرنے کی تدبیر سوچنے لگے۔ سب کی رائے یہ ہوئی کہ حملہ کرنے سے پہلے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا جائے اور سمندر کی طرف سے اس کا خط رجعت منقطع کر دیا جائے۔ چنانچہ مسلمانوں نے رفح، غزہ، سبسطیہ، نابلس، لد، عمواس، بیت جبرین اور یافا فتح کر لیے۔ ان میں سے چھ شہروں پر تو بزور شمشیر قبضہ کیا گیا اور بعض شہروں نے بغیر لڑے جزیے پر صلح کر لی۔ اس طرح بیت المقدس اور رملہ بس یہ دو ہی قلعہ بند شہر تھے، جن کے گرد مسلمانوں کو گھیرا ڈالنا پڑا۔ آپ کا کیا خیال ہے، مسلمان اپنے عقب کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد بیت المقدس کا محاصرہ کر کے اس پر حملہ کر دیتے یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حالات لکھ کر ان کا حکم آنے تک جہاں تھے وہیں ٹھہرے رہتے۔

Marfat.com

ابھی اس کے متعلق مسلمان کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو اطربون کا ایک خط ملا جس میں اس نے لکھا تھا: ''تم میرے دوست اور میرے مثیل ہو۔ تمہیں اپنی قوم میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو مجھے اپنی قوم میں۔ بخدا! اجنادین کے بعد اب تم فلسطین کا کوئی حصہ فتح نہ کر سکو گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ واپس چلے جاؤ اور اپنے تئیں گمراہی میں مبتلا نہ کرو۔ ورنہ اپنے پیش روؤں کی طرح تمہیں بھی منہ کی کھانی پڑے گی۔'' حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو یہ خط پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ انہوں نے جواب میں لکھا: ''میں اس ملک کا فاتح ہوں۔'' اور اطربون کو صلاح دی کہ وہ اپنے مشیروں سے تبادلہ خیال کر لے۔ بہت ممکن ہے وہ اس کی تباہی سے پہلے اسے کوئی نیک مشورہ دے دیں۔ لیکن اجنادین کے معرکے میں مسلمانوں کا خاصا جانی نقصان ہوا تھا، اس لیے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مدد اور ہدایت چاہی اور اپنے خط میں لکھا: ''میں سخت دشمن کا تدارک کر رہا ہوں اور ایسے شہروں میں ہوں جو آپ کے لیے پے سپر کر دیئے گئے ہیں۔ آگے آپ کی رائے؟''①

یہ خط بارگاہ خلافت میں پہنچا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب نے ملاحظہ فرمایا۔ تمام مؤرخوں کی روایت سے، جن میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں، ثابت ہے کہ بعد کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس تشریف لے گئے اور اس کے باشندوں سے پیمان صلح باندھا، لیکن اس خط کے ملنے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیت المقدس تشریف لے جا کر معاہدہ صلح مرتب کرنے کے دوران میں جو واقعات پیش آئے ان میں شدید اختلاف ہے۔

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ بیت المقدس کے باشندوں پر اجنادین کے معرکے کا خوف طاری ہو گیا تھا اور یہ بات ان کے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ بیت المقدس کا شہر ایک نہ ایک دن عربوں کے قبضے میں جا کر رہے گا۔ چنانچہ ان سب نے جن میں اسقف صفرنیوس بھی شامل تھا، متفقہ طور

---

① ایک روایت میں ہے جسے طبری وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ اطربون نے جب حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا خط پڑھا تو اس فقرے پر کہ میں اس ملک کا فاتح ہوں۔ ہنسا۔ اس کے مصاحبین نے اس سے پوچھا کہ اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ بیت المقدس کے فاتح نہیں ہیں۔ اطربون نے انہیں جواب دیا کہ بیت المقدس کے فاتح کا نام عمر رضی اللہ عنہ ہے جس میں تین حرف ہیں اور یہ توریت میں لکھا ہے توریت میں جہاں عمر رضی اللہ عنہ کی صفت بیان کی گئی ہے وہاں غیر مشتبہ الفاظ میں یہ بھی ہے کہ بیت المقدس مسلمانوں کے قبضے میں جائے گا۔ جن مورخین نے یہ روایت نقل کی ہے ان میں سے بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ کہ جیسے ہی اطربون کو یہ معلوم ہوا وہ اپنی فوجیں لے کر مصر بھاگ گیا اور مسلمانوں سے عہدہ برآ ہونے کی مہم اسقف صفرنیوس کے سر چپک گیا۔

Marfat.com

پر صلیب اعظم اور کلیساؤں کے تمام قیمتی ظروف ساحل سمندر پر منتقل کر دیئے اور جہاز میں لاد کر دارالسلطنت قسطنطنیہ بھیج دیئے۔ جہاں بعد کو صلیبؑ، ایا صوفیہ کے کلیسا میں رکھ دیئے گئے۔ اور اس سے پہلے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور مقدس شہر کے نمائندوں میں صلح کی بات چیت شروع ہو، اطربون اپنی فوجوں کو لے کر بیت المقدس سے مصر بھاگ گیا۔ اختلاف اس میں ہے کہ اس کے سوا اور کیا واقعات پیش آئے۔ کیا اطربون کے ایلیاء چھوڑنے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے باشندگانِ ایلیاء سے مصالحت کے لیے آنے سے پہلے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے پیش قدمی کر کے اس کا محاصرہ کر لیا تھا، یا محاصرے سے پہلے ہی ان لوگوں نے صلح کی درخواست پیش کر دی تھی؟ کیا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے شام سے آ کر بیت المقدس کا محاصرہ کیا تھا؟ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے نہیں! یا حضرت عمرو بن عاص بھی ان کے ساتھ اس محاصرے میں شامل تھے؟ کیا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جزیرہ نمائے عرب سے آنے والی امدادی فوجوں کے ساتھ آ کر اس محاصرے میں شرکت فرمائی تھی اور اس کے بعد صلح کی بات چیت ہوئی تھی، یا آپ اہل بیت المقدس کے اس اصرار پر کہ ہم صلح کا پیمان امیر المومنین رضی اللہ عنہ ہی سے باندھیں گے، چند آدمیوں کے ساتھ تشریف لائے تھے؟ اور کیا محاصرہ زیادہ دن جاری رہا تھا یا تھوڑے ہی دنوں میں ختم ہو گیا تھا؟ یہ ہیں وہ مسائل جن میں روایات ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہیں کہ تطبیق دشوار ہو گئی ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ اس داستان کا پھیلاؤ کم کر کے ان واقعات کی تفصیل بیان کریں جو بیت المقدس میں صلح کی بات چیت اور اس کے بعد پیش آئے۔

ان روایات کی تلخیص اور امکانی تمحیص سے پہلے میرے لیے اس طرف اشارہ کر دینا مناسب ہے کہ ایلیا فلسطین کے جنوبی سمت کوہستانی علاقے میں واقع ہے، جس کے محل وقوع نے قدیم ہی سے اسے ایک عظیم الشان اور جنگی نقطہ نظر سے مستحکم قلعہ بنا رکھا تھا۔ قدیم اہل مصر اپنے ان دشمنوں کی مدافعت میں جو اس سمت سے مصر پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے، اس پر اعتماد کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایلیا والوں نے مصری اقتدار کے خلاف بغاوت کی اور اس کی غلامی کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا۔ لیکن اس کے بعد بھی کئی بار مصر کے حلقہ نفوذ میں آیا۔ آخر کار حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں اس نے مصری اثر سے بالکل آزادی حاصل کر لی اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہاں اپنا ہیکل تعمیر کیا۔ چھٹی صدی قبل مسیح جب ایرانیوں نے چڑھائی کی تو ایلیا اور اس کا ہیکل نذر آتش ہو گئے۔ بعد کو یہ ہیکل دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ اس کے بعد یہودیوں

نے اسے اپنا معبد اور دینی شعائر کے لیے مقدس مقام بنالیا۔ انہوں نے اس کی عمارت کو پختہ کیا۔ یہاں تک کہ اس کی حیثیت ایک مضبوط قلعے کی سی ہو گئی جس نے پہلی صدی قبل مسیح میں رومی حملے کو جھیلا۔ رومیوں سے پہلے جب ہیرودوس فلسطین کا فرمانروا ہوا تو اس نے ہیکل کو ڈھا کر اس کی بنیادوں پر پہلے سے بھی زیادہ بلند، مضبوط اور عظیم الشان عمارت بنوائی۔ اس کے بعد جب مسیحیت کے قدم فلسطین میں جمے اور اس پر ایک اچھی خاصی مدت گزر گئی تو اس ہیکل کو فراموش کر دیا گیا یہاں تک کہ وہ قریب قریب کھنڈر ہو کے رہ گیا۔ اس کے باوجود بیت المقدس کا شہر اپنے محل وقوع اور قلعوں کے استحکام کی بنا پر ایک خاص اہمیت کا حامل رہا۔ چنانچہ ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں جب ایرانیوں نے اس پر حملہ کیا تو اس کے دروازے فوراً ان کے لیے نہیں کھولے گئے، بلکہ اٹھارہ دن کے محاصرے کے بعد بیت المقدس والے اطاعت پر مجبور ہوئے۔ اس کے بعد جب ہرقل نے دوبارہ اس پر قبضہ کیا تو یہودیوں پر یہ الزام لگا کر کہ جب ایرانیوں نے بیت المقدس پر حملہ کیا تھا تو انہوں نے حملہ آوروں کے ساتھ ہمدردی اور اپنے ملک کے خلاف جاسوسی کی تھی، انہیں طرح طرح سے ستایا، ان کی گردنیں ماریں اور انہیں جلاوطن کیا۔

تاریخ بیت المقدس کی یہ سرسری جھلک اس روایت کی نفی کرتی ہے، جس کا بیان ہے کہ بیت المقدس میں مسلمانوں کی بالکل مقاومت نہیں کی گئی، جیسے ہی اطربون کو یہ معلوم ہوا کہ غازیان اسلام چڑھائی کرنے آرہے ہیں، وہ مصر بھاگ گیا اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے وہاں پہنچتے ہی اسقف صفرنیوس نے اس شرط پر مسلمانوں کو صلح کی درخواست بھیج دی کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ بنفس نفیس تشریف لا کر صلح کا معاہدہ مرتب فرمائیں، آپ پڑھ چکے ہیں کہ بیت المقدس نے اپنی پوری تاریخ میں حملوں کی مزاحمت کس طرح کی اور مسلمانوں کی آمد سے بیس سال پہلے ایرانیوں کے ساتھ مقابلہ کیا۔ حالانکہ انہی دنوں ایرانیوں نے شام میں رومیوں پر فتح پائی تھی اور انہیں کئی موقعوں پر شکست دی تھی، جس طرح مسلمانوں نے یرموک، دمشق، فحل اور اجنادین میں رومیوں کے کس بل نکالے تھے۔ اس کے باوجود اس مقدس شہر نے مقابلہ کیے بغیر ایرانیوں سے ہار نہیں مانی۔ ان حالات میں یہ بالکل فطری تھا کہ بیت المقدس والے مسلمانوں کی بھی اسی طرح مزاحمت کرتے، جس طرح انہوں نے ایرانیوں کی مزاحمت کی تھی۔ اس سے اس روایت کی تصدیق ہوتی ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ صلح کی پیشکش سے پہلے مسلمانوں کو کئی مہینے محاصرہ کرنا پڑا اور یہ قول غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ انہوں نے بغیر کسی مقاومت کے صلح کی درخواست بھیج دی تھی۔

اس طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس روایت کو حقیقت سے بعید سمجھیں جس کا بیان ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ یا حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے تنہا یا مشترکہ طور پر بیت المقدس کا محاصرہ کیا، جیسا کہ طبری، ابن اثیر اور ابن کثیر وغیرہ نقل کرتے ہیں۔ طبری کی روایت ہے: ''کہا جاتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے شام آنے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا تو اہل شہر نے انہی شرطوں پر جو شام کے دوسرے علاقوں کے باشندوں سے ہو چکی تھیں، صلح کی درخواست کی۔ مگر اس میں اتنی شرط اور بڑھائی کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ خود تشریف لا کر صلح کی تکمیل کریں۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس کی اطلاع بارگاہ خلافت میں ارسال کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینے سے روانہ ہو گئے۔''

ہم اس روایت کو خلاف حقیقت اس لیے سمجھتے ہیں کہ بیت المقدس کے محاصرے کے وقت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ حمص، حلب، انطاکیہ اور ان کے آس پاس کے شہروں کی فتوحات میں مصروف تھے اور ہرقل ان کے بالمقابل رہاء میں بیٹھا لشکر جمع کر رہا تھا کہ انہیں الٹے پاؤں واپس ہونے پر مجبور کر دے۔ یہ تمام واقعات بھی بیت المقدس کے محاصرے کی طرح سنہ 15ھ مطابق سنہ 636ء کے ہیں اور صحیح یہ ہے کہ بیت المقدس کا محاصرہ اسی سن میں کئی مہینے تک جاری رہا جس سن میں یہ دونوں سپہ سالار شام کے انتہائے شام میں بڑھتے چلے جا رہے تھے، یہاں تک کہ انہوں نے ہرقل کو اپنے دارالسلطنت میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ ایسی صورت میں کہ وہ دونوں ادھر مصروف تھے یہ کہنا کہ ان میں سے کسی ایک یا دونوں نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا، ایک ایسی بات ہے جو کسی طرح نہیں بنتی اس لیے اسے ناقابل قبول قرار دینا پڑتا ہے۔

اب صرف یہ ایک روایت اور باقی رہ جاتی ہے کہ بیت المقدس کا محاصرہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے کیا تھا جو طویل مدت تک جاری رہا اور بیت المقدس والوں نے بڑے جوش اور بڑی شدت سے مسلمانوں کا مقابلہ کیا اور یہی روایت ہماری رائے میں صحیح ہے، اس لیے کہ یہ اس مقاومت سے اتفاق رکھتی ہے، جو بیت المقدس نے مختلف زمانوں میں ہر حملہ آور کے مقابلے میں ظاہر کی اور اس لیے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ، جہاں تک فوجی قیادت کا تعلق ہے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے کسی طرح کم نہ تھے۔ ان کی فوجی مہارت و مقدرت کے لیے یہی ثبوت کافی ہے کہ وہ فاتح مصر ہیں جو رومیوں کے نزدیک ایک مستحکم پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاید آپ کو یاد ہوگا کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شام پر حملے کے لیے فوجیں روانہ کی تھیں تو ابن عاص رضی اللہ عنہ نے

Marfat.com

ان فوجوں کا سپہ سالار بننا چاہا تھا اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس وقت ان سے فرمایا تھا: ''اگر تم اس مرتبہ فوجوں کے سپہ سالار نہیں بنائے گئے تو ان شاء اللہ وہ دن بہت جلد آئے گا جب تم امیر ہو گے اور تم پر کوئی دوسرا افسر نہ ہوگا۔'' اس سے پہلے بھی وہ اس لشکر کے امیر رہ چکے تھے جو عہد صدیقی میں بنو قضاعہ کے ارتداد کا استیصال کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ایک ایسا شخص جس کی شان یہ ہو، جسے امن اور جنگ دونوں میں اپنی ذہانت و تدبیر آفرینی کے لیے بے مثال شہرت حاصل ہو اور جو فلسطین کے اسلامی لشکر کا سپہ سالار اور اس ملک کا فاتح بھی ہو۔ بلاشبہ وہی بیت المقدس کے محاصرے کا قائد ہے۔ اسی نے اس کا محاصرہ کیا اور اسی نے اہل شہر سے صلح کی ابتدائی بات چیت کی۔

محاصرہ طویل اور اہل شہر کی مزاحمت شدید ہوتی گئی، یہاں تک کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مدد چاہی اور انہیں لکھا: ''میں سخت دشمن کا تدارک کر رہا ہوں اور ایسے شہروں میں ہوں جو آپ کے لیے۔ پے سپرد کر دیئے گئے ہیں۔ آگے آپ کی رائے! طبری کی ایک روایت میں ہے کہ ''ایلیا کے باشندے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے لیے اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ایلیا کے باشندوں کے لیے ایک مصیبت بنے ہوئے تھے۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ نہ ان پر قابو پا سکے نہ رملہ پر، اس لیے انہوں نے خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ ان کی امداد و تقویت کے لیے ایک عظیم لشکر بھیجا جائے تاکہ وہ محصورین پر قابو پا سکیں۔''

کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس لشکر کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے یا وہیں رہے یہاں تک کہ بیت المقدس کے باشندوں نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے صلح کی بات چیت کی اور اس شرط پر شہر مسلمانوں کے سپرد کرنے کی حامی بھری کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ بنفس نفیس تشریف لا کر معاہدہ صلح کی تکمیل فرمائیں؟ مشہور یہی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اہل ایلیا سے صلح کی تکمیل ہی کے لیے مدینہ سے تشریف لے گئے تھے اور اسی بنا پر گنتی کے چند آدمی آپ کے ہمراہ تھے، لیکن بعض روایات ایسی بھی ہیں جو اس مشہور روایت سے اختلاف کرتی ہیں۔ عدی بن سہل کی ایک روایت ہے کہ ''جب اہل شام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فلسطین کے خلاف مدد چاہی تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر کیا اور ان کی مدد کے لیے نکلے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''آپ کہاں تشریف لیے جاتے ہیں۔ کیا سگ گزیدہ دشمن سے لڑنے کا ارادہ ہے؟'' ابن کثیر نے ایک اور روایت نقل کی ہے کہ: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ اہل ایلیا سے تکمیل صلح کے لیے فلسطین تشریف لے گئے۔ آپ ایک لشکر کے ساتھ ان کی طرف روانہ ہو گئے اور مدینہ میں اپنا قائم مقام حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

Marfat.com

بنایا۔" تعجب ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ محض صلح کی تکمیل اور عہد نامے کی تسوید کے لیے لشکر کے ساتھ تشریف لے جاتے ہیں اور اسی طرح تعجب ہے کہ اہل بیت المقدس معاہدہ صلح کی تکمیل کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مدینہ سے تشریف لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ حالانکہ جانتے ہیں کہ اگر مدینہ سے کوئی قافلہ لگاتار سفر کر کے ان کی طرف آئے تو پورے تین ہفتہ لگیں گے۔ اس لیے میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ محاصرے کی طوالت اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ان خطوط سے جن میں دشمن کی طاقت کا ذکر کر کے مدد طلب کی گئی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پیمانہء صبر لبریز ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب ان سے نئی کمک طلب کی گئی تو اس کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی روانہ ہو گئے اور جابیہ میں قیام فرمایا۔ جو صحرائے شام اور سرزمین اردن کے درمیان واقع ہے۔ اس دوران میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ شام کی فتح سے فارغ ہو چکے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کو حکم بھیجا کہ جابیہ میں آ کر ملیں تا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے اور فوج کے دوسرے سرداروں سے مشورے کے بعد بیت المقدس کی مہم سر کرنے کی کوئی مفید ترین راہ تلاش کر سکیں۔

اطربون اور صفرنیوس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تشریف آوری کا علم ہوا اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں شام پر جو بیتی تھی اس کی بھی اطلاع ملی تو انہوں نے سمجھ لیا کہ بیت المقدس کی مقاومت اب زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ اطربون تو کچھ فوج لے کر چپکے سے مصر سے کھسک گیا اور بوڑھے پادری نے اپنی نجات کی طرف سے مطمئن ہو کر مسلمانوں سے صلح کی گفتگو شروع کر دی اور چونکہ اسے یہ معلوم تھا کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ جابیہ میں اقامت فرما ہیں، اس لیے یہ شرط لگا دی کہ صلح کا معاہدہ لکھنے کے لیے وہ خود تشریف لائیں۔ جابیہ اور بیت المقدس میں اتنا فاصلہ نہ تھا کہ صفرنیوس کی اس درخواست کے جواب میں عذر پیش کر دیا جاتا۔

یہ ہے وہ بات جسے میں صحیح سمجھتا ہوں اور جو شام و فلسطین پر حملے سے متعلق واقعات کے سلسلے میں تاریخی سیاق کے مطابق ہے۔ مشہور روایت بھی اس کی نفی نہیں کرتی۔ اگرچہ اس کا یہ بیان اس سے مختلف ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینے سے روانہ ہی اس وقت ہوئے تھے جب اہل بیت المقدس نے صلح کی پیشکش کو اس شرط سے مشروط کیا تھا کہ خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ خود آ کر خود عہد نامے کی تکمیل کریں۔ اس روایت کے بیان کرنے والے اس مسئلے میں باہم اختلاف رکھتے ہیں کہ اہل ایلیا کا متذکرہ پیغام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں کس نے بھیجا؟ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ یا حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے؟ اسی طرح اس سنہ کے متعلق بھی ان میں اختلاف پایا جاتا ہے، جس سن میں بیت المقدس فتح ہوا۔ اس بات کو ترجیح دینے کے بعد، جو اس روایت کے خلاف

ہے۔ میں ان اقوال کی چھان بین میں نہیں الجھوں گا اور یہاں صرف اس مشہور روایت کو نقل کرنے ہی پر بس کروں گا، جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مدینہ سے ایلیا تشریف لے جانے کا ذکر ہے۔

اس روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے سپہ سالار کا وہ خط ملا جس میں ان سے فلسطین تشریف لانے کی درخواست کی گئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خط مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مسلمانوں کو پڑھ کر سنایا اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ ہی میں رہیں۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا: ''اگر آپ یہیں ٹھہریں اور تشریف نہ لے جائیں تو وہ سمجھیں گے کہ آپ نے ان کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی اور آپ ان سے لڑنے کے لیے مستعد ہیں۔ چنانچہ زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ وہ خود حقیر سمجھ کر جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔''

لیکن حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے سے اختلاف کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایلیا جانے کا مشورہ دیتے ہوئے فرمایا: ''مسلمانوں نے سردی، جنگ اور طول قیام کی غیر معمولی مشقت برداشت کی ہے...... اگر آپ تشریف لے جائیں گے تو اس میں آپ کے اور مسلمانوں کے لیے امن و عافیت اور بہتری ہے، لیکن اگر آپ نے انہیں اپنی اور صلح کی طرف سے مایوس کر دیا تو یہ بات آپ کے حق میں اچھی ثابت نہ ہوگی۔ وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہیں گے اور انہیں اپنے ملک اور رومی بادشاہ کی طرف سے کمک پہنچ جائے گی۔ خاص طور پر اس لیے کہ بیت المقدس ان کے نزدیک بڑی عظمت رکھتا ہے اور ان کی زیارت گاہ ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے کو پسند و قبول فرمایا اور مدینے میں انہیں اپنا نائب بنا کر لوگوں کو حکم دیا کہ ان کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینے سے روانہ ہوئے اور جابیہ میں قیام فرمایا۔[1] فوج کے سرداروں کو

---

[1] طبری اور ابن اثیر وغیرہ لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ سے جابیہ گھوڑے پر تشریف لے گئے۔ لیکن واقدی اور اس کے متبعین کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی اونٹنی پر روانہ ہوئے۔ اونٹنی پر دو تھیلے تھے جن میں سے ایک میں ستو تھا اور دوسرے میں کھجوریں۔ آپ کے سامنے پانی سے بھرا ہوا ایک مشکیزہ تھا اور پیچھے زادِ راہ کا کشکول۔ مسلمانوں کی ایک جماعت ساتھ تھی، روزانہ صبح آپ کشکول بیچ میں رکھ دیتے اور وہ سب آپ کے ساتھ کھانا کھاتے۔ اثنائے سفر میں آپ ان مسلمانوں کو، جو آپ کے ہمراہ تھے، دین کی تعلیم دیتے تھے اور دین کے خلاف ان باتوں سے روکتے تھے جن کا ارتکاب وہ ناواقفیت

Marfat.com

آپ لکھ چکے تھے فلاں تاریخ تک مجھ سے جابیہ میں ملو۔ چنانچہ جب انہیں آپ کی تشریف آوری کا علم ہوا تو آپ کے حکم کی تعمیل میں روانہ ہو گئے۔ سب سے آگے یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ، پھر

« کی وجہ سے کر بیٹھتے تھے۔ جب وہ شام کے قریب پہنچے تو سواروں کا ایک دستہ اپنی طرف آتے دیکھا جو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس لیے بھیجا کہ انہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تشریف آوری کی خبر دے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس میں داخل ہونا چاہا۔ اس وقت آپ نمدے کا کرتہ پہنے ہوئے تھے جس میں چودہ پیوند لگے تھے اور بعض پیوند ادھوڑی کے تھے۔ ہمراہیوں نے عرض کیا: ''بہتر ہے اگر آپ اونٹنی کے بجائے گھوڑے پر سوار ہو جائیں اور سفید لباس پہن لیں۔'' چنانچہ ایسا ہی کیا اور کندھے پر ایک ریشمی رومال ڈال لیا جو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ ایک ترکی گھوڑا پیش کیا گیا اور آپ اس پر سوار ہوئے۔ لیکن جب اسے کلیل بھری چال چلتے دیکھا تو اتر گئے اور ساتھیوں سے فرمایا: ''میری لغزش سے درگزر کرو، اللہ قیامت کے دن تمہاری لغزش سے درگزر فرمائے گا۔ جس نخوت اور کبر نے اس وقت میرے دل میں راہ پائی شاید تمہارے امیر کو ضرور ہلاک کر ڈالتے۔'' اس کے بعد وہ پوشاک اتار کر پھر وہی پیوند لگے کپڑے پہن لیے۔

ابن کثیر اس سفر کے سلسلے میں ابو الغالیہ دمشقی سے ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ: ''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک خاکستری رنگ کے اونٹ پر ایلیا کے رستے جابیہ تشریف لائے۔ آپ کی پیشانی سے اوپر کا حصہ دھوپ میں چمک رہا تھا۔ سر پر نہ ٹوپی تھی نہ عمامہ۔ دونوں پاؤں بے رکاب کجاوے کے اگلے پچھلے حصے کے درمیان رگڑ کھا رہے تھے۔ اونٹ کی پیٹھ پر ایک اونی کمبل تھا جو قیام کی حالت میں بستر کا بھی کام دیتا تھا۔ خرجی چیتے کی کھال یا شملے کی تھی جس میں کھجور کی چھال بھری تھی۔ اسی خرجی کو ضرورت کے وقت تکیہ بنالیا جاتا تھا۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ گاڑھے کا بوسیدہ کرتہ پہنے تھے جو پہلو سے پھٹا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا: ''قوم کے سردار کو بلاؤ!'' جلومس کو حاضر کیا گیا۔ ارشاد فرمایا: ''میرا کرتہ دھو کر سی لاؤ اور مجھے تھوڑی دیر کے لیے کوئی کپڑا یا قمیص دو۔'' ایک ریشمی قمیص پیش کی گئی، دریافت کیا 'یہ کیا ہے؟'' کہا: 'ریشم' فرمایا: ''ریشم کیا ہوتا ہے؟'' لوگوں نے بتایا۔ آپ نے کرتہ اتارا جو دھو کر اور پیوند لگا کر حاضر کیا گیا۔ آپ نے ان کی قمیص اتار کر اپنا کرتہ پہن لیا۔ جلومس نے عرض کیا'' آپ عرب کے بادشاہ ہیں۔ اس ملک میں آپ کا اونٹ پر جانا زیب نہیں دیتا۔ اگر آپ دوسرا لباس پہن لیں اور ترکی گھوڑے پر سوار ہو جائیں تو رومیوں کی نگاہ میں عظمت بڑھے گی۔'' ارشاد فرمایا: ''خدا نے ہمیں جو عزت دی ہے وہ اسلام سے ہے۔ اس کے سوا ہم کو کچھ نہیں چاہیے!'' ترکی گھوڑا لایا گیا جس کی پیٹھ پر ایک چادر ڈال دی گئی۔ زین وغیرہ نہ کسی گئی۔ آپ اس پر سوار ہوئے پھر فرمایا: ''روکو! روکو،...... اس سے پہلے میں نے لوگوں کو شیطان پر سوار ہوتے نہیں دیکھا تھا۔'' آخر کار اونٹ لایا گیا اور آپ اس پر سوار ہوئے۔ ابن کثیر نے طارق بن شہاب کی بھی ایک روایت نقل کی ہے۔ ان کا بیان ہے: ''جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام پہنچے تو ایک جگہ رستے میں پانی روک بن گیا۔ آپ اپنی اونٹنی پر سے اترے، موزے اتار کر ہاتھ میں لے لیے اور اونٹنی کو ساتھ لے کر پانی میں اتر گئے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا: '' آج آپ نے وہ کام کیا ہے جس کی اہل زمین کے نزدیک بڑی عظمت ہے۔ آپ نے یہ کیا اور وہ کیا۔'' فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان کے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ''ابوعبیدہ! یہ بات تمہارے کہنے کی نہ تھی۔ کوئی اور کہتا تو کہتا۔ تم دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل، سب سے حقیر اور سب سے زیادہ قلیل تھے۔ اللہ نے تمہیں اسلام سے عزت دی۔ اب جب بھی تم اللہ کے سوا کسی اور سے عزت طلب کرو گے تو اللہ تمہیں ذلیل کر دے گا۔''

Marfat.com

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور ان کے پیچھے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اس شان سے پہنچے کہ ان پر نگاہ رکتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ یہ تینوں دیبا و حریر کے لباس پہنے چلے آرہے ہیں۔ یہ دیکھتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خون کھول گیا۔ گھوڑے سے اتر پڑے، سنگریزے اٹھا کر ان کی طرف پھینکے اور غصے سے فرمایا: ''کتنی جلدی تم لوگوں نے اپنی وضع بدل دی۔ اس لباس میں مجھ سے ملنے آئے ہو؟ کیا دو ہی برس میں تم اپھر گئے؟ خدا کی قسم! اگر دو سو برس تمہارا یہی طرز عمل رہا تو خدا تم کو بدل کے تمہاری جگہ اوروں کو حکمران کردے گا۔'' سرداران لشکر نے معذرت کے لہجے میں عرض کیا: ''امیر المومنین! ان قباؤں کے نیچے ہتھیار ہیں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہتھیار دیکھے تو غصہ ٹھنڈا ہوا اور فرمایا: ''پھر کوئی حرج نہیں۔'' اس کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کے جابیہ میں داخل ہوئے۔ سب لوگ آپ کی رکاب میں تھے۔

آپ جابیہ میں فروکش تھے کہ ایک دن سپہ گران اسلام نے شمشیر بدست سواروں کا ایک دستہ اپنی طرف آتے دیکھ کر گھبرا کر ہتھیار سنبھالے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں دیکھا تو مسکرائے اور فرمایا: ''گھبراؤ نہیں! یہ لوگ امان طلب کرنے آرہے ہیں۔'' آنے والے بیت المقدس کے اسقف صفر نیوس کے ایلچی تھے جو امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے صلح کرنے حاضر ہوئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دمشق کی شرائط صلح پر ان سے صلح کر لی، بلکہ اس سے بھی زیادہ کشادہ دلی کا ثبوت دیا۔ معاہدہ صلح جو طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے، یہ ہے:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! یہ وہ امان ہے جو اللہ کے بندے امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے ایلیا کے لوگوں کو دی۔ یہ امان، ان کی جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام مذاہب والوں کے لیے ہے۔ اس طرح پر کہ ان کے گرجاؤں کو مسکن بنایا جائے گا، نہ وہ ڈھائے جائیں گے انہیں ان کے احاطے کو کچھ نقصان پہنچایا جائے گا، نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی۔ مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہیں کیا جائے گا، نہ ان میں سے کسی کے ساتھ بدسلوکی رکھی جائے گی۔ ایلیا میں ان کے ساتھ یہودی نہ رہنے پائیں گے۔ ایلیا والوں پر یہ فرض ہے کہ اور شہروں کی طرح جزیہ دیں اور یونانیوں اور چوروں کو نکال دیں۔ ان یونانیوں میں سے، جو شہر سے نکلے گا، اس کی جان اور مال کو امن ہے تا آنکہ وہ اپنی پناہ گاہ میں پہنچ جائے اور جو ایلیا ہی میں رہنا پسند کرے اسے بھی امن ہے، لیکن اسے جزیہ دینا ہوگا اور ایلیا والوں میں سے جو لوگ جان اور مال لے کر یونانیوں کے ساتھ چلے جانا چاہیں انہیں اور ان

گرجاؤں اور صلیبوں کو امن ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی پناہ گاہ تک پہنچ جائیں۔ ایلیا میں دوسرے ملکوں کے جو لوگ ہیں ان میں سے اگر کوئی یہاں رہنا چاہے تو رہ سکتا ہے۔ اسے بھی ایلیا والوں کی طرح جزیہ ادا کرنا ہوگا۔ اگر کوئی رومیوں کے ساتھ جانا چاہے تو چلا جائے اور اگر کوئی اپنے اہل و عیال میں واپس نا چاہے تو ہو جائے۔ ان سے کوئی چیز نہیں لی جائے گی۔ یہاں تک کہ ان کی کھیتیاں کٹ جائیں اور جو کچھ اس تحریر میں ہے اس پر خدا کا، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا، خلفاء رضی اللہ عنہم کا اور مسلمانوں کا ذمہ ہے۔ بشرطیکہ یہ لوگ جزیہ مقررہ ادا کرتے رہیں۔

معاہدے کے خاتمے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مہر ثبت فرمائی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے گواہی لکھی۔ صفرنیوس کے ایلچی معاہدہ لے کر بیت المقدس پہنچے جسے پڑھ کر اسقف اور اہل شہر بے انتہا خوش ہوئے اور وہ خوش کیوں نہ ہوتے؟ مسلمانوں نے انہیں قرار بخشا تھا، ان کے جان و مال اور عقائد کو امان دی تھی کہ کسی کو اس کے مذہب کی بنا پر کوئی تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی اور نہ اس سلسلے میں اس پر کوئی جبر کیا جائے گا۔ انہیں خوشی کیوں نہ ہوتی؟ اس عہدنامے نے اجازت دی تھی کہ شہر والوں میں سے جو چاہے رومیوں کے ساتھ جا سکتا ہے اور اس کی طرف سے اذن عام تھا کہ بیت المقدس میں رہنے والے رومی اور دوسرے غیر ملکی اگر چاہیں تو امن و اطمینان سے یہاں رہ سکتے ہیں۔ پھر جزیے کے سوا، جو وہ اپنی حفاظت اور امن کے بدلے ادا کریں گے۔ اور کوئی فرض ان پر عائد نہیں کیا گیا تھا۔ بھلا کہاں یہ فراخ دلانہ سلوک اور کہاں وہ ہرقل کی دھینگا دھینگی جب اس نے اہل شہر کو سرکاری مذہب قبول کرنے کے لیے اپنا آبائی مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا تھا جس نے انکار کیا اس کے ناک کان کاٹ دیئے اور اس کا گھر ڈھا دیا۔ بلاشبہ یہ صلح ایک نئے عہد کی نوید ہے جس کے دروازے اللہ نے بیت المقدس کے عیسائیوں پر کھول دیئے اور یہ ایک ایسا عہد ہے جو تاریخ نے ان کے لیے کبھی فراہم نہیں کیا اور جس کی انہیں کوئی امید نہ تھی۔

اس صلح کی خبریں جب اہل رملہ کو ملیں تو وہ بھی امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے اسی قسم کا معاہدہ کرنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ یہی حال فلسطین کے دوسرے لوگوں کا تھا۔ لد والوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایک مکتوب ارزانی ہوا جس کے دائرہ نفاذ میں وہ شہر بھی شامل کر لیے گئے جنہوں نے اس کے بعد مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ اس خط میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لد کے باشندوں کے جان و مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور تمام مذاہب کو امان دی اور کہا کہ اگر وہ

Marfat.com

شام کے شہروں کی طرح جزیہ ادا کریں گے تو ان کے مذہب پر جبر نہیں کیا جائے گا اور نہ اختلاف عقائد کی بنا پر کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔ ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فلسطین پر دو حاکم مقرر فرمائے اور ملک کا آدھا حصہ ان دونوں میں بانٹ دیا۔ چنانچہ علقمہ بن حکیم کا مرکز حکومت رملہ قرار پایا اور علقمہ بن مجز کا ایلیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فلسطین کی صلح مکمل کر کے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو مع ان کے ہمراہیوں کے شمالی شام میں اپنی اپنی خدمت پر روانہ کر دیا۔[1] اس کے بعد حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیت المقدس تشریف لے جانے کا ارادہ فرمایا، لیکن آپ کا گھوڑا ابھی تک چلنے کے قابل نہ ہوا تھا۔ چنانچہ ایک ترکی گھوڑا حاضر کیا گیا اور آپ اس پر سوار ہوئے۔ گھوڑا چلا تو تکلیل کرنے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ناگوار ہوا، اس پر سے اتر پڑے اور چادر کا دامن اسکے منہ پر مار کے فرمایا: ''تجھے خدا سمجھے! یہ اٹھلاتی چال تو نے کہاں سے سیکھی؟'' اور اس کے بعد پھر کبھی ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوئے۔ کچھ دن آپ نے جابیہ میں قیام فرمایا۔ اس دوران میں آپ کا گھوڑا ٹھیک ہو گیا اور آپ اس پر سوار ہو کر بیت المقدس میں داخل ہوئے۔ بطریق، صفرینوس اور شہر کے معززین نے استقبال کیا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ انہیں اپنے قرب سے نوازا اور ایسی باتیں کیں جن سے آپ کی محبت ان کے دل میں پیدا ہو گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ آپ نے ان کی جانوں اور ان کے عقائد و معابد کو جو امان دی ہے اس میں صداقت پائی جاتی ہے اور محسوس کیا کہ آپ کو حق و انصاف سے جو محبت ہے اس کی عہد قیصری کے ظلم و جبر میں کہیں جھلک تک نظر نہیں آتی۔ دن ڈھل گیا اور لوگ دوسرے دن صبح حاضر ہونے کی اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ تنہا ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کیا۔

اور اس سے بڑی کون سی نعمت ہو سکتی ہے کہ وہ مسجد اقصیٰ کے شہر کے فاتح اور وہاں نماز پڑھنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہوں۔ اللہ نے اپنے بندے اور رسول پر انعام فرمایا اور ایک رات اسے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس پہنچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہیکل سلیمان کے کھنڈروں پر نماز ادا فرمائی، جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت

[1] بعض روایات میں ہے کہ یہ دونوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیت المقدس گئے اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ واپس ہوئے تو اپنی اپنی خدمت پر روانہ ہوئے۔ لیکن مشہور روایت وہی ہے جو ہم نے نقل کی ہے۔

Marfat.com

عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام مقتدی تھے اور آپ ﷺ امام! اور اس دن کے بعد سے، جس دن اللہ کے حکم سے یہ معجزہ تمام ہوا، رسول اللہ ﷺ نہ فلسطین تشریف لے گئے، نہ مسجد اقصیٰ میں رونق افروز ہوئے۔ آپ ﷺ کی خلافت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سنبھالی اور اللہ نے انہیں بھی یہاں آنے کا موقع نصیب نہیں کیا، لیکن اب یہ سعادت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ارزانی فرمائی گئی ہے۔ بیت المقدس نے ان کے لیے اپنے دروازے کھولے ہیں اور ایک ایسے ظفر مند کی صورت میں ان کا استقبال کیا ہے، جس کے انصاف، رواداری اور مذہب کے معاملے میں کسی پر جبر نہ کیے جانے کی شدید خواہش نے اسے محبوب بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ بیت المقدس مسلمانوں کا پہلا قبلہ ہے۔ وہ عیسائیوں کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے مزار ہے اور یہودیوں کے لیے ارض معاد ہے کیا اس سے بڑی بھی کوئی نعمت ہوسکتی ہے؟ جس کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے پروردگار کا شکر ادا کریں! پس اگر وہ تمام رات نماز پڑھتے ہیں تو بھی پورا حق ادا نہیں کرتے۔ وان ربك من بعدها لغفور رحيم.

صبح ہوئی تو صفرنیوس خدمت فاروقی میں حاضر ہوا اور آپ کو شہر کے آثار اور زیارت گاہیں دکھانے کے لیے اپنے ساتھ لے گیا۔ بھلا بیت المقدس میں آثار کی کیا کمی تھی! وہ انبیاء و رسل کا شہر ہے۔ جب کلیم اللہ بنو اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکلے، یہیں تشریف لائے۔ یہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا صلیب دینے کا قصہ پیش آیا، جس کی بنا پر یہاں کلیسائے قیامت تعمیر کیا گیا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جسم پہلے اس میں دفن کیا گیا اور اس کے بعد یہاں سے آسمان پر اٹھایا گیا یہیں پیغمبروں کے آثار میں سے محراب داؤد علیہ السلام اور صخرہ یعقوب ہیں اور یہیں وہ پتھر صخرہ ہے، جس کے متعلق سیرت کی کتابوں میں مسطور ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس پر سے معراج کے لیے آسمان کی طرف تشریف لے گئے۔ اس کے علاوہ یہیں وہ ہیکل سلیمان علیہ السلام کے کھنڈر ہیں جو ایک عظیم الشان بادشاہ اور متعدد پیغمبروں کی یاد دلانے کے لیے باقی رہ گئے ہیں۔

اس قسم کے بہت سے آثار ان صنم کدوں کے کھنڈروں پر قائم تھے، جو فلسطین کے فرمانرواؤں نے رومیوں کی آمد سے پہلے تعمیر کرائے تھے، بلکہ ان میں سے کچھ صنم کدے تو اس سے بھی پہلے اس زمانے میں تعمیر ہوئے تھے، جب مصریوں نے بھی فلسطین کی سرزمین پر قدم نہ رکھا تھا۔ غالباً صفرنیوس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بخل نہیں برتا اور ان عبادت کدوں کے مشہور قصے جو بے شمار تھے، آپ کو سنا دیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور صفرنیوس کلیسائے قیامت میں تھے کہ نماز

کا وقت آ گیا۔ بطریق نے عرض کیا: ''آپ یہاں نماز پڑھ لیجئے کہ یہ بھی ایک سجدہ گاہ خداوندی ہے'' لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معذرت فرمائی کہ اگر آج انہوں نے یہاں نماز ادا کی تو مسلمان ان کے اس عمل کو مستحب یا سنت قرار دے کر ہمیشہ ان کی تقلید کریں گے، اگر انہوں نے ایسا کیا تو وہ عیسائیوں کو ان کے گرجاؤں سے نکال دیں گے اور امان کے عہد کی خلاف ورزی کریں گے۔ اسی طرح جب کلیسائے قیامت کے قریب کلیسائے قسطنطین کے دروازے پر عیسائیوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نماز پڑھنے کے لیے بساط بچھائی تو آپ نے اس وقت بھی معذرت فرما دی اور ہیکل کے کھنڈروں پر ''مقدس پتھر'' کے قریب ایک جگہ نماز ادا فرمائی اور یہ وہ جگہ ہے جہاں بعد کو مسلمانوں نے ایک نہایت عالی شان مسجد تعمیر کی، جو مسجد اقصیٰ ہے۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہ مسجد اتنی سادہ تھی جتنی سادہ اپنی تعمیر کے وقت مسجد نبوی ﷺ تھی۔

بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کلیسائے قیامت میں نماز پڑھنے سے دراصل اس لیے گریز کیا کہ اس میں تصویریں اور مورتیاں تھیں اور متذکرہ بالا عذر محض بات بنانے کے لیے پیش کر دیا کہ بوڑھے بطریق کا دل تھوڑا نہ ہو، لیکن ایک تاریخی واقعے، کی جو دنیا کے مختلف المذاہب انسانوں کے باہمی تعلقات پر بڑا اہم اثر ڈالتا ہے، یہ توجیہ صحیح نہیں ہے۔ اس کے عدم صحت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ کلیسائے قیامت کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ صفرنیوس کے ساتھ بیت لحم میں کلیسائے مہد کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے اور جب نماز کا وقت آیا تو وہاں نماز پڑھی حالانکہ اس میں کلیسائے قیامت کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ مورتیاں، تصویریں، صلیبیں تھیں۔ اس کے بعد انہیں اندیشہ ہوا کہ مسلمان کلیسا میں ان کے نماز پڑھنے کو حجت قرار دے کر کہیں عیسائیوں کو اس سے نکال باہر نہ کریں۔ چنانچہ ایک خاص عہد لکھ کر بطریق کو دے دیا، جس کی رو سے یہ کلیسا عیسائیوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا اور پابندی لگا دی گئی تھی کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی مسلمان اس میں داخل ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ پھر ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایوان کسریٰ کو مسلمانوں کے لیے معبد بنا دیا تھا، لیکن اس میں جو مورتیاں تھیں انہیں ہاتھ تک نہ لگایا تھا، حالانکہ مدائن کی فتح اور اس ایوان کے مالک ہو جانے کے بعد اگر وہ چاہتے تو ان مورتیوں کو وہاں سے ہٹوا سکتے تھے۔ آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کلیسا میں مورتیاں اور تصویریں ہونے کی بناء پر وہاں نماز پڑھنے سے کیوں گریز فرماتے، جبکہ رسول اللہ ﷺ مدینہ ہجرت فرمانے سے پہلے کعبے کے قریب نماز ادا فرماتے تھے، جہاں بہت سی مورتیاں تھیں اور یہ مورتیاں آپ کو اور دوسرے مسلمانوں کو کعبے کے قریب نماز پڑھنے سے نہ

Marfat.com

روکتی تھیں۔ ہجرت کے سات سال بعد دو ہزار مسلمانوں کی معیت میں رسول اللہ ﷺ عمرہ قضا کے لیے مکہ تشریف لائے اور بیت اللہ کا طواف فرمایا حالانکہ اس وقت تک کعبے میں بت موجود تھے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کعبے کی چھت پر چڑھ کر ظہر کی اذان دی اور رسول اللہ ﷺ نے دو ہزار مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔ آخر محمد ﷺ کے متبعین اس جگہ نماز کیوں نہ پڑھتے جہاں تصویریں اور مورتیاں تھیں، جب کہ اسلام ایمان باللہ کا دوسرا نام ہے اور جبکہ اسلام میں اعمال کا مدار نیتوں پر ہے۔ پس جس کسی کا ایمان نکھر گیا اور جس کسی نے اپنے آپ کو اللہ کے لیے وقف کر دیا وہ جدھر منہ کرے گا اللہ کی طرف کرے گا۔

فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے کعبے کے صحن اور اس کے اطراف سے جو بت ہٹوائے، اس کی وجہ صرف یہ تھی اللہ کا گھر اس دین کے سوا ہر دین کے لیے حرام ہو جائے جو اللہ نے ہدایت و امتیاز کی دلیل بنا کر اپنے نبی ﷺ پر نازل فرمایا ہے۔ تا کہ ان بتوں کو دیکھ کر کوئی اپنا زمانہ جاہلیت یاد نہ کرے اور اس کے دل میں اس زمانے کے لیے کوئی شوق، کوئی بے چینی پیدا نہ ہو، لیکن جن لوگوں کے دل اللہ کے لیے آئینہ اور جن کی روحیں حضرت حق جل شانہ کی عبادت کے سوا تمام پرستشوں سے منزہ ہو گئی ہیں انہیں کوئی خوف نہیں ہے، جہاں ان کا جی چاہے نماز پڑھیں، انہیں کائنات میں ہر جگہ اللہ جل شانہ وتبارکت اسماؤہ کا جلوہ نظر آتا ہے۔

کلیسائے قیامت میں نماز پڑھنے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عذر ایک ایسا واقعہ ہے جو مذاہب کی تاریخ اور دنیا کے مختلف المذاہب انسانوں کے باہمی تعلقات پر بڑا اہم اثر ڈالتا ہے۔ یہ ایک آئینہ ہے جس میں اسلامی رواداری اور دین میں کوئی جبر نہیں۔ اس اصول پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا صدق تمسک جھلکتا ہے اور اس سے صدر اول کے مسلمانوں کی اس سیاست پر روشنی پڑتی ہے جو مذہبی آزادی کی اساس پر قائم تھی اور جس کا اصول یہ تھا کہ دعوت الی اللہ حکمت اور دل نشیں نصیحت کے ساتھ دینی چاہیے۔ بحث اور مناظرے میں بہتر سے بہتر طریق اختیار کرنا چاہیے اور جس شخص سے تمہاری دشمنی ہو اس کے ساتھ بھی اس طرح پیش آنا چاہیے گو یا وہ تمہارا گہرا دوست ہے۔ تعجب ہے کہ تیرہ سو برس سے زیادہ گزر چکے ہیں، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بیت المقدس میں مذہبی رواداری کی ایسی اعلیٰ مثال قائم فرما گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد بھی وہاں صدیوں تک مسلسل لڑائیوں کی آگ بھڑکتی رہتی ہے، یہاں تک کہ آج بھی وہ دینی نعروں اور مذہبی تعصب کے اعتبار سے دنیا کے مختلف حصوں میں شورش و ہیجان اور عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک مستقل

جھگڑے کا سبب بنا ہوا ہے۔ اگر مختلف قوموں کے فرماں روا، اور سیاست دان اس حقیقت کو پا لیتے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس دور میں پائی تھی اور ان کی طرح سمجھ لیتے کہ دین میں کوئی زور وزبردستی نہیں ہے، جو کچھ قیصر کا ہے وہ قیصر کو اور جو کچھ اللہ کا ہے وہ اللہ کو دے دیتے اور ارض معاد یا ہیکل سلیمان علیہ السلام کے نام فلسطین کو اپنا حق نہ گردانتے تو دنیا اس کرب واذیت سے نجات حاصل کر لیتی جو ربع مسکون کے مختلف گوشوں میں سامان اضطراب بنی ہوئی ہے اور جس کے اثر سے نہ کوئی براعظم آزاد ہے نہ اس خاکدان ہستی کی کوئی قوم۔ اس کے جواب میں ایک انصاف پسند آپ سے کہے گا: ''لوگ آرام سے رہنا ہی کب چاہتے ہیں؟ کیا لڑائی جھگڑوں کے سوا بھی ان کے پاس جاہ وشرف اور عظمت وآسودگی کا کوئی ذریعہ ہے؟ کیا دنیا کی تاریخ ان لڑائیوں کی ایک مسلسل زنجیر نہیں ہے، جن کی آگ اغراض نے کبھی مذہب کے نام پر بھڑکائی ہے اور کبھی عقیدے کی آزادی کے نام پر؟ لیکن مذہب اور عقیدے کی آزادی ان کے زعم وگمان سے پاک ہیں۔ انہیں تو محض ان لڑائیوں کے لیے جواز کا بہانہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے جو اغراض کی پیاس بجھانے کی غرض سے لڑی جاتی ہیں اور ان اغراض کو مذہب اور عقیدے کی آزادی سے بس اتنا ہی واسطہ ہوتا ہے کہ ان کا اپنا پیٹ بھر جائے۔'' یہ جواب بالکل درست ہے اور دلالت کرتا ہے کہ انسانیت کا ضمیر ابھی تک عالم طفولیت میں ہے اور پیغمبروں اور رسولوں، فلسفیوں اور حکیموں کی تعلیمات نے انسانیت کے دل میں وہ اثر پیدا نہیں کیا جو اثر وہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔

عیسائیوں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ حسن سلوک دیکھ لینے کے بعد، جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، میں بعض مسیحی مؤرخین کے اس غلط گمان کی تردید کرنا ضروری نہیں سمجھتا، جس کے پیش نظر وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس کے عیسائیوں سے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا اس کی شرائط یہ تھیں کہ مسلمان دن یا رات کو جس وقت چاہیں گے عیسائیوں کے گرجے میں جا سکیں گے۔ عیسائی انہیں روکنے کے مجاز نہیں۔ عیسائی اپنے مذہب کے متعلق کوئی تشہیر نہیں کریں گے، نہ کسی کو اپنے مذہب میں داخل ہونے کی دعوت دیں گے۔ وہ مسلمانوں کا لباس نہیں پہنیں گے۔ نہ ان کی طرح سجیں بنیں گے وہ عربی زبان نہیں بولیں گے جو فاتحین کی زبان ہے اور نہ ان کے نام پر اپنے نام رکھیں گے۔ وہ نہ گھوڑوں پر سوار ہوں گے نہ ہتھیار باندھیں گے۔ جب کوئی مسلمان ان کے پاس آئے گا تو جب تک وہ نہ بیٹھ جائے، کھڑے رہیں گے وہ شراب نہیں بیچیں گے، کلیساؤں پر صلیب نصب نہیں کریں گے، گھنٹے نہیں بجائیں گے اور مسلمانوں کے خادم کو نوکر نہیں رکھیں گے۔''

Marfat.com

یہ اور اس قسم کی دوسری چیزیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس طرز عمل سے کوئی نسبت نہیں رکھتیں، جو انہوں نے کلیسائے قیامت اور کلیسائے مہد میں اختیار فرمایا تھا۔ نہ اس بے پایاں مسرت ہی سے اتفاق کرتی ہیں جو صفرنیوس اور ایلیا کے تمام باشندوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صلح پر ظاہر کی تھی۔ حالانکہ ان دونوں کلیساؤں کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس طرز عمل اور بطریق اور دوسرے معززین شہر کے استقبال فاروقی رضی اللہ عنہ کا ذکر قدیم عیسائی مؤرخین ہی نے تفصیل سے کیا ہے۔ متقدمین عرب کی کتابوں میں اس کا کوئی قابل ذکر بیان نہیں ملتا۔ یہ تمام شرطیں ان مبلغین نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب کی ہیں جنہوں نے اہل صلیب کو فلسطین پر چڑھائی کے لیے بھیجا تھا۔ ان لوگوں کی غرض مندانہ تبلیغ نے حکومت کی وہ تمام برائیاں اور تعصب کی وہ تمام شدت آفرینیاں جان بوجھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذات سے منسوب کر دیں، جو ان کے بہت بعد اس وقت ظہور میں آئیں، جب زوال وانحطاط کے عمل نے اسلامی حکومت کے وجود کو بوسیدہ کر دیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس آخری دور میں مسلمانوں اور تعصب پرستوں کے درمیان یہی کچھ پیش آیا ہو، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان تمام چیزوں سے پاک اور ان کی ذات گرامی ان تمام پستیوں سے بمراتب بلند تھی۔ انہیں اس کی ضرورت بھی کیا تھی، جب اللہ نے ان کے لیے ساری دنیا کے دروازے کھول دیئے تھے، لوگ بغیر کسی جبر و جور کے فوج در فوج اسلام میں داخل ہو رہے تھے اور روم وایران کی فوجیں ان کی فوجوں کے مقابلے میں ہزیمت وفرار کے سوا اور کوئی راہ نہ پاتی تھیں۔ پس اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک تجربہ کار اور بعید النظر سیاست دان نہ تھے تو پھر ان کی فطرت نے ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کی ضرورت کیوں محسوس کی، جن کے شہروں کے دروازے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے لیے کھل رہے تھے اور جو اپنی باگ ڈور امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے سپرد کر رہے تھے۔ آپ کا دل ان کے متعلق کیا کہتا ہے، جب کہ ان کی سیاست، الہامی سیاست تھی۔ فتح وظفر نہ انہیں احتیاط سے بے خبر کرتی تھی، نہ ان کے دل میں پندار و نازش کے بیج بوتی تھی۔ ان کا حزم اس حقیقت کو ان کی نظر سے اوجھل نہ ہونے دیتا تھا کہ جب تک محکوم قوموں کے ساتھ رحم وانصاف کا برتاؤ کیا جاتا ہے وہ طغیان وسرکشی پر آمادہ نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں کے تمام انصاف پسند مؤرخین یک زبان ہو کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عدل وانصاف اور نرمی و رواداری کے گن گاتے ہیں اور انہوں نے بیت المقدس کے معاملے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا، وہاں کے باشندوں سے صلح کرنے میں جو اعتدال برتا، اس کا احترام کرتے ہیں۔

Marfat.com

ان منصف مزاج مؤرخوں کے اجماع میں وہ روایت بھی کوئی تغیر پیدا نہیں کرتی، جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دن بیت المقدس میں مسلمانوں سے خطاب کرنے کھڑے ہوئے اور اپنے خطبے میں یہ آیت پڑھی:

﴿مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا﴾ (الکہف: 17)

ترجمہ: ''جسے اللہ نے ہدایت دی وہ ہدایت یاب ہے اور جسے گمراہ کیا وہ اپنے لیے کوئی ولی اور کوئی مرشد نہیں پائے گا۔''

اس وقت حاضرین میں سے ایک پادری کھڑا ہوا اور بولا: ''اللہ کسی کو گمراہ نہیں کرتا!'' اور جب اس نے یہ بات دہرائی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پاس والوں سے فرمایا: ''اسے دیکھتے رہو! اگر یہ پھر وہی کہے تو اس کی گردن اڑا دو!'' اور پادری اس تخویف سے خاموش ہو گیا۔ اس روایت کے بعد بھی اگر انصاف پسند عیسائی مؤرخین اپنے اجماع پر قائم رہے تو اس کی وجہ محض یہی نہیں ہے کہ یہ روایت معتبر سند نہیں رکھتی، بلکہ اس سے زیادہ یہ ہے کہ اگر یہ صحیح بھی ہے تو بھی اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انصاف اور رواداری پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس پادری کے ساتھ کوئی مناظرہ نہیں کر رہے تھے، بلکہ ایک خطیب کی حیثیت سے مسلمانوں کو وعظ و تلقین فرما رہے تھے، لیکن اس پادری نے دخل انداز ہو کر سلسلہ کلام منقطع کیا اور اپنی بات کو دہرا کر نظام میں خلل ڈالا، جس سے گمان ہوتا تھا کہ وہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی تقریر میں گڑبڑ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تخویف سے آگے قدم نہیں بڑھایا اور جب پادری خاموش ہو گیا، اس نے دوبارہ قطع کلام کی کوشش نہ کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر تقریر شروع کر دی اور اس کے ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھی اور پادری کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ کی گئی۔

اگر اس پادری سے متعلق یہ روایت صحیح ہے تو ہم اسے ایک نیا آئینہ قرار دیں گے، جس میں اس اثر کے خطوط زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں، جو اس زمانے کی مسیحی فرقہ بندیوں نے عام زندگی پر ڈالا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس تخویف پر کوئی عیسائی غضب ناک نہ ہوا، نہ اس دھمکی میں اسے تعصب یا جبر و تشدد کی کوئی جھلک نظر آئی۔ بات یہ تھی کہ فرقہ بندیوں نے عیسائیوں کو ایک دوسرے سے پھاڑ دیا تھا اور وہ اس پادری کے دخل در معقولات کو ان معاشرتی آداب کے منافی سمجھ رہے تھے، جو کسی مسلمہ عقیدے کے خلاف تعصب کو برداشت نہیں کرتے۔ لیکن مسلمان ان کے تمام فرقوں کے ساتھ رواداری سے پیش آتے تھے، ان سب کو یکساں سمجھتے تھے اور

ان کے مسلمات میں دراندازنہ ہوتے تھے۔اس لیے وہ پادری واقعی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تخویف کا مستحق تھااور کسی کو یہ حق نہ پہنچتا تھا کہ اس پر اعتراض کرے یااسے فتنہ وشورش کا سبب بنائے۔

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رواداری کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ بیت المقدس کو عیسائیوں کے لیے چھوڑ دیتے اوراس پر مسلمانوں کا کوئی مذہبی حق نہ رہتا۔بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ اول تھااور اللہ نے اپنے بندے (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس مسجد اقصیٰ کی سیر کرائی تھی۔اس لیے یہ شہر جتنا عیسائیوں کے نزدیک مقدس ومحترم تھا،حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس سے کچھ کم نہ تھا۔اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ مسلمان جس شہر میں جاتے تھے،وہاں اپنے لیےایک مسجد ضرور بناتے تھے۔ہم بیان کر آئے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صفرنیوس سے معذرت فرمائی تھی کہ وہ کلیسائے قیامت میں نماز نہیں پڑھ سکتے،اورانہوں نے ہیکل کے کھنڈر پر صخرہ یعقوب علیہ السلام کے قریب ایک مقام پر نماز ادا کی تھی،جہاں بعد کوایک سادہ سی مسجد تعمیر کی گئی،جیسی تعمیر کے دن مدینہ میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تھی۔

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کعب احبار سے مشورۃً دریافت کیا کہ نماز کس جگہ پڑھی جائے؟ یہ صاحب یہودیت سے مسلمان ہوئے تھے۔بولے:''اگر آپ میری بات مانیں تو 'صخرہ'کے پیچھے نماز پڑھیں،سارابیت المقدس آپ کے سامنے ہوگا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:''تم میں ابھی تک یہودیت کا اثر باقی ہے۔نہیں،میں اس جگہ نماز پڑھوں گا،جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی تھی۔''اور طبری کی روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کعب سے پوچھا:''تمہارے خیال میں ہم مسجد کہاں بنائیں؟''کعب نے کہا:''صخرہ کی طرف!''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:''واللہ!تم میں اب تک یہودیت کا اثر باقی ہے۔جبھی میں نے دیکھا تھا کہ تم نے صخرہ کے پاس آکر جوتی اتاردی تھی ہم اس کا قبلہ اس کے صدر کو بنائیں گے،جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری مسجدوں کا قبلہ ان کے صدر کو بنایا ہے۔ہمیں صخرہ کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔''اور مسجد کا قبلہ اس کے صدر کو بنایا جس کا رخ صخرہ کی طرف نہیں بلکہ کعبے کی طرف تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قبلہ کعبے کو بنایا،صخرہ کو نہیں۔اس لیے کہ کتاب اللہ میں کعبہ ہی مسلمانوں کا قبلہ ہے،لیکن اس کے باوجود فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کے احترام میں کوئی کمی نہ کی۔اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں وہ اسراء کا مقام ہے،بلکہ صخرہ کی انہوں نے اتنی تعظیم کی کہ جب اس پر کوڑے کا انبار دیکھا جو رومی وہاں لالا کر ڈالا کرتے تھے تو اپنے ہمراہیوں سے

فرمایا: ''جو میں کرتا ہوں تم بھی وہی کرو!'' یہ کہہ کر جھکے اور کوڑا اٹھا اٹھا کر دور پھینکنے لگے۔ ساتھیوں نے بھی آپ کی تقلید کی، یہاں تک کہ نام کو گندگی باقی نہ رہی۔ اس دن سے صخرہ مسلمانوں کی نگرانی میں آ گیا، تا آنکہ عبدالملک بن مروان نے بڑی توجہ سے اس پر ایک گنبد تعمیر کرایا، جو فن تعمیر میں ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ عمارت نہ صرف اس کی بنائی ہوئی مسجد اقصیٰ اور مسجد حرام سے بازی لے گئی، بلکہ اپنی زندگی میں جتنی مسجدیں بھی اس نے تعمیر کرائیں، ان میں سے ایک بھی اس کا جواب پیش نہ کر سکی۔ دمشق میں قیام کی وجہ سے، جہاں عیسائیوں کے گرجے اور دوسری عمارتیں بکثرت تھیں، عبدالملک کو بازنطینی طرز تعمیر سے بطور خاص دلچسپی ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جتنی مسجدیں اس نے تعمیر کرائیں وہ اپنے اندر نگاہ و دل کی کشش کا پورا سامان رکھتی تھیں۔

بیت المقدس تشریف لانے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا۔ چنانچہ جس رستے سے آپ تشریف لائے تھے اسی رستے مدینہ واپس ہو گئے۔ جابیہ پہنچ کر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کچھ دن قیام فرمایا اور اس کے بعد اپنے گھوڑے پر روانہ ہو گئے۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فلسطین میں جو کام کیے تھے ان کی اطلاع حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے مسلمانوں کو مل چکی تھی۔ چنانچہ مدینے کے باہر انہوں نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔ وہ ایسا کیوں نہ کرتے جب کہ عراق کی طرح شام بھی کلیۃً ان کے قبضے میں آ گیا تھا اور ان کا شاندار استقبال کیوں نہ کیا جاتا جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے اس دن سے لے کر، جس دن اللہ نے دنیا کے گوشے گوشے میں اپنے دین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معبوث فرمایا تھا، آج تک اس نوعیت کا سفر کیا تھا۔

آپ کا کیا خیال ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ! اللہ کی بخشی ہوئی ان فتوحات پر قانع ہو کر اپنی حکومت کی تنظیم اور وحدت کے استحکام میں مصروف ہو جائیں کہ یہی ان کی تمنا ہے اور اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ ان کے اور ایرانیوں کے درمیان کوئی آگ کا پہاڑ ہوتا جو ایرانیوں کو ان کی طرف آنے دیتا نہ انہیں ایرانیوں کی طرف جانے دیتا اور اسی لیے وہ آرزو کرتے تھے کہ ان کے اور رومیوں کے درمیان ایک دیوار ہوتی جو رومیوں کو ان سے اور انہیں رومیوں سے بے خبر کر دیتی، لیکن قدرت کی مرضی ان کی مرضی سے زیادہ قوی تھی اور دست قضا ان کی لوح تقدیر میں لکھ چکا تھا کہ حضرت

Marfat.com

خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ شام میں دشمن کی قوت کا بالکل خاتمہ کر دیں اور اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے ملک بھی فتح کریں، جو اللہ ان کے ہاتھوں فتح کرانا چاہتا ہے۔ اس لیے ہم امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو حکومت کی تدبیر و تنظیم کے لیے مدینہ چھوڑ کر شام چلتے ہیں کہ دیکھیں اللہ اس کے ساتھ کیا کرتا ہے؟

Marfat.com

باب:13

شام پر مسلمانوں کے قبضہ کی تکمیل

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ، بیت المقدس سے اپنی اپنی خدمت پر واپس آ گئے، چنانچہ یزید رضی اللہ عنہ دمشق میں ٹھہر گئے، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حمص میں قیام فرمایا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے قنسرین کی امارت سنبھال لی۔ ان میں سے ہر ایک نے حکومت کا انتظام ایسی خوبی وخوش اسلوبی سے کیا کہ سختی کو نرمی میں سمو دیا اور انصاف کو مہربانی سے دامن اور گریبان کر دیا۔ دشمن کو ہر جگہ شکست ہو جانے اور فلسطین کے انتہائی جنوب سے لے کر شام کے انتہائی شمال تک قبضے میں آ جانے کے بعد مسلمان اب رومیوں کے اچانک حملوں سے محفوظ ہو گئے تھے۔

لیکن اہل جزیرہ، جو عراق اور شام کے درمیان آباد تھے اور جن کے بھائیوں کی بستیاں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے آدمیوں نے ہیت، تکریت، موصل اور قرقیسیا میں مسمار کر دی تھیں۔ اپنے بھائیوں کی بربادی کے بعد سے آتش بجاں تھے، بلکہ انہیں نظر آ رہا تھا کہ اگر عراق کی طرح مسلمان شام میں بھی شہر پر شہر فتح کرتے، قبائل کو اپنا اطاعت گزار بناتے اور اسلام قبول نہ کرنے والوں پر جزیہ عائد کرتے ہوئے یوں ہی آگے بڑھتے رہے تو ایک نہ ایک دن ان کی اپنی آبادیاں بھی غازیان اسلام کی زد میں آ جائیں گی۔ یزدگرد کے "رے" فرار ہو جانے کے بعد وہ اس کی طرف سے مایوس ہو گئے تھے، اس لیے انہوں نے ہرقل کو لکھا کہ اگر وہ مسلمانوں سے لڑنے اور انہیں ان کے مقبوضات سے نکال باہر کرنے کے لیے بحری راستے سے لشکر بھیجے تو وہ اس کی مدد کریں گے۔ ہرقل نے اس مسئلے پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس میں نقصان کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ اگر تقدیر اس پر مہربان ہو جائے اور وہ اپنے ان حلیفوں کی مدد سے شمالی شام میں مسلمانوں کو شکست دے سکے تو اس کی فوجیں دمشق اور بیت المقدس میں اسلامی لشکروں کا مقابلہ کر سکتی ہیں

Marfat.com

اس دن گویا ایک معجزہ ہوگا اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مزار عربوں سے واپس لے لے گا، جس طرح اس سے پہلے ایرانیوں سے واپس لے لیا تھا۔ اس کے بعد صلیب اعظم لے کر شام سے گزرتا ہوا بیت المقدس پہنچے گا اور بیس سال پہلے کی طرح اسے اس کی جگہ نصب کر دے گا۔ اگر ایسا ہو گیا تو بلاشبہ صلیب کو وہی عظمت وشان حاصل ہو جائے گی جو قسطنطین کے عہد میں حاصل تھی اور اللہ اس کے ہاتھوں مسیحیت کو وہ نصرت و کامیابی عطا فرمادے گا جو اسے تمام مذاہب پر فضیلت بخش دے گی۔

اہل جزیرہ نے ہرقل کو دوبارہ خط لکھا جس سے وہ سمجھ گیا کہ ان کے رادے میں کوئی جھول نہیں ہے۔ اس نے دیکھا کہ ان میں سے اکثر عیسائی عرب اپنے مذہب کا دامن مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں اور اس کی راہ میں لڑ کے مرجانا بہتر سمجھتے ہیں۔ ہرقل کو شام کے میدان کارزار سے دور ہوئے ایک برس سے زیادہ ہو گیا تھا اس لیے اب اس کے دل میں وہ پہلا سا خوف باقی نہ رہا تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ بہت سے سرحدی قلعے ابھی اتنے مستحکم ہیں کہ مسلمانوں کے حملوں کی تاب لا سکتے ہیں۔ اس کا جنگی بیڑا ابھی ہنوز محفوظ تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مسلمان سمندر اور سمندر کی طرف سے آنے والی ہر چیز سے ڈرتے ہیں۔ اس سے اس کے ارادے میں قوت پیدا ہوئی اور وہ اہل جزیرہ کا مطالبہ تسلیم کر لینے پر مائل ہو گیا۔ یہ صحیح ہے کہ شمالی شام میں مسلمانوں کی سرحدیں مستحکم ہیں اور انہیں سر کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ لیکن یہ عرب عیسائی اگر صحرا کی طرف سے حملہ آور ہو گئے تو خالد رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو پریشان کر دینے کے لیے کافی ہوں گے۔ پھر جب سمندر کے رستے اس کی بھیجی ہوئی کمک عین موقع پر پہنچے گی اور مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ ان پر مشرق اور مغرب کی طرف سے بیک وقت حملہ کیا گیا ہے تو ان کے بازو شل ہو جائیں گے اور اہل شام ان کے خلاف بغاوت کر دیں گے۔ اس طرح اسے اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کا موقع مل جائے گا۔

ہرقل نے اپنے خط میں ان قبائل کو جوش دلایا، ان کی ہمتیں بڑھائیں اور لکھا کہ جہازوں کو حکم دے دیا گیا ہے۔ وہ فوج اور سامان جنگ لے کر اسکندریہ سے انطاکیہ پہنچ رہے ہیں۔ ہرقل کا خط ملنے پر یہ قبائل اپنی تمام فوجیں لے کر جزیرے سے حمص کی طرف روانہ ہو گئے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو ان تمام باتوں کی اطلاع ملی تو انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو مشورے کے لیے قنسرین سے بلایا اور ان دونوں سپہ سالاروں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ دشمن سے مقابلہ

کرنے کے لیے تمام اسلامی فوجیں شمالی شام میں جمع ہو جائیں چنانچہ انطاکیہ، حماۃ، حلب اور قریب کی تمام فوجیں چھاؤنیوں کے لشکر حمص میں اکٹھے کر دیئے گئے۔ ادھر سارے ملک میں یہ خبر پھیل گئی کہ ہرقل کی فوجیں بحری رستے سے آ رہی ہیں اور جزیرے کے قبائل حملے کے لیے حمص کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔ چنانچہ گردنیں بڑھ بڑھ کے ایک دوسرے سے پوچھنے لگیں۔ "قیصر اور اس کے حلیفوں کا یہ نیا حملہ کس چیز سے روکا جائے گا؟" اور جب ہرقل کے جہاز انطاکیہ پہنچے تو شہر کے دروازے فوج کے لیے کھل گئے، رعایا مسلمانوں کے خلاف ہو گئی اور تمام شمالی شام میں بغاوت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو حمص میں محصور پایا جسے باغیوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور دشمنوں کو سمندر اور صحرا دونوں طرف سے اپنی سمت بڑھتے دیکھا۔ اب وہ کیا کریں؟ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور کہا کہ میں نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا ہے، جس میں اس نازک مرحلے پر ان سے مدد طلب کی ہے اس کے بعد ان سے پوچھا کہ مسلمان دشمن سے باہر نکل کر مقابلہ کریں یا مدینہ سے آنے والی کمک کے انتظار میں قلعہ بند ہو کر لڑیں؟ صرف حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے میدان میں نکل کر لڑنے کا مشورہ دیا، باقی تمام فوجی افسروں کی یہ رائے ہوئی کہ قلعہ بند ہو کر جلد سے جلد کمک طلب کرنی چاہیے۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کی رائے قبول کر لی اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے مشورے سے اختلاف کیا۔ چنانچہ مورچوں کو اور مضبوط کر کے بارگاہ خلافت میں اپنے ساتھیوں کی رائے لکھ بھیجی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بات کو کبھی فراموش نہ ہونے دیتے تھے کہ عراق و شام کے اسلامی لشکر کو اگر کبھی اس قسم کا خطرہ پیش آ گیا تو اسلامی فتوحات اسی ابتلا سے دوچار ہو جائیں گی، جس سے وہ ان کی خلافت کے دن دوچار تھیں۔ اسی لیے انہوں نے بصرہ اور کوفہ آباد کرنے کا حکم دیا تھا اور اسی لیے ان دونوں شہروں کو مسلمانوں کی فوجی چھاؤنیاں بنایا تھا جہاں کوئی غیر مسلمان آباد نہ تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے سات شہروں میں سے ہر شہر میں چار ہزار سوار مقرر تھے جو ہر وقت اس قسم کی ہنگامی ضروریات کے لیے کیل کانٹے سے لیس رہتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کا خط بارگاہ خلافت میں پہنچا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محسوس فرمایا کہ مسلمانوں کا یہ عظیم سپہ سالار ایک بہت بڑے خطرے میں گھر گیا ہے تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو فوری حکم دے کر روانہ کیا کہ "جس دن تمہارے پاس میرا یہ خط پہنچے اسی دن قعقاع بن عمرو کو امدادی فوج کے ساتھ حمص بھیج

Marfat.com

دو! ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ وہاں گھر گئے ہیں، جتنی جلدی اور جتنی تیزی سے ممکن ہو کمک انہیں پہنچ جانی چاہیے۔" حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اسی دن امیرالمومنین رضی اللہ عنہ کے حکم کی تعمیل کی اور قعقاع کی سرکردگی میں چار ہزار تجربہ کار سواروں کی فوج فراہم ہوکر کوفہ سے حمص کی طرف چل پڑی۔

معاملہ اتنا خطرناک تھا کہ محض چار ہزار فوج لے کر قعقاع کا اس کے مقابلہ کے لیے چلے جانا کافی نہ تھا۔ کیونکہ جزیرے سے حمص آنے والوں کی تعداد تیس ہزار تھی اور وہ فوج اس کے علاوہ تھی جو ہرقل نے جہازوں کے ذریعے انطاکیہ بھیجی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ ان کے آدمی شام کے ہر شہر میں وہاں کے باشندوں سے نبٹ رہے ہیں۔ اگر وہ ان شہروں کو چھوڑ کر حمص چلے گئے تو سارے شام کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اس لیے انہوں نے قعقاع کو کوفہ سے روانگی کا حکم دینے کے بعد اور بھی احکام صادر کیے جو از اول تا آخر ان کے تدبر اور دور اندیشی کے آئینہ دار تھے۔ جزیرے سے حمص آنے والے قبائل نے یہ جرأت اس لیے کی ہے کہ وہ جانتے ہیں، ان کی بستیاں اسلامی حملوں کی زد سے باہر ہیں۔ پس اگر ان بستیوں پر حملہ کر دیا جائے تو یہ قبائل الٹے پاؤں واپس ہو جائیں گے اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور ان کی فوجوں پر جو دباؤ پڑ رہا ہے اس میں تخفیف ہو جائے گی۔ اس لیے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو چاہیے کہ سہیل بن عدی اور عبداللہ بن عتبان کو فوج دے کر جزیرے روانہ کر دیں کہ اہل جزیرہ ہی ہیں جنہوں نے رومیوں کو اہل حمص کے خلاف ابھارا ہے۔ سہیل کو رقہ بھیجنا چاہیے اور عبداللہ بن عتبان کو نصیبین اور جب یہ دونوں سردار رقہ اور نصیبین فتح کر لیں تو انہیں حران و رہاء بھیج دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ولید بن عقبہ کو الجزیرہ کے ان غیر مسلم عربوں کے مقابلے پر روانہ کرنا چاہیے جو قبائل بنی ربیعہ اور تنوخ میں سے ہیں اور عیاض بن غنم کو جزیرے کی جنگ کا سالار اعظم ہونا چاہیے۔ چنانچہ جب یہ سب کے سب سپہ سالار روانہ ہوئے تو اہل جزیرہ کو ہیت، قرقیسیا اور موصل والوں کا حشر یاد آگیا اور وہ مقابلہ نہ کر سکے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا انہوں نے اندازہ فرما لیا تھا کہ بار بار شکستیں کھانے کے بعد ہرقل نے جو یہ بحری رستے سے فوجیں بھیجی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے اپنی قوت پر اعتماد ہے اور وہ یقین رکھتا ہے کہ اس میں تنہا مسلمانوں کے مقابلے کی قدرت ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اسکندریہ سے جہازوں پر آنے والی فوجوں کا کماندار اس نے اپنے بیٹے قسطنطین کو بنایا ہے۔ اگر ہرقل اس معرکے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو سیاست فاروقی رضی اللہ عنہ

Marfat.com

بالکل ختم ہو کر رہ جائے گی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس احتمال کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے، اس سیاست کو ایک لمحے کے لیے بھی خطرے میں پڑتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ اس بنا پر ضروری تھا کہ اس ہلاکت آفریں صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جتنا بوجھ وہ اٹھا سکتے تھے، اٹھاتے، بلکہ بنفس نفیس اس کا مقابلہ کرتے۔ چنانچہ مدینہ اور اس کے اطراف سے جتنی فوجیں جمع ہو سکتی تھیں فراہم کیں اور انہیں لے کر دمشق کے رستے میدان جنگ کی طرف روانہ ہوئے۔

اس طرح نوزائیدہ سلطنت اپنے وجود کے تحفظ کے لیے ہر طرف سے حرکت میں آ گئی۔ قعقاع، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے برق رفتاری سے روانہ ہوئے۔ سہیل بن عدی، عبداللہ بن عتبان، ولید بن عقبہ اور عیاض بن غنم اہل جزیرہ کی گوشمالی کے لیے چلے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حمص کے ارادے سے مدینہ چھوڑا۔ یہ خبریں جزیرہ نمائے عرب کی طرح عراق و شام میں بھی پھیل گئیں اور جزیرے کے ان قبائل کے ساتھ جو محاصرے کے لیے آئے تھے، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو بھی ملیں۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو ان خبروں سے اطمینان ہو گیا، لیکن قبائل نے یقین کر لیا کہ جو حرکت انہوں نے کی ہے اس کے بعد مسلمان ان کی بستیوں کا کوئی لحاظ نہیں کریں گے اور ان کا بھی وہی حشر ہو گا جو اس سے پہلے موصل، ہیت اور قرقیسیا کا ہو چکا ہے۔ چنانچہ ان کے دل اکھڑ گئے اور انہوں نے جہاں سے آئے تھے وہیں واپس جانا بہتر سمجھا کہ شاید ان کی واپسی ہی ان کے قصور کی کچھ تلافی کر دے۔

ایک دن حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ جو سو کر اٹھے تو معلوم ہوا کہ جزیرے کے قبائل اپنے ملک واپس چلے گئے ہیں اور ان کے مقابلے پر اب صرف ہرقل کا لشکر رہ گیا ہے۔ انہوں نے اپنی فوج کے سرداروں کو بلا کر کہا کہ وہ رومیوں کے مقابلے کو میدان میں نکلنا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے اور کہا: ''اس سے پہلے کہ رومی اس نئی صورت حال کا کوئی انتظام کریں ان پر فوراً حملہ کر دینا چاہیے۔'' رومیوں نے جو یہ دیکھا کہ قبائل انہیں چھوڑ کر چلے گئے اور مسلمان ان سے لڑنے کے لیے حمص کے مورچوں سے نکل رہے ہیں تو سمجھے کہ ان کے خلاف سازش کی گئی ہے اور حیرت نے انہیں گھیر لیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے ان پر حملہ کر دیا اور رومیوں کی قوت حیرت سے اتنی مغلوب ہو گئی کہ اس حملے کو بھی نہ سہار سکی۔ حالانکہ اگر قبائل رومیوں کو چھوڑ کر نہ چلے جاتے تو ان میں واقعی اتنی طاقت تھی کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اندیشے اپنی جگہ بالکل درست تھے، لیکن ان کی حیرت نے ان کے مقابلے کی قوت

Marfat.com

اتنا کمزور کر دیا کہ انہیں شکست کھانی پڑی اور اس سے پہلے کہ قعقاع بن عمرو، حمص اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ شام کے رستے میں جابیہ ① پہنچیں وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ جابیہ پہنچے، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا قاصد ملا اور اس نے بیان کیا کہ قعقاع کے حمص پہنچنے سے تین دن پہلے ہی اللہ نے مسلمانوں کو رومیوں پر فتح یاب کر دیا۔ اور رائے معلوم کی کہ قعقاع اور ان کی فوج کو مال غنیمت میں سے حصہ دیا جائے یا نہ دیا جائے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مطمئن ہو گئے اور اس خبر کے بعد سفر جاری رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔ وہیں سے حضرت امین الامت رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ اہل کوفہ کو مال غنیمت کی تقسیم میں شریک کیا جائے کہ ان کی آمد کی خبر ہی نے دشمن کے دل پر رعب طاری کیا، جس کی وجہ سے اس نے شکست کھائی۔ اللہ کوفہ والوں کو جزائے خیر دے کہ اپنے علاقے کی حفاظت اور دوسرے شہر والوں کی اعانت کرتے ہیں۔'' اور اس کے بعد مدینے کی طرف کوچ فرما دیا۔

آپ کا کیا خیال ہے؟ ہرقل کی فوجیں یہاں سے قنسرین یا حماۃ یا ان شہروں میں گئیں جن میں فتنہ و بغاوت کے شعلے بھڑک رہے تھے کہ مسلمانوں سے لڑنے کے لیے اپنی صفیں درست کریں، یا مسلمانوں نے تعاقب کر کے ان کا صفایا کر دیا؟ اور یہ کہ حمص میں مسلمانوں کی فتح و نصرت کی خبر سن کر حلب، انطاکیہ اور دوسرے مضبوط و مستحکم قلعوں کے باغیوں نے کیا کیا؟ مؤرخین اس سلسلے میں کوئی ایسی بات نہیں لکھتے جو صحیح طور پر ہماری رہنمائی کر سکے۔ گمان غالب یہ ہے کہ روم کے جو ہزیمت خوردہ سپاہی موت کے منہ سے بچ سکے، وہ انطاکیہ کی طرف بھاگ گئے اور وہاں سے جہازوں میں بیٹھ بیٹھ کے سمندر کے رستے اسکندریہ یا بزنطیہ کی طرف چلے گئے۔ اس شکست کے بعد ان پر اور قیصر پر اتنی مایوسی چھا گئی کہ وہ پھر کبھی شام کا رخ نہ کر سکے۔ ادھر باغیوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ رومی فوجیں جہازوں میں بیٹھ کر فرار ہو گئی ہیں، تو ان کی بغاوت بھی اپنی موت آپ مر گئی۔ چنانچہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ قنسرین واپس ہو گئے اور شمالی شام کے ہر امیر نے اپنی اپنی امارت سنبھال لی۔ ان سب کا اطمینان تھا کہ حالات سکون پر آ گئے ہیں اور اب انہیں کوئی چیز پریشان کرنے والی نہیں۔

لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ قنسرین میں زیادہ دن نہ ٹھہر سکے۔ عراق سے جو فوجیں اہل جزیرہ کی گوشمالی کے لیے بھیجی گئی تھیں اور جن میں سہیل بن عدی، عبداللہ بن عتبان اور ولید بن

① ایک روایت میں، جسے ابن کثیر صحیح سمجھتے ہیں، بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سرغ کے مقام پر پہنچ گئے تھے۔

Marfat.com

عقبہ کے جھنڈے عیاض بن غنم کی کمان میں تھے جب ان قبائل کی بستیوں میں پہنچیں جنہوں نے ہرقل کا ساتھ دیا تھا تو یہ قبائل حمص سے واپس ہونے شروع ہو گئے تھے۔ سہیل بن عدی اپنے لشکر کو لے کر فراض کے راستے رقہ پہنچے۔ رقہ والے قلعہ بند ہو گئے اور جب سہیل نے ان کا محاصرہ کر لیا تو ایک دوسرے سے کہنے لگے: ''ہم اہل عراق اور شام کے بیچ میں ہیں۔ پھر ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے جو ہم ان کی یا ان کی جنگ میں شامل ہوں!'' انہوں نے واسط میں عیاض بن غنم کے پاس صلح کا پیغام بھیجا اور سہیل بن عدی نے عیاض کے حکم سے کہ وہی امیر لشکر تھے، ان سے صلح کر لی اور انہیں ذمیوں کے زمرے میں شامل کر لیا۔ عبداللہ بن عتبان دجلہ کے کنارے کنارے موصل پہنچے اور وہاں سے دریا عبور کر کے نصیبین کی طرف چلے نصیبین [1] والوں نے صلح کی درخواست کی اور جو شرائط اہل رقہ سے کی گئی تھیں، انہیں شرائط پر ان سے بھی صلح ہو گئی، ولید بن عقبہ اور بنو تغلب، جزیرے کے عربوں کی طرف بڑھے۔ ان لوگوں نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ لیکن بنوایا دارض روم کی طرف کوچ کر گئے۔ ولید نے اس کی اطلاع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مدینہ بھیجی اور ان لوگوں کے متعلق بارگاہ خلافت کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ اس کے بعد عیاض، سہیل اور عبداللہ بن عتبان کو اپنے ساتھ لے کر حران کی طرف روانہ ہوئے رستے میں جتنے مقامات پڑے ان پر قبضہ کرتے ہوئے حران پہنچے۔ وہاں کے باشندوں نے جزیے پر صلح کر لی اور ان کے ساتھ ذمیوں کا سا سلوک کیا گیا۔ بالکل یہی کچھ اہل رہاء نے کیا۔ جب سہیل بن عدی وہاں پہنچے۔ اور اس طرح سارے کا سارا جزیرہ مسلمانوں کے زیر نگیں آ گیا۔ اس ملک میں کوئی خاص دقت پیش نہ آئی، بلکہ یہ بہت آسانی سے فتح ہو گیا۔ اور اس کے فتح ہو جانے سے عراق اور شام میں مسلمانوں کا اقتدار ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو گیا۔

تعجب ہے کہ جو قبائل ہرقل کو خط لکھ لکھ کر اسے اپنی مدد کا یقین دلاتے ہیں وہ اتنی جلدی مسلمانوں کے مقابلے میں گھٹنے ٹیک دیتے ہیں، لیکن ان کی طرف سے یہ عذر پیش کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے رومیوں کو اپنے دشمن کے سامنے سے بھاگتے دیکھا اور انہیں یقین ہو گیا کہ یہ

---

[1] نصیبین وہی مقام ہے جو آج کل دیار بکر کہلاتا ہے۔ کوسان دی برسوال کا کہنا ہے کہ ہیت، قرقیسیا اور موصل ان لڑائیوں میں فتح ہوئے ہیں۔ لیکن تمام ثقہ مؤرخین کی روایت ہے کہ یہ شہر اس سے پہلے ہی فتح کیے جا چکے تھے اور یہی ہمارا بھی بیان ہے۔

Marfat.com

مسلمان ان کے لیے موت کا پیام بنا کر بھیجے گئے ہیں، اس لیے ان کا مقابلہ فضول ہے اور بہتری اسی میں ہے کہ ان سے مصالحت کر لی جائے۔ بزنطینی مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ رہاء کے حاکم نے عیاض سے اس شرط پر صلح کر لی تھی کہ اپنی حکومت کو مسلمانوں کے حملے سے بچانے کے لیے وہ ایک لاکھ دینار انہیں ادا کرے گا۔ ہرقل کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے حاکم رہاء کے اس اقدام کو تسلیم نہ کیا اور اسے اس کی خدمت سے معزول کر دیا، لیکن حاکم رہاء نے یہ دیکھ کر کہ ملک سے قیصر کا اقتدار ختم ہو چکا ہے اور اس کے تمام معاملات مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گئے ہیں، معزولی کے حکم کی تعمیل نہ کی اور وہ تعمیل کرتا بھی کیسے جب وہ اپنے مقصد اور مصالحت کے تحت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا دامن عطوفت چھوڑ ہی نہ سکتا تھا۔ اس لیے کہ اس قوت کے مقابلے میں جو اسے سہارا دے رہی تھی، قیصر کے انکار کی تائید کرنا اس کے امکان سے باہر تھا۔

جب ولید بن عقبہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ بنوایاد کے سوا، جو ترک وطن کر کے ارض روم میں چلے گئے ہیں، باقی تمام جزیرے کے عرب مسلمانوں کے ساتھ ہو گئے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہرقل کو ایک خط بھیجا جس میں لکھا: ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ عربوں کا ایک قبیلہ اپنا وطن چھوڑ کر تمہارے شہر میں چلا گیا ہے۔ واللہ! یا تو تم انہیں اپنے ملک سے نکال دو، ورنہ ہم عیسائیوں کو، جو ہمارے ملک میں آباد ہیں، تمہارے پاس دھکیل دیں گے!'' ہرقل کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات مان لینے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا اور اس نے بنوایاد کو اپنے علاقے سے نکال دیا۔ ان میں سے چار ہزار تو اپنی بستیوں میں واپس آ گئے جو مسلمانوں کے زیر اقتدار آ چکی تھیں اور باقی شام اور جزیرے کے درمیان بلاد روم میں منتشر ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہرقل کو یہ خط ایک تو اس لیے لکھا تھا کہ مسلمانوں سے شکست کھانے والے ان کے دشمن کی سرزمین میں پناہ لے کر کہیں اس قابل نہ ہو جائیں کہ دوبارہ مسلمانوں پر چڑھائی کر دیں اور دوسرے اس لیے کہ تمام عرب ایک جگہ اور ایک اقتدار کے سائے میں جمع ہو جائیں۔

بنوتغلب نے بنوایاد کی سی حرکت تو نہ کی اور وہ اپنا وطن چھوڑ کر سرزمین روم میں تو نہ گئے۔ لیکن جب ولید بن عقبہ نے انہیں مسلمان ہونے پر مجبور کیا تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ اس کا فیصلہ ہم امیر المومنین رضی اللہ عنہ پر چھوڑتے ہیں۔ ولید نے ان کے انکار کی اطلاع بارگاہ خلافت میں بھیجی جس کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بنوتغلب کو ان کی مرضی پر چھوڑ دیا اور ولید کو منع کر دیا کہ

انہیں مسلمان ہونے پر مجبور نہ کریں۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے لکھا: ''یہ قید صرف جزیرہ عرب کے لیے ہے کہ اس کے باشندوں کی طرف سے اسلام کے سوا اور کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی۔ اس لیے انہیں اس شرط پر چھوڑ دو کہ وہ کسی نومولود کو عیسائی نہیں بنائیں گے اور نہ کسی کو اسلام میں داخل ہونے سے روکیں گے۔''

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ حکم پہنچا تو ان میں سے بعض اللہ کے دین میں داخل ہونے پر رضا مند ہو گئے لیکن بعض نے عیسائیت پر ہی قائم رہنا چاہا۔ اس کے بعد یہ لوگ اس پر اڑے کہ ہم ذمی بنا کر جزیہ نہیں دیں گے اور ان کا وفد مدینہ گیا جس میں کچھ نومسلم بھی تھے۔ ان نومسلموں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کیا: ''انہیں خراج پر مجبور نہ کیجئے کہ وہ اس میں اپنی سبکی سمجھتے ہیں۔ ہاں! ان کے مال سے دگنا صدقہ لے لیا کیجئے وہی جزیہ ہو جائے گا۔ اس شرط کے بعد کہ جن نومولودوں کے والدین مسلمان ہو گئے ہیں انہیں عیسائی نہیں بنایا جائے گا، وہ جزیے کے نام سے چڑتے ہیں۔'' لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اصرار کیا کہ انہیں جزیہ دینا پڑے گا۔ اس پر انہوں نے کہا: ''بخدا! اگر آپ ہم پر جزیہ عائد فرمائیں گے تو ہم رومی علاقے میں نقل وطن کر لیں گے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر تم رومی علاقے کی طرف بھاگے تو میں تمہیں وہاں سے بلوا کر قید کر دوں گا۔'' انہوں نے کہا: ''تو پھر ہم سے کچھ لے لیا کیجئے، لیکن اسے جزیہ نہ کہیے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہم تو اسے جزیہ ہی کہیں گے، تم جو چاہے اس کا نام رکھ لو!'' حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ گفتگو اتنی شدت اختیار کر گئی ہے تو فرمایا: ''امیر المومنین! کیا سعد بن مالک رضی اللہ عنہ نے ان سے دوگنا صدقہ نہیں لیا تھا؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''ہاں!'' اور جزیے کے بجائے ان سے صدقہ لینے پر راضی ہو گئے۔

بنو تغلب کے عیسائیوں نے جزیہ نہ دینے پر اس لیے اصرار کیا تھا کہ وہ اپنی قوم میں عزت و وقار کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور جزیہ دینے کو ایک ایسی ذلت و پستی کی بات سمجھتے تھے جو نہ ان کے لائق تھی اور نہ اس عظمت و شان ہی سے میل کھاتی تھی جو اپنی قوم میں انہیں حاصل تھی۔ ان کی عظمت اور ان کی قوت یہی دو باتیں تھیں جن کی بنا پر ولید بن عقبہ چاہتے تھے کہ وہ اسلام میں آئیں اور مسلمان ان کی قوت و طاقت سے فائدہ اٹھائیں۔ جزیے کے معاملے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ان کے ساتھ شدت سے پیش آنا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کے مشورے سے

Marfat.com

ان کا دو گنا صدقہ قبول کر لینا، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی ایک ایسی سیاست ہے جو مرتدین کے سلسلے میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور ایران و روم جیسے دو قوی ترین دشمنوں کے مقابلے میں خود ان کے لیے اپنے مؤقف سے مختلف ہونے کے باوجود تعریف و تحسین کی مستحق ہے۔ بنو تغلب عرب تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ عرب کی عزت کے شدید خواہش مند۔ اگر ان میں سے کچھ لوگ عیسائیت پر قائم بھی رہتے تو کیا ہوا۔ کچھ دن کے بعد ہی سہی، وہ سب کے سب اسلام کی طرف آئیں گے، اس مرحلے پر ان کے ساتھ نرمی سے پیش آنا انتہائی درجے کی بالغ نظری تھی۔ زمانے نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حسن و فراست اور دور اندیشی کی تائید کر دی جب اس کے بعد بنو تغلب نے مسلمانوں کی قابل قدر مدد کی اور بہت سے موقعوں پر دشمنوں کے خلاف ان کا ساتھ دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان عیسائیوں سے صرف صدقہ ہی قبول کر لینے پر اکتفا نہ کیا بلکہ دیکھا کہ ان کے اور ولید بن عقبہ کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے۔ اور محسوس فرمایا کہ بہت ممکن ہے کہ ولید کو تنگ کریں اور ولید ضبط و تحمل کا دامن چھوڑ کر ان کے ساتھ زیادتی کر بیٹھیں، تو ولید کو معزول کر کے ان کی جگہ فرات بن حیان کو مقرر کر دیا تا کہ ان کے علاقوں میں امن و سکون بحال رہے۔

یہ سب کچھ سنہ 17ھ میں مکمل ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ شام میں جنوب کے اس سرے سے لے کر شمال کے اس سرے تک مسلمانوں کے اقتدار نے استحکام حاصل کر لیا، واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد سیرت فاروقی رضی اللہ عنہ کے خاتمے تک شام میں نہ کسی بغاوت کا نشان ملتا ہے نہ ہرقل کی طرف سے اسے واپس لینے کی کسی کوشش کا۔ البتہ قیساریہ کے متعلق کچھ روایتیں ہیں۔ اس سے پہلے ہم قیساریہ کے اس محاصرے کا ذکر کر چکے ہیں، جو بیت المقدس کی فتح سے کچھ پہلے حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے کیا تھا اور جس کی فتح کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ اس معرکے میں رومیوں کے اسی ہزار آدمی مارے گئے اور یہ تعداد ہزیمت و فرار کے بعد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ لیکن علامہ بلاذری اس شہر کے متعلق اختلاف روایات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: کہنے والوں میں سے کچھ یہ کہتے ہیں کہ اسے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فتح کیا اور کچھ یہ کہتے ہیں کہ اسے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد عیاض بن غنم نے فتح کیا جو اس وقت ان کے قائم مقام تھے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اسے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فتح کیا...... لیکن بات یہی ہے جس پر علماء کا اتفاق ہے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس کا محاصرہ کیا۔ وہ جمادی الاولیٰ سنہ 13ھ میں اس پر خیمہ زن ہوئے۔ اس طرح کہ جب تک وہاں ٹھہر سکتے،

ٹھہرتے اور جب مسلمانوں کو کہیں دشمن کے مقابلے میں جمع ہونے کی ضرورت پیش آتی فوراً ان سے جا ملتے۔ چنانچہ وہ اسی دوران میں اجنادین، فحل، دمشق اور یرموک کے معرکوں میں شریک ہوئے۔ پھر فلسطین کی طرف واپس ہوئے اور فتح ایلیا کے بعد قیساریہ کا محاصرہ کیا اور قیساریہ سے مصر گئے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے بعد یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ والی ہوئے اور اپنے بھائی معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کے محاصرے پر مامور کر کے دمشق آئے۔ یہاں طاعون میں مبتلا ہوئے اور اسی میں وفات پا گئے۔'' ان تمام روایات کی تلخیص یوں کی جا سکتی ہے کہ قیساریہ کا محاصرہ کیا گیا اور اس نے اتنا طول پکڑا کہ بعض روایات میں اس کی مدت سات برس بیان کی جاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قیساریہ ایک مستحکم سرحدی قلعہ تھا جس کی برجیاں اور فصیلیں نہایت مضبوط تھیں اور یہاں شہریوں اور فوجیوں کی اتنی کثیر آبادی تھی کہ انطاکیہ اور دمشق میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ علامہ بلاذری لکھتے ہیں: ''روزانہ رات کو ایک لاکھ فوج اس کی فصیل پر پہرہ دیتی تھی۔ اس کی فتح کا سبب یہ ہوا کہ ایک یہودی ایک رات کو مسلمانوں کے پاس آیا اور انہیں ایک بدرو دکھائی جس میں کمر کمر پانی تھا۔ مسلمان رات گئے اس بدرو میں داخل ہوئے اور وہیں سے انہوں نے تکبیریں کہنی شروع کیں۔ رومیوں نے اسی بدرو کے ذریعے بھاگنا چاہا مگر جب وہاں پہنچے تو مسلمانوں کو موجود پایا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اسے سنہ 17ھ میں فتح کیا تھا۔ لیکن بعد کو اس کے باشندوں نے بغاوت کر دی اور رومیوں نے انہیں سہارا دیا۔ چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے دوبارہ فتح کیا اور اس کی حفاظت کے لیے ایک چھاؤنی قائم کر دی۔ یہاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سات لاکھ تنخواہ دار فوج پائی۔ سامرہ کے تیس ہزار یہودیوں کے دو لاکھ آدمی تھے اور تین سو بازار تھے جن میں تجارت کی گہما گہمی تھی۔

پہلے ہم کہہ آئے ہیں کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ قنسرین میں زیادہ دن نہ ٹھہرے۔ حمص سے اپنی امارت پر واپس آنے کے بعد جو لڑائیاں انہوں نے لڑیں ان کی تفصیل معتبر کتابوں میں اس سے زیادہ نہیں ملتی کہ وہ عیاض بن غنم کے ساتھ رومیوں کے علاقے میں گئے اور وہاں سے بے شمار مال غنیمت لے کر واپس ہوئے۔ میرے خیال میں بات یہ ہے کہ شمالی شام میں مسلمانوں کی حکومت کے خلاف جو بغاوت ہوئی اور اس کے سلسلے میں جہازوں پر رومی فوجوں کے انطاکیہ پہنچنے کے بعد جو صورت حال پیش آئی وہ حمص میں رومیوں کے شکست کھاتے ہی ختم نہ ہوئی۔ چنانچہ مؤرخین نے بھی لکھا ہے کہ حلب، حماۃ اور انطاکیہ وغیرہ کے قبائل نے بغاوت کر دی اور

Marfat.com

حضرت خالد رضی اللہ عنہ، عیاض بن غنم اور مسلمانوں کے دوسرے سپہ سالاروں کو اس کا استیصال کرنا پڑا۔ واقدی نے لکھا ہے کہ حلب نے شدید مقابلہ کیا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ طویل محاصرے کے بعد اسے فتح کر سکے۔ جب شمالی شام کی بغاوت فرو ہو گئی تو مسلمان وہاں سے آرمینیا پہنچے جس طرح اس سے پہلے وہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مرعش اور شمشاط وغیرہ پر حملوں کے بعد آگے بڑھ گئے تھے۔ اس کے بعد پہلے کی طرح وہ شام واپس آ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جوں ہی عیاض بن غنم جزیرے کی مہم سے فارغ ہوئے، مسلمانوں کی سرحدوں کو مستحکم کرنے اور دشمنوں کے دل میں رعب بٹھانے کے لیے آرمینیا کی طرف بڑھے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بھی ادھر ہی کا رخ کیا۔ یہاں تک کہ آمد اور رہا پہنچ گئے۔ وہ جدھر سے گزرتے شہر فتح کرتے، مال غنیمت سمیٹتے اور دلوں پر رعب بٹھاتے۔ ① اس کے بعد جب وہ قنسرین واپس آئے تو ان کے پاس بہت سا مال غنیمت جمع ہو گیا تھا۔ اس لیے اِدھر اُدھر سے لوگ انعام کے لالچ میں ان کے پاس پہنچے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے انہیں مایوس نہ ہونے دیا۔ ان لوگوں میں اشعث بن قیس بھی تھا جسے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دس ہزار درہم انعام میں دیے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے قلقیہ اور آرمینیا میں جس قائدانہ مہارت کا ثبوت دیا تھا لوگوں نے اس پر حیرت کا اظہار کیا۔ ان کے عراق و شام کے معجزنما کارناموں کو سراہا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ان انعامات کا چرچا عام ہو گیا، جو انہوں نے شاعروں اور سورماؤں کو دیے تھے۔ خاص طور پر اشعث بن قیس کے انعام کی بڑی شہرت ہوئی اور اسے بنو غسان اور حیرہ کے بادشاہوں کی فیاضیوں کی نظیر ٹھہرایا گیا۔ لوگوں کی اس فریفتگی اور اشعث کے اس انعام کی خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں پہنچی، جس طرح اپنے عمال کی تمام خبریں انہیں پہنچتی رہتی تھیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے اس فعل کو اچھا نہ جانا اور آپ نے فرمایا: ''بخدا! میں خدا کے سامنے سچا نہیں ہوں گا اگر جس حکم کا مشورہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیتا تھا اسے خود نافذ نہ کروں۔ واللہ! خالد رضی اللہ عنہ میری طرف سے ہرگز کسی صوبے کے والی نہیں ہوں گے۔'' اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو بلا کر ان کے عمامے سے ان کی مشکیں کسوا دو اور ان کی ٹوپی

① بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ ان معرکوں میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ، عیاض بن غنم کے ماتحت تھے، لیکن دوسرے مؤرخین کا بیان ہے کہ وہ آزادانہ پیش قدمی کر رہے تھے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کے ماتحت نہیں رہے۔

اتار کر پوچھو کہ "اشعث بن قیس کو انعام انہوں نے اپنے پاس سے دیا ہے یا جہاد کی غنیمت سے؟ اگر جہاد کی غنیمت سے دیا ہے تو خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں اور اپنے پاس سے دیا ہے تو فضول خرچی کی ہے۔" اور انہیں حکم دیا کہ دونوں صورتوں میں انہیں معزول کر کے ان کے علاقے کو اپنی ولایت میں شامل کر لیں۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو یہ خط ملا تو حیران رہ گئے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لیے ان کے، فوج کے اور تمام مسلمانوں کے دل میں بڑی عزت تھی۔ لیکن امیر المومنین رضی اللہ عنہ واجب الاطاعت ہیں اور ان کے حکم کی تعمیل فرض۔ اس لیے انہوں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو بلا کر اس حکم کی تعمیل امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے قاصد اور موذن رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر چھوڑ دینی چاہیے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو لکھا اور جب وہ آئے تو ان سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خط کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ لوگوں کو جمع کر کے خود منبر پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ کا بھیجا ہوا قاصد کھڑا ہوا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے پوچھا: "تم نے دس ہزار درہم اپنے پاس سے دیئے تھے یا جہاد کی غنیمت سے؟ حضرت خالد رضی اللہ عنہ یہ سن کر مبہوت ہو گئے اور انہوں نے کوئی جواب نہ دیا، قاصد نے اپنا سوال دہرایا، لیکن حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ہونٹوں کو جنبش نہ ہوئی۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ منبر پر خاموش بیٹھے تھے، انہوں نے اپنی زبان سے کچھ نہ کہا۔ جب قاصد کے سوال اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی خاموشی کا سلسلہ ختم ہوا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ اٹھے اور فرمایا: "امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا حکم ہے کہ تمہارے عمامے سے تمہاری مشکیں کسی جائیں اور تمہارے سر سے ٹوپی اتار لی جائے، یہاں تک کہ تم اس بات کا جواب دو، جو اس وقت تم سے پوچھی جا رہی ہے۔" یہ سن کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی حیرت اور بڑھ گئی لیکن قفل سکوت نہ ٹوٹا۔ اس وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے ان کی ٹوپی اتار لی اور ان کے ہاتھوں کو ان کی پیٹھ کی طرف لے جا کر عمامے سے باندھ دیئے۔ اس کے بعد پوچھا: "کیا کہتے ہو؟ انعام اپنے پاس سے دیا یا جہاد کی غنیمت سے؟"

تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بلا تاخیر جواب دیا: "اپنے پاس سے! مسلمان حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ جواب سن کر مارے خوشی کے چلا اٹھے۔ ان میں سے اکثر نے یہ سمجھ لیا کہ اب سارا جھگڑا ختم ہو گیا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ پہلے کی طرح قنسرین کی امارت پر واپس چلے جائیں گے جس کے بعد زمانہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے کارنامے اس واقعے کو لوگوں کے ذہن سے فراموش کر دیں گے۔ یہ دیکھ کر انہیں ابھی اطمینان ہو گیا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جیسے ہی حضرت خالد

Marfat.com

رضی اللہ عنہ کا جواب سنا اِن کی مشکیں کھول دیں اور انہیں ٹوپی پہنادی۔ اس کے بعد اپنے ہاتھ سے ان کا عمامہ باندھا اور فرمایا: "ہم اپنے حاکموں کا حکم سنتے اور ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ اپنے آقاؤں کی خدمت اور تعظیم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔"

اللہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ دونوں پر اپنی رحمت کے پھول برسائے وہ تقدیر کی غیر معمولی قوتوں میں سے دو قوتیں تھے، جب تک یہ قوتیں پوشیدہ رہیں جزیرہ نمائے عرب ان کے لیے کشادہ ہو گیا، لیکن جب وہ کھلیں اور پھیلیں تو ان کے پھیلاؤ سے ایران و روم کی سلطنتیں تنگ ہو گئیں۔ اس کے بعد یہ دونوں قوتیں ٹکرائیں اور ضروری ہو گیا کہ ان میں سے ایک قوت سمٹ کر دوسری قوت کو پوری طرح پھیلنے کا رستہ دے دے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے سمٹنے والی قوت بننا منظور کر لیا کہ تصادم کہیں دونوں ہی قوتوں کو فنا نہ کر دے اور یہ اللہ کا فضل و کرم تھا کہ ان کے سمٹاؤ کی گھڑی اس وقت آئی، جب مسلمان شام میں اپنے برپا کیے ہوئے اقتدار، اپنے قائم کیے عدل اور اپنی مستحکم کی ہوئی سیاست کی طرف سے مطمئن ہو چکے تھے۔

کیا مسلمانوں نے شام کو بھی اسی طرح اپنا مستقر بنا لیا، جس طرح عراق کو بنایا تھا اور کوفہ اور بصرہ کی طرح چند شہر اپنے قیام کے لیے مخصوص کر کے ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئے؟ نہیں بلکہ انہوں نے دمشق اور حمص جیسے شام کے بڑے بڑے شہروں میں اقامت اختیار کی اور ان قبائل کو جو اسلام لے آئے تھے اور ان شہروں کے قریب کھلے میدانوں میں رہتے تھے، اپنے ساتھ رہنے پر ابھارا اور ان شہروں سے آگے قدم نہ بڑھایا۔ یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ شام میں گھنے باغ تھے، سرسبز و شاداب وادیاں تھیں، جن میں حد نظر تک کھیت ہی کھیت لہلہاتے تھے۔ بلند و بالا پہاڑ تھے۔ جنہیں برف نے نکھرا ہوا سفید لباس پہنا رکھا تھا۔ انجیر و زیتون کے لدے پھندے درخت اور انگور کی جاں نواز بیلیں تھیں۔ اچھلتا کودتا پانی جب بلندیوں سے وسیع و ہموار میدانوں کی طرف اترتا تھا تو روح پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ پھر یہ کیا بات تھی کہ شام نے مسلمانوں کا دل اپنی طرف اتنا نہیں کھینچا تھا جتنا عراق نے کھینچا تھا؟ اس میں راز یہ ہے کہ عراق ریگستان اور کھجور کے درختوں کا علاقہ تھا جس کی طرف کھجوروں اور ریگستانوں سے دلچسپی رکھنے والی طبیعتیں لپکتی تھیں اور انسان اسی چیز کی طرف زیادہ میلان رکھتا ہے۔ جس سے مانوس ہو اور جس میں وہ اپنے لیے راحت و اطمینان محسوس کرے۔ اس کے علاوہ اہل عراق نے بہت جلد اسلام قبول کر لیا تھا جس کی وجہ سے ان کے اور اہل جزیرۃ العرب کے درمیان

Marfat.com

رشتے استوار ہو گئے تھے۔اس کے برعکس شام کے اکثر و بیشتر عیسائی اول اول اپنے مذہب سے چمٹے رہے اور انہوں نے ترک مذہب پر ادائے جزیہ کو ترجیح دی، چنانچہ مذہبی اختلاف ان کے اور عرب فاتحین کے درمیان ایک پردہ بنا رہا۔لیکن ان دونوں حصوں عراق اور شام...... میں حکومت کی سیاست میں کوئی فرق نہ تھا، بلکہ وہ دونوں جگہ ذمیوں کی حمایت اور قومی و مذہبی اختلاف کے باوجود ان میں مساوات قائم کرنے کی بنیاد پر استوار کی گئی تھیں، اس کی رو سے تمام مسلمان ان فرائض کی بجا آوری میں ایک دوسرے کے برابر تھے جو نئے دین نے ان پر عائد کیے تھے۔وہ اللہ کا حق ادا کرتے تھے اور انہوں نے اپنی زندگی اطمینان وخوش دلی سے اللہ کے لیے وقف کر دی تھی۔

شام اور عراق میں مسلمانوں کے جماؤ نے عربی قومیت کے اتحاد کی راہ ہموار کر دی تو کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے وقت آ گیا تھا کہ وہ نوزائیدہ سلطنت کو اتحاد کی لڑی میں پرو کر اس کی قوت میں اور اضافہ کر دیں؟ یہ ان کی سب سے بڑی تمنا تھی، بلکہ یہ ان کا عزم صمیم تھا۔لیکن قضا و قدر کے حکم کے سامنے کوئی عزم نہیں ٹھہرتا اور قضا و قدر یہ ارادہ کر چکے تھے کہ سلطنت اور پھیلے، اس کی حدود اور وسیع ہوں۔آگے چل کر ہم یہی دیکھیں گے کہ قضا و قدر کے اس حکم میں کیا حکمت پوشیدہ تھی۔

Marfat.com

باب:14

قحط اور طاعون

مدینہ اور جزیرہ نمائے عرب کے مختلف گوشوں میں مسلمان اس فتح و نصرت کی خبروں سے مسرت اندوز ہو رہے تھے جو عراق و شام میں ان کی فوجوں سے پیمان وفا باندھ چکی تھی۔ مال غنیمت کا خمس بارگاہِ خلافت میں پہنچتا اور خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ اسے مسلمانوں میں تقسیم فرما دیتے جس سے ان کی زندگی میں آسودگی اور ان کی بدویانہ تنگی و خشکی میں تمدنی، فراخی اور تازگی سر سرانے لگی۔ وظیفوں اور روزینوں کے اس سلسلے نے ان میں اتنی سکت پیدا کر دی کہ وہ یمن اور شام کی تجارتی اشیاء میں سے من بھاتی چیزیں خرید سکیں اور جہازوں کے ذریعے مصر سے آنے والی نعمتوں کا ذخیرہ فراہم کر سکیں جو اس سے پہلے انہیں کبھی نصیب نہ ہوئی تھیں۔ اس فراخ دستی و فارغ البالی نے انہیں زندگی سے زیادہ قریب کر دیا۔ شوق جہاد ان کے دلوں میں تیز ہو گیا اور وہ اس دین قیم سے چمٹ گئے جس نے دنیا اور آخرت کی نعمتیں ان پر عام کر دی تھیں۔

عیش و فراغت کی یہی زندگی بسر کر رہے تھے کہ تقدیر نے انہیں دو انتہائی ہولناک مصیبتوں سے دوچار کر دیا جو سنہ 17ھ کے اواخر سے شروع ہو کر اس کے بعد آنے والے سال کے خاتمے تک مسلط رہیں۔ ان میں سے ایک مصیبت تو ان پر ان کے وطن جزیرہ نمائے عرب میں نازل ہوئی اور دوسری ان کے بھائیوں پر شام کے میدان جہاد میں۔ پہلی مصیبت وہ قحط تھا جس نے ملک عرب کو جنوب کے آخری کناروں سے لے کر شمال کی انتہائی سرحدوں تک گھیر لیا تھا، یہ مسلسل نو مہینے تک جاری رہا جس میں کھیتیاں تباہ اور مویشی ہلاک ہو گئے اور انسانوں کو حد درجہ تکلیف و عذاب کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری طرف عمواس کا طاعون تھا جو شام سے عراق تک پھیل گیا تھا۔ اس میں ہزاروں ممتاز مسلمان مرد اور عورتیں، فوجی اور شہری موت و ہلاکت کی لپیٹ میں آ گئے، یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے تمام مسلمانوں کے دل میں ایک دہشت سی بیٹھ گئی۔

قحط کا سبب یہ ہوا کہ جزیرہ نمائے عرب میں پورے نو مہینے تک مینہ کے نام پر ایک بوند نہ پڑی۔ ادھر آتش فشاں پہاڑ پھٹنے لگے جس نے زمین کی سطح اور اس کی ساری روئید گی جل گئی اور وہ سیاہ مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ جب ہوا چلتی ساری فضا گرد آلود ہو جاتی اس لیے لوگوں میں اس برس کا نام ہی ''عام الرمادہ'' (خاک والا برس) پڑ گیا۔ بارش کے نہ ہونے، آندھیوں کے چلنے اور کھیتوں کے جل جانے سے قحط کی صورت پیدا ہو گئی جس نے انسانوں اور جانوروں کو ہلاک کرنا شروع کر دیا، چنانچہ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ فنا ہو گئے اور جو بچ رہے انہیں سوکھ لگ گیا۔ یہاں تک کہ ایک شخص بھیڑ کو ذبح کرتا اور اس کی بدہیئتی دیکھ کر بھوک اور مصیبت کے باوجود چھوڑ کے کھڑا ہو جاتا۔ بازار سارے سونے پڑے تھے اور ان میں خرید و فروخت کے لیے کچھ نہ تھا۔ لوگوں کے ہاتھ میں روپے تھے مگر ان کی کوئی قیمت نہ تھی؛ اس لیے کہ بدلے میں کوئی ایسی چیز نہ ملتی تھی جس سے وہ پیٹ کی آگ بجھا سکتے۔ مصیبت طویل اور ابتلا شدید ہو گئی۔ لوگ جنگلی چوہوں کے بل کھودنے لگے کہ جو اس میں سے ملے نکال کے کھا لیں۔

قحط کی ابتداء میں مدینہ والوں کی حالت دوسروں سے بہتر تھی۔ جس کا سبب یہ تھا کہ مدینہ میں شہریت کا شعور پیدا ہو چکا تھا اور مدینہ والوں نے آسودگی کے زمانے میں ضروریات زندگی کا ذخیرہ فراہم کر لیا تھا، جو متمدن لوگوں کی عادت ہے۔ چنانچہ جب قحط کا آغاز ہوا تو وہ اس ذخیرے کے سہارے زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن بدویوں کے پاس کوئی اندوختہ نہ تھا، اس لیے وہ شروع ہی میں بھوکے مرنے لگے اور دوڑ دوڑ کے مدینہ پہنچے کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے فریاد کر کے اپنے اہل و عیال کی زندگی کے لیے روٹی کا ٹکڑا مانگیں۔ ہوتے ہوتے ان پناہ گیروں کی آتی کثرت ہو گئی کہ مدینے میں تل رکھنے کو جگہ نہ رہی۔ اب مدینہ والے بھی ابتلا میں پڑ گئے اور بدویوں کی طرح بھوک اور قحط نے ان پر بھی وار کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود کیا کریں اور ان بھوکوں کا پیٹ کس طرح بھریں؟ بیت المال ان کے ہاتھ میں تھا اور ان کے عراق و شام کے عمال بس اتنا ہی سامان غذا بھیج سکتے تھے جو قحط سے پہلے کی عام معیشتی زندگی کو سنبھال سکتا۔ پھر اگر وہ چاہتے تو بجا طور پر عذر کر سکتے تھے کہ خلافت کی اہم ذمہ داریاں انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ وہ مزید ذمہ داری قبول کر کے جان پر ستم جھیلیں اور اسے تمام مسلمانوں کی نگرانی و سرپرستی کے بوجھ تلے دبا دیں۔ لیکن اس موقع پر جو طرز عمل انہوں نے اختیار فرمایا وہ ایک ایسی روشن مثال ہے، جس

Marfat.com

واقف ہونا اور جس کی تقلید کرنا ہر اس شخص کا فرض ہے جس کے ہاتھ میں قوم کی باگ ڈور ہو۔
قحط کی شدت کے زمانے میں ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گھی میں چوری ہوئی روٹی آئی۔ آپ نے ایک بدوی سے شریک طعام ہونے کے لیے فرمایا۔ جس طرف گھی تھا وہ بدوی اس طرف سے بڑے بڑے لقمے مارنے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "معلوم ہوتا ہے تم نے کبھی گھی نہیں کھایا!" بدوی نے جواب دیا: "ہاں! میں نے فلاں فلاں دن سے آج تک گھی یا تیل نہیں کھایا اور نہ کسی کو کھاتے دیکھا۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس وقت قسم کھائی کہ جب تک لوگ قحط میں مبتلا ہیں وہ گوشت اور گھی کو ہاتھ نہ لگائیں گے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنی اس قسم کو پورا کیا، یہاں تک کہ اللہ کے حکم سے مینہ برسا اور لوگوں پر مینہ کی قحط کی مصیبت ٹل گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اس عہد پر اتنی شدت سے قائم تھے کہ ایک دفعہ بازار میں گھی اور دودھ بکتا ہوا آ گیا اور آپ کے غلام نے چالیس درہم میں خرید لیا۔ وہ یہ دونوں چیزیں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا۔ "اللہ نے آپ کی قسم پوری کی۔ بازار میں گھی اور دودھ آ کر بکنے لگا اور میں چالیس درہم میں خرید لایا۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "تم نے بہت مہنگا خریدا ہے انہیں خیرات کر دو! میں فضول خرچی کا روادار نہیں۔" پھر تھوڑی دیر کے لیے سر جھکایا اور اس کے بعد فرمایا "مجھے لوگوں کی تکلیف کا احساس کیونکر ہو سکتا ہے جب تک میں خود ان کی مصیبت میں شریک نہ ہوں!"

یہ حکمت و دانائی بجائے خود عظیم و جلیل ہے۔ لیکن اس کی عظمت و جلالت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب اس کا صدور ایک ایسی ذات سے ہوتا ہے جس میں ان دنوں کسریٰ اور قیصر دونوں کے ملک جمع ہو گئے تھے...... وہ ملک جن کی فرمانروائی مسلمانوں کے لیے صرف ایران و روم ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے مقابلے میں فکر و امتیاز کا نشان تھی۔ عراق و شام اور ان کی راحتیں اور آسائشیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے تھیں اور ایران کی جو راحت، شام کی جو آسائش فاروق اعظم رضی اللہ عنہ چاہتے اپنے لیے مخصوص کر سکتے تھے۔ لیکن وہ راحت و آسائش کو دنیوی چیز اور آرام و تن آسانی کو سرمایہ گمراہی سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے آخرت کی بھلائی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انہیں ٹھکرا دیا۔ وہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ تھے لیکن پھر بھی ان کا یہ خیال تھا کہ وہ عوام کی تکلیف کا اندازہ نہیں کر سکتے تاوقتیکہ ان کی اکثریت کی طرح غربت و ناداری کے مصائب جھیل کر جلد سے جلد اس ابتلاء کو دور کرنے کی کوشش نہ کریں۔" عام الرمادہ" میں لوگوں نے انہیں دیکھا کہ ان کا رنگ سیاہ پڑ گیا ہے حالانکہ وہ سرخ و سپید تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ گھی، دودھ اور

Marfat.com

گوشت ان کی غذا تھی، لیکن جب لوگ قحط میں مبتلا ہوئے تو انہوں نے یہ تمام چیزیں اپنے اوپر حرام کرلیں اور صرف روغن زیتون سے روٹی کھانے لگے۔ انہوں نے کثرت سے فاقے کرنے شروع کردیے۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے ان کی یہ حالت دیکھی تھی وہ کہتے تھے۔ "اگر اللہ عام الرمادہ کا قحط دور نہ فرماتا تو ہمارا خیال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے غم میں جان دے دیتے۔" اور حقیقت بھی یہی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کا بڑا غم کھایا اور ان کے لیے اپنی تمام کوششیں صرف کردیں انہوں نے جزیرہ نمائے عرب کے باشندوں کی مدد کے لیے عراق و شام کے عمال کو خطوط لکھے۔ ان خطوط کے الفاظ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل سے نکلے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ادائے فرض کے لیے حد درجہ بے چین ہیں اور انہیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ رعایا کے ایک ایک فرد کے لیے وہ خدا اور ضمیر کے سامنے جواب دہ ہیں، انہوں نے فلسطین میں عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو لکھا۔ "سلام علیک...... اما بعد! کیا تم مجھے اور میرے پاس والوں کو ہلاک ہوتے دیکھو گے اور تمہارے پاس والے زندہ رہیں گے۔"

"مدد! مدد! مدد!!!" اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ "اما بعد! اطمینان رکھیے، میں ایک ایسا قافلہ بھیج رہا ہوں جس کا پہلا سرا آپ کے پاس ہوگا اور آخری سرا میرے پاس!"

اسی قسم کے خط حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو شام بھیجے اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو عراق اور ان سب نے بھی حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا سا جواب دیا۔ امرائے سلطنت میں حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اپیل پر لبیک کہنے اور جزیرہ نمائے عرب کے باشندوں کی مدد کو پہنچنے میں پہل کی اور سب سے پہلے سامان غذا سے لدے ہوئے چار ہزار اونٹ لے کر مدینہ پہنچے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے اردگرد پڑے ہوئے قحط زدوں میں غذا تقسیم کرنے کا کام انہی کے سپرد فرمایا اور جب وہ اس کام سے فارغ ہوگئے تو حکم دیا کہ چار ہزار درہم انہیں دے دیے جائیں۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "امیر المومنین! مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اللہ اور اس کے انعام کی خاطر کیا ہے۔ مجھے دنیوی غرض کی طرف نہ کھینچیے!" لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا "یہ لے لو۔ جب تم نے اسے طلب نہیں کیا تو اس میں کوئی حرج نہیں! مجھے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک دفعہ ایسا ہی واقعہ پیش آچکا ہے جو کچھ تم نے مجھ سے کہا یہی میں نے بھی خدمت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ پر بخشش فرمائی۔" یہ سن کر

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے وہ رقم لے لی اور اپنی ولایت کی طرف روانہ ہو گئے۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فلسطین سے اونٹ اور ایلہ ① کی بندرگاہ سے جہازوں پر سامان غذا بھیجا آٹے اور گھی سے بھرے ہوئے بیس جہاز سمندر کے رستے چلے اور آٹے سے لدے ہوئے ایک ہزار اونٹ خشکی کے رستے روانہ ہوئے۔ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے شام سے تین ہزار اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار اونٹ بھیجے اور ان سب پر صرف آٹا لدا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے پانچ ہزار کمبل اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے تین ہزار چغے ارسال کیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مملکت کے مختلف شہروں اور صحرائی علاقے میں کھانے پینے کا سامان تقسیم کرنے کے لیے آدمی مقرر کیے اور مدینہ والوں کی، جن میں اِدھر اُدھر کے آئے ہوئے عرب بھی شامل تھے، خبر گیری خود اپنے ذمہ لی۔ ان کے کارندے لوگوں پر سے مصیبت کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے جزیرہ نمائے عرب کے مختلف گوشوں میں روانہ ہو گئے۔ تقسیم کرنے والوں کو عراق کے دہانوں کے قریب کھانے پینے کا وہ سامان ملا، جو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بھیجا تھا۔ اور انہوں نے لوگوں کے لیے اونٹ ذبح کرنے شروع کر دیئے، انہیں روٹیاں کھلائیں اور کپڑے پہنائے یہاں تک کہ اللہ نے ابتلا دور کر دی۔ یہی کچھ ان کارندوں نے مکہ اور مدینہ کے درمیانی علاقوں میں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس کارندے کو شام کے قافلے کی طرف بھیجا تھا۔ اس سے فرمایا: ”جونہی تمہیں غذائی قافلہ ملے اسے اہل صحرا کی طرف لے جانا۔ سامان کے تھیلوں کے لحاف بنا کر انہیں اڑھانا اور اونٹ ان کے لیے ذبح کر دینا کہ وہ ان کا گوشت کھائیں اور چربی رکھ لیں۔ اس بات کا انتظار نہ کرنا کہ وہ کہیں ہم اس کے سہارے بارش کا انتظار کریں گے۔ آٹا وہ ذخیرے کے طور پر رکھیں گے یہاں تک کہ اللہ ان کی مصیبت کو راحت سے بدل دے۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل مدینہ اور ان کے پاس جمع ہونے والوں کے کھانے پینے کا انتظام اپنے ذمے لیا۔ وہ روٹی کو روغن زیتون میں بھگو کر ثرید بناتے تھے۔ اور ایک دن بیچ جانور ذبح کر کے ان کا گوشت ثرید پر رکھ دیتے تھے اور جو غذا عوام کھاتے تھے ان کے ساتھ خود بھی وہی تناول فرماتے تھے۔ پھر جب عراق و شام سے اونٹ آ گئے تو روزانہ اپنے دستر خوان کے لیے بیس

① ایلہ وہ مقام ہے جو آج کل عقبہ کہلاتا ہے۔

جانور ذبح کراتے تھے اور لوگوں کو کھلاتے تھے۔ انہوں نے چند نگران مقرر کیے تھے جو شام کو ان کی خدمت میں جمع ہو کر دن بھر کی رپورٹ دیتے تھے۔ ایک دن رات کو، جب لوگ کھانا کھا چکے، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے دستر خوان خلافت پر شریک طعام ہونے والوں کے شمار کا حکم دیا تو سات ہزار آدمی گنتی میں آئے۔ مریضوں، بچوں اور ان اہل وعیال کا، جو نہیں آئے، شمار کیا گیا، تو وہ چالیس ہزار نکلے۔ کچھ دن کے بعد ان دونوں گروہوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا چنانچہ جو لوگ فاروقی دستر خوان پر آ کر کھاتے تھے ان کی تعداد دس ہزار تھی اور دوسروں کی پچاس ہزار۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کارندے بجر دم دیگوں پر پہنچ جاتے اور کام کرتے کرتے انہیں سورج نکل آتا۔ اس کے بعد حلوہ اور گوشت مریضوں، بچوں اور ان اہل وعیال میں تقسیم کیا جاتا جو امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے دستر خوانوں سے غذا حاصل نہ کر سکتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان قحط کے ماروں کی دیکھ بھال خود فرماتے تھے۔ یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ انہیں بھوک کے چنگل سے بچنے کے ذرائع واقعی میسر ہیں اور جو لوگ خود غذا تیار کرنے کی سکت رکھتے تھے، آٹا، کھجوریں اور لگاون مہینے کے مہینے ان کے گھروں میں بھیج دیتے تھے۔ یہ سامان لوگوں میں اس طرح تقسیم کیا جاتا تھا کہ اسے زمانہ جنگ کی تقسیم غذا کے جدید نظام سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ زیادہ ہوا تو زیادہ تقسیم کر دیا گیا اور کم ہوا تو کم۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے۔ "جب میں دیکھتا کہ غذا لوگوں کی ضرورت کے لیے ناکافی ہے تو جس گھر میں جتنے افراد ہوتے اتنے ہی اور شامل کر دیتا تاکہ وہ آدھا آدھا بانٹ لیں۔ یہاں تک کہ اللہ مینہ برسا دے اور وہ اس قحط پر غالب آ جائے۔ یہ میں اس لیے کرتا تھا کہ آدھا پیٹ کھانے سے وہ ہلاک نہیں ہوں گے۔"[1]

---

[1] ابن سعد نے "طبقات" میں بہت سی روایتیں نقل کی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو عوام کا کتنا خیال تھا اور اس سلسلے میں وہ اپنی ذات اور اولاد پر کتنی زیادتی روا رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک روایت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں گوشت پیش کیا گیا جس میں گھی پڑا تھا۔ آپ نے اسے کھانے سے انکار کر دیا۔ اور فرمایا: "ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ سالن ہے۔" آپ نے ایک شخص سے پانی طلب کیا، وہ شہد لے آیا۔ آپ نے شہد واپس کر دیا۔ اور فرمایا: "واللہ! میں ایسی بات نہیں کروں گا جس کا قیامت کے دن مجھ سے جواب طلب کیا جائے!" اپنے ایک لڑکے کے ہاتھ میں آپ نے تربوز دیکھا اور فرمایا: "واہ! امیر المومنین کے بیٹے! تم پھل کھا رہے ہو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بھوکی مر رہی ہے۔" لڑکا روتا ہوا بھاگ گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ معلوم کر کے خاموش ہو گئے کہ اس نے یہ تربوز مٹھی بھر کھجور کے عوض خریدا تھا۔ عام الرمادہ میں آپ ایک عورت کے پاس سے گزرے جو حلوہ بنا رہی تھی، فرمایا: "اس طرح نہیں!" اور چمچہ لے کر دکھایا کہ اس طرح بناتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ آپ چمڑے کے دو تھیلے اور روغن زیتون کا کنستر اٹھائے چلے جا رہے ہیں۔ چند قحط زدہ لوگ نظر آئے تو ان کے لیے کھانا تیار کیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا..... وغیرہ۔)

Marfat.com

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام عربوں کا اتنا خیال رکھا، اس کے باوجود ان میں بیماری پھوٹ نکلی اور بہت سے لوگ اس کی نذر ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مریضوں کی عیادت کو جاتے اور جب کوئی مرجاتا تو اس کے لیے کفن بھیجتے اور اس کی نماز جنازہ پڑھتے تھے۔ وہ نو مہینے تک، جن میں لوگوں کو انتہائی مصائب و شدائد جھیلنے پڑے مسلسل کام کرتے رہے اور عمال سلطنت کی مدد سے جس قدر بھی ان سے ہو سکا، قحط کی ہلاکت آفرینیوں کا زور توڑتے رہے۔ لیکن جب اعانت کی راہیں تنگ ہوئیں تو جزیرہ نمائے عرب میں بیماری اور موت نے شدت پکڑ لی اور لوگوں پر انتہائی دہشت طاری ہو گئی۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اللہ کے دامن رحمت کے سوا کہیں پناہ نظر نہ آئی۔ نو مہینے تک مسلسل ان کا یہ معمول رہا کہ لوگوں کو عشاء کی نماز پڑھانے کے بعد کاشانہ خلافت میں داخل ہوتے تھے اور ساری رات نماز پڑھتے رہتے تھے۔ خدا سے گڑگڑا کر یہ دعا مانگتے تھے کہ وہ ان کے ہاتھوں امت کو ہلاک نہ کرائے۔ لیکن جب ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول نہ فرمائی تو نماز استسقاء کا فیصلہ کیا اور اپنے تمام عمال کو لکھ بھیجا کہ فلاں دن لوگوں کو لے کر باہر نکلو اور پروردگار عالم کے حضور گڑگڑاؤ کہ ان پر سے یہ سختی دور کر دے۔ اس دن وہ خود بھی لوگوں کو لے کر نکلے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ردائے مبارک ان کے جسم پر تھی۔ نماز ختم کرنے کے بعد انہوں نے اور ان کے ساتھ تمام مسلمانوں نے اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں تضرع و زاری کی اور گڑگڑا، گڑگڑا کے دعائیں مانگیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دیر تک روتے رہے یہاں تک کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ ان کے پہلو میں کھڑے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہا۔ "یا اللہ! ہم تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کو تیرے حضور شفیع بناتے ہیں۔" حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے پروردگار سے دعا مانگی۔ ان کی دونوں آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔ لوگ اپنے رب کے سامنے کھڑے خشیت و زاری کے انتہائی جذبات کے ساتھ دعائیں مانگ رہے تھے اور جانتے تھے کہ اگر اس نے مینہ نہ برسایا تو موت یقینی ہے۔ آخر کار اللہ نے اپنے ان مومن بندوں کی دعا قبول فرمائی، جنہوں نے اس سے کیے ہوئے عہد کو پورا کیا تھا۔ بے شک اللہ اپنے بندوں کے لیے رؤف و رحیم ہے۔

اللہ نے اپنے بندوں کی دعا قبول فرمائی اور دھواں دھار بارش کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیئے۔ پیاسی زمین دیکھتے دیکھتے سیراب ہو گئی۔ اور اس نے اپنا خاکستری لباس اتار کے دھانی پوشاک پہن لی۔ اب ان عربوں کے لیے، جو چاروں طرف سے آ کر مدینہ میں

Marfat.com

جمع ہو گئے تھے۔ وہاں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہ رہی۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان میں جاتے اور فرماتے۔ "جاؤ! اپنے اپنے وطن کو واپس جاؤ!" انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ مدینہ کی زندگی کو عیش و آرام کی زندگی سمجھ کر وہیں نہ رہ پڑیں۔ بلکہ انہوں نے بدویوں کو چند ایسے لوگوں کے سپرد کر دیا، جوان کے کھانے اور سواری کا انتظام کر کے انہیں اپنی اپنی جگہ پہنچوا دیں۔ پھر جہاں ضرورت پیش آتی تھی وہ خود بھی ان کے لیے سفر کی سہولتیں بہم پہنچاتے تھے۔ اپنے وطن واپس ہو کر یہ لوگ پھر معمول کے مطابق زندگی بسر کرنے لگے۔ حالانکہ اب انہیں مال غنیمت میں سے وہ وظیفے نہیں مل رہے تھے، جوان کی آسودگی کا سبب تھے۔ یہ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جزیرۃ العرب کے قحط میں مصروف تھے اور انہوں نے اپنے لشکر کو سخت احکام دے رکھے تھے کہ جب تک وہ اپنی مدافعت پر مجبور ہی نہ ہو جائیں، دشمن سے جنگ نہ کریں۔ عام الرمادہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے آدمی نہ بھیجے، بلکہ جب تک قحط دور نہ ہو گیا انہیں روکے رکھا۔ جب لوگ اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگے اور سرمایہ حیات وافر ہو گیا تو کارندوں کو بھیجا اور حکم دیا کہ ہر صاحب استطاعت سے دو حصے وصول کیے جائیں۔ ایک حصہ عام الرمادہ کا اور ایک اس کے بعد کے سال کا۔ پہلا حصہ محتاجوں میں تقسیم کر دیا اور دوسرا حصہ بارگاہ خلافت میں پہنچا دیا۔ اس سے ضرورت مندوں کی ضرورت میں بہت تخفیف ہو گئی۔ پھر یہ تاکید بھی تھی کہ ان لوگوں کے سوا کسی کو تکلیف نہ دی جائے اور اتنا بوجھ نہ ڈالا جائے جسے برداشت کرنے کی ان میں طاقت نہ ہو۔

مناسب ہے کہ ہم اس مرحلے پر تھوڑی دیر کے لیے توقف کریں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیاست کو دیکھیں جو اس قحط کے زمانے میں، جس سے انہیں اور ان کی قوم کو سابقہ پڑا، ان کی خدمات سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے ہماری مراد استعجاب و احترام کے ان جذبات کا اظہار نہیں ہے جو ان خدمات کے پیش نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے دل میں پیدا ہوتے ہیں، بلکہ ہم ان خدمات کے آئینے میں حکومت کی اس تصویر کے اجمالی خطوط دیکھنا چاہتے ہیں، جو اس شخص کے ذہن میں مرتسم تھی جسے قضا و قدر نے اس مقصد کے لیے مخصوص فرمایا تھا کہ وہ اسلامی معاشرے میں نظام حکومت کو تفصیلی رنگ دینے کا سب سے پہلے آغاز کرے۔ ان خدمات و اعمال میں جو چیز سب سے زیادہ نظر کو اپنی طرف کھینچتی ہے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ذمہ داریاں قبول کرنا اور اپنی جان کو خود مورد ستم بنانا ہے۔ انہوں نے اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں سے روگرداں ہونے کے لیے اپنے اوپر یہ بوجھ نہیں لادا تھا کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ وہ اس لیے کرتے تھے کہ ان

شعور، غریبوں، کمزوروں اور محتاجوں کے شعور سے ہم آہنگ ہو جائے۔ ان کا ارشاد ہے: ”جب تک میں خود لوگوں کی مصیبت میں شریک نہ رہوں گا مجھے ان کی تکلیف کا کیسے اندوزہ ہوگا؟“ اس لیے وہ اپنے آپ کو ان محتاجوں کی سطح پر لے آئے تھے، جنہیں زندگی برقرار رکھنے کے لیے صرف انہی کا دستر خوان میسر آتا تھا۔ جس پر وہ دوسرے ہزاروں بھوکوں کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں کے ہمراہ کھانا کھاتے تھے۔ اور اپنے گھر میں کھانا کھانے پر رضامند نہ ہوتے تھے۔ تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ اپنے لیے ایسی چیز پسند کرتے ہیں جو ان کی قوم کے فاقہ زدوں کو میسر نہیں۔ اپنے اس عمل سے ان کے دو اہم مقصد تھے۔ ایک تو یہ کہ انہیں لوگوں کے دکھ درد کا احساس ہو جائے تاکہ وہ ان سے ہمدردی اور ان کی تکلیفیں دور کرنے کے سلسلے میں سعی وعمل کی رفتار تیز کردیں اور دوسرا یہ کہ عوام کو اطمینان حاصل ہو جائے کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ مصائب وشدائد میں ہمارے برابر کے شریک ہیں اور ان کے جذبات مشتعل نہ ہوں۔ بلکہ وہ ہر تکلیف واذیت پر راضی برضا رہیں کہ مملکت کا سب سے بڑا آدمی اس ابتلا میں ان کا ساتھ دے رہا ہے اور ان دونوں مقصدوں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اتنے کامیاب رہے کہ کسی قوم کا کوئی فرمانروا اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔

اس بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک فرمانروا کا سب سے پہلا فرض یہ تھا کہ وہ اپنی زندگی کو عوام کی زندگی کے برابر رکھے۔ لیکن اسی طرح ان کی یہ بھی رائے تھی کہ اہل استطاعت کو جائز روزی سے نفع اندوز ہونے کے لیے دولت جمع کرنے اور زمین سے غلہ لینے کا موقع دیا جائے تاکہ یہ سرمایہ ان کے لیے شعلہ عمل کو بھڑکائے اور دولت اور نعمت کی زیادتی کے لیے مساعی قدم برق رفتار ہو جائیں۔ اس سے عوام کے دل میں اپنے فرمانروا کی محبت بڑھے گی۔ وہ اس کی سیاست کو اپنا لیں گے اور اس سیاست کی راہ میں زیادہ سے زیادہ قربانیاں کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اپنے حاکم سے عوام کی یہ محبت اور شدید تعلق خاطر دیکھ کر قوم کے اعیان واکابر کی نگاہ میں اس کا مرتبہ بلند ہو جائے گا اور کسی کے دل میں اس کے خلاف نافرمانی وسرکشی کا خیال نہ آسکے گا۔ اس کے علاوہ قوم کے مختلف طبقوں میں اخوت ومحبت کے رشتے استوار ہو جائیں گے کیونکہ ان مختلف طبقوں میں فرمانروا کا وہی مقام ہوتا ہے، جو مقام انسان کے جسم میں قلب کا ہوتا ہے۔ فرمانروا، ان میں عدل وانصاف سے زندگی کا سامان تقسیم کرتا ہے اور ان سب کا رخ عام بھلائی کی طرف پھیر دیتا ہے۔

Marfat.com

ابھی قحط پوری طرح ختم نہ ہونے پایا تھا اور اللہ نے یہ مصیبت ان کے سروں پر کلیتہً دور نہ کی تھی کہ شام میں وباء کے پھوٹنے اور اس کے عراق تک پہنچ جانے کی خبر نے انہیں بے چین کر دیا۔ فلسطین کے ایک شہر ''عمواس'' میں طاعون پھیلا اور اس کی چھوت نے پورے شام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مرض کا حملہ اتنا شدید تھا کہ جس کسی کو وہ ہدف بناتا اسے تیزی سے موت کے منہ میں پہنچا دیتا اور افسوس! کہ اس نے بہت سے انسانوں کو ہدف بنایا۔ یہ وباء مہینوں تک پھیلی رہی اور پچیس ہزار مسلمان اس کی بھینٹ چڑھ گئے، جن میں حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ، حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ، سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ، عتبہ بن سہیل رضی اللہ عنہ اور اسی مرتبے کے سینکڑوں اعیان واکابر شامل تھے۔ حارث بن ہشام اپنے ستر اہل خاندان کے ساتھ مدینہ سے شام گئے اور ان میں سے چار کے سوا باقی سب کے سب اس بلائے بے درماں کی نذر ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس طاعون میں، جو شہریوں کی طرح فوجیوں میں بھی پھیل گیا تھا، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے چالیس افراد کام آئے اس تباہی نے لوگوں پر دہشت طاری کر دی اور وہ اس کے عواقب سے تھرا اٹھے۔ اگر اس وقت دشمن پلٹ کے ان پر حملہ کر دیتا تو وہ یقیناً اس کا مقابلہ نہ کر سکتے۔ لیکن رومیوں کو اندیشہ تھا کہ جو وباء مسلمانوں پر چھائی ہوئی ہے کہیں ان پر مسلط نہ ہو جائے۔ اس لیے وہ حملہ کی جرأت نہ کر سکے۔

وباء کی خبریں ابتداءً پریشان کن نہ تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام جانے کا ارادہ فرما رہے تھے کہ فتح کے بعد اس کا نظم ونسق مرتب فرمائیں۔ چنانچہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ مدینہ سے چلے اور جب تبوک کے قریب سرغ کے مقام پر پہنچے تو سپہ سالاران عساکر اسلامی، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ اور شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ سرزمین شام جراثیم زدہ ہو گئی ہے اور طاعون کی شدت کا ذکر کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ خبر سن کے مضطرب ہوئے اور شام کے وقت مہاجرین اولین کو بلا کر ان سے مشورہ کیا کہ وبا کے باوجود شام کا سفر جاری رکھا جائے یا مدینہ کی واپسی کا فیصلہ کیا جائے؟ حاضرین میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ ایک گروہ نے کہا، آپ ایک ایسے مقصد کے لیے تشریف لائے ہیں جس میں خدا کی خوشنودی کے سوا اور کچھ مطلب نہیں، وبا آپ کے لیے روک نہیں بنی چاہیے! لیکن دوسرے گروہ نے عرض کیا...... ''وہاں ہلاکت وفنا کا دور دورہ ہے۔ ہماری رائے نہیں ہے کہ آپ وہاں تشریف لے جائیں۔ مہاجرین کی طرح انصار رضی اللہ عنہم نے بھی باہمی اختلاف رائے کا اظہار کیا۔ ایسا معلوم ہوتا

تھا کہ انہوں نے مہاجرین رضی اللہ عنہم کی باتیں سن لی ہیں اور انہی کو دہرا رہے ہیں۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قریش کے ان مہاجرین کو جمع کیا جو فتح مکہ کے وقت موجود تھے۔ اور ان سے مشورہ طلب فرمایا۔ ان میں سے ایک نے بھی اختلاف نہ کیا اور سب نے یک زبان ہو کر کہا ''لوگوں کو واپس لے چلیے! وہ ہلاکت وفنا کی جگہ ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واپسی کا حکم دے دیا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے لوگوں میں اعلان کر دیا کہ صبح ہوتے ہی سامان سفر تیار کریں۔ صبح کی نماز کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ''میں واپس جا رہا ہوں۔ تم بھی واپس چلو۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ان مشوروں اور اس فیصلے کے وقت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ موجود نہ تھے۔ جب انہیں اس کا علم ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بولے ''عمر! قضائے الٰہی سے بھاگتے ہو؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس اعتراض پر مبہوت ہو گئے اور تھوڑی دیر تک حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو ٹکٹکی باندھے دیکھ کر فرمایا۔ ابوعبیدہ! کاش یہ بات کوئی اور کہتا۔ ہاں! میں بھاگ رہا ہوں قضائے الٰہی سے قضائے الٰہی کی طرف!'' پھر سر جھکا کر کچھ سوچتے رہے اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا خیال ہے اگر ایک شخص کسی ایسی وادی میں اترے جس کا ایک حصہ سرسبز ہو اور دوسرا بنجر تو کیا جس نے بنجر حصے میں بھیڑیں چرائیں، قضائے الٰہی سے نہیں چرائیں اور جس نے سرسبز حصے میں بھیڑیں چرائیں قضائے الٰہی سے نہیں چرائیں؟'' اس گفتگو کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے شام کے حالات اور وبا سے بچنے کے طریقوں پر تبادلہ خیال کیا۔ یہ دونوں ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ پہنچے تو دیکھا کہ کھلبلی مچی ہے۔ پوچھا، کیا بات ہے؟ اور جب لوگوں نے بات بتائی تو کہا۔ ''مجھے اس کے متعلق علم ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: ''اگر تم سنو کسی ملک میں وبا پھیلی ہے تو وہاں مت جاؤ! لیکن اگر تم کسی جگہ ہو اور وبا پھوٹ پڑے تو وہاں سے بھاگو نہیں!'' یہ حدیث سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مطمئن ہو گئے فرمایا ''الحمد للہ! لوگو! چلو۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے ہمراہیوں کو لے کر مدینہ واپس چلے گئے اور سرداران فوج اپنی اپنی عملداریوں میں۔ مدینہ پہنچ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام کے مسلمانوں کے متعلق سوچنا شروع کیا کہ انہیں طاعون کی تباہ کاریوں سے کیسے بچایا جائے؟ خاص طور پر امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا بہت خیال تھا کہ کہیں وہ طاعون کی زد میں آ کر وفات نہ پا جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی زندگی اس لیے اور بھی عزیز تھی کہ وہ انہیں اپنے بعد خلیفہ نامزد کرنا

Marfat.com

چاہتے تھے۔ کیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار رضی اللہ عنہم کو دعوت نہیں دی تھی کہ وہ ان دونوں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں سے کسی ایک کے ہاتھ پر بیعت کر لیں۔ مسلمانوں نے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی اور اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی۔ ان حالات میں اگر وہ طاعون میں وفات پا جاتے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کس کو خلیفہ نامزد کریں گے؟ اس کے علاوہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے بے انتہا محبت تھی اور ان کے دل میں اس مرد مومن کا بڑا مرتبہ تھا۔ اسی لیے وہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو وبا کے گرداب سے نکالنے کے لیے شام سے بلا لینا چاہتے تھے۔ لیکن انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ خدا پر اٹل ایمان رکھتے ہیں۔ ادائے فرض کو اپنی زندگی پر مقدم سمجھتے ہیں۔ اور وہ کسی قیمت پر اپنے ساتھیوں کو شام میں چھوڑ کر قضائے الٰہی سے نہیں بھاگیں گے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو جو خط ارسال کیا اس میں اپنے اندیشوں کی طرف کوئی اشارہ نہ کیا بلکہ لکھا۔ ''میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں آپ سے زبانی بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ خط پڑھتے ہی روانہ ہو جائیں گے!'' حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے یہ خط پڑھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مطلب سمجھ لیا کہ وہ انہیں وبا کی حدود سے نکالنا چاہتے ہیں اور فرمایا۔ ''اللہ، امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو معاف فرمائے!'' اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا: ''معلوم ہوتا ہے آپ کو میری ضرورت ہے، لیکن میں اسلامی لشکر میں ہوں اور میرے دل میں اسے چھوڑنے کا کوئی خیال نہیں۔ چنانچہ میں اس وقت تک اپنے ساتھیوں سے جدا نہیں ہونا چاہتا جب تک اللہ میرے اور اُن کے متعلق اپنا حکم صادر نہ فرما دے۔ امیر المومنین! مجھے اپنے ارشاد کی تعمیل سے معذور سمجھئے اور لشکر ہی میں رہنے دیجئے!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ خط پڑھ کر رونے لگے۔ حاضرین نے پوچھا۔ ''کیا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنسوؤں سے گھٹی آواز میں جواب دیا۔ ''نہیں مگر معلوم ہوتا ہے ہو جائے گا۔''

میں چاہتا تھا کہ مدینہ واپس ہوتے وقت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے اس اعتراض کے جواب میں کہ ''عمر! تم قضائے الٰہی سے بھاگتے ہو؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو حکیمانہ بات ارشاد فرمائی تھی اس پر ایک نظر ڈالتا۔ اسی طرح اب میری خواہش تھی کہ ان دو خطوں پر اظہار رائے کرتا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے ایک دوسرے کو لکھے۔ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ ارشاد اور یہ دونوں خط ایک آئینہ ہیں۔ جس میں اس عہد کی زندگی، اس زندگی کے عناصر قوت اور اس دور میں اسلامی سلطنت کی وسعت و کشادگی کے اسباب جھلکتے ہیں، لیکن میں نے بہتر یہی سمجھا کہ پہلے

Marfat.com

وہ واقعات بیان کر دوں جو وباء کے ختم ہونے اور شام کی زندگی کے اپنی طبعی رفتار پر آجانے تک پیش آئے کیونکہ ان واقعات سے ایک طرف تو اس آئینے کو مزید جلا حاصل ہوگی اور دوسری طرف صدر اول کے مسلمانوں کا...... جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی رضی اللہ عنہم تھے...... طریق فکر واضح ہو جائے گا کہ وہ کس طرح حق کے سوا، جو ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا ہر قید اور ہر غرض سے آزاد ہو کر سوچتے تھے اور اللہ تعالیٰ کس طرح انہیں عرفان حق کی توفیق ارزانی فرماتا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کا خط پڑھ کر رو دیئے اور سوچنے لگے کہ اہل شام کو ہلاکت کے اس بھنور سے کیسے نکالیں؟ اہل الرائے اصحاب سے مشورے کے بعد انہوں نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو لکھا۔ ''تم لوگوں کو نشیب میں لے کر اترے ہو۔ اس لیے کسی بلند اور پر فضا مقام پر چلے جاؤ!'' حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ ابھی اس حکم کی تعمیل کے متعلق سوچ رہے تھے کہ طاعون نے ان پر وار کیا اور وہ اللہ کو عزیز ہو گئے۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنا جانشین معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو نامزد کیا تھا، لیکن پہلے ان کے صاحبزادے اور بعد کو وہ خود طاعون میں مبتلا ہوئے۔ اور دونوں کے دونوں انتقال فرما گئے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنا قائم مقام حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو بنایا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ایک تقریر کی اور فرمایا: ''یہ وبا جب پھوٹتی ہے تو آگ کی طرح پھیلتی ہے، پہاڑوں میں چھپ کر اپنی جانیں بچاؤ۔'' اس کے بعد لوگوں کو لے کر وہاں سے نکلے اور پہاڑوں میں چلے گئے۔ تا آنکہ وبا کا زور گھٹتے گھٹتے بالکل ختم ہو گیا۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی اس تقریر کا علم ہوا تو نہ صرف یہ کہ آپ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ اسے اپنے اس حکم کی تعمیل قرار دیا، جو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا تھا۔

اس وبا کی علت کیا تھی؟ اور وہ کون سا سبب تھا، جس پر اسے محمول کیا جائے؟ جو روایات ہم تک پہنچی ہیں، وہ اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دیتیں۔ بعض متاخرین کا کہنا ہے، عمواس کا طاعون اس لیے پھیلا کہ جنگ کے میدانوں میں لوگ بکثرت مارے گئے اور چونکہ ان میں سے بیشتر دفن نہ کیے جا سکے اس لیے ان کی لاشیں سڑتی رہیں۔ اور ان کے جراثیم فضا میں پھیل کر وبا کا سبب بن گئے۔ لیکن متقدمین مؤرخین اسے اللہ کا غضب قرار دیتے تھے۔ جو بعض اہل شام کے شراب پینے پر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی بددعا کے نتیجے میں نازل ہوا۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا۔ ''شام کے چند مسلمان مے نوشی کے مرتکب ہوئے ہیں اور ہماری بازپرسی پر یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہمیں اختیار دیا گیا ہے اس لیے ہم نے شراب پی ہے۔ قرآن

Marfat.com

نے صرف یہ فرمایا: ''پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟ لیکن اس کا ترک ہم پر واجب نہیں ٹھہرایا۔'' قرآن نے شراب نوشی کی کوئی سزا مقرر نہیں کی تھی۔ نہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں کسی شرابی پر حد جاری کی گئی تھی۔ اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے اصحاب رائے کو جمع فرما کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے خط کا ان سے ذکر کیا۔ ان لوگوں نے رائے دی کہ قرآن کے ارشاد ''پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟'' کا مطلب یہ ہے کہ باز رہو اور سب نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ شراب پینے والوں کو اسی اسی درّے لگائے جائیں اور ان کی شہادت نامعتبر قرار دی جائے۔ ① حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ شراب پینے والوں کو بلاؤ۔ اگر وہ شراب کو حلال بتائیں تو انہیں قتل کرا دو اور اگر اس کے حرام ہونے کا اقرار کریں تو ان کے اسی، اسی درے لگواؤ۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو بلایا اور مجمع عام میں ان سے شراب کے متعلق سوال کیا۔ ''انہوں نے کہا ''شراب حرام ہے!'' چنانچہ ان کو اسی، اسی درے لگوائے اور کہا۔ ''اے اہل شام! تم پر کوئی نہ کوئی آفت ضرور نازل ہو گی۔'' اور طاعون اسی بددعا کا نتیجہ تھا۔

میرا خیال ہے کہ آج اکثر و بیشتر لوگ متاخرین کی رائے یا اس سے ملتی جلتی بات کو ترجیح دیں گے اور اہل شام کے خلاف ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی بددعا کو وبا کا سبب نہیں سمجھیں گے۔ جو الفاظ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے منسوب کیے جاتے ہیں، مجھے شبہ ہے کہ وہ ان کی زبان سے ادا ہوئے ہوں۔ محض چند آدمیوں کے شراب پینے پر وہ شام کے باشندوں کے حق میں ایسے ہلاکت خیز عذاب کی دعا کیسے مانگ سکتے تھے جب کہ لوگ شراب نوشی سے کہیں بڑھ کر گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور اللہ ان کی پاداش میں ایسا کوئی عذاب نازل نہیں کرتا جو گنہگاروں اور بے گناہوں دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ پھر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ایک ایسے مسلمان تھے جن کا دل نرم اور ایمان پختہ تھا۔ وہ ان لوگوں سے زیادہ نیک اور صالح تھے جو ان الفاظ کو ان کی ذات سے منسوب کرتے ہیں۔ کہیے! آپ کا کیا خیال ہے۔ جب کہ آپ دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں

---

① چند روایتیں یہ کہتی ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کے متعلق، جس نے شراب پی تھی، مشورہ لیا۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس شخص پر حد قذف جاری کی جائے۔'' اور دلیل کے طور پر کہا: ''جب کوئی شخص شراب پیتا ہے تو مدہوش ہو جاتا ہے تو واہی تباہی بکتا ہے اور واہی تباہی بکتا ہے تو بہتان باندھتا ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی رائے کو قبول فرما لیا اور مے نوشی کے جرم میں اسی درے لگوائے۔ (دیکھو: مؤطا صفحہ 311)

Marfat.com

طاعون کی حدود سے نکالنے کے لیے مدینہ بلایا تو انہوں نے صاف جواب دے دیا کہ میں اپنے اہل لشکر کو چھوڑ کر نہیں آ سکتا۔ لیکن ہمارا یہ شک کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ الفاظ ادا نہیں ہوئے، لوگوں کے شراب پینے کی نفی نہیں کرتا۔ جب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے شراب پینے والوں کو بلا کر ان سے پوچھا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ﴾ (المائدہ:91) سے اپنے فعل کی تاویل کی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے ان کا معاملہ بارگاہ خلافت میں پیش کر دیا اور اس کے بعد خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ کے حکم کی تعمیل میں ان لوگوں کو درے لگوائے۔

اس واقعے سے متعلق روایات کا تواتر اور عہد فاروقی رضی اللہ عنہ اور اس کے بعد حد خمر کا جاری کیا جانا اس کی صحت کا قطعی ثبوت ہے۔ پھر یہ روایت اس امر کی تائید بھی کرتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں اللہ تعالیٰ سے شراب کے متعلق دعا فرمائی کہ وہ اس سلسلے میں مسلمانوں کو واضح ہدایت عطا کرے، اس لیے کہ شراب عقل اور مال کی دشمن ہے۔ ان حالات میں کوئی تعجب نہیں اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بادہ نوشوں پر سختی فرمائی ہو اور مے خواری کی سزا مقرر کر کے اسے اپنے عہد میں نافذ بھی فرمایا ہو تا کہ بعد کو آنے والے اسے حدود اللہ کے طور پر جاری کر سکیں۔

وبا کا سبب چاہے کچھ ہو بہر حال لوگ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے کہنے پر پہاڑوں میں چلے گئے کہ طاعون کا زور ٹوٹ جائے۔ لیکن اس وقت تک شام میں پچیس ہزار مسلمان اس قہر الٰہی کی نذر ہو چکے تھے اور یہ وبا شام سے عراق منتقل ہو کر سب سے زیادہ اہل بصرہ کی بھینٹ لے چکی تھی جو اسلامی لشکر کا بہترین حصہ تھا۔ اس کے باوجود یزدگرد نے عراق واپس لینے کی اس سے زیادہ فکر نہ کی جتنی ہرقل نے فلسطین یا شام واپس لینے کے لیے کی تھی۔ ہرقل کی طرح اسے بھی یہ خوف تھا کہ مبادا طاعون اس کی فوجوں میں پھیل کر شام سے ایران پہنچ جائے اور اس کی ہلاکت خیزیاں جنگ اور اس کے نتائج سے زیادہ تباہ کن ثابت نہ ہوں۔ وبا ختم ہونے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے اثرات مابعد سے کیسے عہدہ برآ ہوں؟ اگر وہ اتنے مسلمانوں کی ہلاکت اور اسلامی لشکر کی کثیر تعداد کے لقمہ اجل ہو جانے کے بعد بھی شام کو اس کے حال پر چھوڑ دیتے تو فتح شام ناخوشگوار نتائج سے دوچار ہو جاتی کیونکہ رومی اس پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے چڑھائی کی سوچ رہے تھے۔ اس کے علاوہ مرنے والوں کی میراث کے جھگڑوں نے وہاں کے اقتصادی نظام میں گڑبڑ پیدا کر دی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ کسی طرح گوارا نہ تھا کہ ترکوں کی تقسیم مسلمانوں میں فتنہ و فساد کا بیج بوئے۔ ان حالات میں ان کے لیے بس یہی ایک رستہ رہ گیا تھا کہ بنفس نفیس شام

Marfat.com

تشریف لے جائیں اور تمام حالات کا مطالعہ کر کے انتظام کریں چنانچہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا قائم مقام مقرر کیا اور صحابہ کی ایک جماعت کے ہمراہ مدینہ سے ایلہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر شہر کے پادری کو بلایا اور اسے اپنا کُرتا دے کر، جو طوالت سفر سے پھٹ گیا تھا۔ ارشاد فرمایا ''اسے دھو کر پیوند لگا دو۔'' پادری نے کُرتا دھو کر اس میں پیوند لگا دیئے اور اسی طرح کا ایک اور کُرتا بھی سلوا دیا۔ دونوں کُرتے لے کر وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا ''یہ آپ کا کُرتا ہے جسے دھو کر میں نے پیوند لگا دیئے ہیں اور یہ دوسرا کُرتا آپ میری طرف سے قبول فرمائیے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا کُرتا پہن لیا اور دوسرا کُرتا واپس کرتے ہوئے فرمایا۔ ''میرا کُرتا اس سے زیادہ پسینہ جذب کرتا ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایلہ سے روانہ ہوئے اور جابیہ پہنچ کر قیام فرمایا۔ شام و فلسطین کے عمال نے حاضر خدمت ہو کر مسلمانوں کی بپتا بیان کی۔ آپ نے تمام ملک شام کا دورہ فرمایا۔ مختلف علاقوں میں مسلمانوں کے معاملات کی چھان بین کی، ان کے ساتھ فیاضی سے پیش آئے۔ دمشق، حمص اور ان دوسرے شہروں میں، جو وبا کی تباہ کاریوں کا بطور خاص نشانہ بنے تھے۔ عربوں کے لیے جاڑے اور گرمیوں کی فرودگاہیں قرار دیں۔ پھر شام کی سرحدوں اور لشکر گاہوں کو مستحکم کیا۔ غذا کی تقسیم کا از سر نو انتظام ہوا اور اس کام میں مدد دینے کے لیے لوگوں کو خود نامزد فرمایا۔ اس سے فارغ ہو کر ترکے تقسیم کیے اور مرحومین عمواس کا متروکہ مستحقین کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر انہیں پہنچا دیا اس طرح تمام معاملات درستی پر آ گئے اور سابقہ نظام بحال ہو گیا۔ ایک طویل خوف و دہشت کے بعد لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور رومیوں کو شام پر دوبارہ قبضہ کرنے کا خیال اپنے دل سے نکالنا پڑا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے انتقال کی خبر ملی تھی، آپ نے ان دونوں کی جگہ علی الترتیب شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ اور معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا۔ جابیہ کے زمانہ قیام میں آپ نے شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کو ان کی خدمات سے معزول کر دیا۔ شرحبیل رضی اللہ عنہ نے پوچھا ''کیا آپ نے مجھے کسی ناراضگی کی بنا پر معزول فرمایا ہے؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ ''نہیں، تم مجھے بہت عزیز ہو لیکن میں ایک ایسے شخص کو چاہتا ہوں جو تم سے زیادہ قوی ہو۔'' شرحبیل رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ ''تو پھر لوگوں میں اس کا اعلان فرما دیجیے تا کہ مجھے کسی ندامت اور قباحت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور مجمع عام سے خطاب فرمایا: ''لوگو! بخدا میں نے شرحبیل رضی اللہ عنہ کو کسی ناراضگی کے سبب معزول نہیں

کیا بلکہ میں ایک ایسے شخص کو حکومت پر مقرر کرنا چاہتا ہوں جو ان سے زیادہ قوت کے ساتھ حکومت کرے۔" یہ سچ ہے کہ شرحبیل رضی اللہ عنہ ایک آزمودہ کار سالار فوج تھے، لیکن ان میں وہ سیاسی سوجھ بوجھ نہ تھی جو عوامی نفسیات کا احاطہ کر سکتی۔ اس کے برعکس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ گو جوان تھے مگر سیاست و تدبر میں ان کا پایہ بلند تھا اور ان کی نگاہ معاملات کی تہ تک فوراً پہنچ جاتی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام سے مدینہ واپس ہوتے ہوئے جابیہ پہنچے تو عام جلسے میں ایک تقریر کی اور اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا...... "میں تم لوگوں پر والی بنایا گیا ہوں۔ تمہارے جو معاملے میرے سپرد کیے گئے ہیں، ان شاء اللہ میں انہیں ٹھیک ٹھیک انجام دوں گا۔ ہم نے اموال غنیمت، عطیے اور فرودگاہیں تم میں برابر برابر تقسیم کی ہیں اور تمہارے حقوق تم کو پہنچائے ہیں۔ چنانچہ تمہارے لیے فوجیں مرتب کی ہیں اور تمہاری راحت و آسائش کے اسباب فراہم کیے ہیں۔ ہم نے تمہیں آباد کیا ہے، مال غنیمت اور جہاد کے انعامات سے آسودہ، خوش حال بنایا ہے۔ ہم نے تمہارے حوصلوں کو بلند کیا ہے۔ تمہارے لیے رزق و عطاء کا حکم کیا ہے۔ پس اگر کوئی ایسی بات جانتا ہو جس پر عمل ہونا چاہیے تو وہ ہمیں بتائے، ان شاء اللہ ہم اس پر عمل کریں گے۔"

نماز کا وقت آ گیا۔ جس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ روانگی کا مصمم ارادہ فرما چکے تھے۔ لوگوں نے عرض کیا "حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے اذان کے لیے فرمایئے۔" جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تھا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دینی چھوڑ دی تھی۔ اب جو اللہ نے مسلمانوں کے سر سے بلا ٹالی تو انہوں نے اذان سننے کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت حق جل شانہ کی وہ نعمت یاد کرنے کے لیے کہ اس نے اپنا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان میں معبوث فرما کر انہیں اسلام کی دعوت دی اور زمین کا وارث بنایا۔ خاکدان وجود کے مختلف گوشے ان کے پاؤں تلے بچھائے اور ایران و روم کی قوتیں ان کے لیے خاک میں ملا دیں۔ اس کے بعد جب ان پر مصیبت نازل ہوئی تو اسے دور کر دیا اور اپنے عذاب و انتقام کا ذریعہ نہ بنایا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بلند آواز میں اذان دی، جسے ماہ و سال کی گردشیں متاثر نہ کر سکی تھیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کو وہ مبارک عہد یاد آ گیا جس میں وہ نبی رحمۃ علیہ التحیۃ والتسلیم کی امامت میں صفیں باندھ کر نماز پڑھتے تھے اور ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض یاب و ہدایت اندوز ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک صحابی ایسا نہ تھا جس کی داڑھی آنسوؤں سے تر نہ ہو، جن لوگوں کو وہ مقدس عہد دیکھنا نصیب نہ ہوا تھا وہ صحابیوں کو روتا دیکھ کر رونے لگے۔ سب سے زیادہ آنسو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہائے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فضل و برکت کو سب سے

Marfat.com

زیادہ وہی یاد کرتے تھے۔ نماز کا یہ اعلان جو مؤذن رسول ﷺ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی زبانی بیت المقدس کے قریب، شام کی فضاؤں میں پہلی اور آخری مرتبہ گونجا، جو دنیا کی تاریخ میں، شام میں مسلمانوں کی فتح، اسلام کے قیام اور دوامی استحکام کا نشان بن گیا۔ چنانچہ کوئی مؤرخ اس کا ذکر کرنا نہیں بھول سکتا۔ اس لیے کہ وہ بطور خود اللہ کی نصرت ہے اور فتح مبین۔

اہل شام کو رخصت کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ واپس ہو گئے اور عراق کے سفر کا مصمم ارادہ فرمایا، لیکن اللہ کو اس ارادے کی تکمیل منظور نہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام سے پہلے عراق جانے کا ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ جب اس کے شمال میں پہنچے تو فراض سے حلب اور دمشق کی طرف آ گئے، لیکن کعب احبار نے اس ارادے کو تبدیل کرا دیا اور کہا کہ سفر کا آغاز شام سے فرمایئے۔ چنانچہ یہ سفر آخری سفر تھا۔ جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ جزیرہ نمائے عرب سے باہر تشریف لے گئے۔ ① طاعون عمواس اور اس سے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرز عمل بیان کر چکنے کے بعد اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس دور کے مسلمانوں میں عقلی آزادی کا کیا اثر تھا۔ یہ آزادی کن کن قوتوں پر مشتمل تھی۔ اور مسلمانوں کے لیے اس عظیم الشان سلطنت کے دروازے کس طرح کھلے جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور پھیلتی رہی تا آنکہ جب مسلمانوں نے اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کر لی تو اللہ نے بھی انہیں بدل دیا۔

---

① بعض روایات کہتی ہیں کہ کعب احبار نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس رائے سے اختلاف کیا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنا سفر عراق سے شروع فرمائیں۔ کہا جاتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو بلا کر کہا کہ وہ مفتوحہ ممالک کا دورہ کر کے مسلمانوں کے حالات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اور اس مسئلے میں ان سے رائے طلب فرمائی۔ کعب احبار نے دریافت کیا "آپ پہلے کہاں تشریف لے جانا چاہتے ہیں؟" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "عراق!" کعب احبار نے عرض کیا "ایسا نہ کیجئے۔ شر کے دس حصے ہیں جن میں سے نو مشرق میں ہیں اور ایک مغرب میں۔ مشرق میں شیطان کے سینگ اور تمام نا [illegible] ل علاج بیماریاں ہیں۔" لیکن حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "امیر المومنین! کوفہ ہجرت کے بعد ہجرت کرنے کی جگہ اور قبہ اسلام ہے۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ ہر مسلمان اس کی طرف دیکھے گا۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "مرحومین عمواس کے ترکے ضائع ہو رہے ہیں میں انہیں تقسیم کرنے کے لیے پہلے شام جاؤں گا اور اپنی سوچی سمجھی رائے کے مطابق عمل کروں گا۔ اس کے بعد وہاں سے جاؤں گا اور ملک کا دورہ کر کے لوگوں پر اپنا نقطہ نظر واضح کروں گا۔" بعض نقادوں کا خیال ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے جو عبارت منسوب کی گئی ہے وہ ان واقعات سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے منسوب کی گئی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کوفہ کو اپنا دار الخلافہ قرار دینے کے وقت پیش آئے، ورنہ انہوں نے شام اور عراق میں کوئی تفریق نہیں فرمائی تھی۔ اسی طرح ان نقادوں کا یہ بھی خیال ہے کہ کعب احبار والی روایت بھی بعد کو وضع کی گئی ہے

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کے ارادے سے روانہ ہوئے تو سرغ کے مقام پر امرائے لشکر آپ سے آکر ملے اور عرض کیا "سرزمین شام جراثیم زدہ ہوگئی ہے۔" یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مدینہ واپس ہونے کا حکم دیا۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے اعتراض کیا "عمر! قضائے الٰہی سے بھاگتے ہو؟" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "ہاں! قضائے الٰہی سے قضائے الٰہی کی طرف!" یہ اعتراض اور یہ جواب دونوں مسئلہ تقدیر اور اس کے اس اختلاف پر روشنی ڈالتے ہیں جو آج بھی اپنی جگہ قائم ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جواب "اسلامی قدریت" کی دقیق ترین تصویر ہے حضرت ابن جراح رضی اللہ عنہ اور وہ لوگ جنہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سفر شام جاری رکھنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ "آپ ایک ایسے مقصد کے لیے تشریف لائے ہیں، جس میں خدا کی خوشنودی کے سوا اور کچھ مطلوب نہیں وباء آپ کے لیے روک نہیں بننی چاہیے۔" چونکہ اس پر ایمان رکھتے تھے کہ خدا کے حکم کے بغیر کوئی مصیبت ہم تک نہیں پہنچ سکتی اور ہر وقت، پہلے سے لکھ دیا گیا ہے۔ چنانچہ جب کسی کا وقت آجاتا ہے تو پھر ایک لمحہ اِدھر یا اُدھر نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہماری فکر ہمیں غیبی ابتلا سے نہیں بچا سکتی۔ پس جب ہم کسی بات کا ارادہ کرلیں تو ہمارا فرض ہے کہ اس کے سوا ہر چیز کی طرف سے آنکھیں بند کرکے آگے بڑھتے چلے جائیں۔ کوئی مصیبت اور کوئی رکاوٹ ہمارے پاؤں کی زنجیر نہ بنے۔ امرائے لشکر کا یہ عقیدہ ایک بے مثال قوت کا سرچشمہ ہے۔ ایک سپاہی، جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے لامحالہ اسے فتح و نصرت کا ضامن بھی سمجھتا ہے۔ سچے ایمان کا سب سے پہلا حکم یہ ہے کہ سپاہی موت سے نہ ڈرے بلکہ خوش دلی کے ساتھ اس کی طرف بڑھے۔ اگر شہید ہو جائے تو یہ شہادت اللہ، وطن اور اس مقصد کی راہ میں ہوگی جسے وہ حاصل کرنا چاہتا تھا اور اگر ظفر مندی کے ساتھ زندہ رہ جائے تو ابدی افتخار کا تاج اس کے سر کی زینت ہوگا۔ اس عقیدہ پر فوج کا ایمان ہی تھا جس نے مسلمانوں کو مختلف میدانوں میں کامیاب و کامران کیا۔ انہوں نے اللہ کی راہ میں شہادت پسند کی اس لیے اللہ نے انہیں عزت و کرامت کی زندگی عطا فرمائی۔

لیکن قدریت کا یہ مفہوم، جو ایک سپاہی کی زندگی میں غیر معمولی اثر رکھتا ہے۔ ایک سیاست دان کے نظریہ قدر پر پورا نہیں اتر سکتا، جو عوامی مصالح اور جنگ و امن دونوں میں ان کی فلاح و بہتری کا ذمہ دار ہے۔ اسی طرح وہ مفکر بھی اس سے اتفاق نہیں کرسکتا، جس کا کام معاملات کی چھان بین کرنا اور ان کے تمام پہلوؤں سے پر نظر ڈالنا ہے یہ صحیح ہے کہ ہر "وقت" پہلے سے ہی لکھ

Marfat.com

دیا گیا ہے اور ہماری فکر و تدبیر ہمیں غیبی ابتلا سے نہیں بچا سکتی، لیکن اس کے باوجود ہمارا فرض ہے کہ ہم معاملات کو خوب اچھی طرح جانچیں، پرکھیں اور اپنے علم و عقل کی ہدایت کے مطابق باحسن طریق ان میں تصرف کریں۔ پھر جس نقطے کی طرف ہمارا علم، ہماری عقل اور ہمارا حسن تدبر ہماری رہنمائی کرے وہی تقدیر الٰہی ہے۔ جس طرح ایک سپاہی کا میدان جنگ میں موت کی طرف جھپٹنا اور اس کے نتیجے میں کامیابی یا ناکامی سے دوچار ہونا تقدیر الٰہی ہے۔ سالار لشکر کا اولین فرض ہے کہ اپنی غلط رائی سے فوج کو ہلاکت میں نہ ڈالے اور جب تک اسے پوری طرح یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ حالات شمشیر آزمائی اور سرفروشی کے حق میں ہیں، اپنے سپاہیوں کو موت کے منہ میں نہ دھکیلے، لیکن جب میدان میں اتر جائے تو کم سے کم نقصان اٹھا کر کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرے اور ایک صاحب سیاست، ایک صاحب امر کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی ذات اور ان لوگوں کو ہلاکت سے بچائے جن کی سیاسی رہنمائی اس کے ذمے ہے بشرطیکہ حکومت اعلیٰ اور اس کی موجودہ آئندہ سیاست کو نقصان پہنچائے بغیر وہ اس دنیے بچ سکتا ہو یا لوگوں کو بچا سکتا ہو۔ اس طرح اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے تو اس کی یہ کامیابی اپنی جگہ اتنی ہی قابل فخر ہو گی جتنی ایک سپاہی کے لیے میدان جنگ میں اس کی ظفرمندی۔ پھر اسی کامیابی کو تقدیر الٰہی کہا جائے گا، جس سے اللہ نے از راہ رحمت اپنے بندوں کو نوازا۔

یہی نقطہ نظر تھا ان لوگوں کا جنہوں نے طاعون کو ہلاکت و تباہی سے تعبیر کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مدینہ واپس ہو جانے کا مشورہ دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے قبول فرمالیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل سرتاسر حکیمانہ فعل تھا۔ اگر وہ شام تشریف لے جاتے اور طاعون ان کی جان لے لیتا تو مسلمانوں کو اتنا بڑا نقصان اٹھانا پڑتا کہ ان کے سارے کام چوپٹ ہو جاتے۔ یا ان کے چند ساتھیوں کو وہاں چھوت لگ جاتی اور وہ ان سب کو لے کر واپس آتے تو وبا جزیرہ نمائے عرب میں پھیل جاتی اور اس کے باشندے ایک ایسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتے جس سے انہیں بچانا امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا سب سے پہلا فرض تھا۔ اس بنا پر جب وہ جزیرہ نمائے عرب کو وبا سے بچانے کے لیے موت سے فرار کر رہے تھے تو یقیناً تقدیر الٰہی کی طرف فرار کر رہے تھے۔ انہوں نے جزیرہ نمائے عرب اور اپنے آپ کو اس بلائے بے درماں سے محفوظ کیا تھا جو اللہ نے ان پر نازل نہیں کی تھی۔

اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے سامنے جو مثال بیان فرمائی وہ مسئلہ تقدیر میں ان کی رائے کی بہترین تفسیر ہے۔ اگر کوئی چرواہا کسی ایسی وادی میں جائے جس کا ایک

حصہ سرسبز ہو اور دوسرا بنجر تو اس نے سرسبز یا بنجر جس حصے میں بھیڑیں چرائیں تقدیر الٰہی سے چرائیں۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ اگر اسے دونوں کا علم تھا اور اس نے جان بوجھ کر کسی ایک حصے کا انتخاب کیا تو اس کا یہ انتخاب تقدیر الٰہی ہے، اس لیے کہ اس کی فیصلہ کرنے والی عقل اسے اللہ نے عطا کی تھی اگر وہ دوسرے حصے سے بے خبر تھا تو اس کا معلوم حصے میں بھیڑیں چرانا تقدیر الٰہی ہے۔ اس لیے کہ وہ دوسرا حصہ اس کی نگاہوں سے اوجھل تھا اور وہ ان میں سے ایک کا انتخاب نہ کرسکتا تھا، لیکن شام اور اس کی وبا کے سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے دونوں پہلو تھے، جن میں سے کسی ایک پہلو کا انتخاب کرنا ان کا فرض تھا۔ چنانچہ مشورے کے بعد انہوں نے یہ پہلو انتخاب کرلیا اور تقدیر الٰہی سے تقدیر الٰہی کی طرف فرار کر گئے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سن کر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا اپنے فیصلے پر اور بھی اطمینان ہوگیا کہ ''اگر تم سنو کسی ملک میں وبا پھیلی ہے تو وہاں مت جاؤ۔ لیکن اگر تم کسی جگہ ہو اور وبا پھوٹ پڑے تو وہاں سے بھاگو نہیں! یہ حدیث، جیسا کہ دورِ حاضر کے انکشاف نے ہمیں سمجھا دیا ہے، ایک صحیح ذہن پیدا کرتی ہے کہ جس شہر میں وبا پھیل جائے اسے دوسرے شہروں سے کاٹ دینا چاہیے۔ یہی نہیں بلکہ ان صحت مندوں کو بھی دوسرے شہر کے لوگوں سے دور رکھنا چاہیے بہت ممکن ہے کہ بظاہر تندرست ہونے کے باوجود، وبا کے جراثیم ان کے جسموں میں چھپے ہوں اور ان کی چھوت دوسرے شہر میں بھی پھیل جائے۔ اس قسم کے احتمال کے لیے احتیاط واجب ہے اور یہی احتیاط تھی جس نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو فوراً مدینہ واپس ہونے پر مجبور کیا۔ ایک صحیح ذہن لوگوں کو اس امر سے باز نہیں رکھتا کہ وہ اپنے ملک کی حدود میں کوئی ایسی جگہ تلاش کرلیں جہاں اپنے خیال میں وہ بیماری کی تباہ کاریوں سے محفوظ ہوسکتے ہیں۔ یہی مدعا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جب انہوں نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا کہ ''تم لوگوں کو نشیبی زمین میں لے کر اترے ہو انہیں کسی بلند اور پرفضا مقام پر لے جاؤ اور یہی مراد تھی حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی جب انہوں نے لوگوں کو طاعون سے بچنے کے لیے پہاڑوں پر چلے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عمرو بن عاص کی اس رائے کو ناپسند نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک یہ قضائے الٰہی سے قضائے الٰہی کی طرف فرار تھا جو عقل و حکمت کا عین مقتضا اور از روئے روایت فرض ہے۔ اس مفہوم کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی ادا کیا جاسکتا ہے کہ جو کچھ ہم اس زندگی میں حاصل کرتے ہیں قضا و قدر ہی سے حاصل کرتے ہیں۔ ایک عقل مند حکیم کو اللہ جس بھلائی کی توفیق دیتا

Marfat.com

ہے وہ اس کے لیے تقدیر الٰہی ہوتی ہے۔ اور ایک ناسمجھ انسان کو اپنے قصور فہم سے جو تکلیف پہنچتی ہے وہ اس کے لیے تقدیر الٰہی بن جاتی ہے۔

دیکھے آپ نے تقدیر کے سلسلے میں یہ دو مختلف نظریے؟ جن میں سے ایک تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور ان کے مسلمان ساتھیوں نے اختیار کیا تھا اور دوسرا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم خیال مسلمانوں نے اور یہ دونوں فریق اس پر ایمان رکھتے تھے کہ جہاں انہیں اپنی اپنی رائے پر قائم رہنے کی پوری آزادی حاصل ہے، وہاں ایک دوسرے کی رائے کا احترام بھی ان پر فرض ہے۔ پھر وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ کسی ایک نظریئے کی تائید سے ان کے عقیدے کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا، نہ ان سے حسن ایمان اور خصوص اسلام ہی پر کوئی زد پڑتی ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ چونکہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ تھے۔ اس لیے عمل انہیں کی رائے پر کیا گیا۔ تاہم حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے اپنی رائے نہ بدلی، نہ اس کے خلاف عمل کیا اور اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کا اور ان کی رائے کا احترام کرتے رہے، جس طرح ان لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کی رائے کے احترام میں سرمو فرق نہ آنے دیا۔

یہ عقلی آزادی اور یہ باہمی احترام ہی صدر اول کے مسلمانوں کی قوت کا وہ عنصر تھا، جس نے انہیں دشمن پر غالب اور اس کے ملک پر فتح یاب کیا۔ اس لیے انہیں یقین تھا، ان کا ہر فرد جماعتی مفاد کے پیش نظر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے، اسے حق کی تلاش محض حق کی خاطر ہوتی ہے اور انسانی طبیعتوں میں رائے کا اختلاف اگر لوث وغرض کی قید و بند سے آزاد ہو تو بڑا قابل قدر ہوتا ہے۔ کسی رائے پر دوسری رائے کو ترجیح اسی وقت دی جاتی ہے جب اپنی مصلحت کے پیش نظر جماعت اسے حق سمجھتی ہے اور جماعت کی مصلحت ہمیشہ ان حالات کے زیر اثر ہوتی ہے جو زمان و مکان کے تغیر کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ جماعت کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا کہ جس رائے کو وقت اور مقام کے لحاظ سے وہ حق سمجھتی ہے اسے اپنا لے اور اس سے اختلاف کرنے والوں کو جو خیر و حق کی تلاش میں اپنے اختیار کردہ رستے پر چل رہے ہیں، ان کی صواب دید پر چھوڑ دے۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے میرے نزدیک ''اسلامی قدریت'' کی دقیق ترین تصویر ہے، اسی طرح وہ اس ''علمی جبریت'' سے بھی اتفاق کرتی ہے، جو آج ہمارے لیے ایک جانی بوجھی چیز ہے اور جسے آج سے دو ہزار سال پہلے یونان کے فلاسفر بھی جانتے پہچانتے تھے۔ اس جبریت کا کہنا ہے کہ ہم اپنے فکر و عمل میں آزاد نہیں ہیں۔ ہمارا کسی رائے اور

Marfat.com

کسی امر کو اختیار کرنا بہت سے عوامل، ہماری فطرت، ہماری وراثت، ہماری تعلیمی نشو ونما اور ہمارے صحیح ماحول پر موقوف ہے جو ہمارے دائرہ اقتدار سے باہر ہیں۔ اسی طرح اس پر ہماری انسانی جبلتوں اور ذاتی خواہشوں کا بھی اثر پڑتا ہے۔ پھر بسا اوقات کوئی اتفاقی حادثہ، جو نہ ہمارے حاشیہ خیال میں ہوتا ہے نہ کسی اور کے، ہماری زندگی اور ہمارے فکر وعمل کا رخ بدل دیتا ہے اور یہ فطرت، وراثت اور نشو ونما، یہ جبلتی خواہشیں اور اتفاقات سب کے سب تقدیر الٰہی ہیں جن کو بدلنے پر ہم قادر نہیں۔ اس لیے جو بھی تقدیر الٰہی سے بھاگتا ہے وہ تقدیر الٰہی کی طرف بھاگتا ہے۔

عقلی آزادی نے صدر اول کے مسلمانوں میں باہمی احترام کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے اختلاف رائے نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رنجیدہ نہیں کیا اور انہیں یہ فکر رہی کہ وہ عامۃ المسلمین اور خود اپنے دوست حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی بھلائی کے لیے انہیں جراثیم زدہ سرزمین سے کیسے نکالیں؟ وہ دونوں خط جو اس سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے ایک دوسرے کو لکھے۔ نگاہوں کو ٹھہراتے ہوئے ذہن میں مختلف خیالات کو جھنجھوڑتے ہیں، اگر آپ ان خطوں کو جذباتی رخ سے دیکھیں تو آپ کو ان میں وفا کی ایک ایسی تصویر نظر آئے گی، جس کی مثالیں بہت ہی شاذ ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفا امین الامت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے جو سقیفہ بنی ساعدہ میں ان کے ساتھ تھے اور جن کی سیاسی قیادت نے اہل شام کو ان کا مطیع ومنقاد بنا دیا اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی وفا اپنی فوجوں سے جو ان کے ساتھ جنگ کے میدانوں میں اتریں اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان کی بازی لگا کر رومیوں پر شاندار فتح حاصل کی اور اگر آپ ابھرتی ہوئی اسلامی سلطنت کو عام بھلائی کے پہلو سے ان خطوں پر نظر ڈالیں تو اس بھلائی کے لیے ان دونوں بزرگوں کو مختلف الرائے پائیں گے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے مقصد میں یہ دونوں متحد ہوں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی قیمت کیا ہے اور ان کی بقا میں مسلمانوں کے لیے کتنی فلاح ہے؟ اسی لیے وہ انہیں اس ہلاکت آفریں وبا سے نکالنا چاہتے تھے جس میں مبتلا ہو کر مر جانا کوئی قابل فخر بات نہ تھی اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ اپنی فوج کے سلسلے میں ان کا فرض کیا ہے؟ اسی لیے وہ اپنی جان بچانے کی خاطر اپنی فوج سے بے وفائی کرنے کو ایک ایسی برائی سمجھتے تھے جو ان کے اور ان کی طرح دوسرے سپہ سالاران افواج کے لیے ایک بدترین مثال بن جائے گی۔ اس کے علاوہ یہ دونوں بزرگ اپنے

Marfat.com

خطوں میں اپنی اپنی رائے پر جمے رہتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ انسان کے تقدیر الٰہی کی طرف بھاگنے میں خود بھی کوئی حرج نہیں سمجھتے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو بھی اس کی طرف بلاتے ہیں اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو اصرار ہے کہ لوح تقدیر میں جو کچھ لکھ دیا گیا ہے، اس سے بھاگنا نہیں چاہیے، چاہے موت سامنے ہی کیوں نہ آ کھڑی ہو۔ چنانچہ وہ شام ہی میں رہتے ہیں اور راضی برضائے الٰہی ہو کر اپنی جان دے دیتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا خط پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ ان کی مخالفت کر رہے ہیں، ان کا حکم نہیں مان رہے، پھر بھی انہیں غصہ نہیں آتا اور وہ ان کی مخالفت کو نظام حکومت سے بغاوت پر محمول نہیں فرماتے، بلکہ اپنے دوست کی محبت انہیں بے چین کر دیتی ہے اور وہ اس طرح رونے لگتے ہیں گویا ان کے خیال میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

کیا کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کی تکریم اور ان کی رائے کے احترام کے ساتھ ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان پر اور انہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر جو اعتماد تھا بڑی حد تک اسی نے مسلمانوں میں فاتحانہ قوت پیدا کر دی تھی، جس کے بل پر وہ تیزی سے بڑھے اور ان نازک حالات میں کامیابی حاصل کر کے، جو قادسیہ اور شمالی شام میں ہماری نظر سے گزر چکے ہیں، ثابت کر دیا کہ ان کے اس غیر معمولی جرأت و اقدام کا سبب مسلمانوں کا اللہ پر ایمان ہے اور درحقیقت یہی عناصر تھے جنہوں نے مسلمانوں کی قوت واستقامت میں اضافہ کیا۔ جب یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ آزادی کے احترام اور باہمی اعتماد ہی نے ان بڑی بڑی سلطنتوں کی شیرازہ بندی کی ہے، جو مختلف زمانوں میں دنیا پر حکمران رہی ہیں تو یہ دیکھ کر ہمیں کوئی تعجب نہیں رہتا کہ انہیں خصوصیات نے اسلامی سلطنت کی سیاست کا رخ متعین کیا اور اس میں ایک ایسی تہذیب کی بنیادیں استوار کر دیں جس پر چل کر انسان نے کمال کی راہ طے کی۔

میں اس اثر کی طرف اشارہ کیے بغیر اس باب کو ختم کرنا نہیں چاہتا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کو اردن کی امارت سے معزول کر کے معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو تمام ملک شام کا امیر بنا دینے سے ہوا اور جس کے سبب بعد کو اموی حکومت کی داغ بیل پڑی۔ اسلامی دارالخلافت مدینہ سے دمشق منتقل ہوا اور عرب ان عناصر سے گھل مل گئے جن کے دین میں شیر وشکر ہو جانے سے ابھرتی ہوئی سلطنت کو ایسی تبدیلیوں کا سامنا کرنا پڑا، انہوں نے اسے عربی سے زیادہ اسلامی بنا دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بر بنائے احترام بنوہاشم کو مفتوحہ ممالک کا والی نہیں بناتے

تھے، بلکہ انہیں مشورے کے لیے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ مدینہ میں ہی رکھتے تھے۔ اس کے متعلق ان سے کہا گیا تو انہوں نے ایک دن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا ''میں نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور لوگوں کو عامل مقرر فرماتے تھے اور آپ حضرات کو چھوڑ دیا کرتے تھے۔ بخدا! میں نہیں جانتا کہ اہل ہونے کے باوجود آپ کو حکومت سے الگ رکھا جائے یا اس بات سے ڈرا جائے کہ اپنے مرتبے کی وجہ سے آپ اسے کوئی اہمیت نہ دیں گے اور آپ پر عتاب ہوگا، کہ ایسی صورت میں عتاب ہونا ضروری ہے۔'' اور معاویہ رضی اللہ عنہ ایک دانش مند شخص تھے جن کی دانش مندی ان کی آنکھوں پر اغراض کا پردہ پڑنے نہیں دیتی تھی۔ حلیم الطبع تھے جن کی بردباری انہیں طاقت کے استعمال سے روکتی تھی اور بالغ النظر تھے جن کی حکمت سے لوگ مانوس ہو گئے تھے اور جنہوں نے اپنی خوش کلامی اور حسن تدبیر سے عوام کا دل موہ لیا تھا۔ وہ عہد فاروقی رضی اللہ عنہ کے خاتمے تک شام کے والی رہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بھی انہیں اپنے عہدے پر برقرار رکھا گیا۔ ان کی سیاست نے اہل شام کو اس قدر اپنا گرویدہ بنا لیا تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین اہل بیت کے مقابلے میں بھی انہیں کے مددگار و معاون رہے۔ اور اس کا اسلامی سلطنت کی زندگی پر جو اثر ہوا وہ ظاہر ہے۔

اس امارت سے جو واقعات رونما ہونے والے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت ان کا اندازہ نہ کر سکے تھے، فتح مکہ کے وقت جب سے ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور ان کے قبیلے والوں نے اسلام قبول کیا تھا، بنو عبد شمس اور بنو عبد مناف کے باہمی جھگڑوں کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ اسلامی فتوحات کے دوران میں آپ ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور ان کے صاحبزادوں کی پرخلوص خدمات دیکھ ہی چکے ہیں۔ اسی بنا پر لوگ پرانی عداوتوں کو بھول گئے تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو شام کی امارت ملنے پر کسی کے ذہن میں شبہ نے راہ نہ پائی، نہ کسی نے یہ سوچا کہ آگے چل کر اس امارت کے کیا نتائج مترتب ہوں گے اور تھا کون اس زمانے میں یہ سوچنے والا کہ بڑی بڑی شورشیں تند و تیز آندھیوں کی طرح تباہی مچا کر اپنے پیچھے کچھ اثرات چھوڑ جاتی ہیں اور خود جوں کی توں زمین کی تہوں میں محفوظ ہو جاتی ہیں کہ طوفان گزر جانے کے بعد اپنے قدیم برگ و بار ایسی صورت میں پیدا کریں جو نئی فضا اور نئے ماحول کے عین مطابق ہوں؟

شام کے معاملات کی درستی و تنظیم کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اہل شام سے رخصت ہوئے اور ان دو بلاؤں کے زوال سے مطمئن ہو کر، جو مسلمانوں پر نازل ہو گئی تھیں، مدینہ واپس آئے۔ کچھ

Marfat.com

دن وہاں قیام فرمایا اور اس کے بعد جیسا کہ ہر سال ان کا معمول تھا مسلمانوں کو لے کر فریضہ حج ادا کرنے مکہ تشریف لے گئے۔ حج سے فارغ ہو کر وہ مدینہ واپس آئے کہ ان لڑائیوں کی خبریں معلوم کر کے جو ایران میں ایرانیوں اور مصر میں رومیوں سے لڑی جا رہی ہیں، اپنی نئی سیاست کے ایسے اصول مرتب کریں جن کے ذریعے سے ان واقعات کا مقابلہ کیا جا سکے، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہیں چاہتے تھے کہ پیش آئیں، چنانچہ اب ہمیں یہ بھی خبریں سننے کے لیے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ چل کر دیکھنا چاہیے کہ اسلام اور مسلمانوں کی سیاست میں ان خبروں نے وہ اثر کس طرح مرتب کیا، جس نے سلطنت کے دامن کو مشرق میں چین اور مغرب میں تونس کی حدود تک پھیلا دیا۔

Marfat.com

باب:15

ایرانی فتوحات میں توسیع

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیاست یہ تھی کہ فتوحات کے قدم عراق وشام کی حدود میں رک جائیں، ان سے آگے نہ بڑھیں اور اس طرح عرب ایک ایسی وحدت میں منسلک ہو جائیں جو جزیرہ نمائے عرب کے جنوب سے صحرائے ساوہ کے شمال تک پھیلی ہوئی ہو۔ چنانچہ فتح مدائن کے بعد جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ان پہاڑوں کے اس طرف ایرانیوں کا تعاقب کرنے کی اجازت چاہی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں تحریر فرمایا: ''کاش! سواد اور پہاڑ کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو جائے کہ نہ وہ ہماری طرف آ سکیں اور نہ ہم ان کی طرف جا سکیں۔ ہمارے لیے سواد کی شاداب زمینیں کافی ہیں۔ میں مسلمانوں کی سلامتی کو مال غنیمت پر ترجیح دیتا ہوں!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی اس سیاست میں بالکل پرخلوص تھے اور درحقیقت یہ اسلامی سیاست میں ایک نیا قدم تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی خواہش تھی کہ جزیرۃ العرب اور اس کی سرحدیں اتنی محفوظ و مضبوط ہو جائیں کہ ایران اور روم اس پر چڑھائی نہ کر سکیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کسریٰ اور قیصر اور مصر وشام و عراق کے فرمانرواؤں کو جنگ و پیکار کے بغیر اسلام کی توفیق ارزانی فرما دے اور یہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سیاست تھی۔ جب خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے ارشاد نبوی کی تکمیل میں رومیوں سے لڑنے کے لیے اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر شام کی سرحدوں پر بھیجا پھر جب مثنیٰ بن حارثہ شیبانی رضی اللہ عنہ عراق میں داخل ہوئے اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ان کی مدد کو پہنچ کر ایرانیوں پر فتح پائی اور اس کے بعد جب شام میں اسلامی فتوحات کا آغاز ہوا تو اس وقت بھی نہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ بات آئی تھی نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں کہ عراق وشام کی سرحدیں پے سپر کی جائیں۔ عراق اور شام میں وہ عربی قبائل تھے جنہوں نے جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر حیرہ اور غسان کی حکومتیں قائم کی تھیں۔ یہ لوگ مسلمانوں سے بہت گہرا

Marfat.com

رشتہ رکھتے تھے۔ اس لیے مسلمانوں میں بھی فطری طور پر ان کا ساتھ دینے اور انہیں اپنے ساتھ ملانے کی خواہش پائی جاتی ہے، لیکن اس سے آگے جو ایران و روم کی سرزمین تھی اس پر چڑھائی کرنے اور فتح پانے کی کوئی تمنا پہلے اور دوسرے خلیفہ کے دل میں نہ تھی۔

لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ واقعات شخصیتوں پر غالب آ کر انہیں اپنی رائے میں اعتدال اور سیاست میں تبدیلی پیدا کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ واقعات نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا۔ اول اول تو انہوں نے ایران اور وم کے مقابلے میں اپنی سیاست کا رخ بادل نخواستہ بدلا، لیکن بعد کو جب یہ نئی سیاست کامیابی سے ہمکنار ہو کر ایک ایسے نقطے کی طرف قدم زن ہوئی جو امیر المومنین رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں کی توقع کے خلاف تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ پوری قوت اور پورے جوش کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہو گئے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جنگ قادسیہ کا ایک ایرانی سپہ سالار ہرمزان موت کے منہ سے بچ نکلا تھا۔ اس نے شکست کھانے کے بعد، میدان جنگ سے فرار ہو کر اہواز میں پناہ لی تھی اور وہیں مقیم ہو گیا تھا۔ اور یہ بھی آپ نہ بھولے ہوں گے کہ شہنشاہ ایران (یزدگرد) مدائن کی فتح کے بعد حلوان اور وہاں سے رے بھاگ گیا تھا اور ایران کی تمام فوجیں اور ان کے سردار اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے۔ پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو یہ حکم دیا کہ ایرانیوں کا تعاقب نہ کرو، بلکہ عراق کی تنظیم اور اصلاح میں مصروف ہو جاؤ تو ایرانیوں نے سمجھا کہ عرب ان سے ڈر کر تعاقب سے باز رہے ہیں اور اس گمان نے انہیں عربوں پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ ابتداءً اہل اہواز نے حملے کی سوچی، اس لیے وہ سب سے پہلے مسلمانوں کے مقابل ہو گئے۔ نتیجتاً انہیں منہ کی کھانی پڑی اور ان کی یہ ہزیمت بعد کو پیش آنے والی ایرانی شکستوں اور پسپائیوں کا پیش خیمہ بن گئی۔

اہواز عراق عرب کے جنوب مشرق میں اس سے متصل واقع تھا جس میں دریائے دجلہ کی دو شاخیں نہر دجیل اور نہر کارون بہتی تھیں۔ جبل فارس کی بلندیاں اسے عراق عرب سے جدا نہ کرتی تھیں۔ البتہ کہیں کہیں وہ پہاڑیاں روک بن جاتی تھیں جنہیں مخصوص راستوں کے بغیر طے کرنا دشوار تھا۔ اور یہ راستے یہاں کے باشندوں کے لیے جانے پہچانے تھے۔ اہواز چونکہ ابلہ اور بصرہ کے قریب واقع تھا۔ اس لیے یہاں کے لوگ دوسرے ایرانیوں سے پہلے عربوں سے گھل مل گئے۔ چنانچہ اکثر روایتوں میں ہے کہ ابلہ [illegible] صدیقی رضی اللہ عنہ میں حضرت خالد بن ولید

رضی اللہ عنہ کے عراق پہنچتے ہی فتح کر لیا تھا۔ اس کے بعد ایرانیوں نے اسے واپس لے لیا اور وہ انہیں کے قبضے میں رہا تا آنکہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں عتبہ بن غزوان نے اسے دوبارہ فتح کر لیا۔ عتبہ کا انتقال ہو گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو بصرہ کا والی بنایا[1] عتبہ اپنی وفات سے کچھ پہلے مدینہ آئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں اہل اہواز نے مسلمانوں کے اقتدار کے خلاف بغاوت کی سوچی۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ ان سے مقابلہ کرنے نکلے۔ یہاں تک کہ اپنی اور ان کی درمیانی سرحدوں کو محفوظ و مامون کر دیا اہل اہواز پر غالب آنے میں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کو کوئی زحمت پیش نہ آئی۔ لیکن وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیاست کو جانتے تھے اس لیے ان کے ملک میں گھس کر ان کا تعاقب نہ کیا بلکہ انہیں زیر کر کے جزیے پر صلح کر لی۔ لیکن زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ وہ اپنے عہد سے پھر گئے اور مسلمانوں کو معاہدہ صلح سے آزاد کر کے اپنی زمین ان کے لیے حلال کر دی۔

ہوا یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو بصرہ کی ولایت سے معزول کر دیا اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو والی بنا کر حکم دیا کہ محاکمے کے لیے مغیرہ رضی اللہ عنہ کو میرے پاس بھیجو اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا ''ابوموسیٰ! میں تمہیں عامل بنا کر ایک ایسی سرزمین میں بھیج رہا ہوں جہاں شیطان نے انڈے بچے دے دیئے ہیں۔ پس ہمیشہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پابندی کرنا۔ اگر تم نے اسے بدلا تو اللہ تمہیں بدل دے گا۔'' حضرت ابوموسیٰ نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین! میری مدد کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہ رضی اللہ عنہم مجھے عنایت فرمائیے! کہ اس امت اور ان کے کاموں میں، میں نے انہیں کھانے میں نمک کی طرح پایا ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''جن جن صحابیوں کو چاہو اپنے ساتھ لے جاؤ۔'' اس اجازت کے مطابق حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے انیس صحابیوں رضی اللہ عنہم کو اپنے ہمراہ لے لیا۔

ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ بصرہ پہنچے۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ کے نام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ان کے ساتھ تھا۔ یہ سب سے مختصر فرمان تھا۔ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں کسی شخص کو لکھا۔ ''امابعد! مجھے ایک سنگین خبر ملی ہے جس کی بنا پر میں ابوموسیٰ کو امیر بنا کر بھیج رہا ہوں۔ اپنے اختیارات ان کے سپرد کر کے فوراً حاضر ہو!'' امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے اہل بصرہ کے نام پر حکم لکھا۔ ''امابعد! میں ابوموسیٰ کو تم

[1] اس کا مفصل ذکر پہلے گزر چکا ہے

پر امیر بنا کر بھیج رہا ہوں تا کہ وہ ظالموں کے مقابلے میں مظلوموں کی مدد کریں، تمہاری مدد سے دشمنوں کے ساتھ جنگ کریں، ذمیوں کے جان و مال اور حقوق کی نگرانی کریں، تمہارا اخراج وصول کریں اور اس کو تم پر صرف کریں اور رستوں کو خطرے سے محفوظ رکھیں۔"

اہل اہواز نے بصرہ کے والیوں میں جو یہ تبدیلی دیکھی تو سمجھے کہ اس سے مسلمانوں میں بے چینی پھیلے گی اور وہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف بھڑک اٹھیں گے جس کی وجہ سے ان کے خلاف بغاوت کرنی ممکن ہو جائے گی کیا کسریٰ کے درباریوں میں وہ یہی کچھ دیکھتے نہ آئے تھے؟ کیا عجمی اشراف و امراء کے باہمی تعلقات مکر و فریب کی فضا میں گھرے ہوئے نہ تھے؟ کہ جب کسی امیر کو موقع ملتا وہ اپنے دشمنوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا۔ چنانچہ وہ اپنے عہد سے پھر گئے اور جزیہ ادا کرنے سے انکار کر دیا، جس پر انہوں نے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے صلح کی تھی۔ مسلمانوں کے خلاف بغاوت کا حوصلہ انہیں اس لیے اور بھی ہوا کہ بحرین کے گورنر علاء بن حضرمی نے فارس پر حملہ کرنے کے لیے جہازوں کے ذریعہ خلیج فارس عبور کیا۔ وہ اپنے لشکر سمیت خشکی پر اترے اور راستے میں جو ایرانی فوجیں ملیں، انہیں شکست دیتے ہوئے فارس کے عظیم الشان دارالسلطنت اصطخر کی طرف بڑھتے چلے گئے، لیکن چوک یہ ہوئی کہ عقب کی حفاظت کرنا بھول گئے، جس سے فائدہ اٹھا کر ایرانیوں نے ساحل کی واپسی کا راستہ کاٹ دیا۔ علاء جانتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمندر کے سفر کو پسند نہیں فرماتے اس لیے انہوں نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے اجازت حاصل کیے بغیر ہی یہ حملہ کر دیا تھا اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے مدائن فتح کیا تو علاء کو رشک ہوا اور انہوں نے سوچا کہ اصطخر فتح کر کے فخر و امتیاز میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ہم دوش ہو جائیں، لیکن جب انہیں اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی اور گھر گئے تو مدد کی درخواست کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بصرہ اور کوفہ کی فوجوں کو حکم دیا کہ علاء اور ان کے ساتھیوں کو اس مصیبت سے نکالیں اور علاء کو اس غلطی کی پاداش میں بحرین کی ولایت سے معزول کر کے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ماتحت کر دیا۔

ان اسباب نے ایرانیوں کو مسلمانوں کے خلاف بغاوت کرنے پر جرأت دلائی۔ انہوں نے جزیہ دینے سے انکار کر دیا، جسے پہلے وہ منظور کر چکے تھے۔ اب لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اگر مسلمان خاموش ہو جاتے تو اندیشہ تھا کہ ان کی بغاوت زور پکڑ لیتی۔ پھر ایرانی مزاحمت سوچتے اور یہ لے اتنی بڑھ جاتی کہ وہ سرحد پار کر کے عراق عرب کے وقار کو صدمہ پہنچا دیتے۔ ا

لیے حضرت ابوموسیٰ نے اپنی فوجیں جمع کر کے اہواز کی طرف روانہ کیں اور مناذر اور نہر تیری کو فتح کرنے کے بعد اسے بھی فتح کرلیا۔ اس جنگ میں اسلامی فوجوں کی قیادت کس کس کے ہاتھ میں رہی؟ وہ کون کون سے ایرانی سپہ سالار تھے جنہوں نے ان فوجوں کا مقابلہ کیا اور ان سے شکست کھائی؟ فوجیں کیسے روانہ ہوئیں اور طریق جنگ کیا تھا؟ اس کے اجمال و تفصیل دونوں میں روایات بے حد مختلف ہیں۔ لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مسلمانوں نے خوزستان کی سرحد پار کرلی تھی اور محاصرے کے بعد اہواز پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ فتح اہواز کے بعد ایرانیوں نے صلح کی درخواست بھیجی، جس کے جواب میں مسلمانوں نے یہ شرط پیش کی کہ خوزستان کا جتنا علاقہ انہوں نے فتح کرلیا ہے۔ وہ انہیں کے قبضہ اقتدار میں رہے گا اور ایرانی اپنے ملک کی حدود سے آگے قدم نہ بڑھائیں گے۔ روایات اپنے تمام تر اختلاف کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مشہور سیاست کی تائید اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی اس خواہش کے اظہار میں متفق ہیں کہ فتح کے قدم عراق عرب کی حدود سے آگے نہ بڑھیں۔ اسی طرح ان کی تفصیلات اس گوشے سے بھی نقاب اٹھاتی ہیں جو اس باب میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہمارے لیے مناسب ہے کہ ان روایات کا خلاصہ اس طرح پیش کردیں کہ کوئی ضروری پہلو چھوٹنے نہ پائے۔

مؤرخ طبری نے مناذر اور نہر تیری کی فتح اور مسلمانوں سے ہرمزان کے تعلقات کے بیان میں درازنفسی سے کام لیا ہے۔ ان کی روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہرمزان قادسیہ سے بھاگ کر اہواز پہنچا اور وہاں کے باشندوں کو میسان اور دست میسان پر حملہ کرنے کے لیے ابھارنے لگا جو عراق عرب کے قریب واقع تھے۔ حملے کے لیے دو رستے تجویز کیے گئے۔ ایک مناذر کا رستہ اور دوسرا نہر تیری کا رستہ۔ عتبہ بن غزوان نے ہرمزان کے خلاف حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے کمک طلب کی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے سلمٰی بن قین اور حرملہ بن ریطہ کو بھیج دیا۔ یہ دونوں میسان اور دست میسان کی سرحدوں پر آکر اترے اور غالب وکلیب سے مدد چاہی جو عربی النسل قبیلے تھے اور اہواز میں آباد ہوگئے تھے۔ ان دونوں قبیلوں نے اپنے قومی بھائیوں کی دعوت پر لبیک کہی اور ایرانیوں سے قیامت آسا مقابلے کے بعد مناذر اور نہر تیری پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد دجیل پہنچے اور اسے طے کر کے سوق اہواز کی طرف بڑھے۔ ہرمزان کو ایرانیوں کی اس ابتلا کا حال معلوم ہوا تو مسلمانوں سے صلح کی درخواست کی۔ جسے مسلمانوں نے اس شرط پر قبول کرلیا کہ خوزستان کا جو علاقہ اسلامی فوجوں نے فتح کرلیا ہے وہ ایرانیوں کو واپس نہیں کیا جائے گا۔

Marfat.com

اس کے بعد ہرمزان اور غالب وکلیب میں سرحدوں پر جھگڑا ہو گیا۔ ہرمزان نے نہ صرف یہ کہ سلمیٰ اور حرملہ کے حکم سے انحراف کیا بلکہ کردوں سے مدد طلب کر کے بے شمار فوج جمع کر لی اور مسلمانوں سے جو معاہدہ کیا تھا اسے توڑ دیا۔ ان واقعات کی اطلاع بارگاہ خلافت میں بھیجی گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حرقوص بن زہیر السعدی کو جو صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے، ایک فوج دے کر ہرمزان کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ حرقوص نے ہرمزان کو اہواز سے نکال باہر کیا اور ہرمزان بھاگ کر رامہرمز میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے بعد حرقوص نے جزء بن معاویہ کو ہرمزان کے تعاقب کا حکم دیا اور جب ہرمزان نے یہ دیکھا کہ مسلمانوں سے مفر کی صورت نہیں تو دوبارہ صلح کی درخواست کی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے منظور کر لی گئی۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے جزء اور حرقوص کو لکھا کہ جن مقامات پر تم قابض ہو وہاں کی حکومت تمہارے ہی قبضے میں رہے اور جزء کو شہر بسانے کی اجازت مرحمت فرمائی جزء نے نہریں کھدوائیں اور غیر آباد زمینوں کو آباد کر دیا۔ یہ طبری کی روایت کا خلاصہ ہے۔ ابن اثیر نے اپنی تاریخ الکامل میں بھی یہی روایت نقل کی ہے۔ لیکن ابن کثیر نے اسے بے حد مختصر کر دیا ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھا کہ مسلمانوں نے ہرمزان کو شکست دے کر مناذر، اہواز اور نہر تیری فتح کر لیے۔ ان لڑائیوں میں ہرمزان کی بے شمار فوج ماری گئی اور تستر تک سارا علاقہ مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ ابن خلدون نے ابن کثیر سے بھی زیادہ ایجاز واختصار سے کام لیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ طبری اور بلاذری کی روایتوں کے باہمی اختلاف نے مؤرخین کو اس اختصار پر مجبور کیا ہو۔

بلاذری کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ بیرواز کو شکست دے کر اور اس سے مال پر صلح کر کے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے سوق اہواز پر حملہ کیا، لیکن جب ابوموسیٰ، مغیرہ رضی اللہ عنہ کی جگہ بصرہ کے گورنر ہوئے تو بیرواز نے عہد شکنی کی، ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس پر حملہ کر کے اہواز فتح کر لیا۔ اس جنگ میں بہت سے ایرانی غلام مسلمانوں کے ہاتھ آئے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں لکھا: ''تم میں زمین آباد کرنے کی سکت نہیں ہے، اس لیے جتنے غلام تمہارے ہاتھ لگے ہیں ان سے دستبردار ہو کر ان پر جزیہ عائد کر دو!'' مسلمانوں نے اس حکم کی تعمیل میں سارے غلام چھوڑ دیئے۔ اس کے بعد ابوموسیٰ مناذر کی طرف روانہ ہوئے اس کا محاصرہ کر لیا۔ گھمسان کا رن پڑا جس میں مہاجر بن زیاد شہید ہو گئے۔ ایرانیوں نے ان کا سر کاٹ کے قلعے کے دو کنگروں کے درمیان لٹکا دیا۔ لڑائی کی باگ ڈور مہاجر کی جگہ ان کے بھائی ربیع نے سنبھالی اور بہت سے ایرانیوں کو قتل و اسیر کرنے کے

Marfat.com

بعد مناذر فتح کرلیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوموسیٰ کو لکھا: ''مناذر، سواد کی بستیوں کی سی ایک بستی ہے، جو کچھ تم نے حاصل کیا ہے واپس کردو۔'' آپ نے دیکھا، روایات کا اختلاف صرف اسی حد تک محدود نہیں ہے کہ یہ لڑائیاں کس کس نے لڑیں اور کس کس طرح لڑیں، بلکہ اس سے گزر کر تاریخ و سنین تک پہنچ گیا ہے۔ پھر ان لڑائیوں کے آغاز کے سلسلے میں جو اختلاف ہے وہ اس اختلاف سے کسی طرح کم نہیں جو ان جنگوں کے سپہ سالاران عساکر سے متعلق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ یہ جنگ سنہ 15 ھ میں شروع ہوئی اور دوسری روایت میں ہے کہ سنہ 16 ھ میں۔ کوئی اس کی ابتداء سنہ 17 ھ میں بتاتا ہے اور کئی سنہ 19 ھ میں، اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا آغاز سنہ 20 ھ کے اواخر میں ہوا۔ گمان غالب یہ ہے کہ یہ لڑائیاں سنہ 15 ھ کے اواخر میں شروع ہوئیں اور چونکہ صلح ٹوٹتی رہی اس لیے ان کا سلسلہ متذکرہ بالا سنین تک جاری رہا۔

لیکن یہ مختلف روایات اس پر متفق ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی سیاست کے لحاظ سے اسلامی فتوحات کو عراق عرب سے آگے بڑھانا نہ چاہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ شکست کھانے کے بعد جب کبھی ایرانی صلح کی درخواست کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے قبول فرمالیتے تھے۔ غلاموں کے متعلق انہوں نے ہر بار یہی حکم دیا کہ ان کو چھوڑ دیا جائے اور صرف خراج پر بس کیا جائے۔ پھر وہ اپنے آدمیوں کے نام بستیاں بسانے، نہریں کھدوانے، بنجر زمینوں کو قابل زراعت بنانے اور رعایا کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنے کے فرمان جاری فرماتے رہتے تھے اور اگر ایرانی حقیقت کے سامنے سر جھکا دیتے، اس سیاست پر رضامند ہوجاتے اور مسلمانوں سے کیے ہوئے معاہدوں کا احترام کرتے تو ایران کے اقتدار کی باگ ڈور یزدگرد ہی کے ہاتھوں میں رہتی اور عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ ان حدود تک ہرگز وسیع نہ ہوتا جن حدود تک وہ وسیع ہوگیا۔ ان علاقوں میں ایرانیوں سے لڑنا، ان پر غالب آنا اور ظفرمند ہونا کوئی آسان کام نہ تھا ایرانی ہر جگہ جان توڑ کر مقابلہ کرتے تھے اور مسلمانوں کے لیے بڑی نازک صورت حال پیدا کردیتے تھے۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا ہے کہ ایرانیوں کی جانبازی و سرکشی سے مجبور ہوکر مسلمانوں کو اپنی فوجیں میدان جنگ سے ہٹا کر کسی اور جگہ لے جانی پڑی ہیں۔ ہرمزان کے رامہرمز کی طرف پسپا ہوتے وقت جزء بن معاویہ اس کے تعاقب میں نکلے۔ لیکن جب شغر کی بستی میں پہنچے تو ہرمزان نے انہیں عاجز کردیا اور وہ ایک ایسی بستی کی طرف پلٹ گئے جس میں ان کے مقابلے کی طاقت نہ تھی۔

Marfat.com

یزدگرد کو اپنے اہل وطن کی اس مقاومت کا حال معلوم ہوا تو اپنے ملک کے کھوئے ہوئے علاقوں کو واپس لینے کی خواہش اس کے دل میں ابھری۔ اپنی گذشتہ ہزیمتوں اور عرب کی فتح یابیوں پر رنج والم کا اظہار کر کے اس نے ایرانیوں کو غیرت دلائی اور ان کے جوش کو بھڑکانا شروع کیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت وہ مرو میں تھا، لیکن بعض اسے اسطخر یا قم میں بتاتے ہیں۔ اس نے اہل فارس کے نام ایک خط لکھا جس میں کینہ وبغض کے جذبات کو ہوا دیتے ہوئے ملامت کے انداز میں تحریر کیا: ''اے اہل فارس! تم نے سواد اور اہواز میں عربوں کا اقتدار تسلیم کر لیا۔ لیکن وہ اس پر مطمئن نہ ہوئے اور اب تمہارے گھروں میں گھسے چلے آ رہے ہیں۔ اٹھو! اے اہل فارس! اور دشمن پر فتح پاؤ! ساتھ ہی اہل فارس اور اہل اہواز نے بھی خطوط لکھے اور ایرانی عربوں پر فتح پانے کے لیے متحد ومتفق ہو گئے۔ یہ خبریں حرقوص بن زہیر اور دوسرے سپہ سالاران اسلام کو ملیں اور انہوں نے بارگاہ خلافت میں ارسال کر دیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ نعمان بن مقرن کی سرکردگی میں ایک بڑا لشکر فوراً اہواز کی طرف بھیجو اور چند مسلمان جانبازوں۔ کے نام بھی تحریر فرما دیئے کہ وہ ہرمزان کے مقابلے کے لیے اس لشکر کے ساتھ روانہ کیے جائیں ساتھ ہی حضرت ابوموسیٰ کو فرمان بھیجا کہ سہیل بن عدی کی امارت میں ایک بڑی فوج اہواز روانہ کرو اور شجاعان اسلام کی ایک جماعت کو نامزد فرمایا کہ وہ اس فوج کے ساتھ جائے۔

کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ احکام ان کی اس سیاست کے خلاف نہ تھے کہ مسلمان عراق عرب سے آگے نہ بڑھیں ان لشکروں کے بھیجنے سے ان کا مقصد سرزمین ایران میں داخل ہونا تھا یا وہ محض ایرانیوں کی تادیب کے لیے روانہ کیے گئے تھے کہ شکست کھانے کے بعد انہیں دوبارہ عہد شکنی کی جرأت نہ ہو؟ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس مسئلے میں کسی ایک نتیجے پر نہ پہنچے تھے۔ پھر ایران پر قبضہ کرنے سے زیادہ انہیں اپنی سیاست عزیز تھی۔ بصرہ کی فوج کا ایک وفد بارگاہ خلافت میں حاضر ہوا، جس میں احنف بن قیس بھی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وفد سے گفتگو فرمائی، اس کے بعد احنف بن قیس کی طرف رخ کر کے کہا: ''مجھے تم پر اعتماد ہے کہ میں نے تمہیں صادق القول پایا ہے۔ بتاؤ ذمیوں پر زیادتی تو نہیں کی گئی، وہ ظلم سے تنگ آ کر بھاگے ہیں یا کسی اور وجہ سے؟'' احنف نے جواب دیا۔ ''نہیں! وہ ظلم سے نہیں بھاگے، رعایا کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا ہے جیسا آپ چاہتے ہیں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''اچھا، تو اب تم لوگ جاؤ!'' اس کے بعد

Marfat.com

جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو یزدگرد کے متعلق یہ اطلاع ملی کہ وہ ایرانیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا رہا ہے تو غدر کاروں کو ایک ایسا سبق دینے کا ارادہ فرمایا جسے وہ زندگی بھر نہ بھول سکیں۔ چنانچہ نعمان بن مقرن اور سہیل بن عدی کو ان کی گوشمالی کے لیے بھیج دیا۔

رامہرمز میں ہرمزان کا مقابلہ کرنے کے لیے نعمان سرزمین اہواز سے گزرتے چلے گئے۔ ہرمزان کو جب ان کی آمد کا حال معلوم ہوا تو ایک بہت بڑا ایرانی لشکر لے کر اربک ① کے مقام پر پہنچا اور چھوٹتے ہی مسلمانوں پر شدت کا حملہ کر دیا۔ اسے امید تھی کہ مسلمان اس حملے کی تاب نہ لا سکیں گے۔ فریقین جان توڑ کے لڑتے رہے، ہرمزان نے جو مسلمانوں کی قوت دیکھی تو اربک سے رامہرمز اور وہاں سے تستر کھسک گیا۔ اس اطمینان کے تحت کہ تستر کی فصیلوں اور برجیوں میں وہ قلعہ بند ہو سکے ادھر۔ ادھر نعمان نے رامہرمز پہنچ کر اس پر قبضہ کر لیا۔ سہیل بن عدی بصرہ سے ہرمزان کے مقابلے کے لیے روانہ ہوئے لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ نعمان نے رامہرمز پر قبضہ کر لیا ہے اور ہرمزان تستر بھاگ گیا ہے تو سوق اہواز سے اپنا رخ اس مستحکم شہر کی طرف کر لیا اور وہاں پہنچ کر دیکھا کہ نعمان بن مقرن پہلے ہی سے دشمن کے مورچوں کے سامنے اپنی فوج لیے موجود ہیں۔ سلمی، حرملہ، حرقوص اور جزء نکلے اور سب کے سب فصیلوں کے قریب جا پہنچے۔ مسلمانوں کی تمام فوجوں نے اس مستحکم شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ہرمزان اور اس کی فوجیں، جو فارس و اہواز کے باشندوں پر مشتمل تھیں، خندقیں کھود کر مورچہ بندی کر چکی تھیں۔ وہ دشمن کے سامنے کھڑی تھیں کہ انہیں اپنے قلعے کی مضبوطی پر ایمان تھا اور وہ جانتی تھیں کہ ہمارے مورچوں میں کوئی نہیں گھس سکتا۔ جو کوئی آگے بڑھے گا اسے پیچھے دھکیل دیا جائے گا۔

ہرمزان اپنے اندازے میں غلط نہ تھا۔ مسلمانوں نے شہر کی فصیلوں پر چڑھائی کرنی چاہی، لیکن انہیں پسپا کر دیا گیا۔ ایرانیوں نے بھی کئی بار حملے کیے، جن میں کبھی تو انہیں الٹے پاؤں واپس ہونا پڑا اور کبھی انہوں نے مسلمانوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ لڑائی یوں ہی طول کھینچتی رہی، جس میں کبھی ایک فریق کو غلبہ ہو جاتا کبھی دوسرے فریق کو، بالآخر جب اندرون شہر ہرمزان کے پاس غیر معمولی لشکر جمع ہو گیا جو کسریٰ کے نفیر کے جواب میں ملک کے مختلف گوشوں سے آیا تھا، تو مسلمانوں نے

① اربک جسے اربق بھی کہا گیا ہے، رامہرمز کے جوار میں ہے۔ بعض کتابوں میں جہاں ان فتوحات کا ذکر ہے، اس کا نام اربل لکھا ہے، لیکن یہ تحریف ہے۔

Marfat.com

دشمن کی قوت کا پوری طرح اندازہ کرلیا۔ اب ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ کمک طلب کر کے اپنی قوت بڑھائیں اور شہر پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ ابوسبدہ نے ، جو کوفہ اور بصرہ کی فوجوں کے سالار تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا جس میں تستر کے استحکام اور قلعہ بند ایرانی فوجوں کا حال بیان کر کے دربار خلافت سے مدد طلب کی۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو حکم بھیجا کہ بصرہ کی تمام فوج لے کر ابوسبدہ کی مدد کو جائیں اور ان کی ماتحتی میں دشمن سے لڑیں۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اپنا لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ جسے ایسے ایسے نامور بہادروں کی اعانت حاصل تھی جو اکثر معرکوں میں ہتھیلی پہ سر رکھ کے لڑے اور فتح و نصرت نے ان کے قدم چومے۔

محاصرہ جاری رہا اور جنگ شدت اختیار کرتی گئی۔ ایرانی شہر سے نکل کر مسلمانوں پر حملہ کرتے اور فریقین کی بڑی تعداد کھیت رہ جانے کے بعد اپنے مورچوں میں واپس آجاتے۔ حضرت ابوموسیٰ نے یہ پوری تفصیل بارگاہ خلافت میں لکھ بھیجی اور امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو جو کوفہ کے حاکم تھے، حکم دیا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اپنا قائم مقام بنا کر ابوسبدہ کی مدد کے لیے روانہ ہو جائیں۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور ان کی فوجوں کے پہنچ جانے کے بعد مسلمانوں نے محسوس کیا کہ اب فصیل کا گھیراڈالے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ محاصرہ کئی مہینوں سے جاری ہے، اس لیے اب شہر پر حملہ کر ہی دینا چاہیے۔ ہرمزان نے قلعوں کی بلندی سے مسلمانوں کو جنگ کی تیاریاں کرتے دیکھا تو اپنی فوج کو حکم دیا کہ شہر سے نکل کر ایک دم دشمن پر ٹوٹ پڑو۔ اسے کامل یقین تھا کہ فتح اس کے نصیب میں آئے گی اور وہ مسلمانوں کو الٹے پاؤں بھاگنے پر مجبور کر دے گا۔ چنانچہ وہ خود بھی مقابلے کے لیے نکلا، جنگ شہر کے دروازوں پر ہو رہی تھی کہ براء بن مالک کی نظر ہرمزان پر پڑی۔ وہ پہچان گئے اور قتل کرنے کے لیے اس کی طرف دوڑے۔

براء نے اپنے آپ کو فریب نہیں دیا تھا۔ وہ ایک آزمودہ کار بہادر نامور شہسوار تھے۔ مسلمانوں نے ارتداد کی جنگوں اور عراق و شام کی معرکہ آرائیوں میں ان کے شجاعت آفریں کارنامے دیکھے تھے اور گواہ تھے کہ وہ کہیں مغلوب نہیں ہوئے۔ تستر کے میدان میں انہوں نے مبارزوں کو ہلاک کیا تھا، جوان کی شجاعت و جواں مردی کو زیر کرنے نکلے تھے۔ لیکن ہرمزان بھی طاقت اور بہادری میں ان سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے دشمن کا وار خالی کر دیا اور ایک

Marfat.com

ہی ضرب میں براء کو موت کی نیند سلا دیا۔ براء کا انتقام لینے کے لیے مجزاۃ بن ثور نکلے۔ لیکن انہیں بھی براء سے زیادہ کچھ نہ ملا اور وہ بھی مسلمانوں کے بہترین بہادر کی طرح شہادت پا گئے۔

مسلمان جانتے تھے کہ تستر، خوزستان کا دارالسلطنت اور اس کے تمام شہروں سے زیادہ مضبوط ہے۔ اگر اس پر قبضہ ہو گا تو ایرانیوں کی شان خاک میں مل جائے گی اور ان کی ہمتیں جواب دے جائیں گی۔ اس لیے اپنے دو قابل فخر بھائیوں کی شہادت بھی ان کے حوصلے پست نہ کر سکی، بلکہ جنگ کی محبت، پیش قدمی کے شوق، مصیبتوں سے کھیلنے کی تڑپ اور حصول فتح کے لیے موت پر جھپٹنے کی تمنا نے ان کے جذبہ شہادت طلبی کو اور تیز کر دیا۔ جب شام ہوئی اور سورج ڈوبنے لگا تو ایرانیوں پر تکان کے آثار طاری ہو گئے۔ اور ان کے لیے شہر واپس ہو کر اس کے قلعوں اور فصیلوں میں جا کر بیٹھ رہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔

دوسرے دن صبح کوئی جنگ کے لیے باہر نہ نکلا جس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے دیکھ لیا تھا مسلمان زندگی سے زیادہ موت پر جان دیتے ہیں اور انہوں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک ان کا ایک متنفس بھی زندہ ہے وہ تستر سے نہیں جائیں گے۔ سارا شہر فوجوں سے پٹا پڑا تھا اور لڑائی طول کھینچ چکی تھی۔ ایک دن ایک ایرانی شہر والوں سے آنکھ بچا کر شہر سے نکل آیا اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے امان چاہی۔ انہوں نے اس شرط پر امان دے دی کہ وہ شہر میں داخل ہونے کا کوئی ایسا رستہ بتائے جس سے شہر فتح ہو سکے اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیا کہ اگر اللہ مسلمانوں کو دشمن پر فتح یاب کر دے گا تو وہ اس کی اور اس کے اہل وعیال کی کفالت کریں گے۔ اس شخص نے بتایا کہ پانی کے رستے شہر میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اشرس بن عوف شیبانی کو اس کے ساتھ کر دیا۔ وہ انہیں ساتھ لے کر نہر دجیل میں اتر گیا اور ایک سرنگ کے رستے شہر میں نکلا۔ جو آب در کے پہلو سے گزرتی تھی ① اور اشرس کو نوکروں کا لباس پہنا کر تستر کے بازاروں اور گلی کوچوں میں پھرایا، اس کے مخفی استحکامات اور ہرمزان کو دکھایا اور اس کے بعد حضرت ابوموسیٰ کے پاس بھیج دیا۔ اشرس نے اس ایرانی کے سچے ہونے کی تصدیق کی۔

① حمزہ اصفہانی کا کہنا ہے، خوزستان میں بہت سی نہریں ہیں جن میں سب سے بڑی نہر تستر ہے۔ جس پر شاپور بادشاہ نے تستر کے دروازے کے قریب ایک شادروان تعمیر کرایا، یہاں تک کہ پانی شہر تک بلند ہو گیا اس لیے کہ تستر زمین سے اونچی جگہ واقع ہے۔ یہ شادروان آدھا میل لمبا ہے جس کی تعمیر میں مضبوط پتھر، چٹانیں اور لوہے کے ستون صرف کیے گئے ہیں اور اس کا فرش سیسے کا ہے۔

Marfat.com

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے چالیس آدمی اشرس کے ساتھ کیے اور دو سو آدمی ان کی کمک پر بھیجے۔ یہ لوگ رات کے آخری حصے میں روانہ ہوئے شہر میں داخل ہو کر پہرہ داروں کو قتل کر دیا اور فصیلوں پر چڑھ کر نعرہ تکبیر بلند کیا۔ ان کی آوازیں سن کر ہرمزان پر دہشت سی طاری ہو گئی۔ وہ اپنے قلعے میں بھاگ گیا اور ہمراہیوں سے کہنے لگا: ''عربوں کو ہمارے بھید بتانے والا، ہو نہ ہو کوئی ہمارا ساتھی ہے جس کی رائے میں عربوں کی قسمت عروج پر ہے اور ہمارا ستارہ ڈوب چکا ہے۔'' اپنے سرداروں کو بھاگتے اور عربوں کو شہر کے دروازے کھول کر اندر گھستے دیکھ کر ایرانیوں میں کھلبلی مچ گئی اور وہ اتنے بدحواس ہوئے کہ حملہ آوروں کے خوف سے اپنے بیوی بچوں کو قتل کر کر کے دجیل میں پھینکنے لگے۔ کیا انہوں نے نہیں سنا تھا کہ شہر ناقابل تسخیر ہے اور ان کا سپہ سالار اپنی شان وقوت کے لحاظ سے ہر جنگ آزما پر فوقیت رکھتا ہے، اب وہی امیر بھاگ رہا ہے، وہی شہر اپنے دروازے کھول رہا ہے اور عرب اس میں بڑھے چلے آ رہے ہیں پھر اس کے بعد ننگ و ذلت اور غلامی وانکساری کی زندگی میں کون سی بھلائی ہے اور جب ایسے ہی موقع پر موت کو زندگی سے زیادہ محبوب نہ سمجھا جائے گا تو کب سمجھا جائے گا؟

ہرمزان اپنے قلعے میں جا کر بیٹھ گیا، جو مسلمان پانی کے رستے شہر میں داخل ہوئے تھے انہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ہرمزان نے جھانک کر دیکھا اور کہنے لگا: ''میرے ترکش میں سو تیر ہیں۔ بخدا! جب تک میرے پاس ایک بھی تیر باقی رہے گا تم مجھ تک نہیں پہنچ سکو گے اور میرا کوئی تیر خطا نہیں کرتا۔ پھر میرے گرفتار کرنے میں کیا لطف رہے گا۔ اگر تم میں سے سو مقتول یا مجروح ہو گئے؟'' اس نے یہ بات ان سے کہہ تو دی مگر یہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر وہ مقابلہ کرتے ہوئے پکڑا گیا تو یقیناً مارا جائے گا اور اب صلح کے سوا بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں۔ مسلمانوں نے پوچھا: ''تم کیا چاہتے ہو؟'' بولا: ''میں اس شرط پر اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے سکتا ہوں کہ تم مجھے عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا دو، وہ میرے ساتھ جیسا سلوک چاہیں کریں۔'' مسلمانوں نے اس کی یہ شرط قبول کر لی۔ ہرمزان نے تیر کمان پھینک کر اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ وہ اس کی مشکیں کس کر حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئے اور پورا واقعہ انہیں سنا دیا۔

ہرمزان کو انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور احنف بن قیس کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کیا گیا۔ مدینہ پہنچ کر ہرمزان اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے درمیان بڑی طویل گفتگو

ہوئی، جسے ہم اس باب کے آخر میں نقل کریں گے۔ ہرمزان کا اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کر دینا ہی تستر کی شکست کا اعلان تھا۔ چنانچہ باقی ماندہ اہل شہر نے مقاومت سے ہاتھ روک لیا اور سپر انداز ہو گئے۔ مسلمانوں نے شہر کا انتظام سنبھال کر اس کے سارے مال واسباب پر قبضہ کر لیا اور خمس امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے لیے نکال کر باقی آپس میں بانٹ لیا۔ اس دن سوار کے حصے میں تین ہزار اور پیادے کے حصے میں ایک ہزار درہم آئے۔ اس سے پہلے کہ خوزستان کے باقی حصے کو فتح کرنے کے لیے ہم اسلامی لشکر کے ساتھ آگے بڑھیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر توقف کریں اور فتح تستر میں جو عبرتیں پوشیدہ ہیں ان کا کھوج لگائیں۔

جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں، تستر خوزستان کا دارالسلطنت تھا، جسے ایران کا مستحکم ترین شہر اور قوی ترین قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ پھر یزدگرد نے ہرمزان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ خوزستان اور فارس کے جنوبی علاقوں کا اقتدار اس کے حوالے کر دے گا۔ چنانچہ یہی سب سے قوی محرک تھا جس نے ہرمزان کی مقاومت میں بے جگری پیدا کی اور وہ مہینوں، مسلمانوں کے سامنے ڈٹا رہا۔ اس کے باوجود تستر کے ایک شخص کے دل نے اسے کیسے گمراہ کیا کہ اس نے عربوں کو شہر میں داخل ہونے کا رستہ بتا دیا اور اپنے تمام اسرار ان پر منکشف کر دیئے؟ بعض روایات تو یہ کہتی ہیں کہ امرائے عجم کی ایک جماعت اپنے آدمیوں سمیت تستر کا محاصرہ کرنے والے مسلمانوں سے مل گئی اور لڑائی میں اپنے ابنائے وطن کے خلاف مسلمانوں کا ساتھ دے کر معنوی ضعف وانتشار کے گہرے غار میں گر پڑی۔ پھر اس مضبوط و مستحکم شہر کی مدافعت میں اتنی مصیبتیں جھیل چکنے کے بعد ہرمزان آخر کار اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کر دینے پر کیوں رضامند ہوا اور اس نے خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ کو اپنی زندگی اور موت کا اختیار کیوں دے دیا؟ میں یہاں قومی شعور کی اس کمزوری کو دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا جس کا ذکر قادسیہ کے ذیل میں آچکا ہے اور جو اس دور کے ایرانی ذہن میں اس حد تک رچ بس گئی تھی کہ حب ذات اور طلب حیات ہر معنوی اعتبار پر غالب آ گئی تھی جس کے زیر اثر ایرانی دربار انتشار و اضطراب کا شکار ہو گیا تھا اور امراء اقتدار کے لیے ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ان آثار ونتائج کو، جو تستر اور اس کے بعد کی ہزیمتوں پر تمام ہوئے، اس معنوی حالت پر منطبق کروں۔

جہاں کہیں کسی قوم میں اجتماعی رشتوں کی بوسیدگی معنوی روح کے اضمحلال کا سبب ہوئی ہے، اس قوم کی قوت مقابلہ نے جواب دے دیا ہے اور اس کی نگاہیں مستقبل تک پھیلنے، اس کے فوائد

Marfat.com

منافع کا احاطہ کرنے سے قاصر ہو گئی ہیں۔ اس اعتبار سے اجتماعی رشتے معنوی زندگی کی اساس و مدار ہیں اور قوم میں معنوی قوت کو وہی مقام حاصل ہے جو مقام فرد میں بقائے ذات کے فطری جذبے کو حاصل ہے۔ جس طرح یہ جذبہ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ تاحد امکان ہم اپنے اعضائے جسم کی صحت و سلامتی کے لیے کوشاں رہیں اور جب بقائے حیات کے لیے کسی عضو کو قطع کرا دینا ضروری ہو جائے تو اسی جبلت کے زیر اثر بلا تکلف اس عضو کو قطع کرا دیں، اسی طرح وہ معنوی قوت، جس کی جماعت میں وہی حیثیت ہے جو فرد میں اس جبلت کی ہے، جماعت کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے افراد کی جہاں تک ممکن ہو حفاظت کرے، لیکن پوری جماعت کے وجود کی حفاظت کے لیے چند افراد کی قربانی ناگزیر ہو جائے تو اس میں مطلق پس و پیش سے کام نہ لے اور یہ افراد بھی اپنے اس قومی وجود کی صیانت میں خوشی خوشی قربانی پیش کریں جس نے انہیں عزت و عظمت بخشی ہے اور جو ان کی آئندہ نسلوں کے وقار و بزرگی کی تنہا ضامن ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جب کسی جسم کی قوت حیات کمزور پڑ جاتی ہے تو اس کے اعضاء اپنا اپنا وظیفہ صرف اپنے اپنے مفاد کے پیش نظر ادا کرتے ہیں، پورے جسم سے انہیں کوئی غرض نہیں رہتی اور اس طرح بقائے حیات کا جذبہ رفتہ رفتہ موت کے لیے جگہ خالی کر دیتا ہے۔ بالکل یہی حال ایک قوم کا ہے کہ جب اس کے افراد میں اجتماعی رشتوں کو گھن لگ جاتا ہے، وہ صرف اپنے ہی مفاد کے لیے سوچنے لگتے ہیں اور ان کی نظر ان ذمہ داریوں تک پہنچنے کے قابل نہیں رہتی جو انہیں ایک دوسرے سے مربوط کرتی ہیں اور جن پر ان کا جماعتی وجود استوار ہوتا ہے تو اس وقت وہ قوم قوت کے بعد کمزوری اور عزت کے بعد ذلت کا شکار ہو جاتی ہے اور اس کی معنوی قوتیں موت کی نیند سو جاتی ہیں جو اس قوم کی جماعتی زندگی کے خاتمے کی دلیل ہے اور جماعتی زندگی ہی کسی قوم کے وجود کی ضامن ہوتی ہے۔

وہ قوم جس کی معنوی روح اپنی قوت کے نقطہ کمال پر پہنچ گئی ہو، مایوسی اور اطاعت سے گوش آشنا نہیں ہوتی اور ذلت و کمزوری کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتی ہے۔ ایسی قوم نہ ذلیل و کمزور ہو سکتی ہے نہ مر سکتی ہے، اس لیے کہ اس کی معنوی قوت حیات ہر کمزوری پر غالب آجاتی ہے اور ہر دوں ہمتی کی راہ میں روک بن کے کھڑی ہو جاتی ہے، اس قوم کے افراد باہمی تعلقات میں ایک جماعت کی مثال ہوتے ہیں جو قوت اور مقام دونوں کے لحاظ سے اس کے وجود کی یکساں ذمہ دار ہوتی ہے۔ ایسی قوم اگر اپنے کچھ افراد سے محروم بھی ہو جاتی ہے تو ان کا کام دوسرے افراد آ

سنبھال لیتے ہیں اور اس طرح نہ صرف یہ کہ اس قوم کو اپنی کھوئی ہوئی چیز کا فطری بدل مل جاتا ہے، بلکہ اس میں پہلے سے بھی زیادہ قوت و طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس قوم کا کوئی فرد زندگی کی کسی راحت یا خود زندگی کے لیے دشمن کو اپنے بھید نہیں بتاتا اور جب اس کا کوئی سردار ہرمزان کی طرح گھر جاتا ہے تو زندگی پر، لڑتے لڑتے جان دے دینے کو ترجیح دیتا ہے کہ اس کی جنگ اور اس کی موت اس کے ہم عصروں کے لیے ایک بلند مثال اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک برتر سبق بن جائے۔ اگر تقدیر اس قوم کو کسی دن مغلوب کر بھی دیتی ہے تو دوسرے دن وہ پھر اٹھتی ہے، اپنی قوتیں جمع کر کے میدان میں اترتی ہے اور اس طرح تمام قوموں کے ساتھ شان و شوکت اور عزت و طاقت کی زندگی بسر کرتی ہے۔

ایرانی قوم کے اجتماعی رشتے، ان اسباب کی بنا پر جن کا ذکر ہم اس کتاب میں کسی اور جگہ کر چکے ہیں، چونکہ مضمحل ہو گئے تھے اور اس اضمحلال نے ان کی معنوی قوت کو تباہ کر دیا تھا، اس لیے اس پر روم اور پھر عرب کا غالب آ جانا بالکل فطری بات تھی۔ اس کے افراد جہاں کسی کو اپنے ملک پر چڑھائی کرتے دیکھتے تھے دشمن کو اپنے تمام بھید بھاؤ بتا دیتے تھے اور اپنی زندگی کا امن و سکون حاصل کرنے کے لیے اس کے ساتھ مل کر اپنی قوم کے خلاف لڑتے تھے۔ حالانکہ اس طرح وہ خود اپنے وطن کا امن و سکون غارت کر دیتے تھے۔ اس کی بہت سی مثالیں آپ کی نظر سے گزر چکی ہیں۔ آپ نے امرائے عجم کی پراگندگی اور سازشیں دیکھی ہیں۔ ایرانی فوجوں اور سپہ سالاروں، بلکہ خود یزدگرد کو مدائن اور حلوان سے بھاگتے دیکھا ہے، پھر جب کسی قوم کی معنوی زندگی کا یہ حال ہو تو کیا تعجب ہے اگر اس کے افراد، جو یہ بھول چکے ہیں کہ وہ اسی قوم کے فرزند ہیں اور اس کے ان پر بڑے احسانات ہیں، اس سے غداری کریں اور کیا تعجب ہے اگر قومی رشتوں کے انتشار و اضمحلال کے بعد اس کا ہر فرد زندگی اور عزت و بزرگی اور اقتدار جو کچھ تلاش کرے صرف اپنے ہی لیے تلاش کرے۔

تستر، اہواز کے شمال میں اس سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر، نہر کارون کے کنارے آباد ہے اور سوس، تستر کے مغرب میں چند میل کی مسافت پر واقع ہے، تستر کے محاصرے کے دوران میں مسلمانوں اور اہل سوس کے درمیان اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس لیے لازمی امر تھا کہ مسلمان تستر سے فارغ ہو کر سوس کا رخ کرتے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ سوس کی لڑائی نے طول کھینچا اور مسلمانوں کو اچھی خاصی دقت اٹھانی پڑی۔ یہاں تک کہ شہر میں کھانے پینے کا سامان

ختم ہو گیا اور اہل سوس کے لیے صلح کے سوا موت سے بچنے کا اور کوئی رستہ نہ رہا۔ انہوں نے رئیس شہر سے درخواست کی کہ مسلمانوں سے صلح کی بات چیت کرے۔ رئیس شہر نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے اس شرط پر صلح چاہی کہ اس کے سو رشتہ داروں کی جان بخش دی جائے۔ یہ شرط منظور کر لی گئی۔ رئیس شہر نے سو آدمیوں کے نام گنوا دیئے، لیکن اپنا نام بھول گیا، حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ رئیس شہر بوکھلا گیا اور کہا: ''مجھے چھوڑ دو، میں تمہیں بہت سامان دوں گا۔'' لیکن حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا اور اس کی گردن مار دی۔

فتح سوس کی روایات کے سلسلے میں علامہ طبری نے لکھا ہے کہ یزدگرد کے حکم سے سیاہ اسواری مسلمانوں سے لڑنے اصفہان سے نکلا مگر جب اس نے دیکھا کہ صوبہ اہواز کے بعد مسلمانوں نے تستر پر بھی قبضہ کر لیا ہے تو ان سرداروں کو جمع کر کے، جو اس کے ساتھ آئے تھے، مسلمانوں کے کارنامے بیان کیے اور کہا: ''جو لشکر ان کے مقابلے پر آتا ہے وہ اسے شکست دے دیتے ہیں اور جس قلعے پر وہ حملہ کرتے ہیں اسے فتح کر لیتے ہیں۔ اب اپنے بارے میں سوچ لو۔'' سب نے اس سے اتفاق کیا اور حضرت ابوموسیٰ کے پاس پیغام بھیجا: ''ہمیں تمہارے دین سے دلچسپی ہے اور ہم اس شرط پر اسلام قبول کر سکتے ہیں کہ تمہارے ساتھ ایرانیوں سے لڑیں گے، عربوں سے جنگ نہیں کریں گے اور اگر کوئی عرب ہم سے لڑے گا تو تم ہماری حفاظت کرو گے۔ ہم پر کوئی روک ٹوک نہ ہو گی، جہاں ہمارا جی چاہے گا، رہیں گے۔ تم ہمیں امتیازی عطیے دو گے اور اس کی ضمانت ہم اس امیر سے لیں گے جو تم سب کا افسر ہے۔'' حضرت ابوموسیٰ نے جواب دیا: ''نہیں، ہمارے حقوق و فرائض برابر برابر ہوں گے!'' لیکن وہ اس پر رضامند نہ ہوئے۔ حضرت ابوموسیٰ نے پورا واقعہ بارگاہ خلافت میں لکھ بھیجا جس کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تحریر فرمایا: ''جو کچھ وہ مانگتے ہیں انہیں دے دو!''

چنانچہ وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ حضرت ابوموسیٰ ان میں سے سو آدمیوں کے دو دو ہزار اور چھ آدمیوں کے، جو ان کے سردار تھے، ڈھائی ڈھائی ہزار روزینے مقرر کر دیئے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ سوس میں دانیال علیہ السلام نبی کی قبر ہے، ان کی لاش عریاں ہے اور لوگ اس سے مرادیں مانگتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ لاش کو کفنا کر دفن کر دیا جائے۔ حضرت دانیال علیہ السلام کا مزار آج بھی اس شہر میں عظمت و جلال کا مرکز بنا ہوا ہے۔ انیسویں صدی عیسوی میں اس کے گرد ایک عمارت بنوا دی گئی ہے جہاں لوگ زیارت

برکت کے لیے حاضری دیتے ہیں۔ سوس سے فارغ ہوکر مسلمان جندیٰ شاپور کی طرف بڑھے جو سوس کے شمال مشرق میں اس کے قریب ہی واقع ہے۔ کئی دن محاصرہ رہا، ایک دن شہر کے دروازے خود بخود کھل گئے، گویا اہل شہر اور مسلمانوں کے درمیان صلح ہو چکی ہے۔ مسلمانوں نے اس خوف سے کہ اس میں کوئی چال نہ ہو، لوگوں کو دریافت حال کے لیے بھیجا۔ شہر والوں نے کہا: ''تم نے جزیے کی شرط پر جو امان بھیجی تھی وہ ہم نے قبول کر لی۔'' سب کو حیرت تھی کہ یہ کیا ہوا؟ تحقیق سے پتا چلا کہ ایک غلام نے اہل شہر کو امان کا رقعہ لکھ دیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو واقعے کی اطلاع دی گئی اور انہوں نے صلح کی اجازت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''اس امان نامے کا احترام کیا جائے!''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وقتاً فوقتاً ان فتوحات کی خبریں پہنچ رہی تھیں اور جب کوئی خبر آپ کو ملتی، آپ مسلمانوں کی توفیق اور راست قدمی پر اللہ کے حضور سجدہ شکر بجالاتے۔ ان کا جذبہ تشکر اور بھی بڑھ جاتا، جب انہیں مفتوحہ شہروں کی اہمیت معلوم ہوتی اور مسلمانوں کے ایلچی ان شہروں کی خوبیاں بیان کرتے۔ چنانچہ اہواز (یا ایرانیوں کی زبان میں ہرمز شہر) ایک بہت بڑا شہر تھا جو مدائن کی طرح سات پرگنوں کو شامل تھا۔ ہر پرگنہ آبادی و تجارتی گہما گہمیوں کا مرکز تھا۔ ایران کے مختلف گوشوں میں اس شہر کی عظمت و شان کے چرچے تھے، تستر خوزستان کا دارالسلطنت تھا، جسے اس زمانے میں غیر معمولی شہرت حاصل تھی۔ یہ ایران کے میدانی علاقے کے جنوب مغرب میں ایک ناقابل تسخیر قلعے کی حیثیت رکھتا تھا۔ سوس، جس کا پرانا نام شوشان ہے اور جو مدت دراز تک میڈیا کا دارالسلطنت رہا، اپنے حسن و رونق کے اعتبار سے ہر شخص کے دل کی دھڑکن بنا ہوا تھا اور خوزستان...... وہ وسیع و عریض صوبہ ہے جو عراق عرب اور عراق عجم کے درمیان پھیلا ہوا تھا، اکاسرہ کے تاج کا ایک گراں بہا موتی تھا۔ اللہ نے ان شہروں میں ہر جگہ مسلمانوں کو عزت و نصرت سے نوازا تو کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ فتوحات کا یہ سلسلہ جاری رکھیں اور اسلامی فوجوں کو مشرقی ایران کے آخری سرون تک پہنچ جانے کا حکم دے دیں، یا فتوحات کا دامن مفتوحہ علاقوں سے آگے نہ پھیلنے دیں اور ایرانیوں کو ان کے علاقے میں پریشان نہ کریں، ان کے دلوں میں انتقام کی آگ نہ بھڑکائیں کہ وہ اسلامی فوجوں کی مقاومت پر ڈٹ جائیں جس کے نتائج اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہوں گے؟

ادھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس مسئلے پر غور فرما رہے تھے، اللہ سے اپنے آئندہ اقدام کے لیے

Marfat.com

ہدایت طلب کر رہے تھے اور ادھر حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور احنف بن قیس اپنے آدمیوں کے ہمراہ مال غنیمت کا خمس اور ہرمزان کو ساتھ لے کر تستر سے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ ہو رہے تھے۔ مدینہ کے قریب پہنچ کر ہرمزان نے دیبا کی زرکار پوشاک زیب بدن کی، موتیوں اور جواہر سے مرصع تاج، جو آذین کے لقب سے مشہور تھا، سر پر رکھا اور خالص سونے کا عصائے شاہی، جس میں موتی اور یاقوت جڑے ہوئے تھے، ہاتھ میں لیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور اسلامی دارالخلافہ کے باشندے وہ ٹھاٹ باٹھ دیکھیں جو امرائے عجم کا شعار ہے۔ مدینہ میں داخل ہو کر ان لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مکان کا رخ کیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کوفہ کے وفد سے بات چیت کرنے مسجد میں تشریف لے گئے ہیں۔ ان لوگوں نے وہاں پہنچ کر تلاش شروع کی۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نظر نہ آئے۔ مدینہ کے چند لڑکوں کی نگاہ ان پر پڑی، وہ ان کا مقصد سمجھ گئے اور انہیں بتایا کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ مسجد کی دائیں طرف اپنے چغے پر سر رکھے سو رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کوفہ کے وفد سے ملاقات کرنے کے لیے چغہ پہن کر تشریف لائے تھے، جب وفد رخصت ہو گیا تو آپ نے چغہ اتار کر اسے تکیہ بنایا اور اس پر سر رکھ کر سو گئے۔ احنف رضی اللہ عنہ، انس رضی اللہ عنہ اور ہرمزان واپس ہوئے۔ پیچھے پیچھے مدینہ کے لڑکے اور وہ تماشائی تھے جن کی آنکھوں میں اس عجمی رئیس کے شاہانہ لباس نے چکاچوند پیدا کر دی تھی اور وہ اس کی زینت و آرائش سے نظر آسودہ ہونے کے لیے کھنچے کھنچے چلے آ رہے تھے، یہ لوگ مسجد میں داخل ہوئے اور چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ مسجد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ یہ لوگ خاموشی سے بیٹھ گئے کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے آرام میں خلل نہ پڑے۔

ہرمزان لوگوں کے بار بار آنے جانے سے بھی ان کا مقصد نہ سمجھ سکا کہ ان کی باتیں اس کے لیے ناقابل فہم تھیں، جب اس نے یہ دیکھا کہ مسلمان اطمینان سے مسجد میں بیٹھ گئے ہیں اور وہاں اس سونے والے شخص کے سوا اور کوئی نہیں تو یہ خیال کیا کہ یہ لوگ شاید نماز پڑھنے کے بعد اپنے بادشاہ سے ملیں گے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ہو نہ ہو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت پہرے داروں کی حفاظت میں رونق افزائے ایوان شاہی ہوں گے کیونکہ ایسے باجبروت شہنشاہ کے لیے، جس کی فوجوں نے ایران و روم کے پرخچے اڑا دیئے ہیں، ایک ایسا ایوان ہونا ضروری ہے، جس کے دروازے پر دربان ہوں۔ لوگ ان کی سادہ زندگی کی کتنی ہی باتیں کریں، لیکن یہ سادگی اس وسیع ملک کو مختلف محکموں سے بے نیاز نہیں کر سکتی جو اس کا انتظام چلائیں۔ نہیں! امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے

لیے ایوان و دربار ہونے ہی چاہئیں، جن کے ذریعے سے وہ اپنے وقت اور کام کی تنظیم کر سکیں۔
ہرمزان نے دیکھا کہ احنف بن قیس ہر کانا پھوسی کرنے والے کو خاموش رہنے کا اشارہ کر رہے ہیں کہ خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ کی نیند پریشان نہ ہو۔ پاس بیٹھے ہوؤں میں جو لوگ اس کی زبان سمجھتے تھے، ہرمزان نے ان سے پوچھا: ''عمر کہاں ہیں؟'' سونے والے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا: ''وہ رہے!''

یہ بات رئیس عجم کے سان و گمان میں نہ تھی....؟ اس نے شدت حیرت سے تھوڑی دیر کے لیے سر جھکا لیا اور اس کے بعد پوچھا: ''ان کے دربان اور پہرے دار کہاں ہیں؟'' جواب ملا: ''ان کا نہ کوئی پہرے دار اور دربان ہے نہ کوئی کاتب اور ایوان!'' ہرمزان کو یہ سن کر اور بھی تعجب ہوا۔ اس نے اپنے پاس والوں یا اپنے دل سے کہا: ''اس شخص کو پیغمبر ہونا چاہیے اور اگر یہ پیغمبر نہیں ہے تو اس کا عمل ضرور پیغمبروں کا سا ہے۔'' سرگوشیوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بیدار کر دیا اور آپ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اپنے پہلو میں رئیس عجم کو بیٹھے دیکھ کر، جس کے لباس اور عصائے شاہی کے جواہر آنکھوں کو خیرہ کیے دیتے تھے، آپ نے پوچھا: ''یہ ہرمزان ہے؟'' لوگوں نے عرض کیا ''ہاں!''

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسے اور اس کے طمطراق کو غور سے دیکھتے ہوئے فرمایا: ''میں آگ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اور اسی سے مدد چاہتا ہوں۔ ہزار ہزار شکر ہے اس خدا کا جس نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو اسلام کے مقابلے میں ذلیل و خوار کیا۔ مسلمانو! اس دین کو مضبوطی سے پکڑ لو اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر چلو۔ دنیائے دُوں کی دلفریبیوں میں نہ آؤ، دنیا بڑی دھوکے باز ہے۔'' تستر سے آئے ہوئے وفد نے عرض کیا: ''یہ شاہ اہواز ہیں، ان سے گفتگو فرمائیے!''
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نہیں! جب تک اس کے جسم پر اس لباس میں سے ایک تار بھی باقی ہے اس سے گفتگو نہیں کروں گا۔'' اور امیر المومنین رضی اللہ عنہ اس شخص سے بات کر بھی کیسے سکتے تھے، جس نے مسلمانوں کے بے مثال بہادروں کو شہید کیا تھا اور اب وہ بارگاہ خلافت میں شاہی لباس پہنے بیٹھا تھا۔ وہ تو اس کی بے عزتی اور قتل کا حکم دینے والے تھے۔

لوگوں نے ستر پوش کے سوا ہرمزان کی ساری پوشاک اتار دی اور موٹا جھوٹا لباس پہنا دیا۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب اسے اس حال میں دیکھا تو فرمایا: ''کیوں اے ہرمزان! تو نے سرکشی کا وبال اور حکم الٰہی کا نتیجہ دیکھا؟'' ہرمزان نے جواب دیا: ''اے عمر! جاہلیت کے زمانے میں جب خدا نے ہمیں اور تمہیں ٹکرایا تھا تو ہم تم پر غالب آئے تھے اس لیے کہ خدا نہ ہماری طرف تھا نہ

Marfat.com

تمہاری طرف، لیکن جب وہ تمہارے ساتھ ہوا تو تم ہم پر غالب آگئے!'' حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم جاہلیت میں ہم پر اپنے اتحاد اور ہماری پراگندگی کی وجہ سے غالب آئے تھے، لیکن اب اپنی پے درپے شکستوں کے لیے تمہارے پاس کون سا عذر اور کون سی دلیل ہے؟''
ہرمزان نے دیکھا کہ یہ سوال کرتے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے غیظ و غضب کی چنگاریاں نکل رہی ہیں، اس نے کہا: ''مجھے ڈر ہے کہ یہ بتانے سے پہلے ہی آپ مجھے قتل کر دیں گے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس سے نہ ڈرو!''

ہرمزان نے پینے کے لیے پانی مانگا۔ ایک بے ہنگم سے پیالے میں پانی لایا گیا۔ ہرمزان نے کہا: ''اگر میں پیاس سے مر بھی جاؤں تو بھی ایسے پیالے میں پانی نہیں پی سکتا۔'' چنانچہ دوسرے گلاس میں پانی لایا گیا جسے اس نے قبول کر لیا، لیکن جب گلاس لیا تو اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور وہ بولا: ''مجھے خوف ہے کہ پانی پیتے ہی میں قتل نہ کر دیا جاؤں؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جب تک تم پانی نہ پی لو تمہیں کوئی خطرہ نہیں؟'' ہرمزان نے یہ سن کر سارا پانی انڈیل دیا۔ (زمین پر ڈال دیا)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا: ''اس کے لیے دوبارہ پانی لاؤ، اسے بیک وقت قتل اور پیاس کی مصیبت میں مبتلا نہ کرو!'' ہرمزان نے کہا: ''مجھے پانی کی ضرورت نہیں، میں تو اپنی جان بچانا چاہتا تھا۔'' اس کے بعد ان دونوں میں گفتگو شروع ہوئی، جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے شدت اور سختی دیکھ کر احنف بن قیس رضی اللہ عنہ اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو دخل دینا پڑا۔ علامہ طبری اور ابن کثیر نے یہ گفتگو اس طرح نقل کی ہے:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ: ''میں تجھے قتل کروں گا۔''

ہرمزان: ''لیکن آپ مجھے امان دے چکے ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ: ''تو جھوٹ بولتا ہے۔''

انس بن مالک رضی اللہ عنہ: ''یہ سچ کہتا ہے امیر المومنین! آپ اسے امان دے چکے ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ: ''افسوس، اے انس! میں مجزاۃ اور براء کے قاتل کو امان دے سکتا ہوں؟ اللہ کی قسم! یا تو مجھے یہ بتاؤ کہ یہ مفہوم تم نے میرے کن الفاظ سے اخذ کیا، ورنہ میں تمہیں سزا دوں گا۔''

انس بن مالک رضی اللہ عنہ: ''آپ نے اس سے فرمایا تھا، جب تک تم میری بات کا جواب دے

رہے ہو تمہیں خوف نہ کرنا چاہیے۔ اس کے بعد آپ نے اس سے فرمایا تھا۔ جب تک تم پانی نہ پی لو، اندیشے کی کوئی بات نہیں۔"

احنف بن قیس رضی اللہ عنہ اور دوسرے حاضرین نے بھی انس رضی اللہ عنہ کے قول کی تائید کی اور کہا کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ ہرمزان کو امان دے چکے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہرمزان پر ایک غضب ناک نگاہ ڈالی اور فرمایا: "تو نے مجھ سے فریب کیا۔ خدا کی قسم! میں صرف ایک مسلمان کی خاطر دھوکا کھا رہا ہوں۔"

اس کے بعد ہرمزان نے اسلام قبول کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا دو ہزار سالانہ روزینہ مقرر کر دیا اور اسے مدینہ میں رہنے کی اجازت عطا فرمائی۔ علامہ بلاذری نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ مروان بن معاویہ سے حمید نے کہا اور ان سے انس رضی اللہ عنہ نے کہا: "ہم نے تستر کا محاصرہ کیا۔ ہرمزان نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ابو موسیٰ نے ہرمزان کو میرے ساتھ (حضرت) عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا۔ میں اس کو لے کر مدینہ مبارک پہنچا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: "کچھ بات کر!"

اس نے کہا: "زندہ رہنے والوں کی سی یا مرنے والوں کی سی؟"

بولے: "بات کر ڈر نہیں!"

ہرمزان نے کہا: "ہم عجمی اس وقت تک تمہیں مارتے اور دباتے رہے جب تک اللہ نے ہمیں اور تمہیں نبٹ لینے کو آزاد چھوڑ دیا تھا، لیکن جب اللہ تمہارے ساتھ ہو گیا تو ہمارے ہاتھ تمہارے مقابلے سے عاجز ہو گئے۔"

(حضرت) عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "انس! کہو کیا کہتے ہو؟"

میں نے کہا: "میں اپنے پیچھے ایک تیز کانٹا اور سگ گزیدہ دشمن چھوڑ آیا ہوں۔ اگر امیر المومنین رضی اللہ عنہ اسے قتل کر دیں گے تو اس کی قوم زندگی سے مایوس ہو جائے گی اور جان توڑ کر لڑے گی اور اگر اس کو زندہ رہنے دیا تو اسے زندگی کا لالچ دامن گیر ہو گا۔"

(حضرت) عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "انس! سبحان اللہ! اس نے براء بن مالک اور مجزاۃ بن ثور سدوسی کو قتل کیا ہے؟"

میں نے کہا: "امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے پاس اس کے قتل کی کوئی سبیل نہیں ہے!"

بولے: "کیا اس نے تمہیں کچھ دے دیا ہے؟"

Marfat.com

میں نے کہا: ''لیکن امیر المومنین رضی اللہ عنہ ہی نے اس سے کہا تھا، کوئی بات نہیں۔''

بولے: ''یہ میں نے کب کہا؟ شاہد لاؤ، ورنہ میں پہلے تم ہی کو سزا دوں گا!''

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں اٹھا اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے پاس گیا۔ وہ اس وقت مجلس میں موجود تھے اور انہیں وہ بات یاد تھی، وہ آئے اور انہوں نے شہادت دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہرمزان کو رہا کردیا اور وہ اسلام لایا اور اس کے لیے روزینہ مقرر کردیا گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ہرمزان کے درمیان ترجمانی کے فرائض حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ انجام دے رہے تھے، لیکن وہ حضرت زید بن ثابت کی طرح فارسی زبان میں مہارت نہ رکھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید کو بلوایا۔ وہ آئے اور ترجمانی کرنے لگے۔ ہرمزان کی بات میں اس کی مسلمانوں سے بار بار عہد شکنی کا کوئی جواب نہ پا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس وفد کی طرف رخ کیا جو تستر سے آیا تھا اور کہا: ''شاید مسلمان ذمیوں کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں جس کی وجہ سے وہ عہد شکنی کرتے ہیں۔''

وفد نے عرض کیا: ''ہمارے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے، جس سے مسلمانوں کے حسن سلوک اور وفائے عہد پر حرف آتا ہو!''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''پھر وہ عہد شکنی کیوں کرتے ہیں؟''

ارکان وفد نے بہت چاہا کہ مسلمانوں کی خوش سلوکی کے باوجود ذمیوں کی عہد شکنی کا سبب ظاہر کریں، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان میں سے کسی کی بات میں قابل اطمینان پہلو نظر نہ آیا۔ اس وقت احنف بن قیس رضی اللہ عنہ نے کہا:

''امیر المومنین! اس کی وجہ میں بتاتا ہوں۔ آپ نے ہمیں ملک میں آگے بڑھنے سے روک دیا ہے اور حکم دے رکھا ہے کہ جو علاقے ہمارے قبضے میں ہیں، ہم انہیں میں محدود رہیں، لیکن ایران کا بادشاہ زندہ ہے اور ان کی پشت پر موجود ہے۔ جب تک وہ (زندہ) رہے گا، ایرانی ہم سے لڑتے رہیں گے۔ کیونکہ ایک جگہ دو بادشاہ کبھی اتفاق سے نہیں رہ سکتے، تاوقتیکہ ان میں سے ایک، دوسرے کو نکال باہر نہ کرے اور یہ آپ دیکھ ہی چکے ہیں کہ ہم نے یکے بعد دیگرے ان علاقوں پر قبضہ کیا ہے وہ انہیں کے طغیان وسرکشی کی بنا پر کیا ہے۔ دراصل یہ ایرانیوں کا بادشاہ ہے جو انہیں ابھار ابھار کر ہمارے مقابلے میں بھیجتا ہے۔ اور ان کی یہ حرکتیں جاری رہیں

تا آنکہ آپ ہمیں آگے بڑھنے کا حکم نہ دیں۔ جس وقت ہم ان کے ملک میں گھس کر شاہ ایران کو اس کی مملکت سے نکال دیں گے۔ ایرانیوں کی تمام امیدیں منقطع ہو جائیں گی اور ان کے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صبر وسکون کے ساتھ احنف کی توجیہات سنیں۔ پھر بڑی دیر تک سر جھکائے کچھ سوچتے رہے، اس کے بعد فرمایا: "تم نے سچ کہا اور شرح وتفسیر کا حق ادا کر دیا۔"
ہرمزان کو جب احنف رضی اللہ عنہ کی تقریر کا مطلب معلوم ہوا تو اس نے بھی تائید کی، جس کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس پر اور بھی اعتماد واطمینان ہو گیا۔ اس کے بعد خبریں پہنچیں کہ اہل نہاوند مسلمانوں سے لڑنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ اب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے لیے اس تقریر کی صداقت میں شبہے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی اور وہ تردد وکشمکش کی حالت سے نکل گئے۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ فتوحات کو عراق کی حدود سے آگے نہ بڑھنے دینا ناممکن ہو گیا ہے اور واقعات انہیں طوعاً وکرہاً ان کی سیاست سے ہٹا کر ایرانی فتوحات میں توسیع کی طرف لے جا رہے ہیں تا آنکہ یزدگرد کو سرزمین ایران ہی سے نکال دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو ارض ایران میں بڑھنے اور ایرانیوں سے لڑنے کے لیے کیل کانٹے سے لیس ہونے کا حکم دے دیا۔

ہرمزان نے مدینے میں اقامت اختیار کر لی اور اسلام کی بہترین خدمات انجام دیتا رہا۔ وہ ہر وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہتا اور انہیں مشورہ دینے میں بھی بخل سے کام نہ لیتا، لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید کیے گئے تو ہرمزان پر ان کے قتل کی سازش میں شریک ہونے کا الزام لگایا گیا۔ عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا یقین ہو گیا اور انہوں نے ہرمزان اور اس کے ساتھ جفینہ کو قتل کر دیا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی جہاں ہم اس کے نتائج پر تبصرہ کریں گے۔

اب ہمیں ایران واپس چلنا چاہیے یہ دیکھنے کے لیے کہ وہاں کیا ہوا؟ اور اہل نہاوند مسلمانوں سے لڑنے کے لیے کس طرح جمع ہوئے؟ پھر ہمیں اس پر بھی نگاہ ڈالنی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی نئی سیاست (فتوحات کی توسیع کی سیاست) کس طرح مرتب فرمائی، جس کے نتیجے میں پورے ایران اور پورے مصر پر ان کا قبضہ ہو گیا۔

باب:16

فتح نہاوند

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے احنف بن قیس رضی اللہ عنہ کی تقریر سنی اور ان سے فرمایا: "بخدا! تم نے سچ کہا اور شرح وتفسیر کا حق ادا کر دیا۔" اور اس کے بعد نہاوند کی خبریں پہنچیں تو ذہن فاروقی رضی اللہ عنہ میں شک وتردد کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ بالکل فطری تھا کہ یہ خبریں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل سے شک وتذبذب کی کیفیت دور کر دیں۔ اس لیے کہ جب ہرمزان اور اس کے لشکر کی شکست کی اطلاعات مختلف صوبوں میں پہنچیں تو امرائے عجم پر دہشت سی طاری ہوگئی اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اگر باہمی بے اعتمادی اور پراگندگی کا سلسلہ ختم نہ ہوا تو ہرمزان کا سا حشر ان کا بھی ہوگا! انہوں نے ایک دوسرے کو خط لکھے اور ایلچی بھیجے کہ ان حملہ آوروں کے خلاف ہمیں متحد ہو جانا چاہیے جو آج سے چند سال پہلے تک ایران کی قوت وسطوت کے کاسہ لیس تھے اور ان میں سے کسی کی جرأت نہ تھی کہ اس کی ہیبت کے سامنے آنکھ اٹھا سکتا، لیکن آج وہ ایرانیوں کے گھروں میں گھس کر لڑ رہے ہیں۔ ان کا اقتدار ایران کے وسیع صوبوں میں پھیلتا جا رہا ہے اور ان کی پیش قدمیاں اس طرح جاری ہیں، گویا روئے زمین پر کوئی نہیں ہے جو ان کی طاقت کے سامنے ٹھہر سکے۔

سب سے پہلے جو قدم ان امراء نے متفقہ طور پر اٹھایا وہ یہ تھا کہ اس تحریک کی قیادت کے لیے یزدگرد کو خط لکھا تاکہ عوام ان کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔ کسریٰ، ایران کا سرنامہ، اس کے مجد وشرف کا وارث اور اس کے نظام کا مرکزی نقطہ تھا۔ ملک کے مختلف گوشوں میں عوام اس کی اطاعت کا دم بھرتے تھے اور ایران کا کوئی چھوٹا بڑا اس کے حکم سے سرتابی نہ کرتا تھا۔ مدائن سے فرار ہونے کے بعد یزدگرد ایران کے مختلف دارالسلطنتوں میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ حوادث نے اسے حلوان سے "ری" پہنچایا۔ وہاں سے وہ اصفہان بھاگا، اصفہان سے اصطخر اور اصطخر سے مرو۔ اس دوران میں مسلمانوں کی خبریں اس کی پریشانیوں کو اور بڑھاتی رہیں، لیکن جب امرائے عجم کا

خط اسے ملا اور اس خط میں اس نے دشمن کے خلاف ان کا جذبہ غیرت و اتحاد دیکھا تو اس میں جوانی کی ایک لہر اٹھی، جس نے اس کی مایوسی کو امید اور بے چینی کو اطمینان سے بدل دیا۔ اس نے تمام اہل ایران کو ایک پیام دیا، جس میں ان کی غیرت و حمیت کو اکسایا اور باب، خراسان، حلوان، بجستان، طبرستان، جرجان، نہاوند، ری اور اصفہان، ہمدان، غرض اپنی سلطنت کے تمام صوبوں اور شہروں میں ایک فرمان جاری کیا جس میں اہل ایران کی شجاعت کو ابھار کر انہیں بتایا کہ عربوں کا حملہ ایک چڑھتی ہوئی آندھی ہے جو بہت جلد اتر جائے گی۔ عارضی بادل ہیں جو آناً فاناً چھٹ جائیں گے، لیکن اس آندھی کا اترنا اور ان بادلوں کا چھٹنا، ایرانیوں کے شانہ بشانہ چلنے اور دشمن کے مقابلے میں آہنی دیوار کی طرح ڈٹ جانے پر موقوف ہے۔ اگر وہ ثابت قدم رہے تو اس کو اپنے ملک سے نکال دیں گے اور وہ ناکام و دل شکستہ، ان کے کارناموں کو دہراتا ہوا الٹے پاؤں واپس ہو جائے گا۔

خوزستان اور ہرمزان کی خبریں تمام ایران میں پھیل گئیں جس سے ہر چھوٹا بڑا سہم کے رہ گیا اور جب کسریٰ کا فرمان پہنچا تو سب کے سب لبیک کہتے ہوئے اس کی طرف دوڑے۔ چنانچہ تمام امیروں نے اپنے اپنے لشکر نہاوند کی طرف بھیج دیئے۔ یہاں تک کہ ڈیڑھ دو لاکھ کا جم غفیر فیروزان کے جھنڈے تلے آ گیا۔ جب یہ تمام فوجیں جمع ہو گئیں اور ملک کے مختلف گوشوں سے آئے لشکروں کے سالار فیروزان کے پاس پہنچے تو اس نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا: ''محمد (ﷺ) نے، جو عربوں کے پاس یہ دین لے کر آئے، ہمارے ملک سے تعرض نہیں کیا۔ ان کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور انہوں نے بھی ہمارے اپنے ملک سے غرض نہیں رکھی، سواد سے متصل صرف انہی بستیوں اور شہروں پر چڑھائی کی، جن میں عرب آباد تھے، لیکن جب سے ملک کی باگ ڈور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں آئی ہے وہ ہماری بے حرمتی کر رہا ہے۔ ہمارا ملک ہم سے چھین رہا ہے۔ یہی نہیں وہ ہمارے گھروں میں گھس کر ہم پر حملہ کر رہا ہے۔ حکومت کا صدر مقام اس نے لے لیا ہے اور سواد و اہواز کے اکثر علاقوں پر اس کا قبضہ ہو گیا ہے۔ پس اگر تم اس کی طرف نہ بڑھے تو وہ تمہاری طرف آئے گا اور یہ خطرہ اس وقت تک دور ہونے والا نہیں جب تک تم اس کی فوج کے ایک ایک سپاہی کو اپنے ملک سے نہ نکال دو۔ ان دو شہروں، بصرہ اور کوفہ کی اینٹ سے اینٹ نہ بجا دو! اور اس کے بعد اسے اپنے فرار اور اپنے ملک کے بچاؤ کی فکر میں نہ الجھا دو!''

Marfat.com

سالاران لشکر نے یہ بات فوج کے سامنے دہرائی تو ان کے جذبہ شجاعت میں آگ سی لگ گئی۔ وہ اس دن کا انتظار کرنے لگے جب انہیں دشمن کے سامنے صف آرا ہونے کا موقع ملے گا اور ان میں سے ہر ایک نے قسم کھالی کہ جب تک کسریٰ اور اس کی فوجوں کو فتح نصیب نہ ہوگی، وہ اپنے وطن نہیں جائے گا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو پیہم یہ خبریں ملیں تو انہیں احنف بن قیس کی صداقت رائے کا یقین ہو گیا اور اس امر میں کوئی شک باقی نہ رہا کہ جب تک ایرانیوں پر کاری ضرب نہ لگائی جائے گی، وہ اسی طرح برسر پیکار رہیں گے اور اگر کہیں تقدیر ان پر مہربان ہوگئی تو ان کے گھوڑے عراق عرب کو دوبارہ پامال کر دیں گے۔ اس وقت یہ عربی حکومت جس کے قیام کی طرف سے وہ مطمئن ہو گئے ہیں، اضطراب وانتشار ہی نہیں، زوال وہلاکت کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو عراق اور اس کے انجام کی فکر یہ دیکھ کر اور بھی ہوئی کہ بعض عرب، جو وہاں جا کر آباد ہو گئے تھے، فتنہ وفساد اور عداوت وخصومت کی طرف مائل ہوتے جارہے تھے۔ زندگی کی آسائشوں نے ان کے دلوں میں رشک ومنافست کی آگ سلگا دی تھی۔ پھر وہ آپس کے لڑائی جھگڑوں میں اتنے الجھ گئے تھے کہ ان کے خلاف ایرانیوں کی تیاریاں بھی ان کی توجہ اپنی طرف منعطف نہ کر سکیں۔ چنانچہ ایک طرف تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ یزدگرد، فیروزان اور نہاوند میں جمع ہونے والے ایرانی لشکروں کی خبریں امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کر رہے تھے اور دوسری طرف اہل کوفہ کی ایک جماعت، جراح بن سنان اسدی کی قیادت میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے برسر پرخاش تھی۔ ان کے خلاف شورشیں برپا کر رہی تھی اور ایک ایک بات کی شکایت بارگاہ خلافت میں بھیج رہی تھی۔ اس نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ پر یہ تک الزام لگا دیا تھا کہ وہ نماز اچھی طرح نہیں پڑھاتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے مدینہ میں ملاقات کی اور ان کی شکایتیں سننے کے بعد فرمایا: ''تمہارے شر کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ تم اس مسئلے کو ایسے وقت میں لے کر اٹھے ہو، جب دشمن تمہیں نیست ونابود کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے، لیکن خدا کی قسم! اس کے باوجود میں تمہاری شکایتوں پر غور کروں گا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عمال کے خلاف شکایتوں کی تحقیقات کے لیے محمد بن مسلمہ کو مقرر فرماتے تھے۔ چنانچہ انہیں کوفہ بھیجا۔ وہاں پہنچ کر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ پر عائد کردہ الزامات کے سلسلے میں لوگوں سے پوچھ گچھ شروع کی تو انہوں نے کہا: ''سعد رضی اللہ عنہ

ہمیشہ بھلائی کی ہے، ہم ان کا تبادلہ نہیں چاہتے!'' الزام لگانے والوں کے سوا باقی سب نے یہی کہا۔ ابن مسلمہ، حضرت سعد رضی اللہ عنہ، جراح بن سنان اور اس کے ساتھیوں کو لے کر مدینہ واپس ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا بیان سنا اور اس میں انہیں کوئی ایسی بات نظر نہ آئی، جس پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے باز پرس کی جا سکے تاہم انہوں نے بہتر یہی سمجھا کہ ایسے نازک موقع پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ان کی خدمت پر واپس نہ بھیجا جائے، جب کوفہ میں لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکانے والے موجود ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں سے پوچھا: ''کوفہ کا والی کسے بنایا جائے؟'' بولے: ''عبداللہ بن عتبان کو!''

ابن عتبان رضی اللہ عنہ ایک معمر بزرگ تھے، جن کا شمار کبار صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا تھا اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کوفہ کا والی بنانے کی حامی بھر لی اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بغیر کسی کوتاہی اور خیانت کے معزول کر کے مدینہ میں ٹھہرا لیا۔ اگر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نہاوند میں ایرانی فوجوں کے اجتماع کی خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہ بھیجتے اور مدینہ پہنچنے کے بعد ان کی تیاریوں کے متعلق رو در رو گفتگو نہ فرماتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ یقیناً انہیں ان کی خدمت پر واپس بھیج دیتے اور ان شکایتوں کا مطلق اثر نہ لیتے جن میں سے ایک بھی ان کے سامنے صحیح ثابت نہ کی جا سکی تھی۔ ابن عتبان رضی اللہ عنہ نے ایرانیوں کی تیاریوں کے متعلق جو خبریں بارگاہ خلافت میں ارسال کیں، ان سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بیان کی تائید ہوتی تھی۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی احتیاط بڑھتی چلی جاتی تھی۔ اس کے بعد بھی خبریں برابر آتیں اور دلوں کو خوف و رعب سے دھڑکاتی رہیں۔ اب وہ فوجیں، جو فیروزان کی قیادت میں جمع ہوئی تھیں، ہمدان روانہ ہو گئی ہیں۔ اب انہوں نے اپنا رخ حلوان کی طرف کر لیا ہے اور اب وہ کوفہ کی طرف بڑھ رہی ہیں اور وہاں پہنچا ہی چاہتی ہیں۔

کہیے! اب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کیا کریں! ان کی دوربین نگاہوں نے ان خبروں کے اس مبالغے کو تو پا لیا جس کی صورت گری خوف نے کی تھی کہ جب کسی آنے والے خطرے کا ڈر دلوں میں گھر کر لیتا ہے تو واہمہ اسے حقیقت سے کہیں زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ لیکن اس امر میں انہیں کوئی شبہ نہ تھا کہ ایرانی مسلمانوں کے خلاف متحد ہو کر جنگ کے لیے تیار ہو گئے ہیں اور اگر ان کا مقابلہ نہ کیا گیا، ان کے حملہ کرنے سے پہلے ان پر دھاوا نہ بولا گیا تو ان کی قوت و جرأت میں اضافہ ہو جائے گا۔ جو عین ممکن ہے کہ خوزستان اور عراق عرب کے اسلامی مقبوضات کے لیے خطرہ بن جائے۔ پھر تو واقعی معاملہ سنگین ہے اور ایرانیوں سے مقابلہ کرنے کی تیاری ایک مقدس فرض!

Marfat.com

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے مشورے کا ارادہ کیا جو ایسے معاملات میں ان کا معمول تھا۔ منادی نے اعلان کیا: ''لوگو! نماز کے لیے جمع ہو جاؤ!'' جب تمام مسلمان مسجد میں پہنچ گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر پر کھڑے ہوئے اور ایرانی فوجوں کے اجتماع، ان کی تیاریوں اور کثرت تعداد کے متعلق جو اطلاعات ان کے عمال نے بھیجی تھیں، انہیں حاضرین کے سامنے دہرا کر فرمایا: ''اگر آج کے بعد کل کا دن آیا تو میں نے ایک ارادہ کیا ہے۔ سنو اور مختصر جواب دو۔ آپس میں نہ جھگڑو، ورنہ کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ کیا رائے ہے؟ جو لوگ میرے ساتھ ہیں یا جنہیں میں ساتھ لے کر جا سکتا ہوں، انہیں ساتھ لے کر جاؤں اور ان دونوں شہروں کے وسط میں قیام کر کے ان سے مدد طلب کروں، اس کے بعد ان کا معاون بن کر بیٹھوں یہاں تک کہ اللہ میری خواہش کے مطابق انہیں کامیاب وظفر مند کر دے!'' بعض لوگوں نے رائے دی کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ فوج لے کر عراق جائیں اور ایرانیوں سے لڑنے، ان کے ملک پر حملہ کرنے کے لیے شام اور یمن سے فوجیں طلب کریں۔ دوسرے گروہ نے خیال ظاہر کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینے ہی میں رہیں اور جتنی فوج بھیج سکتے ہیں، ایرانیوں سے مقابلہ کرنے کے لیے بھیج دیں، لیکن اکثریت اپنی رائے کے اظہار میں تکلف برتتے رہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ انہیں لوگوں میں تھے۔ آخر کار وہ اٹھے اور فرمایا:

''امیر المومنین! اگر آپ نے اہل شام کو شام سے ہٹایا تو رومی ان کے بال بچوں کو آلیں گے، اگر اہل یمن کو یمن سے بلوایا تو حبشہ ان کے ملک میں گھس آئے گا اور اگر آپ نے مدینہ چھوڑا تو سارے عرب میں ہلچل مچ جائے گی اور خود اپنے ملک کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ آپ کا عرب میں وہی مقام ہے جو مقام دانوں میں رشتے کا ہوتا ہے کہ وہی دانوں کو یکجا کرتا ہے اور وہی انہیں بکھرنے سے بچاتا ہے۔ ایرانی کل جب آپ کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ یہ عرب کا امیر اور ان کی مرکزی قوت ہے اور باؤلے کتوں کی طرح آپ پر جھپٹ پڑیں گے، اور یہ جو آپ نے ان کی تعداد کا ذکر فرمایا تو گذشتہ جنگوں میں ہم کثرت کے بل پر نہیں لڑے، فتح ونصرت کے بل پر لڑے ہیں۔ اس لیے آپ اپنی جگہ نہ چھوڑیے اور اہل کوفہ کو، جو عرب کے نامور بہادر اور سردار ہیں فرمان بھیج دیجیے کہ دو تہائی فوج محاذ پر چلی جائے اور ایک تہائی اپنی جگہ رہے اور اہل بصرہ کو حکم دیجیے کہ وہ ان کی مدد کریں۔''

Marfat.com

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے پر اظہار مسرت فرمایا اور اعلان کرا دیا کہ وہ مدینہ ہی میں قیام فرمائیں گے اور ایرانیوں کے مقابلے کے لیے پیہم لشکر بھیجتے رہیں گے۔ اس کے بعد فرمایا: "اب مجھے یہ بتاؤ کہ اس جنگ کا سپہ سالار کس کو بنایا جائے؟ لیکن ہونا چاہیے وہ عراقی!" حاضرین نے کہا: "اس کا فیصلہ آپ سے بڑھ کر کون کرسکتا ہے؟ آپ کی رائے سب سے افضل اور فوج پر آپ کی نظر سب سے گہری ہے۔ آپ کے پاس عراق کے شہریوں اور فوجیوں کا وفد آیا تھا۔ آپ نے ان لوگوں کو دیکھا ہے اور آپ ان کے متعلق جانتے ہیں۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "بخدا! میں یہ خدمت جس شخص کے سپرد کروں گا، اس کا سینہ سب سے پہلے نیزوں کے لیے سپر بنے گا اور وہ شخص نعمان بن مقرن ہے۔" لوگوں نے کہا: "بالکل صحیح انتخاب ہے۔" اور بلاشبہ نعمان ہی اس کے مستحق بھی تھے۔ مسلمان انہیں ایک ایسے بے جگر نے شہ سوار کی حیثیت سے جانتے تھے جو پس وپیش اور فرار کے نام سے ناآشنائے محض تھے۔ وہ جنگ میں بڑے استقلال و تحمل سے کام لیتے تھے، اور جب تک اچھی طرح موقع ومحل نہ دیکھ لیتے تھے، جلد بازی کو مصلحت جنگ کے خلاف سمجھتے تھے۔

جس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مانعین زکوٰۃ سے جہاد فرمانے تشریف لے گئے ہیں اور ذوالقصہ کے مقام پر انہیں شکست دی ہے، یہ اسلامی فوج کے میمنے پر تھے۔ اسی طرح جس دن سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ عراق کی مہم پر تشریف لے گئے، یہ ان کے پہلو بہ پہلو عراق کی تمام معرکہ آرائیوں میں داد شجاعت دیتے رہے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی طرح فتح ونصرت ان کے رکاب میں بھی چلتی رہی۔ اس کے بعد جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ عراقی فوج کے سپہ سالار مقرر کیے گئے تو نعمان ان کے ساتھ بھی اسلامی لشکر کے ہراول میں رہے، قادسیہ اور عراق عرب کی فتح میں انہوں نے امتیازی کارنامے سرانجام دیئے اور خوزستان کے معرکوں میں اپنی جاں بازی و سروفروشی کی دھاک بٹھادی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کسکر کے عامل تھے کہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک شکایتی خط لکھا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ان سے خراج جمع کرنے کی خدمت لینی چاہتے ہیں، لیکن انہیں جہاد پسند ہے۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو تحریر فرمایا: "نعمان نے مجھے لکھا ہے کہ تم ان کو جمع خراج پر مامور کرنا چاہتے ہو، لیکن وہ اسے پسند نہیں کرتے اور جہاد کو محبوب رکھتے ہیں۔ انہیں کسی اہم خدمت پر بھیجو!"

Marfat.com

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نعمان کو ان ایرانی فوجوں کے مقابلے پر بھیجنے کا فیصلہ فرمالیا جو فیروزان کی قیادت میں جمع ہوئی تھیں تو انہیں لکھا: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! اللہ کے بندے امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے نعمان بن مقرن کے نام! تم پر سلامتی ہو۔ میں اس معبود کا سپاس گزار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ امابعد! مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایرانیوں کی ایک بڑی فوج تم سے لڑنے نہاوند میں جمع ہوئی ہے۔ جب میرا یہ خط تمہیں ملے اللہ کے حکم اور اس کی مدد سے، ان مسلمانوں کو لے کر، جو تمہارے پاس ہیں، روانہ ہو جاؤ۔ انہیں پتھریلے اور دشوار گزار رستوں سے نہ لے جاؤ۔ نہ ان کو کسی جائز حق سے محروم کرو، جس کے زیر اثر وہ اسلام سے بدظن ہو جائیں۔ اور نہ انہیں نشیبی جنگلوں سے لے کر گزرنا کہ مجھے ایک مسلمان کی جان ایک لاکھ دینار سے زیادہ پیاری ہے۔ پس اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاؤ اور راہ میں جا کر پڑاؤ ڈالو۔ میں نے اہل کوفہ کو لکھا ہے کہ وہ ایک لشکر تمہارے پاس بھیجیں۔ جب یہ لشکر تم سے آملے تو ساری فوج کو لے کر فیروزان اور اس کی غیر ایرانی فوجوں سے لڑنے نکلو۔ والسلام علیک!''

دوسرا خط حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن عتبان کو لکھا جو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بعد کوفہ کے والی بنائے گئے تھے۔ ''کوفہ سے اتنی اتنی فوج نعمان بن مقرن کی مدد کو بھیجو! میں نے نعمان کو لکھا ہے کہ اہواز سے ماہ کی طرف پیش قدمی کریں۔ کوفہ کی فوج کو چاہیے کہ وہ ماہ میں نعمان سے جا ملے اور نعمان اس فوج کو لے کر نہاوند روانہ ہو جائیں۔ کوفہ کی فوج پر میں حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو سالار مقرر کرتا ہوں۔ کل فوج کے سالار اعلیٰ نعمان ہوں گے۔ میں نے نعمان کو یہ بھی لکھا ہے کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے تو کل فوج کے سالار حذیفہ ہوں گے اور اگر حذیفہ کو کوئی گزند پہنچے تو امیر لشکر نعیم بن مقرن ہوں گے۔'' یہ خط حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سائب بن اقرع کے حوالے فرمایا کہ اسے کوفہ لے جائیں اور سائب کو امیر غنیمت کے عہدے پر سرفراز کر کے ان سے فرمایا: ''اگر خدا تمہیں فتح یاب فرمادے تو مال غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دینا۔ دیکھو، مجھے دھوکہ نہ دینا، نہ کوئی جھوٹی بات مجھ تک پہنچانا اور اگر مسلمانوں کو شکست ہو گئی تو نہ تم مجھے دیکھنا، نہ میں تمہیں دیکھوں گا۔''

اسی دن حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا: ''بصرہ والوں کو لے کر ماہ پہنچو۔ سپہ سالار اعلیٰ نعمان بن مقرن ہوں گے۔'' اور سلمیٰ بن قین، حرملہ بن ریطہ اور سالاران فوج کو، جو فارس اور اہواز کے درمیان تھے، حکم دیا: ''ایرانیوں کی توجہ اپنے بھائیوں کی طرف سے ہٹائے رکھو اور ان

Marfat.com

طرح اپنی قوم اور اپنی زمین کی حفاظت کرو۔ جب تک میرا حکم نہ پہنچے، فارس اہواز کی درمیانی حدود میں رہو!'' اس حکم سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مراد یہ تھی کہ اہل نہاوند کو فارس کی امدادی فوجوں سے محروم کردیا جائے اور فیروزان کی قوت میں مزید اضافہ نہ ہونے پائے۔ یہ تمام پیش بندیاں اس خطرے کے مقابلے کے لیے تھیں، جس کی خبریں متواتر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہنچ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے گرد ایک ایسی فضا تیار کی کہ مسلمان بغیر کسی تساہل اور پس و پیش کے ایرانیوں کے مقابلے پر ڈٹ جائیں۔ فوجیں ماہ کی طرف روانہ ہوئیں اور نعمان بن مقرن کے جھنڈے تلے جمع ہوگئیں۔ ان میں ایسے ایسے جانباز شہ سوار تھے جو موت سے کھیلنا ہی اپنی زندگی سمجھتے تھے۔ اس جنگ میں قادسیہ اور مدائن جیسے معرکوں میں شریک ہونے والے مجاہدین بھی اپنی تاریخ فخر میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے کے لیے آئے تھے اور جو سرفروش قادسیہ کی لڑائی میں داد شجاعت نہ دے سکے تھے، وہ بھی اس خیال سے نبرد آزمائی کے لیے نکل آئے تھے کہ فتح نہاوند کا فخر کسی اور کے حصے میں نہ آئے۔ اس معرکے میں جاں بازی و سرفروشی میں کوئی اوران پر بازی نہ لے جائے۔

اسلامی لشکر حلوان پہنچا۔ نعمان نے ایرانیوں کی سن بُن لینی چاہی کہ اپنے جاسوسوں کی اطلاعات کے مطابق احتیاطی تدابیر عمل میں لائیں۔ انہوں نے طلیحہ بن خویلد اسدی، عمرو بن معدی کرب زبیدی اور عمرو بن ابی سلمٰی مزنی کو اس خدمت پر مامور کیا۔ یہ تینوں سارے دن گرم سفر رہے۔ جب رات ہوئی تو عمرو بن ابی سلمٰی واپس آئے اور مسلمانوں کو بتایا کہ دشمن کا کہیں پتا نہیں ہے۔ طلیحہ اور عمرو بن معدی کرب رات بھر چلتے رہے۔ اس کے بعد عمرو بن معدی کرب بھی واپس آگئے۔ لوگوں نے پوچھا: ''پلٹ کیوں آئے؟'' بولے: ''ہم ایک دن اور ایک رات چلتے رہے لیکن ہمیں کچھ نظر نہ آیا۔ مجھے ڈر ہوا کہیں ہم کو رستے ہی میں نہ پکڑ لیا جائے۔'' طلیحہ نے اپنے ساتھیوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور سفر جاری رکھا، یہاں تک کہ نہاوند پہنچ گئے۔ وہاں ایرانیوں کی خبریں حاصل کیں اور واپس آ کر نعمان کو بتایا کہ یہاں سے نہاوند تک کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ سن کر نعمان نے فوج کو روانگی کا حکم دیا اور چلتے چلتے دشمن کے قلعوں کے قریب پہنچ گئے۔ مسلمانوں نے تین بار تکبیر کے نعرے بلند کیے، جس سے ایرانی لرز اٹھے اور ان کے دل خوف و دہشت سے کانپنے لگے۔

فیروزان کو معلوم ہوا کہ مسلمان تیس ہزار کی تعداد میں ایرانیوں سے لڑنے آئے ہیں، لیکن

Marfat.com

اس نے تعداد کو قابل اعتنا نہ سمجھا، نہ یہ سوچ کر اپنے آپ کو دھوکا دیا کہ مسلمان ان ڈیڑھ لاکھ ایرانیوں کے مقابلے پر ہیں جو اپنے آخری سانس تک لڑنے کی قسم کھا چکے ہیں اور مضبوط و مستحکم برجیوں میں قلعہ بند ہیں۔ وہ قادسیہ کی لڑائی میں موجود تھا اور ان عربوں کی جرأت و شجاعت کی دھاک اس کے دل پر بیٹھ چکی تھی۔ جنہوں نے ہرمزان کو میدان جنگ سے بھگا کر ایرانیوں کو عبرت ناک شکست دی تھی۔ چنانچہ اس نے اسلامی لشکر میں کہلوایا کہ اپنا کوئی آدمی بھیجو جس سے ہم بات چیت کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا انتخاب عمل میں آیا۔ انہوں نے نہاوند کے اردگرد کا میدان طے کیا اور فصیلوں کو عبور کر کے فیروزان کے پاس پہنچے۔ نہاوند ایک بہت بڑا شہر تھا جو عراق عجم میں حلوان و ہمدان کے درمیان، حلوان سے نوے میل جانب شرق اور ہمدان سے تیس میل جانب غرب واقع تھا۔ اس میں کشادہ سبزہ زار، دل کشا نہریں اور نظر فریب باغ تھے جو اس کے باشندوں کی راحت و فارغ البالی کے ضامن تھے۔ وسط شہر میں ایک مستحکم قلعہ تھا جس کی مضبوط دیواریں اور بلند فصیلیں گویا اس کی محافظ تھیں۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ، فیروزان کے پاس پہنچے تو وہ ایک طلائی تخت پر تاج پہنے بیٹھا تھا۔ چاروں طرف پہرے دار تھے، گویا شیطان ہیں جن کے نیزوں کی چمک نگاہوں کو اچک لینا چاہتی ہے۔ ان دونوں میں جو گفتگو ہوئی وہ مدائن میں یزدگرد اور اسلامی وفد کی گفتگو سے بہت ملتی جلتی تھی۔ آخر میں فیروزان نے کہا: ''یہ قدر انداز، جو میرے تخت کے گرد کھڑے ہیں، ابھی تمہارے جسموں کو اپنے نیزوں سے چھید دیتے، لیکن مجھے گوارا نہیں کہ ان کے نیزے تمہارے ناپاک خون میں آلودہ ہوں۔ اب بھی اگر تم یہاں سے چلے جاؤ تو ہم تم سے درگزر کرتے ہیں ورنہ اپنا حشر تو تم خود دیکھ لو گے!''

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے عربوں کی پچھلی بدبختی کے سلسلے میں فیروزان کی تائید کی اور اس کے بعد فرمایا: ''بخدا! جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں مبعوث ہوئے ہیں ہمارے پروردگار نے ہمیں برابر فتح و نصرت سے نوازا ہے، یہاں تک کہ ہم تمہارے پاس پہنچ گئے ہیں۔ خدا کی قسم! ہم اس بدبختی کی طرف کبھی واپس نہ ہوں گے جب تک تمہارا ملک تم سے لے نہ لیں یا تمہاری زمین ہماری لاشوں سے پٹ نہ جائے!'' سفارت ناکام ہو جانے کے بعد مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ واپس ہوئے اور نعمان سے اس عظیم الشان شہر فسطاط میں ملے جس کے متعلق مشہور تھا کہ عراق بھر میں کوئی شہر نہیں جو عظمت و جلال میں فسطاط سے لگا کھاتا ہو، جب نعمان کو سفارت کی ناکامی کا حال معلوم ہوا تو جنگ کے لیے تیار ہو گئے اور شہر کا محاصرہ کر لیا، مسلسل دو دن تک عربوں اور ایرانیوں

Marfat.com

میں لڑائی ہوتی رہی۔ ایرانی اپنے قلعوں سے موقع دیکھ کر ہی نکلتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے فصیل کے چاروں طرف لوہے کے گوکھرو بچھا دیے تھے اور صرف اتنی جگہ خالی رکھی تھی کہ جس وقت حملے کے لیے نکلنا چاہیں نکل سکیں۔ مسلمانوں کے گھوڑے ان گوکھروؤں کو پار نہ کر سکتے تھے، یہ بات مسلمانوں پر بہت گراں گزری۔ انہیں اندیشہ ہوا کہ جنگ طول کھینچے گی اور اس کا نتیجہ خراب ہوگا۔ چند اہل الرائے مل کر نعمان کے پاس گئے اور ان سے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔ نعمان خود یہی سوچ رہے تھے، ان کی بات سن کر بولے: ''ذرا صبر کرو! بے آپے نہ ہو!''

یہ کہہ کر فوج کے تجربہ کار تیغ آزماؤں کو بلوایا اور جب وہ آ گئے تو ان سے کہا: ''تم دیکھ رہے ہو کہ مشرکین اپنے قلعوں میں پناہ لیے بیٹھے ہیں اور جس وقت چاہتے ہیں اسی وقت نکلتے ہیں اور یہ بھی تمہیں معلوم ہے کہ اس صورت حال سے مسلمان کتنے دل تنگ ہیں۔ پھر بتاؤ کہ اس طوالت سے بچنے اور اس بے چارگی سے نکلنے کی کیا صورت ہے؟'' بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ محاصرہ اور تنگ کر دیا جائے۔ جتنی تم پر لڑائی میں طوالت گراں ہے، اس سے زیادہ ان پر قلعہ بندی گراں ہوگی۔ عمرو بن معدی کرب نے کہا: ''ان سے لڑو اور ان پر غالب آؤ۔ انہیں خوفزدہ نہ کرو۔'' لیکن حاضرین نے یک زبان ہو کر اس رائے کو مسترد کر دیا اور کہا: ''دیواریں ہمارے لیے روک ہیں اور ہمارے مقابلے میں ان کا ساتھ دیں گی۔'' آخر میں طلیحہ بن خویلد نے اپنی رائے ظاہر کی۔ ''میرے نزدیک بہتر یہ رہے گا کہ ایک مصلح دستہ ان کی طرف بھیجئے جو انہیں چاروں طرف سے گھیر لے اور ان میں لڑائی کا جوش پیدا کرنے کے لیے ان پر تیر برسائے اور جب وہ جوش میں آ کر باہر نکلنے کا ارادہ کریں تو ہماری طرف اس طرح پلٹے گویا شکست کھا کر پیچھے ہٹ رہا ہے۔ چونکہ ہم نے آج تک کسی جنگ میں ایسا نہیں کیا ہے، اس لیے جب وہ ہمیں پیچھے ہٹتا دیکھیں گے تو انہیں کوئی شبہ نہ ہوگا اور وہ ہم پر فتح پانے کے لالچ میں باہر نکل آئیں گے۔ اس وقت وہ ہم سے اور ہم ان سے سمجھ لیں گے اور اللہ اپنی مشیت کے مطابق ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا۔''

اس رائے کو سب نے پسند کیا اور مطمئن ہو گئے۔ نعمان نے قعقاع بن عمرو کو حکم دیا کہ کل صبح اپنی فوج لے کر شہر پر حملہ کریں اور جب ایرانی نمودار ہوں تو اس طرح پیچھے ہٹیں، گویا بھاگ رہے ہیں۔ قعقاع اپنی فوج لے کر آگے بڑھے اور شہر پر تیر برسانے شروع کر دیئے۔ ان کے ارادے سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا فصیل پر دھاوا بول رہے ہیں، وہ اتنی ہمت اور بے جگری سے آگے بڑھ

Marfat.com

رہے تھے کہ ایرانیوں کو ان کا حملہ روکنے کے لیے سنبھل کے اٹھنا پڑا، جو ایرانی آگے بڑھتا تھا مسلمان اس کی طرف جھپٹتے تھے، تا آنکہ ان کا خون جوش میں آ گیا اور وہ شہر سے باہر نکل آئے انہوں نے دیکھا، مسلمانوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ ان پر آسانی سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ فصیلوں اور گوکھروؤں کو پار کر کے وہ مسلمانوں کی طرف بڑھے۔ قعقاع تھوڑی دیر تک جم کے لڑتے رہے کہ ان پر چال نہ کھل جائے، اس کے بعد اپنی فوج کو لے کر پیچھے ہٹنے لگے۔ ایرانیوں نے جو مسلمانوں کو بھاگتے دیکھا تو ان کا قصہ پاک کرنے کے لیے تعاقب میں چلے۔ نعمان پہلے ہی اپنے لشکر کو اتنا پیچھے ہٹ جانے کا حکم دے چکے تھے کہ شہر کے قلعوں اور فصیلوں سے پھینکے جانے والے تیر ان تک نہ پہنچ سکیں۔ چنانچہ اسلامی فوجیں گجردم اپنی جگہ سے ہٹ کر، ٹیلوں کے پیچھے دشمن کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ قعقاع الٹے پاؤں بھاگتے اور ایرانی ان کا پیچھا کرتے رہے۔ لیکن اس خوف سے کہ مسلمان کہیں پلٹ کر حملہ نہ کر دیں، بچاؤ کے لیے اپنے آگے لوہے کے گوکھرو بچھاتے جاتے تھے۔ قعقاع کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کا لشکر پیچھے ہٹ جانے کی بنا پر ان سے دور ہو گیا ہے اس لیے وہ اور تیزی سے پیچھے ہٹنے لگے اور ایرانیوں نے بھی اسی شدت سے ان کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ انہیں مسلمانوں کی شکست کا یقین ہو گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے اب مزید احتیاط کی ضرورت نہیں سمجھی اور لوہے کے گوکھروؤں کو پیچھے چھوڑ کر تیزی سے دوڑے کہ ان بھاگنے والوں کا نام و نشان تک باقی نہ چھوڑیں۔ فیروزان کی سرکردگی میں سارا ایرانی لشکر، سرزمین ایران کو ان ''حملہ آوروں'' سے پاک کرنے کے لیے باہر نکل آیا اور دروازے کے پہرے داروں کے سوا نہاوند میں اس کا کوئی محافظ باقی نہ رہا۔ جب وہ شہر سے بہت آگے نکل گئے اور شہر کی برجیوں اور فصیلوں کی حفاظت ان کی دسترس میں نہ رہی تو گھبرا گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ مسلمان کھڑے ہیں اور قعقاع بھی اپنی فوج سمیت اب ان سے جم کر مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان کا یہ خوف جاتا رہا۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ ایک چال ہے جس کے ذریعے قعقاع نے اپنی شکست خوردہ فوج کے عقب کی حفاظت کرنی چاہی ہے تاکہ ایرانی انہیں تلوار کے گھاٹ نہ اتار دیں اور اس طرح مسلمانوں کی قوت کا بالکل ہی خاتمہ نہ ہو جائے۔

قعقاع اپنی فوج سمیت اسلامی لشکر سے جا ملے اور سرفروشان اسلام کے ساتھ یہ انتظار کرنے لگے کہ نعمان حملے کا حکم کب دیتے ہیں؟ اس دن جمعہ تھا اور نعمان نے اپنے لشکر کو تاکید کر دی تھی کہ دن ڈھلنے سے پہلے ایرانیوں پر دھاوا نہ بولیں۔ اس کے بعد وہ انہیں حکم دیں گے۔

Marfat.com

لیکن ایرانی زوال سے کچھ پہلے ہی مسلمانوں کے قریب پہنچ گئے اور تیر پھینکنے شروع کر دیئے جس سے کچھ مسلمان زخمی ہو گئے۔ لوگوں نے نعمان کو حملے کا اشارہ کیا لیکن وہ خاموش رہے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''مجھے حکم ملنا چاہیے کہ میں کیا کروں!'' نعمان نے سکون و تحمل کے لہجے میں جواب دیا: ''ذرا صبر کرو! ابھی حکم ملتا ہے اور جب تمہیں حکم ملے، اسے اچھی طرح انجام دینا! مجھے یقین ہے اللہ نہ ہمیں مایوس کرے گا نہ تمہیں! جو بات تم جرأت و بے صبری سے حاصل کرنا چاہتے ہو وہی ہم استقلال و تحمل سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔'' جب سورج ڈھلنے کو ہوا، نعمان اپنے ترکی گھوڑے پر سوار ہوئے اور ایک ایک علم کے پاس جا کر مجاہدین کی ہمت بڑھانے اور ان میں جوش پیدا کرنے لگے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ نے مسلمانوں سے نصرت کا جو وعدہ فرمایا تھا، پورا کر دیا ہے، صرف تھوڑی سی کسر باقی رہ گئی ہے۔ پھر انہیں بتایا کہ ان کی ذلت و بدبختی کا دور ختم ہو چکا ہے اور اب وہ عزت و سربلندی سے نوازے جا رہے ہیں۔ ان کا دشمن اپنی زمین کے لیے لڑ رہا ہے اور وہ اللہ کے دین کے لیے لڑ رہے ہیں، اس لیے ایرانی اپنی دنیا کی حفاظت اتنے جوش اور اتنی قوت سے نہیں کر سکتے، جتنے جوش اور جتنی قوت سے مسلمان اپنے دین کی حفاظت کریں گے۔ نعمان کے ان الفاظ نے مجاہدین اسلام کی صفوں میں ایک آگ سی لگا دی۔

''تم میں سے ہر شخص اپنے گرد و پیش پر چھایا ہوا ہے۔ جب میرا حکم ملے تیار ہو جاؤ! میں تین تکبیریں کہوں گا پہلی تکبیر پر تم اپنی صفیں درست کر لینا، دوسری تکبیر پر ہتھیار کس کے حملے کے لیے کیل کانٹے سے لیس ہو جانا! اور تیسری تکبیر پر میں ان شاء اللہ حملہ کر دوں گا، تم بھی میرے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑنا۔ یا اللہ! اپنے دین کو عزت دے! اپنے بندوں کی مدد کر! اور نعمان کو اپنے دین کی سربلندی اور اپنے بندوں کی نصرت کے لیے آج سب سے پہلے شہادت کے مقدس خون سے سرخرو فرما۔'' نعمان ایک ایک علم کے پاس سے گزرتے اور اسی قسم کی باتوں سے سرفروشان اسلام کا دل بڑھاتے رہے۔ مجاہدین میں اچھی طرح جوش پیدا کر چکنے کے بعد وہ اپنی جگہ واپس آئے۔ سارے لشکر کی آنکھیں ان پر لگی تھیں کہ اپنی سفید قبا اور سفید ٹوپی کی وجہ سے وہ الگ پہچانے جاتے تھے۔ نعمان نے پہلی، دوسری اور پھر تیسری تکبیر کہی، مسلمان جنگ کے لیے اتنے بے تاب تھے کہ چاہتے تھے کسی طرح اڑ کے دشمن کے پاس پہنچ جائیں اور اسے فنا کر دیں۔ ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا، جو شہادت یا فتح حاصل کیے بغیر اپنے گھر لوٹ جانا چاہتا ہو۔ تکبیریں ختم

کرتے ہی نعمان پرچم بہ دست، دشمن کی طرف بڑھے اور ایرانیوں پر اس طرح جھپٹے جیسے عقاب اپنے شکار پر جھپٹتا ہے، ان کی تلوار سروں کا صفایا کرنے لگی۔ شہ سواروں کو زمین کھانے لگی۔ یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے خون میں لتھڑے ہوئے زخمیوں اور مقتولوں کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ دوسرے مسلمان بھی تیزی سے ان کے گرد جمع ہو گئے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک قوت و شجاعت میں نعمان تھا۔ ایرانیوں نے جو مسلمانوں کو اس طرح بے جگری سے حملہ کرتے دیکھا تو وہ بھی ان پر ٹوٹ پڑے۔ اب دونوں طرف سے تلواریں نکل آئیں اور یہ عالم ہو گیا کہ چخاچخ کی آوازوں اور ان سورماؤں کے نعروں کے سوا، جن کی بھڑکی ہوئی شجاعت موت سے بھاگنا نہ جانتی تھی اور کوئی آواز سنائی ہی نہ دیتی تھی۔ لڑائی نے اس دن اتنی شدت پکڑی کہ اس سے پہلے کسی معرکے میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اپنی کثرت اور مسلمانوں کی جاں بازی کے سبب ایرانی اتنے قتل ہوئے کہ زمین ان کے خون سے لالہ زار ہو گئی۔ لڑائی زوروں پر تھی اور زمین پر خون اتنی کثرت سے بہہ رہا تھا کہ انسانوں اور گھوڑوں کے پاؤں پھسل پھسل جاتے تھے۔ آفتاب مغرب کی طرف مائل ہوا۔ نعمان گھوڑے پر سوار، جھنڈا ہاتھ میں لیے، دائیں طرف رخ کرتے تو مسلمانوں کی تلواریں ایرانیوں کے میسرے کا صفایا کرنا شروع کر دیتیں اور بائیں طرف پلٹتے تو ایرانیوں کا میمنہ خاک و خون میں لوٹتا نظر آتا۔ نعمان دشمن کے قلب کو چیرتے جا رہے تھے کہ ان کے گھوڑے کا پاؤں پھسلا اور وہ زمین پر آ رہے۔ اللہ نے اس وقت ان کی وہ دعا قبول فرمالی جس میں انہوں نے راہ حق میں شہادت سے سرفراز ہونے کی تمنا کی تھی اور ایک تیر آ کر ان کی ران میں ترازو ہو گیا۔ ان کے بھائی نعیم نے انہیں دیکھا تو دوڑ کر پہنچے۔ ان کی لاش کو انہیں کپڑوں میں کفنا دیا اور ان کے ہاتھ سے جھنڈا لے کر حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے نعیم کو ان کے بھائی کی جگہ مقرر کیا اور انہیں تاکید کر دی کہ یہ بات کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں، اس سے مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس کے بعد جھنڈا لے کر چلے اور جہاں نعمان تھے وہاں پہنچ کر اسے بلند کر دیا۔ رات ہو گئی، لیکن لڑائی اسی شدت سے جاری تھی مسلمان دشمنوں پر اسی طرح حملے کر رہے تھے، ان کے قلب لشکروں کو اس طرح چیر رہے تھے کہ ایرانیوں کی روح کانپ کانپ جاتی تھی، جب تاریکی چاروں طرف پھیلی تو ایرانیوں کے حوصلے جواب دے گئے، ان کی جمعیت

Marfat.com

منتشر ہو گئی اور وہ شکست کھا کر پیچھے ہٹنے لگے۔ لیکن لوہے کے گوکھروؤں نے ان کے قدم روک لیے، یہ دیکھ کر مسلمانوں نے انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کر دیا۔ گویا وہ ایرانی تیغ آزما نہیں، کمزور و مجبور بھیڑیں ہیں۔ بھاگنے والوں نے گوکھروؤں سے بچ کر نکلنا چاہا لیکن پیچھے خندق تھی، جسے ایرانیوں کے خوف اور رات کی تاریکی نے ان کی نظروں سے چھپا دیا تھا اور وہ گھوڑوں سمیت اس میں جا پڑے۔ خندق میں گر کر ہلاک ہونے والے ایرانی اتنے تھے کہ بعض مؤرخین کے اندازے میں ان کا شمار اسی ہزار تک پہنچتا ہے اور یہ ان تیس ہزار ایرانیوں کے علاوہ ہیں جو لڑائی میں کام آئے۔ اس طرح تباہ و برباد ہوا ایرانیوں کا وہ ٹڈی دل لشکر جو مسلمانوں کو اپنے ملک سے نکالنے کے لیے ایران کے طول وعرض سے جمع ہوا تھا۔ اب مسلمان اُلٹا انہیں موت کا مزہ چکھا رہے تھے۔ انہیں اتنی عبرت ناک شکست دے رہے تھے کہ فرار ہو جانے والے کے سوا ایک متنفس بھی زندہ نہ بچ سکا۔

اپنی جان بچا کر بھاگنے والوں میں فیروزان بھی تھا، وہ تنہا اپنے گھوڑے پر سوار ہمدان کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا کہ نعیم نے اسے دیکھ لیا اور قعقاع بن عمرو کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا۔ فیروزان ابھی ہمدان کی سرحد پر ہی پہنچا تھا کہ قعقاع نے اسے جا لیا۔ ہوا یہ کہ شہد سے لدے ہوئے گدھوں اور خچروں کا ایک قافلہ پہاڑ کی گھاٹی سے گزر رہا تھا جس نے بھگوڑے سپہ سالار کا رستہ روک لیا۔ وہ گھوڑے سے اتر گیا اور پہاڑ میں کہیں پناہ لینے کے لیے پیدل چل پڑا۔ قعقاع نے اس کا پیچھا کیا اور پکڑ کے اسے قتل کر دیا۔ مسلمانوں کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو بولے: ''اللہ کے لشکر شہد کے ہوتے ہیں۔'' یہ بات ایک کہاوت ہو گئی اور اس دن سے اس گھاٹی کا نام ہی ''شہد کی گھاٹی'' پڑ گیا۔ ایرانی فوج کے مفرورین بھاگتے بھاگتے ہمدان جا پہنچے، لیکن مسلمانوں نے انہیں یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ وہ ان کا پیچھا کرتے کرتے ہمدان پہنچ گئے، اور اس کا محاصرہ کر کے قسم کھالی کہ جب تک شہر کے دروازے نہیں کھلیں گے واپس نہیں جائیں گے۔ حاکم شہر کو جب فیروزان اور اس کے لشکر کا حشر معلوم ہوا تو مسلمانوں سے صلح کی درخواست کی، جو قعقاع نے اس شرط پر قبول کر لی کہ ہمدان اور دست بے مسلمان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس کے سوا مسلمان ان سے اور کچھ طلب نہ کریں گے اور انہیں امان دے دی جائے گی۔ اس معاہدے سے امن بحال ہو گیا۔ جو بھاگ گئے تھے واپس آ گئے اور زندگی نے سکون و اطمینان کی راہ اختیار کر لی۔

قعقاع اپنے ساتھیوں سمیت واپس ہوئے تو دیکھا کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ جنگ کے بعد اپنی فوج کو لے کر نہاوند میں داخل ہو چکے ہیں اور ایرانیوں کے مال و اسباب اور مویشیوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ مال غنیمت سائب بن اقرع کے حوالے کر دیا گیا، جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خدمت پر مامور فرمایا تھا۔ یہ غنیمت مسلمانوں کی توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ جو حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے فاتحین میں تقسیم کر دی۔ سر سے کفن باندھ کر لڑنے والوں کو دوسروں سے زیادہ حصہ ملا۔ پھر وہ سپاہی بھی اس تقسیم میں شریک کیے گئے جو عقب فوج کی حفاظت پر مامور تھے اور ان لوگوں کو بھی اس میں سے حصہ دیا گیا، جو لڑائی میں شامل ہونا چاہتے تھے، لیکن کسی وجہ سے نہ ہو سکے۔ اس کے باوجود اس دن سوار کے حصے میں چھ ہزار درہم اور پیدل کے حصے میں دو ہزار درہم آئے۔ یہ تو جو ملا سو ملا، اس کے علاوہ کسریٰ نے اپنے آتش کدے موبد کے پاس اڑی تھڑی کے لیے کچھ جواہر رکھوا دیئے تھے، جس سے مسلمان بالکل بے خبر تھے۔ اچانک یہ موبد ان کے پاس آیا اور کہا کہ اگر مسلمان اس کی جان بخش دیں تو وہ انہیں ایک گراں بہا خزانے کا پتا دے سکتا ہے، حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے امان دے دی اور اس نے بیش قیمت جواہرات سے بھرے ہوئے وہ صندوقچے ان کے سامنے لا کر رکھ دیئے۔ مسلمانوں نے اس خزانے کو دیکھا، لیکن انہیں غنیمت ہی میں سے اتنا کچھ مل چکا تھا کہ اب کسی مزید دولت کی طلب ان میں باقی نہ رہی تھی...... انہوں نے کہا، اس خزانے کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واسطے مخصوص کر دیا جائے۔ اس کے بعد جب مسلمان تقسیم غنیمت سے فارغ اور اپنے ٹھور ٹھکانے سے مطمئن ہو گئے تو سائب بن اقرع خمس اور ان صندوقچوں کو لے کر مدینہ روانہ ہوئے کہ فتح کی خبر کے ساتھ ساتھ یہ بے بہا خزانہ بھی بارگاہ خلافت میں پیش کر دیں۔

ادھر نہاوند میں یہ کچھ ہو رہا تھا اور ادھر مدینے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجاہدین اسلام کے لیے بے چین تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں بری خبر سننے میں نہ آئے اور اس خوف نے ان کی نیند اڑا دی تھی۔ وہ رات رات بھر جاگتے رہتے اور اللہ سے اپنے لشکر کی فتح کے لیے دعائیں مانگتے رہتے۔ معرکے کی رات جب وہ حصول خبر کے لیے نکلنے لگے تو ان کا خوف ایک دم اطمینان سے بدل گیا اور انہیں ایسا محسوس ہوا کہ اللہ نے ان کے لشکر کو فتح یاب کر کے اپنا وعدہ پورا فرما دیا ہے۔ حذیفہ نے ظریف بن سہم کو اسی وقت روانہ کر دیا تھا کہ وہ جلد سے جلد مدینہ پہنچ کر امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو فتح کی خوش خبری سنا دیں، جب وہ مدینہ پہنچے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا تو انہوں نے

Marfat.com

اسلامی فتح کی نوید سنائی، لیکن ناگوار خبریں اپنے دل ہی دل میں رہنے دیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے مسلمان اس فتح سے بہت خوش ہوئے۔ ان کے ہاتھ تضرع وخشیت کے ساتھ بے اختیار بارگاہ رب العزت میں اٹھ گئے اور انہوں نے دوڑ کر مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں شکرانے کے نفل ادا کیے۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جو تفصیلی خبر سننے کے آرزومند تھے، مدینہ کے باہر تشریف لے گئے اور ایران کے رستے پر ہو لیے۔ دور سے ایک سوار نظر پڑا جسے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے پہچان کر فرمایا: ''یہ سائب بن اقرع ہے!'' جب وہ سوار قریب آیا اور اس نے ان لوگوں کو سلام کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''کہو کیا خبر لائے؟'' بولا: ''نوید فتح!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نعمان کیسے رہے؟'' کہا: ''زمین ایرانیوں کے خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔ ان کے گھوڑے کا پاؤں پھسلا وہ گرے اور شہید کر دیئے گئے۔'' یہ سنتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کانپ گئے اور لرزتی ہوئی آواز میں فرمایا: ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ انہوں نے بہت چاہا مگر آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکے۔ بے اختیار ان کی ہچکی بندھ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا بیٹا یا کوئی بہت ہی قریبی عزیز وفات پا گیا ہے۔ جب غم کا بوجھ ذرا ہلکا ہوا تو سائب سے شہداء کے نام پوچھے۔ سائب نے سربرآوردہ مسلمانوں کے نام گنوانے کے بعد کہا: ''ان کے علاوہ جو مسلمان شہید ہوئے ہیں امیر المومنین رضی اللہ عنہ انہیں نہیں جانتے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا: ''عمر انہیں جانتا تو کیا ہوا! خدا تو انہیں جانتا ہے، جس نے انہیں شہادت کے انعام سے سرفراز فرمایا ہے۔ وہ عمر رضی اللہ عنہ کے جاننے نہ جاننے کو کیا کریں؟'' سب لوگ واپس ہوئے، سائب ان کے ساتھ تھے۔ مدینہ پہنچ کر خمس مسجد میں رکھ دیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چند رفقاء کو، جن میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ بھی تھے، رات کے پہرے پر مقرر فرمایا کہ صبح ہوتے ہی یہ مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اٹھے اور کاشانہ خلافت میں تشریف لے گئے۔ سائب پیچھے پیچھے چلے اور انہیں بتایا کہ میرے پاس بیش قیمت جواہر کے دو صندوقچے بھی ہیں، جو غازیانِ اسلام نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے لیے مخصوص کیے ہیں۔ علامہ طبری، سائب بن اقرع سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: ''میں نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے جواہر کے صندوقچوں کے متعلق عرض کیا تو انہوں نے فرمایا: ''انہیں بیت المال میں داخل کر دو، ان کے متعلق پھر دیکھا جائے گا اور تم فوج سے جا ملو!'' میں نے انہیں بیت المال میں جمع کرا دیا اور خود الٹے پاؤں کوفہ روانہ ہو گیا۔ حضرت

Marfat.com

عمر رضی اللہ عنہ نے وہ تمام رات جاگ کر کاٹی اور صبح میرے پیچھے قاصد دوڑایا، اور بخدا! وہ میرے کوفہ میں داخل ہونے سے پہلے مجھ تک نہ پہنچ سکا۔ جب میں نے اپنا اونٹ بٹھایا تو میرے اونٹ کے پیچھے اس نے بھی اپنا اونٹ بٹھایا اور مجھ سے کہا: ''امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں چلو! انہوں نے مجھے تم کو بلانے کے لیے بھیجا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن اس سے پہلے تم تک نہ پہنچ سکا۔''

میں نے پوچھا: ''کیوں کیا کام ہے؟'' کہنے لگا ''بخدا! مجھے معلوم نہیں!'' چنانچہ میں پھر اونٹ پر سوار ہوا اور اس کے ساتھ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میرا اور ام سائب کے بیٹے کا، بلکہ ام سائب کے بیٹے کا اور میرا کیا بنے گا؟'' میں نے عرض کیا: ''امیر المومنین! کیا ہوا؟'' ......فرمایا: ''افسوس ہے تجھ پر۔ جس رات تو روانہ ہوا، جب میں سویا تو میرے پروردگار کے فرشتے نمودار ہوئے اور مجھے اپنے ہمراہ جواہر کے ان صندوقچوں کے پاس لے گئے جو انگاروں کی طرح دہک رہے تھے اور مجھ سے کہا۔ ''ہم تمہیں ان انگاروں سے جلائیں گے۔ میں نے ان سے کہا میں انہیں مسلمانوں میں تقسیم کردوں گا۔ تمہارا باپ غارت ہو۔ اب یہ صندوقچے تم بجھ سے۔ لے جاؤ اور انہیں فروخت کرکے ان کی قیمت مسلمانوں میں تقسیم کردو۔'' میں یہ صندوقچے لے کر چلا اور انہیں کوفہ کی مسجد میں لاکر رکھ دیا۔ تاجر میرے گرد جمع ہو گئے۔ عمرو بن حریث مخزومی نے دونوں صندوقچے دو لاکھ میں خریدے اور سرزمین ایران میں جاکر انہیں چار لاکھ میں فروخت کردیا۔ اس کے بعد سے اہل کوفہ آج تک سب سے زیادہ دولت مند ہیں۔'' اسی طرح علامہ طبری نے ایک اور روایت بھی نقل کی ہے کہ سائب یہ دونوں صندوقچے لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے پیچھے چلے اور جب وہ کاشانہ خلافت میں داخل ہوئے تو انہیں بتایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بخدا! وہ لوگ نہیں سمجھے مگر کم سے کم تمہیں تو ان کو ساتھ نہیں دینا چاہیے تھا۔ مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ!! فوراً یہ صندوقچے لے کر حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ کہ وہ انہیں فوج میں تقسیم کردیں!'' سائب وہ جواہر حذیفہ کے پاس لے گئے جو چار لاکھ میں فروخت ہوئے ان کی قیمت جب مجاہدین میں تقسیم کی گئی تو ہر سوار کے حصے میں چار ہزار درہم آئے۔ یہ ان چھ ہزار درہم کے علاوہ تھے جو اس سے پہلے انہیں مل چکے تھے۔

مدینہ والوں کو نہاوند کی فتح کی بڑی خوشی تھی، لیکن اس فتنے پر جتنے مسرور اہل کوفہ تھے اور کوئی نہ تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس کا نام ہی ''فتح الفتوح'' رکھ دیا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس لڑائی میں جن لوگوں نے ہتھیلی پر جان رکھ کے ایرانیوں کا مقابلہ کیا وہ کوفہ کے تھے، یا پھر یہ کہ

میدان جنگ سے مدینہ کے مقابلے میں قریب تر تھا، اس لیے یہاں کے باشندے اس جنگ کو بڑی اہمیت دے رہے تھے اور اس کے نتائج کی طرف سے فکر مند تھے اور جب نہاوند فتح ہو گیا تو انہوں نے ازراہ نیک فالی اور اپنے اس اطمینان خاطر کی تعبیر کے لیے جو اس کے نتیجے میں انہیں حاصل ہوا تھا۔ اس فتح کو اس نام سے موسوم کر دیا۔ بہر حال سبب چاہے کچھ ہو، نہاوند کی فتح واقعی ''فتح الفتوح'' تھی کہ اس کے بعد ایرانیوں کے قدم کہیں نہ جم سکے۔ بلکہ مسلمانوں نے ان کے گھروں میں گھس گھس کے انہیں مارا۔ تمام ایرانی صوبوں میں ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور پھر ایرانیوں کا اتحاد بھی مسلمانوں کے اس تند و تیز دھارے کو نہ روک سکا جو ان کے ملک میں امڈا چلا آرہا تھا۔ انجام کار کسریٰ کو اپنے ملک سے بھاگ کر غیروں سے مدد کی بھیک مانگنی پڑی۔ اس نے دوسرے کے ملک میں سر چھپایا اور اس کے بعد اپنے وطن سے دور اس طرح بے کسی کی موت مر گیا۔ گویا وہ کبھی ایران میں رہا ہی نہ تھا، گویا اس ملک میں کبھی اس کی حکومت ہی نہ تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہاوند کی کامیابی پر اہل کوفہ سے بھی زیادہ خوش تھے، ان کے دل میں غازیان اسلام کی عزت و توقیر اتنی بڑھ گئی تھی کہ انہوں نے اس جنگ میں غیر معمولی شجاعت و جانبازی کا مظاہرہ کرنے والوں کو مزید انعامات عطا کیے۔ چنانچہ ان لوگوں کو قدر افزائی کے طور پر، فے کے علاوہ ایک ایک ہزار دراہم اور ملے۔ آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اتنے خوش کیوں نہ ہوتے؟ انہیں معلوم تھا کہ نہاوند کی ایرانی فوج میں مملکت کے سارے سورما جمع ہو گئے ہیں اور ایران کے تمام اعیان و امراء نے قسم کھائی ہے کہ جب تک وہ عربوں کو اپنے ملک سے نکال کر بے سرو سامانی کی حالت میں جزیرہ نمائے عرب کی طرف نہ دھکیل دیں گے، اپنی تلواریں نیام میں نہ کریں گے۔ لیکن اب وہی سورما شکست کھا کر بھاگ رہے ہیں۔ اب وہی اعیان و امراء شکست کی ذلت سے بچنے کے لیے پناہ تلاش کرتے پھر رہے ہیں اور وہ نہیں ملتی، بلکہ چاروں طرف وہ عرب ہی عرب ہیں جن کی سلطنت پھیلتی جارہی ہے، جن کا بول بولا ہوتا جارہا ہے اور جن کے نام کسریٰ کی تمام سلطنت میں، شمال سے لے کر جنوب اور مغرب سے لے کر مشرق تک، قلب و گوش کے لیے ایک زلزلہ بنے ہوئے ہیں۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ جونہی اہل ہمدان کو نہاوند اور فیروزان کا حشر معلوم ہوا وہ صلح کے لیے دوڑے۔ بصرہ کی جو فوج نہاوند میں لڑی تھی، اس کے سالار حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ تھے۔ جب وہ نہاوند سے واپس ہوئے تو دینور سے گزرے۔ پانچ دن محاصرہ جاری رہا، آخری دن لڑائی

Marfat.com

ہوئی۔ سورج ڈوبنے سے پہلے ہی دینور والوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور خراج وجزیہ کے عوض اپنے جان و مال اور اولاد کی امان چاہی جو قبول کر لی گئی۔ حضرت ابوموسیٰ نے دینور ہی کی شرائط صلح پر اہل سیروان سے بھی صلح کر لی۔ ان کے ایک عامل نے صیمرہ والوں سے مصالحت کی اور قرار پایا کہ ان کا خون نہیں بہایا جائے گا۔ ان کے غلام چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کے معاملات سے کوئی غرض نہ رکھی جائے گی۔ اس کے بدلے وہ مسلمانوں کو جزیہ وخراج ادا کریں گے اور اس صلح نامے کو مہر جان قذق کے تمام علاقوں پر حاوی سمجھیں گے۔ حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے دینار ایرانی سے شہر "ماہ" کے متعلق صلح کی اور شہر والوں کو یہ معاہدہ لکھ دیا کہ "ان کی جان و مال اور زمین محفوظ ہیں، انہیں تبدیل مذہب پر مجبور نہیں کیا جائے گا، نہ ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت روا رکھی جائے گی، جب تک وہ ہر سال مسلمانوں کے مقرر کردہ حاکم کو جزیہ ادا کرتے رہیں گے۔ اور جزیہ بقدر استطاعت ہر بالغ شخص اپنی جان اور مال کے بدلے ادا کرے گا۔ مسافر کو رستہ بتاتے رہیں گے، سڑکوں کو درست کراتے رہیں گے، مسلمانوں کے جو لشکر ان کے پاس سے گزریں گے، انہیں ایک دن اور ایک رات اپنے پاس ٹھہراتے رہیں گے اور خلوص ووفا کو اپنا شعار بنائے رہیں گے، ان کی حفاظت کی جائے گی۔ لیکن اگر انہوں نے دھوکہ دیا اور معاہدے سے پھر گئے تو پھر ہم پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی!"

نہاوند کی شکست نے ایرانیوں کو اس قدر خوف زدہ کر دیا تھا کہ ان کا اضطراب بڑھ گیا اور ان کی معنوی قوتوں کے زوال کی رفتار تیز تر ہوگئی۔ ان حالات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے ضروری تھا کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی فوجیں ایران کے تمام صوبوں میں پھیلا دیں تاکہ پورا ملک بے جان ہو کر اسلامی اقتدار کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور کوئی ایرانی سردار پہلے کی طرح اپنے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے۔ چنانچہ ایران میں فوجیں بھیجنے کا کام حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود سنبھال لیا۔ خراسان کا علم احنف بن قیس کو دیا اور اردشیر و شاپور کا علم مجاشع بن مسعود سلمی کو۔ اصطخر کے لیے عثمان بن ابی العاص ثقفی کا انتخاب کیا اور درابجرد کے لیے ساریہ بن زنیم کنانی کا، کرمان کے محاذ پر سہیل بن عدی کو مقرر فرمایا اور سجستان کے محاذ پر عاصم بن عمرو کو۔ مکران کی مہم حکم بن عمرو تغلبی کے سپرد کی اور ان سب سپہ سالاران افواج کو حکم دے دیا کہ اپنے اپنے علاقے میں جانے کے لیے تیار رہیں۔

عراق عرب کی فتح میں جو حیثیت قادسیہ کی جنگ کو حاصل تھی، وہی حیثیت فارس کی فتح میں

نہاوند کے معرکے کو حاصل ہوگئی۔ جس طرح قادسیہ کی شکست کے بعد یزدگرد نے مدائن میں مسلمانوں کے مقابلے کی کوشش کی تھی، اسی طرح اب نہاوند کی شکست کے بعد اس نے رَی، مرو اور اصطخر میں مسلمانوں کی پیش قدمی روکنی چاہی۔ آذربائیجان، خراسان، فارس اور مکران کے صوبہ داروں نے اس کی مدد کی اور اس طرح مسلمانوں کے اس بپھرے ہوئے دھارے کے سامنے بند باندھنے کا ارادہ کیا جو ان کے وطن کی عظمت و بزرگی کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ آگے چل کر ہم ان کی یہ کوشش، یزدگرد کی سرگشتگیاں، ایرانیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے کارنامے دیکھیں گے اور آنے والے باب میں ان کی اجمالی داستان پیش کریں گے۔

⊙❀⊙

Marfat.com

باب: 17

ایرانی فتوحات کا تتمہ

نہاوند اور ہمدان، عراق عجم میں اتنی اہم جگہ واقع ہیں کہ اگر انہیں ایرانی سلطنت کی ریڑھ کی ہڈی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہاں کے باشندے نسلی، لسانی اور مذہبی اعتبار سے خالصتاً ایرانی تھے، جن کا عراق عرب سے کوئی نسبی تعلق نہ تھا اور نہ وہ عربی زبان کا ایک لفظ ہی جانتے تھے۔ اس لیے نہاوند میں ایرانیوں کی شکست دراصل سلطنت کسریٰ کی شکست تھی، جس کے بعد کسریٰ اور اہل ایران کے لیے صرف دو ہی صورتیں باقی رہ گئی تھیں۔ یا تو وہ مسلمانوں کے سامنے سپر انداز ہو جاتے یا اپنے آپ کو ایک ایسی ہلاکت خیز جنگ پر آمادہ کر لیتے جس میں انہیں کامیابی ہوتی تو وہ عربوں کو ایران سے نکال باہر کرتے اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تو اکاسرہ اپنے تخت سے ہاتھ دھو بیٹھتے اور ان کی سلطنت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی۔ اسی طرح ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ عراق عجم ایرانی صوبوں کے قلب میں واقع تھا۔ اس کے شمال میں آذربائیجان، طبرستان اور جیلان تھے اور مشرق میں سمان اور صحرائے ایران۔ جنوب میں فارس و کرمان تھے اور مغرب و جنوب مغرب میں عراق عرب اور خوزستان۔ پھر عراق عجم میں اصفہان، ہمدان اور ری جیسے بڑے بڑے شہر تھے، جن کی اہمیت و مرکزیت نے ان میں دارالسلطنت کی سی شان پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ جب مسلمانوں نے عراق عجم پر حملہ کر کے ان بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا تو ان کے لیے پورے ایران کے دروازے کھل گئے اور وہ اس میں پھیل گئے......اور افسوس کے قابل تھی وہ قوت جو اس کے بعد بھی رستے میں قدم روک لیتی۔

لیکن یزدگرد اس تیز و تند دھارے کو کیسے روک سکتا تھا؟ وہ دیکھ رہا تھا کہ قادسیہ فتح کرنے کے بعد مسلمان عراق عرب میں مدائن و جلولا تک آ پہنچے ہیں۔ انہوں نے بصرہ اور کوفہ جیسے دو شہر آباد کر لیے ہیں۔ خوزستان میں ہرمزان کی قوت مقابلہ ختم کر دی ہے اور نہاوند میں ایرانی طاقتوں

Marfat.com

سے ٹکرا کر انہیں بری طرح خاک میں ملا دیا ہے۔ کیا ان واقعات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قسمت ان کی دوست اور شریک ہے اور کوئی انہیں روکنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہ قسمت ہی کی یاوری ہے کہ انہوں نے شام میں ہرقل کو شکست دے کر بزنطیہ بھگا دیا اور نصرانیت کے گہوارے، ہیکل سلیمان کے مستقر بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ ان حالات میں کیا یزدگرد کے لیے بہتر نہ ہوگا کہ وہ اس شان کے حملہ آوروں سے مصالحت کر لے۔ جتنا علاقہ وہ فتح کر چکے ہیں ان کے لیے چھوڑ دے اور اپنے لیے اپنے آبائی ملک کے باقی ماندہ حصے کو غنیمت سمجھے۔ ممکن ہے جو تقدیر آج اس سے ناراض ہے کل اس پر مہربان ہو جائے یا آپ کا خیال یہ ہے کہ پشت ہا پشت کی حکومت کا غرور اسے مغلوبانہ صلح سے باز رکھے گا اور جوانی کی جرأت و بے باکی اسے ایک اور ٹکر لینے پر ابھارے گی؟ سچ یہ ہے کہ وہ اسی کشمکش میں پسا جا رہا تھا۔ اس بات کی ضمانت کون دے سکتا تھا کہ اس کی درخواست صلح خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ کی طرف سے مسترد نہیں کی جائے گی اور اگر ایسا ہو گیا تو اس سے بڑی ذلت کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور اس بات کی ذمہ داری کون قبول کر سکتا تھا کہ ایران کے امراء اور جاگیردار نئی جنگ کی دعوت پر لبیک ہی کہیں گے۔ اگر انہوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا تو اس کی خود اپنے ملک میں یہ حالت ہوگی، گویا وہ تخت و تاج سے محروم کر دیا گیا ہے۔ جس کا کوئی حکم نہیں مانتا، جس کے جھنڈے تلے کوئی نہیں آتا۔ چنانچہ اس نے رحمت خداوندی سے کوئی بڑی امید باندھے بغیر معاملے کو تقدیر کے حوالے کر دیا کہ وہ جو چاہے کرے۔

ایرانی سرداروں اور سپہ سالاروں کے اپنی اپنی جگہ چلے جانے سے یزدگرد کی امیدوں کا پھول اور بھی مرجھا گیا۔ جس دن وہ تخت نشین ہوا ہے اور اس نے مدائن کے ایوان کسریٰ میں جلوس فرمایا ہے تو ان سب نے اس کی مدد کا وعدہ کیا تھا، اس لیے کہ اس وقت حکومت کے پاس ایک قابل فخر فوج تھی، جس کی وجہ سے لوگ اس کی اطاعت پر مجبور تھے۔ چنانچہ وہ سب کے سب اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور چونکہ اس وقت تک دشمن کو روکنے کی امیدیں بے جان نہ ہوئی تھیں اس لیے سب نے حملہ آوروں کے مقابلے میں اپنی اپنی فوجیں نہاوند بھیج دی تھیں لیکن حکومت کی فوج نے شکست کھائی اور غنیم کو نکال باہر کرنے کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اب ان کے حواس جاتے رہے اور ان میں سے اکثر اپنی اپنی امارت کے تحفظ اور اپنی اپنی حکومت کے انجام کی فکر میں اس کا ساتھ چھوڑ گئے کہ مسلمانوں کو اپنی علمداریوں سے دور رکھنے کی کوشش کریں

Marfat.com

یا ان سے مصالحت کر کے ان کے نام پر اپنی حاکمیت برقرار رکھیں۔ یزدگرد سے ان امراء کا رشتہ کسی شہنشاہی اقتدار یا نظام کا رشتہ نہ تھا بلکہ ایک ایسے بادشاہ سے خوش سلوکی کا رشتہ تھا جس کی حکومت کو تقدیر کے ہاتھوں نے کمزور کر دیا تھا اور وہ اپنے ملک میں بھگوڑے کی طرح اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ پس اگر قضا و قدر نے اس کی لوحِ تقدیر میں اس کا خاتمہ لکھ دیا ہے تو یہ امراء اپنے ضمیر کے سامنے اپنی اس بے وفائی کی توجیہ پیش کر دیں گے اور اگر اسے کامیابی میسر آ گئی تو وہ پھر یزدگرد کے پاس چلے آئیں گے اور وہ اس دن بلاشبہ ان پر ضرورت کا حکم صادر کرے گا۔

ان امراء کے اس طریقِ فکر پر انہیں مجرم ٹھہرانے میں آپ حق بجانب ہیں۔ اس طرح نہ حکومتیں قائم رہتی ہیں نہ ان کی شان میں کوئی اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن آخری دور میں ایران کو جن حوادث سے دوچار ہونا پڑا ان کے پیشِ نظر ایرانی امراء کی یہ خود غرضی بالکل فطری تھی۔ خاص طور پر اس لیے کہ وہ ایران کی قدیم ترین تاریخ کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔ ایرانی اس سرزمین پر جس کا نام ان کے نام پر رکھا گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے صدیوں پہلے قابض ہوئے تھے اور جس زمانے میں قابض ہوئے تھے اس زمانے میں وہ ایک ایسی قوم تھے جو سادہ زندگی پر جان دیتی تھی۔ مشکلیں جھیلنے اور میدانِ جنگ میں پامردی دکھانے کے لیے بے چین رہتی تھی اور اس کے بلند حوصلے فتوحات سے کم کسی مرتبے پر راضی نہ ہوتے تھے۔ عراق عجم میں ایرانیوں کی مڈبھیڑ میڈیا والوں سے ہوئی۔ ایک قیامت آسا جنگ کے بعد جب صلح کی نوبت آئی تو اہل میڈیا کو ایرانی اقتدار کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ وہ ایرانیوں کی صف میں شامل ہو گئے اور ان کے ساتھ مل کر دشمنوں سے لڑتے رہے۔ ایرانی اس ملک میں مابین النہرین کے علاقے تک پہنچ گئے اور وہاں سے مصر و یونان کی طرف بڑھے۔ ایران اور یونان کی ریاستوں میں متعدد جنگیں ہوئیں جن کے نتیجے میں یونانیوں نے ایرانیوں کو یورپ پر حملہ کرنے سے روک دیا۔ اس زمانے میں ایران چند ریاستوں پر مشتمل تھا جن کی زمامِ حکومت کسی نہ کسی جنگ آزما امیر کے ہاتھ میں تھی ہر امیر اپنی ریاست کا تنہا مالک تھا اور اپنی حدودِ مملکت میں خود مختار تھا۔ اس کے بعد یہ ریاستیں متحد ہو گئیں جن کا فرمانروائے اعلیٰ کسریٰ مقرر ہوا۔ پورے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر کسریٰ نے "شہنشاہ اعظم" کا لقب اختیار کیا۔ ایرانیوں نے پڑوس کی مشرقی اور مغربی حکومتوں پر حملے کیے اور ان کی سلطنت وسیع ہوتی چلی گئی۔ تا آنکہ سکندر مقدونی نے انہیں شکست دے کر ان کے ملک میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ سکندر کی سیاست یہ تھی کہ وہ ہر ملک کی داخلی حکومت وہیں کے باشندوں

سونپ دیا کرتا تھا۔ اس لیے ایرانی امراء بدستور قائم رہے اور اپنی اپنی مملکت میں ان کے اختیار و اقتدار پر کوئی آنچ نہ آئی۔ اس چیز نے اس ملک سے ان کا تعلق اور گہرا کر دیا اور وہ اس پر اور حریص ہو گئے۔ سکندر کے بعد ایرانیوں نے دوبارہ آزادی حاصل کر لی اور حکومت کا تاج بنوساسان کے سر پر رکھا گیا۔ اب اکاسرہ ایران وہ تھے۔ انہوں نے مدائن کو دارالسلطنت بنایا اور امرائے ایران کو ان کے علاقوں میں برسر حکومت رہنے دیا۔ بنوساسان نے ایران کو پھر اسی قدیم ڈگر پر ڈال دیا۔ جنگ آزمائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور ایرانی سلطنت وسعت و کشادگی حاصل کرنے لگی۔ مفتوحہ ممالک کے مختلف گوشوں سے دولت و ثروت کے خزانے ایران کی سمت ابل پڑے، جس سے ایرانیوں کی زندگی میں فراغت و آرام اور آسائش و آسودگی کا رنگ نکھرتا چلا گیا۔ راحت و اطمینان کا یہ دور مدتوں جاری رہا اور انجام کار آہستہ آہستہ عیش کوشی میں تبدیل ہونے لگا۔ عیش کوشی نے نزاکت کو جنم دیا اور نزاکت نے جرأت و مردانگی کی وہ تمام صفات ایرانیوں سے چھین لیں، جو انہیں اپنے اسلاف سے ورثہ میں ملی تھیں۔ پھر ان خوبیوں کے عوض ارادے کی وہ پختگی اور تحمل کی وہ قوت ان میں پیدا نہ ہو سکی جو صحت مند تہذیب اپنے حلقہ بگوشوں کو عطا کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی سلطنت رفتہ رفتہ روبہ زوال ہونے لگی۔ ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں ایرانیوں نے اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنا چاہا اور رومیوں کو شکست دے کر بیت المقدس اور مصر پر قبضہ کر لیا۔ ان لڑائیوں میں رومیوں کو اس لئے شکست ہوئی کہ ان کا طرز حکومت غلط اور انتظام ناقص تھا۔ اس کے بعد جب ہرقل روم کا فرماں روا ہوا تو اس نے ایرانیوں کو شکست دے کر صلیب اعظم ان سے چھین لی۔ اس شکست کا صرف یہی اثر نہ ہوا کہ ایرانی اپنی سرحدوں میں پسپا ہو گئے، بلکہ ان کی ہمتیں بھی جواب دے گئیں۔ ان کے امراء میں انارکی پھیل گئی اور انہیں اپنے اوپر اعتماد نہ رہا۔ اس کے بعد جب عربوں نے ان پر حملہ کیا تو ان عوامل نے ان کی رہی سہی ہمت بھی چھین لی اور وہ غازیانِ اسلام کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے بچاؤ کی راہ تلاش کرنے لگا اور امرائے ملک نے چاہے تھوڑے ہی وقت کے لیے سہی، فاتح کے زیر سایہ اپنا چھوٹا اقتدار ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ انہوں نے کسریٰ کا ساتھ چھوڑ دیا جو ان کے اتحاد و عظمت کی علامت تھا کہ تقدیر اس کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے۔

ایران کے شہنشاہ اور اکثر و بیشتر اعیان و امراء کا حال یہ تھا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جونہی اپنے لشکر کی نہاوند میں کامیابی اور اہل ہمدان سے مصالحت کی طرف سے اطمینان ہوا، آپ کو

Marfat.com

احنف بن قیس کا یہ قول یاد آیا، ''جب تک یزدگرد ایرانیوں کی پشت پر موجود ہے وہ مسلمانوں سے لڑتے رہیں گے۔ جس ملک میں دو بادشاہ ہوں ان میں کبھی اتفاق کی صورت نہیں نکلتی تاوقتیکہ ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کو نکال باہر نہ کرے!'' اس اعتبار سے ایرانیوں کا ایران میں اس وقت تک تعاقب کرنا اشد ضروری ہے، جب تک کسریٰ کو وہاں سے نکال نہ دیا جائے تمام ملک بلاشرکت غیرے مسلمانوں کے قبضے میں نہ آجائے۔ تو پھر اس مقصد کے حصول کی بہترین راہیں کیا ہوسکتی ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے مناسب نہ تھا کہ وہ عراق عجم کو فتح کرنے سے پہلے اپنی فوجوں کا رخ فارس کی طرف پھیر دیتے۔ عراق عجم فتح کر لینے سے ایک تو اسلامی فوجوں کا عقب اور خط رجعت محفوظ ہو جائے گا۔ دوسرے وہ رستے کھل جائیں گے جن کے ذریعے اسلامی لشکر کو مضبوط کرنے کے لیے عراق عرب اور جزیرہ نمائے عرب سے امدادی فوجیں بھیجی جا سکیں گی، لیکن فوجوں کو عراق عجم میں ہمدان سے ری کی طرف بڑھ کر اسے فتح کرنا چاہیے یا نہاوند سے اصفہان کی طرف آجانا چاہیے کہ پہلے اس وسیع و عریض صوبے کو زیر نگیں کیا جائے جو خوزستان اور عراق سے بہت زیادہ قریب ہے۔

جس وقت عرب نہاوند اور ہمدان میں داخل ہوئے، یزدگرد ری میں مقیم تھا۔ اس نے جو یہ دیکھا کہ مسلمان اس مستقر کی طرف بڑھ رہے ہیں تو اصفہان بھاگ کر وہاں کے باشندوں کو جنگ پر ابھارنے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر ملی تو مسلمانوں کو اصفہان کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو توقع تھی کہ یزدگرد مقابلہ کرے گا اور گرفتار کرلیا جائے گا اور اس کی گرفتاری سے ایران کی قوت مقاومت ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ عبداللہ بن عتبان رضی اللہ عنہ کو روانگی کا حکم دیا اور عبداللہ رضی اللہ عنہ کوفہ کی اس فوج کو، جو ان کے ساتھ تھی اور نعمان بن مقرن کے اس لشکر کو، جو نہاوند میں تھا، ساتھ لے کر ری کی طرف بڑھ گئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورۃً ہرمزان سے فرمایا: ''تمہاری کیا رائے ہے حملہ فارس سے شروع کیا جائے یا آذربائیجان سے یا پھر اصفہان سے؟'' ہرمزان نے جواب دیا۔ ''فارس اور آذربائیجان دو بازو ہیں اور اصفہان سر۔ اگر ایک بازو کٹ جاتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا بازو کام کرتا ہے لیکن اگر سر کٹ جائے تو بازو بے کار ہو جاتے ہیں، اس لیے پہلے سر سے شروع کیجیے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ رائے پسند آئی اور فوجوں کو اصفہان فتح کرنے کا حکم دے دیا گیا۔

اصفہان ایک بہت ... شہر اور عراق عجم کے اس صوبے کا صدر مقام تھا جس کا نام ہی اس

کے نام پر رکھا گیا تھا یہ دو شہروں، جی اور یہودیہ کو ملا کر بنایا گیا تھا۔ یہودیہ میں خالصتاً یہودیوں کی آبادی تھی اور یہ شہر یزدگرد اول نے اپنی یہودی ملکہ ''شوش وخت'' کی خواہش پر تعمیر کرایا تھا اور جی ایک قصبہ تھا۔ زمین بڑی شاداب، ہوا بے حد خوشگوار اور پانی نہایت شیریں۔ اسی لیے شاہان عجم نے اسے اپنی قیام گاہ بنایا تھا۔ اصفہان کوہستانی سلسلے کے جنوبی سرے پر واقع تھا، جس کی زمین کشادہ اور زرخیز تھی۔ ملک کے مختلف گوشوں کی شاہراہیں یہاں آ کر ملتی تھیں۔ اصفہان سے ری جانے والا رستہ قاشان اور اس کے بعد قم سے گزرتا تھا۔

ابن عتبان رضی اللہ عنہ فوج لے کر روانہ ہوئے۔ اصفہان کے باہر ان کی مڈبھیڑ ایک بہت بڑے ایرانی لشکر سے ہوئی جس کے سپہ سالار [1] نے فوراً ہی جنگ شروع کر دی۔ قیامت کا رن پڑا۔ ایرانیوں کے مقدمۃ الجیش پر ایک گرگ باراں دیدہ شہریار بن جادویہ تھا [2] اس کا شمار ایرانیوں کے ان گنے چنے بہادر جنگ آزماؤں میں تھا، جن کے مقابلے میں دشمن کو میدان چھوڑ کر بھاگتے ہی بن پڑتی تھی۔ اس نے جب اپنی فوج کا پلہ ہلکا پڑتے دیکھا اور ایرانی مقتولوں کی کثرت پر اس کی نظر گئی تو ڈرا کہ فوجی کہیں ہمت نہ ہار بیٹھیں۔ وہ پہلی صف میں آ گیا اور مسلمانوں سے مبارز طلب ہوا۔ عبداللہ بن ورقاء ریاحی مقابلے کو نکلے اور اسے قتل کر دیا۔ ایرانیوں نے جو اپنے مشہور شہسوار کو خاک وخون میں تڑپتے دیکھا تو ان میں کھلبلی مچ گئی اور وہ اس گاؤں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ مسلمانوں نے وہاں چھاؤنی بنائی اور اس جگہ کا نام رستاق الشیخ رکھ دیا ایرانی جی کی طرف پسپا ہو کر اصفہان کی فصیلوں میں پناہ تلاش کر رہے تھے اور عین اسی وقت مسلمان اس مضبوط و مستحکم شہر پر حملہ کرنے کی تجویزیں سوچ رہے تھے۔

یزدگرد کو جب رستاق الشیخ میں ایرانیوں کا حشر معلوم ہوا تو وہ اصفہان سے کرمان بھاگ گیا۔ عبداللہ بن عتبان رضی اللہ عنہ نے جی کی طرف بڑھ کر اصفہان کا محاصرہ کر لیا۔ ایرانی قلعہ بند ہو گئے۔ وہ کبھی کبھی نکلتے، مسلمانوں سے دو دو ہاتھ کرتے اور پھر اپنے مورچوں میں گھس جاتے۔ جب ان جھڑپوں کا سلسلہ طویل ہو گیا تو ایرانی تنگ آ کر ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے میدان میں نکل آئے۔ دونوں لشکروں نے صفیں آراستہ کیں، لڑائی شروع ہونے ہی والی تھی کہ اصفہان کے

---

[1] اس سپہ سالار کا نام استندار تھا۔

[2] اس کا نام شہر براز جادویہ بھی آیا ہے۔

Marfat.com

حاکم فاذوستان ① نے عبداللہ بن عتبان رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا۔ "نہ تم میرے ساتھیوں کو قتل کرو اور نہ میں تمہارے ساتھیوں کو۔ آؤ! ہم آپس میں مبارزت کر لیں۔ اگر میں تمہیں قتل کر دوں تو تمہارے ساتھی واپس ہو جائیں گے اور اگر تم مجھے مار ڈالو تو میرے ساتھی تمہاری حفاظت کریں گے۔ بشرطیکہ ان کی طرف ایک بھی تیر نہ جائے۔ تھوڑی دیر تک دونوں میں زور آزمائی ہوتی رہی، آخر فاذوستان نے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے کہا۔ "میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ میں نے تمہیں واقعی جواں مرد پایا ہے۔ میں تمہارے ساتھ تمہارے لشکر میں چلتا ہوں اور تم سے صلح کر کے اس شرط پر شہر تمہارے حوالے کیے دیتا ہوں کہ جو یہاں رہنا چاہے گا جزیہ ادا کر کے رہے گا اور اس کا مال محفوظ ہوگا۔ جن کی زمینیں جبراً تم نے لے لی ہیں وہ بھی اس شرط میں شامل ہوں گے اور اپنے اپنے گھروں کو واپس آجائیں گے جو کوئی ہمارے اس معاہدے میں شریک ہونا پسند نہ کرے گا وہ جہاں چاہے گا چلا جائے گا اور اس کی زمین تمہاری ہوگی۔" عبداللہ رضی اللہ عنہ نے یہ صلح منظور کر لی اور اہل صفہان ذمی بن گئے۔ صرف تیس (30) آدمیوں نے اپنی قوم سے اختلاف کیا اور کرمان جا کر اپنی قوم سے مل گئے۔

جس وقت مسلمان اصفہان فتح کرنے کے لیے معرکہ آزما تھے۔ بلاد شمال جو بحیرہ قزوین کے جنوب میں واقع تھے، اسفندیار رازی کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ اسفندیار اسی رستم کا بھائی تھا، جو قادسیہ کی جنگ میں شکست کھا کر مارا گیا تھا۔ وہ اس وقت مسلمانوں کو ری سے نکالنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اہل ہمدان کو یہ معلوم ہوا تو ان کے حوصلے بڑھ گئے اور انہوں نے معرکہ نہاوند کے بعد جو صلح مسلمانوں سے کی تھی وہ توڑ دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شکست عہد کی اطلاع ملی اور بارگاہ خلافت سے نعیم بن مقرن کے نام یہ حکم نامہ جاری ہوا کہ وہ ہمدان جائیں اور بزور شمشیر شہر میں داخل ہو کر انہیں ایسی عبرتناک سزا دیں کہ وہ آئندہ ایسی جرأت نہ کر سکیں اور دوسروں میں بھی مسلمانوں سے کیے ہوئے وعدے کو توڑنے کی ہمت نہ رہے۔ اہل ہمدان نے جب نعیم کا نام اور انہیں معلوم ہوا کہ وہ ان کی طرف آ رہے ہیں تو انہیں نہاوند کا معرکہ یاد آ گیا۔ "فیروزان" اور "شہد" کی گھاٹی میں اس کے انجام نے انہیں بوکھلا دیا۔ ان کی ہمتیں پست ہو گئیں اور رعب ان پر چھا گیا۔ انہیں اپنے محصور و مقہور ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا اور جب انہیں یہ خبریں ملیں کہ نعیم

① مؤرخین عرب کی کتابوں میں اس کا یہی نام ہے۔ لیکن انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی عبارت یہ ہے۔ "عبداللہ بن عتبان رضی اللہ عنہ، خلیفہ عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے جی کی طرف روانہ ہوئے۔ اس کے حاکم چار فاذوستانوں میں سے ایک تھا، چاروں سلطنت ایران کے ... تھے"۔

ہمدان کے آس پاس کے شہر فتح کر لیے ہیں تو ان کے خوف و دہشت میں اور اضافہ ہو گیا اور اپنی بدانجامی کی تصویر ان کی آنکھوں میں پھرنے لگی۔ جب نعیم نے ہمدان پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا تو انہوں نے صلح کی درخواست بھیجی لیکن اس کے قبول ہونے میں انہیں شبہ تھا اور شبہ کیوں نہ ہوتا جب کہ وہ معاہدہ توڑ چکے تھے۔ لیکن ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا جب انہیں معلوم ہوا کہ ان سے اس شرط پر جزیہ قبول کر لیا گیا ہے کہ اہل شہر کو معاہدہ یاد دلاتے رہنے کے لئے مسلمان فوج کا ایک دستہ ہمدان میں رہے گا اور اس کا افسر ان سے جزیہ وصول کرے گا۔ کیا نعیم نے صلح کی یہ درخواست اس لیے قبول کی تھی وہ شہر پر حملہ کر کے اپنے سپاہیوں کی جانیں ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے یا اس کا سبب یہ تھا کہ اسفندیار کی تیاریوں کی خبریں انہیں برابر مل رہی تھیں اور انہوں نے بہتر یہ سمجھا کہ اپنی پوری قوت کو محفوظ رکھیں اور اس بڑھتی ہوئی طاقت سے نبرد آزما ہوں جو انہیں ری سے دور رکھنا اور ہمدان سے نکالنا چاہتی تھی اور جس کا مقصد یہ تھا کہ جو علاقے نعیم اور ان کے بھائی نے فتح کیے ہیں، وہ ان سے واپس لے لے؟ نعیم نے خواہ کسی وجہ سے اہل ہمدان کی درخواست صلح قبول کی ہو، یہ واقعہ ہے کہ جو فوجیں اسفندیار کے پاس جمع ہو رہی تھیں، ان کی تعداد اور قوت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ نعیم، ہمدان میں بارہ ہزار مجاہدین اسلام کی قیادت کر رہے تھے کہ انہیں خبر ملی، ایرانی فوجیں مختلف سمتوں سے ان کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ دیلمی اپنے امیر موتا، اہل ری اپنے سردار، زینبی [1] ابوالفرخان اور آذربائیجان والے اپنے سالار، اسفندیار کی قیادت میں روانہ ہوئے اور ورج روذ کو مرکز اتصال قرار دیا۔ دستبی ورج روذ کے بالکل قریب ہی واقع تھا اس لیے نعیم نے ایرانی فوجوں کی خبریں حاصل کرنے کے لیے اپنے جاسوس اس کی طرف روانہ کیے۔ سب سے پہلے دیلمی ورج روذ پہنچے اور جاسوسوں نے نعیم کو ان کی آمد کی اطلاع بھیجی۔ نعیم نے یزید بن قیس کو اپنا نائب مقرر کیا اور خود ہمدان سے نکل کر ان ایرانی فوجوں کے بالمقابل جا اترے جو ان سے لڑنے کے لیے جمع ہوئی تھیں۔ ان فوجوں کی تعداد پوری ہو چکی تھی، اس لیے جونہی مسلمان آ کر اترے، انہوں نے بغیر کسی تاخیر کے اسلامی لشکر پر حملہ کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی قوت مسلمانوں کو شکست دینے ہی کے لیے نہیں بلکہ ان کے استیصال کے لیے بھی کافی ہے۔ فریقین اس شدت سے لڑے کہ نہاوند کی یاد تازہ ہو گئی۔ مسلمان چونکہ فتوحات کے عادی ہو چکے تھے، اس لیے ان پر غالب آنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کے برعکس دیلم اور ایران کی

---

[1] ایرانی نام زنبدی یا زبندی ہے۔ لیکن مؤرخین عرب اسے زینبی لکھتے ہیں۔

Marfat.com

فوجیں چونکہ ایسے کسی جھنڈے کو نہ جانتی تھیں جس کے نیچے وہ جمع ہوں اور جس کی سربلندی کے لیے وہ اپنی جانیں نچھاور کر دیں اس لیے جب شام ہوئی تو اپنی بے شمار لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔

نعیم، ہمدان کی شکست اور مصالحت کی اطلاع بارگاہ خلافت میں بھیج چکے تھے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھ چکے تھے کہ دیلم، ری اور آذربائیجان سے فوجیں جمع ہونے کی اطلاعیں مل رہی ہیں۔ یہ خبر سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اللہ سے اپنے لشکر کی فتح و نصرت کے لیے دعائیں مانگنے لگے۔ وہ مدینہ میں انتہائی بے چینی کے ساتھ اس معرکے کی خبر کا انتظار کر رہے تھے کہ عروہ بن زید الخلیل پہنچے۔ اس سے پہلے عروہ معرکہ جسر کی خبر لا چکے تھے، جس میں ابوعبیدہ ثقفی شہید ہوئے تھے اور مسلمانوں نے شکست کھائی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا "بشیر؟"[1] آنے والے نے کہا "نہیں۔" "عروہ!" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "انا للہ وانا الیہ راجعون" یہ سن کر عروہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مطلب سمجھ گئے اور کہا۔ "خدا کا شکر ادا کیجیے کہ اس نے ہمیں فتح یاب کیا ہے!" اور پورا واقعہ سنایا۔ جب ان کی بات پوری ہو گئی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "تم خود وہیں ٹھہرتے اور کسی اور کو بھیج دیتے!" عروہ نے کہا "میں اپنے بھائی کو اپنا نائب مقرر کر آیا ہوں۔ میری خوشی یہی تھی کہ میں یہ خوش خبری لے کر خود پہنچوں۔" اس دن سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا نام "بشیر" رکھ دیا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے حکم سے وہ نوید نامہ پڑھا گیا جو عروہ نعیم کی طرف سے لائے تھے...... مسلمانوں نے اللہ کا شکر ادا کی اور شکرانے کے نفل پڑھے۔

عروہ، نعیم کے نام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط لے کر ہمدان پہنچے جس میں لکھا تھا۔ "امابعد! ہمدان میں اپنا نائب مقرر کر کے خود ری کی طرف کوچ کرو، دشمن سے لڑو اور پھر وہیں قیام کر لو! اس لیے کہ یہ شہر دوسرے شہروں کے وسط میں واقع ہے اور تمہارے مقصد کے لیے دوسرے تمام شہروں سے زیادہ کارآمد بھی!" یہ خط پڑھتے ہی نعیم نے یزید بن قیس کو ہمدان میں اپنی جگہ نائب مقرر کیا اور خود فوج لے کر ری کی طرف بڑھے۔ انہیں یقین تھا کہ اللہ مسلمانوں کو فتح یاب کرے گا اور ان کو اس میں شکست ہوتا بھی کیوں جب وہ ری کی فوجوں سے، جن میں دیلم اور آذربائیجان کی فوجیں بھی شامل ہیں، لڑ کر انہیں شکست دے چکے تھے اور شاید نعیم کو خوش فہمی کچھ زیادہ ہی تھی

[1] عربی میں بشیر کے معنی خوش خبری دینے والے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے، کوئی خوش خبری لائے ہو؟۔ مترجم

Marfat.com

اس زمانے میں ری کا بادشاہ، بہرام چوبیں کا پوتا، سیاوخش بن مہران تھا۔ ورج روذ کی لڑائی کے بعد اسے یقین ہوگیا کہ مسلمان اب اس کے پایہ تخت کا رخ کیے بغیر نہ رہیں گے۔ چنانچہ اس نے رنباوند، طبرستان، قومس اور جرجان والوں سے مدد طلب کی اور ان سے کہا، ''تم جانتے ہو کہ اگر مسلمانوں نے ری پر قبضہ کرلیا تو پھر تمہارا کوئی ٹھکانا نہیں۔'' ان سب نے سیاوخش کی مدد کی اور اس کے پاس اتنی فوج جمع ہوگئی جو سامان اور تعداد کے لحاظ سے نعیم کی فوج کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ یہ ساری فوجیں ری میں قلعہ بند ہوگئیں جسے سیاوخش نے ہر طرح مضبوط کر رکھا تھا۔ سیاوخش نے جب ری میں جمع ہونے والی ان فوجوں کو دیکھا تو اسے یقین ہوگیا کہ مسلمان ان پر غالب نہیں آسکتے، نہ ری کے مستحکم قلعوں پر حملہ کرسکتے ہیں۔

ری کی مدافعت میں اہل شمال کا متحد ہوجانا تعجب انگیز نہیں ہے، اس لیے کہ ری اس علاقے کا بہت بڑا شہر تھا، جسے اپنے استحکام کی بنا پر ایک جائے پناہ کی سی حیثیت حاصل تھی۔ اس میں آتش کدوں کے اردگرد بڑی بڑی عبادت گاہیں تھیں، جو مذہبی اجتماع کے موقعوں پر زیارت گاہ خاص و عام ہوتی تھیں۔ اس لحاظ سے اس شہر پر حملہ گویا ایرانی تقدس پر حملہ تھا، جس کی مدافعت مذہبی فریضے کا درجہ رکھتی تھی۔ پھر یہ شہر اپنے محل وقوع کی بنا پر ایک وسیع تجارتی مرکز تھا، جہاں مشرق و مغرب کا مال آکر فروخت ہوتا اور یہاں کے باشندوں کو دولت و آسودگی سے مالا مال کردیتا۔ یہاں کے رہنے والے اور گردونواح کے لوگ چونکہ شہر کی مضبوطی کی طرف سے مطمئن تھے، اس لیے اس شہر یا اس کے آس پاس کی اقامت کو اپنے لیے امن و راحت کی ضمانت سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے اس شہر کو خطرے میں دیکھا تو اس کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور حملہ آوروں کو روکنے ورج روذ پہنچ گئے، لیکن ورج روذ میں انہیں شکست ہوئی تاہم انہوں نے ہمت نہ ہاری اور یہ ہزیمت انہیں دوبارہ جمع ہوکر شہر کی مدافعت کرنے سے باز نہ رکھ سکی۔

شاید مدافعین کا جوش وخروش شہر فتح کرنے کے عوض، مسلمانوں سے بہت زیادہ قربانیاں طلب کرتا، لیکن تقدیر کا فیصلہ اس کے برعکس ہوا اور یہ فتح نعیم اور ان کے ساتھیوں کے اندازے سے بھی بڑھ کر کم قیمت میں حاصل ہوگئی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ری کا بادشاہ، سیاوخش، ورج روذ کی لڑائی کے بعد زینبی ابوالفرحان کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آیا۔ مسلمانوں کے مقابلے میں راہ فرار اختیار کرنے پر اسے برا بھلا کہا اور اس کا عہدہ اس سے چھین لیا۔ یہ بات زینبی کے دل مین بیٹھ گئی اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ نعیم شہر فتح کرنے کے لیے آرہے ہیں تو ری سے نکلا

Marfat.com

اور شہر سے باہر نعیم سے ملاقات کر کے سیاوخش کے خلاف ان کا ساتھ دینے کی پیشکش کی۔ مسلمانوں نے جبل ری کے دامن میں پڑاؤ ڈالا۔ یہاں مدافعین سے مڈبھیڑ ہوئی اور دن ڈوبنے تک کسی فریق کے حق میں فیصلہ نہ ہوسکا۔ جب رات ہوئی تو زینبی نے نعیم سے کہا۔ "ان کی تعداد زیادہ ہے اور آپ کی کم۔ میرے ساتھ ایک سوار دستہ بھیجئے۔ میں شہر میں ایسے رستے سے داخل ہوں گا کہ انہیں پتا نہ چل سکے گا۔ ادھر آپ ان پر حملہ کر دیجئے جب وہ آپ سے مقابلہ کرنے نکلیں گے تو ان کے پاؤں اکھڑ جائیں گے۔" نعیم کو اس کی یہ تجویز خوش آئی۔ انہوں نے اپنے چچازاد بھائی، منذر بن عمرو کی قیادت میں ایک سوار دستہ اس کے ساتھ کر دیا، جسے زینبی شہر میں اس طرح لے گیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ نعیم نے شہر کے محافظوں کو رات بھر تیروں اور نیزوں میں الجھائے رکھا اور انہیں یہ معلوم نہ ہوسکا کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے؟ صبح ہوئی تو مسلمانوں کا دستہ شہر میں نمایاں ہوگیا اور سواروں نے تکبیر کا نعرہ بلند کیا جسے سن کر ایرانیوں کو یقین ہوگیا کہ ان پر پشت سے حملہ کر دیا گیا۔ وہ بے اوسان ہو کر بھاگے اور مسلمانوں نے انہیں تلوار کی باڑھ پر رکھ لیا۔ نعیم شہر میں داخل ہوئے۔ سیاوخش شکست کھا کے بھاگ گیا اور کسی کو معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کہاں گیا؟ ری میں جو مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا وہ قدر و قیمت میں مدائن کے مال غنیمت سے کم نہ تھا۔ نعیم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نامہ فتح لکھا اور خمس کے ساتھ بارگاہ خلافت میں بھیج دیا۔

فتح کے بعد ری کا انجام کیا ہوا! وہاں کوئی تھا جس سے مسلمان صلح کرتے! ہاں تھا! نعیم نے زینبی کو اہل ری کا نمائندہ قرار دے کر اس سے صلح کر لی اور شہر کی برجیاں اور مورچے مسمار کرنے کے بعد سیاوخش کی جگہ اسے ری کا حاکم بنا دیا۔ پھر پرانے شہر کے پاس ہی ایک نیا شہر آباد کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح آل بہرام کا دور ختم ہوا اور مسلمانوں کی طرف سے حکومت کا شرف، امیر زینبی اور اس کی اولاد کو عطا کیا گیا۔ اتنی تباہی کے بعد بھی رے، بنوامیہ اور بنوعباس کے دور تک ایک عظیم شہر اور مسلمانوں کی اہم چھاؤنی بنا رہا۔ البتہ بعد کو جب اس کے قریب ہی شمال مغرب میں طہران کی داغ بیل ڈالی گئی تو اس کا ستارہ اقبال غروب ہوگیا۔ اگرچہ اس کے کھنڈر آج بھی دیکھنے والوں کو اس کی عظمت و جلالت کی یاد دلاتے ہیں۔ رے میں مسلمانوں کی فتح بڑی شاندار فتح تھی۔ اسی لیے آس پاس کے شہر اور صوبے دوڑ دوڑ کر ان سے جزیے پر صلح کرنے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے جب سوید بن مقرن نے قومس پر چڑھائی کی تو کوئی مقابلے پر نہ آیا اور بغیر لڑے بھڑے شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ سوید نے وہاں فوج ڈال دی اور شہر والوں سے

Marfat.com

مصالحت ہوگئی۔ اسی طرح ری میں شکست ہوجانے اور تمام حلیفوں کے اپنی اپنی جگہ واپس چلے جانے کے بعد اہل دنباوند نے بھی ان کے بھائی نعیم سے صلح کر لی۔

دنباوند ایک شہر تھا جوری کے قریب ایک پہاڑ پر آباد تھا۔ اس کے باشندے ری کی مدافعت کے لیے اس کے قلعوں میں چلے گئے تھے، لیکن جب شہر نے اپنے دروازے کھول دیئے اور اس کے مدافعین، اہل دنباوند سمیت، اپنی اپنی فرودگاہوں کی طرف پسپا ہوئے تو دنباوند والوں کے لیے صلح کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ انہوں نے دولاکھ درہم سالانہ جزیہ پر مسلمانوں سے صلح کر لی۔ قرار یہ پایا کہ جب تک وہ اپنے وعدے پر قائم ہیں ان کے علاقے میں لوٹ مار نہیں مچائی جائے گی۔ نہ ان کی اجازت کے بغیر کوئی ان کی حدود میں داخل ہوگا۔ البتہ قومس ایک بہت بڑا اور وسیع علاقہ تھا جس میں بہت سے شہر، گاؤں اور کھیت تھے۔ یہ طبرستان کے پہاڑوں کے جنوب میں ری اور نیشاپور کے درمیان پھیلا ہوا تھا جسے طبرستان، بحیرہ قزوین سے جدا کرتا تھا۔ ری کی فتح اور قومس و دنباوند کی صلح کے بعد مملکت ایران سے جرجان، طبرستان اور آذربائیجان کے سوا مسلمانوں اور سواحل قزوین کے درمیان اور کچھ باقی نہ رہا۔ اگر مسلمان انہیں فتح کر کے ان کے باشندوں سے صلح کر لیں تو مملکت کسریٰ کا یہ حصہ، انتہائی شمال تک ان کے قبضے میں آجائے۔ صلح قومس کے بعد سوید بن مقرن نے بسطام میں پڑاؤ ڈالا اور جرجان کے فرماں روا کو لکھا کہ یا تو وہ صلح کر لے ورنہ اسلامی فوجیں اس کی طرف آ رہی ہیں۔ اس ایرانی بادشاہ نے فوراً دہستان اور جرجان کی طرف سے صلح کر لی کہ وہ مسلمانوں کو جزیہ ادا کریں گے اور مسلمان ان کے جان و مال اور مذاہب و رسوم کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ اس صلح نامے میں ایک ایسی واضح شق رکھی گئی، جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔ ''تم میں جس کسی سے ہم کوئی مدد لیں گے یہی اس کا جزیہ ہوگا۔ اس سے روپیہ وصول نہ کیا جائے گا۔'' اس نص سے بڑھ کر اور کوئی چیز اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ جزیہ دراصل کسی مغلوب قوم کی حفاظت کا معاوضہ تھا، لیکن اگر وہ قوم اپنی حفاظت خود کرے یا مسلمانوں کا ساتھ دے تو اس سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔

جرجان، ساحل قزوین کے جنوب مشرق میں، طبرستان، جرجان کے قریب، اس ساحل کے جنوب میں اور آذربائیجان طبرستان کے قریب، اس ساحل کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ طبرستان کے بادشاہ نے جب دیکھا کہ مسلمانوں نے ری پر قبضہ اور اہل قومس سے صلح کر کے اسے جنوب کی طرف سے گھیر لیا ہے اور اہل جرجان سے صلح کر کے اس کی مشرقی راہیں مسدود

Marfat.com

کردی ہیں اور اب اس کے لیے سرزمین ایران کا اگر کوئی رستہ رہ گیا ہے تو وہ صرف آذربائیجان کا رستہ ہے جو خود اکھاڑا بننے والا ہے، تو اس نے صلح کو ترجیح دی اور اس سلسلے میں سوید سے مراسلت شروع کی، جس کے نتیجے میں طبرستان اور جیلان کی پہاڑیوں کی طرف سے صلح ہوگئی کہ ان دونوں علاقوں کے باشندے ہر سال جزیہ ادا کریں گے اور اس کے بدلے مسلمان ان کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ نہ انہیں غارت گری کا نشانہ بنایا جائے گا، نہ ان کی اجازت کے بغیر کوئی ان کی حدود میں داخل ہوگا۔ مغربی جانب سے طبرستان آذربائیجان کا ہمسایہ ہے۔ اس کی سرحدیں شمال میں دیلم اور جنوب میں عراق عرب اور جزیرے سے ملتی ہیں۔ اس زمانے میں اردبیل، ایرانی مملکت کے اس حصے کا ایک بہت بڑا شہر تھا اور جہاں آج کل تبریز آباد ہے، اس کے قریب واقع تھا۔ آذربائیجان سطح بحر سے ڈیڑھ ہزار میٹر کی بلندی پر ایک پہاڑی ملک ہے جس کی بعض چوٹیاں چار چار ہزار میٹر اونچی ہیں۔ آذربائیجان ایک فارسی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں آگ کی زمین، یا آتش کدے۔ اس ملک کا یہ نام اس لیے پڑ گیا کہ اسلامی حملے کے وقت تک یہاں آتش کدوں کی بہتات تھی، لیکن جب ایران میں آتش پرستی ختم ہوئی اور اس کے باشندوں نے اسلام قبول کرلیا تو آذربائیجان کا نام بدل کر ماژندراں کردیا گیا۔

جس وقت سوید بن مقرن جرجان و طبرستان میں پیش قدمی کر کے ان باشندوں سے پیمان صلح باندھ رہے تھے، ان کے بھائی نعیم ری میں بیٹھے، زینبی کی مدد سے، جس کو انہوں نے شہر کا حاکم بنایا تھا، حکومت کا انتظام مکمل کر رہے تھے، اس سے فارغ ہو کر انہوں نے سماک بن خرشہ انصاری کی قیادت میں غازیان ری کی ایک فوج عتبہ بن فرقد اور بکیر بن عبداللہ کی کمک پر بھیجی جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آذربائیجان فتح کرنے کی خدمت تفویض فرمائی تھی۔ بکیر بن عبداللہ اپنی فوجوں کو لے کر جا رہے تھے کہ رستے میں اسفندیار بن فرخ زاد سے ٹکر ہوگئی جو ورج روذ سے شکست کھا کر اپنے لشکر سمیت واپس آرہا تھا۔ فریقین ایک دوسرے سے گتھ گئے۔ شدید لڑائی کے بعد اسفندیار کو ہزیمت ہوئی اور وہ گرفتار کرلیا گیا۔ بکیر نے اسے قتل نہیں کیا، قید رکھا جس کی وجہ ہوئی کہ اسفندیار نے بکیر سے پوچھا۔ ”آپ کو صلح پسند ہے یا جنگ؟“ بکیر نے جواب دیا ”صلح!“ ایرانی سپہ سالار نے کہا۔ ”تو پھر مجھے اپنے پاس قید رکھیے کیونکہ اگر میں نے اہل آذربائیجان کی طرف سے صلح نہ کی یا ان کے پاس نہ گیا تو وہ پہاڑوں میں بھاگ جائیں گے۔ نہ جانے پھر کب تک وہاں مورچہ بند رہیں۔!“ لیکن جب عتبہ بن فرقد نے اسفندیار کے بھا

بہرام کے پڑاؤ کی طرف پیش قدمی کر کے اسے شکست دی اور وہ فرار ہو گیا تو آذربائیجان کی قوت مقابلہ بے جان پڑ گئی۔ اس وقت عتبہ نے اسفندیار سے صلح کر لی اور اسے پورے آذربائیجان کے لیے ایک عہد نامہ لکھ دیا کہ ''اس ملک کے باشندے مسلمانوں کو حسب استطاعت جزیہ ادا کریں گے اور مسلمان ان کے جان و مال اور مذہب و رسوم کی حفاظت کے ضامن ہوں گے۔''

شمالی ایران میں مسلمانوں کا اپنی پیش قدمی جاری رکھنا، ایک فطری امر تھا، تاکہ اس علاقے میں مقابلہ کرنے والی طاقتوں کا خاتمہ ہو جائے۔ بحیرہ قزوین میں آذربائیجان کی طرف ایک بندرگاہ تھی، جسے باب یا باب الابواب کہتے تھے۔ یہ بڑی مستحکم بندرگاہ تھی جس کی گودی میں زنجیریں بندھی ہوئی تھیں کہ اجازت کے بغیر کوئی جہاز آ جا نہ سکے۔ باب کے حاکم کا نام شہر براز تھا۔ جب اسے مسلمانوں کی پیش قدمی کا علم ہوا تو اس نے ان کے امیر عبدالرحمٰن بن ربیعہ کو امان طلبی کا خط لکھا۔ اس کے بعد خود ان سے ملا اور کہا ''میرا ایک سگ صفت دشمن اور مختلف قوموں سے مقابلہ ہے۔ میں قبحی یا ارمنی نہیں ہوں۔ تم لوگ میری قوم اور میرے وطن پر غالب آ چکے ہو۔ اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں تمہاری ہر طرح مدد کروں گا، تمہیں ہر طرح خوش رکھوں گا، لیکن ہم سے جزیہ لے کر ہمیں ذلیل نہ کرو!'' عبدالرحمٰن نے اسے سراقہ بن عمرو کے پاس بھیج دیا، جو اسلامی فوج کے سالار اعلیٰ تھے۔ شہر براز نے ان کے سامنے بھی وہی بات دہرائی۔ سراقہ نے ان کی درخواست قبول کر لی اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر دشمن سے جنگ کرنے والوں پر جزیہ معاف کر دیا، لیکن مسلمانوں کی طرف سے جنگ میں حصہ نہ لینے والے پر وہ بدستور عائد رہا۔ بعد کو یہ حکم ایک قانون بن گیا، جس کے زیر اثر مسلمان کے ساتھ ان کے دشمن سے لڑنے والے مشرکین جزیے سے مستثنیٰ قرار دیے گئے۔ سراقہ نے اپنے فیصلے کی اطلاع حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیجی۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے اسے پسند کیا اور اس کے نفاذ کی اجازت عطا فرما دی۔

باب سے فارغ ہو کر سراقہ نے اپنے ماتحت افسروں کو آس پاس کی پہاڑی آبادیوں میں بھیجا۔ یہاں کے باشندوں نے جنگ کیے بغیر جزیے پر صلح کر لی۔ صرف موتان والوں نے قلعہ بند ہو کر بکیر کا مقابلہ کیا، لیکن بعد کو وہ بھی جزیہ ادا کرنے پر رضامند ہو گئے۔ اسی اثناء میں سراقہ وفات پا گئے اور عبدالرحمٰن بن ربیعہ ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ عبدالرحمٰن ترکوں سے لڑنے چلے تو شہر براز نے کہا: ''ہم تو اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ ترک ہمیں باب ہی میں رہنے دیں!'' عبدالرحمٰن

Marfat.com

نے جواب دیا۔ ''لیکن ہم ان کے گھروں میں گھسے بغیر دم نہیں لیں گے۔ خدا کی قسم! ہمارے ساتھ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہمارا امیر ہمیں اجازت دے دے تو میں ان کو لے کر روم میں پہنچ جاؤں!'' ایرانی سردار نے پوچھا کہ وہ لوگ کون ہیں؟ عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ ''رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم! یہ حضرات بڑے خلوص سے جہاد کے لیے نکلے ہیں۔ انہیں ایام جاہلیت میں بھی عزت حاصل تھی اور اسلام نے ان کے شرف میں اور اضافہ کر دیا۔ یہ سدا وقار و احترام کے مرکز رہیں گے۔ فتح و نصرت ہمیشہ ان کی رکاب میں چلے گی، یہاں تک کہ کوئی ان پر غالب آ کر انہیں بدل دے اور یہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں۔'' لیکن عبدالرحمٰن نے ابھی ترکوں سے جنگ شروع نہیں کی تھی کہ انہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انتقال کی خبر ملی۔ اس علاقے کے باشندے مسلمانوں سے بھاگ کر پہاڑوں میں جا چھپے تھے۔ عبدالرحمٰن واپس ہو گئے اور اس کے بعد انہوں نے عہد عثمانی رضی اللہ عنہ میں ان پر دوبارہ حملہ کیا۔

آپ نے دیکھا کہ ری اور ہمدان کے بعد شمالی ایران کی قوت مقابلہ کس طرح ختم ہوئی اور یہاں کے بادشاہوں اور سرداروں نے کس طرح دوڑ دوڑ کے مسلمانوں سے صلح کی۔ کوئی ان میں جزیہ قبول کر لیتا اور کوئی اپنے لیے اسے بہتر سمجھتا کہ مسلمانوں کے شانہ بشانہ دشمن سے جنگ کر کے جزیہ دینے کی ذلت سے بچ جائے۔ پھر آپ نے یہ بھی دیکھا کہ عراق عجم کے اس طرف مشرق اور جنوب میں جو ایرانی ریاستیں تھیں، ان میں سے ایک نے بھی اس شمالی علاقے کی طرف اعانت کا ہاتھ نہ بڑھایا۔ کیا یہ اس علاقے سے غداری و بے پروائی تھی، یا یہ ریاستیں خود اتنی الجھی ہوئی تھیں کہ انہیں کسی کی مدد کا خیال ہی نہ آ سکتا تھا اگر آپ چاہیں تو ان ریاستوں کی طرف سے عذر پیش کر سکتے ہیں، اس لیے کہ ایرانی مملکت کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی فتوحات نے انہیں خوف زدہ کر دیا تھا اور اس خوف نے ان میں یہ سوچنے کی قوت ہی باقی نہ چھوڑی تھی کہ وہ مجاہدین اسلام کے مقابلے میں، جن سے تقدیر پیمان وفا باندھ چکی ہے اور جن کے سامنے دنیا کی کوئی قوت نہیں ٹھہر سکتی، کسی دوسرے کی مدد کریں۔ پھر ان تمام ریاستوں کو مسلمانوں کے حملے کی بھی توقع تھی اور انہیں جب کبھی اس کا خیال آ جاتا تھا خوف سے کانپنے لگتی تھیں۔ ان کی مثال ڈرے سہمے اس انسان کی سی تھی جو اپنے لیے تنکے کا سہارا بھی کافی سمجھتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا خوف کے مارے سے کوئی مدد طلب نہیں کرتا، جو خود اپنی مدد کرنے سے قاصر ہو۔

مسلمانوں کے حملے کا اندیشہ محض ان کے واہمے کی تخلیق نہ تھا، بلکہ تمام حالات اس کی تا

کر رہے تھے۔ اسے ایک ایسی حقیقت کا روپ دے رہے تھے جوان کی نگاہوں کے سامنے مجسم تھی اور جسے زمانے کے سوا کوئی کم نہ کر سکتا تھا جو آئے اور اس حقیقت کے تمام آثار و نقوش کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑے۔ وہ اسے فراموش کر بھی کیسے سکتے تھے۔ جب مسلمان خوزستان اور عراق عجم میں ہونے کی بنا پر شمالاً صوبہ فارس کے پڑوس میں پہنچ گئے تھے اور غرباً خراسان کے پڑوس میں۔ اگر وہ فارس اور خراسان کی طرف بڑھ جائیں تو جنوب میں کرمان اور مکران کی راہیں ان کے لیے کھل جائیں گی اور خراسان کے اس طرف ایران کی سرزمین، اپنی انتہائی حدود تک ان کے پاؤں تلے بچھ جائے گی۔ ایرانی دیکھ رہے تھے کہ غازیان اسلام ان کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں، گویا ایک مصیبت ہیں جسے ٹالنے یا جس سے بچنے کی کوئی سبیل نہیں۔ صوبہ فارس کے باشندوں نے اس وقت کو یاد کیا جب چند برس پہلے علاء بن حضرمی، خلیج فارس عبور کر کے ان تک پہنچے تھے اور اس جنگ میں تقدیر نے مسلمانوں کے خلاف ان کا ساتھ دیا تھا۔ کیا کل کی طرح تقدیر آج بھی ان کا ساتھ دے گی؟ یا مسلمان ایک طرف بصرہ سے ان کی طرف بڑھیں گے اور دوسری طرف بحرین سے خلیج فارس عبور کر کے ان کے ملک میں در آئیں گے اور اس کے بعد ان کی زمین کو اس طرح پامال کریں گے، جس طرح اس سے پہلے مملکت ایران کے بڑے بڑے شہروں اور صوبوں......عراق، خوزستان، اصفہان اور ری وغیرہ......کو پامال کر چکے ہیں۔

ابھی نعیم بن مقرن نے ری کو فتح ہی کیا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام سپہ سالاروں کو سرزمین ایران میں پیش قدمی کی اجازت دے دی۔ جو فوجیں اصفہان میں تھیں، وہ خراسان کی طرف روانہ ہو گئیں۔ بصرہ اور بحرین کے لشکروں نے فارس اور کرمان کا رخ کیا اور جزیرہ نمائے عرب کی امدادی فوجیں ان اسلامی فوجوں کی قوت بڑھانے چلیں جو کسریٰ کے ملک میں ادھر ادھر پھیلی ہوئی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ اللہ انہیں فتح سے نوازے گا اور مسلمانوں کو ایران کی ساری زمین کا وارث بنائے گا۔ وہ ایرانیوں کے لئے اطمینان و قرار کی کوئی ایسی جگہ چھوڑنا نہ چاہتے تھے، جہاں وہ متحد ہو سکیں یا اس کے سوا کچھ اور سوچ سکیں، اس طرح شمال سے لے کر جنوب تک کسریٰ کی تمام مملکت ایک ایسی زبردست جنگ کا اکھاڑا بن گئی، جس کے ہر معرکے میں مسلمان قلیل التعداد ہوتے تھے، لیکن اس کے باوجود فتح ہمیشہ ان ہی کے حصے میں آتی تھی۔ بھگوڑا کسریٰ جہاں کہیں پناہ لیتا لڑائی کی خبریں اس کا پیچھا کرتیں اور اسے کوئی ایسی جگہ نظر نہ آتی جہاں وہ سر چھپا سکے۔ وہ بے اختیار ایک جائے پناہ سے دوسری جائے پناہ اور ایک شہر سے

Marfat.com

دوسرے شہر میں بھاگتا پھرا لیکن قرار کہیں نہ ملا آخر کار وہ ایک ایسے بادشاہ کی طرح جسے انتہائی ذلت کے ساتھ اپنے ملک سے نکال دیا گیا ہو، غیروں کی مدد اور قوت کا سہارا تلاش کرنے ایران سے نکل گیا۔

مسلمان صوبہ فارس پر حملہ کرنے کے لیے بحرین اور بصرہ سے چلے۔ عثمان بن ابی العاص ثقفی، خلیج فارس عبور کر کے جزیرہ ایز کاروان پہنچے اور اس پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد وہ فارس کی طرف بڑھے اور شہر توج کا محاصرہ کرلیا۔ وہاں انہیں مجاشع بن مسعود ملے جو بصرہ سے روانہ ہوئے تھے، لیکن ایرانیوں نے ان کو توج کے قریب روک لیا تھا۔ اس مستحکم شہر نے شمال و مغرب سے بڑھنے والی فوجوں کی مقدور بھر مقاومت کی، لیکن جب محاصرہ طویل ہو گیا تو اس کی قوت مقابلہ کمزور پڑ گئی اور بے شمار مدافعین کو قتل کرنے کے بعد مسلمانوں نے اسے فتح کرلیا۔ شہر والوں کا مال واسباب ضبط کر کے ان پر جزیہ عائد کر دیا گیا اور اس طرح اس شہر نے غازیان اسلام کے سامنے اپنے گھٹنے ٹیک دیئے جو اس سے پہلے علاء بن حضرمی کو الٹے پاؤں واپس کر دینے پر مدتوں فخر کرتا رہا تھا۔ مجاشع شاپور اور اردشیر کی طرف روانہ ہوئے اور لڑائی کے بعد ان دونوں کو فتح کرلیا۔ عثمان بن ابی العاص نے اصطخر کا رخ کیا جو اس صوبے کا دارالسلطنت اور ایک بہت بڑا شہر تھا۔ ہر بز نے تمام فوجیں اس شہر کی حفاظت کے لیے جمع کر رکھی تھیں اور یہ ارادے کیے بیٹھا تھا کہ یا تو حملہ آوروں کو پسپا کرے گا یا اپنی جان دے دے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایرانیوں کے دل میں اصطخر کا مرتبہ تقدس کی حد تک بلند تھا۔ ایرانی جب سرزمین ایران میں داخل ہوئے تھے، اسی صوبے سے داخل ہوئے تھے اور اسی شہر کو انہوں نے اپنا دارالسلطنت بنایا تھا۔ اسی طرح یہ شہر اس دور میں جس کی تاریخ ہم بیان کر رہے ہیں، اکاسرہ ایران، ساسانیوں کا وطن تھا۔ ساسان اردشیر اول کا دادا اصطخر کے اس آتش کدے کا نگران تھا جسے "آتش خداوندان اناہید کا گھر" کہا جاتا تھا۔ ساسانیوں کی سلطنت قائم ہو جانے کے بعد یہ شہر حکومت کا مذہبی مرکز شمار کیا جانے لگا اور مدتوں ایران کا پایہ تخت رہا۔ اسی لیے اس شہر میں ایرانی بادشاہوں کے بہت سے مقبرے ہیں۔ ایک ایسی شان اور ایک ایسے مرتبے کے شہر کی خاطر ایرانیوں کا جمع ہو جانا اور اس کی مدافعت میں جان کی بازی لگا دینا، کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔

اصطخر ایران کے قدیم ترین شہر پرسو پولیس کے قریب واقع تھا۔ پرسو پولیس بنو ساسان پیش رو "شاہان اکمینین" کے عہد حکومت میں اس ملک کا دارالسلطنت تھا۔ چنانچہ اصطخر کی

Marfat.com

چٹانیں، جن میں سلاطین آل ساسان دفن ہیں، پرسوپولیس کے ان مقبروں کے جوار میں ہیں جن میں "شاہان المنین" موت کی ابدی نیند سو رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اصطخر اس وقت آباد ہوا جب سکندر اعظم کے حملے نے پرسوپولیس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ چنانچہ نئے شہر کی بہت سی عمارتیں پرسوپولیس کے ہی کھنڈروں کے مسالے سے تعمیر کی گئیں۔ آباد ہونے کے بعد اصطخر نے بڑی تیزی سے ترقی و رونق کی راہیں طے کیں۔ یہاں تک کہ دولت بنی ساسان کا پایہ تخت بن گیا۔ پھر اس کی مذہبی مرکزیت کے سبب یہاں بڑی بڑی عالی شان عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ مقدسی نے اصطخر کی جامع مسجد کا ذکر کیا ہے کہ اس میں بے شمار بڑے بڑے ستون ہیں، جن کے بھاری بھاری سرے بیلوں کے سر کی شکل میں تراشے گئے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ مسجد قدیم زمانے میں ایک آتش کدہ تھی جس کی تعمیر کا سامان پرسوپولیس سے حاصل کیا گیا تھا۔ مقدسی نے دریائے اصطخر کے پل کی عظمت اور اس شہر کے گھنے باغوں کی دل فریبی کے بھی بڑے گن گائے ہیں۔ اصطخر کے نواحی پہاڑ، معدنی دولت سے مالا مال تھے جسے اس شہر کی ترقی اور رونق میں بڑا دخل حاصل تھا۔

ہربز نے اس مسلح شہر کی حفاظت کے لیے فوجیں جمع کیں اور شہر سے نکل کر جور کے میدان میں آ گیا۔ یہاں اس کی ٹکر عثمان بن ابی العاص سے ہوئی، جس میں عثمان نے فتح پائی اور ہربز کو شہر پناہ کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ ایرانی فوجوں نے شہر میں قلعہ بند ہو کر مسلمانوں سے شدید جنگ جاری رکھی، لیکن مسلمانوں کو باقاعدہ کمک پہنچتی رہی اور انہوں نے محاصرہ تنگ کر دیا۔ ہربز اور اس کی فوجیں محاصرے کی شدت وطوالت سے گھبرا گئیں۔ ان کے حوصلوں میں ضعف پیدا ہو گیا اور شہر نے اپنے دروازے کھول دیئے۔ مسلمان شہر میں داخل ہوئے، محافظوں کو قتل کیا اور بہت سا مال غنیمت ان کے ہاتھ لگا۔ کچھ شہری بھاگ گئے، ابن ابی العاص نے جزیہ پر امان دے دی اور جو لوگ بھاگ گئے تھے، ہربز سمیت واپس آ کر غازیان اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ عثمان کو خبر ملی کہ بعض مسلمانوں نے، غنیمت تقسیم ہونے سے پہلے ہی کچھ مال اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ انہوں نے ایک تقریر کی اور کہا۔ "اللہ جب کسی قوم کی بھلائی چاہتا ہے تو اسے امانت و دیانت کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ پس تم اس کی حفاظت کرو اگر تم نے اپنے دین میں سے امانت کو پہلے کھو دیا تو آہستہ آہستہ تم اپنی ساری چیزیں کھو دو گے۔" عثمان نے مال غنیمت جمع کیا جو بے شمار تھا اور خمس نکال کر خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عثمان کے اس کارنامے کی اتنی قدر افزائی کی کہ انہیں بحرین کا والی بنا دیا۔

Marfat.com

آپ کا کیا خیال ہے۔ اصطخر نے با آسانی اپنی شکست قبول کر لی تھی اور وہ بخوشی تقدیر کے سامنے جھک گیا تھا؟ نہیں، بلکہ اس کا شاندار ماضی اس کے سامنے حال کی ہولناکیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا رہا اور وقتاً فوقتاً اس شہر میں بغاوت کے شعلے بھڑکتے رہے۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اہل شہر نے وہ معاہدہ توڑ دیا جو ہربز نے ابن ابی العاص کے ساتھ کیا تھا اس کے بعد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بھی اس شہر نے بغاوت کی۔ لیکن دونوں دفعہ اسے ناکامی ہوئی اور اصطخر والوں کو طوعاً و کرہاً معاہدے کا احترام کرنا پڑا۔ پہلی دفعہ جس چیز نے اصطخر والوں کو بغاوت میں سہارا دیا تھا وہ یہ تھی کہ صوبہ فارس کا بادشاہ شہرک کسریٰ کے مستقر ''کرمان'' سے قریب تھا۔ اسے جب اصطخر کی شکست کا حال معلوم ہوا تو شہر والوں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنے لگا اور پورے صوبے میں بغاوت کے بیج بو دیئے۔ اس نے لوگوں کو چند سال پہلے کے وہ شاندار کارنامے یاد دلائے جب علاء بن حضرمی بحرین سے ان پر حملہ کرنے آئے تھے۔ شہرک کی ان کوششوں سے اصطخر میں بغاوت پھوٹ پڑی اور فارس کے وہ علاقے بھی باغی ہو کر اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے جن میں بغاوت کرنے کی سکت تھی۔ عثمان کے بھائی، حکم بن ابی العاص شہرک کے مقابلے کو نکلے اور توج کے مقام پر پہنچ کر اسے اپنا فوجی مستقر بنا لیا۔ یہاں سے انہوں نے آس پاس کے شہروں میں غارت گری شروع کر دی اور خاصا مال غنیمت جمع کر لیا، لیکن شاپور اردشیر، ارجان اور اصطخر اس غارت گری سے متاثر نہ ہوئے۔ مسلمانوں کی اس لوٹ مار نے شہرک کو بھڑکا دیا اور وہ حکم سے لڑنے، اپنی فوج لے کر توج کی طرف چلا۔ اس نے اپنی فوج کے عقب میں ایک دستہ مقرر کیا اور حکم دیا کہ جو ایرانی میدان چھوڑ کر بھاگے اسے قتل کر دو۔ فریقین میں بڑی دیر تک شدت کی جنگ ہوتی رہی۔ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ فتح کس کی ہو گی۔ جب غبار چھٹا تو معلوم ہوا کہ فتح مسلمانوں کے حصے میں آئی ہے۔ شہرک اور اس کا بیٹا مارے جا چکے ہیں اور ایرانی بھاگ گئے ہیں۔ اس معرکے کا اثر یہ ہوا کہ ایرانیوں کی رہی سہی معنوی قوت بھی فنا ہو گئی، یہاں تک کہ عثمان بن ابی العاص بحرین سے اپنے بھائی کی مدد کو آئے اور اس وسیع صوبے میں، جدھر ان کا جی چاہا گئے۔ لیکن انہیں کوئی قابل ذکر مزاحمت پیش نہ آئی۔

علامہ بلاذری لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بصرہ سے روانہ ہوئے اور ایرانیوں سے جنگ کے اس مرحلے میں عثمان بن ابی العاص سے جا ملے۔ ان دونوں نے مل کر ارجان فتح کیا اور جزیہ و خراج کی شرط پر صلح کر لی، پھر یہ دونوں شیراز

کی طرف بڑھے اور اسے اس شرط پر فتح کر لیا کہ اس کے باشندے ذمی ہوں گے اور خراج دیں گے، جو ان سے جلاوطن ہونا چاہے اسے رخصت ہوگی اور یہ کہ انہیں قتل کیا جائے گا نہ لونڈی غلام بنایا جائے گا۔ اسی طرح صوبہ اردشیر کا سینز بھی فتح ہوا۔ اس کی زمین اس کے باشندوں کے ہاتھ میں رہنے دی گئی کہ اس کو آباد کریں۔ عثمان بن ابی العاص درابجرد آئے۔ یہ شہر اہل فارس کے علم و دین کا مرکز تھا۔ ہربز نے کچھ مال کے بدلے، جو اسی وقت ادا کر دیا، اس شرط پر صلح کر لی کہ اہل درابجرد کو تمام و کمال وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بلاد فارس کے مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کو حاصل ہیں۔ ہربز نے اسی شرط پر شہر فسا کی طرف سے بھی صلح کر لی جو درابجرد کے قریب واقع تھا۔

فسا اور درابجرد کی فتح کے سلسلے میں علامہ طبری اور ان کے متبعین نے علامہ بلاذری کی اس روایت سے اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان دونوں شہروں کی مہم پر ساریہ بن زنیم روانہ ہوئے تھے۔ ایرانیوں کی چھاؤنی کے قریب پہنچ کر وہ اتر پڑے اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے نے طول کھینچا تو ایرانیوں نے کُردوں سے مدد طلب کی اور وہ ہر طرف سے کھنچ کھنچ کر ان کے پاس پہنچنے لگے۔ جب اتنی طاقت فراہم ہوگئی کہ مسلمان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے تو دوسرے دن دھاوا بول دینے کی تجویز ٹھہرائی۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اس رات خواب میں میدان جنگ کا پورا نقشہ نظر آ گیا۔ آپ نے دیکھا کہ مسلمان کھلے میدان میں ہیں اور اگر وہ یہیں رہے تو گھیر لیے جائیں گے، لیکن اگر وہ پہاڑ کی طرف ہٹ آئیں اور اسے اپنی پشت بنائیں تو پھر ان پر صرف ایک ہی طرف سے حملہ ہو سکے گا اور اس صورت میں مسلمان فتح حاصل کر لیں گے۔ جب صبح ہوئی اور وہ وقت آیا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خواب میں دیکھا تھا تو اجتماع کا حکم دیا۔ منادی نے اعلان کیا۔ ''مسلمانو! نماز کے لیے جمع ہو جاؤ۔'' جب لوگ جمع ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا۔ ''لوگو! میں نے ان دونوں لشکروں کو دیکھا ہے!'' اس کے بعد اپنا خواب بیان کیا اور بلند آواز میں کہا۔ ''ساریہ بن زنیم! پہاڑ کی طرف ہٹ جاؤ! پہاڑ کی طرف!'' پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ''اللہ کی فوجیں ہوتی ہیں۔ شاید ان میں سے کوئی میری یہ بات مسلمانوں تک پہنچا دے۔''

عین اسی وقت ساریہ اپنی فوج کو لے کر پہاڑ کی سمت ہٹ آئے۔ دشمن سے یک طرفہ جنگ لڑی اور اس کے بہت سے سپاہی قتل کرنے کے بعد فتح یاب ہوئے۔ اس جنگ میں جو مال غنیمت

Marfat.com

مسلمانوں کو ملا اس میں جواہر کی ایک ٹوکری بھی تھی، جو مسلمانوں سے ہبہ کرا کے ساریہ نے فتح کی خوش خبری کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کر دی۔ ساریہ کا قاصد مدینہ پہنچا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے۔ وہ بھی دستر خوان پر بیٹھ گیا۔ کھانا کھلا کر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے گھر واپس ہوئے تو قاصد بھی پیچھے پیچھے ہولیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خیال کیا، شاید بھوکا رہ گیا ہے اور اسے بھی اپنے ساتھ گھر میں لے گئے۔ خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ کا کھانا لایا گیا۔ روٹی، روغن زیتون اور موٹا پسا ہوا نمک۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کھانے کی طرف دیکھ کر اپنی بیوی کو آواز دی۔ ''کیا تم کھانے کے لیے نہیں آؤ گی؟'' انہوں نے کہا۔ ''میں کسی مرد کی آہٹ سن رہی ہوں!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''ٹھیک ہے!''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھانا کھا چکے تو قاصد نے پوری سرگزشت بیان کی، جسے سن کر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے۔ پھر اس نے جواہر کی ٹوکری کا ذکر کیا کہ ساریہ رضی اللہ عنہ نے مجاہدین سے ہبہ کرا کے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں نذر کی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تیوری پر بل پڑ گئے اور آپ نے چیخ کر کہا ''نہیں! نہیں! یہ اس نے کوئی اچھی بات نہیں کی! فوراً واپس جا کر اسے فوج میں تقسیم کرو۔'' اور دروازہ کھول کر قاصد کو باہر دھکیل دیا۔ قاصد نے عذر کیا کہ اس کا اونٹ تھکا ہوا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صدقے کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ اسے دے دیا اور بدلے میں اس کا اونٹ رکھ لیا۔ اس طرح وہ عتاب کا مارا قاصد محروم و ناکام واپس ہو گیا۔ یہ ہے وہ روایت، جو فسا اور دراابجرد کی فتح کے سلسلے میں علامہ طبری اور ان کے متبعین نے نقل کی ہے اور یہی عام طور پر مشہور بھی ہے۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو آپ کو یہ سوال کرنے کا حق پہنچتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز ''ساریہ پہاڑ کی طرف ہٹ جاؤ!'' اور عین اسی وقت ساریہ کے اپنی فوج کو لے کر پہاڑ کی طرف ہٹ جانے میں واقعی کوئی تعلق ہے، یا یہ محض ایک اتفاق تھا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خواب اس لیے دیکھا کہ ان کا ذہن ہر وقت مجاہدین فارس میں الجھا رہتا تھا اور ساریہ نے اپنی فوجیں اس لیے پہاڑ کی طرف سمیٹ لیں کہ اس وقت جنگی مصلحت کا تقاضا یہی تھا؟ آگے چل کر روایت میں ہے کہ مدینہ والوں نے ساریہ کے قاصد کو گھیر کے پوچھا۔ ''کیا تم نے لڑائی کے دن فارس میں کوئی آواز سنی تھی؟'' ساریہ کے قاصد نے کہا۔ ''ہاں! ہم نے سنا تھا ساریہ پہاڑ کی طرف ہٹ جاؤ پہاڑ کی طرف۔ ہم ہلاک ہونے ہی والے تھے کہ پہاڑ کی طرف سمٹ گئے اور اللہ نے ہمیں فتح یاب کر دیا۔''

Marfat.com

میں ایسی کوئی علمی توجیہ نہیں پاتا جو مجھے اس روایت پر مطمئن کردے۔ اس لیے کہ وحی کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ کی وفات پر ختم ہو گیا تھا اور ''لاسلکی'' پیغام رسانی نہ صرف یہ کہ اس زمانے میں نامعروف تھی بلکہ اس کا خیال بھی کسی کے ذہن میں نہ آسکتا تھا۔ پھر یہ بھی میں قطعیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ بات ''انتقال افکار'' کے ذریعے پہنچی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روحانی کیفیت اس رات ساریہ کے نفس پر طاری ہو گئی تھی جس کے زیر اثر وہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا حکم اس طرح بجالا رہے تھے جس طرح عمل تنویم کا معمول اپنے عامل کے احکام کی تعمیل کرتا ہے۔ اس کے باوجود یہی ایک تاویل ہے جو بمشکل تصور کی گرفت میں آنے کے باوصف آخری تاویل کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے اور جسے اس روایت کے صحیح ہونے کی صورت میں، اس کی قریب ترین توضیح کہا جاسکتا ہے۔ ساریہ نے جب اپنی فوج کو پہاڑ کی طرف سمٹ جانے کا حکم دیا ہے تو وہ اسی کیفیت سے متاثر تھے اور انہوں نے اپنی فوج سے یہی کہا کہ یہ حکم انہیں ایک غیبی آواز نے دیا ہے۔ جس وقت ابن ابی العاص کا لشکر صوبہ فارس میں پیش قدمی کر رہا تھا، سہیل بن عدی، کرمان میں نبرد آزما تھے اور حکم بن عمرو تغلبی مکران میں داد شجاعت دے رہے تھے۔ اہل کرمان مسلمانوں کے سامنے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔ مجاہدین نے ان کا ملک فتح کر لیا۔ اور بہت سے اونٹ اور بھیڑ بکریاں غنیمت میں ان کے ہاتھ آئیں ○ لیکن مکران والوں نے دریائے مکران پر مورچہ بندی کر لی۔ ان کے اور غازیان اسلام کے درمیان نہایت شدید جنگ ہوئی، جس میں فتح و کامرانی کا سہرا مسلمانوں کے سر رہا۔ دشمن کے بے شمار سپاہی کام آئے۔ مسلمان کئی دن تک ان کا تعاقب کرتے اور انہیں تلوار کے گھاٹ اتارتے رہے۔ تا آنکہ دریا تک پہنچ گئے۔ اس کے بعد مکران واپس آئے اور وہیں مقیم ہو گئے۔ حکم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نام فتح کا مسرت نامہ لکھا اور صحار عبدی کو قاصد بنا کر خمس کے ساتھ، جس میں ایک ہاتھی بھی تھا، بارگاہ خلافت میں ارسال کر دیا۔ ○ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ ہاتھی کو فروخت کر کے اس کی قیمت فاتحین میں تقسیم کر دی جائے۔

○ ایک روایت میں ہے کرمان، عبداللہ بن بدیل بن ورقاء خزاعی نے فتح کیا تھا۔

○ روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحار سے مکران کے متعلق پوچھا۔ ان کا قاعدہ تھا کہ جہاں سے کوئی بارگاہ خلافت میں آتا تھا، وہاں کے حالات اس سے ضرور دریافت فرماتے تھے۔ صحار نے کہا۔ ''امیر المومنین! وہاں کے میدان، پہاڑوں کا بھرم، پانی بہت کم، میوے سرمایہ محرومی والم اور دشمن رشک افراسیاب ورستم! بھلائی کی بخیل، برائی طویل۔ وہاں جو زیادہ ہے وہ کم ہے اور جو کم ہے وہ کالعدم ہے۔ اس کے علاقہ جتنا حصہ ہے وہ سب شر و بدبختی کا قصہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''تم شعر کہہ رہے ہو یا واقعہ بیان کر رہے ہو؟'' صحار نے کہا۔ ''نہیں! واقعہ بیان کر رہا ہوں۔

Marfat.com

مسلمان جب کرمان فتح کرنے کے لیے بڑھے ہیں، یزدگرد وہیں تھا۔ اس نے جو یہ دیکھا کہ یہ شہر بھی دوسرے شہروں کی طرح مسلمانوں کے حملے کی تاب نہ لا سکے گا تو خراسان بھاگ گیا۔ اسے قوی امید تھی کہ خراسان اور سجستان کے باشندے مسلمانوں کا مقابلہ کرسکیں گے اور یہ امید اس کے دل میں اس لیے راہ پا گئی تھی کہ بصرہ اور کوفہ وغیرہ سے، جہاں مسلمانوں کی فوجی چھاؤنیاں تھیں، خراسان اور سجستان بہت دور تھا اور مسلمانوں کے لیے یہاں فوجیں بھیجنا، عراق عجم یا فارس و کرمان میں فوجیں بھیجنے سے زیادہ مشکل تھا۔ سجستان، کرمان کے شمال میں تھا اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یہ مہم عاصم بن عمرو کے سپرد فرمائی تھی۔ چنانچہ عاصم اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے جہاں عبداللہ بن عمیر بھی ان سے مل گئے۔ سجستان والے اپنے ملک کی سرحدوں پر حملہ آوروں کے خلاف صف آراء ہوئے لیکن زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے اور پیچھے ہٹ کر اپنے دارالحکومت زرنج میں قلعہ بند ہوگئے۔ مسلمانوں نے زرنج کا محاصرہ کرلیا اور اپنے غارت گر دستے آس پاس کی بستیوں میں بھیجنے شروع کر دیئے۔ زرنج کے مدافعین کو یقین ہوگیا کہ محاصرے کی طوالت ان کے ملک کو بہت نقصان پہنچائے گی۔ اس لیے انہوں نے اس شرط پر صلح کی درخواست کی کہ سجستان کے کھیتوں کو مسلمان پامال نہیں کریں گے۔ مسلمانوں نے یہ شرط مان لی، چنانچہ وہ کھیتوں سے بچ بچ کے چلتے تھے۔ مبادا انہیں کوئی نقصان پہنچ جائے اور ان پر نقض عہد کا الزام عائد کر کے اہل سجستان خراج دینے سے انکار کر دیں۔ اس طرح دونوں فریق معاہدے کا احترام کرتے رہے اور ان کی طرف سے ادائے فرض میں کوئی کوتاہی نہ ہوئی۔

سجستان نے اس قدر جلد شکست کیسے تسلیم کرلی، جب کہ مؤرخین اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''وہ خراسان سے بڑا اور مضبوط تھا۔ اس کے باشندے قندھار، ترکوں اور دوسری قوموں سے اکثر جنگ آزما رہے۔'' اس کی سب سے آسان توجیہ یہ ہے کہ انہوں نے کسریٰ کو دیکھا تھا کہ وہ جہاں کہیں ہوتا ہے، مسلمانوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر فرار ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں بالکل فطری تھا کہ وہ کسریٰ کی تقلید کرتے اور اپنے آپ کو اس ہلاکت سے بچاتے۔ وہ کیوں مقابلہ کرتے جب شہنشاہ اعظم مقابلہ نہیں کر رہا تھا اور وہ کیوں اپنی جانوں کی قربانی دیتے، جب شہنشاہ اعظم اپنے عیش و آرام کی قربانی دینے پر تیار نہ تھا۔ آپ کا کیا خیال ہے شہنشاہ اعظم اپنے آخری مستقر خراسان میں بھی مسلمانوں کا مقابلہ کرے گا یا نہیں؟ اس کے سوا اس کے پاس رستہ بھی کون سا رہ گیا

ہے! اگر وہ خراسان سے بھی اسی طرح بھاگ جاتا ہے، جس طرح اس سے پہلے حلوان، ری، اصفہان اور کرمان سے بھاگ چکا ہے، تو ایران میں اس کے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی۔ پھر یا تو اسے ہرمزان کی طرح اپنے آپ کو دشمنوں کے حوالے کر کے ذلت وغلامی کا طوق گلے میں ڈالنا پڑے گا یا اپنے ملک کی سرحدیں پار کر کے تاتار یا چین میں پناہ لینی پڑے گی، جہاں بیٹھ کر وہ دوسروں سے امداد واعانت کی بھیک مانگے اور اگر وہ اس کی درخواست قبول کرلیں تو ان کے بل پر اپنا ملک واپس لے لے، ورنہ بھگوڑوں کی سی شرمناک زندگی بسر کرے اور جب وقت آئے تو انتہائی مایوسی و بے چارگی کی حالت میں مرجائے۔

احنف بن قیس جب ان فوجوں کو لے کر، جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ کی تھیں، خراسان کی سرحدوں پر پہنچے تو یزدگرد مرو میں تھا۔ خراسان ایک بہت بڑا صوبہ تھا جس کی سرحدیں مغرب میں عراق عجم سے ملتی تھیں اور مشرق میں افغانستان اور ہندوستان سے۔ اس کے جنوب میں کرمان اور بجستان تھے اور شمال میں وہ ایران کی انتہائی سرحدوں تک پھیلا ہوا تھا۔ نیشا پور، ہرات، مرو اور بلخ اس کے بڑے بڑے شہروں میں سے تھے۔ اس زمانے میں خراسان بڑا زرخیز علاقہ تھا اور وہاں سوت اور ریشم کے نفیس کپڑوں کی صنعت عروج پر تھی۔ یہاں کے زمانہ قیام میں یزدگرد نے کوشش کی کہ اہل خراسان کو جوش دلا کر حملہ آوروں کو اپنے آباؤ اجداد کی باقی ماندہ زمین فتح کرنے سے روک دے۔ لیکن وہ یہ بھول گیا یا اس نے جان بوجھ کر بھلا دیا کہ وہ پورے ایران کی قوتوں کو پہلے بھی نہاوند کی بھٹی میں جھونک کر دیکھ چکا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے سامنے ان کی ایک پیش نہ گئی اور وہ بری طرح کچل کے رکھ دی گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب مسلمان مؤرخین معرکہ نہاوند کو ''فتح الفتوح'' کا لقب دیتے ہیں تو کوئی مبالغہ نہیں کرتے۔ اس کے بعد ایران کے جنوب وشمال میں جتنے بھی معرکے ہوئے، ایرانیوں کے پاؤں مسلمانوں کے مقابلے میں نہ جم سکے۔ خراسان نے بھی دوسروں سے زیادہ ثبات قدم کا ثبوت نہ دیا۔ احنف بن قیس طبسین کے رستے خراسان میں داخل ہوئے اور ہرات تک انہیں کوئی قابل ذکر مزاحمت پیش نہ آئی۔ ہرات ایک بہت بڑا شہر تھا جو خراسان کے وسط میں واقع تھا۔ اسے چاروں طرف سے پہاڑوں نے گھیر رکھا تھا اور اس کے گھروں اور گلی کوچوں میں پانی کی نہریں رواں تھیں۔ اس کی وسیع تجارت نے دولت وآسودگی کے لحاظ سے، اسے اکثر شہروں پر امتیاز بخش رکھا تھا اور اس کا

Marfat.com

غذائی اندوختہ مسلسل کئی مہینوں تک اس کی کفالت کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا جغرافیائی محل وقوع بھی اس کی حفاظت کا ضامن تھا اور اس ضمانت کی توثیق وہ مسلح قلعے اور مستحکم دیواریں کرتی تھیں جنہوں نے چاروں طرف سے ہرات کا احاطہ کر رکھا تھا۔ اس کے باوجود احنف بن قیس کو کچھ زیادہ وقت صرف نہ کرنا پڑا۔ انہوں نے ہرات کو بزور شمشیر فتح کر لیا اور شہر والوں نے سپر انداز ہو کر صلح کے لیے اپنا دامن پھیلا دیا۔

ہرات کا سقوط پورے خراسان کے سقوط کا پیش خیمہ تھا۔ احنف نے ایک دستہ شہر کی نگرانی کے لیے چھوڑ دیا اور تھوڑی سی فوج نیشاپور اور سرخس بھیج کر خود اسلامی لشکر کے ساتھ مرو شاہجہان کی طرف چلے جہاں یزدگرد مقیم تھا۔ یہ مرو ہرات کے شمال میں واقع تھا اور نیشاپور ان دونوں کے درمیان تھا۔ مرو خراسان کا بہت بڑا شہر اور دارالسلطنت تھا، لیکن اس کا جغرافیائی محل وقوع، ہرات کے جغرافیائی محل وقوع کی طرح مضبوط و محفوظ نہ تھا۔ وہ پہاڑ سے دور ایک ہموار میدان میں آباد تھا، جہاں پانی اور کھانے پینے کی چیزوں کی بہتات تھی۔ اس لیے جوں ہی یزدگرد کو یہ معلوم ہوا کہ احنف اس کی طرف آ رہے ہیں وہ مرورود چلا گیا۔ یہ شہر مرو کے قریب ایک بہت بڑے دریا کے کنارے آباد تھا، جہاں مورچہ بندی کی جا سکتی تھی، لیکن احنف نے اسے مورچہ بند ہونے کی مہلت نہ دی۔ ان کے پاس کوفہ کی امدادی فوجیں پہنچ گئی تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ اپنی پیش قدمی جاری رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پھر کسریٰ کو دم نہ لینے دیا اور وہ مرورود سے بلخ چلا گیا۔ احنف نے مرورود میں پڑاؤ ڈالا اور کوفہ کی فوجیں بلخ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ ان فوجوں نے جس وقت اس شہر کا محاصرہ کیا جو فارس اور طبرستان کی سرحدوں پر واقع تھا تو احنف بھی ان سے آ ملے۔ فطری بات تھی کہ بلخ بھی ہرات اور مرو سے زیادہ ثابت قدمی نہ دکھا سکتا اور یہ بھی فطری بات تھی کہ یزدگرد یہاں سے فرار ہو جاتا کہ مسلمانوں کے مقابلے سے بھاگنا اس کی عادت بن چکی تھی۔ احنف بن قیس کوفہ کی فوج کو لے کر بلخ میں داخل ہوئے اور جب وہاں کے حالات سے مطمئن ہو گئے تو ربعی بن عامر کو بلخ اور اس کے آس پاس کا علاقہ سپرد کر کے خود مرورود واپس آ گئے اور اسے اپنا فوجی صدر مقام بنا لیا۔

اب یزدگرد کے لیے اپنے ملک میں کوئی جگہ نہ رہی تھی جسے وہ اپنی جائے قرار یا جائے فرار بنا سکتا۔ چنانچہ اس مرتبہ اس دریا کو عبور کر کے، جو ایران اور ترکستان کے درمیان حد فاصل تھا،

Marfat.com

سمرقند میں خاقان ترک کے پاس پناہ گزیں ہوگیا۔اس سے پہلے جب وہ مروشاہجہان میں تھا، اس نے خاقان ترک اور شاہ چین سے مدد کی درخواست کی تھی، لیکن اس کے قاصد بڑی دیر میں ان تک پہنچے اور ان کے پاس سے کوئی جواب لے کر نہ آئے۔پھر جب مسلمانوں نے اسے دھکیلا تو اس نے خاقان ترک کے دامن میں پناہ لی اور اس سے مدد کا خواستگار ہوا۔شاید خاقان ترک نے بھی مسلمانوں کی پیش قدمی کو اپنے ملک کے لیے خطرہ سمجھا اور اسے بہتری اسی میں نظر آئی کہ مسلمانوں کے ترکستان پہنچنے سے پہلے ان کے قدم روک لے۔کسریٰ کی پناہ طلبی اس کے لے ایک دلیل بھی تھی، جس سے وہ اپنی قوم کے پندار کو ہوا دے سکتا تھا۔خاقان نے اپنی ایک فوج تیار کی جس میں فرغانہ اور صفد کے تیغ آزما بھی شامل ہوگئے اور یزدگردان کو اپنے ساتھ لے کر مسلمانوں سے مقابلہ کرنے خراسان روانہ ہوگیا اس دوران میں احنف بن قیس، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خراسان کی فتح اور مروین و بلخ پر قبضے کی اطلاع دے چکے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خط پڑھا تو چہرہ فرط مسرت سے دمک اٹھا اور منہ سے بے اختیار نکل گیا۔''وہ احنف ہے اہل مشرق کا سردار!'' لیکن اپنے ظفر مند سپہ سالار کو خراج تحسین پیش کرنے کے فوراً بعد فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس مرحلہ کے عواقب پر غور کرنا شروع کر دیا۔وہ پھر محتاط ہوگئے اور فرمایا۔''میں چاہتا تھا کہ خراسان کی طرف اپنی فوجیں نہ بھیجتا اور میری یہ بھی خواہش تھی کہ ہمارے اور خراسان کے درمیان آگ کا سمندر حائل ہوتا'' انہیں اندیشہ ہوا کہ کہیں احنف خراسان سے آگے مشرق کی طرف نہ بڑھ جائیں، جس طرح انہیں خوف تھا کہ فتوحات کا نشہ مسلمانوں کو سرکش نہ بنا دے اور وہ زمین میں فساد نہ برپا کر دیں۔انہوں نے احنف بن قیس کو لکھا۔''امابعد! دریا ہرگز پار نہ کرنا اور اس طرف ہی رہنا تمہیں معلوم ہے کہ تم کس طاقت کے بل پر خراسان میں داخل ہوئے ہو، اس طاقت کو ہمیشہ محفوظ رکھنا، فتح و نصرت ہمیشہ تمہارے قدموں میں رہے گی۔دیکھو! دریا ہرگز عبور نہ کرنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس احتیاط کا جواز موجود تھا۔مشرق میں فتوحات کا دامن اتنا پھیل گیا تھا کہ اس نے پورے ایران کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔پھر مسلمانوں کی قوت شام، عراق اور ایران کے مختلف گوشوں میں بکھری ہوئی تھی اور خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ بعض مفتوحہ علاقوں کی بغاوت اور بدامنی سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتے تھے۔انہیں خطرہ تھا کہ ان علاقوں میں بھی کوئی ایسی

Marfat.com

صورت پیش نہ آجائے جو حمص میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے محصور ہو جانے سے پیش آ گئی تھی۔ اس کے علاوہ فارس سے آگے بڑھنے میں اس بات کا بھی قوی اندیشہ تھا کہ کہیں تاتار و مغول اپنی اور اپنے ملک کی مدافعت کے لئے جوش میں نہ آجائیں لہٰذا بہتر یہی تھا کہ فتوحات کا یہ سلسلہ اس وقت تک کے لیے روک دیا جائے جب تک حکومت کا نظام مستحکم نہ ہو جائے اور مفتوحہ ممالک کے باشندے اسلامی حکومت میں سکون و اطمینان سے نہ رہنے لگیں۔ ان حالات میں بھلائی کی بس یہی ایک صورت تھی کہ احنف یا کوئی دوسرا سپہ سالار فارس کی سرحدوں سے آگے قدم نہ رکھتا۔ بعد کو پیش آنے والے واقعات نے ثابت کر دیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے نہایت صائب تھی اور اپنی اس احتیاط میں وہ بڑی دور اندیشی سے کام لے رہے تھے۔ خاقان ترک، یزدگرد کے ساتھ دریا عبور کر کے بلخ پہنچ گیا اور کوفہ کی فوج مرورود کی طرف پسپا ہونے پر مجبور ہو گئی کہ وہاں احنف اور ان کے لشکر سے جا ملے۔ خاقان نے اس فوج کا تعاقب کیا، ایرانیوں کے ساتھ ہو جانے سے اس کی جمعیت میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ اپنے اس لشکر جرار کو لے کر خاقان مرورود جا پہنچا۔ احنف نے اس ٹڈی دل کو دیکھ کر موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا اور خیال کیا کہ اگر اس طوفان بلا کر بلخ اور دریا کے اس پار دھکیل بھی دیا گیا تو بھی مسلمانوں کے لیے دریا پار کرنا مناسب نہ ہوگا اور یہی رائے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی بھی تھی۔ چنانچہ احنف نے سوچا کہ فوج کو لے کر کسی ایسی جگہ سمٹ جائیں جہاں دریائے مرورود سامنے ہو اور پہاڑ پیچھے تاکہ دریا ان کے اور دشمن کے درمیان خندق کا کام دے اور پہاڑ پشت کی طرف سے ان کی حفاظت کرے، جب صبح ہوئی تو احنف نے سب کو جمع کر کے کہا۔ ''تمہاری تعداد کم ہے اور دشمن کی زیادہ لیکن تمہیں اس سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے کہ بہت سے قلیل التعداد گروہوں نے، کثیر التعداد گروہوں پر اللہ کے حکم سے غلبہ پایا ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' یہاں سے کوچ کرو اور ایسی جگہ چلو جہاں پہاڑ تمہاری پشت پر ہو اور دریا تمہارے اور دشمن کے درمیان۔ اس کے بعد اس سے یک طرفہ مقابلہ کرو!''

اسلامی فوج مناسب جگہ پہنچ گئی اور ترک آگے بڑھ کر ان کے مقابل آ کھڑے ہوئے۔

احنف نے صرف یہی احتیاط کافی نہ سمجھی، بلکہ خاقان تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ حکم پہنچانے کی بھی کوشش کی کہ مسلمان دریا عبور کر کے ترکوں کے ملک میں نہ جائیں۔ انہوں نے جاسوس بھیج کر یہ خبر دشمن کے لشکر میں عام کر دی۔ خاقان نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان نہ دریا عبور کرنے کی کوشش

Marfat.com

کررہے ہیں اور نہ انہیں جنگ کی دعوت دے رہے ہیں تو اسے بھی اس خبر کی صحت پر یقین ہو گیا۔
کئی دنوں دونوں لشکر آمنے سامنے کھڑے رہے، ترک صبح و شام میدان میں نکلتے اور رات کو اپنے لشکر میں واپس ہو جاتے، لیکن مسلمان ان کی طرف نہ بڑھتے۔ احنف نے جاسوس بھیج کر دشمن کی شب گاہ کا پتہ لگایا اور اسی رات چند ساتھیوں کو لے کر خاقان کے لشکر کے قریب پہنچ گئے۔ جب صبح ہوئی تو ترکوں کے ہراول کا سوار اس طرح نکلا گویا مسلمانوں پر حملہ کرنے جا رہا ہے۔ احنف نے اسے جالیا اور کچھ دیر مقابلہ کے بعد اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد دوسرا سوار نکلا اور احنف نے اس کی بھی گردن اڑا دی۔ آخر میں تیسرا آیا، لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا جو اس سے پہلے اس کے دونوں ساتھیوں کا ہو چکا تھا۔ احنف اپنے لشکر میں واپس آ گئے۔ خاقان ترک قیام گاہ سے نکلا۔ میدان میں تین لاشیں پڑی تھیں۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ دونوں لشکروں کے درمیان دریا بہہ رہا تھا اور مسلمانوں میں جنگ کے آثار بالکل مفقود تھے۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کی خبر صحیح ہے۔ اس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ''ہمارا قیام بہت طویل ہو گیا ہے اور ہمیں اس قوم سے لڑنے میں کوئی فائدہ بھی نہیں، چلو! واپس چلیں!'' خاقان اپنے لشکر سمیت میدان جنگ سے روانہ ہو گیا اور بلخ جا پہنچا۔ مسلمانوں نے احنف سے کہا۔ ''تعاقب کے متعلق کیا رائے ہے؟'' احنف نے جواب دیا۔ ''نہیں! تم اپنی جگہ سے نہ ہلو، انہیں جانے دو!'' اس چیز سے خاقان کو اور بھی یقین ہو گیا کہ مسلمان اس سے لڑنا نہیں چاہتے اور وہ بلخ کے پاس سے دریا عبور کر کے اس کے ملک میں داخل نہیں ہوں گے۔ اس یقین نے اسے بے چین کر دیا کہ وہ ایران چھوڑ کر جلد سے جلد اپنے دار السلطنت واپس چلا جائے۔ یزدگرد مسلمانوں سے اپنا حساب آپ چکا تا رہے گا۔

کوفہ کی فوج جب بلخ سے ہٹ کر احنف کے پاس مرو روذ پہنچی ہے، یزدگرد ایرانی فوج کو لے کر بلخ سے مرو شاہجہان کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے حارثہ بن نعمان کا ان کے مسلمان ساتھیوں سمیت محاصرہ کر لیا اور اپنا ایک گڑا ہوا خزانہ نکال کر کچھ لوگوں کی حفاظت و نگرانی میں دے دیا۔ جب خاقان مرو سے بلخ پہنچا اور یزدگرد کو اپنے حلیف کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ وہ ایران چھوڑ کر اپنے ملک واپس جا رہا ہے تو چاہا کہ اپنے خزانے لے کر اس سے جا ملے۔ یہ خزانے بڑے قیمتی تھے، جن میں شاہی جواہرات کے علاوہ وہ زر مال بھی شامل تھا جو یزدگرد نے اثنائے کار میں ایرانی خزانوں سے جمع کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ خزانوں کی قیمت لگانے سے اعداد

Marfat.com

قاصر تھے۔ ایرانیوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ یزدگرد خزانے لے کر بھاگ جانا چاہتا ہے تو انہوں نے اس سے پوچھا۔ ''اب آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟'' یزدگرد نے جواب دیا۔ ''میں خاقان سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد یا میں اس کے ساتھ رہوں گا یا چین چلا جاؤں گا۔'' ایرانیوں نے کہا۔ ''ذرا صبر سے کام لیجئے! آپ کی یہ رائے درست نہیں! آپ ایک ایسی قوم کے پاس اس کے ملک میں جا رہے ہیں جو آپ کے ملک اور آپ کی قوم کا ساتھ چھوڑ کے جا رہی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ ہمارے ساتھ مل کر اس قوم سے صلح کر لیں جو ہمارے ملک میں امن وسکون کے ساتھ حکومت کر رہی ہے۔ وہ دشمن جو ہمارے ملک میں ہم سے نرمی برتتا ہے، ہمیں اس دشمن سے زیادہ محبوب ہے جو اپنے ملک میں ہم پر مہربانی کرتا ہے۔'' یزدگرد نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور وہ یزدگرد کی رائے سے متفق نہ ہوئے۔ آخر کار انہوں نے کہا۔ ''اگر آپ ہماری بات نہیں مانتے تو یہ خزانے یہیں چھوڑ جایئے! ہم انہیں دوسرے ملک میں نہیں جانے دیں گے۔'' کسریٰ نے ان سے اختلاف کیا اور اپنی رائے پر اڑا رہا۔ مجبوراً ان لوگوں کو سرتابی کرنی پڑی اور انہوں نے کسریٰ کے ساتھیوں سے لڑ بھڑ کے ان خزانوں پر قبضہ کر لیا۔ کسریٰ اپنے حاشیہ برداروں کے ساتھ بلخ بھاگ گیا، لیکن خاقان وہاں سے جا چکا تھا۔ اس لیے کسریٰ بھی اس کے پیچھے پیچھے فرغانہ پہنچ گیا جو سمرقند میں ترکوں کا دارالسلطنت تھا۔

اہل ایران احنف کے پاس پہنچے اور صلح کر کے کسریٰ کے خزانے ان کے حوالے کر دیئے۔ اس کے بعد اپنی اپنی جگہ آ گئے اور اطمینان سے رہنے سہنے لگے۔ احنف، کوفہ کی فوج کو مرورود سے بلخ لے گئے اور اسے وہاں چھوڑ کر خود اپنے صدر مقام پر واپس آ گئے۔ ان لڑائیوں میں مسلمانوں کو بے شمار مال غنیمت ملا۔ یہاں تک کہ ایک ایک سپاہی کا حصہ، قادسیہ کی غنیمت کے حصے کے برابر ٹھہرا۔ احنف نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نامہ فتح لکھا اور خمس کے ساتھ ان کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے حکم سے خط پڑھا گیا۔ اس کے بعد فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اللہ نے مجوسی سلطنت کو تباہ اور اس کے شیرازے کو منتشر کر دیا۔ اب اس ملک میں کوئی قوت نہیں جو مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکے۔ دیکھو! اللہ نے تمہیں ان کی زمین، ان کے ملک، ان کے مال اور ان کی اولاد کا وارث بنایا ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ تم کیا کرتے ہو؟ اللہ نے اپنا حکم پہنچا دیا اور اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اب تمہیں بھی چاہیے کہ اس کے حکم کی تعمیل میں اس شخص کا خیال رکھو جو تم سے کیے ہوئے عہد کا احترام کرتا ہے اور اپنے وعدے سے

Marfat.com

نہیں پھرتا۔ اپنے آپ کو نہ بدلو، ورنہ خدا تمہیں بدل کر تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے گا۔ مجھے اس امت کی بدبختی کا کوئی اندیشہ نہیں مگر یہ کہ تم ہی اس کے لیے مصیبت بن جاؤ۔''

یزدگرد ایران سے ترکستان بھاگ گیا اور اس کے فرار سے اکاسرہ بنی ساسان کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اس کے باوجود وہ برسوں اپنے آباؤ اجداد کے ملک پر قابض ہونے کے لیے خیالی پلاؤ پکاتا رہا۔ چنانچہ اس لالچ میں کہ ایک نہ ایک دن ایران میں مسلمانوں کے خلاف بغاوت ہو گی اور اسے غاصبان اسلام سے انتقام لینے کا موقع ملے گا، وہ خراسان کے ان لوگوں سے خط و کتابت کرتا رہا جن کی وفاداری پر اسے اعتماد تھا۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں خراسان میں بغاوت ہوئی۔ یزدگرد نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ترکستان سے مرو پہنچ کر ان لوگوں کو جمع کیا، جن سے اس کی مراسلت رہی تھی لیکن مسلمانوں نے بہت جلد یہ بغاوت فرو کر دی اور ان لوگوں سے زمام اقتدار چھین لی جنہوں نے مسلمانوں کی بالادستی سے انحراف کیا تھا۔ یزدگرد کے ساتھیوں نے سمجھ لیا کہ اب ان میں اپنے ارادے کو جامہ عمل پہنانے کی طاقت نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ گئے اور یزدگرد مجبور ہو گیا کہ جہاں سے آیا تھا پھر وہیں بھاگ جائے۔ لیکن اس مرتبہ بھاگنا آسان نہیں تھا، اس لیے کہ پورا ایران اس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ مسلمانوں نے ایرانی جاسوس لگا دیئے کہ وہ یزدگرد کو گھیر لیں اور گرفتار کر کے ان کے پاس لے آئیں۔ بھگوڑے بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا تو دریا کے کنارے ایک چکی میں روپوش ہو گیا اور وہاں بری طرح قتل کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اہل خراسان نے اسے جالیا اور قتل کر کے اس کی لاش دریا میں پھینک دی۔ ایک روایت ہے کہ چکی والے نے اس کا شاہانہ لباس دیکھا اور جب وہ سو گیا تو اسے قتل کر دیا۔ ترک اس کو تلاش کرتے ہوئے آئے اور یہ دیکھ کر کہ وہ قتل ہوا پڑا ہے، انتقاماً چکی والے اور اس کے اہل و عیال کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا، اس کے بعد اس کی لاش کو تابوت میں رکھ کر اصطخر لے گئے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ چکی والا مرو کے حاکم کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ یزدگرد اس کے ہاں چھپا ہوا ہے۔ مرو کے حاکم نے یہ سن کر اپنی فوجوں کو حکم دیا کہ ''جاؤ! اور اس کا سر لے کر میرے پاس آؤ!'' چکی والا اپنی دکان میں گیا اور یزدگرد کو قتل کر کے اس کا سر تو فوج کے حوالے کر دیا اور لاش دریا میں پھینک دی۔ ان روایات میں چاہے کوئی سی روایت صحیح ہو، اس امر پر ان سب کا اتفاق ہے کہ عظیم القدر اکاسرہ کا یہ چشم و چراغ چکی والے کی پناہ میں قتل کر دیا گیا اور اس

Marfat.com

کے قتل سے اکاسرہ بنی ساسان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

فارس کی فتح اور یزدگرد کا فرار، دونوں عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں اتمام کو پہنچ گئے۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایرانیوں نے ابتداء ہی میں مسلمانوں کی حکومت کو خوش دلی و رضامندی کے ساتھ قبول کر لیا تھا؟ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اس حکومت کو اکاسرہ کی حکومت کے مقابلے میں عدل و انصاف سے قریب اور جبر و استبداد سے دور پایا تھا۔ عربوں نے ان کے مذہبی معاملات میں انہیں بالکل پریشان نہیں کیا، نہ کبھی ان کے ذاتی مسائل میں دخل دیا۔ پھر انہوں نے امرائے ایران کو صوبوں میں اتنے اختیارات دے دیئے جو یزدگرد اور ان کے بزرگوں کی حکومت کے زمانے میں بھی انہیں حاصل نہ تھے۔ اسی طرح انہوں نے عام مناصب بھی ایرانیوں کے لیے چھوڑ دیئے اور ان سے خود کوئی فائدہ اٹھانے کی خواہش یا کوشش نہیں کی بلکہ صرف جزیے پر ہی اکتفا کیا اور ان معاہدات کا برابر احترام کرتے رہے جو ان کے اور مختلف ریاستوں کے درمیان قرار پائے تھے، لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد ایرانیوں نے وہ ذلت و عار محسوس کر لی جو اجنبی حکومت کے استیلاء میں ہوتی ہے اور معاہدوں کی وہ دفعات انہیں اکھرنے لگیں جو ان کے شعور کے لیے ایک مستقل جراحت اور ان کی عزت کے لیے ایک دائمی ناسور تھیں۔ صلح اصفہان کی آخری شرط یہ تھی۔ ''کوئی ایرانی کسی مسلمان کو گالی دے گا تو اسے سزا دی جائے گی اور مارے گا تو قتل کر دیا جائے گا۔'' صلح ری میں وہاں کے باشندوں پر فرض کیا گیا تھا کہ ''وہ شب و روز فاتحین کی تواضع کریں گے اور انہیں تعظیم دیں گے۔ اگر کسی ایرانی نے مسلمان کو گالی دی یا اس کی اہانت کی تو سزا کا مستوجب قرار پائے گا اور مارا تو قتل کا سزاوار ہوگا۔'' اور جرجان کے معاہدے کی ایک دفعہ یہ تھی کہ ''جو کوئی مسلمان کو گالی دے گا، اس کی سزا پائے گا اور جو کوئی اسے مارے گا اس کا خون حلال ہوگا۔'' تو کسی مسلمان کو گالی دینے اور اس کی اہانت کرنے یا مارنے سے، عزت یا جان کی بھینٹ کسی ایرانی کو دینی پڑے گی، مذہبی معاملات میں آزادی اور مالی آسودگی کے تحفظ کو اس کی قیمت قرار دیا جا سکتا ہے؟ ایرانیوں کے لیے اس پر مطمئن ہو جانا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئے ابھی کچھ زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ انہوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کی سرکوبی کے لیے وقتاً فوقتاً مسلح فوجیں بھیجنی پڑیں۔

انہوں کی گوشمالی اور انہیں دوبارہ حلقہ اطاعت میں لے آنا کوئی دشوار بات نہ تھی۔ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس نکتے کو فراموش نہ کیا تھا کہ ایرانیوں جیسی قوم، جو تہذیب و عظمت

Marfat.com

بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے، اول اول اجنبی اقتدار کو تسلیم نہیں کرے گی اور اسی لیے انہوں نے ایران کے مختلف حصوں میں فوجی چھاؤنیاں قائم کر کے ان تمام بغاوتوں کی پیش بندی فرما دی تھی، جن کا ایران کے کسی طبقے کی طرف سے برپا ہونا ممکن تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوسرے بہت سے معاملات کی طرح اس مسئلے میں بھی بڑی احتیاط اور دور اندیشی سے کام لیا تھا۔ اس لیے کہ انسان میں بزرگی کا احساس دوسرے تمام احساسات سے قوی ہوتا ہے اور اس کا زور صرف وہی قوت توڑ سکتی ہے جو اپنی توہین پر بھڑک اٹھنے والے کو، بزرگی یا زندگی میں سے کسی ایک کے انتخاب پر مجبور کر کے بزرگی کے احساس اور بقائے حیات کے فطری جذبے کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیتی ہے۔ یہ مرحلہ ایرانی قوم کی زندگی میں اتنا دور رس ثابت ہوا کہ وہ قبول اسلام تک پہنچ گئی اور دوسری طرف اسلامی سلطنت کی زندگی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، لیکن اس کی تفصیل ہماری اس کتاب کے دائرہ بحث سے خارج ہے۔

ایران کے دانش مندوں کی نظر اسلام کی بلندی پر گئی۔ پھر انہوں نے محسوس کیا کہ معاہدوں کی بعض ذلت آمیز دفعات سے وہ اپنی بزرگی کو صرف اسی طرح محفوظ رکھ سکتے ہیں کہ حاکموں کا دین قبول کر لیں اور ان کے ساتھ اچھی طرح گھل مل کے اس اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کریں، جسے یزدگرد کے زیر سایہ، ان کی تلواریں غیروں کے ہاتھ میں جانے سے نہ روک سکیں۔ ان میں مذہبی تعصب بھی اتنا شدید نہ تھا کہ وہ انہیں اسلام کی نعمتوں سے راحت اندوز ہونے کی اجازت نہ دیتا، جن میں سب سے پہلی نعمت تو یہی تھی کہ وہ محض اسلام قبول کر لینے سے حاکموں کے ہم روش ہو جائیں گے، انہیں برابر کے حقوق مل جائیں گے اور وہ مسلمانوں میں شادی بیاہ کر سکیں گے۔ پھر جب انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو حکومت پر اپنے قدیم عقیدے کو مسلط کرنے کی کوشش کی جس میں وہ ایک بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔'' انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی شائع کردہ ''''تاریخ المورخ'' میں اس موضوع پر جو اظہار خیال کیا گیا ہے یہاں ہم اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ ''فتح کے بعد ایرانی اسلام میں فوج در فوج داخل ہونے لگے جس کے بہت سے سبب تھے، لیکن ان سب کو دو اسباب میں سمیٹا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ اسلام حاکموں کا دین تھا اور دوسرا یہ کہ ایرانی اپنے سابقہ سرکاری مذہب سے برائے نام ہی دلچسپی رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ دونوں...... ایرانی اور اسلامی عقیدے اکثر موقعوں پر مل جاتے تھے۔ چنانچہ ایک مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لینا، پہلے عقیدے کے لیے ایسا کوئی زلزلہ نہ تھا، جس سے

لوگ چونک پڑتے۔ خداؤں کے تعدد نے ایرانیوں کا ایمان کمزور کر دیا تھا اور ان کا تصور ''رومزو'' اسلامی الوہیت کے تصور سے قریب ہو گیا تھا۔ پھر عربی عقیدے کی سادگی، مزدکی شعائر کی پیچیدگیوں سے نجات کا سبب تھی اور قرآن کی فرض کی ہوئی زکوٰۃ، صدقہ و احسان کے ان احکام کے مطابق بلکہ ان سے بلند تھی جن کا حکم ''آوستا'' نے دیا تھا اور قرآن میں جنت و دوزخ اور آخرت کا جو ذکر ہے وہ بھی ان کی کتابوں میں موجود تھا...... اس لیے ایرانی قوم کے نزدیک اسلام نے ان کے بنیادی عقائد میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی تھی، سوائے اس کے کہ وہ اللہ اور محمد ﷺ کے دو نئے نام لایا تھا اور ان آٹھ کلموں کو جو اسلام کی بنیاد سمجھے جاتے تھے ان اکیس کلموں کی جگہ رکھتا تھا، جن پر ایرانیوں کے عقیدے کی تعمیر ہوئی تھی۔

مذہب کی اس تبدیلی کا اثر سیاسی پہلو پر بھی پڑا۔ ایرانی عقیدہ، ملک کے بادشاہ کو ''خدا کا بیٹا'' قرار دیتا تھا اور اسے پیدائشی طور پر عظمت و تقدس کا دیوتا سمجھتا تھا۔ چنانچہ جب ایرانیوں نے مدینہ اور دمشق کی حکومتوں کے خلاف بغاوت کی تو محمد (ﷺ) کے چچا زاد بھائی (حضرت) علی عربی کے گرد جمع ہو گئے اور ان کے چاروں طرف بھی جلال و تقدس کا وہ ہالا قائم کر دیا گیا جو ان کے اسلاف اپنے قومی بادشاہوں کے گرد قائم کرتے چلے آئے تھے۔ پھر جس طرح ان کے بزرگ کسریٰ کو ''آسمان کا بیٹا'' مقدس بادشاہ کے لقب سے ملقب کرنے کے عادی تھے اور ان کی کتابوں میں اسے ''سید و مرشد'' لکھا جاتا تھا، اسی طرح انہوں نے بھی اپنے اسلام کے زمانے میں (حضرت) علی رضی اللہ عنہ کو امام کا لقب دے دیا، جو اپنی سادگی کے باوجود بڑے اہم معنی کا مالک ہے اگر اس کے حامل میں دنیوی اقتدار اور عقلی برتری جمع ہو جائیں۔ جب (حضرت) علی رضی اللہ عنہ وفات پا گئے تو ایرانی ان کے صاحبزادوں (حضرت) حسن رضی اللہ عنہ اور (حضرت) حسین رضی اللہ عنہ کے گرد جمع ہو گئے اور ان کے بعد ان کی اولاد کے۔ کہا جاتا ہے کہ (حضرت) حسین رضی اللہ عنہ نے اکاسرہ بنی ساسان کے آخری تاجدار کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ چنانچہ ازدواج کے بعد امامت، مقدس حق سے رشتہ بہ دامن ہو گئی۔ پھر کربلا کے میدان میں (حضرت) حسین رضی اللہ عنہ کے خون نے اس وحدت کو متبرک بنا دیا جو اسلام اور قدیم ایران کے درمیان قائم ہوئی تھی۔ وہ بغاوت جس نے بنو امیہ سے حکومت چھین کر رسول اللہ ﷺ کے قرابت داروں، بنو عباس کو تخت پر بٹھا دیا، ایرانیوں ہی کی برپا کی ہوئی تھی، جس کے ذریعے انہوں نے اپنے اصول امامت کی تشکیل و تصدیق کر دی۔ اگرچہ وہ ان ... کو تاج نہ پہنا سکے جسے تاج پہنانے کی راہ میں اپنی تمام تر کوششیں صرف کر دی تھیں۔"

یہ واقعات جو تاریخ المؤرخ میں لکھے ہیں اور جن کا ذکر تمام مؤرخین نے کیا ہے، عہد فاروقی رضی اللہ عنہ کے بعد پیش آئے۔ یہاں ان کا ذکر ہم نے پڑھنے والے کی توجہ اس حقیقت کی طرف منعطف کرنے کے لیے کیا ہے کہ ایرانیوں کے دل شروع ہی سے عربی حکومت پر مطمئن نہ تھے، بلکہ وہ اس سے اباء کرتے تھے۔ اول اول انہوں نے اس کے خلاف علانیہ بغاوت کرنی بھی چاہی، لیکن اس میں ناکامی ہوئی تو دوسرے ذرائع سے اقتدار حاصل کرنے کی سرتوڑ کوششیں کرنے لگے اور عام زندگی کے تمام میدانوں میں انہیں اقتدار کا بہت بڑا حصہ بھی مل گیا۔ مسلمانوں کے ایران فتح کرنے سے ایرانی اس قدر نشتر بہ دل تھے کہ ان کے چند آدمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جان کے دشمن ہو گئے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت جو فتح خراسان کے کچھ ہی دن بعد ہوئی، ایرانی سازش ہی کا نتیجہ تھی۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔ یہاں تو ہمارا اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ جب احنف بن قیس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خراسان کی فتح کا خط لکھا تو اسلام کے اس فدائی نے بالکل سچ فرمایا تھا ''اللہ نے مجوسی سلطنت کو تباہ کر دیا ہے اور اسلام کو ان کی زمین، ان کے ملک اور ان کی اولاد کا وارث بنا دیا ہے۔'' اور یہ فتح اکاسرہ بنی ساسان کی سلطنت کے خاتمے کی سچی نظیر تھی۔ ①

① بہت ممکن ہے قاری کو محسوس ہوا ہو کہ ہم نے فتح ایران کے اکثر معرکوں کی تاریخیں معین نہیں کیں اور بعض موقعوں پر ان سپہ سالاروں کا نام لکھنا بھی بھول گئے، جو ان معرکوں میں فوجوں کی قیادت کر رہے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایرانی معرکوں کی تاریخوں کا تعین اور تحقیق بہت دشوار بلکہ شاید ناممکن ہے۔ میرے لیے یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ایران کے دو اہم ترین معرکوں...... قادسیہ اور نہاوند...... تک کی تاریخوں میں التباس پایا جاتا ہے اور یہ التباس صرف مسلمان مؤرخوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ دوسری زبانوں کے مؤرخین بھی انہی کی طرح شک و ریب میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ قادسیہ کی جنگ 636ء یا 637ء کے ابتدائی مہینوں میں ہوئی اور نہاوند کی لڑائی 640ء، 641ء اور 642ء میں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی اور علامہ طبری کا کہنا ہے کہ قادسیہ کی جنگ سنہ 14ھ میں ہوئی جو 635ء یا اوائل 636ء کے مطابق ہے۔ نہاوند اور اصفہان کی فتح وہ سنہ 21ھ میں بتاتے ہیں۔ خراسان، ری، جرجان، طبرستان اور آذربائیجان ان کے نزدیک سنہ 22ھ میں فتح ہوئے اور فارس، کرمان، مکران اور بجستان کی تاریخ فتح وہ سنہ 22ھ قرار دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ بعض ایسی روایات بھی نقل کرتے ہیں جنہیں وہ خود ساقط الاعتبار سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ آذربائیجان 18ھ میں ہمدان، ری، جرجان اور طبرستان کے بعد فتح ہوا۔ علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ خراسان کی فتح فارس، کرمان اور مکران کی تسخیر کے بعد واقع ہوئی اور یہی صحیح بھی ہے۔ اس طرح خراسان سنہ 23ھ میں فتح ہوا بشرطیکہ فارس اور اس کے آس پاس کے علاقے بھی [illegible] میں فتح ہوئے ہوں۔ لیکن علامہ بلاذری اکثر و بیشتر ان تمام روایات کے خلاف جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ [illegible] حضرت [illegible] کے عہد خلافت میں فتح ہوا۔ اسی طرح وہ ان اکثر سپہ سالاروں [illegible] میں بھی»

Marfat.com

اب جبکہ ہم ایران کی فتح سے فارغ ہو چکے ہیں، ہمیں ایک دوسرے میدان میں چلنا چاہیے، جہاں مسلمانوں کی تلواریں عین اس وقت برق پاشیاں کر رہی تھیں، جب سرزمین کسریٰ میں ان کی تابناکیاں نگاہوں کو خیرہ کیے دے رہی تھیں اور جہاں ان کے کارنامے اسی قدر سراہے جا رہے تھے، جس قدر ایران میں انہیں خراج تحسین پیش کیا جا رہا تھا۔ پھر اس میدان کے سپہ سالار حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ تھے جو مسلمانوں میں اپنی ذہانت و تدبیر کے لحاظ سے سب سے ممتاز فوجی قائد تھے۔ یہ آخری میدان، مصر کا میدان ہے!

⊙❀⊙

» جو ان بہت سی مختلف لڑائیوں میں فوجوں کے کماندار رہے، علامہ طبری اور ان کے متبعین سے اختلاف کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں جتنی تحقیق میرے بس کی تھی، میں نے کی ہے۔ روایات کا باہم مقابلہ کیا ہے، پھر انہیں اس عہد کے ایران کے طبعی اور سیاسی جغرافیے پر منطبق کیا ہے اور اس باب میں وہی روایت پیش کی ہے، جسے میں سمجھتا ہوں کہ وہ صحت سے قریب تر ہے، لیکن جس مسئلے میں روایات ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں اور اس مسئلے کا اثبات عہد فاروقیہ کی اسلامی سلطنت کی تاریخ میں کوئی اہمیت بھی نہیں رکھتا، اسے میں نے نظر انداز کر دیا ہے اور میرا خیال ہے میری اس روش سے ہمارے پیش نظر موضوع کی کوئی جوہری چیز قاری کی نظر سے پوشیدہ رہنے نہیں پائی ہے۔ میرا تو اس باب میں سب سے بڑا مقصد یہ رہا ہے کہ سرزمین ایران میں اسلامی فتوحات کی تصویر اس طرح پیش کروں کہ وہ ہر قسم کے ابہام و اضطراب سے پاک ہو۔

Marfat.com

باب:18

اسلامی فوجوں کی مصر کی طرف پیش قدمی

ادھر احنف بن قیس، نعیم بن مقرن، ان کے بھائی سوید اور عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان جیسے نامور اور مردآزما سپہ سالاران اسلام کی قیادت میں اسلامی لشکر کی تلواریں ایران کی فضاؤں میں لہرا رہی تھیں اور ادھر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اپنی فوج کو لیے مصر میں پیش قدمی فرما رہے تھے۔ شہر پر شہر فتح کر رہے تھے اور حکومت کے تخت اُلٹ اُلٹ کے رومیوں کو وہاں سے نکال رہے تھے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے مصر کی طرف پہلا قدم ماہ ذی الحجہ سنہ 18 ھ میں اٹھایا اور سرزمین مصر میں پہلا قدم سنہ 19 ھ کے اوائل میں رکھا۔ اس کے بعد مصریوں اور رومیوں سے لڑتے ہوئے آگے بڑھے۔ اول اول تو انہوں نے احتیاط برتی، لیکن جب خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی امدادی فوجیں ان کے پاس پہنچ گئیں تو رفتار تیز کر دی اور فتح و نصرت ان کی رکاب میں چلنے لگی۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ مصر کی طرف حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حکم سے روانہ ہوئے تھے، لیکن یہ حکم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بڑی سوچ بچار اور طویل پس و پیش کے بعد دیا تھا۔ ایک متواتر روایت میں ہے کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو مصر کے حملے کی طرف اس وقت توجہ دلائی تھی جب بیت المقدس نے مسلمانوں کے لیے اپنے دروازے کھول دیئے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سنہ 16 ھ میں اس کے باشندوں سے صلح فرما چکے تھے۔ شاید اس دن حضرت عمرو بن عاص نے اپنی گفتگو میں رومی سپہ سالار اطربون کا ذکر بھی کیا تھا کہ وہ رومی افواج کو لے کر فلسطین سے وادی نیل میں چلا گیا ہے، اس لیے اس سے پہلے کہ اسے ایک سرسبز و شاداب ملک میں مورچہ بند ہونے کی مہلت ملے، وہ اس کے مستحکم قلعوں اور غلے کے ذخیروں میں مدافعت و مقاومت کے وسائل و اسباب پا سکے، جو ہرقل کے دل سے شکست اور "مقدس شہر" سے فرار کی ذلت کا احساس

Marfat.com

مٹادیں، اس کا تعاقب بہتر اور ضروری ہے اور شاید اسی طرح اپنی گفتگو میں انہوں نے مصر کی ان بے شمار نعمتوں کی بھی تصویر کھینچی تھی جن کا بیشتر حصہ رومی غصب کر جاتے تھے اور مصریوں کو ان میں سے صرف اتنا ہی ملتا تھا کہ وہ زرخیز زمین کو بونے جوتنے کی قوت حاصل کر سکیں۔ شاید یہ باتیں انہوں نے خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ کے سامنے بار بار دہرائی تھیں اور انہیں تقویت پہنچانے، ان میں وزن پیدا کرنے کے لیے یہ بھی کہا تھا کہ مصری عوام سے رومی افسروں کا سلوک تقریباً ویسا ہی ہے، جیسا عراقی عوام سے ایرانی حکام کا ہے۔ اور مذہبی نزاع نے ساحل نیل پر، مصریوں کے جذبات اور کینہ وغضب کو اتنا برانگیختہ کر دیا ہے کہ وہ بغاوت وسرکشی کی طرف نہ جانے کے باوجود حاکموں کے لیے حمایت کا کوئی جوش اپنے اندر نہیں پاتے اور یہ تمام وہ چیزیں ہیں جو اس شاداب وادی میں مسلمانوں کے لیے فتح ونصرت کی ضمانت بن سکتی ہیں۔ پھر اگر اس میں وہ اثر بھی شامل کر لیا جائے، جو اس زمانے میں لوگوں کے دلوں پر قائم ہے کہ مسلمان بے پناہ قوت کے مالک ہیں اور اللہ ان کے ساتھ ہے، اس لیے ان پر کوئی غالب نہیں آ سکتا تو مصر پر حملہ کرنے اور وہاں اسلامی پرچم گاڑ دینے میں تکلیف وتردد کا کوئی محل باقی نہیں رہ جاتا۔ اس کے علاوہ مصر میں دولت وثروت کے بے شمار خزانے ہیں جو مسلمانوں کو دنیوی نعمتوں سے اسی طرح نواز سکتے ہیں جس طرح جہاد فی سبیل اللہ میں شہادت طلبی انہیں اخروی نعمتوں سے بہرہ یاب کر سکتی ہے۔

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ اور اسی قسم کی باتیں بار بار سنیں اور غور سے سنیں پھر ان کے متعلق بہت کچھ سوچتے بھی رہے، اس لیے کہ جس کسی میں مصر پر حملہ کرنے کی طاقت ہو اس کے لیے مصر پر حملہ کرنے کا خیال فی نفسہٖ بڑی دل کشی رکھتا ہے۔ بھلا عراق وشام کی ثروت سرسبزی کو مصر کی ثروت وسرسبزی سے کیا واسطہ؟ دنیا کا کون سا خطہ ہے جس کی تاریخ مصر کی تاریخ سے زیادہ دامن دار ہو یا مشرق کے دونوں حصوں میں وہ کون سے آثار ہیں، جو عظمت وجلال کے پیش نظر مصر کے آثار سے آنکھ ملا سکیں؟ لیکن مصر کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جب بھی کوئی بات کہی جاتی تھی، وہ سوچ میں پڑ جاتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کو مصر پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں دی اور جب دو برس کے بعد حملے کی اجازت ملی بھی تو مدینہ میں کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے اسے ناپسند کیا اور اس کی بدانجامی کے خوف سے چاہا کہ یہ حکم واپس لے لیا جائے۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ کو آ ۔۔۔ سے روک دیا جائے۔

Marfat.com

حضرت عمر ؓ کو آخر اتنا تردد کیوں تھا؟ اس کے بہت سے اسباب تھے جن میں پہلا سبب یہ تھا کہ سنہ 17ھ کے اواخر تک فتوحات کے باب میں ان کی سیاست، خالصتاً عربی سیاست تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ عراق و شام کو جزیرۃ العرب میں شامل کر لینے کے بعد ان کی سرحدوں سے آگے قدم رکھا جائے۔ ان دونوں ملکوں کو بھی فاروق اعظم ؓ جزیرہ نمائے عرب میں اس لیے شامل کرنا چاہتے تھے کہ وہ عربی قبائل جو ترک وطن کر کے لخمیوں اور غسانیوں کے زیر سایہ آباد ہو گئے تھے، کسریٰ اور قیصر کے اثر و نفوذ کا جوا کندھوں سے اتار کر وہاں عربی حکومت قائم کر لیں۔ اور سچ بھی یہ ہے کہ اس ملک کو صرف عربوں ہی کے لیے ہونا چاہیے تھا، جہاں وہ آزاد اور صاحب اقتدار ہوں تاکہ عربی قوم ایک ایسی وحدت میں منسلک ہو جائے جس کا ایک سرا خلیج عدن اور بحر ہند میں ہو اور دوسرا سرا شمالی جانب صحرائے ساوہ کے انتہائی کنارے پر۔ اسی لیے حضرت عمر ؓ نے حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ کو عراق کے میدانوں سے گزر کر جبل فارس کی طرف بڑھنے کی اجازت نہیں دی تھی اور خواہش ظاہر کی تھی کہ سواد اور جبل فارس کے درمیان آگ کی ایک دیوار ہوتی کہ نہ ایرانی ادھر آ سکتے، نہ مسلمان ادھر جا سکتے۔ وہ پوری قوت سے اپنی اسی سیاست پر کاربند رہے، یہاں تک کہ مسلمانوں کے لیے ہرمزان سے لڑنا ناگزیر ہو گیا۔ اس کے بعد جب ایرانیوں نے نہاوند میں اپنی قوت جمع کی اور اللہ نے مسلمانوں کو ان پر فتح یاب فرمایا تو حضرت عمر ؓ نے اسلامی فوجوں کو پورے ایران میں پھیل جانے کا حکم دے دیا کہ یزدگرد کو وہاں سے نکال دیا جائے اور تمام باغیانہ قوتوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔

فتح مصر کے سلسلے میں حضرت عمر ؓ کے پس و پیش کا دوسرا سبب یہ تھا کہ سنہ 16ھ کے اخر تک پورا شام مسلمانوں کے زیر اقتدار نہیں آیا تھا۔ اس کے شمال میں ہنوز مقابلہ جاری تھا اور وہاں مسلمانوں کے قدم ابھی تک نہیں جمے تھے۔ آخر کار یہ مہم حضرت ابوعبیدہ بن الجراح ؓ اور حضرت خالد بن ولید ؓ کے سپرد کی گئی اور یہ اس وقت کی بات ہے، جب ہرقل نے اپنی فوجیں سمندر کے راستے اسکندریہ سے انطاکیہ بھیجی تھیں اور اہل جزیرہ رومیوں کی مدد کو آئے تھے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی اور رومیوں نے اہل جزیرہ سمیت راہ فرار اختیار کی۔ اس کے علاوہ قیساریہ نے، جو سمندر کے کنارے ایک بہت محفوظ و مستحکم مقام پر واقع تھا، اس وقت تک ہتھیار نہ ڈالے تھے اور وہ مسلمانوں کے فلسطینی مرکزوں کے لیے ایک مستقل خطرہ بنا ہوا تھا۔ آخر الامر حضرت معاویہ بن ابی سفیان ؓ نے اسے بھی فتح کر لیا۔ اس صورت میں کہ سنہ 17ھ کے اواخر

Marfat.com

تک شام و فلسطین کی کیفیت یہ تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ مصر میں رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے اپنی فوجیں شام سے مصر بھیج دیں۔ تو کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ جب اللہ شام فتح کرا دے گا، اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس جنگ کے لیے قدم اٹھائیں گے؟ اس میں انہیں تردد تھا اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور ان کے علاوہ مدینے کے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم ان کے اس تردد میں اور اضافہ کر رہے تھے۔

جب پورا شام فتح ہو گیا تو ایک نیا سبب اور پیش آ گیا جس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس تردد سے نہ نکلنے دیا جزیرہ نمائے عرب میں قحط پڑ گیا اور بہت سے آدمی اس میں ہلاک ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ، قحط کے دفعیے میں لگ گئے۔ وہ مصر میں رومیوں پر حملہ کرنے کے متعلق سوچ بھی کیسے سکتے تھے، جب تک کہ جزیرۃ العرب میں لوگ بھوکوں مر رہے تھے اور روم یا ایران میں لڑنے والی کوئی اسلامی فوج ان کی مدد کو نہ پہنچ سکتی تھی! ابھی قحط کی یہ مصیبت پوری طرح دور نہ ہوئی تھی کہ فلسطین کے ایک شہر 'عمواس' میں طاعون پھوٹ پڑا اور پھیلتا پھیلتا شام اور بصرہ تک پہنچ گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے تمام مسلمان اس بلائے ناگہانی سے بے اوسان ہو گئے۔ یہاں تک کہ عراق و شام میں بغاوت کے اندیشے نے انہیں ڈرا دیا اور یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ ایرانی اور رومی کہیں پلٹ کر مسلمانوں پر حملہ نہ کر دیں اور مفتوحہ علاقے ان کے قبضے سے نہ نکل جائیں۔ بالکل فطری تھا کہ قحط اور طاعون کے زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہ سب کچھ بھول جاتے جو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے مصر کے متعلق ان سے کہا تھا اور اس پر حملہ کرنے کا خیال سرے سے ان کے دل میں آتا ہی نہیں۔

ان واقعات کے دوران میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے مکمل خاموشی اختیار کر لی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مصر پر حملے کے متعلق کوئی بات نہ کہی، لیکن اس کے باوجود یہ خواہش ان کے دل میں برابر چٹکیاں لیتی رہی کہ فرصت کے لمحات میں وہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو اس عظیم الشان فتح کا یقین دلا دیں۔ چنانچہ جزیرہ نمائے عرب میں جب عام زندگی بحال ہو گئی اور شام میں وبا کا کوئی اثر باقی نہ رہا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں کے حالات کی درستی اور فوجوں کی از سر نو تنظیم کے لیے شام تشریف لے گئے۔ جابیہ میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ان سے ملے اور ان کے ساتھ شام کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ابن عاص رضی اللہ عنہ نے پھر فتح مصر کا ذکر چھیڑا اور چند ایسی دلیلیں پیش کیں جو نئی اور ان کے خیال میں خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ کا تذبذب دور کر دیتیں

Marfat.com

کے لیے کافی تھیں۔ انہوں نے کہا: ''اگر قحط اور طاعون کی ہلاکت آفرینیوں کے بعد مسلمانوں نے محض مفتوحہ ممالک پر قناعت کر لی تو ان کے دشمن یہ سمجھیں گے کہ وہ کمزوری کا شکار ہو گئے ہیں اور یہ گمان انہیں حملے پر اکسائے گا۔ پھر یہ اطربون، جو مصر میں اپنی فوجیں جمع کر کے لڑائی کے لیے کیل کانٹے سے لیس ہوا بیٹھا ہے، جب لڑنے کے لیے کسی کو نہ پائے گا تو اپنی فوجیں لے کر مسلمانوں پر حملہ کرنے فلسطین کی طرف بڑھے گا! ایسی صورت میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ مسلمان اس کے امن کدے میں اچانک اس پر ٹوٹ پڑیں، اس لیے کہ حملہ مدافعت کا بہترین ذریعہ ہے؟ جس وقت عرب کی قوتیں مصر پر حملے کے لیے بڑھیں گی، رومیوں کو یقین ہو جائے گا کہ ان کی طاقت پہلے کی طرح آج بھی غیر معمولی ہے اور وہ خوف زدہ ہو کر مدافعانہ مؤقف اختیار کر لیں گے، اس طرح شام ان کے جوابی حملے سے محفوظ ہو جائے گا، پھر ہرقل سمندر کے رستے مصر سے اپنی فوجیں انطاکیہ یا کسی اور جگہ کیسے بھیج سکے گا جبکہ مسلمان خود مصر میں اس سے برسر پیکار ہوں گے اور اگر اللہ نے کسی دن مسلمانوں کو مصر فتح کرا دیا، انہیں اس کا وارث بنا دیا اور اس پر ابن عاص رضی اللہ عنہ کا ایمان تھا، تو یہ ایک ایسی کامیابی ہوگی جس کے سامنے ہر کامیابی پھیکی پڑ جائے گی، لیکن اگر قوتیں برابر رہیں اور رومیوں نے صلح چاہی تو مسلمان شام، جزیرۃ العراق اور ان تمام علاقوں میں، جو اس سے پہلے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی تلواروں نے فتح کیے ہیں، رومیوں کی طرف سے محفوظ و مامون ہو جائیں گے۔ مصر میں مسلمانوں کے شکست کھانے کا اول تو کوئی اندیشہ ہی نہیں ہے اور بفرض محال انہیں شکست ہو بھی گئی تو وہ اتنی خطرناک بہرحال نہ ہوگی کہ قیصر کی سلطنت کا جو حصہ مسلمانوں نے فتح کر لیا ہے وہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس لیے کہ شام کے مختلف گوشوں میں پھیلی ہوئی اسلامی فوجیں، اس کے تحفظ و استحکام کی ضامن ہیں۔ پھر وہاں کے عرب باشندے اپنے ہم نسل بھائیوں کے ساتھ مل کر اس کی مدافعت کے لیے ہر وقت سینہ سپر ہیں اور غیر عرب اپنے تئیں اس لیے مسرور و مطمئن پاتے ہیں کہ مسلمانوں کی فرمانروائی، رومیوں کی فرمانروائی سے بہتر ہے اور وہ سابقہ حکمرانوں کے مقابلے میں ان پر زیادہ عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرتے ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دلیلیں سنیں اور مختلف پہلوؤں سے ان پر غور فرماتے رہے۔ ان کے دل نے کہا کہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی رائے مان لینی چاہیے اور یہ دیکھ کر وہ اس رائے کی طرف اور بھی مائل ہو گئے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا فتح مصر پر ایمان ایک ایسی منطق پر استوار ہوا ہے

Marfat.com

جسے رد کرنا دشوار ہے۔ اس کے علاوہ مصر کی فتح بجائے خود بھی بڑی دلکش اور دل افزا تھی۔ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور اس عہد کے اکثر و بیشتر عرب مصر اور اس کی دولت و ثروت کے متعلق بہت کچھ جانتے تھے۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ مصر کے باشندے رومی اقتدار اور طرز حکومت سے نالاں ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی درخواست مسترد نہیں کی، لیکن یہ کہہ کر انہیں کچھ دن کے لیے روک دیا کہ مدینہ جا کر وہ اس کے متعلق لکھیں گے۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے خط کا انتظار کرنے لگے اور اس دوران میں مصر کی روانگی کا لائحہ عمل مرتب کرتے رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے بہت سے عرب مصر کے متعلق بہت کچھ جانتے تھے اور یہ معلومات صرف انہیں لوگوں تک محدود نہ تھیں جو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی طرح اپنی تجارت کے سلسلے میں مصر آتے جاتے رہتے تھے بلکہ اس سے زیادہ وسیع اور اس سے زیادہ گہری تھیں، مصر اور بلاد عرب کے تعلقات بہت قدیم زمانے سے چلے آرہے تھے۔ مصر عہد فراعنہ سے ایک بحری سلطنت تھی، جس کے جنگی اور تجارتی بیڑے تاریخ کے قدیم ترین عہد سے بحیرہ روم اور بحیرہ قلزم کی موجوں کا سینہ چاک کر رہے تھے۔ ان بیڑوں کے جہاز بلاد عرب کے جنوب میں تجارتی سامان لے کر جاتے تھے اور وہاں سے مختلف قسم کی تجارتی چیزیں لے کر آتے تھے، جن میں سر فہرست وہ عطر اور خوشبوئیں ہوتی تھیں، جن سے حنوط شدہ لاشوں کو بسایا جاتا تھا۔ ان جہازوں کے چلنے اور لنگر انداز ہونے کی جگہ وہ تھی، جہاں آج کل قصیر آباد ہے، یہاں مصر جانے والا تجارتی سامان اس رستے سے لے جایا جاتا تھا جو فراعنہ کے ابتدائی خاندانوں کے زمانے میں بحیرہ قلزم کے ساحلی شہر قصیر سے شروع ہو کر نیل کے کنارے اقفط پر تمام ہوتا تھا۔ ماہرین آثار قدیمہ نے کرناک[1] اور چند مصری معابدوں کی تصویروں کے نقوش سے ان جہازوں اور ان جہازوں پر لادے جانے والے تجارتی سامان کی وضاحت کی ہے، اسی طرح انہوں نے فرعونی ملکہ ہاناسو کے بنوائے ہوئے ''بحری مندر'' کے نقوش سے جہاز رانی کے اس رستے کا اثبات کیا ہے جو مختلف بحیروں سے گزرتا ہوا، خلیج سویز کے قریب دریائے نیل کو بحیرہ قلزم سے ملاتا ہے۔ جہاز رانی کے اس رستے پر بحیرہ روم اور بحیرہ قلزم کے درمیان ان جہازوں کی آمد و رفت تھی، جو مصر و مغرب کا تجارتی سامان، مشرق میں اور مصر و مشرق کی تجارتی اشیاء مغرب میں لایا اور لے جایا کرتے تھے۔

---

[1] قلعے یا فوج کے استحکام و حفاظت کے لیے چاروں طرف دیوار نما ستونوں کی قطار (لغات جدید، تالیف مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم)

چنانچہ مصر اس زمانے میں آج سے کہیں بڑا تجارتی مرکز تھا، جس کی شہرت ساری دنیا میں تھی اور مصر کے بعض بادشاہوں نے تجارتی سامان کی آمد ورفت میں سہولت پیدا کرنے کے لیے بطور خاص توجہ صرف کی تھی۔

یہ بحری بیڑے ہی مصر اور بلاد مصر کے قدیم تعلقات کا تنہا ذریعہ نہ تھے بلکہ خاکنائے سویز بھی ان کا نقطہ اتصال تھا جو کسی زمانے میں منقطع نہیں ہوا۔ جزیرہ نمائے سینا کا ایک رستہ تھا جسے قدیم مصری تانبے کی کانوں تک پہنچنے کے لیے استعمال کرتے تھے جو سینا میں واقع تھیں۔ یہ رستہ حجاز کے شمال سے ہوتا ہوا تیما کے قریب اس رستے سے مل جاتا تھا جو فرات کے کنارے بابل تک پہنچتا تھا اور بابل و عراق مختلف زمانوں میں مصر کے زیر اقتدار رہ چکے تھے۔ چنانچہ یہ رستہ ان دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی رشتے کا ایک ذریعہ تھا جو کبھی کبھی ان کے لیے باہمی جنگ و پیکار کا سبب بھی بن چکا تھا۔ حجاز کے شمال میں ہو کر گزرنے والا سینا کا یہ رستہ اس طرح مکہ اور یمن کو جانے والے قافلوں کے رستے سے بھی مل جاتا تھا۔ اس رستے پر ان قافلوں کی بڑی گہما گہمی رہتی تھی جو مصر اور بحیرہ قلزم کے شہروں کا تجارتی سامان یمن، ایران، ہندوستان اور مشرق بعید کے ممالک میں پہنچایا کرتے تھے اور اسی رستے سے یمن، ایران، ہندوستان اور مشرق بعید کی تجارتی اشیاء بکثرت مصر اور بحیرہ روم کے شہروں میں لے جائی جاتی تھیں۔ چنانچہ مصری تاجر اپنے قافلوں کے ساتھ بلاد عرب سے گزرتے تھے اور وہ عرب، جو مشرق کا سامان تجارت لے کر مصر جاتے تھے، مصر پہنچ کر کچھ دن ٹھہرتے تھے اور وہاں سے نیا سامان تجارت لے کر واپس آتے تھے۔ یہ سلسلہ قدیم ترین زمانے سے جاری تھا اور لوگوں کے بحری تجارت سے مانوس ہو جانے کے باوجود برابر جاری رہا۔

مؤرخین عہد عتیق کہتے ہیں کہ یہی تعلق تھا جس کی بنا پر بہت سے عربوں نے فراعنہ کے عہد میں، مصر کے ریگستانوں کو اپنا مسکن بنا لیا تھا اور مصر کے تارکین وطن، قافلوں کے رستے پر ایک نخلستان کے قریب آباد ہو گئے تھے۔ بعد کو یہی تارکین وطن وہ بیج بن گئے جس سے یثرب...... مدینۃ الرسول علیہ الصلوٰۃ والسلام...... کے برگ و بار پیدا ہوئے۔ یہ تجارتی تعلقات اور قافلوں کی حفاظت ہی وہ تنہا رشتہ نہ تھا جس نے قدیم زمانے میں عربوں اور مصریوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا، بلکہ ان کے درمیان صلہ رحمی بھی قائم تھا، جسے اہل یمن نے تو بھلا دیا تھا، لیکن اہل حجاز اور ان میں خاص طور پر مکہ اسے فراموش نہ کر سکے تھے۔ اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت

Marfat.com

اسمٰعیل علیہ السلام عربوں کے جداعلیٰ تھے اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام اصل نسل سے مصری تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی زوجہ حضرت سارہ علیہا السلام کے ساتھ عراق سے فلسطین اور فلسطین سے مصر تشریف لے گئے۔ مصر کے بادشاہ نے ان کی خدمت میں حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو پیش کیا اور ان کے بطن سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔ حضرت سارہ علیہا السلام نے جب یہ دیکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے درمیان مساوات برتتے ہیں تو ناراض ہو گئیں اور قسم کھالی کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے ساتھ نہیں رہیں گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ اور ان کے صاحبزادے کو لے کر جزیرۃ العرب میں تشریف لے گئے اور انہیں اس جگہ اتارا جہاں آج کل مکہ آباد ہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے قبیلہ جرہم کی ایک دوشیزہ سے شادی کر لی، جس سے بارہ لڑکے پیدا ہوئے اور یہ عرب مستعربہ کے جدالاجداد ہیں چنانچہ یہ عرب اپنے ننھیالی رشتہ داروں، بنو جرہم کی طرف سے نسبتاً عربوں سے تعلق رکھتے تھے جو یعرب بن قحطان کی اولاد تھے اور ان کے جداعلیٰ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ننھیال مصری تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے مصر تشریف لے گئے اور وہاں سے حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو لے کر جزیرۃ العرب آئے۔ اس طرح ان دونوں نسلوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے اکیس سو (2100) برس پہلے نسبی تعلق پیدا ہو گیا اور اس نئے رشتے نے اس تجارتی رشتے میں جو ان دونوں قوموں کے درمیان مدت مدید سے قائم تھا، ایک اور اضافہ کر دیا۔ پھر اس نسبی رشتے کے دو سو برس بعد ان دونوں قوموں کے درمیان ایک سیاسی رشتے نے جنم لیا، جس نے تاریخ پر اپنا ایک مستقل اثر چھوڑا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مصر کے ملوک رعاۃ[1] ہکوس، اصلاً عرب تھے جو ترک وطن کر کے پہلے فلسطین میں آباد ہوئے، اس کے بعد مصر کا رخ کیا اور وہاں لڑ بھڑ کے اپنی حکومت کی بنیاد ڈالی، جو بیسویں صدی قبل مسیح علیہ السلام کے اوائل سے شروع ہو کر پندرہویں صدی قبل مسیح علیہ السلام کے اواخر تک، مسلسل پانچ سو برس قائم اور اس تمام مدت میں پوری وادی نیل پر محیط رہی۔ اس کے بعد مصریوں نے ان لوگوں کو نکال دیا۔ جب یہ مصر سے نکلے ہیں تو ان کی تعداد چالیس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ یہ ہکوس بنی اسرائیل ہی تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ انہی کے عہد حکومت میں پیش آیا تھا۔ مصر و عرب کے یہ تجارتی، سیاسی اور نسبی تعلقات یوں ہی چلتے رہے۔ کبھی کمزور پڑ جاتے، کبھی قوت پکڑ لیتے، رومیوں نے مصر پر قبضہ کر لینے کے بعد کچھ دن کے لیے ان میں ضعف پیدا ہوا، لیکن بعد کو یہ پھر اپنی سا

Marfat.com

رفتار پر آ گئے، جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب گرمیوں کے موسم میں شام کے سفر پر جایا کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ ایلہ (عقبہ) کے قریب قافلوں کے اس رستے پر ہو لیتے جو سیدھا مصر پہنچتا تھا۔ اکثر عربوں کا شام آنا جانا رہتا تھا۔ جب وہ شام پہنچتے اور اپنی تجارتی ضروریات سے فارغ ہو جاتے تو وہاں سے مصر چلے جاتے۔ جیسا کہ جاہلیت اور اسلام میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا معمول تھا۔

مصر اور عرب کے تعلقات میں، بحری راستہ بھی قافلوں کے راستے سے کچھ کم اہمیت نہ رکھتا تھا۔ مصری ملاحوں کے جہاز جدہ اور عرب کی دوسری بندرگاہوں پر لنگر انداز ہوتے تھے جہاں وہ تجارتی اشیاء کا تبادلہ کرتے اور ملاح اپنے کھانے پینے کی ضروری چیزیں خریدتے تھے۔ انہیں تعلقات کی بنا پر بعض مصری عرب میں آ کر آباد ہو جاتے تھے۔ جس طرح بعض عرب، گرمیوں کے تجارتی سفر پر جاتے اور مصر پہنچ کر اس کے ریگستانوں میں قیام کر لیتے تھے۔ سیرت کی کتابوں میں ہے کہ بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے چند سال پہلے ایک دفعہ مکہ میں سیلاب آیا جس سے کعبے کی دیواریں منہدم ہو گئیں۔ اس سیلاب میں ایک رومی تاجر باقوم کا جہاز جو مصر سے آ رہا تھا، ٹوٹ گیا اور سمندر کی موجوں نے اسے ساحل پر پھینک دیا۔ مکے والوں نے کعبے کی بنیادیں بھرنے کے لیے اس جہاز کی لکڑی خرید لی اور ایک قبطی نجار سے جو مکے میں مقیم تھا، اس کام میں تعاون چاہا۔ اس قبطی نے مکہ والوں کے لیے کام کرنے اور باقوم کا ہاتھ بٹانے کی حامی بھر لی۔ مصر کا صرف ایک یہی قبطی نہ تھا جو بلد حرام میں رہتا تھا بلکہ اور بھی کچھ مصری وہاں آباد تھے۔ ان تعلقات کی وجہ سے عربوں کو مصر کے متعلق بہت سی باتیں معلوم تھیں اور قرآن مجید نے بھی اکثر موقعوں پر اس ملک کا ذکر کر کے ان کی معلومات میں اضافہ کر دیا تھا۔ انہیں اپنے بھائی بندوں کی زبانی، جو بہ سلسلہ تجارت مصر آتے جاتے رہتے تھے، مصر کے عظیم دریا، زرخیز زمین، سرسبز کھیتوں اور کثیر پیداوار کا حال پہلے ہی سے معلوم تھا، لیکن جب قرآن نے حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات بیان کیے تو ان سنی سنائی باتوں کی تصدیق کے علاوہ بہت سی نئی چیزیں بھی ان کے علم میں آ گئیں۔ اللہ تعالیٰ فرعون اور اس کی قوم کی غرقابی کا ذکر کرنے کے بعد سورۂ دخان میں فرماتا ہے:

﴿كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُونٍ وَّزُرُوعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيمٍ وَّنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ﴾ (الدخان: 25-27)

Marfat.com

ترجمہ: ''یہ لوگ کتنے باغ اور چشمے اور کھیت اور عمدہ مکانات اور آرام کے سامان جن میں مزے اڑاتے تھے، چھوڑ مرے۔''

پھر سورۂ زخرف میں فرماتا ہے:

﴿ وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ (الزخرف:51)

ترجمہ: ''اور فرعون نے اپنے لوگوں میں یہ منادی کرائی: لوگو! کیا مصر کا بادشاہ میں نہیں ہوں اور یہ نہریں میرے (محل کے) نیچے بہہ رہی ہیں؟ کیا تم کو سوجھتا نہیں۔''

اس کے بعد سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَيْرٌ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ﴾ (البقرہ:61)

ترجمہ: ''جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم سے ایک کھانے پر کبھی صبر نہ ہو سکے گا۔ تو اپنے مالک سے دعا کر! ہمارے لیے زمین کی پیداوار نکالے۔ ساگ اور ککڑی اور گیہوں (یا لہسن) اور مسور اور پیاز۔ موسیٰ نے کہا تم بڑھیا چیز کے بدلے گھٹیا لینا چاہتے ہو۔ (اور اچھا تو خیر تم ایسا کرو) مصر میں اتر پڑو، وہاں جو تم مانگتے ہو وہ تم کو ملے گا۔''

دوسری جگہ قرآن نے مصر کے محلوں اور اس کے آثار کا ذکر اور مصر کی تاریخ اور مصریوں کے عقائد و عبادات کی طرف اشارے کیے ہیں۔ یہ اور مصر سے متعلق اسی قسم کی دوسری روایات، حضرت ابراہیم، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ اور دوسرے پیغمبروں علیہم السلام کے حالات کے ضمن میں نازل کی گئیں، جن سے مسلمانوں کے ذہن میں مصر کے طبیعی جغرافیے کی ایک تصویر کھنچ گئی اور عہد عتیق سے لے کر اس وقت تک مصری تاریخ ان کی نگاہوں کے سامنے آگئی۔ قرآن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ دہرایا اور مسلمانوں کے حافظے میں ابن عمران کی زندگی کے تمام واقعات تازہ ہو گئے فرعون نے اپنے پریشان خوابوں کی تعبیر دینے والوں کی ہدایت کے مطابق تمام ملک میں فرمان جاری کر دیا کہ جس گھر میں لڑکا پیدا ہو قتل کر دیا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کی والدہ نے اپنے شیر خوار جگر گوشے کو دریائے نیل میں بہا دیا۔ فرعون کے گھر والوں کی نظر پڑی

تو بچے کو دریا سے نکال لیا اور پالنے پوسنے لگے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جوان ہوئے تو بنی اسرائیل کے ایک شخص کی حمایت کرتے ہوئے ایک مصری کو مکا مار کر ہلاک کر دیا۔ مصریوں کے خوف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین چلے گئے اور وہاں کے سردار کی بیٹی سے شادی کر لی۔ دس برس اس سردار کی خدمت کرنے کے بعد طور کی راہ مصر روانہ ہوئے۔ وادیٔ ایمن میں ان کے رب نے انہیں پکارا اور رسالت تفویض فرما دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام، فرعون کے پاس پہنچے اور اسے اللہ کی طرف بلایا۔ فرعون کی رگ غرور پھڑکی اور اس نے اپنی قوم سے کہا: "اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی " "میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں!" پھر اپنے وزیر سے کہنے لگا:

﴿یٰهَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۙ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤی اِلٰهِ مُوْسٰی وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ﴾ (المؤمن:36۔37)

ترجمہ: "اے ہامان! میرے لیے ایک محل تیار کر! شاید میں ان رستوں تک جا پہنچوں جو آسمان کے رستے ہیں، پھر موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھوں اور میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے معجزات دکھائے جن کے جواب میں فرعون نے جادوگروں کو طلب کیا، لیکن جادوگروں نے جب یہ دیکھا کہ عصائے موسوی ان کے تمام ساحرانہ کمالات کو نگل گیا تو وہ سب کے سب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور ان کی دیکھا دیکھی بنی اسرائیل بھی ساتھ ہو گئے، فرعون نے محسوس کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے متبعین ان کی سلطنت میں فساد برپا کریں گے، اس لیے وہ ان کی جان کے درپے ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر ارض معاد کی طرف چلے، فرعون نے ان کا تعاقب کیا، لیکن اللہ نے اس کے لشکر سمیت اسے دریا میں غرق کر دیا اور وہ باغ، چشمے، کھیت، عمدہ مکانات اور عیش و راحت کے سامان چھوڑ کر، جن میں وہ اور اس کے ہم قوم مزے اڑاتے تھے، ہلاک ہو گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے نے عربوں کو مصر کی وہ نعمت و ثروت یاد دلائی جس کا بیشتر حصہ غیر ملکی حکام ہڑپ کر جاتے تھے۔ عزیز مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدا اور اس کی بیوی نے انہیں بڑی عزت و تکریم کے ساتھ رکھا۔ غالباً اس لیے کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے ملک کے لیے مفید سمجھ رہی تھی یا شاید اس لیے کہ آگے چل کر انہیں اپنا بیٹا قرار دلانا چاہتی تھی، لیکن جب حضرت یوسف علیہ السلام

Marfat.com

جوان ہوئے اور شباب نے ان کے حسن میں نکھار پیدا کیا تو عزیز مصر کی بیوی خود ان کی محبت میں گرفتار ہوگئی:

﴿وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا اِنَّا لَنَرٰهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَا اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ﴾ (یوسف:30-32)

ترجمہ: ''اور شہر میں عورتوں نے کہنا شروع کیا کہ عزیز کی بیوی غلام کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتی ہے اور اس کی محبت اس کے دل میں گھر کر گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ صریح گمراہی میں ہے۔ جب اس نے ان عورتوں کی چال سنی تو ان کو بلوا بھیجا اور ان کے لیے کھانا تیار کیا اور ہر ایک کو ایک چھری دی اور یوسف ؑ سے کہا کہ ان کے سامنے باہر آؤ۔ جب عورتوں نے دیکھا، اسے بہت بڑا سمجھا اور اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور بے اختیار بول اٹھیں کہ سبحان اللہ! یہ آدمی نہیں، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔ تب عزیز کی عورت نے کہا یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے طعنے دیتی تھیں اور بے شک میں نے اس کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا مگر یہ بچا رہا اور اگر یہ وہ کام نہ کرے گا جو میں اس سے کہتی ہوں تو قید کر دیا جائے گا اور ذلیل ہوگا۔''

حضرت یوسف علیہ السلام اپنے انکار پر قائم رہے اور قید کر دیئے گئے۔ جن عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے انہیں عزیز کی بیوی کے اس فعل میں کوئی ایسی بات نظر نہ آئی جس پر اسے ملامت کی جا سکتی۔ حضرت یوسف علیہ السلام چند برس قید خانے میں رہے اور وہاں سے اس وقت نکلے جب بادشاہ کے اس خواب کی تعبیر بیان کی جس میں اس نے دیکھا تھا کہ سات موٹی گایوں کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات خوشے سبز ہیں اور سات خشک، اور کہا:

﴿قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا

فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ... فَمَا حَصَدْتُّمْ ... مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِیْهِ یُغَاثُ النَّاسُ وَ فِیْهِ یَعْصِرُوْنَ ﴾(یوسف:47-49)

ترجمہ: ''تم لوگ سات سال تک متواتر کھیتی کرتے رہو گے، تو جو غلہ کاٹو تھوڑے سے غلے کے سوا، جو کھانے میں آئے اسے خوشوں ہی میں رہنے دینا۔ پھر اس کے بعد سات سال سخت آئیں گے کہ جو غلہ تم نے جمع کر رکھا ہو گا سب کھالو گے، صرف وہی تھوڑا سا رہ جائے گا جو تم بااحتیاط رکھ چھوڑو گے پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں لوگوں کی فریاد سنی جائے گی اور اس میں وہ انگور بھی نچوڑیں گے۔''

بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے خزانوں کا امین بنادیا اور انہوں نے اتنی خوبی سے انتظام کیا کہ ملک میں پھر اسی سرسبزی و شادابی اور رونق و آسودگی کا دور دورہ ہو گیا۔ زمینیں پیداوار کے خزانے اُگلنے لگیں اور ساگ، ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز، جو اللہ نے چاہا ان میں پیدا ہونے لگا۔ حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہ قصے مصر کے طبیعی حالات اور اس کی مرفہ الحالی کے ایسے مرقعے ہیں، جن میں مصریوں کے عقائد و عبادات اور ان کے اخلاق و عادات، ان کی تاریخ اور ان کے ابتدائی طرز حکومت کے نقوش جھلکیاں مارتے ہیں۔ مصر کے حالات پر قرآن کریم نے جو روشنی ڈالی ہے اس کے بعض حصوں کا خلاصہ ہم اوپر پیش کر آئے ہیں۔ فطری بات تھی کہ صدر اول کے مسلمان مصر کے متعلق قرآن کے فرمودات کا تتبع کرتے اور یہ تتبع ان کے حافظے میں مصر کی تمام معلومات تازہ کر دیتا پھر یہود و نصاریٰ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کے معاملے میں باہم لڑتے جھگڑتے اور ان کے متعلق جو کچھ قرآن میں آیا ہے، اس پر مسلمانوں سے بحث و تکرار کرتے رہتے تھے جس سے ایک طرف تو مسلمانوں کے علم میں اضافہ ہوتا تھا اور دوسری طرف مصر پر ان کی نظر اور وسیع اور گہری ہوتی چلی جاتی تھی۔

مصر کے متعلق مسلمانوں کی معلومات صرف ابتدائی زمانے تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ وہ اپنے زمانے کے مصر کو اس کی قدیم تاریخ کے مقابلے میں کہیں زیادہ جانتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ایران و روم کے معاملات سے عربوں کو بطور خاص دلچسپی تھی یہاں تک کہ وہ دو گروہوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ ایک گروہ ایران کا طرفدار تھا اور دوسرے گروہ کی ہمدردیاں روم کے ساتھ تھیں۔ ساتویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں جب ایران نے روم پر غالب آ کر مصر و شام فتح کیے ہیں،

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ معبوث ہو چکے تھے۔ آپ کے دشمن ایرانیوں کے دوست تھے اور کہتے تھے کہ ''رومیوں نے شکست اس لیے کھائی ہے کہ وہ بھی مسلمانوں کی طرح اہل کتاب ہیں۔'' مسلمان پہلے ہی روم کے طرفدار تھے، لیکن ان کی طرفداری میں اس وقت اور بھی شدت پیدا ہوگئی، جب اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا:

﴿غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ﴾ (الروم:2-4)

ترجمہ: ''رومی مغلوب ہو گئے ہیں زمین کے قریب ترین حصے میں۔شام میں، اور وہ مغلوب ہونے کے بعد، چند برس میں غالب آجائیں گے۔''

فریقین، ان دونوں عظیم الشان سلطنتوں کے حالات کا مطالعہ کرتے رہے۔ ان کی باہمی معرکہ آرائیوں کی خبریں سنتے اور ان خبروں پر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے۔ مصر میں ایرانیوں اور رومیوں کی جنگ بہت دنوں تک جاری رہی۔ ایرانیوں نے 616ء میں مصر پر چڑھائی کی تھی، جہاں وہ نو برس تک قابض رہے، لیکن اس کے بعد ہرقل نے انہیں مصر وشام سے نکال دیا۔ اس تمام مدت میں مسلمانوں کی نگاہیں انہیں علاقوں پر لگی رہیں۔ انہیں یقین تھا، جیسا کہ اللہ نے اپنے نبی ﷺ پر وحی میں فرمایا ہے، رومی ایک نہ ایک دن ایرانیوں پر ضرور غالب آئیں گے۔ جس وقت اللہ کی بات پوری ہوئی اور ایرانی اپنے ملک میں دھکیل دیے گئے۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ ہجرت فرما چکے تھے اور مسلمانوں کے فوجی دستے مدینے کے گردونواح میں بھیجے جا رہے تھے۔ اس کے بعد جب حالات درست ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے کسریٰ، قیصر، حیرہ اور غسان کے بادشاہوں، جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی فرمانرواؤں اور حاکم مصر کے پاس اپنے ایلچی بھیجے اور ان سب کو اسلام کی دعوت دی۔

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ حاکم مصر مقوقس نے رسول اللہ ﷺ کے مکتوب مبارک کے جواب میں جو کچھ کہا تھا وہ تمام ملوک وامراء کے جواب سے بہتر اور دوستانہ تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کے ایلچی حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ خط بھیجا کہ میرے عقیدے میں بھی ایک نبی ظہور ہونے والا ہے مگر میرا خیال تھا کہ وہ شام میں ظاہر ہوگا، اور لکھا کہ اس نے ایلچی کے ساتھ عزت واکرام کا سلوک کیا ہے اور ان کے ہمراہ دو نوجوان لڑکیاں، ایک سفید رنگ کا خچر، ایک

گدھا، کچھ مال اور مصری مصنوعات نذرانے کے طور پر بھیجی ہیں۔[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں لڑکیوں میں سے حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو ذات رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص فرمالیا۔ ان کے بطن سے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ تولد ہوئے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی فرماتے تھے: ''قبطیوں کے ساتھ خوش سلوکی سے پیش آنے کا حکم مانو کہ تم پر ان کا حق ہے اور تم سے ان کا رشتہ!''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کو مقوقس کے پاس ایلچی بنا کر بھیجنا اور عین اسی وقت حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو عمان کی سفارت پر مامور کرنا، اس امر کا ثبوت ہے کہ حضرت حاطب رضی اللہ عنہ تجارت کے سلسلے میں اکثر و بیشتر مصر آتے جاتے رہتے تھے اور اس سے گمان ہوتا ہے کہ مصری زبان بھی یہ بخوبی جانتے تھے۔ اگر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کے

---

[1] ابن عبدالحکم نے ''مصر کی فتوحات اور حالات'' میں حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کی اس سفارت کا ذکر کیا ہے اور اس مکتوب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی عبارت، جو حضرت حاطب رضی اللہ عنہ، حاکم مصر کے پاس لے کر گئے تھے، یہ درج کی ہے۔ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عظیم القبط مقوقس کے نام۔ سلامتی ہو اس پر جو حق کی پیروی کرے۔ امابعد! میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر تم نے اسے قبول کرلیا تو تم بھی سلامت رہو گے اور اللہ اس کا دوگنا اجر ارزانی فرمائے گا۔ اے اہل کتاب! اس بات کی طرف آجاؤ جو ہم تم دونوں کے لیے یکساں طور پر مسلّم ہے اور وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے۔ گویا خدا کو چھوڑ کر اسے اپنا پروردگار بنالیا ہے۔ پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو کہہ دو! ہم (تو) خدا کے ماننے والے ہیں۔'' ابن عبدالحکم نے یہ بھی لکھا ہے کہ مقوقس نے ایک رات حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کو تخلیے میں بلا کر ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دریافت کیا اور جب حضرت حاطب رضی اللہ عنہ نے ذات رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات بیان کیں تو کہا: ''میں جانتا ہوں کہ ایک پیغمبر ابھی آنا باقی ہے لیکن میرا خیال تھا کہ وہ شام میں ظہور کرے گا۔ کیونکہ اس سے پہلے تمام پیغمبر وہیں مبعوث ہوئے ہیں۔ لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ وہ جہد و مصیبت کی سرزمین عرب میں ظاہر ہوا ہے۔ قبطی اس کی حلقہ بگوشی میں میرا ساتھ نہیں دیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ انہیں میری اور تمہاری گفتگو کا علم ہو۔ تمہارے پیغمبر کا اس ملک پر غلبہ ہوگا۔ اس کے ساتھی بعد کو ہمارے ان میدانوں میں اتریں گے اور ان پر غالب آئیں گے۔ لیکن میں قبطیوں سے اس کے متعلق ایک حرف نہ کہوں گا۔ تم اپنے دوست کے پاس واپس جاؤ!'' صبح مقوقس نے کاتب کو بلا کر عربی زبان میں یہ خط لکھوایا: ''عبداللہ کے بیٹے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عظیم القبط مقوقس کا سلام۔ امابعد! میں نے آپ کا خط پڑھا اور جو کچھ آپ نے اس میں تحریر فرمایا ہے، جس چیز کی طرف دعوت دی ہے اسے سمجھا۔ میں جانتا تھا کہ ایک پیغمبر ابھی آنا باقی ہے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ وہ مصر میں ظہور کرے گا۔ میں نے آپ کے قاصد کا احترام کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو لڑکیاں جو قبطیوں میں بڑے درجے اور حیثیت کی مالک ہیں اور سواری کے لیے ایک خچر ہدیۃً پیش کر رہا ہوں۔ والسلام!

Marfat.com

مقابلے میں مصر اور اس کی زبان سے زیادہ واقف ہوتے تو رسول اللہ ﷺ انہیں حضرت حاطب رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیتے اور مقوقس کے پاس انہیں کو ایلچی بنا کر بھیجتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مصر کے متعلق مسلمانوں کی معلومات خاصی وسیع ہو گئی تھیں، جس وقت حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے فتح مصر کا ذکر چھیڑا، مسلمان اس سے کئی سال پہلے عراق و شام فتح کر چکے تھے۔ ان دونوں ملکوں میں انہوں نے اقامت اختیار کر لی تھی اور یہاں کے باشندوں سے ان کا میل جول اچھا خاصا بڑھ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہرقل ایرانیوں کو مصر سے نکالے، ایرانی دس برس تک مصر پر حکومت کرتے رہے تھے اور انہیں اس کے قلعوں اور میدانوں، اس کی دولت اور تہذیب کے متعلق بہت کچھ واقفیت حاصل ہو گئی تھی، جس کا ذکر انہوں نے ان عربوں سے کیا، جن سے ایران میں اسلامی فتوحات کے بعد ان کے تعلقات قائم ہوئے۔ مصر و شام کا رشتہ، ایران و مصر کے رشتے سے بھی قوی تھا اس لیے کہ یہ دونوں ملک رومیوں کے زیر اقتدار تھے اور اس لیے کہ اہل شام کا تجارت کے سلسلے میں اکثر مصر آنا جانا رہتا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اہل شام سے بھی مصر کے متعلق بہت سی معلومات حاصل کیں اور اس طرح جب حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ سے فتح مصر کی گفتگو چھیڑی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور دوسرے بہت سے مسلمانوں کے ذہن میں مصر کی واضح تصویر موجود تھی۔

یہ تصویر بڑی دلکش تھی۔ مصر کی شادابی و زرخیزی تمام دنیا میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی تھی۔ گیہوں، جو اور اسی قسم کا دوسرا غلہ جو مصریوں کی ضرورت سے بچ رہتا تھا، رومی سلطنت کا پیٹ پالتا تھا۔ غلے کے علاوہ بھی مصر میں کھانے پینے کی بے شمار چیزیں تھیں اور قیمتی پتھروں اور کانوں کے ذخیرے کے اعتبار سے بھی وہ بے اندازہ دولت کا مالک تھا۔ باوجودیکہ مصر، رومی سلطنت کا محکوم تھا اور قیصر روم کے زمانے میں ایرانیوں نے اسے بری طرح پامال کیا تھا، پھر بھی اس کی اہمیت میں کوئی فرق نہ آیا اور وہ علیٰ حالہ دنیا کا سب سے بڑا مرکزی مقام رہا جس میں علم و فن، صنعت و زراعت اور تجارت کے اجتماع نے رونق و ترقی کی ایک ایسی شان پیدا کر دی تھی جو نگاہوں کو لبھاتی اور دلوں کو رجھاتی تھی۔ مصر کے دارالسلطنت اسکندریہ نے اپنی وہ تمام تازگی اور دل فریبی محفوظ رکھی جو سکندر مقدونی نے اس کی تعمیر میں صرف کی تھی اور جس میں دس صدیوں کے امتداد نے عظمت و جلال کا ایک ایسا دل فریب و نظر نواز رنگ بھر دیا تھا کہ دنیا کے ہر حصے سے لوگ بے اختیار اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ اس کی آبادی لاکھوں سے متجاوز تھی اور وہاں

اس زمانے کی تمام مشہور نسلوں اور مختلف عقیدوں کے لوگ آباد تھے۔ اسکندریہ میں خالص مصریوں کی آبادی نصف سے زیادہ نہ تھی باقی نصف آبادی میں رومی، یونانی، فینیقی اور عرب وغیرہ تھے۔ ان میں کچھ ایسے تھے جن کا مذہب یہودی تھا اور کچھ ایسے جو مسیحیت پر ایمان رکھتے تھے اور یہ سب کے سب اس سحر کار شہر کی فضا میں، عظمت و آسودگی کے زیر سایہ سکون و اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے اور اس کی عظمت بھی کیسی عظمت، اس کا جلال بھی کیسا جلال تھا! اس کا بڑا مینار، منارۂ فاروس، دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک تھا۔ وہاں بڑی بڑی عبادت گاہیں، فنون کے وسیع سے وسیع تر میدان، عالیشان عمارتیں، عام تفریح گاہیں اور حمام اتنے تھے کہ ان کا شمار نہیں ہوسکتا اور ان کی دل کشی کا یہ عالم تھا کہ مہذب سے مہذب اور ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ شہروں سے آنے والے سیاح بھی انہیں دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ اسکندریہ کے بازار دنیا کے تمام بازاروں سے بڑے اور ان کی چہل پہل دنیا کی ہر چہل پہل سے بڑھ کے تھی۔ وہاں گیہوں، ریشم، کاغذ اور شیشے کے علاوہ مصر کی پیداوار و مصنوعات کی بہت بڑی تجارت ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ بلاد نوبہ اور حبش سے سونے اور ہاتھی دانت کا بے انتہا سامان وہاں لایا جاتا تھا۔ ہندوستان و چین کے سمندروں سے روئی، ریشم، چاندی اور جواہرات وغیرہ پہلے بحیرہ قلزم آتے تھے اور وہاں سے اس نہر کے ذریعے نیل میں منتقل کیے جاتے تھے جو بحیرہ قلزم کو دریائے نیل سے ملاتی تھی اور اس کے بعد اس عظیم الشان دریا کے اوپر اوپر بہتی ہوئی اسکندریہ پہنچ جاتی تھی۔

اسکندریہ کی اس لمبی چوڑی تجارت کو دیکھتے ہوئے کوئی تعجب نہیں اگر اس کی بندرگاہ، دنیا کی تمام بندرگاہوں سے بڑی ہو اور جہاز سازی کی صنعت اس کی سب سے بڑی صنعت۔ اسکندریہ کی بندرگاہ اتنی چوڑی تھی کہ اس میں مختلف حجم کے بارہ ہزار جہاز بیک وقت سما جاتے تھے اور جہاز سازی کا کام وہاں روزانہ ہوتا تھا۔ جہاز بنانے کے لیے لکڑی شام سے آتی تھی مصر میں ایک بڑی مضبوط قسم کی سن پیدا ہوتی تھی جسے ''دقس'' کہتے تھے۔ اس سے جہازوں کی رسیاں بٹی اور اس کے بادبان بنے جاتے تھے۔ اسکندریہ میں تجارتی جہازوں کی طرح جنگی جہاز بھی تیار کیے جاتے تھے۔ جنگی جہاز بڑے اور چھوٹے دو قسم کے بنائے جاتے تھے، بڑے جہاز میں ایک ہزار سپاہیوں کی گنجائش ہوتی تھی اور چھوٹے جہاز میں سو آدمی آتے تھے۔ ان جہازوں میں جو آلات نصب کیے جاتے تھے وہ افریقی شعلوں کا مینہ برساتے تھے۔ یہ شعلے بڑے ہلاکت آفریں ہوتے تھے۔ ان کا مسالا اتنی جلد اور اتنی تیزی سے بھڑکتا تھا کہ اس کا بجھانا ناممکن ہو جاتا تھا اور اس میں ہلاکت

Marfat.com

بازی اور آتش زنی کی ایسی قوت ہوتی تھی کہ عمارتیں جل کے راکھ ہو جاتی تھیں اور دل خوف و دہشت سے دہل دہل جاتے تھے۔ بعض بڑے جہازوں میں منزلیں اتنی اونچی ہوتی تھیں کہ جب یہ جہاز کسی مسلح شہر کے قریب پہنچتے تھے تو ان کا بالائی حصہ بلندی میں شہر کی فصیلوں سے جاملتا تھا اور جہاز کے سپاہی مدافعین شہر کے ہم سطح ہو جاتے تھے۔ اب اگر وہ چاہتے تو جہاز سے چھلانگ لگا کر فصیلوں پر پہنچ جاتے، ورنہ جہازوں کی منزلوں اور فصیلوں کے درمیان پل باندھ کر اسے عبور کر لیتے۔

اسکندریہ میں بنائے جانے والے بعض تجارتی جہاز اتنے بڑے ہوتے تھے کہ ایک جہاز میں بہ وقت چار ہزار اردب [1] گیہوں لادا جا سکتا تھا۔ یہ تجارتی جہاز اکثر بحر قلزم سے گزر کر یہ جزیرہ نمائے عرب کی بندرگاہوں میں لنگر انداز ہوتے تھے اور مصر کی بنائی ہوئی یا کہیں اور سے مصر آئی ہوئی تجارتی اشیاء وہاں اتار کر حجاز و یمن کے متمدن عربوں کے سامنے ان مصریوں کی زندگی کا ایک دلپذیر مرقع پیش کرتے تھے، جن کی لگاتار محنت اور مسلسل کوشش ہی ان کا قومی امتیاز تھی۔

یہ صنعتی و تجارتی فروغ ہی تنہا وہ خصوصیت نہ تھی جس نے اسکندریہ کو دنیا کے تمام شہروں سے ممتاز کر رکھا تھا بلکہ اسکندر اعظم کے اسے آباد کرنے اور بطالسہ کے اس میں قیام پذیر ہونے سے عربوں کی فتح تک یہ شہر دنیا بھر میں عقلی و علمی ارتقا کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ صحیح ہے کہ یہ ارتقاء کبھی رک جاتا تھا، کبھی اس میں حرکت پیدا ہو جاتی تھی اور کچھ دور...... بالخصوص مصر پر رومیوں کی حکومت کا دور...... ایسے بھی گزرے ہیں جن میں بعض دوسرے شہر بھی ان خصوصیات کے اعتبار سے اسکندریہ کے شریک و سہیم بن گئے تھے تاہم مصر کا یہ دارالسلطنت ہمیشہ ان ترقیوں کا مرجع رہا ہے اور یہاں کے عالموں، شاعروں، مصنفوں اور فنکاروں نے مسلسل دس صدیوں تک دنیا کی عقلی زندگی کو سنوارا اور نکھارا ہے۔ یہ فضیلت اسی شہر کے باشندوں کو حاصل ہے کہ انہوں نے یونانی تہذیب کی نشر و اشاعت میں، جو اسکندریہ کے آباد ہونے سے پہلے معرض وجود میں آچکی تھی اپنی قوتیں صرف کیں، نئے نئے مذاہب فکر قائم کیے، جن میں سے بعض یونانی مذاہب فکر سے رشتہ بہ دامن تھے، بعض ان سے بالکل مختلف تھے اور بعض ان دونوں سے الگ اپنا ایک مستقل وجود رکھتے تھے اور اس میں تعجب کی کوئی بات بھی نہیں جبکہ اسکندریہ ہر قوم اور ہر ملت کے علماء

1۔ اردب: غلہ ناپنے کا ایک بڑا پیمانہ قبطی الاصل ہے۔ (لغات جدیدہ از مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم)

Marfat.com

ماہرین فن وادب کا ملجا و ماویٰ تھا اور وہاں عام کتب خانوں، مدرسوں اور علم کے سرچشموں کی اتنی بہتات تھی جو کہیں اور نظر نہیں آتی۔ اسکندریہ کا طبی مدرسہ اتنا عظیم الشان تھا کہ دنیا کا اور کوئی مدرسہ اس کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا، جو اطباء اس مدرسے میں تعلیم پاتے تھے ان کی قابلیت مسلم ہوتی تھی اور وہ دنیا جہان میں جہاں کہیں جاتے تھے، عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے، اسی طرح وہاں فقہ و الٰہیات کی تعلیم کا بھی بہت چرچا تھا اور اس کا اثر ان فلسفیانہ مذاہب میں نمایاں تھا، جن کے لیے اسکندریہ کا مدرسہ مخصوص تھا اور جو مسیحیت کو، جس کی اساس روحانیت پر تھی، یونان کے ان فلسفیانہ مذاہب سے ملا دینا چاہتے تھے جن کا مدار محض عقلی منطق پر تھا۔ اس عہد میں فقہ کا یہ چرچا بھی اس مذہبی نزاع کو قوت پہنچانے کا ایک ذریعہ تھا جس نے مصر کو کئی بار اٹھایا بٹھایا اور اسے رومیوں کے مقابلے پر لا کھڑا کیا۔ یہاں تک کہ عربوں کے مصر فتح کرنے سے ذرا پہلے مصریوں اور رومیوں کا یہ جھگڑا نہایت نازک صورت اختیار کر گیا۔ اسکندریہ کے مدرسوں میں فلکیات، ریاضیات، تقویم بلدان اور ہندسہ وغیرہ کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہاں کے علماء نے بہت سی کتابیں لکھیں، جن کا اب صرف تاریخوں میں ذکر ہی پایا جاتا ہے، اس کے علاوہ اسکندریہ کے ادیب اور مصنف شعر و شاعری کے بڑے رسیا تھے اور یہ مذاق اتنا عام تھا کہ علماء بھی اپنے افکار نظم کر دیا کرتے تھے۔

علوم و ادبیات کی اس مقبولیت کے پیش نظر، فنون کی گرم بازاری اور اہل فن کی ذہانت و قابلیت ایک لازمی چیز تھی۔ اس لیے اگر اسکندریہ والوں کی شہری زندگی اور جوش عمل میں اس کے آثار جھلکتے ہوں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ فراعنہ متقدمین کے زمانے سے مصر کے مہندس (انجینئر) مشہور تھے۔ اس لیے اس مسیحی عہد کے فن تعمیر میں قدیم عبادت گاہوں کے جلال اور یونانی فن تعمیر کی دل فریبی کا امتزاج بالکل فطری تھا اور سچ یہ ہے کہ اسکندریہ کی تشکیل و تعمیر ایسے حسین انداز میں کی گئی تھی کہ نگاہیں اس پر رکتی تھیں اور دل اس کی طرف کھنچتے تھے۔ اسکندریہ کا نقشہ شطرنج کی بساط کے طرز پر بنایا گیا تھا۔ آٹھ سڑکیں مشرق سے مغرب کو جاتی تھیں، جنہیں شمال سے جنوب کو آنے والی آٹھ سڑکیں قطع کرتی تھیں۔ بیچ کی دو شاہراہیں بڑی کشادہ تھیں جن کے دونوں طرف شہر کی بہترین عمارتیں دعوت نظارہ دیتی تھیں۔ شہر کی فصیلیں، قلعے، محل اور کلیسا برق تاب سنگ مرمر کے بنے ہوئے تھے۔ جنہیں دیکھ کر آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو جاتی تھی ان

Marfat.com

میں سے اکثر عمارتوں کے بیرونی حصے پر دن کے وقت مصر کے بنے ہوئے سبز پردے ڈال دیے جاتے تھے۔ یہ ہے اس عہد کے مصری دارالسلطنت کی تصویر، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکندریہ کے رہنے والے کتنے آسودہ حال تھے اور تہذیب میں ان کا درجہ کتنا بلند تھا۔ علم وثقافت کا جو وافر سرمایہ اس شہر میں جمع ہوگیا تھا اس کے اعتبار سے دنیا کے کسی ملک کا کوئی دارالسلطنت ان دنوں اس کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ وہاں مذہبی اور فلسفیانہ عقائد کا اختلاف لفظی بحث اور نزاع کے دائرے میں رہا تھا اور ان ادوار سے قطع نظر، جن میں اباطرہ نے اپنا مذہب مصریوں پر زبردستی مسلط کرنا چاہا۔ کبھی شدت وسنگدلی کی حد تک نہ پہنچا تھا۔ بہت ہوا تو زبانی بحث وتکرار نے مختلف المذاہب افراد کے درمیان ملامت اور دشنام کی صورت اختیار کرلی اور بس! ایپکوری فلسفی لوگوں کو مادی عیش وآرام کی طرف بلاتے اور انہیں زندگی کے لذائذ سے لطف اندوز ہونے کی تلقین کرتے تھے، لیکن اس لذت پرستی کے باوجود وہ زندگی کو ایک خوشگوار دل لگی اور ایک زہریلی راحت سے زیادہ حیثیت نہ دیتے تھے۔ رواقی ایپکوریوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور انسان کو دنیاوی راحتوں سے کنارہ کش رہنے کی دعوت دیتے تھے کہ وہ عقل کو تباہ اور روح کی پاکیزگی کو غارت کردیتی ہیں اور مسیحی پاکباز تمدن کی پالغز سے بچ کر اپنے آس پاس کے کسی ویرانے میں کنج عافیت تلاش کرتے تھے، جہاں ان کی روح کو سکون اور ان کے دل کو اطمینان میسر آسکے، لیکن مذہبی جبر واستبداد کے دنوں میں معاملہ بالکل الٹ جاتا تھا۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عیش وراحت کا گہوارہ اسکندریہ ان شورشوں اور ہنگاموں کا اکھاڑا بن گیا جنہوں نے شہر کی پرسکون فضا کو برہم کردیا اور اس میں ہر طرف ایک بے چینی، ایک انارکی پھیلادی۔

جس وقت ابن عاص رضی اللہ عنہ نے خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ کو فتح مصر کے آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے، مصر اور اس کے دارالسلطنت میں مذہبی مظالم کی بھٹیاں سلگ رہی تھیں جس کا سبب یہ تھا کہ ہرقل نے ایرانیوں پر فتح پانے اور بیت المقدس میں صلیب بلند کرنے کے بعد جب یہ دیکھا کہ مسیحیت کو رنج وہلاکت کے بھنور سے نکالنے کے لیے تمام مسیحی دنیا کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی ہیں، تو اسی وقت اس سوچ میں پڑ گیا کہ مسیحیت کے مختلف عقائد کو ایک مذہب میں سمودیا جائے۔ اس مسئلے میں اس نے شام اور بزنطیہ کے بطریقوں سے گفتگو کی جو مختلف مسیحی فرقوں کی نمائندگی کرتے تھے اور انہیں خلقدونیہ کے اجتماع میں شرکت کی دعوت دی جہاں ان سب نے مل کر "ایک مسیحی مذہب" کی ضرورت واہمیت کو تسلیم کرلیا۔ اب ہرقل نے اسکندریہ کی مذہبی پیشوائی،

قیرس کے سپرد کردی جو کوہ قاف میں فاسیس کا اسقف تھا اور اس سے کہا کہ اہل مصر کو سرکاری مذہب کا حلقہ بگوش بنائے۔ لیکن ہرقل کی ذہانت اس نکتے کو نہ پاسکی کہ جس مذہب کے ذریعے وہ عیسائیوں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ مصری کلیسا اسے قبول نہیں کرے گا اور اس کی نگاہ اس حقیقت تک نہ پہنچ سکی کہ اہل مصر کے انکار و گریز کی صورت میں اگر اس نے سرکاری مذہب کا کڑوا نوالہ زبردستی ان کے حلق میں ٹھونسنا چاہا تو اس کے بڑے خطرناک نتائج برآمد ہوں گے۔ بہر حال مصر و شام میں ہرقل نے یہی طرزِ عمل اختیار کیا اور یہی اس وقت اس کی سمجھ میں آیا کہ مذہبی معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینا اور لوگوں کو کسی ایک عقیدے پر متحد کرنا، حکومت کے فرائض میں سے ہے۔ [1]

اس زمانے میں مصر کے قبطیوں کا سب سے بڑا اسقف بنیامین [2] تھا جس کے لیے عوام کے دلوں میں بڑی محبت و عزت تھی۔ وہ ایک عقلمند انسان تھا، نیکی اور بھلائی کا عاشق اور کینہ وغرور کے مارے ہوئے پادریوں کا جانی دشمن۔ وہ اس مذہب عیسوی کے حق میں بڑا شدید التعصب تھا جس پر مصری عوام ایمان رکھتے تھے۔ یہ مذہب یعقوبی فرقے کا مذہب تھا جو کہتا تھا کہ ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں الوہیت و بشریت دونوں جمع ہوگئی تھیں۔ جسمانی صورت اختیار کرتے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طبیعتیں دو تھیں۔ لیکن اس کے بعد ایک ہوگئیں۔'' یہ عقیدہ اس ملکانی فرقے کے عقیدے سے مختلف تھا جس کا کہنا تھا کہ ''بیٹا ازل میں باپ سے پیدا ہوا تھا اور جوہر و نور ہونے کے اعتبار سے غیر مخلوق تھا۔ بعد کو یہی بیٹا اس انسان سے مل کر، جو حضرت مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا ہوا، ایک ہوگیا اور اس کا نام مسیح علیہ السلام رکھا گیا۔'' 631ء کے موسم گرما میں جب قیرس اہل مصر کو سرکاری مذہب کا پیرو بنانے کے لیے اسکندریہ پہنچا تو بنیامین وہاں سے فرار ہوگیا اور ریگستان میں پھیلے ہوئے گرجوں میں پناہ تلاش کرتا ہوا قوص پہنچ گیا، وہاں اس نے قوص کے قریب صحرا میں ایک چھوٹا سا گرجا بنالیا جو چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا، اس لیے اس تک پہنچنا بہت دشوار تھا۔ بنیامین کا فرار ایک خطرہ تھا جس نے قبطیوں کو پریشان اور پادریوں کو خوف زدہ کردیا نئے مذہب کی اس دعوت و تبلیغ کو انہوں نے انتہائی کفر پر محمول کیا اور قیرس کے اس نمائشی طرزِ عمل کا بھی کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا جو اس نے مصر پہنچنے کے بعد شروع شروع میں اختیار کیا تھا اور جس سے اس کی مراد اہل مصر کو یہ اطمینان دلانا تھا کہ وہ قوت کے بل بر اس مذہب

[1] ''مصر میں عربوں کی فتوحات'' مصنف الفریڈ بٹلر، مترجم فرید ابو حدید۔ ص155

[2] بعض مؤرخین عرب نے اس کا نام ''ابومیامین'' لکھا ہے۔

کو مسلط کرنا نہیں چاہتا، بلکہ دلیل و حجت کے ذریعے اس کی اشاعت چاہتا ہے۔ قبطیوں نے عام اس سے کہ وہ یعقوبی ہوں یا ملکانی...... متفقہ طور پر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی تبلیغ و اشاعت کو ایک ایسی بدعت قرار دیا جو سراسر گمراہی تھی۔ اس بدعت کے خلاف عوام کی نفرت اس وقت اور بڑھ گئی جب صفرنیوس، بیت المقدس سے مصر آیا اور وہاں ملکانیوں کا پیشوا بن بیٹھا۔ اس کے بعد جب قیرس نے اسکندریہ میں ایک مذہبی اجتماع منعقد کیا اور ارکان مجلس کو اس نئے مذہب پر بحث و گفتگو کی دعوت دی تو صفرنیوس نے کبھی دلیلیں دے کر، کبھی خوشامد کر کے قیرس کو اپنے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی اور قیرس نے یہ دیکھ کر کہ مصری قوم اس کی دعوت سے اسی طرح نفرت اور عداوت کرتی رہے گی، فیصلہ کر لیا کہ اپنی بات منوانے کے لیے اب وہ ظلم و تشدد کی راہ اختیار کرے گا۔

قیرس نے ظلم و تشدد کا سہارا لیا اور پورے دس برس تک مصر کو جبر و استبداد کی چکی میں پیتا رہا۔ اس کی سزائیں اتنی ہولناک اور وحشیانہ تھیں کہ کسی زمانے میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ بنیامین کے بڑے بھائی کو سزا دینے کے لیے یہ بہیمانہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ اس کے جسم پر جلتی ہوئی مشعلیں رکھ دی گئیں۔ یہاں تک کہ اس کے دونوں پہلوؤں سے چربی پگھل پگھل کر زمین پر بہنے لگی اور جب اس کے بعد بھی اس کا ایمان متزلزل نہ ہوا تو اس کی بتیسی اکھڑوا دی گئی، اسے ریت کی بوری میں بند کر کے ساحل پر لے جایا گیا۔ وہاں اس سے کہا گیا کہ اگر وہ نیا مذہب قبول کر لے تو اس کی جان بخش دی جائے گی، لیکن اس نے انکار کر دیا۔ تین بار یہ پیش کش کی گئی اور تینوں بار اس نے ٹھکرا دی۔ آخر کار اسے سمندر میں پھینک دیا گیا، جہاں وہ ڈوب کر مر گیا۔ صموئیل پادری کے پاس اس کے ریگستانی گرجا میں ایک خط بھیجا گیا، جس میں اسے نیا مذہب قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ خط ایک فوجی افسر لے کر گیا تھا، جس کے ساتھ سو سپاہی بھی تھے۔ صموئیل نے وہ خط چاک کر دیا اور کہا: "ہمارا سردار بنیامین کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ خدا کی لعنت ہو ان کافروں کے اس خط پر، جو رومی سلطنت کی طرف سے مسلط کیے گئے ہیں! خدا کی لعنت ہو خلقیدونی اجتماع اور ان لوگوں پر، جنہوں نے اس اجتماع کی تجویزوں سے اتفاق کیا ہے۔"

اس جرم پر صموئیل کو اتنا مارا گیا کہ گمان ہوتا تھا، مر گیا لیکن وہ پھر تندرست ہو کر قیرس کی مخالفت کرنے لگا۔ قیرس نے حکم دیا کہ اس کی مشکیں کس کر اور گلے میں لوہے کا طوق ڈال کر

Marfat.com

ہمارے حضور پیش کیا جائے اور صموئیل یہ کہتا ہوا خوشی خوشی ان کے ساتھ ہولیا۔ ''اگر خدا نے چاہا تو آج مجھے شہادت نصیب ہوگی۔ اس لیے کہ مسیح علیہ السلام کی راہ میں میرا خون بہایا جائے گا۔'' اس کے بعد اس نے بے دھڑک قیرس کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ جب اسے قیرس کے حضور پیش کیا گیا تو قیرس نے فوجیوں کو حکم دے کر اسے پٹوایا۔ یہاں تک کہ اس کے جسم سے خون بہنے لگا۔ اس کے بعد قیرس نے اس سے کہا: ''صموئیل! او بد بخت زاہد! تجھے گرجا کا رئیس کس نے بنایا ہے؟ اور یہ حکم کس نے دیا ہے کہ تو راہبوں کو مجھے برا بھلا کہنے اور میرے مذہب میں کیڑے ڈالنے کا سبق سکھائے؟'' صموئیل نے جواب دیا: ''نیکی، اللہ اور اس کے ولی ''بطریق بنیامین'' کی اطاعت میں ہے نہ کہ اے ابلیس کی اولاد! اور اے بے ایمان دجال! تیری اور تیرے شیطانی مذہب کی اطاعت میں!'' قیرس نے حکم دیا کہ صموئیل کے منہ پر مکے مارے جائیں اور اس سے کہا: ''صموئیل! تجھے غلط فہمی ہے کہ تیرے راہب تجھے محترم سمجھیں گے اور تیری پاکدامنی کے گن گائیں گے۔ اسی لیے تجھ میں اتنی جرأت پیدا ہوئی ہے، لیکن میں تجھے بتاؤں گا کہ بڑے آدمیوں کو گالیاں دینے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس وقت تیرا دل تجھ سے سوال کرے گا کہ تو نے سرزمین مصر کے حاکموں اور مذہبی پیشواؤں کا احترام کیوں نہیں کیا؟''

پادری نے جواب دیا: ''ابلیس بھی پہلے ملائکہ کا سردار تھا لیکن اس کے تکبر و طغیان نے اسے اللہ کا حکم ماننے سے روک دیا اور یہی حال تیرا ہے اے خلقیدونی مکار! تیرا مذہب مذموم ہے اور تو شیطان اور اس کے لشکر سے بھی زیادہ لعنت کا مستحق ہے!'' قیرس، صموئیل کے اس جواب سے بھڑک اٹھا اور اس نے فوج کو اس کے قتل کا اشارہ کیا۔ لیکن فیوم کے حاکم نے اس کی جان بخشی کرا دی اور اسے سرزمین مصر سے نکال باہر کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ بنیامین کے بھائی اور صموئیل کی یہ سزائیں، دو آئینے ہیں جن میں قیرس کی سفاکیوں کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ جو لوگ نیا مذہب قبول کرنے سے انکار کرتے تھے، انہیں کوڑے لگوائے جاتے تھے، ہولناک سزائیں دی جاتی تھیں اور قید خانے کی تاریک قبروں میں پھینک دیا جاتا، جہاں موت ہی آ کر انہیں اس عذاب سے نجات دلاتی تھی۔ یہ اسی ظلم و تشدد کا نتیجہ تھا کہ ہرقل اور قیرس کی طرف سے عوام کے دلوں میں روز بروز نفرت بیٹھتی گئی، یہاں تک کہ بہت سے لوگ اپنا ایمان بچا کر بلاد نوبہ اور حبش کی طرف ہجرت کر گئے۔ جو لوگ بھاگنے کی سکت نہ رکھتے تھے اور نہ ان میں سختیاں جھیلنے کی ہمت تھی انہوں نے بادل نخواستہ اپنا مذہب چھوڑ دیا اور دکھاوے کے لیے سرکاری مذہب میں داخل ہو گئے۔ کچھ

Marfat.com

ایسے بھی تھے جنہوں نے دولت ومنصب کے لالچ میں آ کر نئے مذہب کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اس لیے نہیں کہ انہیں اس مذہب سے محبت تھی یا وہ اس پر ایمان رکھتے تھے، بلکہ اس لیے کہ وہ اسے دینوی راحت وآسائش کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ تاہم ان دس برس کی مدت میں مصریوں کو جو مصائب ومظالم سہنے پڑے، انہوں نے بزنطیہ، قیصر اور قیرس کے خلاف ان کے دل میں نفرت کا ایک ایسا بیج بو دیا جو ان کی فضائے حیات پر چھا گیا اور خون کے ساتھ ان کی رگوں میں دوڑتا رہا۔

کیا یہ محض مذہبی تعصب ہی تھا جس نے مصری قوم کو نئے مذہب سے اس درجہ بیزار ومتنفر کر دیا تھا اور وہ اس کے خلاف اتنی شدید جنگ لڑنے پر آمادہ ہو گئے تھے؟ جو کوئی اس سوال کا جواب اثبات میں دیتا ہے، وہ غلطی نہیں کرتا، اس لیے کہ مصریوں میں مذہبی احساس اتنا رچ بس گیا تھا کہ ان کے قومی مزاج کا ایک جزو بن گیا تھا۔ فراعنہ کے عہد میں بھی مصریوں کا یہی حال تھا اور اس کے بعد بھی صدیوں تک ان کی یہی کیفیت رہی۔ غالباً یہ مذہبی شغف نتیجہ تھا عقیدے کی اس سادگی کا جو مختلف مذاہب قبول کرنے کے باوجود مصریوں میں قائم رہی۔ مصری قدیم ترین زمانے سے موحد تھے لیکن اپنی توحید پرستی کے باوصف ان کا خیال یہ تھا کہ خدائے خالق ومنعم اتنا بلند ہے کہ صفائے قلب کے ہوتے ہوئے بھی انسان اس کی ذات تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے اس کی رضا جوئی اور ہمیشہ اس کا تقرب تلاش کرتے رہنا انسان کا فرض ہے۔ لیکن یہ مذہبی احساس ہی وہ تنہا سبب نہ تھا جس نے مصریوں کو اس طویل دور تشدد میں اپنے مذہب کے لیے ثابت قدم رکھا۔ وہ مسیحیت پر فرعونی بت پرستی کے بعد ایمان لائے تھے اور جس طرح ان کے اسلاف عہد فراعنہ میں اپنے مذہبی علوم پر وسیع نظر رکھتے تھے اسی طرح ان کے علمائے مذہب بھی قبطی شریعت کے مختلف مباحث سے مہارت کی حد تک واقف تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور فقہ اسلامی کو اپنی توجہ کا مرکز بنا کر اس میں تبحر پیدا کرنے لگے۔

مسیحیت اور اسلام کی طرف وہ کسی ظلم یا زبردستی کے زیر اثر نہیں آئے تھے بلکہ انہیں دلیل و حجت سے مطمئن کیا گیا تھا۔ اور انہوں نے ان دونوں مذہبوں کی افادیت سے متاثر ہو کر انہیں قبول کیا تھا۔ پھر یہ کیا بات تھی کہ ہرقل کا سرکاری مذہب جب اول اول ان کے سامنے بطریق احسن پیش کیا گیا تو انہوں نے اس سے بیزاری کا اظہار کیا۔ بلکہ اسے آنکھ بھر کے دیکھا تک نہیں اور کیا وجہ تھی کہ بعد کو انہوں نے اس مذہب کی اتنی شدید مخالفت کی کہ قیرس کو ان پر اتنے خوفناک

مظالم ڈھانے اور انہیں اپنے مذہب سے ہٹانے کے لیے وہ بدترین طریقے اختیار کرنے پڑے جو ہم اوپر دیکھ آئے ہیں۔ بلاشبہ اس مسئلے میں سیاسی اثر کو بڑا دخل تھا۔ مصری قوم رومی حکومت سے اتنی تنگ آ چکی تھی کہ اس نے کئی بار رومیوں اور پھر بیزنطینیوں کے خلاف شدید بغاوتیں کیں۔ وہ ایرانیوں کے فوکاس پر حملہ آور ہونے سے پہلے بھی اس حکومت سے تنگ تھے اور ہرقل کے ایرانیوں پر غالب آنے اور انہیں مصر سے نکال دینے کے بعد بھی تنگ ہی رہے۔ فوکاس کی حکومت، جبر و استبداد کی حکومت تھی جس نے مصریوں کا پیمانہ صبر لبریز کر دیا تھا۔ چنانچہ ہرقل نے قیصر کے خلاف مسلح بغاوت کی تو اہل مصر نے ہرقل کا ساتھ دیا، ایرانی حکومت کی دہ (10) سالہ مدت میں مصریوں نے ایک ایسی آزادی محسوس کی جس کی مثال انہیں فوکاس کے عہد میں ڈھونڈنے سے نہ ملتی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ایرانیوں نے حکومت کے معاملات اس ''وفاق'' کی صورت میں جو ایرانی سلطنت کا جانا بوجھا نظام تھا، اہل مصر ہی کے ہاتھوں میں رہنے دیئے تھے اور ہرچند کہ مصر کی حکومت کے اعلیٰ مناصب پر ایرانی حکام ہی مقرر تھے۔ تاہم مصریوں کے وہ بہت سے بوجھ ہلکے کر دیئے گئے تھے جو انہیں پیسے ڈالتے تھے۔ اس کے بعد جب ہرقل نے ایرانیوں کو شکست دے کر مصر ان سے واپس لے لیا تو مصریوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا کہ ہرقل ان ہی کی طرح عیسائی تھا۔ انہیں امید تھی کہ فوکاس کے خلاف بغاوت میں انہوں نے ہرقل کا جو ساتھ دیا تھا، وہ اسے یاد ہوگا اور اس کی حکومت ان کے لیے ایک بوجھ نہ بنے گی۔ لیکن زیادہ وقت نہ گزرنے پایا تھا کہ قدیم رومی حکومت کی برائیاں ایک ایک کر کے پلٹ آئیں اور انہوں نے محسوس کر لیا کہ ہرقل کی حکومت ایرانیوں کی حکومت سے بھی کہیں بدتر ہے۔

قیصر کی طرف سے جو حکام مقرر کیے جاتے تھے وہ نہ صرف یہ کہ اہل مصر سے لگان کے طور پر ان کی پیداوار اور مصنوعات لے کر بیزنطیہ بھیج دیتے تھے، بلکہ سرزمین مصر کو رومی حکومت کی ملکیت سمجھ کر ان کے مالکوں پر جزیہ...... اور اگر آپ چاہیں تو اسے لگان بھی کہہ سکتے ہیں...... عائد کرتے تھے جو انہیں کھیتی باڑی کرنے کے معاوضے میں ادا کرنا پڑتا تھا۔ اگر آسودہ حالی کا زمانہ ہوتا تو شاید لوگ اس جزیے اور لگان کو صبر و سکون سے برداشت کر لیتے۔ لیکن جس وقت مصر کی باگ دوڑ ہرقل کے ہاتھ میں آئی ہے، مصر مصائب و آلام کے دور سے گزر رہا تھا۔ فوکاس کے عہد میں، اس نہر کے بند ہو جانے سے جو بحیرہ قلزم کو دریائے نیل اور پھر بحیرہ روم سے ملاتی تھی، بے چینی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی، لیکن اس نہر کو نہ ایرانیوں نے کھولنے کی ضرورت محسوس کی، نہ ہرقل کے

Marfat.com

عمال نے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت تباہ ہوگئی اور وہ بہت سے یونانی اور یہودی قلاش ہو کر رہ گئے جو اسکندریہ کے بازاروں میں کاروبار کرتے تھے اور اندرون ملک میں پیداوار اور مصنوعات کی قیمتیں اتنی گر گئیں کہ لوگوں کے حواس جاتے رہے۔ شیشے، کپڑے اور کاغذ وغیرہ کی صنعتیں، جن سے مصر کے زیریں اور وسطی حصوں کی رونق تھی، کساد بازاری کی نذر ہوگئیں اور کیوں نہ ہوتیں جب کہ مصر کے باہر ان کی کہیں کھپت نہ تھی۔ اب لے دے کران کا ایک یہی مصرف رہ گیا تھا کہ قیصر انہیں جزیے کے طور پر وصول کرلیا کرے۔

ان وجوہ کی بنا پر لوگ رومی حکومت سے نفرت کرنے لگے اور ان کے دلوں میں یہ خواہش چٹکیاں لینے لگی کہ مصر اجنبی چنگل سے چھٹکارا پا کر خود مختار ہو جائے، لیکن رومیوں نے مصر میں اسلحہ سازی اور ہتھیاروں کے استعمال پر پابندی لگا رکھی تھی اور مصر کا روشن خیال طبقہ حکومت کا وظیفہ خور ہونے کے سبب اس کے ہاتھ بک چکا تھا، ان حالات میں ایک نہ ایک وسیلہ ہونا ضروری تھا جو قوم کو اس مصیبت سے نجات دلائے اور اسی لیے اہل مصر بغاوت کی طرف ڈھل گئے۔ ادھر قیرس نیا مسیحی مذہب لے کر آ گیا اور اسے مصر پر مسلط کرنا چاہا، یہاں تک کہ مذہبی گروہ اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس پر لعن طعن کرنے لگا، اس طرح مصری قوم کے لیے انتقام کی پیاس بجھانے کا دروازہ کھل گیا اور اس ہولناک جبر و استبداد کا دور شروع ہوگیا جو اوپر آپ کی نظر سے گزرا اور جس نے مصریوں کے دل میں قیصر، قیرس، ان کی حکومت اور ان کے نئے مذہب کی طرف سے نفرت کا زہر گھول دیا۔ یہ تمام واقعات امیر المومنین رضی اللہ عنہ اور دوسرے باخبر مسلمانوں سے پوشیدہ نہ تھے۔ جور و ستم کا یہ طوفان، جو مسلسل دس سال تک مصر میں تباہی مچاتا رہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ذرا پہلے شروع ہوا تھا اور عہد صدیقی رضی اللہ عنہ سے گزر کر عہد فاروقی رضی اللہ عنہ کے ان لمحات تک جا پہنچا تھا، جن میں مسلمانوں نے مصر کی سرزمین پر قدم رکھا۔ دس سال کی اس مدت میں عربوں اور مصریوں کے درمیان حسب سابق تجارت ہوتی رہی اور دونوں ملکوں کی بڑی بڑی خبریں آپس میں ایک دوسرے کو ملتی رہیں۔ عربوں کو مصر کے متعلق معلومات اس لیے بھی زیادہ تھیں کہ مصر کی سرحدیں شام سے ملتی تھیں۔

اس صورت میں ضروری تھا کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ مصر کے حالات سے واقف ہوتے کہ وہ فلسطین میں مقیم تھے اور فلسطین جور و ستم کے اس جہنم سے قریب تر تھا جہاں اہل مصر نے قیصر اور اس کے عمال کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ چنانچہ ابن عاص رضی اللہ عنہ

Marfat.com

جانتے تھے کہ اگر عربوں نے مصر میں رومیوں پر حملہ کیا تو جبر وظلم کی چکی میں پسنے والی مصری قوم اپنے حاکموں کی حمایت و اعانت کا کوئی جذبہ اپنے اندر نہ پائے گی۔ اگر چہ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ اہل مصر عربوں کی صف میں شامل ہو کر اس خوف سے رومیوں کے خلاف نہیں لڑیں گے کہ مبادا عربوں کو شکست ہو جائے پھر ان کے اور عربوں کے درمیان کوئی ایسا رشتہ بھی نہیں ہے جو ان میں جوش پیدا کر سکے، اس لیے کہ نسلی، لسانی اور مذہبی اعتبار سے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو اپنے اس گمان پر کہ اہل مصر، رومیوں کی اعانت میں سرد مہری سے کام لیں گے۔ اس لیے اور بھی اطمینان تھا کہ اس زمانے میں کیا مصری اور کیا غیر مصری، مسلمانوں کی سیاست کو سب جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مسلمان کسی کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرتے، نہ کسی کو اس کے عقائد سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ قرآن کے اس ارشاد کی بنا پر کہ ''اب جو کوئی سیدھی راہ اختیار کرے اس کی راست روی اس کے لیے مفید ہے۔'' ان کا اصول یہ تھا کہ جو کوئی اپنے دین پر قائم رہ کر جزیہ ادا کرنا چاہے اسے اپنے فعل کا اختیار ہے، لیکن چونکہ مذہبی مظالم ہی رومیوں کے خلاف اس بغاوت کا سبب تھے جس کی آگ تمام اہل مصر کے دلوں میں بھڑک رہی تھی، اس لیے ان کا اسلامی رواداری کو خوش آمدید کہنا اور مسلمانوں اور رومیوں کی جنگ میں تماشائی کی حیثیت اختیار کرنا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ وہ نہ مسلمانوں کے غلبے کی صورت میں رومیوں کو جوش دلا سکتے تھے، نہ اپنے اور رومیوں کے مذہبی اشتراک کی بنا پر ان کی حمایت میں مسلمانوں سے لڑ سکتے تھے، اس لیے کہ انہیں رومیوں پر سرے سے یہ اعتماد ہی نہ تھا کہ وہ عدل و انصاف سے کام لے کر حکام اور رعایا میں مساوات برتیں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ''طاعون عمواس'' کے بعد جب شام تشریف لے گئے تو جابیہ کے مقام پر ابن عاص رضی اللہ عنہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے ساتھ فلسطین اور شام کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ اثنائے سفر میں انہوں نے پھر فتح مصر کا قصہ چھیڑا اور پچھلی دلیلیں دہرانے کے بعد اپنی رائے کی تائید میں کچھ نئی دلیلیں بھی پیش کیں، یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے متفق ہو گئے، لیکن ساتھ ہی یہ کہہ کر انہیں کچھ دنوں کے لیے روک دیا کہ مدینہ جا کر وہ اس کے متعلق حکم دیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کی رائے سے اس لیے اور بھی اتفاق کیا کہ وہ ان کی جنگی مہارت اور سیاسی بصیرت سے واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر ابن عاص رضی اللہ عنہ

مصر کی مہم پر روانہ ہوئے تو اپنی ان خوبیوں کے سبب اللہ کے حکم سے کامیاب رہیں گے اور واقعات نے ثابت کر دیا کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی شخصیت نے جو ذہانت و دلیری کی جامع تھی، انہیں فتح مصر کا ہیرو بنا دیا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ،حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرح آتش زار جنگ میں بے دھڑک کود پڑنے کا نام بہادری نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کی دلیری بڑی سوجھ بوجھ کی دلیری تھی جو عجلت و بے صبری کے مقابلے میں استقلال و تحمل ہی کو کامیابی کا ذریعہ قرار دیتی تھی اور صبر و تاخیر کا دامن اس وقت تک ہاتھ سے نہ چھوڑتی تھی جب تک حالات ہی جرأت واقدام کے متقاضی نہ ہوں اور جب تک یہ یقین ہی نہ ہو جائے کہ فتح اس جرأت واقدام کا لازمی نتیجہ ہوگی۔ اس کے علاوہ ان کی ذہانت جنگ میں عملاً حصہ نہ لینے والوں کو بھڑ کانا پسند نہ کرتی تھی اور وہ جبر و تشدد کے بجائے ان لوگوں کو لطف و مہربانی کے سلوک کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے، لیکن جہاں کہیں اپنے آپ کو تشدد پر مجبور پاتے تھے، وہاں اس میں تکلف بھی نہیں کرتے تھے۔ تاہم حد سے زیادہ سختی ان کے اصول کے خلاف تھی۔ پھر دوسرے اسلامی سپہ سالاروں کے مقابلے میں وہ اس نکتے کو بروئے کار رکھتے تھے کہ جنگ، دھوکے اور فریب کا نام ہے، اس لیے اس کے دوران میں اعلیٰ اخلاقی قدروں سے چمٹے رہنا چنداں ضروری نہیں۔ جس سپہ سالار کی خصوصیات یہ ہوں وہ اگر مصر فتح کرنے چلے تو بلاشبہ توفیق الٰہی کا زیادہ سے زیادہ مستحق ہے۔

جس وقت حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے دل میں مصر فتح کرنے کا خیال آیا تھا، ان کی عمر پچاس یا اس سے کچھ زیادہ تھی۔[1] قد چھوٹا، سر بڑا، سیاہ چمکیلی آنکھیں، جن سے خوشی کے وقت

[1] متفقہ روایت میں ہے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے سنہ 43ھ میں عید کے دن (6 جنوری 664ء) میں وفات پائی لیکن وفات کے وقت ان کی عمر کیا تھی؟ اس میں اختلاف پایا جاتا ہے کسی کے نزدیک ان کا انتقال ستر برس کی عمر میں ہوا ہے اور کسی کے نزدیک نوے برس کی عمر میں۔ بٹلر کی رائے میں انہوں نے ستر برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اور مصر روانہ ہوتے وقت ان کی عمر پینتالیس (45) سال کی تھی، لیکن جو لوگ بٹلر کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نوے سال تک زندہ رہے۔ وہ اپنی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ حبشہ کے مسلمان مہاجروں کے خلاف جو سفارت لے کر ابن عاص نجاشی کے دربار میں گئے تھے، وہ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت سے چار سال پہلے کی بات ہے۔ اس لیے اگر ان کی وفات ستر (70) یا تہتر (73) سال کی عمر میں ہوئی تو اس سفارت کے وقت ان کا سن تیئس (23) یا چھبیس (26) کا ماننا پڑے گا، جو کسی بادشاہ کے دربار میں سفارت لے جانے کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ لیکن بٹلر اپنی رائے کے ثبوت میں یہ کہتا ہے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جنگ صفین (658ء) میں شامل تھے اور اس معرکے میں انہوں نے اپنی ذہانت و شجاعت کے بڑے حیرت ناک کارنامے دکھائے۔ اگر ان کا انتقال نوے (90) سال کی عمر میں ہوا، تو جنگ صفین کے وقت ان کی عمر چوراسی (84) برس کی ٹھہرتی ہے اور بٹلر کی رائے میں یہ عمر ایسی ہے جس میں انسان اس قسم کے کارنامے سرانجام نہیں دے سکتا، جن کا مظاہرہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے جنگ صفین کے موقع پر کیا تھا۔

Marfat.com

خوشی اور غصے کے وقت غصہ جھانکتا رہتا تھا۔ گھنی بھنویں، بڑا دہانہ، لمبی داڑھی اور ان کے اردگرد بشاشت وخندہ روئی کی لہریں، سینہ چوڑا، ہتھیلیاں اور پاؤں بڑے بڑے اور سراپا سے ایک ایسی قوت نمایاں جس میں شدت نہ ہو۔ وہ ایک ایسے بہادر تھے جن کی شہ سواری اور شمشیر زنی کی شہرت عام تھی، ان کی کاٹھی مضبوط اور اعضاء چست وچالاک تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مشقتیں اٹھانے کے عادی ہیں۔ اس کے علاوہ ذہانت وفطانت، وقار وتمکنت، زیرکی ودانائی اور زبان آوری وسخن فہمی میں ان کا ایک خاص مرتبہ تھا۔ چنانچہ جب مسلمانوں نے پہلے پہل حبشہ کی طرف ہجرت کی تو قریش نے انہیں کو رئیس وفد بنا کر نجاشی کے دربار میں بھیجا تھا کہ یہ اپنے زور استدلال سے کام لے کر مسلمانوں کو مکہ واپس بھجوادیں اور اگرچہ ان کی سفارت اپنے مقصد میں ناکام رہی، لیکن انہوں نے مقدمہ پیش کرنے میں زور بیان اور قوت استدلال کا حق ادا کر دیا۔ ان کی یہی عقلی برتری بعد کو انہیں اسلام کی طرف لے گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ ہجرت فرما گئے ہیں اور عربوں میں آپ ﷺ کا کلمہ بلند ہو رہا ہے۔ انہیں شبہ ہوا کہ قریش آپ ﷺ پر غالب نہیں آسکیں گے اور انہوں نے اپنے حق میں یہی بہتر سمجھا کہ تجارت کے لیے نکل جائیں۔ چنانچہ وہ شام، یمن، حبشہ اور مصر کے تجارتی سفر پر چلے گئے۔ اس کے بعد جب انہوں نے اہل مکہ کے ساتھ غزوہ احزاب میں شرکت کی اور قریش شکست کھا کر واپس ہوئے تو انہیں یقین ہو گیا کہ وہ محمد (ﷺ) کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اس وقت انہوں نے قریش کے آدمیوں کو جمع کیا اور ان سے کہا: "واللہ! مجھے صاف نظر آرہا ہے کہ محمد ﷺ کا ستارہ اپنے انتہائی عروج پر پہنچنے والا ہے۔ اس لیے میری رائے یہ ہے کہ ہم نجاشی کے پاس چلے جائیں اور وہیں سکونت اختیار کر لیں۔ اگر محمد ﷺ نے ہماری قوم پر غلبہ پالیا تو ہم نجاشی کے پاس ہوں گے اور نجاشی کے زیر سایہ رہنا ہمارے لیے محمد ﷺ کے محکوم ہو کر رہنے سے کہیں بہتر ہے اور اگر ہماری قوم غالب آگئی تو کیا کہنا، پھر تو مزے ہی مزے ہیں!"

سامعین نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور ان کے ساتھ حبشہ چلے گئے۔ ان لوگوں نے آپس میں یہ طے کر لیا تھا کہ جب تک قریش اور محمد (ﷺ) کا جھگڑا کسی واضح نتیجے پر نہیں پہنچے گا، وہ حبشہ ہی میں رہیں گے۔ اس کے بعد جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر قریش سے صلح کا معاہدہ کیا، جس کی رو سے فریقین نے دس سال کے لیے جنگ بندی کر دی تھی اور اس امر پر متفق ہو گئے تھے کہ محمد (ﷺ) اس سال مکہ میں داخل نہیں ہوں گے، البتہ آئندہ سال عمرہ

کے لیے آئیں گے، تو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو یقین ہو گیا کہ محمد ﷺ کا ستارہ اقبال ترقی پر ہے، اس لیے ابھی حبشہ سے مکہ واپس ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب وہ سال بھی گزر گیا اور انہیں عمرہ قضا کی اطلاعات پہنچیں کہ مسلمان مکہ میں داخل ہوئے، کعبے کا طواف کیا اور صفا او رمروہ کے درمیان دوڑے تو ان کے دل نے تسلیم کر لیا کہ محمد (ﷺ) حق پر ہیں اور وہ مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ رستے میں انہیں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ملے، جو قبول اسلام کے لیے مدینہ جا رہے تھے۔ یہ بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ مدینے پہنچ کر پہلے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دست رسالت ﷺ پر بیعت کی، اس کے بعد حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ قریب آئے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! (ﷺ) میں اس شرط پر آپ سے بیعت کرتا ہوں کہ میرے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں، آئندہ کی بات میں نہیں کرتا!'' رسول اللہ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''عمرو! بیعت کر لو! اسلام پچھلے سارے گناہ دھو دیتا ہے، جس طرح ہجرت سے پچھلی تمام معصیتیں ڈھل جاتی ہیں۔'' حضرت ابن عاص رضی اللہ عنہ نے بیعت کی اور رخصت ہو گئے۔

آپ کا کیا خیال ہے؟ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اس یقین کے بعد اسلام قبول کیا کہ محمد ﷺ لامحالہ قریش پر فتح یاب ہوں گے، اس لیے انہیں اپنی قوم سے پہلے فاتح کی صف میں شامل ہو جانا چاہیے، یا حبشہ کے زمانہ قیام میں وہ رسالت محمدی ﷺ پر غور کرتے رہے اور جب ان کا دل اس پر ایمان لے آیا تو ان میں قبول اسلام کا جذبہ پیدا ہوا؟ روایت ہے کہ قریش کا ایک نوجوان ان کے پاس آیا اور کہا: ''اے ابو عبداللہ! قوم کا خیال ہے کہ تم محمد (ﷺ) کی طرف ڈھل گئے ہو!'' حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اسے جبل حرا میں ملنے کا وقت دیا اور جب یہ دونوں ملے تو ابن عاص رضی اللہ عنہ نے اس نوجوان سے پوچھا: ''میں تجھے خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ ہم ہدایت پر ہیں یا ایرانی اور رومی؟'' نوجوان نے ایک لحظہ سوچے بغیر جواب دیا: ''ہم!'' حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے مسکت لہجے میں کہا: ''پھر یہ راست روی کی فضیلت ہمارے کس کام کی؟ جب مادی اعتبار سے وہ ہمارے مقابلے میں زیادہ صاحب اقتدار ہیں...... میرا دل گواہی دیتا ہے کہ دوسری زندگی کے متعلق محمد (ﷺ) جو کچھ کہتے ہیں وہ سچ ہے۔ واقعی آخرت میں نیکی کا بدلہ نیکی اور برائی کا بدلہ برائی سے دیا جائے گا۔'' اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس سے حضرت عمرو بن عاصؓ کا خط فکر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اسلام کے افادی پہلوؤں پر غور کر کے اسے قبول کیا تھا۔ اول اول اپنی قوم کے ساتھ وہ بھی رسول اللہ ﷺ کی رسالت سے انکار کرتے رہے۔ لیکن جب قریش کی ہ

اکھڑی تو انہوں نے اپنی روش پر نظر ثانی کی اور سوچا کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو ایمان باللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں جو مومن کے جنت میں داخل ہونے کا پروانہ اور اس کے دنیوی اقتدار کی ضمانت ہے۔ چنانچہ وہ جبر وخوف کے زیر اثر نہیں، ایمان وانشراح کے رستے اسلام کی طرف لپکے اور اسی کی طرف اشارہ ہے رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث مبارک کا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سب سے بہتر اسلام اور سب سے بہتر ایمان عمرو بن عاص کا ہے۔''

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے بہت جلد رسول اللہ ﷺ کا اعتماد حاصل کر لیا، یہاں تک کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے ''جب سے میں اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے، رسول اللہ ﷺ نے ہم دونوں کو کسی جنگ میں بھی اپنے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے الگ نہیں رکھا۔'' اور کوئی تعجب نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو ان دونوں حضرات پر اس لیے غیر معمولی اعتماد ہوا کہ آپ ﷺ انہیں مکہ سے جانتے تھے آپ کو معلوم تھا کہ ان دونوں کا اپنی قوم میں کیا مرتبہ ہے اور آپ مسلمانوں اور قریش کی لڑائیوں میں ان کی قوت وشجاعت کا مشاہدہ فرما چکے تھے۔ اس کے بعد حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی ذہانت وصلاحیت کو دیکھ کر حضور ﷺ کو ان پر اور بھی زیادہ اعتماد ہو گیا۔ غزوہ ذات السلاسل میں، جو حجاز کے شمال میں واقع ہوا، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ غازیان اسلام کے سپہ سالار تھے قبائلی دشمنوں پر فتح پانے کے بعد انہوں نے اپنے ساتھیوں کو تعاقب سے روک دیا اور فوج پر قدغن لگا دی کہ تاپنے کے لیے آگ نہ جلائی جائے۔ جو کوئی اس حکم کی مخالفت کرے گا اسے آگ میں پھینک دیا جائے گا، جب یہ لشکر مدینہ واپس آیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کی شکایت کی۔ رسول اللہ ﷺ نے وجہ دریافت فرمائی تو ابن عاص رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا: ''آگ جلانے سے میں نے اس لیے روکا تھا کہ حریف کو ہماری قلت تعداد کا علم نہ ہو جائے اور تعاقب سے اس لیے باز رکھا کہ دشمن کو کمک نہ پہنچ جائے۔''

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے آغاز اسلام ہی میں رسول اللہ ﷺ کو ان پر اعتماد ہو گیا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے جن صحابہ رضی اللہ عنہم کو تبلیغی خطوط دے کر مختلف ملوک وامراء کے پاس بھیجا تھا، ان میں ابن عاص رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ ان کا انتخاب عمان کی سفارت کے لیے ہوا تھا جو خلیج فارس کے کنارے پر واقع ہے کہ وہاں جا کر جلندی کے دونوں بیٹوں جیفر اور عباد کو قبول اسلام کی دعوت دیں۔ ان دنوں عمان، فارس کا محکوم تھا، اس کے باوجود حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے وہاں جانے اور رسول اللہ ﷺ کا پیغام ان دونوں امیروں تک پہنچانے میں تکلف سے کام نہ لیا۔ انہوں نے

Marfat.com

عباد سے گفتگو کی اور اسے دلیلوں سے مطمئن کرنا چاہا۔ کبھی اس سے وعدے کیے، کبھی اسے اور اس کے بھائی کو دھمکیاں دیں۔ انہوں نے کہا اگر جیفر اسلام قبول کر لے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے عمان کی امارت عطا فرما دیں گے۔ جس طرح اس سے پہلے بازان کو یمن کی امارت عطا فرما چکے ہیں۔ اس وقت جیفر عمان کے مالداروں سے صدقات وصول کر کے انہیں فقیروں اور محتاجوں میں تقسیم کیا کرے گا۔ دونوں بھائی کچھ دن تک آپس میں صلاح و مشورہ کرتے رہے۔ جیفر نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کی قوت بڑھے گی اور ڈرا کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی دھمکی کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فوجیں کہیں سرزمین عمان کو پامال نہ کر دیں۔ چنانچہ اس نے اسلام قبول کر لیا اور عمان کی امارت پر قائم و بحال رہا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اسی کے پاس اقامت اختیار کر لی اور عوام میں اللہ کے دین کی تبلیغ کرنے اور انہیں اسلام کی تعلیم دینے لگے وہ عمان ہی میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے خلیفہ منتخب ہوئے۔ اس کے بعد جب عرب میں ارتداد کا فتنہ پھوٹا تو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ مدینہ آئے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے احکام کی تعمیل میں مرتدین کی سرکوبی کریں۔

جنگ و سیاست میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی ان صلاحیتوں کے اظہار نے ان میں حد سے زیادہ خود اعتمادی پیدا کر دی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انہیں ذات سلاسل کے موقع پر حجاز کے شمال میں قبائل سے جنگ کرنے بھیجا تو یہ ڈرے کہ کہیں دشمن کا عظیم لشکر اسلامی فوج کو تباہ نہ کر دے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کمک طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو مہاجرین اولین کے ساتھ، جن میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے، ان کی مدد کے لیے بھیجا اور روانگی کے وقت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''تم دونوں آپس میں اختلاف نہ کرنا!'' نماز کا وقت آیا تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے امامت کرنی چاہی، لیکن حضرت عمرو بن عاص نے انکار کیا اور کہا: ''آپ میری مدد کے لیے آئے ہیں!'' حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نہیں! میں اپنی فوج کا امیر ہوں اور آپ اپنی فوج کے۔'' ابن عاص رضی اللہ عنہ نے اصرار کیا ''نہیں! آپ میری مدد کے لیے آئے ہیں!'' حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''عمرو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا تھا کہ آپس میں اختلاف نہ کرنا۔ اس لیے اگر تم میری بات نہ مانو گے تو میں تمہاری بات مان لوں گا۔'' ابن عاص نے کہا: ''میں آپ کا امیر ہوں۔ آپ میری مدد کے لیے آئے ہیں۔'' حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تو پھر پڑھاؤ نماز!'' اور فوج کی امامت حضرت عمرو

بن عاص رضی اللہ عنہ نے کی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو جو سبقت اسلام میں حاصل تھی وہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ تو کیا، حضرت عمر بن خطاب ذکو بھی حاصل نہ تھی، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو لسان نبوت نے ''امین الامت'' کے لقب سے سرفراز فرمایا تھا اور اس کمک میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر امیر بنایا تھا۔ اس کے باوجود حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو اصرار تھا کہ وہ ان کی مدد کو آئے ہیں، اس لیے انہیں ان کے ماتحت ہونا چاہیے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بڑے نرم خو اور مرنجاں مرنج انسان تھے اور دنیوی معاملات کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے، اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم جزو ایمان سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو اپنی امارت پر شدید اصرار ہے تو اپنے ارادے سے دست بردار ہو گئے اور ان کی ماتحتی میں جنگ لڑی۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اس فوج کے بھی علمبردار تھے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قضاعہ کے مرتدین کے مقابلے میں بھیجی تھی جب ان کے ارتداد پر قابو پالیا گیا اور تمام عرب میں اس فتنے کا استیصال ہو گیا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فتح شام کا ارادہ فرمایا اور وہاں چار لشکر بھیجے۔ ان میں سے ایک لشکر کے کمان دار حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ تھے اور دوسرے لشکر کے سالار حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور حکم دیا کہ اگر یہ لشکر شام میں کسی جگہ جمع ہو جائیں تو ان سب کے سپہ سالار حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ہوں گے۔ حضرت عمرو ابن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو کر ان سے درخواست کی کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہہ کر شام کی فوجوں کا امیر انہیں بنوادیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم سے جھوٹ کیوں بولوں! میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس سلسلے میں ایک لفظ نہیں کہوں گا۔ ہمارے نزدیک ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا مرتبہ تم سے کہیں زیادہ ہے۔'' ابن عاص رضی اللہ عنہ نے دوبارہ کہا: ''اگر مجھے ان پر افسر بنا دیا جائے تو اس سے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے فضل و شرف میں کوئی کمی نہ آئے گی؟''...... حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان کے جواب میں فرمایا: ''اے عمرو! اس لشکر کے ساتھ جاؤ۔ اگر تم اس مرتبہ امیر نہیں بنائے گئے تو کیا ہوا؟ ان شاء اللہ بہت جلد تمہیں ایسی امارت سونپی جائے گی جس میں اور کوئی تم پر افسر نہ ہوگا۔'' اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی امارت میں روانہ ہو گئے۔

لیکن ان کی اس ماتحتی نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے سالاران لشکر کی نگاہ میں ان کا مرتبہ کم نہیں کیا۔ وہ سب کے سب ان کی ذہانت و فطانت، ان کی عقلی برتری اور بعید النظری کے قائل تھے چنانچہ جب کوئی دشواری پیش آتی، وہ ان سے رائے لیتے اور ان کے مشورے میں وہ

روشنی پاتے جو خطرے کو دور اور فتح وظفر کی راہ کو روشن کر دیتی۔ شاید امارت کی یہ خواہش محض ان کی خود اعتمادی ہی کی وجہ سے نہ تھی، ان کے حسب ونسب اور قریش میں ان کی بلند مرتبی کو بھی اس میں بہت کچھ دخل تھا۔ ان کا قبیلہ بنو سہم، قریش کا معزز قبیلہ تھا جو قریش کے دیوتاؤں کے خاص اوقاف کا نگران تھا۔ اس شعبے کا سردار اس زمانے کے دستور کے مطابق ان اوقاف کا انتظام کرتا تھا۔ اس بنا پر اس قبیلے کے افراد مالی معاملات میں خاص درک وبصیرت رکھتے تھے۔ چنانچہ اس کے آثار حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ میں بھی نمایاں تھے، چاہے ان کی ذاتی زندگی ہو یا حکومت کے عام مناصب، انہوں نے جمع مال میں غیر معمولی مہارت کا ثبوت دیا۔ اس کے علاوہ بنو سہم عہدۂ قضاء پر بھی فائز تھے اور یہ وہ منصب تھا جس نے اس قبیلے کے ارکان میں اصابت رائے، وقار اور معاملہ فہمی کی خصوصیات پیدا کیں۔ ان دونوں عہدوں نے بنو سہم کی دولت میں اضافہ کیا۔ ان کا مرتبہ بڑھایا اور ان میں قوت کے اسباب جمع کیے اور وہ اس قابل ہو گئے کہ جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے قبیلے، بنو عدی کو بنو عبد الشمس نے ان کے گھروں سے، جو صفا کے قریب واقع تھے، نکالا تو بنو سہم نے اس کو امان دی۔ اسی طرح جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے اسلام کا اعلان کیا اور بنو سہم نے انہیں قتل کرنے کی ٹھانی تو عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے والد، عاص بن وائل سہمی نے ان کی پشت پناہی کی۔ عاص بن وائل اتنے دولت مند تھے کہ ریشم کا زرکار لباس پہنتے تھے۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی امارت و وجاہت نے انہیں تفقہ فی الدین اور کلام اللہ کے علم سے بے بہرہ نہیں کیا، وہ بہت سے مسلمانوں سے زیادہ قرآن کو جانتے اور سمجھتے تھے، اسی طرح وہ تمام عربوں سے زیادہ تہذیب یافتہ اور اس زمانے کے حالات سے باخبر تھے۔ وہ کریم النفس، وسیع الاخلاق اور رقیق القلب انسان تھے۔ ایک طرف لوگ ان کی ذہانت وفطانت کا احترام رکھتے تھے اور دوسری طرف ان کی ان خوبیوں کے گرویدہ تھے۔ اپنے ابنائے قوم کی طرح انہوں نے بھی بڑی سیاحتیں کی تھیں اور تجارت وسفارت کے سلسلے میں اکثر یمن، حبشہ، شام اور مصر آتے گئے تھے۔ ہمیں اس میں مطلق شبہ نہیں کہ انہوں نے مصر کے کئی سفر کیے تھے۔ اگرچہ بعض مؤرخین یہ کہتے ہیں کہ وہ صرف ایک ہی بار مصر گئے اور اسی سفر میں انہیں فتح مصر کا خیال آیا تھا۔ صرف ایک بار مصر جانے کا یہ قصہ بڑا انوکھا ہے اور باوجودیکہ یہ ہمیں کسی "دیو مالا" کی کہانی معلوم ہوتا ہے اس کا انوکھا پن ہم سے اس کے ذکر کی سفارش کرتا ہے، چنانچہ بیان کیا جاتا ہے: "عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ چند اہل قریش کے ساتھ تجارت کے سلسلے میں بیت المقدس گئے۔ اسکندریہ کا ایک رومی شماس بھی

Marfat.com

ان دنوں زیارت کے لیے وہاں آیا تھا۔ وہ پہاڑ سے اتر رہا تھا اور یہ اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اونٹ چرا رہے تھے اس دن گرمی بہت تھی اور پیاس کی شدت سے شماس کے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے اس نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے پانی مانگا اور انہوں نے اسے اتنا پانی پلایا کہ وہ سیر ہو گیا تکان اور پیاس نے چونکہ اسے بے حال کر دیا تھا اس لیے پانی پی کر وہیں کہیں ایک گڑھے کے پاس سو گیا۔ تھوڑی دیر اس گڑھے سے ایک بہت بڑا سانپ نکلا۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی نگاہ پڑی اور انہوں نے تیر سے اس سانپ کو ہلاک کر دیا جب شماس بیدار ہوا تو اپنے پہلو میں سانپ کو مرا پایا۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے پورا واقعہ بیان کیا تو شماس نے آگے بڑھ کر ان کے سر کو بوسہ دیا اور کہا: ''آپ نے دو دفعہ مجھے موت کے منہ سے بچایا ہے۔ ایک دفعہ پیاس کی شدت سے اور دوسری طرف اس سانپ سے! آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟''

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اسے بتایا کہ مقصد سفر تجارت ہے اور انہیں اتنے نفع کی امید ہے کہ ایک اونٹ خرید لیں۔ شماس نے معلوم کر لیا کہ عرب میں ایک آدمی کا خوں بہا سو اونٹ ہے، جن کی قیمت ایک ہزار دینار ہوتی ہے۔ اس نے ابن عاص رضی اللہ عنہ سے کہا: ''کیا آپ میرے ساتھ میرے ملک چلیں گے۔ میں خدا کو گواہ بنا کر وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا دو جانوں کا خوں بہا دوں گا۔ اس لیے کہ اللہ نے مجھے آپ کے ہاتھوں دو دفعہ موت سے بچایا ہے۔'' حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ شماس اسکندریہ کا رہنے والا ہے اور اسکندریہ وہ کبھی نہیں گئے تھے انہوں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور ان میں سے ایک شخص کو ساتھ لے کر شماس کے ہمراہ اسکندریہ چلے گئے۔ شہر کی عظیم الشان عمارتیں اور آبادی اور دولت کی فراوانی دیکھ کر ابن عاص رضی اللہ عنہ حیران رہ گئے اور شماس سے بولے: ''میں نے ایسا شہر اور اتنی دولت کبھی نہیں دیکھی!'' جس دن ابن عاص رضی اللہ عنہ اسکندریہ پہنچے وہاں ایک عظیم الشان جشن منایا جا رہا تھا جس میں شہر والوں کے علاوہ امراء اور حکام بھی شامل تھے۔ شماس نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کو ریشمی لباس پہنایا اور اپنے ساتھ جشن میں لے گیا۔ جہاں ملوک و امراء ایک سنہری گیند اچھال رہے تھے۔ اس گیند کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ وہ جس کی آستین میں گرے گی وہ شہر کا بادشاہ ہونے سے پہلے نہیں مر سکتا۔ اس دن وہ گیند عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی آستین میں آ گری۔ اس پر لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی اور انہوں نے کہا: ''یہ پہلی بار ہے کہ اس گیند نے ہمیں دھوکا دیا ہے بھلا! یہ بدو ہمارا بادشاہ ہو سکتا ہے۔ نہیں! ہرگز نہیں!!''

''اس کے بعد شماس نے اہل اسکندریہ سے دو ہزار دینار جمع کر کے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو

Marfat.com

دیئے اور ایک آدمی ساتھ کر دیا کہ انہیں بیت المقدس پہنچا دے۔'' ابن عبدالحکم کہتے ہیں: ''اس طرح عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ مصر کے رستوں سے واقف ہوئے اور انہیں پتہ چلا کہ مصر دنیا کے سب ملکوں سے زیادہ ممتاز اور دولت مند ملک ہے۔'' میرا خیال ہے، قارئین اس امر میں مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ قصہ، اپنی طرفگی کے باوجود ''دیو مالا'' کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا ہے جسے کسی عنوان فتح مصر کے خیال کا نقطہ آغاز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ غالباً بلاذری، مقریزی اور ابن عبدالحکم وغیرہ مؤرخین نے اسی روایت کے پیش نظر یہ لکھ دیا کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ساڑھے تین ہزار فوج لے کر اپنی مرضی سے مصر فتح کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھا، جس میں ان کی خود رائی پر سخت ملامت و سرزنش کی، لیکن ہماری رائے میں یہ بات خرافات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اگر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ محض اپنی مرضی سے مصر پر حملہ کرنے جاتے تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس کی کم سے کم سزا یہ ہوتی کہ وہ ابن عاص رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیتے۔ دراصل فتح مصر کا خیال انہی حالات میں پیدا ہوا، جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں اور جن کے پیش نظر امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق کیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی تاکید یہی کی کہ جب تک وہ مدینہ پہنچ کر فتح مصر کا حکم نہ دیں، ابن عاص رضی اللہ عنہ اس سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ مدینہ پہنچ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اصحاب رائے کو جمع کیا اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے دلائل ان کے سامنے دہرا کر مشورہ چاہا۔ حاضرین میں اختلاف رائے ہوا۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ چونکہ فتح مصر کے حق میں تھے اس لیے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو مصر جانے کا حکم دے دیا اور شریک بن عبدہ کے ہاتھ انہیں ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا: ''لوگوں کو مصر چلنے کی دعوت دو اور جو تیار ہو انہیں ساتھ لے کر روانہ ہو جاؤ۔''

جس وقت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا یہ خط پہنچا، حضرت عمرو بن عاص ؓ نے قیساریہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ خط پڑھ کر محاصرہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا اور خود تھوڑی سی فوج لے لی جس کی تعداد میں اختلاف ہے کہ وہ ساڑھے تین ہزار تھی یا چار ہزار۔ اس کے بعد امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے قاصد، شریک بن عبدہ کو کمک طلبی کا پیغام دے کر مدینہ رخصت کیا تاکہ شام کی چھاؤنیاں کمزور نہ پڑ جائیں، اور خود عریش کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ اس انتظار میں سست رفتاری کے ساتھ سمندر کے کنارے کنارے چلے جا رہے تھے کہ مدد آ جائے تو اسے لے کر مصر میں داخل

Marfat.com

ہوں۔ لیکن رستے ہی میں انہیں یہ خبر ملی کہ جو لوگ...... اور ان میں سر فہرست حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں۔ فتح مصر کو نوزائیدہ سلطنت کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں، ان کی سرگرمیاں مدینے میں بڑھ گئی ہیں۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں سے مجبور ہو کر اپنی رائے نہ بدل دیں اور کمک بھیجنے کے بجائے الٹا انہیں واپسی کا حکم نہ دے دیں۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا یہ اندیشہ غلط نہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور وہ لوگ، جو اس حملے کو خطرناک سمجھ رہے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو برابر مجبور کر رہے تھے، بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ''امیر المومنین! عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نڈر اور بے دھڑک آدمی ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مصر کے حالات کا صحیح اندازہ کیے بغیر ناکافی فوج لے کر نکل کھڑے ہوں گے اور مسلمانوں کو ہلاکت میں ڈال دیں گے۔''

کہیے! یہ باتیں سننے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیا کریں؟ کیا اپنے سپہ سالار کو روانگی کا حکم دینے اور اس کی رائے سے اتفاق کر لینے کے بعد اب اسے واپس بلا لیں! اگر وہ ایسا کرتے ہیں اور ابن عاص رضی اللہ عنہ مصر کی سرحد میں داخل ہو چکے ہیں تو کیا ان کی واپسی مسلمانوں کی ہمتیں پست نہ کر دے گی؟ اور دشمن ان پر جری نہ ہو جائے گا؟ لیکن انہیں یہ بھی اندیشہ لاحق تھا کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی رائے نہ مانی گئی، ان کی بات نہ سنی گئی تو وہ بھڑک اٹھیں گے۔ پھر انہوں نے مصر میں رومی فوجوں پر فتح حاصل کرنے کے لیے اگر ابن عاص رضی اللہ عنہ کو امدادی فوجیں بھیجیں تو مخالفین مدینہ کے اندیشے قوی ہو کر یقین کی صورت اختیار کر لیں گے۔ ان تمام مصلحتوں اور نزاکتوں کو دیکھتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کو لکھا: ''اگر میرا یہ خط سرحد مصر پار کرنے سے پہلے وصول ہو تو جہاں سے چلے ہو وہیں لوٹ جاؤ! اور اگر سرحد پار کر چکے ہو تو پیش قدمی جاری رکھو۔ میں تمہارے لیے کمک بھیجوں گا۔'' یہ خط ایک قاصد کو دیا کہ مصر جانے والے سپہ سالار کو پہنچا دے۔ قاصد جب حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا، وہ رفح کے مقام پر تھے۔ اس نے کمک کا ذکر نہ کیا جس کا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو انتظار تھا، بلکہ انہیں خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ کا خط دینا چاہا، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان لوگوں کا خیال آ یا جو مصر پر حملے کی شدت سے مخالفت کر رہے تھے اور انہوں نے اندازہ کر لیا کہ اس خط میں واپسی کا حکم ہو گا۔ وہ چلتے رہے اور قاصد سے مدینے کی خبریں معلوم کرتے رہے یہاں تک کہ ایک گاؤں میں پہنچے جو رفح اور عریش کے درمیان تھا۔ وہاں پہنچ کر ابن عاص رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''یہ گاؤں

Marfat.com

کس ملک میں ہے؟" لوگوں نے جواب دیا: "مصر میں!" اس وقت وہ سواری سے اترے اور قاصد نے انہیں خط دیا۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے خط پڑھ کر حاضرین سے کہا: "امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے حکم دیا ہے کہ اگر یہ خط مجھے مصر کی سرحد پار کرنے سے پہلے ملے تو میں واپس ہو جاؤں، لیکن یہ مجھے اس وقت ملا ہے جب ہم مصر میں داخل ہو چکے ہیں اس لیے اللہ کی برکت اور اعانت پر بھروسہ کر کے بڑھے چلو!" اسی طرح یہ بھی کہا کہ "ان کے یہ کلمات پہلی فتح ہیں۔"①

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فوج کو مصر میں آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر وہ کمک پہنچنے تک اسی گاؤں میں ٹھہرے رہے تو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم خیال مسلمانوں کی سرگرمیاں بڑھ جائیں گی۔ وہ خلیفۃ المسلمین کو کمک بھیجنے سے روک کر مصر کی اسلامی فوج کو فلسطین واپس بھجوانے کی کوشش کریں گے اور اس طرح وہ قیمتی موقع ہاتھ سے نکل جائے گا، جس کے متعلق ابن عاص رضی اللہ عنہ کا ایمان تھا کہ وہ اس سے یقینی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا

---

① حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے نام امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے دو خطوط کے متعلق یہ متواتر روایت ہے کہ پہلے خط میں انہیں مصر جانے کا حکم دیا گیا اور دوسرے خط میں واپس بلایا گیا، بشرطیکہ وہ مصر کی سرحدوں میں داخل نہ ہوئے ہوں، لیکن کچھ اور روایات بھی ہیں، جو ابن عبدالحکم اور دوسرے مؤرخین نے نقل کی ہیں۔ یہ روایات اس متواتر روایت سے قدرے اختلاف کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک روایت میں ہے کہ فتح مصر کے سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ آخر تک متردد رہے۔ اس کے راوی، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے نام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خط کی عبارت یہ نقل کرتے ہیں۔ "تم فوج لے کر روانہ ہو جاؤ میں استخارہ کرتا ہوں۔ میرا خط ان شاء اللہ تمہیں بہت جلد ملے گا۔ اگر لکھوں کہ لوٹ آؤ اور میرا خط پڑھتے وقت تم سرحد مصر میں داخل نہ ہوئے ہو تو لوٹ آنا اور اگر خط تمہیں مصر میں داخل ہونے کے بعد ملے تو پیش قدمی جاری رکھنا اور اللہ سے اعانت و نصرت کی دعا کرتے رہنا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب تک مصر جیسی مہتم بالشان مہم کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور نہ کر لیتے اور اس کے متعلق ان کے دل کا ایک ایک شبہ دور نہ ہو جاتا، عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو روانگی کا حکم دے دیتے۔ مخالف روایتوں میں دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جابیہ میں تھے اور ابن عاص رضی اللہ عنہ اپنی فوج کے ساتھ قیساریہ میں کہ انہوں نے مصر پر حملے کی اجازت کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک خفیہ مراسلہ بھیجا اور ان کی کمان میں جو فوج تھی اسے لے کر راتوں رات مصر کی طرف نکل گئے۔ قیساریہ میں مقیم اسلامی فوج کے دوسرے سالاروں کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے فوراً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مطلع کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کو یہ خط لکھا: "عاصی بن عاصی کے نام! امابعد! تم نے اپنے ساتھیوں کو ایک بڑے خطرے میں ڈال دیا ہے۔ میرا یہ خط اگر تمہیں سرحد پار کرنے سے پہلے موصول ہو تو لوٹ آؤ اور اگر سرحد پار کرنے کے بعد ملے تو پیش قدمی جاری رکھو میں تمہارے لیے کمک بھیجوں گا۔" اگر یہ صحیح ہے تو اس میں حیلہ سازی کا ایک پہلو نکلتا ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جانے پہچانے کردار اور بے داغ مشقت آمیز زندگی کے قطعاً منافی ہے۔"

خیال تھا، رومی شام کی طرح مصر میں مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور مصر دنیا کا سب سے دولت مند ملک ہے، اگر مسلمانوں نے اسے فتح کر لیا تو پھر کوئی قوت، ان کی قوت کے برابر نہ ہوگی۔
حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ چار ہزار مجاہدوں کے ساتھ عریش پہنچے، لیکن وہاں رومیوں کی کوئی فوج نہ تھی۔ اس سے ان کا ارادہ اور پختہ ہو گیا اور پیش قدمی کی ہمت بڑھ گئی۔

امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا قاصد واپس ہوا اور بتایا کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ مصر کی سرحدوں میں داخل ہو گئے ہیں اور رومیوں سے مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ وہ اس وقت تک ہرگز واپس نہ ہوں گے جب تک شکست ہی انہیں پسپا ہونے پر مجبور نہ کر دے۔ اب ان لوگوں کے لیے، جو مصر پر حملے کو مسلمانوں کے حق میں خطرہ سمجھ رہے تھے، اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ اپنی مخالفت ترک کر کے نتیجے کا انتظار کریں۔ اگر ابن عاص رضی اللہ عنہ اپنے مقصد میں ناکام ہوئے تو یہ ناکامی مخالفین کی اصابت رائے اور بعید النظری کی دلیل ہوگی اور اگر فتح یاب ہوئے تو اس ظفر مندی پر حیرت و مسرت کا اظہار کرنے والے پہلے وہی ہوں گے۔
لیکن قضا و قدر نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے نصیب میں کامیابی لکھی تھی اور مشیت الٰہی یہی تھی کہ مصر اسلام کے سائے میں آ کر، اسلامی سلطنت کے تاج کا ایک بیش قیمت موتی بن جائے۔

⊙❀⊙

Marfat.com

باب:19

مصر میں اسلامی فوج کی کامیابیاں

امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قاصد منزلیں مارتا، مدینہ واپس ہوا۔ وہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے لیے خبر لے کے آیا تھا کہ حضرت عمرو بن عاص فتح کے فولاد شکن ارادے اور کمک کی انتہائی احتیاج کے ساتھ، سرزمین مصر میں داخل ہو گئے ہیں۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ عریش پہنچے، لیکن وہاں مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا، اس لیے وہ بحیرہ سربونہ کے جنوب میں اس رستے پر ہو لیے جس سے گزر کر پچیس برس پہلے ایرانیوں نے مصر پر حملہ کیا تھا۔ رستے میں انہیں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی اور وہ فرما پہنچ گئے جہاں رومی فوج ان کا مقابلہ کرنے کے لیے کیل کانٹے سے لیس کھڑی تھی۔ عریش سے فرما کا رستہ تقریباً ستر میل لمبا ہے۔ یہ ایک صحرا سے گزرتا ہے، جس میں کہیں کہیں چشمے اور گاؤں ہیں جو مسافر کے لیے سفر کی مشقت آسان کر دیتے ہیں۔ اس لیے فلسطین سے مصر جانے والا یہ رستہ قدیم ترین زمانے سے جاری ہے۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسف قمبیز، سکندر، قلوپطرہ اور حضرت عیسیٰؑ کا خاندان [1] سب اسی رستے سے مصر پہنچے تھے۔ پھر مصر اور بیت المقدس کے درمیان حاجیوں اور ایشیا و افریقہ کے درمیان تجارت و سیاحت کا بھی یہی رستہ تھا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھی تجارت کے سلسلے میں کئی بار اس سے گزرے تھے اور جب اس شماس کے ساتھ مصر گئے تھے، جس کا قصہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو دو جانوں کا خوں بہا دینے کے لیے اسکندریہ لے گیا تھا اس وقت بھی اسی رستے سے گئے تھے۔

---

[1] بٹلر فتح مصر، ص ۱۸۵، ترجمہ ابو حدید۔

فرما، مصر کا ایک مشہور شہر تھا جو قبطیوں کے زمانے میں ''پرمون'' کہلاتا تھا اور فراعنہ کے دور میں اس کا نام 'پلوز' تھا۔ یہ بحیرہ روم اور پلوزی نہر کے دہانے کے قریب جو دریائے نیل کی سات 33 شاخوں میں سے ایک شاخ تھی، ایک پہاڑی پر آباد تھا۔ اس زمانے میں اس سے بھی پہلے، سمندر کے رخ، نشیبی مصر میں دریائے نیل کی سات شاخیں تھیں، جن میں دو آج بھی ''نہر دمیاط'' ''اور نہر رشید'' کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں سے پہلی نہر کا نام اس زمانے میں فتنتی تھا اور دوسری کا نہر بلبیتی تھا تیسری شاخ ان دونوں شاخوں سے الگ اپنا ایک مستقل وجود رکھتی تھی اور ان کے جنوب میں چھ میل کے فاصلے سے شروع ہو کر، مشرقی سمت اس علاقے سے گزرتی تھی، جسے آج ہم مشرقی صوبے کے نام سے جانتے ہیں اور چوبیس (۲۴) میل سے کچھ زیادہ جانب شرق، پورٹ سعید کے مقام پر، بحیرہ روم سے مل جاتی تھی۔ یہ تیسری شاخ وہی 'نہر پلوزی' تھی۔ باقی کی چار شاخیں ان دو شاخوں سے نکلتی تھیں جو ہمارے زمانے تک موجود ہیں۔ ان میں سے دو شاخیں 'مشرقی' اور ''دقہلی'' صوبوں سے بہتی ہوئی، بحیرہ منزلہ کے درمیان بحیرہ روم سے ہم آغوش ہو جاتی تھیں۔

مشرقی شاخ کا نام ''نہر تانیتی'' تھا جو تانیس سے گزرتی تھی اور تانیس اسی اثری شہر، صان الحجر کا دوسرا نام تھا جو آج تک مشہور ہے۔ دوسری شاخ نہر 'منڈیزی' تھی جو میت غمر کے قریب نیل سے پھوٹ کر ''دقہلی'' صوبے کا سینہ چاک کرتی ہوئی، بحیرہ منزلہ کے درمیان، پورٹ سعید اور دمیاط کے درمیانی مقام پر گرتی تھی۔ 'نہر سبنتی' ''قناطر خیریہ' کے قریب ''نہر دمیاط'' سے نکل کر منوفی اور مغربی صوبوں میں سے ہوتی ہوئی بحیرہ برلس میں تحلیل ہو جاتی تھی اور سب سے آخری شاخ 'نہر کانوبی' نہر رشید' کے وسط سے پھوٹ کر شمال مغرب کی طرف رُخ کرتی تھی اور اسکندریہ کے قریب مشرقی جانب جا گرتی تھی۔ پانی کا یہ دُور دُور تک پھیلا ہوا جال مصر کے سرسبز و زرخیز عظیم مثلث کو سیراب کرتا تھا اور یہ مثلث مغربی جانب، اسکندریہ سے گزر کر، برقہ کی سرحدوں سے جا ملتا تھا۔ چنانچہ یہ علاقہ گنجان اور آسودہ حال تھا، جس کے باشندے گھنے اور لدے پھندے باغیچوں سے گھرے ہوئے مکانوں میں رہتے تھے، یہاں برقہ کی سرحدوں تک باغ ہی باغ تھے جن میں بڑے لذیذ پھل لگتے تھے اور بکثرت روم بھیجے جاتے تھے۔ یہاں کے انگور بہت مشہور تھے جن کے لطیف نشے کی ورجل اور سترابو نے ویسی ہی تعریف کی ہے جیسی ابونواس اور اس کے دوستوں نے ہیت اور

Marfat.com

عانات کی شراب کی۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جب فرما پہنچے ہیں تو اس مثلث کے شمال مشرقی زاویے کے سرے پر تھے، جب سے وہ مصر کی سرحدوں میں داخل ہوئے تھے۔ ان کی پیش قدمی کی خبریں رومیوں کو برابر مل رہی تھیں۔ اب رومی کیا کریں..........؟ جس وقت ابن عاص رضی اللہ عنہ عریش اور فرما کا درمیانی ریگستان طے کر رہے تھے، رومیوں نے ان کے مقابلے پر آنے کا خیال تک نہ کیا۔ اس لیے کہ جانتے تھے صحرا کی لڑائی میں عربوں کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ پھر عریش کے آس پاس کا علاقہ فلسطین کے قریب ہے، وہاں بیت المقدس اور اس کے گرد و نواح سے مسلمانوں کو باسانی کمک پہنچ سکتی ہے۔ چنانچہ مصر کے حاکم مقوقس نے یہی بہتر سمجھا کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو آگے بڑھنے دیا جائے، یہاں تک کہ وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جائیں جہاں انہیں خود بھی کمک پہنچنے کی اُمید نہ رہے۔ اس مصلحت کے پیش نظر، اس نے پہلا میدان، فرما کے مستحکم قلعوں کو قرار دیا اور یہ تک سوچنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ اس معرکے میں یا تو اسے خود شرکت کرنی چاہیے، یا پھر روم کے سپہ سالار اعظم اطربون کو بھیجنا چاہیے۔

رومیوں نے عربوں سے لڑنے کے لیے مورچہ بندی کر لی۔ انہیں یقین تھا کہ وہ شہر کی مدافعت کر سکیں گے اور دشمن کو اُلٹے پاؤں بھاگنے پر مجبور کر دیں گے۔ اس لیے کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ قلیل التعداد فوج ہے اور محاصرے کا سامان بھی اتنا نہیں جتنا ان ایرانیوں کے پاس تھا، جنہوں نے اس سے پہلے فرما کو کوئی خاص تکلیف اُٹھائے بغیر فتح کر لیا تھا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو بھی رومیوں کی قوت و تعداد کا پتا چل گیا تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کی فوج میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے فرما پہنچ کر لڑائی چھیڑنے میں کسی تکلف و تامل سے کام نہ لیا۔ پڑاؤ ڈالنے سے پہلے انہوں نے فوج کے سامنے ایک تقریر کی اور اسے یاد دلایا کہ "روم اور ایران میں جہاں کہیں مسلمانوں نے دشمنوں سے مقابلہ کیا ہے، ان کی تعداد ہمیشہ کم رہی ہے، لیکن وہ ہر لڑائی میں دشمن پر فتح یاب ہوئے ہیں، اس لیے کہ اللہ ان کے ساتھ تھا اور اس نے ان کی مدد کی" اور یہ بات کوئی جھوٹی بات نہ تھی۔ مسلمانوں نے ایک مہینے تک محاصرہ جاری رکھا اور آخر کار رومیوں کو نہایت شرمناک شکست دے کر شہر پر قابض ہو گئے۔

یہ کیسے ہوا؟ چار ہزار کی جمعیت نے ایک ایسے شہر کا محاصرہ کس طرح کر لیا جس کی

Marfat.com

فصلیں مستحکم اور قلعے مضبوط تھے مسلمان، رومی فوجوں کو شکست دے کر شہر میں کیسے گھس گئے اور اس کے قلعوں کو انہوں نے کس طرح فتح کر لیا؟ بعض مؤرخین اسے ایک عجیب بات تصور کرتے ہیں اور جب اس کا کوئی سبب ان کی سمجھ میں نہیں آتا تو کہہ اُٹھتے ہیں کہ محاصرے کے دوران میں فرما کے قبطیوں نے عربوں کی مدد کی تھی، اس لیے وہ اپنے دشمن پر غالب آگئے۔ مقریزی اور ابوالمحاسن کا یہی کہنا ہے۔ لیکن ابن عبدالحکم لکھتے ہیں کہ ''اسکندریہ میں قبطیوں کا ایک اسقف تھا جسے ابومیامین کہتے تھے۔ جب اسے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی آمد کا حال معلوم ہوا تو اس نے سارے قبطیوں کو لکھ بھیجا ''حکومت اب رومیوں کے پاس نہ رہے گی اور ملک ان سے چھن جائے گا، اس لیے تم عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو جاؤ!'' چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت فرما میں جتنے قبطی تھے، ان سب نے حضرت ابن عاص رضی اللہ عنہ کی مدد کی''۔

لیکن ابن عبدالحکم کی یہ روایت بھی مقریزی اور ابوالمحاسن کی روایتوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اس لیے یہ ابومیامین، اسقف بنیامین ہی تھا جو عربوں کے مصر پر حملے کے وقت اسکندریہ میں موجود نہ تھا، بلکہ اس سے کئی برس پہلے قوص بھاگ گیا تھا، جیسا کہ ہم پچھلے باب میں بیان کر چکے ہیں۔ شاید ابن عبدالحکم اور آخری دور کے دوسرے مؤرخین نے یہ قصہ اس لیے نقل کیا ہے کہ انہیں قبطیوں کی اعانت کے سوا، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے رومیوں پر غالب آنے کی اور کوئی وجہ نظر نہ آئی اور انہوں نے اس واقعے کو نقل کر کے ثبوت میں یہ سند پیش کر دی کہ قبطی، رومی حکومت سے نالاں تھے اور مذہبی استبداد کے دور میں انہوں نے رومیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ قبطیوں نے نہ مسلمانوں کا ساتھ دیا، نہ رومیوں کا، اور مسلمانوں کے رومیوں پر فتح پانے، ان کے مورچوں اور قلعوں پر قبضہ کرنے میں قبطیوں کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عربوں سے جنگ میں قبطیوں نے رومیوں کا جو تھوڑا بہت ساتھ دیا، وہ قیصر اور اس کے عمال کے دباؤ سے مجبور ہو کر دیا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ انہوں نے عربوں کے ساتھ تعاون نہیں کیا۔ ان چند لوگوں کی انفرادی اور خفیہ اعانت کے سوا، جو رومیوں اور ان کی حکومت سے اس درجہ نالاں تھے کہ انہوں نے اپنی جان اور آزادی کو خطرے میں ڈال کر عربوں کو رومیوں کے تمام بھید بھاؤ بتا دیئے، باقی تمام مصری قوم بڑے شوق اور بے صبری کے ساتھ لڑنے والوں کا تماشا دیکھتی رہی۔

رومیوں نے اہل مصر کو طرح طرح سے ستایا تھا۔ ان پر ایسے ایسے ظلم ڈھائے تھے، انہیں

Marfat.com

اس بُری طرح لوٹا کھسوٹا تھا کہ ان کے دل میں اپنے حاکموں کے لیے امداد و اعانت کا کوئی جذبہ باقی نہ رہا تھا اور عربوں سے انہیں اس وقت تک کوئی واسطہ ہی نہ پڑا تھا جو وہ ان سے نفرت کرتے یا انہیں خوش آمدید کہتے۔ پھر مصر میں رومیوں کی قوت و طاقت کو دیکھتے ہوئے وہ یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ آخر الامر کون کس پر غالب ہوگا؟ یہ صحیح ہے کہ شام و عراق میں عربی فتوحات کی خبریں مصر بھی پہنچ رہی تھیں، لیکن ابھی مصر والوں کو یاد تھا کہ ہرقل نے کچھ ہی دن پہلے ایرانیوں کو شکست دے کر انہیں مصر سے نکالا ہے۔ اب اگر وہ علانیہ عربوں کی مدد کرتے اور فتح رومیوں کو ہو جاتی تو یہ انتہائی خطرے کی بات تھی اور انہیں پہلے سے کہیں زیادہ مظالم و شدائد کا نشانہ بننا پڑتا۔ رومیوں سے انہیں نفرت تھی ہی، پھر ان کی مدد وہ کیوں کرتے؟ ان باتوں کے علاوہ لڑائی بھی اس وقت تک اپنی ابتدائی منزلوں میں تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس لیے عقل مندی کا تقاضا یہی تھا کہ حالات کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد کوئی ایسی روش اختیار کی جائے، جس میں ظلم و ضرر سے بچاؤ کا بھی پہلو ہو اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ بھی اُٹھایا جا سکے۔

مصری قوم کا یہ موقف وہ فطری مؤقف تھا جو اس زمانے میں اس جیسی ہر قوم کو اختیار کرنا چاہیے تھا۔ اہل مصر چاہتے تھے کہ رومی ان کے ملک سے نکل جائیں تا کہ مصر کی نعمتوں میں سے ان کا فطری حق انہیں مل سکے اور وہ ملک کے ہر حصے میں ہر طرح کی آزادی اور بزرگی بہرہ مند ہو سکیں، لیکن جب سے سکندر مقدونی نے ان کی آزادی پر ڈاکہ ڈالا تھا، جس طرح دوسری قوموں کی آزادی ان سے چھینی تھی، اس وقت سے اہل مصر مغلوب و محکوم ہو گئے تھے۔ جب سکندر مرا تو مصر کی حکومت یونانی بطالسہ کے قبضے میں آ گئی۔ بطالسہ نے یونانیوں اور رومیوں سے قطع تعلق کر کے، مصر میں ایسے ڈیرے ڈالے کہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اب اہل مصر کو ان میں کوئی اجنبی عنصر نظر نہ آتا تھا، جس کے خلاف وہ بھڑکتے یا بغاوت کرتے۔ مالکیوں کے خاندان ان دنوں میں مصر اور غیر مصر میں اجنبی الاصل تھے......اور ان کا آج بھی یہی حال ہے...... خاندان کسی دور میں مصر آئے اور کرائے کی ان فوجوں کی مدد سے جن کا پیشہ ہی جنگ کرنا تھا، بزور شمشیر اس کے تخت پر براجمان ہو گئے۔ جنگ کے بعد جب امن و سکون بحال ہوا تو ان خاندانوں نے مفتوحہ ملک میں آباد ہو کر اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ عوام نے انہیں خوش آمدید کہا اور انہیں اپنی پشت پناہ بنا کر سارے جھگڑے انہیں کے سپرد کر دیئے۔ یہی حال بطالسہ کا تھا کہ وہ مصر آئے اور یہیں

کے ہو رہے۔ انہوں نے مصر کو اور مصر نے انہیں اپنا لیا۔ جولیس سیزر کے آنے تک یہی حالات رہے۔ اس کے بعد انطونی آیا۔ یہ دونوں قلوپطرہ کے عہد میں مصر پہنچے اور ان کی آمد سے مصر، رومی سلطنت کا ایک جزو ہو گیا، جو یورپ میں مغرب اور شمال کی انتہائی حدود تک پھیلی ہوئی تھی اور ایشیا میں صحرائے ساوہ تک۔ ابھی مصر کو رومی سلطنت میں شامل ہوئے کچھ دن نہ گزرے تھے کہ ایک نیا عنصر پیدا ہوا، جس نے دنیا کے تصورات بدل دیئے اور حصول شرف کو فتوحات کی وسعت کے دائرے سے نکال کر ایک ایسے بلند میدان میں پہنچا دیا، جو انسانی ضمیر کے پختہ ہو جانے کے بعد انسان کے لیے سب سے بہتر اور موزوں تر مقام ہے۔ یہ عنصر، مسیحیت تھی، جس نے دنیوی مال ومتاع کو حقیر اور اس کے لیے جنگ وجدال کو مذموم قرار دے کر انسان کو محبت واخوت کی تعلیم دی۔

روم ومصر میں مسیحیت کے پھیلتے ہی لوگ تمام اگلے پچھلے کینہ وبغض اور عداوت ودشمنی کو بھول گئے اور اس نے ان کے سامنے ایک ایسی مقدس سلطنت کا تصور پیش کیا، جس کے پرچم تلے، وہ اللہ کے سائے میں بھائی بھائی بن کر رہیں، لیکن زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ اس تصور کو بادلوں نے گھیر لیا اور اس پر لوگوں کے ایمان کمزور پڑ گئے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مسیحیت میں مختلف فرقے پیدا ہونے شروع ہوئے اور ہر فرقہ دوسرے فرقے کو نفرت وکراہت کی نظر سے دیکھنے لگا۔ ان فرقہ بندیوں نے لوگوں میں پھر تشتت وافتراق کے بیج بو دیئے۔ مصریوں نے اپنے رومی حکام کو برا سمجھنا شروع کر دیا اور رومیوں کے مذہبی تشدد نے مصریوں کی اس بیزاری کو شدید نفرت تک پہنچا دیا۔ فرما میں مصریوں نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی مدد نہیں کی، پھر انہوں نے اپنی معمولی فوج کے ساتھ اتنے مضبوط شہر کا محاصرہ کر کے رومیوں کو کس طرح شکست دی اور ان کے مستحکم قلعے کیسے فتح کیے؟ مشہور روایت کے مطابق ایک مہینے اور دوسری روایت کے پیش نظر دو مہینے تک مسلمانوں نے شہر کا محاصرہ جاری رکھا۔ اس دوران میں رومی فوجیں وقتاً فوقتاً شہر سے نکلتیں اور چند جھڑپوں کے بعد واپس ہو جاتیں۔ اس اثناء میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ آس پاس کے علاقوں میں چھاپے مار دستوں کو بھیج بھیج کر، فوج کی غذائی ضروریات پوری کرتے رہے۔ محاصرہ طویل ہو جانے کے بعد مدافعین شہر یہ توقع کر رہے تھے کہ عربوں کو مصر سے نکالنے کے لیے مرکزی حکومت ان کی مدد کرے گی، لیکن نہ کمک پہنچی، نہ اس کے پہنچنے کی کوئی خوشخبری انہیں ملی۔ اب رومی سالار نے، عربوں پر فتح پانے کے لالچ میں، فیصلہ کیا کہ شہر کی چار دیواری

Marfat.com

سے نکل کر دشمن سے دست بدست جنگ کرے۔ لیکن لڑائی شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ مسلمان بھرے ہوئے شیر ہیں جو موت سے نہیں ڈرتے۔ اس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ شہر کی طرف سمٹ کر قلعوں میں پناہ لے لے۔ انہیں پسپا ہوتے دیکھ کر مسلمان ان پر جھپٹ پڑے اور کشتیوں کے پشتے لگا دیئے، جس سے رومی فوج میں عام افراتفری پھیل گئی۔ مسلمانوں نے تیزی سے بڑھ کر شہر کے دروازے پر قبضہ کر لیا اور فصیلوں سے گزر کر قلعوں پر مسلط ہو گئے۔ اب رومیوں کے لیے تسلیم کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے شہر پر قابض ہو کر مضبوط قلعوں کو منہدم کرا دیا، ان تمام جہازوں کو آگ لگوا دی جو قریب کی بندرگاہ میں لنگر انداز تھے اور وہ سارے کلیسا، وہ تمام دیر مسمار کرا دیئے، جن میں رومی قلعہ بند ہو سکتے تھے، اس کے بعد اس شہر کو ایک ایسا قلعہ بنا دیا، جس سے فلسطین اور بلاد عرب کے رستے پر امن ہو گئے۔ اب وہ یہ سوچ رہے تھے کہ مصر کی اس فتح اولین کے بعد آئندہ کے لیے راہ عمل کیا ہو؟ مقوقس نے فرما کے مدافعین کی مدد کیوں نہیں کی؟ یہ سوال ہر مؤرخ کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ بٹلر کے نزدیک اس کی وجہ صرف قیرس کی قیصر سے بددیانتی ہے، جس نے اسکندریہ کی بطریقی کو قسطنطنیہ کے اثر سے آزاد کرانے کے لیے عربوں سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا، لیکن بٹلر اپنی اس رائے کا استنباط، صرف حالات وحوادث سے کرتا ہے، اس کے لیے کوئی واقعاتی سند نہیں دیتا۔ ہمارے خیال میں وہ کسی تاریخی حقیقت کے بجائے، مسیحی جذبے سے مغلوب ہو گیا ہے۔ کیونکہ قیرس کسی عرب سے ملا ہی نہیں، جو وہ ان سے معاہدہ کرتا پھر اس نے بعد کو بابلیون اور اسکندریہ میں مسلمانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ پس یہ کہنا کہ اس نے کسی ذاتی غرض کے لیے رومی حکومت سے غداری کی تھی محض جذباتی بات ہے، جس کی تائید تاریخی منطق نہیں کرتی۔

ہمارے نزدیک فرما کے مدافعین کی مدد نہ کرنے کے بہت سے اسباب تھے، جن میں سب سے پہلا مصر کے رومیوں کا یہ احساس تھا کہ مصری عوام ان سے زبردست عداوت رکھتے ہیں۔ انہوں نے مصر یا اسکندریہ کی فوجیں فرما بھیج دیں اور مصریوں نے ان کے خلاف بغاوت کر دی تو ان کی طاقت جواب دے جائے گی اور فرما کی امداد انہیں بڑے شہروں کی بغاوت کے برے اثرات سے نہیں بچا سکے گی۔ پھر وہ ابھی ان شکستوں کو بھی نہ بھولے تھے جو شام اور فلسطین میں انہیں مسلمانوں کے ہاتھوں اُٹھانی پڑی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ وہ کھلے میدانوں میں ان سے جرأت

کے حملوں کا مقابلہ کرنے کو تیار نہ ہوئے اور یہی بہتر سمجھا کہ مصر اور منف کے قریب بابلیون میں قلعہ بند ہو جائیں، جہاں نیل ان کے اور دشمن کے درمیان خندق کا کام دے اور فرما اور دوسرے چھوٹے چھوٹے قلعہ بند شہر مسلمانوں کی پیش قدمی کو اتنی دیر تک روکے رکھیں کہ انہیں بڑے بڑے مرکزی مقامات کو مضبوط و مستحکم کرنے کا موقع مل جائے۔ اس کے بعد اگر عربوں نے آگے قدم بڑھایا اور شہر مصر تک پہنچ گئے تو اس کے قلعے ان کے لیے روک بن جائیں گے اور بہت ممکن ہے کہ ان کا قصہ بھی پاک کر دیں۔ اس طرح مسلمانوں کو مصر سے نکالا جا سکے گا اور وہ دوبارہ مصر پر چڑھائی کرنے کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لا سکیں گے۔

یہ انداز فکر جنگی نقطہ نظر سے غلط تھا۔ لیکن بعد کو جو واقعات پیش آئے وہ بتاتے ہیں کہ اول اول جب عرب مصر میں داخل ہوئے، مقوقس اور اس کے ساتھیوں کا انداز فکر یہی تھا۔ فرما فتح ہو جانے کے بعد وہ بدو جو صحرائے مصر کی سرحدوں پر آباد تھے، غنیمت کے لالچ میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مل گئے اور اس طرح وہ نقصان پورا ہو گیا جو مسلمانوں کو اپنے پہلے محاصرے میں اُٹھانا پڑا تھا۔ اس کے بعد ابن عاص رضی اللہ عنہ ان سرحدوں کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف روانہ ہوئے اور قدیم شہر ''مجدل'' سے گزر کر اس مقام پر پہنچے جہاں آج کل ''قنطرہ'' آباد ہے۔ یہاں سے انہوں نے مغرب کی طرف قصاصین کا رخ کیا اور جنوب مغرب کی سمت اپنی پیش قدمی جاری رکھتے ہوئے بلبیس جا پہنچے، سرزمین مصر کی اس طویل مسافت میں جو اسلامی شہ سواروں نے طے کی، ابن عبدالحکم اور ان کے متبعین کے الفاظ میں ابن عاص رضی اللہ عنہ کو ''صرف معمولی سی مزاحمت پیش آئی۔''

یہ مؤرخین لکھتے ہیں کہ جو بدو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو گئے تھے، ان میں سے ایک چرواہا رستے کی کسی بستی میں گیا۔ وہاں ایک قبطی دوسرے قبطی سے کہہ رہا تھا: ''تمہیں ان لوگوں پر حیرت نہیں ہوتی کہ اتنی قلت تعداد کے باوجود رومی فوجوں سے ٹکر لینے چلے ہیں؟'' دوسرے نے جواب دیا ''یہ لوگ جس طرف رخ کرتے ہیں کامیاب ہوتے ہیں۔'' یہ طویل مسافت اور قبطیوں کی یہ گفتگو صریح دلالت کرتی ہے کہ مقوقس اور اس کے ساتھی مصریوں کی طرف سے مطمئن نہیں تھے اور اسی لیے انہوں نے اس کھلی اور صحرا سے ملی ہوئی زمین میں غازیان اسلام کا مقابلہ کرنے کی جگہ شہر مصر میں قلعہ بند ہو جانے کو ترجیح دی۔ چنانچہ مسلمانوں کو رستے میں ''معمولی سی مزاحمت'' کے سوا کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی۔ یہاں تک کہ وہ بلبیس پہنچ گئے، جہاں

Marfat.com

سے مصر کے شہر اور قلعوں کا فاصلہ صرف تینتیس (۳۳) میل تھا۔ مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ مسلمان بلبیس میں ایک مہینے تک رہے۔ اس دوران میں لڑائی ہوتی رہی اور آخر میں فتح مسلمانوں کو ہوئی، لیکن اس امر میں ان کا اختلاف ہے کہ یہ جنگ شدید تھی یا اس میں بھی مسلمانوں کو اتنی ہی مزاحمت پیش آئی جو فرما سے کوچ کرنے کے بعد رستے میں پیش آئی تھی۔

بعض روایات ہے کہ جب ابن عاص رضی اللہ عنہ بلبیس پہنچے تو مقوقس نے مسلمانوں کو مصر سے واپسی کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے اپنے نمائندے ان کے پاس بھیجے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے پادریوں کے اس وفد کے سامنے بعثت نبوی کا حال بیان کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم دہرانے کے بعد کہ اتمام حجت کے طور پر لوگوں کے سامنے اسلام پیش کرنا مسلمانوں کا فرض ہے، ان سے کہا ''ہم تمہیں اسلام کی دعوت دیتے ہیں، جو کوئی ہماری اس دعوت کو قبول کرلے گا، اس میں اور ہم میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ لیکن جو اس سے انکار کرے گا ہم اس سے جزیہ لیں گے اور اس کے معاضے میں اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ ہمیں بتایا جاچکا ہے کہ ہم تم پر فتح پائیں گے اور ہمیں نصیحت کی گئی ہے کہ اگر تم ہماری دعوت قبول کرلو تو قرابت داری کے احترام میں ہم تمہاری بطور خاص حفاظت کریں!'' پادری سمجھ گئے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ حضرت ہاجرہ k کے رشتے کی طرف اشارہ کررہے ہیں اور بولے ''اتنی دور کی رشتہ داری کو صرف پیغمبر ہی زندہ کرسکتے ہیں،'' پھر کہا ہم واپس آکر ایمان لائیں گے! حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''مجھ جیسے شخص کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا، لیکن میں تمہیں تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔ تم خود بھی سوچ لو اور اپنی قوم سے بھی مشورہ کرلو، اس کے بعد میں تم سے جنگ کروں گا!'' انہوں نے مزید مہلت چاہی تو پہلے ایک دن بڑھا کر چار دن اور آخر کار پانچ دن کردیئے گئے۔ پادریوں نے ساری گفتگو مقوقس کو سنائی۔ سپہ سالار اطربون نے مسلمانوں سے جنگ کرنے پر اصرار کیا۔ نمائندگی کرنے والے پادریوں نے لوگوں کو سراسیمہ پاکر ان سے کہا ''ہم تمہارے بچاؤ کے لیے انتہائی کوشش کریں گے اور ان کے پاس نہیں جائیں گے ابھی چار دن باقی ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ اس دوران میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی، امن وامان رہے گا۔''

اس گفتگو کے بعد اطربون بارہ ہزار کیل کانٹے سے لیس فوج لے کر روانہ ہوا اور بلبیس پہنچ کر اچانک مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا، لیکن ابن عاص رضی اللہ عنہ بھی حد درجہ محتاط تھے۔ ان کی تمام فوج گنے چنے شہ سواروں پر مشتمل تھی، اس لیے قیامت کا رن پڑا اور جیسا کہ اس روایت کے ناقلین کا بیان

Marfat.com

ہے۔ مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد اس میں کام آئی۔ رومیوں کے ایک ہزار سپاہی قتل اور تین ہزار سپاہی گرفتار ہوئے۔ اس کے بعد اطربون میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور اس کے لشکر کی دھجیاں بکھیر دی گئیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اطربون اس معرکے میں قتل کر دیا گیا تھا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ پورے ایک مہینے تک بلبیس میں کیوں مقیم رہے؟ اور کیا وہ رومیوں کے مقابل ہونے اور ان پر فتح پانے سے پہلے ایک ماہ تک یہاں رہے اور فتح یاب ہوتے ہی شہر مصر کی طرف روانہ ہو گئے۔ یا فتح کے بعد انہوں نے بلبیس میں ایک ماہ تک قیام کیا اور اس دوران میں آئندہ کے لیے لائحہ عمل مرتب کر کے پھر آگے بڑھے؟

جن کتابوں کو میں نے اپنا ماخذ بنایا ہے، ان میں اس کی وضاحت نہیں ہے۔ بٹلر نے عربی فتوحات کی تاریخوں کے متعلق جو چھان بین کی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ عیدالاضحیٰ سنہ ۱۸ ہجری مطابق ۱۲ دسمبر ۶۳۹ء کو عریش میں تھے۔ انہوں نے فرما، ایک مہینے کے محاصرے کے بعد قریباً ۲۰ جنوری ۶۴۰ء کو فتح کیا، اور اسی سال اپریل کی آخری تاریخوں میں ہلیو پولیس پہنچے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلبیس وہ فروری میں پہنچے تھے اور مارچ کا بیشتر مہینہ انہوں نے وہیں گزارا لیکن ان تاریخوں میں ہمارے سوال کا جواب نہیں ملتا۔ آپ از راہ استنباط کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے بلبیس پہنچتے ہی مصری نمائندے ان کے پاس آ گئے تھے اور اطربون سے مسلمانوں کی جنگ ان کے ابتدائی زمانہ قیام میں ہو گئی تھی، فتح پانے کے بعد مسلمانوں نے فوراً وہاں سے کوچ نہیں کیا تھا بلکہ وہیں ٹھہر کے آس پاس کے علاقوں کی حمایت حاصل کرتے رہے تھے اور ایک مہینے کی مسلسل جدوجہد کے بعد انہیں مصریوں کا تعاون حاصل ہوا تھا۔ لیکن اسی طرح آپ یہ بھی استنباط کر سکتے ہیں کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ مصری نمائندوں کی آمد سے پہلے بلبیس میں ایک ماہ تک مقیم رہ کر خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ کی موعودہ کمک کا انتظار کرتے رہے اور جب اطربون ان کی طرف فوج لے کر آیا تو اسے شکست دے دی۔ پھر اس فتح نے مسلمانوں کے دل میں جو ہمت و جوش اور رومیوں کے دل میں مسلمانوں پر غالب نہ آ سکنے کا جو رعب و یقین پیدا کیا تھا، اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے انہوں نے اس امید میں شہر مصر کا رخ کیا کہ اللہ تعالیٰ وہاں بھی مسلمانوں کو اپنی نصرت سے نوازے گا۔

کیا اطربون کے مقابل ہونے سے پہلے وہ کمک پہنچ گئی تھی، جس کا حضرت ابن عاص رضی اللہ عنہ کو انتظار تھا اور اس کمک کے بل پر انہوں نے اطربون کو شکست دی تھی، یا اس فتح میں ان کے

ساتھ وہ مختصر اسلامی لشکر جو فرما کی جنگ کے بعد بچ رہا تھا وہ بدوی سپاہی تھے، جنہوں نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی فوج میں شامل ہو کر محاصرۂ فرما کے جانی نقصان کی تلافی کر دی تھی۔ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ امدادی فوج بلبیس کی فتح اور وہاں سے اسلامی لشکر کی روانگی کے بعد پہنچی تھی۔ ابن عبدالحکم اور ان کی متابعت میں سیوطی اور ابن تغری بردی کہتے ہیں کہ "عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے پیش قدمی کی اور رستے میں انہیں معمولی سی مزاحمت پیش آئی۔ بلبیس پہنچ کر وہ تقریباً ایک مہینے تک رومیوں سے لڑتے رہے اور آخر کار اللہ نے انہیں فتح عنایت فرمائی۔ یہاں سے معمولی مزاحمتوں کا سامنا کرتے ہوئے وہ ام دنین پہنچے اور شدید جنگ کے بعد ظفر مند ہوئے۔ ام دنین سے انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کمک بھیجنے کے لیے لکھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چار ہزار مجاہدین اسلام کی ایک فوج روانہ کر دی، جس سے ابن عاص رضی اللہ عنہ کے لشکر کی تعداد آٹھ ہزار ہو گئی۔" اس بیان سے صراحت ہو جاتی ہے کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے کمک پہنچنے سے پہلے اطربون پر فتح پائی تھی اور اس کے بعد ہی بلبیس سے روانہ ہوئے تھے۔ اطربون اور اس کی بارہ ہزار فوج کو انہوں نے چار ہزار کے اس لشکر سے شکست دی تھی جو عربوں اور مصر کے بدویوں پر مشتمل تھا۔

ابن عاص رضی اللہ عنہ بلبیس سے صحرا کی سرحد پر پیش قدمی کرتے ہوئے ام دنین کی بستی کے قریب جا پہنچے، جو دریائے نیل پر خلیج تراجان کے منبع کے پاس واقع تھی۔ یہ خلیج سوئز کے قریب شہر مصر کو بحیرہ روم سے ملاتی تھی۔ جہاں آج کل قاہرہ کا محلہ ازبکیہ ہے، وہیں اس زمانے میں دنین کی بستی تھی، جسے رومیوں نے قلعہ بند کر رکھا تھا، اس کے قریب دریائے نیل کا گھاٹ تھا، اس گھاٹ پر بہت سی کشتیاں کھڑی رہتی تھیں۔ یہ بستی بابلیون کے شمال میں تھی جو شہر مصر کا سے بڑا قلعہ تھا۔ اس لحاظ سے ام دنین کو مصریوں کے اس محبوب علاقے کی، جو فراعنہ متقدمین کا دارالحکومت بھی رہ چکا تھا، سب سے پہلی دفاعی چوکی کہا جا سکتا ہے۔ بابلیون کا قلعہ، رومیوں کا ناقابل تسخیر قلعہ تھا اور اس جگہ واقع تھا جہاں آج کل قدیم مصر آباد ہے۔ اس کی بنیادیں ٹھوس اور دیواریں بے حد مضبوط تھیں، جن کے سہارے یہ قلعہ زمانے کی گردشوں کا مقابلہ کرتا رہا اور اس کی جڑیں انیسویں عیسوی کی آخری دو دہائیوں سے پہلے تک نہ ہل سکیں۔ مسمار ہو جانے کے باوجود آج بھی اس شہر کے کھنڈر ہماری نگاہوں کے لیے سامان عبرت بنے ہوئے ہیں۔

اس قلعے کے جنوب میں چند میل کے فاصلے پر منف کا تاریخی شہر آباد تھا، جو اس زمانے میں مصر کا دارالسلطنت تھا، جب ساری دنیا کی نگاہیں مصر پر لگی ہوئی تھیں کہ وہ نزول وحی کا منبع اور

Marfat.com

تہذیب وتمدن کا مرکز تھا۔ منف کی یہ آن بان قائم رہی، یہاں تک کہ اسکندریہ اس پر سبقت لے گیا اور اس دن سے منف کا سر جھکنے اور اس کا آفتاب عظمت واقبال گہنانے لگا۔ تاہم یہ شہر رونق وجلال میں اسکندریہ سے آنکھ ملاتا رہا۔ جب مصر عالمی تہذیب کی پیشوائی کرتا تھا۔ اسی طرح وہ اہرام اور وہ عظیم الشان مقبرے بھی اسکندریہ کے لیے سرمایہ نازش تھے جو اس کے چاروں طرف بکھرے پڑے تھے۔ مصر اس زمانے میں منف یا اس شہر کو کہتے تھے جو منف کے بالمقابل دریائے نیل کے کنارے پر واقع تھا، اس کی شہرت اتنی وسیع اور اس کی آبادی اتنی گنجان تھی کہ بعض اوقات اسی کو منف کے نام سے موسوم کر دیا جاتا تھا۔ منف اور حیرہ کے درمیان گزرنے والے مغربی صحرا میں عظیم وجلیل اہرام کا ایک سلسلہ قائم تھا جو ہرم خوفو اور اس کے دوہم جوار اہرام پر اس جگہ ختم ہوتا تھا جہاں ان اہرام کے سائے میں بیٹھا ہوا کشیدہ سر ابوالہول روزانہ طلوع آفتاب کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا ہے۔ یہ سب کے سب اہرام ومقابر، روضہ، بابلیون اور ام دنین کے قلعوں کے سامنے تھے۔

کیا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ چلنے والے مسلمانوں نے کبھی اس نظر فریب منظر کا تصور بھی کیا تھا جس کی تمام دنیا میں نظیر نہیں ملتی؟ کیا ان بدویوں نے جو اسلامی فوج کی فرما سے روانگی کے بعد اس میں شامل ہوئے تھے، بلبیس سے چلتے وقت، جب رومی لشکر پر فتح حاصل کر لی گئی تھی، مسلمان سپاہیوں سے اس کا ذکر کیا تھا؟ اور کیا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی فوج میں سے کسی نے مدائن کی فتح اور کسریٰ کا سفید محل دیکھا تھا کہ وہ اندازہ کر سکتا کہ سرزمین مصر کے اس حصے میں دنیا کے عجائب جمع ہیں۔ یا اپنی قلت تعداد اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے رومیوں سے خطرناک ٹکر لینے کی فکر میں وہ اس درجہ منہمک تھے کہ انہیں ان باتوں کا ہوش ہی نہ تھا؟ ام دنین کے قریب پہنچ کر انہوں نے پڑاؤ ڈالا اور نیل کے وسیع پاٹ نے، اس کے گرد پھیلے ہوئے سبزہ زاروں اور بہار کے مسکراتے ہوئے درختوں اور پودوں نے جنت نگاہ بن کر ان کے دامن دل کو کھینچ لیا۔ لیکن فوراً ہی ان کی نگاہیں اس دلفریب منظر سے ہٹ کر ان قلعوں پر جم گئیں جو ان کے سامنے استادہ تھے اور جنہیں ان کی مضبوطی کے باوجود رومیوں نے پوری طرح مسلح کیا تھا۔ اگر عرب ان قلعوں پر فتح نہ پا سکے تو پھر ان کے لیے پورے مصر میں کہیں ٹھکانا نہیں! رومیوں نے قلعہ بابلیون میں اپنی بہترین فوج پہنچا دی تھی اور ام دنین کے قلعے کو خوب اچھی طرح مضبوط کر کے جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ انہیں اس میں کوئی شک نہ رہا تھا کہ یہ جنگ زندگی اور موت کی جنگ ہے، جس کے نتیجے میں یا تو وہ

Marfat.com

عربوں کو پسپا کر دیں گے یا خود اُلٹے پاؤں بھاگتے ہوئے اسی قسم کے الفاظ دہرائیں گے جو شام کو آخری بار الوداع کہتے وقت ہرقل کی زبان سے بے اختیار نکل گئے تھے اور کہیں گے "تجھ پر سلامتی ہو، اے مصر! اب ہم آپس میں کبھی نہیں ملیں گے!"

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے موقع کی نزاکت اور خطرے کو محسوس کیا، جاسوسوں کی خبروں سے انہیں اندازہ ہو گیا کہ ان کی فوج قلعہ بابلیون کی فتح یا اس کے محاصرے کے لیے ناکافی ہے، وہ اپنی اس فوج کے ساتھ مصر کے شہر کو فتح نہیں کر سکیں گے جو قلعہ بابلیون کے جوار اور حمایت میں ہے۔ اسی طرح انہیں یہ احساس بھی ہوا کہ اگر رومیوں سے جنگ نہ کی گئی تو اسلامی فوج کا رعب جاتا رہے گا اور اس کی ہمتیں پست ہو جائیں گی جس سے دشمن کو شہ ملے گی اور وہ مسلمانوں پر غالب آ کر انہیں بری طرح پیچھے دھکیل دے گا۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہو گیا تو اس کا نتیجہ نہ جانے کیا ہو گا؟ حالانکہ فتح مصر پر اصرار کرنے والے وہی تھے اور انہیں یقین تھا کہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ عنقریب ان کی مدد ضرور کریں گے، لہٰذا دشمن سے ایک نصرت انجام ٹکر لینی ناگزیر ہے۔ اس کے بعد انہیں اتنا وقت مل جائے گا کہ کمک پہنچنے کا انتظار کر سکیں۔ لیکن قلعہ بابلیون کو فتح کرنے کی ابھی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس لیے ام دنین کے قلعے کا محاصرہ کر کے اس کی فتح کے لیے پوری قوت صرف کر دینی چاہیے۔ اگر وہ اس پر قابض ہو گئے تو اس کی بندرگاہ کے سارے جہاز ان کے اشارے پر ہوں گے اور وہ اطمینان سے آئندہ کے لیے لائحہ عمل مرتب کر سکیں گے۔ احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کو ہلاکت میں نہ ڈالیں اور امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ سے فوجی امداد حاصل کریں تاکہ اس کی آمد سے ان کی فوج کے حوصلے بڑھ جائیں۔ چنانچہ انہوں نے قاصد کے ہاتھ ایک خط مدینہ بھیجا اور اس میں اپنے سفر مصر کے حالات، قلعوں کی تفصیلات اور ان پر حملہ کرنے کے لیے کمک کی ضرورت کا اظہار کیا۔ ادھر فوج میں یہ اعلان کرا دیا کہ امدادی فوجیں بہت جلد پہنچنے والی ہیں۔ اس کے بعد ام دنین کی طرف بڑھے اور اس کا محاصرہ کر کے قلعے میں غذائی اور فوجی ضروریات کے سامان کی رسد روک دی۔

قلعہ بابلیون میں جو رومی تھے، انہوں نے ادھر آنے کی کوشش نہ کی۔ انہیں اطربون کا حشر معلوم ہو چکا تھا اور وہ جانتے تھے کہ عربوں سے کھلے میدان میں لڑنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ ام دنین کی فوجیں البتہ کبھی کبھار نکلتیں اور ناکام جھڑپوں کے بعد واپس ہو جاتیں۔ کئی ہفتے اسی طرح گزر گئے۔ مسلمانوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ تھی، اس لیے کہ غذائی سامان ان کے قبضے میں

Marfat.com

تھا۔اسی اثناء میں خبر ملی کہ بارگاہ خلافت سے پہلی امدادی فوج روانہ کردی گئی ہے اور وہ آج کل میں پہنچا ہی چاہتی ہے اس خبر سے مسلمانوں کی ہمت وطاقت میں اضافہ ہوگیا، جب یہ امدادی فوج پہنچی اور ہرقل کی ان فوجوں نے، جو قلعے کی حفاظت کررہی تھیں، اسے دیکھا تو ان کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور انہوں نے قلعے سے نکل کر مقابلہ کرنا کم کردیا۔حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے، جو قلعے کے درون وبروں سے واقف تھے، جب ان کی یہ حالت دیکھی تو ایک وقت مقرر کر کے مجاہدین کو حکم دیا کہ یک جان ہو کر قلعے پر دھاوا بول دیں اور بزور شمشیر اسے فتح کرلیں۔خود ابن عاص رضی اللہ عنہ مقدمۃ الجیش کے ساتھ قلعے کے دروازے کی طرف بڑھے۔اللہ نے انہیں فتح ونصرت سے ہم کنار کیا اور دشمن کی بڑی تعداد کو تلوار کے گھاٹ اُتارنے اور جو زندہ بچے انہیں گرفتار کرنے کے بعد وہ قلعے پر قابض ہوگئے۔

مؤرخین نے اس جنگ کے فیصلہ کن مرحلے کا ذکر نہیں کیا۔بٹلر کا کہنا ہے کہ اس دن حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اپنے سپاہیوں پر تشدد کیا تھا اور سند میں مؤرخین عرب کی یہ روایت پیش کی ہے کہ ''حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فوج کے کچھ سپاہیوں کو لڑائی سے ہچکچاتے دیکھ کر انہیں اُبھارا اور پیش قدمی کا حکم دیا۔پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا۔''آگے بڑھیے! اللہ تعالیٰ آپ حضرات کے طفیل ہمیں فتح یاب کرے گا۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معرکے میں کود پڑے۔ان کی دیکھا دیکھی دوسرے مسلمان بھی جوش میں آگئے اور اللہ نے انہیں فتح ونصرت سے شاد کام فرمایا۔ابن اثیر اس قصے کو عین شمس کے سلسلے میں بیان کرتے ہیں۔بہرحال یہ قصہ کسی جنگ میں پیش آیا ہو، اس میں شک نہیں کہ ام دنین پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے میں کمک کی آمد کو بہت بڑا دخل تھا جب کہ اس فتح میں دیر ہوتی جارہی تھی۔یہاں سے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے کشتیوں پر دریائے نیل عبور کیا اور اہرام جیزہ سے گزر کر صحرا میں قدم زن ہوگئے۔

بابلیوں کی پناہ میں بیٹھے ہوئے رومیوں کو ام دنین میں اپنے ساتھیوں کا حشر معلوم ہوا تو ہکا بکا رہ گئے اور ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ اسلامی لشکر دریائے نیل کو عبور کرکے صحرا میں گرم سفر ہے۔ابن عاص رضی اللہ عنہ نے دریا کیوں پار کیا ہے؟ وہ کدھر کا رخ کریں گے؟ کیا ان کا ارادہ یہ ہے کہ نہر کانوبی کے رستے اسکندریہ جا کر اسے فتح کریں؟ اگر ایسا ہے تو انہیں منہ کی کھانی پڑے گی! لیکن جب سے ابن عاص رضی اللہ عنہ سرزمین مصر میں داخل ہوئے تھے، رومیوں کو ان کی نقل وحرکت کی خبریں برابر مل رہی تھیں اور انہیں ابن عاص رضی اللہ عنہ کی جنگی چالوں

اور دوراندیشیوں کا خاصا تجربہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ ان کی منزل مقصود کا اندازہ نہ کر سکے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اس وقت اسکندریہ کا قصد نہیں کیا تھا اور وہ یہ غلطی کر بھی کیسے سکتے تھے جبکہ جانتے تھے، اسکندریہ کا بحری رستہ رومیوں کی مدد کے لیے کھلا ہوا ہے اور اگر وہ اس کی طرف بڑھیں گے تو بابلیون کے قلعے کو اپنے پیچھے چھوڑ جائیں گے، جہاں رومیوں نے بے شمار فوج اور اسلحہ جمع کر رکھا ہے۔ وہ تو اصل میں فیوم جانا چاہتے تھے تاکہ وہاں کے باشندوں میں خوف وہراس پیدا کریں اور مصریوں کو یقین دلادیں کہ رومی حکومت بالآخر ختم ہونے والی ہے۔ فیوم اور بابلیون کے درمیان جو صحرائی رستہ تھا اس میں کوئی دشواری بھی نہ تھی، جزیرہ نمائے عرب کے صحرازادے اس پر بہ آسانی سفر کر سکتے تھے۔ پھر وہ قریب کا رستہ تھا جسے گھڑ سوار چند گھنٹوں میں طے کر لیتا تھا۔ اگر ابن عاص رضی اللہ عنہ اس صوبے میں خوف وہراس پھیلانے میں کامیاب ہو گئے تو ان کا مقصد پورا ہو جائے گا اور انہیں اتنا وقت مل جائے گا کہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اس نئی کمک کا انتظار کر سکیں، جس کی مدد سے وہ فتوحات کا پروگرام مکمل کر کے مصر میں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔

لیکن فیوم کی سرحد پر پہنچتے ہی حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ رومی اس صوبے کی مدافعت کے لیے کمربستہ ہو چکے ہیں اور انہوں نے اس کے رستوں پر فوج متعین کر دی ہے۔ یہ سن کر ابن عاص رضی اللہ عنہ صحرا میں رک گئے اور چھوٹے چھوٹے دستوں کو آس پاس کی بستیوں پر چھاپے مارنے کے لیے بھیجنا شروع کر دیا، جو فوج کی غذائی ضروریات کے پیش نظر مویشی لے آتے تھے۔ اسی اثناء میں اس علاقے کے بدویوں سے معلوم ہوا کہ رومیوں کا ایک دستہ حنا نامی سپہ سالار کی قیادت میں نیستانوں اور کھجور کے باغوں کی آڑ لیتا ہوا ان کے مقابلے پر آ رہا ہے۔ جب اسلامی دستے آبادی پر چھاپا ماریں گے، وہ مختلف راستوں پر متعین فوج کو لے کر ان پر حملہ کر دے گا، یہ خبر سنتے ہی ابن عاص رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج کو پیچھے ہٹا لیا، یہاں تک کہ حنا اور اس کے دستے سے دور ہو گئے۔ اس کے بعد پلٹے اور اسے گھیر کر اس کے ایک ایک آدمی کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس کارنامے نے یہاں کے باشندوں پر رعب طاری کر دیا۔ فیوم کے رومی سپہ سالار کو جب حنا کے مارے جانے کی اطلاع ملی تو بہت غمگین ہوا اور اس کی لاش ڈھونڈنے کا حکم دیا۔ جب دریا سے اس کی لاش ملی تو اسے حنوط کر کے بابلیون پہنچایا گیا، جہاں سے وہ ہرقل کے پاس قسطنطنیہ بھیج دی گئی۔ اسے دیکھ کر ہرقل کو بے حد صدمہ ہوا اور اس نے قسم کھائی کہ اپنی پوری قوت

کے ساتھ مدافعت کرے گا۔

رومی فوج مسلمانوں سے لڑنے فیوم سے روانہ ہوئی لیکن ابن عاص رضی اللہ عنہ نے حنا پر کامیابی اور اس کامیابی کا جو رعب اس صوبے پر پڑا تھا، اسی کو اپنے لیے کافی سمجھا اور صحرا میں مورچہ بند ہو کر بیٹھ رہے۔ وہ جانتے تھے کہ رومی صحرا میں عربوں سے لڑتے ہوئے ڈرتے ہیں اور اس میں انہیں موت چھپی ہوئی نظر آتی ہے۔ رومیوں نے جو انہیں صحرا کی طرف سمٹتے دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور یہ سمجھ کر کہ مسلمان ڈر کے مارے بھاگ رہے ہیں۔ خوشی خوشی اپنے مستقر پر واپس آ گئے اور شکر کیا کہ اللہ نے انہیں اس خطرناک جنگ سے بچا لیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ ان سے ڈر کر صحرا کی طرف نہیں ہٹے تھے بلکہ پوری تیزی کے ساتھ ام دنین واپس جا رہے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کا ایک قاصد ان کے پاس آیا تھا اور اس نے یہ اطلاع دی تھی کہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تازہ کمک روانہ کر دی ہے جو فرما سے بلبیس اسی رستے سے آ رہی ہے جس رستے سے ابن عاص رضی اللہ عنہ آئے تھے اور رومیوں کے قلعوں کے پاس پہنچا ہی چاہتی ہے۔ اب حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ کمک کی طرف واپس ہوں، ورنہ اندیشہ تھا کہ رومی انہیں دریا پار نہ کرنے دیں گے اور وہ ابن عاص رضی اللہ عنہ تک نہ پہنچ سکے گی۔ سچ یہ ہے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں انتہائی ذہانت و بصیرت کا ثبوت دیا تھا۔

رومی نیل کے کنارے قلعہ بابلیون میں موجود تھے اور ان کے لیے بالکل ممکن تھا کہ قلعے سے نکل کر دریا عبور کرتے اور کمک، مسلمانوں تک نہ پہنچنے دیتے۔ لیکن رومیوں نے ایسا نہ کیا اور ابن عاص رضی اللہ عنہ کو موقع مل گیا کہ وہ فوج کو لے کر نیل کے مشرقی کنارے پر اُتر جائیں اور اس کمک سے جا ملیں جو رومی قلعے کے قریب ہلیو بولیس میں خیمہ زن ہوئی تھی۔ اس عدیم النظیر سپہ سالار سے یہ جنگی معجزہ کیسے ظہور پذیر ہوا؟ کیا اس نے رات کی تاریکی کے پردے میں دریا عبور کیا؟ کیا رومی اتنے بے خبر تھے کہ انہیں اسلامی فوجوں کے دریا پار کرنے کی کوئی سن گن نہ ملی اور وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ یا انہیں کمک پہنچنے کا علم ہو چکا تھا اور وہ ڈرتے تھے کہ اگر قلعہ خالی کیا گیا تو یہ کمک اس پر دھاوا بول کر اسے تاراج کر دے گی؟ مؤرخین نے اس ماہرانہ پالیسی اور فیوم سے ہلیو بولیس تک کے اس خطرناک سفر کے ضمن میں کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے اس مسئلے پر روشنی پڑتی ہو۔ بٹلر نے مختلف مآخذ کو سند بنا کر جو کچھ کہا ہے اس کا لب لباب یہ

Marfat.com

ہے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے دریا عبور کر لیا۔ چاہے طاقت کے بل پر، چاہے رومیوں کو دھوکہ دے کر............ بٹلر نے لکھا ہے: ''گمان غالب یہ ہے کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے ام دنین کے شمال میں نچلی طرف سے دریا عبور کیا۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی کمک دو حصوں میں تقسیم ہو کر عین شمس یعنی ہلیو پولیس کی طرف جا رہی ہے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مغربی سمت خطرے سے خالی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ ڈرتے تھے کہ رومی ان کے ارادے کو بھانپ کر کہیں ان کے اور اس امدادی فوج کے درمیان حائل نہ ہو جائیں جو زبیر رضی اللہ عنہ لے کر آئے تھے۔ لیکن رومی سپہ سالار تھیوڈور نے حسب عادت اس موقع کو ہاتھ سے کھو دیا اور مسلمانوں پر فیصلہ کن ضرب نہ لگائی۔ چنانچہ ابن عاص رضی اللہ عنہ کے لیے امدادی فوجوں کی طرف بڑھنا ممکن ہو گیا اور وہ ہلیو پولیس میں اپنے ساتھیوں سے جا ملے جو ان کی مدد کے لیے آئے تھے۔ اس طرح ان کی فوج کے حوصلے بڑھ گئے اور اپنی اس شاندار کامیابی پر ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

یہ امدادی فوج آٹھ ہزار مجاہدین پر مشتمل تھی جس کی کمان حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ اور مسلمہ بن مخلد ان رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ ان کی آمد سے بہت خوش ہوئے۔ اگر ان کے پہنچنے میں کچھ دیر اور لگ جاتی تو صورت حال اتنی نازک ہو جاتی کہ بڑے سے بڑا سپہ سالار بھی اس سے عہدہ برآ نہ ہو سکتا۔ حق ہے کہ سرزمین مصر میں قدم رکھنے کے بعد سے کمک پہنچنے تک ابن عاص رضی اللہ عنہ میدان جنگ میں جس طرح داد شجاعت دیتے رہے اس کی بنا پر وہ صحیح معنی میں اس کے مستحق ہیں کہ ایک ماہر و جانباز سپہ سالار کا تاج فخر ان کے سر پر رکھا جائے۔ انہوں نے قیامت آسا خطرات کا بے دھڑک مقابلہ کیا اور دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا کہ رومی اس قوم کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے، جس نے کسریٰ کی طاقت کے پرخچے اُڑا دیئے اور قیصر کی قوتوں کو کچل کے رکھ دیا۔ کیا انہوں نے فرما، بلبیس، دنین اور فیون میں رومی لشکروں کا مقابلہ نہیں کیا، لیکن رومی ان پر ایک بار بھی غالب نہ آ سکے اور ہر بار رومیوں پر غالب آئے۔ اس دوران میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ان کے خطوط مسلسل پہنچتے رہے جن میں جلد سے جلد کمک کی درخواست ہوتی تھی۔ پہلی کمک جو بارگاہ خلافت سے روانہ کی گئی، بہت کم تھی۔ لیکن اس سے ابن عاص رضی اللہ عنہ کے ارادے میں کوئی ضعف پیدا نہ ہوا، نہ انہوں نے مایوسی کو اپنے دل میں راہ پانے دی، بلکہ وہ اس بلند معنوی قوت کو قائم و برقرار رکھنے کی کوششوں میں لگے رہے، جو مجاہدین اسلام کی رگوں میں شجاعت و جوان مردی کا خون بن کر

رہی تھی۔ پھر انہیں یہ بھی یقین تھا کہ حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ مزید کمک ارسال فرمائیں گے۔ جس سے وہ اپنے تمام حوصلوں کو جامہ عمل پہنا سکیں گے۔

تعجب ہے کہ اتنے دنوں تک حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو مدد کیوں نہیں پہنچی؟ فرما اور بلبیس میں ان کی کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ انہیں جلد سے جلد کمک بھیجتے تا کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ کو دریائے نیل کے مستحکم قلعوں میں اس قلیل فوج کے ساتھ رومیوں سے ٹکر نہ لینی پڑتی۔ آپ کے خیال میں کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کا سپہ سالار عریش یا فرما میں ٹھہر کے کمک کا انتظار کرے گا اور اپنے اس مختصر سے لشکر کے ساتھ دشمن سے برسر پیکار نہ ہوگا۔ لیکن جب انہیں یہ اطلاعات ملیں کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ فرما کو فتح کر کے بلبیس کی طرف روانہ ہو گئے ہیں اور عنقریب فراعنہ کے پایہ تخت میں رومیوں سے نبرد آزما ہوا چاہتے ہیں تو انہوں نے عوام کو مدد کے لیے پکارا اور اس کے بعد جب ام دنین میں ابن عاص رضی اللہ عنہ کے ظفر مند ہونے کی خبر پہنچی تو حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں مزید کمک روانہ کی؟[1] بات چاہے کچھ ہو، اس وقت حضرت زبیر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی اور صحابی رضی اللہ عنہما تھے۔ ان کا شمار عرب کے گنے چنے بہادروں میں ہوتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب ان کے ارادے سے آگاہی ہو تو انہیں بلا کر فرمایا ''ابو عبداللہ! کیا مصر کی امارت چاہتے ہو؟'' حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: نہیں! مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میں تو جہاد اور مسلمانوں کی اعانت کے لیے جا رہا ہوں۔ اگر میں دیکھوں گا کہ عمرو رضی اللہ عنہ نے مصر فتح کر لیا ہے تو ان کے کام میں دخل نہیں دوں گا اور بعض ساحلی علاقے فتح کر کے ان سے جا ملوں گا۔ لیکن اگر وہ جہاد میں مصروف ہوئے تو ان کا ساتھ دوں گا۔''

---

[1] اس مسئلے میں روایات مختلف ہیں کہ مصر میں کمک کب روانہ کی گئی اور ایک ہی دفعہ روانہ کی گئی یا دو دفعہ؟ یہ روایات ابن عبدالحکم نے نقل کی ہیں اور اکثر مؤرخین نے انہیں قبول کیا ہے۔ لیکن ہم نے وہ روایت درج کی ہے جو واقعات کے سیاق وسباق سے دوسری روایتوں کے مقابلے میں قریب تر ہے۔ دوسری روایات میں سے ایک روایت میں ہے کہ ''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو ابن عاص رضی اللہ عنہ خطرے میں نظر آئے۔ آپ نے حضرت زبیر بن عوام کو بارہ ہزار مجاہدین کے ساتھ ان کی مدد کو بھیجا اور ابن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی اعانت سے فتح پائی۔'' دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے چار ہزار کی کمک بھیجی اور لکھا ''میں تمہاری مدد کو چار ہزار مجاہدین بھیج رہا ہوں۔ ایک ایک ہزار مجاہدین پر ایک ایک امیر ہے اور ہر امیر ایک ہزار آدمیوں کے برابر ہے۔ امیر یہ ہیں: زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ، عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ، اور خارجہ بن حذافہ۔ تم یہ سمجھو کہ تمہارے ساتھ بارہ ہزار سرفروش ہیں اور بارہ ہزار سرفروش قلت تعداد کی بنا پر مغلوب نہیں ہو سکتے!''

Marfat.com

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے حق میں دعا فرمائی اور انہیں رخصت کیا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ فوج لے کر روانہ ہوئے اور مصر میں داخل ہو کر عین شمس کا رخ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو انتخاب کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بہت بڑی توفیق تھی۔ یہ مرد شجاع اپنی قوت اور عزم واستقلال کے لیے ابتدا ہی سے مشہور تھا اور لوگ اس کی بہت عزت وتکریم کرتے تھے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی عمر سولہ برس کی تھی کہ انہوں نے اسلام قبول کیا۔ یہ حبشہ کی دونوں ہجرتوں میں شامل تھے اور جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں برابر شریک رہے۔ جنگ احد میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے موت پر بیعت کی تھی اور غزوۂ خندق میں جب نبی عربی علیہ التحیۃ والتسلیم نے صلائے عام فرمائی کہ احزاب اور بنو قریظہ کی خبر کون لائے گا تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے تئیں پیش کیا۔ پھر دوسری اور تیسری صلائے نبوتؐ پر لبیک کہنے والے بھی یہی تھے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے۔ میرے حواری زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ ہیں۔'' فتح مکہ کے دن مہاجرین رضی اللہ عنہم کے تین علموں میں سے ایک علم حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا۔ ان خصوصیات کی بنا پر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب اور محبوب تھے۔ جب مدینے میں مکان تعمیر ہوئے تو انہیں ایک وسیع قطعہ زمین عطا کیا گیا اور بنی نضیر کا ایک نخلستان بھی دیا گیا۔ اس کے علاوہ بارگاہ رسالتؐ سے ریشم پہننے کی اجازت مرحمت ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی انہیں محبوب رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے جرف اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پورا عقیق ان کی جاگیر میں دے دیا۔ ان سے جو ملتا تھا ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا اور جو فوج ان کی قیادت میں جاتی تھی، وہ بس انہیں کا دم بھرتی تھی۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے دریائے نیل عبور کر کے عین شمس کا رخ کیا اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کی امدادی فوج سے جا ملے۔ زمانے کی گردشوں نے عین شمس کی عظمت کو پامال کر دیا تھا اور اس کے آثار مٹ چکے تھے جو عظیم فرعونی عہد کا مدینۃ الشمس تھا۔ یہ شہر کسی زمانے میں علوم ومطالعات کا مرکز تھا جس سے افلاطون اور دوسرے یونانی فلاسفہ متعارف تھے۔ یہاں ان کی حکمت ومعرفت نے آنکھ کھولی تھی، یہاں انہوں نے فلسفہ وہیئت کی تعلیم حاصل کی تھی اور اس شہر کی وسیع آبادی، بلند وبالا عمارتوں، جلال آگیں عبادت گاہوں، میناروں اور مورتیوں کو دیکھا تھا جن کا ذکر ہیروڈوٹس نے کیا ہے اور جہاں کی مذہبی شخصیتوں کے علم وتبحر کی داستان مصر کی

Marfat.com

پوری تاریخ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسکندریہ اور اس کے فلسفے نے ''عین الشمس'' کی عظمت اور منف کے امتیاز کو خاک میں ملا دیا۔ اس کے بعد جب مصر میں رومی حکومت قائم ہوئی اور اہل مصر نے مذہب عیسوی اختیار کیا تو علم و دانش عین شمس سے ایسے رخصت ہوئے کہ پھر کبھی واپس نہ ہوئے۔ یہاں کی مورتیاں اور مینار ڈیلٹا کے بعض شہروں میں منتقل کر دیئے گئے بلکہ بحیرہ روم کے رستے روم پہنچا دیئے گئے اور اس طرح مدینۃ الشمس سے وہ سب کچھ چھین لیا گیا، جسے علم و حکمت نے صدیوں روشن رکھا تھا۔ چنانچہ جس وقت عرب یہاں پہنچے تو اس کی قدیم عظمت و بزرگی میں سے اس کے یونانی نام: ''ہلیو بولیس'' اس کی منہدم دیواروں، اس کی زمین کی تہوں میں دبی ہوئی مورتیوں اور اس کے ایک مینار کے سوا، جو شہر مطریہ میں آج بھی قائم ہے اور کچھ باقی نہ رہا تھا، جو اپنے سیاح کو مدینۃ الشمس کی عظمت و قدامت کے نقوش دکھاتا اور اس عظیم و جلیل عہد کی چپ چاپ داستان سناتا۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے عین شمس کے کھنڈر منتخب کیے اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں آئی ہوئی امدادی فوج کے ساتھ وہاں پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ جگہ زمین سے کچھ اونچی اور دفاعی سہولتوں کے لیے موزوں تھی۔ یہاں پانی بھی بکثرت تھا اور غذائی سامان کی بھی قلت نہ تھی۔ اپنی قیام گاہ کی طرف سے مطمئن ہو کر ابن عاص رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ساڑھے پندرہ ہزار مجاہدین ان کے گرد و پیش ہیں اور سمجھ لیا کہ ان کے اور رومیوں کے درمیان فیصلہ کن گھڑی قریب آ پہنچی ہے۔ چنانچہ انہوں نے جنگی معاملات میں بصیرت رکھنے والوں کو جمع کیا اور ان کے مشورے سے جنگ کا پروگرام بنایا۔ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ رومی قلعہ بابلیون سے نکل کر میدان میں شمشیر آزما ہوں۔ اسی اثنا میں ان کے جاسوسوں نے یہ خوش خبری سنائی کہ اللہ تعالیٰ بہت جلد ان کی یہ خواہش پوری کرنے والا ہے۔ رومی سپہ سالار تھیوڈور نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور ان سب نے یہ رائے ظاہر کی کہ اس طرح قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہنے سے مصری ہمیں کمزور و بزدل سمجھ رہے ہیں اور ان کے دلوں میں مسلمانوں سے جا ملنے اور ان کی اعانت کرنے کی خواہش چٹکیاں لینے لگی ہے۔ اس کے علاوہ رومی تعداد و سامان دونوں کے لحاظ سے مسلمانوں پر فوقیت رکھتے تھے، چنانچہ انہوں نے میدان میں نکل کر عربوں سے لڑنے کا فیصلہ کیا اور عین شمس کی طرف بڑھے کہ مسلمانوں کو وہاں سے نکال دیں۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ کو جب ان کے اس ارادے کا علم ہوا تو ان سے مقابلہ کرنے اور ان پر فتح پانے کی تدبیر سوچی کہ پانچ سو جانبازوں کا

Marfat.com

ایک دستہ رات کی تاریکی میں پہاڑ کے عقبی حصے کی طرف روانہ کیا کہ پہاڑی قلعے کے قریب بنو وائل کے غاروں میں جا چھپے اور پانچ سو مجاہدین کا دوسرا دستہ خارجہ بن حذافہ کی سرداری میں صبح سے کچھ پہلے ام دنین ......آج کل کے محلہ ازبکیہ........... کی طرف بھیجا اور ان دونوں دستوں کو خاص خاص احکام دے دیئے، صبح کی کرن پھوٹی تو ابن عاص رضی اللہ عنہ اپنی پوری فوج کو لے کر عین شمس سے چلے اور اس جگہ پہنچے جسے ہمارے زمانے میں عباسیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یہاں وہ ٹھہر گئے اور قلعہ بابلیون سے آنے والے رومی لشکر کا انتظار کرنے لگے۔

رومی پو پھوٹتے ہی اپنے قلعے سے نکلے اور شمال مشرقی جانب ان باغوں اور مکانوں سے گزرتے ہوئے، جنہوں نے قلعے کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا، عین شمس کی طرف بڑھنے لگے۔ اتنے میں خبر ملی کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ رومیوں سے لڑنے کے لیے اپنی فوج لے کر وہاں سے چل پڑے ہیں، اس خبر سے رومیوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور انہیں اپنی فتح کا یقین ہو گیا۔ سب نے مل کر مرتے دم تک لڑنے کی قسم کھائی۔ ان کو اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ اگر آج وہ فتح حاصل نہ کر سکے تو اس زرخیز اور دولت مند ملک میں ان کی حکومت ختم ہو جائے گی۔ دونوں فریق ٹکرا گئے اور اس گھمسان کا رن پڑا کہ جانبین کو غبار نے ڈھانپ لیا۔ ان میں سے کوئی اس وقت تک پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا، جب تک جنگ ہی کسی فریق کے حق میں فیصلہ نہ کر دے۔ لڑائی زوروں پر تھی کہ بنو وائل کے غاروں میں چھپا ہوا دستہ نمودار ہوا اور آندھی کی طرح رومیوں کے عقب پر ٹوٹ پڑا۔ رومی اس چال سے بے خبر تھے، ان میں ایک کھلبلی مچ گئی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا اور وہ ام دنین کی طرف پسپا ہونے لگے۔ اسی اثنا میں دوسرا دستہ اپنی کمین گاہ سے نکلا اور رومیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے لگا۔ رومی سمجھے کہ عربوں کے تین لشکر تین مختلف سمتوں سے ان پر حملہ آور ہوئے ہیں اور اب مقاومت کی کوئی صورت نہیں ہے۔ ان کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا اور اکثر و بیشتر رومی سپاہی عربوں کی تلوار سے بچنے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے، مفرورین کا ایک گروہ قلعے تک پہنچ گیا اور اس میں جا چھپا، دوسرا گروہ مارے خوف کے دریا کی طرف دوڑا اور کشتیوں میں بیٹھ کر قلعے کی طرف روانہ ہو گیا۔ کتنے لوگ معرکے میں کام آئے، ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔

عربوں نے جو دشمن کو اس قدر خوف زدہ پایا تو ام دنین کی طرف جھپٹے اور دوبارہ اس پر قابض ہو گئے۔ اس طرح مسلمانوں نے اس معرکے میں، جسے مؤرخین معرکہ عین شمس کے نام سے موسوم کرتے ہیں، شاندار اور فیصلہ کن فتح حاصل کی۔ اس فتح سے دریائے نیل کے ساحل

مسلمانوں کا فرش پا انداز بنا دیا اور وہ تمام مصر کو اپنی مٹھی میں محسوس کرنے لگے۔ وہ مصر کو اپنے قبضے میں کیوں نہ محسوس کرتے جب کہ انہیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ قلعہ بابلیوں میں پناہ لینے والی فوجوں کو جونہی اس معرکے میں کام آنے والے رومی سپاہیوں کی تعداد کا پتا چلا تو وہ اپنی جائے پناہ سے بھاگ کھڑی ہوئیں اور کشتیوں میں بیٹھ کر نیل کی مغربی شاخ.........نہر رشید.........کے رستے منوفیہ کی شمالی جانب، قلعہ نقیوس میں پہنچ گئیں، لیکن اس کے باوجود قلعے میں اتنی مسلح فوج موجود ہے جو اس کی مدافعت کر سکے۔ مسلمانوں کی کامیابی نے لوگوں پر اتنا رعب طاری کر دیا تھا کہ وہ غازیان اسلام کی فتح کو یقینی سمجھنے لگے تھے۔ اس معرکے کے بعد ابن عاص رضی اللہ عنہ نے جو طریقہ عمل اختیار کیا، اس نے ان لوگوں کے اس یقین کو اور بھی پختہ کر دیا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ شہر مصر کی طرف روانہ ہوئے اور جنگ کیے بغیر اس پر قابض ہو گئے۔ قلعے کی فوج، اپنے معمول کے خلاف، شہر مصر کی کوئی اعانت نہ کر سکی۔ اس کے بعد ابن عاص رضی اللہ عنہ نے عین شمس سے اپنی فوج کو بلا کر قلعے کے شمال مشرق میں ان باغوں اور کلیساؤں کے درمیان منتقل کر دیا۔ جہاں بعد کو فسطاط کا شہر آباد ہوا۔ خبر ملی کہ فیوم کی حفاظتی فوج، مسلمانوں کی فتح سے مطلع ہو کر، نقیوس کی سمت بھاگ گئی ہے۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ ایک دستہ لے کر روانہ ہوئے، دریا عبور کیا اور صحرا کے رستے فیوم کے پورے صوبے پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ایک اور فوج ڈیلٹا کے جنوب میں روانہ کی جس نے صوبہ منوفیہ کے دو شہروں، اثریب اور منوف پر قبضہ کر لیا۔

ان تمام واقعات نے لوگوں کو یقین دلا دیا کہ فتح و نصرت غازیان اسلام سے پیمان وفا باندھ چکی ہے۔ ان کے دل خوف و دہشت سے لبریز ہو گئے اور انہوں نے طوعاً و کرہاً وہ تمام ٹیکس قبول کر لیے جو روپے پیسے اور غذائی سامان کی صورت میں ابن عاص رضی اللہ عنہ نے ان پر عائد کیے تھے، بالخصوص یہ دیکھ کر کہ ان کے رومی حکام عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے حکم سے اس طرح ان کے سامنے لائے جاتے ہیں کہ ہاتھ گردنوں سے بندھے ہوتے ہیں اور بیڑیاں پاؤں میں ہوتی ہیں۔ ان میں سے اکثر تو نصرت رکاب مجاہدین سے اس درجہ خوف زدہ ہوئے کہ اسکندریہ بھاگ گئے، اس امید میں کہ اسکندریہ کے قلعوں اور فصیلوں میں انہیں پناہ مل جائے گی اور سمندر کے رستے قیصر کی اتنی فوج وہاں پہنچ جائے گی کہ اس کے سہارے سے ان حملہ آوروں کی قہرمانی قوت کا مقابلہ کیا جا سکے گا۔ اس فتح نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو بے آپے نہیں کیا تھا کہ وہ قلعہ بابلیون فتح کرنے سے پہلے اسکندریہ کی طرف بڑھ جاتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو انہیں مجبوراً اپنی قوت کو

Marfat.com

دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑتا۔ ایک حصے کو وہ قلعے کے محاصرے کے لیے چھوڑتے اور دوسرے حصے کو ساتھ لے کر شمالی جانب روانہ ہوتے اور نہر نیل کے رستے لڑتے بھڑتے اسکندریہ پہنچتے اور فوج کی اس طرح تقسیم کر دینے میں جو خطرہ تھا وہ ان سے پوشیدہ نہ تھا۔ قلعے میں جو رومی فوج پناہ لیے بیٹھی تھی اس میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا کہ وہ قلعے کی مدافعت کر سکتی تھی اور اس وقت تو وہ اور بھی جان توڑ کر لڑتی جب عرب قلعے کے دروازے کھول کر زبردستی اس میں داخل ہوتے۔

ہر چند کہ ان کی معنوی روح کمزور پڑ چکی تھی، پھر بھی وہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ محاصرہ طویل ہونے کی صورت میں ہرقل یا اسکندریہ کے رومی سپہ سالاران کی مدد کو پہنچ کر انہیں اس مصیبت سے نجات دلائیں گے۔ ان فوجوں کو محاصرے کی طوالت میں کوئی شک نہ تھا۔ گرمیوں کا موسم آ رہا تھا اور نیل کی سطح بلند ہوتی جا رہی تھی۔ مسلمان چونکہ دریا عبور کر کے قلعے پر حملہ آور نہیں ہو سکتے، اس لیے انہیں پانی کی سطح کم ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ایسے میں قلعے کے محافظوں کو صبر و سکون سے کام لینا چاہیے۔ اس لیے کہ اکثر ناگہانی واقعات لڑائی کا رخ بدل دیتے ہیں اور ہر لڑائی میں فتح اس فوج کو نصیب ہوتی ہے، جس میں صبر و برداشت کی قوت زیادہ ہو۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے محاصرے کی ٹھان لی اور قلعے میں پناہ لینے والے مقابلے پر کمربستہ ہو گئے۔ ان کے حوصلوں میں زیادہ جان اس لیے پڑ گئی کہ قلعوں کی دیواریں اتنی بلند اور اس کی برجیاں اتنی مستحکم تھیں کہ ان تک پہنچنا ناممکن تھا۔ آج قدیم مصر میں جو کچھ ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں وہ تو صرف ٹوٹی ہوئی دیواروں اور ان دو منہدم برجیوں کے کھنڈر ہیں، جن کے درمیان قدیم دروازہ تھا، لیکن عربی فتوحات کے زمانے میں یہ رومیوں کا سب سے مضبوط اور ناقابل تسخیر قلعہ تھا، اس کی فصلیں ساٹھ قدم اونچی اور اٹھارہ قدم چوڑی تھیں اور اس کے محل فصیلوں سے بھی زیادہ بلند تھے۔ ہر محل میں چھت پر پہنچنے کے لیے زینے بنے ہوئے تھے۔ جہاں سے مشرق میں جبل مقطم اور مغرب میں جیزہ اہرام اور صحرائے لوبیا کے نظارے نگاہوں کے سامنے پھیل جاتے تھے اور شمال و جنوب میں دریائے نیل کے بہاؤ کو دُور دُور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ دریائے نیل قلعے کے بڑے دروازے تک پہنچتا تھا، جہاں رومی کشتیاں ان سیڑھیوں کے پہلو میں لنگر انداز ہوتی تھیں، جو قلعے سے دریا میں اترتی تھیں، یہ بڑا دروازہ لوہے کا بنا ہوا تھا یا اس پر آہنی چادر چڑھی ہوئی تھی۔ چنانچہ اسی کے استحکام اور کشتیوں کی حفاظت میں ہونے کی وجہ سے اس پر حملہ کرنا بہت دشوار تھا۔

اس کے علاوہ جزیرہ روضہ میں بھی جو دریائے نیل کے وسط میں واقع تھا، چند مستحکم قلعے

Marfat.com

تھے، جن سے قلعہ بابلیون کی مضبوطی کو تقویت پہنچتی تھی۔ قلعے کے اندر کنویں کھدے ہوئے تھے جن کی وجہ سے مدافعین کو پانی کے لیے پریشان نہ ہونا پڑتا تھا۔ اسی طرح قلعے کے اردگرد پھیلے ہوئے کھیت اور باغ ان کی غذائی ضروریات بہم پہنچاتے تھے۔ قلعہ کو ایک خندق نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا، جس پر ایک متحرک پل تھا، لیکن اس پل کو صرف اندر ہی سے کھولا یا ہلایا جاسکتا تھا۔ ان تمام استحکامات کے پیش نظر، قلعہ بند فوجیں دشمن سے بالکل محفوظ تھیں، اور جب تک انہیں کمک پہنچے یا کوئی جنگی حادثہ عربوں کو الٹے پاؤں واپس ہونے پر مجبور کر دے، بڑے اطمینان سے قلعے کی مدافعت کر سکتی تھیں۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ وہ جانتے تھے کہ دریا کی طغیانی اور قلعے کی مضبوطی کی وجہ سے محاصرہ طول کھینچے گا۔ لیکن انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ دریا کا یہ چڑھاؤ ایک یا دو مہینے سے زیادہ نہیں رہے گا اور اس دوران میں دشمن سے چھیڑ چھاڑ ان کی معنوی قوت کو مضمحل کر دے گی۔ پھر دریا کے چڑھاؤ نے موجوں میں جو تیزی پیدا کر دی ہے۔ اس کے سبب نیل کے رستے نقیوس یا اسکندریہ سے قلعے تک کسی کمک کا پہنچنا بہت مشکل کام ہے۔ اگر کچھ دن اور کچھ ہفتے اسی طرح گزر گئے اور قلعے کے محافظین کمک سے مایوس ہو گئے تو ان کی معنوی قوت اور بھی کمزور ہو جائے گی اور ان کی ہوا اکھڑ جائے گی۔ ان حالات میں اگر وہ پانی کا چڑھاؤ کم ہونے تک ثابت قدم رہے تو قلعے پر حملہ کرنا ان کے لیے ممکن ہو جائے گا۔

محاصرے کے آغاز ہی سے مقوقس قلعے میں موجود تھا[1] اور قلعے کی فوجوں کا سپہ سالار ایک رومی تھا، جسے عرب مؤرخین ''اعیرج'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ بٹلر کا خیال ہے کہ یہ نام ''جارج'' کی تحریف ہے۔ قلعے کی ساری فوج رومی سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ قبطی صرف گنتی کے تھے اور وہ بھی شاید رومیوں کی خدمت پر مامور تھے۔ رومی قلعے سے عربوں پر منجنیقوں کے ذریعے

---

① مورخین نے اس قلعے کا نام بابلیون، باب الیون اور قصر شمع لکھا ہے۔ ''النجوم الزاہرہ'' میں ابن تغری بردی لکھتے ہیں: ''عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ روانہ ہوئے اور بابلیون پہنچے اور کہتے ہیں کہ محل .... قدیم مصر کے قصر شمع ...... پر ایک رومی حاکم تھا۔'' لیکن ابن عبدالحکم نے اکثر جگہ اس کا نام باب الیون لکھا ہے۔ علامہ بلاذری فرماتے ہیں: ''شہر کا نام الیونہ تھا جسے مسلمانوں نے بدل کر فسطاط کر دیا۔'' ڈاکٹر بٹلر کہتے ہیں کہ قلعے کا نام قبطی زبان میں ''بابلیون...... رن...... خیمی'' تھا جس کے معنی بابلیون مصر کے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ قیصر تراجان نے ایک پرانے قلعے کے جوار میں...... جس کا نام صدیوں سے بابلیون چلا آتا تھا، قلعہ بنوایا۔ اس کا نام بابلیون اس لیے پڑا کہ بابل کے کچھ قیدی، جنہیں سیزوستریس اپنے ساتھ لے کر آیا تھا، یہاں مقیم تھے۔ اس نام کی توجیہ کے سلسلے میں چند روایات اور بھی ہیں جنہیں ہم بہ خوف طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔

Marfat.com

پتھراؤ کرتے تھے اور اس کے جواب میں عرب ان پر پتھر اور تیر پھینکتے تھے۔ اسی طرح محاصرے کو ایک مہینہ گزر گیا۔ لیکن عربوں کے حوصلے میں کوئی فرق نہ آیا، نہ انہوں نے صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے چھوڑا۔ مقوقس اور اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ دریائے نیل کا پانی اترنا شروع ہوگیا ہے۔ یہ ماہ اکتوبر ۶۴۰ء کے آغاز کی بات ہے اور ایک خفیہ اجلاس بلایا جس میں مشورے کے بعد مقوقس نے اپنی رائے بھی تفصیل کے ساتھ پیش کی۔ اس کا خیال تھا کہ محاصرہ اٹھوانے کے لیے ابھی چند مہینے اور مدد نہیں ملے گی اور اس مدت میں عرب ان کا ناطقہ بند کر دیں گے، انہیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں گے اور آخر وہ ایسا کیوں نہ کریں گے جب کہ اس سے پہلے فرما، بلبیس، ام دنین، فیوم اور عین شمس میں رومی فوجوں کو شکست دے چکے ہیں اور اب ان کا محاصرہ کیے بیٹھے ہیں۔ اس نے کہا: ''کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ عربوں کو کچھ دے دلا کر واپس کر دیا جائے تا کہ مصر دوبارہ رومیوں کے قبضے میں آجائے؟ مقوقس نے اپنے دلائل ایسے دلکش اسلوب میں پیش کیے کہ حاضرین اس سے متفق ہو گئے لیکن مناسب یہی قرار پایا کہ عربوں سے بات چیت ایسے خفیہ طریق پر کی جائے کہ قلعے کی فوج میں سے کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہو اور مقوقس اس بات چیت میں بذات خود حصہ لے۔ مقوقس اور اس کے ساتھی رات کے سیاہ پردے میں چھپ کر قلعے سے نکلے اور کشتیوں میں بیٹھ کر جزیرہ روضہ کی طرف روانہ ہوئے وہاں پہنچ کر انہوں نے بابلیون کے پادری کے ساتھ کچھ آدمی کیے اور اسے یہ مراسلہ دے کر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کیا:

''تم ہمارے ملک میں گھس آئے ہو اور ہم سے لڑنے تلے ہوئے ہو۔ ہمارے ملک میں تمہارا قیام طویل ہو گیا ہے، حالانکہ تم مٹھی بھر ہو اور کیل کانٹے سے لیس رومی فوجیں تم سے مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ دریائے نیل نے تمہیں گھیر رکھا ہے اور تم ہمارے ہاتھوں میں قید ہو۔ اپنے کچھ آدمی ہمارے پاس بھیجو کہ ہم سنیں، وہ کیا کہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کوئی ایسی صورت نکل آئے جو ہمارے اور تمہارے لیے یکساں پسندیدہ ہو اور یہ جنگ ختم ہو جائے، پیشتر ازیں کہ رومی افواج تم پر چھا جائیں اور بات چیت کا کوئی پہلو، کوئی فائدہ باقی نہ رہے۔ ہو سکتا ہے کہ جنگ کا نتیجہ تمہاری خواہش اور امید کے خلاف نکلے اور تمہیں ندامت اٹھانی پڑے۔ اس لیے اپنے نمائندے ہمارے پاس بھیجو کہ ان کے ذریعے ہماری اور تمہاری پسند کی بات طے ہو جائے۔'' مقوقس کو انتظار تھا کہ اس کے ایلچی ابن عاص رضی اللہ عنہ کا جواب لے کر اسی دن لوٹ

Marfat.com

آئیں گے کہ اسی جواب پر گفتگو کے ردو قبول کا انحصار تھا۔ اگر انکار ہوا تو فریقین حسب معمول جنگ جاری رکھیں گے اور آمادگی ظاہر کی گئی تو بشرط امکان صلح کی کوشش کی جائے گی، لیکن مقوقس کے قاصد پورے دو دن تک واپس نہ آئے، اب اسے تشویش پیدا ہوئی اور اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''معلوم ہوتا ہے انہوں نے قاصدوں کو گرفتار کرلیا ہے یا جان سے مار دیا ہے، بہت ممکن ہے ان کا مذہب انہیں اس کی اجازت دیتا ہو!'' لیکن حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے انہیں مسلمانوں کی ہمت اور حوصلہ مندی دکھانے کے لیے روکا تھا۔ دو دن کے بعد جب یہ لوگ واپس ہوئے تو رئیس وفد کے پاس مقوقس کے نام ابن عاص رضی اللہ عنہ کا یہ مکتوب تھا۔

''ہمارے اور تمہارے درمیان صرف تین صورتیں ہیں، یا تم اسلام قبول کرلو اور اس صورت میں تم ہمارے بھائی ہوگے۔ ہمارے تمہارے حقوق یکساں ہوں گے، یا زیردست بن کر جزیہ ادا کرو، ورنہ ہم صبرو استقلال کے ساتھ تم سے لڑیں گے یہاں تک کہ خدا ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کردے اور خدا سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔'' مقوقس یہ سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ اس شخص کا جواب نہ تھا جو بات چیت کرنا چاہتا ہو، بلکہ اس فاتح کا جواب تھا جو احکام نافذ کررہا ہو۔ کیا اس قوم کا غرور یا اعتماد نفس اس حد کو پہنچ چکا ہے، اسے دولت یا کسی اور چیز کا لالچ نہیں دیا جاسکتا؟ اس نے وفد سے ان کا حال پوچھا: رئیس وفد نے جواب میں کہا: ''ہم نے ایک ایسی قوم کو دیکھا ہے جس کا ہر فرد زندگی سے زیادہ موت اور غرور سے زیادہ خاکساری پر جان دیتا ہے۔ ان میں ایک بھی ایسا نہیں جو دنیا سے کوئی دلچسپی یا غرض رکھتا ہو۔ وہ زمین پر بیٹھتے ہیں، گھٹنوں پر رکھ کر کھاتے ہیں، ان کا امیر گویا انہیں میں سے ایک ہے۔ ان میں شریف اور کمینے، آقا اور غلام کی کوئی تمیز نہیں۔ جب نماز کا وقت آتا ہے تو کوئی پیچھے نہیں رہتا۔ سب وضو کرتے ہیں اور خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھنے لگتے ہیں۔'' مسلمانوں کے یہ اوصاف سن کر مقوقس سوچ میں پڑ گیا، اس کے بعد سر اٹھا کر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: قسم ہے اس ذات کی! جس کی قسم کھائی جاتی ہے، یہ لوگ چاہیں تو پہاڑوں کو بھی اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں۔ ان سے کوئی نہیں لڑسکتا اگر ہم آج ان سے صلح نہ کرسکے جب کہ نیل نے انہیں گھیر رکھا ہے تو کل اس خطرے سے نکل جانے کے بعد انہیں صلح پر کیسے آمادہ کرسکیں گے؟''

آپ کا کیا خیال ہے مقوقس کے دل میں کمزوری راہ پاگئی تھی، جو اس نے یہ بات کہی یا وہ عربوں کو روپے پیسے سے پرچا کے مصر کی سرزمین ان سے خالی کرالینا چاہتا تھا؟ ان دونوں باتوں

کا جواب، آنے والے واقعات دیں گے۔ اس وقت تو اس نے اپنے قاصدوں کے ہاتھ مسلمانوں کو یہ پیغام بھجوایا: ''اپنے نمائندے ہمارے پاس بھیجو، ہم ان سے گفتگو کریں گے، بہت ممکن ہے کوئی ایسا پہلو نکل آئے جس میں ہم تم دونوں کی بھلائی ہو۔'' حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے یہ درخواست مسترد نہیں کی اور دس افراد پر مشتمل ایک وفد بھیج دیا جس میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ یہ ایک سیاہ رنگ اور بڑے ہاڈ کے انسان تھے۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے رومیوں سے گفتگو کرنے کی ذمے داری ان کے سپرد کی اور انہیں حکم دیا کہ ان تینوں شرطوں میں کسی ایک شرط کے سوا، رومیوں کی کوئی تجویز قبول نہ کریں۔ وفد مقوقس کے پاس پہنچا اور عبادہ رضی اللہ عنہ نے اس سے بات کرنا چاہی۔ لیکن وہ انہیں دیکھ کر بولا ''اس کالے کلوٹے شخص کو میرے پاس سے ہٹاؤ اور گفتگو کے لیے کسی اور کو آگے کرو!'' اس سے غالباً مقوقس کا مدعا مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنا تھا، لیکن ان سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ انہیں عبادہ رضی اللہ عنہ کی بات اور رائے پر اعتماد ہے۔ آخر کار عبادہ رضی اللہ عنہ نے گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا ''اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دنیا طلبی سے روکا ہے اور ان کے دلوں میں آخرت کی رغبت اور جہاد فی سبیل اللہ کی تڑپ پیدا کی ہے۔''

مقوقس عبادہ رضی اللہ عنہ کی ان باتوں سے بڑا متاثر ہوا اور اس تاثر کا اظہار اپنے ساتھیوں پر بھی کیا۔ پھر عبادہ رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: ''تم سے لڑنے کے لیے رومیوں کی بے شمار فوجیں ہمارے پاس آ رہی ہیں جو اپنی طاقت اور قہرمانی کے لیے مشہور ہیں اور کسی میں ہمت نہیں کہ ان کے مقابلے پر آسکے۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم اپنی کمزوری اور قلت تعداد کی وجہ سے ان کے سامنے نہ ٹھہر سکو گے! تمہیں یہاں پڑے ہوئے کئی مہینے ہو گئے ہیں اور معاش کی تنگی کے ساتھ ساتھ دوسری ضروریات نے بھی تم کو پریشان کر رکھا ہے۔ ہم تمہاری کمزور، قلت تعداد اور بے سروسامانی کی وجہ سے تم پر ترس کھاتے ہیں اور تم سے مصالحت کر لینے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ہماری طرف سے سپاہیوں کو دو دو دینار، سپہ سالار کو سو دینار اور خلیفہ کے لیے ایک ہزار دینار کی پیش کش قبول کرو اور اس سے پہلے کہ ایک قہر آگیں طاقت تم پر مسلط ہو جائے، یہاں سے چلے جاؤ۔'' اس گفتگو میں وعدہ بھی تھا اور وعید بھی، ترغیب بھی تھی اور ترہیب بھی۔ عبادہ رضی اللہ عنہ کے سامنے تیس ہزار دینار پیش کیے جا رہے تھے جو مسلمانوں کے مصر سے واپس چلے جانے کی قیمت تھی اور اگر وہ پیش کش قبول نہ کریں تو ساتھ ہی اس امدادی فوج کی دھمکی بھی دی جا رہی تھی، جس کا ذکر مقوقس نے

Marfat.com

اپنی گفتگو میں کیا تھا، لیکن ابن عاص رضی اللہ عنہ کے احکام بالکل واضح تھے۔ ان میں کسی قسم کا ابہام نہ تھا اور عبادہ رضی اللہ عنہ دلیر انسان تھے جن کے نزدیک موت ہنسی کھیل سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ انہوں نے رومی جمعیت کے ذکر کو پائے حقارت سے ٹھکراتے ہوئے مقوقس کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل کیا:

(كَمْ مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِينَ) (البقرہ: ٢٤٩)

ترجمہ: بہت سی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آگئی ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

اور اسے بتایا کہ ہر مسلمان صبح وشام اپنے پروردگار سے شہادت کی دعا مانگتا ہے، اس لیے انہیں معاش کی تنگی، یا دوسری ضروریات کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتیں۔ اس کے بعد کہا: "تم خوب اچھی طرح سوچ لو اور ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کردو۔ صرف تین شرطیں ہیں جن پر ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے ان میں سے جو شرط چاہو قبول کر لو اور اپنے تئیں فضول باتوں میں نہ الجھاؤ۔ یہ حکم مجھے میرے امیر نے اور میرے امیر کو امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے دیا ہے اور یہی اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل تھا۔" ختم کلام کرتے ہوئے انہوں نے کہا: "اگر یہ لوگ اسلام قبول کرلیں گے تو عرب واپس چلے جائیں گے اور اگر قبول اسلام کے بجائے جزیہ دینا منظور کریں گے تو مسلمان انہیں اپنی حفاظت میں لے لیں گے اور ہر طرح کا خیال رکھیں گے، لیکن اگر اسلام اور جزیہ دونوں سے انکار کیا تو پھر فریقین میں فیصلہ تلوار کرے گی۔" مسلمانوں کی ان تین شرطوں کے سوا، مقوقس نے عبادہ رضی اللہ عنہ کے سامنے جو تجویز بھی رکھی، مسترد کر دی گئی۔ مجبور ہو کر مقوقس نے اپنے ساتھیوں کی طرف رخ کیا اور ان کی رائے معلوم کرنی چاہی۔ انہوں نے مسلمانوں کی شرطیں ماننے سے انکار کر دیا اور عبادہ رضی اللہ عنہ اپنے مطالبات میں سے ایک حرف کم کیے بغیر اسلامی وفد کو لے کر چلے گئے۔ مقوقس نے اپنے ساتھیوں کو پھر نصیحت کی کہ وہ مسلمانوں سے مصالحت کرلیں انہوں نے پوچھا: "ان کی کون سی شرط قابل قبول ہے؟"

مقوقس نے کہا "ہاں! اب میں تمہیں اس کی رائے دوں گا اور مسلمانوں سے لڑنا، مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہارے بس کا کام نہیں۔ اب تیسری شرط رہ جاتی ہے اور وہ تمہیں مان بھی لینی

Marfat.com

چاہیے۔''

وہ بولے: تمہارا مطلب ہے ہمیشہ کے لیے ہم مسلمانوں کے غلام ہو جائیں؟'' مقوقس نے کہا: ''ہاں! تم غلام ضرور ہو جاؤ گے، لیکن ایسے غلام جن کی اپنے ملک پر حکومت ہوگی اور جو اپنی جان، اپنے مال اور اپنی اولاد کو مسلمانوں کی دست برد سے بچالیں گے اور یہ غلامی اس سے بہتر ہے کہ تمہارا ایک ایک آدمی مار دیا جائے، یا تمہیں اس طرح غلام بنالیا جائے کہ تم اور تمہارے اہل وعیال اپنے وطن میں نشانہ ستم بن جائیں اور مسلمان بھیڑ بکریوں کی طرح تمہیں بیچتے اور خریدتے رہیں؟'' انہوں نے کہا: ''اس سے موت بہتر ہے!'' اور قلعے میں واپس آ کر پل توڑ دیا جس سے پھر وہی حالت جنگ پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ مؤرخین عرب کہتے ہیں: ''جو رومی قصر میں تھے، مسلمانوں نے ان سے لڑنے پر اصرار کیا اور فتح پائی۔ بے شمار رومی قتل و گرفتار ہوئے اور ساری کشتیاں جزیرے میں چلی گئیں۔''

بٹلر نے لکھا ہے: ''ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکابر روم نے سوچ بچار کے لیے عربوں سے ایک ماہ کی مہلت طلب کی، جس کا قطعی جواب ابن عاص رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہ ملا کہ غور وفکر کے لیے انہیں زیادہ سے زیادہ تین دن دیئے جا سکتے ہیں، لیکن مقوقس کی اس حرکت کا جب لوگوں کو علم ہوا تو وہ بھڑک اُٹھے اور شاہی فوج نے جنگ پر اصرار کیا۔ ابھی مہلت کے تین دن بھی نہ گزرے تھے کہ قلعے والوں نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں اور ابن عاص رضی اللہ عنہ کو کوئی جواب نہ بھیجا بلکہ اچانک قلعے سے نکلے اور پلوں کے رستے، بے خبری کی حالت میں مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ مسلمانوں کو اس غیر متوقع حملے سے کوئی پریشانی نہ ہوئی، انہوں نے فوراً اپنے ہتھیار سنبھال لیے اور رومیوں کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔ بڑی گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں فریقین نے غیر معمولی شجاعت کا اظہار کیا۔ آخر کار عربوں نے رومیوں کے چھکے چھڑا دیئے اور رومی اپنے بہت سے سپاہی مسلمانوں کو بھینٹ دے کر قلعے میں پسپا ہو گئے۔'' ہمارے نزدیک ان دونوں روایات میں کوئی اختلاف نہیں ہے، بلکہ وہ اس پر متفق ہیں کہ عربوں کو یہ فتح عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور مقوقس کی گفتگو کے کچھ دن بعد حاصل ہوئی تھی۔ مقوقس نے موقع کو ہاتھ سے جانے دینا مناسب نہ سمجھا اور اپنی قوم کو مشورہ دیا کہ جزیے کے عوض عربوں سے صلح کر لے، اسی میں ان کی بہتری ہے۔ قوم نے بادل نخواستہ اس کی بات مان لی اور اس نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ وہ ابھی تک مصالحت پر آمادہ ہے اور کہلوایا: ''مجھے امان دے دیجیے کہ میں آپ سے ملاقات کروں۔ میرے

Marfat.com

چند رفقاء میرے ساتھ ہوں گے اور آپ کے چند رفقاء آپ کے ساتھ۔ اگر ہمارے درمیان کوئی فیصلہ ہوگیا تو بہتر ہے، ورنہ معاملات پھر اپنی سابقہ صورت حال پر بحال ہو جائیں گے۔''

ابن عاص رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے مقوقس کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کیا اور جنگ کو ترجیح دی کہ مصر کی پوری مملکت ان کے لیے غنیمت بن جائے۔ لیکن ابن عاص رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: ''تمہیں معلوم ہے، امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے مجھے کیا ہدایات دی ہیں؟ ان کا حکم ہے کہ اگر وہ ان تینوں شرطوں میں سے کوئی ایک شرط قبول کرلیں تو پھر ہمیں ان سے نہیں الجھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ تم دیکھ رہے ہو کہ پانی ہمارے اور ان کے درمیان حائل ہے، جس کی وجہ سے جنگ میں بڑی دقت پیش آئے گی۔'' حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی یہ رائے ایک تجربہ کار سیاست دان اور بالغ النظر سپہ سالار کی رائے تھی، پانی نے مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور وہ صعید کے علاقے یا دوسرے شہروں اور بستیوں کی طرف پیش قدمی نہیں کرسکتے تھے۔ ایسی حالت میں جنگ شروع کرنا سخت غلطی تھی اور پانی اترنے کا انتظار کرنا گویا دشمن کو تیار ہونے اور اسکندریہ سے امداد حاصل کرنے کا موقع دینا تھا۔ علاوہ ازیں قلعے میں جو رومی فوجیں تھیں، ان کے ارادے پست ہو چکے تھے، ان کی قوتیں جواب دے گئی تھیں اور یہ ان سے بات چیت کرنے کا بہترین نفسیاتی لمحہ تھا تاکہ مایوسی ان میں ضد اور بے باکی پیدا نہ کردے۔ پناہ کے لیے ان کے پاس ایک مضبوط قلعہ تھا ہی جس میں وہ طویل مدت تک قیام کرسکتے تھے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور مقوقس کے درمیان صلح اس پر ہوئی کہ پورے مصر میں ہر بالغ قبطی بلا امتیاز دو دینار بطور جزیہ ادا کرے گا۔ نابالغ بچے، عورتیں اور بوڑھے اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ مسلمانوں کی ہر جماعت جہاں چاہے گی قیام کرسکے گی۔ ایک یا ایک سے زائد مسلمان جس مصری کے ہاں ٹھہریں گے، وہ تین دن تک ان کی مہمان نوازی کرے گا۔ مصریوں کی زمین، مال، کلیسا، صلیبیں اور خشکی و تری سب انہیں کے رہیں گے اور ان کی درآمدی و برآمدی تجارت میں کوئی رخنہ پیدا نہ کیا جائے گا۔

یہ صلح نامہ طے تو ہوگیا، لیکن اس کا نفاذ شہنشاہ کی منظوری تک ملتوی رکھا گیا اور اسے ہرقل تک پہنچانے کا کام مقوقس نے خود اپنے ذمے لیا۔ قرار یہ پایا کہ قیصر کا جواب آنے تک دونوں فوجیں جہاں ہیں وہیں رہیں گی اور رومی قلعے کا قبضہ نہیں چھوڑیں گے۔ مقوقس دریا کے رستے اسکندریہ روانہ ہوا اور وہاں سے پوری تفصیلات قسطنطنیہ لکھ بھیجیں۔ ان تفصیلات کے ساتھ ایک یادداشت بھی تھی جس کے آخر میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ صلح تسلیم کرکے مصر کو جنگ کی تباہ

Marfat.com

کاریوں سے بچالیا جائے۔ ہرقل کو یادداشت اور معاہدہ پڑھ کر بہت غصہ آیا۔ وہ اس کی عبارت سے یہ معلوم نہ کر سکا کہ صلح صرف قلعہ بابلیون سے متعلق ہے یا سارا مصر عربوں کے قدموں میں ڈال دیا گیا ہے؟ نیز یہ کہ جزیہ وصول کرنے کے بعد عرب، مصر میں رہیں گے یا چلے جائیں گے؟ اپنے شبہات کی وضاحت کے لیے اس نے مقوقس کو طلب کیا۔ عندالملاقات مقوقس نے مسئلے کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی اور ہرقل سے کہا کہ عرب اس کے بعد مصر سے چلے جائیں گے، لیکن جب شہنشاہ نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی تو اس نے اظہار حقیقت کو بہتر سمجھتے ہوئے کہا:

''اگر عربوں اور ان کی بے جگری کو دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کو مغلوب کرنا غیر ممکن ہے۔ پس ہمارے لیے صلح سے بہتر اور کوئی رستہ نہیں ہے۔ اگر انہوں نے قلعہ بابلیون بزور شمشیر فتح کر لیا تو سارا ملک ان کی غنیمت بن جائے گا۔''

ہرقل عربوں کی طاقت سے نا آشنا نہیں تھا۔ وہ کئی سال تک شام میں ان کے ناقابل فراموش کارنامے دیکھ چکا تھا تاہم اسے یہ توقع نہ تھی کہ مصر میں بھی اس کی فوجوں کو اسی بلائے بے درماں کا سامنا کرنا پڑے گا اور پھر اتنی جلدی! وہ نسلی اور جغرافیائی محرکات جو شام میں عربوں کے لئے سرمایہ اعانت بنے تھے، وادی نیل میں ان کا کہیں وجود نہ تھا۔ وہ قلعہ بابلیون کے استحکام سے اچھی طرح واقف تھا اور یہ حقیقت بھی اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھی کہ اگر مدافعین کی قرار واقعی طور پر قیادت کی جائے تو اسے فتح کرنا محال ہے۔ مصر میں اس کی ایک لاکھ فوج تھی جس میں سے صرف بارہ ہزار سپاہی برسرپیکار تھے۔ پھر مسلمانوں کے یہ مٹھی بھر جنگ آزما جو صحرا کی خاک چھان رہے ہیں، اس ٹڈی دل لشکر پر کیسے غلبہ پا سکتے ہیں جو آہن صفت ناقابل تسخیر قلعوں میں محفوظ ہے۔ ہو نہ ہو اس میں کوئی راز ہے اور وہی اس شرمناک صورت حال کا ذمہ دار ہے جو اس کے قلب مملکت میں پیدا ہو گئی ہے۔ یہ سوچ کر ہرقل بھڑک اُٹھا اور مقوقس پر الزام لگایا کہ اس نے حکومت سے غداری کر کے مصر کو عربوں کے لیے خالی کر دیا ہے۔ اس کے بعد اسے بزدلی و نافرمانی کے جرم میں حاکم شہر کے حوالے کر دیا، جس نے پہلے اس کے جرم کی تشہیر کی اور پھر اسے انتہائی ذلت و اہانت کے ساتھ ملک سے نکال دیا۔ ہرقل کے ذہن میں جن وسوسوں نے راہ پائی اور اپنے لشکر کی شکست کے ذیل میں جو شبہات اس کے دل میں پیدا ہوئے انہیں اس کی انتہا پسندی پر محمول نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم مقوقس پر حکومت کے خلاف غداری کا الزام عائد کر رہے ہیں۔ بلکہ کہنا یہ ہے کہ اگر بابلیون کی قیادت کسی ماہر سپہ سالار کے

Marfat.com

ہاتھ میں ہوتی جو اپنی فوجوں کو کھلے میدان میں عربوں سے مقابلہ کرنے کے لیے نہ بھیجتا، صرف تیروں اور منجنیقوں سے انہیں روکے رکھتا، تو قلعے میں مدافعت کی قوت تھی اور وہ اپنے محافظین کو ہر طرح کی شکست سے بچا سکتا تھا۔

مقوقس کے ملک بدر ہونے کے بعد جو واقعات پیش آئے وہ ہمارے اس قول کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔ ہرقل نے صلح نامہ منسوخ کر دیا اور مصر میں اس کی اطلاع مسلمانوں کو دسمبر ۶۴۰ء کی آخری تاریخوں میں ملی۔ مہلت ختم ہوگئی اور فریقین نے پھر لڑنا شروع کر دیا۔ قلعے کے محافظوں کی تعداد کم ہوگئی تھی۔ پھر کسی طرف سے انہیں کمک بھی نہ پہنچی تھی اور حالات عربوں کے حق میں سازگار تھے۔ نیل میں طغیانی نہ رہی تھی اور اس خندق میں بھی پانی کم ہوگیا تھا جس نے قلعے کا احاطہ کر رکھا تھا۔ اس بنا پر عربوں کو قلعے پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔ اب رومیوں نے پانی کے بدلے خندق میں لوہے کے نکیلے تار بچھا دیئے تھے۔ قلعے کے دروازوں کے سامنے یہ تار نسبتاً زیادہ تھے جس کی وجہ سے عرب قلعے پر دھاوا نہ بول سکے اور محاصرے کو کئی مہینے لگ گئے اس دوران میں فریقین تیروں اور منجنیقوں سے لڑتے رہے۔ قلعے کے مدافعین اس سے زیادہ کچھ بھی نہ کر سکتے تھے اور اگر وہ کبھی لڑنے کے لیے باہر نکلتے بھی تھے تو عرب انہیں پسپا کر دیتے تھے۔ سرمائی مہینے گزر گئے اور قلعے والے مقاومت کرتے رہے۔ اگر انہیں نقیوس یا اسکندریہ سے مدد مل جاتی اور ہرقل اپنے کسی کارآزمودہ سپہ سالار کو فوج دے کر بھیج دیتا تو جنگ کی حالت مختلف ہوتی اور عربوں کو اس مستحکم علاقے کی تسخیر میں غیر معمولی مشقتیں اُٹھانی پڑتیں۔

لیکن ایک طرف تو کمک نہ پہنچی اور دوسری طرف قلعے میں بیماری پھیل گئی۔ رومی روزانہ برجیوں پر چڑھ چڑھ کے دیکھتے۔ لیکن دور دور تک کمک کے آثار نہ دکھائی دیتے۔ علاوہ ازیں آئے دن انہیں یہ خبریں ملتیں کہ عرب آس پاس کی زمینوں پر قبضہ کرتے جا رہے ہیں اور آبادی ہلاک ہو رہی ہے۔ ۶۴۱ کا مارچ شروع ہوا اور نیل کا پانی خشک یا تقریباً خشک ہوگیا۔ اسی اثنا میں خبر آئی کہ فروری ۶۴۱ء کے نصف اول میں ہرقل کا انتقال ہوگیا۔ (1) رومی اس خبر سے سخت پریشان ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود قلعے والے مقابلہ کرتے رہے اور اپنے دلوں کو اس امید سے بہلاتے

---

(1) بٹلر لکھتا ہے کہ ہرقل ۱۱ فروری ۶۴۱ء کو مرا تھا۔ لیکن تاریخ المورخ میں اس کی موت مارچ ۶۴۱ء میں بتائی گئی ہے۔ خود بٹلر کے الفاظ میں "یہ مسئلہ بھی دوسرے مسائل کی طرح اُلجھا ہوا ہے۔" لیکن جو مورخین اس کے قریب گزرے ہیں ان کا اختلاف فروری اور مارچ ۶۴۱ء سے متجاوز نہیں ہوتا۔

Marfat.com

رہے کہ کمک آکر انہیں اس طوفان بلا سے نکال لے گی۔ جو مصیبت مصر میں ہرقل پر آئی تھی، اس نے اس کی موت کو قریب تر کر دیا۔ مقوقس کی ملاقات کے بعد اسے بخار آنا شروع ہوا اور پریشانی نے اس کے دماغ کو اس درجہ گھیر لیا کہ وہ بابلیون کے دفاع و اعانت کے متعلق کچھ سوچ ہی نہ سکا۔ اس کے سوا کسی اور نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ جب سے عربوں نے دمشق اور بیت المقدس پر قبضہ کر کے رومیوں کو شام سے نکالا تھا اور وہ مصر میں پناہ لے کر ہر طرف خوف و ہراس پھیلا رہے تھے، رومی حکومت شرمناک شکست کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی تاہم قلعے کی دیواری اور برجیوں کے استحکام نے اپنے ان محافظوں کو جو موت کے منہ سے بچے ہوئے تھے، مارچ کی آخری اور اپریل کی ابتدائی تاریخوں تک غازیان اسلام کے مقابلے میں ثابت قدم رکھا۔

عرب سات مہینے کے طویل محاصرے سے اتنے تنگ آ گئے تھے کہ انہیں اپنی زندگی اور اپنا وجود دونوں بے حقیقت نظر آنے لگے تھے۔ انہوں نے دمشق میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، مدائن میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور نہاوند میں نعیم بن مقرن کے کارنامے یاد کیے۔ شجاعت و جانبازی میں وہ ان شیران بیشہ جنگ سے پیچھے رہنا نہیں چاہتے تھے۔ بالخصوص حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ ان میں سب سے زیادہ جری اور اللہ کی راہ میں سب سے زیادہ سرفروشی کے جذبے سے سرشار تھے۔ انہوں نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ”میں اپنی جان خدا کی راہ میں قربان کرتا ہوں اور میری تمنا ہے کہ اللہ میری اس قربانی کو مسلمانوں کی فتح کا سبب بنائے!“ اس کے کچھ دن بعد وہ ایک دستے کے ساتھ، رات کی تاریکی میں آگے بڑھے اور ایک خاص جگہ سے خندق عبور کی۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے فصیل پر سیڑھی لگادی اور اپنے ساتھیوں کو یہ حکم دے کر سیڑھی پر چڑھ گئے کہ جب میں تکبیر کہوں تو اسے دہراتے ہوئے اوپر چڑھ آنا، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ قلعے کی دیوار پر پہنچ گئے اور تکبیر کے نعرے بلند کرنے شروع کیے، تلوار ان کے ہاتھ میں چمک رہی تھی۔ ان کے ساتھیوں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا، فصیل پر چڑھ کے ان کے پہلو میں کھڑے ہو گئے اور سب نے مل کر ”اللہ اکبر“ کا نعرہ لگایا۔ جو مسلمان قلعے سے باہر تھے انہوں نے یہ نعرہ دہرایا اور رومیوں کو یقین ہو گیا کہ عربوں نے قلعے پر دھاوا بول دیا ہے۔ ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر قلعے کا دروازہ کھول دیا اور مسلمانوں نے اندر داخل ہو کر اس پر قبضہ کر لیا۔

Marfat.com

ایک روایت تو یہ ہے، لیکن دوسری روایت جو بٹلر نے طبری کے حوالے سے نقل کی ہے، ظاہر کرتی ہے کہ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کو لے کر فصیل پر چڑھ گئے اور قلعے کے جو محافظ وہاں موجود تھے ان کے سر قلم کر کے قلعے میں اترنا چاہا، لیکن دیکھا کہ رومیوں نے وہاں ایک دیوار بنا رکھی ہے اور اس طرف سے قلعے میں نہیں اترا جا سکتا۔ چنانچہ وہ اپنی جگہ ٹھہر گئے۔ جب صبح ہوئی تو قلعہ کے سالار نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس پیغام بھیجا کہ ''اگر قلعے کے محافظین کو امان دے دی جائے تو قلعہ مسلمانوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔'' حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اس پر اعتراض کیا اور ابن عاص رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اگر آپ تھوڑی دیر اور صبر کر لیں تو ہم قلعے میں اُتر جائیں گے اور سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق طے ہو جائے گا۔'' لیکن حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ان کی بات نہ مانی اور سالار قلعہ سے اس شرط پر مصالحت کر لی کہ تین دن کے اندر اندر قلعے کی فوج، چند روز کا سامان لے کر قلعہ خالی کر دے گی اور دریا کے رستے روانہ ہو جائے گی۔ قلعے میں جو اسلحہ اور ذخائر ہیں وہ مسلمانوں کے ہوں گے۔ علامہ طبری نے اس کی تفصیل بیان نہیں کی۔ حالانکہ تمام مسلمان مؤرخین نے لکھا ہے کہ قلعے پر مسلمانوں کے دھاوا بولنے کے بعد حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے صلح کی اس درخواست کو قبول کر لیا تھا جو مقوقس کی طرف سے جزیے کے عوض بھیجی گئی تھی۔ اگر صحیح یہ ہے کہ مقوقس قلعے میں موجود نہ تھا اور ہرقل سے ملنے کے بعد ملک بدر کرا دیا گیا تھا تو بٹلر کی روایت کے مطابق ہو سکتا ہے کہ محافظین قلعہ کے سالار ہی نے ابن عاص رضی اللہ عنہ سے صلح کی ہو۔

رومی فوج نے ۱۶ اپریل ۶۴۱ء کو قلعہ خالی کیا اور شکست کی جھانجھ میں مصریوں پر شدید مظالم ڈھائے۔ جن قبطیوں کو محاصرے کے دوران میں، اندرون قلعہ قید کیا گیا تھا ان کے ہاتھ کاٹ دیئے اور انہیں طرح طرح کی سفاکیوں کا نشانہ بنایا، جس کی وجہ سے اس عہد کا مصری مؤرخ، اسقف حنا نقیوسی دامن ضبط اپنے ہاتھ سے چھوڑ بیٹھا اور رومیوں کے خلاف اس کی زبان قلم سے یہ الفاظ نکلے: ''وہ مسیح کے دشمن تھے جنہوں نے مسیحیت کو اپنی نجس و ناپاک بدعتوں سے ذلیل کر دیا اور لوگوں کے ایمان پر ایسی کاری ضرب لگائی جو بت پرست بھی نہ لگا سکے تھے۔ انہوں نے مسیح کی نافرمانی کی اور اس کے متبعین کو رسوا کیا۔ عالم انسانیت میں ان سے بدتر اور کوئی نہ تھا۔ یہاں تک کہ بت پرست بھی۔'' رومیوں کے نکل جانے کے بعد قلعے پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ ہو گیا اور اس طرح مصر میں عربی فتوحات کا پہلا مرحلہ اختتام کو پہنچا۔ اس باب میں جو واقعات وحوادث پیش کیے گئے ہیں، وہ اس مرحلے کی اہمیت پر شاہد ہیں۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے علم و تدبر اور

Marfat.com

دور اندیشی و اصابت رائے نے اس مرحلے کی نزاکت کا اندازہ کر لیا تھا اور بڑے پس و پیش کے بعد فتح و نصرت کا علم آگے بڑھانے پر آمادہ ہوئے تھے۔ اب ہم انہیں اس حال میں چھوڑتے ہیں کہ وہ مفتوحہ علاقوں کے نظم و نسق پر غور کر رہے ہیں اور اس کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے اسکندریہ کی طرف پیش قدمی کرنے کی اجازت چاہیں گے۔ جس دن انہوں نے یہ اجازت حاصل کرنے کے لیے قاصد روانہ کیا، انہیں اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ اللہ ان کے حصول مقصد کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ وہ قبطیوں سے رومیوں کی نفرت اور رومیوں کی کمزوری اور ناامیدی دیکھ چکے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ عظیم الشان دارالسلطنت، اسکندریہ کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے جائیں گے اور وہ ان کا بھی ویسا ہی استقبال کرے گا جیسا کہ اس سے پہلے جولیس سیزر اور انطونی کا استقبال کر چکا ہے اور جس طرح سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ مدائن میں اکاسرہ بنی ساسان کے تخت پر بیٹھے تھے، اسی طرح وہ بھی عنقریب بطالسہ اور رومیوں کے تخت پر متمکن ہوں گے۔

جب ابن عاص رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ان کی فوج ستا چکی ہے اور گرد و پیش کی زمین ان کے قبضے میں آ گئی ہے تو وہ بڑی بے چینی کے ساتھ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی اجازت کا انتظار کرنے لگے۔ حالات کے سازگار ہو جانے پر انہوں نے قلعے سے جزیرہ روضہ اور جزیرہ روضہ سے جیزہ تک کشتیوں کا ایک پل بنانے کا حکم دیا۔ اس طرح وہ دریا کے کنارے تک پہنچ گئے اور دریا میں سفر کرنے والی کشتیوں اور ان کے سامان پر قبضہ کرنا مسلمانوں کے لیے آسان ہو گیا۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے جب مفتوحہ علاقوں میں اپنی فوج متعین کی تو انہیں معلوم ہوا کہ قبطیوں کی قومی پولیس مسلمانوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور کہتی ہے کہ ہم عرب جیسی قوم کے محکوم کیسے رہ سکتے ہیں۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ کو خطرہ لاحق ہوا کہ یہ قبطی کہیں بغاوت نہ کر دیں۔ انہوں نے اونٹ ذبح کرنے کا حکم دیا اور ان کا گوشت پانی اور نمک میں پکایا۔ اس کے بعد قبطیوں کو شریک طعام ہونے کی دعوت دی۔ عربوں نے شوربا پینا شروع کیا اور بوٹیاں اس طرح توڑ توڑ کے کھانے لگے کہ ساری چھینٹیں قبطیوں پر جاتی تھیں۔ ان کے اس بے ڈھنگے پن نے قبطیوں کو ان سے اور زیادہ متنفر کر دیا۔ دوسرے دن ابن عاص رضی اللہ عنہ نے مصری کھانے پکوائے اور فوج کو حکم دیا کہ دستر خوان پر مصری لباس پہن کر آئیں۔ قبطیوں کو بھی دوبارہ دعوت دی گئی۔ عربوں نے مصریوں کی طرح کھانا کھایا اور انہیں کے آداب اختیار کیے جسے دیکھ کر قبطی حیران رہ گئے۔ تیسرے دن ابن عاص رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ صبح سویرے مسلح ہو کر نمائش کے لیے تیار رہے۔ یہ نمائش قبطیوں کو دکھا

Marfat.com

گئی اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: ''میں نے سُنا تھا کہ تم اپنے تئیں بڑا مہذب سمجھتے ہو اور عربوں کو بدتہذیبی کے طعنے دیتے ہو! اس سے مجھے اندیشہ ہوا کہ تم ہلاکت میں نہ پڑ جاؤ اور میں نے تمہیں یہ سب کچھ دکھا دیا کہ عربوں کی اپنے ملک میں کیا حالت تھی۔ تمہارے ملک میں وہ کس طرح رہتے ہیں اور جنگ میں ان کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔'' واپسی پر قبطی آپس میں کہنے لگے: ''عربوں نے تمہیں اپنی ٹھوکر پر مارا ہے۔''

ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے کہا: ''عرب ایسی قوم ہے جس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ انہوں نے تمہیں اپنے پاؤں تلے روندا ہے۔'' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب اس واقعے کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا: ''دوسرے تلوار سے لڑتے ہیں اور ابن عاص رضی اللہ عنہ باتوں سے!'' یا یہ فرمایا: ''بخدا! ابن عاص رضی اللہ عنہ کی جنگ بڑی ٹھنڈی اور نرم ہوتی ہے۔ اس میں وہ شدت اور وہ ہیجان نہیں ہوتا جو دوسروں کی جنگ میں ہوتا ہے۔'' قبطی عربوں کی طاقت کا اندازہ کر کے اور ان کا طرزِ عمل دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور ان کے ایک گروہ نے اسلام قبول کر لیا۔ مسلمانوں نے انہیں مساوی حقوق دیئے اور جزیہ معاف کر دیا۔ اگرچہ اپنے ابنائے قوم کی نگاہوں میں وہ ملعون و مردود ہو گئے۔ ان نومسلم قبطیوں نے جزیے کی وصولی اور ان عیسائیوں کے مال و متاع کی نگرانی میں، جو لڑائی کی وجہ سے اپنے گھر چھوڑ کے چلے گئے تھے، اپنے عرب بھائیوں کے ساتھ تعاون کیا، جس سے ابن عاص رضی اللہ عنہ کی حکومت کے قدم اچھی طرح جم گئے اور وہ اس قابل ہو گئے کہ جس وقت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ انہیں اسکندریہ کی طرف پیش قدمی کرنے کی اجازت دیں تو وہ اطمینان سے روانہ ہو جائیں۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ کی فوج بھی جنگ کے لیے ان سے کچھ کم بے چین نہ تھی۔ قلعہ بابلیون کی فتح نے ان کی معنوی قوتوں میں غیر معمولی بلندی پیدا کر دی تھی اور ابن عاص رضی اللہ عنہ کی طرح یہ یقین ان کے دلوں میں بھی واضح ہو گیا تھا کہ خدا ان کے ساتھ ہے اور ان پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ اس ولولہ انگیز روح کے ساتھ وہ گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومتے جہاں ان کا جی چاہتا، جاتے اور فراعنہ کے شہر میں ان باقی ماندہ آثار کی سیر کرتے جن کی خاموشی ہی ان کی گزشتہ عظمت و سطوت کی مکمل داستان تھی۔ جنہوں نے انسانی تہذیب کا آفتاب طلوع دیکھا تھا، جن کی نگاہیں انسانی ضمیر کی پیدائش اور اس کی آنکھیں کھلنے کے منظر سے آسودہ ہوئی تھیں۔ دن ڈھلے جب وہ اپنی لشکر گاہ میں لوٹتے تو ان کے دل حیرت و استعجاب سے لبریز اور ان کے حواس ان آثار کی عظمت سے مغلوب ہوتے۔ وہ رہ رہ کے انہیں غیر فانی مناظر کا ذکر کرتے جن کی سطوت

وجلال کا دنیا میں کہیں جواب نہ تھا۔منف کی دلآویز اور اس کے حریف، مصر کی رنگا رنگ زندگی، ان کی گفتگو کا دل پسند موضوع تھا۔مصر، منف کے بالمقابل، نیل کے کنارے واقع تھا اور زندگی کی گہما گہمیوں میں اس کے کندھوں سے کندھا ملا کر چلتا تھا، لیکن جب تاریخ نے منف کی عظمت وشوکت کے گیت گائے تو مصر کی زندگی کی جوت آہستہ آہستہ ماند پڑ گئی۔

منف کے آثار کی عظمت اور اس کے گردوپیش پھیلے ہوئے وسیع سبزہ زاروں نے عربوں کے دل پر گہرا اثر کیا۔وہ عراق وشام میں بھی ایسے ہی سبزہ زاروں سے لطف اندوز ہو چکے تھے اور جب سے مصر میں داخل ہوئے تھے، انہیں دیکھ دیکھ کر خالق کائنات جل شانہ کی قدرت پر ان کا ایمان پختہ ہو رہا تھا، لیکن منف میں جو کچھ ان کی آنکھوں نے دیکھا، اسکندریہ بھی اس کی یاد ان کے دل سے نہ بھلا سکا۔منف میں جو آثار تھے ان کی مثال دنیا کے تختے پر کہیں نہ ملتی تھی اور وہ قدیم فراعنہ کی تہذیب وعبادت کے متعلق عجیب وغریب معلومات بہم پہنچاتے تھے۔اس شہر میں ایک بہت بڑا معبد تھا جسے ''فتاح'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔اس میں سورج کی پوجا کی جاتی تھی، جس طرح طیبہ کے معبد، کرنک میں۔اس کے باہر سرابیوم نامی ایک معبد تھا، جس میں ''ابیس'' بچھڑے کا بت تھا، اس معبد کے سامنے ابوالہولوں کی دو طویل قطاریں تھیں جو دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتی تھیں اور عقب میں مقدس چھوڑ کی قبریں تھیں، جن کی عظمت نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتی اور اس قوم کے کارنامے دامن نگاہ کو حیرت سے گراں بار کر دیتے جو اپنی بلند تہذیب کے نقوش کو ان تصویروں اور مجسموں، ان تفریح کدوں اور عمارتوں کی شکل میں ڈھال کر چھوڑ گئے تھے۔اس طرح انہوں نے اپنی دیویوں کی تصویریں بنائیں اور اس طرح ان دیویوں کی نظر فریب مورتیوں میں رمز واشارات کے جادو جگائے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان رہبانوں اور فرعونوں نے خدائے واحد کی عبادت کو کس حد تک فراموش کر دیا تھا، جس پر نور حق سے روشن تابناک دل ایمان لاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے:

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ

ترجمہ: ''بے شک جسے تم پسند کرو، ہدایت نہیں دے سکتے، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت بخش دیتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو زیادہ جانتا ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ مسیحیت نے ان مراسم عبادت کو مٹایا اور اب اسلامی لشکر سرزمین فراعنہ میں

Marfat.com

قدم زن ہے۔ اب اس کے جھنڈے مصر کی فضا میں لہرا رہے ہیں کہ دین حق کو قیامت تک کے لیے یہاں قائم کر دیں۔ اگر حق، زمین پر خدا کی جنت میں قائم نہ ہوگا تو اور کہاں ہوگا اور اگر اللہ کی وہی فوجیں یہاں حق کا علم بلند نہ کریں گی، جنہوں نے اپنی جانیں دین حنیف کی سربلندی کے لیے وقف کر رکھی ہیں تو اور کون کرے گا؟ چنانچہ منف کا حسن و جمال بھی ان کے پاؤں کی بیڑی نہ بن سکا اور اسکندریہ کی طرف پیش قدمی کا شوق بھی ان کے دلوں میں وہی جوش و حرارت پیدا کرتا رہا، جس سے ان کے سپہ سالار کا دل معمور تھا اور جس کی بنا پر وہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی اجازت کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔

اس اجازت میں دیر نہ لگی۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ تین مہینے کے بعد نیل میں پھر طغیانی آ جائے گی، اس لیے بہتر یہی ہے کہ پانی چڑھنے سے پہلے اسلامی لشکر، مصر کے پایہ تخت کی طرف روانہ ہو جائے۔ اجازت ملتے ہی حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے قلعہ بابلیون کی نگرانی ایک مسلح اسلامی دستے کے سپرد کی جس کے سردار خارجہ بن حذافہ سہمی تھے اور خود اپنے لشکر کو لے کے حسن و جمال اور علم و فن کے عظیم مرکز...... اسکندریہ...... کا رخ کیا۔

⊙❀⊙

Marfat.com

باب:20

فتح اسکندریہ

اس سے پہلے کہ ہم غازیان عرب کے ساتھ اسکندریہ جائیں، بہتر ہوگا کہ بحیرہ روم کے رستے باسفورس چلیں، اور رومی سلطنت میں جو اضطراب وانتشار پیدا ہوگیا ہے اور اس اضطراب وانتشار نے قسطنطین کے پایہ تخت پر جو اثر ڈالا ہے اس کا مشاہدہ کریں۔ ہرقل مرگیا اور شام ومصر میں رومیوں کی پے در پے ہزیمت نے سلطنت بھر میں بے چینی کی لہر دوڑا دی۔ ہرقل کی موت نے اس بے چینی میں اور اضافہ کیا، جاہ پسندوں اور شاہی محل کے کارندوں نے سازشوں کا جال پھیلا دیا اور سلطنت کا کوئی گوشہ اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ہرقل کے بعد حکومت کسی ایسے بادشاہ کے ہاتھ میں نہ آئی، جو قوت وتدبیر سے کام لیتا، بلکہ ہرقل کے دو سوتیلے بیٹوں، قسطنطین اور ہرقلیوناس اور ہرقل کی ملکہ مرتینا...... جو ہرقلیوناس کی ماں بھی تھی کے سپرد کی گئی۔ مرتینا نے حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی اور یہ کوشش وہ ایک دفعہ ہرقل کی زندگی کے آخری دنوں میں بھی کر چکی تھی، لیکن قسطنطین اس کی راہ کا ایک بھاری پتھر تھا۔ اس لیے کہ ایک تو وہ اپنے بھائی سے بڑا تھا اور دوسرے عوام میں ہر دلعزیز ہونے کی بنا پر ایک طاقتور گروہ کی ہمدردیاں اسے حاصل تھیں۔ چنانچہ سلطنت میں ایک کشمکش کی حالت پیدا ہوگئی اور اس کشمکش کا وہی نتیجہ ہوا، جو ہونا چاہیے تھا۔ یعنی دھڑے بندیاں شروع ہوگئیں اور جاہ پسندوں نے ملکہ یا قسطنطین کے تقرب کو اپنا مقصد بنا لیا۔ کوئی مرتینا کے ساتھ مل کر اس کے سوتیلے بیٹے کے خلاف سازشوں میں مصروف ہوگیا، کوئی قسطنطین کے حاشیہ برداروں میں اپنا نام لکھوا کر ملکہ کے خلاف ریشہ دوانیاں کرنے لگا۔

غرض یہ کہ رومی سلطنت کی بھی وہی حالت ہوگئی، جو یزدگرد کے تخت نشین ہونے سے پہلے ایرانی سلطنت کی تھی اور جس نے مسلمانوں کے لیے یہ موقع بہم پہنچایا کہ وہ ان دو شیروں روم ا

ایران کو لقمہ اجل بنا کر فتح ونصرت کا تاج اپنے سر پر رکھ لیں۔ اس کے باوجود عوام کی نگاہیں اس تثلیث پر لگی ہوئی تھیں، جو ہرقل کے تخت پر متمکن تھی، انہیں اُمید تھی کہ عظیم بوڑھے شہنشاہ کے آخری عہد حکومت میں، رومی سلطنت جس ابتلا سے دوچار ہوگئی تھی۔ یہ تثلیث اپنی حکمت عملی سے اسے دور کر دے گی۔ ہرقل کی حکومت کا ابتدائی زمانہ، اس سلطنت کا عہد زریں تھا، جس میں وہ ایک نہایت بلند مقام پر فائز ہوگئی تھی اور ہرقل کا نام آسمان عظمت وجلال پر آفتاب بن کر چمکنے لگا تھا۔ لیکن پھر اسی شہنشاہ کے آخری دور میں وہ وقت بھی آگیا جب عزت وعظمت کی یہ بلندیاں ننگ وہزیمت کی پستیوں سے بدل گئیں۔ چنانچہ اس کے جانشینوں کو سب سے پہلے مصر کے حالات نے اپنی طرف متوجہ کیا کہ مصر اور اس کی پیداوار کا ہاتھ سے نکل جانا گویا پوری مملکت کا غذائی بحران میں مبتلا ہو جانا تھا۔ اس لئے قسطنطین نے فوراً قیرس کو اس کی جلاوطنی سے بلوا بھیجا۔ ساتھ ہی مصر سے ایک رومی سپہ سالار کو مشورے کے لیے طلب کیا۔ مرتینا، قیرس کے بلوائے جانے سے بہت خوش ہوئی، شاید اس لیے کہ وہ ملکہ کی طرف میلان رکھتا تھا اور ملکہ کو اس کی چالاکی اور ہوشیاری پر بھروسا تھا۔ قیرس کی ہنوز وہی رائے تھی جو اس نے ہرقل کے سامنے پیش کی تھی، لیکن وہ ان دلیلوں کا قائل ہوگیا، جن کے پیش نظر رومیوں کو عربوں سے صلح نہیں کرنی چاہیے تھی۔ قسطنطین نے مصر کو بھاری امداد دینے کا وعدہ کیا اور جہازوں کو تیاری کا حکم دے دیا۔ ملکہ مرتینا نے قسطنطین کے اس اقدام کی پرزور تائید کی جس سے عوام کے دل بڑھ گئے، لیکن یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی اور اپنے باپ کی موت کے سو دن بعد قسطنطین بھی اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ قسطنطین کی موت کا ذمہ دار مرتینا کو ٹھہرایا گیا اور اونچے طبقے کے ایک گروہ نے اس الزام کو تیزی سے پھیلایا۔ الزام رکھنے اور اسے ہوا دینے والوں میں چونکہ قسطنطین کا بیٹا کونستانس بھی شامل تھا اس لیے عوام مرتینا کے خلاف ہوگئے اور مصر کی طرف کمک کی روانگی رُک گئی۔

مرتینا نے اس تہمت کو بے اصل ثابت کرنے اور اپنے بیٹے ہرقلیوناس کو تخت کا واحد وارث بنانے کی بہتیری کوشش کی، لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، بلکہ بیٹے کو تخت کا واحد وارث بنانے کی کوشش نے اس اتہام کو اور مضبوط کر دیا اور عوام کی طرح فوج بھی اس کے خلاف بھڑک اُٹھی۔ اس بغاوت کے شعلے کئی مہینے تک روشن رہے اور آخر کار اس فیصلے پر ہنگامہ فرو ہوا کہ قسطنطین کے بیٹے کونستانس کو ہرقلیوناس کا شریک حکومت بنا دیا جائے۔ قیرس، یہ دیکھتے ہی کہ بغاوت ختم ہو رہی ہے اور کونستانس اپنے باپ کی جگہ تخت پر بیٹھنے والا ہے، مصر کے رومی مدافعین کی مدد کے لیے فوج

اور راہبوں کی ایک بھاری تعداد لے کر مصر کی طرف روانہ ہو گیا۔ چلنے سے پہلے اس نے ملکہ اور اس کے بیٹے سے ساز باز کر لی تھی اور شاید ملکہ کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ یہ فوج فراعنہ کی سرزمین میں اس کے لیے قوت بنے گی اور اگر دشمن کی سازش سے بزنطیہ میں ملک کے خلاف دوبارہ بغاوت برپا ہوئی تو وہ اور اس کا بیٹا اس فوج کے سہارے مصر میں پناہ لے سکیں گے۔ قیرس کا یہ بحری بیڑہ ستمبر ۶۴۱ء میں اسکندریہ پہنچا اور اسکندریہ والوں نے اس بوڑھے بطریق کا استقبال اس فاتح کی حیثیت سے کیا جو ان کے شہر، ان کے دین اور ان کی سلطنت کو بچانے کے لیے قیصر کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ ①

---

① بٹلر کہتا ہے کہ قسطنطین نے قیرس کو اس کی جلاوطنی سے بلاتے وقت جس رومی سپہ سالار کو مصر سے مشورے کے لیے طلب کیا تھا، وہ سپہ سالار اعظم تھیوڈور تھا۔ پھر لکھتا ہے کہ مرتینا نے تھیوڈور کو اس امدادی فوج کا سالار بنانا چاہا جو قیرس مصر لے جا رہا تھا اور یہ اس لیے کہ مرتینا جانتی تھی کہ فوج کو تھیوڈور سے بہت محبت ہے اور ڈرتی تھی کہ اگر وہ قسطنطنیہ میں رہا تو اس کے دشمنوں سے مل جائے گا۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ تھیوڈور نے دربار کی فضا کو ان سازشوں سے لبریز پایا جن کی بنا پر مرتینا سلطنت کے پایہ تخت سے روڈس جانے پر مجبور ہوئی اور دیکھا کہ مرتینا کے دشمن اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ چنانچہ اس نے عافیت کو ترجیح دیتے ہوئے قرطاجنہ کی طرف چلے جانا بہتر سمجھا یا بہت ممکن ہے کہ اس طرح وہ اس موقع کا انتظار کرنا چاہتا ہو جو اس سے پہلے ہرقل کو مل چکا تھا۔ چنانچہ جب یہ موقع آیا تو تھیوڈور اپنے لشکر کے ساتھ قسطنطنیہ پہنچا اور کمزور تثلیث کو تخت سے اُتار کر خود اس پر قابض ہو گیا، جس طرح ہرقل نے فوکاس کو گرفتار کر کے پہلے تخت سے محروم کیا اور اس کے بعد قتل کر دیا تھا۔ تھیوڈور نے یہ بات اپنے دل میں چھپائے رکھی اور بظاہر مرتینا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے قیرس اور رومی سپاہیوں کے ساتھ مصر روانہ ہو گیا۔ جس جہاز میں وہ تھا اس کے ملاح سے ایک رات اس نے چپکے سے کہا کہ جہاز کا رُخ مغرب میں قرطاجنہ کی طرف پھیر دے۔ ملاح دکھاوے کے لیے جہاز کا رُخ مغرب کی طرف پھیرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر بولا کہ ہوا کا رخ جہاز کو مغرب کی طرف جانے سے روک رہا ہے اور تھیوڈور کو مجبوراً قیس کے ساتھ اسکندریہ اترنا پڑا جہاں اس نے عوام کو بوڑھے بطریق کا استقبال اس طرح کرتے دیکھا جیسے کسی بہادر فاتح کا استقبال کر رہے ہیں۔

بٹلر اپنی اس رائے کی سند میں حنا نقیوسی کی کتاب سے ایک عبارت پیش کرتا ہے، لیکن کہتا ہے کہ میں نے اس عبارت میں تھوڑا سا تصرف کیا ہے۔ حنا کی عبارت یہ ہے کہ ''شہنشاہ'' نے انستاسیوس کے نام کو تھیوڈور کے نام سے بدل دیا اور یہی وہ تصرف ہے جس کی طرف اس نے اشارہ کیا ہے، اس لیے کہ تھیوڈور سپہ سالار اعظم تھا اور خود حنا نے ذکر کیا ہے کہ قیرس کے اسکندریہ واپس آنے سے پہلے وہاں کا حاکم انستاسیوس تھا۔ اسی طرح اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ تھیوڈور روڈس میں قیرس کے ساتھ تھا اور اس کے ہمراہ وہاں سے اسکندریہ آیا تھا۔ ہمیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حنا نقیوسی سے اختلاف کر کے بٹلر نے غلطی کی ہے اور اس کا یہ قول صحیح نہیں ہے کہ قسطنطین نے انستاسیوس کو نہیں، تھیوڈور کو بلایا تھا۔ جو تاریخیں بٹلر نے درج کی ہیں، وہ اس کی غلطی کے خلاف سب سے بڑی شہادت ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان مارچ ۶۴۱ء میں

Marfat.com

کیا قیرس نے مصر آنے سے پہلے کوئی ذاتی پالیسی مرتب کی تھی؟ بٹلر کا خیال ہے کہ وہ عربوں سے صلح کرنے کا حتمی ارادہ لے کر آیا تھا اور ''بلاشبہ اس نے شہنشاہ کو، جو ناتجربہ کار جوان تھا اور اپنی کوئی رائے نہ رکھتا تھا، عربوں کے سامنے سپر انداز ہو جانے، ان سے صلح کر لینے پر آمادہ کر لیا تھا۔ اسی طرح ایوان کے ارکان اور دوسرے معززین کو بھی اپنا ہمنوا بنالیا تھا جو سب کے سب کمزور دبے عقل تھے، سب سے بڑھ کر یہ کہ ملکہ مرتینا بھی اس کی اس بے جان رائے سے متفق ہو گئی تھی۔ بالخصوص اس لیے کہ ملکہ کے ہوا خواہ بھی ہر قیمت پر عربوں سے صلح کر لینے کے حق میں تھے۔ ملکہ کی سیاست ہمیشہ سے تسلیم واطاعت کی سیاست رہی تھی اور یہی نقطہ نظر قیرس کا تھا، جس کا وہ ہر وقت اور ہر موقع پر اظہار کیا کرتا تھا۔''

بٹلر اپنی اس رائے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''قیرس اسکندریہ میں اپنا مذہبی اقتدار مستحکم کرنا چاہتا تھا چاہے یہ اقتدار سلطنت کے کھنڈروں ہی پر قائم کیوں نہ کرنا پڑے۔ قیرس کے اس زاویہ نظر سے زیادہ کوئی ملامت انگیز زاویہ نظر ہمیں نہیں ملتا اور اس سے ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کے اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے درمیان خفیہ تعلقات تھے اور اس نے بلاشبہ

» بابلیون سے اسکندریہ کی طرف روانہ ہوئے اور رستے میں متعدد مقامات پر رومیوں سے مقابلے کرتے ہوئے، جن کی تفصیل اس کتاب میں موجود ہے، جون ۶۴۱ء میں اسکندریہ پہنچے اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ خود بٹلر تسلیم کرتا ہے کہ ان میں سے بعض لڑائیوں میں رومی فوج کی قیادت تھیوڈور نے کی تھی اور اس سلسلے میں اس کا بیان بالکل واضح ہے۔ پس اگر قسطنطین نے تھیوڈور کو قسطنطنیہ بلایا تھا اور یہ وہاں اس سے ملا تھا تو لازمی طور پر یہ مئی سے پہلے کی بات ہو گی۔ اس لیے کہ قسطنطین مئی کے مہینے میں مرا تھا، لیکن مئی اور جون کے مہینوں میں تھیوڈور عربوں کے خلاف رومی فوج کی قیادت کر رہا تھا اور ان دونوں باتوں کا بہ یک وقت جمع ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ رہا شبہ کا استناد کہ تھیوڈور، قیرس کے ساتھ اسکندریہ واپس آیا تھا، سو اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اگر یہ صحیح بھی ہو تو اس سے بس اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ تھیوڈور اسکندریہ کے محاصرے کے دوران میں روڈس گیا تھا اور وہاں سے قیرس کے ساتھ واپس آیا۔ اپنی غیر موجودگی میں فوجوں کی قیادت اس نے انستاسیوس کے سپرد کی تھی جو قسطنطین کی موت کے بعد فوراً مصر واپس آ گیا تھا اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جو تاریخیں بٹلر نے بڑی بحث و تمحیص کے بعد متعین کی ہیں، وہ بھی نظر ثانی کی محتاج ہیں۔ میں اس کی تائید میں بہت سی دلیلوں میں سے صرف ایک دلیل پیش کرتا ہوں اور وہ یہ کہ بٹلر کہتا ہے ہرقل مسلمانوں کے اسکندریہ جانے سے کچھ مہینے پہلے اس وقت مرا ہے، جب انہوں نے بابلیون کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس کے برعکس مسلمان مؤرخین تقریباً سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ ہرقل اسکندریہ کے محاصرے کے پانچ مہینے بعد مرا تھا اور بہت سے یورپی مؤرخین، مسلمان مؤرخوں کے اس قول کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ جب حالت یہ ہو تو ہم مجموعی مفہوم اخذ کرنے اور ان تمام مشتبہ مقامات کو نظر انداز کر دینے میں بجانب ہیں، جو اس عہد کی تضاد و اضطراب سے بھری ہوئی تاریخوں کے متعلق پائے جاتے ہیں۔

Marfat.com

رومی سلطنت سے غداری کی۔ چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ کلیسا کی بھلائی کے وہم میں حکومت کی جڑیں کھوکھلی کر رہا تھا۔" میں بٹلر کی اس رائے سے اختلاف کرنے اور اپنی اس بات کو دہرانے میں اپنے تئیں بالکل حق بجانب پاتا ہوں کہ وہ اس مسئلے میں تاریخی حقائق سے زیادہ مسیحی عصبیت سے متاثر تھا۔ قیرس اچھی طرح جانتا تھا کہ مسلمان اپنے مفتوحہ علاقوں کے عوام کو عقیدہ وخیال کی پوری پوری آزادی دیتے ہیں اور اس کا ان معاہدوں میں صریحی طور پر ذکر ہوتا ہے جو مسلمان مفتوحہ علاقے کے باشندوں سے کرتے ہیں۔ عہد صدیقی رضی اللہ عنہ اور عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں عراق وشام کے معاہدے بھی اسی حقیقت کے شاہد ہیں۔ پھر وہ مصر میں اپنی اس روایت کو کیوں بدلتے؟

مفتوحہ علاقوں کے باشندوں پر انہوں نے جزیہ صرف اس لیے عائد کیا تھا کہ ان کے جان ومال، اہل وعیال اور عقائد ومعابد کی حفاظت کریں اور اس حفاظت میں ملکانیوں اور مینوفیسیوں، حاکم رومیوں اور محکوم قبطیوں کے درمیان کوئی امتیاز روا نہیں رکھا تھا۔ پھر ہم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ قیرس نے خود فریبی میں مبتلا ہو کر یہ گمان کیا ہو کہ وہ عرب کے ذہین ترین انسان، عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے کھیل رہا ہے، انہیں دھوکہ دے رہا ہے جس سے فائدہ اُٹھا کر وہ پہلے کی طرح مذہبی تشدد کا بازار گرم کردے گا۔ اگر بٹلر کا یہ خیال صحیح مان بھی لیا جائے کہ قیرس عربوں سے مصالحت کرنے کا ارادہ لے کر مصر آیا تھا تو یہ ارادہ کسی مذہبی یا سیاسی غرض کے لیے نہ تھا، بلکہ اس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ عربوں سے لڑنے کا نتیجہ رومیوں کی شکست اور تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ رومیوں کی حکومت سازشوں کے ہجوم میں گھری ہوئی تھی اور اس سے ملک میں کمزوری اور مملکت میں زوال شروع ہوگیا تھا۔ یہاں ہم وہ واقعات پیش نہیں کریں گے جن سے قیرس کے مقاصد اور اس کے نقطہ نظر کی وضاحت مقصود ہو اگرچہ آگے چل کر واقعات اس سیاست کی تحدید اس وضاحت سے کردیں گے کہ شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ اب ہم قیرس کو اسکندریہ میں چھوڑ کر بابلیون چلتے ہیں تاکہ غازیان اسلام کے ساتھ ان کی منزل مقصود کی طرف روانہ ہوں۔

مئی ۶۴۱ء میں ابن عاص رضی اللہ عنہ بابلیون سے روانہ ہوئے، جب قسطنطین کی وفات سے سلطنت روم کا پایہ تخت اضطراب وانتشار کی جولان گاہ بنا ہوا تھا۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے سفر کے لیے وہ رستہ پسند کیا جو دریائے نیل کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ اس علاقے کو آج کل صوبہ بحیرہ کہتے ہیں۔ یہ راہ اس لیے اختیار کی گئی تھی کہ وہ نالے بیچ میں حائل نہ ہوں جو صوبہ منوف

میں ڈیلٹا کے جنوب کو قطع کرتے ہیں۔ بابلیون کے دوران قیام میں ابن عاص رضی اللہ عنہ نے مفتوحہ علاقوں کے قبطیوں سے یہ تعاون حاصل کر لیا تھا کہ وہ رستوں کو درست کر دیں گے اور جہاں جہاں ضرورت ہوگی، پل بنادیں گے۔ اس سے مسلمانوں کو تیز رفتاری میں مدد ملی۔ اس سفر میں ابن عاص رضی اللہ عنہ نے قبطیوں کے چند منتخب رؤساء کو، جن سے ان کے تعلقات خوشگوار تھے، اپنے ساتھ لے لیا تھا تاکہ رستے میں جو شہر پڑیں ان کے باشندوں کو یہ رؤساء مسلمانوں سے قریب کرنے کا ذریعہ بنیں۔ ابن عاص کا پروگرام سب سے پہلے نقیوس اور اس کے مضبوط قلعے پر قبضہ کرنا تھا، نقیوس، منوف سے چند میل جانب شمال، دریا کے دائیں کنارے واقع تھا اور جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، مسلمانوں کے قبضے میں تھا۔ رومیوں نے سوچا کہ نقیوس پہنچنے سے پہلے ہی ابن عاص رضی اللہ عنہ کو دریا عبور کرنے سے روک دیں اس کے لیے دریا کے بائیں کنارے پر مزاحمت کرنی ضروری تھی، چنانچہ رومی ''طرنوط'' کے قریب، جسے بعض مؤرخین ''طرانتہ'' کہتے ہیں صف آراء ہوئے۔ یہ مقام نیل کے کنارے، منوف کے جنوب میں زاویہ زریں کے بالمقابل واقع تھا۔ یہاں فریقین میں مقابلہ ہوا اور رومیوں کی شجاعت کے باوجود ابن عاص رضی اللہ عنہ نے بغیر کسی خاص مشقت کے انہیں شکست دے دی۔

ابن عاص رضی اللہ عنہ نے اپنا سفر جاری رکھا، یہاں تک کہ نقیوس اور اس کے مضبوط قلعے کے سامنے پہنچ گئے۔ ان کا غالب گمان تھا کہ اہل قلعہ اپنے اور غازیانِ اسلام کے درمیان دریا کو سپر بنائیں گے، اس لیے وہ دریا پار کرنے کے ذرائع سوچنے لگے اور اس سلسلے میں ان قبطی رؤساء سے بھی مشورہ کیا جو ان کے ساتھ تھے۔ یہ بات ان کے ذہن میں نہ آئی کہ نقیوس کو پیچھے چھوڑ کر مصر کے پایہ تخت کی طرف بڑھ جائیں۔ اس صورت میں اندیشہ تھا کہ قلعے کی فوج عقب سے ان پر حملہ کر دے گی اور ان کے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ مئی کی تاریخوں میں دریا عبور کرنا بھی کچھ مشکل نہ تھا۔ نیل کی سطح گر چکی تھی اور اس کی موجوں میں وہ پہلی سی تندی و تیزی نہ رہی تھی۔ چنانچہ کشتیوں یا پل کے ذریعے اسے پار کر لینا فاتح لشکر کے امکان میں تھا۔ لیکن رومیوں کا خط فکر ابن عاص رضی اللہ عنہ کے انداز فکر سے مختلف تھا انہوں نے یہ سوچا کہ اگر ابن عاص رضی اللہ عنہ کو بغیر کسی مزاحمت کے پایہ تخت کی طرف بڑھنے دیا جاتا ہے، خاص طور پر ایسی حالت میں کہ رومی طرنوط کے مقام پر ان سے شکست کھا چکے ہیں تو عوام کے دل ٹوٹ جائیں گے اور وہ ان لوگوں کی فوراً اطاعت قبول کر لیں گے جن کے مقابلے کی ہمت کسی میں نہیں۔ چنانچہ سالار قلعہ اپنی پوری

فوج لے کر باہر نکلا اور عربوں کا رستہ روکنے کے لیے ان کشتیوں پر سوار ہو گیا جو شہر کے دفاع کی غرض سے تیار کھڑی تھیں۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے ان کشتیوں اور ان سپاہیوں کو دیکھا جو کنارے پر اتر کے ان کی راہ میں حائل ہونا چاہتے تھے اور مجاہدین اسلام کو ان پر تیر برسانے کا حکم دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جو سپاہی کنارے پر اُتر آئے تھے، واپس کشتیوں میں پناہ لینے لگے۔ لیکن مسلمان سواروں نے انہیں آسانی سے بھاگنے نہ دیا، مارتے ہوئے پانی تک لے آئے اور جو رومی دریا میں تھے ان پر تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ رومی سپہ سالار نے خیال کیا کہ مسلمان اب ان پر پانی میں بھی حملہ کریں گے۔ شاید اس نے سُن رکھا تھا کہ مدائن جانے کے لیے مسلمانوں نے دریائے دجلہ کی بپھری ہوئی موجوں کی بھی پرواہ نہ کی تھی، چنانچہ اس نے اپنی کشتی کے ملاح کو اسکندریہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا اور بھاگ گیا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر رومی فوج نے بھی ہتھیار رکھ دیے اور سب اپنی اپنی جان بچانے کی فکر کرنے لگے، لیکن عربوں نے ان کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی اور انہیں گھیر کے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس کے بعد فاتحین بلا روک ٹوک شہر میں داخل ہو گئے کہ شہر اپنے محافظوں سے خالی ہو چکا تھا۔

اس عہد کا مؤرخ حنا نقیوسی لکھتا ہے: ''مسلمان شہر میں داخل ہوئے اور رستے میں انہیں جو ملا اسے قتل کر دیا۔ کلیساؤں میں پناہ لینے والے بھی ان سے نہ بچ سکے۔ مسلمانوں نے عورتوں، مردوں، بچوں، کسی کو نہ چھوڑا۔ اس کے بعد وہ نقیوس کے نواح میں پھیل گئے اور یہاں بھی جو ہاتھ آیا اسے تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ جب وہ مرونا میں داخل ہوئے تو وہاں اسکوتادس اور اس کے اہل وعیال کو پایا جو سپہ سالار تھیوڈور کا قریبی رشتہ دار تھا اور ایک باغ میں چھپا ہوا تھا، اسے بھی اہل وعیال سمیت مسلمانوں نے ختم کر دیا۔''[1] یہ عبارت جو بٹلر نے حنا کی کتاب سے نقل کی ہے مبالغے سے خالی نہیں ہے اور اسی لیے بٹلر کے مترجم استاذ محمد فرید ابو حدید نے اس پر یہ حاشیہ لکھا ہے:

''گمان غالب یہ ہے کہ عرب فاتحین سے بغض وتعصب کی بنا پر حنا نقیوسی نے یہ مبالغہ آرائی کی ہے۔ جنگ میں عربوں کا پہلا اُصول یہ تھا کہ شکست تسلیم کر لینے والے کو قتل نہ کیا جائے، اسی طرح عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کی جان نہ لی جائے۔ یہ ان کے مذہب کا حکم تھا اور اسلام کے دونوں پہلے خلیفہ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے سپہ سالاروں اور

[1] مصر میں عربی فتوحات، عربی ترجمہ، صفحہ ۲۴۸۔

Marfat.com

سپاہیوں کو بطور خاص اس کی تاکید فرماتے تھے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نقیوس میں ٹھہرے اور اس کے اطراف کو رومی اثرات سے پاک کر دیا، جو لوگ نقیوس سے اسکندریہ کی طرف بھاگ گئے تھے ان کے تعاقب میں شریک بن سمی کو روانہ کیا اور شریک نے ان لوگوں کو جالیا رومیوں نے جو ان کے مختصر سے دستے کو دیکھا تو پلٹے اور مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ شریک ان کی کثرت تعداد کے پیش نظر اپنے دستے کو لے کر ایک بلند ٹیلے پر چڑھ گئے اور وہاں سے ان کا مقابلہ کرنے لگے۔ لیکن یہ انہوں نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا تھا کہ اگر کمک نہ پہنچی تو وہ شکست کھا جائیں گے۔ انہوں نے ایک مشہور شہ سوار مالک بن ناعمہ صدفی کو جن کی برق رفتاری مسلم تھی، حکم دیا کہ نقیوس جا کر ابن عاص رضی اللہ عنہ سے مدد طلب کریں۔ وہ ٹیلے سے اُترے اور رومیوں کی صفوں کو چیرتے ہوئے نکل گئے، کوئی ان کی گرد کو بھی نہ پا سکا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اطلاع ملتے ہی شریک کو کمک بھیج دی۔ رومیوں کو جب اس کا علم ہوا تو فرار کی راہ لی۔ اس دن سے یہ بلند ٹیلا جس کے گرد جنگ ہوئی تھی، اس عربی سپہ سالار کے نام سے موسوم ہے، جس نے اس پر پناہ لی تھی اور اسے آج تک ''کوم شریک'' کہا جاتا ہے۔

ابن عاص رضی اللہ عنہ اپنی فوجوں سمیت شریک سے آملے اور نہر رشید کو دائیں طرف چھوڑتے ہوئے نہر کالونی کے ساتھ ساتھ اسکندریہ روانہ ہو گئے۔ انہیں اطلاع ملی کہ رومی سپاہ دمنہور سے چھ میل جنوب کی طرف سلطیس کے قریب ان کی آمد کا انتظار کر رہی ہے۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے باگیں ان کی طرف موڑ دیں اور جاتے ہی ان سے ٹکرا گئے۔ شدید جنگ کے بعد رومیوں نے شکست کھائی اور وہ شکست کیوں نہ کھاتے جب کہ وہاں پناہ لینے کے لیے کوئی قلعہ نہ تھا۔ رومی شکست کھا کر ایسے بھاگے کہ دمنہور میں بھی نہ رکے بلکہ کریون کے قلعوں میں جا کے سانس لیا جو اسکندریہ سے ادھر کے قلعوں کے سلسلے کی آخری کڑی تھی۔ یہاں وہ اس رومی فوج کے ساتھ مل گئے جو تھیوڈور کی کمان میں مسلمانوں سے لڑنے کے لیے تیار تھی۔ تھیوڈور نے، جو مصر میں رومی افواج کا سپہ سالار اعظم تھا، اندازہ کر لیا تھا کہ اگر اسے کریون میں شکست ہو گئی تو عربوں کے لیے پایہ تخت کے دروازے کھل جائیں گے اور اپنی اس فتح کے زور میں وہ اسکندریہ کا شدید محاصرہ کر لیں گے۔ مانا کہ اسکندریہ کے محافظین قوی اور اس کا دفاع آسان ہے۔ تاہم بہتری اسی میں ہے کہ بہر قیمت حملہ آوروں اور پایہ تخت کی فصیلوں کے درمیان کوئی دیوار حائل کر دی جائے۔ چنانچہ وہ خود ایک بڑی فوج لے کر، جس کی قوت پر اسے اطمینان تھا، کریون پہنچا اور یہ دیکھ کر اس کا

Marfat.com

حوصلہ اور بڑھ گیا کہ رومیوں نے کریون کے قلعوں کی مرمت کر کے انہیں مستحکم تر کر دیا ہے۔ پھر ان قلعوں کے سامنے ثعبان کا جو نالہ تھا وہ بھی مدافعین کی حفاظت کر رہا تھا اور کریون سے اسکندریہ جانے والا رستہ بھی صاف و ہموار تھا، جس کے ذریعے ضرورت کے وقت زیادہ سے زیادہ کمک بآسانی پہنچ سکتی تھی۔ کریون کے آس پاس بسنے والے رومیوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہاں فیصلہ کن جنگ ہونے والی ہے تو وہ بھی اطراف سے آ آ کر تھیوڈور کے بازو مضبوط کرنے لگے۔ یہ لوگ فیسو، سی، بلہیب اور دوسرے شہروں سے یہاں پہنچے اور سلطنت کی فوجوں میں شامل ہو گئے۔

ابن عاص رضی اللہ عنہ جو فوج لے کر کریون گئے تھے اس کی تعداد کیا تھی؟ مؤرخین کوئی ایسی روایت بیان نہیں کرتے جس سے ظاہر ہو کہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے اس بارہ ہزار فوج کے علاوہ بھی، جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، کوئی فوج بھیجی تھی۔ پھر یہ فوج بھی چونکہ متعدد معرکوں میں نبرد آزما ہوئی تھی اس لیے یقیناً اس کی اچھی خاصی تعداد کام آ چکی ہوگی۔ پھر ابن عاص رضی اللہ عنہ نے اس فوج میں سے مختلف دستے بھی مفتوحہ علاقوں میں امن وانتظام برقرار رکھنے کے لیے وہاں چھوڑے تھے، تو کیا آپ کے خیال میں انہوں نے مفتوح قبطیوں کو بھی اپنی فوج میں شامل کر لیا تھا، یا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مشرق سے مغرب میں بھٹکنے والے صحرائے مصر کے بدوؤں سے مدد لی تھی، جیسا کہ فرما کی فتح کے بعد ہم دیکھ چکے ہیں؟ ان دونوں امکانات کے متعلق کوئی بات کہنی مشکل ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ قلعہ بابلیون کی فتح کے بعد جب امیر المؤمنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کو اسکندریہ روانہ ہونے کی اجازت دی تو ساتھ ہی کمک بھی بھیجی اور اس وقت کمک بھیجنی دشوار نہ تھی۔ بصرہ اور کوفہ کی فوجیں ایران میں اسلامی لشکر کی امداد کر رہی تھیں۔ شام میں امن وامان بحال ہو چکا تھا اور وہاں حاکموں کے خلاف بغاوت کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا۔ رومی مصر میں الجھے ہوئے تھے، اس لیے شام یا اس کی سرحدوں پر ان کے حملے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ان کی حکومت میں جو سازشیں ہو رہی تھیں وہ اس پر مستزاد تھیں۔ علاوہ ازیں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مختلف میدانوں میں اپنے سپہ سالاروں کی مدد سے کبھی تغافل نہیں برتا اور انہوں نے ابن عاص رضی اللہ عنہ سے وعدہ بھی کیا تھا کہ مصر میں داخل ہونے کے بعد ان کی مدد کی جائے گی تو بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ مصر میں اسلامی فتوحات کے قدم تیز ہو جانے کے بعد بارگاہ خلافت سے برابر کمک بھیجی جاتی رہی اور ابن عاص رضی اللہ عنہ کے اسکندریہ کی طرف روانہ ہوتے وقت اگرچہ

Marfat.com

ہزار سے زیادہ نہیں تو پندرہ ہزار سے زیادہ فوج یقیناً ان کے پاس تھی۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ مصریوں اور بدویوں سے سڑکوں کی تعمیر و نگرانی اور فوج کو رسد پہنچانے کا کام لیا گیا ہو بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان میں سے جن لوگوں پر ابن عاص رضی اللہ عنہ کو اطمینان و اعتماد تھا انہیں اس فوج میں بھی شامل کر لیا ہو جو امن و انتظام کی نگرانی پر مامور تھی، لیکن لڑنے والی فوج جو عرصہ ہائے جنگ میں رومیوں سے نبرد آزما ہوتی تھی، سب کی سب اسلامیان عرب پر مشتمل تھی۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ اور رومی کریون میں صف آراء ہوئے اور فریقین اتنی بے جگری سے لڑے کہ پہلے کی لڑائیوں میں کہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ آخر کار رات کے اندھیرے نے انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور فتح و شکست کا کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ لیکن اگر رومیوں کی کثرت تعداد اور دفاع وطن کے لیے جانبازی و سرفروشی کا لحاظ رکھا جائے، پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ کریون کے قلعے ان کی پشت پناہی کر رہے تھے، ان کے حوصلے بڑھا رہے تھے، تو کہا جاسکتا ہے کہ اس دن پلہ انہیں کا بھاری رہا۔ دوسرے دن صبح ہی سے گھمسان کا رن پڑا اور رات ہونے پر، پہلے دن کی طرح دونوں فوجیں اپنے اپنے مورچوں میں واپس چلی گئیں۔ غرض یہ کہ دس دن...... بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ تک یوں ہی لڑائیاں ہوتی رہیں جن میں مسلمان کبھی کبھی اور رومی اکثر غالب رہے۔ ان معرکوں میں رومیوں نے جس مہارت، شجاعت اور استقامت کا مظاہرہ کیا، اس سے مسلمانوں کے دل ہل ہل گئے۔ یہاں تک کہ ایک دن ابن عاص رضی اللہ عنہ کو اپنی فوج کے ایک ایک دستے کے ساتھ، ایک ایک رکعت اور دو دو سجدوں کی صلوٰۃ خوف ادا کرنا پڑی، تاہم رومیوں کی یہ قوت مسلمانوں کے عزائم پست نہ کر سکی بلکہ ان کی شجاعت میں اور اضافہ ہوگیا۔ وہ پہلے سے زیادہ موت کے پیچھے بھاگنے لگے۔ وردان، جو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے غلام تھے، علم ہاتھ میں لیے اسلامی فوج کے آگے آگے ہوتے تھے اور عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ وردان کے ہم پہلو دشمن سے تیغ آزما رہتے تھے۔ ایک دن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو گہرے زخم آئے اور وہ نڈھال ہو کر وردان سے کہنے لگے: ''وردان! اگر تم ذرا رک جاؤ تو میں سانس لے لوں۔'' وردان نے جو پرچم بکف آگے بڑھ رہے تھے اور جن کی رگوں میں شجاعت کا خون موجیں مار رہا تھا، جواب دیا: ''تم آرام کرنا چاہتے ہو؟ آرام تمہارے سامنے ہے، پیچھے نہیں۔'' یہ جواب سن کر عبداللہ اپنے زخموں کو بھول گئے اور آگے بڑھے۔ ان کے والد کو یہ حال معلوم ہوا تو ان کی خیریت دریافت کرائی۔ عبداللہ نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا وہ ابن اطنابہ کے اس شعر کی تصویر تھا:

Marfat.com

اَقُولُ لَهَا اِذَا جَشَأَتْ وَجَاشَتْ
مَكَانَكِ تُحْمَدِي او تَسْتَرِيحِي

ترجمہ: ''میرا دل جب اکتا جاتا ہے، بے چین ہونے لگتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں۔ اپنی جگہ ڈٹا رہ! اگر زندہ بچ گیا تو تحسین آفریں کا مستحق قرار پائے گا اور (اگر مرگیا) تو سکھ کی نیند سوئے گا!''

قاصد عبداللہ کا یہ جواب لے کر آیا تو ابن عاص رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا: ''واقعی وہ میرا بیٹا ہے!'' اپنی اس شجاعت، استقامت، جواں مردی اور موت سے بے خوفی کی بنا پر مسلمانوں نے کریون اور اس کے قلعے کو فتح کیا اور رومیوں کو شکست دی۔ مسلمانوں کو فتح کیسے ہوئی؟ ان کے کارنامے کیا کیا تھے؟ اور رومیوں کو اتنی مہارت و شجاعت اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنے کے باوجود شکست کیوں ہوئی؟ اس کے متعلق مؤرخین نے کچھ نہیں لکھا۔ ہاں! اس پر وہ سب متفق ہیں کہ معرکہ کریون دس دن یا اس سے بھی کچھ زیادہ برپا رہا تھا اور دونوں فریق اسے فیصلہ کن معرکہ سمجھتے تھے۔ صلوٰۃ خوف اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے زخموں کا ذکر کرنے کے بعد ، جس کا بیان اوپر گزر چکا ہے، ابن عبدالحکم لکھتے ہیں: ''اللہ نے مسلمانوں کو فتح دی۔ انہوں نے رومیوں کو بری طرح قتل کیا اور ان کا تعاقب کرتے ہوئے اسکندریہ پہنچ گئے۔'' بالکل یہی عبارت علامہ سیوطی اور ان مؤرخین کی ہے جنہوں نے ابن عبدالحکم کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ باوجودیکہ یہ قول مختصر ہے اور اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ اس معرکے میں مسلمانوں نے کیسے کیسے کارنامے سرانجام دیئے اور انہیں فتح کس طرح حاصل ہوئی، تاہم یہ حقیقت صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ رومیوں کو اس جنگ میں عبرت ناک شکست ہوئی تھی۔ لیکن بٹلر، حنا نقیوسی کی روایت سے یہ سونگھتا ہے کہ رومی اسکندریہ کی طرف بڑے تحمل اور متانت کے ساتھ پسپا ہوئے تھے۔ حالانکہ حنا کی روایت، جیسا کہ بٹلر نے اسے نقل کیا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتی کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کا ایک کثیر لشکر اسکندریہ کی طرف روانہ کیا۔ اس لشکر نے کریون پر قبضہ کر لیا اور وہاں جو رومی سپاہ تھی وہ اپنے سپہ سالار تھیوڈور کے ساتھ اسکندریہ چلی گئی۔

ایک ایسے فیصلہ کن معرکے کی تفصیلات بیان نہ کرنا جو دس دن .... بلکہ اس سے زیادہ...... برپا رہا ہو، بے حد افسوس ناک ہے۔ ان اسباب و عوامل کا علم، جو رومیوں کی شکست اور مسلمانوں کی فتح کا باعث بنے، بلاشبہ ایک طرف فریقین کی ذہنی کیفیت پر روشنی ڈالتا ہے اور

دوسری طرف ان دونوں فریق کے مقابلے میں مصری عوام کی نفسیات پیش کرتا ہے۔ شروع شروع میں رومیوں نے بڑے جوش وخروش کا مظاہرہ کیا۔ اسکندریہ سے انہیں ہر قسم کی مدد پہنچ رہی تھی۔ پھر یہ انہیں کیا ہوا کہ آخری دن انہوں نے ہمت ہار دی حالانکہ ان کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھی، ان کے پاس مضبوط قلعے بھی تھے اور اسکندریہ کی امداد بھی انہیں حاصل تھی؟ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی قیادت بے جان اور ان کے دشمن کی قیادت نصرت آفریں تھی؟ یا اس کا سبب رومی پایہ تخت سے آنے والی وہ تشویشناک خبریں تھیں جو کریون پہنچیں تو فوج کا دل ٹوٹ گیا؟ یا مسلمانوں نے موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے یمامہ اور یرموک کی طرح یہاں بھی فتح یا موت کا فیصلہ کر لیا تھا اور زندگی کی طلب نے رومیوں کو ان کے سامنے نہ ٹکنے دیا؟ یا فریقین کی اس نازک پوزیشن میں مصری عوام کا بھی دخل تھا کہ انہوں نے رومیوں کے مقابلے میں عربوں کی مدد کی اور ان کی اس اعانت نے جنگ پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ بالآخر مسلمان فتح یاب ہو گئے؟ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض یا تمام محرکات، جنگ کے انجام پر اثر انداز ہوئے ہوں، یا ممکن ہے کہ کچھ ایسے عوامل بھی موجود ہوں، جن کا جنگ سے براہ راست تو کوئی تعلق نہ ہو، لیکن یہ نتیجہ ان کی وجہ سے برآمد ہوا ہو! بہر حال ہم یقین کے ساتھ کسی ایک سبب کو فتح کا موجب قرار نہیں دے سکتے، اس لیے کہ مؤرخین نے یہاں بھی اسی غفلت و بے پروائی کا اظہار کیا ہے جس کا مظاہرہ وہ قادسیہ، یرموک اور نہاوند کے معرکوں میں کر چکے ہیں۔ انہوں نے کوئی ایسی روایت نقل نہیں کی جس کی بنا پر ان اسباب وعوامل کے متعلق کوئی اطمینان بخش بات کہی جا سکے، جو کریون میں رومیوں کی شکست اور عربوں کی فتح کے ذمہ دار تھے۔

تاہم واقعات وحوادث کے سیاق وسباق سے ہم یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ جنگ کے انجام میں مصری عوام کا کوئی قابل ذکر دخل نہ تھا۔ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں رومیوں کے خلاف شدید نفرت پاتے تھے اور مجبوری کے سوا ان کی کوئی مدد کرنے کو تیار نہ تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے متعلق مسلمانوں کے مقاصد کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ خاص طور پر اس وقت، جب مسلمان جنگی ضروریات کے تحت ان کی دولت اور غذائی ذخیروں کی طرف ہاتھ بڑھاتے تھے اور جو کوئی ان کا حکم نہ مانتا تھا اس کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ عربوں کی آمد سے پہلے، اہل مصر رومیوں کے خلاف ہمیشہ برسر کشمکش رہتے تھے اور انہیں یہ اُمید تھی کہ شام میں جو شکستیں ہرقل کو ہو رہی ہیں وہ ایک نہ ایک دن مصر کے لیے رومی پنجہ استبداد سے نجات پانے کا

سبب ہوں گی تا کہ آنکہ اہل مصر اپنے ملک میں آزادی کا سانس لیں گے۔ ظلم وتعدی کا دور ختم ہوگا اور ان کی زمین کے خزانے خود ان کے تصرف میں آجائیں گے۔ کیا مسلمان رومیوں پر غالب آکر ان کی جگہ نہ لے لیں گے، حکومت کی باگ ڈور سنبھال کر وہ نعمتیں اپنے لیے مخصوص نہ کرلیں گے جو پہلے رومیوں نے ہتھیا رکھی تھیں۔ کیا صلح بابلیون میں مسلمانوں نے ان پر جزیہ عائد نہیں کیا تھا اور کیا مسلمان ان سے نسل، زبان اور عقائد و عادات میں اختلاف نہیں رکھتے تھے، اس لیے عین ممکن ہے کہ رومیوں کی طرح وہ بھی انہیں تبدیل مذہب پر مجبور کریں؟ یہ تھے وہ اسباب، جن کی بنا پر اہل مصر رومیوں سے نفرت کرتے تھے اور عربوں کی حکومت سے ڈرتے تھے۔ چنانچہ وہ رومیوں اور عربوں سے صرف اسی وقت تعاون کرتے تھے جب بالکل ہی مجبور ہوجاتے تھے، جس قوم کا یہ حال ہو اس کے متعلق یہ اندازہ کرنا غلط نہ ہوگا کہ معرکہ کریون میں مسلمانوں کی فتح اور رومیوں کی شکست میں اس کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔

یہ رائے اس مختصر سے گروہ کو شامل نہیں ہے، جس نے اپنی کسی مصلحت یا جذبہ مسیحیت سے مغلوب ہوکر رومیوں سے تعاون کیا تھا کہ مسلمان کہیں انہیں تبدیل مذہب پر مجبور نہ کریں۔ اسی طرح گنتی کے وہ لوگ بھی اس رائے کے دائرے میں نہیں آتے جو مسلمانوں سے مل گئے تھے اور بر بنائے مصلحت اسلام قبول کرچکے تھے یا جن کے دلوں میں رومیوں کی ستم آفرینیوں نے غضب وانتقام کی بھٹیاں سلگا رکھی تھیں، اس طرح کے چھوٹے چھوٹے گروہ ہر دور اور ہر قوم میں پائے جاتے ہیں اور استثنائی حیثیت رکھتے ہیں۔ دراصل اس رائے کا اطلاق مصری عوام کی اکثریت پر ہوتا ہے جو ملک میں دور و نزدیک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ اکثریت، جو عوامی جذبات کی صحیح صحیح ترجمانی کرتی تھی، رومیوں کے خلاف اور مسلمانوں سے بے تعلق تھی اور اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ مصر کی حکومت اور ابنائے مصر کے ثمرات محنت میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہ ہو۔

کریون میں عربوں نے رومیوں کو شکست دے کر پسپا ہونے پر مجبور کردیا۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ وہاں بس اتنے ہی دن ٹھہرے کہ ان کی فوج تازہ دم ہوجائے۔ اس کے بعد وہ اس شجاعت پناہ لشکر کو لے کر روانہ ہوئے اور کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر اسکندریہ پہنچ گئے۔ شہر کی فصیلوں کے قریب پہنچ کر فوج رُک گئی۔ اسکندریہ کا دل فریب منظر ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ بھلا دمشق، بیت المقدس، انطاکیہ اور ایوان کسریٰ والے مدائن میں یہ بات کہاں تھی! صحرا زادگان عرب کی آنکھوں نے اس نظر نواز منظر کو اپنی آغوش میں لے لیا، جس کی طلسم کاریاں دلوں اور عقلوں

Marfat.com

پر چھاپے مار رہی تھیں، ان کی نگاہیں دائیں بائیں جس چیز پر رکتی تھیں، حیرت و استعجاب کی تصویر بن کر رہ جاتی تھیں۔

اس عظیم الشان شہر کے مشرق و مغرب میں حد نگاہ تک پھیلا ہوا بحیرہ روم انہیں دعوت نظارہ دے رہا تھا جس کا شفاف پانی نیلگوں آسمان کا آئینہ بنا ہوا تھا۔ موجوں نے سمندر میں ایک ہلچل سی مچا رکھی تھی۔ ایک موج دوسری موج سے گلے ملتی ہوئی ساحل تک آتی اور نرم و نازک ریت سے ٹکرا کر دم توڑ دیتی۔ نگاہیں سمندر سے ہٹ کر جب اس عظیم الشان شہر کی طرف پلٹتیں تو اس کی حیرت زائیوں میں گم ہو کر سمندر اور اس کی موجوں کو بھول جاتیں۔ شہر کے کوچہ و بازار میں ہر طرف باغ بکھرے پڑے تھے، جن کے بلند و بالا درختوں کی چلمن میں سے خوبصورت محل اور عالیشان کلیسا جھانک رہے تھے اس کے بعض حصوں میں ایسے ایسے بلند قلعے اور فصیلیں تھیں کہ ان کے سامنے باقی تمام قلعے اور فصیلیں بے حقیقت نظر آتی تھیں۔ قلعہ بابلیون بھی جس نے ایک بار عربوں کے بڑھتے ہوئے قدم روک لیے تھے، ان عظیم قلعوں میں ایک قلعہ معلوم ہوتا تھا جو شہر کی مضبوطی، استحکام اور دفاعی قوت کی زندہ مثال تھے۔ ان قلعوں اور فصیلوں نے جو خوبصورت عمارتوں کو چھپا رکھا تھا اور آنکھیں صرف ان کے بالائی حصوں ہی کو دیکھ سکتی تھیں جو منقش گنبدوں اور خوش وضع ستونوں سے آراستہ تھے اور جنہیں دیکھ کر قلب و دماغ پر حیرت و استعجاب کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ان گنبدوں کے درمیان کچھ ایسے مینار بھی فضا میں سینہ تانے کھڑے تھے، جن کی بلندیاں عین شمس کے میناروں کو شرماتی تھیں اور جن کی نظیر مصر کے سوا کہیں نہ ملتی تھی۔ ان میناروں کے جھرمٹ میں کلیسائے سان مارک تھا جسے منقش طلسمات نے چاروں طرف سے اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔ یہ کلیسا فن تعمیر کا ایک آبدار موتی تھا جس پر ماہر انجینئر نے حسن و جمال کے تمام رنگ صرف کر دیئے تھے۔ نگاہ جب شہر کے دوسرے حصے پر جاتی تو سراپیوم کے معبد اور اس کی طلائی چھت کے دامن میں آسودہ ہو جاتی اور دقلا یانوس کا بلند مینار اس قلعے سے جھانکتا دکھائی دیتا جو معبد اور اس کے نواح کی حفاظت پر مامور تھا۔

اس وسیع منظر سے گزر کر جب نگاہ سمندر پر جاتی تو فضا میں سر کشیدہ مینارہ فاروس یہ اعلان کرتا نظر آتا کہ میں دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک ہوں۔ اسلامی فوج کی نگاہیں ان عجائبات عمارتوں، مورتیوں، میناروں، کلیساؤں، قلعوں اور فصیلوں پر تیر رہی تھیں اور ہر لمحہ ان کی حیرت و سرگشتگی بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی اس لیے کہ اسکندریہ اس زمانے کے

Marfat.com

حسین ترین شہروں میں سے تھا کیا یہ شجاعت آزما لشکر اس شہر کے حملہ و تسخیر میں کسی قسم کی کوتاہی برتے گا؟ کبھی نہیں! اللہ نے مسلمانوں سے فتح و نصرت کا وعدہ کر رکھا ہے، فصلیں اور قلعے چاہے کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں، ان کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہیں روک سکتے۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے فوج کا ولولہ و جوش دیکھا اور اپنی معلوم و مشہور احتیاط کو چھوڑ کر شہر کی فصیلوں اور برجیوں پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ ان کا خیال تھا کہ کریون کی شکست نے اسکندریہ کے مدافعین کے دلوں میں اسلامی فوجوں کا رعب بٹھا دیا ہوگا اور انہیں یہ یقین ہوگیا ہوگا کہ ان کا انجام بھی ان رومیوں سے بہتر نہیں ہوگا جو کریون سے بھاگ کر ان کے پاس پہنچے تھے۔ ادھر مسلمانوں کو بھی اس میں کوئی شک نہ تھا کہ یہ خوبصورت شہر ان کے لیے اپنے دروازے کھول دے گا۔ چنانچہ انہوں نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کے حکم کی تعمیل کی اور تکبیر کے نعرے بلند کرتے ہوئے اسکندریہ پر دھاوا بول دیا۔ انہیں صرف ان بڑے بڑے پتھروں سے ڈر لگ رہا تھا جو فصیلوں پر نصب کی ہوئی منجنیقوں سے برسائے جا رہے تھے۔ رومیوں کے اس اہتمام و انتظام کی وجہ یہ تھی کہ کریون سے پسپا ہونے کے بعد انہیں یقین ہوگیا تھا کہ عرب جلد سے جلد اسکندریہ پہنچیں گے اور فتح کے نشے میں سرشار ہو کر، بے سوچے سمجھے آتے ہی حملہ کر دیں گے۔ چنانچہ تھیوڈور نے فوج سے تمام نواحی علاقے خالی کرا کے انسے قلعے میں مورچہ بند ہو جانے کا حکم دے دیا اور فصیلوں پر منجنیقیں نصب کرا دیں کہ عرب حملہ کریں تو ان پر بھاری بھاری پتھر برسائے جا سکیں۔ یہ دیکھ کر ابن عاص رضی اللہ عنہ نے سمجھ لیا کہ دشمن پوری طرح تیار ہو چکا ہے۔ انہوں نے پھر احتیاط کا دامن پکڑ لیا اور فوج کو منجنیقوں کی زد سے پرے ہٹ جانے کا حکم دیا۔ یہاں انہوں نے ڈیرے ڈالے اور جنگ کے منصوبے سوچنے لگے۔

ابن عاص رضی اللہ عنہ شہر کی مشرقی جانب، حلوہ اور قصر فاروس کے درمیان خیمہ زن ہوئے تھے۔ بہت جلد انہوں نے تاڑ لیا کہ شہر پر حملہ کرنا آسان نہیں ہے۔ شہر کے شمال میں سمندر اس کی حفاظت کر رہا تھا۔ اس حصے پر صرف رومی قابض تھے اور عربوں کا یہاں کوئی زور نہ چل سکتا تھا۔ جنوب میں بحیرہ مربوط اس کی نگرانی پر مامور تھا جسے پار کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن تھا اور مغربی سمت کو شعبان کے نالے نے گھیر رکھا تھا۔ اب صرف شہر کا ایک ہی رستہ رہ گیا تھا اور وہ مشرقی رستہ تھا جو کریون اور اسکندریہ کے درمیان چلتا تھا۔ دوسری سمتوں کی طرح یہ سمت بھی فصیلوں اور قلعوں سے مستحکم تھی، سمندر کے رستے اسکندریہ کو ہر قسم کی مدد مل سکتی تھی اس لیے کہ مصر کے

ساحلی شہر رومیوں کے قبضے میں تھے اور وہاں سے جہازوں کے ذریعے، شہری باشندوں اور فوجی سپاہیوں کے لیے تمام ضرورت کی چیزیں بھیجی جاسکتی تھیں۔ اسکندریہ کے محافظ، جن کی تعداد پچاس ہزار تھی، اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر انہیں یہاں شکست ہوگئی تو مصر میں رومی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ پھر قیصر کا یہ پیغام بھی ان تک پہنچ گیا تھا کہ: ''اگر عرب اسکندریہ میں فتح یاب ہو گئے تو رومی ہلاک ہو جائیں گے اور ملک ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ رومیوں کے پاس اسکندریہ سے بڑے کلیسا اور کہیں نہیں ہیں۔'' اس پیغام نے ان کی غیرت و شجاعت میں اضافہ کر دیا تھا اور اسکندریہ کے دفاع میں جانیں لڑانے کو تیار ہو گئے تھے۔ ایسی صورت میں جب تک محافظین فصیلوں اور برجیوں میں قلعہ بند ہیں اور کھلے میدان میں نکل کر عربوں سے جنگ نہیں کرتے، شہر پر حملہ کرنے اور رومیوں کو شکست دینے کی کوئی اُمید نہیں۔ کیا رومی میدان میں نکلیں گے؟ اور اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ذہین سپہ سالار کون سی تدبیر اختیار کرے گا؟ کیا صرف اسکندریہ پورے مصر کو مسلمانوں سے بچا لے گا؟

ان دشواریوں کے باوجود ابن عاص رضی اللہ عنہ دشمن پر غلبہ حاصل کرنے سے مایوس نہیں ہوئے۔ ابتداءً ان کی رائے یہ تھی کہ منجنیقوں کی زد سے ہٹے رہیں۔ جب محاصرہ طویل ہو جائے گا رومی اسے اپنی ذلت سمجھ کر باہر نکل آئیں گے اور مسلمان ان سے اچھی طرح نبٹ لیں گے۔ چنانچہ وہ پورے دو مہینے تک حلوہ اور قصر فاروس کے درمیان خیمہ زن رہے اور اس دوران میں رومیوں نے ان۔ سے مقابلے کی کوشش نہ کی۔ اس کے بعد ابن عاص رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کو مقس میں منتقل کر دیا۔ یہاں رومی بحیرے کی طرف سے قلعے کی آڑ لے کر باہر نکلے اور کلیسائے ذہب کے قریب بارہ مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ پھر جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمان ان سے لڑنے کے لیے جمع ہو رہے ہیں تو اپنے قلعوں میں بھاگ گئے۔ اس واقعہ نے بھی ابن عاص رضی اللہ عنہ کے ارادے میں کوئی تزلزل پیدا نہیں کیا اور وہ شہر کے سامنے ڈٹے رہے البتہ پہلے سے زیادہ محتاط ضرور ہو گئے۔ اس طرح رومی قلعہ بند رہے کبھی کبھی باہر نکل آتے۔ مسلمانوں نے اپنا محاصرہ جاری رکھا۔ ان کی غذائی ضروریات آس پاس کے شہروں سے پوری ہو جاتی تھیں۔ اس دوران میں ابن عاص رضی اللہ عنہ نے قلعوں پر حملہ کرنے کا خیال تک نہ کیا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس طرح کامیابی ناممکن ہے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد انہوں نے سوچا کہ اگر وہ اسی طرح رومیوں کے باہر نکل کر لڑنے کے انتظار میں پڑے رہے اور اسلامی فوج جنگ میں مصروف نہ ہوئی تو یہ ان کے لیے نقصان دہ بات ہوگی۔ اس

Marfat.com

سے مجاہدین کے ارادے کمزور پڑ جائیں گے اور بیزاری ان کے دلوں میں راہ پا جائے گی۔ وہ یہ سمجھنے لگیں گے کہ ان میں دشمن سے لڑنے کی تاب نہیں ہے اور یہ گمان ان کی خود اعتمادی کو مجروح اور مستقبل پر ان کے اطمینان کو مضمحل کر دے گا۔ بالآخران کی قوت فکر نے انہیں ایک ایسی راہ دکھائی جس سے بیک وقت یہ دونوں مقصد پورے ہو سکتے تھے۔ یعنی ان کی فوج اکتانے بھی نہ پائے اور محافظین اسکندریہ کے حوصلے بھی پست ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے ڈیلٹا کے شہروں کی طرف فوجی دستے روانہ کیے جنہوں نے وہاں سے رومیوں کو بھگانا شروع کر دیا اور خود فوج کی اکثریت کے ساتھ اسکندریہ کا محاصرہ کیے بیٹھے رہے۔

ابن عاص رضی اللہ عنہ یہ دستے لے کر خود گئے تھے یا ان کی قیادت دوسرے سالاروں کے سپرد کی تھی؟ اس باب میں روایات مختلف ہیں۔ کچھ روایتیں کہتی ہیں کہ ان میں سے بعض دستے ڈیلٹا کے شہروں پر مامور تھے اور بعض دستے صعید مصر میں چھاپے مار رہے تھے اور اس پروگرام پر ابن عاص رضی اللہ عنہ نے اسی وقت سے عمل کرنا شروع کر دیا تھا جب وہ قلعہ بابلیون کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، اسکندریہ کی طرف نہیں بڑھے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ محاصرہ بابلیون کے زمانے میں انہوں نے مختلف دستے روانہ کیے تھے، جن میں سے کچھ دستے اثریب اور منوف پر قابض ہو گئے تھے اور کچھ دستوں نے فیوم کا پورا صوبہ فتح کر لیا تھا۔ کیا جب ابن عاص رضی اللہ عنہ لشکر کے ایک بڑے حصے کو لے کر کریون اور اسکندریہ جاتے وقت ابن عاص رضی اللہ عنہ نے تمام فوجیں جمع کر لی تھیں اور صرف وہی دستے رہ گئے تھے جنہیں بابلیون اور دوسرے مفتوحہ علاقوں میں نظم و نسق برقرار رکھنے اور ہر امکانی بغاوت کو کچلنے کے لیے وہاں چھوڑا گیا تھا۔ حنا نقیوسی کی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے بٹلر نے بیان کیا ہے کہ اسکندریہ کے استحکام کو دیکھتے ہوئے ان دستوں کی قیادت ابن عاص رضی اللہ عنہ نے خود کی تھی جو اسکندریہ سے کریون اور اس کے بعد دمنہور گئے تھے۔ یہاں سے انہوں نے مشرق کا رخ کیا اور صوبہ مغربی میں سنی کے مقام تک جا پہنچے، لیکن اس شہر کو چونکہ چاروں طرف سے فصیلوں اور پانی نے گھیر رکھا تھا اس لیے وہ اس پر قبضہ نہ کر سکے اور اسے چھوڑ کر جنوب میں طوخ کی طرف روانہ ہوئے جو سنی سے تیس میل کی مسافت پر واقع تھا۔ لیکن اہل شہر نے ان کے ارادے کو ناکام بنا دیا اور اب انہوں نے دمسیس کا رخ کیا مگر اسے بھی فتح نہ کر سکے۔ دس مہینے کے اس سفر میں ابن عاص رضی اللہ عنہ کو اس کے سوا کوئی کامیابی نہ ہوئی کہ ڈیلٹا کے باشندوں نے ان کی شوکت و سطوت کو محسوس کر لیا اور جو شہر قلعہ بند نہ تھے، ان پر حملے کر کے مسلمانوں نے مال غنیمت لوٹ لیا۔ ان

Marfat.com

کے بعد وہ بابلیون واپس آ گئے۔ بٹلر اپنی کتاب میں ایک اور مقام پر حسب عادت حنا نقیوسی کی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے مزید لکھتا ہے کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ فوجیں لے کر صعید کی طرف روانہ ہوئے اور اسے کم سے کم وسطی مصر کے شہروں کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد وہ بابلیون واپس آ کر ٹھہر گئے اور یہیں مقوقس نے اسکندریہ سے آ کر ان سے صلح کی۔

علامہ بلاذری، یزید بن حبیب کی ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ ''ان سے جیشانی نے کہا میں نے ایک جماعت سے، جو فتح مصر میں شریک ہوئی تھی، یہ سُنا ہے کہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فسطاط فتح کر کے عبداللہ بن حذافہ سہمی کو عین شمس کی طرف بھیجا۔ وہ اس کی زمین پر غالب ہو گئے اور اس کے اہل قریہ سے فسطاط جیسی صلح کر لی اور خارجہ بن حذافہ عدوی کو فیوم، اشمونین، اخمیم، بشرودات اور صعید کے دیہات کی طرف بھیجا اور انہوں نے بھی یہی کیا اور عمیر بن وہب جمحی کو تنیس، دمیاط، تونہ، دمیرہ، شطا، دقہلہ، بنا اور بوصیر کی طرف بھیجا اور انہوں نے بھی یہی کیا اور عقبہ بن عامر جہنی ...... لیکن بعض کہتے ہیں کہ اپنے آزاد کردہ غلام وردان کو، جس کی طرف مصر کا سوق وردان منسوب ہے، مصر زیریں کے تمام دیہات کی طرف بھیجا اور انہوں نے بھی یہی کہا، عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے سارا مصر فتح کر لیا اور اس طرح اس کی زمین خراجی زمین ہو گئی۔'' ہم علامہ بلاذری کی روایت قبول کرتے ہیں اگرچہ اس میں تاریخوں کا تعین نہیں ہے اور اسے قبول کرنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ ابن عبدالحکم وغیرہ، جنہوں نے فتح مصر کی تاریخ لکھی ہے، اس کی تائید کرتے ہیں کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ اسکندریہ کی روانگی سے لے کر فتح تک اس کے محاصرے میں شریک رہے۔ اس روایت کی روشنی میں جب انہوں نے اسکندریہ کا محاصرہ کر رکھا تھا، ان کے فوجی دستے ڈیلٹا اور صعید میں قدم زن تھے اور اگر یہ صحیح بھی مان لیا جائے کہ ان دستوں نے قلعہ بند شہروں کو اسکندریہ پر قبضہ ہونے کے بعد فتح کیا تھا تو بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ رومی ان شہروں میں محصور کیے گئے تھے اور ان کی حکومت صرف انہیں گوشوں میں باقی رہ گئی تھی جہاں یہ دستے نہیں پہنچے تھے۔

اسی طرح اس میں بھی شبہ نہیں کہ اہل مصر نے نہ عربوں کا خیر مقدم کیا تھا، نہ ان کے خلاف بغاوت کی تھی اس لیے کہ انہیں خوف تھا کہ اگر رومی اسکندریہ میں فتح یاب ہو گئے تو پورے مصر میں ان کی حکومت قائم ہو جائے گی پھر وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ اگر عربوں کو فتح ہو گئی تو ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے گا۔ کیا یہ عرب انہیں اپنے ملک میں آزادی کے ساتھ رہنے دیں گے؟ ...... میں نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے تئیں اس جھوٹی اُمید سے بہلا سکتے تھے جب کہ شام میں

Marfat.com

دیکھ چکے تھے کہ اپنے قدم وہاں جمانے کے بعد حکومت کی کنجیاں عربوں نے اپنے ہاتھ میں لے لی تھیں۔ چنانچہ وہ حقیقت کے سامنے جھک گئے۔ نہ کوئی مقابلے پر آیا نہ کسی نے کسی کے خلاف بغاوت کی بلکہ جہاں رومیوں کی حکومت تھی، بظاہر ان کے غلام بنے رہے اور جہاں عربوں کا اقتدار قائم ہوگیا، ان کی محکومیت اختیار کرلی۔ اپنے ملک کی اس جنگ میں وہ الگ تھلگ رہے۔ ان کی آنکھیں عظیم الشان پایہ تخت پر لگی ہوئی تھیں اور وہ اس کے انجام کی خبروں کا بڑے شوق اور بڑی بے صبری کے ساتھ انتظار کررہے تھے۔ ان کا حال یہ کیوں نہ ہوتا جب کہ مہینوں پر مہینے گزر رہے تھے، لیکن قلعہ بند پایہ تخت مطمئن اور پرامن تھا اور اس میں داخل ہونا تو درکنار مسلمانوں کو اس پر حملہ کرنے کی بھی جرأت نہ ہوتی تھی، جس کا سبب یہ تھا کہ رومیوں کے لیے سمندر کی طرف سے، شہر کے دروازے کھلے تھے اور وہ جس طرح کی مدد چاہتے، اسے بھیج سکتے تھے۔ اکثر روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ لڑائی صرف جھڑپوں تک ہی محدود تھی، باقاعدہ جنگ نہیں ہو رہی تھی۔

ابن عبدالحکم کی ایک روایت ہے کہ قلعہ اسکندریہ کے دروازے سے کچھ رومی باہر نکلے، مسلمانوں پر حملہ کرکے قبیلہ مہرہ کا ایک آدمی قتل کردیا اور اس کا سر کاٹ کے لے گئے اس پر مہریوں کو بڑا غصہ آیا اور انہوں نے کہا: ''ہم اپنے آدمی کی لاش کو سر کے بغیر ہرگز دفن نہ کریں گے!''

ابن عاص رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تم ان لوگوں پر غضب ناک ہو رہے ہو، جنہیں تمہارے غم و غصہ کی کوئی پروا نہیں۔ جب وہ نکلیں تو تم بھی ان پر حملہ کرکے کسی کا سر کاٹ لینا۔ اس کے بدلے تمہیں اپنے ساتھی کا سر مل جائے گا۔'' ایک دن جب رومی نکلے تو عربوں نے ان پر حملہ کرکے ایک شخص کا سر کاٹ لیا اور اس کے بدلے اپنے ساتھی کا سر ان سے لے کر اس کی لاش دفن کردی۔ اب ان جھڑپوں کو جنگ تو نہیں کہا جاسکتا۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ اس صورت حال سے بہت جز بز تھے مگر ان سے زیادہ فوج کو ہلاکت میں ڈالنا ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم خیال پہلے ہی ابن عاص رضی اللہ عنہ کے حملہ مصر کو ان کی جرأت بے جا پر محمول کررہے تھے اور شاید ابن عاص رضی اللہ عنہ کو اپنی فوج کے کچھ لوگوں پر بھی یہ اطمینان نہ تھا کہ وہ خوش دلی کے ساتھ حملے کے حکم کی تعمیل کریں گے۔ اگرچہ یہ انہیں یقین تھا کہ فوج کی اکثریت زندگی پر موت کو ترجیح دیتی ہے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج کے مختلف گروہوں پر جو تبصرہ کیا تھا ہم اسے اپنے اس قول کے ثبوت میں پیش کرسکتے ہیں۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے کہا: ''مصر میں تین قبائل ہیں: بنو مہرہ قتل کرنا جانتے ہیں، قتل ہونا نہیں۔ بنو غافق، جو قتل ہونا جانتے ہیں، قتل کرنا نہیں

بنو بلی، جن میں اکثر رسول اللہ ﷺ کے صحابی رضی اللہ عنہم ہیں اور وہ سب بہتر شہ سوار ہیں۔" ہرقل کی موت کے کچھ دن بعد اسکندریہ، رومی امداد سے محروم ہو گیا اہل بزنطیہ اپنے داخلی انتشار اور پایہ تخت کے ہنگاموں میں الجھ گئے، جہاں مرتینا اور اس کے بیٹے کے خلاف بغاوت پھیل رہی تھی اور ان کی توجہ مصر و اسکندریہ کی طرف سے ہٹ گئی۔ اب وہاں کوئی نہ تھا جو اسکندریہ اور مصر کے دفاع پر غور کرتا۔ چنانچہ مسلمان مؤرخین ہرقل کی موت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اللہ نے اس کی موت پر رومیوں کی شوکت و سطوت کا خاتمہ کر دیا۔"

مدد کا سلسلہ رُک جانے سے محافظین شہر بھی کمزور پڑ گئے۔ انہیں اندیشہ ہوا کہ عرب کہیں ان پر حملہ نہ کر دیں یا ساحلی شہروں پر قبضہ کر کے ان کی رسد نہ روک دیں۔ ان خبروں سے ان کے اندیشے اور بڑھ گئے کہ عرب صعید مصر اور زیریں مصر میں پھیلتے جا رہے ہیں اور انہوں نے قلعہ بند شہروں میں حامیان روم کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ اگر اسکندریہ رسد سے محروم ہو گیا اور اس میں قحط پڑا تو کیا ہوگا؟ جس پایہ تخت کا حال یہ ہو، رومی فوجیں اس میں کیسے ٹھہر سکیں گی جب کہ باسفورس کے کنارے رومی پایہ تخت فتنہ و فساد اور بدامنی و انارکی کا مرکز بنا ہوا ہے! یہ سب ایسے اسباب و عوامل ہیں جو ہر لڑنے والی فوج کی معنوی قوت کو ختم کر دیتے ہیں۔ اسکندریہ کی دفاعی فوج کی معنوی روح بھی کمزور پڑ چکی تھی اور وہ چوطرفہ فصیلوں اور مستحکم قلعوں کے باوجود یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ اگر محاصرین نے ان پر حملہ کر دیا تو کون سی طاقت انہیں شکست سے بچائے گی؟ ان کی روح کمزور کیوں نہ پڑتی جب کہ قسطنطین کے شہر میں امراء کی دسیسہ کاریوں اور حالات کے انتشار نے انہیں مصر اور اس کے دفاع سے بے خبر کر رکھا تھا اور اسکندریہ کے مدافعین میں جتنا جتنا اس صورت حال کا احساس بڑھتا جاتا تھا، ان کی معنوی روح جواب دیتی جاتی تھی۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اسکندریہ کا محاصرہ کیے بیٹھے تھے۔ انہیں اپنے غذائی ذخیروں کی طرف سے بھی اطمینان تھا اور ان مجاہدین اسلام کی طرف سے بھی، جو صعید اور ڈیلٹا میں رومیوں سے نبرد آزما تھے۔

ادھر حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ مدینہ میں مصر کی خبروں کے منتظر تھے۔ خصوصاً سقوط اسکندریہ کی خبر کا انہیں شدید انتظار تھا، لیکن یہ خبر کئی مہینے تک نہ پہنچی۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو یہ تاخیر پسند نہ آئی اور آپ اس کے اسباب تلاش فرمانے لگے۔ مصر کی اسلامی فوج وہ ہے جو بڑے بڑے مستحکم شہر اور ناقابل تسخیر قلعے فتح کر چکی ہے۔ پھر انہوں نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی مدد کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ وہ قلعہ بند شہر کی فصیلوں کے سامنے اس طرح

Marfat.com

پڑے ہیں جیسے یہ جگہ انہیں پسند آ گئی ہو اور وہ اسی کو اپنی منزل سمجھ کر آگے بڑھنے سے بے نیاز ہو گئے ہوں؟ رومیوں کے ملک کی بے چینی اور بدامنی امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھی۔ پھر ابن عاص رضی اللہ عنہ اس نادر موقع کو اپنے ہاتھ سے کیوں گنوا رہے ہیں، جب کہ اس سے پہلے ہرقل کی زندگی میں وہ اجنادین کے محاذ پر رومیوں کو شکست دے چکے ہیں، حالانکہ رومی اجنادین کو بیت المقدس کے دفاعی خط کا پہلا قلعہ تصور کرتے تھے اور بیت المقدس کا دفاع ان کے نزدیک اپنے دین اور حضرت مسیح علیہ السلام کی قبر کا دفاع تھا۔ کیا اب یہ وہی رومی فوجیں نہیں ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کو اسکندریہ کے دروازوں پر روک رکھا ہے......... نہیں، مسلمانوں میں کوئی ایسی خرابی ضرور راہ پا گئی ہے، جس نے موت کی تمنا اور شہادت کی تڑپ ان سے چھین لی ہے ہوسکتا ہے کہ مصر کی نعمتوں نے انہیں مادی آسائشوں کے جال میں پھنسا دیا ہو اور امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بات پر شدت سے ایمان رکھتے تھے کہ دنیا کی محبت انسان کی ہمت و جرأت کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ چنانچہ فتح کی خبر میں جتنی تاخیر ہوتی جاتی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ بڑھتا جاتا۔ آخر جب پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تو اپنے رفقاء سے مصر پر گفتگو کرتے ہوئے ایک دن فرمایا: ''کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے جو مصر کی فتح میں اتنی دیر لگ رہی ہے!'' اس کے بعد ابن عاص رضی اللہ عنہ کو یہ خط لکھا:

''امابعد! میں حیران ہوں تم دو سال سے لڑ رہے ہو اور مصر ابھی تک فتح نہیں ہوا۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں تو یہ آتی ہے کہ تم میں وہ پہلی سی لگن نہیں رہی اور تم بھی اپنے دشمن کی طرح دنیا کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ صرف اسی قوم کی مدد کرتا ہے جس میں سچی لگن ہو۔ میں نے چار بہادر تمہاری مدد کو بھیجے تھے اور تم کو مطلع کیا تھا کہ ان میں سے ہر ایک، ہزار مرد کے برابر ہے۔ میں تو ان کے بارے میں یہی جانتا تھا۔ یہ بات اور ہے کہ وہ بھی اسی مایا موہ میں پھنس گئے ہوں، جس میں دوسرے مبتلا ہیں۔ میرا خط پا کر لوگوں میں تقریر کرو اور انہیں ترغیب دو کہ سچی لگن اور پامردی سے لڑیں۔ مذکورہ چار بہادروں کو فوج کے سامنے رکھو اور فوج کو حکم دو کہ تن واحد کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ یہ حملہ جمعہ کے دن زوال آفتاب کے وقت ہو کیونکہ اس وقت خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے اور دعائیں قبول کی جاتی ہیں۔ اس وقت لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑ گڑائیں اور اس سے فتح کے لیے دعا کریں!''

اسکندریہ کا محاصرہ آخر کتنے مہینے تک جاری رہا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس طوالت نے غضب ناک کر دیا اور آپ یہ خط لکھنے پر مجبور ہو گئے؟ ابن عبدالحکم کہتے ہیں: ''محاصرے کی مدت

Marfat.com

چودہ مہینے...... پانچ مہینے ہرقل کی موت سے پہلے اور نو مہینے اس کی موت کے بعد تھی۔" علامہ بلاذری کی روایت ہے کہ "ابن عاص رضی اللہ عنہ اسکندریہ پہنچے اور دیکھا کہ اہل شہر جنگ کے لیے مستعد ہیں۔ انہوں نے مقوقس کو ایک پیغام بھیجا جس میں دھمکی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں اور رومیوں کا جہاں کہیں مقابلہ ہوا ہے مسلمان ان پر غالب آئے ہیں۔ مقوقس نے اپنی قوم کو صلح کا مشورہ دیا، لیکن انہوں نے جنگ کے سوا دوسری بات سے انکار کر دیا۔ معرکے کا رن پڑا۔ مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا جو تین مہینے رہا۔ پھر عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اس کو تلوار سے فتح کر لیا، اس میں جو کچھ تھا لوٹ لیا۔ مگر باشندوں کو باقی رکھا۔ نہ انہیں قتل کیا اور نہ لونڈی غلام بنایا۔ بلکہ الیونہ کے باشندوں کی طرح ذمی بنا لیا۔" بٹلر اپنی کتاب "تواریخ فتح عربی" کے چوتھے ضمیمے میں لکھتا ہے: "مسلمانوں نے اسکندریہ کا محاصرہ اواخر جون ۶۴۱ء میں شروع کیا تھا اور ۸ نومبر ۶۴۱ء کو اہل شہر نے ہتھیار ڈال دیے۔" جس کا مطلب یہ ہے کہ محاصرہ ساڑھے چار مہینے جاری رہا اور بٹلر کا یہ قول، ابن عاص رضی اللہ عنہ کے نام حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے خط کے اس فقرے کی تائید کرتا ہے کہ "تم دو سال سے لڑ رہے ہو۔" چنانچہ ابن عاص رضی اللہ عنہ دسمبر ۶۳۹ء میں عریش پہنچے اور نومبر ۶۴۱ء میں اسکندریہ پر فتح پانے کی مدت دو قمری سالوں کے برابر ہوتی ہے۔

ابن عاص رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین کا رضی اللہ عنہ مکتوب پڑھا اور فتح اسکندریہ کا پروگرام سوچنے لگے۔ ایک روایت میں ہے، مدینہ کا مکتوب ملنے سے پہلے ہی انہوں نے یہ لائحہ عمل بنانا شروع کر دیا تھا۔ ابن عبدالحکم اپنے والد عبداللہ بن عبدالحکم سے روایت کرتے ہیں: جب اسکندریہ کی فتح میں دیر ہوئی تو ایک دن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ پیٹھ کے بل لیٹ گئے۔ اس کے بعد اُٹھ کر بیٹھے اور کہا: "میں نے اس مسئلے میں غور کیا ہے، اس کا انجام بھی وہی سنوارے گا جس نے اس کے آغاز کو سنوارا ہے۔" ان کی مراد انصار رضی اللہ عنہم سے تھی...... چنانچہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو بلا کر انہیں حکم دیا اور اللہ نے ان کے ہاتھوں اسی دن اسکندریہ فتح کرا دیا۔ لیکن جو لوگ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے مکتوب کا ذکر کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے مجمع عام میں خط سنایا، پھر ان حضرات کو طلب کیا جن کا ذکر اس مکتوب میں تھا اور انہیں فوج کے آگے کر دیا۔ اس کے بعد لوگوں کو طہارت کا حکم دیا۔ سب نے دو رکعت نماز پڑھی اور اللہ سے فتح و نصرت کی دُعا مانگی۔ پھر حملہ کیا اور اللہ کے حکم سے فتح یاب ہوئے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے مسلمہ بن مخلد رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا۔ انہوں نے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو حکم دینے کے لیے کہا ابن عاص رضی اللہ عنہ

Marfat.com

نے عبادہ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور تیر دستان ان سے لے کر علم ان کے سپرد کیا۔ عبادہ رضی اللہ عنہ نے جنگ شروع کی اور اللہ نے اسی دن انہیں فتح سے سرفراز فرمایا۔

یہ ساری روایات جو ابن عبدالحکم نے نقل کی ہیں، نتیجتاً بلاذری کی اس روایت کی تائید کرتی ہیں کہ مسلمانوں نے شہر پر حملہ کیا اور اللہ نے انہیں نصرت یاب فرمایا۔ یہ محرم ۲۰ھ کے پہلے جمعہ کی بات ہے۔ آپ نے دیکھا؟ یہ سب روایتیں تفصیل سے بالکل خالی ہیں۔ علامہ بلاذری نے جو تفصیلات بیان کی ہیں ان کی غایت یہ ہے کہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے دیکھا، قبطیوں کو چھوڑ کر باقی اسکندریہ کے سارے باشندے جنگ کے لیے تیار ہیں۔ عمرو رضی اللہ عنہ صلح کو پسند کرتے تھے۔ مقوقس نے صلح اور التوائے جنگ کی درخواست کی۔ عمرو رضی اللہ عنہ نے اس سے انکار کیا۔ مقوقس نے حکم دیا کہ عورتیں شہر پناہ پر، داخل شہر کی طرف منہ کر کے کھڑی ہوں اور مرد مسلح ہو کر خارج شہر کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوں تا کہ مسلمان خوفزدہ ہو جائیں، عمرو رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں یہ کہلا بھیجا: ''تم نے جو کچھ کیا ہم نے دیکھا، لیکن ہم جس پر غالب ہوئے ہیں اپنی کثرت سے غالب نہیں ہوئے ہم تمہارے بادشاہ ''ہرقل'' سے لڑ چکے ہیں اور اس کا جو حشر ہونا تھا، ہو چکا ہے۔'' مقوقس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''یہ بالکل سچ ہے، یہ قوم ہمارے بادشاہ کو اس کے دارالمملکت سے نکال کر قسطنطنیہ پہنچا چکی ہے اس لیے ہمارے حق میں اطاعت ہی بہتر ہے۔'' اس پر لوگوں نے اسے سخت سست کہا اور جنگ کے سوا دوسری بات سے انکار کر دیا۔ انہوں نے مسلمانوں سے جنگ کی۔ قیامت کا رن پڑا۔ مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا جو تین مہینے رہا۔ پھر عمرو رضی اللہ عنہ نے اسے بزور شمشیر فتح کر لیا۔ یہ ایک نادر تفصیل ہے جو محاصرہ اسکندریہ کے ابتدائی واقعات تو پیش کرتی ہے کہ مقوقس نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کو کس طرح داؤ میں لانا چاہا اور ان دونوں کے درمیان کیا کیا پیغام سلام ہوتے رہے، لیکن اس فیصلہ کن لڑائی پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی، جو بالآخر اسکندریہ کے بزور شمشیر فتح کیے جانے کا سبب بنی اور نہ اس جنگ آزمائی کی کوئی تصویر دکھاتی ہے جس کا نقش شہر کی مضبوط فصیلوں اور مسلح قلعوں پر حملہ کرتے اور ان میں فاتحانہ شان سے داخل ہوتے وقت غازیان اسلام نے صفحہ روزگار پر چھوڑا تھا۔

اس غفلت اور بے پروائی پر ہم زیادہ سے زیادہ افسوس کا اظہار کر سکتے ہیں جس طرح اس سے پہلے فتح کریون کے سلسلے میں کر چکے ہیں، اس لیے کہ اسکندریہ کے بہادر فاتحوں کا حملہ اور

Marfat.com

ان کی تیغ آزمائیاں، انہوں نے دشمن کا مقابلہ کیسے کیا، وہ اسباب کیا تھا جو مسلمانوں کی فتح اور رومیوں کی شکست پر منتج ہوئے اور اسکندریہ والوں نے فاتحین کا استقبال کس طرح کیا، یہ تمام وہ امور ہیں جنہیں اس سلسلے میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور نہ صرف یہ کہ ان کے بیان میں بڑی افسانوی کشش ہوتی بلکہ وہ ہمارے سامنے انسانیت کے ان میلانات ورجحانات کی تصویر بھی کھینچتا جو اس زمانے کے جماعتی وجود کی جان تھے اور جن کی بنا پر اگر ہم ایک طرف ان عوامل سے آشنا ہو سکتے تھے جو اس کے بعد فاتحین ومفتوحین کے انقلاب احوال پر یکساں اثر انداز ہوئے تو دوسری طرف اس عہد کے انسانی معاشروں کی ایک تصویر بھی ہماری نگاہوں کے سامنے آسکتی تھی، جس سے ہم خاص اس عہد کے انسانی ضمیر کا رجحان معلوم کر لیتے اور اس رجحان سے واقف ہونے کے بعد ہمارے لیے ممکن تھا کہ ہم .... مہندسین اور طبیعین کی اصطلاح میں ...... انسانیت کے اس سفر ارتقاء کی ایک بیانیہ تصویر پیش کرتے جو وہ کمال کی جستجو میں تسلسل وتواتر کے ساتھ طے کر رہی ہے۔ مؤرخین نے بعض بہادروں کے جوان مردی کے کارنامے بیان کیے ہیں وہ ہمارے افسوس میں کوئی کمی پیدا نہیں کرتے۔ اس لیے کہ یہ کارنامے .... اگر ان کی روایت صحیح ہے.......... اس عہد کے انسانی فکر کا کوئی عمومی رجحان پیش نہیں کرتے جس میں وہ ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان سے اس عہد کے بہادروں کے انفرادی کردار کا کوئی نہ کوئی گوشہ نگاہوں کے سامنے ضرور آجاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسکندریہ کے محاذ پر ایک دن رومیوں نے مسلمانوں سے شدید جنگ کی۔ جب معرکہ کارزار گرم ہوا۔ ایک رومی نے مسلمہ بن مخلد رضی اللہ عنہ کو مبارزت کے لیے پکارا اور مقابلے کے وقت انہیں زیر کر کے گھوڑے سے نیچے پھینک دیا۔ وہ انہیں قتل کرنا چاہتا ہی تھا کہ مسلمہ رضی اللہ عنہ کا ایک ساتھی ان کی مدد کو پہنچ گیا اور انہیں بچا لیا۔ مسلمہ بن مخلد بہادری کے لیے مشہور تھے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ دیکھا تو مسلمہ رضی اللہ عنہ پر ناراض ہوئے۔

اس کے بعد لڑائی نے اور زور پکڑا اور مسلمان اسکندریہ کے قلعے میں گھس گئے، جن میں ابن عاص اور مسلمہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ رومیوں نے ایک بار پھر ہمت کی اور جوابی حملہ کر کے مسلمانوں کو قلعے سے نکال دیا۔ اتفاق سے چار مسلمان باہر نہ آسکے رومیوں نے قلعے کا دروازہ بند کر دیا اور یہ چاروں مسلمان، جن میں عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور مسلمہ بن مخلد رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے محصور ہو گئے۔ رومی ان دونوں سے ناواقف تھے۔ انہوں نے عربی زبان میں ابن عاص رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں

Marfat.com

سے کہا: ''اب تم ہمارے قیدی ہو چکے ہو اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو اور مفت میں اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو!'' لیکن ان لوگوں نے یہ مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ایک رومی بولا: ''تمہارے ساتھیوں نے ہمارے کچھ آدمی قید کر لیے ہیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اپنے آدمیوں سے تمہارا تبادلہ کر لیں گے اور تمہیں قتل نہ کریں گے۔'' یہ لوگ اس پر بھی راضی نہ ہوئے۔ آخر اس رومی نے جز بز ہو کر کہا: ''پھر کوئی فیصلے کی صورت ہے بھی یا نہیں؟ اچھا! ایسا کرو، ہم اپنا ایک آدمی تمہارے ایک آدمی کے مقابلے میں چھوڑتے ہیں۔ اگر ہمارا آدمی تمہارے آدمی پر غالب آ جائے تو تم اپنے تئیں ہمارے حوالے کر دینا اور اگر تمہارا آدمی ہمارے آدمی کو شکست دے دے تو ہم تمہیں آزاد کر دیں گے!'' چاروں مسلمان اس شرط پر رضا مند ہو گئے۔ رومیوں نے ایک ایسے شخص کو میدان میں اُتارا جس کی قوت و شجاعت پر انہیں بھروسا تھا۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے اس کے مقابلے پر خود نکلنا چاہا۔ لیکن مسلمہ نے روک دیا کہ اگر انہیں کوئی گزند پہنچ گئی تو سارے لشکر کی ہمت ٹوٹ جائے گی اور اپنے لیے ان سے اجازت طلب کی۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تمہاری مرضی! بہت ممکن ہے اللہ تمہیں تلافی کا موقع عطا فرما دے!''

مسلمہ رضی اللہ عنہ مقابلے کے لیے نکلے اور تھوڑی دیر کی زور آزمائی کے بعد حریف کو قتل کر دیا۔ رومیوں کو مجبوراً قلعے کا دروازہ کھولنا پڑا اور یہ چاروں اپنی لشکر گاہ میں آ گئے۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے مسلمہ رضی اللہ عنہ پر جو تعریض کی تھی اس پر بڑی شرمندگی محسوس کی اور مسلمہ سے معافی چاہی۔ مسلمہ رضی اللہ عنہ نے ان کی معذرت قبول کر لی اور ابن عاص رضی اللہ عنہ نے کہا: ''واللہ! میں نے صرف تین مرتبہ فاش غلطیاں کی ہیں۔ دو مرتبہ ایام جاہلیت میں اور ایک مرتبہ آج! لیکن ان میں سے کسی غلطی پر مجھے اتنی شرم نہیں آئی جتنی شرم تم پر طنز کر کے میں نے آج محسوس کی ہے۔ بخدا! مجھے اُمید ہے کہ اب زندگی بھر مجھ سے چوتھی غلطی سرزد نہ ہو گی!'' یہ روایت، خرافات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ تاہم اس سے ایک طرف مسلمہ رضی اللہ عنہ اور دوسری طرف ابن عاص رضی اللہ عنہ کے کردار پر روشنی پڑتی ہے اور یہ دونوں کردار اپنی اپنی جگہ قابل تقلید ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ اس روایت کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ اس اجتماعی زندگی کا کوئی مجموعی رجحان پیش نہیں کرتی جس کا اس فیصلہ کن معرکے پر خاص اثر تھا جو مصر میں رومیوں کے وجود کو ختم کر گیا۔ عجب ہے کہ ہم تک پہنچنے والی روایات اتنی مختصر ہیں کہ ان سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ مسلمان کون سے دروازے سے شہر میں داخل ہوئے تھے، کس طرح داخل ہوئے تھے اور رومیوں نے ان کی مدافعت کے لیے کیا کچھ کیا تھا؟ تاہم اس

Marfat.com

میں کوئی شک نہیں کہ یہ فیصلہ کن معرکہ اس عہد کی ہولناک ترین لڑائیوں میں سے تھا۔ چنانچہ قادسیہ کی سہ روزہ جنگ اور مدائن ونہاوند کی خوفناک رزم آرائیاں بھی اس کے مقابلے میں کم تر تھیں۔ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ مسلمان مؤرخین رومیوں کی اس تاریخی شکست کو ایک سرسری سے فقرے میں اس طرح بیان کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ "جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے رومیوں کو شکست دے دی اور اسکندریہ فتح ہو گیا تو رومی خشکی اور تری دونوں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔"

اس اختصار کا سبب چاہے کچھ ہو، تمام مسلمان مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ اسکندریہ بزور بازو فتح کیا گیا تھا اور فتح کے بعد رومی، غازیان اسلام کی تلواروں سے بچ کر، پناہ کی تلاش میں، جدھر منہ اُٹھا بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن بٹلر نے فتح اسکندریہ کی جو تصویر کھینچی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ گویا رومیوں نے شکست کھا کر عربوں کی اطاعت قبول نہیں کی تھی، ازراہ مصالحت ہتھیار ڈالے تھے، چنانچہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، وہ کہتا ہے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ان دستوں کی قیادت خود کی جو بلاد دلتا میں خوف وہراس پھیلانے کے لیے اسکندریہ سے روانہ ہوئے تھے اور مختلف علاقوں میں غارت گری کرتے ہوئے نیل کی طغیانی کے وقت بابلیون پہنچ کر رُک گئے۔ وہ قلعہ بابلیون ہی میں تھے کہ قیرس تسلیم واطاعت کا پروانہ لے کر اسکندریہ سے ان کے پاس آیا اور عرب امیر سے بولا: "اللہ نے تمہیں یہ زمین عطا کر دی ہے آج کے بعد سے رومیوں کے خلاف تلوار نہ اُٹھانا۔" اور بات چیت کے بعد معاہدہ صلح قرار پایا۔

قیرس صلح کا یہ معاہدہ لے کر اسکندریہ واپس ہو گیا۔ وہاں کے باشندے اس کی اس حرکت سے بالکل بے خبر تھے۔ سرداران فوج سے اس صلح کے منوانے اور اپنے احکام کی تعمیل کرانے میں اسے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ ہوتے ہوتے یہ بات عوام تک بھی پہنچ گئی اور وہ بھڑک اُٹھے۔ ان کی آتش غضب اس وقت اور بھی تیز ہو گئی جب اچانک انہوں نے دیکھا کہ عربوں کی ایک جماعت ان کے شہر میں داخل ہوئی ہے اور بڑی بے پروائی سے اپنے گھوڑوں پر بیٹھی چلی جا رہی ہے۔ لوگ ان کے گرد جمع ہو کر شور وغل مچا رہے ہیں، لیکن ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ یہ دیکھ کر انہیں بڑا غصہ آیا۔ انہوں نے قیرس کو اس کے محل میں گھیر لیا اور اس کے قتل کے درپے ہو گئے۔ موت، بوڑھے بطریق کے سامنے کھڑی تھی، لیکن وہ ذرا ہراساں نہ ہوا، اور اس نے اپنی خوش گفتاری، قوت استدلال اور بڑھاپے کے جلال کا سہارا لے کر نہ صرف مجمع کا جوش ٹھنڈا کر دیا بلکہ

Marfat.com

اپنی رائے کی سچائی بھی واضح کر دی۔ اس کی مدلل تقریر سے بپھرے ہوئے عوام اس درجہ متاثر ہوئے کہ اس پاکباز عالم دین کے خلاف اپنے غیظ وغضب کے اظہار پر آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ انہیں اپنی اس حماقت پر شرم آنے لگی کہ نیک دل قیرس نے تو انہیں غازیان اسلام کی تلواروں سے بچانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی اور وہ اسے قتل کرنے کے لیے اس پر جھپٹ رہے ہیں۔ بالآخر اہل اسکندریہ نے جزیے کی عائد کردہ رقم جمع کی اور اس پر سونے کی ایک بڑی مقدار کا اضافہ کر کے اس تمام دولت کو ایک کشتی میں لاد دیا۔ یہ کشتی جنوبی دروازے سے نکلی جس سے نہر اسکندریہ میں داخل ہوئی تھی اور قیرس اپنی نگرانی میں یہ سارا مال لے کر مسلمانوں کے قائد کی طرف روانہ ہو گیا اور اس طرح اسکندریہ کی فتح اتمام کو پہنچی۔''①

یہ ہے بٹلر کی روایت جو فتح اسکندریہ کے سلسلے میں مسلمان مؤرخوں کے بیان سے بالکل مختلف ہے۔ اس روایت میں بٹلر نے کچھ عہد نامے بھی درج کیے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ عہد نامے مقوقس نے خاص اسکندریہ کے متعلق حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے کیے تھے۔ اگر اس روایت کو برقرار رکھ کر اس کا موازنہ مسلمان مؤرخین کی روایت سے کیا جائے تو قاری کے ذہن میں ایک طرح کی الجھن پیدا ہونا ایک فطری بات ہے۔ اس فاضل مؤرخ نے اپنے مباحث میں جس بے تعصبی اور عالمانہ دقت نظر سے کام لیا ہے وہ اس کے تحقیق کردہ واقعات کے سلسلے میں ہمیں اس کی رائے کے احترام پر مجبور کرتا ہے، اگرچہ استنباط نتائج اور طریق توجیہ کے متعلق اختلاف کی گنجائش پھر بھی باقی رہتی ہے لیکن اسی بے تعصبی کا تقاضا تھا کہ جب اس فاضل محقق پر اس کی رائے کی غلطی واضح ہو جاتی، تو وہ اپنا زاویہ نظر بدل دیتا اور تسلیم کر لیتا کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ اور مقوقس کے درمیان صرف ایک ہی معاہدہ ہوا تھا جس کی شرطیں قلعہ بابلیون کے محاصرے کے وقت وضع کی گئی تھیں۔ اس کے بعد ہرقل نے اس معاہدے کو مسترد اور اس کی پاداش میں قیرس کو ملک بدر کر دیا۔ بٹلر کی روایت کو تنقید کی کسوٹی پر کس لینے کے بعد ہمارے لیے ممکن ہو گیا ہے کہ ہم مسلمان مؤرخین کی روایت سے اس کے ایجاز واختصار کے باوجود، پوری طرح مطمئن ہو جائیں اور تسلیم کر لیں کہ اسکندریہ تلوار کے زور سے فتح ہوا، اور اس کے بعد مقوقس اور عرب سپہ سالار کے درمیان صرف وہ طریق کار مرتب کیا گیا جس کے تحت مصر کے پایہ تخت بلکہ تمام مصر سے رومی فوجوں کا انخلاء عمل میں آنا تھا۔②

① بٹلر، عربی ترجمہ صفحہ ۲۸۸۔ ② بٹلر کے عربی ترجمے کا ساتواں ضمیمہ ص ۴۹۸۔

Marfat.com

مسلمان اسکندریہ میں بزور شمشیر داخل ہوئے۔ انہوں نے اس شہر کی فصیلوں پر حملہ کر کے اس کے دروازے کھول دیئے اور رومی صحرا اور سمندر کی طرف بھاگ گئے۔ پایہ تخت کے رہنے والوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی اور شہر کی کنجیاں ان کے حوالے کر دیں۔ اسکندریہ کی دو شاہراہیں، جو مغرب سے مشرق اور شمال سے جنوب کی طرف جاتی ہیں، اپنے اندر ایک ایسی انفرادیت رکھتی ہیں جس کی نظیر شام یا عراق میں کہیں نہیں ملتی۔ ان شاہراہوں کے طول میں سفید مرمریں ستونوں کی قطاریں ہیں جن کی چمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔ یہ شاہراہیں ایک وسیع میدان میں ایک دوسرے کو قطع کرتی ہیں، جسے گھنے باغوں نے جنت کا ایک ٹکڑا بنا دیا ہے۔ اس کے چاروں طرف عالیشان محل ہیں جنہیں انگور کی بیلوں اور پھلوں اور پھولوں سے لدے پھندے سرسبز باغوں نے گھیر رکھا ہے۔ ان میں سے ایک شاہراہ سمندر کی طرف جا کر بندرگاہ کے چہرے سے نقاب الٹتی ہے اور اس کے گرد و پیش کی وہ تمام چیزیں نگاہوں کے سامنے فروزاں ہو جاتی ہیں جنہیں دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ ان میں سے جس چیز پر بھی نظر پڑ جاتی ہے۔ پھر اس سے ہٹنے کا نام نہیں لیتی۔ یہ بطالسہ کے محل ہیں جن کے بچے کھچے نادر و حسین آثار، علم و فن کی اس عظمت کی داستان دہرا رہے ہیں جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی عظمت نہیں کر سکتی تھی۔ یہ بڑا مقبرہ ہے جس میں سکندر کی لاش ہے اور اس پر ایک طلائی چادر پڑی ہے۔ یہ عجائب گھر ہے جس کے جوار میں وہ عدیم المثال کتبخانے ہیں جو تمام دنیا میں علم کا تنہا مرکز شمار کیے جاتے تھے اور یہ بڑا ایوان ہے جس کے گرد ستونوں کی چار قطاریں ہیں۔ شہر والے اسے تترا پیلوس کے نام سے پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سکندر اعظم نے اس میں ارمیا پیغمبر کو دفن کیا تھا۔ چنانچہ وہ اس کا بہت احترام کرتے ہیں۔ اس زیارت گاہ کے پہلو میں کلیسائے اعظم...... قدیس مرقص کا کلیسا ہے۔ جس کی عمارت دیکھنے دکھانے کے قابل ہے۔ اس کے قریب اور بہت سے کلیسا ہیں جو اس کی عظمت کے آگے سرنگوں ہونے کے باوجود فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل مصر نے اپنے ان دیوتاؤں کا قرب حاصل کرنے کے لیے، جن کی وہ پوجا کرتے تھے، ان عبادت گاہوں کی تعمیر میں دل کھول کے روپیہ خرچ کیا تھا۔

قدیس مرقس کے کلیسا میں، محراب کے سامنے، اس پیغمبر کی لاش ایک مرمریں تابوت میں رکھی تھی اور یہ کلیسا اپنے اسی امتیاز اور شان دار عمارت کی بنا پر تمام لوگوں میں عزت و احترام کی نظر

Marfat.com

سے دیکھا جاتا تھا۔ البتہ کلیسائے قیصریون، جو اسی علاقے میں بندرگاہ اعظم کے کوہستانی رستے کے قریب واقع تھا، اس سے بھی زیادہ شاندار تھا اور اس نے تقریباً اس کی جگہ لے لی تھی کلیسائے قیصریون ابتداء کلیسا کی حیثیت سے تعمیر نہیں ہوا تھا بلکہ یہ بت پرستوں کا مندر تھا جو قلوپطرہ نے سمندر کو جھانکنے والے ایک بلند ٹیلے پر بنوایا تھا تاکہ یہاں آنے والا جب اسکندریہ کی طرف دیکھے تو شہر کی ساری عظمت و رونق اور تمام حسن و جمال اس کی نگاہوں کے سامنے آجائے۔ یہ عالیشان معبد، عظیم الشان بطالسہ کی نور نظر اور شہرہ آفاق ملکہ قلوپطرہ نے جولیس سیزر کے احترام میں بنوایا تھا، اس لیے اس کا نام قیصریون رکھا گیا۔ اس کے بعد جب قلوپطرہ نے خودکشی کر لی اور مصر کی حکومت رومیوں کے ہاتھ میں آئی تو قیصر آگسٹس نے اس کی تعمیر مکمل کرائی اور اس میں بعض ترمیمیں کر کے اسے عظمت کی ایک ایسی تصویر بنا دیا کہ ویلو، اس کی تعریف میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ''قیصر کا معبد ایک ایسی یادگار تھا جس کی کہیں مثال نہ تھی۔ یہ ایک وسیع بندرگاہ پر واقع تھا۔ جس کی عمارت نہایت شاندار اور طرز تعمیر حد درجہ دل فریب تھا۔ اس کی چھتیں اتنی اونچی تھیں کہ لوگ اسے بھی ایک بحری پرچم شمار کرتے تھے۔ اس کو بہترین تصویروں اور مجسموں سے سجایا گیا تھا اور یہاں بڑی بڑی قربانیاں اور تحفے پیش کیے جاتے تھے۔ سارا معبد سونے چاندی کے سامان سے آراستہ تھا، جو ترتیب کے حسن اور اجزائے ترکیب...... عجائب گھروں اور کتب خانوں، گنبدوں اور میدانوں، دالانوں اور سرسبز و شاداب باغیچوں کی ندرت آفرینیوں کا ایک دل پذیر نمونہ تھا۔ یہاں ہر چیز موزوں مقام پر بنائی گئی تھی اور اس فنکار کے ہاتھوں نے ایسے ایسے کمالات صرف کیے تھے کہ وہ رونق و تازگی کا ایک جیتا جاگتا مرقع معلوم ہوتا تھا۔ بنوانے والے نے اس کی تعمیر میں روپیہ پانی کی طرح بہایا تھا اور اپنی بڑی سے بڑی اور قیمتی سے قیمتی چیز بھی اسی میں لگا دی تھی۔ یہ کلیسا، علمائے مسیحیت کے لیے ایک خاص منفعت رکھتا تھا اور جب کبھی آتے جاتے ان کی نظر اس پر پڑتی تھی، آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ ①

کلیسائے قیصریون کے وسط میں دو مینار تھے جنہوں نے عربوں کو مبہوت کر دیا۔ یہ سنگ سرخ کے چوکر بنے ہوئے تھے اور دو کرسیوں پر قائم تھے۔ ایک کرسی کو چار بھنوروں کی شکل میں جن پر قدیم نقوش کندہ تھے، تانبے کی ایک چادر سے منڈھ دیا گیا تھا اور یہ بھنورے مینار کو کرس

① بٹلر کا عربی ترجمہ: صفحہ ۳۲۳۔

سے جدا کرتے تھے۔ یہ کرسی پتھر کا ایک ٹکڑا تراش کر بنائی گئی تھی جس کے نیچے تین درجے تھے اور ہر درجے کو سنگین سیڑھیاں دوسرے درجے سے ملاتی تھیں۔ دوسری کرسی کو شفاف پتھر کے چار مجسمے مینار سے الگ کرتے تھے۔ ان دونوں میناروں کے بالائی سروں پر تانبے یا کانسی کی چادریں منڈھی ہوئی تھیں اور ان پر اسی دھات کے مجسمے بنے ہوئے تھے۔ ایک مجسمہ غالباً ''جیت دیوتا'' کا تھا اور دوسرا کسی ''جل دیوتا'' کا ان میناروں کی کرسیاں اور مورتیاں اپنی تراش وتعمیر کی نزاکت کے اعتبار سے اتنی حسین اور اتنی دل فریب تھیں کہ جب کوئی جہاز بندرگاہ میں داخل یا وہاں سے روانہ ہوتا تو ان کا نظارہ دیکھنے والوں کو حسن ورونق کی جنت میں پہنچا دیتا۔ محلوں اور عبادت گاہوں، کلیساؤں اور مجسموں، ستونوں اور سمندر کو جھانکتے ہوئے میناروں کا یہ حسین جھرمٹ، شہر کی دو بڑی شاہراہوں کے خاتمے پر واقع تھا۔ عرب اس مقام پر پہنچتے تو ایک ایک چیز ان پر حیرت کا طلسم طاری کر دیتی اور نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی اسی حیرت نے سمندر کی راہ بھاگنے والے رومیوں کو اتنی فرصت بہم پہنچا دی کہ وہ اپنے جہاز ساحل سے بآسانی نکال لے گئے۔

شہر کے دوسرے حصے میں، اسکندریہ کے جنوبی دروازے کے قریب، دقلایوس کا ستون تھا جسے بعد کو عربوں نے ''عمود السواری'' کے نام سے موسوم کیا۔ یہ ستون آج بھی موجود ہے اور زبانِ بے زبانی سے سراپیوم کی اس عبادت گاہ کے جمال وجلال اور عظمت وشوکت کی داستان سنا رہا ہے، جو اس ستون کے گرد قائم تھی۔ کرنک کے کھنڈروں کے سوا اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس معبد کی تصویر ہمارے سامنے پیش کر سکے، لیکن پھر بھی اتنا فرق رہ جاتا ہے کہ کرنک میں تمام تر مصری فن تعمیر کی عظمت وجلالت تھی اور سراپیوم کے معبد میں مصری اور یونانی طرز تعمیر شامل تھے۔ چنانچہ اگر ایک طرف اس میں مصری فن تعمیر کا جلال تھا تو دوسری طرف یونانی فن تعمیر کی نزاکت وآرائش۔ یہ معبد سب سے پہلے بطالسہ کے عہد میں سیراپیس دیوتا کی پرستش کے لیے تعمیر کیا گیا تھا، کہتے ہیں کہ جس بطلیموس نے اس کی تعمیر کرائی تھی وہ جزیرہ یونان سے ایک دیوتا کا مجسمہ لے کر آیا تھا اور اس کا نام دو ناموں اوزوریس اور اپیس کے اشتقاق سے مرتب کیا تھا تاکہ اسکندریہ کے باشندے، جن میں مصری الاصل بھی تھے اور وہ یونانی بھی جو ترک وطن کر کے مستقلاً یہاں مقیم ہو گئے تھے، ایک ساتھ اس کی پوجا کر سکیں۔ بطلیموس نے اس دیوتا کا مندر ایک ٹیلے پر بنوایا تھا، جس کے متعلق ایک گروہ کہتا ہے کہ وہ ایتھنز کے اکروپولیس کے ٹیلے کی طرح قدرتی تھا، لیکن دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ وہ انسانوں کا بنایا ہوا تھا۔ حقیقت چاہے کچھ ہو یہ عمارت ایک بلند

Marfat.com

مقام پر، جو قدرتی چٹان کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا، قائم تھی اور بلندی کی وجہ سے سارے شہر کا منظر وہاں سے دکھائی دیتا تھا۔ اس معبد تک پہنچنے کے دو رستے تھے، ایک زینے کا رستہ جس میں سو سیڑھیاں تھیں اور دوسری چڑھائی کا رستہ جس پر گاڑیاں چلتی تھیں!

مؤرخین کی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سراپیوم کی عمارت مستطیل تھی۔ پانچ سو ہاتھ لمبی اور ڈھائی سو ہاتھ چوڑی۔ سیراپیس کا مندر اس کے وسط میں واقع تھا، جس کے اندر اور باہر قیمتی سنگ مرمر لگا ہوا تھا اور اس کے بنانے میں مصری فن تعمیر کی تمام دل فریبیاں صرف کردی گئی تھیں۔ اس مندر کے بیچوں بیچ سیراپیس کا عظیم چوبی مجسمہ نصب تھا جسے سونے اور ہاتھی دانت نے ڈھانک رکھا تھا۔ اس کے بازو پھیلے ہوئے تھے اور پاس کی دیواروں کو چھوتے چھوتے رہ گئے تھے۔ اس مندر کو ایسے عدیم المثال نقوش سے آراستہ کیا گیا تھا کہ ان کی قیمت کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مندر کے گرد ستونوں کی ایک قطار تھی، ان ستونوں کے متوازی جنہوں نے چار برابر کی قطاروں کی صورت میں پورے صحن کو گھیر رکھا تھا۔ عیسائیوں نے عربوں کے مصر میں داخل ہونے سے پہلے بت پرستوں کے اس مندر کو ڈھا دیا تھا۔ مندر کی دل کشی ان کے ہاتھ نہ روک سکی۔ انہیں مجبور نہ کر سکی کہ وہ صرف مورتی کو وہاں سے اکھاڑ پھینکیں اور مندر کی حسین و جمیل عمارت کو اپنی جگہ باقی رہنے دیں۔ سراپیوم کی عمارت، جو سیراپیس کے مندر کے اردگرد بنی ہوئی تھی، عظمت و جلال میں اس سے کسی طرح کم نہ تھی۔ امیانوس اس کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے: ''الفاظ اس کی حقیقی تصویر کھینچنے سے عاجز ہیں۔ اس کے دالانوں میں ستون ہی ستون تھے اور اس کی مورتیاں ایسی معلوم ہوتی تھیں، جیسے جیتے جاگتے دیوتا کھڑے ہوں۔ ان کے علاوہ صناعی کے دوسرے کارنامے بھی اتنے نظر فریب تھے کہ دنیا میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ اس سے زیادہ خوب صورت صرف رومی دارالسلطنت کی عمارت تھی۔ وہ ابدی فخر، جس پر عظیم روم کو بھی ناز تھا۔''

سراپیوم کی عمارت میں بڑے بڑے پتھر تھے، جن میں سے کچھ تو اسکندریہ کے کتب خانے میں لگا دیئے گئے اور کچھ مصر کے قدیم دیوتاؤں کی زیارت گاہوں میں صرف کر دیئے گئے۔ یہاں دو قدیم مینار اور پانی کا ایک بہت بڑا، بے حد حسین، مرمریں حوض بھی تھا، اس عمارت کے بعض حصوں کو عیسائیوں نے کلیسا بنا لیا تھا، جو عربی فتوحات کے وقت تک موجود تھے۔ اس کے دروازے سے ملی ہوئی ایک عمارت تھی، جس میں ستونوں کے دائرے پر ایک بلند سنہری گنبد بنایا گیا تھا۔ یہ عمارت بھی سراپیوم کے بہت سے ستونوں کی طرح، عربی فتوحات کے مدتوں بعد

Marfat.com

قائم رہی۔ بعض مؤرخین اس عمارت کا ذکر کرتے ہیں اور اسے ''مدرسہ ارسطو'' اور قبہء ارسطو' اور بیت الحکمت'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ سراپیوم کے برابر گھڑ دوڑ کا میدان تھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں دس لاکھ تماشائی آتے تھے۔ اس کی عمارت اس طرح بنائی گئی تھی کہ انسانوں کے اس جم غفیر کو دیکھنے اور سننے میں کوئی زحمت پیش نہ آتی تھی۔ تھیٹر ایک دوسری آبادی میں تھا۔ اس کی اپنی ایک الگ شاندار عمارت تھی، جس کی عظمت نگاہوں کو کھینچتی اور جس کا حسن دلوں کو لبھاتا تھا۔ فاتحین تہذیب و تمدن کے ان مظاہر کو دیکھ کر دنگ رہ گئے جو شہر میں داخل ہونے اور اس کے کوچہ و بازار میں چلنے پھرنے سے انہیں نظر آئے، لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ان عالیشان عمارتوں کے نیچے زمین دوز عمارتیں بھی ہیں تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ زمین دوز عمارتیں چار چار، پانچ پانچ منزل کی تھیں اور ہر منزل میں بے شمار ستون اور پتھر تھے، جنہیں پانی جمع کرنے کے لیے حوضوں کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ نیل کی طغیانی کے زمانے میں ان نالیوں کے رستے جو ان عمارتوں کو شیریں نہر سے ملاتی تھیں، پانی یہاں جمع ہوتا رہتا تھا اور اس کے بعد لوگ سال بھر تک یہ پانی پیتے رہتے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر عرب مبہوت رہ گئے۔ لیکن جتنی حیرت انہیں ''بڑا مینار'' دیکھنے سے ہوئی اور کسی چیز سے نہ ہوئی، یہ بہت بڑی اور عجیب عمارت، جزیرہ فاروس کے شمال مشرق میں واقع تھی جسے مضبوط رسیوں سے بنایا ہوا ایک طویل رستہ شہر سے ملاتا تھا۔ ①

یہ مینار جہازوں کی رہنمائی کے لیے بطلیموس ثانی نے تعمیر کرایا تھا، جو دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتا تھا۔ اس میں سفید پتھر لگے تھے جو دن کو دھوپ میں چمکتے تھے اور رات کو اس میں آگ جلا دی جاتی تھی تاکہ سمندر کے مسافر اس کی روشنی میں اپنا رستہ پا سکیں۔ اس طرح یہ مینار شب و روز جہازوں کی رہنمائی کرتا رہتا تھا۔ بطلیموس نے یہ مینار سمندر کی ایک چٹان پر بنوایا تھا اور اس کی تعمیر میں مضبوط چٹانوں کے سیسہ پلائے ہوئے پتھر صرف کیے تھے تاکہ سمندر کا پانی اس کے کسی حصے میں راہ نہ پا سکے۔ یہ تین سو ہاتھ بلند اور چار منزلوں میں منقسم تھا۔ پہلی منزل جو زمین سے متصل تھی، چوکور تھی، دوسری منزل ہشت پہلو، تیسری گول اور چوتھی کھلی ہوئی تھی جہاں جہازوں کی رہنمائی کے لیے آگ روشن کرنے کی جگہیں اور وہ آئینہ تھا جس کے بیان میں مصنفین و مؤرخین نے بڑی دراز نفسی سے کام لیا ہے۔ یہ منزل میں شہر

① اس رستے کا نام ہپتا ستادیوم تھا۔

Marfat.com

کی طرف برآمدے نکلے ہوئے تھے اور مینار کے اندر ایک زینہ تھا جو ان منزلوں کو ایک دوسرے سے ملاتا ہوا اوپر پہنچتا تھا۔ روشنی کے لیے جا بجا روشندان تھے۔ جنہیں فن تعمیر کی باریکیوں کو ملحوظ خاطر رکھ کے بنوایا گیا تھا۔ مینار میں ایک دوسرے میں کھلتے ہوئے بے شمار کمرے تھے جنہیں دیکھ کر عرب تصویر حیرت بن گئے تا آنکہ مقریزی کا بیان ہے: "کہتے ہیں، جو کوئی اس مینار میں داخل ہوتا تھا اس کے بے شمار کمروں، مختلف منزلوں اور رستوں کی بھول بھلیاں میں کھو جاتا تھا۔"

لیکن وہ آئینہ جو اس کی چھت پر نصب تھا، ایک عجوبہ تھا۔ چنانچہ اس آئینے کی دھات، اس کے بنائے جانے کی غرض اور اس کی قوت انعکاس کے متعلق بہت سی باتیں مشہور ہو گئی تھیں۔ مسعودی لکھتے ہیں: "یہ شفاف پتھر کا ایک بہت بڑا آئینہ تھا جس میں روم سے آنے والے جہازوں کا عکس پڑتا تھا حالانکہ وہ حد نظر سے دور ہوتے تھے۔" دوسرا کہتا ہے: "وہ مضبوط شیشے کا بنا ہوا تھا۔" تیسرے کا قول ہے: "وہ چینی فولاد کا تھا۔" اور علامہ سیوطی فرماتے ہیں: "سات ہاتھ چوڑا تھا اور یورپ سے آنے والے جہاز اس میں نظر آتے تھے اور اس سے دشمن کے جہازوں کو جلانے کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ سورج جب مغرب کی طرف جھکنے لگتا تو اس آئینے کو اس کی طرف پھیر دیا جاتا اور اس کی شعاعیں اس میں منعکس ہو کر دشمن کے جہازوں کو جلا دیتیں۔ یہ ایک متفق امر ہے کہ جو جہاز حد نظر سے دور ہوتے تھے، ان کا عکس اس آئینے میں دکھائی دیتا تھا۔" بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں قسطنطنیہ تک کی ساری چیزیں نظر آتی تھیں۔ جس وقت عربوں نے اسکندریہ فتح کیا ہے، یہ مینار صحیح و سالم تھا اور اس طرح آئینہ بھی، لیکن فتح کے بعد یہ دونوں چیزیں زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکیں۔ کیا عربوں نے اس مینار کو ڈھانے کے بعد دوبارہ بنانے کی کوشش کی؟ مؤرخین کا اس میں اختلاف ہے، لیکن اس اختلاف کی تحقیق چنداں ضروری نہیں۔ جن لوگوں کی رائے میں مسلمانوں نے اسے دوبارہ بنانے کی کوشش کی تھی، وہ سب کے سب اس پر متفق کہ انہیں اپنی اس خواہش میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ①

① اس کی تخریب کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس نے مسلمانوں کو رومیوں کے اچانک حملوں سے بچایا، اس لیے رومی اس کی تباہی کے درپے ہو گئے اور چال یہ چلی کہ بادشاہ کے ایک خاص آدمی کو بیش بہا تحفے دے کر، ولید بن عبدالملک کے پاس بھیجا۔ اس شخص نے ازراہ فریب خلیفہ سے یہ ظاہر کیا کہ بادشاہ اس سے ناراض ہو گیا ہے اور اسے قتل کرا دینا چاہتا ہے اس لیے اس کی خواہش ہے کہ مسلمان ہو کر شام میں اقامت اختیار کر لے۔ ولید نے اسے خوش آمدید کہا اور اپنا مقرب بنا لیا۔ اس نے ولید کو شام میں کچھ دفینوں کا پتا دیا اور جب وہ دفینے برآمد ہوئے تو ولید ان کی گراں ارزی کو دیکھ کر

اسکندریہ کے حسن تعمیر اور جلال و جمال نے عرب فاتحین کے دلوں پر جو گہرا اثر چھوڑا تھا میں اسے دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اگر آپ اس اثر کی گہرائی معلوم کرنا چاہتے ہیں تو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے اس خط کی عبارت پڑھ لیجیے جو اس فتح کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ارسال کیا گیا تھا۔ اس خط میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے لکھا تھا: ''اما بعد! میں نے ایک شہر فتح کیا ہے، جس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ زیادہ سے زیادہ بس یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے یہاں چار ہزار عمارتیں اور اتنے ہی حمام پائے۔ اس شہر میں چالیس ہزار یہودی آباد ہیں، جن پر جزیہ عائد کر دیا گیا ہے اور چار سو شاہی رقص گاہیں ہیں۔'' ایک ایسے شخص کے قلم سے، جسے جزئیات نگاری میں کمال حاصل ہو، یہ ایجاز و اختصار اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو اسکندریہ کی تصویر کشی سے معذور پاتے تھے۔ یہی نہیں، بلکہ جب وہ معاویہ بن خدیج کو فتح کی خوش خبری کے ساتھ مدینہ روانہ کرنے لگے تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: ''آپ کوئی خط ساتھ نہیں کریں گے؟'' ابن عاص رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں خط لکھ کے کیا کروں گا؟ کیا تم عرب نہیں ہو کہ پیغام نہ پہنچا سکو اور جو کچھ تم نے دیکھا ہے بیان نہ کر سکو؟'' یہ تھا ابن عاص رضی اللہ عنہ کا جواب حالانکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب تک بات کی انتہائی تفصیل معلوم نہ کر لیں، ان کا اطمینان نہیں ہوتا۔

اسکندریہ کا فاتحین ہی کے نہیں، ان مؤرخین کے دلوں پر بھی بڑا گہرا اثر تھا، جنہوں نے دو سو برس کے بعد ان فاتحین کی داستان مرتب کی۔ چنانچہ آپ نے ان کی روایات میں عجیب عجیب مبالغے دیکھے ہوں گے، جس کی وضاحت صرف راویوں کی اس حیرت سے ہوتی ہے کہ جو کچھ انہوں نے سُنا چھان پھٹک کیے بغیر اسے سچ مان لیا۔ ابن عبدالحکم ایک مستند روایت لکھتے ہیں: ''اسکندریہ کے حماموں کی حدود میں بارہ تہ خانے تھے، سب سے چھوٹے تہ خانے میں ایک ہزار حلقوں کی گنجائش تھی اور ہر حلقے میں آدمیوں کی ایک جماعت سماتی تھی۔'' پھر لکھتے ہیں: ''جب

» بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد اس شخص نے بتایا کہ منارہ اسکندریہ کے..... نیچے سونے اور جواہر کے بہت بڑے خزانے ہیں یہ سُن کر ولید کا جی للچایا اور اس نے ایک فوجی دستے کو اس خدمت پر مامور کیا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس جل کو سمجھتا، نصف مینار ڈھا دیا گیا اور آئینہ اتار لیا گیا، اور اس کے بعد بھی جب خزانے برآمد نہ ہوئے تو پتا چلا کہ ان سے دھوکہ کیا گیا ہے۔ معماروں نے دوبارہ مینار تعمیر کیا، لیکن پہلے مینار کی سی بات پیدا نہ ہو سکی۔ چنانچہ جب بالائی منزل پر آئینہ نصب کیا گیا تو وہ اپنی خصوصیات کھو چکا تھا۔

Marfat.com

اسکندریہ فتح ہوا تو بارہ ہزار کنجڑے اس میں ترکاریاں بیچتے پائے گئے۔" علامہ سیوطی کا بیان ہے کہ "تمام اسکندریہ والے سیاہ اور سرخ کپڑے پہنتے تھے، اس لیے کہ اسکندریہ کی زمین اور عمارتیں سفید مرمر کی تھیں۔ راہبوں کے سیاہ لباس پہننے کی وجہ بھی یہی سنگ مرمر کی چمک تھی۔ انسان کے لیے رات کے وقت شہر میں چلنا پھرنا تکلیف دہ تھا، کیونکہ چاند کی روشنی جب سفید سفید سنگ مرمر پر پڑتی تھی وہ چمک اُٹھتا تھا یہاں تک کہ جلاہا، چراغ روشن کیے بغیر سوئی میں دھاگا پرو لیتا تھا۔ جب تک کوئی شخص سونے اور مرمر کی چمک سے بچنے کے لیے آنکھوں پر کپڑا نہ ڈالے، شہر میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔

سراپیوم کی تعریف میں مسعودی نے لکھا ہے: "اس محل میں سو ستون تھے۔ بیچ کا ستون اتنا بڑا تھا کہ آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس کا بالائی سرا تاج کی شکل میں تراشا گیا تھا...... یہ ستون ہوا کے جھونکوں سے ٹہنیوں کی طرح ہلتے تھے۔" علامہ سیوطی لکھتے ہیں: "یہ ایک ایوان تھا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار کے جنوں نے تعمیر کیا تھا۔ اس میں تین سو مرمریں ستون تھے۔ جن کی بلندی تیس تیس ہاتھ تھی۔ ان ستونوں کے پتھروں کو اتنا صیقل کیا گیا تھا کہ وہ آئینے کی طرح چمکتے تھے اور انسان پشت کی طرف سے آنے والوں کو ان میں دیکھ سکتا تھا۔ ایوان کے وسط میں ایک ستون تھا، جس کی بلندی ایک سو گیارہ ہاتھ تھی۔ اس کی چھت زمردیں مرمر کے ایک ٹکڑے کی تھی جسے جنوں نے تراشا تھا۔ یہ جن انسانوں کی شکل کے تھے جن کے سر گنبدوں جیسے تھے اور ان کی آنکھیں شیروں کے جسم چھیدتی تھیں۔" یہ اور اسی قسم کی بہت سی روایتیں ظاہر کرتی ہیں کہ مصر کے دارالسلطنت نے فاتحین کے دلوں میں جو اثر چھوڑا تھا، تمام مفتوحہ ممالک اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر تھے۔ چنانچہ جو کچھ انہوں نے وہاں دیکھا ہر جگہ اس کا بیان کرنے لگے اور وہ سنی سنائی باتیں بھی اس میں شامل کر دیں، جن میں سے اکثر تنقید کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں۔ اسکندریہ میں داخل ہوتے ہی یہ پہلا اثر تھا جو فاتحین کے دلوں پر پڑا۔ اس کے بعد کچھ زیادہ وقت نہ گزرنے پایا تھا کہ انہوں نے وہاں کے باشندوں کی انوکھی زندگی دیکھی اور ان کی حیرت میں اضافہ ہوگیا۔ وہ مختلف نسلیں جو وہاں آباد تھیں، وہ مختلف ادیان و مذاہب جو ایک دوسرے کے جوار میں رہتے بستے تھے اور بھانت بھانت کی بولیاں جو وہاں بولی جاتی تھیں، یہ ساری چیزیں ایک ایسی زندگی سے بھرپور تھیں جس کا مقابلہ برج بابل کے طلسم آگیں تصورات بھی نہ کرسکتے تھے۔ پھر نسلوں کا یہ اختلاف، ادیان و مذاہب کا یہ تباین اور بولیوں کا یہ تعدد بھی اس

عظیم الشان دارالسلطنت میں رہنے والوں کی زندگی کے سکون واطمینان میں تھوڑی یا بہت کوئی برہمی پیدا نہ کرتا تھا۔ شہر کے سربرآوردہ لوگ مختلف قسم کی نعمتوں اور آسائشوں میں غرق تھے، جس نے باہمی اختلاف کے دروازے ان پر بند کردیئے تھے اور وہ اس متاع راحت کے سوا ہر چیز کو فراموش کیے بیٹھے تھے جس کی تنوع آفرینیوں اور رنگا رنگیوں نے عربوں کو اس درجہ حیران کردیا تھا کہ جو کچھ وہ دیکھتے اور سنتے تھے اس پر جیسے انہیں یقین نہ آتا تھا۔

محاصرہ ختم ہونے کے بعد شہر میں آہستہ آہستہ سکون واطمینان کی کیفیت پیدا ہونے لگی، یہاں تک کہ وہ اپنی پہلی حالت پر آگیا، وہی رنگ رلیاں اور وہی ذہنی وجسمانی عیاشیاں، کہیں علم کی محفلیں آراستہ ہیں، فلسفہ، ریاضی اور طب پر بحثیں ہو رہی ہیں، عقلی راحت اور جسمانی آسودگی سے تعلق رکھنے والے فنون پر تبادلہ خیال کیا جارہا ہے اور شرکائے مجلس اپنی گفتگو میں اتنے شوق وشغف کا اظہار کر رہے ہیں کہ دیکھنے والے کو محسوس ہو رہا ہے جیسے زندگی نام ہی عقل اور علمی وفنی اختراعات کا ہے۔ کہیں تماشا گاہیں ہیں جن میں بہترین ناچنے گانے والیاں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ ہر طرف ڈرامے، موسیقی اور رنگا رنگ فنون لطیفہ کے جلوے بکھرے پڑے ہیں جو عربوں کی آنکھوں نے دیکھے نہ کانوں نے سُنے، بلکہ جن کا تصور بھی کبھی ان کے ذہن میں نہیں آیا۔ کہیں صنعتی کارخانے ہیں جن میں ایک عجیب قسم کا شور بپا ہے۔ کاری گر کے بازو، جو چیزیں یہاں بناتے ہیں، ان کی مضبوطی کی مثال اسکندریہ کے سوا دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ شہر کے مختلف بازاروں میں تجارتی دکانیں ہیں جنہیں جنگ کی آفتوں نے متاثر نہیں کیا۔ یہاں لوگ بڑی خوشی اور اطمینان کے ساتھ ان زراعتی اور صنعتی چیزوں کی خرید وفروخت میں مصروف ہیں، جو مصر کے مختلف علاقوں اور نوبہ، مشرق اقصیٰ، شام اور یورپ کے مختلف ملکوں سے وادی نیل کے اس پایہ تخت میں آتی ہیں اور یہ اسکندریہ کے رجے بچے لوگ ہیں جو حسین اور رنگ برنگے لباسوں میں ملبوس تفریح کدوں، تجارتی بازاروں، علم کی محفلوں اور تماشا گاہوں میں جا رہے ہیں۔ یہ لوگ جب اپنی حویلیوں اور حرم سراؤں میں واپس ہوتے ہیں تو وہاں کا سامان عیش وراحت ان میں زندگی کی محبت اور اس کی آسائشوں سے لطف اندوز ہونے کا شوق اور تیز کردیتا ہے۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ کیا یہ حقیقت سے زیادہ خواب نہیں معلوم ہوتا! لیکن نہیں، وہ ایک ٹھوس حقیقت ہے جو فاتحین کو محسوس ہو رہی ہے۔

امرائے لشکر بھی فوج سے کچھ کم حیرت زدہ نہ تھے، اس حیرت وپسندیدگی کی جھلک آپ اس

خط میں دیکھ چکے ہیں جو ابن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ارسال کیا تھا اور اسکندریہ کے حسن و جمال کی توصیف کے سلسلے میں اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف "چار ہزار عمارتوں ، چار ہزار حماموں، چالیس ہزار یہودیوں اور چار سوشاہی تفریح گاہوں" کے بیان پر اکتفا کیا تھا۔ انہوں نے معاویہ بن خدیج کو مدینہ بھیجا۔ لیکن کوئی خط ان کے ساتھ نہ کیا اور جب انہوں نے خط کے متعلق پوچھا تو کہہ دیا: "کیا تم عرب نہیں ہو کہ پیغام نہ پہنچا سکو اور جو کچھ تم نے دیکھا ہے، بیان کر سکو؟" چند روزہ سفر کے بعد معاویہ دو پہر کے وقت مدینہ پہنچے۔ مسجد کے باہر اونٹنی ٹھہرائی اور اندر جا کے دروازے کے قریب بیٹھ گئے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے گھر سے ایک لونڈی نکلی اور معاویہ کے جسم پر سفر کا لباس اور چہرے پر تکان کے آثار دیکھ کر سمجھ گئی کہ وہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ایلچی ہیں۔ تیزی سے گھر میں داخل ہوئی اور فوراً واپس آ کر بولی: "اُٹھیے! امیر المومنین رضی اللہ عنہ یاد فرماتے ہیں!" معاویہ اس کے پیچھے پیچھے کاشانہ خلافت میں داخل ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھتے ہی سوال کیا: "کیا خبر لائے ہو؟" معاویہ نے جواب میں کہا: مبارک ہو، امیر المومنین! اللہ نے اسکندریہ فتح کرا دیا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں لے کر فوراً مسجد میں تشریف لائے اور مؤذن کو اذان کا حکم دیا۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معاویہ سے فرمایا: "اُٹھو! اور اپنے ساتھیوں کو فتح کا حال سناؤ! جب معاویہ حال سنا چکے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُٹھے اور نماز شکر ادا کی۔ اس کے بعد کاشانہ خلافت میں تشریف لے گئے اور بارگاہ ایزدی میں دُعائیں مانگنے لگے۔ اس سے فارغ ہو کر لونڈی کو کھانا لانے کا حکم دیا۔ وہ اسکندریہ کی نوید فتح لانے والے کے لیے روٹی اور روغن زیتون لے کر آئی۔ معاویہ نے جھجک جھجک کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد وہ ایک تھال میں کھجوریں لائی اور معاویہ نے کھجوریں بھی جھجکتے ہوئے کھائیں۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے سوال فرمایا: "معاویہ! جب تم مسجد میں آئے تھے، تم نے کیا سمجھا تھا؟" معاویہ نے جواب دیا۔ "میں سمجھا تھا، امیر المومنین قیلولہ فرما رہے ہوں گے!" حضرت عمر نے اسی وقت فرمایا: "تم نے غلط سمجھا اگر میں دن کو سوؤں تو رعیت کا نقصان ہے اور اگر رات کو سوؤں تو میرا اپنا نقصان ہے۔ ان دونوں صورتوں میں معاویہ! نیند کیسے آ سکتی ہے!" جس وقت معاویہ مدینہ کی طرف قدم زن تھے، رومیوں نے خشکی اور تری کے رستے اسکندریہ خالی کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، فتح اسکندریہ کے بعد ابن عاص اور مقوقس کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی، شاید

Marfat.com

دارالسلطنت اور پورے مصر سے رومی فوجوں کے انخلاء کے طریق کار ہی تک محدود تھی۔

علامہ بلاذری فرماتے ہیں: ''کہا جاتا ہے تیرہ ہزار دینار کے عوض مقوقس نے ابن عاص رضی اللہ عنہ سے اس شرط پر صلح کی تھی کہ جو اسکندریہ سے جانا چاہے گا، وہ چلا جائے گا اور جو وہاں رہنا چاہے گا رہے گا! ہر بالغ قبطی دو دینار جزیہ ادا کرے گا چنانچہ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے رومیوں کو یہ عہد نامہ لکھ دیا۔''

لیکن حنا نقیوسی کی روایت سے استنباط کرتے ہوئے بٹلر کہتا ہے کہ اسکندریہ کی فتح کے بعد مقوقس اور ابن عاص رضی اللہ عنہ کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ گیارہ مہینے کی مہلت ہوگی۔ اس دوران میں عرب اپنی اپنی فرودگاہوں میں مقیم رہیں گے اور اسکندریہ کی رومی فوجیں اپنا مال واسباب لے کر سمندر کے رستے چلی جائیں گی، جو کوئی خشکی کے رستے جانا چاہے گا، جب تک قیصر کی سرزمین میں داخل نہ ہوگا، ہر مہینے جزیہ ادا کرے گا۔ اس کے بعد بٹلر نے چند ایسی شرطوں کا اضافہ کیا ہے، جو بابلیون کے اس صلح نامے کی شرائط سے ملتی جلتی ہیں جس کی تکمیل عربی سالار اور رومی بطریق کے درمیان ہوئی تھی اور یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ شرطیں اس معاہدے میں تھیں جو عربوں کے محاصرہ بابلیون کے زمانے میں کیا گیا تھا اور یہ وہی محاصرہ تھا جسے ہرقل نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد جب اسکندریہ بزور شمشیر فتح ہوا تو بات صرف اس حد تک رہ گئی کہ اسکندریہ اور مصر کے دوسرے علاقوں سے رومی فوجوں کا انخلاء کیسے عمل میں آئے۔ واقعہ یہ ہے کہ بٹلر نے اس مہلت کا جو ذکر کیا ہے وہ صحیح ہے۔ اگرچہ گیارہ مہینے کی مدت کی تعیین میں اختلاف ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اس کے لیے صرف اتنی ہی مدت رکھی تھی جو ان کے اندازے کے مطابق مہلت اور انخلاء کی شرائط کے سلسلے میں بارگاہ خلافت سے جواب آنے کے لیے کافی ہو سکتی تھی اور وہ مہینے سے زیادہ نہ تھی۔ شاید یہی قول صحت سے قریب تر ہے، ورنہ رومی فوجوں کو نکالنے کے لیے جو جہاز اسکندریہ آئے تھے، ان میں سے اکثر غرق نہ ہوتے۔

مقوقس اسکندریہ سے جانے والے رومیوں کے ساتھ نہیں گیا، بلکہ اپنے محل ہی میں مقیم رہا، وہیں مرا اور وہیں کے ایک قبرستان میں دفن ہوا۔ اسکندریہ چھوڑنے کا خیال بھی اسے نہ آیا اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ بزنطیہ گیا تو اپنی آزادی بلکہ جان تک خطرے میں ڈال دے گا اور اگر اس نے ایسا کیا تو اس کا انجام لازمی طور پر جلاوطنی ہوگا یا موت! اس سے پہلے یہ بوڑھا بطریق اس مقام پر اپنی جلاوطنی کے دن گزار رہا تھا، جہاں ہرقل نے اسے بھجوایا تھا تا آنکہ ہرقل کی موت کے بعد قسطنطین مرتینا اور اس کے بیٹے نے اسے بلوایا اور وہ مرتینا سے ساز باز کر کے اسکند

اور عربوں کے اسکندریہ فتح کرنے اور رومیوں کو مہلت دینے تک یہیں رہا اس دوران میں قسطنطین مار ڈالا گیا اور رومیوں نے مرتینا اور اس کے بیٹے کے خلاف بغاوت کر دی، جس کے نتیجے میں یہ دونوں ماں بیٹے تخت سے اتار دیئے گئے یا قتل کر دیئے گئے اور قسطنطین کا بیٹا: کنتانس تنہا تخت کا مالک ہو گیا۔ مقوقس اور مرتینا میں جو گٹھ جوڑ تھا، قسطنطیہ والوں میں سے کسی کو اس کا خوف نہ رہا تھا۔ لہٰذا اگر اب وہ قسطنطیہ جاتا تو کوئی تعجب نہ تھا کہ اس کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوتا جو اس کی حلیف ملکہ کے ساتھ کیا جا چکا تھا۔ اس لیے اس نے مصر ہی میں رہنے کو ترجیح دی اور اپنے لیے یہی کافی سمجھا کہ عرب فاتح اس کا اثر و نفوذ برقرار رہنے دے گا، جس کے سہارے کم سے کم اس کا مجروح بڑھاپا تو اطمینان سے بسر ہو جائے گا۔''①

جب اسکندریہ فتح ہوا تو بہت سے مصریوں اور رومیوں کو، جو سقوط بابلیون کے بعد اسکندریہ میں پناہ گزیں ہو گئے تھے، اُمید تھی کہ انہیں اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے کی اجازت مل جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے مقوقس سے کہا کہ وہ اس مسئلے پر ابن عاص رضی اللہ عنہ سے گفتگو کرے، لیکن ابن عاص نے یہ درخواست قبول نہ کی، جس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک بعض قلعہ بند شہر فتح نہ ہوئے تھے اور اندیشہ تھا کہ یہ لوگ کہیں ان سے مل کر ان کے بازو مضبوط نہ کر دیں۔ مقوقس نے ابن عاص کے اس انکار کو اپنے اقتدار کے زوال پر محمول کیا اور اس غم نے اسے بہت جلد موت کے منہ میں پہنچا دیا۔ کیا حنا نقیوسی کے بیان کے مطابق مقوقس اس ندامت میں مر گیا کہ اس نے اسکندریہ مسلمانوں کے حوالے کیوں کیا؟ یا جیسا کہ ساویرس کہتا ہے کہ اسے یہ خوف پیدا ہوا کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ

---

① مسلمان مؤرخین قیرس کے سفر قسطنطنیہ کا ذکر کرتے ہیں، نہ اس کی جلاوطنی کا، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہرقل نے اسے خط میں لکھا، جس میں اس کی رائے پر ملامت و سرزنش کی اور اس کی تجویز اس کے منہ پر ماری۔ اسے عربوں سے لڑنے کا حکم دیا اور تاکید کی کہ اس کے سوا وہ اور کچھ نہ سوچے۔ ہرقل نے فوجیں بھی روانہ کیں، جنہوں نے اسکندریہ کے دروازے بند کر کے گویا مسلمانوں کو جنگ کی دعوت دی۔ مقوقس ابن عاص رضی اللہ عنہ سے ملا اور کہا: ''میری آپ سے تین درخواستیں ہیں۔'' ابن عاص نے پوچھا: ''وہ کیا؟'' کہنے لگا: ''ایک تو رومیوں کے ساتھ وہ رعایت نہ کیجیے جو آپ نے میرے ساتھ کی ہے، اس لیے کہ میں نے انہیں نصیحت کی لیکن انہوں نے اسے ٹھکرا دیا۔ دوسرے قبطیوں سے وعدہ خلافی نہ فرمایئے کہ انہوں نے ... نہیں کی۔ تیسرے حکم دے دیجیے کہ جب میں مروں تو مجھے ابو یحنس کے کلیسا میں دفن کیا جائے۔ ابن ...عمولی شرطیں ہیں لیکن غیر مسلم مؤرخین مقوقس کے سفر، اس کی جلاوطنی اور جلاوطنی کے بعد ان کے ...رتے ہیں اور اپنے بیان کو انہوں نے اس طرح ثابت کیا ہے کہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں ...ساتھ اس کی صحت ظاہر ہوتی ہے۔

Marfat.com

اسے قتل کرا دیں گے اور اس نے زہر میں بجھی ہوئی ایک انگوٹھی منہ میں رکھ کر اسی وقت جان دے دی یا اس کا بڑھاپا اپنے پاؤں سے چل کر موت کی طرف گیا؟۔ بٹلر کہتا ہے کہ وہ اسہال معدی میں مبتلا ہو کر طبعی موت مرا اور ۲۱ مارچ ۶۴۲ء کو اسکندریہ میں دفن کیا گیا۔ قیرس مر گیا اور رومی مصر کے پایہ تخت سے نکل گئے۔ مسلمانوں نے اسکندریہ کا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کاروبار حکومت چلانے لگے۔ اس طرح مصر میں رومی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور ان کا اقتدار موت کی نیند سو گیا۔ اگرچہ مصر کے بعض علاقوں میں روم کی محصور فوجیں موجود تھیں، لیکن یہ فوجیں ڈوبی ہوئی سلطنت اور پامال شدہ اقتدار میں جان کیسے ڈال سکتی تھیں! اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں اسکندریہ کا سقوط،، دوسرے لفظوں میں اللہ کی طرف سے اجازت تھی کہ پورا مصر مسلمانوں کے ہاتھ آ جائے اور وہ مصر کے بگڑے ہوئے حالات کو درست اور تباہ شدہ عمارتوں کی مرمت کریں، لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا، جب تک مصر کی پوری سرزمین کو رومیوں کے وجود سے پاک نہ کر دیا اور قبطیوں کے دلوں میں اطمینان پیدا نہ ہو گیا کہ تمام ملک میں عربوں کی حکومت قائم ہو گئی ہے۔ چنانچہ رومیوں کے دل میں پھر کبھی مصر پر حملہ کرنے کا خیال نہ آیا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو اُلٹے پاؤں بھگا دیئے جاتے اور اپنی اس حماقت کا مزہ انہیں اچھی طرح چکھنا پڑتا۔

وہاں یہ کچھ ہوا۔ لیکن کیسے ہوا؟ یہ آپ کو آگے چل کر معلوم ہوگا۔

Marfat.com

باب:21

مصر پر مسلمانوں کا قبضہ

اسکندریہ کی فتح گویا اعلان تھا کہ پورا مصر مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا ہے، چنانچہ خارجہ بن حذافہ نے طیبہ کی حدود تک بلاد صعید پر قبضہ کر لیا اور رومیوں کی صرف معمولی سی تعداد باقی رہ گئی، جس نے پایہ تخت کی فتح کے بعد کہیں آتش قتال بھڑکائی نہ اقتدار کی راہ میں فاتحین سے برسر کشمکش ہوئے۔ رومی جنگ و پیکار کی ہمت کر بھی کیسے سکتے تھے، جب وہ جانتے تھے کہ ان کے مذہبی اور اقتصادی مظالم نے قبطیوں کے دلوں میں ان کے خلاف ایک مستقل نفرت بٹھا رکھی ہے اور یہ نفرت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ قبطی جہاں کسی رومی کو تنہا پاتے ہیں، قتل کر ڈالتے ہیں اور پھر پتا نہیں چلتا کہ اسے کس نے قتل کیا ہے۔ قبطیوں کی یہ روم دشمنی غازیان اسلام کی محبت یا خیر مقدم کا نتیجہ نہ تھی، اس لیے کہ اہل صعید فتوحات کے اس ابتدائی دور میں مسلمانوں کے دائرہ اثر و اقتدار سے دور تھے۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کوئی غصہ نہ تھا بلکہ جو کچھ رنج اور جو کچھ دشمنی تھی، وہ ان رومیوں کے خلاف تھی، جنہوں نے مدتوں ان کو ہدف ستم بنائے رکھا تھا۔ جو اسلامی دستے ڈیلٹا کے علاقے میں بھیجے گئے تھے۔ وہاں کی اکثر بستیوں پر قابض ہو گئے اور ان کا اقتدار اس کے مختلف گوشوں میں پھیل گیا۔ قلعہ بند شہروں کے سوا ان دستوں کے سامنے کوئی نہ ٹھہرا اور یہ شہر بھی بس قلعہ بند ہی رہے، غازیان اسلام کو پسپا نہ کر سکے حالانکہ وہ اپنی مدافعت کر سکتے تھے، جب حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اسکندریہ فتح کر لیا تو ان شہروں میں سے اکثر نے اپنے دروازے کھول دیے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ عرب ان کے گلے کا پھندا کس دیں گے اور وہ زیادہ دیر تک ان نصرت رکابوں کے مقابلے پر نہ ٹھہر سکیں گے۔ لیکن جو شہر بحیرہ روم کے ساحل سے قریب تھے۔ انہوں نے مقاومت جاری رکھی۔ نہ اطاعت قبول کی، نہ دوسروں کی طرح مسلمانوں سے کوئی معاہدہ کیا۔

Marfat.com

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان شہروں میں رومی چھاؤنیاں تھیں، یہاں کی فوجوں نے سوچا کہ چاہے وہ مسلمانوں کی اطاعت قبول کریں، یا ان کے خلاف لڑیں۔ ہلاکت بہرحال ان کی تقدیر ہے۔ چنانچہ حفاظت نفس کا جذبہ انہیں مقاومت کی طرف لے گیا، اس لیے وہ قلعہ بند ہو کر مسلمانوں سے لڑنے کو تیار ہو گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ داعیان روم پروپیگنڈے کے ان تمام وسائل سے کام لے کر، جو اس زمانے میں رائج تھے، یہ افواہیں پھیلاتے پھرتے تھے کہ مسلمان قبطیوں کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آتے ہیں، انہیں طرح طرح سے ستاتے ہیں، ان کا رزق چھینتے ہیں اور لوگوں کو مسلمان بنانے کے لیے مسیحیت کے انکار پر مجبور کرتے ہیں۔ بٹلر نے حنا نقیوسی سے جو نقل کیا ہے اس میں آپ کو یہ خبریں مل جائیں گی اور غالباً یہ حقیقت بھی آپ پر واضح ہو جائے گی کہ ان شہروں کو اپنی مقاومت میں کامیابی کی کوئی اُمید تھی، اس کے باوجود جب غازیان اسلام کے بارے میں رومیوں کی پھیلائی ہوئی افواہیں ان میں عام ہوئیں تو ان پر خوف طاری ہو گیا اور انہوں نے زندگی سے مایوس ہو کر لڑنے مرنے کی ٹھان لی۔

مؤرخین نے بعض مقابلہ کرنے والے شہروں کے نام لکھے ہیں جن میں اخنا جو اسکندریہ کے قریب تھا، بلہیب جو رشید کے جنوب میں واقع تھا اور برلس، دمیاط اور تنیس شامل ہیں اس کے بعد وہ واقعات بیان کیے ہیں جو مسلمانوں اور ان شہروں کے سربراہوں کے درمیان پیش آئے۔ ان میں سے بعض واقعات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اخنا کے حاکم طلما نے ابن عاص رضی اللہ عنہ سے صلح کی درخواست کی، لیکن ابن عاص رضی اللہ عنہ نے اسے ناقابل اعتناء سمجھتے ہوئے اپنی فوجوں کو اخنا کی طرف روانہ ہونے کا حکم دیا۔ مجاہدین اسلام نے وہاں بہت سے لوگوں کو قیدی بنا لیا۔ حالانکہ اخنا بغیر کسی مقاومت کے سرانداز ہو گیا تھا۔ چنانچہ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے وہ تمام قیدی واپس کر دیے جو اسلامی لشکر نے مدینہ بھیج دیے تھے اور انہیں ذمی بنا لیا۔ بلہیب میں بھی یہی کچھ پیش آیا۔ کہا جاتا ہے کہ بلہیب کے قریب ابن عاص رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کا ایک مکتوب پہنچایا گیا، جس میں حکم تھا کہ قیدیوں کو اختیار دیا جائے۔ ان میں سے جو کوئی اسلام قبول کرلے گا، مسلمانوں کا بھائی بن جائے گا۔ قیدیوں کو جب یہ معلوم ہوا تو بہت سوں نے اسلام قبول کرلیا اور مسلمان قبول اسلام کی وجہ سے ان کی عزت و تکریم کرنے لگے۔ عرب برلس سے دمیاط پہنچے اور اس پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح عریش سے اسکندریہ تک کا سارا ساحلی علاقہ مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ اس کے باوجود تنیس

Marfat.com

نے اطاعت قبول نہ کی اور مسلمانوں کے لیے اپنے دروازے نہ کھولے، بلکہ ان کے مقابلے پر آیا اور مختلف مقامات پر ان سے جنگ کی۔ تا آنکہ بزور شمشیر فتح کیا گیا اور مسلمانوں نے اس کا مال غنیمت آپس میں تقسیم کرلیا۔ تنیس کی مقاومت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ ایک گنجان اور بڑا صنعتی شہر ہی نہ تھا بلکہ اسے ایک خاص مذہبی اہمیت بھی حاصل تھی۔ اس کی فصیلیں مضبوط تھیں اور ان میں انیس دروازے تھے، جن پر لوہے کی دبیز چادریں چڑھی ہوئی تھیں، اس میں بہتر کلب اور چھتیس حمام تھے۔ مقریزی کا کہنا ہے کہ تنیس مقابلے پر ڈٹا رہا، اور جب اس کی فتح میں تاخیر ہوئی تو شطا بن ہاموک، جو دمیاط کے قریب ایک شہر کا حاکم تھا اور مسلمان ہو چکا تھا، اپنی عمل داری سے نکلا۔ برلس، دمیدہ اور اشمون طناح سے لشکر جمع کیا اور اسلامی فوجوں سے مل کر دشمن کا مقابلہ کیا۔ جس دن تنیس نے مسلمانوں کے لیے اپنے دروازے کھولے ہیں، وہ بڑی بے جگری سے لڑا اور اسی دن شہید ہو گیا۔ چنانچہ اس کی عمل داری کا نام، جو دمیاط کے مشرق میں واقع تھی، اس کے نام پر رکھ دیا گیا۔

اس طرح ان رومیوں اور مصریوں کی مقاومت ختم کر دی گئی جو مسلمانوں کے مقابلے پر آئے یا جنہوں نے اس جنگ سے اپنے ملک کی آزادی کے لیے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی اور بحیرہ روم کے ساحلوں سے بلاد نوبہ تک سارے مصر میں خالصتاً مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ تنیس کا مرحلہ طے کرنے کے بعد حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو چاہیے تھا کہ آرام کرتے اور اس سے آگے نہ بڑھتے، لیکن انہوں نے سوچا کہ برقہ اور طرابلس میں جو رومی فوجیں ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ قلعہ بند ہو جائیں اور موقع پا کر مصر پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ وہ مصر کے انتظامات کی طرف سے مطمئن ہو کر اسکندریہ سے برقہ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ رستہ اس زمانے میں آج کل کی طرح ویران صحرائی رستہ نہ تھا، بلکہ ایک ایسے سرسبز علاقے سے گزرتا تھا جس کے دونوں طرف کھیتوں، باغوں، نخلستانوں اور ایک دوسری سے ملی ہوئی آبادیوں کی قطاریں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ شہ سواران اسلام بڑے لطف و آرام کے ساتھ برقہ پہنچ گئے اور وہاں بھی انہیں کوئی قابل ذکر مزاحمت پیش نہ آئی۔ صحیح یہ ہے کہ معمولی سے مقابلے کے بعد اہل برقہ نے مسلمانوں سے صلح کر لی اور تیرہ ہزار دینار سالانہ جزیہ دینے پر رضامند ہو گئے۔ برقہ طرابلس کا ایک صوبہ ہے جس کا نام اس کے ایک شہر کے نام پر تھا یہ شہر اس مقام پر آباد تھا جہاں آج کل بن غازی ہے۔ ابن دقماق

Marfat.com

کہتے ہیں: اس صوبے میں بہت سے بھرے پرے شہر تھے۔ جن میں نہروں اور درختوں کی بہتات تھی، یہاں کی آبادی کثیر اور زمینیں زرخیز تھیں، جن میں زعفران کی کاشت ہوتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مشرق و مغرب کے بہت سے تاجر برقہ آتے جاتے رہتے تھے، اس لیے کہ یہاں مشرق و مغرب سے مختلف قسم کا تجارتی سامان آتا تھا جس کی مثال مغرب کے اکثر ملکوں میں ناپید تھی۔ پھر صلح کے بعد کیوں نہ مسلمان اس شہر سے جزیہ وصول کرتے اور برقہ والوں کی ایک جماعت کے ساتھ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مصر بھیجتے رہتے۔

برقہ کی صلح کے سلسلے میں ایک عجیب روایت بیان کی گئی ہے کہ یہاں کے باشندے ادائے جزیہ کے لیے اپنے بچوں کو بیچ دینا جائز سمجھتے تھے۔ اس جواز کی توجیہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کی جاسکتی کہ ادائے قرض کے لیے اپنے بچوں کو فروخت کر دینا ان کے ہاں عیب کی بات نہ تھی۔ چنانچہ مسلمانوں نے اس سلسلے میں ان پر کوئی جبر نہ کیا۔ البتہ جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے ان پر یہ مذموم رسم حرام کر دی۔ ① گمان غالب یہ ہے کہ اہل برقہ کی اولاد اس قبیح رسم سے مطمئن نہ تھی، جس کے ثبوت میں یاقوت کا یہ بیان پیش کیا جاسکتا ہے کہ برقہ کی بیشتر آبادی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ برقہ سے طرابلس کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ ایک مسلح بندرگاہ تھی جس کی حفاظت رومیوں کا ایک لشکر کرتا تھا۔ طرابلس کے چاروں طرف سرسبز کھیت تھے، جن کی پیداوار اس کے قلعوں میں محفوظ رہتی تھی۔ طرابلس والوں نے جو مسلمانوں کو آتے دیکھا تو شہر کے دروازوں پر قفل چڑھا دیے اور اسلامی محاصرے کے سامنے ڈٹ کر بحری مدد پہنچنے کا انتظار کرنے لگے۔ چند ہفتے گزر گئے، لیکن مدد نہ آئی۔ اسی انتظار میں عربوں کو معلوم ہو گیا کہ سمندر کی طرف سے شہر غیر مسلح ہے۔ چنانچہ کچھ مسلمان چوری چھپے اس طرف سے شہر میں داخل ہو گئے اور نعرہ تکبیر بلند کیا۔ اب رومیوں کو فرار کے سوا کوئی راہ نظر نہ آئی، چنانچہ وہ شہر چھوڑ کے کشتیوں کے رستے بھاگ گئے دربانوں نے دروازے کھول دیئے اور ابن عاص رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کو لے کر شہر میں داخل ہو گئے۔

---

① علامہ بلاذری نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرو بن عاص نے "انطابلس اور اس کے دارالحکومت برقہ (جو مصر اور افریقہ کے درمیان ہے) کے باشندوں سے ان کا محاصرہ اور ان سے جنگ کرنے کے بعد جزیے پر اس طرح صلح کر لی کہ وہ اپنی اولاد میں سے جسے چاہیں جزیے میں بیچ دیں اور انہیں اس امر کی تحریر دے دی، لیکن اس کا اطلاق غلاموں پر نہ تھا۔

Marfat.com

اسلامی دستے ادھر اُدھر روانہ کیے گئے جنھوں نے تمام صوبے پر رعب قائم کر دیا اور لوگوں کو تسلیم و اطاعت کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں درخواست بھیجی کہ انہیں تیونس اور اس سے آگے شمالی افریقہ کی طرف بڑھنے کی اجازت دی جائے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی یہ درخواست نامنظور کر دی اور ابن عاص رضی اللہ عنہ برقہ واپس آ گئے۔ جہاں بڑے بڑے بربری قبائل نے آ کر ان کی اطاعت قبول کر لی۔ ① جب حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو اطمینان ہو گیا کہ پورے مصر سے رومی اثر و اقتدار اُٹھ چکا ہے تو وہ مال غنیمت اور قیدیوں کو لے کر اسکندریہ واپس چلے گئے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے مغربی سرحدوں کی طرح مصر کی جنوبی سرحدوں کو بھی محفوظ کر دینا چاہا۔ اس غرض کے لیے عقبہ بن نافع فہری نوبہ کی طرف بھیجے گئے۔ اہل نوبہ مسلمانوں کے مقابلے پر نکلے اور اتنی شدت سے لڑے کہ صلح یا التوائے جنگ کا معاہدہ کیے بغیر عقبہ کو اُلٹے پاؤں واپس ہونا پڑا۔ مسلمانوں کی پسپائی کی وجہ یہ تھی کہ اہل نوبہ قیامت کے تیر انداز تھے۔ ان کا تیر کبھی خطا نہ کرتا تھا۔ وہ تاک تاک کر آنکھوں کو نشانہ بناتے تھے اور وہ بصارت سے محروم ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ عربوں نے ان کا نام ہی ''رماۃ الحدق''، ماہر تیر انداز .... رکھ دیا تھا۔ عقبہ کی واپسی کے بعد بھی ابن عاص رضی اللہ عنہ کے دستے سرحدوں پر ان سے لڑتے رہے اور جب حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت آیا تو عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے التوائے جنگ پر صلح کر لی کہ فریقین ایک دوسرے سے نہیں لڑیں گے۔ اہل نوبہ مسلمان قیدی واپس کر دیں گے اور مسلمان اہل نوبہ کو اتنا غذائی سامان دیں گے، جو ان قیدیوں کی قیمت کے برابر ہوگا۔

اس کے باوجود اہل نوبہ نے اسلامی فوجوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے مصر کی سرحدیں پار کرنے کا خیال نہ کیا، بلکہ دشمن کو اپنے ملک سے نکال کر خاموش بیٹھ گئے۔ چنانچہ ابن عاص رضی اللہ عنہ کو ان کی طرف سے کوئی خوف نہ رہا اور وہ مصر کی جنوبی سرحدوں کی طرف سے بھی اسی طرح

---

① ان میں سب سے بڑا قبیلہ لوانہ کا تھا۔ حسین المحاضرۃ میں علامہ سیوطی کہتے ہیں: بربر فلسطین میں تھے اور ان کا بادشاہ جالوت تھا۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے قتل کر دیا تو بربر وہاں سے نکلے اور مغرب کا رُخ کیا، یہاں تک کہ لوبیہ پہنچ کر ادھر اُدھر پھیل گئے۔ زنانہ اور مغیلہ کے قبیلے مغرب کی طرف بڑھے اور پہاڑوں میں آباد ہو گئے۔ لوانہ کا قبیلہ اور آگے چلا اور انطابلس میں .... جو برقہ ہے ...... سکونت پذیر ہو گیا۔ وہ غرب کے اس حصے میں چاروں طرف آباد ہو گیا اور ہوارہ کا قبیلہ شہر لبدہ میں اُترا۔

Marfat.com

مطمئن ہو گئے، جس طرح برقہ اور طرابلس میں رومیوں کو شکست دینے کے بعد مغربی سرحدوں کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے۔ اب کہ امن و سلامتی کی فکر ان کے لیے وجہ تشویش نہ رہی تھی، انہوں نے اپنی تمام تر توجہ مصر کے نظم و نسق اور حکومت کے استحکام پر مبذول کر دی، لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے ابن عاص رضی اللہ عنہ نے طریق عمل کیا اختیار کیا؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے بہتر ہوگا کہ ہم اس مسئلے کو صاف کر لیں جس پر مؤرخین نے مدتوں غور کیا ہے۔ اس باب کے آغاز اور پچھلے دو باب میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے مصر بزور شمشیر فتح کیا۔ ان کے اور رومیوں کے درمیان صلح نہ ہوئی اور مصر کے قبطی، جو ہرقل اور اس کے جانشینوں کی غلامی کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے، اس حیثیت میں نہ تھے کہ ان سے صلح کر سکتے۔ بابلیون کے اثنائے محاصرہ میں مقوقس نے صلح کی طرح ضرور ڈالی تھی، لیکن ہرقل نے اسے ٹھکرا دیا اور اس انکار کے بعد فریقین پھر ایک دوسرے سے برسر پیکار ہو گئے۔ یہاں تک کہ رومیوں کو شکست اٹھانی پڑی اور وہ سارے مصر سے نکال دیئے گئے۔ اس کے باوجود مؤرخین ایسی روایتیں بیان کرتے ہیں جن میں سے کچھ تو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ مصر از راہ مصالحت فتح ہوا اور کچھ یہ بتاتی ہیں کہ اس کی تسخیر کا سہرا تلوار کے سر پر ہے۔ اپنے بیان میں مؤرخین اتنی شدت اور مبالغے سے کام لیتے ہیں کہ انسان سوچنے لگتا ہے۔ اس مسئلے میں کسی یقینی نتیجے تک پہنچنا ناممکن ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مصر صلح و عہد سے نہیں تلوار سے فتح کیا گیا تھا، وہ فتح مصر میں شریک ہونے والے ایک گروہ کی روایت کو بطور سند پیش کرتے ہیں، جس کا کہنا ہے کہ مصر بزور شمشیر فتح ہوا تھا اور اس قول کی تائید میں بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک صندوق تھا، جس میں وہ تمام عہد نامے محفوظ تھے، جو مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان ہوئے تھے، لیکن اس صندوق میں مصر سے متعلق کوئی عہد نامہ نہیں پایا گیا۔ پھر وہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں: میں یہاں بیٹھا ہوں، لیکن مصر کے کسی قبطی سے میرا کوئی عہد و پیمان نہیں ہے، سوائے اہل انطابلس کے جن سے عہد نامہ ہوا ہے اور ہم اس کی شرطیں پوری کر رہے ہیں۔'' ایک راوی کا بیان ہے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا تھا: ''چاہوں انہیں قتل کروں، چاہوں ان کے مال کا خمس لوں اور چاہوں انہیں بیچ ڈالوں۔'' یہ بات کہنے والے اپنی رائے کی تائید میں ایک دلیل یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو

لکھا: ''مصر کے چند آدمیوں نے رہبانیت اختیار کر لی تھی، ان میں سے ایک راہب مر گیا ہے، لیکن اس کا وارث کوئی نہیں ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں تحریر فرمایا: ''اس کا وارث تلاش کر کے میراث اسے پہنچا دو، اور اگر کوئی وارث نہ ملے تو اس کا ترکہ بیت المال میں داخل کر دو کہ اس کے مستحق مسلمان ہیں۔''

لیکن جن لوگوں کے نزدیک مصر از راہ صلح فتح کیا گیا وہ ان روایات کو سند بناتے ہیں، جن میں سے بعض تو یہ کہتی ہیں کہ پورا مصر از راہ صلح فتح کیا گیا اور بعض کا بیان ہے کہ اسکندریہ کو چھوڑ کر باقی سارے ملک کی تسخیر تلوار کی مرہون منت ہے۔ روایت ہے کہ جب حضرت عمرو بن عاص نے مصر فتح کیا تو صلح اس شرط پر ہوئی کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو چھوڑ کر ہر بالغ قبطی دو دو دینار بطور خراج ادا کرے گا۔ شمار کیا گیا تو ان کی تعداد اسی لاکھ نکلی۔ کہا جاتا ہے کہ جب ابن عاص رضی اللہ عنہ نے اسکندریہ فتح کیا تو اکثر مسلمان چاہتے تھے کہ شہر کا سارا مال و اسباب اور باشندے آپس میں تقسیم کر لیے جائیں، لیکن ابن عاص رضی اللہ عنہ نے کہا: ''امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے اجازت حاصل کیے بغیر میں ایسا نہیں کر سکتا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابن عاص کے خط کے جواب میں لکھا: ''مال تقسیم نہ کرو اور قیدیوں کو چھوڑ دو! ان کا خراج مسلمانوں کے لیے فے ہو گا اور دشمن کے خلاف جنگ میں ان کی مدد کرے گا۔'' ابن عاص رضی اللہ عنہ نے اس حکم کی تعمیل کی اور اہل اسکندریہ پر خراج عائد کر دیا۔ شمار ہوا تو خراج دینے والوں کی تعداد چھ لاکھ تھی۔ اس طرح پورا مصر از راہِ مصالحت فتح کیا گیا، جس میں ہر شخص پر دو دو دینار جزیہ فرض کیا گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک معمر بزرگ سے جو فتح مصر میں شریک تھے، پوچھا گیا: ''لوگ کہتے ہیں کہ اہل مصر سے کوئی عہد نامہ نہیں ہوا تھا؟'' جواب دیا: ''جو یہ کہتا ہے اس کی بات نا قابل اعتبار ہے۔'' پوچھا: ''تو کیا ان سے کوئی عہد نامہ ہوا تھا؟'' کہا: ''ہاں! ایک نہیں، تین عہد نامے ہوئے تھے۔ ایک اخنا کے حاکم طلما سے، دوسرا ان رشید کے فرمانروا قربان سے اور تیسرے برلس کے امیر یحنس سے!'' اور جب صلح کی نوعیت پوچھی گئی ان بزرگ نے بتایا کہ ''صلح دو دینار فی کس جزیہ اور مسلمانوں کے لیے فراہمی غذا کی شرط پر ہوئی تھی اور یہ بھی قرار پایا تھا کہ نہ اہل مصر اپنے وطن سے نکالے جائیں گے نہ ان کی عورتیں، زمینیں اور دفینے چھینے جائیں گے اور نہ ان پر کوئی ٹیکس لگایا جائے گا۔''

یہ ہیں وہ اہم روایات جن سے یہ دونوں گروہ۔ ایک وہ جو کہتا ہے کہ مصر از راہ مصالحت

Marfat.com

ہوااور دوسرا جس کی رائے میں مصر کی تسخیر تلوار کے بل پر ہوئی............استناد کرتے ہیں۔ غالبا اس مسئلے میں آپ مجھ سے اتفاق فرمائیں گے کہ اپنے ظاہری اختلاف کے باوجود یہ روایات ایک ہی نتیجے پر پہنچتی اوراس امر کی تائید کرتی ہیں کہ مصر بیک وقت صلح وشمشیر سے فتح ہوا، اس معنی کر کہ اس کی سرزمین پر جو معرکہ آرائیاں ہوئیں مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان ہوئیں، مسلمانوں اور قبطیوں کے درمیان نہیں۔ فریقین کے مقابلے میں اہل مصر کا جو موقف تھا، آپ چاہیں تو اسے غیر جانبداری سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن دراصل وہ ایک مجبور ومغلوب قوم کا موقف تھا، جو کھلے بندوں کسی فریق کے ساتھ مل کر دوسرے فریق کے خلاف جنگ نہ کر سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ قبطی ہر علاقے میں بالا دست قوت کے احکام کی...... اگر خوش دلی سے نہیں تو بے دلی کے ساتھ تعمیل کرتے تھے۔ چنانچہ جہاں جہاں رومیوں کا اقتدار تھا، سڑکوں کی درستی، پلوں کی تعمیر اور اسی طرح دوسری جنگی ضروریات میں وہ ان کی مدد کرتے تھے اور جہاں جہاں عرب اپنا اثر قائم کر چکے تھے وہاں ان کا ساتھ دیتے تھے۔ پھر جیسا کہ آپ دیکھ آئے ہیں، رومیوں کے مذہبی استبداد اور اقتصادی مظالم نے قبطیوں کو ان کی طرف سے حد درجہ متنفر کر رکھا تھا اور عربوں کی طرف سے انہیں یہ اندیشہ تھا کہ وہ کہیں رومیوں کی جگہ نہ لے لیں اور جو بدسلوکیاں ان کے ساتھ رومی کرتے چلے آئے ہیں، وہی بدسلوکیاں وہ بھی ان سے نہ کرنے لگیں۔ جس قوم کا حال یہ ہو وہ محاربین پر اعتبار کیسے کر سکتی تھی اور یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس نے عربوں یا رومیوں سے جنگ کی ہوگی۔ اس سے واضح ہو گیا کہ مصر میں جنگ صرف عربوں اور رومیوں ہی کے درمیان ہوئی تھی۔ جب عربوں نے رومیوں پر فتح پالی تو انہیں مصر سے نکال کر ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس حقیقت کے پیش نظر ان رومیوں کے مقابلے میں جو عربوں سے لڑے اور شکست کھائی، مصر بزور شمشیر فتح ہوا، لیکن ان مصریوں کے مقابلے میں، جو عربوں سے جنگ آزمانہ ہوئے، اس کی تسخیر، طاقت وقوت کا نتیجہ قرار نہیں دی جا سکتی۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ فتح اسکندریہ کے بعد اخنا، بلہیب، برلس اور دمیاط نے کس طرح بغیر کسی مقاومت کے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور تنیس کی جنگ وفتح میں مصریوں نے عربوں کا کیسا ساتھ دیا تھا۔ اہل مصر آخر عربوں سے کیوں لڑتے، یا انہیں اپنے ملک سے نکالنے کی کوشش کیوں کرتے جب کہ رومیوں نے اپنے زمانہ حکومت میں کوئی مصری فوج تیار نہ کی تھی اور اہل مصر سے

Marfat.com

تمام ہتھیار چھین کر انہیں بالکل نہتا کر دیا تھا کہ وہ حصول آزادی کے لیے کہیں بدیسی حکومت کے خلاف بغاوت نہ کر دیں۔ اس لیے بالکل فطری تھا کہ جوں ہی عربوں نے مصر میں رومیوں پر غالب آ کر انہیں وہاں سے نکالا، اہل مصر نے عربوں کی اطاعت قبول کر لی۔ جب یہ ہو گیا تو اسلام کی طرف سے فاتحین پر فرض قرار پایا کہ وہ قبطیوں کو قبول اسلام کی دعوت دیں تاکہ حقوق و فرائض میں وہ مسلمانوں کے برابر ہو جائیں اور اگر اپنے دین ہی پر قائم رہنا چاہیں تو اپنی حفاظت کے معاوضے میں مسلمانوں کو جزیہ ادا کریں۔ یہ تھی وہ رائے، جو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کے خلاف اختیار کی جن کا خیال تھا کہ ملک مسلمانوں میں تقسیم ہو جانا چاہیے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بھی اس رائے کو پسند فرمایا، اور مصریوں نے بھی اسے بخوشی تسلیم کر لیا۔ اس طرح مصر کی تقسیم، جہاں تک رومیوں کا تعلق ہے، بزور شمشیر، اور جہاں تک مصریوں کا تعلق ہے ازراہ مصالحت تکمیل کو پہنچی۔

وہ کونسی صلح ہے جسے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے پسند فرمایا اور اہل مصر نے بخوشی تسلیم کیا؟ اس بارے میں بہت سی روایات ہیں، لیکن ہم اطمینان و اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس صلح کے مطابق تھی جسے ہرقل نے مسترد کر دیا تھا، اور جس کی شرطیں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور مقوقس کے درمیان اس وقت طے پائی تھیں، جب مسلمانوں نے قلعہ بابلیون کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ علامہ طبری نے اس عہد نامے کی عبارت یہ نقل کی ہے:

"بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"

یہ وہ امان ہے جو عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اہل مصر کو ان کے جان و مال، ان کے مذہب، ان کے کلیساؤں اور صلیبوں اور ان کی خشکی و تری کے سلسلے میں دی ہے۔ ان میں سے کسی چیز میں دخل دیا جائے گا، نہ ان میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ اہل نوبہ کو مصریوں کے ساتھ آباد کیا جائے گا۔ اس کے بدلے اہل مصر اس صلح کو تسلیم کر لینے کے بعد جزیہ ادا کریں گے اور نہر کی توسیع کے سلسلے میں پانچ لاکھ درہم الگ دیں گے۔ اس کے علاوہ چوروں کا تاوان بھی انہیں کے ذمے ہوگا۔ اگر کوئی شخص اس کی ادائی سے گریز کرے گا تو اس کے حصے کی رقم جزیے میں شامل کر دی جائے گی۔ انکار کرنے والے کی ذمہ داری سے بری ہوں گے۔ اگر نہر کا کام تکمیل کو پہنچنے سے پہلے ہی رک جائے گا تو اس کے بقدر رقم چھوڑ دی جائے گی۔ اگر کوئی رومی یا نوبی اس معاہدے میں شامل ہونا

Marfat.com

چاہے تو اس کے حقوق و فرائض بھی وہی ہوں گے جو قبطیوں کے ہوں گے۔ اگر کوئی شخص اسے تسلیم نہ کرے اور یہاں سے جانا چاہے تو جب تک وہ اپنی منزل مقصود پر نہ پہنچ جائے یا ہماری حدود حکومت سے نہ نکل جائے، محفوظ و مامون ہوگا۔ ان لوگوں کو سہ گانہ رقم میں سے ایک رقم بطور جزیہ ادا کرنی ہوگی۔ یہ ہیں اس عہد نامے کی شرائط جن کی ذمہ داری اللہ، اس کے رسول ﷺ، امیر المومنین اور دوسرے تمام مسلمانوں پر ہے۔ اہل نوبہ میں سے جو لوگ اس عہد نامے کو تسلیم کریں گے، وہ اتنے اتنے بار برداری کے جانوروں اور اتنے اتنے گھوڑوں سے مسلمانوں کی اعانت کریں گے اور اس کے معاوضے میں ان کی درآمدی و برآمدی تجارت پر کوئی پابندی نہ لگائی جائے گی۔ زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے دو بیٹے، عبداللہ اور محمد اس کے گواہ ہیں۔ یہ عہد نامہ وردان نے لکھا اور گواہی دی۔''

ہم نے کہا ہے، یہ عہد نامہ اس صلح نامے کے مطابق ہے جس کی شرطیں ابن عاص رضی اللہ عنہ اور مقوقس کے درمیان طے ہوئی تھیں، یہ نہیں کہا کہ یہ وہی صلح نامہ ہے۔ اس لیے کہ جو عبارت علامہ طبری نے درج کی ہے وہ طرفین کا معاہدہ نہیں، دور حاضر کے ماہرین قانون کی اصطلاح میں یک طرفہ صراحت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اہل مصر نے اس عہد نامے کے اعلان کے بعد اسے قبول کر لیا تھا اور اس میں شامل ہو گئے تھے، لیکن یہ قبولیت اس کی قانونی حیثیت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔ اس لیے کہ یہ ایک ایسی سرزمین کو فتح کرنے والے کا لکھوایا ہوا عہد نامہ ہے، جس کے باشندوں نے مقابلہ نہیں کیا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اس سرزمین کے رہنے بسنے والوں کی آزادی، مذہب اور مال و اسباب کی حفاظت کے عوض ان کے فرائض کی تجدید و تعیین کر کے انہیں مطمئن کر دیا جائے۔ اس قسم کے معاہدے کو قبول کرنا دراصل خطرے سے بچنے کے لیے بالا دست قوت کے حکم کی تعمیل کرنا ہے، جسے قانونی اعتبار سے ''رضا مندی'' نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ قانون میں رضا مندی کا مفہوم یہ ہے کہ رضا مندی ظاہر کرنے والے کو پسند و ناپسند کا اختیار حاصل ہو۔ جس معاہدے کی شان یہ ہو وہ قانونی طور پر اس صلح نامے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، جو محاصرہ بابلیون کے دوران میں ابن عاص رضی اللہ عنہ اور مقوقس کے درمیان طے پایا تھا اور جسے بعد کو ہرقل نے مسترد کر دیا تھا۔ مقوقس کی یہ صلح طرفین کے درمیان ہوئی تھی اور اس میں جو باتیں طے کی گئی تھیں، ان کا ذکر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے اس امان نامے میں نہ تھا، جس کا اعلان اہل مصر

Marfat.com

میں اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ اسے قبول کرلیں۔ بٹلر نے اس صلح کی شرطیں حنا نقیوسی سے نقل کی ہیں اگر چہ ان کی ترتیب وہ نہیں رکھی جو اس قبطی مؤرخ کی کتاب میں درج تھی۔ ان شرطوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صلح فاتح مسلمانوں اور مفتوح رومیوں کے درمیان ہوئی تھی اور اس کا تعلق پورے مصر سے تھا۔ اس میں قرار پایا تھا کہ رومی مصر سے اس طرح چلے جائیں گے کہ نہ کبھی واپس ہوں گے نہ اسے دوبارہ فتح کرنے کی کوشش کریں گے۔ جس دن ہرقل اس صلح نامے کو منظور کرے گا، اس کے گیارہ مہینے کے اندر اندر انخلاء مکمل ہو جائے گا۔

رومی وفائے عہد کی ضمانت کے طور پر اپنے ڈیڑھ سو فوجی سپاہی اور پچاس شہری مسلمانوں کے پاس رہن رکھیں گے اور عرب التوائے جنگ کی مدت میں اپنی جگہ رہیں گے، لڑائی چھیڑنے کی کوشش نہ کریں گے۔ یہودیوں کو اسکندریہ میں رہنے کی اجازت دی جائے گی۔ مسلمان مسیحی کلیساؤں پر قبضہ کرنے اور عیسائیوں کے معاملات میں دخل دینے سے باز رہیں گے اور ادائے جزیہ کے سلسلے میں مصر کے قبطیوں اور دوسرے باشندوں کے درمیان کوئی تفریق نہ کی جائے گی۔ اس معاہدے اور اس امان نامے میں زمین آسمان کا فرق ہے، جس کا اعلان صرف ایک فریق کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس معاہدے کی غرض تو یہ تھی کہ مسترد کردہ تجویز کے مطابق حالت جنگ کا تصفیہ کیا جائے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رومی مصر کو عربوں کے لیے چھوڑ دیں گے اور عرب رومیوں سے وعدہ کریں گے کہ یہودیوں کو پایہ تخت سے نہیں نکالا جائے گا۔ عیسائیوں کے معابد وعقائد کا احترام کیا جائے گا اور جزیے میں مصری اور غیر مصری کی تمیز نہیں ہوگی۔ لیکن اس امان نامے سے رومیوں کا کوئی واسطہ نہیں، نہ اس میں مسلمانوں نے رومیوں سے کوئی وعدہ کیا ہے۔ اس لیے اگر بٹلر یہ کہتا ہے کہ امان نامہ، معاہدے سے مختلف نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں تو غلطی کرتا ہے۔

البتہ امان میں جزیے کے متعلق کوئی صراحت نہ تھی کہ وہ مصر کے باشندوں پر کس طرح عائد کیا جائے گا۔ مؤرخین متفق ہیں کہ جزیہ صرف بالغ مردوں پر دو دینار فی کس کے حساب سے لگایا گیا تھا، بچے عورتیں، غلام لب گور بوڑھے، اپاہج لوگ اور نابالغ لڑکے اس سے مستثنیٰ تھے، صاف ظاہر ہے کہ یہ جزیہ انسانوں پر تھا اور اس کا زمین کے لگان سے کوئی تعلق نہ تھا، جو زمیندار کو پیداوار کے مطابق دینا پڑتا ہے۔ علامہ بلاذری عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

Marfat.com

''ابن عاص رضی اللہ عنہ'' نے ہر بالغ مرد پر دو دینار جزیہ لگایا، لیکن فقیر اس سے مستثنیٰ تھے اور زمین کے مالکوں پر دو دیناروں کے علاوہ مسلمانوں کی خوراک کے لیے تین اردب گیہوں، دو قسط تیل، دو قسط شہد اور دو قسط سرکہ مقرر کیا جو دارالرزق میں جمع کر کے تقسیم کیا جاتا تھا۔'' گیہوں، تیل، شہد اور سرکہ کی اس مقررہ مقدار کے سلسلے میں قطعیت سے یہ کہنا مشکل ہے کہ اسے جزیے میں محسوب کیا جاتا تھا یا لگان میں۔ علامہ بلاذری، عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرنے کے بعد ایک روایت بیان کرتے ہیں جو یزید بن ابی حبیب کی طرف منسوب ہے کہ: ''مصر کے اہل جزیہ سے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت میں صلح اول کے بعد ایک اور صلح کی گئی، جس میں ان پر تیل، شہد اور سرکے کی جگہ دو دینار پر دو دینار فی کس اضافہ کیے گئے۔ اس طرح ہر شخص پر چار دینار ہو گئے۔ اس پر وہ راضی ہو گئے اور سب نے اسے پسند کیا۔''

بعض روایات میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ اہل مصر پر ان کی مالی حیثیت کے مطابق جزیہ عائد کیا جائے۔ چنانچہ مالداروں پر چار دینار، درمیانی طبقے پر دو دینار اور باقی سب پر ایک دینار فی کس جزیہ لگایا گیا، اور یہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا وہ اجتہاد ہے جس کی تقلید بعد کو بھی کی گئی۔ امام یوسف رحمۃ اللہ علیہ کتاب الخراج میں فرماتے ہیں: ''جزیہ تمام ذمیوں پر فرض ہے......... اور عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر ہر مرد کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ مالداروں سے اڑتالیس درہم، متوسط الحال لوگوں سے چوبیس درہم اور غریبوں، کسانوں اور مزدوروں سے بارہ درہم سالانہ جزیہ وصول کیا جاتا ہے۔'' حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے مصر میں معاہدہ امن کی تشہیر کرا دی اور اہل مصر اسے قبول کر کے اس میں شامل ہو گئے۔ اب ابن عاص کے لیے وقت آیا کہ وہ جنگ کی سیاست چھوڑ کر امن کی سیاست اختیار کریں۔ اس میں شک نہیں کہ جنگ کے دوران میں ابن عاص رضی اللہ عنہ نے مصلحتاً بعض ایسی تدبیروں کو جامہ عمل پہنایا تھا، جن میں رومیوں اور ان کا ساتھ دینے والے مصریوں کے خلاف شدت و سنگ دلی پائی جاتی تھی، لیکن اس پر انہیں کوئی ملامت نہیں کی جا سکتی۔ جنگ بہر حال جنگ ہے اور اپنے جنگ آزما لشکر کی سلامتی کا خیال رکھتے ہوئے فتح و نصرت کی راہ ہموار کرنا ایک فرض شناس سپہ سالار کا اولین فرض سمجھا جاتا ہے، اس لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ ان دونوں مقصدوں کو حاصل کرنے کے لیے وہ شدت و سنگ دلی میں حد سے تجاوز نہ کرے، وہاں سب سے بڑے ایک اور مقصد کا حصول بھی اس پر لازم ہے اور وہ یہ ہے کہ ان دونوں مقصدوں کو پہنچنے میں جو چیز بھی اس کی راہ کا پتھر بنے اسے اکھاڑ پھینکے۔

Marfat.com

بہر حال جب مسلمانوں کو مکمل فتح حاصل ہوگئی اور رومی شکست کھا کر سرزمین مصر سے نکل گئے تو سپہ سالار کی مہم ختم ہو کر سیاست داں کی مہم شروع ہوئی۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ہر مرحلے پر ایک ایسے تجربہ کار سیاست داں ثابت ہو چکے تھے، جن کا وار کبھی خالی نہ جاتا تھا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ان کی اس بے نظیر صلاحیت سے بدرجہ اولیٰ واقف تھے، چنانچہ انہوں نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کو مصر کا والی بنا دیا اور ابن عاص رضی اللہ عنہ نے مصر کی سیاست اور اس کے انتظام میں وہ نمایاں کارنامے سرانجام دیئے، جن کے سامنے فتح مصر بھی ماند پڑ گئی۔ حالانکہ آپ دیکھ چکے ہیں کہ جنگی مقاصد میں بھی انہوں نے اس طرح کامیابی حاصل کی کہ وہ ایک ناقابل فہم معجزہ معلوم ہوتی ہے۔

اس سیاست پر گفتگو کرنے اور اس کی تفصیلات میں جانے سے پہلے مناسب ہوگا اگر ہم اس کی طرف اجمالی اشارہ کر دیں، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے ان اسباب کے ازالے کی سوچی، جنہوں نے مصریوں کو آتش زیر پا بنا رکھا تھا اور جن کی بنا پر وہ رومیوں کے خلاف بغاوت کرتے رہتے تھے۔ لوگوں کی بے چینی اور اشتعال کا سب سے پہلا اور اہم سبب مذہبی استبداد تھا۔ چنانچہ سب سے پہلا حکم، جس کا اعلان حضرت عمرو بن عاص نے نوبہ سے اسکندریہ تک تمام لوگوں میں کرا دیا، یہ تھا کہ دین میں کوئی جبر نہیں ہے اور عقیدے کی آزادی ایک مقدس چیز ہے۔ اس لیے کسی شخص کی آزادی اور مال و دولت کو اس کے دین یا مذہب کی وجہ سے نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ جو کوئی یعقوبی یا ملکانی عقائد پر قائم رہنا چاہے رہ سکتا ہے اور جو کوئی ایک مذہب سے دوسرے مذہب یا ایک فرقے سے دوسرے فرقے میں جانا چاہے جا سکتا ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑے گی۔ البتہ جو کوئی اسلام قبول کرلے گا وہ مسلمانوں کے حقوق و فرائض میں برابر کا شریک ہو جائے گا۔ اس پالیسی کو ایسی بالغ النظری کے ساتھ روبہ عمل لایا گیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ ساویرس نے لکھا ہے کہ ملکانیوں کا اسقف مرتے مرتے اپنے مذہب پر قائم رہا اور کوئی اسے آنکھ بھر کے نہ دیکھ سکا۔ یعقوبیوں کا پادری بنیامین لوگوں کو دلیل و حجت سے اپنے مذہب کی طرف بلاتا تھا، لیکن کوئی اس کی راہ میں حائل نہ ہوا، کسی نے ان کی سرگرمیوں میں رکاوٹ نہ ڈالی۔ ملکانیوں اور یعقوبیوں کے کلیسا علیٰ حالہ قائم تھے، جن میں مراسم عبادت ادا کیے جاتے تھے اور کسی کی یہ جرات نہ تھی کہ مسیحی معاہدے کے وقار کو ٹھیس پہنچاتا یا ان دونوں میں سے کسی ایک فرقے کے آدمی کو اس کی مرضی کے خلاف مجبور کر سکتا۔ اب آپ خود بہ آسانی اندازہ

Marfat.com

کر سکتے ہیں کہ مذہبی استبداد کی تلخیاں سہنے اور اختلاف عقائد کے جرم میں مسلسل دس برس تک دھتکار، پھٹکار اور عذاب وجلا وطنی کے مظالم برداشت کر چکنے کے بعد، مصریوں پر اس سیاست کا کیا اثر پڑا ہوگا۔

عوام کو یہ دیکھ کر فاتحین کی حکومت پر مزید اطمینان ہوگیا کہ وہ غضب وشکایت کے ایک اور سبب کا ازالہ بھی کر رہے ہیں، جو اشتعال انگیزی میں پہلے سبب، مذہبی استبداد سے کسی طرح کم نہ تھا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ان پر ٹیکسوں کا بوجھ ہلکا کر دیا اور تمام امتیازی خطوط مٹا دیئے جو رومیوں نے اہل مصر پر قائم کر دیئے تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ رومی جزیے کے علاوہ اور بھی طرح طرح کے ٹیکس مصریوں سے وصول کرتے تھے، جن میں سے اکثر غیر منصفانہ تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ بعض طبقوں اور گروہوں کو جزیے اور ٹیکس کی ادائیگی سے معاف رکھا گیا تھا اور اس معافی سے ثمر اندوز ہونے والوں میں اہل اسکندریہ کا نمبر سب سے اُونچا تھا۔ چنانچہ جب حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے غیر منصفانہ ٹیکس ختم کیے اور ان کی ادائیگی میں کسی قسم کا امتیاز باقی نہ رکھا تو یہ مساوات اور یہ بوجھ کی کمی ابن عاص رضی اللہ عنہ کی سیاست کی مقبولیت کا سبب بن گئی اور اس مساوات سے جن جاہ پرستوں کے حقوق پر زد پڑتی تھی، ان کی ناراضگی بھی اس کے حسن قبول میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کرسکی۔ اس اجمالی اشارے میں یہ دو باتیں بیان کر دینے کے بعد اگر ہم اس میں صرف اتنا اضافہ اور کر دیں کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے عدل واصلاح کو مصر میں اپنی سیاست کا سنگ بنیاد بنایا تھا تو بڑی آسانی سے ہماری سمجھ میں آجائے گا کہ مصر میں یہ سیاست کتنی تیزی سے کامیاب ہوئی ہوگی اور اس نے مسلمانوں کی زندگی اور اسلامی سلطنت کی سیاست میں کتنا اہم مقام حاصل کیا ہوگا؟

آپ کا کیا خیال ہے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو اپنی حکومت کا مستقر اور اپنے اقتدار وسیاست کا مرکز کہاں بنانا چاہیے؟ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لیے اسکندریہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہوسکتی۔ جب سے سکندر نے اسے آباد کیا ہے، وہی مصر کا دارالسلطنت چلا آرہا ہے۔ پھر وہ ایک ایسا عظیم الشان شہر ہے، جس کے جمال وعظمت کا مقابلہ دنیا کا کوئی شہر نہیں کرسکتا اور اس میں وہ محل ہیں جو بطلیموسی تاجداروں اور رومی حکام کی اقامت گاہ تھے، چنانچہ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا تھا اور اسکندریہ کو اپنا پایہ تخت بنانے کی اجازت

Marfat.com

چاہی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاصد سے پوچھا: ''میرے اور مسلمانوں کے درمیان دریا تو حائل نہیں ہوگا؟'' قاصد نے جواب دیا: ''امیر المومنین! طغیانی کے وقت دریائے نیل حائل ہوگا!''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں، یہ کسی طرح گوارا نہ فرماتے تھے کہ مفتوحہ ممالک میں ان کے اور مسلمانوں کے درمیان دریا حائل ہو، اس لیے انہوں نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کو لکھا: ''میں مسلمانوں کا کسی ایسی جگہ قیام پسند نہیں کرتا، جہاں گرمی یا سردی میں میرے اور ان کے درمیان دریا حائل ہو۔'' جب یہ مکتوب ابن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا تو امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی مرضی کے مطابق اس سے بہتر جگہ کوئی نہ پائی جو قلعہ بابلیون کے جوار میں تھی۔ یہ مقام دریا کی اہم گزرگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ نیل کی ان شاخوں کے سنگم پر واقع تھا جو ڈیلٹا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ علاوہ بریں وہ منف کے بھی قریب تھا، جو فراعنہ کے عہد میں مصر کا پایہ تخت رہ چکا تھا، پھر اس کے اور حجاز کے درمیان کوئی دریا بھی حائل نہ تھا اور حضرت عمر جب چاہتے، اپنے اونٹ پر سوار ہو کر دریا عبور کیے بغیر اس تک پہنچ سکتے تھے۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے قلعہ بابلیون کے اثنائے محاصرہ میں اس کے قریب ایک خیمہ نصب کر لیا تھا، جسے ان کے ساتھی ''قبہ فسطاط''[1] کے نام سے پکارتے تھے۔ جب ابن عاص رضی اللہ عنہ نے قلعہ فتح کر لیا، اور اسکندریہ جانے پر کمر باندھی تو خیمہ اکھاڑنے کا حکم دیا، لیکن وہاں ایک کبوتر نے بچے دے رکھے تھے۔ ابن عاص نے کہا: ''اس نے ہمارے ساتھ رہ کر حرمت قائم کر دی ہے!'' اور حکم دیا کہ جب تک بچے نہ اُڑ جائیں خیمہ نہ اُکھاڑا جائے! اس کے بعد جب وہ اسکندریہ سے واپس ہوئے تو فوج کو خیمے کے قریب پڑاؤ ڈالنے اور اس کے گرد مکان بنانے کا حکم دیا۔ اس طرح شہر کی بنیاد پڑی اور وہ مختلف عربی محلوں میں تقسیم ہو گیا جن کی تعمیر قبطیوں نے کی۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے خیمے کی جگہ اور اس کے چاروں طرف باغوں اور انگور کی بیلوں کے درمیان ایک مسجد بنوائی اور جب تک سمت قبلہ کا تعین نہ ہو گیا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہیں کھڑے رہے۔ اس کے بعد مسجد میں ایک منبر بنوایا جس پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو

---

① لسان العرب میں ہے کہ فسطاط مختلف بستیوں کے اس مقام اجتماع کو کہتے ہیں جو مسجد جامع کے گرداگرد واقع ہو اور اس سلسلے میں چھ لغت درج کیے ہیں جن میں سے ایک ''فسطاط'' ہے۔ سب کے ذکر کی ضرورت نہیں اور بعض علماء کا خیال ہے کہ فسطاط ایک بیزنطینی لفظ Fossatum سے ماخوذ ہے، جس کے معنی لشکر یا قلعہ بند شہر کے ہیں، عربوں نے یہ لفظ شام و مصر میں سُنا اور اسے اپنی لغت میں شامل کر لیا۔

جب اس کی اطلاع ہوئی تو ابن عاص رضی اللہ عنہ کو خط لکھا: ''اما بعد! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے ایک منبر بنوایا ہے جس پر مسلمانوں سے اونچے ہو کر بیٹھتے ہو۔ کیا یہ اعزاز تمہارے لیے کافی نہیں کہ تم امیر کی حیثیت سے کھڑے ہو کر تقریر کرو اور باقی مسلمان ماتحت کی حیثیت سے تمہارے قدموں میں بیٹھے ہوں۔ میں تاکید کرتا ہوں کہ منبر توڑ ڈالو!'' اور ابن عاص رضی اللہ عنہ نے منبر توڑ دیا۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے لیے بھی ایک مکان بنوایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا: ''ہم نے مسجد جامع کے قریب آپ کے لیے ایک مکان بنوایا ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ ''حجاز میں رہنے والے ایک آدمی کا مکان مصر میں کیسے ہو سکتا ہے؟'' اور حکم دیا کہ اسے مسلمانوں کے لیے بازار بنا دیا جائے۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے اس حکم کی بھی تعمیل کر دی۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے یہ کھلی جگہ پسند کر کے فسطاط کا شہر آباد کر دیا تاکہ مسلمان اہل مصر کو ان کے گھروں سے نکال کر ان پر خود قبضہ نہ کر لیں اور اس طرح ہر اس زیادتی سے دامن بچا لیا جو مصری عوام کے لیے بے چینی اور ناراضگی کا سبب بن سکتی تھی۔ ہو سکتا ہے اس سے ان کی مراد یہ بھی ہو کہ ایک اسلامی شہر بسا کر مسلمانوں کے لشکر سے رابطہ پیدا کیا جائے اور مسلمانوں کے خاندان اس شہر میں آباد ہو کر ایسا ماحول بنا لیں، جس میں اپنے ڈھب کی زندگی بسر کر سکیں، بالکل اسی طرح جیسے بصرے اور کوفے کو آباد کر کے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کیا تھا، لیکن ابن عاص رضی اللہ عنہ مصر کے والی تھے۔ انہوں نے جب اس شہر کو اپنا مستقر حکومت بنا لیا تو رونق و آبادی نے دوڑ کے اس کے قدم لیے۔ اہل مصر کے بہت سے گروہ مختلف گوشوں سے سمٹ سمٹ کے یہاں آئے اور جائیدادیں بنا کر رہنے لگے۔ جب شہر کا دامن پھیلا تو مسلمانوں نے شہر پناہ کے باہر ایک بستی بسائی اور اس کا نام عسکر رکھ کے کاروبار حکومت وہاں منتقل کر دیا۔ اس طرح شہر فسطاط سارے ملک کا دارالخلافہ بن گیا جس کی طرف صعید، زیرین مصر اور بحر روم و بحر قلزم کے ساحلی شہروں کی نگاہیں اٹھتی تھیں۔ چنانچہ اس کی وسعت و آبادی میں روز افزوں ترقی ہونے لگی اور آبادی کی کثرت نے اسے مرکز تجارت بنا کر وہاں کی زندگی کو چار چاند لگا دیئے۔ یہ دیکھ کر اسکندریہ اور منف کے سر برآوردہ لوگوں نے بھی فسطاط کا رخ کیا اور یہ منف کی تباہی کا پیش خیمہ تھا، جس کے بعد اس کی حیثیت ایک اثری قصبے سے زیادہ نہ رہی۔ اب اگر کبھی اس کا ذکر آتا بھی تھا تو فراعنہ مصر کی عظمت کے ذیل میں آتا تھا، جنہوں نے کئی ہزار برس پہلے اسے اپنا پایہ تخت

Marfat.com

بنایا تھا، اسی طرح اسکندریہ کی بھی ساری رونق خاک میں مل گئی اور اسے اپنے ساحلی محل وقوع اور عمرانی عظمت وجلال کے لحاظ سے دنیا کے تمام شہروں پر جو فضیلت حاصل تھی وہ اس سے چھن گئی۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے شہر فسطاط میں قیام فرمایا اور اپنی سیاسی پالیسی کے متعلق سوچ بچار کرتے رہے۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے عقیدے کی آزادی کو اپنی سیاست کا سنگ بنیاد بنایا تھا، چنانچہ جب قبطی راہبوں کو اس پالیسی کا علم ہوا اور اس کی صحت وصداقت میں انہیں کوئی شک وشبہ نہ رہا تو ان کی ایک بہت بڑی تعداد ان کلیساؤں سے نکل کر، جہاں مذہبی استبداد کے زمانے میں انہوں نے پناہ لی تھی، اطاعت کا اعلان کرتی ہوئی ابن عاص رضی اللہ عنہ کی طرف دوڑی۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ قبطیوں کو اسقف بنیامین سے غیر معمولی محبت وتعلق ہے اور جب سے اس نے صعید کے دور دراز علاقے کی طرف بھاگ کر صحرا میں رومیوں کی پناہ لی ہے، قبطیوں کی اس محبت اور تعلق خاطر میں اور بھی شدت پیدا ہوگئی ہے، اس لیے ان کی خواہش تھی کہ بنیامین اپنے مذہبی منصب پر واپس آجائے۔ انہوں نے تمام قبطیوں کو امان دے دی اور بنیامین کے متعلق خاص طور پر فرمایا: ''بوڑھے بطریق کو اپنی اور ان قبطیوں کی جان محفوظ سمجھتے ہوئے واپس آجانا چاہیے جو مصر یا غیر مصر میں آباد ہیں۔ انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے گی۔ نہ ان سے عہد شکنی کی جائے گی۔'' بنیامین کو عرب فاتح کے اس عہد کی اطلاع ملی تو وہ اپنے صحرائی مامن سے نکل کر اسکندریہ کی طرف روانہ ہوا۔ اسکندریہ میں قبطیوں نے ایک ظفر مند کی حیثیت سے اس کا استقبال کیا۔ ان کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی اور یہ خوشی ہر خوف، ہر تکدر سے پاک تھی۔ جب بنیامین اپنے پیروؤں میں اطمینان سے رہنے سہنے لگا تو ابن عاص رضی اللہ عنہ نے اسے بلایا اور اس کے ساتھ نہایت عزت وتکریم سے پیش آئے۔ بنیامین نے ان سے گفتگو کی وقار وتحمل کے ساتھ اس کے لہجے میں بڑی نرمی اور شیرینی تھی۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ کے دل پر اس کا اثر ہوا اور انہوں نے قبطیوں کی مذہبی سیادت بنیامین کے سپرد کردی کہ وہ جس طرح چاہے ان کی مذہبی رہنمائی کرے۔ قبطی بطریق بھی مسلمان فاتح کے حضور سے انتہائی مسرور ومطمئن واپس ہوا اور اسکندریہ پہنچ کر اس نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کے گن گانے شروع کردیئے۔ وہ اپنے عقیدت مندوں سے کہتا تھا: ''میں اپنے شہر اسکندریہ واپس ہوا اور دیکھا کہ یہاں ہر طرح کا امن وامان ہے، اللہ نے کافروں کے جبر واستبداد کی لعنت ہمارے سروں سے دور کردی ہے۔''

Marfat.com

جتنا جتنا وقت گزرتا گیا، بنیامین کے جذبات تشکر و امتنان میں اضافہ ہوتا گیا۔ انجام کار تمام قبطی اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور اپنے مذہبی مراسم بے کھٹکے ادا کرنے لگے۔ بنیامین نے ان کے کلیساؤں کی اصلاح اور ان کی عبادت گاہوں کا دورہ کیا۔ وہ جہاں کہیں جاتا عقیدت مندوں کا ہجوم کھجور کی چھڑیاں اور عودوان ہاتھ میں لیے ایک جلوس کی صورت میں اس کے ساتھ ہوتا۔ دوبارہ آزادی ملنے سے قبطی کتنے مسرور تھے، اس کا اظہار ساویرس ان الفاظ میں کرتا ہے:

''وہ اتنے خوش تھے جیسے بکری کا بچہ جس کی رسی کھول کر اسے ماں کے تھنوں سے دودھ پینے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہو!''

حنا نقیوسی مسلمانوں سے کتنا بغض رکھتا تھا اور ان میں کیڑے ڈالنے کی کیسی کیسی کوششیں کرتا تھا، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اس کے باوجود ابن عاص رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھتا ہے، انہوں نے تسلیم کردہ ٹیکسوں کی وصولی میں بڑا تشدد برتا۔ لیکن کلیساؤں کی ملکیت پر ہاتھ نہ ڈالا نہ چھینا جھپٹی اور لوٹ مار کو اپنا طریقہ بنایا، بلکہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک کلیساؤں کی حفاظت و حمایت کرتے رہے۔ حنا نے مصریوں کا یہ قول بھی نقل کیا ہے: ''رومی سرزمین مصر سے اس لیے نکالے گئے اور مسلمان ان پر اس لیے فتح یاب ہوئے کہ ہرقل نے انسانیت سوز گناہوں کا ارتکاب کیا تھا اور قیرس کے ذریعے قبطیوں اور ان کے مذہب پر بے انتہا ظلم ڈھائے تھے۔ مصر میں رومیوں کی ناکامی اور مسلمانوں کی کامرانی کا یہی سبب ہے!'' ملکانی فرقے سے تعلق رکھنے والے مصری اور وہ رومی بھی، جنہوں نے مصر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ قبطیوں کے مقابلے میں مذہبی آزادی سے کچھ کم بہرہ یاب نہ تھے۔ یعقوبیوں کی طرح ابن عاص رضی اللہ عنہ کی حمایت انہیں بھی حاصل تھی۔ یہ صحیح ہے کہ یعقوبیوں کی نسبت ملکانیوں کی تعداد کم تھی اور ان میں سے بھی بیشتر قبطی، جنہوں نے دور استبداد میں ملکانی عقائد قبول کر لیے تھے، مذہبی آزادی کا زمانہ آتے ہی اپنے پہلے مذہب کی طرف لوٹ گئے تھے انہوں نے اپنے قدیم پیشوا کا دامن تھام کر ساویرس کے الفاظ میں: ''تاج اعتراف، اسی کے ہاتھ سے حاصل کیا تھا، لیکن کچھ قبطی ایسے بھی تھے جو ملکانی عقائد اختیار کر لینے کے بعد ان پر جمے رہے اور اسلامی حکومت نے انہیں تبدیلی مذہب پر مجبور نہ کیا۔ اس لیے فتح مصر کے پچاس برس بعد تک مصر میں ملکانیوں کی ایک خاصی بڑی تعداد باقی رہی اور آگے چل کر جو اس میں کمی ہوئی وہ اس وجہ سے کہ مصریوں نے تو یہ محسوس کیا کہ اجتماعی رشتے جماعت کا مذہب قبول کرنے کے متقاضی ہیں

Marfat.com

اور مصر کے رومیوں نے یہ بہتر سمجھا کہ مصر والوں سے گھل مل جائیں، چنانچہ انہوں نے اکثریت کا مذہب قبول کر لیا یا حاکموں کا۔

اس مذہبی آزادی کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے رومی اور مصری دانش مندوں کو مختلف مذاہب پر غور کرنے کا موقع مل گیا اور ان میں سے اکثر اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ انہوں نے مسیحی فرقوں کے باہمی جھگڑے اور عیسائیوں کی ایک دوسرے پر دراز دستیاں دیکھیں اور مسیحیت سے بیزار ہو کر عقلی آزادی کی روشنی میں ایک ایسے عقیدے کی راہ تلاش کرنے لگے، جسے وہ اپنی مرضی سے اختیار کر سکیں اور اپنے اس ابتدائی دور میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب تھا، جو کائنات کو ہر قید سے آزاد ہو کر دیکھنے کی دعوت دیتا تھا اور اس وقت تک ہر قسم کی گروہ بندیوں سے پاک تھا۔ اس کے ماننے والے اس نفرت انگیز تعصب سے بالکل ناآشنا تھے جو ایک فرقے کو دوسرے فرقے سے پھاڑ دیتا ہے۔ اس کے برعکس ہر صاحب عقل و بصیرت کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھلا تھا اور قرآن کریم کی اعلیٰ و ارفع تعلیمات دلوں کو اپنی طرف کھینچ کر انہیں ایمان و اطمینان کی دولت سے مالا مال کر دیتی تھیں۔ اگر اسے صحیح بھی مان لیا جائے کہ اس زمانے میں جن مصریوں نے اسلام قبول کیا، مسلمانوں کے ہم سطح ہو جانے کے لالچ میں قبول کیا تو بھی یہ بات اہل مصر کی ایک بہت ہی کم تعداد پر صادق آتی ہے، ورنہ ان کی اکثریت تو خوب سوچ سمجھ کر از راہ ایقان و اذعان اسلام کے حلقہ اثر میں آئی تھی۔ اس میں تعجب ہونا بھی نہ چاہیے، اس لیے کہ انسان میں مذہبی عقیدے کی حفاظت کا جذبہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ اس قسم کی مصلحت اسے نہیں ہلا سکتی۔ بٹلر اس سلسلے میں کہتا ہے:

''یہ کہنا بعید از انصاف ہوگا کہ جس قبطی نے بھی اسلام قبول کیا، دنیا اور اس کی آسائش و آرائش کے لیے کیا۔ اگر ان میں سے کوئی اس لالچ میں مسلمان ہوا بھی تھا کہ فاتحین اسلام کے برابر ہو جائے، جو مراعات انہیں حاصل ہیں اسے بھی مل جائیں اور وہ جزیے کی مصیبت سے چھٹکارا پا لے تو اس قسم کا لالچ صرف اسی شخص کو ڈگمگا سکتا ہے جس کا ایمان ناپختہ ہو، لیکن حقیقت، ناگوار اور تلخ حقیقت یہ ہے کہ اکثر پختہ رائے لوگ مسیحیت سے اس لیے نفرت کرنے لگے تھے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اللہ سے محبت کرنے اور اس کی رحمت سے مایوس نہ ہونے کا حکم دیا تھا۔ عیسائیوں نے نہ صرف یہ کہ اس کی پرواہ نہ کی، بلکہ اسے فراموش کر کے فرقہ ورانہ فتنہ و فساد کے شعلے بھڑکانے شروع کر دیئے۔ یہ حقیقت جب ان دانش مندوں پر اچھی طرح واضح ہو گئی تو وہ اسلام کی پناہ میں

Marfat.com

چلے گئے اور اس کا دامن امن و عافیت تھام کر سکون واطمینان اور سادگی و بساطت کے سائے میں آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔''①

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے عقیدے کی آزادی کے تحفظ واحترام اور ٹیکسوں کی وصولی، اصلاحی کاموں کی تکمیل اور عدل وانصاف کی اقامت کے سلسلے میں ایک پالیسی مرتب فرما کر اپنے ماتحت افسروں کو بطور خاص تاکید کردی کہ اسے بہر قیمت روبہ عمل لائیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ افسر عرب تھے یا مصری یا ان کے سوا کوئی اور؟ فتح ونصرت کا فطری مقتضا تھا کہ لشکر کی امارت کسی غیر مسلم کے سپرد نہیں ہونی چاہیے۔ امان نامے میں بھی مصر اور اس کے باشندوں کی حمایت وحفاظت کا فرض مسلمانوں پر عائد کیا گیا تھا۔ اس لیے فوجوں کی امارت بھی لازماً انہیں لوگوں کو ملنی چاہیے جو حمایت وحفاظت کے ذمہ دار بنائے گئے تھے۔ اس کے علاوہ رومیوں کے عہد حکومت میں مصر کی اپنی کوئی فوج نہ تھی۔ اہل مصر کو صرف پولیس میں بھرتی کیا گیا تھا، جو ملک کے داخلی انتظام کی کفیل ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے بھی انہیں اپنی سابقہ خدمات پر بحال رہنے دیا اور فوج، اس کے عہدے اور ہتھیار صرف اپنے لیے مخصوص رکھے، جس میں کسی دوسرے کو مطلقاً دخل واختیار حاصل نہ تھا۔ چونکہ ان مسلمانوں کو ہمیشہ ملکی دفاع کے لیے پابہ رکاب رہنا پڑتا تھا، اس لیے شروع شروع میں انہیں زمینیں حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ ان کی اور ان کے اہل وعیال کی ضروریات کے مطابق تنخواہیں مقرر کردی گئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سارے عہد خلافت میں اسی پر عمل ہوتا رہا۔ ابن عبدالحکم روایت کرتے ہیں کہ ابن مستور کے سوا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی شخص کو مصر کی زمین کا کوئی ٹکڑا نہیں دیا۔ ابن مستور ایک غلام تھے، جن کے ناک، کان، ان کے آقا نے کاٹ دیے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عنایت ومرحمت سے وہ آزاد ہوگئے اور جنگ کے ناقابل قرار دے دیے گئے۔ عہد رسالت کے بعد خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ کی سرپرستی ونگرانی میں رہتے رہے۔ جب مسلمانوں کو مصر میں قرار واطمینان نصیب ہوگیا تو یہ امتناعی حکم بھی واپس لے لیا گیا اور انہیں زمین خریدنے کی اجازت مل گئی، دوسرے لوگوں کی طرح مسلمان بھی اپنی اپنی زمینوں کا لگان دیتے تھے۔ اس طرح زمین کے مالکوں کی تبدیلی اور ان کے مسلمان یا قبطی ہونے کی وجہ سے زمین کے لگان میں کوئی کمی بیشی نہ ہوئی۔

① بٹلر، عربی ترجمہ ص385

Marfat.com

اسلامی لشکر کا گزارہ صرف انہی تنخواہوں پر نہ تھا جو انہیں جزیے کی وصول شدہ رقموں میں سے دی جاتی تھی بلکہ مصریوں پر بھی ان کی سہ روزہ ضیافت فرض تھی۔ اس کے علاوہ انہیں اس زمین پر بھی حقوق حاصل تھے جو رفاہ عام کے لیے ہر گاؤں میں چھوڑ دی جاتی تھی۔ اس کی شہادت اس خطبے سے ملتی ہے جو ابن عاص رضی اللہ عنہ نے ایک مجمع عام میں دیا تھا۔ خطبے میں ہے:

''رعایا کی بہبود رائی کا فرض ہے۔ پس اللہ کے فضل و برکت کی طرف آؤ اور اپنی سر سبز و شاداب زمینوں سے ان کی پیداوار اور دودھ، ان کی بھیڑیں اور شکار حاصل کرو۔ اپنے گھوڑوں کو چراگاہوں میں چرا کر تنومند بناؤ۔ ان کی دیکھ بھال کرو اور ان کا بطور خاص خیال رکھو کہ وہ تم کو تمہارے دشمنوں سے بچاتے ہیں اور انہیں کے ذریعے تم مال غنیمت حاصل کرتے ہو...... سن رکھو! میں انسانوں کی طرح گھوڑوں کا بھی نگران ہوں۔ جس نے بغیر کسی وجہ کے اپنے گھوڑے کو بھوکا مارا تو اس کے بقدر اس کا وظیفہ کم کروں گا۔ واضح رہے کہ تمہیں قیامت کے دن تک پاؤں پھیلا کر بیٹھنا نصیب نہ ہوگا۔ تمہارے چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہیں، وہ سدا تمہاری تاک میں رہیں گے اور تمہارا گھر جو پیداوار اور دولت اور روز افزوں خیر و برکت کا خزانہ ہے، ان کے دلوں کو ہمیشہ بے چین رکھے گا۔''

فوج، اس کی امارت اور اس کے ہتھیاروں کی بات تو یہ ہوئی، لیکن غیر فوجی مناصب ابن عاص رضی اللہ عنہ نے اکثر و بیشتر انہی رومیوں کے پاس رہنے دیئے جو فتح مصر سے پہلے اپنی حکومت کی طرف سے ان عہدوں پر مامور کیے گئے تھے اور جنہوں نے اسلامی اقتدار کے بعد بھی اپنے ملک واپس ہونے کے بجائے، مصر ہی میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ ان میں سے اکثر رومیوں نے اسلام بھی قبول کر لیا تھا کہ حقوق و فرائض میں ان کی حیثیت مسلمانوں کے برابر ہو جائے، اسی طرح ابن عاص رضی اللہ عنہ نے مناس کو زیرین مصر کا حاکم مقرر کیا، جہاں وہ ہرقل کے زمانے میں حکمران تھا اور اس کے دوسرے ابنائے جنس کو بعض اور صوبوں کی حکوت تفویض کی، جو عہدے ذرا کم حیثیت کے تھے، وہ بھی انہیں رومیوں کو دیئے گئے جو مصر سے نہیں گئے تھے، البتہ جن رومی عہدہ داروں نے اجنبی حکومت کی رعایا بننا گوارا نہ کیا اور مصر چھوڑ کر چلے گئے ان کی جگہ قبطیوں کو دے دی گئی۔ فتح مصر کے ابتدائی زمانے میں ابن عاص رضی اللہ عنہ اس کے سوا کوئی پالیسی اپنا ہی نہ سکتے تھے۔ اس لیے کہ یہ بالکل وہی پالیسی تھی جو مسلمانوں نے عراق و شام میں اختیار کی تھی اور جس کی ضرورت ان

Marfat.com

ملکوں سے کہیں زیادہ مصر میں تھی۔ عرب اہل مصر کی زبان نہ جانتے تھے، نہ وہ عربی قومیت ہی انہیں ایک دوسرے سے مربوط کرتی تھی جو ظہور اسلام سے کئی صدی پہلے عراق و شام میں اپنی حکومت قائم کر چکی تھی۔ اس کے علاوہ جو نظام کسی قوم میں برسوں سے قائم ہو، پلک جھپکتے میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا اور اس وقت تک اسے لازماً باقی رکھنا پڑتا ہے، جب تک وقت کے ساتھ ساتھ وہ از خود نئے زمانے کے سانچے میں نہ ڈھل جائے۔ چونکہ فتح مصر کے وقت صوبائی نظم و نسق رومی افسروں کے ہاتھ میں تھا، اس لیے ضرورت و مصلحت یہی تھی کہ انہیں ان کی خدمات پر بحال رہنے دیا جائے اور عرب فاتح دیدہ وری کے ساتھ حالات کا مطالعہ اور موقع و محل کے اعتبار سے نظام حکومت میں مناسب اور معتدل تبدیلیاں کرتا رہے تا کہ اہل ملک کو حکومت میں زیادہ سے زیادہ حصہ بھی مل جائے اور نظام میں ابھی کوئی ایسی برہمی پیدا نہ ہو جو حاکم و محکوم دونوں کے لیے یکساں پریشانی اور نقصان کا سبب بنے۔

ابن عاص رضی اللہ عنہ مصر کے ہر واقعے اور اپنے ہر اقدام کی اطلاع بارگاہ خلافت میں بھیجتے تھے، جب حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو یہ معلوم ہوا کہ بنیامین اپنی قوم میں بڑی حیثیت و منزلت رکھتا ہے تو انہوں نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ وہ مصر کی حکومت اور اس کے باشندوں کی آسائش کے لیے قبطیوں کے اس بطریق کی رائے سے فائدہ اُٹھائیں۔ بنیامین نے بھی مشورہ دینے میں بخل سے کام نہ لیا اور ابن عاص نے اس کا کھویا ہوا سارا اثر و نفوذ اسے بخش دیا۔ بنیامین کا مشورہ یہ تھا کہ زمین کی پیداوار کا خراج اس وقت وصول کیا جائے، جب لوگ اناج کاٹنے اور انگور نچوڑنے سے فارغ ہو جائیں۔ مصر میں جگہ جگہ نہریں کھودی جائیں، پلوں کی مرمت کی جائے اور ہر سال نہروں کی درستی ہو۔ عمال کو تنخواہیں وقت پر دی جائیں تا کہ وہ رشوت نہ لیں۔ حکومت کے ملازموں کو تاکید کی جائے کہ وہ لوگوں کے کاموں میں بے جا رکاوٹیں ڈال کر انہیں نہ ستائیں اور عوام پر کوئی ستم پیشہ حاکم مسلط نہ کیا جائے۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ اس مشورے سے بہت خوش ہوئے اور ملک کے مختلف گوشوں میں اپنے عمال کو لکھ بھیجا کہ وہ اس پر عمل کریں اور اس کی حدود سے آگے نہ بڑھیں، اس کے بعد انہوں نے اصلاحی کاموں کے متعلق سوچنا شروع کیا، جن سے ملک کی دولت میں اضافہ ہو سکے اور باشندگان مصر کی مرفہ الحالی کے ساتھ ساتھ خراج کی آمدنی بھی بڑھ جائے اور شاید بنیامین کے مشورے سے پہلے ہی ابن عاص رضی اللہ عنہ اصلاحی کاموں کے متعلق سوچ رہے تھے۔

Marfat.com

سب سے پہلے جس اہم ترین کام کا خیال ان کے دل میں آیا وہ خلیج تراجان کی کھدائی تھی، جو دریائے نیل کو بحیرہ قلزم سے ملاتی تھی اور جس کی وجہ سے مصر اور جزیرہ نمائے عرب کے ساحلی شہروں کے درمیان آمد و رفت میں بڑی سہولت پیدا ہوسکتی تھی۔ یہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ خلیج تراجان کے عہد سے ہزاروں برس پہلے فراعنہ نے کھدوائی تھی۔[1] تراجان نے تو اسے صرف درست کرایا تھا۔ یعنی صفائی کے بعد اسے اور گہرا کرا دیا تھا۔

پھر جب مصر پر روم و ایران کی مسلسل چڑھائیاں ہوئیں اور ہر طرف ظلم و استبداد کی آگ بھڑکنے لگی تو یہ نہر بے توجہی کا شکار ہو کر اٹ گئی۔ آخر کار ابن عاص رضی اللہ عنہ نے پھر اسے پہلے کی طرح جاری کرانا چاہا اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ مصر کی عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے انہوں نے اسی عظیم الشان کام کا بیڑا اُٹھایا اور بہت ہی قلیل مدت میں، جو پورا ایک سال بھی نہیں تھی، اسے پایہ تکمیل کو پہنچا دیا۔ حالانکہ نہر کی لمبائی ساٹھ میل سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ یہ نہر بابلیون کے شمال سے شروع ہو کر شمال مشرقی جانب بلبیس تک جاتی تھی اور اس سے آگے بڑھ کر مشرقی سمت اختیار کر لیتی تھی۔ بحیرہ تمساح میں پہنچ کر اس کے جنوب سے نکلتی اور مرہ کی جھیلوں میں سے ہوتی ہوئی سویز کے قریب بحیرہ قلزم میں جا گرتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اتنے عظیم الشان کام کا ارادہ کرنے اور اتنی مختصر سی مدت میں اسے پایہ تکمیل تک پہنچا دینے سے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی بے نظیر انتظامی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے، خاص طور پر جب ہم لوگوں کی یہ کہن سنتے ہیں کہ اس زمانے میں اس نہر کا نشان تک باقی نہ رہا تھا۔ تا آنکہ اس کا پتہ لگانے کے لیے ابن عاص رضی اللہ عنہ کو ایک قبطی کی خدمات حاصل کرنی پڑیں، جس کے صلے میں بعد کو اس قبطی پر جزیہ معاف کر دیا۔ اس کام کے لیے ابن عاص رضی اللہ عنہ کو غالباً بیگار کا سہارا لینا پڑا اور انہوں نے ہزاروں مصری مزدوروں کو نہر کھودنے پر لگا دیا۔

میں اپنے آپ کو ان لوگوں کا ہمنوا نہیں بنا سکتا جو اس سلسلے میں عرب فاتح پر ملامت کرتے ہیں۔ بیگار اس دور کے مصر کی ایک عام رسم تھی، جو اس کے بعد بھی ہزار سوا ہزار برس تک جاری رہی۔ نہر سویز کی سرکاری کمپنی نے انیسویں صدی عیسوی میں جب نہر کی کھدائی کا کام شروع کیا تھا تو اسی بیگار کا سہارا لیا تھا۔ بگار دراصل ایک قسم کی جبری بھرتی ہے جو کسی قومی کام کے لیے کی

---

① علامہ ویل نے لکھا ہے کہ فرعون مصر ''نخاؤ'' نے خاکنائے سویز میں، بحیرہ روم سے بحیرہ قلزم تک ایک نہر کھدوائی تھی۔

جاتی ہے اس میں اگر برائی کا کوئی پہلو ہے جس پر اسے مطعون کیا جا سکے تو یہ کہ بھرتی کرنے والے اس میں عدل و نظم کی رعایت ملحوظ نہ رکھیں اور بھرتی ہونے والے اس قومی کام سے فائدہ نہ اُٹھا سکیں، جس کے لیے وہ اپنا خون پسینہ ایک کر رہے ہیں۔ لیکن اگر یہ برائی نہ ہو جو سخت سے سخت تنقید کی مستحق ہے۔ اور اگر بھرتی کسی تعمیری مقصد کے لیے منصفانہ نظام کے تحت ہو جس کا ہر کام کرنے والے کو معقول معاوضہ ملے، تو نکتہ چینی و ملامت کا کوئی محل ہی باقی نہیں رہ جاتا۔

جن مؤرخین نے اس بھرتی پر ابن عاص کو ہدف اعتراض بنایا ہے، ان کے لہجے میں شدت و تلخی شاید اس لیے پیدا ہوگئی ہے کہ ان کے نزدیک نہر تراجان مصر کی نہیں، بلاد عرب کی فلاح کے لیے کھولی گئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس نہر کے کھلنے سے بلاد عرب کو فائدہ پہنچا، لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ مصر کا فائدہ بلاد عرب کے فائدے سے بھی زیادہ تھا۔ اسے ہندوستان اور مشرق بعید سے تجارت کے لیے وہ رستہ دوبارہ مل گیا جو قافلوں کے رستے سے زیادہ آسان تھا اور اس طرح اپنے اس بلند تجارتی مقام کو از سر نو حاصل کرنے کا زریں موقع اس کے ہاتھ آ گیا جو اس کی عظمت و سیادت کے تابناک دور کی یادگار تھا۔ پھر ابن عاص رضی اللہ عنہ کے غور و فکر کی ایک غایت مصر کی بھلائی بھی تھی، جس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ بطلیموس ثانی اور فرعون ''نخاذ'' کی تقلید میں وہ بحیرہ تمساح اور بحیرہ روم کے درمیان ایک نہر کھدوانا چاہتے تھے جو بحیرہ قلزم کو بحیرہ روم سے ملا دے۔ جیسا کہ آج کل ہے۔ انہوں نے اپنے اس ارادے کو جامہ عمل پہنانے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا لیکن خلیفۃ المسلمین کے اس اعتراض نے ان کے ہاتھ باندھ دیئے کہ اس طرح رومیوں کے لیے اس نہر کو عبور کر کے اپنے جہاز بحیرہ قلزم میں لے جانا آسان ہو جائے گا، اور اس وقت تک عربوں کے پاس کوئی تجارتی یا جنگی بیڑا نہ تھا جو رومی بیڑے کا مقابلہ کر سکتا۔ اس لیے اگر اس نہر کی کھدائی کا خیال ترک کیا گیا تو بربنائے احتیاط کیا گیا نہ کسی اور وجہ سے۔ پھر جب ہم یاد کرتے ہیں کہ انیسویں صدی عیسوی میں برطانیہ نے محض اس خوف سے کہ ہندوستان میں اس کے اقتدار پر کوئی آنچ نہ آ جائے، نہر سویز نکالنے کے سلسلے میں کتنی مخالفت کی تھی تو یہ بات ہم پر آئینہ ہو جاتی ہے کہ خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ نے آج سے تیرہ سو برس پہلے اس نہر کے نکالنے پر جس خوف کا اظہار کیا تھا اس پر انہیں الزام دینا کسی طرح جائز نہیں۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو بلاد عرب کی صلاح و فلاح کا جتنا خیال تھا، مصر کے سود و بہبود

Marfat.com

کی فکر اس سے کچھ کم نہ تھی اور جو یہ کہتا ہے، غلط نہیں کہتا کہ اس سیاست سے ابن عاص رضی اللہ عنہ کا مدعا یہ تھا کہ مصر کے اضطراب کو اطمینان سے بدل دیں، اس کے باشندوں کا بوجھ ہلکا اور ان کے درمیان عدل وانصاف قائم کر دیں۔ وہ اس سیاست میں عربی اور مصری دونوں قوموں کے مفاد کی بہترین توفیق اور اسلامی سلطنت کی بنیادوں کے لیے بہترین استحکام پاتے تھے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے یہ پالیسی قبطی بطریق بنیامین کی اس نصیحت سے اخذ کی تھی، جس کا تعلق خراج اور اس کی وصولی سے تھا اور وہ رعایا کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اس پالیسی کی آخری حدود تک چلے گئے تھے۔ یہ خراج پیداوار کی کمی بیشی کے نتیجے میں گھٹتا بڑھتا رہتا تھا اور ہر سال قریہ وشہر کے سربرآوردہ لوگوں کی ایک کمیٹی بیٹھتی تھی جو یہ طے کرتی تھی کہ اس سال حالات کے اعتبار سے کتنا خراج وصول کیا جانا چاہیے، اگر کسی ضلع کی آمدنی خراج کی مقررہ رقم سے بڑھ جاتی تھی تو زائد آمدنی اسی ضلع کی ترقی واصلاح پر صرف کر دی جاتی تھی۔ ہر ضلع میں زمین کا ایک ٹکڑا مخصوص کیا گیا تھا، جس کی آمدنی مفاد عامہ مثلاً کلیساؤں، حماموں اور سڑکوں وغیرہ کی اصلاح ومرمت کے لیے وقف تھی۔ پھر بھی جو خراج وصول ہوتا تھا وہ ان بے شمار ظالمانہ ٹیکسوں کی آمدنی سے کہیں کم تھا، جو رومیوں نے دارالسلطنت کو چھوڑ کر باقی تمام ملک کے مصریوں پر لگا رکھے تھے۔ چنانچہ یہ تخفیف ایک بہت بڑا سبب تھی، جس کی بنا پر تمام قبطی نئی حکومت سے مطمئن تھے اور اس کے گن گاتے تھے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے قائم کیے ہوئے اس نظام سے اہل ملک جتنے خوش تھے، اہل اسکندریہ اتنے ہی ناراض تھے۔ اسکندر مقدونی نے جس دن یہ شہر بسایا تھا اہل شہر کو جزیے سے مستثنیٰ قرار دے دیا تھا اور ان یہودیوں اور رومیوں کو، جو اس کے ساتھ یہاں آکر آباد ہو گئے تھے، واجبات کے سلسلے میں ایسے امتیازی سلوک سے نوازا تھا، جس نے مصر کے اصلی باشندوں سے ان کا درجہ بلند کر دیا تھا۔

بطالسہ بھی اسکندریہ ہی کی روش پر چلتے رہے۔ اس کے بعد جب رومیوں کا دور آیا تو انہوں نے معافی کا دامن پھیلا کر حاکم قوم...... رومی...... کے تمام افراد کو اس میں سمیٹ لیا۔ یہ مرحمت صرف جزیہ یا واجبات ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ اسکندریہ والوں پر بیگار اور اسکندریہ کے اردگرد کی زمینوں پر خراج بھی معاف کر دیا گیا تھا۔[1] اسکندریہ کو ان مراعات سے محروم کرنے کا یہ مقصد نہ

[1] دیکھیے! بہی الدین برکات پاشا کی فرانسیسی تصنیف: ''وہ امتیازات اور معافیاں جن سے مصر میں غیر ملکی فائدہ اُٹھاتے تھے۔'' ص 35-47۔

تھا کہ ٹیکسوں کی تخفیف سے جو نقصان حکومت کو پہنچا ہے اس کی تلافی کی جائے، اس لیے کہ محاصرے کے دوران میں بہت سے لوگ اسکندریہ چھوڑ کر چلے گئے تھے اور اس کی وجہ سے بہت سی منڈیاں مقفل ہو گئی تھیں۔ مصر سے ٹیکس وغیرہ کے سلسلے میں کتنی رقوم وصول ہوتی تھی۔ مؤرخین کا اس میں بڑا اختلاف ہے، لیکن اس پر سب متفق ہیں کہ جتنی رقم رومی اپنے زمانہ حکومت میں وصول کرتے تھے، یہ رقم اس سے بہت کم تھی۔ اس کے باوجود ابن عاص رضی اللہ عنہ نے ٹیکسوں کے بارے میں اپنی پالیسی تبدیل نہ کی اور اپنے تمام زمانہ امارت میں جسے اہل مصر اپنے لیے خیر و برکت کا زمانہ سمجھتے تھے اسی پالیسی پر عمل کرتے رہے۔ مصر کے محاصل کے سلسلے میں مؤرخین کا اختلاف ہے۔ علامہ بلاذری کہتے ہیں کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ مصر سے دس لاکھ دینار بطور خراج وصول کرتے تھے اور مقریزی کا بیان ہے کہ یہ رقم ایک کروڑ بیس لاکھ تھی۔ اس اختلاف کی تاویل میں کہا جاتا ہے کہ بعض مؤرخین نے صرف خراج کی آمدنی کا ذکر کیا ہے اور بعض نے صرف جزیے کی آمدنی کا۔ کچھ ایسے بھی ہیں، جنہوں نے ان دونوں آمدنیوں کو ملا دیا ہے، لیکن اس اختلاف کے باوجود اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جزیے کی درمیانی شرح دو دینار فی کس تھی، جس میں طبقاتی فرق سے کمی بیشی ہوتی تھی۔ جن مصریوں پر جزیہ فرض کیا گیا تھا، ان کی تعداد ایک روایت کے مطابق ساٹھ لاکھ اور دوسری روایت کے مطابق اسی لاکھ تھی، لیکن مصر کے ٹیکسوں کا بار بہرحال رومیوں کے عائد کردہ ٹیکسوں کے بارے سے بہت ہی کم تھا۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے مقررہ کردہ رومی اور قبطی حکام، کاروبار حکومت انہیں حدود میں چلاتے رہے، جو ابن عاص رضی اللہ عنہ نے قائم کر دی تھیں اور دفتری نظام حسب سابق جاری رہا۔ ابن عاص رضی اللہ عنہ اپنی سیاست کی کامیابی پر بہت مسرور تھے، سب سے زیادہ خوشی انہیں مصر کی زرخیزی پر تھی، جس کے دامن میں نعمتیں ہی نعمتیں اور آسائشیں تھیں۔ ان کا وہ مشہور خط، جو مصر کے بارے میں انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ارسال کیا تھا، اس کی شہادت دیتا ہے، جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں، حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس بات کے خواہش مند تھے کہ ان کے عمال اپنی اپنی عمل داریوں کی ایسی واضح تصویر کھینچیں، گویا وہ حضرت عمر کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ چنانچہ جب فاروق اعظم نے ابن عاص رضی اللہ عنہ سے مصر کی تفصیلات طلب کیں تو ابن عاص نے جواب میں لکھا: ''امیر المؤمنین کا مکتوب گرامی ...... اللہ تعالیٰ انہیں تادیر سلامت رکھے! وارود

Marfat.com

فرما ہوا، جس میں مجھ سے مصر کے متعلق تفصیلات طلب کی گئی ہیں۔ امیر المؤمنین! مصر ایک نہایت زرخیز اور سرسبز و شاداب جگہ ہے۔ اس کا طول ایک مہینے اور عرض دس مہینے کی مسافت ہے۔ اسے ایک خاکی رنگ کے پہاڑ اور ایک خاکستری رنگ کے ریگزار نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ اس کے وسط میں دریائے نیل بہتا ہے جس کا خرام سحری مبارک ہے اور روانی شب مسعود۔ اس کا بہاؤ کبھی تیز ہوتا ہے کبھی سست، جیسے آفتاب و ماہتاب کی رفتار، مخصوص اوقات میں اس کی لہریں اتنی سفید اور شیریں ہو جاتی ہیں کہ دودھ کی دھاریں معلوم ہونے لگتی ہیں اور مکھیاں ان پر بھنبھناتی ہیں۔ زمین کے چشمے اور تیز رونالے جب اس میں طغیانی پیدا کر دیتے ہیں تو وہ چنگھاڑنے لگتا ہے اور جب اس کی موجیں بلند ہو کر کناروں کو پھاند جاتی ہیں تو چھوٹی چھوٹی کشتیوں اور ہلکی ہلکی ڈونگیوں کے سوا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا غیر ممکن ہو جاتا ہے اور وہ کشتیاں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بادلوں میں .... جنہیں ڈھلتے دن کی چاندی کھیے! تیر رہی ہیں۔ جب اس کی طغیانی شباب کو پہنچ جاتی ہے تو وہ جس شان سے چڑھا تھا اسی شان سے الٹے پاؤں اتر جاتا ہے۔ اس وقت لوگ نکلتے ہیں، زمین گود کر اس میں دانہ ڈالتے ہیں اور پروردگار سے اس کے پھلنے پھولنے کے اُمیدوار ہوتے ہیں۔

جو لوگ محنت نہیں کرتے وہ بھی بغیر کسی جدوجہد کے اس سے پھل پاتے ہیں، جب دانہ پھوٹتا ہے تو نمی اسے پانی پلاتی اور زمین سے غذا بہم پہنچاتی ہے اور اس وقت یا امیر المؤمنین! مصر کی زمین رنگ برنگ کے چولے بدلتی ہے۔ ابھی چمکتا موتی ہے تو ابھی عنبر اشہب۔ ابھی زمرد سبز ہے تو ابھی گندمی چہرہ، پاک ہے وہ خالق کائنات جس نے مصر کو ان نعمتوں سے نوازا اور رونق و آبادی سے امتیاز بخشا، البتہ یہاں کسی بڑے آدمی کے متعلق معمولی آدمی کی بات نہیں مانی جاتی اور یہاں کا خراج وقت معینہ سے پہلے وصول نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ یہاں کی آمدنی کا تہائی حصہ نہروں اور پلوں کے کام میں صرف ہوتا رہے۔ جب یہاں کے حالات استحکام پذیر ہو جائیں گے تو آمدنی بڑھ جائے گی۔ آغاز و انجام میں خدائے بزرگ و برتر ہی توفیق عطا کرنے والا ہے۔'' مسلمان مؤرخین کہتے ہیں کہ جب یہ خط حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا آپ نے اسے پڑھ کر فرمایا: ''سبحان اللہ! ابن عاص! تم نے مصر کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے کھینچ دی ہے۔''

بعض نقاد اسے ابن عاص رضی اللہ عنہ کا خط تسلیم نہیں کرتے۔ خاص طور پر نقاد ادب کو اس کی صحت

سے قطعی انکار ہے، ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اس خط کے اسلوب اور ادبی محاسن سے صدر اول کے مسلمان بالکل ناآشنا تھے اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے جو دوسرے خطوط ہم تک پہنچے ہیں، ان کا طرز تحریر اس خط سے مختلف ہے اور سچ بھی یہ ہے کہ ان کی یہ دلیل بڑا وزن رکھتی ہے۔ شاید آپ بھی جب اس باب کے باقی حصے میں وہ خطوط پڑھیں گے، جو خاص طور پر جزیے اور خراج کے سلسلے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ابن عاص رضی اللہ عنہ نے ایک دوسرے کو لکھے تھے تو ان لوگوں کے ہم نوا ہو جائیں گے پھر بھی اس دلیل سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ اس خط کے الفاظ ابن عاص رضی اللہ عنہ کے نہیں ہیں! مگر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انہوں نے مصر کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سرے سے کوئی خط ہی نہیں لکھا۔ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مصر کے حالات سے واقفیت بہم پہنچانے کی بھی اتنی ہی بے چینی تھی، جتنی بے چینی انہیں قادسیہ اور عراق کے حالات سے باخبر ہونے کی تھی۔ بڑی حد تک ہمارا خیال یہ ہے کہ ابن عاص رضی اللہ عنہ نے یہ خط اپنے اسلوب میں لکھا ہوگا اور اس میں مصر کے حالات انتہائی تفصیل سے بیان کیے ہوں گے۔ بعد کو یہ خط متاخرین میں سے کسی ادیب کے ہاتھ لگ گیا اور اس نے اسے اس اسلوب میں ڈھال دیا، جو مؤرخین نے اپنی کتابوں میں، اور ہم نے یہاں درج کیا ہے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو ہمیں یقین کر لینا چاہیے کہ اس گل کار ادیب نے پہلے ابن عاص رضی اللہ عنہ کے خط کا مفہوم اچھی طرح ذہن نشین کیا، پھر اسے اپنے زمانے کی زبان میں لکھ کر ادبی محاسن سے سجا دیا۔ اس طرح ابن عاص کا اصل خط تو لوگوں کے ذہن سے فراموش ہو گیا اور مؤرخ کے قلم تک نہ پہنچ سکا، لیکن یہ مصنوعی خط باقی رہ گیا۔ یہاں تک کہ اب ہم یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکتے کہ اس خط کے کون کون سے فقرے ابن عاص رضی اللہ عنہ کے ہو سکتے ہیں اور کون کون سے فقرے اس ادیب کی طرف منسوب کیے جانے چاہئیں، جس نے ان کے کئی صدیوں بعد میں انشاء پردازی کے گل بوٹے کھلائے۔

جب ہم مصر سے متعلق حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے اس الحاقی خط کی نفی کر رہے ہیں تو کیوں نہ لگے ہاتھوں اس قصے کی بھی حقیقت واضح کر دیں جو سرتاسر کسی افسانہ ساز ذہن کی اختراع ہے اور جس میں واقعیت کا شائبہ تک نہیں؟ یہ عروس نیل کی کہانی ہے جس کے سلسلے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ”جب حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ مصر کے والی مقرر ہوئے تو سربرآوردہ قبطیوں کا ایک وفد ان کے پاس آیا اور کہنے لگا: ”ہمارے نیل کا ایک معمول و دستور ہے جس کے بغیر اس

میں روانی پیدا نہیں ہوتی!'' ابن عاص رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''وہ کیا؟ بولے: ''اس مہینے کی بارہویں تاریخ کو ہم ایک دوشیزہ کا انتخاب کرتے ہیں اور اس کے ماں باپ کو رضا مند کر کے اسے بہتر سے بہتر لباس اور قیمتی سے قیمتی زیور پہناتے ہیں، اس کے بعد اس دوشیزہ کو نیل میں ڈال دیتے ہیں اور وہ بہنے لگتا ہے۔'' ابن عاص رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے کہا: ''یہ چیز اسلام میں نہیں ہے اور اسلام پہلے کی تمام رسموں کو کالعدم قرار دیتا ہے۔'' وہ لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور سب نے یک زبان ہو کر اس ارادے کا اظہار کیا کہ اگر نیل میں تھوڑی بہت بھی روانی پیدا نہ ہوئی تو وہ ترک وطن کو ترجیح دیں گے۔'' یہ دیکھ کر ابن عاص رضی اللہ عنہ نے بارگاہ خلافت میں خط لکھا جس کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تحریر فرمایا: ''تم نے ٹھیک کہا کہ اسلام پہلے کی تمام رسموں کو کالعدم قرار دیتا ہے۔ ہم تمہیں ایک پرزہ بھیج رہے ہیں۔ جب میرا یہ خط پہنچے تو اس ''پرزے'' کو ''نیل'' میں ڈال دینا۔''

ابن عاص رضی اللہ عنہ کو یہ مراسلہ ملا تو انہوں نے اس پرزے کو کھول کر پڑھا، اس میں لکھا تھا: ''اللہ کے بندے امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے مصر کے دریائے نیل کے نام! امابعد! اگر تو اپنی مرضی سے بہتا ہے تو نہ بہہ! لیکن اگر تجھ میں روانی پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ واحد و قہار ہے، تو ہم اللہ تعالیٰ واحد و قہار سے التجا کرتے ہیں کہ وہ تجھ میں روانی پیدا کر دے!'' ابن عاص رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مراسلے اور پرزے کے مضمون سے آگاہ کیا اور عید صلیب سے ایک دن پہلے پرزے کو دریائے نیل میں ڈال دیا۔ اہل مصر اس ملک سے نکل جانے کا تہیہ کر چکے تھے کیونکہ نیل کے بغیر ان کا وہاں رہنا بے سود تھا، لیکن جب وہ عید صلیب کی صبح سو کر اٹھے تو رات ہی رات میں دریا کا پاٹ سولہ ہاتھ ہو گیا تھا اور اس طرح یہ قبیح رسم مصر سے مٹ گئی۔ یہ ہے عروس نیل کی روایت جو مسلمان مؤرخین نے لکھی ہے۔ ہم نے متذکرہ عبارت ابن تغری بردی کی ''النجوم الزاہرہ'' سے نقل کی ہے۔

بٹلر مسیحی عہد میں اس قصے کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے: ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ میں اس قصے کی اصل و حقیقت ہے۔ جنوبی سوڈان کے بعید ترین علاقوں میں واقعی یہ رسم تھی کہ وحشی قبائل ایک دوشیزہ کو عروسی لباس پہنا کر دریا میں پھینک دیا کرتے تھے۔ جب مسلمانوں نے نوبہ فتح کیا ہے، غالباً اس کے غیر متمدن گوشوں میں بھی یہ رسم جاری تھی اور شاید فراعنہ مصر کے عہد میں بھی

Marfat.com

دوشیزہ کو دریا میں پھینکنے کا رواج تھا، اور یہ بات تو طے شدہ ہے کہ دریائے نیل کے جشن میں، کی زیادتی و روانی کی دعائیں مانگنے کے لیے برپا کیا جاتا تھا، بہت سی خلاف عقل باتیں عہد قدیم سے چلی آرہی تھیں۔ لیکن دوشیزہ کی قربانی جیسے جرم اس میں نام کو نہ تھے............اس لیے جو کوئی عیسائیوں پر تہمت رکھتا ہے کہ انہوں نے ایسی ملامت انگیز رسم باقی رکھی، جس کی اجازت نہ ان کا مذہب دیتا ہے نہ ان کی قوم ہی میں اس کا کہیں وجود پایا جاتا ہے وہ جھوٹ کا ایک طوفان کھڑا کرتا ہے۔'' تعجب ہے؟ بٹلر پہلے یہ فرض کرتا ہے کہ اس قسم کی قبیح رسم شاید عہد فراعنہ کے مصر میں جاری تھی۔ پھر مصر کے قبطیوں پر برس پڑتا ہے کہ وہ اس مذموم رسم کی حفاظت و نگرانی کا الزام عیسائیوں کے سر تھوپتے ہیں۔ اگر یہ رسم فراعنہ کے عہد میں جاری تھی تو لامحالہ ان کے بعد بھی باقی رہی ہوگی اور اس صورت میں اسے باقی رکھنے پر عیسائیوں کو ملامت نہیں کی جاسکتی، اس لیے کہ فراعنہ کی بہت سی رسمیں عہد مسیحی اور عہد مسیحی سے عہد اسلامی کی طرف منتقل ہوئیں، یہاں تک کہ ان میں سے بعض تو ہمارے اس زمانے تک موجود ہیں۔ ①

فراعنہ کے خلاف اس الزام تراشی اور عیسائیوں کی وکالت میں اس اظہار غضب کا کوئی عذر بٹلر کے پاس نہیں ہے، سوائے اس مذہبی تعصب کے جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے، ورنہ بعد کی علمی تحقیق تو یہ کہتی ہے کہ طغیانی کے لیے کبھی کوئی دوشیزہ نیل میں نہیں ڈالی گئی۔ ہاں! دوشیزہ کی ایک چوبی مورتی کو خوب بنا سنوار کر طغیانی سے کچھ پہلے نیل میں ضرور ڈالا جاتا تھا۔ اگرچہ علماء کا ایک گروہ اس آخری بات کو تسلیم نہیں کرتا۔ اگر یہ صحیح بھی ہے کہ فراعنہ یا غیر فراعنہ طغیانی کی خوشی میں لکڑی کی کوئی مورتی دریائے نیل میں ڈالا کرتے تھے تو اس سے ان کے علم و حکمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ زیادہ سے زیادہ بس یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ رسم من جملہ خرافات تھی جس سے عوام چونکہ راحت پاتے تھے اس لیے اہل علم و حکمت اس پر کوئی اعتراض نہ کرتے تھے۔ عہد فراعنہ کے مصر کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے، لیکن میں نے اس کی مزید تحقیق چاہی اور آثار قدیمہ کے ماہر جناب سلیم بک حسن سے رہنمائی کی درخواست کی۔ موصوف نے کرم فرمایا اور اپنے محققانہ جواب میں وضاحت کی کہ اگر وہ روایت صحیح بھی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک وثیقہ بھیجا اور وہ طغیانی کے لیے نیل میں ڈالا گیا تو بھی کوئی بات نہیں۔ اسے زیادہ سے زیادہ خلیفۃ

① دیکھیے کتاب: Legrain: Louqsor sans Lesphar Aone)

Marfat.com

المسلمین کی رواداری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جو انہوں نے مصریوں سے ایک رسم کے سلسلے میں برتی جس میں رواداری برتنے سے کسی نقصان کا اندیشہ نہ تھا۔ مصر کے کاہنوں اور بادشاہوں کا یہ دستور تھا کہ وہ ہر سال موسم گرما کی تبدیلی کے آغاز میں نیل کے دیوتا کے لیے ایک جشن مناتے تھے، جس میں پہلے بیل، مرغابیاں اور روٹی وغیرہ کی دوسری قربانیاں دیوتا پر چڑھاتے تھے اور پھر سرکنڈوں کے کاغذ پر لکھا ہوا ایک سر بہ مہر وثیقہ نیل میں ڈالتے تھے، جس میں اس کے نام ایک معتدل طغیانی کا حکم ہوتا تھا، جو ملک کی برکت و آسائش کی ضمانت ہو اور یہ جشن اس دن منایا جاتا تھا، جس دن نیل کا گرمائی پانی فیضان عظیم کی بشارت دیتا ہوا اسوان سے شہر سلسلہ پہنچتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مسیحیت نے قربانیوں کی رسم مٹا دی اور وہ مسیحی رومیوں کے عہد میں بند کر دی گئیں۔ اس لیے کہ وہ نیل کے کسی دیوتا کو نہ جانتے تھے، لیکن وثیقہ دریائے نیل میں برابر ڈالا جاتا رہا جو نیل کی طغیانی اور ملک کی عام بھلائی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد جب عرب مصر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلا اسلامی وثیقہ وہ تھا، جسے مؤرخین حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے منسوب کرتے ہیں اور جس میں نیل کو جاری ہونے کا حکم دیا گیا تھا، جس طرح مسیحی عہد میں رومی حاکم اور عہد فراعنہ میں کاہن اور بعض بادشاہ اسے حکم دیا کرتے تھے۔

لیکن عروس نیل کا قصہ، جیسا کہ روایت میں ہے، کوئی اصل و حقیقت نہیں رکھتا [1] اور اس کی بنیاد اس کہانی پر ہے جسے یونانی مؤرخ پلوٹارک نے رواج دیا ہے اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مصر کے بادشاہ اکبتس نے اپنے ملک کو مصائب و حوادث سے محفوظ رکھنے کے لیے الہام سے مدد چاہی۔ اشارہ ہوا کہ نیل کو اپنی بیٹی کی بھینٹ دے۔ چنانچہ اس نے اپنی بیٹی کو نیل میں پھنکوا دیا، لیکن بعد کو جب اس کی یاد نے بہت بے چین کیا تو خود بھی نیل میں کود کر بیٹی کی طرح ہلاک ہو گیا۔ یہ ہے وہ من گھڑت قصہ جسے پلوٹارک کے بعد یونانی اور لاطینی مصنفوں نے پھیلایا، لیکن جس کا مصری کتابوں میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہی اس ضمیاتی کہانی کا سرچشمہ ہے، جو لوگوں میں صدیوں شائع و ذائع رہی اور افسانہ ساز ذہن نے اس کے گرد ایسا تانا بانا بُن دیا کہ اکثر لوگ اسے ایک حقیقت سمجھنے لگے، جس پر واقعتاً عمل ہوتا تھا اور وہ ہر سال ظہور میں آتی تھی۔

---

[1] مصنف کی اس قسم کی خیال آرائیوں کے بارے میں میری رائے یہی ہے کہ اس قسم کی خیال آرائیاں غیر مسلم مؤرخین کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی کا نتیجہ ہیں یا عقل پرستی کو حقیقت پرستی پر غلبہ دینے کا نتیجہ۔ از ناقد۔

Marfat.com

کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ عروس نیل کی کہانی، تخیل نے ''قرطاس ہوریس'' کے مندرجات کے گرد بنی ہے، جو عمیس ثالث کے عہد (مابین 1167ء و 1190 قبل مسیح) سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس بات کی دلیل ہے کہ انسانیت کا ایمان اکثر کہانیوں پر رہا ہے جو زندگی میں کوئی اصل وحقیقت نہیں رکھتیں اور اپنے وجود کے لیے فنکاروں اور مصنفوں کے طرفہ کار قلم کی محتاج ہیں۔ کیونکہ ''قرطاس ہوریس'' میں کسی ایسی اچھوتی دلہن کا ذکر نہیں، جسے بنا سنوار کر نیل میں پھینکا جاتا ہو۔ اس میں تو یہ ہے کہ نیل کی لمبائی میں سو سے زیادہ گھاٹ تھے، جن کے درمیان تقریباً سات سات میل کا فاصلہ تھا۔ ہر گھاٹ پر نیل کے دیوتا حابی کے لیے ایک محراب بنی ہوئی تھی جس کی حفاظت ونگرانی ایک کاہن کے سپرد تھی۔ یہ کاہن کھانے پینے کا سامان نیل کے ان مسافروں سے حاصل کرتا تھا جو حابی پر نذریں چڑھانے آتے تھے۔ ہر محراب پر چوکیدار متعین تھے، جن کے کھانے پینے کا انتظام وہیں ہوتا تھا۔

اسی طرح ہر محراب میں پھولوں کا ایک گلدستہ جو روزانہ بدلا جاتا تھا اور نیل کے دیوتا حابی اور اس کی بیوی ربیت دیوی کی سات سات مورتیاں ہوتی تھیں جو گولر کی لکڑی سے بنائی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ حابی دیوتا اور شہ سواروں کے کچھ اور مجسمے بھی ہوتے تھے۔ حابی دیوتا کے مجسمے سونے اور چاندی، رانگ اور مصر کے مختلف پتھروں، جیسے مرمر، لاجورد، زمرد اور بلور کے اور شہ سواروں کے مجسمے سونے اور چاندی کے، یہ تمام کی تمام مورتیاں موسم گرما کی تبدیلی کے آغاز میں حابی کے جشن عید کے دن دریائے نیل میں بہادی جاتی تھیں اور ان کے بدلے محرابوں میں نئی مورتیاں رکھ دی جاتی تھیں جو اگلی عید پر طغیانی سے ذرا پہلے نیل کی بھینٹ چڑھتی تھیں اور ان کی جگہ پھر نئی مورتیاں محرابوں کی زینت ہو جاتی تھیں۔ غرض کہ یہ سلسلہ ہر سال یوں ہی جاری رہتا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ عروس نیل کا یہ قصہ خیال نے نیل میں بہائی جانے والی انہیں مورتیوں سے لیا ہو اور گولر کی لکڑی اور اس مواد میں، جن سے یہ مورتیاں بنائی جاتی تھیں، جان ڈال دی ہو؟ اور کہیں نیل کی بیوی ''ربیت دیوی'' ہی تو نہیں جس نے خیال کو ایک جیتی جاگتی اچھوتی دلہن کا تصور دیا ہو؟ بات چاہے کچھ ہو، یہ قصہ جیسا کہ آپ نے دیکھا ہے سرتا سر وہم کی آراستہ کی ہوئی ایک کہانی، جسے قدامت نے حقیقت کا لباس پہنا دیا۔ چنانچہ نیل کو حوا کی ایک بیٹی مل گئی، جو اپنے شباب کی رعنائیوں اور لباس عروسی کی آرائشوں کے ساتھ اس کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی،

Marfat.com

مؤرخین نے اس کہانی کو ایک حقیقت کے طور پر بیان کرنا شروع کر دیا، جو زندگی میں مدتوں قائم و برقرار رہی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مؤرخین کی تردید اور استاد سلیم حسن کی اس دقیق اور عالمانہ تغلیط کے بعد یہ کہانی اپنی موت آپ مر جائے گی، یا اب بھی کچھ لوگ ایسے باقی رہ جائیں گے جو اسے کسی عہد کا حقیقی واقعہ سمجھ کر اسی طرح دہراتے رہیں گے؟[1]

عروس نیل کے قصے کی تردید کے بعد، اب ہم ایک اور کہانی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، جس میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم عصر مسلمانوں پر ایک شرمناک الزام لگایا ہے۔ مؤرخین کئی صدیوں تک اسے نقل کرتے رہے اور مسلمان مؤرخوں کو اس میں کوئی قابل تحقیق بات نظر نہ آئی۔ یہ الزام کتب خانہ اسکندریہ کو نذر آتش کرانے کا ہے۔ اس قصے کی تصنیف میں جو مہارت صرف کی گئی ہے غالباً اسی نے مدت تک مسلمان مؤرخوں پر اس کی اصل اہمیت واضح نہیں ہونے دی۔ ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ اس افترا کو بے نقاب کرنے کا سہرا ان مستشرقین کے سر ہے جنھوں نے انیسویں صدی عیسوی میں اس مسئلے کی تنقیح و تردید کی اور ان میں بھی سب سے بڑی فضیلت بٹلر کو حاصل ہے۔ جس نے ایسے مسکت دلائل سے اس الزام کے تار و پود بکھیرے کہ اس کے بنیادی طور پر غلط ہونے میں کسی کو شبہ نہ رہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم عصر مسلمانوں پر اس جھوٹے الزام کی شرمناکی اس سے اور بڑھ جاتی ہے کہ کتب خانہ اسکندریہ دنیا کا عظیم ترین کتب خانہ تھا اور اس میں ہر علم و فن کی ایسی ایسی نفیس کتابیں تھیں، جن کی مثال دور حاضر کے کتب خانوں میں بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ یہ کتب خانہ بطالسہ نے اسکندریہ کے اس عجائب خانے کے مختلف کمروں میں قائم کیا تھا جو شاہی محلوں کے قریب واقع تھا اور اس میں سات لاکھ کتابیں جمع کی تھیں، اس عظیم الشان کتب خانے کی عمارتیں رصدگاہ کی عمارت، طب تشریح اور جراحت، ریاضیات و فلکیات اور قانون کی درس گاہوں اور اس باغ سے متصل تھیں جو علم نبات کے درس کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ کتب خانہ اور اس سے ملی ہوئی یونیورسٹی اس زمانے میں عالمی ثقافت کا سب سے بڑا مرکز شمار کیے جاتے تھے اور کوئی شک نہیں کہ ایسے کتب

---

[1] استاد سلیم بک حسن نے اس کہانی کی تردید و تغلیط میں "قرطاس ہوریس" Harris اور W. Erichsen papyrus ص 41-37-1 اور دوسرے ماخذ کو سند بنایا ہے۔ جن میں ماسبرو کتاب The Dawn of CiVilisation ص 39 الخ اور شارل بالاک کی کتاب Lenilql. Epoque Pharoonique ص 129 الخ شامل ہیں۔

Marfat.com

خانے کو جلانا نا قابل معافی جرم اور انسانیت کے حق میں ایک ایسا بدترین گناہ ہے، جس کا ارتکاب وحشی قبائل ہی کر سکتے ہیں، یا پھر وہ لوگ جو وحشت و درندگی میں ان کے ہم سطح ہوں۔ اس کے باوجود یہ الزام حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم عصر مسلمانوں پر لگایا گیا اور کئی صدیوں تک ان سے چپکا رہا، جس کی وجہ سے وہ طرح طرح کے طنز و سرزنش کا نشانہ بنے رہے۔ آخر کار علم نے اس کی تردید کی اور اب کوئی نہیں جو اس کا ذکر کرے اور اسے افتراء قرار نہ دے۔

اگر قدیم مؤرخین بھی واقعات کو تنقیدی نظر سے جانچنے کی طرف توجہ کرتے اور اس الزام کی تحقیق میں وقت نظر سے کام لیتے تو اس کا جعل بڑی آسانی سے انہیں نظر آ جاتا اور تاریخ چھ صدیوں تک گمراہی میں مبتلا نہ رہتی۔ اس روایت کے من گھڑت ہونے کا ایک سیدھا سا ثبوت یہ تھا کہ مسلمانوں کے مصر فتح کرنے کے پانچ صدی بعد تک اس واقعے کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ حالانکہ جن مؤرخین نے اس زمانے کی تاریخ لکھی ہے، ان میں مصر کے وہ عیسائی بھی شامل ہیں جو ہر ممکن عیب عربوں کے سر منڈھنے میں ذرا تکلف سے کام نہیں لیتے۔ اس کے باوجود ان میں سے کوئی نہ کتب خانہ اسکندریہ کا ذکر کرتا ہے نہ اس کے جلائے جانے کا۔ شاید اس کہانی نے شیعی حلقوں میں جنم لیا ہے۔ چنانچہ ابوالحسن قفطی نے اپنی کتاب تاریخ الحکماء میں اس کا ذکر کیا اور اس سے ابوالفرج بن عبری نے اپنے ہاں نقل کیا۔ یہ دونوں مصنف تیرہویں صدی عیسوی کے ہیں۔ ان کے بعد جو مؤرخین آئے وہ اسے لے اُڑے اور اس کی چولیں درست کر دیں۔ اگر آپ چاہیں تو روایت کے انداز سے اس کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ قبطیوں کے ایک پادری کو جس کا نام حنا نحوی[1] تھا بدعقیدگی کے جرم میں اسقفوں کی ایک مجلس نے معزول کر دیا۔ وہ فتح مصر کے بعد حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں اپنی ذکاوت و ذہانت اور وسعت علم کا قدردان پا کر ان سے قریب ہو گیا، جب اس نے ابن عاص رضی اللہ عنہ پر اپنا اثر اچھی طرح قائم کر لیا تو ایک دن ان سے بولا: ''آپ نے تمام شہر دیکھ لیا اور اس کی قیمتی چیزوں پر اپنی مہر بھی لگا دی۔ میں آپ سے کوئی ایسی چیز طلب نہیں کرتا جو آپ کے لیے مفید ہو، بلکہ ایسی چیز مانگتا ہوں، جو آپ کے کسی کام کی نہیں، لیکن ہمارے فائدے کی ہے۔'' ابن عاص رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''تمہارا مطلب کیا ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''میرا مطلب یہ ہے کہ رومیوں کے خزانوں میں جو فلسفے کی

[1] مسلمان مؤرخین اس کا نام یحییٰ بتاتے ہیں۔

Marfat.com

کتابیں ہیں وہ ہمیں عنایت فرما دیجیے!'' ابن عاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: '' میں اس معاملے میں امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا!''

اس کے بعد انہوں نے اس باب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے معلوم کرائی، جس کا جواب مدینہ سے یہ آیا: '' کتابوں کے بارے میں جو تم نے لکھا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ان میں وہی کچھ ہے جو کتاب اللہ میں ہے تو ہمیں ان کی ضرورت نہیں اور اگر وہ اس کے خلاف ہیں تو ہمارے کس کام کی، انہیں جلا دو!'' جب یہ خط ابن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا تو انہوں نے کتابوں کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کی تعمیل کی اور وہ اسکندریہ کے حماموں میں تقسیم کر دی گئیں، جہاں ان سے چھ مہینے تک آگ روشن کی جاتی رہی۔ یہ ہے قفطی کی روایت کا انتہائی خلاصہ، جس کے خاتمے پر وہ کہتا ہے، اسے سنیے اور تعجب کیجیے!'' دیکھا آپ نے اس قصے میں تصنیف کا کمال: حنا اور ابن عاص رضی اللہ عنہ کے درمیان گفتگو ہوتی ہے، ابن عاص رضی اللہ عنہ خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ کو خط لکھتے ہیں اور خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ کا جواب آتا ہے کہ کتب خانے کو جلا دو! پھر اس حکم کی تعمیل کے لیے جو طریق کار اختیار کیا جاتا ہے، اس کی تفصیلات کتنی باریکی سے وضع کی گئی ہیں۔ ان تمام چیزوں کے بعد واقعات کی صحت میں کسی قسم کا شبہ کیسے باقی رہ سکتا تھا؟ اور مسلمان مؤرخوں کو ان واقعات میں کیوں کر شک ہو سکتا تھا، جبکہ وہ چھٹی صدی ہجری میں لکھے جا رہے تھے جو اسلامی فکر و نقد کے جمود و تعطل کا زمانہ تھا اور جس میں مؤلفین کی کوششیں صرف اسی حد تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں کہ وہ اپنے پیش روؤں کی روایات صحیح و غلط کی تمیز و تحقیق کے بغیر نقل کر دیں؟ چنانچہ اس کا وہی نتیجہ نکلا جو نکلنا چاہیے تھا؟ یعنی مسلمان مؤرخوں نے اس عجیب قصے کو اپنی کتابوں میں جوں کا توں درج کر دیا اور اخلاف محض اسلاف کی نقل پر تکیہ کر کے بیٹھ گئے۔ ادھر عیسائی مؤرخوں نے اس قصے کی صحت پر یقین کر کے اسے اپنی تاریخوں میں جگہ دی اور جو ان کا جی چاہا اپنی طرف سے اس میں ٹانک دیا۔ اس لیے کہ اسلام اور مسلمانوں کا تصور جب کبھی ان کے ذہن میں آتا تھا، مذموم تعصب اور وحشیانہ سنگدلی کا روپ دھار کے آتا تھا۔ یہ واقعات صحت سے محروم یوں ہی پڑے رہے۔ یہاں تک کہ علمی انتقاد نے اپنی حقیقت آزما روشنی ڈالی اور ان کا جھوٹ ظاہر ہو گیا۔

چنانچہ ایک طرف تو گبن، سدیو، رینان، گستاؤلی بان، بٹلر اور دوسرے مؤرخین نے اس کی تردید کی اور دوسری طرف انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور تاریخ المورخ

Marfat.com

وغیرہ نے اسے ناقابل اعتبار قرار دیا اور اس کی نفی و تردید میں علمائے اسلام کے اس واضح فیصلے کا بھی ذکر کیا: ''لڑائی میں یہودیوں اور عیسائیوں کی جو مذہبی کتابیں بطور غنیمت ہاتھ آئیں انہیں آگ کی غذا بنانا کسی حال میں جائز نہیں ہے۔ مؤرخین و علماء اور فلاسفہ و شعراء کی تالیفات بہرصورت اس قابل ہیں کہ مسلمانوں کی بہتری کے لیے ان سے استفادہ کیا جائے!'' پھر یہی نہ سمجھیے کہ مؤرخین نے اس کہانی کی تردید میں صرف اسی قسم کے عام اعتبارات کو سند بنانے پر اکتفا کیا نہیں! اس کی تحقیق و تلاش میں انہوں نے اتنی محنت صرف کی کہ اس کا بے حقیقت ہونا ان پر ثابت ہوگیا۔ اس کے بعد انہوں نے اس کہانی کے ایک ایک جزو کو لے کر نہایت دقیق علمی کسوٹی پر کسا اور محکم ترین ماخذ کو سند بنا کر اس کی تکذیب و تغلیط کی۔ چنانچہ یہ بالکل غلط ہے کہ حنا نحوی نے کتب خانے یا کسی اور چیز کے بارے میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے کوئی گفتگو کی، اس لیے کہ یہ حنا نحوی تو مسلمانوں کے مصر میں داخل ہونے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ یہ ثابت ہے کہ وہ ۵۲۷ء میں عربوں کے مصر میں داخل ہونے سے ایک سو پندرہ برس پہلے لکھتا لکھاتا تھا۔ اب اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ اس نے بیس برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا تو بھی اس کی عمر ایک سو پینتیس (135) برس ٹھہرتی ہے جو ایک غیر معقول بات ہے، اس لیے کہ اتنے معمر انسانوں کے پڑھنے لکھنے کا ثبوت ہمیں مصر کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتا اور یہ بھی صحیح نہیں کہ جب عربوں نے مصر فتح کیا ہے، بطالسہ کا کتب خانہ موجود تھا۔ مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ یہ کتب خانہ سنہ 48ء میں اس وقت جل گیا تھا، جب سیزر اسکندریہ پہنچا اور بندرگاہ کو گھیر کے جہازوں میں آگ لگادی۔ آگ کے شعلے بلند ہوکر پھیلے اور اس کتب خانے کو راکھ کا ڈھیر بنا گئے۔

امیانوس اور سیلوس کا بیان ہے: ''اسکندریہ کے وہ بے بہا کتب خانے، جن کے متعلق قدیم مؤرخین کا اتفاق ہے کہ بطالسہ نے انتہائی محنت و مشقت کے بعد ان میں سات لاکھ کتابیں جمع کی تھیں، اسکندریہ کی لڑائی میں نذر آتش ہوگئے، جب سیزر نے اس پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی'' اور سیلوس کہتا ہے: ''لڑائی کے دوران میں .... سیزر نے ...... شاہی بیڑے کو جلانے کا حکم دیا، جو اس وقت ساحل پر لنگر انداز تھا۔ یہ آگ شہر کے ایک حصے میں پھیل گئی اور وہ چار لاکھ کتابیں جل کر راکھ ہوگئیں جو آگ کے قریب ایک عمارت میں تھیں اور ہمارے ان اجداد کا چھوڑا ہوا یہ عجیب ادبی خزانہ ضائع ہوگیا، جنہوں نے عدیم المثال فنکاروں کی تالیفات

Marfat.com

کا ایک جلیل القدر مجموعہ فراہم کیا تھا۔" اور دیو کاسیوس لکھتا ہے: "آگ ساحل سے گزر کر عمارتوں تک جا پہنچی اور گیہوں کے گودام اور کتابیں اس میں بھسم ہو گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتابیں بڑی قیمتی تھیں اور بہت تھیں" ...... یہ اور اسی قسم کے دوسرے اقوال اس مسئلے میں شبہے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتے کہ بطالسہ کا کتب خانہ عربی فتح سے چھ صدی پہلے جل چکا تھا اور یہ بھی نادرست ہے کہ بطالسہ کا کتب خانہ جل جانے کے بعد جو دوسرے کتب خانے اسکندریہ میں منتقل یا وہاں قائم کیے گئے تھے، وہ عربی فتح کے وقت موجود تھے؟ ان میں سے پرجاموس کا کتب خانہ مارکس انطونی نے قلوپطرہ کو اس نقصان کی تلافی کے طور پر تحفتاً دیا تھا جو اس کے آباؤ اجداد بطالسہ مصر کا کتب خانہ ضائع ہو جانے سے اسے پہنچا تھا۔

بہت ممکن ہے کہ اسکندریہ میں اس کے علاوہ اور بھی کتب خانے ہوں، جنہیں مصر کے دارالسلطنت کی اس بلند علمی حیثیت نے برقرار رہنے دیا ہو، جس کی بنا پر اس کی یونیورسٹی صرف یونانی اور رومی طلباء و علماء ہی کی نہیں، اس زمانے میں دنیا کے تمام شائقین علم کی امنگوں کا مرکز تھی، لیکن یہ تمام کتب خانے بھی ان خانہ جنگیوں کی نذر ہو گئے۔ جن کے شعلے چوتھی صدی عیسوی کے نصف آخر میں عیسائیوں اور بت پرستوں کے درمیان بھڑکے تھے۔ تاریخ المورخ کا بیان ہے: "اسکندریہ میں دو کتب خانے تھے، ایک بروکیون کا کتب خانہ، جو جالینوس کے عہد 263ء میں تلف ہو گیا اور دوسرا سراپیوم کا کتب خانہ جو پہلے کتب خانے کی طرح 391ء میں تیوفیلوس کی بغاوت کا نشانہ بن گیا اور اس طرح ابن عاص رضی اللہ عنہ کے مصر فتح کرنے سے اڑھائی سو برس پہلے ہی ان دونوں کتب خانوں کا نام و نشان تک مٹ گیا تھا۔" تاریخ ہمیں نہیں بتاتی کہ اس مدت میں کسی امیر یا بطریق یا حاکم نے ان کتب خانوں کی جگہ کوئی دوسرا کتب خانہ قائم کیا ہو، یا اس کے لیے کوشش کی ہو۔ بٹلر کہتا ہے: "اوپر آپ دیکھ آئے ہیں کہ مذہبی شورش کے دوران ...... 366ء ...... میں سیزر کے ساتھیوں نے کیسی تباہی مچائی تھی۔ گمان غالب ہے کہ اس میں جو کتب خانہ تھا وہ بھی اسی شورش کی بھینٹ چڑھ گیا۔" اس کے بعد کہتا ہے "عیسائیوں میں تیوفیلوس کی قیادت میں سیراپیس کے عظیم معبد پر ہلہ بول دیا اور اسے تباہ و برباد کرنے لگے۔ یہ بالا تفاق 391ء کا واقعہ ہے مسلمہ طور پر کتب خانہ اس معبد سے ملے ہوئے کمروں میں تھا اور یہ بھی طے شدہ حقیقت ہے کہ معبد بالکل تباہ و برباد کر دیا گیا تھا اس لیے لازم ہے کہ کتب خانہ آپ سے آپ

برباد کردیا گیا ہو۔"①

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ فتح مصر کے وقت حنا نحوی زندہ نہ تھا بطالسہ کا کتب خانہ سیزر کے عہد میں جل چکا تھا اور بعد کو قائم کیے جانے والے کتب خانے مسلمانوں کے مصر میں داخل ہونے سے پہلے ہی تلف ہو چکے تھے، راویوں کے وہ اقوال خود بہ خود ختم ہو جاتے ہیں، جن میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر کتب خانہ اسکندریہ کو نذر آتش کرا دینے کا الزام لگایا گیا ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اسکندریہ کے تمام خاص و عام کتب خانے معدوم ہو گئے تھے اور مصر کے کلیساؤں اور یونیورسٹیوں میں ان کے اپنے کتب خانے بھی باقی نہ رہے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ عربی فتح کے وقت بھی مصر کے دارالسلطنت کی علمی شہرت برقرار تھی۔ فتح سے کچھ پہلے علم کے دورسیا۔ صفرنیوس اور حنا مسکوس وہاں گئے تھے اور اس کے مختلف حصوں کی سیر کی تھی۔ اسکندریہ کے کتب خانوں میں جو کتابیں ان کی نظر سے گزریں، ان کا ذکر انہوں نے بڑی حیرت سے کیا ہے لیکن اس کتب خانے کا ان کی تحریر میں کہیں اشارہ تک نہیں ہے، جس کے متعلق اس کہانی کے راویوں کا بیان ہے کہ وہ خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ کے حکم سے جلا دیا گیا اور یہ سابقہ دلیلوں میں ایک نئی دلیل کا اضافہ ہے، جس سے اس کہانی کا افتراء ثابت ہوتا ہے، پھر فتح مصر کے بعد حنا نقیوسی نے بھی حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی حکومت کے واقعے لکھے تھے اور مسلمانوں پر ایسی بری طرح برسا تھا کہ ان کی جنگی مجبوریوں کو بھی نہیں بخشا۔ لہٰذا کتب خانہ اسکندریہ اور اس کے جلائے جانے کا ذکر اس کے ہاں بھی کہیں نہیں ہے جس سے اس جھوٹے الزام کے سارے تار و پود بکھر کے رہ جاتے ہیں اور مسلمانوں کے بدترین دشمن کے دل میں بھی اس کے متعلق کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔

ان تمام دلیلوں کے بعد ہم اس کم عقلی کی بات کو دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتے، جس کے سلسلے میں مؤرخین کہتے ہیں کہ جو کتابیں حماموں میں تقسیم کی گئی تھیں، ان سے مسلسل چھ مہینے تک آگ جلائی جاتی رہی۔ اگر اس بات کے حق میں کوئی دلیل تھی تو مؤرخین نے اس سے پہلو تہی کیوں کی اور خیال کے طوطے مینا اڑا کر اپنی عبارتوں کو ایسے فقروں پر کیوں ختم کیا جو قفطی کے

① بٹلر نے کتب خانہ سراپیوم کے متعلق نو صفحے میں مفصل بحث کی ہے، جو چاہے اس سے رجوع کر سکتا ہے (بٹلر کا عربی ترجمہ، ص357-366)

Marfat.com

قول: ''اسے سنیے اور تعجب کیجیے؟'' سے ملتے جلتے ہیں۔ ایک ایسی کہانی کے لیے جس کے خلاف اتنی کثرت سے دلیلیں پیش کی گئیں، کیسے ممکن ہوا کہ وہ صدیوں تک دہرائی جاتی رہے اور بعض مسلمان مؤرخین بھی اس کی روایت و تصدیق میں کوئی تکلف محسوس نہ کریں؟ میرے نزدیک اس کا سبب واضح ہے اور وہ پہلی صدی ہجری کے مسلمانوں اور ساتویں صدی ہجری اور اس کے مابعد کے مسلمانوں کی عقلی قوتوں کا فرق ہے! مسلمان عہد رسالتؐ و خلافت راشدہ میں کارگاہ وجود پر غور اور اس کے اسرار کو تلاش کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے تاکہ انہیں معلوم ہو جائے، کائنات میں اللہ کی سنت کیا ہے؟ اس غور و فکر اور ان سرار کی تحقیق و تلاش کے لامحدود وسائل ان کے پاس تھے، بلکہ وہ آزادی فکر کو پوری پوری اہمیت دیتے تھے اور اسے اپنے ایمان کی قوت کا ایک اہم جزو سمجھتے تھے۔ دوسروں کے افکار اور اپنے پیش روؤں کی تحریروں سے واقفیت بہم پہنچانا ان کے نزدیک جائز ہی نہیں، واجب تھا وہ باطل کا مقابلہ کرنے سے نہیں گھبراتے تھے، اس لیے کہ ان کے دل صحیح و سالم اور ان کی بصیرتیں روشن تھیں اور اس لیے کہ جزئیات و تفصیلات ان پر حملہ کر کے ان کے دل و دماغ کو جکڑ کے انہیں فولادی سانچوں میں قید نہ کر سکتی تھیں، جن سے نکلنے کی قوت وہ اپنے اندر نہ پائیں۔ چنانچہ وہ اجتہاد کرتے تھے اور ان کا اختلاف باہمی اقدار میں کوئی کمی نہ آنے دیتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے ذمہ دار تھے اور ان میں سے ہر ایک کا یہ ایمان تھا کہ ان کا ساتھی اگر اجتہاد کرتا ہے تو محض اس لیے کہ وہ اسلام اور تمام مسلمانوں کی بھلائی چاہتا ہے۔ آپ پڑھ آئے ہیں کہ طاعون کے زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے درمیان کیسا اختلاف ہوا تھا، لیکن اس کی وجہ سے نہ امیر المؤمنین کے دل میں امین الامت کا احترام کم ہوا، نہ امین الامت نے امیر المؤمنین کی تعظیم و تکریم میں کوئی فرق آنے دیا۔

مسلمانوں کے اس اجتہاد نے ان کا فہم کا دائرہ اتنا وسیع کر دیا کہ خلفائے عباسیہ نے اپنے حکم سے طب، ریاضی، حکمت اور فلسفے کی ان کتابوں کا ترجمہ کرایا، جو یونان و ایران اور ان کے علاوہ دوسرے ممالک کے مصنفین کی لکھی ہوئی تھیں اور انہیں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خوف نہ ہوا کہ یہ ترجمے عقائد کو داغدار یا دلوں کو فاسد کر دیں گے۔ ایک ایسی قوم، جس کی شان یہ ہو، اس کے کسی فرد کی طرف یہ قول منسوب نہیں کیا جا سکتا: ''کتابوں کے متعلق یہ ہے کہ اگر ان میں وہی کچھ ہے جو کتاب اللہ میں ہے تو ہمیں ان کی ضرورت نہیں اور اگر وہ اس کے خلاف ہیں تو ہمارے کس

Marfat.com

کام کی!''مسلمان جانتے تھے کہ کتاب اللہ میں طب، ہندسہ اور ریاضی جیسے بہت سے علوم وفنون کی تفصیل نہیں ہے اور ان علوم کے متعلق جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں ان کے مضامین سے واقفیت بہم پہنچانا اس کائنات ہستی میں اللہ کی سنت کو جاننے کا بہترین رستہ ہے۔لیکن جب مسلمانوں نے اختلاف رائے کو بدعقیدگی قرار دے کر ایک دوسرے پر طعن والزام کے تیر چلانے شروع کر دیئے تو اسلامی عقلیت بھی اسی گڑھے میں گر پڑی جس میں اس سے پہلے مسیحی عقلیت گر چکی تھی۔لوگوں میں مذہبی جمود پیدا ہو گیا، زبانیں شرک وبدعت کے فتوے برسانے لگیں اور کسی مروجہ رسم کے خلاف تنقید کو ایک ایسا گناہ قرار دے دیا گیا، جس کی سزا اس سے کم کچھ ہو ہی نہ سکتی تھی کہ اس بد زبان کے دین میں کیڑے ڈالے جائیں اور اس کی معاش، اس کی آزادی اور اس کی زندگی کو انتہائی مظالم کا ہدف بنایا جائے۔یہی وجہ ہے کہ آپ کو متاخرین کی کتابوں میں اسلاف کی رائے پر تنقید بہت کم ملے گی، بلکہ آپ دیکھیں گے کہ وہ صرف اس بات کے نقل کرنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں، جو ان کے پیش رو لکھ گئے ہیں چاہے روایات اتنی مختلف ہوں کہ ان کا اختلاف، تناقض وتضاد کی حد تک پہنچ جائے اور کسی سے روایات کے تناقض وتضاد پر صبر نہیں ہو سکتا تو بھی وہ ان کی کجی کو درست اور ان کی غلطی کی اصلاح نہیں کرتا، بلکہ تمام روایات پیش کر دینے کے بعد بس یہ لکھ کر بری الذمہ ہو جاتا ہے کہ''واللہ اعلم کہا یوں ہی جاتا ہے۔''

ابتداءً یہ جمود، عقائد وعبادات اور اصول نقد میں پیدا ہوا، لیکن بہت جلد تمام علوم وفنون میں پھیل گیا، جن میں تاریخ بھی شامل ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل کا کسی ایک پہلو میں آزاد اور دوسرے پہلو میں مقید ہونا ناممکن ہے، عقل جب اپنے پاؤں میں زنجیر ڈالنے پر رضامند اور اصول عقائد وتشریع میں بحث ونظر سے معذور ہو گئی تو جمود اس کی عادت اور اس کے لیے ایک ایسا نظام بن گیا، جس پر وہ ہر معاملے میں چلنے لگی۔اس میں تعجب بھی نہ ہونا چاہیے۔آپ علم اور غیر علم یا کسی علم اور کسی فن کے درمیان حد فاصل قائم نہیں کر سکتے، اس لیے کہ علوم وفنون کا آپس میں رشتہ ہے اور وہ ایک دوسرے کی اعانت کرتے ہیں۔پس اگر عقل کسی ایک پہلو میں آزاد ہو تو دوسرے پہلوؤں میں بھی اپنی آزادی سے دست بردار نہیں ہو سکتی۔اسی طرح اگر وہ کسی ایک جہت میں جامد ہو تو باقی تمام جہات میں بھی جامد ہو جاتی ہے۔اس کا ولولہ عمل سرد پڑ جاتا ہے اور اس کی قوت حیات جواب دے جاتی ہے۔یہی کچھ اسلام کے آخری ادوار میں پیش آیا اور مسلمان مؤرخین

Marfat.com

کتب خانہ اسکندریہ جیسی جھوٹی کہانی کی تصدیق کرنے لگے، جس میں مسلمانوں کے عظیم المرتبت خلیفہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر اس کتب خانے کو نذر آتش کرا دینے کا الزام لگایا گیا تھا۔ یہ ایک انتہائی افسوس ناک بات ہے، اس لیے کہ عقلی آزادی ہی اسلام کا جوہر اور قرون اولیٰ کی اسلامی زندگی کی ٹھوس بنیاد تھی۔ اسی عقلی آزادی نے مسلمانوں کو اتنی بلندی پر پہنچایا تھا اور اسی کی بدولت ان کی سلطنت دیکھتے ہی دیکھتے اتنی وسیع ہو گئی تھی۔

اسلام کو قرار و ثبات بخشنے والی یہی عقلی آزادی تھی، جس نے عربوں میں خود اعتمادی اور عزت نفس کو پروان چڑھایا اور ان میں مساوات کا وہ جذبہ بیدار کیا جو ترقی کے آغاز سے ان کی فطرت کا ایک جزو تھا۔ ایک عرب چاہے وہ صحرا کا رہنے والا ہو یا شہر کا اپنی زندگی کو آزادی کی قیمت سمجھتا تھا۔ وہ ہر اس قوت سے نبرد آزما ہوتا تھا جو اس کی آزادی میں کسی طرح کی حد بندی کرے اور صرف اس ہوا کی سی کامل آزادی ہی کو قبول کرتا تھا، جس میں وہ سانس لیتا تھا، لیکن عربوں کے مشرکانہ عقائد ان کے گلے کا طوق بنے ہوئے تھے، جن کے بوجھ سے وہ دبے جا رہے تھے اور اس ''اعلیٰ مثال'' تک نہ پہنچ سکتے تھے جو ان کے دلوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی اور جس پر وہ جان نچھاور کرتے تھے۔ چنانچہ جب اسلام نے ان کے گلے سے یہ طوق اتار پھینکا اور عقلی آزادی کو بندشوں سے نجات ملی تو جیسا کہ آپ دیکھ آئے ہیں، وہ تمام روئے زمین پر چھا گئے۔ اسلام چونکہ ان کی سر بلندی و آزادی کا خواہش مند تھا، اس لیے ان کے دلوں میں اس نے سچے ایمان کی جوت لگائی اور مومنوں کے درمیان اخوت و مساوات کا رشتہ استوار کیا۔ اب کوئی مسلمان اپنی آزادی و سر بلندی میں افراط و تفریط سے کام لیتا تھا نہ ان میں کسی شخص کی ...... حتیٰ کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی بھی...... مداخلت گوارا کرتا تھا۔

قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کی یہی شان رہی اور ان کی قوت و طاقت میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا لیکن جب ان پر برا وقت آیا اور مسلمان اس آزادی سے آہستہ آہستہ ہٹ کر عقلی جمود تک پہنچ گئے تو انحطاط ان میں سرایت کر گیا اور وہ عروس نیل اور کتب خانہ اسکندریہ جیسی فرضی کہانیوں کی تصدیق کرنے لگے۔ یہی عقلی آزادی تھی، جس نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو یہ توفیق بخشی کہ وہ مصر کا خط سیاست متعین کریں اور مصر و عرب کے نسلی، لسانی اور مذہبی اختلاف کے باوجود، اہل مصر کی تالیف قلب میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔

Marfat.com

عہد فاروقی کے بعد ابن عاص رضی اللہ عنہ نے مصر میں جو کارنامے سرانجام دیئے، ہم نے ان کی تفصیل بیان نہیں کی، اس لیے کہ وہ اس کتاب کے موضوع سے خارج ہیں۔ اب ہمیں اپنے حافظے کو اس زمانے کی طرف واپس لے چلنا چاہیے۔ جب ابن عاص رضی اللہ عنہ نے فتح مصر کے متعلق سوچنا شروع کیا تھا تاکہ ہم مرد مجاہد کے اس کمال کی یاد تازہ کرسکیں کہ اس نے کیسی قابلیت کے ساتھ مصر کو رومیوں کے ہاتھ سے نکال کر مسلمانوں کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہی شخص چار ہزار سے بھی کم لشکر لے کر مصر کی طرف روانہ ہوا۔ اسی نے اس مختصر سے لشکر اور اس معمولی سی کمک کے ذریعے، جو خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ نے اسے بھیجی تھی، یہ ملک فتح کیا اور یہی وہ شخص ہے جس نے اس ملک کی سیاست اور اس کا نظام حکومت مرتب کیا۔ اس کے معاملات کی تدبیر کی اور اس کے باشندوں کا دل ہاتھ میں لیا۔ اس لیے جو یہ کہتا ہے مبالغہ نہیں کرتا کہ ''اسلامی مصر اپنے وجود کے لیے جتنا حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا احسان مند ہے اتنا عراق، شام اور ایران میں سے کوئی ملک اپنے مسلمان فاتح کا احسان مند نہیں۔''

اب ہم عہد فاروقی رضی اللہ عنہ کی ان عظیم الشان فتوحات سے فراغت پا چکے ہیں، جنہوں نے دنیا کو ہلا کے رکھ دیا اور جنہیں دیکھ کر مؤرخین حیرت میں ڈوبے جاتے ہیں۔ ان فتوحات کے دوران میں ہم یہ دیکھنے کے لیے کہ غازیان عرب کسریٰ اور قیصر کی حکومتوں کے تختے کس طرح الٹتے ہیں، جزیرہ نمائے عرب کو چھوڑ آئے تھے۔ اب ہمیں ایک بار پھر مدینہ چلنا اور پہلوئے خلافت میں کھڑے ہو کر دیکھنا چاہیے کہ عہد فاروقی میں جزیرۃ العرب کیسی کیسی تبدیلیوں سے گزرا اور اس کے باشندوں نے ان غیر معمولی واقعات کا کس طرح مقابلہ کیا؟ جنہیں ان کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں اور جنہیں ان کے کان سن رہے تھے۔ ہمارے ساتھ قاری کو بھی نظر آئے گا کہ اس سلسلے میں جو کچھ وہاں پیش آیا وہ اپنی عظمت وجلال کے اعتبار سے اسلامی فتوحات کی عظمت وجلال سے کسی طرح کم نہ تھا، بلکہ ان فتوحات کے مقابلے میں اس کا اثر زیادہ دیرپا اور زیادہ گہرا تھا۔

باب:22

اُمورِ مملکت کا نظم ونسق

جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور غزوات وفتوحات کا دور تھا، جس میں فتح ونصرت نے اسلامی پرچموں سے پیمان وفا باندھ رکھا تھا اور ان کی حکومت مشرق میں افغانسان اور چین، شمال میں اناطولیہ اور قزوین، مغرب میں تیونس اور اس سے آگے بڑھ کے شمالی افریقہ اور جنوب میں بلاد نوبہ سے جا ملی تھی، حالانکہ فتوحات کو اس حد تک وسیع کرنے کا ارادہ نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تھا، نہ ان کے پیشرو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پالیسی تو یہ تھی کہ عربی قوم ایک ایسی وحدت میں ضم ہو جائے جو جنوب میں خلیج عدن سے لے کر انتہائے شمال میں صحرائے ساوہ تک پھیلی ہوئی ہو اور عراق وشام اس وحدت کے دائرے میں آجائیں۔ اس لیے کہ یہاں لخمیوں اور غسانیوں کی حکومت تھی جو عربی النسل تھے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارادہ پورا ہو گیا تو انہوں نے فتوحات کے قدم روک لیے اور خواہش کی کہ ان کے اور ایرانیوں کے درمیان آگ کا پہاڑ حائل ہو جائے کہ نہ ایرانی ان کی طرف آسکیں، نہ وہ ایرانیوں کی طرف جا سکیں۔ وہ تمنا کرتے تھے کہ مسلمانوں اور رومیوں کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی ہو جائے کہ رومی مسلمانوں سے ان کے مفتوحہ علاقے واپس نہ لے سکیں، لیکن واقعات انسانی ارادوں سے اکثر وبیشتر قوی ہوتے ہیں اور واقعات ہی نے مسلمانوں کو اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھنے پر مجبور کر دیا تا آنکہ وہ ان حدود تک پہنچ گئیں جو ہماری نظر سے گزر چکی ہیں۔

ان فتوحات نے اس زمانے کی دنیا اور ان مؤرخین کو حیرت میں ڈال دیا، جنہوں نے واقعات کی تفصیل بیان کرنے کے بعد ان کے اسباب کی چھان بین کرنی چاہی۔ ان فتوحات میں غازیان اسلام اور ان کے ایرانی اور رومی دشمنوں کی نفسیات کو جو دخل تھا اس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، لیکن ایک سبب اور بھی تھا جس نے فتوحات کی وسعت پر غیر معمولی اثر ڈالا اور

Marfat.com

وہ جزیرۃ العرب کا نظام حکومت تھا۔ یہ نظام ہجرت رسول ﷺ کے بعد کے بیس سال میں ایک ایسے انقلاب سے گزرا جس نے عربی قوم کو یہ قوت بخشی کہ وہ سکون واطمینان کے ساتھ ان عظیم الشان تاریخی حوادث کا مقابلہ کر سکے۔ اس سکون واطمینان نے عربوں کے جذبہ خودداری کو بڑھایا، ان میں اپنی قوت کا شعور پیدا کیا اور ان کے اس یقین میں پختگی پیدا کی کہ جس پیغام کے وہ حامل ہیں اسے ساری دنیا تک پہنچانا ان کا اور اسے سننا ساری دنیا کا فرض ہے۔ چنانچہ کوئی طاقت ان کی راہ کا بھاری پتھر بنی نہ کوئی قوت انہیں اپنے پیغام کی اشاعت سے روک سکی۔ یہ نظام نہ کسی منطقی فکر آرائی کا نتیجہ تھا، نہ فقہاء کی قانون سازی کا کارنامہ جنہوں نے مل بیٹھ کر اور اس کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے اسے مرتب کیا اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ یا آپؐ کے خلفاء نے اس کو نافذ کر دیا ہو! ہرگز نہیں! یہ نوزائیدہ سلطنت اپنی طفولیت سے لڑکپن اور لڑکپن سے شباب تک کے ارتقائی مرحلے بڑی تیزی سے طے کر رہی تھی۔ اس لیے والی سلطنت کا اولین فرض تھا کہ ان حالات کا لحاظ رکھے جو ارتقائی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس کی سلطنت میں رونما ہو رہے تھے اور سب سے پہلے اس مرکزی قوت کو منظم کرے جو اس انقلاب وترقی کے پس پردہ کام کر رہی تھی اور مملکت کے مختلف حصوں کو ایک مضبوط لڑی میں پرو کر انہیں ناقابل شکست بنا دے۔ بلاد عرب میں اتحاد یا کسی قوم کا باقاعدہ نظم حکومت قائم ہونے سے پہلے ہی یہ مرکزی قوت ابھرنی شروع ہوگئی تھی اور اس سے پہلے کہ عرب کسی نظم حکومت سے آشنا ہو، آس پاس کے ملکوں میں اپنے اپنے مستقل نظام قائم تھے۔

پھر عراق پر ایرانی اور شام پر بزنطینی نظام حکومت مسلط تھا، لیکن مدینہ والوں نے ان دونوں نظاموں میں سے کسی نظام کا چربہ اتارنے اور ایک مکمل عربی یا اسلامی دستور حکومت کو کاغذ پر ثبت کرنے کی کوشش نہ کی جو مملکت کے نزدیک و دور میں نافذ کیا جائے اور اگر کوئی اس قسم کی کوشش کرتا بھی تو اس کی تحریر اور اصلاح وترمیم ہی میں کئی سال لگ جاتے، جب کہیں مملکت کے مختلف حصوں کے لیے ایک متحدہ دستور وجود میں آتا، لیکن وسیع و برق رفتار فتوحات کے دور میں تدوین دستور کی گنجائش ہوتی ہے نہ وہ اسے برداشت کرتا ہے۔ چنانچہ فتوحات کا دور بالطبع اجتہاد کا دور ہوتا ہے جس میں ہنگامی حالات اور ان کے مقتضیات کو دیکھ کر ہی کوئی حکم دیا جاتا ہے۔ پھر جب فتوحات کی برق رفتاری کا وہ عالم ہو جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں تھا

Marfat.com

تو اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ دستور حکومت منطقی اصولوں سے زیادہ والیٔ سلطنت کے بدیہی فیصلوں پر موقوف ہو اور والیٔ سلطنت فتوحات کے ساتھ ساتھ چلتا رہے، نہ کہ ایک قدم پیچھے رہے۔ مکہ اور طائف کی فتح کے بعد جب سارا جزیرۃ العرب اسلام کے پرچم تلے آ گیا تو یہی کچھ ہوا۔ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف گوشوں سے وفد پہ وفد مدینہ آنے اور قبول اسلام کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ سرکار رسالت نے بھی عرب کے مختلف اطراف میں اپنے عمال بھیجنے شروع کیے جو لوگوں کو دین کی تعلیم دیتے اور ان سے صدقات وصول کرتے تھے۔ ان ملکوں کی فرمانروائی انہیں لوگوں کے ہاتھ میں رہنے دی گئی جو قبول اسلام سے پہلے وہاں کے حاکم تھے، اسی طرح اسلامی احکام کے مطابق کچھ تبدیلیاں کر کے نظام حکومت بھی وہی رہنے دیا گیا جو پہلے سے چلا آتا تھا۔

اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے یاد فرمالیا اور مدینے والوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دست خلافت پر بیعت کی، تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی عہد رسالت کی طرح صدقات وصول کرنے کے لیے اپنے عمال بھیجے، لیکن عربوں نے انکار کر دیا اور اسے اپنے سیاسی استقلال اور شہری آزادی پر حملہ قرار دے کر اس کی حفاظت و مدافعت پر بضد رہے اور اس طرح ارتداد کی لڑائیاں وجود میں آئیں، جن میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کامیابی نے مدینے کا اقتدار بحال کر دیا اور یہی وہ کامیابی تھی جس نے بلاد عرب میں سیاسی اتحاد کی بساط بچھائی۔ پھر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد زمام خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے اپنی تمام تر توجہ اس وحدت کی ایسی تنظیم پر صرف کر دی، جسے عظیم معنوی انقلاب کی تاج پوشی اور اس اقتدار سلطنت کے ستونوں کی تعمیر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جس نے دنیا میں اپنے پرچم نصب کر دیئے۔ یہ تھی اس زمانے کی حالت جس میں اسلام نے ترقی و استحکام کی راہیں طے کرنی شروع کیں۔ اس لیے نظام قائم کرنے والے کی سیرت اور اس کی تعلیم ہی اس نظام کی تصویر تھی جو اس کی شخصیت اور اس کے تصرفات و احکام کا دوسرا نام تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سیرت، اسلام کے روحانی نظام اور اسلامی جمعیت کے نظام کی تمدنی صورت گری کا نقطہ آغاز تھی۔ یہ تصویر وقت اور احوال کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی گئی۔ لیکن اس چوکھٹے سے باہر نہ نکلی جو قرآن نے روحانی اور تمدنی زندگی کے لیے بنایا تھا۔

Marfat.com

اگرچہ جزیرہ نمائے عرب کا سیاسی نظام وہی رہا جو عہد جاہلیت میں تھا اور عہد رسالتؐ میں اس کے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی، لیکن تمدنی زندگی کو قرآن کے اوامر ونواہی نے اس طرح متاثر کیا کہ بعد کے واقعات پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔ فتنہ ارتداد کے استیصال اور عرب کی سیاسی وحدت کے عہد کا افتتاح کرنے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو چاہیے تھا کہ اس وحدت کی تنظیم کرتے اور اس کی بنیادوں کو استوار فرماتے، لیکن ارتداد کی لڑائیوں کے ختم ہوتے ہی عراق وشام میں اسلامی سلطنت اور فتوحات کی بساط بچھنی شروع ہوگئی اور خلیفہ اول ایران وروم کی جنگوں سے قطع نظر کر کے ایک ایسے نظام کی تفصیلات مرتب نہ فرما سکے جو نئے دور کی ضرویات کے مطابق بھی ہوتا اور اس ملک میں قائم بھی کیا جا سکتا، جس کے بعض گوشوں میں ابھی تک بغاوت کے شعلے بھڑک رہے تھے اور جہاں ایک مستحکم وحدت کے لیے فضا ہنوز سازگار نہ تھی۔ اس کے باوجود سیاسی وحدت کا آغاز ہوگیا اور وہ آہستہ آہستہ بلاد عرب کو اپنی آغوش میں لینے لگی۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، جہاں کہیں ہمسایہ ملکوں میں ملتے جلتے احکام نافذ ہوتے ہیں، تمدنی امتیازات دھندلے پڑتے چلے جاتے ہیں اور ان امتیازات کا زوال ان دیواروں کو ڈھا دیتا ہے جو ان ملکوں کے درمیان حائل ہوتی ہیں اور جہاں کہیں ہمسایہ قوموں کی مشترک غرض اور اعلیٰ مثال میں کامل اتفاق ہوجاتا ہے وہ قومیں فطری طور پر ایک دوسرے سے گھل مل جاتی ہیں اور زمانے کا امتداد ان کی اس باہمی پیوستگی کو پختہ بنا دیتا ہے۔ جب سے عربوں نے اسلام قبول کیا تھا، عقائد وعادات اور معاملات میں ان کا مکمل اتحاد ہوگیا تھا، جوا، شراب، مردار، خون، سور کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کی قربانیاں ناجائز قرار دی جا چکی تھیں۔ بیویوں کی تعداد مقرر کر دی گئی تھی۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کی ممانعت ہو چکی تھی۔ معاملات کی تنظیم اور میراث کی ترتیب وجود میں آ چکی تھی اور ان سب چیزوں نے مل کر ان کی تمدنی زندگی میں ایسا سلیقہ پیدا کر دیا تھا جس سے قبل ازیں وہ بالکل ناآشنا تھے۔

پھر عقائد وعبادات کے اتحاد نے ان کے نسلی اور لسانی رشتوں میں مزید قوت ومتانت پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ ارتداد کی لڑائیاں ختم ہوتے ہی جب مسلمان عراق وشام کی طرف بڑھے اور جزیرہ نمائے عرب کی فضائیں ایران وروم کے مقابلے میں ان کی قوت ونصرت سے گونجنے لگیں تو جنگ وفتح کے اشتراک نے عربی وحدت کو اور قوی کر دیا اور وہ تعاون کی ضرورت واہمیت محسوس

کرنے لگے تاکہ فتح ونصرت ان کا ساتھ نہ چھوڑے اور وہ اس کی نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ بہرہ یاب ہوتے رہیں۔ اسی لیے آپ نے دیکھا کہ جن لوگوں کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کے ارتداد کی بنا پر عراق وشام کی جنگوں میں حصہ لینے سے روک دیا تھا، وہ بھی قبائلی اور وطنی اختلاف کے باوجود یہ چاہتے تھے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے طور پر اس جنگ میں شریک ہوں اور ان لوگوں کی طرح اس کی غنیمت سے فائدہ اُٹھائیں۔ جو اول دن سے اسلام پر قائم تھے اور اس کی راہ میں مسلسل جدوجہد کرتے رہے تھے پھر جس وقت آپ ان تمام باتوں پر اس اعلیٰ مثال کا اضافہ کریں گے جس کی طرف اسلام نے عربوں کی رہنمائی کی جس نے اپنے نور سے ان کے دلوں کو روشن کیا اور انہیں ایمان کے جلال و جمال سے چشم آشنا کر کے اس کی راہ میں جاں سپاری ان پر فرض قرار دے دی تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جزیرہ نمائے عرب کی وحدت وقت کے ساتھ ساتھ، کس طرح مرتب اور قوی ہوتی گئی۔ کس طرح اس نے ایک مکمل سیاسی وحدت کی شکل اختیار کی اور کس طرح زمانے نے اسے آہستہ آہستہ استحکام و پختگی بخشی!

اس میں شک نہیں کہ جن بزرگ ہستیوں نے جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کی جڑیں مضبوط کیں، وہی اپنی طاقتور شخصیتوں، اپنی تعلیمات اور اپنے کردار کی بنا پر اس وحدت کا محور تھیں۔ نبی عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات والا صفات اور آپ کی رسالت اسلام اس وحدت کا سرچشمہ اور اساس تھی اور خلیفہ اول نے ان محرکات وعوامل پر کاری ضرب لگائی، جو اس وحدت پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دینا چاہتے تھے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلافت اس وقت سونپی گئی جب جزیرہ نمائے عرب کی وحدت پردوں میں سے جھلک رہی تھی اور جب اس کے لیے تکمیل کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ مبادا وہ شانے کمزور ہو جائیں جنہیں آئندہ اس کا بوجھ سہارنا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ضعف کا شکار ہونے والوں میں سے نہ تھے۔ ان کی شخصیت کی توانائی اور اس کے قوت ظہور کی روشن مثالیں آپ اسی کتاب میں جا بجا دیکھ آئے ہیں اور اس کا جو نمایاں اثر اسلام سے پہلے اور اس کے بعد کی عربی زندگی پر مرتب ہوا تھا، وہ بھی آپ سے پوشیدہ نہیں۔ مدینہ کی ہجرت کے بعد ان کی یہ خصوصیات اور بھی نکھر گئی تھیں، جہاں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرح وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیر خاص تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بعض معاملات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف کرتے تھے، جن میں سے اسیران بدر جیسے دو چار مواقع پر قرآن نے ان کی تائید بھی کی

Marfat.com

اور چونکہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر سچا ایمان رکھتے تھے، اس لیے جب وحی ان کی رائے کے خلاف فیصلہ کرتی تھی تو وہ سب سے پہلے اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی میں بھی انہیں ایک خاص امتیاز حاصل تھا۔ ان کی رائے کے اختلاف کا یہ سلسلہ عہد صدیقی میں بھی جاری رہا۔ جب حضرت ابوبکر اپنی رائے پر اصرار فرماتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے تسلیم کر لیتے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے امیر تھے، لیکن ان کی اطاعت نے ان کی شخصیت کو بھی محو نہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ایمان ہونے کے باوجود انہوں نے وقت کی ضرورت اور سنت ثابتہ کا فرق کبھی فراموش نہ ہونے دیا، بلکہ کبھی کبھی تو وہ سنت پر نظر ثانی کو بھی ممکن سمجھتے تھے اور اپنے اس یقین کے تحت کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت موجود ہوتے تو اپنے فیصلے سے رجوع فرما لیتے، اسے سنت سے انکار پر محمول نہ کرتے تھے۔

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ جن مسائل سے دلچسپی رکھتے تھے، ان میں عرب ممالک کی سیاسی وحدت بھی شامل تھی، لیکن ان کی اس دلچسپی نے انہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اعانت سے کبھی غافل نہ کیا اور وہ صدیقی سیاست کے نفاذ میں پورے خلوص سے کوشاں رہے، اس کے بعد جب وہ خود مسند آرائے خلافت ہوئے تو سب سے پہلے انہوں نے اپنی توجہ اسی وحدت کے استحکام پر مبذول فرمائی۔ ان کے غور و فکر نے انہیں اس نتیجے پر پہنچایا کہ یہ وحدت اس وقت تک محفوظ و مامون نہیں رہ سکتی، جب تک وہ ہر قسم کے شائبے سے بالکل پاک نہ ہو جائے اور اس کی یہی ایک صورت ہے کہ جس طرح عربوں کی زبان ایک ہے اسی طرح ان کا وطن اور ان کے عقائد بھی مکمل طور پر ایک ہو جائیں۔ لیکن یہودی اور عیسائی ابھی جزیرہ عرب میں موجود تھے۔ تو کیا کتاب اور سنت سے اختلاف کیے بغیر حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ انہیں وہاں سے نکال سکتے تھے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچتے ہی یہودیوں سے دوستی کا معاہدہ فرمایا۔ لیکن وہ عہد شکنی کر کے غداری پر اتر آئے اور مدینے سے نکال دیئے گئے۔ اس کے بعد بھی انہوں نے اپنی دشمنی کا سلسلہ جاری رکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جزیرہ نمائے عرب کی اکثر یہودی بستیوں سے جلاوطن فرما دیا۔ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہودیوں کا اپنی آبادیوں میں رہنا کوئی ایسا حق نہ تھا جس کا احترام ضروری ہو اور ان کے ساتھ دوستی کا معاہدہ صرف ایک سیاسی قدم تھا جو مدینے کے ابتدائی دور میں حکومت کی کسی مصلحت کے پیش نظر اُٹھایا گیا تھا۔ لیکن جب رسول

اللہ ﷺ نے یہ محسوس فرمایا کہ حکومت کی اعلیٰ مصلحت اسے درست نہیں سمجھتی تو اسے چھوڑ کر دوسرا طریق عمل اختیار کر لیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے میں حکومت کی اسی اعلیٰ مصلحت کا تقاضا تھا کہ تمام جزیرہ نمائے عرب میں صرف ایک عقیدہ رہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے عہد خلافت کا آغاز ہی اس سے کیا کہ نجران کے عیسائیوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دیا۔ یعلی بن امیہ کو ان کا حکم تھا کہ عیسائیوں پر دین کے معاملے میں زبردستی نہ کی جائے۔ لیکن جو عیسائی اپنے مذہب پر قائم رہے، اسے نکال دیا جائے اور جیسی اور جتنی زمین اس نے نجران میں چھوڑی ہو، ویسی اور اتنی ہی زمین اسے عراق میں دے دی جائے اور ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آیا جائے۔ یہی کچھ ان یہودیوں کے ساتھ کیا گیا جو خیبر اور فدک میں باقی رہ گئے تھے۔ انہیں وہاں سے جلاوطن کر کے شام بھیج دیا گیا، ان کی زمینوں کی قیمت انہیں دے دی گئی اور ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ کی گئی۔ اس طرح جزیرۃ العرب اسلام کے سوا ہر عقیدے سے خالی ہو گیا اور اس وحدت کی بنیادیں وہاں استوار ہو گئیں جو امیر المؤمنین کا مطمح نظر تھی۔

یہ ہے اس سبب کی واضح تصویر، جس کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکالا تھا اور اپنے اس اقدام میں سنت سے اختلاف و تجاوز نہ کیا تھا، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہود و نصاریٰ سے جو عہد فرمایا تھا، وہ کوئی ایسی سنت نہ تھی، جسے حکم کہا جا سکے بلکہ وہ ایک سیاست تھی جو عہد رسالت ہی میں بدل گئی تھی، تو پھر بعد کو اس کی تبدیلی میں کیا قباحت تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سیاست کو اس لیے بدلا تھا کہ بدلتے ہوئے حالات، فتوحات کی وسعت اور جزیرۃ العرب میں وحدتی رشتوں کے استحکام کی شدید خواہش اس کی متقاضی تھی کہ اسے بدلا جائے۔ آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس عہد نامے پر کیوں جمے رہتے جسے حالات برداشت نہ کرتے تھے اور جو مملکت کی مصلحت اور اس کی اعلیٰ سیاست کے پیش نظر مضرت رساں ہو گیا تھا۔ یہ عہد نامہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک خاص وقت کے لیے تھا، جو اپنی مدت ختم ہو جانے کے بعد خود بخود ختم ہو جاتا تھا اور جس کی تجدید اس وقت تک نہ ہو سکتی تھی جب تک امیر المؤمنین ہی نہ چاہیں۔ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ میں وحدت عرب کے سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے وہ خیالات منسوب کر رہا ہوں جو ان کے ذہن میں ہی نہ آئے تھے۔ تمام مورخین اس پر متفق ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو جلاوطن کرنے میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے استناد کیا تھا

''سرزمین عرب میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔'' علامہ بلاذری اور دوسرے مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل نجران کی تعداد بڑھتے دیکھی تو انہیں یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کے وجود سے اسلام کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ اس لیے انہوں نے انہیں جلاوطن کر دیا اور عراق و شام میں اپنے عمال کو حکم دیا کہ ان کی زمینوں کا معاوضہ انہیں دے دو اور ان سے اچھی طرح پیش آؤ۔ اگر وہ نقض عہد کے جرم میں جلاوطن کیے جاتے تو ان سے اتنی نرمی و مہربانی کا برتاؤ ہرگز روا نہ رکھا جاتا۔

بلادعرب میں وحدت کی بنیادیں استوار کرنے کے لیے تنہا یہی کافی نہ تھا کہ وہاں اسلام کے سوا کوئی مذہب نہ رہے۔ جب تک اس کے باشندوں میں وہ تمام امتیازات نہ مٹ جاتے، جن کی بنا پر کچھ لوگ اپنے آپ کو عزت و آزادی کا دوسروں سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے اور جب تک ان میں یہ شعور پیدا نہ ہو جاتا کہ صحیح مساوات ہی ہماری سلامتی کی ضامن ہے، اس وقت تک یہ خواب حقیقت نہ بن سکتا تھا۔ ارتداد اور ارتداد سے پیدا ہونے والی لڑائیوں نے عربوں میں بعض امتیازات پیدا کر دیئے تھے، لیکن چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صحیح وحدت کے خواہش مند تھے، اس لیے ان تمام امتیازات کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنا ان پر فرض تھا، چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مرتدین پر جو پابندی لگائی تھی کہ وہ مسلمانوں کی صف میں شامل ہو کر نہیں لڑ سکتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے ختم کر دیا۔ اس کے بعد حکم دیا کہ عرب غلاموں کو آزاد کر کے ان کے رشتہ داروں کے پاس بھیج دیا جائے۔ اس لیے کہ وہ عربوں میں غلامی کے رواج کو ناپسند فرماتے تھے، اس طرح فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک نئے دور کا افتتاح کیا اور تمام عربوں کے دل میں عرب کے سب سے ہوش مند انسان کی روح سرایت کر گئی۔ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو ایک قوم سمجھنے لگے، جس کا نصب العین مشترک تھا اور اس نصب العین کی طرف انہیں لے جانے والی ایک عمومی سیاست اور ایک اعلیٰ مصلحت تھی جس کی نگرانی امیر المؤمنین فرما رہے تھے۔ یہ اعلیٰ مصلحت، جس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اسلام کے سائے میں عربی وحدت تک پہنچنے کی راہ دکھائی، اسی نے انہیں بتایا کہ وہ عربی تاریخ وسنین کا نقطہ آغاز رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کو قرار دیں، اس وقت تک عرب تاریخوں کا حساب کبھی عام الفیل سے لگاتے تھے اور کبھی عرب کی دوسری بڑی بڑی جنگوں سے، یہ جنگیں چونکہ سب کی سب جاہلیت سے تعلق رکھتی تھیں اور اسلام آیا

ہی تھا جاہلیت کے آثار ورسوم مٹانے، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عہد رسالت کی اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ اس ہجرت کو قرار دیا جو نبی علیہ التحیۃ والتسلیم نے مکہ سے مدینہ کی طرف فرمائی تھی۔ کیونکہ اسی ہجرت کے بعد سے اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو نصرت وکامرانی سے نوازنا شروع کیا تھا اور یہی ہجرت اللہ کے دین کی عزت وسربلندی کا سبب بنی تھی۔ اس کامیاب انتخاب سے عربی وحدت کو بڑی تقویت پہنچی اور اس کی اہمیت اس لیے اور بڑھ گئی کہ اس کی تکمیل 16 ہجری میں ہوئی جب اسلامی فوجیں کسریٰ اور قیصر کے ملکوں میں فاتحانہ پیش قدمی کر رہی تھیں اور مدائن میں گھس کر ایوان اعظم کے پرخچے اُڑا رہی تھیں۔ ادھر بیت المقدس کے دروازے مسلمانوں کے لیے کھل رہے تھے اور وہ کلیسائے قیامت کے پہلو میں مسجد اقصیٰ کی بنیادیں ڈال رہے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب اس شاندار اسلامی سن تقویم کو ایرانی ورومی سن تقویم کے سامنے رکھ کر دیکھا تو یہ ان سے کہیں زیادہ روشن ثابت ہوا، اس لیے کہ اس سے دنیا کی تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سن ہجری کا انتخاب ایک الہامی کارنامہ تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ مملکت کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اسی الہامی قوت کی مدد سے اپنا طرز عمل وضع فرماتے تھے اور یہ طرز عمل ہمیشہ مملکت کی صلاح وفلاح اور اس کے مقاصد کی تکمیل سے قریب تر ہوتا تھا۔ فطری بات تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سیاست کے اصول مرتب کرنے میں اپنی طاقتور شخصیت اور الہامی صلاحیت کا سہارا لیں۔ اس لیے کہ حکومت ابھی نشوو ارتقاء کے ابتدائی مراحل میں تھی اور عراق وشام کی لڑائیاں انتہائی احتیاط اور ہوش مندی کی متقاضی تھیں، جن حالات سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس زمانے میں دوچار ہونا پڑا تھا، اگر وہی حالات ہمارے یا کسی اور زمانے میں پیش آجائیں تو جنگی ضروریات کا تقاضا یہی ہوگا کہ حکومت کی باگ دوڑ کسی ایسے ذمہ دار شخص کو سونپ دی جائے جو تمام تر اختیارات کا مالک ہوتا کہ جنگی کوششوں کی تنظیم اور اس کی دشواریوں کا مقابلہ کرنے میں کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کس طرح عربوں کو اتحاد کی لڑی میں پرو دیا اور کس طرح انہیں آزادی کی دولت سے مالا مال کیا۔ پھر اس کے ساتھ ہی ساتھ جنگ کا بوجھ بھی اُٹھایا اور اس کے لیے ہر قسم کی تیاری اور ہر چھوٹی بڑی بات کا خیال رکھنے میں انتہائی دوربینی وبیدار مغزی کا ثبوت

Marfat.com

دیا...... وہ صرف لشکر کی روانگی اور اس کی پیش قدمی و پسپائی جیسے مسائل ہی پر نظر نہ رکھتے تھے، بلکہ سپہ سالاران اسلام کو جنگ کے خطوط متعین کرنے میں مشورے بھی دیتے تھے۔ یہاں تک کہ اکثر اوقات خود ہی جنگ کی ساری پالیسی مرتب کر کے بھیجتے تھے۔ پھر جب کوئی شہر یا ملک فتح ہو جاتا تو اس کے لیے مفصل سیاست کاری اور ضروری اطلاعات کے لیے احکام بھی بارگاہ خلافت ہی سے ارسال کیے جاتے تھے۔

کیا تیزی سے بدلتے ہوئے ان حالات کی موجودگی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے ممکن تھا کہ وہ آغاز خلافت ہی میں ایک مفصل نظام مرتب کر کے تمام بلادِ عرب میں نافذ کر دیتے، یا عراق میں جو ایرانی نظام رائج اور شام پر جو بیزنطینی نظام مسلط تھا، ان سے جزیرہ نمائے عرب کے لیے کوئی نظام اخذ کر لیتے؟ میں نہیں سمجھتا کہ ان میں سے ایک بات بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذہن میں آئی ہو جزیرۃ العرب اپنے جغرافیائی محل وقوع کے پیش نظر عراق و شام سے جوہری اختلاف رکھتا تھا اور عرب جس زندگی سے مانوس تھے وہ ایران و روم کے نظاموں سے میل نہ کھاتی تھی۔ پھر اگر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی تمام تر توجہ اور کوششیں جنگ پر مرکوز نہ ہوتیں تو شاید وہ اس مسئلے پر غور فرماتے، لیکن عہد فاروقی کی ابتداء میں اسلامی لشکر عراق کے محاذ پر نہایت نازک صورت حال سے دوچار تھا اور شام میں ان کی فوجیں رومی قوتوں سے نبرد آزما تھیں جو سامان و تعداد کے لحاظ سے ان سے دوگنی اور چوگنی تھیں۔ ان حالات میں ان کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ وہ جزیرہ نمائے عرب کو ایک آزاد اسلامی عرب وحدت میں ضم کر دیتے، جس سے عوام میں خود اعتمادی پیدا ہوتی اور خود اعتمادی فاتحانہ قوتوں کو مہمیز کرتی اور اس کی تنظیم زمانے کے سپرد فرما دیتے کہ وہ کتاب و سنت کی حدود میں اسے آہستہ آہستہ پختہ کرتا رہتا اور اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ جزیرۃ العرب کے مختلف حصوں میں کوئی ایک نظام نافذ کرنے کی کوشش کرتے تو اس کے نتائج نہ ان کے لیے خوشگوار ثابت ہوتے نہ مسلمانوں کے لیے۔ شہریوں کو بدویانہ نظام خوش نہ آتا اور بدوی شہری نظام قبول نہ کرتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غلاموں کو واپس کرنے اور مرتدین پر پابندیاں اٹھانے کا جو حکم دیا تھا، اس سے لوگ بہت خوش تھے۔ فارق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام بالکل صحیح تھا کہ انہیں اسی طرح خوش رہنے دیا جائے تا کہ ان میں تعاون کا جذبہ پیدا ہو اور وہ جنگ کی دعوت پر بطیب خاطر لبیک کہہ کر اسلامی فوج کا بوجھ ہلکا کریں۔ اس اثناء میں کوئی حرج نہیں اگر جزیرہ نمائے عرب کے

Marfat.com

مختلف گوشوں مثلاً یمن وغیرہ میں ان کا سابقہ نظام بحال رہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بس یہی کریں کہ ہر ریاست میں اپنا ایک والی بھیج دیں جو وہاں مدینے کی حکومت قائم کر کے لوگوں سے صدقات وصول کرے، ان میں اللہ کی حدود قائم کرے اور انہیں دین کی تعلیم دے تا کہ وہ اپنی زندگی کو اس کے احکام کے سانچے میں ڈھال لیں۔ اس کے سوا باقی تمام معاملات میں ہر قوم اور ہر قبیلے کی شخصی آزادی برقرار رکھی جائے۔ جس کے وہ برسوں سے عادی چلے آ رہے تھے اور ان ریاستوں کے باہمی روابط کو مملکت کے مجموعی مفاد پر اثر انداز نہ ہونے دیا جائے۔ اب کہ بلادِ عرب کا نظام یہ تھا، ہمیں حق پہنچتا ہے کہ آج کل کی ایک دستوری اصلاح مستعار لے کر ان روابط کو ایک ایسے وفاق سے موسوم کریں جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ یا سوئٹزرلینڈ کی ریاستوں کے وفاق سے مشابہ تھا۔

مدینہ اس وفاق کا دار السلطنت تھا، س کے اس تقدم کی تنہا یہی وجہ نہ تھی کہ اس نے مرتدین پر فتح پائی تھی۔ اگر ارتداد کا فتنہ سر نہ اُٹھاتا تو بھی فطری طور پر مدینہ ہی اسلام کا سب سے پہلا دار السلطنت ہوتا اور اسے تمام شہری اور بدوی آبادیوں پر فوقیت دی جاتی۔ کیونکہ یہی وہ شہر تھا جس نے رسول اللہ ﷺ کو پناہ دی تھی۔ آپ کی بزرگ داشت اور آپ کی سازداری کی تھی۔ یہیں قرآن کریم کی مکہ سے زیادہ آیتیں نازل ہوئی تھیں اور یہیں وہ مہاجرین وانصار جمع تھے جو رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سنتے اور آپ کی سنت کو جانتے تھے اور جنہوں نے اللہ کے دین کی نصرت کے لیے اپنی جانیں لڑا دی تھیں۔ چنانچہ مدینہ وحی محمدی کا مقام نزول، اسلامی قانون سازی کا سرچشمہ اور دین کی طرف سب سے پہلے سبقت کرنے والوں کا مستقر تھا، جس نے سارے عرب کو اپنے پرچم تلے جمع کر لیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی کو اپنا دار الخلافہ بنایا تھا اور دین الٰہی کی دعوت کے لیے یہیں سے ملوک وامراء کے پاس اپنے ایلچی بھیجے تھے۔ جس شہر کی شان یہ ہو، عجب کیا اگر وہ دار السلطنت بنایا جائے اور حیرت کیوں اگر ہر چہار طرف سے نگاہیں اس کی طرف اُٹھیں؟ اس کے بعد جب مدینہ کو مرتدین پر فتح حاصل ہوئی، تو اس کامیابی نے اس کا اقتدار مستحکم کر کے جزیرہ نمائے عرب کے ایک ایک گوشے میں پھیلا دیا۔ اس طرح مدینہ برسوں اسلامی حکومت کا مرکز رہا۔ تا آنکہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں اس کی جگہ دمشق نے لے لی۔ عہد فاروقی میں مدینہ کا نظام حکومت اسی بنیاد پر قائم تھا، جو عہد رسالت اور اس کے بعد عہد صدیقی میں اس کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ یہ بنیاد شوریٰ تھی جس میں اللہ کے اس حکم سے

Marfat.com

استناد کیا گیا تھا:

(وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ)(الشوریٰ:38)

ترجمہ:''اور آپس کے مشورے سے کام کرتے ہیں۔''

اور اس ارشاد خداوندی سے جو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرماتے ہوئے کہا گیا تھا:

(وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ)(آل عمران:159)

ترجمہ:''اور معاملات میں ان سے مشورہ لو!''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرماتے تھے جن میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سب سے مقدم تھے۔ آپ ان دونوں سے فرمایا کرتے تھے:''خدا کی قسم! اگر تم دونوں کسی مسئلے پر متفق ہو جاتے ہو تو میں تمہارے مشورے سے کبھی نہیں ہٹتا!'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے تھے:''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتے نہیں دیکھا۔'' اس کے بعد جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عنان خلافت سنبھالتے ہی حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو روم کی جنگ کے لیے بھیجا تو ان سے اجازت چاہی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وہ مدینے میں رہنے دیں تاکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دوسرے رفقاء کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشوروں سے بھی مستفید ہو سکیں۔ یہی طریق کار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اختیار کیا اور ''شوریٰ'' کو اپنی حکومت کی بنیاد قرار دیا۔ جیسا کہ آج کل پارلیمانی نظام میں ہوتا ہے، اس زمانے میں شوریٰ کوئی ایسا نظام نہ تھا، جو خلیفہ کے اختیارات کو محدود کر دے اور نہ مجلس شوریٰ کے ارکان کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ خلیفہ کو اپنی بات ماننے پر مجبور کر سکیں، بلکہ شوریٰ کے باوجود خلیفہ اپنے اختیارات میں آزاد ہوتا تھا اور اس کی باز پرس خدا، خلیفہ کے ضمیر اور ان عوام کے ذمے تھی، جنہوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ جب وہ حق سے تجاوز اور اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا، اپنے رب اور اپنے ضمیر کے مواخذے کا اسے کوئی خوف نہ رہتا تو پھر عوام پر فرض ہو جاتا تھا کہ اس کی ٹیڑھ کو تلوار کی دھار سے سیدھا کر دیں۔ مجلس شوریٰ کے انتخاب کا طریقہ بھی وہ نہ تھا جو آج کل ہم دیکھتے ہیں، بلکہ خلیفہ خود اپنے مشیروں کا انتخاب کرتا تھا پھر یہ مشیر جو رائیں دیتے تھے ان کا موازنہ کر کے جس رائے کو چاہتا قبول کر لیتا اور جس رائے کو چاہتا رد کر دیتا تھا۔

عہد رسالت میں ارباب شوریٰ مدینے کے مہاجرین و انصار تھے جو سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

Marfat.com

کی خدمت میں حاضر رہتے اور آپؐ کے ارشادات سنتے۔ آپ کو مشورہ دیتے اور آپؐ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے۔ اس کے بعد جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عہد آیا تو ان میں سے اکثر عراق وشام کے میدانوں میں چلے گئے اور قریش کے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم ان کے پاس رہ گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں یہی صورت حال تھی۔ مہاجرین رضی اللہ عنہم وانصار رضی اللہ عنہم صحابہ میں سے ممتاز شخصیتیں ان کے پاس تھیں، جس مسئلے کے متعلق وہ کتاب وسنت میں کوئی حکم نہ پاتے ان حضرات کی رائے کی روشنی میں اس کا حل تلاش کرتے۔ یہ بزرگ شوریٰ کے خصوصی ارکان تھے، جن میں حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اور اسی مرتبے کے دوسرے صحابہ نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن حضرت عمر اکثر وبیشتر عام مجلس شوریٰ منعقد کرتے تھے۔ چنانچہ لوگوں کو مسجد نبوی میں بلاتے یا مدینے سے باہر ہوتے تو انہیں نماز کے لیے جمع ہونے کا حکم دیتے اور مشورہ طلب بات ان کے سامنے رکھ دیتے۔ اس مجلس میں ہر شخص کو اپنی اپنی رائے پیش کرنے کا حق ہوتا تھا، اس کے بعد بھی اگر مسئلہ حل نہ ہوتا تو نوجوانوں کو بلا کر ان کی رائے دریافت فرماتے کہ نوجوانی کی عقل تیز ہوتی ہے۔ جب عام مجلس شوریٰ میں اس کا کوئی حل نکل آتا تو اسے نافذ کر دیتے، ورنہ وہ مسئلہ خاص مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کرتے تا آنکہ بحث وتمحیص کے بعد اس کے کسی بہتر حل پر مطمئن ہو جاتے

اس کتاب کے سابقہ ابواب میں ہماری نظر سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہت سی خاص وعام مجالس شوریٰ گزر چکی ہیں۔ عراق میں ابوعبید رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد انہوں نے لوگوں سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ وہ کیا کریں؟ ان سب نے کہا۔ ''آپ ہمیں اپنے ساتھ لے کر چلیں!'' لیکن خواص نے یہ رائے دی: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی کو عراق کا امیر لشکر بنا کر بھیج دیجیے اور خود مدینہ میں رہ کر ان کی مدد کیجیے!'' اس پر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو دوبارہ جمع کر کے فرمایا: ''مسلمانوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ ان کے معاملات مشورے سے طے ہوں۔ میرا بھی وہی خیال تھا جو تم لوگوں کا ہے۔ لیکن تمہارے اہل الرائے نے مجھے جانے سے روک دیا ہے اور اب میری بھی یہی رائے ہے کہ میں خود مدینے میں رہوں اور عراق کسی اور شخص کو بھیج دوں!'' اس کے بعد جب وہ شام روانہ ہوئے اور سپہ سالاران عساکر اسلام نے ان سے مل کر یہ کہا کہ شام کی سرزمین فساد زدہ ہو گئی ہے اور وہاں نہایت شدید طاعون پیدا ہوا ہے، تو انہوں نے لوگوں کو جمع کر کے

مشورہ کیا کہ انہیں وبا کے باوجود شام کا سفر جاری رکھنا چاہیے، یا مدینہ واپس ہو جانا چاہیے؟ بالآخر دوسرے گروہ کی رائے سے اتفاق کیا گیا اور حضرت عمر اپنے ساتھیوں سمیت مدینہ واپس ہو گئے۔

ان کے نزدیک شوریٰ کی حیثیت ایک بنیادی نظام کی تھی، جس پر مملکت کے تمام گوشوں میں عمل ہونا ضروری تھا۔ وہ اپنے امرائے لشکر اور والیوں کو بھی مشورے کا حکم دیتے تھے۔ ابوعبید رضی اللہ عنہ کو عراق روانہ کرتے وقت انہوں نے فرمایا تھا: ''رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی بات سننا اور انہیں اپنے معاملے میں شریک رکھنا۔ فیصلہ کرنے میں عجلت سے کام نہ لینا، کیونکہ جنگ میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جس کے مزاج میں تحمل ہو اور جو موقع سے فائدہ اُٹھانا جانتا ہو!'' وہ اپنے تمام والیوں کو اسی طرح ہدایت کرتے تھے، چاہے انہیں محاذ جنگ کی نگرانی کے لیے بھیجا جا رہا ہو یا کسی علاقے کے انتظام و انصرام کے لیے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ خاندان رسالتؐ کے اہل الرائے صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس مشاورت ہی میں شامل تھے۔ ان میں سے کسی کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امیر لشکر بنایا نہ بلاد عرب یا مفتوحہ ممالک میں ہی والی مقرر کیا۔ ان میں سے کچھ لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے وقت بنو ہاشم نے جو مخالفت کی تھی، اس کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے کھٹکے ہوئے تھے۔ میں اپنے آپ کو ان لوگوں کا ہم خیال نہیں پاتا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے بنو ہاشم کا اختلاف میرے نزدیک مشکوک ہے۔ اگر مخالفت کی یہ کہانی صحیح مان لی جائے تو بھی یہ کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں اپنی خلافت کے زمانے تک اس مخالفت کا کوئی اثر باقی رہا ہوگا، کیونکہ بعد کو تمام بنو ہاشم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی تھی۔ اس کے بعد جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت کی وصیت فرمائی تو ان میں سے کسی نے مخالفت نہ کی، بلکہ سب سے پہلے بیعت کرنے والے بنو ہاشم ہی تھے۔ عہد فاروقی میں جو منزلت ان کی تھی اور کسی مسلمان کی نہ تھی۔ آگے چل کر رجسٹروں کی ترتیب اور وظائف کی تقسیم کے بیان میں یہ منزلت اتنی واضح اور نمایاں ہو کے ہمارے سامنے آئے گی کہ اس نے مسلمانوں کی زندگی اور ان کے رسم و رواج پر جو اثر چھوڑا وہ آج تک باقی ہے۔

حضرت عمر رسول اللہ ﷺ کے قرابت داروں کو اکثر مقدم رکھتے تھے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کی کتنی عزت و تکریم کرتے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قحط کے زمانے میں انہوں نے

Marfat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو خدا کے حضور سفارشی بنایا تھا اور جب بیت المقدس کی صلح کے لیے شام تشریف لے گئے تھے تو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو مدینے میں اپنا قائم مقام بنا کر گئے تھے وہ اکثر حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ اور ان کی علمی وادبی قابلیت کی تعریف کیا کرتے تھے۔ پھر جب ان کی وفات کا وقت آیا اور انہوں نے خلافت کے لیے چھ آدمیوں کی مجلس شوریٰ بنانے کی وصیت فرمائی تو اس میں حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا نام بھی شامل کیا۔ جس کے دل میں بنو ہاشم کی طرف سے کوئی ملال ہو بھلا وہ ان کے ساتھ اس لطف واکرام سے پیش آ سکتا تھا۔ اچھا، تو انہوں نے بنی ہاشم کو فوج کا امیر کیوں نہیں بنایا اور ان میں سے کسی کو بلاد عرب یا مفتوحہ ممالک میں کہیں والی کیوں نہ مقرر کیا؟ آپ حیران رہ جائیں گے جب آپ سے کہا جائے گا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کے احترام میں کہیں کا والی نہ بنایا۔ یہ مفہوم ان کی اس بات سے بھی مستفاد ہوتا ہے جو انہوں نے ایک دن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے فرمائی تھی: ''میں نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ لوگوں کو چھوڑ کر دوسروں کو عامل مقرر فرمایا کرتے تھے .... بخدا! میں نہیں کہہ سکتا کہ حضور آپ حضرات کو اس خدمت سے ارادتاً دور رکھتے تھے، حالانکہ آپ اس کے اہل تھے، یا ذات رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اندیشہ تھا کہ آپ لوگ اسے اپنے مرتبے کے لیے استعمال کریں گے اور آپ پر عتاب ہوگا اور عتاب ضرور ہوگا۔''

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بات .... اگر اس کی نسبت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف صحیح ہے۔ ایک لطیف ومزین معذرت ہے، جس کی تہوں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وہ احتیاط چھپی ہوئی ہے جو وہ بنو ہاشم، کبار صحابہ رضی اللہ عنہم اور رؤسائے قریش سے برتتے تھے۔ اس رائے کے حاملین کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سب کو مدینے میں اس لیے رکھا اور انہیں ارباب شوریٰ میں اس خوف سے شامل کیا گیا کہ اگر یہ مملکت کے مختلف حصوں میں پھیل گئے اور وہاں کا اقتدار ان کے ہاتھ میں آ گیا تو یہ اپنے اختیارات سے فائدہ اُٹھا کر مدینے کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دیں گے اور انہیں یہ اعتماد ہوگا کہ ان کی عملداریاں ان کا ساتھ دیں گی اور ان کے مقاصد کے حصول میں ان کی مدد کریں گے۔ یہ گمان رکھنے والے کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اسی احتیاط کے زیر اثر معزول کیا اور اسی وجہ سے وہ مختلف صوبوں کے والیوں کا بشدت محاسبہ کرتے تھے۔ شبہ تو درکنار رہا، اگر کسی کے متعلق ان کے دل میں یہ خطرہ بھی گزرتا تھا

Marfat.com

کہ اس نے اپنے علاقے میں اثر پیدا کرلیا ہے تو اسے فوراً معزول کر دیتے تھے۔ اگر یہ گمان صحیح ہے تو بھی اس کی وجہ سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر کوئی عیب نہیں لگایا جاسکتا، نہ ان کی سیاست کو مطعون کیا جاسکتا ہے، جس شخص کے ہاتھ میں کسی قوم کی باگ ڈور ہو، احتیاط اس کے فرائض میں داخل ہوتی ہے، خاص طور پر ان نازک حالات میں جو اس زمانے کے مسلمانوں کو محیط تھے۔ لیکن میں اس گمان کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں پاتا، اس لیے کہ نہ یہ حضرت عمر کی مشہور و معلوم صاف گوئی و بے باکی سے اتفاق کرتا ہے نہ صدر اول کے مسلمانوں کی ان باہمی ذمہ داریوں سے میل کھاتا ہے، جنہیں اللہ اور اس کے رسولؐ پر ان کے سچے ایمان نے ثبات و استحکام عطا کیا تھا۔ اس کے علاوہ جن خطرات نے انہیں چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا وہ بھی اس کے متقاضی تھے کہ مسلمان اس قسم کے سوچ بچار سے دور رہیں۔ بھلا کوئی والی یہ گمان کیسے کرسکتا تھا کہ جب تک اس کی پشت پر اسلام اور مسلمانوں کی مجموعی قوت نہ ہو وہ عراق میں ایرانیوں اور شام میں رومیوں سے مقابلے کی سکت رکھتا ہے؟ اور بھلا کسی والی کے دل میں...... چاہے وہ فارس میں ہو یا مصر میں...... اقتدار اعلیٰ کے خلاف بغاوت کا خیال کیسے آسکتا ہے۔ جب ہر وقت جزیرۃ العرب سے آنے والی کمک کا محتاج رہتا تھا اور جب کبھی مدد پہنچنے میں تاخیر ہوتی تھی اس کے لیے دشمن کا مقابلہ کرنا ناممکن ہو جاتا تھا۔

سارا عہد فاروقی رضی اللہ عنہ اسی صورت حال سے دوچار رہا۔ اس لیے کہ اس پوری مدت میں حالت جنگ کبھی ختم نہ ہوئی اور نتائج ہمیشہ ادلتے بدلتے رہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شہنشاہ ایران اپنے قتل کیے جانے سے کچھ پہلے مسلمانوں کے خلاف، ترک و چین سے مدد طلب کر رہا تھا اور یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ رومی برابر مصر پر دوبارہ قبضہ کرنے کی سوچ رہے تھے۔ ان تمام حقائق کے پیش نظر یہ گمان محض گمان ہی رہ جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بنو ہاشم اور رؤسائے قریش کو بربنائے حزم و احتیاط مدینہ میں رکھا تھا؟ اسی طرح یہ خیال بھی غلط ٹھہرتا ہے کہ بقول بعض بنو ہاشم نے چونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے اختلاف کیا تھا اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں ان کی طرف سے کھٹک تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دوسروں کی طرح بنو ہاشم کو بھی خلافت کا حق دار سمجھتے تھے، لیکن انہیں اس سے انکار تھا کہ بنو ہاشم خلافت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث سمجھ لیں۔ یہی بات جیسا کہ بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ

سے فرمائی تھی کہ: ''لوگوں نے پسند نہ کیا کہ نبوت اور خلافت دونوں تمہیں مل جائیں۔ چنانچہ خلافت قریش نے اپنے لیے منتخب کر لی۔ اور یہ بالکل ٹھیک کیا۔'' پھر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو ان چھ آدمیوں کی جماعت میں بھی اسی لیے شامل کیا گیا تھا، جن میں سے کسی ایک کے خلیفہ بنائے جانے کی فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بنو ہاشم، کبار صحابہ رضی اللہ عنہم اور روسائے قریش کو مدینہ میں اس لیے روکا تھا کہ ان کی غیر معمولی عقل و حکمت اور تجربہ و لیاقت سے فائدہ اُٹھائیں اور انہیں اپنا مشیر بنائیں۔ اس لیے کہ شوریٰ حکومت کی بنیاد تھی اور چونکہ آخری رائے خلیفہ ہی کی ہوتی تھی، ہر معاملے میں قول فیصل اسی کی بات سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے ان اختیارات کے بدلے حکومت کی تمام سیاسی ذمہ داریاں بھی اسی کو اُٹھانی پڑتی تھیں۔ چنانچہ سارا اقتدار خلیفہ کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ وہ کتاب وسنت کی حدود میں رہ کر قانون بناتا اور اسے نافذ کرتا تھا۔ وہی قاضی بھی ہوتا تھا اور وہی کمانڈر انچیف بھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ تمام ذمہ داریاں بطریق احسن اُٹھائیں اور تاریخ نے ان کے نام کو بقائے دوام بخش کر اس کے گرد عظمت وجلال کا ایک تابناک ہالہ بنا دیا۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ تمام ذمہ داریاں بڑی خوبی وخوش اسلوبی کے ساتھ سنبھالیں، دل حیرت واستعجاب میں ڈوب جاتے ہیں اور ان میں سے اکثر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی اس عجیب وغریب مقدرت کا راز تلاش کرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی سچے دل سے اس راز کو معلوم کرنا چاہے تو کر سکتا ہے کہ یہ راز فاروق اعظم کی بے نفسی اور خلوص میں مضمر تھا جو فرض کی اہمیت کا پورا پورا احساس کرتے ہوئے وہ ادائے فرض میں برتتے تھے۔ وہ خلافت کی ظاہری شان وشوکت پر نہ جاتے تھے، بلکہ ان کی نظر ہمیشہ اس کی دشواریوں اور ذمہ داریوں پر رہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ کبھی خلافت کے اقتدار نے انہیں مغرور کیا نہ کبھی اس کی ظاہری چمک دمک سے ان کی آنکھیں خیرہ ہوئیں۔ فرض کا یہ احساس ان میں اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ تاریخ اپنے کسی دور میں اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔

میں نہیں سمجھتا کہ اس احساس کی تصویر کھینچنے کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے بہتر الفاظ ہمیں کہیں مل سکتے ہیں: ''میں رعایا کی دیکھ بھال کیسے کر سکتا ہوں جب تک مجھ پر بھی وہ نہ بیتے جو اس پر بیتتی ہے۔'' اور یہ اسی احساس کا کرشمہ ہے کہ وہ کمزوروں اور محتاجوں کے جذبات کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے اپنے تئیں ان کی سطح پر رکھتے تھے۔ کمزور کو طاقتور سے اس کا

دلواتے تھے اور محتاج کو محتاجی کی مصیبت سے چھڑاتے تھے۔ اس کی مثالیں آپ کو قحط کے زمانے میں مل سکتی ہیں، جب انہوں نے اپنی جان سے سختی اُٹھائی اور پورے ایک سال تک گوشت اور گھی اپنی زبان پر نہ رکھا، یہاں تک کہ ان کی صحت خراب ہوگئی۔ چہرے کا رنگ بگڑ گیا اور لوگوں کو ان کی جان کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ غرور ونمائش سے وہ اتنا ڈرتے تھے کہ بعض روایات اس خوف کو حیرت ناک ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''میں عمر کے ساتھ تھا کہ وہ ایک احاطے میں داخل ہوگئے اور دیوار کے پیچھے سے میں نے انہیں یہ کہتے سُنا: ''خطاب کا بیٹا عمر! اور امیر المومنین! سبحان اللہ! خدا کی قسم! خطاب کے چھوکرے! خدا سے ڈر، ورنہ وہ تجھے ضرور اس کی سزا دے گا!'' کہتے ہیں کہ وہ ایک دن اپنی پیٹھ پر پانی کا مشکیزہ لادے جا رہے تھے، لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا، میرے نفس نے مجھے مبتلائے غرور کرنا چاہا تھا۔ میں اسے ذلیل کر رہا ہوں۔'' عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں مملکت کو جو وسعت ہوئی، وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی راہ سے بھٹکا نہ سکی اور انہوں نے انتظام حکومت کے لیے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کوئی الگ ایوان نہیں بنایا۔ اس خصوص میں ان کی شان وہی رہی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تھی۔ عہد فاروقی کے ابتدائی زمانے میں مسجد نبویؐ بالکل ویسی ہی تھی جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بنایا تھا۔ کچی اینٹوں کی دیواریں اور کھجور کی ٹہنیوں کی چھت۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اگر چاہتے تو اسے ڈھا کر از سرنو ایسی شاندار مسجد بنوا سکتے تھے جیسی ان کے جانشینوں کے عہد میں بنوائی گئیں تا کہ ان کی نشست گاہ ان کے وقار سلطنت کے شایانِ شان ہو جاتی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو کوئی ان سے پوچھنے والا بھی نہ ہوتا۔ اس لیے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے مدائن کے ایوان کسریٰ میں قیام کیا تھا اور اسی کو اپنا مستقر حکومت بنایا تھا۔ پھر جب مدائن سے کوفہ منتقل ہوئے تو وہاں بھی اپنے لیے ایک ایسا گھر بنایا جسے لوگ ''قصر سعد رضی اللہ عنہ'' کے نام سے پکارتے تھے

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے ابتدائی چار سال میں مسجد کو ہاتھ تک نہ لگایا، مگر جب مدینہ کی آبادی بڑھی اور مسجد نمازیوں پر تنگ ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو سند بنا کر ''ہمیں مسجد کی توسیع کرنی چاہیے!'' اس کی توسیع کا حکم دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ''اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے نہ سنتا کہ ہمیں اپنی مسجد کو وسیع کرنا چاہیے تو ہرگز اس کی

Marfat.com

توسیع نہ کراتا۔'' مسجد کی توسیع کا حکم دیتے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے نماز اور معاملات حکومت کے لیے مخصوص کرنا چاہا۔ کیونکہ اہل مدینہ نے اسے اپنا دارالندوہ بنا رکھا تھا۔ وہیں بیٹھ کے تجارتی مسائل پر گفتگو کرتے اور اسی کو اپنی افسانہ گوئی اور تفاخر کا میدان بناتے۔ بعض اوقات تو یہاں تک ہوتا کہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ وہاں بیٹھے مہمات امور پر غور فرما رہے ہیں اور لوگوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ چنانچہ مسجد کی توسیع کے بعد اس کے ایک طرف ''بطیحاء'' کے نام سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک جگہ مخصوص کر دی۔ اور فرمایا: ''جو کوئی شور مچاتا، یا اونچی آواز سے بات کرنا یا شعر پڑھنا چاہے وہ اس طرف چلا جائے!'' مسجد کی عمارت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو ترمیم کی وہ اس سے زیادہ نہ تھی کہ صحن وسیع کرا دیا اور دروازوں کی تعداد بڑھوا دی، باقی مسجد اسی طرح رہی جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تعمیر فرمایا تھا۔ وہی پتھروں کی بنیادیں اور وہی کچی اینٹوں کی دیواریں، وہی لکڑی کے ستون اور وہی کھجور کی ٹہنیوں کی چھت اور اسی سادہ وضع کی مسجد سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے سپہ سالار کو احکام صادر فرماتے تھے دیکھیے! یہ کسریٰ کا ایوان اس کے سر پر گر رہا ہے۔ یہ قیصر شام سے قسطنطنیہ کی طرف بھاگ رہا ہے اور یہ عظیم اسکندریہ..... یہ اس دور کی عالمی تہذیب کا پایہ تخت! اپنی کنجیاں مسلمانوں کے حوالے کر رہا ہے۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو سادہ زندگی اختیار کی تھی اور ان کے ایمان نے دنیا کو ان کی نگاہوں میں جو بے اصل بنایا تھا۔ فتوحات کی وسعت نے اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ مسلمانوں نے ان کی خلافت کے آغاز میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرح بیت المال میں ان کا اور ان کے اہل و عیال کا بھی حق مقرر کر دیا تھا۔ لیکن جس وقت مدینے میں مال غنیمت کے انبار لگے اس وقت بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس میں سے اتنا ہی حصہ لیا جتنا ایک عام مسلمان کا ہوتا تھا۔ کیونکہ خلافت کی بنا پر وہ اپنا حق دوسروں کے حق سے زیادہ نہ سمجھتے تھے۔ ایک دن ان سے کسی نے پوچھا ''اللہ کے مال میں سے آپ کے لیے کیا جائز ہے؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس میں سے میرے لیے کیا جائز ہے؟ کپڑوں کے دو جوڑے، ایک جاڑے کا اور دوسرا گرمی کا۔ حج اور عمرہ کے لیے ایک احرام، میرے اور میرے اہل و عیال کے لیے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں۔ جو ان کا حال سو میرا حال۔'' وہ فرمایا کرتے تھے: ''اللہ کا مال

Marfat.com

میرے لیے ایسا ہے جیسا کسی یتیم کا مال۔ ضرورت نہیں ہوتی تو اسے ہاتھ نہیں لگاتا اور حاجت مند ہوتا ہوں تو بقدر احتیاج لے لیتا ہوں۔"

بیت المال سے کچھ لینے میں وہ اس قدر احتیاط برتتے تھے کہ بعض اوقات یہ احتیاط تکلیف دہ ہو جاتی تھی۔ ایک دن انہیں کوئی شکایت ہوگئی جس کے لیے شہد تجویز کیا گیا۔ بیت المال میں شہد کا ایک کپا تھا۔ منبر پر خطبہ دینے آئے تو کہا: "اگر تم اجازت دو تو میں بیت المال سے شہد لے لوں ورنہ وہ مجھ پر حرام ہے!" اور لوگوں نے اجازت دے دی۔ مسلمانوں نے جو انہیں اپنی جان پر یہ سختیاں جھیلتے دیکھا تو ان کی صاحبزادی ام المؤمنین رضی اللہ عنہا حضرت حفصہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ "عمر رضی اللہ عنہ اپنی جان پر سختیاں جھیلے جاتے ہیں۔ اللہ نے رزق کشادہ کر دیا ہے۔ انہیں جو چیز چاہیے مال غنیمت میں سے لے لیں۔ مسلمانوں کی طرف سے اجازت ہے۔" حضرت حفصہ ؓ بھی گویا ان کی ہم خیال ہو گئیں،، جب عمر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو ان لوگوں کی کہن دہرائی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب "اے عمر کی بیٹی حفصہ! تو نے اپنی قوم کے ساتھ بھلائی کی اور اپنے باپ کو دھوکہ دیا، میرے اہل و عیال کا حق میری ذات اور مال میں ہے، میری دیانت و امانت میں نہیں۔"

فخری نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا ہے جو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی اس شدید خواہش کا نہایت سچا ثبوت ہے کہ ان میں اور تمام مسلمانوں میں یکسانی اور کامل مساوات ہو۔ فخری نے لکھا ہے: عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس یمن کی چادریں آئیں جو انہوں نے مسلمانوں میں تقسیم کر دیں۔ ہر مسلمان کو ایک ایک چادر حصے میں ملی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حصہ بھی ایک مسلمان کے برابر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ منبر پر چڑھے تو اسی چادر کا کرتا پہنے تھے۔ انہوں نے لوگوں کو جہاد کی دعوت دی۔ اس پر ایک شخص نے کہا: "ہم تمہاری بات نہیں مان سکتے!" حضرت عمر نے پوچھا "کیوں؟" وہ بولا: "تم نے اپنے آپ کو ہم پر ترجیح دی ہے۔ تمہارے حصے میں ایک چادر آئی تھی۔ لیکن تمہارا قد طویل ہے وہ چادر تمہارے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی، پھر تم نے اس کا یہ کرتا کیسے بنا لیا؟" عمر رضی اللہ عنہ اپنے صاحبزادے کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: "عبداللہ! اس کا جواب تم دو اور عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے اپنے حصے کی چادر والد کو دے دی تھی اور اس سے یہ کرتا پورا ہوا ہے۔ اس شخص نے کہا: "اب کہو! اب ہم تمہاری سنیں گے اور مانیں گے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

Marfat.com

خلافت سے اپنے لیے کچھ نہ چاہا بلکہ جس طرح وہ مسلمانوں کے اتحاد و آزادی کے امانت دار و نگران تھے اسی طرح اپنے آپ کو ان کے مال کا بھی امانت دار و نگران سمجھتے تھے۔ اس چیز نے انہیں سب کا محبوب بنا دیا تھا۔ عوام ان سے یوں اور بھی محبت کرتے تھے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے نزدیک، خلافت کو پدرانہ حیثیت حاصل تھی۔ جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کا خیال رکھتا ہے اسی طرح خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ شفقت و دردمندی کو پدرانہ جذبات میں سب سے مقدس اور سب سے بلند مقام حاصل ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ محتاجوں کے ساتھ سب سے زیادہ شفقت و دردمندی سے پیش آتے تھے، اس لیے کہ وہ شفقت و دردمندی کو اقامت عدل اور تحفظ امن کی طرح حکومت کا ایک فرض سمجھتے تھے۔

ایک رات وہ مدینہ سے نکلے، ان کے غلام اسلم ان کے ساتھ تھے۔ دور نمدے کا ایک خیمہ نظر آیا اور وہ دونوں اس کی طرف روانہ ہو گئے۔ خیمے میں ایک عورت دردِزہ کی تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا حال پوچھا، بولی، "میں ایک عربی عورت ہوں اور میرے پاس کچھ نہیں ہے!" حضرت عمر رضی اللہ عنہ تیز تیز قدم اُٹھاتے گھر آئے اور اپنی بیوی حضرت اُم کلثوم بنت علی بن ابی طالب سے کہا: "اللہ نے ایک نیکی تمہارے پاس بھیجی ہے، اسے حاصل کرو گی؟" اور انہیں واقعہ سنایا، وہ بولیں: "ضرور!" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آٹا گھی وغیرہ اپنی پیٹھ پر لادا، اور حضرت ام کلثوم نے زچگی کا ضروری سامان لیا اور دونوں روانہ ہو گئے۔ حضرت ام کلثوم تو اس عورت کے پاس خیمے کے اندر چلی گئیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ باہر اس کے شوہر کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگے جو انہیں نہ جانتا تھا۔ عورت کے ہاں لڑکا پیدا ہوا اور حضرت ام کلثوم نے پکار کر کہا: "امیر المؤمنین! اپنے دوست کو لڑکے کی خوشخبری سنا دیجیے!" اس شخص نے یہ آواز سنی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس ہمدردی پر حیران رہ گیا اور لگا معذرت کرنے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "نہیں کوئی بات نہیں!" اس کے بعد ان میاں بیوی کو کھانے پینے کی چیزیں دے کر وہاں سے چلے آئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک رات کسی شیر خوار بچے کے رونے کی آواز سنی، گئے اور اس کی ماں سے بولے: "اللہ سے ڈر اور بچے کو نہ رُلا!"

تھوڑی دیر کے بعد بچہ پھر رویا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر اس کی ماں کے پاس جا کر وہی الفاظ دہرائے، رات کا آخری حصہ تھا کہ بچے کے رونے کی پھر آواز آئی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غیظ میں

Marfat.com

آ کر اس کی ماں سے کہا: "خدا تم سے سمجھے! تو کتنی بے رحم ہے! آخر بات کیا ہے، تیرا بچہ خاموش کیوں نہیں ہوتا؟" ماں نے کہا: "اے اللہ کے بندے، میں اسے دودھ نہیں پلاتی اور یہ ضد کر رہا ہے!" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کیوں؟" عورت نے کہا۔ عمر رضی اللہ عنہ کا حکم ہے کہ شیر خوار بچے کو وظیفہ نہ دیا جائے۔" حضرت عمر نے پوچھا: "تجھ سے خدا سمجھے دودھ چھڑانے میں جلدی نہ کر!" صبح کی نماز کے بعد لوگوں سے مخاطب ہوئے اور چھلکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ فرمایا: افسوس ہے عمر پر! نہ جانے کتنے مسلمان بچوں کا خون اس کی گردن پر ہے۔" اس کے بعد اعلان کرا دیا۔ "اپنے بچوں کا دودھ چھڑانے میں جلدی نہ کرو۔ میں ہر مسلمان بچے کا وظیفہ مقرر کرتا ہوں!" اور یہ حکم ہمیشہ کے لیے دے دیا گیا۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ تو قریب قریب سبھی جانتے ہیں کہ وہ پچھلے پہر رات کو ایک عورت کے پاس سے گزرے۔ دیکھا کہ چولہے پر پتیلی چڑھی ہے اور اس کے گرد بچے بلبلا رہے ہیں۔ پوچھا: "بچے کیوں رو رہے ہیں؟ بولی: "بھوک سے! دریافت کیا" اور چولہے پر کیا رکھا ہے؟" اس نے جواب دیا: "پانی ہے انہیں بہلا رہی ہوں کہ سو جائیں! خدا ہمارے اور عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان انصاف کرے گا!"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی وقت واپس آئے، بیت المال سے آٹا گھی لیا اور اپنی پیٹھ پر لاد کر پھر اسی جگہ پہنچے پہلے آٹا اور گھی پتیلی میں ڈالا اور آگ سلگانے لگے۔ جب حلوا تیار ہو گیا، تو اسے بچوں کے سامنے رکھ دیا۔ بچوں نے پیٹ بھر کر کھایا اور سو گئے۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس عورت کے پاس سے رخصت ہو گئے، جسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کون ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ چلتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے۔ "بھوک ہی انہیں جگا اور رلا رہی تھی!" اس ہمدردی اور اس مہربانی نے ان کی حکومت کو لوگوں کے نزدیک محبوب بنا دیا تھا اور وہ خلیفہ کو ہر کمزور، ہر یتیم اور ہر محروم کا باپ سمجھنے لگے تھے، پھر لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بھی گرویدہ تھے، اس لیے کہ فاروق اعظم کو عدل و انصاف سے فطری لگاؤ تھا اور وہ آزادی و مساوات سے بے انتہا محبت کرتے تھے، جس کا آسان سا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنی ذات کو کمزوروں اور محتاجوں کی سطح پر رکھتے تھے، سب سے پہلا خطبہ جو انہوں نے عوام کے سامنے دیا، اس میں فرمایا: "خدا کی قسم! تمہارا ہر کمزور آدمی میرے نزدیک سب سے قوی ہے، تا آنکہ اس کا حق وصول نہ کر لوں اور تمہارا ہر طاقتور آدمی میرے نزدیک سب سے کمزور ہے، تا آنکہ اس سے حق

Marfat.com

وصول نہ کرلوں۔''

ایک دن مسلمانوں کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ''میں نے تم پر عمال اس لیے مقرر نہیں کیے ہیں کہ وہ تمہاری کھالیں ادھیڑیں، تمہیں رسوا کریں اور تمہارا مال چھینیں، بلکہ انہیں اس لیے عامل بنایا ہے کہ وہ تمہیں کتاب وسنت کی تعلیم دیں۔ پس اگر کسی پر اس کا عامل ظلم کرے گا اور اس کی شکایت مجھ تک پہنچے گی تو بدلہ لیے بغیر نہ چھوڑوں گا۔'' اور سپہ سالاران افواج کو لکھا: ''مسلمانوں کو نہ مارنا کہ وہ ذلیل ہو جائیں گے۔ انہیں محروم نہ کرنا کہ وہ بے دینی اختیار کرلیں گے، انہیں آپس میں شیر وشکر نہ ہونے دینا کہ وہ راہ سے بھٹک جائیں گے اور انہیں گھنے جنگل میں لے کر نہ اترنا کہ وہ ہلاکت میں پڑ جائیں گے۔'' یہ حکم انہوں نے سپہ سالاران افواج کو اس لیے دیا کہ براہ راست ان معاملات کو اپنے ہاتھ میں نہ لے سکتے تھے ورنہ جو کام وہ خود کر سکتے تھے ہرگز کسی دوسرے کے سپرد نہ فرماتے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ انہوں نے اپنی خلافت کے آغاز میں کہا تھا: ''خدا کی قسم! تمہارا جو معاملہ میرے سامنے پیش ہوگا، میں اپنے سوا کسی دوسرے کے ذمہ نہ کروں گا۔'' اور اپنے اس قول کو انہوں نے سچ ثابت کر دکھایا کیونکہ وہ ہر چھوٹے بڑے معاملے کو خود طے کرتے تھے، جس طرح فوجی معاملات کی تنظیم، عمال کا تقرر، مملکتی سیاست کی تعیین اور لوگوں کے درمیان منصفانہ فیصلوں جیسے اہم کام وہ خود انجام دیتے تھے، اس کے علاوہ جہاں تک ممکن ہوتا تھا چھوٹے چھوٹے کاموں کو بھی نظر انداز کرتے تھے۔

ایک دن حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ وہ مدینہ کے باہر دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ پوچھا: ''امیر المؤمنین! کہاں؟'' فرمایا ''صدقے کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ بھاگ گیا ہے اسے ڈھونڈنے جا رہا ہوں!'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا ''آپ نے اپنے جانشینوں کو تھکا دیا۔'' ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ وہ اس وقت عشاء کی نماز پڑھ رہے تھے، حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اس وقت آپ کیسے تشریف لائے؟'' فرمایا ایک قافلہ بازار کے پہلو میں آکر اترا ہے، مجھے ڈر ہے مدینے کے چور اسے کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔ اس کی حفاظت کریں!'' دونوں بازار میں پہنچے اور ایک اونچی جگہ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ کچھ فاصلے پر ایک چراغ روشن نظر آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا یہ لوگ چراغ ٹھنڈا کر کے نہیں سوئے!'' دونوں وہاں پہنچے تو کچھ لوگ بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان میں سے ایک شخص کو جانتے

Marfat.com

صبح ہوئی تو اسے بلایا اور کہا: ''تم اور تمہارے ساتھی رات شراب پی رہے تھے؟'' اس نے پوچھا: ''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ امیر المؤمنین! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''میں نے خود دیکھا ہے! وہ شخص بولا: ''کیا اللہ نے آپ کو تجسس سے منع نہیں فرمایا ہے؟'' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سے درگزر کر گئے۔

اپنی خلافت کے آخری دور میں انہوں نے چاہا کہ لوگوں کے معاملات کا بطور خود مطالعہ کریں اور سلطنت کے ہر حصے میں جا کر دیکھیں کہ وہاں کی عمومی حالت کیا ہے اور عمال اپنے فرائض کس طرح انجام دے رہے ہیں؟ ان میں سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ فتح مصر کے بعد انہوں نے فرمایا: ''اگر میں زندہ رہا تو ان شاء اللہ پوری رعایا کا دورہ کروں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ لوگوں کی بعض ضرورتیں بالا ہی بالا قطع کر دی جاتی ہیں۔ نہ عمال انہیں میرے سامنے پیش کرتے ہیں، نہ حاجت مند پہنچتے ہیں۔ چنانچہ میں شام جاؤں گا اور وہاں دو مہینے ٹھہروں گا۔ پھر مصر جاؤں گا اور وہاں دو مہینے ٹھہروں گا، پھر بحرین جاؤں گا اور وہاں دو مہینے ٹھہروں گا۔ پھر کوفہ جاؤں گا اور وہاں دو مہینے ٹھہروں گا پھر بصرہ جاؤں گا اور وہاں دو مہینے ٹھہروں گا، اور بخدا! میرا یہ دورہ بہت مفید و بہتر رہے گا۔'' لیکن موت نے ان کا یہ ارادہ پورا نہ ہونے دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عدل آج تک ضرب المثل ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ اللہ اور اس کے حساب سے ڈرنے والے تھے اور لوگوں پر حکومت کرنے میں جس بے لاگ سوجھ بوجھ، باریک بینی اور محاسبہ نفس کی ضرورت ہوتی ہے اسے خوب جانتے تھے۔ ایک دفعہ دو جھگڑنے والے ان کے پاس آئے تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور فرمایا: ''یا اللہ! ان کے بارے میں مجھے روشنی عطا فرما! ان میں سے ہر ایک میرا دین چاہتا ہے عدل قائم کرنے میں اور وہ اپنے عزیزوں کے ساتھ کوئی نرمی نہ برتتے تھے، بلکہ ایک بار جب انہوں نے لوگوں کو کسی بات سے روکنا چاہا، تو اپنے اہل وعیال کے پاس گئے اور فرمایا: ''میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جسے نے کسی کام سے روکا ہو اور پھر اس نے وہی کام کیا ہو۔ سوائے اس شخص کے جسے سزا دینے میں مجھ سے کمزوری ظاہر ہوئی ہو۔''

ان کے صاحبزادے عبدالرحمن مصر میں تھے۔ ایک دن انہوں نے ابوسروعہ کے ساتھ نبیذ پی اور ان پر نشہ طاری ہو گیا۔ وہ دونوں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے کہ وہ ان پر حد جاری کریں ابن عاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے انہیں جھڑک کر نکال دیا، اس پر عبدالرحمن بولے

Marfat.com

: ''اگر آپ نے حد جاری نہ کی تو جب میں والد کے پاس جاؤں گا، یہ بات ان سے کہوں گا۔'' میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ان دونوں پر حد نہ لگائی تو عمر رضی اللہ عنہ ناراض ہوں گے اور مجھے معزول کر دیں گے اس لیے میں انہیں گھر کے صحن میں لایا اور ان پر حد لگائی۔ عبدالرحمن بن عمر رضی اللہ عنہ گھر کی کوٹھری میں گھس گئے اور اپنا سر منڈایا۔ خدا کی قسم! اس واقعے کے متعلق میں نے عمر رضی اللہ عنہ کو ایک حرف نہیں لکھا، یہاں تک کہ ان کا یہ خط مجھے ملا: ''اللہ کے بندے! امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے عاصی بن عاصی کے نام! ابن عاص! تمہاری جرأت اور بدعہدی پر مجھے حیرت ہے اور میں تمہیں معزول کر کے چھوڑوں گا! تم نے عبدالرحمن کو اپنے گھر میں تازیانے لگائے اور وہیں اس کا سر مونڈا۔ حالانکہ تم جانتے تھے کہ یہ کام میری مرضی کے خلاف کر رہے ہو۔ عبدالرحمن تمہاری رعایا کا ایک فرد ہے تمہیں اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنا چاہیے تھا، جو تم دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہو، لیکن تم نے کہا وہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کا بیٹا ہے، حالانکہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے نزدیک کسی شخص سے حق وصول کرنے میں رعایت و نرمی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ جس وقت میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے اسی وقت اسے ایک اونی عبا پہناؤ اور کاٹھی پر بٹھا کر فوراً میرے پاس بھیج دو تا کہ وہ اپنی بدکرداری کی حقیقت سے آگاہ ہو جائے۔'' جیسا کہ ان کے والد نے کہا تھا، میں نے اسی طرح انہیں بھیج دیا اور عمر کو معذرت نامہ لکھا کہ میں نے انہیں اپنے گھر کے صحن میں حد لگائی اور خدا کی قسم! جس سے بڑی کوئی قسم نہیں، میں ہر ذمی اور ہر مسلمان کو اپنے گھر ہی میں حد لگاتا ہوں اور یہ خط عبدالرحمن بن عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ روانہ کر دیا۔ عبدالرحمن رضی اللہ عنہ اپنے والد کے پاس لے جائے گئے، جب وہ ان کے سامنے پہنچے تو اونی عبا ان کے جسم پر تھی اور سواری کی تکلیف سے وہ چل نہ سکتے تھے۔ ان کے والد نے پوچھا: ''عبدالرحمن! تم نے یہ حرکت کی ہے؟'' عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ان کی سفارش کی اور کہا: ''امیر المؤمنین! ان پر حد لگائی جا چکی ہے۔'' لیکن عمر نے ان کی بات پر دھیان نہ دیا اور عبدالرحمن بن عمر رضی اللہ عنہ چلانے لگے: ''میں بیمار ہوں۔ آپ مجھے قتل کر رہے ہیں!'' روایت میں ہے، اس کے باوجود حضرت عمر نے ان پر دوبارہ حد لگوائی اور انہیں قید کرا دیا۔ پہلے وہ بیمار ہوئے اور پھر مر گئے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انصاف امیر و حقیر اور والی و رعیت میں کوئی تمیز نہ کرتا تھا۔ اس سے پہلے ہم غسانی امیر جبلہ بن ایہم کا قصہ بیان کر چکے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے ایک بدوی کا بدلہ

Marfat.com

کس طرح لینا چاہا تھا جسے اِس مغرور امیر نے مارا تھا۔محمد بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ایک مصری کے تازیانے مارے وہ مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے۔ ''لے! میں بڑوں کی اولاد ہوں!'' حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اس مصری کو قید کر دیا کہ مبادا وہ امیر المؤمنین سے ان کے بیٹے کی شکایت کر دے۔ جب وہ قید سے چھوٹا تو سید ھا مدینے پہنچا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے پاس ٹھہرالیا اور ابن عاص رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے کو مصر سے بلا کر مجلس قصاص میں طلب کیا۔ جب دونوں باپ بیٹے مجلس قصاص میں پیش ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلند آواز میں فرمایا: ''مصری کہاں ہے؟ لے! یہ درہ اور بڑوں کی اولاد کو مار!'' مصری نے محمد کو درے مارنے شروع کیے یہاں تک وہ بے دم ہو گئے۔ مصری انہیں مارتا جاتا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے جاتے تھے: ''بڑوں کی اولاد کو مار!'' جب وہ جی بھر کے اسے مار چکا اور درہ امیر المؤمنین کو واپس کرنے لگا تو آپ نے اس سے فرمایا: ''عمرو رضی اللہ عنہ کی چندیا پر مار! خدا کی قسم! بیٹا تجھے ہرگز نہ مارتا اگر اسے باپ کے اقتدار کا گھمنڈ نہ ہوتا۔'' ابن عاص رضی اللہ عنہ نے کہا ''امیر المؤمنین! آپ بھر پور سزا دے چکے ہیں!'' اور مصری نے کہا: ''امیر المؤمنین! جس نے مجھے مارا تھا، میں نے اس سے بدلہ لے لیا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''قسم ہے خدا کی! اگر تو ابن عاص رضی اللہ عنہ کو مارتا تو ہم اس وقت تک بیچ میں نہ آتے جب تک تو خود ہی اپنا ہاتھ نہ روک لیتا۔'' اور عمرو رضی اللہ عنہ کی طرف مخاطب ہو کر غضبناک لہجے میں فرمایا: ''عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا۔ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا!'' میری غرض یہ نہیں ہے کہ یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس مرتبے پر تفصیلی نظر ڈالوں جو انہیں قاضی کی حیثیت سے حاصل تھا، اس لیے کہ اس باب میں ان کی تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔اوپر جو لکھا گیا ہے اس سے تو صرف یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عدل کے معاملے میں کتنی شدت اور اسے قائم کرنے میں کتنی نکتہ رسی سے کام لیتے تھے۔ وہ لوگوں کے درمیان جس قسم کی مساوات چاہتے تھے اس کا اندازہ ان کے اس قول سے کیا جاسکتا ہے!'' جب دو شخص میرے پاس جھگڑتے ہوئے آتے ہیں تو میں اس کی پروا نہیں کرتا کہ برسرِ حق کون ہے؟'' وہ اپنے رشتے داروں سے اس لیے شدت برتتے تھے، اپنے عمال اور ان کے متعلقین سے اپنے اس یقین کے تحت سختی کا برتاؤ کرتے تھے کہ قوم کی عزت و آزادی اور شرف و بزرگی کی اگر کوئی راہ

ہے تو صرف یہ کہ حاکم ومحکوم، غنی ومحتاج اور امیر وحقیر کے درمیان عادلانہ مساوات قائم کی جائے۔ والیوں کی ذمہ داریاں، محکوموں کی ذمہ داریوں سے زیادہ ہوتی ہیں، اس لیے کہ ان پر اگر کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ ہو تو حکومت کا نشہ انہیں جبر واستبداد کے غرور میں مبتلا کر دیتا ہے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ پیدا نہیں ہوتی جب تک ان کے پیشوا اور رہنما ان سے سیدھے رہتے ہیں!'' ایک اور جگہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب تک راعی اللہ کی راہ میں چلتا رہتا ہے رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے، لیکن جہاں اس نے پاؤں پھیلائے رعایا اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے۔''

اسی لیے جو حیثیت وہ رعایا کے مقابلے میں عمال کی سمجھتے تھے، وہی حیثیت عمال کے مقابلے میں اپنی سمجھتے تھے، یعنی جس طرح عامل اپنے محکوموں کا ذمہ دار تھا اسی طرح وہ اپنے عمال کے ذمہ دار تھے۔ پس اگر عمال اپنی رعایا پر ظلم کریں تو ان سے بھی اسی طرح بدلہ لیا جانا چاہیے جس طرح مدینے کے ایک عام آدمی سے، جو کسی پر ظلم کرے، لیا جاتا ہے۔ ذمہ داری کے احساس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس فقرے میں واضح کیا ہے: ''اگر کوئی عامل کسی کو ہدف ستم بنائے اور اس کی اطلاع مجھ تک پہنچ جائے، لیکن میں اس کے بعد بھی اس عامل کو تبدیل نہ کروں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس شخص پر ظلم میں نے کیا ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ زہد واتقاء کے مرتبہ کمال پر فائز تھے، پھر فقیروں اور محتاجوں کے ساتھ بھی انتہائی شفقت وہمدردی اور انصاف واحسان سے پیش آتے تھے، اس لیے ان کی حکومت عوام کے دلوں میں گھر کر گئی تھی اور ان کی درشتی مزاج، ان کے رعب وجلال کا وہ بار بہت ہلکا پڑ گیا تھا، جس کی وجہ سے لوگ ان کے پاس جاتے ڈرتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ اگر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ میں غیر معمولی دبدبہ وجلال نہ ہوتا تو حاجت مند حاضر ہوتے اور بارگاہ فاروقی رضی اللہ عنہ سے ان کی ضرورتیں پوری ہو جاتیں اپنی درشتی مزاج کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ درہ لے کر مدینہ کا گشت فرماتے تھے کہ جہاں کوئی جماعت کے مروجہ آداب واخلاق کی خلاف ورزی کرتا نظر آئے، چھوٹے بڑے کا لحاظ کیے بغیر اس کی تادیب کریں، اس درے نے لوگوں کے دلوں میں اور بھی ان کی ہیبت بٹھا دی تھی اور وہ ان کے انصاف واحسان اور شفقت وہمدردی کا یقین رکھتے ہوئے بھی ان سے کانپتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی

Marfat.com

وقاص رضی اللہ عنہ کہیں جمع ہوئے۔حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ان سب میں نسبتاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بے تکلف تھے، اس لیے ان حضرات نے ان سے کہا: عبدالرحمٰن! امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ سے لوگوں کی سفارش کرو۔ایک شخص ان کے پاس حاجت لے کر جاتا ہے، لیکن ہیبت اس کی زبان پکڑ لیتی ہے اور بغیر کچھ کہے سنے واپس آ جاتا ہے۔اس میں بیچارے کی حاجت پوری نہیں ہوتی۔''

حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور کہا: ''امیر المؤمنین! لوگوں سے نرمی اختیار فرمایئے! آنے والا آپ کے پاس آتا ہے لیکن آپ کی ہیبت اس کے ہونٹ سی دیتی ہے اور وہ اپنی حاجت کا اظہار کیے بغیر ناکام واپس ہو جاتا ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تمہیں خدا کی قسم ہے عبدالرحمٰن! کیا علی، عثمان رضی اللہ عنہ، زبیر رضی اللہ عنہ اور سعد رضی اللہ عنہ نے تم سے یہ بات کہلوائی ہے؟'' ابن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: ''بخدا! یہی بات ہے!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا: ''میں لوگوں سے نرمی کے ساتھ پیش آیا، یہاں تک کہ اس نرمی نے مجھے خدا سے ڈرا دیا۔ پھر میں نے ان پر سختی کی۔ یہاں تک کہ اس سختی نے مجھے خدا سے ڈرا دیا۔اب جایئے تو کہاں جایئے؟'' حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اس جواب پر رو دیئے اور یہ کہتے ہوئے وہاں سے اُٹھ آئے، افسوس ہے آپ کے بعد ان کے حال پر! افسوس ہے آپ کے بعد ان کے حال پر!'' ان مثالوں سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکومت کی ذمہ داریاں کیسے سنبھالیں؟ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی اس بے مثال مقدرت کا راز بھی آپ پر منکشف ہو گیا ہوگا، جس کے بل پر حکومت کا غیر معمولی بوجھ انہوں نے اس شان سے اُٹھایا کہ دل آج بھی ان کے حضور حیرت واحترام کا خراج پیش کرتے ہیں۔اسی طرح یہ بات بھی آپ نے سمجھ لی ہوگی کہ عہد فاروقی رضی اللہ عنہ کے نظام حکومت کے وہ کون سے پہلو تھے، جنہوں نے فتوحات کی وسعت کا سامان فراہم کیا اور مسلمانوں کے دل میں کامرانی وسربلندی کا شوق بھڑکایا؟

مسلمان امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو اپنے اور اپنے ان اہل وعیال کے حقوق کا بہترین ضامن سمجھتے تھے، جنہیں گھروں میں تنہا چھوڑ گئے تھے، وہ دیکھتے تھے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہر صاحب حق کا حق ادا کرتے اور اس کی ضرورت کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضرورت پر مقدم رکھتے ہیں۔ان حالات میں ان کا اپنے مستقبل اور اپنی اولاد واقارب کے انجام کی طرف سے مطمئن ہو کر جنگ کے میدانوں میں کود جانا ایک لازمی امر تھا، ان میں سے ایک بھی اللہ اور اسلامی سلطنت کی راہ

Marfat.com

میں قتل ہونے سے نہ گھبراتا تھا، کیونکہ اسے یقین تھا کہ اگر وہ شہید ہو گیا تو اس کی اولاد کو اس سے بہتر معاوضہ ملے گا جو اس کے زندہ رہنے کی صورت میں اسے ملتا اور وہ اس پر ایمان رکھتا تھا کہ جو کوئی اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے جان دے گا، اس کے لیے جنت کے دروازے کھل جائیں گے۔ مغربی مؤرخین نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ان صفات کا ذکر کر کے ان پر تعریف و تحسین کے پھول نچھاور کیے ہیں۔ پر ان میں سے بعض یہ خیال بھی ظاہر کرتے ہیں کہ اگر ان صفات کے پیش نظر کسی نظام حکومت کا تصور کیا جائے تو وہ اس دور کا مشہور عربی نظام ہوگا جو قبائلی نظام سے مکمل مشابہت رکھتا تھا۔ قبائلی نظام میں حکومت کا تاج اس شخص کے سر پر رکھا جاتا تھا، جو اپنی قوت سے اپنے قبیلے کے حامیوں کو حفاظت و سیاست کے بازوؤں میں سمیٹ کر یا دوراندیشی سے اپنے قبیلے کا انتظام چلا کر، یا حسن تدبر سے اپنے قبیلے کے تعلقات دوسرے قبائل سے استوار کر کے دوسروں پر اپنی مزیت و فوقیت ثابت کر دیتا تھا۔ چنانچہ اقتدار کی تمام کنجیاں ...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح .... قبیلے کے سردار کے ہاتھ میں ہوتی تھیں۔ یہ سردار رواج سے اپنا قانون بناتا تھا اور اس قانون کی بنیاد پر اپنے قبیلے کے درمیان قصاص یا دیت کا فیصلہ کرتا تھا۔ بلکہ جب کسی دوسرے قبیلے کا کوئی مظلوم یا اس کا وارث اس سردار کے پاس دعویٰ لے کر آتا تھا کہ آپ کے قبیلے کے فلاں آدمی نے مجھ پر ظلم کیا ہے تو اس کے خوں بہا یا قصاص کا فیصلہ بھی اسی قانون کے تحت کیا جاتا تھا۔ ان مؤرخین کا کہنا ہے کہ قرآن نے اس رواج کی تنظیم و تہذیب تو کی جس سے عرب مانوس تھے، لیکن عربوں کو اس نظام کے دائرے سے باہر نہ نکالا جس پر وہ پہلے سے عمل پیرا تھے۔ اس معنی کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حکومت اس عربی نظام پر قائم تھی اور اس کے اصول و قواعد سے متجاوز نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ دونوں حکومتیں ...... حکومت صدیقی اور حکومت فاروقی ...... اس متمدن نظام کے مقابلے میں، جو ان دنوں ایران و روم میں رائج تھا بدوی نظام سے قریب تر تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حکومت خالص عربی حکومت تھی جو روم و ایران کے نظاموں سے نہ زیادہ متاثر ہوئی نہ کم اور اسی لیے وہ اس بدوی نظام کی طرح سادہ تھی جو ان دنوں جزیرہ نمائے عرب کے اکثر گوشوں میں رائج تھا، لیکن یہ حکومت اپنی تمام تر سادگی کے باوجود عہد رسالت کو عہد سلطنت سے ملانے والی ایک مضبوط کڑی اور اس نظام کی فطری پیش

رفت تھی جو عہد رسالتؐ ہی میں ابھرنا شروع ہو گیا تھا، جس وقت رسول اللہ ﷺ نے مدینے میں نزول اجلال فرمایا ہے۔ عرب کے دوسرے علاقوں کی طرح وہاں بھی ایسے قبائل آباد تھے جو اپنے اوپر کسی دوسرے قبیلے کا اقتدار تسلیم نہ کرتے تھے۔ اس لیے کبھی تو اوس و خزرج میں کشت و خون کا بازار گرم ہو جاتا اور کبھی مدینے کے عربوں اور یہودیوں میں جنگ کے شعلے بھڑکنے لگتے اور جب تک کوئی بیرونی خطرہ ہی انہیں اچانک آ کر نہ گھیر لیتا، باہمی اتفاق و اتحاد کی کوئی صورت پیدا نہ ہوتی، لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے مدینے میں قیام فرما کر پہلے مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم میں مواخاۃ قائم کی اور اس کے بعد یہودیوں کو وہاں سے نکال دیا تو بطون و قبائل کے تمام تفرقے مٹ گئے اور مدینہ اس یک جہتی کے بعد ایک ایسی مدنی وحدت میں تبدیل ہو گیا، جس کی شریعت قرآن تھا اور جس کے فرمانروا رسول اللہ ﷺ نظام حکومت کے اس انقلاب سے اہل حجاز نا آشنا تھے، لیکن فتح مکہ کے فوراً بعد وہ مدینہ سے ام القریٰ...... مکہ...... میں منتقل ہو گیا اور غزوہ حنین کے بعد اس نے طائف کو بھی اپنے سایہ رحمت میں لے لیا۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات سے ایک سال پہلے جب مختلف بستیوں اور قبیلوں کے وفد مدینہ آئے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اسلام کا اعلان کیا تو سرکار رسالتؐ نے اپنے چند صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان بستیوں اور قبیلوں میں بھیجا کہ وہ لوگوں کو دین کی تعلیم دیں اور ان سے صدقات وصول کریں۔ یہ حضرات گویا ہراول تھے اس انقلاب کے جس کی طرف جزیرۃ العرب آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا، اس کے بعد جب ارتداد کی لڑائیاں شروع ہوئیں تو دوسرے مسلمانوں کی طرح ان حضرات نے بھی ارتداد کا سر کچلنے کے لیے غیر معمولی شجاعت و سرفروشی کا مظاہرہ کیا اور اس طرح فتح و نصرت کا وہ حق مدینہ کے قدموں میں لا کر ڈال دیا، جس سے کوئی عرب انکار نہ کر سکا۔ ارتداد کی آگ ٹھنڈی پڑ جانے کے بعد ان عاملوں اور والیوں کے اقتدار میں اضافہ ہو گیا، جنہیں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مختلف علاقوں میں مقرر فرمایا تھا۔ اب ان کے اختیارات صرف لوگوں کو دین کی تعلیم دینے اور ان سے صدقات وصول کرنے ہی تک محدود نہ رہے، بلکہ اپنی اپنی عمل داریوں میں انہیں بھی وہی حاکمانہ حقوق حاصل ہو گئے؛ جو قبیلے کے سردار مدینے کے امیر کو حاصل تھے، چنانچہ احکام کا نفاذ قضا اور فوج کے عہدے یہ سب کچھ ان کے ہاتھ میں تھا، لیکن ان تمام اختیارات کے استعمال میں وہ

Marfat.com

خلیفہ کے سامنے ہر طرح جواب دہ تھے۔①

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں زمام خلافت اس وقت آئی جب تمام مرتدین عرب صدق دل سے دوبارہ دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ اس لیے اب ان سے محتاط رہنے یا ان کی بغاوت سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ خلیفہ کے عمال آخر ان پر جبر و تشدد کرتے بھی کیسے؟ جب تمام قبیلوں کے سورما جہاد کے میدانوں میں پہنچ گئے تھے. اور وہاں اللہ کی راہ میں مر بھی رہے تھے اور مار بھی رہے تھے۔ اس بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محسوس فرمایا کہ ان کی وحدت کو اور مستحکم کر دیا جائے اور اپنے عمال کو حکم دیا کہ وہ بھی شیوہ فاروقی رضی اللہ عنہ کے اتباع میں انصاف و دور اندیشی اور لطف و مرحمت سے کام لیں اور معاملات میں عربوں سے چاہے وہ جزیرہ نمائے عرب کے کسی حصے کے رہنے والے ہوں، مساوات برتیں۔ اس غرض سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال کے نام وہ ہدایات جاری کیں جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان عمال کو عربوں پر اس لیے حاکم بنا کر نہ بھیجتے تھے کہ وہ ان کو ذلت و حقارت کے چوبچے میں دھکیلیں، بلکہ اس لیے بھیجتے تھے کہ ان کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ اللہ کی حدود قائم کریں۔ عمال کو ان کا حکم تھا کہ ”سب کو ایک نظر سے دیکھو! قریب و بعید میں کوئی امتیاز روا نہ رکھو! اگر تم نے رشوت لی، حکومت میں ذاتی غرض شامل کی یا غصے میں لوگوں کو ستایا تو اس کی سزا تمہیں بھگتنی پڑے گی۔ حق اگر دن کی روشنی میں بھی قائم کرنا پڑے تو اسے قائم کرو!“

وہ مملکت کے ایک ایک گوشے میں عدل قائم کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں اپنے آپ کو، اپنے ضمیر کو اللہ کے سامنے جواب دہ سمجھتے تھے، یعنی اگر ان کے کسی عامل نے کوسوں دور بھی کسی شخص پر ظلم کیا تو گویا خود انہوں نے اس شخص پر ظلم کیا۔ ایک دن حاضرین سے فرمایا: ”کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر میں نے اپنے علم کے مطابق بہترین آدمی کو تم پر عامل مقرر کر کے اسے عدل کا حکم دے دیا تو میں اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو گیا؟“ لوگوں نے کہا ”جی ہاں!“ فرمایا: ”نہیں! یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک میں یہ نہ دیکھ لوں کہ جو کچھ میں نے حکم دیا تھا اس پر عمل بھی کیا جا رہا ہے یا نہیں؟“ اسی لیے وہ ان عمال کا محاسبہ اتنی شدت سے کرتے تھے کہ ہمارے لیے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے مال کی تقسیم اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

① حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عمال یہ تھے: مکہ میں عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ۔ طائف میں: عثمان بن ابی العاص، صنعاء میں مہاجر بن ابی امیہ رضی اللہ عنہ۔ حضرموت میں زیاد بن عبید۔ خولان میں یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ اور زبید میں ابوموسیٰ۔

Marfat.com

روایات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس شدید محاسبے سے متعلق بعض ایسے واقعات ملتے ہیں جن پر یقین کرتے ہوئے لوگ ہچکچاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ: ''حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے شام میں اپنے اہل وعیال کے لیے راحت وفراغت کے سامان فراہم کر لیے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ملی تو ان کے مشاہرے میں کمی کر دی، یہاں تک کہ امین الامت کی رنگت بگڑ گئی۔ کپڑوں کی حیثیت بدل گئی اور حالت تباہ ہوگئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو فرمایا: اللہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ پر رحم کرے! انہوں نے بڑے صبر وتقویٰ سے کام لیا، اور ان کی تنخواہ بحال کر دی۔'' عمال کے محاسبے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شدت کا یہ عالم تھا کہ وہ عامل کو کبھی ایسے شبہے پر معزول کر دیتے تھے جو دلیل سے ثابت نہ ہوتا تھا، بلکہ بعض اوقات تو ایسے گمان پر بھی اس کی معزولی کا حکم دے دیتے تھے جسے صحیح معنی میں شبہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کے متعلق ایک دفعہ ان سے سوال کیا گیا تو فرمایا، اگر قوم کے معمولی سے فائدے کے لیے بھی کسی امیر کو بدلنا پڑے تو میں اسے بدل دوں گا۔''

ہم نے کئی بار دیکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال کو بغیر کسی شبہے کے محض بر بنائے مصلحت ہی ان کے عہدوں سے معزول کر دیا ہے، جن میں سے ایک حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا معاملہ ہے۔ جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ کی ولایت سے صرف اس لیے ہٹا دیا تھا کہ اس شہر کے چند لوگ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے خلاف بھڑک اُٹھے تھے اور انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی تھی کہ وہ تقسیم میں مساوات نہیں برتتے، رعایا سے انصاف نہیں کرتے اور جنگ میں شریک نہیں ہوتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتنے کے خوف سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا۔ کیونکہ ایرانی فوجیں اس وقت حملے کے لیے جمع ہو رہی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عمال کو ہر سال حج کے موقع پر مکہ میں جمع کرتے تھے۔ عمال سے ان کے کاموں کے متعلق پوچھتے اور عوام سے عمال کا رویہ دریافت فرماتے تھے۔ اس سے وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اپنے فرائض کے احساس میں عمال کتنی احتیاط وہوش مندی سے کام لیتے ہیں اور ادائے فرض کے وقت اپنے یا اپنے کسی رشتہ دار کے مفاد کا لحاظ تو نہیں رکھتے، اس لیے کہ بے غرضی فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے نزدیک ہر چیز پر مقدم تھی۔ چنانچہ جس وقت عمال مقرر ہوتے تھے ان کے مال واسباب کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا تھا اور اگر بعد کو اس میں اضافہ ہو جاتا تو ان کی امانت ودیانت مشکوک سمجھی جاتی تھی۔ فاروق

اعظم رضی اللہ عنہ ان سے حساب لیتے اور زائد سامان ضبط کر لیتے۔ پھر ان سے فرماتے: ''ہم تمہیں والی بنا کر بھیجتے ہیں، تاجر بنا کر نہیں!'' والیوں کے اس شدید محاسبے سے یہ غرض نہ تھی کہ ان کی حاکمانہ شان کو نقصان پہنچایا جائے، یا ان کا وقار کم کیا جائے! وہ اپنے اختیارات میں آزاد تھے۔ ان کے احکام نافذ ہوتے تھے اور جب تک وہ عدل وانصاف کی راہ سے نہ ہٹتے تھے، ان کا اقتدار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اقتدار کے مساوی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود خیرہ سر ان کے ساتھ زیادتی یا کوئی دریدہ دہن ان کی بے عزتی کرتا تو اسے عبرت ناک سزا دی جاتی۔

اہل عراق نے ازراہ تحقیر اپنے امام پر کنکریاں پھینکیں، اس سے پہلے بھی وہ ایک امام کے ساتھ یہی بدتمیزی کر چکے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا اور انہوں نے اہل شام سے کہا: ''اہل عراق کے خلاف تیاری کرو کہ شیطان نے اُن میں انڈے بچے دے دیئے ہیں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عامل کی دلیل بھی سنتے تھے اور اگر اس دلیل سے مطمئن ہو جاتے تھے تو اس کے منہ پر اپنے اطمینان کا اظہار کر دیتے اور جب وہ چلا جاتا تو اس کی تعریف فرماتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ گدھے پر سوار شام جا رہے تھے، دیکھا کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ ایک شاندار جلوس کے ساتھ چلے آ رہے ہیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے گھوڑے سے اتر کر امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو سلام کیا لیکن فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گئے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ نے انہیں تکلیف پہنچائی، کم سے کم آپ ان سے بات تو کر لیتے!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''یہ شاندار جلوس تمہارا ہے؟'' حضرت معاویہ نے جواب دیا: ''جی ہاں!'' دوسری طرف تمہارا یہ حال ہے کہ تم ہر وقت گھر میں گھسے بیٹھے رہتے ہو! حالانکہ تم جانتے ہو کہ اہل حاجات تمہاری ڈیوڑھی پر کھڑے ہیں؟'' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ بھی درست ہے!'' فرمایا: ''افسوس ہے تم پر، ایسا کیوں ہے؟......''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''ہمارے ملک میں دشمن کے جاسوس بہت ہیں۔ اگر ہم اس شان وشوکت سے نہ رہیں تو دشمن ہمیں کمزور سمجھ کر ہم پر ٹوٹ پڑے۔ رہی گھر میں گھسے بیٹھے رہنے کی بات، سو ہمیں ڈر ہے کہ ہماری فیاضی رعایا کو جری بنا دے گی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں آپ کا عامل ہوں۔ آپ مجھے گھٹائیں گے گھٹ جاؤں گا، بڑھائیں گے بڑھ جاؤں گا اور روک دیں گے رک جاؤں گا۔'' تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں

Marfat.com

جب تم سے باز پرس کرتا ہوں، صاف بچ کر نکل جاتے ہو۔ اگر تم سچے ہو تو یہ ایک عقل مند آدمی کی رائے ہے ورنہ جھوٹے ہو تو ایک چال باز کا دھوکہ۔ میں نہ تمہیں اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے روکتا ہوں''۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جب یہ دیکھتے تھے کہ ان کے عمال محض رعایا کی بھلائی کے لیے کام کر رہے ہیں تو ان سے بہت خوش ہوتے تھے اور ان کی بے انتہا تعریف فرماتے تھے۔ عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ کو انہوں نے حمص کا والی مقرر کیا اور کچھ عرصے کے بعد انہیں لکھا: ''جتنا خراج تم نے وصول کیا ہے وہ سارے کا سارا لے کر میرے پاس پہنچو۔'' جب عمیر بارگاہ خلافت میں حاضر ہوئے تو پوچھا: ''کیا کر آئے؟'' انہوں نے جواب دیا: ''آپ نے مجھے وہاں بھیجا اور میں وہاں پہنچا۔ میں نے قوم کے نیک لوگوں کو جمع کیا اور خراج وصول کرنے کی خدمت ان کے سپرد کر دی۔ جب انہوں نے خراج جمع کر لیا تو میں نے اسے موقع موقع سے خرچ کر دیا۔ اگر اس میں سے آپ کے لیے کچھ بچتا تو میں ضرور آپ کی خدمت میں پیش کرتا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کچھ لے کر نہیں آئے؟'' اور جب عمیر نے یقین دلایا کہ انہوں نے سارا خراج اہل حمص پر خرچ کر دیا ہے تو کہا: عمیر کو پھر وہیں بھیج دو' یہ وہی عمیر ہیں جنہوں نے ایک دفعہ حمص کے منبر پر کھڑے ہو کر کہا تھا: ''جب تک اسلام میں حکومت کا زور ہے وہ ناقابل شکست رہے گا، لیکن حکومت کے زور کا مطلب تلوار سے قتل کرنا اور تازیانے سے مارنا نہیں بلکہ حق کے ساتھ فیصلہ اور انصاف کے ساتھ مواخذہ کرنا ہے!'' ایسی صورت میں کہ یہ حکیمانہ فقرہ ان کا مدار عمل تھا، کوئی تعجب نہیں اگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کے متعلق یہ فرمایا کہ ''کاش! عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ جیسا کوئی آدمی میرے پاس ہوتا جس سے میں مسلمانوں کے کام میں مدد لیتا۔'' یہ عمال عہد فاروقی رضی اللہ عنہ کے آغاز میں وہ تمام خدمات انجام دیتے تھے، جو مدینے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذمے تھیں۔ عدالت، صوبے کا انتظام اور فوج کی امارت یہ سب عہدے انہیں عمال کے پاس ہوتے تھے۔ لیکن اپنی خلافت کے چند ہی روز بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محسوس فرمایا کہ حکومت کے وسیع معاملات اور اعلیٰ سیاست نے انہیں ان تمام ذمہ داریوں سے غافل کر رکھا ہے، جن کے متعلق اپنی بیعت کے دن ان کا خیال تھا کہ وہ انہیں خود سنبھالیں گے۔ عراق و شام کے اسلامی لشکروں کی خبریں ان کی بہت سی توجہ اور ان کا بہت سا وقت لے لیتی تھیں اور مملکت کے مختلف حصوں میں عمال کیا کچھ کر رہے ہیں، اس کے متعلق بھی وہ

Marfat.com

سوچتے رہتے تھے، پھر مدینہ کی آبادی بڑھنے اور وہاں روپے کی ریل پیل ہونے سے اہل مدینہ کے مفادات میں الجھنیں اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی جارہی تھیں اور ادھر فتوحات کی وسعت اور مقبوضہ علاقوں کا نظم ونسق اس امر کا متقاضی تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ انتظامی معاملات میں امرائے لشکر کو مشورے اور ہدایتیں دیتے رہیں، اپنی ان تمام مصروفیتوں کے پیش نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ معاون رکھنے پر مجبور ہو گئے جو عوامی مفاد کے لیے اس طرح کام کریں کہ اس سے حکومت کا مفاد متاثر نہ ہو۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے انہوں نے یہ کیا کہ مدینہ کے عدالتی فرائض سے سبک دوش ہو کر یہ خدمت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمادی اور انہیں قاضی کے نام سے موسوم کر دیا کہ لوگ اگر اپنے مقدمے لے کر ان کے پاس آئیں تو وہ ان کا فیصلہ کریں۔ پھر جب کوفہ اور بصرہ آباد ہو گئے۔ عربوں نے وہاں سکونت اختیار کر لی اور لوگوں میں باہمی تنازعات بڑھے تو کوفہ کا قاضی شریح کو بنایا گیا اور بصرہ کا حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو۔ اس کے بعد مصر فتح ہوا اور ہاں کے مسلمانوں کا قاضی قیس بن ابی العاص سہی کو مقرر کیا گیا۔ یہ تمام قاضی کتاب وسنت کی حدود میں رہتے ہوئے آزادانہ فیصلہ کرتے تھے اور ان کا تقرر اختیارات کی تقسیم وتنظیم کی طرف پہلا قدم تھا...... لیکن ایک ایسا قدم جو مملکت کے بدلتے ہوئے حالات سے مجبور ہو کر ضرورت کے تحت اُٹھایا گیا تھا۔ ان دنوں یہی صورت رہی اور اس قدم نے ایک ایسے مقررہ اصول کی شکل، جو مملکت کے ہر گوشے میں رائج ہو، عہد فاروقی کے برسوں بعد اختیار کی۔ حضرت عمر نے قضاۃ کے انتخاب میں، عمال کے انتخاب کی طرح ...... بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ اپنی وہبی صلاحیتوں کا ثبوت دیا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فقہ وشریعت کے عالم تھے اور اس باب میں ان کی نظر اتنی گہری تھی کہ اور کوئی ان کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''عمر کا علم اگر ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور عرب کے تمام قبائل کا علم دوسرے پلڑے میں تو بھی عمر رضی اللہ عنہ کے علم کا پلڑا بھاری رہے گا!''

اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہونے سے پہلے قریش کے عہدہ سفارت پر مامور تھے، پھر جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو ہر وقت خدمت رسالتؐ میں حاضر رہنے لگے۔ اللہ کی طرف سے جو وحی نبی عربی علیہ التحیۃ والتسلیم پر نازل ہوتی اسے حضور ﷺ سے

سیکھتے اور آپ ﷺ کی سنت وقضا سے واقفیت بہم پہنچاتے۔ اس کے علاوہ ان میں لوگوں کے جوہر پہچاننے اور ان کے بعض کاموں سے ان کی خصوصیات معلوم کرنے کا بڑا ملکہ تھا۔ شریح کے قاضی کوفہ بنائے جانے کا واقعہ اس کا بہترین ثبوت ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص سے پسند کی شرط پر گھوڑا خریدا اور امتحاناً اس پر سوار ہوئے گھوڑا چوٹ کھا کر داغی ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو واپس کرنا چاہا مالک نے انکار کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''کسی کو ثالث بنالو!'' مالک نے کہا: ''شریح عراقی!'' .... دونوں شریح کے پاس پہنچے شریح نے فریقین کے دلائل سن کر کہا: ''امیر المؤمنین! یا گھوڑا خریدیے! یا جیسا لیا تھا ویسا واپس کیجیے!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''فیصلہ یہی ہے!'' اور شریح کو کوفہ کا قاضی مقرر کر دیا، جہاں وہ ساٹھ برس تک اس منصب پر فائز رہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مکاتیب واقوال آج بھی اس امر کی زندہ شہادت ہیں کہ قضا اور اس کے اصول واحکام پر ان کی نظر کتنی وسیع تھی۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام ان کا ایک خط گویا آداب قضا کا ایک غیر فانی ٹکڑا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"

''اللہ کے بندے امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی طرف سے عبداللہ بن قیس کو سلام علیک! امابعد! قضا ایک اہم فریضہ ہے جسے لوگ ہر زمانے میں انجام دیتے رہے۔ جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے پیش ہو اس کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھو اور جب صحیح نتیجے پر پہنچ جاؤ تو اسے نافذ کر دو! کیونکہ زبانی فیصلہ بے سود ہے تاوقتیکہ اسے عملاً نافذ نہ کیا جائے۔ مدعی اور مدعاعلیہ کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرو۔ کسی فریق سے بات کرنے یا عدالت میں بٹھانے یا انصاف کرنے میں کوئی امتیاز نہ برتنا تاکہ رودار یہ توقع نہ کرے کہ تم اس سے رعایت برتو گے اور کمزور کو یہ اندیشہ نہ ہو کہ تم اس کے ساتھ ناانصافی سے پیش آؤ گے۔ جو شخص دعویٰ کرے اس سے گواہ مانگے جائیں اور جو دعویٰ نہ مانے اس سے قسم لی جائے۔ مسلمانوں کے درمیان صلح کرانی جائز ہے بشرطیکہ اس سے حرام حلال اور حلال حرام نہ ہو جائے۔ کل اگر تم نے کوئی فیصلہ کیا، آج اس سے بہتر فیصلہ تمہاری عقل نے تمہیں سمجھا دیا تو اپنے پہلے فیصلے کو رد کر سکتے ہو، اس لیے کہ ''حق ازلی ہے۔ اس کی طرف رجوع کرنا غلطی پر اڑے رہنے سے بہتر ہے۔'' جس مسئلے میں شبہ ہو اور وہ تمہیں قرآن وحدیث میں نہ

ملے تو اس پر غور کرو اور پھر غور کرو اور اس کے امثال ونظائر کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے قیاس واجتہاد سے کام لو، کوئی شخص اگر اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے مہلت مانگے تو اسے مہلت دو اور اگر وہ گواہ پیش کر دے تو اس کا حق دلوا دو۔ ورنہ مقدمہ خارج کر دو۔ اس سے شک مٹے گا اور ظلم وستم کی سیاہی دور ہوگئی۔ ہر مسلمان ثقہ ہے۔ سوائے ان اشخاص کے جنہیں کسی سنگین جرم میں درے لگائے جا چکے ہوں یا جنہوں نے جھوٹی گواہی دی ہو یا ولد ونسب میں مشکوک ہوں۔ تمہاری چھپی ہوئی بداعمالیوں کا معاملہ خدا کے ہاتھ ہے۔ دنیا میں قانونی سزا سے بچنے کے لیے اس نے گواہی اور حلف ضروری قرار دیا ہے۔ خبردار! تمہارے دل میں اہل مقدمہ سے خفگی، اکتاہٹ یا چڑچڑا پن پیدا نہ ہو کیونکہ جو شخص حق وانصاف کے موقع پر حق وانصاف کرتا ہے وہ اللہ کے انعام اور اچھی شہرت کا مستحق ہو جاتا ہے جس کسی نے اپنی نیت درست رکھی اس کے اور لوگوں کے درمیان اللہ کافی ہے اور جو ان سے بناوٹی اخلاق سے پیش آیا، اس کے لیے اللہ کے رزق ورحمت کی امید نہ رکھو! والسلام۔''

دیکھیے آپ نے یہ اصول، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خط میں مقرر فرمائے ہیں۔ کیا انہیں اصولوں پر آج کل کی اکثر مہذب قوموں کا نظام عدالت قائم نہیں ہے، بلکہ کیا یہی وہ پائیدار، اصول نہیں ہیں جو زمانے کے ساتھ نہیں بدلے اور جن کے سلسلے میں فقہ وقانون کی کتابوں کی تعلیقات وشروح دسیوں نہیں، سینکڑوں مجلدات میں لکھی گئیں؟ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی کے آداب اور اہل مقدمہ کے معاملے میں اس کے فرائض کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے وہ انتہائی بلند چیز نہیں؟ ان اصولوں کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے مقرر کیا جانا کوئی حیرت ناک بات نہیں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بعض مقدمات ان کے سپرد فرماتے تھے اور خلافت فاروقی رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور میں قضا کے فرائض وہ خود ہی انجام دیتے تھے۔ پھر تعجب اس لیے بھی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ بڑے بالغ النظر فقیہ تھے اور جو مسئلہ ان کے سامنے پیش ہوتا تھا۔ اپنی بہترین معلومات سے کام لے کر اس کا فیصلہ کرتے تھے۔ اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو مشورے کے بعد اجتہاد فرماتے تھے اور ان کا اجتہاد درست ہی نہیں بلکہ حجت ہوتا تھا، جسے بعد کے لوگ یقین واطمینان کے ساتھ قبول کرتے تھے۔ کیا کسی متقی اور انصاف پسند قاضی کے سوا کوئی وہ بات کہہ سکتا ہے، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضیوں کو ہدایت کرتے ہوئے فرمائی ہے: ''جب مدعی اور مدعا علیہ تمہارے سامنے پیش ہوں

Marfat.com

تو ان سے منصفانہ شہادت طلب کرو، یا واضح قسم کھلواؤ کمزور سے اتنے قریب ہو کہ اس کا دل بڑھے اور زبان کھل جائے اور غریب کی دل دہی کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو وہ اپنا حق چھوڑ کر چلا جائے گا اور اس کا حق ضائع کرنے والا وہ شخص ہوگا جس نے اس سے لطف و نرمی نہیں برتی۔''

قضاۃ کا تقرر ایک قدم تھا جو مملکت کے بدلتے ہوئے حالات میں ضرورت کے تحت اُٹھایا گیا تھا۔ کوئی عمومی تنظیم نہ تھی جس سے فی نفسہ کسی اُصول کی تطبیق مقصود ہوتی چنانچہ جن والیوں پر کام کا غیر معمولی بوجھ نہ تھا اور جو عدالتی فرائض انجام دے سکتے تھے، فصلِ خصومات کی خدمت ان سے الگ نہ کی گئی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے صوبوں میں قاضی مقرر نہ فرمائے بلکہ تمام اختیارات انہیں کے ہاتھ میں رہنے دیئے۔ لیکن یہ ابتدائی قدم اُٹھائے ابھی چند برس ہوئے تھے کہ وہ حکومت کے دوسرے نظاموں کی طرح ایک نظام بن گیا۔ چنانچہ عدالت کو انتظامیہ سے الگ کر دیا گیا اور قاضی کی ایک خاص حیثیت ہوگئی جسے ہر قسم کی عزت و احترام کا مستحق سمجھا جاتا تھا ۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی اس وقت مقرر کیے جب مملکت کے ہمہ گیر مسائل نے انہیں انفرادی مقدمات کی سماعت سے غافل کر دیا۔ اس بناء پر قاضیوں کا تقرر حکومت کی تنظیم کے سلسلے میں ایک نیا قدم تھا۔ اس اقدام کا ایک اور بھی سبب ہوا اور وہ یہ کہ جب مدینہ دارالسلطنت قرار دیا گیا اور خراج و غنیمت کی بہتات نے وہاں آسودگی و خوشحالی پیدا کی تو لوگ کثرت سے آ کر وہاں آباد ہونے لگے۔ آپ کو مدائن و جلولا وغیرہ عراق کے اور دمشق و حمص وغیرہ شام کے شہروں کی غنیمت یاد ہوگی۔ آسودگی اور آبادی کی کثرت لوگوں کو جھگڑے پر اُبھارتی اور قاضی کے بوجھ میں اضافہ کرتی ہے، چنانچہ مدینہ کی بھرپور آبادی و خوشحالی کے بعد اس کے سوا چارہ نہ رہا تھا کہ انفرادی لڑائی جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک شخص مخصوص کر دیا جائے، تاکہ امیر المؤمنین اپنی توجہ ان مسائل پر صرف کر سکیں جو اس سے کہیں زیادہ اہم اور نازک ہیں۔ اسی طرح اس مسئلے کو ایک اور اہمیت بھی حاصل تھی کہ جتنا جتنا فتوحات کا دامن وسیع ہوتا جاتا تھا مدینے میں خراج کی ریل پیل ہوتی جاتی تھی یہاں تک کہ اموال کے اس مسئلے نے بجائے خود امیر المؤمنین کی توجہ اپنی طرف جذب کر لی اور وہ اپنے لیے ایک ایسا خاص نظام وضع کیے جانے کا متقاضی ہوا جو بلادِ عرب کی اجتماعی زندگی اور حکومت کے طریقوں کا ایک جزو بن جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی توجہ جزیہ و خراج کے اموال نے اپنی طرف جذب کر لی جو ان کے عمال بھیجتے تھے اور انہوں نے محسوس فرمایا کہ ان

Marfat.com

اموال کی جمع و تقسیم کے لیے ایک نظام کا ہونا ضروری ہے۔ یہ وہ اموال نہ تھے، جو زکوٰۃ و صدقات کے سلسلے میں جزیرہ نمائے عرب کے مسلمان ادا کرتے تھے، اس لیے کہ وہ تو ان لوگوں میں تقسیم کر دیے جاتے تھے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا:

(اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا)..........(التوبہ ۶۰)

ترجمہ: ''صدقات تو صرف فقیروں، مسکینوں اور عمال صدقات کے لیے ہیں۔''

ان صدقات کا بیشتر حصہ مدینہ نہیں بھیجا جاتا تھا، بلکہ ان اقوام و قبائل کے مسکینوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا، جن سے یہ رقم وصول ہوتی تھی۔ اس میں سے جو کچھ مدینہ پہنچتا تھا۔ اس کا بڑا حصہ اونٹوں اور مویشیوں پر مشتمل ہوتا تھا اور جو کچھ ان اہل حاجت پر تقسیم کر دینے کے بعد بچتا تھا، جن کا ذکر صدقات کی آیت میں کیا گیا ہے ان پر ایک خاص نشان لگا کر مدینے کے قریب ایک جگہ رکھ دیا جاتا تھا۔ جس کا نام ''حمی'' تھا۔ جب مسلمان کسی ملک پر چڑھائی کرتے اور کسی کے پاس سواری کے لیے جانور یا لڑنے کے لیے ہتھیار نہ ہوتے تو وہ ان اونٹوں اور اس سامان سے مدد لیتا تھا اور اگر اس کے بعد بھی کچھ بچ جاتا تو وہ غریب محتاج مسلمانوں پر صرف کر دیا جاتا تھا۔ غزوات نبویؐ میں مسلمانوں کو جو مال غنیمت ملتا تھا وہ لڑائی کے بعد ان میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ کچھ نہ بچتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید فرمائی، چنانچہ عراق سے جتنا مال غنیمت آیا اہل مدینہ میں تقسیم کر دیا اور کوئی چیز اس میں سے باقی نہ رہنے دی۔ عہد فاروقی رضی اللہ عنہ کے آغاز میں بھی یہی طریقہ رہا، لیکن فتوحات کی وسعت نے ایک طرف تو مال غنیمت میں بے پناہ اضافہ کر دیا اور دوسری طرف جزیہ و خراج کی بے شمار رقمیں مدینہ پہنچنے لگیں۔ مسلمان، عراق و ایران اور شام و مصر کے جس علاقے پر قبضہ کرتے، اس کے باشندوں سے جزیے کی شرط پر صلح کر لیتے جو اوسط دو دینار فی کس ہوتا تھا۔ یہ آمدنی اس خراج کے علاوہ تھی جو زمیندار اپنی زمینوں کے بدلے ادا کرتے تھے۔

خراج کا ایک حصہ ملکی اصلاح و انتظام پر خرچ کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد جو رقم بچتی تھی، مدینہ بھیج دی جاتی تھی۔ اس سے پہلے ہی کہ ایران کی فتح مکمل اور مصر پر حملے کا آغاز ہو، آمدنی کے اس شعبے میں دولت کی وہ ریل پیل ہوئی کہ امیر المومنین نوزائیدہ سلطنت کے لیے ایک مالی نظام مرتب کرنے کی تجویزیں سوچنے لگے مؤرخین نے اس سبب کی توضیح میں بہت سی روایات درج

ہیں، جس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس موضوع پر سوچنے کے لیے مجبور کیا۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بحرین سے آئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کا حال دریافت کیا اس کے بعد ان سے پوچھا: ''کیا لائے ہو؟'' جواب دیا: ''پانچ لاکھ درہم! حضرت عمر سمجھے کہ وہ مبالغے سے کام لے رہے ہیں، اس لیے پھر وہی سوال کیا اور جب ان سے وہی جواب سُنا تو فرمایا: ''تمہیں نیند آ رہی ہے۔ اپنے گھر جا کے سو جاؤ، کل صبح میرے پاس آنا۔'' دوسرے دن جب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پہنچے اور انہیں یقین دلایا کہ وہ واقعی پانچ لاکھ درہم لائے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے فرمایا: ''یہ ہمارے پاس بڑی دولت لے کر آئے ہیں اگر تم کہو تو گن کر تم میں تقسیم کی جائے اور کہو تو وزن کر کے!''

ایک شخص بولا: ''امیر المؤمنین! میں نے ان ایرانیوں میں دیوان...... رجسٹر...... کا رواج دیکھا ہے، وہ رجسٹروں کے اندراج کے مطابق لوگوں میں رقمیں تقسیم کرتے ہیں۔'' چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ کہا جاتا ہے کہ دیوان...... رجسٹر...... مرتب کرنے کے سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں سے مشورہ کیا۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جتنا مال آپ کے پاس جمع ہو، سال کے سال تقسیم کر دیا کریں اور کوئی چیز باقی نہ رہنے دیں۔'' حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں میں بڑی دولت پھیلتی جا رہی ہے اگر اس کا شمار نہ کیا گیا اور آپ کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان میں سے کس کس کو ملا ہے اور کس کس کو نہیں، تو سارا نظام اتھل پتھل ہو جائے گا۔'' ولید بن ہشام بن مغیرہ نے عرض کیا: ''امیر المؤمنین! میں شام گیا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ سلاطین شام رجسٹروں میں نام درج کرتے ہیں، آپ بھی ایسا ہی کیجیے!'' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی بات مان لی۔ چنانچہ عقیل بن ابی طالب، مخرمہ بن نوفل اور جبیر بن مطعم کو بلایا جو عرب کے مشہور ماہرین انساب تھے اور ان سے کہا کہ ''حیثیت اور مرتبے کے مطابق لوگوں کی فہرست تیار کریں۔''

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیوان...... رجسٹر...... کی تدوین اور وظیفوں کی تعیین کے متعلق مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا اور انہوں نے ان کے حق میں رائے دی۔ پھر فاتحین اسلام سے مشورہ فرمایا اور انہوں نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ سوائے حکیم بن حزام کے جو مکہ کے سرداروں اور صائب الرائے لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ انہوں نے کہا:

Marfat.com

''امیر المومنین! قریش اہل تجارت ہیں، اگر آپ ان کے وظیفے مقرر کر دیں گے تو وہ تجارت چھوڑ بیٹھیں گے، پھر آپ کے بعد کوئی ایسا فرمانروا آئے گا جو ان کے وظیفے بند کر دے گا اور تجارت ان کے ہاتھ سے نکل چکی ہوگی۔'' حکیم کے ان فقروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا غیب کے پردے ان کی نگاہوں سے ہٹا دیئے گئے تھے اور یہ بات ان کے دل میں القا کی گئی تھی۔ وظائف نے عربوں کو کاہل بنا دیا اور وہ روزی کے لیے دوڑ دھوپ کرنے سے بے پروا ہو گئے۔ اس کے بعد جب حالات بدلے، فتوحات کا سلسلہ رکا اور غیر عرب اسلامی حکومت میں شامل ہو گئے اور یہ اس وقت کی بات ہے، جب اسلامی دارالسلطنت مدینے سے دمشق اور دمشق سے بغداد منتقل ہوا..... تو جزیرۃ العرب کے باشندوں کے وظائف بند کر دیئے گئے۔ آسائش و بے عملی کی گود میں پرورش پانے والی نسل نہ تجارت کی طرف لوٹ سکی، نہ روزی کے لیے جدوجہد کر سکی جس کے نتیجے میں حجاز ایسا ویران و بنجر ہوا کہ آج تک نہیں پنپ سکا۔

یہ نتیجہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہوں سے کیسے اوجھل رہ گیا؟ انہوں نے اس کا اندازہ کیوں نہ کیا اور اس سے بچنے کی تدبیر کیوں نہ سوچی؟ بالخصوص جب انہیں یہ بات جتا دی گئی تھی اور اس کے نتائج ان کے سامنے پیش کر دیئے گئے تھے؟ یہ ہے ایک اعتراض جو جزیرہ نمائے عرب کے مفلس و قلاش ہو جانے کے بعد بظاہر دل میں ابھرتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا اندازہ تھا اور وہ اس کی توقع کرتے تھے۔ چنانچہ ایک طرف تو وہ عوام کو محنت و مشقت کرنے اور زیادہ سے زیادہ روزی کمانے کی تاکید فرماتے رہتے تھے اور دوسری طرف ان لوگوں کو شدید نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جو نمائشی زہد و عبادت کے زیر اثر دنیا سے بے تعلقی ظاہر کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے ایک زاہد مرتاض کو دیکھا، اس کے پاس گئے اور ایک درہ مار کر بولے، ''خدا تجھے موت دے! ہمارے دین کا گلا کیوں گھونٹتا ہے؟'' وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے: ''جس کے پاس دولت ہے اسے دولت کو مفید کاموں میں لگانا چاہیے اور جس کے پاس زمین ہے اسے زمین کو آباد کرنا چاہیے۔ کیونکہ عنقریب ایسا شخص آنے والا ہے جو اسی کو دے گا جسے چاہے گا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیوان ...... رجسٹر ...... اس لیے مدون اور وظائف اس لئے مقرر کیے کہ عرب ہمہ تن جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف ہو جائیں اور اللہ کے دین کی دعوت کے لیے میدان صاف کر دیں، نہ وہاں ایران و روم کی حکومت رہے نہ ان کے علاوہ کسی اور کی۔ اس غرض سے انہوں

Marfat.com

نے مفتوحہ ممالک کی زمین فوجیوں میں تقسیم کرنے کی ممانعت فرمادی تاکہ زراعت انہیں جہاد سے غافل نہ کردے اور زمین کی محبت میں وہ اس رسالت کبریٰ کو نہ بھول جائیں جس کے متعلق کارکنان قضا وقدر نے عربوں پر یہ فریضہ عائد کیا تھا کہ وہ اسے لے کر اُٹھیں اور اللہ کے نور و حکمت کو دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلا دیں۔

رجسٹروں کی ترتیب اور وظائف کی تعیین نے قرون اولیٰ کے ان عربوں کو ادائے رسالت میں...... جو اللہ کی طرف سے ان پر فرض کی گئی تھی...... کتنی مدد دی، یہ آپ دیکھ چکے ہیں اور یہی ادائے رسالت تھی جس نے تاریخ میں ان کے نام کو بقائے دوام بخشی اور تاریخی کتابوں کے صفحات ان کے کارناموں سے جگمگا اُٹھے۔ جس جذبے کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ چاہتے تھے کہ عرب اسلام کا پرچم لہرانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ اسی جذبے نے انہیں اس امر سے باز رکھا کہ وہ خراج اور جزیے کی رقم جزیرہ نمائے عرب کی زمین پر صرف کردیں اور سد مآرب کے سے بند باندھ کر اس کے ریگزاروں کو لہلہاتی زمینیں بنادیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو عرب جہاد کو چھوڑ کر اس زندگی کی طرف ڈھل جاتے جس میں مشقت بھی کچھ ایسی زیادہ نہ تھی اور خطرات بھی برائے نام تھے اور اسلامی رسالت کی تبلیغ اس طرح کبھی نہ کرتے جس طرح انہوں نے کی۔ اس کے علاوہ جتنی مہارت انہیں جنگ اور تجارت میں تھی زراعت وصنعت میں نہ تھی، اس لیے وظائف کی تعیین ہی انہیں حصول زر کے اس رستے پر ڈال سکتی تھی جو ان کے میلانِ طبع کے عین مطابق تھا۔ شاید انہوں نے ایسا کیا ہو یا شاید وہ ایسا کررہے تھے۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد بلادِ عرب میں فتنہ وفساد کے شعلے بھڑک اُٹھے اور لوگوں کی توجہ ملکی وسیاسی جھگڑوں میں اُلجھ گئی، ان جھگڑوں کی وجہ سے ایک طرف تو دارالسلطنت پہلے شام اور پھر عراق میں منتقل ہوا اور دوسری طرف جزیرہ نمائے عرب فقر وبدحالی کے چنگل میں ایسا پھنسا کہ آج تک اسے اس چنگل سے نکلنا نصیب نہیں ہوا۔

اب ہم پھر دیوان...... رجسٹر...... کی تدوین اور وظائف کی تعیین کی طرف آتے ہیں۔ دیوان ایک فارسی لفظ ہے جسے معرب کرلیا گیا ہے۔ اس کے معنی ہیں، رجسٹر، جس میں فوجیوں اور وظیفہ خوروں کے نام درج کیے جائیں۔ بعد کو اس لفظ کا مفہوم بدل گیا اور یہ اس مقام کے لیے استعمال ہونے لگا، جہاں سرکاری کاغذات رکھے جاتے ہیں اور جسے آج کل کی اصطلاح میں ''محافظ خانہ'' کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ان عمارتوں پر بولا جانے لگا جن میں سرکاری دفاتر ہوں

اور ساتھ ہی رجسٹر کے معنی میں بھی اور یہ صاف ظاہر ہے کہ عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں وہ اپنے پہلے معنی سے متجاوز نہ ہوا تھا۔ چنانچہ دیوان وہ رجسٹر تھا، جس میں فوجی اور غیر فوجی وظیفہ خوروں کے نام لکھے جاتے تھے اور ہر شخص کے نام کے سامنے اس کے وظیفے کی رقم درج ہوتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رجسٹر مرتب کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا اور عقیل بن ابی طالب، مخرمہ بن نوفل اور جبیر بن مطعم کو بلا کر کہا: ''حیثیت اور مرتبے کے لحاظ سے لوگوں کی فہرست تیار کرو۔'' ان لوگوں نے سب سے پہلے بنو ہاشم کے نام لکھے پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قبیلے بنو تمیم کے اور اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبیلے بنو عدی کے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا تو فرمایا: ''خدا کی قسم! چاہتا تو میں بھی تھا کاش! ایسا ہوتا۔ لیکن تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت سے شروع کرو، جو حضورؐ سے قریب تر ہیں، سب سے پہلے وہ، پھر وہ جو ان کے بعد ہیں، یہاں تک کہ عمر رضی اللہ عنہ کو وہاں رکھو جہاں اللہ نے اسے رکھا ہے۔''

روایت ہے کہ بنو عدی کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ بات معلوم ہوئی تو وہ ان کے پاس آئے اور کہا: ''آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہیں[1] آپ نے اپنا نام وہیں کیوں نہ رہنے دیا، جہاں ان لوگوں نے لکھا تھا۔'' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے غضب ناک نگاہوں سے انہیں دیکھا اور فرمایا:

''واہ! اے بنو عدی! چاہتے ہو کہ میری کمائی کھاؤ اور تمہاری وجہ سے میری نیکیاں برباد ہو جائیں۔ نہیں! خدا کی قسم! تم اسی ترتیب سے آؤ گے جس ترتیب سے تمہارے پاس دعوت پہنچی تھی، چاہے تمہارے ناموں پر رجسٹر ختم ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔ میرے دو رفیقوں نے جو راہ اختیار کی تھی اگر میں اس کے خلاف کروں گا تو میری مخالفت کی جائے گی۔ خدا کی قسم! ہمیں دنیا میں جو عزت ملی ہے اور ہم آخرت میں اپنے عمل کے بدلے اللہ کے جس ثواب کے اُمیدوار ہیں وہ سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ ہے۔ اس لیے آپ ہمارا اشرف ہیں اور آپ کی قوم اشرف العرب! اس کے بعد وہ جو اس سے قریب ہیں پھر وہ جو ان سے قریب ہیں'' یہ ایک نیا مسئلہ تھا جس سے لوگوں کی طبقاتی درجہ بندی مقصود تھی، اس مسئلے کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور اپنی خلافت کے ابتدائی دور میں خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی نہیں چھیڑا تھا۔ قرآن نے مسلمانوں کے کسی طبقے کو دوسرے طبقے پر فضیلت نہیں دی نہ بر بنائے نسب کسی گروہ کے رزق میں اضافہ کیا، جس طرح کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رجسٹروں کی ترتیب میں اس کا لحاظ رکھا تھا اور نہ لوگوں کو ایسے طبقات میں تقسیم کیا جو نسب کی وجہ سے ایک

[1] دوسری روایت میں ہے'' آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ تھے۔

Marfat.com

دوسرے پر امتیاز رکھتے ہوں اور اللہ کے نزدیک پرہیزگاری کے سوا کسی اور بنا پر ایک دوسرے سے بزرگ سمجھے جائیں۔ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے!'' خدا کی قسم! اگر عجمی اپنے اعمال لے کر جائیں گے تو وہ قیامت کے دن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ہم سے برتر ہوں گے۔ انسان قرابت پر نظر نہ رکھے، بلکہ خدا کا انعام حاصل کرنے کے لیے عمل کرے! جس کسی نے عمل میں کوتاہی برتی اس کا نسب اسے سبقت نہیں دلا سکتا۔''

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ تقسیم میں مسلمانوں کے درمیان مساوات برتتے تھے۔ ایک دن ان سے پوچھا گیا: '' آپ سابقین اسلام کو فضیلت نہیں دیتے؟'' جواب میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: '' وہ اللہ کے لیے اسلام لائے ہیں اور اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے، جو وہ قیامت کے دن انہیں عطا کرے گا۔ اس دنیا میں ان سب کا حصہ برابر ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب سابقین کو فضیلت دینی چاہی تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد ان کے سامنے دہرایا گیا انہوں نے فرمایا: '' میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے والوں کو ان لوگوں کے درجے میں نہیں رکھ سکتا، جنہوں نے حضورؐ کے ساتھ مل کر جنگ کی ہے۔''

چنانچہ اہل بدر کو سب پر مقدم رکھا اور جو لوگ ان کے بعد آتے تھے ان کی درجہ بندی ان کے مرتبے کے مطابق کی، لیکن جو حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتے میں سب سے قریب تھے، انہیں فضیلت دینے میں جہاد اور سبقت اسلام کا لحاظ نہ رکھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا وظیفہ بارہ ہزار درہم مقرر کیا اور ان کی بہن حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب کا چھ ہزار درہم۔ امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو بجز ان خاتون کے جن پر ملکیت جاری ہوئی تھی، دس دس ہزار درہم وظیفہ دیا۔ لیکن امہات المومنین نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم میں ہمارے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتا، اس لیے ہم میں مساوات رکھی جائے'' اور حضرت عمر نے ایسا ہی کیا پھر بھی حضرت عائشہ کو دو ہزار درہم زیادہ دیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے محبت فرماتے تھے، چنانچہ انہیں بارہ ہزار درہم وظیفہ ملتا تھا۔ لیکن اس امتیاز پر امہات المومنین میں سے کسی نے اعتراض نہ کیا[1] پھر حضرت عمر نے ان تمام بزرگوں کا پانچ ہزار درہم سالانہ وظیفہ مقرر کیا، جو غزوۂ

---

[1] یہ طبری کی روایت ہے، لیکن ابن سعد کی روایت میں ہے کہ حضرت عمر نے اُمہات المؤمنین کے بارہ بارہ ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا اور جویریہ بنت حارث اور حضرت صفیہ بنت حیی بھی ان میں شامل تھیں۔ ابن سعد نے آخر میں اپنا یہ قول لکھا ہے کہ یہ روایت متفق علیہ ہے۔

Marfat.com

بدر میں شریک تھے اور جو حضرات اپنے اسلام میں اصحاب بدر کے ہم دوش تھے، جیسے حبشہ کے مہاجرین اور غازیان احد انہیں چار چار ہزار درہم سالانہ وظیفہ دیا۔ اصحاب بدر کے فرزندوں کو دو دو ہزار۔

لیکن حضرت امام حسن وحسین علیہما السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی وجہ سے ان کے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رکھا اور ان میں سے ہر ایک کا پانچ پانچ ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا۔ جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے ہجرت کی تھی انہیں تین تین ہزار اور مسلمان فاتحین کو دو دو ہزار وظیفہ دیا۔ مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم کے نوجوان فرزندوں کا وظیفہ مسلمان فاتحوں کے وظیفے کے برابر تھا۔ باقی لوگوں کے وظیفے ان کی حیثیت، حفظ قرآن اور جہاد کے پیش نظر مقرر کیے گئے تھے اور جو باقی بچے ان کے لیے ایک اصول مقرر کر دیا۔ چنانچہ جو مسلمان مدینہ آئے اور وہاں مقیم ہو گئے انہیں پچیس دینار دیئے گئے اور اہل یمن اور شام وعراق کے حاجت مندوں کو علی الترتیب دو ہزار، ایک ہزار نوسو، پانچ سو اور تین سو درہم دیئے گئے۔ تین سو سے کم کسی کا وظیفہ مقرر نہ کیا اور فرمایا: "اگر مال کی کثرت ہوئی تو ہر شخص کو چار ہزار درہم اور وظیفہ دوں گا۔ ایک ہزار اسلحہ کے لیے اور ایک ہزار اہل وعیال کے واسطے چھوڑنے کے لیے اور ایک ہزار اس کے گھوڑے اور خچر کے لیے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نومولود کو سو درہم وظیفہ دیتے تھے اور جب اس میں ذرا شعور پیدا ہو جاتا تھا تو دو سو درہم کر دیتے اور اس کی بلوغت کے بعد اس میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ جب کوئی لاوارث بچہ لایا جاتا تھا، اس کا وظیفہ سو درہم مقرر کیا جاتا تھا اور اس کے ولی کو حسب ضرورت ماہانہ رقم الگ دی جاتی تھی۔ بچے کی رضاعت اور نفقے کا بیت المال کفیل ہوتا تھا، اور اس کے بعد سال کے سال دوسرے بچوں کی طرح اس کے وظیفے میں بھی اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو قاعدہ وضع کر کے اسے تقسیم وظائف کی بنیاد بنایا تھا وہ ان کے اس قول سے واضح ہے: "ہر شخص اس مال میں اپنا حق رکھتا ہے، یہ اور بات ہے کہ اسے دیا جائے یا نہ دیا جائے اور اس پر ہم سب سے زیادہ حق غلام کا ہے۔ اس باب میں میں بھی تم جیسا ہوں۔ لیکن قرآن نے جو ہمارے درجے مقرر کیے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو ہماری حیثیتیں ہیں ان کا لحاظ رکھا جائے گا، چنانچہ سب سے مقدم وہ ہے جس نے اسلام کی خاطر تکلیفیں اٹھائیں۔ پھر وہ جس نے اسلام میں سبقت کی، پھر وہ جس نے اسلام کی راہ میں دولت خرچ

Marfat.com

کی۔ پھر وہ جو حاجت مند ہے اور خدا کی قسم! اس کے بعد بھی کچھ بچا تو جبل صنعا کا چرواہا اس مال میں سے اپنا حصہ لے گا اور یہی اس کا مقام ہوگا۔" اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام آدمیوں کے وظیفے مقرر کر دیئے، کسی کو نظر انداز نہ کیا۔ ابن سعد نے طبقات میں سالم ابوعبداللہ کی ایک روایت نقل کی ہے: "عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے وظیفے مقرر کیے، یہاں تک کہ ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کو وظیفہ نہ ملتا ہو۔ بس وہی لوگ باقی رہ گئے جن کا نہ کوئی رشتہ دار تھا نہ غلام۔ سو ان کا بھی اڑھائی سو سے تین سو تک وظیفہ مقرر کر دیا۔"

لیکن عورتوں اور مردوں کے وظائف کی تقسیم و تنظیم کے لیے جو قاعدے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وضع کیے تھے، کہیں کہیں اس میں ترمیم کرنا پڑی اور کچھ لوگوں کو ان کے امثال واقران سے زیادہ وظیفہ دیا گیا۔ عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کے چار ہزار درہم مقرر کیے گئے۔ یہ وہی عمر رضی اللہ عنہ ہیں جو ام المؤمنین حضرت ام سلمہ کے صاحبزادے تھے۔ اس پر محمد بن عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے اعتراض کیا اور حضرت امیر المؤمنین سے کہا: "آپ نے عمر رضی اللہ عنہ کو ہم پر فضیلت کیوں دی ہے؟ ہمارے بزرگوں نے تو ہجرت بھی کی اور غزوات میں بھی شریک ہوئے! حضرت عمر بن خطاب نے جواب دیا: میں نے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی وجہ سے فضیلت دی ہے۔ لاؤ! اگر ایسی کوئی ماں ہو جس پر ام سلمہ کی طرح عنایت و مہربانی کی گئی ہو!" حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا وظیفہ چار ہزار درہم مقرر کیا۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بولے: "آپ نے مجھے تو تین ہزار درہم دیئے اور اسامہ رضی اللہ عنہ کو چار ہزار۔ حالانکہ جن غزوات میں میں شریک ہوا ہوں، اسامہ شریک نہ ہوئے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اسے اس لیے زیادہ وظیفہ دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے تم سے اور اس کے باپ کو تمہارے باپ سے زیادہ چاہتے تھے۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ حضرت اسماء بنت عمیس کو ایک ہزار، حضرت ام کلثوم بنت عقبہ رضی اللہ عنہا کو ایک ہزار اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ کو ایک ہزار درہم وظیفہ دے کر ان کی ہم چشموں سے انہیں ممتاز کر دیا کہ وہ ان حضرات کی بیویاں اور مائیں ہونے کی بنا پر ایک خاص مقام رکھتی تھیں، جو دوسرے مسلمانوں سے زیادہ فضیلت و امتیاز رکھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ وظیفہ کے ہر حقدار کو اس کا حق پہنچ جائے۔ یہاں تک کہ تقسیم وظائف کی ذمہ داری وہ اپنے ذمہ لے لیتے تھے۔ حزام بن ہشام کعبی اپنے والد کے حوالے سے بیان کرتے ہیں

کہ انہوں نے کہا: ''میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ خزاعہ کا رجسٹر لیے جا رہے ہیں۔ قدید پہنچ کر انہوں نے ہر بیاہی ہوئی عورت اور بے بیاہی لڑکی کو بلایا اور اس کا وظیفہ اپنے ہاتھ سے اسے دیا۔ وہاں سے عسفان پہنچے اور اسی طرح ایک ایک کا وظیفہ اسے پہنچا دیا۔'' ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حذیفہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ لوگوں کے وظیفے اور روزیاں انہیں دے دی جائیں۔'' حذیفہ نے لکھا: ''ہم نے سب کے وظیفے اور روزیاں تقسیم کر دی ہیں، پھر بھی بہت کچھ بچ گیا ہے!'' حضرت عمر نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا: ''یہ ان کا حصہ ہے، جو اللہ نے انہیں بخشا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ اور اس کی اولاد کا اس پر کوئی اجارہ نہیں، جو کچھ بچا ہے وہ بھی انہیں میں تقسیم کر دو۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خط حذیفہ کو اس لیے لکھا تھا کہ وظائف کے رجسٹر تمام کے تمام مدینے میں نہ تھے، وہ الگ الگ تھے اور ان شہروں یا ان قبیلوں کے حاکموں کے پاس رہتے تھے، جن شہروں یا جن قبیلوں کے وظیفہ خوروں کے نام ان میں درج ہوتے تھے۔ چنانچہ حمیر کا رجسٹر والئی یمن کے پاس، بصرہ کا رجسٹر والئی بصرہ کے پاس اور اسی طرح ہر صوبے کا رجسٹر اس صوبے کے عملدار کے پاس تھا۔ اس سے یہ ہوا کہ ہر مسلمان کو اسی شہر میں وظیفہ مل جاتا تھا، جس میں وہ رہتا تھا اور جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ اور اس کے اطراف کی آبادیوں میں وظیفہ یابوں کا وظیفہ خود پہنچاتے تھے، اسی طرح ہر عمل دار اپنے صوبے کے وظیفہ یابوں کا وظیفہ خود پہنچاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رجسٹر کب مرتب اور وظیفے کب مقرر کیے؟ اس مسئلے میں اختلاف ہے، علامہ طبری کہتے ہیں کہ سنہ 15 ہجری میں اور ابن سعد کا کہنا ہے کہ محرم سنہ 20 ہجری میں، لیکن یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان میں سے کون سی تاریخ صحیح ہے؟ سنہ 15 ہجری میں اگرچہ مدائن فتح نہ ہوا تھا مگر عراق کی آبادیاں مسلمانوں کے قبضے میں آ چکی تھیں اور اگرچہ اس وقت بیت المقدس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے اپنے دروازے نہ کھولے تھے۔ مگر مسلمان دمشق پر قبضہ اور اردن کی تطہیر کر چکنے کے بعد حمص اور قنسرین کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تو کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ عراق کی آبادیوں اور شام کے شہروں سے جو خراج مدینہ آتا تھا، اس نے حضرت عمر کی توجہ رجسٹروں کی ترتیب کی طرف منعطف کرائی۔ جیسا کہ علامہ طبری کا بیان ہے۔ یا انہوں نے یہ قدم اس وقت اٹھایا جب عراق و شام مکمل طور پر فتح ہو گئے اور وہاں سے جزیہ و خراج کی رقم اتنی کثرت سے آنے لگی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا، اسے گن کر تقسیم کریں یا تول کر۔ یہاں تک کہ انہیں

Marfat.com

رجسٹر مرتب کرنے کا مشورہ دیا گیا اور یہ ابن سعد کی روایت کے مطابق سنہ ۱۰ ② ہجری کی بات ہے۔

میں اپنے آپ کو اس آخری رائے کی طرف مائل پاتا ہوں، لیکن قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا، اس رائے کی طرف میرے میلان کی وجہ یہ ہے کہ محض میدان جنگ سے آنے والے مال غنیمت کے سہارے رجسٹر مرتب نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اس لیے کہ مال غنیمت ایک غیر یقینی ذریعہ تھا اور رجسٹروں میں درج کردہ وظائف ایک یقینی سالانہ خرچ۔ اس بناء پر وظائف، جزیہ وخراج ہی کی رقموں سے ادا ہو سکتے تھے اور جس سن میں علامہ طبری لکھتے ہیں کہ رجسٹر مرتب کیے گئے، اس سن میں جزیہ وخراج کی رقمیں اس حد کو نہ پہنچی تھیں کہ وہ تمام عربوں کے وظائف کا بار اُٹھا سکتیں۔ جتنی بے چینی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وظیفے کی تقسیم کرنے کی تھی، اتنی ہی بے چینی جزیرۃ العرب اور مفتوحہ ممالک کے عربوں کو وظیفے وصول کرنے کی تھی اور کیوں نہ ہوتی جب حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ان کے دلوں میں اس کا شوق بھڑکاتے تھے اور وظیفے کی رقم کو منفعت بخش کاموں میں لگانے کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے تھے: ''کم سواد عربوں میں سے جس کسی کو وظیفہ ملے اسے چاہیے کہ بکریاں خرید کر اپنے سرمایے میں شامل کر لے اور جب دوبارہ وظیفہ ملے تو مویشی خرید لے۔ کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ میرے بعد ایسے لوگ تمہارے والی بنیں گے جو اپنے دور میں وظیفے جاری نہیں کریں گے۔ اگر تم میں سے کوئی اس وقت تک زندہ رہا تو اس کے پاس اتنی جمع جکڑی ہوگی کہ وہ اس کے سہارے زندگی بسر کر لے۔'' اور اکثر لوگ حضرت عمر کی اس نصیحت پر عمل کرتے تھے۔

لیکن جن حضرات کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وظائف میں امتیازی حیثیت دی تھی، ان میں سے کچھ بزرگ اس رقم کو صدقے کے طور پر دے دیا کرتے تھے...... ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے متعلق مشہور ہے کہ جب وظیفے کی رقم انہیں ملی تو انہوں نے فرمایا: ''اللہ عمر رضی اللہ عنہ کو معاف کرے، میری دوسری بہنیں اس وظیفے کی مجھ سے زیادہ مستحق تھیں۔'' کہا گیا: ''یہ ساری رقم آپ کی ہے!'' فرمایا ''سبحان اللہ! اور اسے کپڑے میں چھپا کر بولیں: ''اسے زمین پر ڈال کر کپڑا ڈھانک دو!'' اس کے بعد برزہ بنت رافع سے فرمایا: ''اس رقم میں سے مٹھی بھر کر فلاں فلاں قبیلے کے حق داروں اور یتیموں کو دے آؤ'' جو رقم باقی بچی، وہ کپڑے کے نیچے رہی۔ برزہ نے کہا، ''ام

Marfat.com

المومنین! اللہ آپ کو معاف کرے، بخدا! اس میں ہمارا بھی حصہ ہے!" فرمایا: "تمہارا حصہ اس کپڑے کے نیچے ہے۔" جب کپڑا اُٹھایا گیا، تو صرف پچاسی درہم نکلے۔ اس کے بعد حضرت زینب نے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے اور کہا: "یا اللہ! عمر کا وظیفہ اس سال کے بعد مجھے نہ ملے!" اللہ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی اور وہ اپنے رب سے جاملیں۔

ام المومنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور چند دوسرے مسلمانوں کی یہ کیفیت ضرور تھی، لیکن بیش تر لوگ وظیفہ لے کر تجارت کرتے تھے۔ اس لیے جو وظیفہ یاب ہزاروں درہم وصول کرتے تھے ان کی دولت دگنی اور چوگنی ہوگئی۔ اس سے طبقاتی امتیازات نے جنم لیا اور اجتماعی نظام پر ان امتیازات کا اتنا واضح اثر پڑا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ انتہائی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے درمیان جو مساوات رکھی تھی، وہی بہتر تھی اور وظائف کے معاملے میں انہیں بھی اس روش پر چلنا چاہیے تھا۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا: "خدا کی قسم! اگر میں آئندہ سال تک زندہ رہا تو آخری آدمی کو پہلے آدمی سے ملا کر ایک وجود بنا دوں گا۔" اور کہا اگر میں ایک سال زندہ رہ گیا تو سب سے پست آدمی کو سب سے بلند آدمی سے ملا دوں گا!" لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مسلمانوں کو ایک سطح پر لانے کے لیے اگر امتیازی وظیفوں میں کمی کی گئی تو اس سے ایک ایسی ناراضگی پھیل جانے کا اندیشہ ہے جس کے نتائج ناخوشگوار ہوں گے۔ چنانچہ ان کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ چھوٹے وظیفہ یابوں کے وظیفوں میں اضافہ کر کے انہیں بڑے وظیفہ یابوں کی سطح پر پہنچا دیا جائے۔ ان کا ارشاد تھا: "اگر میں دولت کی فراوانی تک زندہ رہا تو ہر مسلمان کا وظیفہ تین ہزار درہم کر دوں گا۔ ایک ہزار اس کے جانوروں اور ہتھیاروں کے لیے، ایک ہزار خود اس کے لیے اور ایک ہزار اس کے اہل وعیال کے لیے۔"

لیکن وہ سال بھر زندہ نہ رہے اور آنے والے سال سے پہلے ہی شہید کر دیے گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبقات باقی رہ گئے اور ان طبقات کا آگے چل کر ملت اسلامیہ کی زندگی پر جو اثر پڑا اس کی تفصیل اس کتاب کے دائرہ بحث سے خارج ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صرف وظیفہ خوروں ہی کا رجسٹر نہیں بنایا، بلکہ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے مراسلت کا رجسٹر وجود میں آیا۔ شام، عراق اور مصر کے جو رجسٹر تھے وہ علی الترتیب رومی، فارسی اور قبطی زبان میں لکھے جاتے تھے

Marfat.com

اور ان کی ترتیب وتحریر مسلمانوں کے نہیں، ایرانیوں، رومیوں اور قبطیوں کے ہاتھ میں تھی۔ مراسلت کا یہ رجسٹر بھی خراج کے رجسٹر، سکہ ڈھالنے کے لیے ٹکسال کی تعمیر اور مختلف شہروں میں بیت المال کے قیام کی طرح انہی برق رفتار تبدیلیوں کا مرہون تھا، جو اسلامی فتوحات اور مسلمانوں کے ایرانی ورومی سلطنتوں کے مختلف گوشوں میں پھیل جانے کی وجہ سے ظہور میں آئی تھیں۔ اس سے پہلے اسلامی مملکت میں اس قسم کے رجسٹر کہیں نہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے خطوط آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم لکھتے تھے اور ان خطوط کی نقل اور ان کے جواب کاشانہ نبوت میں محفوظ رکھے جاتے تھے۔ سرکار رسالت مآب ﷺ نے کوئی بیت المال بھی قائم نہیں فرمایا تھا، اس لیے کہ آپ غنیمت اور صدقات کی رقم وصول ہوتے ہی مسلمانوں میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی اسی سنت پر عمل کیا۔ چنانچہ جو خطوط مرتدین اور ان سے لڑنے والے امرائے لشکر کو لکھے اور عراق وشام کے محاذوں پر جانے کے لیے جو دعوت نامے فوج اور اس کے سپہ سالاروں کو بھیجے جاتے وہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ ہی کے مکان میں جمع رہتے تھے۔

امرائے لشکر کا بھی یہی طریقہ تھا، وہ خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جو عرضداشتیں بھیجتے، اپنے لشکر کو جو احکام دیتے، دشمن کو جو خطوط لکھتے اور مفتوحہ علاقوں کے باشندوں سے جو معاہدے کرتے وہ سب انہیں کے پاس محفوظ رہتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس غنیمت کا جتنا مال آتا، سب کا سب تقسیم فرما دیتے اور اس میں سے کوئی چیز باقی نہ رکھتے تھے۔ اس کے بعد جب عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں مملکت کی حدود وسیع ہوئیں اور اس کی وجہ سے حکومت کا کام بڑھا، سرحدی چوکیاں قائم کی گئیں، اور جزیہ وخراج وغیرہ کی رقمیں پے در پے مدینہ آنے لگیں تو اس نئی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ان وسائل سے کام لینا ناگزیر ہو گیا، جو ان تمام معاملات کی تنظیم اس طرح کریں کہ ساتھ ساتھ مملکت کی صلاح وفلاح کی راہیں بھی کھلتی جائیں اور لوگوں میں عدل وانصاف بھی قائم ہوتا جائے۔ پھر مفتوحہ علاقوں میں ایک ایسی حکیمانہ سیاست بروئے کار لائی جائے کہ وہاں کے باشندے اس حکومت سے خوش ہو جائیں جو قیصر وکسریٰ کی حکومتوں کی جگہ قائم ہوئی تھی۔ اس باب اور اس سے پہلے باب میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ یہ تمام کام کتنی حزم واحتیاط اور حکمت ودانائی کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچائے گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کس طرح فتوحات کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوئے۔

حق یہ ہے کہ وہ غیر معمولی قوت، جس نے رسول اللہ ﷺ کی ہجرت اور سلطنت فاروقی

کے درمیانی عرصے میں اسلامی سلطنت کی تنظیم کی۔ ہر طرح کے اکرام واحترام کی مستحق ہے۔ بھلا کہاں یہ عظیم الشان سلطنت اور اس کا جدید نظام اور کہاں مدینے کی وہ ابتدائی تنظیم جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی ہجرت کے بعد مسلمانوں میں مواخات قائم کر کے فرمائی تھی۔ بلاشبہ یہ متمدن حکومت، جو ایران، عراق، شام، مصر اور پورے جزیرۃ العرب پر سایہ فگن تھی اس بدوی حکومت سے کہیں آگے تھی، جو سنہ 6 ہجری سے پہلے، جب رسول اللہ ﷺ نے اہل مکہ سے صلح حدیبیہ فرمائی، مدینے کی حدود سے آگے نہ بڑھی تھی اور یہ صلح حدیبیہ وہی صلح ہے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا تھا:

(اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحاً مُّبِیْناً لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ وَیُتِمَّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکَ وَیَھْدِیَکَ صِرَاطاً مُّسْتَقِیْماً) (الفتح 1،2)

ترجمہ: ''بے شک ہم نے تجھے ایک نمایاں فتح دی تا کہ اللہ تیری سب اگلی پچھلی خطائیں معاف فرما دے، اور تجھ پر اپنے احسانات کی تکمیل کر دے اور تجھے سیدھے رستے پر لے چلے۔''

اس صلح نامے کے بعد مسلمانوں نے ایک نئی زندگی شروع کی جس کے ساتھ نظام حکومت بھی آہستہ آہستہ ترقی کرتا گیا۔ چنانچہ سنہ 7 ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے مختلف ملوک وامراء کو اسلام کے دعوت نامے بھیجے، کسریٰ نے یہ دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے فوراً بعد مر گیا۔ یہ دونوں باتیں گویا یمن کے ایرانی گورنر کے قبول اسلام کا سبب بنیں۔ وہ پرچم رسالتؐ کے سائے میں آ گیا اور نبی عربی علیہ التحیۃ والتسلیم کا اطاعت گزار ہو کر یمن میں حکومت کرتا رہا۔ سنہ 8 ہجری میں مکہ اور طائف فتح ہوئے اور وہاں کے باشندوں نے اسلام قبول کر لیا، جس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں شہروں کے لیے مدینے سے ایک عامل بھیجا۔

سنہ 9 ہجری میں جزیرہ نمائے عرب سے وفود آئے اور مدینہ پہنچ کر انہوں نے اپنے اور ہم نسب قبائل کے اسلام کا اعلان کیا۔ سنہ 10 ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے ان قبیلوں میں اپنے عمال بھیجے، جو لوگوں کو دین کی تعلیم دیتے تھے اور ان سے صدقات وصول کرتے تھے۔ سنہ 11 ہجری میں سرکار رسالت ﷺ کی وفات ہو گئی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ مرتدین پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فتح گویا جزیرۃ العرب میں نیا نظام قائم ہونے کی تمہید تھی۔ سنہ 12 ہجری میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے عراق وشام پر حملہ کر کے فتوحات اور اسلامی سلطنت کی بساط بچھانی شروع کی۔ سنہ 13 ہجری میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور

Marfat.com

زمام خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں آئی۔ عہد فاروقی میں عراق، ایران، شام، مصر اور برقہ کی فتوحات مکمل ہوگئیں جس سے اسلامی سلطنت ایک زندہ حقیقت بن گئی۔ ان بڑی بڑی تبدیلیوں نے پندرہ برس سے کم مدت میں رونما ہو کر تاریخ کا رخ بدل دیا اور انسانی تہذیب کو ایک نئی راہ دکھائی، بلاشبہ وہ قوت ہر طرح کے اکرام واحترام کی مستحق ہے جس کے ہاتھوں یہ تبدیلیاں مکمل ہوئیں۔

ان چند برس کے دوران میں نظام حکومت خانہ بدوشی سے ترقی کر کے آہستہ آہستہ وہ تمدنی صورت اختیار کرتا رہا، جس کی تصویر ہم اوپر کھینچ آئے ہیں۔ لیکن یہ صورت اپنے اصل وجوہر کے اعتبار سے عربی اسلامی ہی رہی، جس نے نئے نظام کو شوریٰ کی اساس پر استوار کر کے آگے بڑھایا اور ساتھ ہی ان جدید ترین تعلیمات کو بھی ترقی دی، جو اس زمانے میں جانی پہچانی تھیں۔ ایران اور روم کے شہنشاہوں کو یہ زعم تھا کہ ان کے اقتدار کا سرچشمہ ان کا خداداد حق شاہی ہے، لیکن امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ اپنے اقتدار کو ان لوگوں کے تعاون کا نتیجہ سمجھتے تھے جنہوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ان دونوں شہنشاہوں کے زور وجبر کی کوئی حد ونہایت نہ تھی اور وہ اپنی رعایا کا خون چوسنے، اس کی آزادی کا ہر طرح گلا گھونٹنے میں بالکل آزاد تھے۔ اس کے برعکس امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کتاب وسنت کے پابند تھے اور اہل الرائے کے مشوروں کو پورا پورا وزن دیتے تھے۔ ان کے یہ مشیر نہایت آزادی وبے باکی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے لیکن حد سے آگے قدم نہ بڑھاتے تھے اور یہ حد قائم کرنے والے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس رسالت پر ان کا سچا ایمان تھا جو اللہ نے دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانے کے لیے عربوں کے سپرد فرمائی تھی۔ ارباب شوریٰ اور دوسرے تمام مسلمانوں کی آزادی اس بنیاد پر قائم تھی کہ اللہ اور اس کے اوامر ونواہی کے سامنے سب مسلمان برابر ہیں۔ کوئی امیر کسی عام آدمی پر اور کوئی عرب کسی عجمی پر...... نیکوکاری وپرہیزگاری کے سوا...... کوئی فضیلت نہیں رکھتا۔ اس مساوات اور اس آزادی پر ان کا یہ ایمان ہی تھا، جس نے انہیں اخوت کے اس بلند مقام پر پہنچا دیا، جہاں ہر مسلمان اپنے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ چاہتا تھا جو وہ اپنے لیے پسند کرتا تھا۔

یہ تھے وہ بلند اصول، جنہوں نے اسلامی حکومت کو اپنے سائے میں پروان چڑھا کر مسلمانوں کو عزت بخشی اور یہ تھا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے شرف وافتخار کا ارفع واعلیٰ مقام کہ وہ ان

اصولوں کا دل سے احترام کرتے تھے اور انہیں عام زندگی پر منطبق کرنے کے لیے بے چین رہتے تھے اور جہاں کہیں ایسے اصول پائے گئے ہیں۔ جنہیں لوگوں نے اپنی معاملت کی بنیاد بنایا ہو اور جن کے سائے میں نظام حکومت نے صحت و سلامتی اور عمومی احترام کے ساتھ ترقی کی ہو، پھر حکومت کا دامن بھی ہر قسم کی غرض سے پاک اور عدل و انصاف کے پھولوں سے لبریز رہا ہو، وہاں ہمیشہ قومی شرف وجلال کے آفتاب نے اپنی کرنیں بکھیری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عہد فاروقی میں مسلمان انتہائی بلند مرتبے تک پہنچے اور اسی عہد میں وہ اسلامی سلطنت قائم ہوئی، جو اس کے بعد بھی اپنی ٹھوس بنیادوں اور شاندار عمارت کے ساتھ مدتوں قائم رہی۔

Marfat.com

باب:23

عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں اجتماعی زندگی کا ایک نقشہ

کتنا عظیم الشان تھا وہ انقلاب، جو فتح مکہ کے بعد...... پندرہ برس کے اندر اندر سارے جزیرۃ العرب میں برپا ہو گیا۔ اس کی عظمت کو دیکھتے ہوئے اگر آپ یہ کہیں کہ اسے انقلاب سے بڑھ کر کوئی نام دینا چاہیے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ ایک ''زقند'' تھی جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ چنانچہ اس مختصر سے زمانے میں عرب بت پرستی سے نکل کر اسلام کی طرف آئے اور ......ان کی قبائلی نا اتفاقی اور قومی نفرت ایک ایسی وحدت سے بدل گئی جو ہمہ گیر سیاست اور مشترک غرض کے بل پر قائم تھی۔ اس سے پہلے وہ جزیرہ نمائے عرب کی حدود میں سمٹے ہوئے تھے اور اس کے بعد ایک ایسی وسیع سلطنت کے مالک بن گئے، جس میں رومی اور ایرانی دونوں سلطنتیں تحلیل ہو گئی تھیں۔ پہلے ان کی آبادیوں پر بدویت کی سختی و تنگ دستی چھائی ہوئی تھی اور اب وہ اک ایسی آسودگی و خوش حالی کی زندگی بسر کرنے لگے جو اس سے پہلے ان کے لیے اجنبی تھی۔ ان حالات میں کوئی تعجب نہیں، اگر ان کی اجتماعی زندگی ان برق رفتار تبدیلیوں سے متاثر ہو جاتی اور زندگی اور مطالب زندگی کے متعلق ان کا نقطہ نظر بدل جاتا اور ہوا بھی یہی۔ وہ تمام محرکات جنہوں نے عربوں کو اس ''زقند'' تک پہنچایا، ان کی انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں پر اپنا اپنا اثر رکھتے تھے۔ مذہبی محرک کا اپنا اثر، سیاسی محرک کا اپنا اور اقتصادی محرک کا اپنا اثر۔ یہ اثرات بعض اوقات متناقض ہوتے تھے، لیکن وہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہو کر آپس میں گھل مل گئے اور انہوں نے اجتماعی زندگی میں کچھ ایسی تبدیلی پیدا کر دی کہ اس کا جو اثر بعد کو اسلام اور مسلمانوں کی زندگی پر مرتب ہوا، وہ نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتا اور دماغ کو اپنے متعلق سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔

اس انقلاب کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے، مناسب یہ ہے کہ ہم عربوں کی اسلام سے پہلے کی اجتماعی زندگی پر نظر ڈالیں۔ عربوں کی اکثریت صحرا میں زندگی بسر کرتی تھی۔ شہری

آبادی بہت ہی کم تھی، جس کا سبب یہ تھا کہ جزیرہ نمائے عرب میں باقاعدہ بہنے والی نہریں نہ تھیں اور نہ وہاں سال کے سال وہ موسمی بارشیں ہوتی تھیں جو زمین کو سرسبز وزرخیز بناتی ہیں، بلکہ کبھی تو تباہ کن سیلاب آفریں بارشیں جان کا جنجال بن جاتیں اور کبھی مسلسل کئی فصلوں تک مینہ کی ایک بوند نہ پڑتی۔ چنانچہ چند علاقے چھوڑ کر پورے جزیرۃ العرب میں کھیتی باڑی کا کوئی نظام نہ تھا۔ پھر شہر اور بستیاں ان مقامات پر آباد تھیں جہاں چشموں کی بہتات تھی۔ باقی جو کچھ تھا، ریگستان ہی ریگستان تھا، جہاں بارشیں ہوتیں تو سبزہ اگ آتا، ورنہ زمین بے آب وگیاہ رہتی۔ اس لیے یمن کے ریگزار بھی دوسرے ریگزاروں کی طرح اہل یمن کے ایک بڑے حصے کو شامل تھے۔ البتہ نجد، حجاز اور عرب کے دوسرے تمام علاقوں میں شہری اور صحرائی آبادی کا جو تناسب تھا، اس کے لحاظ سے یمن کی شہری آبادی اس کی صحرائی آبادی سے زیادہ تھی۔

ریگستان میں اجتماعی زندگی کی اساس قبیلہ تھا قبیلہ خاندانوں سے ترکیب پاتا اور خاندان اپنے افراد کے نسبی اور قرابتی تعلقات سے وجود میں آتے تھے۔ خاندان کا ہر گھر نمدے کے خیمے میں رہتا تھا تاکہ جب کوئی قبیلہ اپنے اونٹوں کے لیے چراگاہ اور اپنے بال بچوں کے لیے رزق کی تلاش میں کوچ کرنا چاہے تو اسے اٹھا کر لے جانے میں سہولت رہے۔ قبیلے اکثر گرمی اور بہار کے موسم میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جایا کرتے تھے۔ جب ریگستان کے چھوٹے چھوٹے چشموں کے گرد گھاس کثرت سے اگ آتی تھی، لیکن موسم سرما کی آمد پر چراگاہیں خشک ہو جاتی تھیں تو یہ لوگ شہروں کا رخ کرتے تھے اور ان کے نزدیک ڈیرے ڈال دیتے تھے۔ پیٹ بھر روٹی حاصل کرنے کے لیے وہ اہل شہر کے ساتھ مل کر کوئی کام کرتے تھے، یا ان پر چھاپے مارتے تھے۔ اس لیے کہ ان کی کفیل وہ آزادی تھی جو انہیں اچھے سے اچھے کھانے اور بہتر سے بہتر کپڑے سے زیادہ عزیز تھی۔ ہر قبیلے کا ایک شیخ، ہر خاندان کا ایک سردھرا اور ہر گھر کا ایک مالک ہوتا تھا۔ گھر کا مالک باپ تھا اور اسے اپنے گھر پر مکمل اختیارات حاصل تھے، سب سے زیادہ اختیار اسے اپنی بیوی پر تھا۔ بیوی کی شوہر کے مقابلے میں وہی حیثیت تھی جو حیثیت خادم کی اپنے آقا کے مقابلے میں ہوتی ہے۔ وہ نہ اسے جواب دے سکتی تھی، نہ اس کی نافرمانی کر سکتی تھی۔ اس کا کام بس یہ تھا کہ گھر کی خدمت کرے اور اپنے آقا کی نسل بڑھائے۔

چنانچہ طلاق کا سب سے اہم سبب کسی عورت کا بانجھ ہونا تھا۔ تعداد ازدواج کی کوئی حد مقرر

نہ تھی تاکہ نسل زیادہ سے زیادہ پھیلے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ عرب کثرت اولاد کے بے حد خواہش مند تھے جس کی مدد سے وہ اپنے قبیلے اور اپنے گھر کی حمایت وحفاظت بڑی اچھی طرح کر سکتے تھے۔ آپ کو رسول اللہ ﷺ کے جد امجد عبدالمطلب بن ہاشم کا قصہ یاد ہوگا جب انہوں نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر ان کے ہاں دس لڑکے پیدا ہوئے اور جوان ہو کر ان کے قوت بازو بنے تو وہ کعبے کے قریب اپنے ایک بیٹے کو اللہ کے نام پر قربان دیں گے اور آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ انہوں نے عبداللہ کے بدلے سو اونٹوں کی قربانی دے کر اپنی یہ منت کس طرح پوری کی تھی۔عرب دوسرے قبیلے میں شادی کرنے کو ترجیح دیتے تھے،ان کا اعتقاد تھا کہ اس قسم کی شادی سے اولاد زیادہ طاقتور، زیادہ ذہین ہوتی ہے اور اپنے قبیلے کی لڑکیوں سے شادی کرنے میں عموماً جھگڑے اور عداوتیں پیدا ہوتی ہیں۔ان کا یہی اعتقاد تھا جس کی بنا پر وہ جنگ میں حاصل ہونے والی لونڈیوں کو اولاد پیدا کرنے کے لیے روک لیا کرتے تھے۔جس طرح مقتول کے خوں بہا میں وہ سب سے پہلے قاتل کے گھرانے کی دو لڑکیاں طلب کرتے تھے اور اپنے اس مطالبے سے دست بردار نہ ہوتے تھے۔جب کہ اونٹ، بکری اور مال کے مطالبے کبھی کبھی ترک بھی کر دیا کرتے تھے۔اس کے باوجود اگر کوئی اپنی بنت عم کے لیے پیغام دیتا تھا تو اسے غیر قبیلے والے پر اولیت حاصل ہوتی تھی اور اگر وہ قبیلے کا مقررہ مہر ادا کر دیتا تھا تو لڑکی کا باپ اپنی بیٹی کو اس سے روک نہ سکتا تھا، چاہے دوسرا دگنا اور چوگنا مہر ہی کیوں نہ دے رہا ہو۔

نوجوان لڑکی والوں کو پیام دیتا، مہر ادا کرنے کے بعد نکاح کرتا اور لڑکی کو اپنے گھرانے اور قبیلے میں لے آتا۔یہی عربوں کا عام رواج تھا، لیکن اس کے علاوہ شادی کے دوسرے طریقے بھی تھے، جن میں سے کچھ قائم رہ گئے، باقی سب اسلام نے مٹا دیئے۔ان میں سے ایک طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص کسی عورت سے شادی کر کے اسے اس کے قبیلے میں ہی چھوڑ دیتا تھا اور جب تجارت یا سفر کے سلسلے میں وہاں سے گزرتا تھا، تو کچھ دن کے لیے بیوی کے پاس ٹھہر جاتا تھا۔بعض عورتیں اپنی خاندانی شرافت یا مالداری کی بنا پر اپنے رشتے داروں ہی میں رہنا پسند کرتی تھیں۔ اپنی دولت اور اپنے تجارتی کارندوں کو چھوڑنا انہیں کسی طرح منظور نہ ہوتا۔بچے جوان ہونے تک اپنی ماؤں کے پاس ہی رہتے تھے، اس لیے وہ منسوب بھی اپنے ننھیالی قبیلوں ہی سے ہوتے تھے۔ اسی قسم کا واقعہ سلمٰی بنت عمرو کا ہے جو مدینے کے قبیلہ خزرج کی ایک شاخ بنونجار سے تعلق رکھتی

Marfat.com

تھیں۔ یہ ایک شریف اور مالدار خاتون تھیں اور اپنے اہل قبیلہ کے ذریعے تجارت کرتی تھیں۔ ایک دن شام سے واپس آتے ہوئے ہاشم بن عبد مناف کا گزر مدینے میں ہوا، انہوں نے جو سلمٰی کا اپنی قوم میں یہ اثر و امتیاز دیکھا تو ان سے متاثر ہو گئے۔ پیام دیا، جسے سلمٰی نے قبول کر لیا، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنی مرضی کی مختار ہوں گی۔ ان کے بطن سے شیبہ پیدا ہوئے اور ان کے چچا مطلب انہیں اپنے ساتھ اونٹ پر بٹھا کر مکہ لے آئے۔ قریش نے جب انہیں دیکھا تو سمجھے مطلب غلام خرید کر لائے ہیں اور بولے: ''عبدالمطلب۔'' اس دن سے ان کا نام ہی عبدالمطلب پڑ گیا اور کسی نے انہیں شیبہ کے نام سے نہ پکارا۔

بعض مؤرخین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہی نکاح اصل میں ''متعہ'' تھا جو اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں تو جائز رکھا گیا، لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے حرام قرار دے دیا۔ پھر بھی شیعوں میں اس کا رواج آج تک پایا جاتا ہے۔ ہنگامی نکاح کی صورت دوسری تھی، اس میں عورت کو اختیار تھا کہ جب چاہے، اس رشتے کو توڑ دے، اور اس کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ وہ اپنے خیمے کے دروازے کا رخ بدل دے۔ اس سے اس کا شوہر سمجھ جاتا تھا کہ اب وہ اس کی بیوی نہیں رہی۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ جب وہ یمن میں تھا تو زبید کے گھرانوں میں اس قسم کے نکاح کا رواج پایا جاتا تھا۔ اسی طرح مؤرخین یمن کا بیان ہے کہ کسی زمانے میں ''خاندانی ملکیت'' کا بھی رواج تھا اور عورت بھی اس ملکیت کا ایک جزو سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ وہ خاندان کے تمام افراد کی بیوی یا دوست ہوتی تھی۔ خاندان کا جب کوئی مرد اس کی خواب گاہ میں مطلب برآری کے لیے جاتا تھا تو اپنا عصا دروازے کے پاس رکھ دیتا تھا اور پھر کوئی دوسرا شخص اندر نہ جاتا تھا، لیکن اس کی رات ہمیشہ رئیس خاندان ہی کے لیے وقف ہوتی تھی۔ اس کے باوجود اس عورت کا کسی اجنبی کے ساتھ ہم بستر ہونا ایک ایسا جرم تھا جس کی سزا موت تھی۔ اس سلسلے میں ایک روایت بیان کی گئی ہے کہ کسی سردار کی لڑکی ایک خاندان کی ''مشترکہ ملکیت'' تھی، لیکن وہ ایک ایسے نوجوان سے محبت کرتی تھی جس کا تعلق اس خاندان سے نہ تھا، جب وہ نوجوان اس کے پاس آتا، وہ دروازے پر ایک عصا رکھ دیتی تا کہ کسی پر اس کا پردہ فاش نہ ہو جائے۔ ایک دن اتفاق سے خاندان کے تمام افراد جمع تھے۔ انہوں نے جو دروازے پر عصا رکھا تو عورت کی بدچلنی کا راز ان پر کھل گیا اور وہ کیفر کردار کو پہنچا دی گئی۔

Marfat.com

نکاح کی یہ قسم عجیب معلوم ہوتی ہے، لیکن اس سے بھی عجیب تر وہ نکاح ہے جو نطفہ لینے کے لیے کیا جاتا تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ شوہر اپنی بیوی کو کسی دوسرے مرد کے پاس بھیج دیتا تھا اور وہ جب حاملہ ہو جاتی تھی تو اسے اپنے گھر لا کر حمل کو اپنی طرف منسوب کر لیتا تھا۔ اس فعل قبیح کے دامن میں پناہ غالباً اسی وقت لی جاتی تھی جب مرد عقیم مگر اولاد کا خواہش مند ہوتا تھا۔ لیکن ''گود لینے'' کی رسم کے ہوتے ہوئے اس قسم کی غیرت سوز حرکت کی ضرورت کیا باقی رہ جاتی تھی؟ کیونکہ عربوں کا دستور تھا کہ وہ لڑکیوں کو نہیں، لڑکوں کو متبنٰی کرتے تھے اور ''لے پالک'' کو نسب اور قبیلے کے معاملے میں صلبی اولاد کا مقام دیتے تھے، تا آنکہ کبھی کبھی تو اپنے حقیقی بیٹوں کے ساتھ اسے میراث تک میں شریک کر لیتے تھے۔ بہرکیف چاہے ہم اس ازدواج کو تسلیم نہ کریں اور چاہے اسلام اس کے ساتھ ساتھ متبنٰی کرنے کو بھی ناجائز قرار دیتا ہو، لیکن مؤرخین کہتے ہیں کہ ایام جاہلیت میں یہ بھی عربوں کی ایک رسم تھی۔ ہم نے ازدواج کی ان مختلف صورتوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ان سے عربوں کے نزدیک عورت کی بے حیثیتی کا اظہار ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ اس کی حیثیت غلام سے بھی گئی گزری تھی۔ اس کے ثبوت کے لیے صرف اتنا ہی بتا دینا کافی ہوگا کہ گھر کے مالک کا وارث...... چاہے وہ باپ ہو یا بھائی یا بیٹا...... یہ حق رکھتا تھا کہ بیوہ کے پاس جائے اور اس کے سر پر چادر ڈال کر اس کا مہر ادا کر دے، اس کے بعد وہ اس کی بیوی ہو جاتی تھی۔ اس طرح اگر وہ چاہے تو مہر وصول کر کے کسی دوسرے سے اس کی شادی بھی کر سکتا تھا۔ عورت کے لیے اس انجام سے بچنے کی بس ایک ہی راہ تھی اور وہ یہ کہ اس سے پہلے ہی وہ اپنے میکے چلی جائے۔ اس صورت میں شادی کا اختیار اسے یا اس کے ولی کو حاصل ہو جاتا تھا۔

متعہ...... ہنگامی نکاح...... کے سوا، رشتہ ازدواج قطع کرنے میں عورت کی رائے کو کوئی دخل نہ تھا، نکاح کی باقی جتنی بھی صورتیں تھیں، ان میں علیحدگی دو ہی طریقوں سے ہو سکتی تھی: خلع یا طلاق خلع کی تکمیل شوہر اور بیوی کے ولی کی باہمی رضامندی کے بعد ہوتی تھی، لیکن طلاق کے لیے ضروری تھا کہ شوہر تین بار پختہ ارادے سے کہے کہ میں نے طلاق دی۔ عورت...... چاہے وہ بیوی ہو یا بیٹی، بہن ہو یا رشتہ دار...... ورثے سے محروم رہتی تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب کہتے تھے، ''ورثہ کا مستحق وہ ہے جو نیزہ بازی کرے، اپنے وطن کو دشمن سے بچائے اور غنیمت حاصل کرے۔'' لیکن بیٹیوں کو برابر کا حصہ ملتا تھا۔ بڑے بھائی کو دوسرے بھائیوں پر صرف اتنا امتیاز

Marfat.com

حاصل ہوتا تھا کہ جسے کے انتخاب کا پہلا حق اسے دیا جاتا تھا۔ مرد کو اپنی بیوی پر جو اقتدار حاصل تھا، وہ تو آپ دیکھ ہی چکے۔ بیٹوں پر بھی اس کے بڑے اختیارات تھے اور بیٹیاں تو بیٹوں سے بھی زیادہ مجبور و محکوم تھیں، چنانچہ بعض قبائل میں باپ ذلت یا محتاجی کے خوف سے اپنی بیٹی کو زندہ دفن کر دیتا تھا تو کوئی اس سے پوچھنے والا نہ تھا۔ شادی کے معاملے میں لڑکی اور اس کی ماں دونوں عضو معطل تھیں۔ سارا اختیار باپ کے ہاتھ میں تھا اور اسی لیے جب لڑکی اپنے شوہر کے گھر چلی جاتی تھی تو اس کی حفاظت باپ ہی کے ذمے ہوتی تھی، چاہے لڑکی اپنے قبیلے میں بیاہی گئی ہو، یا کسی غیر قبیلے میں۔ جب اس کا شوہر اس کے ساتھ زیادتی کرتا یا اسے طلاق دے دیتا تو وہ اپنے میکے میں چلی آتی اور اپنے باپ کی حمایت وسرپرستی میں زندگی بسر کرتی تھی۔

البتہ لڑکے کو اختیار تھا کہ جہاں چاہے پیام دے۔ پیام دینے کے بعد وہ اپنے باپ کو رضامند کرنے کی کوشش کرتا تھا اور جب اس کی شادی ہو جاتی تھی اور وہ اپنی بیوی کو ایک الگ مکان میں رکھ کر اس کی کفالت خود کرنے لگتا تھا تو باپ کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی تھی، لیکن اگر وہ اپنی بیوی کے ساتھ گھر میں رہتا تھا تو پھر باپ کو اس پر پورا اختیار واقتدار حاصل ہوتا تھا۔ یہ ہے بدوی زندگی کے خاندانی اور گھریلو نظام کا مختصر سا خاکہ، جس میں بہ حیثیت مجموعی عرب کی شہری زندگی کے خاندانی اور گھریلو نظام کی تصویر بھی شامل ہے۔ اس لیے شہروں کے رہنے والے بھی بدویوں کی طرح قبیلوں ہی میں منقسم تھے اور ان میں سے اکثر بدوی الاصل تھے، جن کے دلوں میں شہری زندگی کا شوق پیدا ہوا اور وہ شہروں میں آکر رہ بس گئے۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد شاید آپ آج بھی ان بدویوں میں، جنہیں ہنوز تہذیب وتمدن کی ہوا نہیں لگی، اس نظام کے بچے کھچے آثار کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، اگر چہ اسلام نے بہت کچھ مٹا دیا تھا آپ کو یہ آثار مصر اور مصر کے علاوہ دوسرے عربی بولنے والے ملکوں کے ان شہریوں کی زندگی میں بھی نظر آئیں گے، جو اپنے آپ کو عربوں سے منسوب کرتے ہیں، چنانچہ ان میں سے اکثر اپنی بیٹیوں کو ترکے سے محروم رکھتے ہیں اور انہیں ایسی نظر سے دیکھتے ہیں جس کے زیر اثر مرد کو ان پر قریب قریب وہی غیر معمولی اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں، جو اسلام سے پہلے کی بدوی زندگی میں ہم دیکھ آئے ہیں اور بہت سے لوگ ایسے ہیں جو شادی کے معاملے میں لڑکی اور اس کی ماں کی رائے کو بالکل وزن نہیں دیتے۔ اگر لڑکی کا شوہر مر جائے، یا اسے طلاق دے دے، یا اس کے ساتھ بدسلوکی کرے تو لڑکی

Marfat.com

آج بھی اپنے باپ کے گھر پناہ لیتی ہے اور اپنے باپ کے ساتھ رہنے والے نکھٹو بیٹوں پر باپ کا آج بھی غیر معمولی اقتدار ہے۔

عرب کے بدویوں اور شہریوں کا خاندانی اور گھریلو نظام آپس میں ملتا جلتا تھا، لیکن زندگی کے سروسامان اور اس چیز میں، جسے آج ہم ''اقتصادی نظام'' سے موسوم کرتے ہیں، وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ اہل شہر اپنی زندگی، تجارت اور اپنے ان باغوں، تاکستانوں اور کھیتوں کی پیداوار کے سہارے بسر کرتے تھے، جن میں بونے جوتنے اور دیکھ بھال کا کام وہ کرائے کے آدمیوں سے لیتے تھے اور اپنی اس تجارت وزراعت سے انہیں بہت زیادہ آمدنی ہوتی تھی۔ ان میں سے اکثر اپنا روپیہ سود پر چلاتے تھے اور جو لوگ کاروبار وغیرہ کرنا چاہتے تھے، انہیں بھاری منافع پر قرض دے کر اپنی رقم تھوڑی سی مدت میں دوگنی کر لیتے تھے۔ یہ سب لوگ زندگی کی ان راحتوں اور آسائشوں میں کھیلتے تھے، جن سے اہل بادیہ واقف بھی نہ تھے شراب، موسیقی اور جوا ان کے لیے دن رات کا مشغلہ تھا اور خواہشوں کی شکم سیری نے زندگی کو ان کی نظر میں محبوب اور اطمینان افزا بنا دیا تھا۔ لیکن علامہ ابن خلدون مبالغے سے کام لیتے ہیں جب ان کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ ''بہت سی برائیوں اور بداخلاقیوں نے ان کی روح کو داغدار بنا دیا تھا۔ جس قدر چالاکی وعیاری ان میں راہ پا گئی تھی، جتنی راحت پسندی، دنیا طلبی، زر پرستی، دروغ بیانی اور شہوت رانی ان پر غالب آ گئی تھی اتنی ہی نیکی کی راہیں ان سے دور ہو گئی تھیں۔ یہاں تک کہ ان کی زندگی سے غیرت بالکل جاتی رہی تھی۔ چنانچہ ان میں سے اکثر اپنی محفلوں اور اپنے بزرگوں اور رشتہ داروں کے سامنے بلا تکلف گالیاں بکتے تھے اور ان کے قول وفعل میں بدکاری وبے حیائی اتنی بڑھ چکی تھی کہ شرم وغیرت کا احساس ان میں نام کو باقی نہیں رہا تھا۔''

مختصر یہ کہ وہ بے ایمانی، فریب اور بے وفائی کی پوٹ تھے۔ حالانکہ بلاشبہ ان میں کچھ خوبیاں بھی تھیں اور اگر وہ خوبیاں نہ ہوتیں تو ان کی تجارت ہرگز بارآور نہ ہوتی اور وہ اپنے سنگدل ماحول سے کبھی ٹکر نہ لے سکتے، لیکن وہ حیلہ کار تاجر تھے اور اسی حیلہ کاری نے وہ بعض کمزوریاں ان میں پیدا کر دی تھیں، جن کا ذکر علامہ ابن خلدون نے کیا ہے۔ تجارت اور سود سے جو بے شمار نفع انہیں ہوتا تھا اس کی وجہ سے وہ لذتوں میں ڈوب گئے تھے اور بلند اخلاقی کی بہت سی خوبیاں ان کی کتاب زیست سے محو ہو گئی تھیں۔

Marfat.com

لیکن خانہ بدوشی کی زندگی چراگاہوں کی تلاش اور اونٹ کے گوشت اور دودھ سے ترکیب پاتی تھی۔ ایک بدوی کی ملکیت نمدے کا ایک خیمہ ہوتا تھا، جس میں وہ اپنی زندگی گزارتا تھا یا وہ غلہ اور پھل جو اپنے گردوپیش کی زمین میں بوتا تھا کیونکہ قاعدہ یہ تھا کہ کھیت اس کا ہے جو اسے بوئے لیکن یہ ملکیت برائے نام ہوتی تھی اس لیے کہ بدوی زراعت کو پسند نہ کرتے تھے اور کھیتی باڑی کو اپنے مرتبے سے کم تر چیز سمجھتے تھے۔ لیکن قبیلے کی آبادی کے اردگرد جو چراگاہ ہوتی تھی وہ قبیلے کی مشترک ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ یہی حال اس گھاس کا تھا جو ریگستان کی آبادی کی ان محفوظ چراگاہوں میں پیدا ہوتی تھی اور ہمسایہ قبائل کو یہ حق حاصل تھا کہ باہمی مفاد کے پیش نظر ایک قبیلہ اپنی زمین کا تبادلہ دوسرے قبیلے کی زمین سے کرلے۔ قبائلی بستیوں کی حد بندی آپس کے اتفاق اور رواجی یکسانی سے ہوتی تھی اور جب کوئی قبیلہ چراگاہ کی تلاش میں نکلتا تھا تو کسی دوسرے قبیلے کے لیے جائز نہ تھا کہ اس کی جگہ آباد ہو جائے، اس کے رشتہ داروں اور ساتھیوں سے خون خرابہ کرے۔ چنانچہ ہم آج بھی جغرافیے کے نقشوں میں ان قبائل کی بستیاں پہچان سکتے ہیں، لیکن اس قسم کی دراز دستیاں عام تھیں اور ان کے نتیجے میں قبائل کی باہمی پیکار کوئی انوکھی بات نہ تھی بلکہ جاہلی زندگی کا جانا پہچانا وطیرہ تھا، اس لیے ایک بدوی پیدائشی طور پر شمشیر آزما اور قبائل کی زندگی اکثر اوقات مار دھاڑ اور چھینا جھپٹی کی زندگی ہوتی تھی۔ چھاپے مارنا، لوٹ مار کرنا، اور اپنے مورچوں میں بھاگ آنا، اہل بادیہ کا عام دستور تھا۔ جب کوئی قبیلہ لڑائی سے واپس آتا، چوکنا ہو کر اپنے مورچوں میں بیٹھ جاتا کہ جس طرح اس نے دوسرے قبیلے پر حملہ کر کے اس کا مال اسباب چھینا ہے، اسی طرح وہ قبیلہ بھی اس پر حملہ کر کے اس کا مال اسباب چھیننے کی کوشش کرے گا۔

علامہ ابن خلدون اہل بادیہ کے متعلق لکھتے ہیں: ''لوٹ مار اور خوش وقتی ان کی زندگی تھی۔ جہاں انہیں اپنے آپ کو خطرے میں ڈالے بغیر موقع ملتا، لوٹ مار مچاتے اور اپنی بے آب وگیاہ پناہ گاہوں کی طرف بھاگ جاتے تھے۔ ان کا سردار اس عصبیت پر غالب آنے کے لیے، جو سرمایہ مدافعت تھی، چونکہ ان کا محتاج تھا اس لیے اسے مجبوراً ان کی جبلت وخصلت کی رعایت رکھنی اور ان کی باہمی چپقلشوں کو نظر انداز کرنا پڑتا تھا مبادا عصبیت، کمزوری کا شکار ہو کر اسے اور اس کی قوم کو ہلاک کر دے۔'' حملہ وانتقام کے خوف کا یہ فطری اثر تھا کہ وہ قبیلے کی یک جہتی کی مزید تقویت کے لیے اس قبیلے کے افراد کو ماضی کی یادوں اور اپنے اسلاف کے جرأت آموز اور

Marfat.com

شجاعت انگیز کارناموں کے طلسم زار میں پہنچا دیتا اور یہی راز تھا عربوں کی اپنے نسب سے غیر معمولی دلچسپی کا کہ اس کے ذریعے وہ دوسروں پر اپنی بڑائی جتائیں، اپنی یک جہتی کو قوت دیں اور اپنے اسلاف کی بلندیوں تک پہنچیں جو شجاعت اور سخاوت پناہ گیر کی حمایت اور اسی قسم کی ان دوسری خوبیوں کے لیے مشہور تھے، جن کا بیج بدوی زندگی نے ان کی فطرت میں بویا تھا اور جو ان کی سیرت و کردار کا ایک مستقل جزو تھیں اور اخلاف کا یہ فرض تھا کہ ان خوبیوں میں اپنے اسلاف کی تقلید کریں کہ صرف انہیں خوبیوں کے سہارے وہ بدوی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ ایک بدوی ہمیشہ دوسروں کے حملے کی زد میں رہتا تھا اور بدویانہ زندگی عسرت و تنگ دستی کی زندگی تھی جو کبھی کبھی فاقہ کشی تک پہنچ جاتی تھی، اس لیے اگر اہل بادیہ شریف و سخی نہ ہوتے، مہمانوں کی آؤ بھگت اور پڑوسیوں کی حمایت نہ کر سکتے تو ان میں سے اکثر ہلاک ہو جاتے پھر صحرا کی زندگی فطرت پر غالب آنے اور حملہ آوروں کو منہ توڑ جواب دینے کی زندگی تھی، اس لیے اگر اہل صحرا بہادر، چالاک اور توانا نہ ہوتے تو زندگی کا بوجھ انہیں کچل کے رکھ دیتا اور اگر ان میں پروپیگنڈے کی وہ صلاحیت نہ ہوتی جو دوسروں کو ان سے خوف زدہ کر دیتی تو انہیں شر و فساد میں مبتلا ہو جانا پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم و نثر کا بیشتر حصہ فخر، بہادری اور سخاوت و بزرگی کے ذکر پر مشتمل ہے اور اس میں ان مختلف فضیلتوں کا بیان پایا جاتا ہے، جو خانہ بدوشی کی زندگی کا لازمہ تھیں اور جو اہل صحرا کو اپنے اعادہ و تکرار پر مجبور کرتی تھیں۔

عرب صرف انہیں لوگوں کے خلاف نہیں بھڑکتے تھے جو ان کی بستیوں پر حملہ آور ہوں بلکہ جان مال، عزت، ناموس غرض یہ کہ ہر قدر کو ٹھیس لگنے پر بھڑک اُٹھنا گویا ان کا عام دستور تھا۔ قبیلہ اپنے ہر فرد کا انتقام لینا فرض سمجھتا تھا۔ چنانچہ ان کا کوئی آدمی مارا جاتا اور مقتول کے وارثوں کا نعرہ ''اے عرب کے جانبازو!'' فضا میں گونجتا تو ہر شخص اپنے اپنے ہتھیار سنبھال لیتا تھا۔ قاتل کسی دوسرے قبیلے کا ہوتا تو معاملہ خاص طور پر نازک صورت اختیار کر لیتا تھا۔ چنانچہ اگر قاتل کا گھر وہیں کہیں ہوتا تو اسے آگ لگا دی جاتی، اس کے اونٹ اور مویشی قتل کر دیئے جاتے اور پورے تین دن تک ہر ناجائز بات جائز قرار دے دی جاتی اور اس صورت میں قاتل کے قبیلے کی کوئی بات نہ سنی جاتی لیکن قاتل قتل کرنے کے بعد اکثر کسی ایسے شخص کی پناہ میں چلا جاتا تھا جو اس کی حفاظت کر سکے اور جب وہ پناہ طلب کرتا اور اسے پناہ دے دی جاتی تو خوں بہا اس پر فرض

ہو جاتا، خوں بہا کا طریقہ یہ تھا کہ انتقام لینے والے قاتل سے لڑکیاں، اونٹ اور مال طلب کرتے۔ پہلے قاتل کے رشتہ داروں کے سامنے مطالبات پیش کیے جاتے، پھر آپس میں بات چیت ہوتی رہتی، جس کے نتیجے میں مقتول کا وارث اپنے بہت سے مطالبوں سے دست بردار ہو جاتا، لیکن خوں بہا کے طور پر قاتل کے گھرانے کی دو نوجوان لڑکیاں بہر قیمت وصول کرتا اور انہیں آپنے لیے رکھتا، جسے چاہتا بخش دیتا۔

لیکن جو لڑائیاں عزت اور ناموس کے انتقام میں شروع ہوتیں، ان کی آگ مسلسل کئی برس تک سلگتی رہتی اگر کوئی قبیلہ بطور خود انتقام لینے کے قابل نہ ہوتا تو وہ اپنے حقوق کے اتلاف اور اپنی شرافت کی توہین کا مسئلہ رشتہ مند گھرانوں کے سامنے رکھتا اور اپنے حلیف یا ہمسایہ قبائل سے درخواست کرتا کہ وہ اس کا ساتھ دیں۔ اس قسم کے معاہدے عرب میں عام تھے۔ شاید آپ کو ''حلف الفضول'' کا واقعہ یاد ہو، جس میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی بعثت سے پہلے شرکت فرمائی تھی اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مکہ کے قبائل مظلوم کا ساتھ دیں گے اور اس وقت تک خاموش نہ بیٹھیں گے جب تک اس کا حق اسے نہ مل جائے۔ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد مدینہ کا غزوۂ احزاب بھی مدینے کے یہودیوں اور مکہ اور عرب کے دوسرے قبیلوں کے درمیان معاہدے ہی کی بنا پر وجود میں آیا تھا۔ جاہلیت میں ایسے معاہدے بکثرت ہوتے تھے اور تاریخ وادب کی کتابوں میں ان کے بے شمار واقعات درج ہیں۔ کینہ وانتقام اور جنگ و پیکار کی زندگی انسان کو فال اور شگون کی طرف لے جاتی ہے۔ ظفرمند کو جب توقع کے خلاف فتح نصیب ہوتی ہے تو وہ اسے نیک فالی پر محمول کرتا ہے اور مغلوب جب امید کے خلاف شکست کھاتا ہے تو اسے بدفالی سمجھتا ہے۔

عرب دوسری قوموں سے زیادہ فال اور شگون کے اسیر تھے۔ وہ صرف جنگ وجدال ہی کے مسئلے میں نہیں، زندگی کے تمام معاملات میں شگون اور فال کے بغیر لقمہ نہ توڑتے تھے اور یہ جو عربوں میں جانوروں کے نام پر بچوں کے نام رکھنے کا دستور تھا، بعض مؤرخین اسے بھی اسی فال اور شگون سے منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب کسی کے ہاں بچے پیدا ہو کر مر جاتے تھے اور اس کے بعد کوئی لڑکا پیدا ہوتا تھا تو اس کا نام جانوروں کے نام پر رکھتے تھے۔ جیسے، ثعلب، ثور کلب، ذئب، فہد اور اسد وغیرہ۔

ان مؤرخین کا کہنا ہے کہ اکثر قبائل حیوانوں کے نام سے اس لیے منسوب ہیں کہ ان میں

Marfat.com

سے ہر قبیلے کے جد اعلیٰ نے موت سے بچنے کے لیے اپنے قبیلے کا نام جانور کے نام پر رکھ دیا تھا۔
اگر یہ توجیہ درست ہے تو اس کا اطلاق غیر عرب پر بھی ہوتا تھا۔ کیونکہ جانوروں کے نام پر نام رکھنا ایک ایسی رسم ہے جو تمام قوموں میں پائی جاتی ہے اور خاندانوں کی لومڑی یا بھیڑیے یا ان کے علاوہ دوسرے جانوروں کی طرف نسبت، انگریزوں، فرانسیسیوں اور جرمنوں وغیرہ میں بھی دیکھنے میں آتی ہے، اس لحاظ سے عربوں کی طرح ان قوموں میں بھی اس کا سبب فال اور شگون ہی ہوگا۔
بتوں کی پوجا اور ان کے پہلو میں تیروں کے ذریعے قرعہ اندازی نے عربوں کے شگون اور فال کی لے اور بڑھا دی تھی، جب کوئی کسی کام کا ارادہ کرتا تو استخارے کے تیر لے کر آ جاتا۔ یہ تیر لکڑی یا پتھر کے بنے ہوتے تھے ان میں سے ایک پر ''ہاں'' لکھا ہوتا تھا دوسرے پر ''نہیں'' اور تیسرا ''سادہ'' ہوتا تھا۔ ان تیروں کو ہبل جیسے بت کے زیر سایہ آپس میں گڈ مڈ کر دیا جاتا تھا اور پھر ایک تیر نکال لیا جاتا تھا۔ اگر اس پر ''ہاں'' لکھا ہوتا تھا تو ارادے کے مطابق کام کیا جاتا تھا اور اگر ''نہیں'' والا تیر نکلتا تھا تو ارادہ ترک کر دیا جاتا تھا۔ ''سادہ'' تیر نکلنے کی صورت میں تیروں کو ہلا کر ازسرنو قرعہ اندازی کی جاتی تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جس بت کو وہ پوجتے اور اس کے زیر سایہ قرعہ اندازی کرتے ہیں تیر اس کی مرضی سے نکلتے ہیں۔ چنانچہ وہ دیوتاؤں کا اشارہ اور ان کا حکم سمجھ کر ہی اس کی تعمیل کرتے تھے۔ ہر قبیلے بلکہ ہر گھر کا ایک الگ بت تھا، جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔ جب کوئی سفر کو جاتا، گھر سے رخصت ہوتے وقت برکت طلب کرتا اور سفر سے واپس آتا تو گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کی خدمت میں برکت طلبی کے لیے حاضر ہوتا۔
ابن الکلبی نے ''کتاب الاصنام'' میں لکھا ہے کہ ''پتھروں اور مورتیوں کی پرستش کا سبب یہ ہے کہ جب کوئی مکہ والا سفر پر جاتا تو حرم کی تعظیم اور مکہ کی محبت کے زیر اثر کعبے کا ایک پتھر اپنے ساتھ لے جاتا اور جہاں کہیں قیام کی نوبت آتی، اس پتھر کو رکھ کر کعبے کی طرح اس کا طواف کرتا...... اس چیز نے رفتہ رفتہ پرستش کی صورت اختیار کر لی اور وہ بتوں کو پوجنے لگے۔'' اسی طرح قبائل نے بھی اپنے اپنے بت بنا لیے۔ چنانچہ ینبع میں ہذیل بن مدرکہ کا بت ''سواع'' تھا اور دومۃ الجندل میں بنوکلب کا بت ''ود'' یمن کے قبیلہ ہمدان میں اور اس کے ساتھیوں کا بت ''یعوق'' تھا۔ یہ بت صنعاء کے ایک گاؤں خیوان میں تھا۔ جو مکے سے دو دن اونٹ کی مسافت پر واقع تھا۔ بنوحمیر بلخع نامی مقام پر ''نسر'' کی پوجا کرتے تھے اور مذحج اور اہل جرش ''یغوث'' کی انہیں بتوں کے متعلق اللہ

Marfat.com

تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

(وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا)

(نوح 23،27)

ترجمہ: ''اور جنہوں نے اپنے (اپنے تابعین سے) کہا کہ تم اپنے معبودوں کو ہر گز نہ چھوڑنا اور نہ (بالخصوص) ود کو اور نہ سواع کو اور نہ یغوث، یعوق اور نسر کو چھوڑنا اور ان لوگوں نے بہتوں کو گمراہ کر دیا اور اب تو ان ظالموں کی گمراہی اور بڑھا دے۔''

''منات'' عرب کا سب سے پرانا بت تھا، جو مکہ اور مدینہ کے درمیان قدید میں نصب تھا۔ تمام عرب اس کی تعظیم اور اس کے گرد قربانیاں کرتے تھے۔ ''لات'' طائف والوں کا بت تھا۔ یہ ایک چوکور پتھر تھا جس پر ثقفی دربانوں نے ایک عمارت بنا کر اس کی عظمت میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ ''عزیٰ'' وادی نخلہ کے ایک گھر میں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عربوں کو اس میں سے ایک آواز نکلتی سنائی دیتی تھی، یہ قریش کے نزدیک سب سے بڑا بت تھا۔ وہ اس کی زیارت کو آتے، چڑھاوے چڑھاتے اور قربانیوں کے ذریعے اس کا تقرب حاصل کرتے۔ قریش ان تینوں بتوں کے متعلق کہتے تھے کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور اللہ سے اس کے بندوں کی سفارش کرتی ہیں قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے:

(اَفَرَاَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ) (النجم:15،23)

ترجمہ: ''بھلا تم نے لات اور عزیٰ اور تیسرے منات کے حال میں غور کیا ہے؟ کیا تمہارے لیے تو بیٹے (تجویز) ہوں اور اللہ کے لیے بیٹیاں۔ اس حالت میں تو یہ بہت بے ڈھنگی تقسیم ہوئی۔ یہ (معبودان مذکورہ) نرے نام ہی نام ہیں جنہیں تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے ٹھہرا لیا ہے، اللہ نے تو ان (کے معبود ہونے) کی کوئی دلیل بھیجی نہیں۔''

قریش کے بت خاص خانہ کعبہ میں بھی تھے۔ جن میں سب سے بڑا ہبل تھا۔ یہ انسانی

صورت میں عقیق سرخ سے تراشا گیا تھا۔اس کا دایاں ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا اس لیے قریش نے یہ ہاتھ سونے کا بنوا دیا تھا۔ صفا اور مروہ کے قریب اساف اور نائلہ نامی دو بت تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی مورتیاں تھیں جن میں سے اکثر کا ذکر ابن الکلبی نے کتاب الاصنام میں کیا ہے۔ تاج العروس، مروج الذہب اور ان کے علاوہ مؤرخین کی دوسری کتابوں میں ان تمام بتوں کی تفصیل درج ہے۔ عرب بتوں کو پوجتے وقت اللہ کے وجود سے انکار نہ کرتے تھے بلکہ انہیں اللہ کے ساتھ شریک کرتے اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ حج کعبہ کے وقت لبیک کہتے ہوئے اللہ کا نام لیتے اور ان بتوں کا اس کے شریک کی حیثیت سے ذکر کرتے تھے۔ چنانچہ بعض قبائل کہتے تھے: ''حاضر ہوں! یا اللہ! میں حاضر ہوں! تیرا کوئی شریک نہیں۔ سوائے اس کے جو تیرا شریک ہے، تو اس کا اور دوسری چیزوں کا مالک ہے۔'' قریش کعبے کا طواف کرتے اور کہتے: ''قسم ہے لات وعزیٰ اور تیسرے منات کی۔ یہ اعلیٰ غرانیق ہیں اور ان کی شفاعت پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔'' اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ) (یوسف:106)

ترجمہ: ''اور اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔''

یہ ہے اسلام سے پہلے عربوں کی اجتماعی زندگی کے عقائد وعادات کی اجمالی تصویر جسے دیکھ کر آپ بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام نے ان میں سے کن کن چیزوں کو نیست ونابود کیا۔ فطری طور پر شرک ہی تھا جس کا اثر سب سے پہلے عربی ذہن سے محو ہوا۔ عربوں نے شرک کے متعلق وہ آیات سنیں جنہوں نے قبول اسلام کے بعد انہیں شرک کا سب سے بڑا دشمن بنا دیا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد سنا:

(وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ (ابراہیم:3)

ترجمہ: ''اور ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ساجھی قرار دیے تاکہ دوسروں کو بھی اس کے دین سے گمراہ کریں کہہ دے اور مزے کرلو۔ انجام کار دوزخ ہی تمہارا ٹھکانا ہے۔''

اور یہ ارشاد ہوا:

Marfat.com

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ) (الحج:73)

ترجمہ:اے لوگو!'' ایک عجیب بات بیان کی جاتی ہے۔اسے کان لگا کر سنو(وہ یہ ہے کہ)اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن کی تم لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ ایک (ادنیٰ) مکھی کو تو پیدا کر ہی نہیں سکتے۔گو سب کے سب بھی (کیوں نہ) جمع ہو جائیں اور(پیدا کرنا تو بڑی بات ہے وہ ایسے عاجز ہیں کہ) اگر مکھی ان سے کچھ چھین لے جائے تو اسے چھڑا ہی نہیں سکتے۔ایسا عابد بھی لچر اور ایسا معبود بھی لچر۔''

اور یہ ارشاد:

(وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَاۤ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا وَتَرَاهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ)

(الاعراف:197،198)

ترجمہ:''اور تم جن لوگوں کی خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتے اور نہ وہ اپنی مدد کر سکتے ہیں اور اگر تو انہیں کوئی بات بتانے کو پکارے تو اسے نہ سنیں گے اور تو انہیں دیکھتا ہے گویا وہ تجھے دیکھ رہے ہیں اور کچھ بھی نہیں دیکھتے۔''

اور یہ ارشاد:

(اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْۤ اَوْلِيَآءَ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا) (الکھف:102)

ترجمہ:''سو کیا پھر بھی ان کافروں کا خیال ہے کہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا کارساز قرار دیں۔ہم نے تو کافروں کی دعوت کے لیے دوزخ کو تیار کر رکھا ہے۔''

اور یہ ارشاد:

(قُلْ اَرَاَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِى السَّمٰوٰتِ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَةٍ

Marfat.com

مِّنۡهُ بَلۡ اِنۡ يَّعِدُ الظّٰلِمُوۡنَ بَعۡضُهُمۡ بَعۡضًا اِلَّا غُرُوۡرًا) (فاطر:70)

ترجمہ: ''کہہ، تم اپنے قرارداد شریکوں کا حال تو بتاؤ جنہیں تم خدا کے سوا پوجتے ہو ،یعنی مجھے یہ بتاؤ کہ انہوں نے زمین کا کونسا جزو بنایا ہے۔ یا ان کا آسمان (بنانے) میں کچھ ساجھا ہے۔ یا ہم نے انہیں کوئی کتاب دی ہے کہ یہ اس کی دلیل پر قائم ہوں۔ بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے سے نرے دھوکے کی باتوں کا وعدہ کرتے آئے ہیں۔''

اور یہ ارشاد:

(مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ يَّسۡتَغۡفِرُوۡا لِلۡمُشۡرِكِيۡنَ وَلَوۡ كَانُوۡۤا اُولِىۡ قُرۡبٰى مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُمۡ اَصۡحٰبُ الۡجَحِيۡمِ) (التوبہ:113)

ترجمہ: ''پیغمبر کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دُعا مانگیں، اگرچہ وہ رشتے دار ہی (کیوں نہ) ہوں۔ اس امر کے ظاہر ہو جانے کے بعد کہ یہ لوگ دوزخی ہیں۔''

اور یہ ارشاد:

(فَاِذَا انۡسَلَخَ الۡاَشۡهُرُ الۡحُرُمُ فَاقۡتُلُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَيۡثُ وَجَدْتُّمُوۡهُمۡ وَخُذُوۡهُمۡ وَاحۡصُرُوۡهُمۡ وَاقۡعُدُوۡا لَهُمۡ كُلَّ مَرۡصَدٍ فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوۡا سَبِيۡلَهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ) (التوبہ:5)

ترجمہ: ''سو جب محترم مہینے گزر جائیں تو (اس وقت) ان مشرکین کو جہاں چاہو ،مارو، پکڑو، باندھو اور داؤ گھات کے موقعوں پر ان کی تاک میں بیٹھو، پھر اگر (کفر سے) توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ واقعی اللہ بڑی مغفرت کرنے والا بڑی رحمت کرنے والا ہے۔''

عربوں نے یہ اور اسی قسم کی دسیوں اور آیتیں سنیں اور شرک کا سارا اثر ان کے ذہن سے مٹ گیا، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت جن لوگوں نے راہ ارتداد اختیار کی یا نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا، انہوں نے بھی کسی کو اللہ کا شریک نہیں ٹھہرایا بلکہ ہر جھوٹے نبی نے یہی اعلان کیا کہ محمد (ﷺ) اپنی قوم کے نبی ہیں اور وہ اپنی قوم کا نبی ہے اور جب ارتداد کا خاتمہ ہو گیا تو

Marfat.com

سارے عرب "لا الٰہ الا اللّٰہ " پر ایمان لے آئے۔ شرک کے اس خاتمے کا عربوں کے ذہن اور ان کی اجتماعی زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ اب مسلمانوں کا خدا کے سوا کوئی آقا نہ تھا، بلکہ ان کی تمام تر عقیدت صرف اللہ جل شانہ کے لیے مخصوص ہو گئی تھی۔ اب کوئی مسلمان تیروں کے ذریعے قرعہ اندازی نہ کرتا تھا۔ اب وہ استخارے کے لیے بتوں کے نہیں، خدا کے حضور جاتا تھا، اسی پر بھروسہ کرتا تھا اور اسی سے مدد چاہتا تھا۔ اب وہ خدا ہی کے دامن میں پناہ لیتا تھا اور خدا ہی اسے اپنا رستہ دکھاتا تھا۔ اس سے عربی عقل اور عربی ضمیر کے پاؤں میں بت پرستی کی جو بیڑیاں پڑی تھیں وہ کٹ گئیں اور یہ دونوں انسان کے لیے ترک واختیار کی کسوٹی بن کر اس کے اور خدا کے درمیان تنہا وسیلہ ہو گئے۔ چنانچہ نہ فال اور شگون کے لیے گنجائش رہی نہ پرندوں کی سعادت ونحوست کا انسانی ارادے پر کوئی اثر رہا اور نہ ستاروں میں افراد واقوام کی قسمت پڑھے جانے کی کوئی ضرورت باقی رہی۔ کیونکہ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کی سنت کے مطابق چل رہا ہے اور اللہ کی سنت کو آپ تبدیل ہوتے نہ پائیں گے۔

عربی عقل بت پرستی کی زنجیروں سے آزاد ہو کر اللہ پر ایمان لے آئی جو ہر چیز کا خالق ہے، اور اسے وہم کی غلامی اور ان رسوم کی بندگی سے نجات مل گئی جو اس پر جاہلیت نے فرض کر رکھی تھیں۔ اللہ کی طرف سے آیا ہوا پیغام اب اس کی نگاہوں کے سامنے تھا اور وہ اسے اپنانے کے لیے آمادہ تھی۔ عقل کی اس آزادی کا مذہبی زندگی کی طرح اجتماعی زندگی پر بھی بہت گہرا اثر پڑا۔ اجتماعی زندگی پر اس کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ عورت کے متعلق مرد کا نقطہ نظر بدل گیا، وحی آسمانی نے دونوں صنفوں کو ایک سطح پر لا کر روئے سخن مومن مردوں اور مومن عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کی طرف پھیر دیا۔ عورتوں کے ساتھ نرمی وعزت سے پیش آنے کا ذکر کیا اور ان کے فرائض کی طرح نیکی واحسان کے ساتھ ان کے حقوق بھی مقرر کیے۔ اللہ نے فرمایا:

(اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی) (آل عمران 195)

ترجمہ: "میں کسی شخص کے کام کو، جو تم میں سے کرنے والا ہے اکارت نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت "۔

اور فرمایا:

(وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ

يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْراً)(النساء:127)

ترجمہ:"اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو ،سو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔"

اور فرمایا:

(مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ)(نحل:97)

ترجمہ:"جو شخص کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو بشرطیکہ صاحب ایمان ہو تو ہم اس شخص کو (دنیا میں) بالطف زندگی دیں گے اور (آخرت میں) اس کے اچھے کاموں کے عوض، ان کا اجر دیں گے۔"

اور فرمایا:

(وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ) (فتح:6)

ترجمہ:"اور تا کہ اللہ تعالیٰ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے، جو اللہ کے ساتھ برے برے گمان رکھتے ہیں۔"

اور فرمایا:

(وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَاناً اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلاً كَرِيْماً وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْراً)(بنی اسرائیل:23،26)

ترجمہ:"اور تیرے رب نے حکم کر دیا ہے کہ بجز اس کے کسی کی عبادت مت کرو اور تم (اپنے) ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو۔ اگر تیرے پاس ان میں سے ایک یا دونوں کے دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں سو انہیں کبھی (ہاں سے) ہوں نہ کرنا اور نہ انہیں جھڑکنا اور ان سے بڑے ادب سے بات کرنا اور ان کے سامنے شفقت سے انکسار کے ساتھ جھکے رہنا اور یوں دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار! ان

Marfat.com

دونوں پر رحمت فرما! جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پرورش کیا ہے۔''

یہ اور اسی قسم کی بہت سی آیتیں گوش جاہلیت کے لیے ایک نیا نغمہ تھیں۔ عورت اور مرد اللہ کے سامنے ایک ہیں۔ عورت کو بھی وہی انعام ملتا ہے جو مرد کو ملتا ہے اور عورت بھی وہی سزا پاتی ہے جو مرد پاتا ہے۔ یہ ایک ایسی بات تھی جو نہ عربوں نے اپنوں سے سنی تھی نہ اس سے ملتی جلتی کوئی بات اپنے ایرانی اور رومی پڑوسیوں سے۔ اس کے باوجود وہ اس نئے دین کی تعلیم تھی جو نبی عربی علیہ التحیۃ والتسلیم پر نازل کیا گیا تھا اور جس کے سلسلے میں ہر مسلمان کے لیے ضروری قرار دیا گیا تھا کہ وہ اس پر ایمان لائے اور اس کی پیروی کرے۔ میاں اور بیوی، باپ اور بیٹے، بھائی اور بھائی کے تعلقات پر اس تعلیم کا اثر پڑا، بیوی اب چاکر اور غلام نہ رہی تھی، بلکہ اپنے شوہر کی شریک حیات ہوگئی تھی اور اسے بھی اپنے شوہر پر وہی حقوق حاصل ہو گئے تھے جو ایک شریک کے دوسرے شریک پر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً) (الروم:21)

ترجمہ: ''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیبیاں بنائیں تاکہ تمہیں ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی۔''

اب کسی مرد کے لیے یہ گنجائش باقی نہ رہی تھی کہ وہ اپنی لونڈی سے کراہت ونفرت کرے اور اس کے جسم کو اپنی دولت اندوزی کا ذریعہ بنائے۔ اس باب میں اللہ جل شانہ ارشاد فرماتا:

(وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا) (النور:33)

ترجمہ: ''اور اپنی (مملوکہ) لونڈیوں کو زنا کرانے پر مجبور مت کرو (اور بالخصوص) جب وہ پاک دامن رہنا چاہیں، محض اس لیے کہ دنیوی زندگی کا کچھ فائدہ (مال) تمہیں حاصل ہو جائے۔''

نہ کسی مرد کو اس کی اجازت تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو ستائے یا تنگ وافلاس کے ڈر سے اسے زندہ گاڑ دے۔ قرآن اللہ کے اس حکم کے مطابق اس فعل کو ممنوع قرار دیتا ہے:

(وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ) (الانعام 151)

ترجمہ: ''اور اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت کیا کرو، ہم انہیں اور تمہیں رزق (مقدر) دیں گے!''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

(اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَّاَصْفٰكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ) (الزخرف: 16،17)

ترجمہ: ''کیا اللہ نے اپنی مخلوقات میں سے بیٹیاں پسند کیں اور تمہیں بیٹوں کے ساتھ مخصوص کیا حالانکہ جب ان میں سے کسی کو اس چیز کے ہونے کی خبر دی جائے جسے خدائے رحمٰن کا نمونہ (اولاد) بنا رکھا ہے (مراد بیٹی ہے) تو سارا دن اس کا چہرہ بے رونق رہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہے۔'' اور زندہ گاڑی ہوئی لڑکی کے حق میں فرمایا جاتا ہے:

(وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ) (التکویر: 8،9)

ترجمہ: ''اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر قتل کی گئی تھی؟''

آبائی رسم و رواج کے خلاف یہ بغاوت، واقعی اپنے اندر اتنی جان رکھتی تھی کہ عربی زندگی میں اساسی طور پر ایک ایسا اجتماعی انقلاب برپا کر دیتی جو بدویت اور مدنیت دونوں کو شامل ہوتا۔ یہ بغاوت چونکہ وحی کے ذریعے رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی تھی اس لیے وہ اللہ کا ایک حکم تھی جس سے بچنے کا کوئی رستہ نہ تھا اور جس کی تعمیل بہر صورت ہونی تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی ذہن پر اس بغاوت کا اثر اس عقلی بغاوت کے اثر سے زیادہ شدید تھا، جس نے بتوں کو ڈھا کر اور شرک سے انکار کر کے اللہ کی وحدانیت کا اقرار کیا۔ جب کبھی عقل و دل غلامی کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہوئے ہیں، آزادی کے نور سے ضیا اندوز ہونے کے لیے اس کی طرف دوڑتے ہیں۔ یہی حال ہماری فکر اور ہمارے ذاتی عقائد کا ہے۔ لیکن جہاں زندگی پر ہمارے اختیارات اور دوسروں سے ہمارے تعلقات کا سوال آتا ہے، اطاعت و تسلیم کی ڈوری میں تردد اور ہچکچاہٹ کی گرہیں پڑنی ہونے لگتی ہیں اور عقل کی سپراندازی کے باوجود چاہتے ہم یہی ہیں کہ ہمارا اقتدار بہر صورت قائم رہے اور جو کچھ اس میں کمی آ گئی ہے وہ کسی نہ کسی طرح پوری ہو جائے۔ اس لیے کہ ہماری

Marfat.com

خواہشوں کا مقتضا یہی ہے۔ عقل جتنی چاہے، خواہش سے بلند ہو جائے اور آزادی فکر جتنا چاہے، بلند معانی پر عبور حاصل کر لے۔ انسان پر حکومت وہی جبلت کرتی ہے جو تمام خواہشوں کا مدار ہے۔ ہمارے اس قول کی بہترین تائید خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک بیان سے ہوتی ہے۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی سند سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''بخدا! جاہلیت میں ہم عورتوں کی کوئی حیثیت نہ سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ نے جو چاہا ان کے متعلق نازل کیا اور جو چاہا انہیں حصہ دیا۔ ایک دن میں کسی مسئلے میں الجھا ہوا تھا کہ میری بیوی بولی: ''آپ ایسا ایسا کیوں نہیں کر لیتے؟'' میں نے اس سے کہا، تمہارا اس سے کیا واسطہ؟ تم میرے معاملے میں دخل دینے والی کون ہوتی ہو؟'' وہ کہنے لگی، تعجب ہے ابن خطاب! تمہیں اپنی بات میں میرا دخل دینا تک گوارا نہیں اور تمہاری بیٹی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح جواب دیتی ہے جس سے آپ دن بھر ناراض رہتے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے چادر لی اور اُٹھ کر سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچا اور کہا بیٹی! حفصہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: ''ہاں بخدا! ہم آپ کو جواب دیتے ہیں!'' میں نے کہا ''دیکھو! میں تمہیں خدا اور اس کے رسول کی عقوبت سے ڈراتا ہوں۔ بیٹی! اس عورت کے نقش قدم پر نہ چلو جسے اپنے حسن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نے مغرور کر دیا ہے۔ اس کے بعد ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا، جن سے میری قرابت تھی اور ان سے بھی یہی گفتگو کی۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے مجھ سے کہا، حیرت ہے! ابن خطاب! تم ہر بات میں دخل دیتے دیتے اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج رضی اللہ عنہن کے معاملے میں بھی دخل دینے لگے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں'' یہ بات میرے دل میں چبھ گئی۔ میں آگے کچھ نہ کہہ سکا اور ان کے پاس سے اُٹھ کر چلا آیا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ام المؤمنین حضرت حفصہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما کے درمیان یہ گفتگو ہجرت کے نویں سال اس وقت ہوئی تھی جب اللہ عورتوں کے متعلق اپنے احکام نازل فرما چکا تھا اور جو حیثیت انہیں دینی تھی، دے چکا تھا۔ اس وقت جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ حال تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنے قریب اور آپ کی تعلیمات کے اتنے اطاعت گزار تھے تو ان عربوں کے متعلق آپ خود اندازہ کر لیجیے جو عرب کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے اور ان کی بیویوں، بیٹیوں اور رشتے داروں کے درمیان بھی وہی کچھ...... یا

Marfat.com

شاید اس سے بھی زیادہ..... پیش آتا ہوگا، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے درمیان پیش آیا اور بلاشبہ عورتیں اس پر اصرار کرتی ہوں گی کہ جو حق تعالیٰ نے انہیں عطا کیا ہے۔ مرد اس سے انکار یا اس کے متعلق ان سے جھگڑا نہ کریں، کیونکہ وہ اللہ اس کے کتاب اور اس رسول پر ایمان لا چکے ہیں۔ انسانی معاشرے میں عورت اور مرد کی مساوات سے پیدا ہونے والے انقلاب کا ردعمل جب یہ تھا تو اس وقت اسے آپ سے آپ شدید ہو جانا چاہیے تھا، جب اسلام نے عورت کو وراثت کا وہ حق دیا، جس سے جاہلیت نے اسے محروم کر رکھا تھا اور جب نہ صرف یہ کہ تعدد ازواج کی بے لگامی کو چار بیویوں میں محدود کر دیا گیا، بلکہ مرد کو ہدایت کی گئی کہ اگر وہ بیویوں میں انصاف نہ کر سکتا ہو تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے۔ پس انسانی مرتبے اور جزائے اعمال میں عورت کی مساوات، معنوی اعتبارات سے قریب تر ہے اور اس میں مرد کا کوئی نقصان نہیں کہ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان محبت و مرحمت کا رشتہ ہو محبت بیوی کی طرف سے اور مرحمت اس کی طرف سے، نہ اس میں کوئی حرج ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اس کے والدین کے بارے میں یہ نصیحت کرے۔

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیْكَ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ (لقمان:17)

ترجمہ: "اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اُٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر کہ میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔"

رہی یہ بات کہ عورت کو ورثہ کیوں دیا گیا اور اسے ترکے میں مرد کا شریک کیوں ٹھہرایا گیا جب کہ نیزہ بازی، حفاظت وطن اور جمع غنیمت جیسے اہم کام صرف مرد ہی کے سپرد ہیں۔ سو اس کا تعلق عملی طور پر اس چیز سے ہے جسے بعض لوگ آج کل کی اصطلاح میں "اکتسابی حقوق" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اس کا اثر مادی منفعتوں کے قلب تک پہنچتا ہے اور بیشتر لوگ مادی منفعتوں سے غیر معمولی تعلق رکھتے اور باقی تمام چیزوں سے زیادہ ان سے چمٹے رہتے ہیں اور یہی حال تعدد ازواج کو چار عورتوں میں محدود کرنے اور ایک بیوی کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق ترجیح دینے کا تھا:

Marfat.com

(فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْمَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَلَّا تَعُوْلُوْا)(النساء:3)

ترجمہ: ''تو عورتوں سے جوتم کو پسند ہوں نکاح کرلو۔ دو دو عورتوں سے اور تین تین عورتوں سے اور چار چار عورتوں سے پس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو یا جو لونڈی تمہاری ملک میں ہو وہی سہی، اس امر مذکورہ میں زیادتی نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے۔''

اس آیت میں جو حکم دیا گیا ہے وہ انسانی مرتبے کے عین مطابق ہے، جو قرآن نے عورت کے لیے مقرر کیا ہے پھر بھی زمانہ جاہلیت میں جو چیزیں عربوں میں جائز تھیں، ان کی تحدید کر دی گئی اور چونکہ یہ حکم اسلام نے دیا تھا، اس لیے مسلمانوں کے لیے اس کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ عورت کے بارے میں، جو یہ احکام نازل ہوئے تھے، ان کی تعمیل عربوں پر آسان ہو گئی جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کو یہ ارشاد فرماتے دیکھا:

(اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ)(النساء:37)

ترجمہ: ''مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔''

اور یہ کہ:

(وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى)(البقرہ:282)

ترجمہ: ''اور دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ (بھی) کرلیا کرو۔ پھر اگر وہ دو گواہ مرد (میسر) نہ ہوں، تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنائی جائیں) ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو کہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی بھول جائے تو ان میں ایک دوسری کو یاد دلا دے۔''

اور جب میراث میں مردوں کا حصہ عورتوں سے دوگنا رکھا گیا۔ چنانچہ یہ آیات اس شخص کے لیے جو اپنے قدیم نظریات ہی کو اہم سمجھتا تھا، دروازہ کھولتی ہیں۔ اگرچہ انہوں نے یہ دروازہ زیادہ نہیں، بس یوں ہی سا کھولا اور صرف اس لیے کھولا کہ خاندان کی کفالت اور جہاد فی سبیل اللہ کے طور پر دین و وطن کی مدافعت کا بار مرد کے کندھوں پر رکھا گیا تھا۔ یہ اور اس قسم کی دوسری آیتیں جو عورت کے متعلق نازل ہوئیں، اپنے اندر اتنی قوت رکھتی تھیں کہ عربی زندگی میں ایک غیر معمولی اجتماعی انقلاب برپا کر دیتیں۔ اس لیے کہ عورت خاندان کی بنیاد ہے اور خاندان، قبیلے قوم اور معاشرے کی اساس۔ عورت کے لیے مرد کا احترام اور نسوانی فطرت سے ہم آہنگ معاملات زندگی میں مرد کا عورت کے ذریعے تعاون زندگی کو ایک ایسی قوت اور ایک ایسی توانائی بخشتا ہے کہ اگر عورت سے غلاموں کا سا سلوک کیا جائے، اسے زندگی کے معاملات میں ہر قسم کی شرکت سے دور رکھا جائے تو اس قوت اور اس توانائی تک پہنچنے کا اور کوئی رستہ نہیں ہے اس کے علاوہ عورت کی تعظیم و تکریم فنون لطیفہ کو معراج کمال پر پہنچاتی ہے، جس تک پہنچنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر عورت کو محض مرد کے نفس کی متاع اور اس کے گھر کی کنیز بنا دیا جائے۔ شاید یہ بات آپ اشعار جاہلیت میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ اس زمانے میں عورت کو اکثر و بیشتر متاع نفس ہی سمجھا جاتا تھا اور ان حدود سے ہٹ کر مرد کے دل یا اس کی نظر میں عورت کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ 'سبعہ معلقات' اس کی شہادت دیتے اور تائید کرتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ قریش کی عورتیں اپنے جنگ آزماؤں کے ساتھ بدر کی شکست کا انتقام لینے نکلی تھیں اور جب احد کے مقام پر مشرکین قریش اور مسلمانوں کا مقابلہ ہوا تھا تو وہ اپنے آدمیوں کو جوش دلانے کے لیے یہ اشعار پڑھ رہی تھیں:

ان تقبلوا نعانق

ونفرش النمارق

او تدبروا نفارق

فراق غیر وامق

ترجمہ: ''اگر تم آگے بڑھے تو ہم تمہیں گلے لگائیں گی اور تمہارے لیے مسندیں بچھائیں گی اور اگر پیٹھ دے کر بھاگے تو بے شوقی کے ساتھ تم سے جدا ہو جائیں گی۔''

Marfat.com

گویا قریش کی عورتیں وطن کی عزت اور قومی بزرگی کے تحفظ کے سلسلے میں دشمن پر فتح یاب ہو جانا ہی اپنے سورماؤں کے لیے کافی نہ سمجھتی تھیں، بلکہ ان کے نزدیک شجاعت و پیش قدمی کا صحیح انعام یہ تھا کہ وہ مردوں کی آغوش میں سمائیں اور ان کے لیے مسندیں بچھائیں۔ اسی طرح پیٹھ دے کر بھاگنے کی سزا یہ تھی کہ وہ مردوں سے جدا ہو جائیں۔ اگر مرد و عورت کا رشتہ جاہلیت کی طرح محض متاع نفس تک محدود نہ ہوتا، بلکہ قرآنی احکام کے مطابق محبت و مرحمت پر استوار کیا جاتا تو اپنے سورماؤں کے انعام و سزا کے متعلق قریش کی عورتوں کا نقطہ نظر کچھ اور ہوتا۔ قرآن جو اقتصادی انقلاب لے کر آیا تھا، اس کا اثر اجتماعی انقلاب سے کچھ کم نہ تھا۔ دولت مند، تاجر اور سردار وغیرہ جنہیں زمانہ جاہلیت میں امتیازی مقام حاصل تھا محتاجوں اور مزدوروں سے غرور و تبختر کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اگرچہ یہ غرور و تبختر ان کی آزادی و خودداری کا گلا نہیں گھونٹ سکتا تھا۔ اس لیے مالدار لوگ جب کسی محتاج کو کچھ دیتے تھے، ترس کھا کے دیتے تھے۔ پھر احسان جتا جتا کر اپنی عطا و بخشش کے مرتبے کی بلندی کا ذریعہ بتاتے تھے۔ اسلام نے نزول وحی کے آغاز ہی میں انانیت کے اس جذبے کا مقابلہ کیا۔ لوگوں میں اخوت و مساوات کی بنیاد رکھی۔ مالداروں کو اس خیرات پر سرزنش کی جس کے نتیجے میں وہ احسان جتا جتا کر کچھ دیتے تھے اور محتاجوں کے لیے مالداروں پر زکوٰۃ فرض کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى) (البقرہ: 273، 277)

ترجمہ: ''ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اور بے نیاز ہے اللہ اور بردباری اس کی صفت ہے۔ اے ایمان لانے والو اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر خاک میں نہ ملا دو!''

(اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ .) (البقرہ: ۲۷۱)

ترجمہ: ''اگر آپ صدقات اعلانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔''

صدقہ مالدار کا فقیر پر احسان نہیں بلکہ فقیر کا مالدار کی دولت میں حق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد

Marfat.com

ہے:

(یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتَامٰی وَالْمَسَاکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ)(البقرہ:215)

ترجمہ:''لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو جو مال بھی تم خرچ کرو، اپنے والدین پر، اپنے رشتہ داروں پر، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے اللہ اس سے باخبر ہوگا۔''

یہ ایک نئی تعبیر ہے جس کی اساس پر آپ بہ آسانی اسلامی اشتراکیت کی مکمل عمارت کھڑی کر سکتے ہیں۔ پھر یہ ایک ایسی تعبیر ہے کہ اس قسم کی قوت سے عرب پہلے ناآشنا تھے۔ ہر زمانے میں لوگ احسان وعطا کے متعلق یہ کہتے رہے ہیں کہ وہ دینے والے کا کرم ہے، لینے والے کا حق نہیں لیکن قرآن احسان وعطا کو ایک حق سمجھتا ہے اور صرف یہ حق ہی ہے جو مالدار کی دولت کو گناہ کی آمیزش سے پاک کرتا ہے اس لیے اول اول اس نغمے کے جان دار اثر نے اسلام کی اشاعت میں کام کیا اور بعد کو اسلامی جماعت میں وہ برق رفتار تبدیلیاں پیدا کیں، جن کی تفصیل آپ کی نظر سے گزر چکی ہے۔ سود کے خلاف اسلام نے نہایت شدید جنگ کی، جس کا اندازہ آپ کو اس ارشاد ربانی سے ہوسکتا ہے:

(یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰو وَیُرْبِی الصَّدَقَاتِ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ)
(البقرہ:267)

ترجمہ:''اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے اور بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

(اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰو لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطَانُ مِنَ الْمَسِّ)(البقرہ:275)

ترجمہ: جو لوگ سود کھاتے ہیں، ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو۔''

Marfat.com

بلکہ قرآن نے سود کو لوگوں کے مال ناجائز طریقوں پر کھانے سے تعبیر کیا ہے:

(وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا) (النساء:161)

ترجمہ: ''اور سود لیتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں اور جو لوگ ان میں سے کافر ہیں ان کے لیے ہم نے درد ناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

زمانہ جاہلیت میں سود کا جو رواج تھا اللہ نے اسے حرام قرار دے دیا اور تاکید فرمادی کہ جو شرائط پہلے طے پائی تھیں، ان کے مطابق کوئی شخص رقم وصول نہ کرے! اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ) (البقرہ:258،259)

ترجمہ: ''اے ایمان لانے والو! خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر واقعی تم ایمان لائے ہو، لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے، اب بھی توبہ کرلو (اور سود چھوڑ دو) تو اصل لینے کے تم حق دار ہو۔ نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔''

اس اقتصادی تنظیم کا اجتماعی زندگی پر بڑا قوی اور گہرا اثر پڑا، جسے مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت کی پرجوش تائید نے اور قوی اور گہرا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس آخری زمانے تک مسلمان اپنی پوری قوتوں کے ساتھ سود سے نفرت کرتے چلے آئے ہیں۔ بلاد عرب میں مذہبی اور اجتماعی انقلاب اس سیاسی انقلاب سے جاملا جس نے عربوں کو پراگندگی کے بعد متحد کیا تھا اور فتوحات کو وہ غیر معمولی وسعت دی تھی جو عہد فاروقی رضی اللہ عنہ کے مطالعے کے دوران ہم دیکھ چکے ہیں۔ ان عوامل نے ایک دوسرے کی مدد کی اور عرب اپنی عمرانی اور اقتصادی زندگی کے ایک ایسے مرحلے پر پہنچ گئے، جس کا تصور بھی کبھی ان کے اور ان کے اسلاف کے ذہن میں نہ آیا تھا۔ ہزاروں اور لاکھوں بدوی عراق وشام کی متمدن آبادیوں میں منتقل ہوگئے اور ان میں سے اکثر نے دمشق، حمص،

Marfat.com

قنسرین، مدائن، کوفہ، بصرہ اور اسی قسم کے دوسرے بھرے پُرے بارونق شہروں میں اقامت اختیار کرلی۔ انہوں نے اسکندریہ، منف، طیبہ اور مصر کے دوسرے شہروں میں تعمیر وصنعت کے کارنامے، سرسبز وشاداب کھیت اور لدے پھندے باغات دیکھے، پھر غنیمت کے مال اور وظائف کی آمدنی سے جو کچھ انہوں نے حاصل کیا۔ اس سے نہ صرف یہ کہ ان کی تنگ دستی دور ہوگئی بلکہ ان کی زندگی میں راحت وآسودگی کا رنگ بھر گیا۔

اس کے بعد انہیں شام میں روم کے روح پرور پھول نظر آئے۔ مصر کی دوشیزاؤں اور عراق کی ہرنیوں نے انہیں دعوت نظارہ دی اور ان تمام چیزوں میں ان کی نگاہیں ایک ایسے حسن اور

ایک ایسی دل کشی سے ......لطیف وخوشگوار زندگی کی دل کشی سے ......آشنا ہوئیں کہ یہ دل کشی نہ انہیں اپنی خانہ بدوشی کی زندگی میں نظر آئی تھی، نہ تہذیب وحضارت کی زندگی میں۔ ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ رومیوں کے عبادت کدوں اور مقبروں میں ایسی ایسی نظر فریب مورتیاں تھیں، جن کی تراش میں فنکاروں نے اپنی تمام تر اختراعی قوتیں صرف کردی تھیں اور عیسائیوں کے دیر وکلیسا میں ایسی ایسی بے مثل تصویریں عشرت نظر بنی ہوئی تھیں کہ مصوروں نے کچھ ایسا افسوں اس میں بھرا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی وہ زبان سے بولنے والی ہیں۔ اس کے علاوہ اسکندریہ کا مدرسہ لوگوں میں مختلف علوم وفنون اور اُصول ونظریات کو فروغ دے رہا تھا اور رومی وایرانی دمشق ومدائن سے جس علم وادب کی اشاعت کررہے تھے، وہ ان تہذیبوں کا ثمرہ تھا، جو صدیوں کی آنچ سہ کر پختہ ہوئی تھیں، لیکن بعد کو وہ وقت آیا کہ موت وہلاکت نے ان پر اپنا دامن ڈال دیا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ وہ کون سا اثر تھا جس کی بنا پر اس عہد کے عربوں کی اجتماعی زندگی میں یہ بہت سے محرکات وعوامل جمع ہوگئے؟

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان محرکات میں ایک محرک اور شامل کردیں جس نے ان تمام محرکات کی رہنمائی کی.......... یہ محرک خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذات تھی۔ فقہ وسیاست اور اقتصادیات میں جو اجتہاد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیے ان کا اسلامی معاشرے اور تمام عربوں پر بڑا اثر پڑا۔ عام اس سے کہ وہ جزیرہ نمائے عرب میں مقیم ہوں، یا مفتوحہ ممالک میں جاکر آباد ہوگئے ہوں، اس اجتہاد کی کچھ تفصیل آئندہ باب میں پیش کی جائے گی۔ یہی اجتہاد تھا جس نے عہد فاروقی میں اجتماعی زندگی کو ٹھوکر کھانے سے بچایا اور اسی نے ہر جگہ مسلمانوں کے

Marfat.com

ذہن پر اسلامی روح کی سیادت برقرار رکھی اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک اور بڑی فضیلت ہے جو حکومت میں ان کی منصفانہ روش اور اس کی ذمہ داریاں سنبھالنے میں ان کی قوت وقابلیت پر مستزاد ہے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے الہامی طور پر محسوس فرمایا کہ نفس انسانی جب روحانی بلندیوں کی طرف پرواز کرتا ہے تو خواہشوں کی مقناطیسی قوتیں اسے ہمیشہ اس سطح پر کھینچنے کی کوشش کرتی ہیں جو ان کی فطرت وطبیعت سے مناسبت رکھتی ہے۔ فضا میں اُڑنے والے اس پرندے کی طرح، جو ہمیشہ کشش زمین کی زد میں رہتا ہے کہ جہاں اسے ایتھر کی بلندیوں میں لے جانے والی قوت کمزور پڑے۔ وہ نیچے آرہے۔ پس اگر امیر المؤمنین دوسروں کے واسطے نمونہ بننے کے لیے سب سے پہلے اپنی کمزوریوں کا مقابلہ نہ کرتے، اور پھر تمام لوگوں کی کمزوریاں دور نہ فرماتے تو اندیشہ تھا کہ وہ اصول ومبادی اپنی راہ سے نہ ہٹ جائیں، جو انہیں اس قوت اور اس بلندی کی طرف لے گئے تھے اور دنیا کی خواہش ان پر غالب آکر انہیں ان کی پہلی روش پر نہ ڈال دیں اور اس روش کو ایک ایسے نئے روپ میں پیش نہ کردیں کہ دیکھنے والا اسے اسلام کے مبادی تعلیمات سے ہم آہنگ سمجھنے لگے۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے سب سے زیادہ محتاج اور سب سے زیادہ کمزور شخص کے محسوسات اپنے اوپر طاری کرنے کے لیے اپنی ذات پر کتنی سختیاں جھیلتے تھے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی تو ان کے ساتھیوں کو ان کی زندگی خطرے میں نظر آنے لگتی تھی۔ جب ان کا اپنے ساتھ یہ حال تھا تو پھر ان کے لیے بالکل جائز تھا کہ جس کسی کو انصاف وتقویٰ کی مخالفت کرتے یا خلوص واخلاق کی راہ سے ہٹتے دیکھیں اس پر سختی کریں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عمال کا محاصرہ بڑی شدت سے کرتے تھے۔ جس عامل میں کجی پاتے اسے فوراً معزول فرمادیتے، لیکن جو عمال حکومت کے فرائض عدل واحسان کے ساتھ روبہ عمل لاتے، ان کے وقار کی حفاظت کرتے اور ان کے اقتدار کو تقویت پہنچاتے تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بعض حدود واحکام میں اس طرح اجتہاد فرماتے کہ نہ عہد صدیقی میں اس کی مثال ملتی ہے نہ عہد رسالت میں اور اقتصادیات واجتماعیات میں ایسی قطعی راہیں نکالتے، جن کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ دین قیم کے اصول ومبادی کو ان کی تمام تر پاکیزگی کے ساتھ برقرار رکھنے کی ضامن ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مثالی شخصیت اور اقتصادیات واجتماعیات میں ان کی سیاست نے ان خصوصیات کی قوت وسلامتی میں

Marfat.com

کوئی کمی پیدا نہ ہونے دی جو حملہ و پیش قدمی کے دوران میں عربی ذہن کا ایک جزو بن گئی تھیں۔ فاروق اعظم نے غازیان عرب کو عراق، شام اور مصر میں کھیتی باڑی کی اجازت نہ دی بلکہ جنگ آزما اور فاتح لشکروں کی حیثیت سے اسلامی چھاؤنیوں ہی میں رکھا۔ چنانچہ وسیع و عریض اسلامی سلطنت اسی سیاست کا حتمی نتیجہ تھی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد نے عربوں کی عقلی قوتوں کو ان میدانوں میں گرم جولاں کر دیا جو ان کے فکر و نظر کے لیے بالکل نئے تھے۔ دولت کی ریل پیل نے لوگوں کو اس کا طلب گار بنا دیا اور ان میں جمع مال کی حرص پیدا ہو گئی۔ بعض لوگوں نے اس رجحان کی تعریف کی اور اسے مسلمانوں کی آسودگی کے لیے بہتر سمجھا، لیکن بعض نے اس جذبے کو عیب و مذمت کی نظر سے دیکھا اور اسے اسلامی دعوت کے اُصول و مبادی کے منافی قرار دیا۔ یہ لوگ اپنی رائے کی سند میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پیش کرتے تھے:

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى (العلق: 6،7)

ترجمہ: ''مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے جب اپنے آپ کو مستغنی پاتا ہے۔ بے شک (یہ سب لوگ) تیرے رب کی طرف لوٹیں گے۔''

مفتوحہ ممالک میں مسلمان ان فنی آثار سے نظر آشنا ہوئے جن میں مورتیاں بھی شامل تھیں جو عہد جاہلیت میں کعبے کے آس پاس رکھے ہوئے بتوں سے مشابہ تھیں۔ لیکن مسلمانوں نے انہیں نہیں توڑا، بلکہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے تو ان مورتیوں کے ہوتے ہوئے جن سے مدائن کے ایوان کسریٰ کو سجایا گیا تھا۔ وہاں ادائے صلوٰۃ میں بھی کوئی حرج محسوس نہ کیا اور یہ سمجھ کر وہاں باقاعدہ نماز پڑھتے پڑھاتے رہے کہ جب ان مورتیوں کو پوجنے والا ہی وہاں نہیں ہے تو پھر ان کے باقی رہنے میں کیا نقصان ہے۔ مسلمانوں کی ان عقلی سرگرمیوں کا رخ زیادہ تر ان مسائل کی طرف تھا، جو انہیں کتاب و سنت میں نہیں ملتے تھے، چنانچہ ایسے مسائل پر عربوں نے بطور خاص توجہ دی اور ان میں اجتہاد رائے سے کام لیا، لیکن اس توجہ نے فوری منافع سے آگے قدم نہ بڑھایا۔ یہی وجہ تھی کہ عرب اپنی فطرت کے دائرے میں رہے اور ان کی اس دلچسپی نے انہیں اس نقطے پر نہ پہنچایا جہاں وہ یونانیوں کی طرح فلسفے یا اقتصادیات یا اجتماعیات کے ایسے مذاہب قائم کرتے، جن کا ترکیبی مواد اشیاء کی حقیقت کا گہرا مطالعہ کرنے والی منطق سے حاصل کیا جاتا تھا، یا ایرانیوں کی طرح ادب کی نت نئی راہیں نکالتے جو شاعری کو رزم گاہوں تک پہنچا دیتیں اور ہر نثر

نگاری کو طویل وضخیم داستانوں تک۔

زیادتی ہوگی اگر کوئی شخص اس عہد کی عربی قوم سے یہ مطالبہ کرے کہ اس نے فلسفہ توحید کو اس نہج پر مرتب کیوں نہ کیا۔ جس نہج پر بعد کو غزالی، فارابی اور ابن رشد وغیرہ نے اس کی تدوین وتفصیل کی۔ اس کے لیے تو بس یہی کافی تھا کہ رسول اللہ ﷺ اللہ کی طرف سے جو اصول وعقائد لے کر مبعوث ہوئے تھے، ان پر ایمان لے آتی اور انہیں اپنی عبادات اور زندگی کے معاملات کی اساس بنالیتی۔ اس کے بعد دوسرا سرمایہ فخر اس کے لیے یہ تھا کہ اس نے اسلامی سلطنت کی بنیادیں رکھیں اور اس سلطنت کے فرزندوں نے رفتہ رفتہ ایک ایسی تہذیب کے اصول استوار کر دیئے، جو صدیوں بعد تک انسانیت کی رہنمائی کرتی رہی، جب آپ یہ خیال کریں گے کہ یہ تبدیلی کوئی آسان بات نہ تھی۔ جب آپ کو یہ دھیان آئے گا کہ اس تبدیلی کی راہ میں رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیسی کیسی مساعی صرف کی ہیں اور جب آپ یہ اندازہ کریں گے کہ انسانی زندگی کے اس پہلو میں عربوں کی کیا کیفیت تھی تو اس شان رواداری کو دیکھنا بھی آپ کا فرض ہوگا کہ جن قدیم رسموں کو اسلام نے حرام قرار نہیں دیا تھا، وہ عربوں میں بدستور قائم رہیں اور وہ اس انقلاب کے زیر اثر مرتبہ کمال پر پہنچ گئے جس نے انہیں نت نئی نعمتوں اور آسائشوں سے نوازنے کے بعد اسلامی سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔

واقعہ یہ ہے کہ اس باب میں عربوں کا اپنا کوئی خاص طریقہ نہ تھا اور انسانی جماعت کے عام دستور کے برعکس انہوں نے اس میں کوئی امتیاز حاصل نہ کیا۔ تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ انقلابات کا جتنا اثر انسانی فکر کے مظاہر اور جماعتی ضابطوں پر پڑتا ہے، اتنا انسانی عادات ومیلانات پر نہیں پڑتا۔ چنانچہ لوگ کسی نظریے یا کسی اصول پر ایمان تو لے آتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اپنی جبلی خواہشوں میں کتر بیونت بھی شروع کر دیتے ہیں کہ اس اصول اور اس اصول کی بنیاد پر قائم شدہ نظام کے دائرے میں رہتے ہوئے ان خواہشوں کی پیروی کرتے رہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کی غالب اکثریت ان اعلیٰ مثالوں کے مقابلے میں، جو احکام کی حیثیت سے اس پر فرض کی جاتی ہیں، اپنی فطرت کے تقاضوں سے زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ یہ اکثریت ان گناہوں کی سزا سے بچنے کی ہمیشہ امیدوار......شدید امیدوار......رہتی ہے، جن کا ارتکاب نتیجہ ہوتا ہے انسان کی جبلی خواہشوں اور فطری تقاضوں کا۔ پھر سزا سے بچنے کے لیے راہیں بھی مختلف

ڈھونڈی جاتی ہیں۔ کبھی چھپ کر گناہ کیے جاتے ہیں، کبھی عدالت کے شبہے سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے اور اللہ کا دامن رحمت تو ایسا ہے جس کا سہارا ہمیشہ اور ہر حال میں لیا جاتا ہے۔ کیا اللہ کی رحمت ومغفرت عام نہیں ہے؟ کیا وہ بدی کا بدلہ اس کے برابر اور نیکی کا بدلہ اس سے دس گنا نہیں دیتا؟ اف ! کتنا بد بخت ہے وہ انسان جو اللہ کی رحمت ومغفرت سے بھی مایوس ہو جائے! اللہ کی مخلوقات میں انسان کے لیے بے شمار نعمتیں ہیں۔ جس کسی نے اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حلال اور حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھا اور نیک کام کیے اسے اللہ ضرور اپنے انعام سے نوازے گا اور جس کسی کے قدم ڈگمگا گئے، جس کا نفس امارہ اسے بدی کی راہوں پر لے گیا، لیکن اس نے اپنے گناہوں پر نادم ہو کے توبہ کر لی، تو اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرنے والا ہے۔

وہ کون سی جاہلانہ عادات ورسوم تھیں جو مسلمان ہو جانے کے بعد بھی عربوں کی زندگی میں باقی رہیں؟ اور جب ان کی سلطنت وسیع ہوئی، وہ ہزاروں کی تعداد میں جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر مفتوحہ شہروں میں آباد ہو گئے، تو ان کی زندگی میں کیا کچھ پیش آیا؟ زمانہ جاہلیت میں عرب قبائلی اور نسلی تعصب کا بری طرح شکار تھے، لیکن دعوت اسلامی فطرتاً اس جاہلانہ عصبیت کے خلاف تھی۔ وہ تمام انسانوں کو ایک سطح پر رکھتی تھی اور فضیلت کا معیار انسان کے عمل اور اس کے تقویٰ کو قرار دیتی تھی۔ اس میں عرب اور غیر عرب کی کوئی تمیز نہ تھی چنانچہ قرآن اس بارے میں صریحی طور پر کہتا ہے:

(اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ)(الحجرات:13)

ترجمہ: ''تم میں اللہ کے نزدیک سب سے بزرگ وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

(اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ)(الحجرات:10)

ترجمہ: ''بے شک مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔''

اسلام تمام انسانوں کے لیے نازل ہوا تھا، چاہے وہ گورے ہوں یا کالے، عربی ہوں یا عجمی، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں ارشاد فرمایا تھا: ''لوگو! اللہ تعالیٰ نے جاہلانہ نخوت اور آبائی فخر و ناز کو تم سے دور کر دیا ہے، تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ پرہیز گاری کے سوا کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔''

Marfat.com

اس کے باوجود قبائلی اور نسلی تعصب اکثر عربوں کے دل میں اسی شدت اور اسی قوت کے ساتھ باقی رہا۔ بلکہ نسلی تعصب تو ان کے روم وایران میں پھیل جانے اور ان دونوں ملکوں کے باشندوں پر حکومت کرنے سے اور بڑھ گیا اور عربوں کو یقین ہو گیا کہ قضا وقدر نے جو پیغام ان کے سپرد کیا ہے وہ صرف انہیں کے لیے مخصوص ہے، اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ تاریخ میں قبائلی تعصب کے قائم و برقرار رہنے کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ عہد رسالت کی بات ہے کہ اوس وخزرج میں بسلسلہ مفاخرت جنگ بعاث کا ذکر چھڑ گیا کسی نے کہا: ''اگر تم چاہو تو بخدا! ہم ازسرنو جنگ شروع کرنے کے لیے تیار ہیں۔'' اگر رسول اللہ ﷺ بیچ میں پڑ کر ان میں دوبارہ رشتہ اخوت قائم نہ فرما دیتے تو فریقین میں چل جاتی۔ خلافت راشدہ کے ابتدائی دور میں قبائلی تعصب ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اس لیے کہ فتوحات کی مشغولیت نے عربوں کے باہمی جھگڑوں کو مٹا دیا تھا، لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں اختلاف ہوا تو قبائلی تعصب نے پھر وہی روش اختیار کر لی اور جو عداوت ودشمنی بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کے درمیان عہد جاہلیت میں تھی وہ عود کر آئی۔ یہ قبائلی عصبیت آج تک عرب کے خانہ بدوشوں میں پائی جاتی ہے۔ عام اس سے کہ وہ جزیرۃ العرب میں رہتے ہوں یا اس سے باہر کہیں اور مقیم ہوں۔ فتوحات نے عربوں کے نسلی تعصب کو دگنا اور چوگنا کر دیا اور کیسے نہ کرتیں جب وہ دیکھ رہے تھے کہ ایران وروم کی عظیم الشان سلطنتیں ان کی قوت کے سامنے زمیں بوس ہو رہی ہیں، ان کا اقتدار اسلامی ضرب سے پارہ پارہ ہو رہا ہے، شاید وہ اس تعصب میں کوئی برائی بھی محسوس نہ کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق ارشاد فرما رہا تھا:

(كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ) (آل عمران:110)

ترجمہ: ''اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو، جسے انسان کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

(وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا) (البقرہ:173)

Marfat.com

ترجمہ: ''اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک ''امت وسط'' بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔''

عربوں نے ان آیتوں کو تو یاد رکھا، لیکن ان بہت سی آیتوں کو بھول گئے جن میں اللہ نے ان پر ملامت وسرزنش کی ہے۔ اسی طرح وہ اخوت ومساوات کے ان اُصولوں کو بھی فراموش کر بیٹھے جن کی طرف اسلام نے دعوت دی تھی جنہیں اسلام نے ایمان کی بنیاد بنایا تھا ہم نسلی تعصب کے سلسلے میں عربوں پر گرفت نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ نسلی تعصب آج بھی قوموں کا شعار ہے، جسے نہ صرف یہ کہ اپنایا جاتا ہے، بلکہ اس کی تقویت کے لیے کام بھی کیا جا سکتا ہے۔ کیا سفید فام نسل آج اس زعم میں مبتلا نہیں ہے کہ قضا وقدر نے اسے رنگدار نسلوں کی تہذیبی رہنمائی کے لیے منتخب فرمایا ہے اور کیا آریائی نسل یہ نہیں سمجھتی کہ وہ سامی اور اس کے علاوہ دوسری تمام نسلوں پر برتری رکھتی ہے۔ اس کی ذہانت سب سے زیادہ تیز اور اس کی عقل سب سے زیادہ نکتہ رس ہے اور اسے علم وفن میں تمام قوموں سے بڑھ کر تخلیقی واختراعی قوتیں حاصل ہیں۔ ٹیوٹانی اور جرمن نسلوں کو اپنے متعلق اسی قسم کا دعویٰ ہے، جس کے ڈھول ہر خوش نصیب اور اقبال مند قوم پیٹتی ہے اور اپنے وقت کی سازگاری کو غلامی کا شکنجہ بنا کر دوسری قوموں کو اس میں کستی ہے۔ سب کی سب سفید فام قومیں گلا پھاڑ پھاڑ کے یہ دعویٰ کرتی ہیں، حالانکہ وہ اس تاریخی حقیقت سے بہ خوبی واقف ہیں کہ حکومت واقتدار ایک ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے، جو مختلف نسلوں، رنگوں اور قوموں میں گردش کرتی رہتی ہے، کبھی معنوی زندگی کے روپ میں اور کبھی اقتصادی زندگی کے روپ میں، لیکن اس کا کسی خاص نسل یا کسی خاص رنگ سے ہرگز کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے اگر اس زمانے میں عربوں کا نسلی تعصب شدید سے شدید تر ہو گیا، جب وہ ساری دنیا پر چھا گئے تھے اور جب تہذیب کی تمام کنجیاں ان کے ہاتھوں میں آ گئی تھیں تو یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ اس کے لیے وہ یہ عذر پیش کر سکتے ہیں کہ ہم نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا، جس پر دنیا کی تمام قومیں اور تمام نسلیں چلتی چلی آئی ہیں اور ہم میں بھی عربیت کا تعصب پیدا ہو گیا۔ ہر چند کہ یہ تعصب اسلامی تعلیمات کے بھی منافی تھا اور اس اخوت ومساوات سے بھی میل نہ کھاتا تھا، جس کی دعوت اسلام نے بڑے زور وقوت اور انتہائی وضاحت وصراحت کے ساتھ دی تھی۔ اس تعصب نے عربوں کو ان جاہلانہ رسوم سے چمٹا دیا جن کی اسلامی تعلیمات میں کہیں گنجائش نہیں اور وہ کینہ وانتقام کے لیے

Marfat.com

اپنے دل کے دروازے بند نہ کر سکے۔ اسلامی تعلیمات انتقام کے اس جاہلانہ طریق کو کسی عنوان جائز قرار نہیں دیتیں، جس کی بنا پر قبائل میں جنگ کی آگ برسوں سلگتی رہتی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ)(النحل:126)

ترجمہ: ''اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو، لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔''

اور ارشاد ہوتا ہے:

(يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى)(البقرہ:178)

ترجمہ: ''اے ایمان لانے والو! تمہارے لیے قتل کے مقدموں میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔ آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے۔ غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے اور عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو اس عورت ہی سے قصاص لیا جائے۔''

قصاص ایک حد ہے جو فرمانروا جاری کرتا ہے، مقتول کا وارث بطور خود اس کا حکم نہیں دے سکتا۔ پھر قرآن بھی لطف و مرحمت کا طرفدار ہے اور اس کی بہت سی آیتوں میں عفو و درگزر کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کے باوجود عرب انتقام جوئی کی راہ سے نہ ہٹے اور یہ عادت ان میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہی، یہاں تک کہ خانہ بدوش عربوں کی آج بھی یہی حالت ہے، بلکہ وہ متمدن عرب بھی، جو خانہ بدوشی سے قرابتی تعلق رکھتے ہیں، اپنی زندگی اور ناموس کے لیے اپنے دلوں میں انتقام کی وہی تڑپ پاتے ہیں اور اس کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ انہیں قانون اور اس کے ضابطہ قصاص میں وہ بات نظر نہیں آتی جو ان کا دل ٹھنڈا کر دے، جس سے ان کے جاہلانہ جذبات میں سکون پیدا ہو جائے۔ عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں مسلمانوں چونکہ تیغ آزمائیوں اور نصرت آفرینیوں میں مصروف تھے، اس لیے قبائلی تعصب اور اس سے پیدا ہونے والے جھگڑے ختم ہو گئے، لیکن فتوحات کے نتیجے میں جو مال غنیمت انہیں ملا اور عراق، شام اور مصر میں سکونت اختیار

Marfat.com

کر لینے والے بدویوں کی زندگی میں جو تغیر پیدا ہوا اس نے بہت سے دلوں میں مادی آسائشوں کی جوت جگادی۔

عرب زمانہ جاہلیت میں نبیذ و شراب کے رسیا تھے۔ عورت اور موسیقی پر ان کی جان جاتی تھی اور جتنی سہولت انہیں حاصل ہوتی تھی، یا زندگی کی سختیوں سے جتنے لمحات وہ بچا سکتے تھے ان میں اپنی خواہشوں کا پیٹ بھرنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ چنانچہ جب فتوحات نے ان پر آسائشوں کے دروازے کھولے اور عیش و راحت کے اسباب انہیں میسر آئے تو ان میں سے اکثر ان مرغوبات کی طرف دوڑے جو پہلے سے دل کی تہوں میں چھپے ہوئے تھے، ادھر منطق اپنا یہ فتویٰ لے کر حاضر ہوئی کہ ان مرغوبات سے اوامر و نواہی یا اللہ کی قائم کردہ حدود کی خلاف ورزی نہیں ہوتی اور اس طرح ان کے اطمینان قلب کا سامان بھی فراہم ہو گیا۔ چنانچہ شراب کے شیدائی جام و ساغر کی طرف ڈھل گئے۔ ان کے خیال میں شراب نوشی کوئی گناہ کا کام نہ تھا، اس لیے کہ نہ اللہ تعالیٰ نے شرابی کے لیے کوئی حد مقرر فرمائی، نہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کسی مے نوش کو سزا دی۔

رہا عورتوں سے دلچسپی کا مسئلہ، سو بہت سے لوگوں کی شیفتگی و فریفتگی کا پیٹ کنیزیں بھر دیتی تھیں ایران و روم کی کنیزیں، جن میں اکثر حسین و فتنہ کار ہوتی تھیں...... مال غنیمت کی طرح فوج میں تقسیم کر دی جاتی تھیں اور بازاروں میں بھی بیچنے کے لیے لائی جاتی تھیں کہ جو کوئی ان سے اپنی خواہشوں کو آسودہ کرنا چاہے انہیں خرید لے۔

ادب و تاریخ کی کتابیں شراب، جوئے اور عورتوں کے بے شمار قصوں سے بھری پڑی ہیں۔ اس سے پہلے ہم ان مسلمانوں کا قصہ بیان کر چکے ہیں جنہوں نے شام میں شراب پی تھی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس کے متعلق ان سے پوچھا، انہوں نے انکار تو نہ کیا لیکن از راہ تاویل کہنے لگے: ''ہمیں اختیار دیا گیا ہے اس لیے ہم نے پی ہے۔ اللہ نے کہا کہ کیا تم اس سے باز رہو گے، لیکن اس کی قطعی ممانعت نہیں کی!'' اسی طرح ہم حضرت عبدالرحمٰن بن عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی لکھ چکے ہیں کہ انہوں نے مصر میں شراب پی اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس گئے کہ وہ ان پر حد جاری کریں۔ ان لوگوں کا قصہ بھی آپ پڑھ چکے ہیں، جنہیں ایک رات حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مدینے کے باہر شراب پیتے دیکھا تھا اور صبح جب ان میں سے ایک شخص سے اس کے متعلق سوال کیا تھا تو

Marfat.com

اس نے جواب میں کہا تھا: ''کیا تمہارے پروردگار نے تمہیں تجسس سے منع نہیں کیا؟'' یہ مثالیں ہم نے موقع موقع سے بیان کی ہیں، لیکن اس کے باوجود ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ شراب کی تحریم اور اس کی سزا میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شدت کے باوجود اس زمانے میں مسلمانوں کے بعض طبقات میں مے نوشی کا رواج تھا۔

عورتوں کے متعلق جو قصے بیان کیے گئے ہیں وہ بہت مشہور اور ان میں سے بعض بڑی بڑی شخصیتوں سے منسوب ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حسین کنیزوں کا انتخاب، اس دور میں، ایک عام بات تھی جس سے کسی کو انکار ہوتا تھا، نہ معاشرہ اسے قابل ملامت سمجھتا تھا۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور اسی مرتبے کے بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایران وروم کی کنیزیں اپنے لیے پسند فرمائیں، جن میں سے بعض کے ہاں اولاد ہوئی اور بعض لاولد رہیں۔ صاحب اغانی کی روایت ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ، لیلیٰ بنت جودی غسانی کے والہ وشیدا ہو گئے۔ انہوں نے اس فتنہ کار حسینہ کو ایک رات بیت المقدس میں دیکھا تھا کہ وہ کنیزوں اور دوسری عورتوں کے جھرمٹ میں چلی جا رہی ہے جو ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے ہیں۔ ان میں سے جب کسی کو ٹھوکر لگتی ہے تو اس کی زبان سے بے ساختہ ''اے بنت جودی!'' نکل جاتا ہے اور جب کوئی قسم کھاتی ہے تو بنت جودی کی قسم کھاتی ہے۔ لیلیٰ دمشق میں مقیم تھی، جب مسلمانوں نے اسے فتح کیا تو لیلیٰ کو گرفتار کر کے ایک کنیز کی حیثیت سے حضرت عبدالرحمن کے حصے میں لگا دیا۔ وہ اسے مدینہ لے آئے اور انتہائی شیفتگی کے ساتھ اسے رکھا، لوگوں میں ان کی محبت کا چرچا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ حضرت عبدالرحمن کی ہمشیرہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے بات کی اور لوگوں کے چرچے ان کے سامنے دہرائے۔ حضرت عبدالرحمن نے اس کے جواب میں صرف اتنا کہا: ''ہمشیرہ صاحبہ! مجھے معاف کر دیجیے! بخدا! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی بتیسی نہیں انار کے دانے ہیں!''

اول اول لیلیٰ نے بھی محبت کا جواب محبت اور فریفتگی کا جواب فریفتگی سے دیا اور اپنے آپ کو اس گھر کی ملکہ سمجھتی رہی، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اپنے رشتہ داروں کی محبت اسے بے چین کرنے لگی اور ان لوگوں میں جو شاہانہ اقتدار اسے حاصل تھا وہ رہ رہ کے اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ اس میں تعجب کی کوئی بات بھی نہ تھی! بھلا مدینے کی زندگی کو دمشق کے اس شاہی محل کی

Marfat.com

زندگی سے کیا تعلق تھا جو نظر فریب باغوں اور پھل پھلواریوں میں گزرتی تھی اور بھلا کہاں وہ سیدھی سادی زندگی جو مدینے میں حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے ساتھ بسر ہو رہی تھی اور کہاں وہ نعمت و آسودگی سے بھرپور زندگی، جو وہ اپنے باپ کے محل میں گزار رہی تھی! وہاں جب وہ کسی کام کے لیے اُٹھتی تھی تو اس کے پاؤں تلے فرش بچھایا جاتا تھا اور اس کے سامنے سونے کے دوانار ڈالے جاتے تھے جن سے وہ رستے میں کھیلتی جاتی تھی۔ دمشق میں اس کے پاس اتنی لونڈیاں تھیں کہ ان کا صحیح شمار مشکل تھا......لیکن......مدینے میں وہ خود لونڈی تھی، چاہے اسے اپنے مالک کے دل پر کتنا ہی اختیار واقتدار کیوں نہ حاصل ہو؟ رفتہ رفتہ اس کی بے چینی بڑھ گئی۔ ایک دن حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اس کے پاس سے اُٹھ کر گئے اور تھوڑی دیر کے بعد جو واپس آ کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پوچھا: ''کیوں رو رہی ہو؟'' لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چندے یہی حالت رہی۔ آخر ایک دن حضرت عبدالرحمٰن نے اس سے کہا: ''منہ سے تو کچھ بولو! جو تم چاہو گی ہو جائے گا۔ کہو تو میں تمہیں آزاد کر کے تم سے شادی کر لوں؟ اور کہو تو تمہارے رشتے داروں کے پاس بھیج دوں، یا پھر تمہیں مسلمانوں کو واپس کر دوں؟''

لیکن اس نے تمام باتوں سے انکار کر دیا اور جب حضرت عبدالرحمٰن نے باصرار رونے کا سبب پوچھا تو وہ بولی: ''بادشاہ اپنے برے دنوں کو رو رہا ہے!'' اس فقرے نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے دل کے تاروں کو جھنجوڑ ڈالا۔ لیلیٰ کی یہ بیزاری اور حسن انکار دیکھ کر ان کا دل بجھ گیا اور انہوں نے اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی بے رخی نے لیلیٰ کے درد والم میں اور اضافہ کر دیا۔ وہ بیمار پڑ گئی۔ چہرے کی رنگت جھلس گئی، آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی اور حسن وشباب کی ساری رعنائی جاتی رہی۔ حضرت عبدالرحمٰن نے اسے اپنی بے پروائی و بدسلوکی سے تھکا دیا اور اس قیدی ملکہ کی بدبختی اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس پر رحم آ گیا۔ انہوں نے اپنے بھائی سے فرمایا: ''عبدالرحمٰن! تم نے لیلیٰ سے محبت کی تو حد سے زیادہ اور نفرت کی تو حد سے زیادہ۔ یا تو اس کے ساتھ انصاف کرو یا اسے اس کے رشتے داروں کے پاس پہنچا دو!'' حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اس کی واپسی کا انتظام کر دیا اور وہ دل گرفتہ و دل شکستہ اپنے رشتہ داروں کے پاس چلی گئی، جہاں اس نے اپنی باقی عمر زندگی کی بہترین نعمت سے محروم ہو کر بسر کر دی۔

Marfat.com

حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کا یہ قصہ اپنی نوعیت کا تنہا قصہ نہیں ہے۔ ادب و تاریخ کی کتابوں میں اس قسم کے جتنے نثری قصے ملتے ہیں ان سب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب اسلام کے بعد بھی عورتوں کے دام محبت میں اسیر رہے۔ جنگی قیدیوں میں جو لونڈیاں آتی تھیں انہوں نے ان کے اس شوق وشغف میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ حضرت عبدالرحمن اور ان کی ہم مرتبہ شخصیتوں کے یہ قصے مدینے کے ہیں۔ کوفہ، بصرہ، دمشق، حمص، فسطاط اور اسکندریہ کا اندازہ آپ خود کر لیجیے۔

عورت، شراب اور جاہلانہ مرغوبات سے عربوں کو جو دلچسپی تھی، اس کی توضیح وتفسیر عام طور پر یہ کی گئی ہے کہ وہ مسلسل جنگ و پیکار میں مصروف رہتے تھے، جہاں کسی میدان سے آئے دوسرے میدان کی تیاری کرنے لگے۔ بصرہ، کوفہ اور ان کے علاوہ عراق وشام کے دوسرے شہر اسلامی چھاؤنیاں تھے، جہاں جنگ سے آنے والے اور جنگ پر جانے کی تیاریاں کرنے والے سپاہی جمع رہتے تھے اور آج بھی، جب تاریخ ہمارے سامنے گزشتہ زمانے کے واقعات دہراتی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ اکثر طبیعتوں میں نفسانی جذبات کو بھڑکاتی اور انہیں ان جذبات کی تسکین وتشفی پر مجبور کرتی ہے۔ اس میں یہ راز ہے کہ اہل فوج جب لڑائی سے فارغ ہوتے ہیں تو انہیں خالی وقت گزارنے کے لیے اس کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا کہ ازراہ فخر اپنے کارنامے بیان کریں اور اپنے ان ساتھیوں کے گن گائیں جو معرکہ کارزار میں داد شجاعت دیتے ہوئے کام آ گئے۔ پھر اس زمانے میں میدان اتنا وقت نہ لیتے تھے، جتنا ہمارے زمانے میں لیتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قادسیہ کا میدان تین دن اور نہاوند کا معرکہ اتنے ہی یا اس سے بھی کم وقت میں سر ہو گیا تھا۔ لڑائی صرف اسی وقت طول کھینچتی تھی، جب مسلمان دمشق، قیساریہ، بابلیون یا اسکندریہ جیسے مستحکم شہروں کا محاصرہ کرتے تھے۔ لشکر جب کبھی فتح پاتا اور مال غنیمت وغیرہ لے کر پلٹتا تو اس میں مفتوحہ شہر کی عورتیں اور لڑکیاں بھی ہوتی تھیں، جنگ میں عموماً دیکھا گیا ہے کہ مفتوحہ علاقے میں کچھ دن کے لیے فوج کو اذن عام دے دیا جاتا اور اس کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ دی جاتی تھیں۔ وہ خوب کھاتی پیتی تھی اور جس چیز کو اس کا جی چاہتا، بے کھٹکے تصرف میں لاتی تھی۔ چنانچہ فتح کے بعد جو سپاہی عورتیں پکڑ کے لاتے تھے انہیں اپنی کنیزوں سے لطف اندوز ہونے کا حق پہنچتا تھا، لیکن جس کسی کو اپنے حصے کی کنیز خوش نہ آتی، وہ لطف وراحت کے لیے ترستا پھڑکتا رہتا اور واپسی پر اپنی دلچسپی کا سامان

Marfat.com

تلاش کرتا تھا۔ فوج کا ہر زمانے میں یہی حال رہا ہے۔ چنانچہ آج بھی اس کا یہی حال ہے اور اسی سے ان بعض واقعات کی توجیہ وتفسیر بھی ہوتی ہے جو اسلامی فتوحات کے زمانے میں پیش آئے اور جن کا ذکر ادب وتاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔

لیکن یہ توجیہ وتفسیر اس راز کو بے نقاب نہیں کرتی کہ جنگ وفتح کا دور گزر جانے کے بعد عربوں کو عیش کوشیوں سے دلچسپی کیوں رہی؟ چنانچہ بنوامیہ، بنوعباس اور ان کے عہد کے زوال میں مسلمانوں کی عورت اور شراب سے گرویدگی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی اور نہ صرف یہ کہ رائے عامہ نے ایسے لوگوں کے خلاف کسی شدید ناراضگی کا اظہار نہیں کیا، بلکہ لوگ ان کے اور ان کی عشرت آرائیوں کے قصے مزے لے لے کر سنتے رہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ''صراحئ مئے ناب'' اور ''سفینۂ غزل'' سے جو شغف عربی شاعری میں ظاہر کیا گیا ہے، دنیا کی کسی اور شاعری میں ظاہر کیا گیا ہو؟ اسی طرح میرا خیال ہے کہ ظہور اسلام کے بعد کی شاعری نے عہد جاہلیت کی شاعری سے جتنا استفادہ عورت اور شراب کے موضوع پر کیا ہے کسی اور موضوع پر نہیں کیا۔ چونکہ خواہشوں کو ابھارنا اور ان کی تسکین وتشفی کا زیادہ سے زیادہ سامان فراہم کرنا ہی رزم وپیکار کی فطرت ہے، اس لیے ان سے محض فطری خواہشات ہی بیدار ہوتی ہیں، کوئی بلند جذبہ وجود میں نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ عربی فتوحات بعض فطرتوں میں جاہلانہ خواہشوں کو ہوا دینے سے آگے نہ بڑھیں اور ان خواہشوں کی روک تھام کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو مستحکم اور مضبوط موقف اختیار کیا اس کا ذکر ہم آگے چل کے کریں گے۔

لیکن یہ مؤقف عربوں کی ان گوناگوں دلچسپیوں کے مقابلے میں اختیار نہیں کیا گیا جنہیں اسلام نے جائز قرار دیا تھا۔ ان دلچسپیوں میں غنا کو سب پر تقدم حاصل تھا کہ غنا اور سماع سے جتنی شیفتگی عربوں کو تھی، دنیا کی بہت کم قوموں میں اس کی مثال ملتی ہے بلکہ گانا عربوں کی ضروریات زندگی میں شامل تھا۔ حدی خوانی انہیں اور ان کے اونٹوں کو مسافت کی دشواری بھلا دیتی اور اس کی مشقت ان پر آسان کر دیتی تھی۔ راتوں کے لمبے سفر کے بعد جب وہ ستانے کے لیے کہیں پڑاؤ ڈالتے تھے تو یہی چیز ان کی تسلی کا کچھ سامان ہوتی تھی۔ خاص طور پر جب کوئی ایسا خوش گلو نغمہ کار شریک سفر ہوتا جس کے نغمے ان کے دلوں میں اپنے اہل وعیال کا شوق یا انتقام کی خواہش یا حصول شرف کی لگن تیز کر دیتے تھے۔ اس کا رواج عرب کے بادیہ نشینوں اور شہریوں، دونوں میں

تھا۔ ایک قافلہ کے ساتھ جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس شامل تھے، چرواہوں کی ایک ٹولی بھی روانہ ہوئی۔ رباح فہری، جو نغمہ گری اور حدی خوانی میں بڑی مہارت رکھتا تھا، اس قافلے کے ہمراہ تھا۔ شام ہوئی تو چرواہوں نے رباح سے حدی خوانی کی فرمائش کی۔ رباح نے انکار کے لہجے میں کہا: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہوتے ہوئے؟''

وہ بولے: ''تم شروع کرو! اگر وہ منع کریں، تو خاموش ہو جانا!'' رباح نے حدی خوانی شروع کی، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوئی اعتراض نہ فرمایا، بلکہ سن کر خوش ہوئے اور جب صبح ہونے کو آئی تو رباح سے کہا: ''بس! یہ ذکر الٰہی کا وقت ہے!'' دوسری رات چرواہوں نے رباح سے نصب ① کی فرمائش کی اور جب اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خوف سے انکار کیا تو بولے: ''تم شروع کرو۔ اگر وہ منع کریں تو خاموش ہو جانا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نصب بھی صبح تک سنتے رہے اس کے بعد رباح سے فرمایا: ''بس! یہ ذکر الٰہی کا وقت ہے!'' تیسری رات انہوں نے رامش گروں کے گانے کی فرمائش کی، لیکن رباح نے ابھی گانا شروع ہی کیا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلند آواز سے فرمایا: ''بس کرو! یہ دلوں میں نفرت پیدا کرتا ہے!'' ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حج کے لیے تشریف لے گئے۔ ہمراہیوں نے خوات بن جبیر سے اصرار کیا کہ وہ ضرار کے شعر گا کر سنائیں، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نہیں! ان سے خود ان کے جگر پارے سنو!'' خوات نے اپنے اشعار گا کر سنائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ محظوظ ہوتے رہے، یہاں تک کہ صبح ہوئی تو فرمایا: ''خوات! اب گانا ختم کرو! صبح ہوئی!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ کسی قافلے کے ساتھ تھے کہ یہ شعر ترنم سے پڑھا:

وما حملت من ناقة فوق رحلها
ابرّ و اوفٰی ذمة من محمد

ترجمہ: ''کسی اونٹنی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ راست باز اور وعدہ پورا کرنے والے کو اپنے کجاوے پر نہیں بٹھایا۔''

قافلے والے سننے کے لیے چاروں طرف سے دوڑ دوڑ کر آنے لگے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جو انہیں جمع ہوتے دیکھا تو قرآن پڑھنا شروع کر دیا اور وہ منتشر ہو گئے۔ دونوں طرف سے پھر

① عربوں کا حدی سے ملتا جلتا ایک گانا۔ مترجم

Marfat.com

یہی ہوا۔اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلند آواز سے فرمایا: ”خاکی انڈو! جب میں نے شیطانی ساز چھیڑے تو تم چاروں طرف سے آدھمکے، لیکن جب کتاب اللہ کی آیات پڑھیں تو بھاگ گئے۔“ رباح نے حدی اور نصب سننے کے بعد انہیں رامش گروں کے گانے سے روکنا اور لوگوں پر غضب ناک ہونا، جولحن فاروقی سے لطف اندوز ہونے کے لیے جمع ہوئے تھے، لیکن جب قرآن کی تلاوت کی گئی تو منتشر ہو گئے، یہ دونوں باتیں اس کا ثبوت ہیں کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سماع سے دلچسپی رکھتے تھے، لیکن پسند اس شعر کو فرماتے تھے جس میں گانے والا ان معانی کو دل نشیں پیرائے میں بیان کریں، جن سے شریفانہ جذبات بیدار ہوتے ہیں نہ کہ وہ گانا جو اسے ذلت و پستی کے گڑھے میں دھکیل دے، جہاں نفسانی کمزوریاں اور شہوانی محرکات طرح طرح کے روپ دھار کے دلوں کو ورغلاتے ہیں۔

ہر چند کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شعر کو پسند فرماتے تھے لیکن قرآن پاک کی تلاوت وسماع کو اس پر ترجیح دیتے تھے، اس لیے تعجب کیوں؟ اگر قرآن کی آیات سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ ٹھنڈا پڑ جاتا تھا، اور اکثر وبیشتر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے کہ یہ ان کے ایمان کی گہرائی اور ان کے اسلام کی سچائی کی دلیل تھی اور حیرت کس لیے اگر نفس کے غلط احکام کے سامنے جھک جانا، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے نزدیک ایک ایسی برائی تھی جس کی بنا پر انسان کو عیب دار قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو چیزیں نفس میں کمزوری کے فتنوں کو جگاتی اور شہوانی وسوسوں کے تار ہلاتی ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اس لیے ممنوع قرار دیا تھا کہ وہ جماعتی زندگی پر ان کے بُرے اثرات کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ اور جس طرح ایک حاکم پر حکومت کے نظام اور اس کی سلامتی کی ذمہ داری ہوتی ہے بالکل اسی طرح اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ جماعت کی زندگی اس کی قوت، جوش اور اس زقند کی حفاظت کرے جو وہ بلند اغرض کی طرف لگاتی ہے، اس لیے کہ یہ قوت، یہ جوش اور یہ زقند سب کے سب نظم وسلامتی کے ذرائع ہیں۔ قول کا عمل کے بغیر اس زندگی میں کوئی اثر نہیں۔ ہجو اور مدح عہد جاہلیت میں عربی شاعری کا موضوع تھے۔ زمانہ اسلام میں رہے اور آج تک ہیں بعض شعراء اپنی ہجو ومدح میں اتنا غلو برتتے تھے کہ دلوں میں سوئے ہوئے فتنے بیدار ہو جاتے تھے۔ اس بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان مبالغہ پسند شعراء سے بہ شدت باز پرس فرماتے تھے اور ان کی اس شدید باز پرس نے گمراہیوں کی اشاعت کا سد باب کر دیا تھا۔

Marfat.com

اس سلسلے میں بہت سی روایتیں ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حطیہ کو، جو لوگوں کی مدح وذم میں غلط باتیں نظم کرتا تھا، بے ہودہ گوئی کے جرم میں قید کرلیا اور اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک اس نے اپنی یاوہ گوئی سے توبہ نہ کرلی۔ رہائی کے بعد جب وہ چلنے لگا تو اسے آواز دی اور ازراہ تاکید اس سے فرمایا: ''دیکھو، حطیہ! اگر کوئی قرشی نوجوان تمہارے ساتھ عزت و تکریم سے پیش آیا، تم سے شعر سنانے کی فرمائش کی اور لگے تم لوگوں کی آبروؤں سے کھیلنے تو یوں سمجھنا جیسے میں تمہارے ساتھ ہوں!'' حطیہ نے قسم کھائی کہ وہ ایسا کبھی نہ کرے گا۔ زید بن اسلم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، اس کے بعد میں نے حطیہ کو عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس دیکھا۔ انہوں نے حطیہ کی بڑی آؤ بھگت کی اور کہا: ''حطیہ! کچھ سناؤ؟'' حطیہ نے اپنا کلام سنانا شروع کیا۔ میں نے کہا، ''حطیہ! تمہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول یاد نہیں رہا؟'' حطیہ سہم گیا اور بولا: ''اللہ ان پر رحم کرے، اگر وہ زندہ ہوتے تو ہم ایسا کبھی نہ کرتے!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حطیہ کو زبرقان بن بدر کی ہجو کے جرم میں قید کیا تھا، جس کا ایک شعر یہ ہے:

دع المکارم لا ترحل لبغیتھا

واقعد فانک انت الطاعم الکاسی

ترجمہ: ''فضائل اخلاق کو چھوڑ اور ان کے درپے نہ ہو۔ اطمینان سے بیٹھ کہ تیرے کھلانے پلانے والے بہت ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شعر سے شغف تھا۔ وہ شعر پڑھتے، مثال میں شعر پیش کرتے اور لوگوں کو شعر پڑھنے کا شوق دلاتے تھے۔ جب زبرقان نے ان سے حطیہ کی شکایت کی تو حضرت عمرؓ نے شبہ کی بنا پر سزا دینے میں تکلف کیا اور یہ شعر سن کر فرمایا: ''ہجو تو اس شعر میں نظر نہیں آتی، البتہ خفگی پائی جاتی ہے۔'' اس کے بعد حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے پوچھا جو شاعری کے فن سے باخبر تھے اور جب انہوں نے شہادت دی کہ اس شعر میں واقعی ہجو کا پہلو ہے تو حطیہ کو قید کرلیا اور دھمکی دی کہ آئندہ ایسا نہ کرے، جس کا اثر یہ ہوا کہ حطیہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت سے پہلے کسی کی ہجو نہ کی۔ حضرت عمر نے اس شاعر کو بھی قید میں ڈلوا دیا تھا جس نے بنو عجلان کی ہجو کی تھی۔ اس کا شعر ہے:

اولئک اولاد الھجین واسرۃ الـه

ملئیم وزھط العاجز المتذلل

ترجمہ: ''یہ لوگ کمینوں کی اولاد، لعنتیوں کا خاندان اور عاجزوں اور ذلیلوں کی ٹولی ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے قید کیا، مار پٹوائی اور تہدید کی کہ اگر اس نے پھر ایسا کیا تو دگنی سزا دی جائے گی۔ شعر و شاعری سے شغف کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہجوگو شعراء کو سزائیں دیں، انہیں قید کیا اور مارا، ڈرایا اور دھمکایا اس کی وجہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ علم تھا کہ انسان کی اجتماعی زندگی میں بات کا اثر ہر چیز کے اثر سے زیادہ گہرا ہوتا ہے، چنانچہ لوگ بچپن سے آخر عمر تک اس سے متاثر ہوتے ہیں اور جو باتیں وہ سیکھتے ہیں انہیں کے زیر اثر ان کے افعال و اعمال کا صدور ہوتا ہے۔ ہمارے عقائد و عادات، ہمارا علم و فکر اور ہمارے جذبات و عواطف یہ سب کے سب ان باتوں سے اثر پذیر ہوتے ہیں، جو ہم بچپن سے اپنے رشتہ داروں، اپنے استادوں اور دوستوں سے سنتے اور اپنے پیشرووں کی کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ ہجو و مدح جاہلیت کے چلتے ہوئے سکے تھے، بلکہ ان کا تعلق ان بنیادی محرکات سے تھا جن سے اس دور کی اجتماعی زندگی تشکیل پاتی تھی۔ پھر جب کوئی قبیلہ کسی دوسرے قبیلے کے خلاف چڑھائی کرتا تھا تو ہجو و مدح سے جنگ اور پروپیگنڈے کے نعروں کا کام لیا جاتا تھا اور چونکہ جنگ و پیکار اس زمانے کی عام زندگی تھی۔ اس لیے شعراء ایک قبیلے کی تعریفوں کے پل باندھتے اور دوسرے قبیلے پر کیچڑ اچھالتے تھے، لیکن اب کہ عرب ایک امت ہو گئے تھے، یہ امت اپنے دشمن کے خلاف ایک صف میں کھڑی تھی۔ ضروری تھا کہ امت کی اجتماعی زندگی اس جاہلانہ عادت سے پاک ہو جائے اور امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا فرض تھا کہ وہ اس مقصد کے لیے اپنی تمام مساعی صرف کر دیں۔

جاہلانہ عادت کا ازالہ تیغ آزمائی و نصرت آفرینی کے زمانے میں اس لیے اور بھی ضروری تھا کہ دل آپس میں مل جائیں، قوتیں متحد ہو جائیں اور ساری امت ایک ایسی وحدت کی طرف رخ کرے، جس کے بغیر نہ دشمن کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے ناپاک ارادوں کا خاتمہ! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ سیاست، جو انہوں نے قبائلی نعرے کو ختم کرنے کے لیے اختیار فرمائی، توفیق الٰہی کا نتیجہ تھی، بلکہ وہ سرتا سر راستی، حکمت اور دور اندیشی تھی۔ یہ میں کہہ رہا ہوں، حالانکہ رائے اور اس کے اظہار کی آزادی پر میں سب سے شدید ایمان رکھتا ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ تحریر و تقریر کے علاوہ اور بھی جتنے وسائل انسانیت نے آج تک دریافت کیے ہیں۔ یا آگے چل کر دریافت کرے گی، انسان کو وہ سب کے سب اپنی رائے کے اظہار کے لے استعمال کرنے چاہئیں۔ اس کی وجہ

Marfat.com

یہ ہے کہ رائے ایک الگ چیز ہے اور ہجو واتہام ایک الگ چیز۔ رائے ایک فکر یا مجموعہ افکار ہے جو عقل یا وجدان سے صادر ہوتی ہے اور اسے پیش کرنے سے صاحب رائے کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ جس ماحول میں لوگ زندگی بسر کر رہے ہیں اس کی شدت وسختی دور کی جائے، تا کہ معاشرے میں زیادہ سے زیادہ خوش حالی پیدا ہو سکے۔ اس کوشش میں کبھی تو صاحب رائے سے چوک ہو جاتی ہے اور کبھی وہ بالکل صحیح نتیجے پر پہنچتا ہے۔ چنانچہ آپ کے نزدیک اگر رائے میں کوئی غلطی ہے تو آپ اس سے اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ صاحب رائے کی مخالفت پر اتر آئیں تاوقتیکہ یہ ثابت نہ کر دیں کہ اس نے رائے قائم کرنے میں بدنیتی سے کام لیا اور اس رائے سے اس کی غرض فلاح عام یا عوام کا مشترکہ مفاد نہیں ہے۔ پھر اگر آپ یہ ثابت کر بھی دیں تو بھی آپ کو یہ سزاوار نہیں ہے کہ آپ صاحب رائے کی ذاتی زندگی سے بحث کریں جس کی قائم کردہ رائے یا اس رائے کو جامہ عمل پہنانے سے کوئی تعلق ہے نہ اس ثبوت ہی سے کوئی واسطہ جو آپ نے صاحب رائے کی بدنیتی کے خلاف فراہم کیا ہے۔

صرف انہیں حدود میں رہ کر آپ صاحب رائے کے خلاف...... جتنی شدت وسختی سے چاہیں...... جنگ کر سکتے ہیں۔ اس کے سوا اس کی زندگی کے جس پہلو سے بحث کی جائے گی وہ تہمت ہوگی۔ اور یہی ہجو و بدگوئی ہے، جسے نہ قانون سند جواز دیتا ہے نہ حاکم مباح سمجھ سکتا ہے، بلکہ حاکم کا فرض تو یہ ہے کہ ہجو و بدگوئی کرنے والے کو اتنی شدید جسمانی اور مالی سزا دے کہ مفکرین و مصالحین کے فکر و عمل کی آزادی اس کی یاوہ گوئی سے محفوظ ہو جائے اس حد تک بے لاگ تنقید ان مفکرین و مصلحین کو باز رکھتی ہے کہ وہ رائے میں حق اور عمل میں عمومی فلاح سے تجاوز نہ کریں۔ حضرت ابن خطاب رضی اللہ عنہ نے ہجو اور ہجو گویوں کے خلاف جنگ کرنے میں جس سیاست کو اپنایا اس نے کینہ وانتقام اور اختلاف واشتعال کی آگ بجھا دی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت آپ حطیئہ کی اس بات میں دیکھ آئے ہیں کہ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد اس نے اپنے ہجو یہ اشعار پڑھتے وقت کہی تھی: "اللہ ان پر رحم کرے! اگر وہ زندہ ہوتے تو ہم ایسا کبھی نہ کرتے۔"

لیکن عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہجو گوئی کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا اور وہ اسلامی معاشرے کی اجتماعی زندگی کا معمول بن گیا۔ مگر اب وہ جتنا کھانے کمانے یا خواہشوں کا پیٹ بھرنے کا ذریعہ تھا، اتنا قبائل کی جنگ و پیکار میں پروپیگنڈہ کا وسیلہ نہ تھی۔ یہی حال ہجو گوئی کے علاوہ اسلام سے

Marfat.com

پہلے کی اجتماعی زندگی کے دوسرے معمولات کا تھا۔ اور اس میں حیرت کی کوئی بات بھی نہیں ہے اس لئے کہ ان بہت سے عربوں کے دل میں، جو اسلام قبول کر چکے تھے، جاہلانہ جذبات باقی رہ گئے تھے جن پر وہ غالب نہ آسکے، بلکہ شاید انہوں نے خود ان پر غالب آنا نہ چاہا۔ جناب احمد امین بک نے اس مفہوم کو اپنی کتاب "فجر الاسلام" میں بڑے دل نشیں اسلوب میں بیان فرمایا ہے:

"سچ یہ ہے کہ اسلام اور جاہلیت کے نفسیات و مسائل کا باہمی اختلاف بڑا شدید اور بہت طویل تھا۔ اسلام نے تمام عربوں کو ایک رنگ میں نہ رنگا بلکہ جو لوگ اس سے کما حقہ متاثر ہوئے وہ مہاجرین وانصار کے سابقون اولون تھے۔ دین ان بزرگوں کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا تھا۔ وہ دین سے خلوص رکھتے تھے اور اس کے احکام نافذ کرتے تھے۔ لیکن جو لوگ فتح مکہ کے دن یا اس کے بعد اسلام لائے اور جنہوں نے اس وقت تک کفر وعناد کا دامن نہ چھوڑا جب تک انہیں یہ یقین نہ ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کامیاب وکامران ہو گئے ہیں اور اب ان (مشرکین) کے لیے اسلام کے سوا کہیں جائے قرار نہیں ہے۔ ان میں سے بہت سوں کا دین کمزور تھا۔

﴿لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ﴾ (الحدید:10)

ترجمہ: "جو لوگ فتح مکہ سے پہلے (فی سبیل اللہ) خرچ کر چکے اور لڑ چکے، برابر نہیں، وہ لوگ درجے میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنہوں نے (فتح مکہ) کے بعد میں خرچ کیا اور لڑے۔ اور یوں اللہ تعالیٰ نے بھلائی (یعنی ثواب) کا وعدہ سب سے کر رکھا ہے۔"

مؤرخین نے مرتبے کے لحاظ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی بالکل ٹھیک درجہ بندی کی ہے۔ ان میں سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارہ طبقے قرار دیتے ہیں، جن میں سب سے آخری طبقہ ان لوگوں کا ہے جو فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دین کے اصول وقواعد کو تمام مسلمانوں سے زیادہ سمجھتے تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ان اصولوں کے قیام اور ان قواعد کے استحکام کے ذرائع کیا ہیں؟ اسی لیے وہ اسلامی معاشرے کو ان تمام جاہلانہ مرغوبات سے پاک کر دینا چاہتے تھے، جنہیں

Marfat.com

اسلام برداشت نہیں کرتا تھا اور ان کی یہ انتہائی کوشش تھی کہ اسلامی معاشرے کو اس کی زندگی کے تمام مظاہرے میں نئے دین کے رنگ سے نکھار دیں۔ اسلام اپنی اصل وفطرت کے اعتبار سے شہنشاہی ہے اور اس کی یہ شہنشاہی پہلے اور ہر چیز سے پہلے روحانی ہے۔ اسی لیے وہ دلوں کو اخوت ومساوات کے رشتوں میں مربوط کرتا ہے: ''تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ نہ چاہے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

اس لحاظ سے جو کوئی اس دین کے اصولوں کا امانت دار ہے، اسے لامحالہ ان اصولوں کو ہر اس چیز سے محفوظ رکھنا پڑے گا جو اس دین کے مقاصد کے خلاف ہو، یا اس کی راہ میں روک بنے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس معاملے میں انتہائی سخت اور حد درجہ بے باک تھے، تردد وتکلف اور نرمی وسہل انگاری سے مطلق کام نہ لیتے۔ وہ اللہ کی حدود قائم کرتے اور اہل الرائے کے مشورے سے وہ سزائیں تجویز فرماتے جو اسلام کے مقاصد سے اتفاق رکھتی تھیں۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ شام اور دوسرے مقامات پر جن لوگوں نے شراب پی تھی، ان کے ساتھ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کیا سلوک کیا، روایت ہے کہ انہوں نے شرابی کے بارے میں مشورہ چاہا۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میری رائے میں اسے اسی درّے لگانے چاہئیں، جو تہمت کی سزا ہے اس لیے کہ جب انسان شراب پیتا ہے، مخمور ہو جاتا ہے اور جب مخمور ہو جاتا ہے تو ہذیان بکتا ہے اور جب ہذیان بکتا ہے، تہمت لگاتا ہے۔'' چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شرابی کے اسی درّے لگوائے اور ان کا یہ عمل ان کے عہد میں اور اس کے بعد بالاتفاق شراب نوشی کی سزا کے سلسلے میں حجت قرار دیا گیا۔ ①

آئندہ باب میں جب ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد پر گفتگو کریں گے تو دیکھیں گے کہ وہ اسلامی زندگی کو ان اصولوں کی صحیح اساس پر استوار کرنے کے کتنے خواہشمند تھے جو وحی کے ذریعے نازل ہوئے تھے اور جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نے قائم کیا تھا۔ ہم نے جو کچھ اس باب میں بیان کیا، آپ نے پڑھا اور دیکھ لیا کہ اجتماعی زندگی عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں جن مختلف عوامل کے زیر اثر ترقی پذیر ہوئی ان میں سے اکثر عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود نہ تھے، اور بعض عہد صدیقی رضی اللہ عنہ میں

① بعض روایات میں ہے کہ شرابی کی حد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری فرمائی تھی۔ محمد بک خضری مرحوم نے اپنی کتاب ''تاریخ التشریع الاسلامی'' میں ان حدود کا ذکر کیا ہے جو قرآن میں آئی ہیں اور وہ قصاص، زنا، تہمت، چوری اور رہزنی کی حدود ہیں۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ جن حدود کا ہم نے ذکر کیا ہے، ان کے سوا قرآن میں اور سزائیں نہیں ہیں۔ چھٹی حد سنت سے ظاہر ہوتی ہے اور وہ شرابی کی حد ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری فرمائی تھی۔

Marfat.com

بھی اپنا اثر ظاہر نہ کر سکے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات سے ذرا پہلے، جب عربوں نے اپنے اسلام کا اعلان کیا تھا، جاہلانہ رسوم کچھ تو فنا ہو گئی تھیں اور کچھ حالات کے تحت دب گئی تھیں، جو بعد کو آہستہ آہستہ ابھرنی شروع ہو گئیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان رسموں کے بیج ہنوز زندہ تھے۔ اور ان میں از سر نو پنپنے اور بالیدگی حاصل کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ پھر جن لوگوں نے اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار کر لی تھی، اسلام نے ان کے دلوں میں جدید مراسم وعقائد کی جوت جگائی، جس سے قبل ازیں وہ ناآشنا تھے اور جو مسلمان مفتوحہ ممالک میں جا کر آباد ہو گئے تھے، وہاں انہوں نے ایک نئی تہذیب پائی۔ جس کے مظاہر ان کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ چنانچہ جب وہ ان ملکوں کے باشندوں سے گھلے ملے تو اس تہذیب کا رنگ انہوں نے بڑی خوشی اور بڑے چاؤ سے قبول کر لیا۔

اس ترقی وتبدیلی میں اقتصادی محرک کا اثر دوسرے تمام محرکات کے اثر سے کچھ کم نہ تھا۔ فتوحات نے بہت سے مسلمانوں کو آسودہ حال کر دیا تھا اور زندگی کی بہت سی راحتیں اور سہولتیں انہیں میسر آ گئی تھیں چنانچہ وہ ان سے جی بھر کے لذت یاب ہونے کے لیے ان کی طرف دوڑے۔ جو مسلمان عراق، شام اور مصر چلے گئے تھے وہ زندگی کی آسائشوں کی طرف اس لیے زیادہ ڈھل گئے کہ تہذیب وشائستگی اور سرسبزی وشادابی سے جو رنگارنگ نعمتیں میسر آتی ہیں، بادیہ نشینی میں ممکن نہیں۔ اور جو لوگ جزیرۃ العرب میں رہے وہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جاری کردہ وظائف کی بدولت ان عشرت کاریوں میں کھو گئے، جو عہد جاہلیت میں ان کی متاع زندگی تھیں اور جن کی جھلکیاں ہم اس سے پہلے پیش کر چکے ہیں۔ اس تبدیلی نے عقلی زندگی میں بھی گہما گہمی پیدا کر دی، لیکن اس گہما گہمی کا اثر اس زمانے کے عربوں میں صرف اسی حد تک محدود رہا کہ جن مسائل کے متعلق کوئی وحی نازل نہ ہوئی تھی، نہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت میں پائے جاتے تھے، ان میں اجتہاد کیا گیا۔ شاید آپ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وہ بات یاد ہو گی جو انہوں نے اپنے مرض الموت میں فرمائی تھی: ''میں چاہتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ سے بھتیجی اور پھوپھی کی میراث کے بارے میں پوچھتا، کیونکہ اس کے متعلق میرے دل میں ایک کھٹک سی ہے!'' عہد فاروقی رضی اللہ عنہ اور اس کے بعد کے دور میں اجتہاد کا یہ سلسلہ جاری رہا جس کا ثمر فقہ اسلامی ہے۔

اسی طرح اس تبدیلی نے ان قوموں کی زندگی میں ایک نیا رجحان پیدا کر دیا جو مسلمانوں کے مفتوحہ ممالک میں آباد تھیں۔ اور اس رجحان کا خود عربوں کی زندگی پر بھی بڑا گہرا اثر پڑا۔ یہ

جدید رجحان عراق، شام اور ایران میں ایک خاص ڈھنگ سے نمودار ہوا، اگرچہ ان قوموں میں ان کے نسلی اختلاف کی بنا پر اس کے اثرات مختلف تھے۔ یہ اس لیے کہ عراق و شام میں عربی قبائل آباد تھے۔ ان میں سے جو قبیلے مسلمان ہو گئے وہ تو اسلامی تعلیمات کے دائرہ نفوذ میں آ ہی گئے لیکن جو اپنے دین پر قائم رہے انہوں نے بھی اس سیاسی اور اقتصادی نظام کا اثر قبول کر لیا جو اسلامی فتوحات نے قائم کیا تھا۔ لیکن ایران کا رجحان عراق و شام سے مختلف تھا اور اس اختلاف کا اثر ہمیں اس وقت محسوس ہوگا، جب ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر گفتگو کریں گے۔ اس سے پہلے میں اس اثر کا ذکر کر چکا ہوں جو اسلامی فتوحات نے اپنے ابتدائی دور میں مصر پر چھوڑا تھا۔ یہ اثر عراق، شام اور ایران کے اثر سے مختلف تھا، اس لیے کہ مصر میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی سیاست اس سیاست سے جداگانہ تھی جو عہد صدیقی رضی اللہ عنہ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عراق میں اختیار کی تھی اور فتح شام کے بعد والیان شام نے شام میں۔

مصر کی سیاسی ہیئت بھی ایران سے مختلف تھی اس لیے کہ ایران آزاد و خود مختار تھا اور مصر رومی مملکت کا ایک حصہ لیکن اس معنی کر وہ ایران سے مشابہ تھا کہ ایران کی طرح اس کے باشندے بھی نسل، زبان اور مذہب میں عربوں سے مختلف تھے۔ اس کے باوجود حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی سیاست اتنی ضعیف الاثر نہ تھی کہ وہ اہل مصر کو عربی بولنے والی ایک ''اسلامی امت'' نہ بنا سکتی۔ چنانچہ آگے چل کر مصر نے یہ حیثیت و اہمیت حاصل کر لی کہ اسے عالم اسلام کا دل اور اسلامی تہذیب کا مرکز سمجھا جانے لگا۔ بلاد عرب کی اجتماعی زندگی میں جو انقلاب ہوا، اس کا رخ متعین کرنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بڑا دخل و اثر تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اس جہت میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جو فضیلت حاصل ہے وہ ان کی سیاسی فضیلت سے کسی طرح کم نہیں۔ پھر اس انقلاب کی توجیہ و تشکیل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اثر صرف انہیں مسائل تک محدود نہیں ہے، جن کی طرف ہم نے اس باب اور اس سے پچھلے ابواب میں اشارہ کیا ہے، بلکہ اس خصوص میں مسلمانوں کے دوسرے معاملات کی طرح سب سے بڑا اثر ان

کی مجتہدانہ شخصیت کو حاصل تھا۔ اور یہی بات ہم آئندہ باب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد پر گفتگو کرتے ہوئے بیان کریں گے۔

Marfat.com

باب:24

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد

روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ؟ حضرت سلمان فارسیؓ نے جواب دیا: ''اگر آپ نے مسلمانوں کی زمین سے ایک درہم۔۔۔یا اس سے کم وبیش۔۔۔وصول کیا اور وہ صحیح جگہ صرف نہ ہوا تو آپ بادشاہ ہیں، خلیفہ نہیں!'' اس جواب سے حضرت عمر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بخدا! نہیں کہہ سکتا کہ میں خلیفہ ہوں یا بادشاہ۔ اگر بادشاہ ہوں تو یہ بہت ہی بری بات ہے! کہنے والے نے کہا: ''امیرالمؤمنین! ان دونوں میں فرق ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وہ کیا؟'' بولا ''خلیفہ ناجائز طور پر نہ کچھ لیتا ہے، نہ خرچ کرتا ہے اور الحمدللہ کہ آپ ایسے ہی ہیں۔لیکن بادشاہ زبردستی کرتا ہے۔ایک سے چھین کر دوسرے کو بخش دیتا ہے۔'' یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے۔

خلافت کی یہ تعریف وتحدید، خلافت کے اس مفہوم سے مختلف ہے جو صدر اول کے مسلمانوں کے ذہن میں تھا پہلے چار خلفاء اس لیے محمود ومحترم سمجھے جاتے تھے کہ وہ خلفائے راشدینؓ تھے اور ان کی توصیف وتحسین اس لیے کی جاتی تھی کہ وہ مسلمانوں پر رسول اللہ ﷺ کے نائب تھے۔آپ کے نقشِ قدم پر چلتے تھے، آپ ﷺ کی سنت کا اتباع کرتے تھے اور دین ودنیا کے معاملات میں آپ ہی کا طریق کار اپناتے تھے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی یہی فرماتے ہیں: ''میرے دو محترم رفیق تھے جنہوں نے ایک رستہ اختیا کیا۔اگر میں ان کی راہ سے ہٹا تو لوگ مجھ سے اختلاف کریں گے۔'' لیکن خلفائے راشدین کے بعد جو فرمانروا آئے انہوں نے شاہانہ طور طریق اختیار کیے، اس لیے وہ مسلمانوں کے امیر تھے۔رسول اللہ ﷺ اور آپ کے خلفاء کے نائب نہیں۔رسول اللہ ﷺ کو بادشاہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔آپ نے مدینے میں مسلمانوں کے معاملات کی جس طرح نگرانی فرمائی، اس کی مثال نہ عہدِ رسالت کے رومی وایرانی بادشاہوں

میں ملتی ہے، نہ مختلف قوموں اور مختلف زمانوں کے تاجداروں میں۔۔۔آپ لوگوں کے ہادی ومرشد تھے، بشیر بھی تھے اور نذیر بھی، اپنے رب کے پیام لوگوں تک پہنچاتے اور انہیں حکمت وموعظت حسنہ کے ساتھ دین قیم کی طرف بلاتے۔ مسلمانوں نے آپ کے دامن عاطفت میں پناہ لی کہ لسانِ نبوت سے کلام پاک کی آیتیں سن کر سنت نبوی سے بصیرت حاصل کر کے زیادہ سے زیادہ ہدایت اندوز ہوں۔ آپ کے خلفائے راشدین وہ ہیں جنہوں نے عوام میں حضور ﷺ کی نیابت فرمائی۔

یہ خلفاء پیغمبر نہ تھے جن پر وحی نازل ہوتی، لیکن وہ رسول ﷺ کے صحابہ تھے جو آپ کی تعلیمات کو دل میں جگہ دیتے اور آپ کے احکام کی تعمیل کرتے۔ اس کے بعد جب وہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے لوگوں کو ہدایت کی راہ پر چلاتے ہوئے ان میں آپ کے اصول ومبادی کی نشر واشاعت کی تاکہ جس مسلمان کی گرفت ہو، حق پر ہو اور جو سلوک اس کے ساتھ کیا جائے بر بنائے حق کیا جائے۔ ان معنی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے، جس طرح حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے اور اسی لیے انہوں نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی کہ زندگی کی سادگی، اپنے اور عوام کے درمیان مساوات، حق کی تلاش، لوگوں کو حق کی طرف بلانے اور اس کے مطابق ان کے معاملات کا فیصلہ کرنے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قدم بقدم چلیں۔ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو اتباع وحی کی دعوت دیتے تھے، جو پروردگار عالم کی طرف سے آپ پر نازل ہوتی تھی۔ پھر جب آپ کے حلقہ بگوشوں کی کثرت ہوتی تو وہ اپنی زندگی میں پیش آنے والے ان معاملات کے متعلق آپ سی ہدایت طلب کرنے لگے جن کے بارے میں کوئی وحی نازل نہ ہوئی تھی اور جن پر ان جاہلانہ طریقوں ہی کے مطابق عمل کیا جارہا تھا جو رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے خلاف تھے۔ وحی اکثر ایسے ہی سوالوں کے جواب میں نازل ہوتی تھی۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ○ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا

Marfat.com

تَعْلَمُوْنَ ○ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ
وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ
اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى
يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ
وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا
وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ
○ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ
وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۵ قُلِ الْعَفْوَ كَذٰلِكَ
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ○ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ
وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ
فَاِخْوَانُكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ اِنَّ
اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ
خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا
وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ
وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ
يَتَذَكَّرُوْنَ ○ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي
الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ
اَمَرَكُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ○

(البقرہ215: تا222)

ترجمہ: ”لوگ پوچھتے ہیں: ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو! کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتہ داروں پر، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے اللہ اس سے باخبر ہوگا۔ تمہیں جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور وہ

Marfat.com

تمہیں ناگوار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لیے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لیے بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ لوگ پوچھتے ہیں ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو! اس میں لڑنا بہت بُرا ہے مگر راہ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ اور فتنہ خوں ریزی سے شدید تر ہے وہ تو تم سے لڑے ہی جائیں گے حتیٰ کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہیں اس دین سے پھیر لے جائیں۔ (اور یہ خوب سمجھ لو کہ) تم میں سے جو کوئی اس دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا اس کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے سب لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔ بخلاف اس کے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور جہاد کیا ہے، وہ رحمت الٰہی کے جائز امیدوار ہیں اور اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمت سے انہیں نوازنے والا ہے۔ پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ کہو! ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں مگر ان کا نقصان ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔ پوچھتے ہیں ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو! جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے شاید کہ تم دنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو۔ پوچھتے ہیں یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ کہو! جس طرز عمل میں ان کے لیے بھلائی ہو وہی اختیار کرنا بہتر ہے۔ اگر تم اپنا اور ان کا خرچ اور رہنا سہنا مشترک رکھو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آخر وہ تمہارے بھائی بند ہی تو ہیں۔ برائی کرنے والی اور بھلائی کرنے والے دونوں کا حال اللہ پر روشن ہے۔ اللہ چاہتا تو اس معاملے میں تم پر سختی کرتا مگر وہ صاحب اختیار ہونے کے ساتھ صاحب حکمت بھی ہے۔ تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح مت کرنا جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مؤمن لونڈی مشرک

شریف زادی سے بہتر ہے۔ اگر چہ وہ تمہیں بہت پسند ہو اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مؤمن غلام مشرک شریف سے بہتر ہے۔ اگر چہ وہ تمہیں بہت پسند ہو۔ یہ لوگ تمہیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے تمہیں جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور وہ اپنے احکام واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے۔ توقع ہے کہ وہ سبق لیں گے اور نصیحت قبول کریں گے۔"

یہ مسلسل آیات سورۂ بقرہ کی ہیں جو مختلف اوقات میں نازل ہوئیں اور ان سوالوں کے جواب میں نازل ہوئیں جو مسلمان خدمت رسالت میں پیش کرتے تھے۔ اللہ نے یہ آیات مسلمانوں کی ہدایت، نوع بشر کی رہنمائی اور ان احکام کی صراحت کے لیے اپنے رسول ﷺ پر بذریعہ وحی نازل فرمائیں جن کے متعلق وہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر سوال کرتے تھے۔ ان آیات کا نزول جن واقعات کے نتیجے میں ہوا، مفسرین کرام نے ان کا ذکر کیا ہے اور اس کا نام "اسباب نزول" رکھا ہے۔ محمد بک خضری مرحوم اپنی کتاب "تاریخ التشریع الاسلامی" میں فرماتے ہیں: "وہ احکام جو بغیر کسی واقعے یا سوال کے نازل ہوئے ہیں کم ہیں ہمیں شاید ہی کوئی حکم نظر آیا ہے جس کے سلسلے میں مفسرین نے کوئی ایسا واقعہ درج نہ کیا ہو جو اس کے نزول کا سبب ہوا۔" روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا کہ بے سہارا مسلمانوں کو وہاں سے نکال لائیں۔ وہاں ایک مشرکہ نے اپنے آپ کو نکاح کے لیے پیش کیا۔ وہ چونکہ حسین بھی تھی اور مالدار بھی۔ مرثد نے اس کی پیشکش قبول کر لی اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں تاخیر ہوگئی۔ جب وہ مدینہ واپس ہوئے اور رسول اللہ ﷺ سے نکاح کی اجازت چاہی تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ...... الخ۔

ترجمہ: اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔"

آپ کو یاد ہوگا، مدینے میں یہود و منافقین اوس و خزرج کے درمیان پرانی عداوت کی آگ بھڑکانے کے لیے مے نوشی کے اوقات سے فائدہ اٹھاتے تھے اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے شراب کے متعلق دریافت کیا۔ اس وقت تک اس سلسلے میں کوئی وحی نازل نہ ہوئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بارگاہ رب العزت میں التجا کی: "یا اللہ! شراب کے متعلق ہمیں کوئی واضح

Marfat.com

ہدایت عطا فرما!'' اس پر یہ آیت اتری:

یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ○ (البقرۃ:219)

ترجمہ: تم سے لوگ شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دو ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ نفعے بھی ہیں، لیکن ان کا گناہ ان کے نفعوں سے زیادہ ہے۔''

بعض اوقات مسلمان ایسی چیزوں کے متعلق سوال کر بیٹھتے تھے جس کے بارے میں اس وقت تک کوئی وحی نازل نہ ہوئی ہوتی۔ ایسی صورت میں رسول اللہ ﷺ اپنی رائے سے فیصلہ فرماتے تھے۔ سرکار رسالت کا ارشاد ہے: ''جس مسئلے میں وحی نازل نہیں ہوتی اس کا فیصلہ اپنی رائے سے کرتا ہوں!'' اس کے بعد اگر وحی آپ کی رائے کے خلاف آتی تو آپ فوراً اپنے فیصلے سے رجوع فرما کر قرآن کے حکم کی تعمیل فرما دیتے تھے [1] اور وحی نے ایک بار نہیں، کئی بار آپ کے فیصلے سے اختلاف کیا ہے۔ ان میں سے ایک اسیران بدر کا واقعہ ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ ان قیدیوں نے فدیہ دے کر آزاد ہونے پر اصرار کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ آپ کی قوم اور خاندان کے لوگ ہیں ان سے کیرائی کا سلوک فرمائیے۔ ممکن ہے خدا ان کی توبہ قبول فرما لے۔ ان سے فدیہ لے لیجیے، اس رقم سے کفار کے خلاف آپ کو تقویت پہنچے گی۔'' لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ بولے: ''انہوں نے آپ ﷺ کو جھٹلایا اور مکہ سے نکالا ہے۔ انہیں آگے کیجیے کہ ان میں ان کی گردن مار دوں۔ یہ لوگ کفر کے سرغنہ ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو فدیے کا محتاج نہیں بنایا۔'' ان مشیران خاص کے بعد رسول اللہ ﷺ نے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے سماعت فرمائی اور فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ دیا۔ اس پر یہ حکم نازل ہوا:

مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا وَ اللّٰهُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ لَوْلَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّکُمْ فِیْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ فَکُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (الانفال:٦٧)

---

[1] آمدی کی کتاب الاحکام، جلد چہارم 42-34، لیکن بعض فقہاء و اصولیین اسے تسلیم نہیں کرتے کہ قرآن کے سوا رسول اللہ ﷺ کا جو بھی حکم تھا، اجتہاد تھا بلکہ وہ احادیث و سنن کو اجتہاد نہیں، وحی بتاتے ہیں۔

Marfat.com

ترجمہ: نبی ﷺ کو مناسب نہ تھا کہ ان کے پاس قیدی رہیں جب تک ملک میں خوب قتل نہ کریں۔ تم لوگ تو دنیا کی متاع چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ اگر ایک بات نہ ہوتی کہ اللہ پہلے لکھ چکا تھا تو اس مال لینے میں ضرور تم پر بڑا عذاب آ پڑتا، تو جو کچھ تم نے لیا ہے حلال طیب کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

جب یہ وحی نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر ہم پر عذاب نازل ہوتا تو عمر رضی اللہ عنہ کے سوا اس سے کوئی نہ بچتا۔'' اسی طرح وحی نے ان لوگوں کے سلسلے میں بھی رسول اللہ ﷺ سے اختلاف کیا تھا جنہیں غزوۂ تبوک میں رومیوں کے مقابلے پر جانے کا حکم دیا گیا تھا، لیکن انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں طرح طرح کے عذر پیش کر کے مدینے ہی میں رہنے کی اجازت چاہی اور سرکار رسالت نے ان کی بات قبول فرمالی۔ اس پر اللہ نے ارشاد فرمایا:

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوكَ وَلٰكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ وَسَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ اَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِينَ ○ (التوبہ ۴۲۔۴۳)

ترجمہ: اور کچھ فائدہ قریب الحصول اور سفر متوسط درجے کا ہوتا تو تمہارے ساتھ ہو لیتے، لیکن انہیں مسافت دور معلوم ہوئی اور اب اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم سے بن پڑتا تو ہم ضرور تمہارے ساتھ نکل کھڑے ہوتے۔ یہ لوگ اپنی جانیں وبال میں ڈالتے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ اللہ نے تمہیں معاف کر دیا تم نے انہیں کیوں اجازت دے دی تھی یہاں تک کہ تم پر سچ ظاہر ہو جائے اور یہ کہ تم جھوٹوں کو جان لیتے۔''

اگر یہ آیت پہلے نازل ہو جاتی تو رسول اللہ ﷺ ان لوگوں کو مدینہ میں رہنے کی اجازت کبھی نہ دیتے۔ لیکن ایسا بہت ہی کم ہوا ہے کہ وحی نے رسول اللہ ﷺ کے اجتہاد کی مخالفت کی ہو، اس لیے حضور ﷺ کی وہ سنت، جس سے وحی نے اختلاف نہیں کیا۔ آپ کے طریق اجتہاد کی طرح ایک حجت ہے جس پر ہمیشہ سے عمل کیا جا رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کبھی کبھی قیاس سے بھی کام

Marfat.com

لیتے تھے۔ایک خثعمی جاریہ نے عرض کیا:"یارسول اللہ! میرے باپ پر حج فرض ہے لیکن وہ بڑھاپے کی وجہ سے معذور ہے۔اگر اس کے بجائے میں حج کرلوں تو کیا اسے ثواب مل جائے گا؟ آپ نے فرمایا:"اگر تم اپنے باپ کو مقروض پاؤ اور اس کا قرض ادا کردو تو کیا اسے فائدہ نہیں پہنچے گا؟" کہنے لگی:"جی ہاں پہنچے گا!" فرمایا:"تو پھر اللہ کا قرض پہلے ادا ہونا چاہیے!" اللہ تعالیٰ کے قرض کی ادائیگی اور نفع میں انسان کے قرض سے ملا کر دیکھنا عین قیاس ہے۔رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کے معاملات کا تصفیہ کرتے اور ان سے فرماتے تھے:"تم اپنے جھگڑے لے کر میرے پاس آتے ہو۔بہت ممکن ہے تم میں سے کچھ لوگ اپنی دلیلیں بڑے وزن سے پیش کرتے ہوں اور میں ان دلیلوں کے پیش نظر فیصلہ کردیتا ہوں۔سو اگر میں کسی کو اس کے بھائی کے حق میں سے کچھ دلوانے کا فیصلہ کردوں تو وہ اسے نہیں لینا چاہیے۔کیونکہ جو حصہ میں نے اسے دلوانے کا فیصلہ کیا ہے، وہ دوزخ کا ایک حصہ ہے!"

علامہ آمدی کہتے ہیں"اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اوقات رسول اللہ ﷺ اصل حقیقت کے خلاف بھی فیصلہ فرمادیا کرتے تھے۔" آمدی کے اس قول میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ انہیں دلائل کی بنا پر فیصلہ صادر فرمایا کرتے تھے جو فریقین عدالت نبوی میں پیش کرتے تھے۔آپ کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی وحی نہ ہوتا تھا، بلکہ جو دلائل آپ کے سامنے پیش کیے جاتے تھے، سرکار رسالت انہیں کو اپنے فیصلے کی بنیاد قرار دیتے تھے۔بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ حق دار اپنے حق کو ثابت یا فریق مخالف کے دلائل کو باطل کرنے میں ناکام رہتا ہے اور انصاف پسند قاضی اپنے علم کی بنا پر نہیں بلکہ ان دلائل کو سن کر فیصلہ دے دیتا ہے جن پر اس کا دل مطمئن ہوجاتا ہے۔لیکن"قضا" اور"سنت" دو الگ الگ چیزیں ہیں۔اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ جب حکم سے کوئی ایسا اصول مترتب ہوتا ہے جو ملتے جلتے واقعات پر عمومی حیثیت سے منطبق ہوسکے تو قضا، سنت کو شامل ہوتی ہے، لیکن اپنی جگہ سنت کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو اصول واحکام فرض کیے ہیں انہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول یا عمل یا دونوں سے ظاہر فرمایا ہو۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ ۝

(النحل:۴۴)

ترجمہ:اوراب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تا کہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح وتوضیح کرتے جاؤ، جوان کے لیے اتاری گئی ہے اور تا کہ لوگ (خود بھی) غور وفکر کریں۔''

جس سنت کا تعلق عمل سے ہے،اس کی مثال میں نماز اور حج پیش کیے جاسکتے ہیں۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو پانچوں وقت کی نماز پڑھاتے اور ان سے فرماتے تھے۔''نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے دیکھتے ہو!''اور جب سرکار رسالت نے حج فرمایا تو ہمراہیوں سے ارشاد فرمایا:

''حج کے مناسک مجھ سے سیکھو!،،لیکن قول سے متعلق سنت کو حدیث کہتے ہیں۔حدیث ،وحی کی تفصیل وتفسیر بھی کرتی ہے اور اس کا تعلق زندگی کے ان واقعات سے بھی ہے جو عہد رسالت میں ظہور پذیر ہوئے اور جب انہیں خدمت نبویؐ میں پیش کیا گیا تو حضور ﷺ نے ان کے متعلق اپنی رائے ظاہر فرمائی۔رسول اللہ ﷺ ان امور میں اپنی رائے کا اظہار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورے کے بعد فرمایا کرتے تھے اور اس سلسلے میں آپ کا عمل اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر تھا:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (آل عمران:۱۵۹)

ترجمہ:معاملات میں ان سے مشورہ کرلیا کرو اور جب کوئی ارادہ کرلو تو اللہ پر بھروسا کرو!''

نبی اکرم ﷺ نے اعلان نماز کے لیے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ چاہا،کچھ لوگوں نے کہا: ''آگ!'' کچھ نے کہا''بگل!''اور کچھ بولے''سنکھ''اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں،آخر کار اذان پر فیصلہ ہوا۔جنگ کے لیے روانہ ہوتے وقت رسول اللہ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرماتے تھے کہ کیا کرنا چاہیے!چنانچہ غزوہ احد میں آپؐ نے ان سے رائے طلب کی کہ مدینہ میں قلعہ بند ہوکر دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا مدینے سے باہر نکل کر۔صلح حدیبیہ اور دوسرے غزوات میں بھی سرور کونین کا یہی طرز عمل رہا۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:''میں نے کسی کو نہیں دیکھا، جو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ لیتا ہو!''رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کو اجتہاد کی تلقین بھی فرماتے تھے۔حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا:''دو آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اپنا مقدمہ لے کر حاضر ہوئے۔حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا:''ان کے درمیان فیصلہ کرو!میں نے عرض کیا:''یا نبی اللہ! آپ مجھ سے بہتر فیصلہ فرما سکتے

Marfat.com

ہیں، فرمایا: ''نہیں تم ہی کو فیصلہ کرنا ہوگا!'' میں نے پوچھا، کس چیز پر فیصلہ کروں؟'' فرمایا: ''اگر تم نے ان کا فیصلہ صحیح کیا تو دس نیکیوں کے مستحق ٹھہرو گے اور اگر اجتہاد کیا اور اس میں تم سے غلطی ہوگئی تو ایک نیکی کا ثواب ملے گا۔''

رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو بنو قریظہ کے معاملے میں حکم بنایا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں قتل کر دیا جائے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنالیا جائے اور سرکار رسالت ﷺ کے اس رائے کو پسند فرمایا۔ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے ایک مشرک کو قتل کیا، لیکن مقتول کے کپڑے اور ہتھیار وغیرہ کسی اور نے لے لیے۔ اس پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے فرمایا: ''ہم یہ ہرگز نہیں چاہتے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے دشمن سے جنگ تو اللہ کا کوئی شیر کرے اور اس مقتول کے کپڑے اور ہتھیار وغیرہ ہم تمہیں دے دیں۔ مقتول کے کپڑے ہتھیار وغیرہ اس کے قاتل کو واپس کرو!'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سچ کہا، یہ چیزیں واپس کرو!'' رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا کہ وہاں لوگوں کو دین کی تعلیم دیں تو ان سے دریافت فرمایا: ''کس چیز کے مطابق فیصلہ کرو گے؟'' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، کتاب اللہ کے مطابق!'' فرمایا: ''اگر اس میں نہ ملا؟'' بولے: ''سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق!'' فرمایا ''اور اگر اس میں بھی نہ ملا تو؟: کہنے لگے: ''پھر میں اجتہاد کروں گا!''

رسول اللہ ﷺ نے تائیدی لہجے میں فرمایا: ''اللہ کا شکر ہے، جس نے اپنے رسولؐ کے نمائندے کو وہ توفیق عطا فرمائی، جسے اللہ اور اس کا رسول ﷺ دونوں پسند کرتے ہیں۔'' یہ بات رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث سے بھی اتفاق کرتی ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اگر کتاب وسنت میں کوئی چیز مل جائے تو اس کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر ان میں کوئی حکم نہ ہو تو اجتہاد کرو!'' لیکن عہد رسالتؐ اور اس کے بعد کے ابتدائی ادوار میں اجتہاد سے غرض یہ نہ تھی کہ فقہ کے ایسے مذاہب قائم کیے جائیں، جو مفروضات اور دل میں گزرنے والے خیالات تک کو شامل ہوں، بلکہ وہ زندگی کے انہی معاملات تک محدود تھا جو فی الواقع پیش آتے اور دو ٹوک فیصلے کے محتاج ہوتے تھے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بہتر لوگ کہیں نہیں دیکھے۔ انہوں نے پورے عہد رسالتؐ میں صرف تیرہ سوال دریافت کیے اور وہ سب کے سب قرآن سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ صرف انہیں چیزوں کے متعلق سوال کرتے تھے جو ان کے لیے مفید ہوتی

Marfat.com

تھیں۔عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس شخص پر لعنت بھیجتے تھے جو غیر واقعی بات کے متعلق پوچھتا تھا۔عمر بن اسحاق سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: "رسول اللہ ﷺ کے اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم میرے ہوش سے پہلے ہو گزرے تھے پھر بھی ان میں سے جن بزرگوں کو میں نے دیکھا ہے ان سے زیادہ خوش اخلاق اور نرم خو کسی کو نہیں پایا۔" اس لیے اس اختلاف کا جو ایک مکمل مذہب قائم کرنے کے لیے اجتہاد سے پھوٹتا ہے، اس زمانے کی تشریع پر کوئی نمایاں اثر نہ تھا، بلکہ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دین میں تفرقہ پیدا کرنے اور جھگڑے سے منع فرمایا کرتے تھے۔قرآن کریم کے اس حکم کی تعمیل میں کہ:

اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (الشوریٰ:۱۳)

ترجمہ: یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں متفرق نہ ہو۔"

اور:

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (الانعام:۱۵۹)

ترجمہ: جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور وہ گروہ گروہ بن گئے، یقیناً ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں۔"

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جو اسی مفہوم کی ترجمانی کرتی ہیں۔رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے صحابہ کو تقدیر کے مسئلے پر گفتگو کرتے دیکھا تو امتناعی لہجے میں فرمایا: "تم سے پہلے جن لوگوں نے اس مسئلے میں غور و خوض کیا ہے وہ ہلاک ہو گئے ہیں۔" یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ منقول نہیں ہے کہ وہ فلسفیانہ مسائل پر غور و فکر کرتے تھے اور اگر وہ ایسا کرتے تو جس طرح زندگی کے واقعی مسائل کے سلسلے میں ان کے اجتہاد کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا بھی ضرور ذکر کیا جاتا۔رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد صدر اول کے مسلمان اجتہاد کے اور بھی حاجت مند ہو گئے تھے، اس لیے کہ عہد رسالتؐ میں جو مسئلہ انہیں پیش آتا، وہ سرکار رسالتؐ سے پوچھ لیتے اور انہیں ہدایت مل جاتی۔وہ اپنے جھگڑے بارگاہ نبوتؐ میں پیش کرتے اور آپ ان کا فیصلہ فرما دیتے۔پھر رسالت مآب ﷺ لوگوں کو اچھے کام کرتے دیکھتے تو ان کی تعریف فرماتے اور برائی کی طرف مائل پاتے تو روک دیتے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتے اور ان کی رائیں سمع نبوت تک پہنچتیں، تو جس کی رائے صحیح ہوتی،

Marfat.com

آنحضرت ﷺ اسے صحیح اور جس کی رائے غلط ہوتی اسے غلط فرماتے، لیکن جب سرکار دو عالم ﷺ اپنے پروردگار سے واصل ہوئے تو جن واقعات کے سلسلے میں کوئی حکم موجود نہ تھا، ان میں قیاس سے کام لینا ناگزیر ہو گیا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اجتہاد کیا اور کسی نے ان کے اس فعل پر نکتہ چینی نہ کی۔ لیکن مسلمان اپنی رائے کا اظہار اس طرح نہ کرتے تھے گویا وہ بہرصورت حق بہر قیمت واجب التسلیم ہے بلکہ یا تو اسے ''گمان'' سمجھ کر پیش کرتے اور اس کے لیے خدا سے مغفرت چاہتے تھے اور یا اس سے ان کی غرض یہ ہوتی تھی کہ فریقین میں صلح صفائی ہو جائے۔

علامہ ابن حزم اپنی کتاب ''الاحکام فی اصول الاحکام'' میں لکھتے ہیں: ''لیکن خدا ان بزرگوں سے راضی ہو، انہوں نے قول بالرائے، استحسان اور اختیار سے اکثر کام لیا ہے، لیکن ان میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے اپنی رائے کو ''دین'' بنا کر پیش کیا تھا' جس کا حکم بہر حال واجب التعمیل ہے، بلکہ انہوں نے تو جب کبھی اپنی طرف سے کوئی رائے پیش کی ہے، یہی کہہ کر پیش کی ہے کہ ان کے دل میں یہ بات آئی ہے ان کا خیال یہ ہے وہ فریقین میں صلح کرانے کے لیے یہ بہتر سمجھتے ہیں، وغیرہ [1] اور آخر وہ اجتہاد کیوں نہ کرتے جب کہ نئے نئے قضیے ان کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے اور جن اقوام و قبائل سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سابقہ پڑا تھا، ان کی زندگی کے حالات ان بزرگوں کی زندگی کے حالات سے مختلف تھے اور یہ حالات اور یہ قضیے سب ایک ایسی رائے کے محتاج تھے جس کے بغیر راحت و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے اس وقت اجتہاد کیا، جب رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا مسئلہ پیش آیا۔ آپ کو وہ سب کچھ یاد ہو گا جو سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوا؟ وہ گفتگو اور وہ اختلاف جس نے اتنی شدت اور سختی اختیار کر لی تھی کہ قریب تھا کوئی فتنہ پیدا ہو جائے؟ لیکن بعد کو یہ اختلاف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت پر ختم ہو گیا۔ پھر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے زمام خلافت سنبھالی تو مسلمان بعث اسامہ کے سلسلے میں مختلف الرائے ہو گئے، جس کی وجہ یہ تھی کہ عربوں نے مدینہ کے اقتدار کے خلاف بغاوت کر دی تھی مہاجرین و انصار کے ایک گروہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا: ''یہ لوگ --- لشکر اسامہ کی طرف اشارہ ہے --- مسلمانوں کے ممتاز و سربرآوردہ افراد ہیں اور جیسا کہ آپ خود بھی جانتے ہیں عربوں نے آپ کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ اس لیے مناسب نہیں ہے کہ آپ مسلمانوں کی ایک جماعت کو اپنے سے جدا کر دیں!''

---

[1] الاحکام فی اصول الاحکام۔ جلد ہفتم، ص ۱۱۸، ۱۱۹۔

خود حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے درخواست کی تھی کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہہ کر لشکر کو مدینہ واپس بلوالیں، تاکہ یہ طاقت مشرکوں کے خلاف استعمال کی جاسکے اور وہ اچانک مسلمانوں پر نہ ٹوٹ پڑیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے جواب میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بس یہ فرمایا تھا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں ابوبکر کی جان ہے، اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ درندے مجھ پر جھپٹ پڑیں گے تو بھی میں اسامہ کا لشکر ضرور بھیجوں گا، کیونکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے اور اگر آبادیوں میں میرے سوا کوئی متنفس باقی نہ بچے تو بھی یہ لشکر ضرور جائے گا۔'' اور جب مدینہ کے ہم جوار قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے جنگ کرنی چاہی تو صحابہ کو مشورے کے لیے بلایا۔ ایک گروہ نے جس میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھی رائے ظاہر کی کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں ان سے جنگ نہیں کرنی چاہیے بلکہ دشمن کے خلاف ان سے مدد لینی چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، ہم ان لوگوں سے کیسے لڑ سکتے ہیں جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک وہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰہِ نہ کہیں اور جس نے یہ کہہ دیا اس کی جان و مال مجھ سے محفوظ ہو گئے، بشرطیکہ ان پر کوئی حق نہ ہو۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا: ''خدا کی قسم! جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا، میں اس سے ضرور قتال کروں گا کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے بشرطیکہ ان پر کوئی حق نہ ہو۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''واللہ! میں نے محسوس کیا کہ جنگ کے لیے اللہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سینہ کشادہ کر دیا ہے اور مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ درست فرماتے ہیں۔'' یمامہ کی جنگ میں جب بہت سے حفاظ قرآن نے جام شہادت نوش کیا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس وقت مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: ''یمامہ کی جنگ میں بہت سے حفاظ کام آ گئے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ اگر دوسری لڑائیوں میں بھی یہی سلسلہ جاری رہا تو قرآن کا بہت سا حصہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا، اس لیے میری رائے ہے کہ آپ قرآن کو جمع کرا دیجیے!'' یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حیرت میں رہ گئے اور اسی حالت میں فرمایا: ''میں وہ کام کیسے کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا!'' دونوں بزرگوں میں بڑی طویل گفتگو ہوئی اور آخر کار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

Marfat.com

کی رائے سے متفق ہو گئے۔ انہوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بلا کر ان سے جمع قرآن کے سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اصرار کا ذکر کیا، اس کے بعد فرمایا: ''میں نے عمر سے پوچھا، میں وہ کام کیسے کروں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، عمر نے جواب میں کہا، خدا کی قسم! یہ نیک کام ہے، وہ مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہے، یہاں تک کہ اللہ نے اس کام کے لیے میرا سینہ کھول دیا اور میں بھی عمر کا ہم خیال ہو گیا۔''

اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا روئے سخن زید رضی اللہ عنہ کی طرف کیا اور ان سے فرمایا: ''تم ایک نوجوان اور عقل مند انسان ہو، تمہارا دامن ہر قسم کے الزام سے پاک ہے اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی رہے ہو، قرآن کو جمع کرو!'' حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ دونوں وہ کام کیسے کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! یہ نیک کام ہے!' حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اس گفتگو کو ختم کرتے ہوئے کہا: ''میں ان سے بحث کرتا رہا یہاں تک کہ اللہ نے میرا سینہ بھی اس حقیقت کے لیے کھول دیا، جس حقیقت کے لیے ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کا سینہ کھولا تھا۔'' چنانچہ حضرت زید رضی اللہ عنہ اپنی جگہ سے اٹھے اور پرچوں، ہڈیوں، کھجور کے پتوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن مرتب کرنے لگے، یہاں تک کہ وہ جمع ہو گیا۔

جب ارتداد کی جنگیں ختم ہوئیں اور عراق کی جنگ شروع ہوئی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے غنیمت کا خمس مدینہ روانہ کیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ مال غنیمت لوگوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا جائے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑے ہیں آپ انہیں حضور کی صف میں شامل ہو کر لڑنے والوں کے ساتھ کیسے رکھیں گے؟'' یا یہ کہا، ''جن لوگوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی ہے، آپ انہیں ان لوگوں کے ساتھ کیسے رکھیں گے، جنہوں نے مجبور ہو کر اسلام قبول کیا ہے؟''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا، انہوں نے اسلام اللہ کے لیے قبول کیا ہے اور اس کا اجر انہیں اللہ دے گا، اس دنیا میں تو انہیں برابر ہی کا حصہ ملے گا۔'' آپ دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر تشریف فرما ہوئے تو انہوں نے وظیفے کے سلسلے میں مسلمانوں میں امتیاز برتا اور ان کے مختلف گروہ بنا دیئے۔ یہ تھیں حکومت کے عام معاملات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کی چند مثالیں اور جیسا کہ آپ نے دیکھا، یہ سب کی سب مہتم بالشان تھیں۔ رہا ان کا فقہی اجتہاد، سو اس کی ایک مثال یہ ہے کہ انہوں نے دادی کو چھوڑ کر نانی کو ورثہ دلایا، اس پر بعض

Marfat.com

انصار نے کہا، "آپ نے مرنے والوں کے ترکے میں سے اس عورت کو ترکہ دلوایا ہے کہ اگر وہ مرتی تو مرنے والے کو اس کی وراثت نہ پہنچتی اور اس عورت کو چھوڑ دیا ہے کہ اگر وہ مرتی تو اس کا سارا ورثہ مرنے والے کو پہنچتا۔" یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کو ورثے میں شریک فرمادیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کلالہ کے متعلق سوال کیا گیا۔ انہوں نے فرمایا: "کلالہ کے متعلق میں اپنی رائے سے کہتا ہوں، اگر وہ صحیح ہے، تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے، تو میری اور شیطان کی طرف سے۔ کلالہ وہ ہے جس کا نہ باپ ہو نہ بیٹا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اجتہاد سے جو وافر حصہ ملا تھا وہ آپ اس باب کی پچھلی عبارتوں اور تیسرے اور چوتھے باب میں جہاں ہم نے عہد رسالت اور عہد صدیقی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق گفتگو کی ہے، پڑھ چکے ہیں، فاروق اعظم کے بعض اجتہادات کی تائید قرآن کریم نے کی، اور بعض کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح قرار دیا اور پسندیدگی سے نوازا، یہاں تک کہ حضور فرمایا کرتے تھے کہ "اللہ نے عمرؓ کی زبان اور دل کو حق سے نوازا ہے۔" اور یہ بھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کے خلاف اپنے عہد کا آغاز اس حکم سے کیا کہ مرتدین کے لونڈی غلام ان کے رشتے داروں کو واپس کر دیئے جائیں اور فرمایا: "میں پسند نہیں کرتا کہ عرب میں غلامی کا رواج قائم ہو!"۔ انہوں نے سب سے پہلا لشکر جو عراق بھیجا اس کا سپہ سالار مہاجرین وانصار کے سابقون اولون میں سے کسی کو نہ بنایا، جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا شعار تھا، بلکہ ابوعبید ثقفی کو یہ عزت بخشی کہ وہی سب سے پہلے شخص تھے، جنہوں نے مسلمانوں کی سہ روزہ ہچکچاہٹ کے بعد اپنے آپ کو عراق جانے کے لیے پیش کیا۔ پھر انہوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو شام کی سپہ سالاری سے معزول فرمایا، حالانکہ لسان نبوتؐ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو سیف اللہ کا لقب عطا فرمایا تھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے بارے میں کہا تھا: "میں اس تلوار کو نیام میں نہیں کروں گا جو اللہ کافروں پر کھینچی ہے!"

پھر انہوں نے یہود و نصاریٰ کو جزیرہ نمائے عرب کی یہودی اور عیسائی آبادیوں سے نکال دیا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نجران کے عیسائیوں سے جزیے پر صلح کی تھی جس کے بدلے مسلمانوں پر ان کے عقیدے کا احترام اور ان کی مدافعت فرض تھی اور یہ سب کے سب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وہ اجتہادات ہیں جن کی حکمت ہم ان کے موقع و محل پر بیان کر چکے ہیں۔ پھر اس کے بعد بھی آپ بہت سے موقعوں پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد دیکھ چکے

Marfat.com

ہیں جن میں سے صرف چند اجتہادات کی طرف اشارہ کر دینا ہمارے لیے کافی ہوگا، مثلاً انہوں نے شراب نوشی کی سزا مقرر فرمائی۔ وباء زدہ شہر میں داخل نہیں ہوئے۔ اسی طرح جن شہروں میں جانا خلاف مصلحت سمجھا، وہاں نہیں گئے اور وظائف کی تقسیم میں سبقت اسلام یا رسول اللہ ﷺ کی قرابت کا لحاظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کے درمیان امتیاز قائم کیا ان کے علاوہ اور بھی بہت سے امور ہیں جن میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جزیرۃ العرب اور مفتوحہ ممالک کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر اجتہاد فرمایا، لیکن یہاں ہم ان کے صرف انہیں اجتہادات پر گفتگو کریں گے جن سے عہد فاروقی بطور خاص متاثر ہوا اور جنہوں نے بعد کو اسلام اور مسلمانوں کی زندگی پر موافق یا مخالف اثرات چھوڑے۔

اس سے پہلے کہ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متذکرہ بالا اجتہادات کی تفصیل بیان کریں، ہمارے لیے یہ ذکر کر دینا مناسب ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس پر ایمان رکھتے تھے کہ اسلام دراصل ایک روح اور ایک عقیدہ ہے اور انسان کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس روح کو نہ پہچانے جو اللہ تعالیٰ نے دین حق کے ساتھ اپنے رسول کی طرف وحی کی تھی۔ اسی لیے وہ احکام قرآنی کو اسی روح کے ساتھ منطبق کرتے جس روح کے ساتھ یہ احکام نازل کیے گئے تھے۔ چنانچہ جب ان کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی کوئی سنت قولاً یا فعلاً ثابت ہو جاتی تو اس سنت کے ربط و تعلق کو سمجھتے تاکہ اسے اختیار کرنے میں باریک بینی سے کام لے سکیں۔ پھر جب کوئی مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا جاتا تو اس کا فیصلہ کرتے وقت حدیث کے الفاظ سے نہیں، اس کی روح سے ہدایت حاصل کرتے۔ باوجودیکہ ان کا ایمان بڑا قوی تھا اور وہ تعلیمات نبویؐ کی پیروی انتہائی شدت سے کرتے تھے، اجتہاد میں بڑے جری تھے، چاہے وہ ظاہر نص کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، جب کوئی ایسی نص وارد ہوتی جس کے مطابق فیصلہ کرنا جماعتی حالات کے اعتبار سے ضروری نہ رہتا تو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرتے اور جب جماعت کے حالات تاویل نص کے مقتضی ہوتے تو بے جھجک تاویل فرماتے۔ ان دونوں صورتوں میں ان کی شدید خواہش ہوتی تھی کہ حکم معاشرے کے حالات کے مطابق بھی ہو اور سرکار رسالت ﷺ کی تعلیمات و مبادی کی صحت مند روح سے اتفاق بھی کرے۔ عربوں کی ایک جماعت نے اسلام قبول کیا جس کے افراد اپنی اپنی قوم کے سردار تھے، اللہ تعالیٰ نے صدقات میں ان کا حصہ مقرر کر دیا اور رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ان کے دلوں کی تالیف اور ایمان کے استحکام کے لیے ان کا حصہ انہیں دیا جائے۔ یہی وہ لوگ ہیں

Marfat.com

جنہیں مؤلفۃ القلوب کہا جاتا ہے۔ قرآن نے ان کی عطا کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَالۡعٰمِلِیۡنَ عَلَیۡهَا وَالۡمُؤَلَّفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ

(التوبہ: ٦٠)

ترجمہ: یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لیے جن کی تالیف قلوب منظور ہو۔"

رسول اللہ ﷺ ان کا یہ حصہ غنیمت اور زکوٰۃ میں سے عطا فرماتے تھے، یہ عطیے ابوسفیان، اقرع بن حابس، عباس بن مرداس، صفوان بن امیہ اور عیینہ بن حصن کو ملتے تھے اور ان کی تعداد سو اونٹ فی کس تھی۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے زمام خلافت سنبھالی تو عہد رسالتؐ کے ان عطیوں کو برقرار رکھا۔ اس کے بعد عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس پیش گاہ صدیقی میں حاضر ہوئے اور زمین طلب کی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زمین کے لیے انہیں تحریری حکم دے دیا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسند آرائے خلافت ہوئے، تو ان دونوں نے حاضر خدمت ہو کر درخواست کی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حکم نافذ کیا جائے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ حکم نامہ چاک کر دیا اور کہا: "اللہ نے اسلام کو سربلند اور تم سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اب یا تو تم مضبوطی سے اسلام پر قائم ہو جاؤ، ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار ہو گی۔" اور زکوٰۃ میں سے جو حصہ اس گروہ کو دیا جاتا تھا اسے ممنوع قرار دے کر ان لوگوں کو بھی عام مسلمانوں کے زمرے میں شامل فرما دیا۔

نص قرآن کی تطبیق میں یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد ہے اور بلاشبہ ایسا اجتہاد ہے جس کی توفیق انہیں اللہ کی طرف سے عطا کی گئی تھی۔ عربوں کی اس گروہ کو تحریر اس وقت دی گئی تھی جب اسلام کو ان کی دوستی کی ضرورت تھی۔ لیکن اسلام کی سربلندی کے بعد یہ ضرورت ساقط ہو گئی اور عطاء و بخشش کے لیے کوئی وجہ جواز باقی نہ رہی۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام کو ایرانیوں یا رومیوں کی دوستی کا حاجت مند پاتے تو ان کے لیے بھی کوئی عطا فرض کرتے۔ چنانچہ جب ہرمزان مدینہ آ کر مسلمان ہوا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا وظیفہ مقرر کیا تھا، پھر یہ فرض موقوف تھا، اس ضرورت پر جو وظیفے کی ذات سے متعلق ہوتی تھی۔ اس لیے جب ضرورت ختم ہوئی فرض آپ سے آپ ساقط ہو گیا۔ یہی نص کی روح ہے اور اس کی تطبیق اسی طرح ہونی چاہیے جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک اور نص قرآنی میں اجتہاد کیا تھا، جسے آج ہم تسلیم نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

Marfat.com

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ (البقرہ:۲۲۹)

ترجمہ: طلاق دو بار ہے، پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے، یا بھلے طریقے سے اسے رخصت کر دیا جائے۔"

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ.

ترجمہ: پھر اگر دو بار طلاق دینے کے بعد شوہر نے عورت کو تیسری بار طلاق دی دے تو وہ عورت پھر اس کے لیے حلال نہ ہوگی۔ الا یہ کہ اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو اور وہ اسے طلاق دیدے۔"

اس نص کا مقصد صاف ظاہر ہے کہ طلاق عملی طور پر، بہ دفعات واقع ہوتی ہے۔ اور شوہر دو دفعہ طلاق دینے کے بعد اپنی بیوی سے رجوع کر سکتا ہے، لیکن جب تیسری بار طلاق دیدی جائے تو عورت جب تک کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے، شوہر کے لیے حلال نہیں ہوتی۔ اس نص کی حکمت واضح ہے۔ اس لیے کہ طلاق ازدواجی رشتے کی شکست ہے، جس پر نہ صرف زوجین، بلکہ ان سے گزر کر اولاد تک کے لیے بڑے اہم نتائج مترتب ہوتے ہیں اور اکثر اوقات اولاد کو زندگی بھر اس کے برے اثرات سے نجات نہیں ملتی۔ اس لیے قرآن نے پہلی اور دوسری طلاق کے بعد شوہر کو بیوی سے رجوع کرنے کی اجازت عطا کی ہے اور مشورہ دیا ہے کہ طلاق سے پہلے میاں بیوی کے درمیان ملاپ کرانے کی کوشش کی جائے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا (النساء:۳۵)

ترجمہ: اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتے داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتے داروں میں سے مقرر کرو۔ وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا۔"

لیکن جب مصالحت کا امکان باقی نہ رہے اور طلاق زوجین میں جدائی پیدا کر دے تو اس کے بعد بھی دو طلاقوں کی حد تک رجوع کی اجازت ہے اور اس خیال سے کہ میاں بیوی میں سے کوئی رشتہ ازدواجی کی شکست کو ہنسی کھیل نہ سمجھے، قرآن نے یہ قانون بنا دیا کہ تیسری طلاق کے

Marfat.com

بعد شوہر اس وقت تک اپنی بیوی سے رجوع نہیں کر سکتا، جب تک کسی اور شخص سے نکاح نہ کر لے اور اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے کہ میں تجھے تین طلاق دیتا ہوں!'' تو یہ ایک ہی طلاق سمجھی جائے گی، اس لیے کہ طلاق وہ عمل ہے جو وقوع میں آتا ہے نہ کہ وہ الفاظ جو زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صدیقیؓ میں یہی طریقہ تھا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ماثور ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''عہدِ رسالت، عہدِ صدیقی اور عہدِ فاروقی کے ابتدائی دو سال تک بہ یک وقت تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیا جاتا تھا۔ چنانچہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا، لوگوں کو جس معاملے میں رخصت وسہولت تھی اس کا دروازہ انہوں نے اپنی عجلت پسندی سے اپنے اوپر بند کر لیا ہے، اس لیے ہمیں بیک وقت تین طلاقوں کو طلاق بائن قرار دینا چاہیے!'' انہوں نے یہ حکم نافذ فرما دیا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ظاہر نص وظاہر حکمت سے اختلاف کے باوجود یہ رائے کیسے قائم کی اور اسے لوگوں پر کیسے نافذ کر دیا؟ اس بات کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس آیت کے سبب نزول کی طرف رجوع کرنا چاہیے:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (البقرہ:۲۲۹)

ترجمہ: طلاق دو بار ہے۔ پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے اسے رخصت کر دیا جائے۔''

ابن جریر اپنی تفسیر میں بعض لوگوں کا قول نقل کرتے ہیں: ''یہ آیات اس لیے نازل ہوئیں کہ اہل جاہلیت اور اس آیت کے نزول سے پہلے خود مسلمان بھی بے انتہا طلاقیں دیا کرتے تھے۔ پہلے طلاق دی اور جب عدت کا وقت ختم ہونے کو آیا، بیوی سے رجوع کر لیا۔ اس کے بعد پھر طلاق دے دی اور پھر رجوع کر لیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر ایک حد مقرر کر دی، جس کی بعد مطلقہ عورت اپنے شوہر پر حرام ہو جاتی اور جب تک کسی دوسری سے نکاح کر کے اس سے بھی طلاق نہ لے، شوہر کے لیے جائز نہ ہوتی۔ اس آیت کی رو سے تیسری طلاق کے بعد عورت اپنے شوہر کے نکاح سے آزاد ہو جاتی ہے۔'' روایت ہے کہ عہدِ رسالتؐ میں ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: ''نہ میں تجھے اپنے پاس رکھوں گا نہ کسی دوسرے کے پاس جانے دوں گا۔'' بیوی نے پوچھا: ''وہ کس طرح؟'' بولا: ''تجھے طلاق دوں گا اور جب عدت کا وقت ختم ہونے کو آئے گا تو رجوع کر لوں گا۔ پھر تو دوسرے کے لیے کیسے اور کب حلال ہو گی؟''

Marfat.com

وہ عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اللہ نے (اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ) یہ آیت نازل کی جسے طلاق دینے اور نہ دینے والوں نے یکساں قبول کیا۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا جاہلیت میں ایک ایک شخص تیرہ تیرہ بلکہ اس سے بھی زیادہ طلاقیں دیتا تھا اور عدت کے دوران میں رجوع کر لیتا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تین طلاقوں کی حد مقرر کر دی۔ آیت کے اس سبب نزول سے واضح ہوتا ہے کہ عورت سے رجوع کرنے کا مرد کو صرف اسی وقت تک حق ہے جب تک عدت کے دن نہ گزر جائیں اور مراجعت بھی دو دفعہ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ مرد عورت کو تکلیف نہ پہنچا سکے اور اسکی زندگی ادھر میں نہ چھوڑ دے اور عورت کے ساتھ وہ نرمی ہے جو اسلام کی روح کے عین مطابق ہے قرآن کریم نے عورت کے ساتھ اس نرمی کی تمام راہیں اختیار کی ہیں۔ چنانچہ اس کا حکم ہے کہ جن عورتوں کو دو طلاقیں دی جا چکی ہیں انہیں عدت کا زمانہ اپنے شوہر کے گھر میں گزارنا اور اس دوران شوہر کو ان کے ساتھ خوش سلوکی سے پیش آنا ہوگا۔ قرآن کہتا ہے:

لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (الطلاق:۱)

ترجمہ: ان عورتوں کو ان کے (رہنے کے) گھروں سے مت نکالو (کیونکہ سکنی مطلقہ کا مثل منکوحہ کے واجب ہے) اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں۔ مگر ہاں! کوئی کھلی بے حیائی کریں تو اور بات ہے۔"

اور:

وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ (لبقرہ:۲۴۱)

ترجمہ: جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو انہیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے۔"

اور:

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْفَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (الطلاق:۲)

ترجمہ: پھر جب وہ (مطلقہ) عورتیں اپنی عدت گزرنے کے قریب پہنچ جائیں،

Marfat.com

(تو تم کو دو اختیار ہیں یا تو) انہیں قاعدے کے موافق نکاح میں رہنے دو، یا قاعدے کے موافق انہیں رہائی دو۔"

اور:

وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا (البقرہ:۲۲۸)

ترجمہ: اور ان کے شوہر تعلقات درست کر لینے پر آمادہ ہوں تو وہ اس عدت کے دوران میں انہیں پھر اپنی زوجیت میں لے لینے کے حقدار ہیں۔"

اور:

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ:۲۳۲)

ترجمہ: جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو پھر اس میں مانع نہ ہو کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں۔ جب کہ وہ معروف طریقے سے باہم مناکحت پر راضی ہوں۔

یہ اور اسی قسم کی دوسری آیتیں شوہر کے لیے بیوی کو ستانا ممنوع قرار دیتی اور ضرر رسانی کو ایک بڑا گناہ سمجھتی ہیں۔ اللہ نے مراجعت کا حکم اصلاح کے لیے دیا ہے، لیکن اگر اصلاح ناممکن نظر آئے اور بیوی سے شوہر کے رجوع کرنے کا مقصد محض اسے ستانا ہو تو مراجعت کی حکمت و مصلحت باقی نہیں رہتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مناسب سمجھا کہ وہ یہ حکم جاری کر دیں کہ بہ یک لفظ تین طلاقیں بھی وہی تین طلاقیں شمار ہوں گی جو بہ دفعات دی جاتی ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ جو انسان نکاح کی گرہ کو اتنا بے حقیقت سمجھتا ہے کہ بہ یک وقت تین طلاقیں دے دیتا ہے، وہ بے حس اور یاوہ گو انسان ہے اور اسے اپنی بے حسی اور یاوہ گوئی کا بوجھ اٹھانا چاہیے اور یہی بات ان کے اس قول سے بھی ظاہر ہوتی ہے: "لوگوں کو جس معاملے میں رخصت و سہولت تھی اس کا دروازہ انہوں نے اپنی عجلت پسندی سے اپنے اوپر خود بند کر لیا ہے۔ اس لیے ہمیں بہ یک وقت تین طلاقوں کو طلاق بائن قرار دینا چاہیے۔" یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ اجتہاد ہے جسے بعد کے کئی فقہاء نے تسلیم نہیں کیا اور آج بھی ممالک اسلامیہ کے علماء کا ایک گروہ اس کا مخالف ہے۔ لیکن اس سے نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر کوئی

Marfat.com

حرف آتا ہے، نہ ان کے مخالف گروہ پر نکتہ چینی کی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے علاوہ دوسرے صحابہؓ اپنی رائے کا اظہار قطعیت ولزوم کے ساتھ نہ کرتے تھے نہ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ جو رائے انہوں نے ظاہر کی ہے بس وہی حق ہے۔ بلکہ وہ اسے ایک رائے کی حیثیت سے پیش کرتے تھے جو صحیح ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور غلط ہے تو رائے پیش کرنے والے کی طرف سے جس پر وہ اللہ کے حضور مغفرت کا طالب ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک شخص سے ملاقات ہوئی جس کا کوئی جھگڑا تھا۔ فاروق اعظمؓ نے اس سے پوچھا: ''تمہارے معاملے کا کیا بنا؟'' بولا: حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ کر دیا۔' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر میں بھی فیصلہ کرتا تو یہی کرتا!'' اس شخص نے کہا: ''تو پھر آپ کو کس نے روکا تھا؟ مقدمہ تو آپ ہی کے سامنے پیش کیا تھا!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''اگر تمہارا فیصلہ مجھے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق کرنا ہوتا تو ضرور کرتا لیکن فیصلہ مجھے اپنی رائی سے کرنا تھا۔ اور رائے مشترک ہے!'' چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے جو فیصلہ کیا تھا فاورق اعظمؓ نے اس سے اختلاف نہ کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک دن اپنی رائے ظاہر کی۔ کسی نے کہا: ''یہ اللہ اور عمرؓ کی رائے ہے!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ڈانٹ کر فرمایا: ''تو نے بہت بُری بات کہی! یہ عمرؓ کی رائے ہے، اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور غلط ہے تو عمرؓ کی طرف سے!'' یہ کہہ کر تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے، پھر فرمایا: ''سنت وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے مقرر فرمائی ہے۔ رائے کی غلطی کو امت کے لیے سنت نہ بناؤ'' اب کہ ہم 'طلاق ثلاثہ بکلمة واحدة'' کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کا ذکر کر چکے ہیں اور ان اسباب پر بھی ہم نے روشنی ڈال دی ہے جن کے پیش نظر فاروق اعظمؓ نے ظاہر نص وحکمت سے اختلاف کیا تھا، مناسب ہے کہ اس کے علاوہ نکاح وطلاق اور بیوی اور ماں کے حقوق سے تعلق رکھنے والے، ان مسائل کی طرف بھی اشارہ کر دیں، جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجتہاد فرمایا اور اس اجتہاد کا بعد کو اسلامی تشریع پر بڑا اثر پڑا۔ انہوں نے متعہ کو ممنوع قرار دے دیا جس پر اہل السنّت والجماعت اس وقت سے آج تک برابر عمل پیرا ہیں۔ پھر انہوں نے صاحب اولاد لونڈیوں کی فروخت روک دی۔ حالانکہ عہد رسالت اور عہد صدیقیؓ میں ان کی بیع وشراء کا رواج تھا۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنے

عہد خلافت میں چاہا کہ اس فروخت پر سے پابندی اٹھالیں اور فرمایا کہ ان کا فروخت نہ کیا جانا ایک ایسی رائے تھی جس پر وہ۔۔۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ۔۔۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ متفق تھے لیکن ان کے قاضی عبیدۃ السلمانی نے کہا: ''جماعت کے بارے میں آپ کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مشترکہ رائے ہمارے نزدیک تنہا آپ کی رائے سے زیادہ محبوب ہے۔'' اس کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اچھا! پھر اسی طرح فیصلہ کرو جس طرح کرتے آئے ہو!''

اور اس کا سبب یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اختلاف کو ناپسند فرماتے تھے۔ مطلقہ عورت کے زمانہ عدت میں کسی دوسرے شخص سے نکاح اور عدت ختم ہونے سے پہلے اس کی میراث وغیرہ کے سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ موجود ہیں جن میں سے اکثر آج بھی مدار عمل سمجھے جاتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شرابی کی جو حد مقرر فرمائی تھی، میں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں سمجھتا، یہ ذکر اس سے پہلے آ چکا ہے۔ یہاں تو میں بس اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو حد خمر کو قیاس سے کام لے کر قرآن کی بیان کردہ حد قذف کے مطابق رکھا ہے یہ بھی ان کا ایک اجتہاد ہے اور رائے، اجتہاد اور قیاس ایک چیز ہیں، اور یہ اجتہاد اس فرماں روا کا ہے جو کتاب وسنت کی حدود میں رہ کر قانون بنانے کا اختیار رکھتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے سلسلے میں جو موقف اختیار کیا تھا، وہ اس کے مستحق تھے، اس لیے کہ فاروق اعظم اللہ اور اس کے رسول پر بڑا پختہ ایمان رکھتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے جو پیام لے کر مبعوث ہوئے تھے، اس کے اتباع کی شدید خواہش ان کے دل میں تھی اور وہ سرکار رسالت کی حدیث وسنت کو اپنا مدار حیات بنانے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات کے بھی انتہائی خواہش مند تھے کہ اللہ کی کتاب ہر آمیزش سے پاک رہے اور وہ ہر ایسی چیز کی راہ میں دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں جو مسلمانوں کو قرآن کریم سے ہٹاتی ہو۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور سرکار دو عالم کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قرآن کے سوا میری کوئی بات نہ لکھواور اگر کسی نے لکھ لی ہے تو چاہیے کہ اسے مٹا دے!'' اور حضور نے فرمایا: ''میرے بعد تم میں اختلاف پیدا ہوگا اگر اس وقت میری طرف سے کوئی بات تمہارے سامنے لائی جائے تو اسے کتاب اللہ کے معیار پر پرکھو، اگر وہ اس پر پوری اترتی ہے تو میری طرف سے ہے اور پوری

نہیں اتری میری طرف سے نہیں ہے۔''[1] اس خواہش کا اظہار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عہد رسالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت بھی کیا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے فرمایا۔۔۔ اور اس وقت کا شانہ نبوت میں چند مسلمان حاضر تھے، جن میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی تھے۔۔۔ ''لاؤ، میں تمہیں ایک تحریر لکھ کر دوں، جس کے بعد تم گمراہ نہیں ہو گے!''[2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درد کی شدت ہے۔ تمہارے پاس قرآن موجود ہے اور کتاب اللہ ہمارے لیے کافی ہے۔'' اہل بیت نے اختلاف کیا اور جھگڑنے لگے۔ ان میں سے

---

1 بعض لوگوں نے اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے پر قدح کی ہے۔ یہاں تک کہ امام شافعی فرماتے ہیں: ''ایک بھی شخص نے یہ روایت کسی ایسے راوی سے بیان نہیں کی جس سے کسی چھوٹی یا بڑی چیز کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ثابت ہو۔'' بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ زندیقوں کی وضع کردہ روایت ہے۔ اس کے باوجود امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں ایک حدیث درج کی ہے جو لفظاً مختلف سہی مگر معنوی طور پر اس حدیث سے کلیتہً مشابہ ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر میرے نام سے کوئی بھلی بات تم سے کہی جائے تو خواہ وہ میں نے کہی ہو یا نہ کہی ہو (اسے مان لو) کہ میں بھلی بات ہی کہتا ہوں، لیکن اگر میری طرف سے منسوب کر کے کوئی بُری بات کہی جائے (تو ہرگز تسلیم نہ کرو) کہ میں بُری بات کبھی نہیں کہتا۔'' لیکن جن لوگوں نے ''اگر میری طرف سے کوئی بات تمہارے سامنے لائی جائے تو اسے کتاب اللہ کے معیار پر پرکھو!'' والی حدیث پر قدح کی ہے، انہوں نے اس حدیث کے معارض دیکھ کر قدح کی ہے جو مقدام ابن معدیکرب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''یاد رکھو! مجھے قرآن اور قرآن کے ساتھ اسی جیسی چیزیں دے کر مبعوث کیا گیا ہے۔ عنقریب ایک شخص مسند پر تکیے سے ٹیک لگائے میری حدیث بیان کرے گا اور کہے گا ہمارے اور تمہارے درمیان کتاب اللہ ہے، جس چیز کو ہم نے اس میں حلال پایا، اسے حلال کر لیا اور جسے حرام پایا اسے حرام قرار دے دیا یاد رکھو! جو چیز اللہ کے رسولؐ نے حرام کی ہے، گویا وہ اللہ نے حرام کی ہے نہ میں اس حدیث اور اس قول میں کہ جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کی جاتی ہے وہ کتاب اللہ کے مندرجات کی مخالف نہیں ہو سکتی، کوئی معارضت نہیں پاتا۔ جس طرح یہ فطری ہے کہ جو بھلی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی جائے وہ حضورؐ نے فرمائی ہے، اس لیے کہ سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم بھلی بات ہی فرماتے ہیں، بُری بات نہیں، بالکل اسی طرح یہ بھی فطری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اس وحی کی مخالف نہ ہو جو اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمائی ہے۔

2 بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''مجھے کاغذ دو! میں تمہیں ایک تحریر لکھ دوں تا کہ تم میرے بعد رستے سے بھٹک نہ جاؤ!'' یا فرمایا: ''دوات اور کاغذ لاؤ! میں تمہیں ایک ایسی تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو گے!'')

Marfat.com

کسی نے کہا: ''کاغذ لاؤ۔ رسول اللہ ﷺ تمہارے کے لیے ایک ایسی تحریر رقم فرمائیں گے، جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو گے اور کچھ لوگوں نے عمرؓ کی بات دہرائی۔ جب حضور رسالتؐ میں مخالفت کا شور بلند ہوا تو آپ نے فرمایا: ''میرے پاس سے چلے جاؤ۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے، مسلمانوں کی یہ انتہائی بدبختی تھی کہ ان کے اس اختلاف اور شور سے رسول اللہ ﷺ وہ تحریر رقم نہ فرما سکے۔''

یوں غیب کا حال تو خدا ہی جانتا ہے، مگر وہ ایک وحی تھی جو اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمائی تھی کہ اگر حضورؐ وہ تحریر رقم فرما دیتے تو مسلمان یقینی طور پر گمراہ نہ ہوتے اور امت اللہ کے ارشاد: وَلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ کے مقتضیٰ سے نکل کر اس کے قول: اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ کے تحت آجاتی۔ لیکن جیسا کہ اللہ پہلے ہی سے جانتا تھا، اسے منظور ہی یہ تھا کہ دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں میں بھی اختلاف پیدا ہو۔'' یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی اسی رائے پر قائم رہے ''ہمارے لیے کتاب اللہ کافی ہے۔'' اور مسلمانوں نے بھی عہد صدیقی اور عہد فاروقی میں اسی رائے کا اتباع کیا۔ حالانکہ ان پر پورے یقین اور قطعیت سے ثابت ہو چکا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات فرمائی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد انہوں نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا: ''تم رسول اللہ ﷺ سے حدیثیں روایت نہ کرو، اور جو کوئی تم سے پوچھے بھی تو کہہ دو ہمارے اور تمہارے پاس کتاب اللہ ہے، اس کے حلال کو حلال سمجھو اور اس کے حرام کو حرام!''

جب خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ملی تو وہ بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اسی نقش قدم پر چلے اور لوگوں کو روایت حدیث سے منع کر دیا کہ ان میں اختلاف پیدا نہ ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس حکم کا اثر یہ ہوا کہ حدیث کی روایت کم ہوئی، یہاں تک کہ ابوعمرو شیبانی کہتے ہیں کہ ''میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا کرتا تھا، وہ ازراہ خوف یہ نہیں کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اور جب کہتے تھے تو ان پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی اور کہتے جاتے تھے، آپ نے اس طرح فرمایا، یا شاید اس کے مشابہ، یا اس کے قریب قریب!'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ان حضرات میں تھے جو عہد فاروقی کے بعد بکثرت حدیثیں روایت کرتے تھے۔ ایک دن ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: ''کیا آپ عہد فاروقی میں بھی اسی طرح حدیثیں روایت کرتے تھے؟'' کہنے لگے: ''اگر میں عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس طرح حدیثیں روایت کرتا تو وہ مجھے اپنے درے سے مارتے۔''

Marfat.com

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرظہ بن کعب کو ایک جماعت کے ساتھ عراق بھیجا اور خود ان کی مشایعت کو نکلے۔ جب مدینہ سے باہر آئے تو ان سے پوچھا: ''تم کو معلوم ہے، میں کیوں تمہارے ساتھ ساتھ آتا ہوں؟'' لوگوں نے کہا: ''جی ہاں! ہماری عزت بڑھانے کو!'' فرمایا: اس کے ساتھ یہ غرض بھی ہے کہ تم لوگ ایسی جگہ جا رہے ہو، جہاں کے لوگوں کی آواز قرآن پڑھنے میں شہد کی مکھی کی طرح گونجتی رہتی ہے۔ انہیں حدیثوں میں نہ الجھا دینا۔ قرآن میں آمیزش نہ کرو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے میں احتیاط برتو۔ میں تمہارا شریک ہوں۔'' چنانچہ جب قرظہ وہاں پہنچے تو اہل عراق نے استدعا کی: ''ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کیجئے۔'' انہوں نے کہا: ''عمر رضی اللہ عنہ نے ہم کو منع کر دیا ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روایت حدیث کو ممنوع قرار دے دیا اور اپنے اس حکم کا نفاذ بڑی شدت سے کیا۔ تاہم بعض ایسے موضوعات پر روایت کا سلسلہ جاری رہا، جن کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو روایت سے نہیں روک سکتے تھے۔ ان میں سب سے اہم مقدمات کے فیصلے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کو حجت اور قیاس کے لیے پیش نظر رکھا جا سکے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت اپنی میراث طلب کرنے آئی۔ انہیں قرآن میں دادی کی میراث کی سلسلے میں کوئی حکم نہ ملا۔ اس پر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ میراث میں دادی کا چھٹا حصہ ہے۔'' حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے ان کی تائید کی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسی کے مطابق فیصلہ فرما دیا۔ ایک شخص نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دروازے کے پیچھے سے تین مرتبہ سلام کیا۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب نہ دیا اور وہ واپس ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے پیچھے آدمی بھیجا اور جب وہ آیا تو دریافت کیا: ''تم واپس کیوں ہو گئے؟'' بولا: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ''اگر تم میں سے کوئی کسی کو تین مرتبہ سلام کرے اور وہ جواب نہ دے تو واپس ہو جاؤ۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کی تائید میں شہادت طلب کی اور اس نے پیش کر دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قضاۃ، کتاب وسنت کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ جب کوئی فریق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث یا سنت ان کے سامنے پیش کرتا تھا تو وہ اس کی تصدیق کرتے تھے اور جب وہ ثابت ہو جاتی تھی تو اس کے مطابق حکم دے دیتے تھے اور آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ''قضاء'' کے سلسلے میں حدیث وسنت سے استشہاد کو ممنوع قرار دے بھی کیسے سکتے تھے؟ روایت حدیث سے تو انہوں نے اس اندیشے کی بناء پر روکا تھا کہ اس طرح روایت کا سلسلہ بڑھ جائے گا۔ کچھ لوگوں کو ان کی

مصلحت، وضع احادیث پر مجبور کرے گی اور وہ ان کو صحیح ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کے جال بنیں گے۔ اس طرح جعلی حدیثوں کا ایک انبار لگ جائے گا۔ چنانچہ جس طرح اس سے پہلے انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن کا مشورہ دیا تھا۔ اسی طرح اب تدوین حدیث کے متعلق سوچنا شروع کیا کہ احادیث کا مجموعہ مرتب کر دیا جائے اور اس کے سوا کوئی حدیث بیان نہ کی جائے۔ لیکن جب انہوں نے اس مسئلے پر غور کیا تو تذبذب میں پڑ گئے۔ آخر کار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بلا کر ان سے مشورت چاہی۔ اکثریت نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور مشورہ دیا کہ حدیثیں لکھ کر محفوظ کر دی جائیں۔ وہ مسلسل ایک مہینے تک اس کے متعلق سوچتے اور اللہ سے استخارہ کرتے رہے کہ یہ کام کریں یا نہ کریں۔ ایک دن صبح اٹھے تو گویا اللہ نے انہیں ایک ارادہ بخش دیا تھا۔ لوگوں سے فرمایا: ''جیسا کہ تمہیں معلوم ہے میں نے تم سے کتابت حدیث کا ذکر کیا تھا، لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ تم سے پہلے اہل کتاب نے اللہ کی کتاب کے ساتھ ساتھ اور کتابیں بھی مرتب کی تھیں، وہ ان کتابوں کی طرف ڈھل گئے اور اللہ کی کتاب کو انہوں نے چھوڑ دیا، لیکن بخدا! میں کتاب اللہ میں ہرگز کوئی آمیزش نہیں ہونے دوں گا۔''

چنانچہ کتابت حدیث کا خیال فاروق اعظمؓ نے ترک کر دیا اور اس کے متعلق سلطنت کے گوشے گوشے میں لکھ بھیجا ''جس کے پاس کوئی حدیث ہو اسے محو کر دے! فاروق اعظمؓ کے بعد احادیث کی وضع و اشاعت کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے بنو امیہ اور بنو ہاشم کی عداوت و دشمنی کے جذبات از سر نو بھڑکے، پھر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوئی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ کی، جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینے والوں نے ان کا ساتھ دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں اور ان کے خلاف حدیثوں کی اتنی کثرت ہوئی کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں ان سے انکار کیا اور فرمایا: ''ہمارے پاس کوئی کتاب نہیں ہے جو ہم تمہیں پڑھ کر سنائیں، سوائے قرآن کی آیات اور اس صحیفے کے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا ہے اور جس میں صدقے کے احکام و فرائض ہیں۔''

لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشاد کے باوجود واضعین حدیث اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے اور لوگوں کو اپنی اغراض کی طرف بلاتے، یا ان فضائل کو عام کرنے کے لیے حدیثیں وضع کرتے رہے، جن کے متعلق وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بنا کر پیش کیا گیا تو لوگ

Marfat.com

زیادہ ذوق وشوق کے ساتھ ان کا اتباع کریں گے، تا آنکہ سیاسی اور غیر سیاسی اغراض کے تحت موضوع حدیثوں کی یہ بھرمار ہوگئی کہ ان میں سے اکثر حدیثوں کو کتاب اللہ کے منافی دیکھ کر مسلمان کانپ اٹھے۔ خلفائے بنوامیہ کے عہد میں جعلی حدیثوں کو روکنے کی جتنی کوششیں کی گئیں، سب کی سب اکارت گئیں بلکہ روز بروز ان میں اضافہ ہوتا گیا۔ پھر جب خلافت عباسیہ کا دور شروع ہوا اور رسول اللہ ﷺ کی وفات کے تقریباً دو صدی بعد مامون کا زمانہ حکومت آیا، تو یہ جعلی حدیثیں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوگئیں اور ان کے ذریعے ایسے ایسے اختلافات اور ایسے ایسے فتنوں کو ہوا دی گئی جو تصور میں بھی نہیں آ سکتے۔ اس کا اندازہ آپ صرف اس بات سے کر سکتے ہیں کہ امام بخاریؒ کو چھ لاکھ سے زیادہ متداول حدیثیں ملیں جن میں چار ہزار سے زیادہ ان کے نزدیک صحیح ثابت نہ ہوسکیں اور امام ابوداؤد نے پانچ لاکھ حدیثیں جمع کیں جن میں صرف چار ہزار آٹھ سو حدیثیں ان کے معیار صحت پر پوری اتر سکیں۔ پھر جامعین حدیث نے جن احادیث کو صحت کی سند دی تھی ان میں سے بھی اکثر حدیثوں پر علماء وفقہاء نے جرح کی ہے، اس لیے اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے زمانے کی مسلمہ احادیث وسنن کو جمع کر جاتے تو ان کے بعد وضع احادیث کا سلسلہ ختم ہو جاتا، اور امام دارقطنی کے الفاظ میں جھوٹی حدیثوں کے ہجوم میں صحیح حدیث کی وہ حیثیت نہ ہوتی جیسی سیاہ بیل کی جلد پر سفید بال اور بہت ممکن ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ بات بھی پوری ہو جاتی کہ: ''عہد فاروقی کی حدیثوں کو مدار عمل بناؤ کیونکہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کرنے سے ڈراتے تھے۔''

لیکن ایسا نہیں ہوا اور روایت حدیث کی کثرت ہوگئی۔ لوگ نہ جانتے تھے کہ کون سی حدیث عہد فاروقی کی ہے اور کونسی بعد کو وضع کی گئی ہے۔ اس سے حدیثیں وضع کرنے کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں اور آپ کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے، خاص طور پر یہ دیکھ کر کہ مامون کے عہد میں حدیثوں کی تعداد چھ لاکھ تک پہنچ گئی تھی جن میں صرف چار ہزار حدیثیں صحت کی کسوٹی پر کھری ثابت ہوسکیں اور پھر ان میں سے بہت سی حدیثیں بعد کے علماء کے طعن وتکذیب کا ہدف بنیں، لیکن دل میں یہ شبہ پیدا ہونے کے باوجود آپ فاروق اعظمؓ پر غلطی کا حکم لگانے میں انصاف سے دور ہوں گے۔ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کے بعد مسلمانوں کی زمام امارت جن لوگوں کے ہاتھ میں جائے گی وہ امتناع روایت حدیث میں فاروقیؓ طرز عمل ہی اختیار کریں گے، اور ان کی تقلید میں کثرت سے حدیثیں روایت

Marfat.com

کرنے والوں کو، قید میں ڈلوادیں گے لیکن ان خلفاء نے ایسا نہیں کیا اور نہ صرف یہ کہ جان بوجھ کر ان احادیث کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں جو سیاسی اور غیر سیاسی اغراض کے تحت وضع کی گئی تھیں، بلکہ ان میں سے بعض نے تو واضعین حدیث کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ اس لحاظ سے گناہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نہیں، ان خلفاء کا ہے، خاص طور پر سب سے بڑے مجرم اور سب سے بڑے گنہگار وہ خلفاء ہیں جنہوں نے وضع احادیث کے فتنے کو سہارا دیا۔ ان حالات میں آپ خود ہی بتایئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قصوروار ٹھہرانا کس حد تک قرین انصاف ہے؟

فرض کیجئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کتابت حدیث کا حکم دے دیتے اور ان کے بعد فتنہ پیدا ہوتا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، بنوامیہ اور بنوہاشم میں خانہ جنگی کے شعلے بھڑکتے اور اس جنگ اور اس فتنے میں احادیث نبویؐ کی روایت کو پروپیگنڈے کا ایک آلہ بنا کر استعمال کیا جاتا تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ لوگ اس وقت ان من گھڑت حدیثوں کی کتاب وروایت سے باز رہتے؟ یا آپ کا خیال یہ ہے کہ سیاسی مبلغین ان موضوع حدیثوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے احادیث نبویؐ جمع کرائی تھیں، اسی طرح یہ لوگ بھی ان جعلی حدیثوں کی جمع وترتیب میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے۔ پھر مفاد پرست اپنے سرکاری اقتدار کے بل پر ان میں ایسے ایسے اضافے کرتے جو بعد کو امام بخاری اور دوسرے ائمہ حدیث کے مجموعوں میں کسی نے نہیں کیے۔ اس کے بعد کیا عجب تھا اگر ان سرکاری مجلدات کو وہ مذہبی قیمت حاصل ہو جاتی جس کے متعلق اندیشے کا اظہار کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: ''بخدا! میں کتاب اللہ میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہونے دوں گا!'' اور یہ کہ۔۔۔ ''مجھے خیال آیا کہ تم سے پہلے اہل کتاب نے اللہ کی کتاب کے ساتھ ساتھ اور کتابیں بھی مرتب کی تھیں، وہ ان کتابوں کی طرف ڈھل گئے، اور اللہ کی کتاب کو انہوں نے چھوڑ دیا۔''

اگر فاروق اعظمؓ حدیثیں لکھوا لیتے اور اس کے بعد نہ فتنہ پیدا ہوتا نہ جھوٹی حدیثیں وضع کی جاتیں اور نہ ان کی کثرت اس حد کو پہنچتی کہ اس میں صحیح حدیث کی مثال ایسی ہوتی جیسے سیاہ بیل کی جلد میں سفید بال تو اس وقت ان کا وہ اندیشہ اور بھی یقینی ہو جاتا جس کا اظہار انہوں نے اپنے متذکرہ فقروں میں کیا ہے اس لیے کہ ان کی کتاب اس سند سے خالی ہوتی جو حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع کرتی، بلکہ جو حدیثیں بیان کی جاتیں ان کے متن ونسبت کی تحقیق حضرت

Marfat.com

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ یا دوسرے کبار صحابہؓ کے ذمے ہوتی اور وہ ثابت کرتے کہ یہ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کا کلام ہے، اس وقت لوگوں کے سامنے دو کتابیں ہو جاتیں، جن کا زمانہ تدوین قریب قریب ہوتا، ایک وہ کتاب جو اللہ نے لوگوں تک پہنچانے کے لیے اپنے رسول ﷺ پر نازل فرمائی تھی اور دوسری وہ کتاب جو رسول اللہ ﷺ کے فرمودات پر مشتمل ہوتی اور اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اندیشہ حقیقت کی صورت اختیار کر لیتا کہ لوگ کتاب اللہ کو چھوڑ کر کتاب حدیث کی طرف ڈھل جائیں گے۔ اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے احتیاط برتی اور وہ اپنی احتیاط میں پوری طرح کامیاب ہوئے کیونکہ کتاب اللہ، جو اللہ نے لوگوں کے لیے ہدایت ورحمت اور نور بنا کر اپنے رسولؐ پر نازل فرمائی تھی، آج تک لوگوں کے سامنے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور بعد کو تحقیق پیشہ جامعین نے رسول اللہ ﷺ کی جو احادیث ان کے راویوں کی سند کے ساتھ جمع کی ہیں، انہیں کوئی کتاب اللہ میں نہیں ملاتا نہ کوئی ان کی وجہ سے قرآن کو چھوڑ کر محض انہیں پر تکیہ کرتا ہے بلکہ لوگ ان حدیثوں کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یہ احترام صاحب سند کی حیثیت اور مرتبے کے مطابق ہوتا ہے۔ پھر اس احترام سے احادیث کی بحث وتمحیص میں بھی کوئی خلل نہیں پڑتا اور ناقدین حدیث انہیں قرآن کی کسوٹی پر کستے اور ان کے متن وسند پر، آزادی کے ساتھ جرح وتعدیل کرتے ہیں۔ کیا اتنا کچھ پڑھ لینے کے بعد بھی آپ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ چاہے آپ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن تدوین حدیث کا خیال اور بالآخر اس کا ترک ان کا ایک بالکل جائز اجتہاد تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جو اجتہادات آپ نے پڑھے، واقعی اس لائق تھے کہ مسلمانوں کے دل ان سے مطمئن ہو جاتے اور وہ ہوئے بھی۔ اس اعتبار سے اگر آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو امام المجتہدین کے لقب سے موسوم کریں تو کر سکتے ہیں اور کوئی آپ کو اغراق یا مبالغے کا الزام نہیں دے سکتا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نظری اجتہاد کا کبھی قصد نہیں کیا اور نہ اس سے خوش ہوئے جس کی وجہ ان کا یہ علم تھا کہ نظری اجتہاد، اختلاف کی طرف لے جاتا ہے اور وہ اختلاف کو سب سے زیادہ ناپسند فرماتے تھے۔ ایک دن انہوں نے سنا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اس مسئلے میں اختلاف کر رہے ہیں کہ نماز ایک کپڑے میں پڑھی جائے یا دو کپڑوں میں؟ رسول اللہ ﷺ کے دو صحابی آپس میں اختلاف کرتے ہیں۔ آج کے بعد میں تم سے دو

آدمیوں کو کبھی اختلاف کرتے نہ سنوں ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا!" وہ فرمایا کرتے: "آپس میں اختلاف نہ کرو! اگر تم نے ایسا کیا تو تمہاری آئندہ نسلیں اس سے بھی زیادہ اختلاف کریں گی۔" عدم اختلاف کی دعوت شروع اسلام ہی سے ان کی رائے تھی۔ چنانچہ جب کوئی رسول اللہ ﷺ سے غیر واقعی اور وہمی امور کے متعلق پوچھتا تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس پر لعنت بھیجتے تھے۔ اس کے بعد جب وہ مسند نشین خلافت ہوئے تو اتحاد بین المسلمین کا جذبہ ان میں اور شدت پکڑ گیا، یہاں تک کہ وہ اس وقت تک اس مسئلے پر بحث و مباحثہ سے ہاتھ نہ اٹھاتے تھے، جب تک صادر کی جانے والی رائے کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہ ہو جاتے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں فرماتے ہیں: "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ وہ صحابہؓ سے مشورہ و مباحثہ کرتے تھے تا آنکہ تاریکی دور ہو جاتی تھی اور ان کا ضمیر اس مسئلے پر اپنے اطمینان کا پوری طرح اظہار کر دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر فیصلے اور فتوے مشرق و مغرب میں قابل تقلید سمجھے جاتے ہیں۔"[1] اور اسی لیے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: "جب عمر رضی اللہ عنہ کوئی راہ اختیار کر لیتے تو وہ ہمارے لیے آسان ہو جاتی تھی۔" فقہ اسلامی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کی جتنی احسان مند ہے وہ سیاست اسلامی کی اس احسان مندی سے کسی طرح کم نہیں جو سلطنت کے قیام میں ان کی اصابت رائے اور صدق عزم و ایمان کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ انہوں نے فقہ میں وہ اصول و نظریات مقرر کیے جنہیں بعد کو آنے والوں نے اپنا مدار عمل بنایا اور اس بات کو کہ ان کا صدور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذات سے ہوا ہے، ان اصول و نظریات کی صحت کی دلیل سمجھا۔ ان میں سے اکثر مہتم بالشان اثر رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ آج تک اسلامی فقہ اور اس کے علاوہ دوسرے قوانین کو عمومی حیثیت سے شامل ہیں، کیونکہ وہ ایسے عالمگیر اصول ہیں جو نقض و شکست کو اپنے پاس تک نہیں پھٹکنے دیتے۔ ان اصولوں میں سے ایک ضرورت کا اصول ہے۔ قرآن نے قتل، چوری، زنا، تہمت اور رہزنی کی حدود مقرر کی ہیں جو اللہ کی حدود ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (المائدہ: ۴۷)

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، جلد ۱، ص ۱۰۵۔

ترجمہ: اور جولوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی فاسق ہیں۔"

اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بہتر سمجھا کہ سزا ضرورت کے تحت دی جائے اور اس رائے کی سند اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو بنایا:

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (البقرہ:۱۷۳)

ترجمہ: "ہاں! جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھالے، بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو، یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

ایک دن پیش گاہ فاروقی میں ایک زانیہ کو حاضر کیا گیا اس نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے رجم کرنے کا حکم دے دیا۔ اس پر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "بہت ممکن ہے وہ معذور ہو!" پھر اس عورت سے پوچھا: "تمہیں اس فعل پر کس چیز نے مجبور کیا؟" وہ بولی "میرا ایک شیریک ہے، اس کی اونٹیوں کے تھنوں میں پانی اور دودھ تھا۔ لیکن میری اونٹیوں کے تھن خشک تھے، میں پیاسی تھی، میں نے اس سے پانی مانگا، لیکن اس نے کہا کہ جب تک تم اپنے نفس کو میرے سپرد نہ کرو گی میں تمہیں پانی نہیں پلاؤں گا۔ میں نے تین مرتبہ انکار کیا، لیکن جب مجھے پیاس کی شدت سے اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی تو میں اس کی بات ماننے پر مجبور ہوگئی اور اس نے مجھے پانی پلا دیا۔" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اللہ اکبر! فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" سنن بیہقی میں ابوعبدالرحمن السلمی سے ایک روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت لائی گئی جسے پیاس نے بے جان کر دیا تھا۔ وہ چرواہے کے پاس گئی اور اس سے پانی مانگا، لیکن چرواہے نے کہا کہ جب تک تو اپنا جسم میرے حوالے نہ کرے گی، میں تجھے پانی نہیں پلاؤں گا اور اس نے چرواہے کی بات مان لی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے رجم کرنے یا نہ کرنے کے متعلق مسلمانوں سے مشورہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "وہ مجبور تھی۔ میری رائے میں اسے چھوڑ دینا چاہیے!" اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے چھوڑ دیا۔

روایت ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں نے مزینہ کے ایک شخص کا اونٹ چرا لیا۔ انہیں امیر المؤمنین کی خدمت میں پیش کیا گیا، مجرموں کے اقرار جرم پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کثیر بن

صلت کو ان کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا لیکن جب کثیر جانے لگے تو انہیں واپس بلایا اور اس کے بعد کہا: ''بخدا! اگر میں یہ نہ جانتا ہوتا کہ تم غلاموں سے کام لیتے ہو اور پھر انہیں اس حد تک بھوکا مارتے ہو کہ خدا کی حرام کی ہوئی چیزیں ان کے لیے حلال ہو جاتی ہیں تو میں ضرور ان کے ہاتھ کٹوا دیتا۔'' اس کے بعد روئے سخن عبدالرحمن بن حاطب بن ابی بلتعہ کی طرف کیا اور کہا: ''خدا کی قسم! اگر میں نے ان کے ہاتھ نہیں کٹوا دیے تو میں تم پر ایسا تاوان ضرور ڈالوں گا، جس سے تمہیں تکلیف ہوگی۔'' پھر فرمایا: ''اے مزنی! تمہارا اونٹ کتنی قیمت میں تم سے خریدا جا سکتا تھا؟'' بولا چار سو درہم میں!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابن حاطب سے کہا: ''جاؤ اور اسے آٹھ سو درہم دیدو!'' اور چوری کرنے والے غلاموں پر حد معاف کردی اس لیے کہ حاطب نے انہیں بھوکا مار کر چوری پر مجبور کیا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قائم کردہ اصولوں میں ایک اصول پیش گاہ عدالت میں فریقین کی مساوات ہے، جس کا رواج آجکل اکثر مہذب قوموں میں پایا جاتا ہے۔ اس کے متعلق، جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں انہوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور دوسرے قاضیوں کو تحریری حکم بھیجا تھا اور خود اپنے احکام میں بھی اسے انتہائی باریک بینی کے ساتھ روبہ عمل لاتے تھے، اس سلسلے میں جو کچھ انہوں نے کیا اس کی مثالیں ہم اس سے پہلے بیان کر آئے ہیں۔ اس خصوص میں جبلہ بن ایہم غسانی کا قصہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح ایک واقعہ وہ ہے جب ایک یہودی نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے خلاف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عدالت میں مقدمہ پیش کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جو مقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے نزدیک تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: ''ابوالحسنؓ! اٹھو! اور اپنے مدعی کے مقابل جا کر بیٹھو!'' یا یہ فرمایا: ''ابوالحسنؓ! جس جگہ مدعی ہے، وہاں جاؤ!'' حضرت علی رضی اللہ عنہ فریق مخالف کے قریب پہنچے اور اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پر ناگواری کا اثر تھا۔ جب مقدمہ ختم ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''علیؓ! کیا اپنے مخالف فریق کے سامنے بیٹھنا تمہیں ناگوار ہوا؟'' روایت آگے چل کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ جواب نقل کرتی ہے کہ ''ہرگز نہیں لیکن مجھے یہ بات گراں گزری کہ آپ نے ابوالحسن کہہ کر ہمارے درمیان مساوات نہیں برتی!'' مطلب یہ تھا کہ کنیت میں تعظیم کا پہلو نکلتا ہے، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد اس حقیقت کی نفی نہیں کرتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پیش گاہ عدالت میں فریقین کے درمیان مساوات برتنے کے شدید خواہش مند تھے اور وہ اس انصاف کا

Marfat.com

سب سے پہلا تقاضا سمجھتے تھے جو قاضی کے اپنے خاص اندازے یا کسی فریق سے اس کی محبت یا نفرت کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

اس مساوات کے اثر اور مستغیث کے دل میں اس کی اطمینان آفرینی کا اظہار ایک دلچسپ گفتگو سے ہوتا ہے، جو ابن طباطبا نے اپنی کتاب "الفخری فی الاداب السلطانیہ" میں نقل کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص سے کہا: "میں تجھ سے محبت کرتا ہوں!" اس شخص نے پوچھا: "آپ میرے حق میں سے کچھ کم کرنا چاہتے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ "نہیں۔" بولا: "تو پھر محبت سے عورتوں کے سوا کوئی خوش نہیں ہو سکتا۔" شاید آپ یہ گمان کریں کہ پیش گاہ عدالت میں مساوات کا اصول کوئی فقہی اجتہاد نہیں ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد پر گفتگو کے سلسلے میں اس کا ذکر ایک ایسی تجویز ہے جسے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن حقیقتاً یہ عین اجتہاد ہے، اس لیے کہ اکثر قوموں میں بھی اسے حال ہی میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں میرے لیے صرف انہیں امتیازات کا ذکر کر دینا کافی ہوگا جو ابھی کچھ دن پہلے تک اجنبیوں کے لیے سلطنت عثمانیہ کے دستور قانون میں موجود تھے اور مصر میں بھی اگرچہ بڑی حد تک یہ امتیازات ختم ہو گئی ہیں، پھر بھی انکا کچھ نہ کچھ اثر ابھی تک باقی ہے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قائم کردہ یہ اصول ایک مکمل فقہی اور تمام تر اجتہادی کارنامہ تھا۔ پھر اس کے ساتھ جب آپ یہ خیال کریں گے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں جو ہنگامے یورپ میں برپا ہوئے ان کا سب سے پہلا مقصد قانون و عدالت کے سامنے اسی مساوات کا حصول تھا اور انقلاب فرانس نے جو اصول وضع کر کے انہیں انسانی حقوق کے چارٹر کی حیثیت سے پیش کیا تھا، ان میں اولیت، مساوات کے اصول ہی کو حاصل تھی، تو آپ کو اس میں کوئی شبہ نہ رہے گا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اجتہادی نظریہ، عین فقہ تھا اور اسی کے ذریعے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے انقلاب و ترقی کے ان مرحلوں میں عرب کی رہنمائی کی جنہوں نے عربوں کو خانہ بدوشی کی غیر مہذب زندگی سے نکال کر، جو حکومت و عدالت کے عام اصولوں سے ناآشنائے محض تھی، تہذیب و حضارت کی دولت سے مالا مال کر دیا اور وہ اسلامی نظام کے اس کاخ بلند پر فائز ہو گئے جو قانون اور قانون کا نفاذ کرنے والوں کی نظر میں مساوات کی اساس پر قائم تھا۔

جن مسائل کے متعلق کتاب اللہ میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے۔ ان کی تفصیل و توضیح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ اجتہاد ہے جو فقہ کے اسی اصل و جوہر پر مبنی ہے جس سے عربی زندگی میں بنے

Marfat.com

حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کام لیا۔ قرآن نے وراثت کا ایک ایسا نظام قائم کیا جسے قبل از اسلام کوئی نہ جانتا تھا اور وراثت کے تمام حق داروں کا حق ٹھہرایا۔ لیکن بعض تفصیلات ایسی بھی تھیں، جن کے متعلق اس نظام میں کوئی حکم نہ تھا۔ دادی کی وراثت کے سلسلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا واقعہ آپ پڑھ آئے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے بھی اسی طرح کے مسائل پیش کیے گئے جن کے متعلق کتاب وسنت میں کوئی حکم نہ تھا اس لیے انہیں چاروناچار اجتہاد رائے سے کام لینا پڑا، انہیں مسائل میں وہ مشہور مسئلہ بھی ہے جسے ''مسئلہ عمریہ'' یا مسئلہ حجریہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک ترکہ تقسیم کیا گیا تو انہوں نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ سگا بھائی ماں اور باپ دونوں کی طرف سے بھائی ہوتا ہے۔ لہٰذا سگے بھائی کو ترکے سے محروم کرنا انصاف سے بعید ہے۔ اور اسی لیے فرمایا: ''فرض کرو اس کا باپ پتھر ہی تھا۔'' اور ایک روایت میں ہے گدھا ہی تھا اور سگے بھائی کو ترکہ دلوایا، لیکن اخیافی بھائی دوسرے اخیافی بھائیوں کے ساتھ ترکے میں شریک ہوتا ہے۔

شام کے طاعون عمواس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو میراث کی بہت سی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ طاعون میں ہزاروں آدمی لقمہ اجل بن گئے تھے اور اس کی وجہ سے ترکے کی تقسیم میں ایسی ایسی الجھنیں پیدا ہو گئی تھیں کہ انہیں سلجھانے کے لیے دنیا کی بڑی سے بڑی عدالت گاہیں بھی مدتوں مصروف رہتیں۔ جب فضا جراثیم سے پاک ہو گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بنفس نفیس شام تشریف لے گئے اور معاملات حکومت کی تدبیر و تنظیم کے بعد جو دوسرے کام وہاں کیے ان میں تقسیم میراث بھی تھی۔ چنانچہ حقیقی وارثوں کو ان کا حصہ دلوایا اور ایک ایک وارث کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا۔ یہ معاملہ کتنا نازک تھا اور اس سے کیسے کیسے جھگڑے پیدا ہو سکتے تھے، اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ میرا مقصد ان میں سے کسی چیز کی تفصیل بیان کرنا نہیں ہے۔ میں تو یہاں از راہ تحسین و تعظیم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اجتہاد کی طرف اشارہ کر رہا ہوں کہ انہوں نے ایک ایسے دشوار مسئلے کو چند ہفتوں میں اس طرح حل کر دیا کہ تمام مسلمان مسرور و مطمئن ہو گئے، حالانکہ اس مسئلے سے ان کے مخصوص مفادات وابستہ تھے اور یہ آخری اور قطعی دلیل ہے اس بات کی کہ جو اجتہاد بے غرضانہ انصاف پر مبنی ہوتا ہے لوگ اس سے یقینی طور پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

اب میں ایک ایسے مسئلے کی طرف آتا ہوں جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد تھا نوزائیدہ سلطنت سے متعلق ان کی عام سیاست اور اس شدید خواہش کا جو سلطنت کے بدلتے ہوئے

Marfat.com

حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ان کے دل میں تھی اور یہی اجتہاد تھا جس کی بدولت سلطنت میں برابر وسعت و کشادگی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ اس اجتہاد کا تعلق اس سرزمین سے تھا، جو عراق وشام میں بزور شمشیر فتح کی گئی تھی۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ عراق وشام کے مسلمان قادسیہ پر ظفر یاب ہو گئے تھے انہوں نے مدائن، جلولا، حمص اور حلب وغیرہ شہروں پر فتح حاصل کر لی تھی اور وہاں بے شمار مال غنیمت ان کے ہاتھ لگا تھا جس کا خمس الگ کر کے وہ امیر المؤمنین کی خدمت میں روانہ کر دیتے تھے اور جو باقی بچتا تھا، نصرت یاب فوجوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ یہ تقسیم اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق تھی:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (الانفال:41)

ترجمہ: ''اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور رشتے داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔''

چنانچہ جب انہوں نے عراق میں سواد کی زمین فتح کی تو اسے بھی اسی طرح تقسیم کرنا چاہا، یعنی اس کا پانچواں حصہ بیت المال کو دے دیا جائے اور باقی ان مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے جو اس کی فتح میں شریک تھے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زمین کی تقسیم سے اختلاف کیا اور فرمایا: ''پھر ان مسلمانوں کا کیا بنے گا جو بعد کو آئیں گے اور دیکھیں گے کہ زمینیں اور ان کے کاشت کار فاتحین میں تقسیم کر دیے گئے ہیں اور آبائی وراثت کے حقوق نے دوسروں کو ان سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا ہے۔ نہیں! یہ کوئی رائے نہیں ہے!'' حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کیا یہ زمینیں اور ان کے غیر مسلم کاشت کار اللہ نے انہیں (فاتحین) فتح میں نہیں دیے؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں جواب دیا ہے تو یہی بات جو تم کہہ رہے ہو، لیکن میری رائے اس کے حق میں نہیں ہے۔ واللہ! میرے بعد ایسا کوئی شہر فتح نہ ہوگا جس سے اتنا بڑا نفع حاصل ہو، بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ الٹا مسلمانوں پر بوجھ بن جائے۔ پس اگر عراق وشام کی زمینیں اور ان کے کاشت کار فاتحین میں تقسیم کر دیے گئے تو سرحدوں کی حفاظت کیسے ہوگی اور عراق وشام کے شہروں کی بیواؤں اور یتیموں کی کفالت کیوں کر کی جا سکے گی؟''

فاتحین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس دلیل سے مطمئن نہ ہوئے اور اپنے مطالبے پر اڑے رہے۔

Marfat.com

انہوں نے کہا: ''ہماری تلواروں کے ذریعے جو مال اللہ نے ہمیں عنایت فرمایا ہے کیا وہ آپ ان لوگوں کی خاطر ہمیں نہیں دیں گے جو لڑائی میں موجود نہیں تھے؟'' لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی رائے پر قائم رہے اور صرف اتنا فرمایا: ''میری رائے یہی ہے!'' حضرت عمر کا یہ اصرار دیکھ کر ان لوگوں نے کہا: ''اچھا، تو مشورہ فرما لیجیے!'' حضرت عمر نے مہاجرین اولین کو جمع کیا اور ان میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اپنی اسی بات پر جمے رہے کہ فاتحین کے حقوق ان میں تقسیم کر دیے جائیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ہم خیال ہو گئے۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انصار کے دس اعیان واشراف کو بلوایا..... جن میں پانچ قبیلہ اوس کے تھے اور پانچ قبیلہ خزرج کے..... اور ان سے کہا: ''میں نے آپ حضرات کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ آپ اس امانت کی ادائیگی میں میری مدد کریں۔ جو میں نے آپ ہی لوگوں کی صلاح وفلاح کے لیے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ آخر میں بھی تو آپ حضرات کی طرح جماعت کا ایک فرد ہوں۔ آج آپ حق کا اعتراف کرتے ہیں۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ کون میرا مخالف ہے اور کون موافق، نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ خواہ مخواہ میری خواہش کی تائید کریں۔ اللہ کی کتاب آپ کے پاس موجود ہے، اور وہ ناطق بالحق ہے۔ قسم بخدا! جس مسئلے پر میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں اس سے میری مراد حق کے سوا اور کچھ نہیں!'' وہ بولے ''فرمایئے امیر المؤمنین! ہم سُن رہے ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ان لوگوں کی بات آپ نے سن لی ہے، جو مجھے سمجھتے ہیں کہ میں ان کے حقوق پر دست اندازی کر رہا ہوں، حالانکہ میں ظلم کی راہ اختیار کرنے سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ اگر میں ان کی کسی چیز کسی اور کو..... ازراہ ظلم..... دے رہا ہوں تو یہ میری بدبختی ہے، لیکن میں نے دیکھا کہ ارض کسریٰ میں اب کوئی جگہ نہیں جو ہمیں فتح کرنی ہو۔ اللہ نے ان کے اموال اور ان کی زمینیں..... کاشتکاروں سمیت..... ہمیں عطا فرما دی ہیں، چنانچہ میں نے غنیمت کا مال تو انہیں میں تقسیم کر دیا اور خمس نکال کر اس کے مصرف میں لے آیا کہ میں اس کا مجاز تھا اور زمینوں کے متعلق یہ مناسب سمجھا کہ وہ عجمی کاشت کاروں ہی کے پاس رہنے دوں اور ان پر لگان عائد کروں۔ جزیہ وہ پہلے ہی سے دیتے ہیں۔ اس طرح یہ دونوں محاصل مسلمانوں کے لیے..... جن میں مجاہدین، عیال واطفال اور آئندہ نسلیں بھی شامل ہیں..... فے ہو جائیں گے دیکھو! یہ سرحدیں ہیں جن پر حفاظتی چوکیاں قائم کرنی ناگزیر ہیں۔ یہ بڑے بڑے شہر ہیں جن کی نگرانی

فوجی چھاؤنیوں کے بغیر ناممکن ہے اور ان دونوں چیزوں کے لیے روپے ہونا اشد ضروری ہے۔ پھر ان محافظین کو تنخواہیں کہاں سے دی جائیں گی اگر زمینیں اور ان کے بونے جوتنے والے (غلام بنا کر) مسلمانوں میں تقسیم کر دیے گئے؟''

الغرض فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اپنی رائے سے نہ ہٹے انہوں نے اپنی اس رائے کے سلسلے میں کتاب وسنت کے کسی حکم کا نہیں بلکہ مملکت اور اس کی سیاست کے عام مفاد کا سہارا لیا تھا اور اس اعتبار سے یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک اجتہادی رائے تھی جس کی تائید میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایسی محکم دلیلیں پیش فرمائی تھیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور انصار رضی اللہ عنہم کے وہ دس افراد ان سے مطمئن ہو گئے، جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے استدلال نے لاجواب کر دیا تھا، چنانچہ ان سب نے یک زبان ہو کر کہا: ''رائے آپ ہی کی درست ہے۔ جو کچھ آپ نے سوچا اور فرمایا ہے، ہم اسے تسلیم کرتے ہیں۔ واقعی اگر ان سرحدوں اور شہروں میں حفاظتی چوکیاں اور فوجی چھاؤنیاں قائم نہ کی گئیں اور محافظین کی گزر بسر کے لیے ان کے روزینے مقرر نہ کیے گئے تو کفار دوبارہ اپنے شہروں پر قبضہ کر لیں گے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی رائے پر اطمینان ہو گیا اور ان کے مخالفین کے لیے سرتابی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''اب ایک ایسے شخص کا انتخاب اور رہ جاتا ہے جس میں عقل بھی ہو اور تجربہ بھی تاکہ وہ زمینوں کی صحیح پیمائش کرے اور غیر مسلم کاشت کاروں پر ان کی برداشت سے زیادہ ٹیکس نہ لگائے۔'' سب نے عثمان بن حنیف کے نام پر اتفاق کیا اور کہا ''انہیں اس اہم خدمت پر مامور فرمائیے! ان کے پاس نظر ہے، عقل ہے اور تجربہ ہے۔'' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں سواد کا والی بنا دیا۔ عثمان بن حنیف کے حسن انتظام کا اندازہ اس سے کیجیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت سے ایک سال پہلے صرف کوفہ سے ایک لاکھ درہم ٹیکس وصول ہوا اور اس زمانے میں درہم ایک مثقال کا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں جو رائے قائم فرمائی تھی اس کی بہترین تصویر ان کا وہ خط ہے جو انہوں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے اور اس کی صحت پر مطمئن ہونے کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا۔ اس خط میں انہوں نے تحریر فرمایا: ''مجھے تمہارا خط ملا، جس میں تم نے لکھا ہے کہ لوگ تم سے اس مال غنیمت کی تقسیم کا مطالبہ کر رہے ہیں جو اللہ نے انہیں بخشا ہے، جس وقت میرا یہ خط تمہیں ملے، پہلے اس مال اور ان چوپایوں کا جائزہ لو، جو لوگوں نے لشکر میں جمع کیے ہیں اور پھر ان سب کے

Marfat.com

لیے چھوڑ دو جو ان زمینوں میں کام کرتے ہیں تا کہ ان کی آمدنی سے مسلمانوں کو وظیفے دیئے جا سکیں، اگر تم نے وہ بھی مجاہدین میں تقسیم کر دیں تو آئندہ نسلوں کے لیے کچھ باقی نہ رہے گا۔"

اسی قسم کی گفتگو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب کے درمیان فتح شام کے بعد ہوئی۔ یہ حضرات دو یا تین دن تک برابر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بحث و گفتگو کرتے رہے۔ مسلمان چاہتے تھے کہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ بھی شام کی زمینیں ان میں تقسیم کر دیں، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمینیں تقسیم فرما دی تھیں اور اس مطالبے میں حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ پیش پیش تھے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کو بھی وہی جواب دیا جو ارض عراق کے سلسلے میں گفتگو کرنے والوں کو دیا تھا: "اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کے لیے کچھ باقی نہ چھوڑوں!" اور زمینیں تقسیم نہیں کیں، بلکہ جو لوگ ان میں کھیتی باڑی کرتے تھے انہیں کے پاس رہنے دیں تا کہ ان کے خراج سے مسلمانوں کو وظائف دیئے جا سکیں۔ یہ تھا ان زمینوں کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد جو مسلمانوں نے جنگ میں حاصل کی تھیں اور یہ اجتہاد قاضی ابو یوسف کے الفاظ میں جو انہوں نے "کتاب الخراج" میں تحریر کیے ہیں "توفیق الٰہی تھا جس میں تمام مسلمانوں کی بھلائی اور بہتری مضمر تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ جو رائے قائم کی تھی کہ ان زمینوں کا خراج جمع کر کے مسلمانوں میں تقسیم کیا جائے، اس سے ان کا مقصد جماعت کا عمومی مفاد تھا، اس لیے کہ اگر خراج لوگوں کے وظیفوں اور ان کی روزیوں کے لیے وقف نہ کیا جاتا تو نہ سرحدوں کی حفاظت ہو سکتی، نہ مجاہدین کو جہاد کے لیے تیار کیا جا سکتا اور اگر یہ شہر وظیفہ یاب محافظین سے خالی ہو جاتے تو کفار کی واپسی کا ہمہ وقت کھٹکا لگا رہتا۔ یوں خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ بہتری کس پہلو میں تھی۔"

بڑے بڑے معاملات، بالخصوص امور مملکت عامہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کی مثالیں پیش کی جا چکیں۔ اب رہ جاتا ہے مسائل فقہ و شریعت میں ان کا اجتہاد، سو اس سے کتب فتاویٰ بھری پڑی ہیں اور اس پر ائمہ اربعہ کے علاوہ ملت اسلامیہ کے دوسرے فقہاء بھی پوری طرح اعتماد کرتے ہیں۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان تمام فتاویٰ کا استقصاء یا ان تمام نظریات کا اثبات کروں کیونکہ یہ تفصیل اسلامی سلطنت اور اس کی پیش رفت کے دائرہ بحث میں نہیں آتی۔ میں نے تو اس باب میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ بلاد عرب اور عربوں کے مفتوحہ ممالک کی عام زندگی کے تغیر و انقلاب میں ذات فاروقی رضی اللہ عنہ کا کتنا زبردست اثر تھا، اب چاہے یہ اثر سیاسی پہلو سے

Marfat.com

ہو، یا اجتماعی اور اقتصادی پہلو سے۔ بلاشبہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اجتہاد میں سخت گیری و بے باکی کی طرف بہ شدت مائل تھے، حالانکہ کمزوروں پر ان کی شفقت و مہربانی مشہور ہے۔ ان کی سخت گیری و بے باکی مؤلفۃ القلوب اور ایک سانس میں تین طلاقیں دینے والوں کے لیے تھی، مے نوشوں، بکثرت حدیث روایت کرنے والوں اور ان غازیان اسلام کے لیے تھی جو عراق و شام کی غنیمت میں حاصل شدہ زمین آپس میں تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ اپنے فیصلوں میں بے لاگ انصاف سے کام لینا اور پیش گاہ عدالت میں فریقین کے درمیان مساوات برتنا، چاہے عام نگاہوں میں وہ کتنا ہی فرق مراتب کیوں نہ رکھتے ہوں، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی عادت تھی اور ان کا درہ لیے پھرنا بھی اسی سخت گیری و بے باکی کا ایک مظہر تھا جسے وہ کبھی نظر انداز نہ ہونے دیتے تھے، یہاں تک کہ ان معاملات میں بھی جو صاحب معاملہ کے ارادہ و اختیار سے باہر ہوتے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک رات گشت کر رہے تھے کہ ایک عورت کو یہ شعر گاتے سُنا:

اَلَاسبیل الیٰ خمرٍ فاشربھا اَم ھَل سبیل اِلیٰ نَصرِ بن حجاج

ترجمہ: ”ہے کوئی صورت میری بادہ نوشی کی اور ہے کوئی سبیل کہ میں نصر بن حجاج کے پاس پہنچ سکوں؟“

دن نکلا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نصر کے متعلق دریافت کیا اور اسے بلانے آدمی بھیجا۔ جب وہ بارگاہ فاروقی رضی اللہ عنہ میں پیش کیا گیا تو دیکھا کہ حقیقت میں وہ نہایت حسین ہے۔ چہرہ بھی حسین اور زلفیں بھی حسین۔ حکم دیا کہ اس کے بال مونڈ دیئے جائیں۔ لیکن بال مونڈنے سے اس کا حسن دب نہ سکا، پیشانی اور نمایاں ہوگئی، حکم دیا کہ اس کا منہ کالا کر دیا جائے مگر اس سے بھی اس کا حسن گہنا نہ سکا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”نہیں! قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تو اس جگہ نہیں رہ سکتا جہاں میں رہتا ہوں۔“ اس کے لیے وجہ کفاف کا حکم دیا اور اسے بصرہ بھیج دیا اور اس سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ مدینۃ الرسول کی عورتیں اس کے فتنے سے محفوظ ہو جائیں۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ گشت فرما رہے تھے کہ ایک محلے میں عورتوں کو آپس میں کہتے سُنا: ”مدینہ کا سب سے زیادہ حسین شخص کون ہے؟“ ان میں سے ایک عورت بولی: ”ابوذئب“ جب ابوذئب کو حاضر کیا گیا تو اسے حقیقت میں مردانہ حسن کا نمونہ پایا۔ بولے

''خدا کی قسم! تو عورتوں کا بھیڑیا ہے! تو عورتوں کا بھیڑیا ہے!'' اس کے بعد فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تو اس سرزمین میں نہیں رہ سکتا، جہاں میں رہتا ہوں۔'' ابوذئب نے کہا: ''اگر میرا یہاں سے جانا ضروری ہے تو مجھے وہیں بھیج دیجیے جہاں آپ نے میرے چچازاد بھائی کو بھیجا ہے۔'' اس کی مراد نصر بن حجاج سے تھی...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے لیے بھی وجہ کفاف کا حکم دیا اور بصرہ بھیج دیا۔

اس متشددانہ طرزِ عمل سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مدعا ہر اس کمزوری کے خلاف جنگ کرنا تھا جو عربوں کے دل میں ہوا و ہوس کی حکومت قائم کر سکتی تھی اس لیے کہ قوت ہی اسلام کی روح اور اس کا جوہر ہے اسی کے بل پر انسان، نفس کی گمراہیوں اور خواہش کی اثر کاریوں پر غالب آتا ہے اور وہی قوم کو ضعیف و ناتوانی کی تمام برائیوں سے پاک کرتی اور ہر اس حملہ آور کو منہ توڑ جواب دیتی ہے جو اسے اس کے عقیدے سے بھٹکانا چاہتا ہے اور یہی وہ روح ہے جس نے مسلمانوں کو کمزوروں پر مہربانی کرنے کا حکم دیا اور اس مہربانی پر احسان جتانے کو گناہ عظیم ٹھہرایا۔ مہربانی کا مقصد یہ تھا کہ کمزوروں کی کمزوری کا علاج کیا جائے، مبادا احتاجی یا جہالت یا بیماری ان کی ناتوانی میں اضافہ کر دے اور وہ غیر اللہ کے سامنے رونے اور گڑگڑانے لگیں۔ چنانچہ جب ان کی کمزوری جاتی رہی' وہ صحت مند ہو گئے۔ اپنی نظر میں ان کی قیمت بڑھ گئی اور وہ اس جماعت کی قوت بن گئے، جس سے انہیں نسبت تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام کی اس روح کو بھی سب سے زیادہ جانتے تھے اور انہیں اس کا بھی سب سے زیادہ علم تھا کہ زندگی کے وہ کون سے محرکات ہیں، جو اس روح کو کمزور کرتے ہیں، اسی لیے وہ ہر وقت ان محرکات کا مقابلہ کرنے کے درپے رہتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ نفس انسانی بلندیوں پر چڑھتے اور پستیوں میں گرتے وقت ایسے عوامل کی کھینچا تانی میں ہوتا ہے جن پر اکثر اوقات اس کا کوئی زور نہیں چلتا۔ پستیاں اسے اپنی طرف زیادہ کھینچتی ہیں اور ان میں گرنا اس کے لیے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اس کے برعکس بلندی اس سے جہاد نفس کا تقاضا کرتی ہے تاکہ وہ ان دام ہائے رنگا رنگ میں نہ پھنس جائے جو فطرت حیات نے قدم قدم پر اس کے لیے بچھا رکھے ہیں اور انہیں اپنی بقا کی ضروریات قرار دے کر ایسی ایسی آرائشوں سے نظر فریب بنا رکھا ہے جو نفسانی خواہشوں کو بھڑکاتی اور ان کی طلب تیز کرتی ہیں۔ انسان ان آرائشوں کی طرف دیوانہ وار دوڑتا ہے اور ان میں الجھ کر ان کی فتنہ انگیزیوں اور ہوس آفرینیوں کو دوآتشہ کر دیتا ہے۔

لوگ اکثر و بیشتر ان دام ہائے رنگا رنگ کی زینت و آرائش میں ایک آسودگی، ایک شائستگی پاتے ہیں اور اس باب میں وہ حیوانات سے مختلف ہیں۔ انسان اور حیوان دونوں بقائے حیات، کھانے پینے اور بقائے نسل کے لیے توالد وتناسل کے محتاج ہیں۔ حیوان کھانے پینے کی انہیں چیزوں پر اکتفا کرتا ہے جو اسے زندہ رکھ سکیں اور حیوانی نر اپنی مادہ سے صرف بقدر مقتضائے نسل ہی تعلق رکھتا ہے، لیکن انسان خورد نوش اور محبت و رغبت کو اپنا سرمایہ حیات قرار دے کر اس پر جان چھڑکتا ہے، اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے اپنی انتہائی قوتیں صرف کر دیتا ہے۔ وہ اس متاع سے نعمت اندوز ہونے کے لیے ایسے ایسے ذریعے تلاش کرتا ہے جن سے دوسری مخلوق جبلی طور پر نا آشنا ہوتی ہے۔ لوگ اس متاع پر اس وقت زیادہ جان دیتے ہیں اور اس سے شکم سیر ہونے کی خواہش اس وقت انہیں اور زیادہ بے چین کرتی ہے جب انسانی جماعتیں زوال و انحطاط کے غار میں گر پڑتی ہیں، لیکن نوخیز جماعت اس فتنے کی آلودگیوں سے بچ کر پاکیزگی کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے اور اس پاکیزگی کو اپنی قوت و سربلندی کا ذریعہ بناتی ہے۔ یہی وہ پاکیزگی ہے جس کی طرف اسلام نے دعوت دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی اس خصوص میں مسلمانوں کے لیے ایک مکمل نمونہ تھی آپؐ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی تمام تر کوششیں اس نکتے پر مرکوز کر دیں کہ پاکیزگی کا بیج مسلمانوں کے باطن میں اس طرح جڑ پکڑ لے کہ سویدائے قلب میں ایمان کی جگہ پہنچ جائے۔ چنانچہ مسلمان اس جذبے کے زیر اثر اُٹھے جسے اس پاکیزگی کی معنوی قوت نے بیدار اور ایمان باللہ نے دگنا اور چوگنا کر دیا تھا اور وہ فارس و روم کی حدود میں در آئے، ان کا تاج اقتدار چھین لیا اور ان کی سلطنت پر ایسی بھرپور ضرب لگائی کہ وہ پھر کبھی نہ پنپ سکی۔

اپنے اجتہاد سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غرض یہی پاکیزگی تھی۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ وہ اس پاکیزگی کے مرتبہ کمال پر فائز تھے، اسی طرح باقی مسلمان بھی بہ حیثیت مجموعی اس نعمت سے بڑی حد تک فیض یاب تھے اور یہ اثر تھا اس دور اندیشی و استقامت کا جس کا ظہور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی ذات سے ولاۃ و عمال کے محاسبے اور بندگان نفس پر جبر و تشدد کی صورت میں ہوتا تھا، لیکن اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ زندگی کے واقعات مصلحین کی غرض کے ساتھ ساتھ ہو لیتے ہیں اور حصول مقصد کی کوشش کو طرح طرح کی آمیزشوں سے داغدار بنا دیتے ہیں اور یہ چیزیں مصلحین

Marfat.com

اکساتی ہیں کہ وہ اپنے اجتہاد میں مقصد سے تجاوز کر جائیں۔ یہ اس لیے کہ پستی اور بلندی کے درمیان جھونٹے کھانا انسان کی فطرت ہے اور اس فطرت کے عوامل فرد اور جماعت دونوں کے نفس میں ایک دوسرے کی ہمسائیگی اختیار کر کے آپس میں برسر کشمکش رہتے ہیں۔ انسان اکثر اوقات ان سے دھوکہ کھا جاتا ہے اور کمزوری کے اسباب کو قوت کے اسباب اور پستی کے محرکات کو بلندی کے محرکات سمجھ کر قبول کر لیتا ہے، بلکہ یہ اسباب و محرکات گھل مل کر ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کا یہ باہمی عمل اور اثر اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ عقل بھٹک جاتی ہے اور اجتہاد ان کے درمیان ٹھوکریں کھانے لگتا ہے۔ آپ پڑھ آئے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے غنیمت کا مال مسلمانوں میں برابر برابر تقسیم کرنے کا حکم دیا تھا، لیکن جب زمام خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنبھالی اور فارس و روم کے اموال غنیمت کی ریل پیل ہوئی تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے رجسٹر مرتب کرائے اور وظائف کی تقسیم میں امتیازی حدود قائم کیں اور بعد کو جب اس کا نتیجہ ظاہر ہوا تو مسئلے پر از سر نو غور کیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ اس معاملے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا طرز عمل واقعی بہتر تھا۔ انہوں نے اپنے فیصلے سے رجوع کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے کو روبہ عمل لاتے موت نے ان کے قدم روک لیے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ معذور بھی تھے۔ فارس و روم سے جو دولت پیہم پہنچ رہی تھی، اس نے جزیرۃ العرب کے ان بہت سے لوگوں کے دلوں میں ہوا و ہوس کے پردے ڈال دیئے تھے، جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پاکیزگی کا مجسمہ دیکھنا چاہتے تھے، چنانچہ بہت کم لوگ تھے جو اپنے ذہن کا جائزہ لے کر بلندی کے محرکات کو نقص و کمزوری کے شائبوں سے پاک کر سکتے تھے اور ان سے بھی کم تھے جن کی پاکیزگی انہیں عصمت و عفت کے ان مراتب عالیہ پر فائز کر سکتی! جہاں جرم و قصور کی ہوا تک نہیں پہنچتی، اس لیے کہ جرم و قصور انسان کی فطرت ہیں، جن کی طرف انسان کو اس کی خواہشیں لے جاتی ہیں اور یہ خواہشیں بعینہ وہی جبلتیں ہیں جو بقائے حیات اور بقائے نوع کے لیے ہمارے جسموں میں ترکیب دی گئی ہیں، لیکن پاکیزگی گناہ و ثواب اور خیر و شر کے درمیان خط امتیاز کھینچتی ہے اور ہمیں ترغیب دیتی ہے کہ ہم نفع و ثواب کے دائرے میں رہیں، ان چیزوں کی طرف قدم نہ بڑھائیں جو ہم کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ گناہ و ثواب، نیکی اور بدی، فائدہ اور نقصان، اکثر اوقات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ جس طرح سونا اور اس جیسی دوسری قیمتی

Marfat.com

دھاتیں، سنگریزوں اور معمولی دھاتوں میں مل جاتی ہیں۔ اب اگر صرف قیمتی دھات ہی الگ کرنی مقصود ہو تو اس آمیزے کو پگھلانا پڑے گا، جس کا نتیجہ کبھی تو کامیابی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر کھوٹ زیادہ نہ ہو اور کبھی یہ پگھلانے کا عمل ہی بجائے خود موجب فساد بن جاتا ہے، اگر اسے ہوشیاری وعقل مندی کے ساتھ نہ کیا جائے۔

اور اس میں شک نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اجتہاد اور دعوت پاکیزگی میں بڑے عقل مند اور بیدار مغز تھے، ان کی عقل مندی کا امتیازی پہلو یہ تھا کہ وہ نہایت دقیقہ سنجی کے ساتھ روح اسلام کی اسی طرح پیروی کرتے تھے جس طرح اللہ نے اسے اپنے رسولؐ پر نازل فرمایا تھا، وہ اس روح کی جزئیات تک سے واقف تھے، اسی لیے ان کے اجتہاد نے مسلمانوں کو ایک ایسے بلند مقام پر پہنچا دیا۔ جہاں اسلامی سلطنت کی بقا اور استحکام کے سلسلے میں معجز نما کارناموں کا اظہار ان کے لیے آسان ہو گیا۔ نپولین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان عظیم الشان معرکوں کے مقابلے میں جنہوں نے یورپ کے دروازے اس پر کھول دیئے اور اسے ماسکو تک پہنچا دیا۔ وہ اس مدنی قانون پر زیادہ نازاں تھا جو اس کے عہد میں وضع کیا گیا اور جس کی ترتیب وتدوین میں اس نے خود بھی حصہ لیا تھا، تو کیا اسی قسم کی بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے اور کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ان فتوحات کے مقابلے میں، جو ان کے عہد خلافت میں اتمام پذیر ہوئیں، اپنے اجتہادی کارناموں پر زیادہ فخر کر سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ نپولین اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ دونوں کی سلطنتوں کے انجام میں فرق وامتیاز کریں، نپولین کی سلطنت اس کی زندگی ہی میں ختم ہو گئی۔ لیکن حضرت عمر کی سلطنت مسلمانوں میں کئی صدیوں تک ایک نسل کے بعد دوسری نسل اور ایک خاندان کے بعد دوسرے خاندان میں منتقل ہوتی رہی تاہم اگر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فخر کرنے والوں میں ہوتے تو انہیں اپنے اجتہادی کارناموں پر زیادہ فخر ہوتا کہ اسی اجتہاد نے اسلامی سلطنت قائم کی اور اسی اجتہاد نے اسے کئی صدیوں تک برقرار رکھا۔

لیکن یہی اجتہاد اور یہی سلطنت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے تکلیف ومصیبت کا سبب بھی بنے۔ اگرچہ انہوں نے ان دونوں ذمہ داریوں کو نہایت ہمت اور طاقت کے ساتھ سنبھالا اور انہیں اپنے پروردگار کے حکم کے مطابق انتہائی بلند مقام پر پہنچا دیا، لیکن مسلمانوں کے مفتوحہ ممالک کی اکثر قوموں کے دل میں اس اجتہاد اور اس سلطنت کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے

Marfat.com

خلاف کینہ وانتقام کی آگ دہکنے لگی جس کا ایک اثر بعد کو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہ نتیجہ آپ کے دل میں حیرت واستعجاب پیدا کرے گا لیکن ہے یہ واقعی ایک نا قابل انکار حقیقت! اور اس حقیقت کو آپ آئندہ باب میں...... جو اس کتاب کا آخری باب ہے...... بالکل بے نقاب دیکھیں گے۔

باب:25

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت

دس برس اور کچھ مہینے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے امیر المؤمنین کی حیثیت سے گزارے وہ اللہ اور اس کے دین کے لیے وقف تھے۔ اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال کی انہیں کوئی پرواہ نہ تھی۔ ان کا دل، ان کی عقل اور ان کے اعضاء و جوارح اس بار عظیم کے اٹھانے میں مصروف رہتے تھے جو قضا وقدر نے ان کے شانوں پر رکھ دیا تھا۔ چنانچہ وہ فوج کے سپہ سالار اعظم تھے۔ فقہائے اسلام میں انہیں فقیہ اکبر کا مرتبہ حاصل تھا۔ وہ ایک ایسے مجتہد تھے جن کی رائے سند سمجھی جاتی تھی اور جن کا اجتہاد تسلیم کیا جاتا تھا! وہ ایک ایسے انصاف پسند اور پاک دامن قاضی تھے جو مقدمات کے فیصلے کرتے اور طاقتوروں سے کمزوروں کو ان کا حق دلواتے تھے! وہ تمام مسلمانوں کے بڑے سے پہلے چھوٹے ...... طاقتور سے پہلے کمزور اور مالدار سے پہلے فقیر کے...... شفیق ومہربان باپ تھے۔ وہ ایسے بندہ مؤمن تھے جن کے اللہ اور اس کے رسولؐ پر سچے ایمان نے ان کی خود اعتمادی میں اضافہ کر دیا تھا اور ان کی رائے کی قدر و قیمت ان پر اچھی طرح واضح کر دی تھی۔ وہ ایک تجربہ کار سیاست دان تھے جو اپنے ارادوں کو جانتے تھے اور انہیں اپنی مقدرت کے دائرے سے نکلنے نہ دیتے تھے اور ان کی مقدرت کے ساتھ ساتھ ان کے ارادے بھی وسیع ہوتے جاتے تھے۔

وہ ایک صاحب نظر حکمران تھے، جن کی عقل وحکمت نے ان کے لیے مختلف النسل، مختلف اللسان اور مختلف المذاہب قوموں پر حکومت کرنا آسان بنا دیا تھا اور وہ رعایا کے معاملات کی تدبیر اس طرح کرتے تھے کہ لوگ ان سے اپرائیں نہیں بلکہ قریب تر ہو جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ان خصوصیات کو دیکھتے ہوئے کوئی عجب نہیں، اگر ان کے عہد میں مسلمانوں کو سچے ایمان نے ابھارا، ان کے دلوں میں شہادت فی سبیل اللہ کی تڑپ پیدا کی اور انہوں نے ایران، عراق، شام، مصر اور دوسرے ممالک فتح کر لیے اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ان امتیازات کے پیش نظر کوئی حیرت

Marfat.com

نہیں، اگر عرب مغرب کی انتہائی حدوں سے لے کر مشرق کے انتہائی سروں تک تمام دنیا کی نگاہوں کا مرکز بن گئے، حالانکہ اسلام سے پہلے وہ ایک خانہ بدوش قوم تھے جو صرف انفرادی اغراض کے لیے جیتی تھی اور اجنبی اقتدار کی محکوم تھی۔ کتنی مہتم بالشان تھی وہ کوشش جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دس سال کی مدت میں یہ بار عظیم اٹھانے کے لیے صرف کی۔ آپ اس کتاب میں جا بجا اس کوشش کے تابناک نقوش ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ لیکن یہ نقوش بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تمام کوششوں کے آئینہ دار نہیں ہیں۔ کیا کسی اہل قلم کے لیے ممکن ہے کہ وہ عظیم شخصیت کی تصویر حیات کھینچتے وقت چھوٹے بڑے تمام خطوط کا احاطہ کر لے! لکھنے والا تو اس زندگی کے کسی ایک پہلو کو دیکھتا ہے اور اس کے لیے تو بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اس پہلو پر اتنی روشنی ڈال دے کہ اس کے تمام خطوط روشن ہو کر اور نمایاں ہو کر سامنے آ جائیں۔ اس کتاب کا بھی وہی مقصد ہے جو میری کتاب ''الصدیق اکبر رضی اللہ عنہ'' کا مقصد تھا اور یہ کہ میں اسلامی سلطنت کی تاریخ لکھوں، اس لیے میں نے ان دونوں بزرگوں کی سوانح لکھتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا ہے کہ میں سلطنت اور اس کی وسعت کی حدود سے آگے نہ بڑھوں۔

ان دس برس کے بعد، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین کی حیثیت سے گزارے، ان کی عمر کیا تھی؟ اس سلسلے میں مؤرخین کے اختلاف کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں: ''وہ.......... حضرت عمر رضی اللہ عنہ ...... جنگ فجار سے چار برس پہلے پیدا ہوئے اور ان کی عمر پچپن برس کی تھی۔ ایک قول کے مطابق وہ ساٹھ برس کے، دوسرے قول کے مطابق تریسٹھ برس اور کچھ مہینے کے اور یہی صحیح بھی ہے اور تیسرے قول کے مطابق اکسٹھ برس کے تھے۔'' ایک روایت میں ہے کہ ان کی عمر پینسٹھ برس کی تھی۔ ان تمام روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پچپن اور پینسٹھ برس کے درمیان تھے اور گمان غالب یہ ہے کہ ان کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز تھی، لیکن چونکہ وہ اپنی جان پر سختیاں جھیلتے اور اپنی تمام مدت خلافت میں تنگ دستی کی زندگی کو ترجیح دیتے رہے تھے، یہاں تک کہ قحط کے زمانے میں لوگوں کو ان کی جان تک خطرے میں نظر آنے لگی تھی، اس لیے بالکل فطری تھا کہ آرام و آسائش میں زندگی بسر کرنے والے کے مقابلے میں سن و سال کا بوجھ انہیں زیادہ محسوس ہوتا۔ ان کی اہم ذمہ داریوں نے اس بوجھ میں اور اضافہ کر دیا تھا اور اس سے ان کے کندھے شل ہوئے جاتے تھے، پھر یہ ذمہ داریاں انہیں اتنی بھی مہلت نہ دیتی تھیں کہ وہ کچھ دن کے لیے دم لے لیں یا اس بوجھ کو کچھ ہلکا کر دیں جو سلطنت کے چھوٹے بڑے

معاملات نے ان کی عہد خلافت میں ان پر ڈال رکھا تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سال کے سال حج کو تشریف لے جاتے تھے اور حج کے دنوں میں اپنے ولاۃ وعمال کو مکہ بلاتے تھے تاکہ ان کے کاموں جائزہ لیں اور صوبوں کے معاملات کی تدبیر وتنظیم میں ان کی رہنمائی کریں۔ معمول کے مطابق وہ اس سال سنہ ۲۳ھ میں ـــ بھی حج کو گئے۔ امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن ہمراہ تھیں۔ جب ارکان حج سے فارغ ہوئے اور منیٰ سے پلٹے تو ابطح میں اپنا اونٹ بٹھایا، سنگریزے جمع کر کے ایک چبوترہ سا بنایا اور اس پر اپنی چادر کا کنارہ ڈال دیا۔ پھر اس کے بعد اس پر چت لیٹ گئے اور اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہنے لگے: "اللہ! میری عمر زیادہ ہوگئی ہے ہڈیاں نرم پڑ گئی ہیں، قوتیں جواب دے رہی ہیں اور رعایا پھیل گئی ہے، اب مجھے اپنے پاس بلالے، اس حال میں کہ میرا دامن عجز و ملامت سے پاک ہو!" یہ ایسی دعا ہے، جو انسان ساٹھ سال کی عمر سے پہلے نہیں مانگتا، خاص طور پر جب اس کا جسم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جسم کی طرح صحت مند اور قوی ہو۔

بہت ممکن ہے کہ انہوں نے اپنے جسم میں ناتوانی اور کمزوری کی سرسراہٹ محسوس کر لی ہو اور وہ جلد اپنے پروردگار سے جا ملنا چاہتے ہوں، اس انجام کے متعلق وہ سوچتے بھی بہت رہتے تھے۔ ابن سعد نے طبقات میں روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حج سے واپس آتے ہی جمعے کے دن مدینے میں ایک عام خطبہ دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: "لوگو! میں نے ایک خواب دیکھا ہے، جسے میں اپنی موت کا پیام سمجھتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ایک لال رنگ کے مرغے نے مجھے دو ٹھونگیں ماری ہیں۔" پھر کہا: "لوگو! تم پر احکام فرض کر دیئے گئے، تمہارے لیے قانون حیات مرتب کر دیا گیا اور تمہیں ایک کھلے راستے پر ڈال دیا گیا، اب یہ اور بات ہے کہ تم لوگوں کو ادھر ادھر بھٹکا دو![1]

---

[1] ابن سعد نے مختلف خطبے درج کیے ہیں اور انہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب کر کے لکھا ہے کہ انہوں نے آخری حج سے واپس ہو کر یہ خطبے جمعے کے دن دیئے تھے، اس سنہ میں ماہ ذی الحجہ کا آخری جمعہ انتیسویں تاریخ کو پڑتا ہے اور جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس تاریخ کو کوئی خطبہ نہیں دیا۔ وہ ماہ ذی الحجہ کی بارھویں تاریخ کو منیٰ سے واپس ہوئے۔ اب اگر انہوں نے مکہ میں قیام نہ بھی کیا ہو اور سیدھے مدینہ ہی چلے آئے ہوں تو بھی وہ ذی الحجہ کی پندرھویں تاریخ کے بعد مدینہ پہنچے ہوں گے۔ اس کے بعد اس مہینے کا جمعہ بائیسویں ذی الحجہ کو پڑتا ہے اور یہی وہ تاریخ ہے جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ممکن ہے کہ خطبہ دیا ہو۔

یہ آخری عبارت موت کے قریب محسوس کرنے والے کی وصیت سے بہت ملتی جلتی ہے جو کسی کو نیکی پر ابھارنے کے لیے از راہ پند و موعظت کی گئی ہو۔ اسی طرح اس خطبے کا وہ حصہ بھی وصیت سے بہت مشابہ ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا: ''کلالہ سے زیادہ اہم مسئلہ میرے نزدیک کوئی نہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے جتنی مرتبہ کلالہ کے متعلق گفتگو کی ہے کسی چیز کے متعلق نہیں کی اور میں نے جب سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونا شروع کیا ہے آپ نے جتنی بار ناراضگی کا اظہار کلالہ کے بارے میں فرمایا ہے اور کسی چیز کے بارے میں نہیں فرمایا ہے، یہاں تک کہ میری پیٹ میں انگلیاں چبھو کر مجھ سے فرمایا: ''عمر! سورۃ النساء کی آخری آیت کو اپنے لیے کافی سمجھو!''۔۔۔اور اگر میں زندہ رہا تو اس سلسلے میں ایسا فیصلہ کر دوں گا جس سے وہ لوگ بھی جو قرآن پڑھتے ہیں اور وہ بھی جو قرآن نہیں پڑھ سکتے، فیصلہ کر سکیں گے!'' اس کے بعد فرمایا: ''اللہ! میں تمام شہروں کے حکام پر تجھے گواہ بناتا ہوں کہ میں نے انہیں صرف اس لیے بھیجا تھا کہ وہ لوگوں کو دین اور سنت رسول کی تعلیم دیں۔ ان سے عدل و انصاف کے ساتھ پیش آئیں، ان میں غنیمت تقسیم کریں اور ان کے معاملے میں اگر کوئی مشکل درپیش ہو، تو میرے پاس پیش کریں!'' بنو تمیم کے جویریہ بن قدامہ کہتے ہیں، ''جس سال حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وفات پائی ہے، میں نے بھی حج کیا تھا۔ مدینہ آ کر انہوں نے خطبہ دیا اور فرمایا، ''میں نے خواب میں دیکھا ہے ایک مرغا مجھے ٹھونگیں مار رہا ہے۔'' وہ صرف اسی سال تک زندہ رہے، یہاں تک کہ شہید کر دیئے گئے۔

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا موت کو اپنے سے قریب محسوس کرنا جب کہ سوائے ضعف و ناتوانی کے احساس کے وہ بیمار بھی نہ تھے، غیر معمولی غور و فکر کا طالب ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جن کے دلوں میں ۔۔۔تندرست ہوتے ہوئے۔۔۔ ایسے خیالات آئیں، جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں آ رہے تھے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اپنے مرض الموت کے آغاز میں یہ محسوس کر لیا ہے کہ ان کا وقت قریب آ گیا ہے تو کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہونے والی بات وقت سے پہلے الہام کر دی گئی تھی؟ یا سن و سال کی زیادتی قوتوں کی کمزوری اور رعایا کے پھیلاؤ نے انہیں موت کی قربت کا احساس دلا دیا تھا اور وہ دعا کرنے لگے تھے کہ خدا انہیں اپنے پاس بلا لے؟ آپ کو اختیار ہے، اپنے لیے جو جواب چاہیں، سوچ لیں لیکن مسلمان مؤرخوں نے اس سلسلے میں بہت سی روایات

Marfat.com

درج کی ہیں جنہیں ہم امیر المؤمنین کی شہادت کا ذکر کرنے کے بعد، تفصیل سے بیان کریں گے۔ ۲۶ ذی الحجہ سنہ ۲۳ھ کو بدھ کے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ سورج طلوع ہونے سے پہلے لوگوں کو نماز پڑھانے کے لیے کاشانہ خلافت سے نکلے۔ انہوں نے مسجد میں کچھ لوگ مقرر کر رکھے تھے جو ہر نماز سے پہلے صفیں درست کیا کرتے تھے۔ جب صفیں درست ہو گئیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور دیکھا کہ پہلی صف کچھ آگے پیچھے ہے۔ اسے درے سے ٹھیک کیا۔ لوگ اپنی اپنی جگہ قرینے سے بیٹھ گئے تو اذان دی گئی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ امامت کے لیے آگے بڑھے۔ اس وقت صبح کی سفیدی پوری طرح نمایاں نہ ہوئی تھی۔ ابھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز کی تکبیر شروع ہی کی تھی کہ ایک شخص اچانک ان کے سامنے آیا اور اپنے خنجر سے ان پر تین یا چھ وار کیے جن میں سے ایک زیر ناف پڑا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دھاردار آلے کی گرمی محسوس کی، نمازیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ہاتھ پھیلا کر کہا، ''پکڑو، اس کتے کو اس نے مجھے قتل کیا ہے۔''

یہ کتا جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا نصرانی غلام ابولولوہ فیروز تھا۔ یہ ایران کا باشندہ تھا جو نہاوند کی جنگ میں پکڑا گیا اور اس کے بعد جناب مغیرہ بن شعبہ کی غلامی میں آ گیا۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کی نیت سے منہ اندھیرے مسجد میں آ گیا تھا۔ اس نے اپنی چادر میں ایک خنجر چھپا رکھا تھا جس کا دستہ بیچ میں تھا اور دونوں طرف بڑی تیز دھاروں کے پھل تھے وہ مسجد کے ایک گوشے میں چھپ گیا اور جب نماز شروع ہوئی تو وار کر دیا اور اس کے بعد اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا۔ نمازیوں میں ایک بے چینی سی پھیل گئی۔ بہت سے لوگ اس کتے کو پکڑنے اور سزا دینے کے لیے اس کی طرف دوڑے، لیکن فیروز نے ان کا ہاتھ اپنی کمر تک نہ پہنچنے دیا اور دائیں بائیں خنجر کے وار کرنے لگا۔ یہاں تک کہ بارہ آدمی زخمی ہو گئے، جن میں سے ایک قول کے مطابق چھ اور دوسرے قول کے مطابق نو جاں بر نہ ہو سکے۔ آخر ایک شخص اس کے پیچھے سے آیا اور اپنی چادر اس پر ڈال کر اسے زمین پر گرا دیا۔ فیروز کو یقین ہو گیا کہ وہ اسی جگہ قتل کر دیا جائے گا۔ چنانچہ جس خنجر سے اس نے امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو مجروح کیا تھا، اسی خنجر سے اپنا کام بھی تمام کر لیا۔ جو وار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زیر ناف پڑا تھا، اس سے صفاق اور آنتیں کٹ گئی تھیں، اس لیے وہ مہلک ثابت ہوا۔ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ زخم لگنے کے بعد کھڑے نہ رہ سکے، بلکہ فرش پر گر پڑے اور اپنی جگہ نماز پڑھانے کے لیے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو کھڑا کر دیا۔

Marfat.com

حضرت ابن عوف رضی اللہ عنہ نے قرآن کی دو مختصر ترین سورتوں۔۔۔سورۃ العصر اور سورۃ الکوثر۔۔۔ میں لوگوں کو نماز پڑھائی۔لیکن ایک روایت یہ ہے کہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے گرد دوسرے مسلمانوں کو زخمی پڑے دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھے اور جب لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اٹھا کر کاشانہ خلافت میں لے جانے لگے تو اس منظر سے ان کے غم واضطراب میں اور اضافہ ہو گیا۔مجمع اسی بدحواسی و بے چینی میں تھا کہ کسی نے کہا،''اللہ کے بندو! نماز تو پڑھ لو، سورج نکل آیا ہے۔'' چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ امام بنائے گئے اور انہوں نے دو مختصر ترین سورتوں میں نماز پڑھائی۔

یہ دوسری روایت بلاشبہ صحیح ہے، لوگ اس پریشانی وبدحواسی کے عالم میں نماز کے لیے از سر نو صفیں کیسے درست کر سکتے تھے، جب کہ امیر المؤمنین ان کی نگاہوں کے سامنے زمین پر پڑے تھے اور ان کے زخموں سے جیتا جیتا خون بہہ رہا تھا۔ان کے گرد دوسرے مجروحین خون میں لتھڑے ہوئے تھے اور انہیں میں قاتل کی لاش بھی تھی۔اگر ہم یہ تصور کر بھی لیں کہ زخم کھانے کے باوجود وہ اپنی جگہ امامت کے لیے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو کھڑا کرنے کے متعلق سوچ سکتے تھے۔حالانکہ اس قسم کا تصور عقل سے سرتاسر بعید ہے۔۔۔تو بھی یہ خیال کرنا ہمارے لیے ناممکن ہے کہ لوگ خوف و پریشانی کے ان لمحات میں صفیں درست کر سکتے تھے، اس لیے ہمیں لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہوش یا بے ہوشی کی حالت میں مسجد کے قریب کاشانہ خلافت میں لے جائے گئے۔زخمیوں کو مسجد کے باہر یا اس کے کسی گوشے میں پہنچایا گیا اور فیروز کی لاش بطیحا میں لے جا کر ڈال دی گئی۔اس کے بعد لوگ مسجد میں واپس آئے اور اس حادثے پر گفتگو کرتے رہے، یہاں تک کہ کسی نے انہیں نماز یاد دلائی اور اس پر انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو اپنا امام بنا کر ان کے پیچھے نماز پڑھی۔نماز سے فارغ ہو کر لوگ مسجد کے مختلف گوشوں اور بطیحا میں منتشر ہو گئے۔ہر شخص کی زبان پر اسی لمناک سانحے کا ذکر تھا، جو ان کی آنکھوں کے سامنے پیش آیا تھا۔یہ خبر بجلی کی سی سرعت سے تمام مدینے میں پھیل گئی۔سونے والے جاگ اٹھے اور سب کے سب۔۔۔مرد، عورتیں اور بچے دوڑے کہ اس قیامت آفریں حادثے کی تفصیلات معلوم کریں، دوسرے زخمیوں کو بھی ان کے گھروں میں پہنچایا گیا۔ان میں سے کچھ مر چکے تھے، کچھ مرنے والے تھے اور کچھ زخموں کی تکلیف سے کراہ رہے تھے۔بڑے

Marfat.com

بڑے اہل الرائے دریافت حال کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، "میں (حضرت) عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تھا۔ ان پر مسلسل غشی طاری رہی، یہاں تک کہ صبح نمودار ہو گئی۔ جب دن نکلا تو عمر رضی اللہ عنہ کو ہوش آیا۔ انہوں نے ہماری صورتیں دیکھیں اور پوچھا، "لوگوں نے نماز پڑھ لی؟" میں نے کہا: "ہاں!" بولے: "جس نے نماز چھوڑی وہ مسلمان نہیں ہے!"

اس کے بعد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کے مطابق باہر آئے اور پکار کر لوگوں سے کہا: "لوگو! امیر المؤمنین دریافت فرماتے ہیں، "کیا یہ واقعہ تم لوگوں کے مشورے سے ہوا؟" لوگ یہ دیکھ کر سہم گئے کہ یہ بات ان کی طرف رخ کر کے کہی جا رہی ہے اور یک زبان ہو کر چلائے: "معاذ اللہ! ہمیں اس کا کوئی علم نہیں، ہمیں اس کی کوئی خبر نہیں!" اور یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا، اگر انہیں یہ بات معلوم ہوتی تو وہ اپنی اولاد فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر سے فدا کر دیتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: "امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ پر حملہ کس نے کیا ہے؟ لوگوں نے کہا: "اللہ کے دشمن ابولولوہ نے جو مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا غلام ہے!"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے بستر پر لیٹے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے منتظر تھے کہ وہ ان کے سوال کا کیا جواب لے کر آتے ہیں۔ انہیں اس طبیب کا بھی انتظار تھا جو انہوں نے اپنے رشتے داروں کے ذریعے بلوایا تھا، جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ واپس آئے اور لوگوں کی کہی انہیں سنائی اور بتایا کہ ان پر حملہ ابولولوہ نے کیا ہے اور دوسرے چند آدمیوں کو زخمی کر کے خودکشی کر لی ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرا قاتل کسی ایسے کو نہیں بنایا جو اس کے حضور اپنے کبھی کے کیے ہوئے ایک سجدے کو میرے لیے حجت بناتا، الحمد للہ! کہ مجھے کسی عرب نے قتل نہیں کیا۔" ایک عرب طبیب آیا اور اس نے نبیذ پلائی۔ وہ نبیذ جب ناف کے نیچے والے زخم سے نکلی ہے تو بالکل خون معلوم ہوتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک انصاری طبیب کو بلوایا، پھر بنو معاویہ کا ایک اور طبیب آیا۔ اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دودھ پلایا، لیکن وہ جوں کا توں زخم سے نکل گیا اور اس کے رنگ میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوا۔ طبیب نے کہا: "امیر المؤمنین! اللہ کو یاد کیجیے!" مطلب یہ تھا کہ موت یقینی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "بنو معاویہ کے بھائی! تم نے سچ کہا، اگر اس کے سوا تم کوئی اور بات کہتے تو جھوٹ بولتے!" طبیب کی یہ بات سن کر حاضرین پر غم کا

پہاڑ ٹوٹ پڑا اور وہ رونے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "ہم پر آنسو نہ بہاؤ جسے رونا ہو، یہاں سے چلا جائے۔ کیا تم نے رسول ﷺ سے نہیں سنا کہ "رشتے داروں کے رونے سے میت پر عذاب ہوتا ہے۔"

جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے لوگوں کی کہن سن رہے تھے، طبیب سے مشورہ لے رہے تھے اور وہ مایوسی کا اظہار کر رہا تھا، مسلمان مسجد میں اور اس کے آس پاس ٹولیاں بنائے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ ابولولوء نے یہ ذلیل حرکت کیوں کی؟ مؤرخین نے اس سلسلے میں بہت سی روایات نقل کی ہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ روایات اس گفتگو کے بعض حصوں پر مشتمل ہوں جو ان ٹولیوں کے درمیان ہوئی تھی اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض مؤرخین نے ان روایات کا تجزیہ کر کے ان میں سے بعض کو قبول کر لیا ہو، بعض کو رد کر دیا ہو اور بعض کو محض خرافات قرار دے دیا ہو۔ میں یہ تمام روایات قاری کے سامنے پیش کر دوں گا کہ وہ جو چاہے، رائے قائم کر لے۔ لیکن ان روایتوں کو بیان کرنے سے پہلے میں اس یقین کا اعلان کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت ایک سازش کا نتیجہ تھی، جس کا پروگرام اس سانحے سے کچھ دن پہلے بنایا گیا تھا، لیکن حاضرین مسجد قطعی طور پر اس کے متعلق کوئی علم نہ رکھتے تھے، نہ ان کے پاس اس وقت اس کا کوئی ثبوت تھا۔ یہ ثبوت بعد کو فراہم ہوا اور اس کا جو اثر پڑا اُس کا حال ہم ابھی آپ کو سناتے ہیں۔

ابن سعد نے جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی سند سے طبقات میں ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے آخری حج کے موقع پر عرفہ کی پہاڑیوں پر کھڑے تھے کہ انہوں نے ایک شخص کو پکار پکار کر کہتے سنا۔ "یا خلیفہ! یا خلیفہ!" کچھ لوگ سفر کی تیاری کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے یہ سن کر اس سے کہا، "اللہ تجھے سرمہ در گلو کرے! تجھے کیا ہوا؟" جبیر نے بلند آواز میں اس دوسرے شخص سے کہا، "اسے گالی نہ دو!" دوسرے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ عقبہ پر کھڑے رمی جمار فرما رہے تھے۔ جبیر ان کے ساتھ تھے کہ ایک کنکری حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آ کر لگی اور ان کا سر پھٹ گیا۔ جبیر نے پہاڑ سے کسی کی آواز آتے سنی، جو کہہ رہا تھا: "رب کعبہ کی قسم! مجھے بتایا گیا ہے کہ اس سال کے بعد عمر رضی اللہ عنہ اس مقام پر کبھی کھڑے نہ ہوں گے۔" اور یہ وہی شخص تھا جو کل چیخ چیخ کر "یا خلیفہ! یا خلیفہ!" کہہ رہا تھا۔ اسی طرح ابن سعد نے حضرت ام کلثوم بنت ابی بکر رضی اللہ عنہ سے

Marfat.com

ایک روایت نقل کی ہی کہ وہ اپنی ہمشیرہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے حوالے سے کہتی ہیں کہ انہوں نے کہا: ''عمرؓ کا وہ آخری حج تھا، جس میں امہات المؤمنینؓ ان کے ساتھ تھیں! جب ہم عرفہ سے واپس ہوئے تو میں محصب سے گزری۔ وہاں میں نے ایک سانڈنی سوار کو یہ کہتے سنا: ''امیر المؤمنین: کہاں ہیں؟'' ایک دوسرے شخص نے جواب دیا۔ ''یہ رہے امیر المؤمنینؓ!'' یہ سن کر اس نے اپنا اونٹ ٹھہرایا۔ اس کے بعد اس کی بلند آواز آئی، وہ یہ شعر پڑھ رہا تھا:

علیك سلام من امام و بارکت
ید اللّٰه فی ذاك الادیم الممزق
فمن یسع اویرکب جناحی نعامة
لیدرك ما قدمت بالامس یسبق
قضیت امورا ثم غادرت بعدها
بوائق فی اکمامها لم تفتق

ترجمہ: تجھ امام پر سلام ہو اور اللہ کا ہاتھ اس پھیلی ہوئی کشادہ زمین میں برکت کرے۔ پھر جو دوڑے گا یا شتر مرغ کے بازوؤں پر سوار ہوگا، تم نے جو کچھ کل بھیجا ہے، اسے آگے جاتا ہوا پائے گا۔ تم نے تمام امور پورے کردیئے اس کے بعد تم نے اس حالت میں چھوڑ دیا کہ وہ کلیاں ہیں، جو اس طرح اپنے غلاف میں ہیں کہ چٹکی نہیں ہیں۔''

اس سوار نے وہاں سے جنبش بھی نہ کی اور نہ یہ معلوم ہوسکا کہ وہ کون ہے۔ ہم اس کے متعلق یہی کہتے تھے کہ وہ جن تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ اس حج سے واپس آئے، تو ان پر حملہ ہوگیا اور وہ اپنے رب سے جا ملے۔ میں ان روایتوں پر کوئی حاشیہ چڑھانے کی ضرورت نہیں سمجھتا، یہ گمان مشکل ہے کہ یہ وجود جسے جن کہا جاتا ہے اور وہ شخص جو بقول بعض فال دیکھنے والا تھا اور جس نے کہا تھا کہ ''اس سال کے بعد عمر رضی اللہ عنہ اس مقام پر کبھی نہیں کھڑے ہوں گے۔'' ان دونوں میں سے کسی کو بھی اس چیز کا علم تھا جو فیروز یا اس کے ساتھ سازش کرنے والوں کے دل میں گردش کر رہی تھی، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مدینہ واپس آنے کے بعد، ان کی شہادت سے کچھ دن پہلے جو کچھ ہوا، اس کی تفصیلات چھان بین کے قابل ہیں، شاید وہ ہمیں اس حقیقت تک پہنچادیں جو ابتدائی دور کے مؤرخین میں سے کسی ایک نے بھی ثابت نہیں کی۔ علامہ طبری، ابن اثیر اور دوسرے

Marfat.com

مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حج سے واپس آنے کے بعد ایک دن بازار کا گشت لگانے نکلے۔ رستے میں ابولولوء ملا اور ان سے کہنے لگا۔ ''امیر المؤمنین! مجھے مغیرہ بن شعبہؓ سے بچائیے! مجھ پر بہت زیادہ خراج ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''تم کتنا خراج ادا کرتے ہو؟'' بولا: ''دو درہم روزانہ''! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اور کام کیا کرتے ہو؟'' کہنے لگا: ''نجاری، نقاشی اور آہن گری۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''تمہارے پیشوں کو دیکھتے ہوئے خراج زیادہ معلوم نہیں ہوتا!'' میں نے سنا ہے تم کہتے ہو کہ ''اگر میں چاہوں تو ہوا سے چلنے والی چکی بنا سکتا ہوں!'' کہنے لگا، ہاں!'' فرمایا: ''تو پھر مجھے ایک چکی بنا دو!'' بولا، ''اگر میں زندہ رہا تو آپ کے لیے ایسی چکی بناؤں گا جس کا چرچا مشرق سے مغرب تک ہوگا!'' اور یہ کہہ کر چلا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اس غلام نے ابھی ابھی مجھے دھمکی دی ہے!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے گھر تشریف لے گئے، دوسرے دن کعب احبار رضی اللہ عنہ ان کے پاس آئے اور کہا: ''امیر المؤمنینؓ! تیار ہو جائیے! آپ تین دن میں وفات پا جائیں گے!'' کعب عہد رسالتؐ میں یہودیوں کے ایک بہت بڑے عالم تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے تھے۔ وہ اپنا میلان اسلام کی طرف ظاہر کرتے تھے لیکن اعلان اس وقت کرنا چاہتے تھے جب ان پر وہ تمام علامتیں آئینہ ہو جائیں جو نبی عربی علیہ التحیۃ والتسلیم اور آپؐ کے صحابہ کرام کے متعلق انہوں نے کتب یہود میں پائی تھیں۔ چنانچہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت کا فیصلہ ہو گیا تو کعب نے اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کعب کے اس ڈراوے پر متعجب ہو کر ان سے پوچھا:

''تمہارا کیا مطلب ہے؟'' بولے: ''میں نے یہ توریت میں پڑھا ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ بات سن کر حیرت میں رہ گئے اور فرمایا: ''اللہ! عمر بن خطابؓ کا نام تم نے توریت میں پڑھا ہے۔ کعب نے کہا، نام ہی نہیں آپ کا حلیہ اور صفات اور یہ کہ آپ کا وقت ختم ہو گیا ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو چونکہ کوئی تکلیف یا بیماری نہیں تھی، اس لیے کعب کی اس گفتگو سے انہیں اور بھی حیرت ہوئی تاہم انہوں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ دوسرے دن کعب پھر آئے اور کہا، ''امیر المؤمنینؓ! ایک دن گزر چکا ہے اور دو دن باقی رہ گئے ہیں۔'' پھر اس کے ایک دن بعد انہوں نے کہا: ''دو دن گزر گئے ہیں اور اب صرف ایک دن اور ایک رات باقی ہے۔ آپ کی زندگی بس کل صبح تک ہے۔'' اور دوسرے دن صبح ابولولوء نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کاری زخم

لگائے، اس کے بعد جب لوگ اور ان کے ساتھ کعب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کعب کو دیکھا تو فرمایا:

تـوعـدنـی کـعـبٌ ثـلاثـاً أعـدّهـا
ولا شكّ انّ الـقـول مـا قـال لـی کـعـب
ومـا بـی حـذار الـمـوت انّـی لـمـیّـتٌ
ولـکـن حـذار الـذّنـب یـتـبـعـه الـذّنـب

ترجمہ: کعب نے مجھے ڈرایا ہے کہ میری زندگی کے صرف تین دن باقی رہ گئے ہیں، اور جو کچھ کعب نے مجھ سے کہا ہے اس میں کچھ شبہ نہیں۔ مجھے موت کا کیا ڈر کہ میں تو مر ہی رہا ہوں۔ البتہ یہ خوف ہے کہ ایک گناہ کے بعد دوسرا گناہ ہوتا ہے۔"

سرولیم میور نے اپنی کتاب "الخلافۃ الاولیٰ" میں کعب کا یہ قصہ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے، "ہمارے لیے یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ یہ عجیب قصہ کیسے وجود میں آیا۔ ہوسکتا ہے کہ ابولولوء کے چہرے پر دشمنی اور غضب کے آثار دیکھ کر کعب نے عمر رضی اللہ عنہ کو خبردار کیا ہو" ابولولوء کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے گفتگو اور کعب کے اس قصے سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ایرانی نے امیر المومنین کو دھمکی دی اور کعب نے تین دن پہلے قتل کا وقت مقرر کر دیا، ہمارے خیال میں کوئی شخص یہ نہیں سمجھتا کہ آسمانی کتابیں انفرادی واقعات کی تعین اتنی دقت وتفصیل کے ساتھ کرتی ہوں اس لیے کہ تمام کتب سماویہ علم غیب کو صرف خدائے واحد ہی کے لیے مخصوص قرار دیتی ہیں۔ اس سے لازمی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ کعب اس راز سے واقف تھے اور اسی لیے انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبردار کیا تھا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابولولوء کی دھمکی کے بعد بھی اس تنبیہ کا کوئی خیال نہ کیا اور ہونے والی بات ہو کے رہی۔ کعب کی تنبیہ اور ابولولوء کا حملہ دونوں اس امر کی دلیل ہیں کہ اس میں کوئی راز تھا جو ارتکاب جرم کے وقت تو ظاہر نہیں ہوا، لیکن بعد کو کھل گیا۔ ہم اسے اس کے موقع پر بیان کریں گے۔

لوگ مسجد میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ ابولولوء نے یہ ناشدنی حرکت کیوں کی؟ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا شانہ خلافت میں اپنے بستر پر لیٹے تھے، طبیب انہیں سفر آخرت کی تیاری کا مشورہ دے رہا تھا اور سربرآوردہ مسلمان اس ناگہانی مصیبت کے متعلق ان سے گفتگو کر رہے تھے جو مسلمانوں کے اس عظمت مآب خلیفہ کی وفات کے بعد، خطرناک نتائج کا سبب بن سکتی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفہ کون ہو؟ یہ سب سے بڑی فکر تھی، جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان لوگوں کے دل و دماغ الجھے ہوئے تھے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرح مسلمانوں کا خلیفہ خود نامزد کر دینا چاہیے یا انہیں اپنا خلیفہ خود منتخب کر لینے کے لیے آزاد چھوڑ دینا چاہیے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوا تھا۔ روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا۔ ''بہتر ہوتا اگر آپ کسی کو خلیفہ بنا دیتے!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: ''کس کو؟'' کہا، آپ کا کام کوشش کرنا ہے، کیونکہ آپ ان کے رب نہیں ہیں! اگر آپ اپنی زمین کے نگران کو بلاتے ہیں تو کیا یہ نہیں چاہتے کہ وہ اپنی واپسی تک کسی کو اپنا قائم مقام بنا کر آئے؟'' فرمایا: ''کیوں نہیں!'' کہا، ''اور جب آپ اپنے ریوڑ کے چرواہے کو بلاتے ہیں تو کیا یہ نہیں چاہتے کہ وہ اپنی واپسی تک کسی دوسرے کو اپنی جگہ مقرر کر آئے؟''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ''اگر میں کسی کو خلیفہ نامزد کروں تو کر سکتا ہوں کہ جو مجھ سے بہتر ہے۔۔۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ۔۔۔ انہوں نے اپنا خلیفہ نامزد کیا تھا اور اگر خلیفہ نامزد نہ کروں تو یہ بھی کر سکتا ہوں کہ جو مجھ سے بہتر تھے۔ سرکار رسالت مآب ﷺ انہوں نے اپنا خلیفہ نامزد نہیں فرمایا تھا۔'' روایت ہے کہ سعد بن زید رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا ''اگر آپ مسلمانوں کے کسی فرد کے متعلق اشارہ فرما دیتے تو لوگ آپ کو امین سمجھتے!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''میں اپنے بعض ساتھیوں میں حرص پاتا ہوں۔'' اس کے بعد فرمایا: ''اگر سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ میں سے کوئی ہوتا تو میں اسے خلیفہ بنا دیتا، کیونکہ مجھے ان پر اعتماد تھا۔'' دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ''میں کسے خلیفہ بناؤں؟ اگر ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ ہوتے تو انہیں بنا دیتا!'' اس شخص نے کہا، ''امیر المؤمنین! آپ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے کیوں گریز فرماتے ہیں؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا، ''خدا تجھے غارت کرے! واللہ! میں خدا کی رضا نہ چاہوں گا کہ ایسے شخص کو خلیفہ بناؤں! جو اپنی بیوی کو اچھی طرح طلاق بھی نہ دے سکتا ہو!''

اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ زخمی ہونے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب ان کے گھر لے جایا گیا تو انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو بلا کر کہا، ''میں تمہیں ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں!'' حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بولے، ''اگر آپ مجھے مشورہ دے رہے ہیں تو میں آپ کی بات قبول کرتا ہوں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم کیا کہنا چاہتے

Marfat.com

ہو؟'' اور حضرت ابن عوف رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا، ''آپ کو خدا کی قسم! کیا آپ مجھے اس خلافت کا مشورہ دے رہے ہیں؟ ۔۔۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ'' نے جواب دیا۔ ''بخدا نہیں!'' اس گفتگو کے بعد حضرت عبدالرحمٰن کی زبان سے آخری بات جو نکلی وہ یہ تھی کہ ''بخدا! اب میں اس میں کبھی دخل نہ دوں گا!'' ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں خلیفہ کے انتخاب کا کوئی قاعدہ مقرر نہ تھا، اسی طرح یہ روایات اس امر کا بھی ثبوت ہیں کہ جونہی سلطنت کا دامن پھیلنا شروع ہوا، مسلمانوں میں باہمی رشک و منافست کی فتنے انگڑائیاں لینے لگے اور یہی حضرت عمر نے فرمایا بھی تھا کہ ''میں اپنے ساتھیوں میں حرص پاتا ہوں۔'' مسلمانوں کی اسی حرص کی بنا پر وہ کسی کو اپنے بعد خلیفہ نامزد کرنے سے ہچکچا رہے تھے، جس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنا جانشین نامزد کیا تھا، رہا ان کا یہ قول کہ اگر ابوحذیفہ کے آزاد کردہ غلام سالمؓ یا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ میں سے کوئی ہوتا تو میں اسے خلیفہ بنا دیتا۔۔۔ سو۔۔۔ گمان غالب یہ ہے کہ۔۔۔ دراصل ان کی غرض اس نازک صورت حال سے صرف نظر کرنا تھا جس سے عہدہ برآ ہونا، عمرؓ جیسے بے باک، جری اور دھن کے پکے انسان کے لیے بھی دشوار ہو گیا تھا۔

تاہم وہ اس مسئلے کو ادھر میں بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو واقعات سقیفہ بنی ساعدہ میں پیش آئے تھے، وہ ان کی نظر کے سامنے تھے اور اب تو صورت حال اس سے بھی کہیں زیادہ نازک تھی، پہلے خلافت کا دعویٰ صرف مہاجرین و انصار تک محدود تھا، لیکن اب چونکہ روم اور ایران کی جنگوں میں تمام عربوں نے شرکت کی تھی اس لیے ہر قبیلہ یہ سمجھتا تھا کہ اسے خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔ اور یہ بھی اس وقت تھا جب بعض قبیلے یہ دعویٰ نہ کرتے کہ خلافت کے لیے وہ بھی اپنا نمائندہ بھیجنے کے مجاز ہیں، اس صورت میں عربوں اور نوزائیدہ اسلامی سلطنت کے لیے جو خطرہ تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ تمام مسلمانوں سے زیادہ اسے محسوس کر رہے تھے چنانچہ بہت ہی قلیل مدت کے سوچ بچار کے بعد فوراً خلافت کو چھ آدمیوں: حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حضرت علی بن طالب رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی مجلس مشورت پر منحصر کر دیا۔ ان حضرات کی خلافت کے سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک قول ماثور ہے کہ ''میں نے ان لوگوں سے زیادہ کسی کو خلافت کا حقدار نہیں پایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاحین حیات ان سے خوش رہے۔ ان میں سے جس کسی کو بھی خلیفہ بنایا جائے وہی میرے بعد خلیفہ

Marfat.com

ہوگا۔" اوران چھ بزرگوں کا نام لینے کے بعد فرمایا، "اگر خلافت سعد رضی اللہ عنہ کو ملے تو انہیں دے دی جائے کہ میں نے سعد رضی اللہ عنہ کو کسی کمزروی اور خیانت کی بناپر معزول نہیں کیا تھا۔ بصورت دیگر جس کو بھی اس خدمت کے لیے انتخاب کیا جائے، مسلمانوں کو اس کی مدد کرنی چاہیے۔"①

جب لوگوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کا علم ہوا تو وہ مطمئن ہو گئے۔ فاروق اعظمؓ نے ان حضرات کو بلایا جنہیں خلافت کی مجلس شوریٰ کا رکن نامزد کیا تھا اور فرمایا: "علیؓ! میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر خلافت تمہیں مل جائے تو بنو ہاشم کو لوگوں کی گردن پر سوار نہ کر دینا!۔۔۔

① شوریٰ کا قصہ اور یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارباب خلافت کی نامزدگی کس طرح کی، علامہ طبری اور ابن اثیر نے اس کا حال اس طرح لکھا ہے: جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو زخمی کر دیا گیا تو لوگوں نے ان سے کہا "امیر المومنینؓ! بہتر ہوتا، اگر آپ کسی کو خلیفہ نامزد کر دیتے!" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا "اگر ابوعبیدہؓ زندہ ہوتے تو میں انہیں خلیفہ بنا دیتا اور اگر میرا رب مجھ سے پوچھتا تو کہہ دیتا کہ میں نے تیرے (نبی ﷺ) کو فرماتے سنا ہے کہ ابوعبیدہؓ اس امت کے امین ہیں او راگر ابوحذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالمؓ زندہ ہوتے تو خلافت ان کے سپرد کر دیتا اور اگر میرا رب مجھ سے پوچھتا تو کہہ دیتا کہ میں نے تیرے نبی (ﷺ) کو فرماتے سنا ہے کہ سالم اللہ تعالیٰ سے بہت محبت کرتے ہیں۔" ایک شخص نے کہا: "عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق کیا خیال ہے؟" فرمایا "اللہ تجھے غارت کرے، بخدا! میں نے اللہ سے اس بات کی خواہش کبھی نہیں کی، افسوس ہے تجھ پر! میں اس شخص کو خلیفہ کیسے بناؤں جو اپنی بیوی کو طلاق دینے سے عاجز رہا۔ وہ ہمارے نزدیک اتنا عقل مند نہیں ہے کہ تمہاری زمام کار سنبھالے۔ یہ میرے لیے کوئی پسندیدہ بات نہ ہوگی کہ میں اپنے کسی گھر والے کے لیے خلافت چاہوں۔ اگر یہ بھلائی ہے تو ہمیں حاصل ہو چکی اور اگر برائی ہے تو اس کا ہم سے دور ہی رہنا اچھا ہے، خاندان عمرؓ کا ایک فرد کافی ہے اور امت محمدیؐ کو مسئولیت کے لیے کافی ہے۔ بہرحال میں نے اپنے نفس سے جنگ کی اور اپنی اولاد کو محروم کر دیا۔ اس کے بعد بھی اگر مجھے نجات مل جائے اور میں اس طرح چھوٹ جاؤں کہ نہ سزا ملے نہ جزا تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔ دیکھو، اگر میں کسی کو خلیفہ بناؤں تو بنا سکتا ہوں کہ جو مجھ سے بہتر تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ۔۔۔ انہوں نے خلیفہ بنایا تھا، اور اگر نہ بناؤں تو یہ بھی کر سکتا ہوں کہ جو مجھ سے بہتر تھے۔۔۔ آنحضرت ﷺ۔۔۔ انہوں نے کسی کو اپنا قائم مقام نامزد نہیں فرمایا تھا۔ اور اللہ اپنے دین کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔" لوگ ان کے پاس سے چلے گئے۔ شام کو پھر آئے اور کہا، "امیر المومنینؓ! بہتر ہوتا اگر آپ کوئی وصیت فرما دیتے!" فرمایا: "میں نے گفتگو کے بعد پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ میں غور کروں اور تم میں سے کسی کو خلیفہ بنا دوں، لیکن میں نے نہ چاہا کہ زندگی میں بھی اس کا بار اٹھاؤں اور مرنے کے بعد بھی۔ پس یہ جماعت تم پر مقرر کر دی گئی ہے جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ یہ لوگ جنتی ہیں اور چھ آدمیوں کا نام لیا۔" ابن قتیبہ نے "الامامۃ والسیاسۃ" میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، "اگر میں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو پاتا تو انہیں خلیفہ بنا دیتا اور اگر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ہوتے تو یہ ذمہ داری ان کے سپرد کر دیتا۔" پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی احادیث دہرائیں جو ان دونوں کے متعلق تھیں اور کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ ان سے دریافت فرمائے گا تو وہ یہ حدیثیں پیش کر دیں گے۔"

عثمانؓ! میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر تم خلیفہ ہو جاؤ تو بنو ابی معیط کو لوگوں کی گردن پر سوار نہ کر دینا! سعد! میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر خلافت کا فیصلہ تمہارے حق میں ہو تو اپنے رشتے داروں کو لوگوں کی گردن پر سوار نہ کر دینا، اسی طرح دوسرے ارکان شوریٰ کو بھی قسمیں دلائیں۔ پھر کہا، ''جاؤ، مشورہ کر کے فیصلہ کرو، مسلمانوں کو نماز صہیب رضی اللہ عنہ پڑھائیں گے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ ان کے انتقال سے پہلے مشورت ختم ہو جائے اور مسلمان اپنے لیے خلیفہ کا انتخاب کر لیں تاکہ وہ اپنی جان، اسلام اور سلطنت کے انجام کی طرف سے مطمئن ہو کر جان آفریں کے سپرد کریں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو ارکان شوریٰ میں شامل کر دیا تھا لیکن وہ صرف شوریٰ کے دوسرے ارکان اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان ایک واسطہ تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''لوگ کھڑے ہو کر مشورہ کرنے لگے، مجھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک یا دو بار مشورے میں شامل ہونے کی دعوت دی، لیکن بخدا! میں اس میں شامل ہونا پسند نہیں کرتا تھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ ان کے معاملے میں ہوگا وہی جو والد نے کہا تھا اور خدا کی قسم! میں نے بہت ہی کم دیکھا ہے کہ ان کے ہونٹوں میں حق کے سوا کسی بات کے لیے جنبش پیدا ہوئی ہو۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مجھ سے بہت زیادہ اصرار کیا تو میں نے کہا، ''کیا آپ لوگوں کو سمجھ نہیں ہے کہ امیر المؤمنین زندہ ہیں اور آپ امیر بنا رہے ہیں؟ خدا کی قسم! مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مرقد سے جگا دیا، انہوں نے فرمایا، ''تم لوگ مہلت دو! اگر میں مر جاؤں تو صہیب رضی اللہ عنہ تمہیں تین دن نماز پڑھائیں گے۔ پھر تم اپنے معاملے میں اتفاق کر لو اور اگر اس کے بعد تم میں سے کوئی، مسلمانوں کے مشورے کے بغیر، امیر بنے تو اس کی گردن مار دو!''

جس دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا گیا ہے، حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ مدینے میں موجود نہیں تھے، اس لیے لوگوں سے مہلت طلب کرنے کے بعد کہا، ''اپنے بھائی طلحہ کا تین دن انتظار کرنا، اگر وہ آ جائیں تو فبہا ورنہ اپنے معاملے کا تصفیہ کر لینا۔'' معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ڈرتے تھے کہ لوگ ان کی وفات کے بعد ایک دوسری کی مخالفت کریں گے اور ان کی یہ مخالفت شورش کی صورت اختیار کر جائے گی۔ بنو ہاشم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدد کریں گے، بنو ابی معیط حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیں گے اور اہل فوج حضرت زبیر رضی اللہ عنہ یا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ یا حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو

چاہیں گے کہ تینوں ممتاز سپہ سالاروں میں سے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انصار رضی اللہ عنہ کو بلا کر کہا: ''انہیں تین دن تک ایک گھر میں بند رکھو، اگر وہ ٹھیک ٹھیک کام کریں تو خیر ورنہ گھر میں گھس کر ان کی گردنیں مار دینا۔'' پھر ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کو بلایا جو عرب کے گنے چنے بہادروں میں سے تھے اور ان سے کہا، ''جس گھر میں یہ مشورہ کریں اس کے دروازے پر کھڑے ہو جانا اور کسی کو گھر میں'' نہ جانے دینا'' دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''ابو طلحہ! اپنے قبیلے کے پچاس انصاریوں کو لے کر ارکان شوریٰ کے ساتھ رہنا، میرا خیال ہے کہ یہ کسی ایک رکن کے گھر میں جمع ہوں گے۔ تم اپنے ساتھیوں کو لے کر اس گھر کے دروازے پر کھڑے ہو جانا اور کسی گھر میں نہ جانے دینا! ان لوگوں کو تین دن سے زیادہ مہلت دینے کی ضرورت نہیں۔ اس دوران میں انہیں اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لینا چاہیے! اللہ! میری طرف سے تو ان کا نگران ہے!''

آپ کا کیا خیال ہے، اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان چھ اشخاص میں سے کسی ایک کو بطور خود خلیفہ نامزد فرما دیتے تو مسلمان ان کے انتخاب کو بھی اسی طرح قبول کر لیتے، جس طرح انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے سلسلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کو قبول کر لیا تھا؟ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کا یقین ہوتا تو وہ تردد سے ہرگز کام نہ لیتے''[1] لیکن جو حالات ان کے سامنے تھے وہ انہیں مطمئن نہ ہونے دیتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے لوگوں سے فرمایا تھا، ''اگر تم میں سے کوئی مسلمانوں کے مشورے کے بغیر امیر بننا چاہے تو اس کی گردن اڑا دینا۔'' لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا اور چند برس گزر گئے۔ لیکن جب وقت نے طول کھینچا تو ان میں ناگواری پھیلنے لگی یہاں تک کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش برپا کر کے انہیں شہید کر دیا۔ ان کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی، جو کئی سال تک مسلسل جاری رہی۔ یہ خانہ جنگی ثابت کرتی ہے کہ

---

[1] ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ان لوگوں ۔۔۔ ارکان شوریٰ ۔۔۔ کو ایک گھر میں پہنچا دو اور جب یہ کسی شخص کے حق میں فیصلہ کر دیں تو ان کی مخالفت کرنے والے کی گردن اڑا دو!'' جب یہ لوگ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس سے چلے گئے تو فرمایا ''اگر یہ شخص جس کی کنپٹیوں کے بال اڑے ہوئے ہیں ۔۔۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مراد ہے ۔۔۔ امیر بنا دیا گیا تو یہ انہیں رستے پر چلا سکتا ہے!'' ان کے صاحبزادے نے فرمایا: ''امیر المومنین! پھر آپ کے لیے کیا مانع ہے؟'' ۔۔۔ فرمایا: ''میں پسند نہیں کرتا کہ زندگی میں بھی اس کا بوجھ اٹھاؤں اور مرنے کے بعد بھی۔'' لیکن بعض لوگ اس روایت سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''یہ سیاسی غرض کے تحت وضع کی گئی ہے!

Marfat.com

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اختلاف امت کے جس ہولناک انجام سے ڈرتے تھے اس میں کوئی مبالغہ نہ تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے دلوں میں کیا کچھ ہے؟ اور انہیں اندازہ تھا کہ وہ قبائلی عصبیت، جو بلاد عرب پر "لوائے رسالت" کے لہرانے کے بعد سے دم سادھے بیٹھی تھی، اسے پھر نئے سرے سے کھل کھیلنے کی چھٹی مل جائے گی اور سلطنت کی وسعت اس کے پھیلنے اور بھڑکنے میں معین ہوگی اسی لیے انہوں نے اس کا علاج یہ سوچا کہ خلافت کو چھ آدمیوں کی مجلس شوریٰ پر منحصر کر دیا اور موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس سے بہتر اور کوئی علاج ہو بھی نہیں سکتا۔ یہ علاج فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بعد دس برس تک کامیاب رہا، لیکن جن اسباب و عوامل نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خوف زدہ کر رکھا تھا، وہ اس دوران میں بھی طبیعتوں کو نفسانی اغراض پر ابھارتے رہے او رنفسانی اغراض نے اکثر عقل و حکمت کے فیصلوں کو پامال کر کے وہی حالات پیدا کر دیئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پچیس برس بعد مسلمانوں کی زندگی میں پیدا ہو گئے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صرف یہی نہیں کیا کہ خلافت کو ان چھ ارکان شوریٰ میں منحصر کر دیا جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تا حین حیات خوش رہے بلکہ آئندہ ہونے والے خلیفہ کے لیے کچھ ایسے مستحکم سیاسی اصول بھی مرتب کر دیئے چاہے، جن سے سلطنت کے معاملات درست رہیں اور اسلام کی عزت میں اضافہ ہو۔ اس سلسلے میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "میں اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ اللہ سے ڈرتا رہے، مہاجرین اولین کے حقوق کی حفاظت کرے اور ان کا احترام ملحوظ رکھے۔ مفتوحہ ممالک میں رہنے بسنے والوں سے اچھا سلوک کرے کہ انہوں نے اسلام کی مدد کی ہے، دشمنوں پر غالب آئے ہیں اور مال جمع کیا ہے۔ صرف وہی کچھ ان سے لیا جائے جو ان کی ضرورت سے زائد ہو اور وہ خوشی سے دے دیں۔ انصار کا خاص خیال رکھے کہ انہوں نے بے گھروں کو گھر دیئے اور ایمان کی حفاظت کی۔ ان کا احسان مانا جائے اور ان کی کوتاہیوں سے چشم پوشی کی جائے۔ عربوں سے خوش سلوکی کے ساتھ پیش آئے کہ یہی لوگ اصل عرب اور مادہ اسلام ہیں۔ ان کے مالداروں سے زکوٰۃ وصول کر کے ان کے محتاجوں میں تقسیم کر دے۔ ذمیوں کے حقوق کا ہر طرح پاس کرنے کہ وہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری میں ہیں۔ ان سے جو وعدہ کیا گیا ہے، اسے پورا کرے۔ ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ ڈالے اور ان کے دشمنوں سے جنگ کرے۔"

اس روایت میں بعض مؤرخین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول میں اور اضافہ کرتے ہیں: "یا

Marfat.com

اللہ! کیا میں نے پیام پہنچا دیا، میں اپنے بعد کے خلیفہ کے لیے بہترین اور پاکیزہ ترین راحت چھوڑے جا رہا ہوں!" حملے کے بعد سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے انجام ہی پر غور و فکر کرتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے بعد ان کی ایسی کوئی اجتہادی رائے باقی نہ رہ جائے، جس سے وہ مطمئن نہ ہوں اور جس کی صحت کا انہیں پختہ یقین نہ ہو۔ اس سے پہلے کلالہ کے متعلق فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی بات اور وہ گفتگو ہم درج کر آئے ہیں جو اس مسئلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے درمیان ہوئی تھی اور جس کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "سورۃ نساء کی آخری آیت کو کافی سمجھو!" سورۃ نساء کی وہ آخری آیت یہ ہے:

يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِثُهَا إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ وَإِنْ كَانُوا إِخْوَةً رِجَالًا وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَنْ تَضِلُّوا وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

(النساء:١٧٦)

ترجمہ: "لوگ تم سے کلالہ کے معاملے میں فتویٰ پوچھتے ہیں؟ کہو وہ اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے، اگر کوئی شخص بے اولاد مر جائے اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے ترکے میں سے نصف پائے گی اور اگر بہن بے اولاد مرے تو بھائی اس کا وارث ہوگا۔ اگر میت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکے میں سے دو تہائی کی حقدار ہوں گی اور اگر کئی بھائی بہنیں ہوں تو عورتوں کا اکہرا اور مردوں کا دہرا حصہ ہوگا۔ اللہ تمہارے لیے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔"

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آخری خطبے میں ہم ان کا یہ قول بھی نقل کر چکے ہیں کہ "اگر میں زندہ رہا تو اس کے سلسلے میں ایسا فیصلہ کروں گا، جسے قرآن پڑھنے والے اور نہ پڑھنے والے دونوں اپنے فیصلے کا مدار بنائیں گے!" انہوں نے میراث میں دادا کے حصے کے متعلق اپنی ایک اجتہادی رائے اسی رات شانے کی ایک ہڈی پر لکھی تھی جس کی صبح ان پر حملہ کیا گیا جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ زخم مہلک ہے تو اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "ہڈی لاؤ! جس پر کل میں نے دادا کے حصے کا مسئلہ لکھا تھا۔" اس سے ان کا مقصد اپنی اس تحریر کو مٹا دینا تھا تاکہ ان کے بعد

Marfat.com

کوئی اپنی حجت نہ بنا لے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا، ''امیرالمؤمنین! یہ کام آپ کی طرف سے ہم بھی کر سکتے ہیں۔'' یہ کوئی آسان بات نہ تھی کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنے والد کو زخموں کی تکلیف میں مبتلا چھوڑ کر تحریر مٹانے بیٹھ جاتے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہ مانے اور فرمایا: ''نہیں ---!'' اور وہ اس وقت تک مطمئن نہ ہوئے جب تک ہڈی نہ آ گئی اور انہوں نے اپنی تحریر اپنے ہاتھ سے نہ مٹا دی۔

آپ کو یاد ہوگا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسند خلافت پر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے یہ حکم دیا تھا کہ مرتدین کے غلام ان کے رشتے داروں کو واپس کر دیئے جائیں اور فرمایا تھا: ''میں پسند نہیں کرتا کہ عربوں میں غلامی کا رواج قائم ہو!'' فتوحات کی وسعت میں ان کے اس حکم کو بہت بڑا دخل تھا۔ مرتدین سب کے سب جزیرہ نمائے عرب کے رہنے والے تھے۔ عرب کے کچھ بطون وقبائل شام وعراق میں جا کر بس گئے تھے اور ان دونوں ملکوں کی لڑائیوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہو گئے تھے، چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ ان کا وقت آخر ہے تو عربوں کے اتحاد اور خود اعتمادی میں اضافہ کرنا چاہا اور بستر پر پڑے پڑے فرمایا: ''عرب کے قیدیوں میں سے جو میری وفات پائے، وہ آزاد ہے!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد کوئی ایسا اجتہاد نہ تھا، جس سے ان کی سابقہ رائے کی نفی ہوتی ہو بلکہ انے اس حکم کی: ''میں پسند نہیں کرتا کہ عربوں میں غلامی کا رواج قائم ہو!'' بڑی دوراندیشانہ تطبیق تھی، شاید انہیں اندیشہ تھا کہ ان کے بعد ہونے والا خلیفہ ان کی اس اجتہادی رائے کی تطبیق نہ کر سکے گا جو انہوں نے اپنی خلافت کے پہلے ہی دن صادر کر دی تھی۔ اس لیے اپنے شروع کیے ہوئے کام کو انجام پر پہنچانے اور تمام غلاموں کو آزاد کر دینے سے پہلے انہوں نے اس دنیا کو چھوڑنا نہ چاہا۔

پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سوچا کہ ان کے بعد مسلمانوں کا انجام کیا ہوگا، پھر اپنے اجتہادات پر غور کیا اور اس کے بعد انہیں خیال آیا کہ ان پر قرض ہے جسے ادا کرنے سے پہلے وہ اس دنیا کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ بات اصل میں یہ تھی کہ انہوں نے بیت المال سے چھیاسی ہزار درہم قرض لے رکھے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان سے اس قرض کا ذکر کر کے فرمایا: ''میرا متروکہ فروخت کر دو، اگر اس سے ادا ہو جائے تو بہتر، ورنہ بنو عدی سے یہ درخواست کرنا اور اگر وہ بھی پورا نہ کر سکیں تو کل قریش سے، لیکن قریش کے علاوہ اور کسی کو تکلیف نہ دینا۔'' چند دوسرے مسلمانوں کی طرح حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ

کو بھی یہ معلوم تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ رقم قرض لے کر مسلمانوں پر خرچ کی ہے۔اس لیے انہوں نے کہا: ''آپ بیت المال سے لے کر یہ قرض کیوں نہیں ادا فرما دیتے؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا: ''معاذ اللہ! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم اور تمہارے ساتھی میرے بعد یہ کہیں کہ ہم نے اپنا حصہ عمر کے لیے چھوڑ دیا، تم مجھے تسلی دے دو! مگر ایک مصیبت میرے گلے پڑ جائے اور میں ایک ایسی مشکل میں مبتلا ہو جاؤں کہ اس سے نکلے بغیر میرے چھٹکارے کی کوئی سبیل نہ ہو۔'' پھر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''میرے قرض کی ذمہ داری قبول کرو!'' اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس کی ذمہ داری لے لی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابھی دفن نہیں کیے گئے تھے کہ ان کے صاحبزادے نے ارکان شوریٰ اور چند انصار کو اپنی اس ضمانت پر گواہ بنایا اور جمعے کا دن ابھی گزرنے نہ پایا تھا کہ قرض کی رقم لے کر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچے اور چند گواہوں کے سامنے اس بار سے سبک دوش ہو گئے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے مال کے چوتھائی حصے کے لیے اپنی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کے حق میں وصیت فرمائی تھی اور کہا تھا کہ جب وہ بھی وفات پا جائیں تو یہ مال آل عمرؓ کے اکابر میں تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دنیا کے حساب سے فارغ ہو گئے اور اب اپنی فکر کا رخ اس زندگی کی طرف پھیر دیا جو موت کے بعد شروع ہونے والی تھی۔ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ اپنے دو محترم رفیقوں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق کے ہم پہلو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں دفن کیے جائیں۔اس سے پہلے وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کی اجازت طلب کر چکے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا انہیں اجازت دے چکی تھیں لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے فرمایا: ''جب میں مر جاؤں تو ایک بار ان سے پھر اجازت طلب کر لینا، اگر اجازت مل جائے تو بہتر ورنہ اصرار نہ کرنا، مجھے اندیشہ ہے کہیں انہوں نے مجھے میرے اقتدار کی وجہ سے اجازت نہ دیدی ہو۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا گیا تو انہوں نے اپنے صاحبزادے سے فرمایا: ''عبداللہ! ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس جاؤ اور ان سے کہو، عمرؓ آپ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے۔۔۔ دیکھو امیر المؤمنین نہ کہنا کہ اب میں مسلمانوں کا امیر نہیں رہا۔۔۔ اور مستدعی ہے کہ آپ اسے اس کے دو محترم رفیقوں کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت

Marfat.com

عطا فرما دیجیے" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ بیٹھی رو رہی تھیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے سلام کے بعد عرض کیا۔ "عمرؓ بن خطاب آپ سے اپنے دو محترم رفیقوں کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت چاہتے ہیں!" حضرت عائشہ نے فرمایا: "خدا گواہ ہے، یہ جگہ میں نے اپنے لیے رکھی تھی، لیکن آج میں انہیں اپنے اوپر ترجیح دیتی ہوں۔"

جب حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ واپس آئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اجازت دے دی ہے تو فرمایا۔ "مجھے اس آرام گاہ سے بڑھ کر کوئی چیز عزیز نہیں ہے۔ دیکھو! عبداللہ بن عمر! جب میں مر جاؤں تو میرا جنازہ لے کر جانا اور ام المؤمنین کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہنا، "عمر بن خطابؓ اجازت چاہتا ہے۔ اگر وہ اجازت دے دیں تو جنازہ اندر لے جانا۔ ورنہ مجھے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دینا۔" اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اعمال کے سلسلے میں اپنے نفس کا محاسبہ فرمانے لگے۔ انہیں تھوڑی دیر کے بعد ایک نہایت دشوار، نہایت شدید مؤقف سے دو چار ہونا تھا۔ یہ مؤقف اپنے پروردگار کی بارگاہ میں ان کی حاضری تھی جوان سے تقدیم وتاخیر، ترک واختیار اور ظاہر وباطن کے متعلق پوچھے گا، کیسے! ان کے پروردگار نے ان کے لیے کون سا انجام رکھا ہے؟ کیا ان کی نیکیاں ان کی برائیوں کو زائل کر دیں گی یا برائی، نیکی پر غالب آ جائے گی؟ اور اللہ انہیں اس کا پورا پورا بدلہ دے گا۔۔۔؟ وہ اس خیال سے بہت بے چین تھے۔ ایک عیادت کو آنے والے نے کہا: 'خدا کی قسم! مجھے امید ہے کہ آگ آپ کے جسم کو کبھی مس نہ کرے گی۔"

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس شخص کی طرف دیکھا، ان کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر حاضرین کے دل بھر آئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا، "اے شخص! اس معاملے میں تیرا علم بہت قلیل ہے۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں زمین کے سارے خزانے آنے والی آزمائش کے خوف پر نچھاور کر دیتا!" ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہ آخری فقرہ کہا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ان کے پاس تھے، وہ بولے: "خدا کی قسم! مجھے امید ہے کہ آپ کو اس سے زیادہ کچھ نہ دیکھنا پڑے گا، جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (مریم: ۷۱)

ترجمہ: اور تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس پر سے گزر نہ ہو۔"

کیونکہ جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے، آپ امیر المؤمنین، امین المؤمنین اور سید المؤمنیں، کتاب اللہ سے فیصلہ فرماتے ہیں اور حصے برابر، برابر تقسیم کرتے ہیں۔" یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے، سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا، "ابن عباس! کیا تم میرے لیے اس کی شہادت دو گے؟"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے شانے پر ہاتھ مار کے فرمایا، "ابن عباس! میرے لیے اس کی شہادت دینا!" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا ہاں "میں گواہی دوں گا!" حق یہ ہے کہ حساب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ خوف ان کے ایمان کے استحکام ، ان کے یقین کی قوت اور ان کے اس خوف الٰہی کی شہادت دیتا ہے جو ہر اس انسان کا سرمایہ حیات ہے جس نے اپنے ہر کام میں خلوص نیت کے ساتھ اللہ کی خوشنودی کو مدنظر رکھا، جب ان پر حملہ کیا گیا تو لوگ ان کے پاس آئے۔ وہ ان کو خراج تحسین پیش کرتے، انہیں الوداع کہتے اور امیر المؤمنین کے لقب سے مخاطب کرتے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "کیا تم امارت کو میرا توشہ آخرت بنا رہے ہو؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت کی اور جب اللہ نے آپ کو یاد فرمایا تو آپ مجھ سے خوش تھے، اس کے بعد میں ابوبکر کے ساتھ رہا، ان کا حکم سنتا اور مانتا ، آخر کار وہ بھی وفات پا گئے اور میں آخری دم تک ان کا حکم سنتا اور مانتا رہا، لیکن اب تمہاری یہ امارت ہی میرے لیے خوف کا سبب بن گئی ہے۔"

زخموں کی تکلیف چونکہ شدید تھی اس لیے حاضرین ان کی تعریف و توصیف کر کے اسے بھلانے لگے، اس پر فرمایا: "جو عمر رضی اللہ عنہ کو بہکانا چاہتا ہے، وہ خود فریب خوردہ ہے، خدا کی قسم ! میرے تو یہ خواہش ہے کہ جیسا میں یہاں آیا تھا ویسا ہی یہاں سے چلا جاؤں، نہ مجھے کچھ دینا ہو نہ لینا ہو۔" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا، "حملے کے بعد عمر بن خطاب کے پاس سے پہلے میں پہنچا تھا۔ میں نے ان سے کہا، جنت کی بشارت قبول فرمایئے! آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی اور آخر تک خدمت رسالت میں حاضر رہے۔ پھر آپ کو مسلمانوں کی حکومت سونپی گئی اور آپ نے اسے طاقتور بنایا اور امانت کا حق ادا کر دیا۔" فرمایا: "تم مجھے جنت کی بشارت دے رہے ہو، لیکن خدا کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اگر میرے اختیار میں ہو تو میں اس سے پہلے کہ مجھے حقیقت کا علم ہو، پیش آنے والے خوف پر دنیا و مافیہا نچھاور کر دوں۔ رہا وہ ذکر جو تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت کے سلسلے میں کیا ہے وہ درست

Marfat.com

ہے۔''لوگ جتنی ان کی تعریف کرتے تھے، اتنا ہی ان کا خوف بڑھتا جاتا تھا۔ روایت ہے کہ انہوں نے ایک تنکے کی طرف ہاتھ بڑھایا جوان کے بستر کے قریب زمین پر پڑا تھا اور اسے اٹھا کر اپنی آنکھوں کے سامنے لے گئے اور کہنے لگے'' کاش! میں یہ تنکا ہوتا، کاش میں پیدا ہی نہ کیا جاتا! کاش! میری ماں مجھے نہ جنتی! کاش! میں کچھ بھی نہ ہوتا! کاش! میں نسیا منسیا ہوتا۔''

یہ حال صدق ایمان پر دلالت کرتا اور اس عظیم انسان'' کی جلالت شان کا احساس دلاتا ہے، جو مسلمانوں کی امارت کا بار اٹھا کر اس گراں قدر ہستی نے ظاہر کی۔ فاروق اعظمؓ ان فتوحات پر نازاں نہیں ہوئے، جو ان کے عہد میں تکمیل کو پہنچیں۔ نہ ایران وروم کی تسخیر نے انہیں ناشکرا بنایا اور نہ وہ لوگوں کی تعریف وتحسین سے مغرور ہوئے، بلکہ انہیں یہ خوف تھا کہ اگر کبھی انہوں نے کسی کمزور پر ظلم کیا ہوگا اور اس کمزور کی فریاد آسمان پر پہنچی ہوگی تو عمر رضی اللہ عنہ کی تمام عمر کی نیکیاں صاحب عرش کے حضور بے وزن ہو جائیں گی۔ یہی خشیت تھی جس کی بنا پر وہ اپنی صاحبزادی اُم المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو تکنے لگے جو روتی اور یہ کہتی ہوئی اپنے والد کے پاس پہنچی تھیں: '' اے اللہ کے رسول کے دوست! اے اللہ کے خسر! اے امیر المؤمنینؓ!'' یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا،'' میں اپنے حق پدری کی بنا پر تم سے کہتا ہوں کہ مجھ پر بین نہ کرنا، البتہ تمہاری آنکھوں پر مجھے اختیار نہیں ہے۔ جس میت پر بین کیا جاتا ہے فرشتے اس سے نفرت کرتے ہیں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے رشتے داروں کو گریہ وزاری سے روک دیا اور وہ نوحہ وماتم کی بڑی شدت سے ممانعت فرماتے تھے۔ حضرت صہیبؓ نے زخم سے دودھ خارج ہوتے جو دیکھا تو بے اختیار چیخ اٹھے:'' ہائے عمرؓ! ہائے برادر! آپ کے بعد ہمارا کون ہے؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنا تو فرمایا:'' بھائی! صبر سے کام لو، کیا تم نہیں جانتے کہ جس پر بین کیا جاتا ہے، اس پر عذاب ہوتا ہے؟''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ اندیشہ ہوا کہ ان کے عزیز واقارب ان کے مرنے کے بعد تجہیز وتکفین میں غلو سے کام لیں گے، اس لیے وصیت فرمادی کہ نہ انہیں مشک سے نہلایا جائے، نہ مشک ان کے قریب لایا جائے۔۔ عرب میں دستور تھا کہ جب ان کا کوئی ممتاز فرد مرتا تھا تو اسی مشک سے نہلاتے تھے اور اپنے بیٹے سے فرمایا:'' مجھے اوسط درجے کا کفن دینا، کیونکہ اگر اللہ کے نزدیک مجھ میں کوئی بھلائی ہوگی تو وہ اسے اچھے لباس سے بدل دے گا اور اگر میں اس کے برعکس بُرا ہوا تو ہو مجھ سے چھین لے گا اور بہت تیزی سے چھین لے گا۔ میری قبر بھی معمولی ہونی چاہیے۔ عورتیں

Marfat.com

فرمایا: "اسے چھوڑنا انصاف سے بعید ہے، میری رائے میں اس کو قتل کرا دینا چاہیے۔" لیکن بعض مہاجرین نے اس رائے کو ناقابل برداشت شدت وسختی پر محمول کیا اور کہا: "کل عمر قتل کیے گئے ہیں، اور آج ان کا بیٹا قتل کر دیا جائے؟"

اس اعتراض نے حاضرین کو مغموم کر دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی خاموش رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے لیے حاضرین پر نگاہ دوڑائی، اس لیے کہ اگر وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے پر عمل کرتے ہوئے حضرت عبیداللہؓ کے قتل کا حکم دے دیتے ہیں تو آل عمر کے دل پر ایسے زخم لگتے جو کبھی مندمل نہ ہوتے اور اس سے ایسی ایسی شورشیں وجود میں آتیں، جن کے نتائج اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس کے علاوہ سنگ دلی کی ایک ایسی مثال قائم ہو جاتی جس سے زیادہ سختی و بے رحمی کا انسان تصور بھی نہ کر سکتا، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مزاج میں نرمی تھی جو اس قسم کی سنگدلی سے انہیں دور رکھتی تھی، اس لیے انہوں نے چاہا کہ حاضرین میں سے کوئی شخص اس نازک صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی راہ نکالے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اس مجلس میں موجود تھے، انہوں نے کہا: "اللہ نے آپ کو اس سے معاف رکھا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے، جب آپ مسلمانوں کے امیر نہیں تھے اور چونکہ یہ واقعہ آپ کے عہد خلافت میں نہیں ہوا اس لیے آپ پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کے اس قول میں منطق پائی۔ اس لیے ان کی رائے سے مطمئن نہیں ہوئے اور بہتر یہی سمجھا کہ خون بہا ادا کیا جائے، چنانچہ فرمایا: "میں ان مقتولین کا ولی ہوں، اس لیے خوں بہا مقرر کر کے اپنے مال سے ادا کروں گا۔"

حق یہ ہے کہ حضرت عبیداللہ رضی اللہ عنہ کے قتل کا فتویٰ سنگ دلانہ تھا جس میں عدل کا پہلو مشتبہ رہتا تھا، فرض کیجیے، حضرت عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنے اس یقین میں کہ ہرمزان جفینہ نے ان کے والد محترم کے خلاف ابولولوء سے سازش کی ہے، راہ صواب سے ہٹ گئے تھے پھر بھی ان کے پاس شبہے کا عذر تھا اور یہ عذر انہیں حد قتل سے محفوظ رکھنے اور ان کی سزا کو ہلکا کرنے کے لیے کافی تھا، اور بہت ممکن تھا اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پوری وقت نظر کے ساتھ تحقیق وتفتیش فرماتے تو ساز کے سارے تار و پود بکھر جاتے اور ایک ایسا ثبوت فراہم ہو جاتا جس کے بعد اس مسئلے میں کسی قسم کے شبہے کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی شہادتوں کو اگر ہرمزان اور جفینہ کے خلاف مکمل ثبوت نہ بھی مانا جائے تو بھی وہ حضرت عبیداللہ بن

Marfat.com

عمر رضی اللہ عنہ کو اس اقدام پر مجبور کرنے کے لیے کافی تھیں، اور ان سے ثابت ہوتا تھا کہ جس خنجر سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا وہ سرگوشی کرتے وقت سازش کرنے والوں کے ہاتھ میں تھا۔ شاید حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ سمجھ کر اس معاملے کی تفتیش کرنی مناسب نہ سمجھی کہ اس سے ایرانیوں کے جذبات بھڑک اٹھیں گے اور ان کے اور عربوں کے درمیان کینہ و دشمنی میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس لیے انہوں نے مقتولوں کا خوں بہا اپنی جیب سے ادا کر دیا، اور ساتھ ہی زیاد بن لبید البیاضی کو یہ حکم بھی دے دیا کہ وہ حضرت عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ پر تعریض نہ کرے، اس طرح وہ فتنہ سو گیا جس کا بیدار ہونا کوئی اچھی بات نہ تھی اور مسلمان سلطنت کے مختلف گوشوں میں واپس ہو کر پھر وہی زندگی بسر کرنے لگے، جو وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات سے قبل بسر کرتے تھے۔

ابولولوء نے خودکشی کر لی اور ہرمزان وجفینہ قتل کر دیئے گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مقتولوں کا خوں بہا اپنی جیب سے ادا کر دیا اور حضرت عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے اس فعل پر غور و فکر کی ممانعت فرما دی۔ ان سب چیزوں نے مل کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل پر ایک ایسا پردہ ڈال دیا جو آج تک پڑا ہوا ہے، اور مؤرخین آج بھی اسے چھیڑنے سے گریز کرتے ہیں اور قسم بہ حق کہ مجھے اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے اس فعل پر اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی شہادتیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور ان کی ہمشیرہ ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے اس یقین کو جائز ثابت کرتی ہیں کہ ان عجمیوں نے ان کے محترم والد کے خلاف سازش کی تھی۔ اور فیروز و ہرمزان کی طرف سے ان کی اس سازش کے لیے یہ عذر پیش کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے ان کا ملک فتح اور ان کے شہنشاہ کو ایک ایسے فرار پر مجبور کیا تھا جس کا انجام نہایت ذلیل اور بدترین صورت میں ظاہر ہوا۔ اپنے وطن کی اس ذلت و شکست پر ان کے دل بھڑکے تو انہوں نے از راہ انتقام جوئی سازش کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کی اس سازش کا شکار ہو گئے، جس میں تعجب کی کوئی بات نہیں بلکہ حیرت تو ان لوگوں پر ہونی چاہیے جو یہ سمجھتے ہیں کہ فیروز نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس لیے شہید کیا کہ امیر المؤمنین ؓ نے خراج میں کمی نہ کر کے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا، حالانکہ خراج کی زیادتی کی دوبارہ شکایت لے کر آنا اس کے لیے کوئی دشوار بات نہ تھی۔ اگرچہ وقت کی نزاکت کے لحاظ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سازش پر پردہ ڈالنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے لیکن مؤرخین پر تو ایسی کوئی پابندی بھی نہ تھی۔ ایرانیوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اسلام نے ان کو اور انہوں نے اسلام کو عزت دی تھی اور اس باب میں ان کی بھی وہی حیثیت تھی جو ان کے علاوہ

Marfat.com

دوسری مسلمان ہونے والی قوموں کی تھی، اس لیے ہر مؤرخ کا فرض تھا اور ہے کہ وہ ایک ایسے مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کرے جو تاریخ کی ملکیت ہو جانے کی بنا پر واجب التوضیح ہو گیا ہے، اسی لیے میں نے اس مسئلے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے اور اس یقین کے ساتھ کہ یہ رائے ان بہت سے واقعات کی وضاحت بھی کرتی ہے، جو بعد کو عرب و ایران کے درمیان پیش آئے۔ ①

یہ مسئلہ صراحت کے لائق سب سے زیادہ اس لیے ہے کہ اس کا تعلق امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب کی ذات سے ہے اور یہ وہ گرامی قدر وجود ہے جس کا نام تاریخ میں یادگار رہا ہے اور ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اس نے انصاف، بے لوثی، دانائی، اصابت رائے اور صدق نیت کی ایک زندہ جاوید مثال قائم کی۔ وہ اللہ اور اس کے دین کے لیے وقف ہو گیا اور اللہ نے اس کے ذریعے اسلام کو ایسی عزت بخشی کہ اس کا پرچم دنیا کے گوشے گوشے میں لہرانے لگا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا ذکر کیا گیا، تو حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمایا: ''عمر اسلام کا ایک مستحکم قلعہ تھے، جس میں لوگ داخل تو ہو جاتے تھے مگر نکلتے نہیں تھے لیکن جب ان کی وفات ہو گئی تو قلعہ کی دیوار میں شگاف پڑ گیا اور لوگ اسلام سے خارج ہونے لگے۔'' حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلام ایک آنے والے شخص سے مشابہ تھا، جو برابر قریب ہوتا جائے، لیکن جب وہ شہید کر دیئے گئے تو پیچھے ہٹنے والے کی مثال ہو گیا جو برابر پیچھے ہی ہٹتا چلا جائے۔'' روایت ہے کہ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے جب وہ قوت و چستی کی ابتدائی منزلوں میں تھے، فرمایا: ''اگر عمر رضی اللہ عنہ وفات پا گئے تو اسلام غلام ہو جائے گا میں پسند نہیں کرتا کہ ان کے بعد میں اس دنیا میں زندہ رہوں۔ اگر تم زندہ رہے تو جو کچھ میں کہتا ہوں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ عمر رضی اللہ عنہ کے بعد اگر کوئی والی بنایا گیا اور اس نے بازپرس میں عمر رضی اللہ عنہ کی سی شدت اختیار کی تو لوگ اس کی اطاعت نہیں کریں گے۔ اس کی شدت ان سے برداشت نہ ہو گی اور اگر اس نے کمزوری اختیار کی تو لوگ اسے قتل کر ڈالیں گے!''

---

① جناب عباس محمود العقاد نے اپنی کتاب عبقریۃ عمرؓ میں یہی رائے ظاہر کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ...... اللہ ان کو اپنی رحمت سے نوازے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی حکومت کے دشمنوں کی سازش کا شکار ہوئے، خراج کا قصہ تو محض ایک پردہ تھا، جو مدینہ اور دوسرے ملکوں کے سازشیوں نے اس قصاص سے بچنے کے لیے ڈالا تھا، جس کی سزا انہیں اس سازش یا اس سازش کے اسباب و محرکات کے انکشاف پر بھگتنی پڑتی۔)

Marfat.com

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے جو کچھ فرمایا، انہیں صفات کے متعلق فرمایا، جن سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ حقیقتاً متصف تھے اور انہیں خوبیوں کا اجتماع تھا، جن کی وجہ سے مسلمان ان کی ایسی ایسی باتیں اٹھاتے تھے جو کسی دوسرے کی نہ اٹھا سکتے تھے اور انہیں کی بنا پر پرستاران اسلام ان کی وفات پر اتنے مغموم ہوئے، گویا اس دن سے پہلے ان پر کوئی مصیبت آئی ہی نہ تھی اور وہ مغموم کیوں نہ ہوتے؟ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر بیٹھے ہیں تو مسلمان فقیر تھے لیکن اس کے بعد اللہ نے ان کو غنی کر دیا۔ وہ ایران و روم سے ڈرتے تھے لیکن اب ایران و روم کے سردار ہو گئے۔ وہ زمین کے ایک گوشے میں سمٹے ہوئے تھے، جس کا نام بھی تقریباً دنیا کی زبان پر نہ آتا تھا، لیکن بعد کو اللہ کے فضل نے انہیں دنیا کی سماعت و بصارت کا مرکز بنا دیا، یہ سب کچھ تھا۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہی رہے، جو تھے، نہ ان کے ظاہر میں فرق آیا، نہ باطن میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی۔ انہوں نے اپنی ذات اور اپنے عزیز و اقارب کے لیے کبھی دولت و عزت کی فکر نہ کی، بلکہ مسلمانوں کی امارت کو ایک بوجھ سمجھا جو قضا و قدر نے ان کے کندھوں پر ڈال دیا تھا۔ چنانچہ وہ ہمیشہ یہی کوشش کرتے رہے کہ ان کا دامن امارت صرف اوروں ہی کے نہیں بلکہ اپنے ضمیر کے بھی کسی شبہے سے داغدار نہ ہونے پائے اور وہ اپنے زمانہ خلافت میں ہر حقدار کو اس کا حق پہنچا دیں۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ نے اسلام کو عزت دی اور اپنے نیک بندوں کو زمین کا وارث بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی رحمت سے نوازے اور ان سے راضی ہو! بے شک وہ اللہ کے صاحب ایمان بندوں میں سے تھے۔

⊙❀⊙

Marfat.com

حرفِ اختتام

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلامی سلطنت کی جو بساط بچھائی تھی وہ عہد فاروقی میں مشرق میں حدودِ چین سے لے کر مغرب میں برقہ سے آگے تک اور شمال میں بحرِ قزوین سے لے کر جنوب میں بلادِ نوبہ تک وسیع ہوگئی۔ ایران، عراق، شام اور مصر کو اس سلطنت نے اپنی آغوش میں لے لیا اور تمام بلادِ عرب اس میں سما گئے۔ چنانچہ ان محرکات وعوامل کے فعل وانفعال نے، جو ان اقوام میں سے ہر قوم کے ساتھ الگ الگ مخصوص تھے، بعد کو عالمی تہذیب کا رخ متعین کرنے میں بڑے دُوررس اثرات چھوڑے۔ ان محرکات وعوامل کا فعل وانفعال چونکہ فطری تھا، اس لیے امیر المومنینؓ اور ان کے سوا کسی دوسرے کے امکان میں نہ تھا کہ وہ ان کے اثرات کو مٹا دیتا، ان نتائج کو بدل دیتا جو ان سے مترتب ہوئے تھے۔

یہ قومیں جب اسلامی سلطنت کے پرچم تلے آئی ہیں تو اپنے اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے آپس میں بے حد مختلف تھیں، جس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے ہر قوم باقی تمام قوموں سے زبان، نسل، عقیدے، تہذیب اور اجتماعی اور اقتصادی ہیئت میں الگ تھی۔ یہ صحیح ہے کہ عرب قبائل صحرائے سماوہ میں عراق وشام کی سرحدوں پر آباد تھے اور ان قبائل نے حیرہ وغسان کی حکومتیں قائم کی تھیں لیکن شام اور عراق کے اصل باشندے نسلاً غیر عرب تھے، اور عربی کے سوا دوسری زبانیں بولتے تھے۔ رہے ایران اور مصر، سو ان کا عربوں سے کوئی نسلی اور لسانی تعلق نہ تھا۔ ایرانیوں کے عقائد اہل شام اور مصریوں کے عقائد سے مختلف تھے اور اہل عراق رومی نصرانیت اور ایرانی مجوسیت میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر قوم کی زندگی اور اس کا تہذیبی رنگ وروغن دوسری قوموں کی زندگی اور ان کے تہذیبی رنگ وروغن سے بالکل مختلف تھا۔ یہ تمام قومیں اپنے اس باہمی تفاوت واختلاف کے باوجود محض دس سال کی مختصری مدت میں سلطنت کے دائرہ وحدت میں جمع ہوگئیں لیکن جو قوت قوموں کو مغلوب کر کے انہیں کسی سیاسی اقتدار کے سائے میں جمع کر دیتی ہے، وہ اس تفاوت کو دور نہیں کر سکتی، جو اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے ان قوموں کے

Marfat.com

درمیان ہوتا ہے۔ صرف تدریجی ترقی ہی ہے جو قوموں کو ان کے صدیوں اور قرنوں کسی ایک حال پر قائم رہنے کے بعد اس حال سے ہٹا سکتی ہے تو پھر یہ تبدیلی کس طرح ہوئی؟ عہد فاروقیؓ میں وہ کس حد تک پہنچی؟ اور اس کے بعد اس نے کون سا رخ اختیار کیا؟

اپنے حافظے میں ان گفتگوؤں کو تازہ کیجئے جو مؤرخین نے اپنی کتابوں میں درج کی ہیں اور لکھا ہے کہ وہ ایک طرف ایران کی جنگ میں سفرائے اسلام اور کسریٰ یزدگرد اور اس کے سپہ سالار رستم کے درمیان ہوئی تھیں اور دوسری طرف یرموک کی جنگ میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور رومی سپہ سالار جارج کے درمیان۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کی گفتگوئیں شہنشاہ حبش نجاشی اور ان مسلمانوں کے درمیان ہو چکی تھیں جو ہجرت کر کے اس کے ملک میں گئے تھے؟ ان تمام گفتگوؤں کا مرکزی نقطہ اور دائرہ یہ تھا کہ عرب اپنے قومی رشتوں کی بوسیدگی کے سبب ذلیل و کمزور تھے، جن کی قسمت پر دوسری قومیں حکومت کرتی تھیں۔ فقیر و محتاج تھے جنہیں زندگی کی راہ میں جان بار کوششیں کرنی پڑتی تھیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی نعمت سے سرفراز فرما کر ان میں مبعوث کیا تو وہ متحد ہو گئے۔ ان کی فاقہ زدگی، شکم سیری سے بدل گئی اور وہ ذلت کے بعد عزت سے نوازے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی جو گفتگوئیں ہوئیں اگر ان کا وہ مقصد نہیں بھی تھا جو مؤرخین نے بیان کیا ہے تو دوسرا مقصد بھی پہلے مقصد سے کوئی بنیادی اختلاف نہیں رکھتا۔

اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ مسلمان جہاں جہاں گئے، اسلام کا نیا پیغام غور و فکر کا موضوع بن گیا اور اس پیغام پر ایمان لانے والے عربوں کی کامیابی اس امر کی دلیل ہو گئی کہ روحانی اور اجتماعی نظام حیات کی حیثیت سے یہ پیغام ایک تعمیری پیغام ہے۔ اور جہاں کسی معاشرے میں کوئی فکر رواج پا کر عام شعور پر غالب آتی ہے وہاں وہ اپنا اثر ضرور چھوڑتی ہے جو اس معاشرے کے حالات کے مطابق قوی یا کمزور ہوتا ہے۔ اس کی قوت فکر کو ذہنوں میں راسخ کر کے ایمان کے درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ اور اس کا ضعف فکر کو آہستہ آہستہ بھاپ بنا کر اڑا دیتا اور نسیان اس پر ہلاکت و فنا کا دامن ڈال دیتا ہے۔ جن ملکوں پر مسلمان حملہ آور ہوئے، وہاں کے حالات نے اسلامی فکر کو ہر زبان اور ہر مجلس کا موضوع گفتگو بنا دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس روحانی اساس پر یہ فکر مبنی تھی وہ بالکل صاف و سادہ اور ہر الجھاؤ سے پاک تھی اور وہ اخلاقی نظام جو

Marfat.com

اس بنیاد پر قائم کیا گیا تھا، اتنا شاندار تھا کہ اس کی رونق نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی، پھر اسلام کا اجتماعی نظام بھی اپنی سادگی اور بلندی کے اعتبار سے اس کے اخلاقی انظام اور اس کی روحانی اساس سے کسی طرح کم نہ تھا، اور جہاں تک اسلامی فکر کی بنیاد اور اس کے مختلف نظاموں کا تعلق ہے، وہ آج بھی وہی صفائے جوہر رکھتی ہے، نہ اسے مذہبی اختلاف کوئی صدمہ پہنچا سکا نہ اس اختلاف کی تفصیلات اس کی چمک دمک کو ماند کر سکیں۔ چنانچہ جب مسلمان عراق وشام کے قلب میں درآئے، جب ایران ومصر کی سرزمین ان کا فرش پا انداز بنی توان کے پرچم قاہرانہ اور ظفر مندانہ شان سے ان کے آگے آگے تھے اور ان ممالک کے باشندوں کو چاروناچار اسلامی فکر کے متعلق سوچنا پڑ رہا تھا، جو غازیان اسلام کی نصرت آفرینیوں کا اصل راز اور حقیقی سرچشمہ تھی۔

پھر مسیحی اور مجوسی فرقوں کا باہم اختلاف اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا، جس کی وجہ سے بعض مقامات پر لوگ طرح طرح کے مظالم کا شکار ہو رہے تھے، یہ مظالم ایک فریق کے عقیدے کو ڈگمگا کر اسے اپنی راہ سے بھٹکا رہے تھے اور دوسرے فریق کے مذہبی تعصب کو بھڑکا کر اس میں اپنے عقیدے کے لیے زیادہ سے زیادہ قربانی کا جذبہ تیز کر رہے تھے۔ اور یہ دوسرا محرک تھا جو لوگوں کو نئے دین اور اس کی تعلیمات پر غور وفکر کی دعوت دے رہا تھا۔ مزید برآں مسلمان مسیحی یا مجوسی فرقوں کے کسی فرد کو قبول اسلام پر مجبور نہ کرتے تھے، بلکہ انہوں نے عقیدے کی آزادی کو اپنی دعوت کی بنیاد بنایا تھا۔ اس کا قرار واقعی اثر ان لوگوں پر بھی پڑا جو اپنے مذہب سے چمٹے ہوئے تھے اور وہ لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے، جن کی بے حوصلگی نے انہیں اپنے عقیدے سے ہٹا دیا تھا۔ چنانچہ ان دونوں گروہوں کے اکثر افراد اس نئے دین اور اس کے حلقہ بگوشوں کو ایسی نظر سے دیکھنے لگے جو نفرت وکراہت سے پاک تھی۔ میں یہ گفتگو دوبارہ چھیڑنے کی ضرور نہیں سمجھتا کہ وہ اس کتاب میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ وہ تمام معاہدے جو مسلمانوں نے شام وعراق، ایران اور مصر کے باشندوں سے کیے، مذہبی احترام کے پیش نظر یہ شرطیں ان میں بطور خاص رکھی گئیں کہ نہ کوئی شخص اپنے مذہب کی تبدیلی پر مجبور کیا جائے گا، نہ کسی عبادت گاہ کو بری نیت سے ہاتھ لگایا جائے گا۔ پھر واقعات مصر کے ذیل میں جو کچھ ہم نے لکھا ہے وہ بھی آپ کی نظر سے گزر چکا ہے کہ مسلمانوں نے مختلف مذاہب کے پیروؤں کو کس حد تک ایک دوسرے کے عقائد کی عزت وتکریم پر مجبور کیا اور انہیں کس طرح آپس کی اذیت کاریوں سے باز رکھا، ان حالات میں بالکل

فطری تھا کہ مفتوحہ ممالک کے باشندے نئے دین اور اس کے اطاعت کیشوں کو قدرومنزلت کی نظر سے دیکھتے اور ان فاتحین کی تعظیم وتکریم کرتے، جنہوں نے عدل ومساوات پر اپنی حکومت کی بنیاد رکھی تھی۔

مفتوحہ ممالک کے باشندوں نے نئے دین اور اس کی تعلیمات پر زیادہ غور وفکر اس لیے کیا کہ مذہبی آزادی عطا کرنے والے معاہدوں میں مسلمان ہونے اور نہ ہونے والوں کے درمیان فرق وامتیاز کیا گیا تھا یعنی اپنے اپنے مذہب پر قائم رہنے والوں کے لیے فرض قرار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی جان اور مال مذہبی آزادی کی حفاظت وحمایت کے بدلے فاتحین کو جزیہ ادا کریں گے، لیکن اسلام قبول کر لینے والوں پر جزیہ معاف تھا اور انہیں فاتحین اسلام کے برابر رکھا گیا تھا۔ جو مسلمانوں کا حق، وہ ان کا حق اور جو مسلمانوں کا فرض وہ ان کا فرض۔ وہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل اور میدان کارزار میں ان کے پہلو بہ پہلو ہوتے تھے۔ ان کی مسلمانوں سے رشتے داریاں ہوگئی تھیں اور وہ لڑائیوں میں مسلمانوں کے ساتھ بقدر شجاعت مال غنیمت حاصل کرتے تھے، لیکن اس دین کے اصول ومبادی چونکہ صحیح وسالم اور بلند وبرتر تھے اور یہی صفات وہ اپنے حلقہ بگوشوں میں بھی پیدا کر دیتے تھے، اس لیے ضروری تھا کہ عہد فاروقی میں ایک بڑی تعداد اس دولت سے مالا مال ہو جاتی۔ اگرچہ یہ تعداد ان ملکوں میں پھر بھی کم رہی جن کی زبان عربی نہ تھی اور اس لیے وہ اس دین کی عظمت ودل کشی سے پوری طرح ذوق آشنا نہ ہو سکے تھے۔ نومسلموں کی اس کثرت اور فاتحین کے ان سے مساویانہ سلوک کو دیکھ کر اوروں میں بھی نئے دین کے متعلق غور وفکر کرنے کی خواہش پیدا ہوئی اور ان میں سے جس جس نے اس کے اصول ونظام کو سمجھ لیا وہ بے اختیار اس کے دائرہ ایمان واطاعت میں داخل ہو گیا۔

پھر جب عرب فاتحین عراق، شام، ایران، روم اور مصر کے باشندوں سے ملے جلے تو جس طرح جنگوں کا اثر پڑا تھا اس میل جول کا بھی اثر پڑا۔ اس لیے کہ جنگوں نے مختلف قوموں کے ہزاروں، لاکھوں افراد کو ان کے وطن سے نکال کر زندگی کے نت نئے روپ دکھائے اور اس طرح فکر ونظر کے ایسے ایسے وسیع میدان ان مجاہدین کے سامنے کھل گئے جو ان کی اقامت گاہوں کی دوری کے سبب ان کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ صلیبی جنگوں سے مشرق ومغرب کے بعض علاقے جس طرح متاثر ہوئے، پھر قسطنطنیہ پر ترکوں کے حملے اور فتحیابی کے بعد مغربی تہذیب نے جو یکسر

ایک نیا روپ اختیار کیا، جس کے نتیجے میں یونانی علوم وفنون کو ایک نئی زندگی ملی اور وہ یورپ کے مختلف گوشوں میں پھیلے، مؤرخین آج بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اپنے ابتدائی دور میں بالکل یہی اثر اسلامی فتوحات کا بھی تھا۔ چنانچہ جس طرح عربوں کے اختلاط نے مفتوح ومغلوب قوموں کو نئے دین پر غور وفکر کی دعوت دی، اسی طرح ایرانی، رومی اور مصری تہذیب نے بھی عربوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ اور اس کا اثر یہ ہوا کہ فکری افق کی وسعتوں نے طرفین کے سامنے اپنے چہرے سے نقاب اٹھادی اور جدید عناصر کی تقلید نے عربوں کی فکر کو تمدنی زندگی کی طرف اور مفتوحہ قوموں کی فکر کو روحانی ومعنوی زندگی کی طرف اتنی تیزی سے بڑھایا کہ ان سب کی ذہنیتیں قریب قریب ہوگئیں، اگرچہ وہ فطری امتیازات پھر بھی نہ مٹ سکے جن کے سانچے میں حالات نے ان مختلف ذہنیتوں کو ڈھالا تھا۔

اس کا اثر آپ مسلمان ہونے والے ایرانیوں اور رومیوں کے اسلام اور عربوں کی ان عیش کوشیوں میں دیکھ چکے ہیں۔ جن کی طرف وہ مال غنیمت کی نعمت باریوں کے بعد ڈھلے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ مفتوحہ قوموں اور بالخصوص ایرانیوں کے دل میں فاتحین کی طرف سے کینہ وبغض کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں جو انہیں وقتاً فوقتاً مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتی بھی رہتی تھیں، لیکن یہ کینہ وغضب فطری تعامل اور اس سے پیدا ہونے والے اس تغیر کے قدم نہ روک سکے جو غالب آنے اور مغلوب ہونے والوں کی ذہنیت میں یکساں راہ پا گیا تھا۔ اور نہ اس تبدیلی کے پاؤں کی زنجیر بن سکے جو زندگی کے متعلق ان کے نقطہ نظر میں مسلسل قربت ویکسانی پیدا کررہا تھا اس کا اثر عہد فاروقی میں نگاہوں کو محسوس نہ ہوا، لیکن وہ اندر ہی اندر اپنا کام کرتا رہا اور اس کے نتائج چند برس بعد اس وقت ظہور میں آئے جب حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کوفہ کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور اس کے بعد حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے دمشق کو اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ پھر اس وقت جب یونانی فلسفے کے قائم کردہ فکری مذاہب نے عربی ذہن میں راہ پائی اور اس کے بعد اس وقت جب ایرانی فن اور نظام حکومت نے اسلامی زندگی میں داخل ہوکر انجام کار بغداد کو دنیا کا صدر مقام بنادیا۔ عہد فاروقیؓ میں اس تبدیلی کی رفتار بہت تیز تھی، اگرچہ بظاہر محسوس نہ ہوتی تھی، وہ ایک نئی تہذیب کی بساط بچھا رہی تھی جس کی آغوش میں مسلمانوں کا دین بھی تھا اور یونانیوں، ایرانیوں اور مصریوں کا علم وفلسفہ اور آداب وفنون بھی اس طرح زندگی کا ایک جدید نظام وجود میں

Marfat.com

آرہا تھا، جو اس کے سیاسی واقتصادی اور اجتماعی وعقلی پہلوؤں کو شامل تھا اور اسے جماعت کی عمومی اور افراد کی خصوصی زندگی کے قالب میں ڈھال رہا تھا۔

اس تبدیلی کا اثر عہد فاروقی ؓ میں نمایاں نہیں ہوا، جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب تو دشمن سے جنگ آزمائیوں میں اس قدر منہمک تھے کہ اس کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت نہ مل سکی اور مغلوب قوموں کو اپنی شکست پر ماتم کرنے کے سوا اور کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ چنانچہ ابتدائی مؤرخین کی کتابوں میں آپ ایسے مقامات بہت ہی کم پائیں گے، جن سے انسانی ذہن کے اس تغیر کی تصویر کشی ہوتی۔ اور اگر ایسی کوئی چیز آپ کو ملے گی بھی تو اس طرح دبی ہوئی کہ نظر شاید ہی اس تک پہنچ سکے۔ اس لیے کہ واقعات کی کثرت نے اس پہ ہجوم کر کے اسے اپنی موجوں میں غرق کر دیا ہوگا، لیکن واقعات کی یہی کثرت ہمارے لیے اس امر میں شبہے کی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑتی کہ فتوحات کے ابتدائی دور میں یہ عمل کارفرما ہو گیا تھا۔ مؤرخین نے ان اموال غنیمت کی تفصیل بیان کی ہے جو عہد فاروقی کی معرکہ آرائیوں میں مسلمانوں کو حاصل ہوئے اور بتایا ہے کہ ان کی رنگا رنگی اور کثرت کا یہ عالم تھا کہ عربوں کی آنکھیں انہیں دیکھ کر چندھیا گئیں اور وہ ان پر شیفتہ وفریفتہ ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ان اندیشوں کا بھی ذکر کیا ہے کہ مسلمان اگر غنیمت کے جال میں پھنس کر ان اصول ومبادی کو فراموش کر بیٹھے، جن کے بل پر انہوں نے دشمن کو زیر کیا ہے، تو ان میں تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ اور اس تبدیلی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ انہیں بدل دے گا۔

اسی طرح مؤرخین نے بصرہ اور کوفہ کی باہمی رقابت اور ان قبائل عرب کے اختلاف کا حال بھی لکھا ہے، جو ان دونوں شہروں میں آباد تھے۔ یہ تمام باتیں اور عرب وعجم کے اختلاط سے پیدا ہونے والے واقعات ہم پر یقین کی حد تک ثابت کر دیتے ہیں کہ آگے چل کر خلافت وملوکیت میں جو کشمکش پیدا ہوئی، اسلامی معاشرے میں فنی اور فکری نزاکتوں نے جو رواج پایا اور اس تغیر سے ابتدائی دور ہی میں جو حالات وجود پذیر ہو کر عہد فاروقی کے مفتوحہ شہروں کو اسلامی اداروں اور فقہی مدارس کا گہوارہ بنانے کا سبب ہوئے، انہیں سب چیزوں کا اثر تھا، جس نے اسلامی تہذیب کو جنم دیا اور قرون اولیٰ میں اسلامی سلطنت کی عظمت قائم کی، پھر یہی چیز اس وقت بھی بہ شدت کارفرما رہی جب سلطنت کے وجود میں زوال وانحطاط کے محرکات رینگنے شروع ہوئے۔

لیکن ایک ہی چیز سے دو متضاد نتائج کیسے پیدا ہو سکتے ہیں کہ وہی محرکات سلطنت کے قیام و عظمت کا سبب بھی ہوں اور پھر وہی محرکات اسے زوال و انحطاط کے غار میں بھی دھکیل دیں؟ اس سوال کا جواب اسلامی سلطنت پر بھی صادق آتا ہے اور اس کے علاوہ دوسری سلطنتوں پر بھی۔ چنانچہ ان عوامل کی کیت اور ان کا دائرہ اثر دونوں ایک زمانے میں دوسرے زمانے سے مختلف ہوتے ہیں اور ان کا یہ زمانی اختلاف نتائج میں بھی اختلاف پیدا کر دیتا ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے، جس کا مشاہدہ ہم طبیعی مظاہر کی طرح اجتماعی مظاہر میں بھی کرتے ہیں۔ پس جس طرح کیمیائی عناصر میں نوع و مقدار کا اختلاف ان کی اثر کاریوں کے نتائج میں اختلاف پیدا کرتا ہے، اسی طرح اجتماعی مظاہر میں بھی نوع و مقدار کے اختلاف سے اسی قسم کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔

چنانچہ جس وقت جماعت کی معنوی قوتیں بڑھ جاتی ہیں۔ چاہے یہ قوتیں روحانی ہوں، یا اخلاقی، یا عقلی ...... تو ان کی اثر کاری مادی قوتوں کے ساتھ مل کر جماعت کو عظمت و بلندی کے مرتبے پر پہنچا دیتی ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ معنوی قوتیں ہی ہم میں انسانی کمالات کی لگن اور ان کی راہ میں مسلسل دوڑ دھوپ کا جذبہ پیدا کرتی ہیں، لیکن اس کے باوجود جماعت اپنی مادی قوتوں اور ان کی بیش از بیش سرگرمی و مستعدی سے کبھی بے نیاز نہیں ہوتی۔ البتہ ان قوتوں کی سرگرمی اور نتیجہ آفرینی میں اضافہ معنوی قوتوں کے اثر سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہماری معنوی قوتیں کمزور پڑ جاتی ہیں تو ہماری مادی سرگرمیوں میں بھی ضعف پیدا ہو جاتا ہے اور ہماری نتیجہ آفرینی بھی جواب دے جاتی ہے۔ ہم اس کتاب میں کئی بار اس طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ جب اسلام نے عربوں کے ذہن کو بت پرستی کی زنجیروں سے آزاد کر کے انہیں ایک عقیدے اور ایک پرچم کے سائے میں جمع کیا تو ان کی معنوی قوتیں اپنے مرتبہ کمال پر پہنچ گئیں۔ اسی طرح جب مسلمانوں نے دو شیروں۔ ایران و روم پر غلبہ حاصل کیا تو اس کا مفتوحہ ممالک پر بہت اچھا اثر پڑا، اس لیے کہ ایران کی بے چینی اور بدامنی کا بنیادی سبب امرائے عجم کی دسیسہ کاریاں تھیں اور شام و مصر میں رومی حکومت کی تباہ حالی کا بنیادی سبب مذہبی استبداد۔

چنانچہ جب مسلمانوں نے عرق و ایران پر قبضہ کر لیا تو دربار کا وجود ختم ہو گیا اور اہل دربار کی دسیسہ کاریوں کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہی، ہر امیر اپنی ریاست کے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ اور اپنی سیاست کو بہتر بنانے کی کوشش کرنے لگا، تاکہ امیر المومنین ؓ اور دوسرے مسلمان

Marfat.com

حاکموں کے غضب و ناراضگی کا ہدف نہ بنے، ایران و عراق کے عوام نے مسلمانوں کی برتری کا اندازہ ان کی عادلانہ حکومت سے کیا اور طبعاً یہ سمجھ لیا کہ اگر انہوں نے مسلمانوں کے لیے اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار نہ کیا تو فاتحین کی نظر میں ان کی حیثیت ذلت و بے عزتی کی اس سطح سے بھی گر جائے گی، جس پر شکست نے انہیں لا کھڑا کیا تھا، اور وہ ان کی نفرت و حقارت کا مستوجب بھی قرار پا جائیں گے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی بہترین قومی خصوصیتیں، علم و فن اور صنعت و حرفت کی قابل رشک صلاحیتیں جو انہیں اپنے باپ دادا سے ورثے میں ملی تھیں اور اپنی تمام مہارتیں جن میں عرب ان کی برابری نہیں کر سکتے تھے، اپنے کاموں میں ظاہر کرنی شروع کر دیں۔ یہی کچھ اہل شام اور اہل مصر نے بھی کیا جب عربوں نے ان کے ملک فتح کر لیے اور انہیں مذہبی استبداد کے چنگل سے نجات مل گئی تو شورش و بغاوت کے وہ اسباب بھی خود بخود ختم ہو گئے، جن سے حکومت میں خرابی اور ملک میں بدامنی پیدا ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی ان بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے لگے، جو تجارت، زراعت، صنعت اور علوم و فنون میں، جو انہیں اپنے اسلاف سے وراثتاً ملی تھیں اور وہ صحت مند قوتیں جو انہیں فطرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھیں، بروئے کار آکر بہترین نتائج پیدا کرنے لگیں۔

ان تمام چیزوں نے شرف و بزرگی کے لیے ایک طرح کی مسابقت پیدا کر دی اور ہر جماعت سلطنت کی تمام قوموں میں معزز و مفتخر ہونے کے لیے اپنی انتہائی صلاحیتوں پر تکیہ کرنے لگی۔ اس کا فطری نتیجہ یہ نکلا کہ سلطنت بحیثیت مجموعی عظمت و بلندی کے مرتبے پر فائز ہو گئی اور اس نے دنیا میں ایک قابل رشک مقام حاصل کر لیا۔ مسلمان حکام سلطنت کے مختلف گوشوں میں اس جوش اور اس ولولہ عمل کو سراہتے تھے، وہ اسے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتے اور مزید جوش، مزید سرگرمی کے طالب و امیدوار رہتے تھے۔ پھر اسلام نے حریت، اخوت اور مساوات کے جو اصول مقرر کیے تھے وہ ان پر جوش کارکنوں کو ان کے اصول و عقائد اور زبان کے باہمی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے قریب کرتے تھے اور اس نوزائیدہ سلطنت کے پرچم کے سایے میں رہنے بسنے والی قوموں کو نئے دین میں زیادہ سے زیادہ داخل ہونے کی دعوت دیتے تھے، یہاں تک کہ یہ قومیں قریب قریب اس وحدت کے دائرے میں سما گئیں، جس کے اطراف ایک ایسی مشترکہ غایت کی طرف رواں دواں تھے جو پوری سلطنت اور اس کے ایک ایک جزو کی عظمت

Marfat.com

تھی۔اس غیر معمولی جوش و سرگرمی نے ان قوموں میں رشک و مسابقت کا جذبہ پیدا کر دیا، جن سے اسلامی سلطنت تشکیل پذیر ہوئی تھی اور رشک و مسابقت کے اس جذبے نے سلطنت کو وسعت وعظمت بخشی، اور آخر سلطنت یہ راہ کیوں نہ اختیار کرتی، جبکہ اتحاد وانجام کے عوامل امتداد وقت کے ساتھ ساتھ ان قوموں کی قوت میں اضافہ کر رہے تھے، چنانچہ اسلام نے عقیدے کی آزادی اور دین میں جبراختیار نہ کیے جانے کو جو اپنا اصول بنایا تھا اس کی وجہ سے مصر وشام اور عراق وایران کے اکثر لوگوں نے نئے دین پر غور وفکر کیا اور اس میں برضا ورغبت فوج درفوج داخل ہو گئے۔

ان لوگوں کے اسلام میں داخل ہونے سے ان کی وحدت کو اور عزت اور سربلندی حاصل ہوئی، اس لیے کہ اسلام صرف عقیدے ہی کا حامل نہ تھا بلکہ روحانی میدان سے گزر کر اخلاق اور اجتماعی میدانوں میں بھی گرم جولاں تھا اور اپنا دامن پکڑنے والوں پر ایسے اخلاقی وقانونی ضوابط فرض کرتا تھا جو اپنے اصل وجوہر میں مسیحی اور مجوسی ضابطوں سے بھی اسی قدر مختلف تھے جس قدر ان جاہلانہ ضابطوں سے جو نبی عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے پہلے جزیرہ نمائے عرب میں کارفرما تھے۔اخلاقی قدریں جس جماعت میں بھی ایک ہو جائیں اس کے اطراف کو ایک ایسی وحدت میں جمع کر دیتی ہیں جو افراد کی باہمی شناسائی اور یگانگی میں اضافہ کرتی ہے اور معروف و منکر، خیر وشر اور حرام وحلال پر سب کا اتفاق جمہور کے وجود میں ایک ایسا ربط پیدا کرتا ہے، جو اس کی معنوی قوت کو بڑھا کر مادی سرگرمیوں کو برق رفتار بنا دیتی ہے۔چنانچہ جب یہ اتفاق ایک ہی اصل سے......اور وہ عقیدہ تھا......وجود پذیر ہوا تو سب کے سب اللہ کے سامنے اپنے جواب دہ ہونے پر ایمان لے آئے، جو ہر چیز کا خالق ہے اور انہیں ان کے اعمال کا بدلہ دے گا، اچھے اعمال ہوئے تو اچھا اور بُرے اعمال ہوئے تو بُرا۔یہ تھا سبب باہمی ربط کے استحکام کا اور جس قدر یہ ربط مستحکم تھا، اسی قدر وحدت کی قوت زیادہ تھی، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ربط پیدا ہوا اور جب مفتوحہ قوموں کے افراد اپنے نئے حال پر مطمئن ہو گئے اور اس کے زیر سایہ انہوں نے اپنی زندگی کی تنظیم کر لی تو اس ربط نے سلطنت کے تمام گوشوں میں استحکام بھی حاصل کر لیا۔

اس ربط کے استحکام اور اس وحدت کی قوت میں اس چیز سے اور اضافہ ہوا کہ اسلام نے مذہب واخلاق کے میدانوں سے گزر کر قانون کے میدان میں قدم رکھا اور مسلمانوں نے اس

Marfat.com

وسیع سلطنت کے مختلف گوشوں میں اپنے معاملات زندگی کا مدار ان احکام کو بنایا جو خاندانی نظام، میراث اور اجتماعی و اقتصادی تنظیم سے متعلق قرآن میں وارد ہوئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان معاملات میں قرآن کے ارشاد کی حیثیت عام اصولوں سے زیادہ نہ تھی، لیکن قانونی تفصیلات کی ترتیب و تدوین میں ان عام اصولوں کا بڑا اثر پڑا اور جب عربوں نے سلطنت کے مختلف گوشوں میں ان اصولوں کو عدالتی ضابطوں پر منطبق کیا تو اس سے ان کا اثر اور بڑھ گیا اور ایک قانونی وحدت پیدا ہو کر سلطنت کی زندگی کے ابتدائی دنوں ہی میں رواج پا گئی اور اس کے رواج میں اضافہ اس سے ہوا کہ اسلامی قانون اور اسلام کے مذہبی و اخلاقی قواعد کو اس زمانے میں ایک ایسی وحدت سمجھا جاتا تھا، جس کے اجزاء ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جا سکتے تھے۔ چنانچہ اس چیز نے بھی رابطے کے استحکام اور اس وحدت کی قوت کو بڑھایا جو تمام اجزائے سلطنت کی شیرازہ بند تھی۔ ایسی صورت میں کہ قرآن اللہ کی کتاب اور اس دین کی اساس ہے، یہ بالکل فطری بات تھی کہ مفتوحہ ممالک کے باشندے اپنے دین میں بصیرت حاصل کرنے اور اپنے حکام کی زبان جاننے کے لیے قرآن کی زبان سیکھتے اور عقیدہ اور زبان دو قوتیں ہیں جو اپنے حلقہ اثر کے لوگوں کو متحد کرنے اور ان کے تعاون و تالیف میں بڑا کام کرتی ہیں۔

میں اس مسئلے پر کسی استدلال کی ضرورت نہیں پاتا جب کہ لاطینی قوموں کی وحدت، انگریزی بولنے والی قوموں کی اجتماعی ہیئت، عیسائی قوموں کا تکافل و تضامن اور اسی طرح کے دوسرے حقائق ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم ایک ایسے زمانے میں ہیں جس میں آزادی کے اصول ساتویں صدی عیسوی کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسعت کے ساتھ مقرر کیے گئے ہیں اور علم نے ہمیں وحدت کے اسباب سے قریب تر کر دیا ہے، کیونکہ زمین کی طنابیں اس طرح کھینچ دی گئی ہیں کہ اس زمانے میں کوئی اس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ جن مؤرخین نے اسلامی سلطنت کے ابتدائی عہد کی تاریخ لکھی ہے، ان میں سے اکثر نے اس غیر معمولی دخل و اثر کو محسوس کیا ہے، جو اس سلطنت کے قیام و استحکام میں اسلام اور عربیت کے فروغ کو حاصل تھا اور اسی لیے بعض مؤرخین نے یہ سوال بھی کیا ہے کہ فاتحین نے اپنے مذہب اور اپنی زبان کو مفتوحہ ممالک میں لازمی قرار کیوں نہیں دیا؟ ان کا خیال ہے کہ اگر وہ ایسا کرتے تو اس سلطنت میں زوال و انحطاط کے جراثیم ہرگز راہ نہ پا سکتے۔ میرے نزدیک یہ گمان اتنا پوچ ہے کہ میں اسے

Marfat.com

بحث وابطال کے قابل بھی نہیں پاتا۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایسے مفروضے پر بحث و گفتگو کرنا، جو سرے سے وجود ہی میں نہ آیا ہو، دوسرے لفظوں میں اپنا وقت ضائع کرنا ہے، کیونکہ اس قسم کے مفروضات کو نقد و تمحیص کی کسوٹی پر کسنے سے انسانی مستقبل کی تشکیل و تعمیر میں بڑی مدد ملتی ہے، بلکہ میں تو اس گمان کو بنیادی طور پر فاسد سمجھتا ہوں اس لیے کہ اگر عرب مفتوحہ قوموں کو اپنا مذہب اور اپنی زبان اختیار کرنے پر مجبور کرتے تو سلطنت قائم ہوتے ہی فنا ہو جاتی جس کی وجہ یہ ہے کہ ہر وہ معاشرہ جس کی طرف لوگ اپنی خوشی اور آزادی کے ساتھ نہیں آتے بہت جلد زوال و ہلاکت کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے اور ہر وہ نظام جو زور و زبردستی کے سہارے قائم کیا جاتا ہے، لوگوں میں شورش و بغاوت کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ اس بنا پر اگر مسلمان مفتوحہ قوموں کو اسلام پر مجبور کرتے تو اس سے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچتا بلکہ مفتوحہ ممالک کی زمین ان کا وجود برداشت نہ کرتی اور وہاں کے باشندوں میں ان کے خلاف بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھتے۔ اس صورت میں مسلمانوں کو اپنی حکومت کے لیے جبر و استبداد کے سوا کوئی بنیاد نہ ملتی، اور جو حکومت جبر و استبداد پر قائم کی جاتی ہے وہ سریع الزوال ہوتی ہے۔ ہم بھی دیکھ چکے ہیں اور صدر اول کے مسلمانوں نے بھی دیکھ لیا تھا کہ جب ہرقل نے مختلف مسیحی فرقوں پر ایک عیسوی مذہب مسلط کرنے کی کوشش کی تو اس کا حشر کیا ہوا؟ عوام نے اس کے اور رومی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی، جس کے نتیجے میں ہرقل کو اسلامی قوت کے مقابلے میں شکست کھا کر شام کی طرف بھاگنا پڑا، اور مسلمانوں کے مصر فتح کر لینے کے بعد وہ اپنی سلطنت ہی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

اس کے برعکس لوگ جب کسی عقیدے کو قبول کر کے آزادی و رضامندی کے ساتھ اس کے حلقہ اثر میں داخل ہوتے ہیں تو یہ عقیدہ ان کی زندگی کا ایک جزو بن جاتا ہے اور ان کے دلوں میں تقدس کا ایک ایسا مقام حاصل کر لیتا ہے کہ وہ اس کے لیے سینہ سپر ہو جاتے ہیں اور اس کی راہ میں جان تک دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ چنانچہ صدر اول کے مسلمانوں نے اپنے مذہبی اصولوں کے نفاذ میں جو طریق کار اپنایا وہ یہ تھا کہ ہر شخص اپنے اپنے عقیدے میں آزاد ہے اور دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔ وہ تمام تر حکمت پر مبنی تھا اور اسی نے اسلامی سلطنت کو وسعت و عظمت بخشی۔ زبان کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی ہے جیسا دین کا معاملہ کہ جب تک لوگ اسے برضا و رغبت قبول نہ کریں اور جب تک انہیں یہ محسوس نہ ہو کہ اسے سیکھنے میں ان کا بڑا فائدہ ہے، اس وقت تک

کسی زبان کے باقاعدہ سیکھنے کا تو ذکر ہی کیا، لوگوں کو اس کے بولنے پر بھی مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں نے مفتوحہ ممالک کے باشندوں کو مذہبی معاملات میں آزادی کی جو ضمانت دی تھی، وہ بھی ایک سبب تھا جس نے ایران و روم وغیرہ کو اسلام اور عربی زبان قبول کرنے پر آمادہ کیا، لیکن غیر قوموں کے مسلمان ہونے کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اسلام نے رنگ و نسل اور زبان ورواج کے اختلاف کے باوجود مسلمانوں میں مساوات رکھی تھی اور یہ اصول مقرر کر دیا تھا:

''پرہیزگاری کے سوا کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں!''

نیز یہ کہ ''مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ان میں سے کسی کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ نہ چاہے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے!'' چنانچہ اس اخوت، اس حریت اور اس مساوات نے مل کر ایک ایسی فضا پیدا کر دی، جس نے سلطنت میں وحدت کی قوت کو دوچند کر دیا اور اس کے سائے میں سلطنت کے ایک ایک جزو کی سرگرمی تیز سے تیز تر ہو گئی۔ اس کے باوجود اگر آپ چاہیں تو اسلام کے عصر اول یا اس سے ملحقہ ادوار میں ان اجزاء میں سے ہر جزو کے وہ کارنامے الگ الگ کر کے بھی دیکھ سکتے ہیں جو ان سب کے ذوق و شوق نے فقہ و ادب، علم و فلسفہ اور صنعت و زراعت کے عظیم آثار اور معنوی و مادی زندگی کے تمام مظاہر میں اپنے کمالات کی حیثیت سے یادگار چھوڑے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے جو اس کی فطرت سے ترکیب پاتا ہے اور وراثت کے زیر اثر زمانے میں قائم و دائم رہتا ہے۔ یہ مزاج آداب و فنون اور مختلف اسالیب فکر میں تو نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے، لیکن مادی زندگی کے آثار مثلاً صنعت و زراعت وغیرہ میں بھی چھپا نہیں رہتا۔ عربی ادب کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایرانیوں اور رومیوں نے اس میں فکر و تحریر کے ایسے رنگا رنگ اسالیب داخل کیے جن سے جزیرۃ العرب کے باشندے بالکل ناآشنا تھے، حالانکہ ایرانیوں اور رومیوں نے عربی جزیرۃ العرب کے باشندوں ہی سے سیکھی تھی۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں اس لیے کہ زبان ایک زندہ وجود ہے جو اپنے ماحول کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور اس معنی کر کہ وہ انسانی فکر و تصور کے اظہار کا ایک آلہ ہے، اپنے اسلوب و ہیئت میں فکر و تصور کے مختلف رنگوں سے متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے عربی زبان کا ان رنگوں اور ان تصویروں سے متاثر ہو کر، جن سے ایرانی اور رومی اپنی فکر و ثقافت میں مانوس تھے، اپنی شاعری اور نثر نگاری میں بھی وہی اسلوب اختیار کر لیا، جن سے یہ اغراض

Marfat.com

فرمایا، "اسے چھوڑنا انصاف سے بعید ہے، میری رائے میں اس کو قتل کرا دینا چاہیے۔" لیکن بعض مہاجرین نے اس رائے کو ناقابل برداشت شدت وسختی پر محمول کیا اور کہا، "کل عمر قتل کیے گئے ہیں، اور آج ان کا بیٹا قتل کر دیا جائے؟"

اس اعتراض نے حاضرین کو مغموم کر دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی خاموش رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے لیے حاضرین پر نگاہ دوڑائی، اس لیے کہ اگر وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے پر عمل کرتے ہوئے حضرت عبید اللہ کے قتل کا حکم دے دیتے ہیں تو آل عمر کے دل پر ایسے زخم لگتے جو کبھی مندمل نہ ہوتے اور اس سے ایسی ایسی شورشیں وجود میں آتیں، جن کے نتائج اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس کے علاوہ سنگ دلی کی ایک ایسی مثال قائم ہو جاتی جس سے زیادہ سختی و بے رحمی کا انسان تصور بھی نہ کر سکتا، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مزاج میں نرمی تھی جو اس قسم کی سنگدلی سے انہیں دور رکھتی تھی، اس لیے انہوں نے چاہا کہ حاضرین میں سے کوئی شخص اس نازک صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی راہ نکالے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اس مجلس میں موجود تھے، انہوں نے کہا، "اللہ نے آپ کو اس سے معاف رکھا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے، جب آپ مسلمانوں کے امیر نہیں تھے اور چونکہ یہ واقعہ آپ کے عہد خلافت میں نہیں ہوا اس لیے آپ پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابن عاص رضی اللہ عنہ کے اس قول میں منطق پائی۔ اس لیے ان کی رائے سے مطمئن نہیں ہوئے اور بہتر یہی سمجھا کہ خون بہا ادا کیا جائے، چنانچہ فرمایا، "میں ان مقتولین کا ولی ہوں، اس لیے خوں بہا مقرر کر کے اپنے مال سے ادا کروں گا۔

حق یہ ہے کہ حضرت عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے قتل کا فتویٰ سنگ دلانہ تھا جس میں عدل کا پہلو مشتبہ رہتا تھا، فرض کیجیے، حضرت عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنے اس یقین میں کہ ہرمزان جفینہ نے ان کے والد محترم کے خلاف ابولولوء سے سازش کی ہے، راہ صواب سے ہٹ گئے تھے پھر بھی ان کے پاس شبے کا عذر تھا اور یہ عذر انہیں حد قتل سے محفوظ رکھنے اور ان کی سزا کو ہلکا کرنے کے لیے کافی تھا، اور بہت ممکن تھا اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پوری وقت نظر کے ساتھ تحقیق و تفتیش فرماتے تو ساز کے سارے تار و پود بکھر جاتے اور ایک ایسا ثبوت فراہم ہو جاتا جس کے بعد اس مسئلے میں کسی قسم کے شبے کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی شہادتوں کو اگر ہرمزان اور جفینہ کے خلاف مکمل ثبوت نہ بھی مانا جائے تو بھی وہ حضرت عبید اللہ بن

Marfat.com

عمر رضی اللہ عنہ کو اس اقدام پر مجبور کرنے کے لیے کافی تھیں، اور ان سے ثابت ہوتا تھا کہ جس خنجر سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا وہ سرگوشی کرتے وقت سازش کرنے والوں کے ہاتھ میں تھا۔ شاید حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ سمجھ کر اس معاملے کی تفتیش کرنی مناسب نہ سمجھی کہ اس سے ایرانیوں کے جذبات بھڑک اٹھیں گے اور ان کے اور عربوں کے درمیان کینہ و دشمنی میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس لیے انہوں نے مقتولوں کا خوں بہا اپنی جیب سے ادا کر دیا، اور ساتھ ہی زیاد بن لبید البیاضی کو یہ حکم بھی دے دیا کہ وہ حضرت عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ پر تعریض نہ کرے، اس طرح وہ فتنہ سو گیا جس کا بیدار ہونا کوئی اچھی بات نہ تھی اور مسلمان سلطنت کے مختلف گوشوں میں واپس ہو کر پھر وہی زندگی بسر کرنے لگے، جو وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات سے قبل بسر کرتے تھے۔

ابولولوء نے خودکشی کر لی اور ہرمزان وغیرہ قتل کر دیے گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مقتولوں کا خوں بہا اپنی جیب سے ادا کر دیا اور حضرت عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے اس فعل پر غور و فکر کی ممانعت فرما دی۔ ان سب چیزوں نے مل کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل پر ایک ایسا پردہ ڈال دیا جو آج تک پڑا ہوا ہے، اور مؤرخین آج بھی اسے چھیڑنے سے گریز کرتے ہیں اور قسم بہ حق کہ مجھے ان کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے اس فعل پر اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی شہادتیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور ان کی ہمشیرہ ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے اس یقین کو جائز ثابت کرتی ہیں کہ ان عجمیوں نے ان کے محترم والد کے خلاف سازش کی تھی۔ اور فیروز و ہرمزان کی طرف سے ان کی اس سازش کے لیے یہ عذر پیش کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے ان کا ملک فتح اور ان کے شہنشاہ کو ایک ایسے فرار پر مجبور کیا تھا جس کا انجام نہایت ذلیل اور بدترین صورت میں ظاہر ہوا۔ اپنے وطن کی اس ذلت و شکست پر ان کے دل بھڑکے تو انہوں نے ازراہ انتقام جوئی سازش کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کی اس سازش کا شکار ہو گئے، جس میں تعجب کی کوئی بات نہیں بلکہ حیرت تو ان لوگوں پر ہونی چاہیے جو یہ سمجھتے ہیں کہ فیروز نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس لیے شہید کیا کہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے خراج میں کمی نہ کر کے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا، حالانکہ خراج کی زیادتی کی دوبارہ شکایت لے کر آنا اس کے لیے کوئی دشوار بات نہ تھی۔ اگرچہ وقت کی نزاکت کے لحاظ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سازش پر پردہ ڈالنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے لیکن مؤرخین پر تو ایسی کوئی پابندی بھی نہ تھی۔ ایرانیوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اسلام نے ان کو اور انہوں نے اسلام کو عزت دی تھی اور اس باب میں ان کی بھی وہی حیثیت تھی جو ان کے علاوہ

Marfat.com

دوسری مسلمان ہونے والی قوموں کی تھی، اس لیے ہر مؤرخ کا فرض تھا اور ہے کہ وہ ایک ایسے مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کرے جو تاریخ کی ملکیت ہو جانے کی بنا پر واجب التوضیح ہو گیا ہے، اسی لیے میں نے اس مسئلے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے اور اس یقین کے ساتھ کہ یہ رائے ان بہت سے واقعات کی وضاحت بھی کرتی ہے، جو بعد کو عرب و ایران کے درمیان پیش آئے۔ ①

یہ مسئلہ صراحت کے لائق سب سے زیادہ اس لیے ہے کہ اس کا تعلق امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب کی ذات سے ہے اور یہ وہ گرامی قدر وجود ہے جس کا نام تاریخ میں یادگار رہا ہے اور ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اس نے انصاف، بے لوثی، دانائی، اصابت رائے اور صدق نیت کی ایک زندہ جاوید مثال قائم کی۔ وہ اللہ اور اس کے دین کے لیے وقف ہو گیا اور اللہ نے اس کے ذریعے اسلام کو ایسی عزت بخشی کہ اس کا پرچم دنیا کے گوشے گوشے میں لہرانے لگا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا ذکر کیا گیا، تو حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمایا، ''عمر اسلام کا ایک مستحکم قلعہ تھے، جس میں لوگ داخل تو ہو جاتے تھے مگر نکلتے نہیں تھے لیکن جب ان کی وفات ہو گئی تو قلعہ کی دیوار میں شگاف پڑ گیا اور لوگ اسلام سے خارج ہونے لگے۔'' حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا، ''عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلام ایک آنے والے شخص سے مشابہ تھا، جو برابر قریب ہوتا جائے، لیکن جب وہ شہید کر دیئے گئے تو پیچھے ہٹنے والے کی مثال ہو گیا جو برابر پیچھے ہی ہٹتا چلا جائے۔'' روایت ہے کہ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے جب وہ قوت و چستی کی ابتدائی منزلوں میں تھے، فرمایا: ''اگر عمر رضی اللہ عنہ وفات پا گئے تو اسلام غلام ہو جائے گا میں پسند نہیں کرتا کہ ان کے بعد میں اس دنیا میں زندہ رہوں۔ اگر تم زندہ رہے تو جو کچھ میں کہتا ہوں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ عمر رضی اللہ عنہ کے بعد اگر کوئی والی بنایا گیا اور اس نے باز پرس میں عمر رضی اللہ عنہ کی سی شدت اختیار کی تو لوگ اس کی اطاعت نہیں کریں گے۔ اس کی شدت ان سے برداشت نہ ہوگی اور اگر اس نے کمزوری اختیار کی تو لوگ اسے قتل کر ڈالیں گے!''

① جناب عباس محمود العقاد نے اپنی کتاب عبقریۃ عمرؓ میں یہی رائے ظاہر کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ..... اللہ ان کو اپنی رحمت سے نوازے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی حکومت کے دشمنوں کی سازش کا شکار ہوئے، خراج کا قصہ تو محض ایک پردہ تھا، جو مدینہ اور دوسرے ملکوں کے سازشیوں نے اس قصاص سے بچنے کے لیے ڈالا تھا، جس کی سزا انہیں اس سازش یا اس سازش کے اسباب و محرکات کے انکشاف پر بھگتنی پڑتی۔)

Marfat.com

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے جو کچھ فرمایا، انہیں صفات کے متعلق فرمایا، جن سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ حقیقتاً متصف تھے اور انہیں خوبیوں کا اجتماع تھا، جن کی وجہ سے مسلمان ان کی ایسی ایسی باتیں اٹھاتے تھے جو کسی دوسرے کی نہ اٹھا سکتے تھے اور انہیں کی بنا پر پرستاران اسلام ان کی وفات پر اتنے مغموم ہوئے، گویا اس دن سے پہلے ان پر کوئی مصیبت آئی ہی نہ تھی اور وہ مغموم کیوں نہ ہوتے؟ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر بیٹھے ہیں تو مسلمان فقیر تھے لیکن اس کے بعد اللہ نے ان کو غنی کر دیا۔ وہ ایران وروم سے ڈرتے تھے لیکن اب ایران وروم کے سردار ہو گئے۔ وہ زمین کے ایک گوشے میں سمٹے ہوئے تھے، جس کا نام بھی تقریباً دنیا کی زبان پر نہ آتا تھا، لیکن بعد کو اللہ کے فضل نے انہیں دنیا کی سماعت و بصارت کا مرکز بنا دیا، یہ سب کچھ تھا۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہی رہے، جو تھے، نہ ان کے ظاہر میں فرق آیا، نہ باطن میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی۔ انہوں نے اپنی ذات اور اپنے عزیز و اقارب کے لیے کبھی دولت و عزت کی فکر نہ کی، بلکہ مسلمانوں کی امارت کو ایک بوجھ سمجھا جو قضا و قدر نے ان کے کندھوں پر ڈال دیا تھا۔ چنانچہ وہ ہمیشہ یہی کوشش کرتے رہے کہ ان کا دامن امارت صرف اوروں ہی کے نہیں بلکہ اپنے ضمیر کے بھی کسی شبہے سے داغدار نہ ہونے پائے اور وہ اپنے زمانہ خلافت میں ہر حقدار کو اس کا حق پہنچا دیں۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ نے اسلام کو عزت دی اور اپنے نیک بندوں کو زمین کا وارث بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی رحمت سے نوازے اور ان سے راضی ہو! بے شک وہ اللہ کے صاحب ایمان بندوں میں سے تھے۔

Marfat.com

حرفِ اختتام

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلامی سلطنت کی جو بساط بچھائی تھی وہ عہد فاروقی میں مشرق میں حدود چین سے لے کر مغرب میں برقہ سے آگے تک اور شمال میں بحر قزوین سے لے کر جنوب میں بلادِ نوبہ تک وسیع ہوگئی۔ ایران، عراق، شام اور مصر کو اس سلطنت نے اپنی آغوش میں لے لیا اور تمام بلادِ عرب اس میں سما گئے۔ چنانچہ ان محرکات وعوامل کے فعل واثر نے، جو ان اقوام میں سے ہر قوم کے ساتھ الگ الگ مخصوص تھے، بعد کو عالمی تہذیب کا رخ متعین کرنے میں بڑے دُوررس اثرات چھوڑے۔ ان محرکات وعوامل کا فعل واثر چونکہ فطری تھا، اس لیے امیر المومنین رضی اللہ عنہ اور ان کے سوا کسی دوسرے کے امکان میں نہ تھا کہ وہ ان کے اثرات کو مٹا دیتا، ان نتائج کو بدل دیتا جو ان سے مترتب ہوئے تھے۔

یہ قومیں جب اسلامی سلطنت کے پرچم تلے آئی ہیں تو اپنے اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے آپس میں بے حد مختلف تھیں، جس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے ہر قوم باقی تمام قوموں سے زبان، نسل، عقیدے، تہذیب اور اجتماعی اور اقتصادی ہیئت میں الگ تھی۔ یہ صحیح ہے کہ عرب قبائل صحرائے سماوہ میں عراق وشام کی سرحدوں پر آباد تھے اور ان قبائل نے حیرہ وغسان کی حکومتیں قائم کی تھیں لیکن شام اور عراق کے اصل باشندے نسلاً غیر عرب تھے، اور عربی کے سوا دوسری زبانیں بولتے تھے۔ رہے ایران اور مصر، سو ان کا عربوں سے کوئی نسلی اور لسانی تعلق نہ تھا۔ ایرانیوں کے عقائد اہل شام اور مصریوں کے عقائد سے مختلف تھے اور اہل عراق رومی نصرانیت اور ایرانی مجوسیت میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر قوم کی زندگی اور اس کا تہذیبی رنگ وروغن دوسری قوموں کی زندگی اور ان کے تہذیبی رنگ وروغن سے بالکل مختلف تھا۔ یہ تمام قومیں اپنے اس باہمی تفاوت واختلاف کے باوجود محض دس سال کی مختصر سی مدت میں سلطنت کے دائرہ وحدت میں جمع ہوگئیں لیکن جو قوت قوموں کو مغلوب کر کے انہیں کسی سیاسی اقتدار کے سائے میں جمع کر دیتی ہے، وہ اس تفاوت کو دور نہیں کر سکتی، جو اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے ان قوموں کے

درمیان ہوتا ہے۔ صرف تدریجی ترقی ہی ہے جو قوموں کو ان کے صدیوں اور قرنوں کسی ایک حال پر قائم رہنے کے بعد اس حال سے ہٹا سکتی ہے تو پھر یہ تبدیلی کس طرح ہوئی؟ عہد فاروقیؓ میں وہ کس حد تک پہنچی؟ اور اس کے بعد اس نے کون سا رخ اختیار کیا؟

اپنے حافظے میں ان گفتگوؤں کو تازہ کیجئے جو مؤرخین نے اپنی کتابوں میں درج کی ہیں اور لکھا ہے کہ وہ ایک طرف ایران کی جنگ میں سفرائے اسلام اور کسریٰ یزدگرد اور اس کے سپہ سالار رستم کے درمیان ہوئی تھیں اور دوسری طرف یرموک کی جنگ میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور رومی سپہ سالار جارج کے درمیان۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کی گفتگوئیں شہنشاہ حبش نجاشی اور ان مسلمانوں کے درمیان ہو چکی تھیں جو ہجرت کر کے اس کے ملک میں گئے تھے؟ ان تمام گفتگوؤں کا مرکزی نقطہ اور دائرہ یہ تھا کہ عرب اپنے قومی رشتوں کی بوسیدگی کے سبب ذلیل و کمزور تھے، جن کی قسمت پر دوسری قومیں حکومت کرتی تھیں۔ فقیر و محتاج تھے جنہیں زندگی کی راہ میں جان بار کوششیں کرنی پڑتی تھیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی نعمت سے سرفراز فرما کر ان میں مبعوث کیا تو وہ متحد ہو گئے۔ ان کی فاقہ زدگی، شکم سیری سے بدل گئی اور وہ ذلت کے بعد عزت سے نوازے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی جو گفتگوئیں ہوئیں اگر ان کا وہ مقصد نہیں بھی تھا جو مؤرخین نے بیان کیا ہے تو دوسرا مقصد بھی پہلے مقصد سے کوئی بنیادی اختلاف نہیں رکھتا۔

اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ مسلمان جہاں جہاں گئے، اسلام کا نیا پیغام غور و فکر کا موضوع بن گیا اور اس پیغام پر ایمان لانے والے عربوں کی کامیابی اس امر کی دلیل ہو گئی کہ روحانی اور اجتماعی نظام حیات کی حیثیت سے یہ پیغام ایک تعمیری پیغام ہے۔ اور جہاں کسی معاشرے میں کوئی فکر رواج پا کر عام شعور پر غالب آتی ہے وہاں وہ اپنا اثر ضرور چھوڑتی ہے جو اس معاشرے کے حالات کے مطابق قوی یا کمزور ہوتا ہے۔ اس کی قوت فکر کو ذہنوں میں راسخ کر کے ایمان کے درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ اور اس کا ضعف فکر کو آہستہ آہستہ بھاپ بنا کر اڑا دیتا اور نسیان اس پر ہلاکت و فنا کا دامن ڈال دیتا ہے۔ جن ملکوں پر مسلمان حملہ آور ہوئے، وہاں کے حالات نے اسلامی فکر کو ہر زبان اور ہر مجلس کا موضوع گفتگو بنا دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس روحانی اساس پر یہ فکر مبنی تھی وہ بالکل صاف و سادہ اور ہر الجھاؤ سے پاک تھی اور وہ اخلاقی نظام جو

Marfat.com

اس بنیاد پر قائم کیا گیا تھا، اتنا شاندار تھا کہ اس کی رونق نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی، پھر اسلام کا اجتماعی نظام بھی اپنی سادگی اور بلندی کے اعتبار سے اس کے اخلاقی انظام اور اس کی روحانی اساس سے کسی طرح کم نہ تھا، اور جہاں تک اسلامی فکر کی بنیاد اور اس کے مختلف نظاموں کا تعلق ہے، وہ آج بھی وہی صفائے جوہر رکھتی ہے، نہ اسے مذہبی اختلاف کوئی صدمہ پہنچا سکا نہ اس اختلاف کی تفصیلات اس کی چمک دمک کو ماند کر سکیں۔ چنانچہ جب مسلمان عراق وشام کے قلب میں در آئے، جب ایران ومصر کی سرزمین ان کا فرش پا انداز بنی تو ان کے پرچم قاہرانہ اور ظفر مندانہ شان سے ان کے آگے آگے تھے اور ان ممالک کے باشندوں کو چار ونا چار اسلامی فکر کے متعلق سوچنا پڑ رہا تھا، جو غازیان اسلام کی نصرت آفرینیوں کا اصل راز اور حقیقی سرچشمہ تھی۔

پھر مسیحی اور مجوسی فرقوں کا باہم اختلاف اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا، جس کی وجہ سے بعض مقامات پر لوگ طرح طرح کے مظالم کا شکار ہو رہے تھے، یہ مظالم ایک فریق کے عقیدے کو ڈگمگا کر اسے اپنی راہ سے بھٹکا رہے تھے اور دوسرے فریق کے مذہبی تعصب کو بھڑکا کر اس میں اپنے عقیدے کے لیے زیادہ سے زیادہ قربانی کا جذبہ تیز کر رہے تھے۔ اور یہ دوسرا محرک تھا جو لوگوں کو نئے دین اور اس کی تعلیمات پر غور وفکر کی دعوت دے رہا تھا۔ مزید برآں مسلمان مسیحی یا مجوسی فرقوں کے کسی فرد کو قبول اسلام پر مجبور نہ کرتے تھے، بلکہ انہوں نے عقیدے کی آزادی کو اپنی دعوت کی بنیاد بنایا تھا۔ اس کا قرار واقعی اثر ان لوگوں پر بھی پڑا جو اپنے مذہب سے چمٹے ہوئے تھے اور وہ لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے، جن کی بے حوصلگی نے انہیں اپنے عقیدے سے ہٹا دیا تھا۔ چنانچہ ان دونوں گروہوں کے اکثر افراد اس نئے دین اور اس کے حلقہ بگوشوں کو ایسی نظر سے دیکھنے لگے جو نفرت وکراہت سے پاک تھی۔ میں یہ گفتگو دوبارہ چھیڑنے کی ضرور نہیں سمجھتا کہ وہ اس کتاب میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ وہ تمام معاہدے جو مسلمانوں نے شام وعراق، ایران اور مصر کے باشندوں سے کیے، مذہبی احترام کے پیش نظر یہ شرطیں ان میں بطور خاص رکھی گئیں کہ نہ کوئی شخص اپنے مذہب کی تبدیلی پر مجبور کیا جائے گا، نہ کسی عبادت گاہ کو بری نیت سے ہاتھ لگایا جائے گا۔ پھر واقعات مصر کے ذیل میں جو کچھ ہم نے لکھا ہے وہ بھی آپ کی نظر سے گزر چکا ہے کہ مسلمانوں نے مختلف مذاہب کے پیروؤں کو کس حد تک ایک دوسرے کے عقائد کی عزت وتکریم پر مجبور کیا اور انہیں کس طرح آپس کی اذیت کاریوں سے باز رکھا، ان حالات میں بالکل

Marfat.com

فطری تھا کہ مفتوحہ ممالک کے باشندے نئے دین اور اس کے اطاعت کیشوں کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے اور ان فاتحین کی تعظیم و تکریم کرتے، جنہوں نے عدل و مساوات پر اپنی حکومت کی بنیاد رکھی تھی۔

مفتوحہ ممالک کے باشندوں نے نئے دین اور اس کی تعلیمات پر زیادہ غور و فکر اس لیے کیا کہ مذہبی آزادی عطا کرنے والے معاہدوں میں مسلمان ہونے اور نہ ہونے والوں کے درمیان فرق و امتیاز کیا گیا تھا یعنی اپنے اپنے مذہب پر قائم رہنے والوں کے لیے فرض قرار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی جان اور مال مذہبی آزادی کی حفاظت و حمایت کے بدلے فاتحین کو جزیہ ادا کریں گے، لیکن اسلام قبول کر لینے والوں پر جزیہ معاف تھا اور انہیں فاتحین اسلام کے برابر رکھا گیا تھا۔ جو مسلمانوں کا حق، وہ ان کا حق اور جو مسلمانوں کا فرض وہ ان کا فرض۔ وہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل اور میدان کارزار میں ان کے پہلو بہ پہلو ہوتے تھے۔ ان کی مسلمانوں سے رشتے داریاں ہو گئی تھیں اور وہ لڑائیوں میں مسلمانوں کے ساتھ بقدر شجاعت مال غنیمت حاصل کرتے تھے، لیکن اس دین کے اصول و مبادی چونکہ صحیح و سالم اور بلند و برتر تھے اور یہی صفات وہ اپنے حلقہ بگوشوں میں بھی پیدا کر دیتے تھے، اس لیے ضروری تھا کہ عہد فاروقی میں ایک بڑی تعداد اس دولت سے مالا مال ہو جاتی۔ اگرچہ یہ تعداد ان ملکوں میں پھر بھی کم رہی جن کی زبان عربی نہ تھی اور اس لیے وہ اس دین کی عظمت و دلکشی سے پوری طرح ذوق آشنا نہ ہو سکے تھے۔ نومسلموں کی اس کثرت اور فاتحین کے ان سے مساویانہ سلوک کو دیکھ کر اوروں میں بھی نئے دین کے متعلق غور و فکر کرنے کی خواہش پیدا ہوئی اور ان میں سے جس جس نے اس کے اصول و نظام کو سمجھ لیا وہ بے اختیار اس کے دائرہ ایمان و اطاعت میں داخل ہو گیا۔

پھر جب عرب فاتحین عراق، شام، ایران، روم اور مصر کے باشندوں سے ملے جلے تو جس طرح جنگوں کا اثر پڑا تھا اس میل جول کا بھی اثر پڑا۔ اس لیے کہ جنگوں نے مختلف قوموں کے ہزاروں، لاکھوں افراد کو ان کے وطن سے نکال کر زندگی کے نت نئے روپ دکھائے اور اس طرح فکر و نظر کے ایسے ایسے وسیع میدان ان مجاہدین کے سامنے کھل گئے جو ان کی اقامت گاہوں کی دوری کے سبب ان کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ صلیبی جنگوں سے مشرق و مغرب کے بعض علاقے جس طرح متاثر ہوئے، پھر قسطنطنیہ پر ترکوں کے حملے اور فتحیابی کے بعد مغربی تہذیب نے جو یکسر

ایک نیا روپ اختیار کیا، جس کے نتیجے میں یونانی علوم وفنون کو ایک نئی زندگی ملی اور وہ یورپ کے مختلف گوشوں میں پھیلے، مؤرخین آج بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اپنے ابتدائی دور میں بالکل یہی اثر اسلامی فتوحات کا بھی تھا۔ چنانچہ جس طرح عربوں کے اختلاط نے مفتوح ومغلوب قوموں کو نئے دین پر غور وفکر کی دعوت دی، اسی طرح ایرانی، رومی اور مصری تہذیب نے بھی عربوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ اور اس کا اثر یہ ہوا کہ فکری افق کی وسعتوں نے طرفین کے سامنے اپنے چہرے سے نقاب اٹھادی اور جدید عناصر کی تقلید نے عربوں کی فکر کو تمدنی زندگی کی طرف اور مفتوحہ قوموں کی فکر کو روحانی ومعنوی زندگی کی طرف اتنی تیزی سے بڑھایا کہ ان سب کی ذہنیتیں قریب قریب ہوگئیں، اگرچہ وہ فطری امتیازات پھر بھی نہ مٹ سکے جن کے سانچے میں حالات نے ان مختلف ذہنیتوں کو ڈھالا تھا۔

اس کا اثر آپ مسلمان ہونے والے ایرانیوں اور رومیوں کے اسلام اور عربوں کی ان عیش کوشیوں میں دیکھ چکے ہیں۔ جن کی طرف وہ مال غنیمت کی نعمت باریوں کے بعد ڈھلے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ مفتوحہ قوموں اور بالخصوص ایرانیوں کے دل میں فاتحین کی طرف سے کینہ وبغض کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں جو انہیں وقتاً فوقتاً مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتی بھی رہتی تھیں، لیکن یہ کینہ وغضب فطری تعامل اور اس سے پیدا ہونے والے اس تغیر کے قدم نہ روک سکے جو غالب آنے اور مغلوب ہونے والوں کی ذہنیت میں یکساں راہ پاگیا تھا۔ اور نہ اس تبدیلی کے پاؤں کی زنجیر بن سکے جو زندگی کے متعلق ان کے نقطہ نظر میں مسلسل قربت ویکسانی پیدا کررہا تھا اس کا اثر عہد فاروقی میں نگاہوں کو محسوس نہ ہوا، لیکن وہ اندر ہی اندر اپنا کام کرتا رہا اور اس کے نتائج چند برس بعد اس وقت ظہور میں آئے جب حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کوفہ کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور اس کے بعد حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے دمشق کو اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ پھر اس وقت جب یونانی فلسفے کے قائم کردہ فکری مذاہب نے عربی ذہن میں راہ پائی اور اس کے بعد اس وقت جب ایرانی فن اور نظام حکومت نے اسلامی زندگی میں داخل ہوکر انجام کار بغداد کو دنیا کا صدر مقام بنادیا۔ عہد فاروقی میں اس تبدیلی کی رفتار بہت تیز تھی، اگرچہ بظاہر محسوس نہ ہوتی تھی، وہ ایک نئی تہذیب کی بساط بچھارہی تھی جس کی آغوش میں مسلمانوں کا دین بھی تھا اور یونانیوں، ایرانیوں اور مصریوں کا علم وفلسفہ اور آداب وفنون بھی اس طرح زندگی کا ایک جدید نظام وجود میں

Marfat.com

آرہا تھا، جو اس کے سیاسی و اقتصادی اور اجتماعی و عقلی پہلوؤں کو شامل تھا اور اسے جماعت کی عمومی اور افراد کی خصوصی زندگی کے قالب میں ڈھال رہا تھا۔

اس تبدیلی کا اثر عہد فاروقی ؓ میں نمایاں نہیں ہوا، جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب تو دشمن سے جنگ آزمائیوں میں اس قدر منہمک تھے کہ اس کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت نہ مل سکی اور مغلوب قوموں کو اپنی شکست پر ماتم کرنے کے سوا اور کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ چنانچہ ابتدائی مؤرخین کی کتابوں میں آپ ایسے مقامات بہت ہی کم پائیں گے، جن سے انسانی ذہن کے اس تغیر کی تصویر کشی ہوتی۔ اور اگر ایسی کوئی چیز آپ کو ملے گی بھی تو اس طرح دبی ہوئی کہ نظر شاید ہی اس تک پہنچ سکے۔ اس لیے کہ واقعات کی کثرت نے ان پر ہجوم کر کے اسے اپنی موجوں میں غرق کر دیا ہوگا، لیکن واقعات کی یہی کثرت ہمارے لیے اس امر میں شبہے کی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑتی کہ فتوحات کے ابتدائی دور میں یہ عمل کارفرما ہو گیا تھا۔ مؤرخین نے ان اموال غنیمت کی تفصیل بیان کی ہے جو عہد فاروقی کی معرکہ آرائیوں میں مسلمانوں کو حاصل ہوئے اور بتایا ہے کہ ان کی رنگا رنگی اور کثرت کا یہ عالم تھا کہ عربوں کی آنکھیں انہیں دیکھ کر چندھیا گئیں اور وہ ان پر شیفتہ و فریفتہ ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ان اندیشوں کا بھی ذکر کیا ہے کہ مسلمان اگر غنیمت کے جال میں پھنس کر ان اصول و مبادی کو فراموش کر بیٹھے، جن کے بل پر انہوں نے دشمن کو زیر کیا ہے، تو ان میں تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ اور اس تبدیلی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ انہیں بدل دے گا۔

اسی طرح مؤرخین نے بصرہ اور کوفہ کی باہمی رقابت اور ان قبائل عرب کے اختلاف کا حال بھی لکھا ہے، جو ان دونوں شہروں میں آباد تھے۔ یہ تمام باتیں اور عرب و عجم کے اختلاط سے پیدا ہونے والے واقعات ہم پر یقین کی حد تک ثابت کر دیتے ہیں کہ آگے چل کر خلافت و ملوکیت میں جو کشمکش پیدا ہوئی، اسلامی معاشرے میں فنی اور فکری نزاکتوں نے جو رواج پایا اور اس تغیر سے ابتدائی دور ہی میں جو حالات وجود پذیر ہو کر عہد فاروقی کے مفتوحہ شہروں کو اسلامی اداروں اور فقہی مدارس کا گہوارہ بنانے کا سبب ہوئے، انہیں سب چیزوں کا اثر تھا، جس نے اسلامی تہذیب کو جنم دیا اور قرون اولیٰ میں اسلامی سلطنت کی عظمت قائم کی، پھر یہی چیز اس وقت بھی بہ شدت کارفرما رہی جب سلطنت کے وجود میں زوال و انحطاط کے محرکات رینگنے شروع ہوئے

Marfat.com

لیکن ایک ہی چیز سے دو متضاد نتائج کیسے پیدا ہو سکتے ہیں کہ وہی محرکات سلطنت کے قیام و عظمت کا سبب بھی ہوں اور پھر وہی محرکات اسے زوال و انحطاط کے غار میں بھی دھکیل دیں؟ اس سوال کا جواب اسلامی سلطنت پر بھی صادق آتا ہے اور اس کے علاوہ دوسری سلطنتوں پر بھی۔ چنانچہ ان عوامل کی کمیت اور ان کا دائرہ اثر دونوں ایک زمانے میں دوسرے زمانے سے مختلف ہوتے ہیں اور ان کا یہ زمانی اختلاف نتائج میں بھی اختلاف پیدا کر دیتا ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے، جس کا مشاہدہ ہم طبیعی مظاہر کی طرح اجتماعی مظاہر میں بھی کرتے ہیں۔ پس جس طرح کیمیائی عناصر میں نوع و مقدار کا اختلاف ان کی اثر کاریوں کے نتائج میں اختلاف پیدا کرتا ہے، اسی طرح اجتماعی مظاہر میں بھی نوع و مقدار کے اختلاف سے اسی قسم کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔

چنانچہ جس وقت جماعت کی معنوی قوتیں بڑھ جاتی ہیں۔ چاہے یہ قوتیں روحانی ہوں، یا اخلاقی، یا عقلی......تو ان کی اثر کاری مادی قوتوں کے ساتھ مل کر جماعت کو عظمت و بلندی کے مرتبے پر پہنچا دیتی ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ معنوی قوتیں ہی ہم میں انسانی کمالات کی لگن اور ان کی راہ میں مسلسل دوڑ دھوپ کا جذبہ پیدا کرتی ہیں، لیکن اس کے باوجود جماعت اپنی مادی قوتوں اور ان کی بیش از بیش سرگرمی و مستعدی سے کبھی بے نیاز نہیں ہوتی۔ البتہ ان قوتوں کی سرگرمی اور نتیجہ آفرینی میں اضافہ معنوی قوتوں کے اثر سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہماری معنوی قوتیں کمزور پڑ جاتی ہیں تو ہماری مادی سرگرمیوں میں بھی ضعف پیدا ہو جاتا ہے اور ہماری نتیجہ آفرینی بھی جواب دے جاتی ہے۔ ہم اس کتاب میں کئی بار اس طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ جب اسلام نے عربوں کے ذہن کو بت پرستی کی زنجیروں سے آزاد کر کے انہیں ایک عقیدے اور ایک پرچم کے سائے میں جمع کیا تو ان کی معنوی قوتیں اپنے مرتبہ کمال پر پہنچ گئیں۔ اسی طرح جب مسلمانوں نے دو شیروں۔ ایران و روم پر غلبہ حاصل کیا تو اس کا مفتوحہ ممالک پر بہت اچھا اثر پڑا، اس لیے کہ ایران کی بے چینی اور بدامنی کا بنیادی سبب امرائے عجم کی دسیسہ کاریاں تھیں اور شام و مصر میں رومی حکومت کی تباہ حالی کا بنیادی سبب مذہبی استبداد۔

چنانچہ جب مسلمانوں نے عرق و ایران پر قبضہ کر لیا تو دربار کا وجود ختم ہو گیا اور اہل دربار کی دسیسہ کاریوں کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہی، ہر امیر اپنی ریاست کے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ اور اپنی سیاست کو بہتر بنانے کی کوشش کرنے لگا، تاکہ امیر المومنینؓ اور دوسرے مسلمان

Marfat.com

حاکموں کے غضب و ناراضگی کا ہدف نہ بنے، ایران و عراق کے عوام نے مسلمانوں کی برتری کا اندازہ ان کی عادلانہ حکومت سے کیا اور طبعاً یہ سمجھ لیا کہ اگر انہوں نے مسلمانوں کے لیے اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار نہ کیا تو فاتحین کی نظر میں ان کی حیثیت ذلت و بے عزتی کی اس سطح سے بھی گر جائے گی، جس پر شکست نے انہیں لا کھڑا کیا تھا، اور وہ ان کی نفرت و حقارت کا مستوجب بھی قرار پا جائیں گے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی بہترین قومی خصوصیتیں، علم و فن اور صنعت و حرفت کی قابل رشک صلاحیتیں جو انہیں اپنے باپ دادا سے ورثے میں ملی تھیں اور اپنی تمام مہارتیں جن میں عرب ان کی برابری نہیں کر سکتے تھے، اپنے کاموں میں ظاہر کرنی شروع کر دیں۔ یہی کچھ اہل شام اور اہل مصر نے بھی کیا جب عربوں نے ان کے ملک فتح کر لیے اور انہیں مذہبی استبداد کے چنگل سے نجات مل گئی تو شورش و بغاوت کے وہ اسباب بھی خود بخود ختم ہو گئے، جن سے حکومت میں خرابی اور ملک میں بدامنی پیدا ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی ان بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے لگے، جو تجارت، زراعت، صنعت اور علوم و فنون میں، جو انہیں اپنے اسلاف سے وراثتاً ملی تھیں اور وہ صحت مند قوتیں جو انہیں فطرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھیں، بروئے کار آ کر بہترین نتائج پیدا کرنے لگیں۔

ان تمام چیزوں نے شرف و بزرگی کے لیے ایک طرح کی مسابقت پیدا کر دی اور ہر جماعت سلطنت کی تمام قوموں میں معزز و مفتخر ہونے کے لیے اپنی انتہائی صلاحیتوں پر تکیہ کرنے لگی۔ اس کا فطری نتیجہ یہ نکلا کہ سلطنت بحیثیت مجموعی عظمت و بلندی کے مرتبے پر فائز ہو گئی اور اس نے دنیا میں ایک قابل رشک مقام حاصل کر لیا۔ مسلمان حکام سلطنت کے مختلف گوشوں میں اس جوش اور اس ولولۂ عمل کو سراہتے تھے، وہ اسے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتے اور مزید جوش، مزید سرگرمی کے طالب و امیدوار رہتے تھے۔ پھر اسلام نے حریت، اخوت اور مساوات کے جو اصول مقرر کیے تھے وہ ان پر جوش کارکنوں کو ان کے اصول و عقائد اور زبان کے باہمی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے قریب کرتے تھے اور اس نوزائیدہ سلطنت کے پرچم کے سایے میں رہنے بسنے والی قوموں کو نئے دین میں زیادہ سے زیادہ داخل ہونے کی دعوت دیتے تھے، یہاں تک کہ یہ قومیں قریب قریب اس وحدت کے دائرے میں سما گئیں، جس کے اطراف ایک ایسی مشترکہ غایت کی طرف رواں دواں تھے جو پوری سلطنت اور اس کے ایک ایک جزو کی عظمت

Marfat.com

تھی۔ اس غیر معمولی جوش و سرگرمی نے ان قوموں میں رشک و مسابقت کا جذبہ پیدا کر دیا، جن سے اسلامی سلطنت تشکیل پذیر ہوئی تھی اور رشک و مسابقت کے اس جذبے نے سلطنت کو وسعت و عظمت بخشی، اور آخر سلطنت یہ راہ کیوں نہ اختیار کرتی، جبکہ اتحاد و انجام کے عوامل امتداد وقت کے ساتھ ساتھ ان قوموں کی قوت میں اضافہ کر رہے تھے، چنانچہ اسلام نے عقیدے کی آزادی اور دین میں جبر اختیار نہ کیے جانے کو جو اپنا اصول بنایا تھا اس کی وجہ سے مصر و شام اور عراق و ایران کے اکثر لوگوں نے نئے دین پر غور و فکر کیا اور اس میں برضا و رغبت فوج در فوج داخل ہو گئے۔

ان لوگوں کے اسلام میں داخل ہونے سے ان کی وحدت کو اور عزت اور سربلندی حاصل ہوئی، اس لیے کہ اسلام صرف عقیدے ہی کا حامل نہ تھا بلکہ روحانی میدان سے گزر کر اخلاق اور اجتماعی میدانوں میں بھی گرم جولاں تھا اور اپنا دامن پکڑنے والوں پر ایسے اخلاقی و قانونی ضوابط فرض کرتا تھا جو اپنے اصل و جوہر میں مسیحی اور مجوسی ضابطوں سے بھی اسی قدر مختلف تھے جس قدر ان جاہلانہ ضابطوں سے جو نبی عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے پہلے جزیرہ نمائے عرب میں کارفرما تھے۔ اخلاقی قدریں جس جماعت میں بھی ایک ہو جائیں اس کے اطراف کو ایک ایسی وحدت میں جمع کر دیتی ہیں جو افراد کی باہمی شناسائی اور یگانگی میں اضافہ کرتی ہے اور معروف و منکر، خیر و شر اور حرام و حلال پر سب کا اتفاق جمہور کے وجود میں ایک ایسا ربط پیدا کرتا ہے، جو اس کی معنوی قوت کو بڑھا کر مادی سرگرمیوں کو برق رفتار بنا دیتی ہے۔ چنانچہ جب یہ اتفاق ایک ہی اصل سے......اور وہ عقیدہ تھا...... وجود پذیر ہوا تو سب کے سب اللہ کے سامنے اپنے جواب دہ ہونے پر ایمان لے آئے، جو ہر چیز کا خالق ہے اور انہیں ان کے اعمال کا بدلہ دے گا، اچھے اعمال ہوئے تو اچھا اور برے اعمال ہوئے تو برا۔ یہ تھا سبب باہمی ربط کے استحکام کا اور جس قدر یہ ربط مستحکم تھا، اسی قدر وحدت کی قوت زیادہ تھی، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ربط پیدا ہوا اور جب مفتوحہ قوموں کے افراد اپنے نئے حال پر مطمئن ہو گئے اور اس کے زیر سایہ انہوں نے اپنی زندگی کی تنظیم کر لی تو اس ربط نے سلطنت کے تمام گوشوں میں استحکام بھی حاصل کر لیا۔

اس ربط کے استحکام اور اس وحدت کی قوت میں اس چیز سے اور اضافہ ہوا کہ اسلام نے مذہب و اخلاق کے میدانوں سے گزر کر قانون کے میدان میں قدم رکھا اور مسلمانوں نے اس

Marfat.com

وسیع سلطنت کے مختلف گوشوں میں اپنے معاملات زندگی کا مدار ان احکام کو بنایا جو خاندانی نظام، میراث اور اجتماعی و اقتصادی تنظیم سے متعلق قرآن میں وارد ہوئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان معاملات میں قرآن کے ارشاد کی حیثیت عام اصولوں سے زیادہ نہ تھی، لیکن قانونی تفصیلات کی ترتیب وتدوین میں ان عام اصولوں کا بڑا اثر پڑا اور جب عربوں نے سلطنت کے مختلف گوشوں میں ان اصولوں کو عدالتی ضابطوں پر منطبق کیا تو اس سے ان کا اثر اور بڑھ گیا اور ایک قانونی وحدت پیدا ہو کر سلطنت کی زندگی کے ابتدائی دنوں ہی میں رواج پا گئی اور اس کے رواج میں اضافہ اس سے ہوا کہ اسلامی قانون اور اسلام کے مذہبی واخلاقی قواعد کو اس زمانے میں ایک ایسی وحدت سمجھا جاتا تھا، جس کے اجزاء ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جاسکتے تھے۔ چنانچہ اس چیز نے بھی رابطے کے استحکام اور اس وحدت کی قوت کو بڑھایا جو تمام اجزائے سلطنت کی شیرازہ بند تھی۔ ایسی صورت میں کہ قرآن اللہ کی کتاب اور اس دین کی اساس ہے، یہ بالکل فطری بات تھی کہ مفتوحہ ممالک کے باشندے اپنے دین میں بصیرت حاصل کرنے اور اپنے حکام کی زبان جاننے کے لیے قرآن کی زبان سیکھتے اور عقیدہ اور زبان دو قوتیں ہیں جو اپنے حلقہ اثر کے لوگوں کو متحد کرنے اور ان کے تعاون وتالیف میں بڑا کام کرتی ہیں۔

میں اس مسئلے پر کسی استدلال کی ضرورت نہیں پاتا جب کہ لاطینی قوموں کی وحدت، انگریزی بولنے والی قوموں کی اجتماعی ہیئت، عیسائی قوموں کا تکافل وتضامن اور اسی طرح کے دوسرے حقائق ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم ایک ایسے زمانے میں ہیں جس میں آزادی کے اصول ساتویں صدی عیسوی کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسعت کے ساتھ مقرر کیے گئے ہیں اور علم نے ہمیں وحدت کے اسباب سے قریب تر کر دیا ہے، کیونکہ زمین کی طنابیں اس طرح کھینچ دی گئی ہیں کہ اس زمانے میں کوئی اس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ جن مؤرخین نے اسلامی سلطنت کے ابتدائی عہد کی تاریخ لکھی ہے، ان میں سے اکثر نے اس غیر معمولی دخل واثر کو محسوس کیا ہے، جو اس سلطنت کے قیام واستحکام میں اسلام اور عربیت کے فروغ کو حاصل تھا اور اسی لیے بعض مؤرخین نے یہ سوال بھی کیا ہے کہ فاتحین نے اپنے مذہب اور اپنی زبان کو مفتوحہ ممالک میں لازمی قرار کیوں نہیں دیا؟ ان کا خیال ہے کہ اگر وہ ایسا کرتے تو اس سلطنت میں زوال وانحطاط کے جراثیم ہرگز راہ نہ پاسکتے۔ میرے نزدیک یہ گمان اتنا پوچ ہے کہ میں اسے

بحث وابطال کے قابل بھی نہیں پاتا۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایسے مفروضے پر بحث و گفتگو کرنا، جو سرے سے وجود ہی میں نہ آیا ہو، دوسرے لفظوں میں اپنا وقت ضائع کرنا ہے، کیونکہ اس قسم کے مفروضات کو نقد و تمحیص کی کسوٹی پر کسنے سے انسانی مستقبل کی تشکیل و تعمیر میں بڑی مدد ملتی ہے، بلکہ میں تو اس گمان کو بنیادی طور پر فاسد سمجھتا ہوں اس لیے کہ اگر عرب مفتوحہ قوموں کو اپنا مذہب اور اپنی زبان اختیار کرنے پر مجبور کرتے تو سلطنت قائم ہوتے ہی فنا ہو جاتی جس کی وجہ یہ ہے کہ ہر وہ معاشرہ جس کی طرف لوگ اپنی خوشی اور آزادی کے ساتھ نہیں آتے بہت جلد زوال و ہلاکت کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے اور ہر وہ نظام جو زور و زبردستی کے سہارے قائم کیا جاتا ہے، لوگوں میں شورش و بغاوت کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ اس بنا پر اگر مسلمان مفتوحہ قوموں کو اسلام پر مجبور کرتے تو اس سے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچتا بلکہ مفتوحہ ممالک کی زمین ان کا وجود برداشت نہ کرتی اور وہاں کے باشندوں میں ان کے خلاف بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھتے۔ اس صورت میں مسلمانوں کو اپنی حکومت کے لیے جبر و استبداد کے سوا کوئی بنیاد نہ ملتی، اور جو حکومت جبر و استبداد پر قائم کی جاتی ہے وہ سریع الزوال ہوتی ہے۔ ہم بھی دیکھ چکے ہیں اور صدر اول کے مسلمانوں نے بھی دیکھ لیا تھا کہ جب ہرقل نے مختلف مسیحی فرقوں پر ایک عیسوی مذہب مسلط کرنے کی کوشش کی تو اس کا حشر کیا ہوا؟ عوام نے اس کے اور رومی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی، جس کے نتیجے میں ہرقل کو اسلامی قوت کے مقابلے میں شکست کھا کر شام کی طرف بھاگنا پڑا، اور مسلمانوں کے مصر فتح کر لینے کے بعد وہ اپنی سلطنت ہی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

اس کے برعکس لوگ جب کسی عقیدے کو قبول کر کے آزادی و رضامندی کے ساتھ اس کے حلقہ اثر میں داخل ہوتے ہیں تو یہ عقیدہ ان کی زندگی کا ایک جزو بن جاتا ہے اور ان کے دلوں میں تقدس کا ایک ایسا مقام حاصل کر لیتا ہے کہ وہ اس کے لیے سینہ سپر ہو جاتے ہیں اور اس کی راہ میں جان تک دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ چنانچہ صدر اول کے مسلمانوں نے اپنے مذہبی اصولوں کے نفاذ میں جو طریق کار اپنایا وہ یہ تھا کہ ہر شخص اپنے اپنے عقیدے میں آزاد ہے اور دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔ وہ تمام تر حکمت پر مبنی تھا اور اسی نے اسلامی سلطنت کو وسعت و عظمت بخشی۔ زبان کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی ہے جیسا دین کا معاملہ کہ جب تک لوگ اسے برضا و رغبت قبول نہ کریں اور جب تک انہیں یہ محسوس نہ ہو کہ اسے سیکھنے میں ان کا بڑا فائدہ ہے، اس وقت تک

Marfat.com

کسی زبان کے باقاعدہ سیکھنے کا تو ذکر ہی کیا، لوگوں کو اس کے بولنے پر بھی مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں نے مفتوحہ ممالک کے باشندوں کو مذہبی معاملات میں آزادی کی جو ضمانت دی تھی، وہ بھی ایک سبب تھا جس نے ایران و روم وغیرہ کو اسلام اور عربی زبان قبول کرنے پر آمادہ کیا، لیکن غیر قوموں کے مسلمان ہونے کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اسلام نے رنگ و نسل اور زبان ورواج کے اختلاف کے باوجود مسلمانوں میں مساوات رکھی تھی اور یہ اصول مقرر کر دیا تھا: ''پرہیزگاری کے سوا کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں!''

نیز یہ کہ ''مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ان میں سے کسی کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ نہ چاہے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے!'' چنانچہ اس اخوت، اس حریت اور اس مساوات نے مل کر ایک ایسی فضا پیدا کر دی، جس نے سلطنت میں وحدت کی قوت کو دو چند کر دیا اور اس کے سائے میں سلطنت کے ایک ایک جزو کی سرگرمی تیز سے تیز تر ہو گئی۔ اس کے باوجود اگر آپ چاہیں تو اسلام کے عصر اول یا اس سے ملحقہ ادوار میں ان اجزاء میں سے ہر جزو کے وہ کارنامے الگ الگ کر کے بھی دیکھ سکتے ہیں جو ان سب کے ذوق و شوق نے فقہ و ادب، علم و فلسفہ اور صنعت و زراعت کے عظیم آثار اور معنوی و مادی زندگی کے تمام مظاہر میں اپنے کمالات کی حیثیت سے یادگار چھوڑے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے جو اس کی فطرت سے ترکیب پاتا ہے اور وراثت کے زیر اثر زمانے میں قائم و دائم رہتا ہے۔ یہ مزاج آداب و فنون اور مختلف اسالیب فکر میں تو نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے، لیکن مادی زندگی کے آثار مثلاً صنعت و زراعت وغیرہ میں بھی چھپا نہیں رہتا۔ عربی ادب کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایرانیوں اور رومیوں نے اس میں فکر و تحریر کے ایسے رنگارنگ اسالیب داخل کیے جن سے جزیرۃ العرب کے باشندے بالکل ناآشنا تھے، حالانکہ ایرانیوں اور رومیوں نے عربی جزیرۃ العرب کے باشندوں ہی سے سیکھی تھی۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں اس لیے کہ زبان ایک زندہ وجود ہے جو اپنے ماحول کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور اس معنی کر کہ وہ انسانی فکر و تصور کے اظہار کا ایک آلہ ہے، اپنے اسلوب و ہیئت میں فکر و تصور کے مختلف رنگوں سے متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے عربی زبان کا ان رنگوں اور ان تصویروں سے متاثر ہو کر، جن سے ایرانی اور رومی اپنی فکر و ثقافت میں مانوس تھے، اپنی شاعری اور نثر نگاری میں بھی وہی اسلوب اختیار کر لیا، جن سے یہ اغراض

پوری ہوتی تھیں، بالکل فطری بات تھی۔

ایرانیوں اور رومیوں نے عربی فن وادب میں جو نئے رنگ داخل کیے ان کا خود عربوں پر بھی بہت واضح اثر پڑا۔ آپ اس اثر کو بصرہ اور کوفہ والوں کے اس لسانی اختلاف میں نمایاں طور پر دیکھیں گے، جس کا ذکر زبان وادب کے مؤرخین آج تک کرتے ہیں۔ یہ اختلاف پیدا اس لیے ہوا کہ بصرہ اور کوفہ عراق میں ہیں اور ایران کے ہمسایہ، اس لیے ان دونوں شہروں کے باشندوں کا ایران کی ہمسائیگی اور ایرانی تہذیب کے ان اثرات سے متاثر ہونا جو ان تک پہنچے، بالکل فطری تھا۔ اسی طرح اس میں بھی حیرت کی کوئی بات نہیں اگر ان دونوں شہروں میں سے ایک شہر نے اپنی عربیت کی زیادہ حفاظت کی اور دوسرے شہر نے ایرانی تہذیب کو اپنانے میں غلو سے کام لیا۔ قومی مزاج صرف معنوی زندگی اور اس کے فنی، علمی اور ادبی مظاہر ہی میں نمایاں نہ تھا، بلکہ آپ مادی زندگی میں بھی اس مزاج کے بہت سے اثرات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ یمن کی چادریں، دمشق کا ریشمی اور مصر کا سوتی کپڑا اور اسی قسم کی دوسری چیزیں، جو بقدر اختلاف فطری، صنعت و اقتصاد میں امتیازی رنگ کی حامل ہیں، اس مزاج کی بقا کا زندہ ثبوت ہیں اور ظاہر کرتی ہیں کہ سلطنت کی وحدت سے پیدا ہونے والے واقعات بھی اس اختلاف کو مٹا سکے نہ اس کے اثرات کو زائل کر سکے۔

لیکن معنوی اور مادی زندگی کے مختلف مظاہر میں قومی مزاج کی اس نمود نے سلطنت کی وحدت کو اس کے ابتدائی ادوار میں کم و بیش کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور سلطنت کی قوتیں انتہائے مشرق سے انتہائے مغرب اور انتہائے شمال سے انتہائے جنوب تک باہم مربوط ہوگئیں۔ اس ارتباط نے ان قوتوں کو ازدواجی رشتوں میں پرو دیا اور اس رشتے کے نتائج وثمرات سے سلطنت کے تمام اجزاء کو باہم پیوست کر دیا۔ اسلامی توحید کے سائے میں جب یونانی فلسفے کا امتزاج ایرانی تہذیب سے ہوا تو اس سے اسلامی فلسفہ پیدا ہوا اور جب ایرانی تخیل و بیزنطینی فن عربی زبان سے ہم آغوش ہوئے تو عربی شاعری اور عربی نثر نگاری میں اسلامی ادب کے مختلف رنگ مہکنے لگے۔ پھر جب ایرانی فن آرائش اور بیزنطینی فن تعمیر میں رشتہ مواصلت قائم ہوا تو اس کے نتیجے میں عربی فن تعمیر وجود میں آیا۔ ازدواج کا یہ سلسلہ سلطنت کے تمام گوشوں میں زندگی کے مفید اور بکار آمد پہلوؤں تک پہنچ گیا اور اس سے ایک نئے وجود نے جنم لیا، جس کی قوت اور تازگی ماہ و سال

Marfat.com

کے ساتھ بڑھتی رہی۔ یہ وجود عربی فتوحات کی رہنمائی کرتا اور ان کے قدم سے قدم ملا کر چلتا تھا، اس نے دنیا کے قریب و بعید گوشوں میں اپنے اقتدار کے پرچم لہرا دیئے تھے اور عربی فتوحات کے مقابلے میں اس کا اثر زیادہ دیرپا، اس کی جڑیں زیادہ مضبوط اور اس کی شاخیں زیادہ گھنی تھیں۔ اس نئے وجود کا نام اسلامی تہذیب ہے!

قرون اولیٰ میں اس تہذیب کے زیر سایہ سلطنت اس طرح پروان چڑھی کہ دنیا حیرت میں رہ گئی اور نگاہیں ہر جانب سے اس کی طرف کھنچنے لگیں۔ یہ اسی کا اثر تھا کہ مملکت کے وسیع گوشوں میں لوگ مقامی امتیازات کو بھول گئے۔ وہ صرف یہی کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں اور آپس میں بھائی بھائی، جنہیں آزادی، اخوت اور مساوات کے وہ اصول باہم مربوط کرتے ہیں جو اسلام نے مقرر کیے ہیں۔ ان کے درمیان حکومت، انصاف و پرہیزگاری کی بنیاد پر قائم تھی، اس لیے وہ آپس میں شادیاں کرتے تھے، عرب، ایرانی، عراقی، شامی، یا مصری لڑکی کو اپنے حبالہ عقد میں لاتے تھے اور ان ممالک کے مسلمان عرب لڑکیوں سے نکاح کرتے تھے، اس طرح خون اور نسب کی قرابتوں نے تمام مسلمانوں کو محبت کے رشتے میں باندھ کر ان کے دلوں سے نسلی اور قومی تعصب کا مفہوم بالکل محو کر دیا اور اسلامی وحدت میں ایک ایسی روح پھونک دی جو سلطنت کی قوت واستحکام اور اس کے فرزندوں کی معنوی و مادی نتیجہ آفرینیوں کے شوق میں اضافہ کرتی تھی اور اس سے اسلامی تہذیب کا محل اور بلند ہو گیا۔ مسلسل کئی نسلوں تک یہی صورت حال برقرار رہی۔ ان محرکات کے عمل کا، جو سلطنت کی ہر قوم کے ساتھ مخصوص تھے، مشرق و مغرب میں عالمی تہذیب کا رخ متعین کرنے میں بہت اثر ہے۔ اور چونکہ ان محرکات کو روبہ عمل لانے اور ان کا رخ متعین کرنے والی قوتیں غیر معمولی اثر و اقتدار کی حامل تھیں، اس لیے تفرقہ و کمزوری کے عوامل ماہ و سال کے پردوں میں چھپے رہے اور ان کا اثر سمٹ کے رہ گیا۔ جہاں اس اثر کا کوئی پہلو سر اٹھاتا، قوت دفاعہ اس کا کام تمام کرنے کے لیے دوڑتی۔ اس کی ایک جھلک ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت میں دیکھ چکے ہیں۔ لیکن ان عوامل کے چھپ جانے کی وجہ سے ان پر کوئی ایسی کاری ضرب نہ پڑ سکی جو ان کا قصہ ہی پاک کر دیتی بلکہ وہ سب کے سب اپنی کمین گاہوں میں چھپے رہے جس طرح صحت مند جسم میں بیماری کے جراثیم چھپے بیٹھے رہتے ہیں۔ جہاں انہوں نے حرکت کی اپنی جگہ سے نکلنا چاہا، صحت کے اسباب نے انہیں مغلوب کر کے ان کی کمین گاہوں اور خلیوں میں

Marfat.com

دھکیل دیا۔

اس طرح کوئی شخص یہاں تک کہ خود صاحب جسم بھی ان جراثیم کے وجود کا احساس نہیں کر پاتا اور نہ اسے ان کی اس قدرت کا پتا چلتا ہے کہ اسباب صحت کے کمزور ہوتے ہی وہ سرگرم عمل ہو جائیں گے۔ انہیں محافظ قوتوں کے زیر سایہ اہل شام اموی دور حکومت میں مسلمان عربوں کے مددگار تھے اور اہل ایران رسول اللہ ﷺ کی قرابت کی بنا پر عباسیوں کے زبردست معاون۔ لیکن اہل مصر اسلامی سیاست کے اسٹیج پر اس وقت نمودار ہوتے تھے، جب کوئی بہت ہی نازک مرحلہ پیش آجاتا تھا۔ اہل مصر کے اس ڈرامائی ظہور اور اہل ایران و شام کی اس اعانت نے سلطنت کو آگے بڑھانے، طاقت و قوت کی طرف اس کے قدم تیز کرنے اور بہم پیوستہ اجزاء کے ساتھ اسے قائم رکھنے میں بڑا کام کیا یہاں تک کہ وہ زمانہ آگیا جس کی چکی حرکت میں آکر اس سلطنت کی قوت و شوکت کا کام تمام کرنے والی تھی۔ زمانے کی یہ گردش اس وقت شروع ہوئی جب ان محرکات و عوامل کی محافظ قوتوں کا عمل کمزور پڑ گیا؛ جو سلطنت کی ہر قوم کے ساتھ مخصوص تھے اور جن سے سلطنت کے نشو و ارتقاء اور اس کے اثر و اقتدار میں اضافہ ہوتا تھا۔ اگرچہ تفرقہ وضعف کے عوامل عہد اول ہی سے اپنی اپنی کمین گاہوں اور خلیوں سے وقتاً فوقتاً نکلتے رہتے تھے لیکن شکست کھا کر الٹے پاؤں بھاگتے اور ان اسباب کے سامنے پسپا ہونے پر مجبور ہو جاتے تھے جو سلطنت کے وجود کی صحت و توانائی کے ضامن تھے۔ تاہم جب کبھی یہ عوامل ظاہر ہوتے، اپنے پیچھے ایک ایسا اثر چھوڑ جاتے جس کا کچھ دنوں تو لوگوں میں چرچا رہتا، لیکن اس کے بعد گردو پیش کے واقعات و حوادث کا جلال اس کو طاق نسیاں کے حوالے کر دیتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت سب سے پہلی نمایاں علامت تھی جو تفرقے کے عوامل کی نمود پر دلالت کرتی تھی، لیکن جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سریر آرائے خلافت ہو کر اس فتنے کا سر کچل دیا جو اپنے اندر قیامت بننے کی صلاحیتیں رکھتا تھا اور جب حضرت عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو قتل کر دیا جن کے متعلق انہیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس سازش کے بانی مبانی ہیں جس کے نتیجے میں ان کے والد محترم کی جان گئی تو مسلمان پھر اپنی تیغ آزمائیوں اور نصرت یابیوں میں مصروف ہو کر سلطنت کی عمارت کو مستحکم کرنے لگے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے چھ برس بعد بنو ہاشم و بنو امیہ کا اختلاف پھر عود کر آیا۔ اس کی چھپی ہوئی قوتیں پھر اپنی کمین گاہوں سے نکل آئیں،

Marfat.com

جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکومت کے اعلیٰ مناصب پر اپنے رشتے داروں کو فائز کر دیا تھا اس سے ان کے دشمن...... جو سب کے سب مسلمان تھے۔ سلطنت کے مختلف گوشوں میں ان کے خلاف متحد ہو گئے اور اس باب میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے احکام و تصرفات کو ہدف طعن و اعتراض بنانے لگے۔ ان کا یہ گٹھ جوڑ فتنے کی صورت اختیار کر گیا، جس کا سب سے زیادہ اثر ان مسلمانوں پر پڑا جو مصر میں مقیم تھے، ان کی شرکت نے اس فتنے کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک پہنچا دیا۔ چنانچہ جب اس معمر خلیفہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہو گئی اور اس کی جگہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے دست خلافت پر بیعت کی گئی تو بنو امیہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خوں بہا کا مطالبہ کیا اور اس کے بعد آنکھیں بند کر کے بغاوت کر دی۔ اب تمام سلطنت میں مسلمانوں کے دو فریق ہو گئے تھے، ایک فریق بنو ہاشم کا مددگار تھا اور دوسرا فریق بنو امیہ کا حامی۔

یہ فتنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے صاحبزادے امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ختم ہوا اور مسلمانوں کی زمام امارت بنو امیہ نے سنبھال لی۔ اس فتنے نے سلطنت کی عمارت کو جھنجھوڑ تو ضرور ڈالا لیکن اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکا، کیونکہ یہ عمارت بہت ٹھوس اور اس کے ستون بڑے مضبوط تھے تفرقے کے محرکات ابھی تک زور نہ پکڑ سکے تھے اس لیے کہ مفتوحہ ممالک ہنوز ننگ شکست کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے اور ضعف و انحطاط کے وہ اسباب ابھی ان پر مسلط تھے جو انہیں اپنے سابقہ حکمرانوں سے ورثے میں ملے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی اموی حکومت قائم ہوئی، بنو امیہ نے فتوحات کی اس سیاست پر چلنا شروع کر دیا جو ان کے پیش رو خلفاء نے آغاز کی تھی۔ اب تفرقے کے عوامل پھر اپنی اپنی کمین گاہوں میں جا چھپے اور سلطنت میں رہنے بسنے والی قومیں اس عالی شان محل کی پختگی اور استحکام میں تعاون کرتی رہیں جو اسلامی تہذیب کا محل تھا۔ لیکن اس فتنے سے مفتوحہ قوموں کو یہ شہ ملی کہ وہ اپنی قوت حیات کو دوبارہ حاصل کریں اور اپنے رجحان کو نئی تہذیب کے سایے میں اس طرح تقسیم کر دیں کہ وہ اپنے حاملین کے اقتدار کی ضمانت بن جائے۔

ایرانی اس مقصد کے حصول میں سب قوموں سے پیش پیش اور تیز رفتار تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ بنو ہاشم حضرت علی رضی اللہ عنہ، امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان لوگوں کا انتقام لینے کے لیے بے چین ہیں، جن پر بنو امیہ نے زیادتیاں کی ہیں۔ چنانچہ ایرانی مفکرین نے امامت اور امام کے اصول کو اس طرح بنا سنوار کے پیش کیا کہ اس نے اہل عراق کے دل موہ لیے اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے معاونین

Marfat.com

کے گروہ میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے دل و جان سے ابو مسلم خراسانی کی مدد کی جو آخر کار عباسیوں کی بنوامیہ پر فتح یابی کا سبب بن گئی اور مرکز حکومت دمشق سے بغداد منتقل ہو گیا۔

عباسیوں کی حکومت قائم ہو گئی اور انہوں نے ایرانیوں کو اپنا وزیر و مشیر بنالیا، جس کا اسلامی زندگی پر بہت گہرا اثر پڑا۔ اگر آپ اس اثر کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو اپنے حافظے میں ان واقعات کو تازہ کیجئے جو اس عہد میں پیش آئے، اس عہد میں رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہوئی حدیثیں جمع کی گئیں، یونانی فلسفہ عربی میں منتقل کیا گیا، ایرانیوں میں ایسے ایسے باکمال شاعر اور نثر نگار پیدا ہوئے جنہوں نے ایرانی تہذیب کے مختلف مظاہر کا قرآن کی زبان میں ترجمہ کر دیا۔ علوم و فنون اور آداب میں وہ تازگی و تابناکی پیدا ہوئی کہ تمام دنیا کی نگاہیں اس پر جم کے رہ گئیں اور ان علوم و فنون میں سلطنت کی تمام قوموں کے عبقریانہ نتائج فکر کا ایسا پیوند لگایا گیا، جس سے اسلامی تہذیب کا مقام بلند ہو گیا اور وہ صدیوں تک دنیا کی رہنمائی کرتی رہی۔ یہ اسی تابناکی کا نتیجہ تھا کہ علم کلام اور فقہ و ادب و لغت میں متعدد مذاہب فکر رواج پا گئے اور سیاست و حکومت کے اسالیب اور فکر کے مظاہر و آثار میں رنگا رنگی پیدا ہو گئی۔ اس سے ہر قوم کے لیے ممکن ہو گیا کہ وہ اسلامی فکر کو اپنے قومی مزاج میں رنگ کر سلطنت کے گوشے گوشے میں پھیلا دے اور چونکہ یہ فکر اسلامی رنگ میں رنگی ہوئی اور عربی زبان میں لکھی ہوئی ہے، اس لیے اس کو پسند کرنے والے بھی اسے مل جائیں، اس طرح ہر قوم نے اپنی شخصیت کو عربی قالب سے نکال لیا جو دراصل اسلامی تہذیب ہی کا ایک قالب تھا اور ہر قوم یہ کوشش کرنے لگی کہ کسی نہ کسی طرح سلطنت کے اقتدار پر قبضہ جمالے یا کم سے کم اس تہذیب کے سائے میں استقلال کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو جائے۔

اس صورت حال نے سلطنت کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ اس کی وہ متحد سیاست نہ رہی جس کا مقصد لوگوں میں اسلامی پیغام کی نشر و اشاعت تھا اور اس طرح سلطنت و حکومت میں قومی فکر نے غلبہ پالیا، جو اس کے بعد بھی اس وقت تک قائم رہا، جب تک ترکوں نے سلطنت کے تمام اجزاء پر اقتدار حاصل کر لیا اور انہیں تلوار کے زور سے از سر نو مرتب کر کے ان سے عثمانی سلطنت قائم کی۔ چنانچہ یہ سلطنت، ترکی قومی سلطنت تھی، عربی اسلامی سلطنت نہ تھی اور اسی لیے اس نے اسلامی پیغام کی اشاعت کو اپنا مقصد بنانے کے بجائے اسلام کو اپنے مرتبے اور اقتدار کی حفاظت کا وسیلہ بنایا۔

Marfat.com

یہ ایک ہلکی سی جھلک تھی، جس سے میرا مقصد ان محرکات کے عمل کا اظہار تھا جو اسلامی سلطنت کی تمام قوموں کے ساتھ مخصوص تھے اور جنہوں نے مختلف زبانوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اثر کیا۔ میں وہ اسباب اور ان اسباب کی نوعیت بھی بیان کرنا چاہتا تھا جو سلطنت کے نشو و ارتقاء اور قوت و طاقت اور اسلامی تہذیب کے قیام و رفعت میں معین ہوئے اور وہی بعد کو اس سلطنت کے زوال و انحطاط کا سبب بن کر اس کے وجود میں رینگنے لگے۔ میرا خیال ہے، میرے ساتھ آپ کی بھی یہی رائے ہوگی کہ ان عوامل کی تفصیل و تحلیل ان کے عمل کی ظاہر و مخفی صورتوں کا اظہار اور ان واقعات کا بیان جو اس دوران میں ان عوامل کے دوسری قوموں اور تہذیبوں سے ملنے کے بعد پیش آئے، یہ سب چیزیں تاریخ کے گوشوں پر ایک نئی روشنی ڈالتی ہیں جس کی عالم اسلام ہی کو نہیں، تمام دنیا کو شدید ضرورت ہے۔

مستشرقین کی طرح عرب اور مسلمان مصنفین کو بھی یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے اس تاریخ کے بہت سے پہلوؤں پر بحث و تحلیل کی نظر ڈالی ہے۔ میری انتہائی خواہش ہے کہ میں اس میدان میں ان حضرات کی مشارکت کے لیے اپنی کوشش جاری رکھوں اور میری یہ کوشش اسی نہج پر ہو جس کی ابتداء میں نے اپنی کتاب "حیات محمد ﷺ" سے کی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اپنی توجہ اس بحث کے چوتھے حلقے کی طرف مبذول کروں، جس میں ان واقعات کا تجزیہ کیا جائے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور بنوامیہ کی حکومت کے درمیان پیش آئے، اگرچہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سلطنت کی زندگی کے یہ لمحات بڑے نازک اور انتہائی پرخطر ہیں۔

میں بارگاہِ رب العزت میں دست بدعا ہوں کہ وہ مجھے اس کوشش کی توفیق ارزانی فرمائے، جس طرح اس سے پہلے اس نے مجھ پر انعام فرمایا ہے کہ ہدایت اور توفیق اسی جل شانہ کی طرف سے ہے اور ہر کام کا مرجع اُسی کی ذاتِ اقدس و اعلیٰ ہے۔

Marfat.com

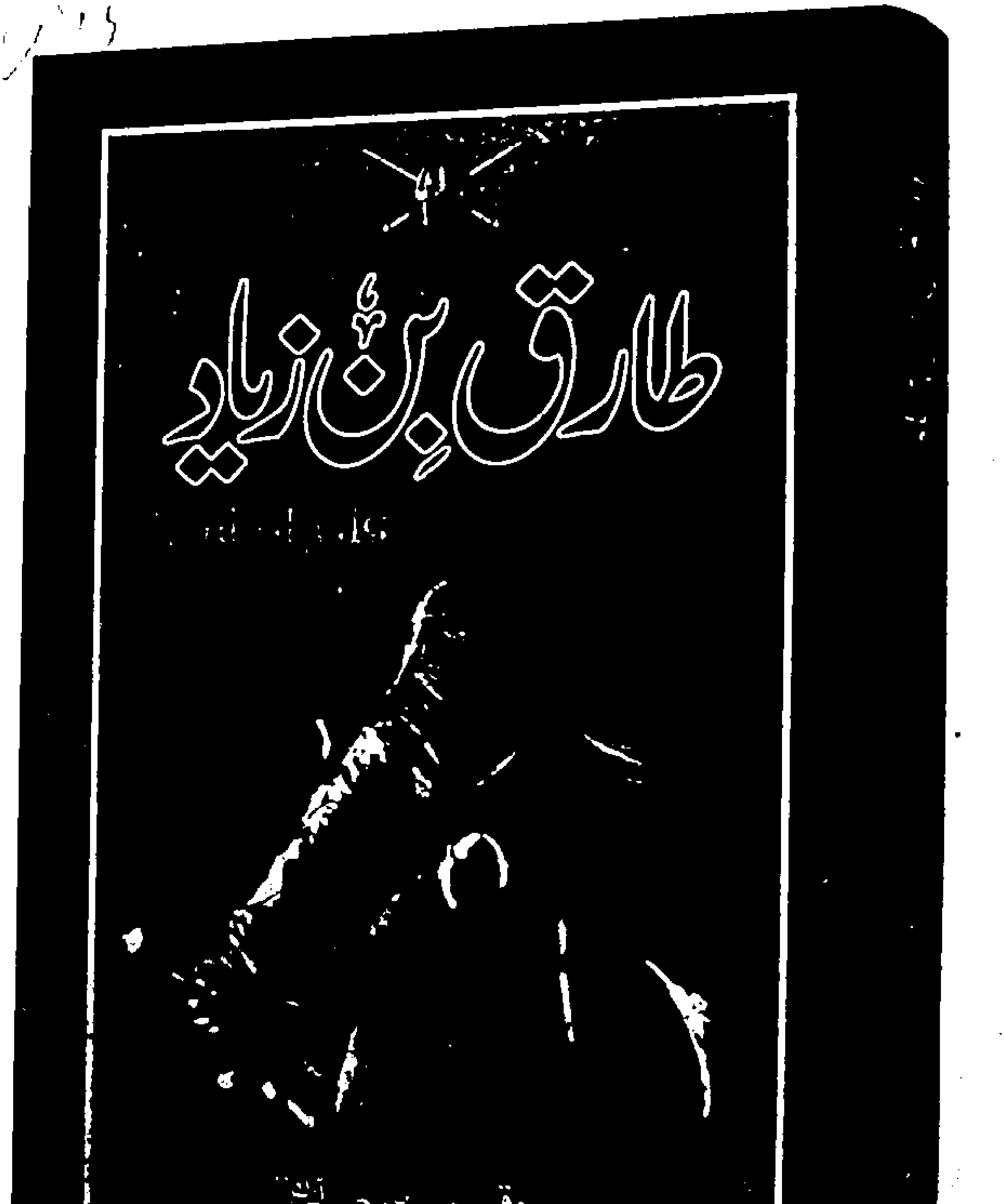

Marfat.com

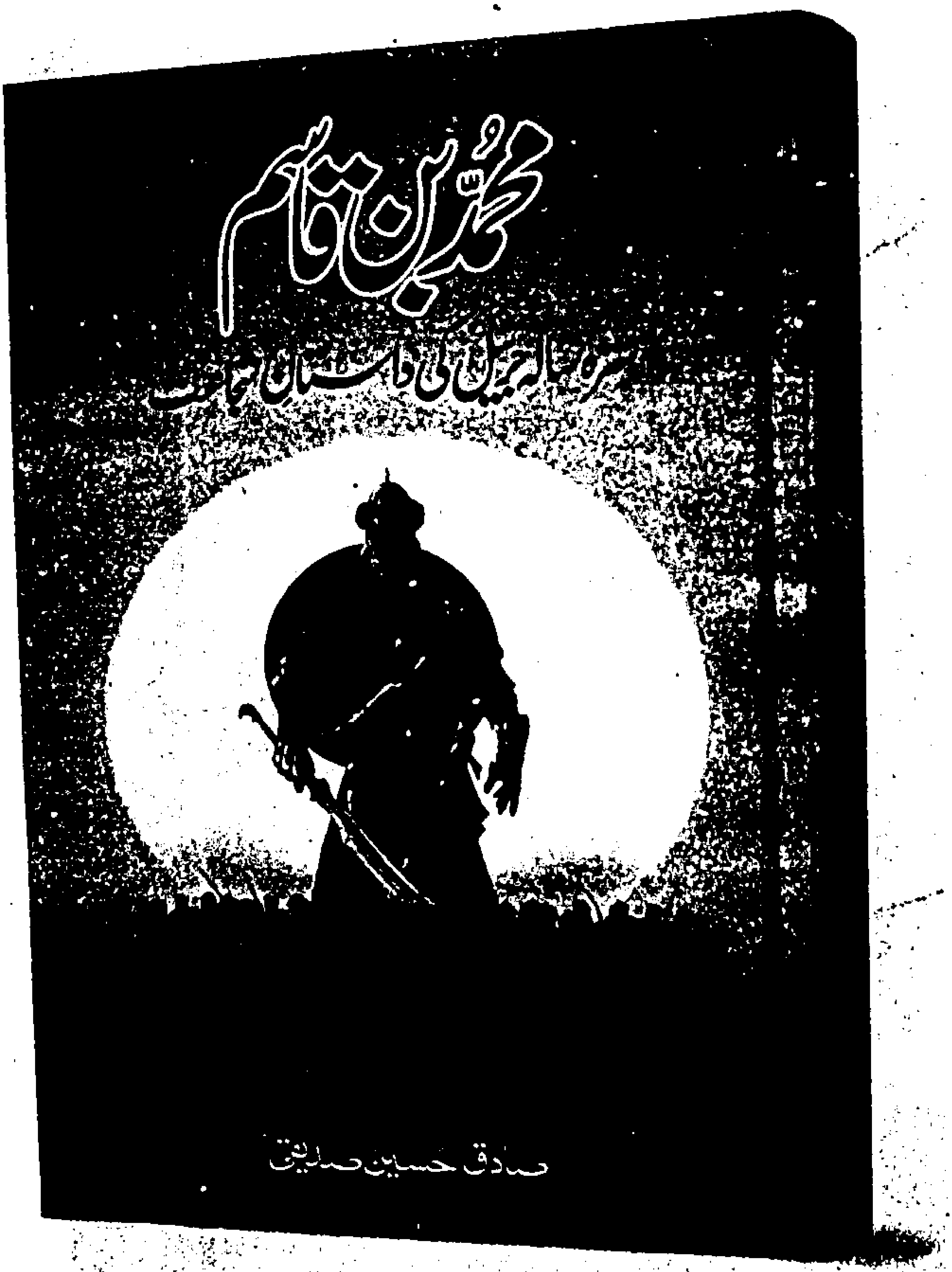

Marfat.com

خلیفۂ ثانی، مرادِ رسول ﷺ اِمامِ عدل و حُرّیت
ناصرِ دینِ مبین فاتحِ عرب و عجم امیرُ المؤمنین

سیدنا حضرت
عُمر فارُوقِ اعظم رضی اللہ عنہ

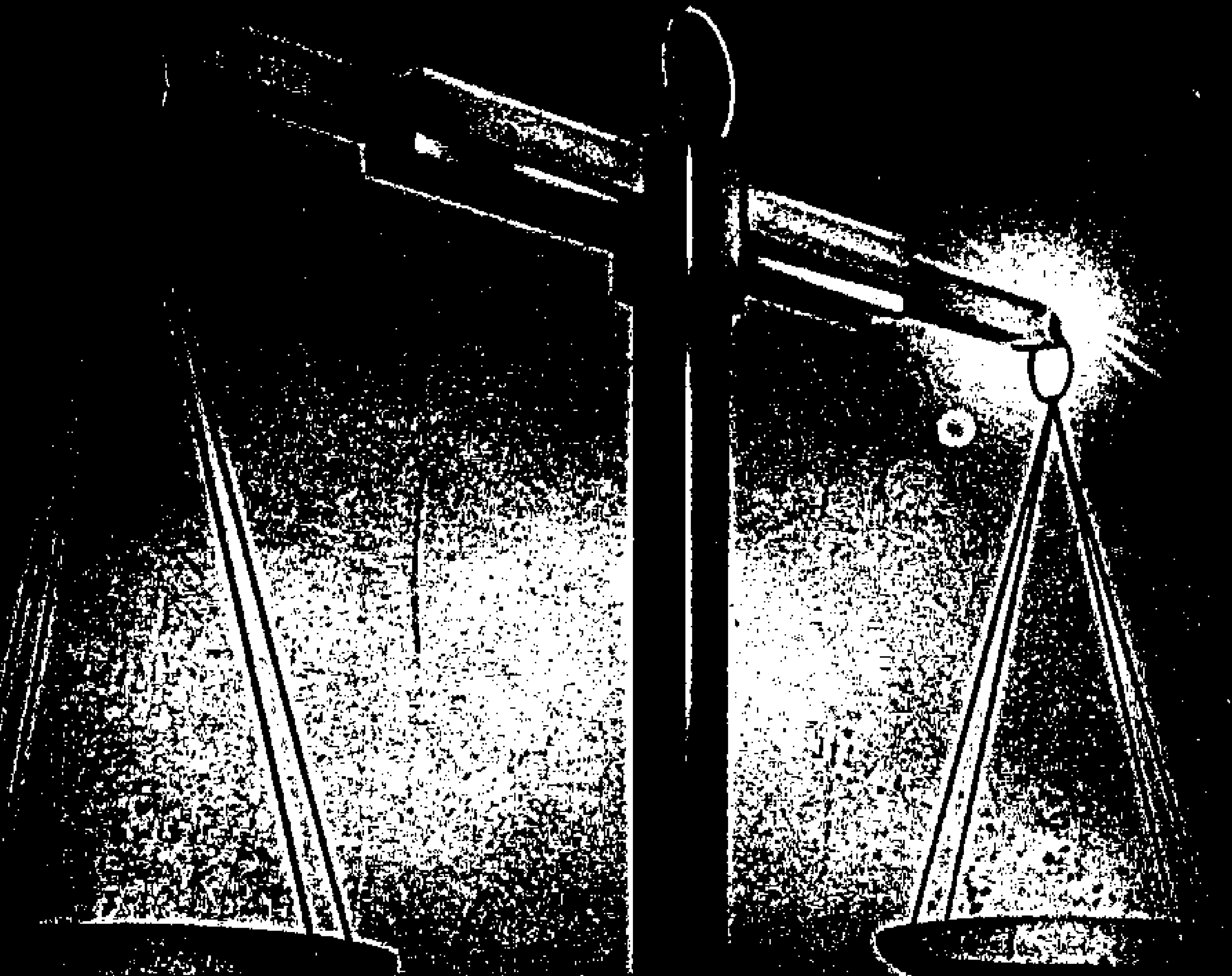

مصنف محمد حسین ہیکل

مترجم حبیب اشعر دہلوی

TR
طٰہٰ رحیم پبلیکیشنز

Marfat.com